حیاتِ محمد ﷺ
صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم
محمد حسنین ہیکل
urdukutabkhanapk.blogspot

حیاتِ محمد
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

محمد حسنین ہیکل

مترجم:
محمد مسعود عبدہ

فہرست

تعارف

حیات محمد ﷺ کے مؤلف محمد حسین ہیکل مصر کے نامور ادیب، فلسفی، روشن خیال مفکر، اجتہاد پسند اور جدید طرز نگارش کے علمبردار ہیں۔ ادبی اور علمی حلقوں میں ان کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔

البتہ مؤلف نے حیات محمد ﷺ جن اہم ترین مقاصد کے تحت لکھی ہے، آپ اگر آغاز میں ہی اس سے متعارف ہو جائیں تو ممکن ہے کہ آپ کے شعور مطالعہ کے لیے یہ تعارف کتاب کے مرکزی خیال کی اہمیت کو سمجھنے میں اضافی معاونت کا موجب ہو۔

اس کتاب کا بنیادی مقصد مغرب کے اسلام دشمنی کا کلیسائی پادریوں کے ان جھوٹے الزامات کا علمی انداز میں جواب دینا ہے جو محض ان کی عصبیت پر استوار ہیں۔ حیات محمد ﷺ مستشرقین سکالرز کی سیرت طیبہ پر لکھی ہوئی کتابوں میں غیر مصدقہ، بے بنیاد اور غلط معلومات پر استوار واقعات کی تردید کرتا ہے۔ چنانچہ موصوف خود حیات محمد ﷺ کے مقدمہ طبع اول میں لکھتے ہیں۔

(۱) مغربی مصنفین تحقیق کیے بغیر اسلام پر الزام تراشی میں حد سے زیادہ بڑھ گئے۔

(۲) بعض مغربی اہل قلم نے محمد ﷺ کو ایسے رومی راہب سے تشبیہ دی جو اپنے لیے پوپ کا مقام حاصل نہ ہونے کی وجہ سے مخلوق خدا پر بپھر گیا۔

(۳) مغرب کے ہجوگو شعراء نے آں حضرت ﷺ کو طلائی مورتی کی صورت پیش کیا جسے لوگ مسجدوں میں رکھتے ہیں۔

(۴) ”اولان“ نے اپنی نظم میں جو واقعہ بیان کیا ہے۔ اس میں ہسپانوی عیسائی فوجوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے اصنام توڑے جا رہے ہیں جو تین خداؤں پر مشتمل ہیں۔

(۱) ترخاجان (۲) محمد (نعوذ باللہ) (۳) ابولون

الغرض ان کینہ پرور ہذیان گو مسیحی مصنفین کے ایسے ہذلیات مسلسل نشوونما پاتے رہے ہیں۔ خصوصاً ان اہل قلم کے زور سے! (۱) زولف ولوحیم (۲) نیکولا ویس (۳) و تیقس (۴) مراتشی (۵) ہوتنگر (۶) .بلیاندر (۷) پریدو وغیرہ

(۸) "این برونزایل" نے قرآن مجید کے لاطینی ترجمہ میں سب سے پہلے اسلام کی صورت کو مسخ کیا۔

(۹) پھر چودہویں صدی میں برباسکل نے اسلام کے ابتدائی نشوونما پر قلم سے ناپاک حملے کئے۔

(۱۰) قرون وسطیٰ کے اکثر مسیحی مصنفوں نے آنحضرت ﷺ کو لامذہب ثابت کرنے کا مسیحی فرض ادا کیا۔

مغرب نے اسلامی ممالک میں اپنے مبلغین بھیجے تاکہ مسیحیت کی نیابت اسلام پر ناروا الزام لگا کر مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کر کے عیسائیت کی طرف مائل کر سکیں۔ "ابتدا ہیں نے علمی زندگی طے کرنے کے بعد عملی دور میں قدم رکھتے ہی میں علمی انداز میں ان تمام الزامات اور بہتانات کا جواب دینے میں مصروف ہو گیا جو مغربی عیار اہل قلم نے محمد ﷺ پر لگائے تھے"۔

اس عظیم اور وقت کے اہم ترین مقصد کی تکمیل میں موصوف کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ قارئین بہتر کر سکیں گے۔

میرے خیال میں مستشرقین اور عیسائی مشنری آج بھی ہمارے ملک میں ویسے ہی آب و تاب سے سرگرم عمل ہیں جس کا جواب علمی اسناد کے ساتھ دینا ہر اس اہل قلم کا فرض ہے جو مسلمان کہلاتا ہے۔

کتاب حیات محمد ﷺ کے آخر میں مؤلف محترم نے "اسلامی تمدن قرآنی نقطہ نگاہ سے" اور "اسلامی تمدن اور مستشرقین" کے عنوانات سے مزین دونوں مقالات انتہائی فکر انگیز تحریر کا شاہپارہ ہیں۔

اگرچہ موصوف نے حیات محمد ﷺ میں واقعات کو تحریر فرماتے ہوئے قرآن مجید ہی کی آیات پر اعتماد کیا ہے۔ لیکن علامہ دہر محمد حسین ہیکل نے رسول اللہ ﷺ کے

نام پر درود سلام کی عدم تکرار کے جواز میں علماء اور محدثین کا سہارا لیا ہے۔ انتہائی معذرت کے ساتھ مترجم نے قرآن مجید کے اس حکم کی تعمیل کی ہے جس میں ارشاد ہے۔

"ان اللہ وملٰئکۃ یصلون علی النبی یاایھا الذین امنو صلو علیہ وسلموا تسلیما"

(ترجمہ) اللہ اور اس کے فرشتے نبی ﷺ پر درود و سلام بھیجتے ہیں تم بھی درود و سلام بھیجا کرو۔

میری عقل و دانش کے مطابق اللہ تعالیٰ کا حکم حرف آخر ہے اور غیر منقطع ہے اللہ تعالیٰ کے واضح احکامات کی تاویلات کرنا خود سری کے مترادف ہے۔

اسی طرح موصوف نے صحابہ کرام کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھنا غیر ضروری قرار دیا ہے لیکن جب قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ان جاں نثاران محمد ﷺ کو خود یہ اعزاز بخشا ہے۔ رضی اللہ عنہ ' ورضوا عنہ ' (۳۰۔ سورہ بینہ ۸) تو مجھے اس سے اغماض برتنے کا کوئی حق نہیں۔

مؤلف سے انتہائی معذرت کے ساتھ میری تمنا ہے کہ مرتے دم بھی رسول اللہ ﷺ کا ذکر ہو درود و سلام کا تکرار زبان پر ہو اور فدایان شمع رسالت کے اسماء کو رضی اللہ عنہ سے سجاتا رہوں اور میرا دم نکل جائے۔

مترجم

محمد مسعود عبدہٗ

اردو کُتب خانہ
URDUKUTABKHANAPK.BLOGSPOT

مقدّمہ مؤلّف (طبعِ اوّل)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ مؤلف (طبعِ اوّل)

عظیم و اعلیٰ اسمِ مسمّٰی محمدؐ

بلاشبہ یہی ایک اسمِ مسمّٰی محمد علیہ الصلوٰۃ و السّلام وہ اسم مبارک ہے۔ جو اس کرۂ ارض پر بسنے والے تمام مسلمانوں کے دلوں کو ہر لحہ صبحِ بہار سے زیادہ لطف و سرور عطا کر رہا ہے۔

ہاں یہی وہ اسم محمد علیہ الصلوٰۃ و السّلام ہے جو ہم مسلمانوں کے دلوں کی بستیوں کو ساڑھے تیرہ سو سال سے آباد و شاد کر رہا ہے۔ اور تا قیامت اپنی برکتوں سے فیض یاب کرتا رہے گا۔ (انشاء اللہ)

مؤذّن کی اذان

ادھر رات کی گہری سیاہ چادر پر صبح نے اپنا نور بکھیرا' ادھر اس زمین پر رہنے والے تمام مسلمانوں نے اس اسم مسمّٰی کے حضور صلوٰۃ کے تحائف پیش کیے۔

اب سورج طلوع ہوا' ڈھلا' زوال پذیر ہوا' مؤذن نے صلوٰۃ ظہر کا اعلان کیا تو پھر اس کرۂ ارض پر چاروں طرف آباد بے گنت افراد نے اسی اسمِ مُسمّٰی کی خدمت میں صلوٰۃ و سلام کا ہدیہ عقیدت پیش کیا۔ یہ سلسلہ چلا۔ عصر' مغرب اور عشاء کے وقت بھی جب مؤذن کے اس اعلان کی آواز فضاؤں میں گونجی کہ محمد اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں تو تمام دنیا کے مسلمانوں نے اس حقیقتِ کبریٰ کی تصدیق و تائید کرتے ہوئے کہا۔ بے شک محمد اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول ہیں "صلی اللہ علیہ وسلم"

عقیدت و محبّت

اس اسمِ مسمّٰی کی ذات سے مسلمانوں کی عقیدت و محبت کا عالم یہ ہے کہ حالت صلوٰۃ میں بھی جب اس اسمِ ستودہ صفات کا ذکر آیا تو پہلو میں دل انتہائے عقیدت کی لذتوں سے سرشار ہو گیا — غرض عقیدت و محبت اور احترام و اعتراف احسان کا یہ سلسلہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے اور انشاء اللہ آئندہ بھی اسی طرح جاری ساری رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کے بندے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصدِ وحید دینِ اسلام کا غلبہ اس دنیا کے ذرہ ذرہ

پر اپنا علم گاڑ دے! (آمین)

تذکرۂ ماضی

محمد ﷺ کو دینِ اسلام کا پیغام دنیا کے تمام کناروں تک پہنچانے میں زیادہ مدت تک انتظار کرنے کی تکلیف اٹھانا نہیں پڑی۔ آپؐ کی زندگی میں ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تکمیل کرتے ہوئے اعلان فرما دیا۔ الیوم اکملت لکم دینکم (آج کے دن ہم نے تمہارے لئے تمہارے دین کی تکمیل کر دی)۔

دعوتی خطوط

آپ ﷺ نے ابتدا میں ہی شاہ ایران کسریٰ اور شاہِ روم ہرقل کے علاوہ اطراف کے دوسرے حکمرانوں کو دینِ اسلام کی دعوت پر مبنی خطوط ارسال فرمائے۔ جس کے نتیجے میں ڈیڑھ صدی کے اندر اندر مغرب میں اندلس اور مشرق میں ہندوستان، ترکستان، افغانستان اور شام تک دینِ اسلام کی مشعلِ ہدایت روشن ہو گئی۔ ادھر عرب اور چین کے درمیانی ملکوں میں ہر خطہ کے لوگ جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ تو ادھر مصر، تیونس، برقہ، الجزائر، اور مراکش پر دینِ اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔

آنحضرت ﷺ کے مولد عرب کے علاوہ یورپ اور افریقہ تینوں کے جغرافیائی حدود میں واقع کوئی خطہ ایسا نہ تھا جس میں بسنے والوں کے دلوں میں دینِ اسلام اتر نہ گیا ہو۔

سقوطِ اندلس

بلاشبہ مذکورہ تمام ممالک پر اسلامی پرچم اپنی آب و تاب کے ساتھ لہرا رہا تھا کہ اندلس، میں عیسائیوں کی سازشیں کامیاب ہوئیں۔ ان کے مظالم نے لاتعداد مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ کہیں تو اذیتیں اتنی پہنچائیں کہ وہ دم توڑ گئے اور کہیں کمزور دل ایمان والے مسلمان خوف و ہراس کا شکار اپنے لہلہاتے سر سبز و شاداب وطن کو چھوڑ کر افریقہ کے بے آب و گیاہ ملک میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے اور جو مسلمان ظالم عیسائیوں کا ظلم برداشت نہ کر سکے اور ہجرت سے بھی معذور تھے وہ عیسائیوں کا بپتسمہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ غرض سقوطِ اندلس سے مسلمانوں کو بے پناہ سیاسی خسارہ ہوا۔

فتوحاتِ عثمانی

سقوط اندلس کے المیہ سے جو مسلمانوں کو گھاٹا ہوا تھا فتوحات عثمانی نے اس کی تلافی کر دی۔ عثمانی افواج نے نہ صرف قسطنطنیہ پر تسلط جمالیا۔ بلکہ اس پورے علاقہ میں دین اسلام کی روشنی سے وہاں کی بستیوں کو روشن کر دیا۔ یہاں کے لوگوں کے دلوں میں اسلام کی تعلیم نے اتر کر ان کے اخلاق کو ایسا متاثر کیا کہ اس کا اثر بلقان تک خوشبو بن کر پھیلا' یہی خوشبو اور دین اسلام کی امن و سکون بخش روشنی روس اور بلون تک پہنچ گئی۔ ہسپانیہ کے وسیع خطہ پر دین اسلام کا پرچم لہرانے لگا۔ جس کا اس سے پہلے تصور کرنا بھی ناممکن تھا۔

قابلِ حیرت حقیقت

حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جب سے دین اسلام نے اپنی تعلیم کا سفر شروع کیا ہے۔ اگرچہ عیسائیوں نے اس کی راہ میں بڑے ظالمانہ بند باندھنے کی کوشش کی لیکن پھر بھی قابلِ حیرت حد تک دین اسلام آگے بڑھا اور سب مظالم پر غالب آیا۔

البتہ کچھ ممالک ایسے ضرور تھے جن میں رہنے والوں نے مسلمانوں پر دین اسلام کے دشمنوں نے بے حد و حساب ظلم و ستم کئے۔ لیکن ان کے مظالم و جبر نے ان مسلمانوں کو ہمت شکستہ پیشوں میں جتنا دھکیلنے کی کوشش کی' اللہ کے فضل و کرم سے ان کی ہمتیں اور توانا ہوئیں' ایمان اور یقین میں اور پختگی آئی۔

اسلام دشمنی اور مسیحیت

مسیحیت کی ہر ممکنہ تدبیر اور مدافعت کے باوجود جب دین اسلام کو ناقابل شکست قوت حاصل ہو گئی تو مسیحی پیروکار بوکھلا گئے اور اپنے دلوں میں مستقل اسلام دشمنی کا کینہ لئے ہوئے مصروف جنگ ہو گئے۔

بت شکنی اور شخصیت پرستی کا خاتمہ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی زندگی میں بت پرستی اور شخصیت پرستی دونوں کو فنا کر دیا۔ یہی طریق نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بعد میں آنے والے خلفائے راشدین نے بھی اختیار کیا اور ایران' افغانستان دونوں ملکوں پر اسلامی پرچم لہرایا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کا ایک حصہ سندھ' صوبہ گجرات اور مہاراشٹر بھی دین اسلام سے متعارف ہو گیا۔ حیرہ' یمن' شام اور مصر تو وہ ملک تھے جہاں عیسائیت صدیوں سے اپنا اثر و غلبہ حاصل کئے ہوئے تھی حتیٰ کہ وہ

قسطنطنیہ جو عیسائیت کی تقسیم کا سرچشمہ تھا۔ اس کے دل میں بھی دینِ اسلام پوری شان کے ساتھ آباد ہو گیا۔ جس کے بعد عیسائیت پر نزع کا عالم طاری ہو گیا۔

غور طلب بات

کیا مسیحیت کی قسمت میں بھی وہی زوال لازم ہو چکا تھا جو اسلام کے مقابلہ میں بت پرستی کا مقدر ہو گیا؟ بلاشبہ ایسا ہی ہوا۔ عیسائی مذہب آسمانی کتاب کا حامل ہونے کے باوجود اور ایسی آسمانی کتاب جس کی صداقت کی تصدیق خود خاتم النبین نے فرمائی اسی انجام سے دو چار ہونے والا تھا۔ جو عرب کے بت پرستوں کا مقدر ہو چکا ہے۔

کیا عرب جیسے بے آب و گیاہ ملک کے صحرا نشینوں کے مقدر کا ستارہ اتنا ہی سربلند ہونے والا تھا کہ وہ گلستانِ اندلس' بزنطینہ اور ان مسیحی ملکوں پر حکمران بن کر منصۂ شہود پر آئیں۔ جن سے لا تعلق ہونے کے مقابلہ میں عیسائی حکمران اور عیسائی عوام نے اپنی موت کو ترجیح دی۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس کشمکش کے نتیجہ میں دونوں فریقین کے درمیان صدیوں تک معرکۂ جنگ و جدال جاری رہا۔ یہ لڑائیاں توپ و تفنگ شمشیر و سناں کی شکل میں ہی نہیں تھیں بلکہ دونوں کے درمیان مناظروں کے معرکے قائم ہوئے۔ مسلمان اور عیسائی اپنے اپنے طرف داروں کو ان کے مذہب پہ قائم رہنے کی فکری اور علمی تقویت پہنچاتے ہوئے مخالف فریق کو اپنے دین میں شامل ہونے کی ترغیب دیتے۔

مسیح علیہ السّلام اور اسلام

دینِ اسلام نے حضرت مسیح علیہ السلام کی عظمت و عزت میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی۔ صاف اور واضح الفاظ میں اعلان فرما دیا۔ "کہ حضرت مسیح اللہ کا بندہ ہے" اس پر اللہ تعالیٰ نے کتاب (انجیل) نازل فرمائی۔ اسے منصبِ نبوت کا خلعت عطا فرمایا۔ ان کا وجود ہر مقام و محل میں باعثِ برکت ہے۔ "خالقِ جہاں نے اسے تا قیامت صلوٰۃ قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم فرمایا۔ یہ بھی کہہ دیا" کہ وہ اپنی والدہ کے لئے مجسمۂ خدمت و نیکی ہیں۔ وہ سخت گیر اور بدبخت نہیں۔ بلکہ اس پر اللہ تعالیٰ کی سلامتی ہو۔ یومِ پیدائش سے لے کر یومِ وفات تک! اور جس دن اس کو حشر میں دوبارہ زندگی بخشی جائے' جس کی گواہ سورہ مریم کی آیت نمبر30 قرآن حکیم میں موجود ہے۔ (م)

قال انی عبداللّٰہ اتانی الکتاب وجعلنی نبیا" وجعلنی مبارکا" این ماکنت و اوصانی بالصلوۃ والزکوۃ مادمت حیا" و برا" بوالدتی ولم

یجعلنی جبارا شقیا و السلام علی یوم ولدت و یوم اموت و یوم ابعث حیاً ذالک عیسیٰ ابن مریم قول الحق الذی فیہ یمترون۔

"عیسیٰ علیہ السلام نے جھولنے کی عمر میں فرمایا" میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے۔ اور نبی بنایا ہے اور میں جہاں ہوں جس حال میں ہوں مجھے صاحب برکت کیا ہے اور جب تک زندہ رہوں مجھے قیام صلوٰۃ اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور مجھے اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا بنایا ہے اور سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔ اور جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا مجھ پر سلام و رحمت ہے"۔ سچائی کے آئینہ میں یہ ہیں عیسیٰ ابن مریم اور تم اس (سچائی) پر شک کرتے ہو!

غور کیجئے کتنے تعجب کی بات ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کے اس اعلیٰ ترین مرتبہ کے اعلان کے باوجود مغربی اہل قلم اپنے آپ کو موجودہ دور کے روشن ترین علم کے مینار اور ترقی یافتہ ہونے کا دعویٰ کرنے والے نکتہ چینی کی اندھی روایت کے بخار میں کیوں مبتلا ہیں؟

ہمارے اس تعجب میں اس وقت تو اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ جب کوئی دانشور مسلمانوں کے دور اول کے اوراق پہ نظر ڈالتا ہے اور پڑھتا ہے کہ مسلمانوں نے فارس کے آتش پرستوں کے مقابلہ میں رومی عیسائیوں کی فتح پر کس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

اور یہ زمانہ بھی وہ تھا۔ جب نبی الخاتم محمد ﷺ مسیحی بادشاہ ہرقل کی افواج کے ہاتھوں ایران کا آتشکدہ ٹھنڈا ہوتے دیکھ رہے تھے۔ جب کہ جنوب کی طرف ایران نے اپنا اچھا خاصا رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ خصوصاً جب یمن سے حبشیوں کو نکال دینے کے بعد اس نے اپنے اقتدار کو اور زیادہ مضبوط کر لیا تھا۔

614 عیسوی میں اسی کسریٰ نے "شہر براز" کو سپہ سالا بنا کر شاہ روم کی گوشمالی کے لئے ایک بہت بڑا لشکر بھیجا جس نے رومیوں کو روند کر ان کے آباد شہروں کو ویران اور قلعوں کو کھنڈر بنا دیا۔

زیتون کے سر سبز و شاداب باغوں کو چٹیل میدانوں میں بدل دیا۔ اور انہیں بے سرو سامان بنا کر شام کی وادیوں میں قید کر دیا۔ جو اذرعات بصریٰ کے نام سے موسوم اور عرب کی سرحدوں سے ملی ہوئی ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب کہ مسلمان انتہائی تھوڑی تعداد میں تھے اور مکہ کے مشرکین کا تختہ ستم بنے ہوئے تھے۔ لیکن ان کی دلی ہم دردیاں اپنے ہمسایہ ایرانیوں کی بجائے روم

کے دور افتادہ عیسائیوں سے ان کے اہل کتاب ہونے کی وجہ سے تھیں۔
بالکل اسی طرح جس طرح کفار مکہ کو ایران سے اس لئے محبت تھی۔ کہ کفار کی طرح ایرانی بھی منکر وحی و کتاب تھے، اور ایرانیوں کو مسیحوں سے دشمنی اس لئے تھی کہ عیسائی حامل کتاب تھے۔
یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے رومی عیسائیوں کی شکست پر انتہائی افسوس کا اظہار کیا۔
اس عہد میں سب سے زیادہ طاقتور رومی حکومتیں تھیں۔ آتش پرست ایران (2) روم کے اہل کتاب جو عیسائی حکومت تھی عرب کا ایک حصہ جنوبی افریقہ کی طرف سے ایران سے ملتا تھا دوسرا حصہ (شمال مشرق) رومیوں کے پڑوس میں تھا اس پر بھی مسلمان کھلم کھلا ایرانیوں کے دشمن اور رومیوں کے دوست تھے۔ اور ایرانی عیسائیوں سے ان کے اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان کے دشمن تھے۔ چنانچہ کفار مکہ کو جب عیسائیوں کی شکست کا علم ہوا تو انہوں نے انتہائی خوشی کا اظہار کیا۔ جشن منائے گئے۔ شادیانے بجائے گئے یہاں تک کہ یہ فتح و شکست مسلمانوں اور قریش کے درمیان عملی کشمکش کا پیش خیمہ بن گئی۔

عیسائیوں کی حمایت میں مسلمانوں اور کفار کی باہم شرط

واقعہ یوں ہے کہ ایک دن کفار مکہ کے سردار ابی بن خلف کی زبان سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سامنے عیسائیوں کی شکست پر انتہائی خوشی کے جملے نکل گئے جن کے جواب میں ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔
عیسائیوں کی شکست پر اتنی خوشیاں نہ مناؤ مجھے یقین ہے کہ جلد ہی عیسائیوں کو ایرانیوں پر فتح حاصل ہو گی۔
ابی بن خلف یہ سن کر آگ بگولہ ہو گیا۔ اور انتہائی سخت لہجہ میں کہا۔ "تم جھوٹے ہو"۔
ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواباً فرمایا۔ اللہ کے دشمن تم جھوٹے ہو۔ اگر تجھے اپنی سچائی پہ اتنا بھروسہ ہے تو میں اس پر دس اونٹوں کی شرط لگاتا ہوں۔
اگر عیسائی ان آتش پرستوں پر سال ختم ہونے سے پہلے غالب نہ آئے تو میں یہ شرط ہار دوں گا۔ ورنہ تم مجھے دس اونٹ دے دینا۔
شرط کا یہ واقعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ آپ بے شک زیادہ اونٹوں کی بازی لگا سکتے ہیں مگر مدت میں تھوڑی

سی توسیع ہونی چاہیے۔

چنانچہ نتیجہ کے طور پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور ابی بن خلف میں سو سو اونٹوں کی شرط کے ساتھ مدت کو سال پورا ہونے تک بڑھا دیا گیا۔ اور ٹھیک ایک سال بعد ہی 625 میں روم کے بادشاہ ہرقل نے ایرانیوں پر حملہ کیا اور فتح حاصل کر لی۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ نے شرط جیت لی اور قرآنِ حکیم میں اس کا ذکر ان الفاظ میں موجود ہے۔

"روم میں فی الحال رومی عیسائی شکست کھا گئے۔ مگر وہ عنقریب ہی ایران پر غالب آ جائیں گے۔ اور اللہ عزوجل کے ہاتھوں ہر کام کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی۔ اور جس روز روم کو (مجوسیوں) پر دوبارہ غلبہ حاصل ہو گا اس روز مسلمان بھی ان کی فتح و کامرانی پہ خوشیاں منائیں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے نصرت ہے۔ وہ جس کی چاہے اس کی مدد کرے وہ سب پر غالب اور مہربان ہے۔ وہ اپنا وعدہ پورا کر کے رہتا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے۔"

اشتراکِ عقائد

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے دلوں میں ہرقل اور عیسائیوں کی فتح کا جذبہ اس قدر موجزن تھا۔ کہ جاں نثارانِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والوں کے درمیان بھائی چارہ قائم تھا۔ اگرچہ کبھی کبھی علمی جدل و بحث کی معرکہ آرائیاں بھی ہو جاتیں۔ اس کے برعکس یہودیوں کے دلوں میں پہلے ہی دن سے مسلمانوں کے خلاف منافقانہ جذبات تھے۔ جس نے بڑھتے بڑھتے عداوت اور دشمنی کی مستقل اور واضح شکل اختیار کر لی۔ اسی دشمنی کی وجہ سے یہودیوں کو کلی طور پر جلاوطنی کی سزا بھگتنا پڑی' قرآن حکیم نے اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین امنوا الیھود و الذین اشرکوا ولتجدن اقربھم مودۃ للذین آمنوا الذین قالوا انا نصاریٰ ذالک بان منھم قسیسین ورھباناً وانھم لا یستکبرون (82:5)

"(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم دیکھو گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ہیں اور دوستی کے لحاظ سے ایمان والوں کے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان میں عالم بھی ہیں اور مشائخ بھی ہیں اور وہ تکبر نہیں کرتے۔"

غور فرمایئے ان آیات کی روشنی میں مسلمانوں اور اہلِ کتاب عیسائیوں میں کتنی ہم

آہنگی پائی جاتی ہے۔ دونوں انسانی زندگی کی ابتدا ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

"اللہ نے آدم و حوا کو خلق فرمایا۔ بہشت کو ان کا مسکن بنا دیا۔ اور انہیں حکم دیا ایسا نہ ہو کہ تم شیطان کے بہکاوے میں آ جاؤ۔ اور اس درخت کا پھل چکھ لو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہیں بہشت سے نکال دیا جائے گا۔ شیطان تم دونوں کا دشمن ہے۔ اسی لئے تو اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا"۔ (بحوالہ قرآن حکیم)

اس معاملہ میں مسیحی صرف اس حد تک مختلف ہیں کہ شیطان نے آدم کے حضور سجدہ کرنے کے بجائے اللہ کے کلمہ کے تقدس سے انکار کر دیا۔ اس نے حوا کو بہکایا اور ان کے سامنے ایک پر فریب نقشہ قائم کیا۔

"در حقیقت آدم اور حوا دونوں شیطان کے فریب میں آ گئے اور دونوں نے اس ممنوعہ شجر کا پھل چکھا' اس لمحہ دونوں کے بدن سے خود لباس اتر گیا اور دونوں ننگے ہو گئے۔ وہ اپنی یہ حالت دیکھ کر سخت پریشان ہوئے اور اللہ تبارک و تعالیٰ سے معافی کے طلبگار ہوئے' اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا۔ مگر دونوں کو بہشت سے نکال کر زمین پر پھینک دیا' جہاں ان کی اولاد ایک دوسرے کی دشمن بن گئی"۔

ادھر فرزندانِ ابلیس ہمیشہ کے لئے اولاد آدم کی دشمنی میں ہمہ تن کامیاب ہو گئے۔ ان تمام انبیاء میں سے حضرت نوح علیہ السلام' جناب ابراہیم علیہ السلام' حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں جن پر انہیں کی زبان میں (احکامات کا مجموعہ) کتابیں نازل فرمائی گئیں۔ جو ان کی اپنی تصدیق کے علاوہ اپنے سے پہلے نازل شدہ آسمانی کتابوں کی صداقت کی تائید کرتی تھیں۔ طے ہوا کہ جس طرح شیطان کے مقابل فرشتے ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کرنے میں منہمک رہیں گے اسی طرح خود نسل آدم میں سے بھی شیطان کے پیرو کار ایک اللہ وحدہ' لا شریک کی عبادت کرنے والوں سے ہر طرح سے مصروف جنگ رہیں گے۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن کا ظہور ہو جائے گا۔

حضرت عیسیٰ اور مریم کا ذکرِ خیر

قرآن حکیم میں حضرت عیسیٰ اور مریم علیہما السلام کا ذکر جس بہترین انداز میں آیا ہے۔ اس سے دونوں کی عزت و تکریم ثابت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود حیران کن سوال یہ ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں مسلسل صدیوں سے تصادم کی وجہ کیا ہے؟

اختلاف کے اسباب

سب سے اہم سبب تو مسلمانوں اور عیسائیوں کے بنیادی عقیدہ میں واضح اختلاف

ہے۔ چنانچہ عہد رسالت علیہ الصلوٰۃ و السلام میں بھی اسی عقیدہ کی بحث وجہِ نزاع بنی رہی۔ البتہ یہ بحثیں آپس میں جان لیوا دشمنی یا بغض کی حد تک نہ پہنچیں۔

نصاریٰ نبی الخاتم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کو ہی تسلیم نہیں کرتے مگر مسلمان عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بندہ اور رسول مانتے ہیں۔

نصاریٰ تثلیث کو مانتے ہیں اور مسلمان توحید پر اس پختگی سے ایمان رکھتے ہیں کہ اس وحدہ' لاشریک کی عبودیت کے سوا کسی کی مداخلت کو گوارا نہیں کر سکتے۔

مسیحی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت' عبودیت کو صحیح ثابت کرتے ہوئے مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں۔

مسیح نے گہوارہ میں کلام کیا۔

مسیح کو جو معجزے دیئے گئے وہ کسی اور نبی کو نہیں دیئے گئے۔

حضرت عیسیٰ اللہ تعالیٰ کے رتبہ تک جا پہنچے۔

اس آخری دلیل کے اثبات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مسیحی علماء قرآن حکیم کی ہی یہ آیتیں پیش کرتے تھے۔

اذ قالت الملا ئکۃ یمریم ان اللہ یبشرک بکلمۃ منہ اسمہ المسیح عیسیٰ ابن مریم
وجیھًا فی الدنیا والآخرۃ ومن المقربین ○ ویکلم الناس فی المھد وکھلاً ومن الصالحین ○ قالت رب انی یکون لی ولد ولم یمسسنی بشر ○ قال کذالک اللہ یخلق مایشاء اذقضیٰ امرًا فانما یقول لہ کن فیکون ○ و رسولًاالی بنی اسرآئیل ○ انی قد جئتکم بآیہ من ربکم ○انی اخلق لکم من الطین کھئیۃ الطیر فانفخ فیہ فیکون طیراً باذن اللہ' وابرئ الاکمہ والابرص واحی الموتٰی باذن اللہ وانبئکم بماتاکلون وما تدخرون فی بیوتکم ان فی ذالک لآیۃ لکم ان کنتم مومنین ○(3:44 تا 48)

ترجمہ:

اور وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے جب فرشتوں نے مریم سے کہا کہ مریم اللہ تم کو اپنی طرف سے ایک فیض کی بشارت دیتا ہے۔ جس کا نام مسیح اور مشہور عیسیٰ ابن مریم ہو گا اور جو دنیا اور آخرت میں باوقار اور اللہ تعالیٰ کے خاصوں میں سے ہو گا۔

اور ماں کی گود میں اور عمر میں بڑا ہو کر دونوں حالتوں میں لوگوں سے یکساں گفتگو

کرے گا۔ اور نیکو کاروں میں ہو گا۔ مریم نے کہا۔ میرے پروردگار میرے ہاں بچہ کیوں کر ہو گا کہ کسی انسان نے مجھے ہاتھ تک تو لگایا نہیں۔ فرمایا اللہ تعالیٰ اسی طرح جو چاہتا ہے۔ پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو فرما دیتا ہے ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

اور وہ انہیں لکھنا پڑھنا اور دانائی اور تورات اور انجیل سکھائے گا۔ اور عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف رسول بن کر جائیں گے۔ اور کہیں گے کہ میں تمہارے پاس پروردگار کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ تمہارے سامنے مٹی کی مورت بشکل پرندہ بناتا ہوں۔ پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے سچ مچ جاندار ہو جاتا ہے۔ اندھے اور ابرص کو درست کرتا ہوں۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم سے مردوں میں جان ڈال دیتا ہوں اور جو کچھ تم کھا کر آتے ہو۔ اور جو اپنے گھروں میں جمع رکھتے ہو۔ سب تم کو بتا دیتا ہوں۔ اگر تم صاحبِ ایمان ہو تو ان باتوں میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں موجود ہیں۔

چنانچہ مسیحی قرآن مجید کی انہیں آیتوں کے حوالے دے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معبود ہونا ثابت کرتے تھے۔

وہ کہتے "حضرت مسیح مردوں کو زندہ کرتے تھے۔ مادر زاد اندھوں کو بینائی اور برص زدہ اشخاص کو شفائے کامل عطا کرتے۔ مٹی سے پرندوں کی مورتیاں بنا کر ان میں پھونک لگاتے جس سے وہ سچ مچ کا مردہ بن جاتا۔ مسیح غیب کی جو جو باتیں فرماتے وہ صحیح ثابت ہوتیں۔

لہٰذا یہ صفات اللہ ہی کی ہو سکتی ہے۔ یوں کہیے کہ عہد رسالت کا ہر عیسائی اسی انداز سے سوچتا اور مسلمانوں سے مناظرہ کرتے وقت انہیں دلائل کا سہارا لیتا ہے۔

تثلیث میں مقام مریم علیہا السلام

اس دور کے بعض نصاریٰ نے مریم علیہا السلام کو اس بنا پر اللہ تعالیٰ کی حکمرانی میں شامل ہونے کا مجاز قرار دے لیا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو کلمہ سے نوازا مگر یہ عقیدہ صرف اس دور کے عیسائیوں کا تھا۔ جب کہ عرب میں عیسائی کئی فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جو جزیرۃ العرب میں ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ یہ سب باہم اختلافات کے باوجود جب مسلمانوں سے نفرت کرتے تو سب ایک ہو جاتے۔ یہ مسیح کو اللہ اور اللہ کا بیٹا اور تیسرا اقنوم قرار دیتے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ ماننے والوں کے دلائل ہم اوپر نقل کر چکے ہیں۔ جن کی تفصیل اس طرح ہے۔

"مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے' انہوں نے گھوارے ہی میں سمجھ بوجھ کی باتیں کیں' اور یہ بھی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے جو تعارفی بیان کا انداز اختیار فرمایا۔ وہ یہ ہے"

میں نے کہا۔ میں نے پیدا کیا ہے اور میں نے فیصلہ کیا۔ چنانچہ نبی اکرم ﷺ ان کی یہ بے معنی باتیں سنتے اور انتہائی احسن طریقہ سے ان کو جواب دیتے۔ ان میں سختی کا وہ انداز شامل نہ ہوتا جو نبی اکرم ﷺ مشرکوں سے بات کرتے وقت اختیار فرماتے تھے۔

یعنی آپ وہی کچھ ارشاد فرماتے جو کتب سابقہ میں آپ ﷺ کی صداقت میں موجود ہوتا۔ یا وحی اور منطق سے انہیں قائل کرنے کی کوشش فرماتے۔ مثلاً قرآن مجید میں ہے۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ہو المسیح ابن مریم قل فمن یملک من اللہ شیئا ان اراد ان یھلک المسیح وامہ ومن فی الارض جمیعا واللہ ملک السموات والارض وما بینھما یخلق مایشاء واللہ علی کل شی قدیر ○

وقالت الیھود والنصاری نحن ابناء اللہ واحباؤہ قل فلم یعذبکم بذلوبکم بل انتم بشر ممن خلق یغفر لمن یشاء ویعذب من یشاء (5 تا 17 تا 18)

ترجمہ :۔ جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ عیسیٰ ابن مریم اللہ ہیں بے شک وہ کافر ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اگر عیسیٰ ابن مریم کو اور ان کی والدہ کو اور جتنے لوگ زمین میں ہیں سب کو (اللہ) ہلاک کرنا چاہے تو اس کے آگے کس کی مجال ہے۔ جو دم مار سکے۔ یاد رکھو آسمان اور زمین جو کچھ ان دونوں میں ہے' سب پر اللہ تعالیٰ ہی کی بادشاہی ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اور ایک جگہ یوں بھی ارشاد فرمایا۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ہو المسیح ابن مریم وقال المسیح یبنی اسرائیل اعبدوا اللہ ربی و ربکم انہ من یشرک باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ وما وہ النار وما للظالمین من انصار۔

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثۃ وما من الہ الا الہ واحد و ان لم ینتھوا عمایقولون لیمسن الذین کفر وامنھم عذاب الیم۔ (5:72 تا 73)

ترجمہ :۔ اور وہ لوگ بے شک کافر ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ مریم کے بیٹے مسیح خدا ہیں۔ حالانکہ مسیح یہود سے یہ کہا کرتے تھے۔ کہ اے بنی اسرائیل اللہ ہی کی عبادت کیا کرو۔ جو ہمارا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی۔ (اور جان رکھو کہ) جو شخص اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی

کو شریک ٹھہرائے گا اللہ تعالیٰ اس پر جنت حرام کر دے گا۔ اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

اور وہ لوگ بھی کافر ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ اللہ تین میں کا تیسرا ہے حالانکہ اس معبود واحد کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اگر یہ لوگ ایسے قول و عقائد سے باز نہیں آئیں گے تو ان میں سے جو کافر ہوئے وہ سخت تکلیف دینے والا عذاب پائیں گے۔

اور ایک جگہ قیامت کے روز کی کارروائی کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ یوں فرماتے ہیں۔

واذ قال اللہ یا عیسیٰ ابن مریم ءانت قلت للناس اتخذونی و امی الھین من دون اللہ قال سبحانک ما یکون لی ان اقول مالیس لی

بحق ان کنت قلتہ فقد علمتہ تعلم ما فی نفسی ولا اعلم ما فی نفسک انک انت علام الغیوب ماقلت لھم الا ما امرتنی بہ ان اعبدواللہ ربی ربکم و کنت علیھم شھیداً مادمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت الرقیب علیھم وانت علی کل شی شھید ○

ان تعذبھم فانھم عبادک و ان تغفرلھم فانک انت العزیز الحکیم(5:۔ 116 تا 118)

"اور اس وقت کو بھی یاد رکھو جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اے عیسیٰ بن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود مقرر کر لو۔ وہ کہے گا تو پاک ہے مجھے کب یہ سزاوار تھا۔ کہ میں ایسی بات کہتا جس کا مجھے کوئی حق نہیں۔ اگر میں نے ایسا کہا ہو گا تو تجھ کو معلوم ہو گا (کیونکہ) جو بات میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے اور جو تیرے ضمیر میں ہے اسے میں نہیں جانتا بے شک تو علام الغیوب ہے۔

میں نے ان سے کچھ نہیں کہا سوائے اس کے جس کا تو نے مجھے حکم دیا۔ وہ یہ کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے اور میں جب تک ان میں رہا ان کے حالات کی خبر رکھتا رہا جب تو نے مجھے دنیا سے اٹھا لیا تو تو ان کا نگران رہا۔ تو ہر چیز سے خبردار ہے۔ اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے۔ تو تیری مہربانی ہے۔ بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے"۔

لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ مسیحیوں نے الوہیت کے معاملہ میں تثلیث کے عقیدہ کو اختیار کر رکھا ہے۔ اسی نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کے بیٹے کا رتبہ دے رکھا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے خود اپنا تعارف کراتے ہوئے عیسائیوں کے اس مفروضہ کی سخت تردید کر دی۔

ارشاد ہے۔

قل ھو اللہ احد ○ اللہ الصمد ○ لم یلد ○ ولم یولد ○ ولم یکن لہ کفوا احد ○

(112: 1 تا 4)

اعلان عام کر دو کہ اللہ تعالیٰ اکیلا ہے۔ بے نیاز ہے۔ نہ اسے کسی نے جنا ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔ اور نہ ہی کوئی اس کا ہم پلہ ہے (ہم صفت ہے)

دوسری جگہ وضاحت فرمائی۔

ماکان للہ ان یتخذ ولد اسبحانہ (19: 35)

"اللہ تعالیٰ کا صاحب اولاد ہونا اس کی شان و عظمت کے خلاف ہے۔ وہ اس محتاجی سے بلند تر ہے"۔ ایک اور دلیل کے ساتھ اپنی خود مختاری کا ثبوت دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ان مثل عیسٰی عند اللہ کمثل ادم خلقہ من تراب ثم قال لہ کن فیکون (6: 13۔ 59)

عیسٰی علیہ السلام کا حال اللہ کے نزدیک آدم جیسا ہے۔ کہ اس نے پہلے مٹی سے اس کا قالب بنایا پھر فرمایا (انسان) ہو جا تو وہ انسان ہو گیا۔

ظاہر ہے اسلام عیسائیت کے بالکل برعکس توحید کا علم بردار ہے۔ اس کا یہ عقیدہ ہمہ پہلو پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں ہمہ پہلو صفائی اور وضاحت بھی موجود ہے۔ جو اتنا صاف اور ستھرا ہے کہ اس پر ادنیٰ پرچھائیں بھی گوارا نہیں۔ اسلام اس میں ذرہ بھر شرک کے شائبہ کو بھی کفر قرار دیتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ پوری شدت کے ساتھ صاف اور واضح اعلان فرماتے ہیں کہ۔

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ یغفر ما دون ذالک لمن یشآ (4: 48)

اللہ تعالیٰ کسی کا یہ جرم کبھی بھی نہیں بخشے گا جو اس کے ساتھ کسی دوسری ہستی کو شریک ٹھہرائے، ہاں اس کے سوا جتنے بھی گناہ ہوں وہ چاہے تو جسے چاہے بخش دے۔

ہو سکتا ہے کہ عیسائیت کا بت پرستی سے صدیوں سے تاریخی طور پر ربط و تعلق ہو لیکن محمد ﷺ کی نگاہ میں مشرکانہ مسلک کی معمولی تنکے کے برابر بھی وقعت نہیں۔ آپؐ کا اپنا عقیدہ بھی یہی تھا اور اسی عقیدہ کی پوری شد ومد سے اپنی امت کو دعوت دی اور اس پر سختی سے قائم رہنے کا حکم فرمایا۔ اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ اور لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد ہے۔ عہدِ نبوی میں نصاریٰ کے اس بنیادی اختلاف تثلیث اور مسلمانوں کے عقیدۂ توحید کے تضاد کی بنیاد پر فریقین میں مناظرے بھی ہوئے مگر ایسے مواقع پر رسول رحمتہ للعلمین ﷺ ہمیشہ جادلھم بالتی ھی احسن (16: 126) کے اصول کے تحت گفتگو فرماتے۔ اور وحیِ الٰہی اس معاملہ میں آپ کی تائید و

معاونت فرماتی۔

قصۂ صلیب

دوسرا مسئلہ عہدِ نبوی میں حضرت مسیح کا صلیب زدہ نہ ہونا ہے۔ جس پر بڑی بحثیں ہوئیں۔ نصاریٰ کا دعویٰ تھا کہ حضرت عیسیٰ نے تمام عالم کی نجات کے لئے اپنے گلے میں پھانسی کی رسی پہن کر خود کو قربان کر دیا مگر مسلمان اس قصہ کو تسلیم نہیں کرتے۔ اس کے بارہ میں ان کا واضح اعتقاد یہ ہے۔

(1) نہ تو یہودیوں نے انہیں قتل کیا۔

(2) اور نہ وہ انہیں دار پر چڑھا سکے۔

ارشادِ ربانی ہے۔

وقولهم انا قتلنا المسيح عيسى ابن مريم رسول الله وما قتلوه وما صلبوه ولكن شبه لهم وان الذين اختلوافيه لفي شك منه مالهم به من علم الا اتباع الظن و ماقتلوه يقينابل رفعه الله اليه وكان الله عزيزً احكيماً (157:14 تا 157)

"اور یہ کہنے کے سبب کہ ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ مسیح کو جو اللہ کے رسول (کہلاتے تھے) قتل کر دیا ہے اللہ نے ان کو ملعون کر دیا اور انہوں نے عیسیٰ کو قتل نہیں کیا اور نہ انہیں سولی پر چڑھایا۔ بلکہ ان کو ان کی سی صورت معلوم ہوئی اور جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں۔ وہ ان کے حال سے شک میں پڑے ہوتے ہیں۔ اور ظن کی پیروی کے سوا ان کو مطلق علم نہیں ہے۔ انہوں نے عیسیٰ کو یقیناً قتل نہیں کیا۔ بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے"۔

اب قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام کو مصلوب مان لیا جائے تو بھی آپ کا بنی آدم کے کے گناہ گاروں کی طرف سے کفارے کا عقیدہ چاہے کتنا خوش نما ہو۔ جس کو شاعری میں اچھوتے اسلوب کے بیان کی صورت خراج تحسین تو پیش کیا جا سکتا ہے۔ یا اخلاقیات اور نفسیات کے نقطۂ نگاہ سے اسے زیبِ داستاں قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس عقیدہ کو اسلام کے اس قطعی اصول سے کوئی تطبیق نہیں دی جا سکتی جس میں صاف کہہ دیا گیا ہے کہ۔

ولا تزر وازرة وزر اخرىٰ (18:35)

کوئی شخص کسی اور کا بارِ گناہ خود پر نہیں اٹھا سکے گا۔

بلکہ یہ فیصلہ بالکل واضح الفاظ میں سنا دیا گیا ہے۔ کہ قیامت کے دن ہر مرد ہر عورت اور ہر فرد بشر اپنی ہی نیکی کی جزا سے مستفیض ہو گا یا اپنی بدی کے بدلے میں سخت ترین سزا پائے گا۔ حتیٰ کہ

لا یجزی والد عن ولدہ ولا مولود ھو جاز عن والدہ شیئا (33:31)

عیسائی اور مسلمان

اب سوال یہ ہے کہ کیا کسی عیسائی نے آج تک مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان فکری ہم آہنگی بیدار کرنے کی کوئی تدبیر سوچی ہے ؟ کیا بحیثیتِ اجتماعی مسلمانوں کے عقیدہ توحید اور مسیح علیہ السلام کی تعلیمات کے درمیان مصالحانہ روابط پیدا کرنے کی کوئی راہ تلاش کرنے کی کوشش ہے؟ ہر گز نہیں البتہ جزوی طور پر کچھ مسیح کے ماننے والوں نے دعوتِ اسلام پر لبیک یقیناً کہا۔

اب ذرا رومی عیسائیوں کے رویہ پہ غور کیجئے۔ مسلمانوں نے جن رومیوں کی فتح و نصرت کی تمنائیں کیں جن کی کامیابیوں پر خوشیاں منائیں۔ وہ مسلمانوں کے ہی خلاف صف آرا ہو گئے انہوں نے دینِ اسلام کی تعلیم پر سیاسی نقطۂ نگاہ سے غور کیا اور سمجھا کہ اگر دینِ اسلام غالب آ گیا تو ان کا اپنا اقتدار ختم ہو جائے گا اور ان کی وسیع و عریض حکومت کو زمین بوس ہونا پڑے گا۔

اس غیر حقیقت پسندانہ سوچ کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا جال پھیلانا شروع کر دیا۔ بالآخر ایک لاکھ' دوسری روایت کے مطابق دو لاکھ کا لشکرِ جرار مسلمانوں کے خلاف لا کھڑا کر دیا۔ یہ معرکہ غزوۂ تبوک کے نام سے مشہور ہے۔ اس معرکہ کی قیادت خود نبی اکرم ﷺ نے فرمائی جس کا مقصد صرف عیسائیوں کے ظالمانہ رویوں کا دفاع کرنا تھا۔ مسلمانوں کے خلاف طویل مدت تک درپردہ تیاریوں کی وجہ سے آئے دن لڑائیاں ہونا شروع ہوئیں۔ پھر ایک دن وہ بھی آیا۔ جب مسیحیوں سے مسلمانوں نے اندلس چھین لیا اور مشرق و مغرب میں اسلام کی فتوحات کا دائرہ ہندوستان اور چین کی حدود تک وسیع ہو گیا اور مشرق و مغرب دونوں کے اطراف پر مشتمل لوگ زیادہ تعداد میں مسلمان ہو گئے اور اسلام قبول کرنے والے ممالک میں عربی زبان بھی مقبول و محبوب ہو گئی۔

صلیبی جنگوں کا آغاز

تاریخ نے پھر نیا رخ پلٹا۔ عیسائیوں کے دلوں میں اندلس واپس لینے کے بعد غرور پیدا

ہو گیا۔ جس کے بعد انہوں نے بڑے منظم طریقے سے جنگیں لڑنا شروع کر دیں۔ ان لڑائیوں کے لئے مسیحی مناروں نے صلیب کے پرستاروں کو ابھارنے کے لئے مسلمانوں کے دین پر کھلم کھلا طعن و کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ حد یہ ہے کہ انہوں نے نبی کل عالم علیہ الصلوٰۃ و السلام کی شان میں انتہائی گھٹیا قسم کے جھوٹ اور الزامات سے اپنی زبانوں کو آلودہ کرنا مسیحیت کا فریضہ سمجھ لیا' افسوس اس بات کا ہے کہ یہ لوگ حضرت محمد ﷺ کے فرمودات اور قرآن پاک میں نازل شدہ ان آیات کو بالکل نظرانداز کر گئے جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اعلیٰ منزلت کے تذکرے ہیں۔ یہاں تک کہ ان کے رفعِ الی السماء آسمان پر زندہ پہنچا دینے تک کی رفعت کا ذکر بھی منقول ہے۔

مسیحی مصنّفین کی نگاہ میں محمد ﷺ کا مقام

مسیحی تصنیف کتاب موسوم "فرینگ لاورس فرانسہ" میں آنحضرت ﷺ کی ذاتِ اقدس کے متعلق عیسائی مصنّفین کی زہر افشانی کے چند نمونے نقل کیے جاتے ہیں۔ یہ کتابیں نویں صدی (عیسوی) کے نصف اول میں لکھی گئی ہیں۔

(1) (نقلِ کفر کفر باشد) (م) ان.... خوبیوں کے باوجود حضرت محمد ﷺ جادوگر لٹیرا' ریاکار اور تھا۔ جو ان طریقوں سے پوپ کا مقام حاصل کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی تو اپنے ساتھیوں کے تعاون سے اس نے ایک جدید دین کی طرح ڈال دی جس میں اس نے خیالی داستانیں بھر دیں۔ چنانچہ یورپ میں محمد ﷺ پر جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں یہ سب کہانیاں موجود ہیں۔

(2) سرورِ کائنات ﷺ کے بارہ میں جو واقعات یورپ میں 183 میں "آینو" اور "فرانیسک مثل" نے اپنی اپنی تصنیفات میں درج کیے ہیں۔ وہ بھی اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ قرونِ وسطیٰ کے مسیحی اہل قلم نے نبی محترم علیہ الصلوٰۃ و السلام پر انتہائی نازیبا انداز میں نکتہ چینی کی ہے۔

(3) سترھویں صدی میں bell مسیحی نے قرآن مجید میں موجود تاریخی واقعات کی تخریج کرتے ہوئے محمد ﷺ کے خلاف اس کے دل میں بھرے ہوئے زہر کو بری طرح اگل دیا ہے۔ تاہم وہ اس حقیقت کا اعتراف کیے بغیر بھی نہ رہ سکا کہ رسول امن و سلام علیہ الصلوٰۃ و السلام نے اخلاقی اور اجتماعی نظام کو وہ خوبیاں بخشی ہیں کہ اگر اس نظام میں "قصاص" اور تعددِ ازدواج نہ ہوتا تو مسیحی نظامِ اجتماعیت اور اسلامی نظامِ اجتماعیت میں کوئی فرق نہ تھا۔

(4) امیل در منگم (فرانسیسی) ان مصنفین میں سے ہے۔ جس نے رسول اللہ ﷺ سے متعلق لکھتے ہوئے کسی حد تک انصاف کا دامن نہیں چھوڑا۔ در منگم نے بے انصاف مسیحی مصنفوں کی چند عبارتیں بطور تمہید بیان کرنے کے بعد لکھا ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی دونوں فرقوں میں اختلاف و بدگمانی کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس کے بعد یہ آگ دن بدن اور تیز ہو گئی۔ جسے اہل مغرب نے اپنے دامن سے ہوا دے کر اسے اور زیادہ بھڑکا دیا۔ حتیٰ کہ

(1) مغربی مصنفین تحقیق کئے بغیر اسلام پر الزام تراشی میں حد سے بڑھ گئے۔

(2) ان مصنفین کے ساتھ شعرا نے بھی اندلس کے مسلمانوں پر انتہائی غیر منصفانہ انداز میں کیچڑ اچھالا۔ ان شاعروں نے حضرت محمد ﷺ کو لٹیرا' رہزنوں کا سردار' ریاکار' عیاش' ہوس ناک اور جادوگر کہنے میں بھی دریغ نہ کیا۔

(3) بعض مغربی اہلِ قلم نے صادق و مصدق محمد ﷺ کی تشبیہ رومی راہب کے ساتھ دی جو پوپ کا مقام حاصل کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کے بعد اللہ کی مخلوق پر بپھر گیا ہو۔

(4) ایک اور مخبوط الحواس مصنف نے حضرت محمد ﷺ پر ایسا خدا بن بیٹھنے کا افترا باندھا جس خدا کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے اس کے پیرو انسانوں کی قربانی پیش کرتے۔

(5) چیرو نوچن نو جوان نبستا" زیادہ سنجیدہ ہے۔ لکھتا ہے حضرت محمد ﷺ نے شراب کی مستی میں جان دی اور اس کی لاش ملی کے ڈھیر پہ ملی۔

(6) ایک انطاکی شاعر نے ان لوگوں کی شہادت کی روشنی میں ھجو لکھی ہے۔ اور آپ کی ایسی مورتی دیکھی جو سونے اور چاندی سے بنی ہوئی اور ہاتھی کی عماری میں جلوہ افروز ہے۔

(7) "اولان" "Auolan" نے اپنی نظم میں جو واقعہ بیان کیا ہے۔ اس میں ہسپانوی عیسائی فوجیوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے اصنام توڑے جا رہے ہیں۔ جو تین خداؤں پر مشتمل ہیں۔ (1) ترخاجان (2) محمد (3) ایولون!

کتاب قصہ محمد کا مصنف لکھتا ہے کہ اسلام میں ایک عورت کے لئے متعدد شوہر جائز ہیں۔ غرض ان کینہ پرور' ہذیان گو مسیحی مصنفین کے ایسے ہزلیات مسلسل نشو و نما پاتے رہے ہیں۔ خصوصاً ان اہلِ قلم کے دور "(1) زولف ولوھیم" (2) نیکو (اولیس (3) و تیقس (4) مراتشی (5) ہونگر (6) یلیانذر (7) بریدو وغیرہ جو بیک زبان و حال اور اسلام کو مجموعہ الحاد و اعمال شیطانی کا نتیجہ' مسلمانوں کو وحشی اور ان کی کتاب قرآن کو مبتذل لکھتے ہیں۔

ان مصنفین کی بکواس اور بھی حیرت انگیز ہے جب وہ اسلام سے متعلق اس قسم کی ہزلیات لکھنے کے بعد معذرت کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔

(8) "الیبن برونز ایل" جس نے قرآن کے لاطینی ترجمہ کی صورت میں اسلام کو مسخ کرنے کی سب سے پہلی کوشش کی۔

(9) پھر چودھویں صدی میں "ہرباسکل" نے اسلام کی ابتدا پر قلم اٹھایا۔

(10) نوسان ہشتم نے اپنی تصنیف میں محمد ﷺ کو مسیح کا دشمن ثابت کرنے کی کوشش کی۔

(11) درمیانی صدیوں میں اکثر مسیحی مصنفوں نے حضرت محمد ﷺ کو لامذہب ثابت کرنے کی کوشش کی۔

(12) بارھویں' چودھویں' اور سولھویں صدی عیسوی میں 'ایمون لیون' گیوم باسکل نے (علی الترتیب) اسلام کو مختلف افکار اور عقائد کے تضاد کا مجموعہ ثابت کر دکھایا۔

(13) البتہ مندرجہ ذیل علمائے مغرب نے اپنی تصانیف میں کہیں کہیں اسلام کے بارے میں اظہار کرتے ہوئے انصاف سے کام لیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں (1) بو لفستلیمیہ (2) شول (3) کوسان ہرشنال (4) الاذری (5) سپرنگر (6) بار قلمی ساتلر (7) دکاستری (8) کارلائل وغیرہ۔ لیکن رسول اللہ ﷺ سے بغض و عناد کا یہ لاوا 1876 میں پھر پھوٹ نکلا ذاتی نے اسی سال انصاف کا دامن یہاں تک چھوڑ دیا کہ آپ کو منافق ناپاک عرب لکھ کر بھی شاید اس کا کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ جس طرح اس سے پہلے "فوسربر" 1822 میں اپنی بکواس سے دل کے پھپھولے پھوڑے تھے اور یہ سلسلہ دیر تک تا بہ حیات "رودلف ولوھیم" جاری رہا۔

ان مغربی مصنفوں کی دشمنی انہیں کہاں تک لے پہنچی۔ کینہ پن کہاں تک لے گیا کہ سینکڑوں برس سے مسلسل اولاد آدم میں ایک دوسرے سے دشمنی اور کینے کی آگ بھڑکا رکھنے میں دن رات مصروف ہیں۔ جب کہ وہ اپنے زعم کے مطابق اس دور کو علم و تحقیق اور آزادی فکر کا دور قرار دیتے ہیں۔ جیسا کہ درمنگم نے بھی ان مصنفین کی برائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کو ملامت کی ہے۔

البتہ (الف) ان مغربی مصنفوں میں بعض دانشور رسول اللہ ﷺ کے متعلق اتنا اعتراف کرتے ہیں کہ آپ ﷺ کو خود پر نازل ہونے والی کتاب اور رسالت پر بھیجے جانے کا دل سے یقین تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں وحی کے ذریعہ جن احکام کو دوسروں تک پہنچانے کا حکم دیا تھا انہیں اس پر بھی پورا الیقین تھا۔

(ب) بعض مصنفین نے آنحضرت ﷺ کی مافوق الفطرت روحانیت کے ساتھ آپ کے حسن کردار، اخلاقِ حسنہ اور بلند مرتبہ میں آپ کے ہمہ صفت نمونہ خلق عظیم ہونے کا بھی اعتراف کیا ہے۔

(ج) بعض علماء نے آپ کو اخلاق حمیدہ کا دلکش مجسمہ ہونے کی وجہ سے بھی سراہا ہے۔ اس پر بھی سرزمین اسلام اور بانی اسلام کے ساتھ دلی دشمنی کی بیماری میں مبتلا ہیں۔ مغربی جاہل علماء نے اسلامی ممالک میں مسیحیت کی نیابت کو صحیح ثابت کر کے اسلام پر ناروا بہتان تراشی کر کے مسلمانوں کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی بہت کوشش کی، اور کر رہے ہیں۔

مسیحیوں کی اسلام دشمنی کے اسباب

مسیحیوں کی اسلام دشمنی کی وجہ تلاش کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ یہ جاننا ضروری ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے خلاف مسلسل تبلیغی اور فوجی جنگیں کیوں جاری رکھی ہیں۔

اول۔ اس کی سب سے بڑی وجہ عیسائیوں کی جہالت ہے، انہیں رحمت دو عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ ظاہر ہے اپنے فکری مخالف کی سوانح یا دوسرے کے حالات سے ناواقفیت تعصب اور دشمنی کا اصل مہیج ہو سکتا ہے۔ یہ جہالت صدیوں تک رہنے کی وجہ سے مغربی مفکروں کے رگ و ریشہ میں سما گئی اور ان کے ذہن میں اسلام دشمنی کے مختلف بت اور مورتیں بن کر ابھرتی رہی جن کی روک تھام مسلمانوں کے لئے اشد ضروری ہے۔

دوم۔ ہماری رائے میں اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے علاوہ ایک اور سبب بھی ہے جس نے مغرب کو اسلام اور اس کے خلاف اکسایا۔ ہمارا ذہن اس سلسلہ میں سیاسی لڑائیوں کی طرف منتقل نہیں ہوتا کیوں کہ ہم اس کو نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اصل سبب نہیں سمجھتے۔

غور کریں تو بات واضح یوں ہوتی ہے کہ مغرب کا مزاج عیسائیت کی بنیادی تعلیم سے تو ایک طرف جزوی طور پر بھی ہم آہنگ نہیں۔

ان کی مذہبی تعلیم یہ ہے کہ زہد اختیار کرو۔ دنیا سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ یہی نہیں بلکہ اس تعلیم میں اونچے روحانی لطائف موجود ہیں لیکن مغرب اس تعلیم کو اپنا نہیں سکتا۔ اسے اس تعلیم سے عملاً مکمل اختلاف ہے۔ یہ مذہب جو ہزاروں برس سے بت پرست چلا آ رہا

تھا۔ اس کے ملک کے طبعی اور جغرافیائی حالات گواہ ہیں کہ بلا کی سردی اور اقتصادی بدحالی کا تقاضا تھا کہ وہ اس کے خلاف جنگ کرتے۔ معلوم ہوا کہ لڑائی ان کی طبعی جغرافیائی مجبوری تھی۔ پھر جب اس کو عفوو درگزر کرنے کی تعلیم پر مبنی مذہب کو مجبوراً اختیار کرنا ہی پڑا تو اس نے ان تعلیمات کو بھی جنگ وجدل میں ڈھال لیا اور روحانی تربیت کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ روحانی تربیت جسے ہم جسم اور روح کے درمیان توازن قائم رکھنے والی زنجیر قرار دیتے سکتے ہیں اس کو چورہ چورہ کر دیا اور اسے پھر سے قائم کرنا اسلام کے مقدر میں تھا۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کی وجہ سے اسلام اور مسیحیت کے درمیان تعصب اور دشمنی جڑ پکڑ گئی۔ عیسائیوں نے (مغرب کے دانشوروں نے) اسلام کے خلاف دشمنی کا جو موقف اختیار کیا وہ شاہ حبشہ کے اس موقف کے بالکل الٹ ہے جو اس نے مہاجر مسلمانوں کے معاملہ میں اختیار کیا' حالانکہ وہ بھی عیسائی تھا۔

مشاہدہ کہتا ہے کہ اہل مغرب دین داری اور الحاد میں اس قدر غلو کے عادی ہو گئے ہیں کہ اعتدال اور بھول چوک میں امتیاز ہی اٹھ گیا۔ بلاشبہ مغرب میں ایسے دین دار زاہد اور عابد اشخاص بھی موجود ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریوں کی صحیح صحیح پیروی کرتے ہیں لیکن گنتی میں نہ ہونے کے مترادف' ان کو چھوڑ کر مغرب کے تمام لوگ ایسے جنگی حملوں کی فکر میں رہتے ہیں جو بظاہر ہر مذہب کے نام سے کئے جاتے ہیں لیکن ان کی تہ میں سیاست کار فرما ہوتی ہے۔ میدان جنگ کے ذوقِ تماشا اور اقتدار کی ہوس نے انہیں اس قدر دیوانہ بنا دیا ہے کہ غیر مسیحی حریف تو ایک طرف انہوں نے آپس میں بھی ایک دوسرے کے فرقہ کے ساتھ خونی جنگیں کرنے سے دریغ نہیں کیا۔

عیسائیوں کی جنگوں میں دونوں طرف سپہ سالاری کا مقدس فریضہ ہر فریق پوپ ''اسقف'' بجا لاتا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ جو فریق آج غالب آیا۔ وہ کل دوسروں کے ہاتھوں شکست خوردہ ہو گیا۔

ان جنگوں کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی میں جب دنیاوی حکوت غالب آ گئی تو اس نے علم کے نام سے دنیاوی زندگی کو ختم کر دیا۔ اس نے سمجھا کہ وہ علم و عرفان کی روشنی میں اس روحانی پیاس کو بھی بجھا سکے گی۔ اسے بجھانا صرف مذہبی اقتدار ہی کے ذریعہ ممکن ہے لیکن آج ایک طویل جنگ وجدل کے بعد مغرب کو یہ احساس ہونا شروع ہو گیا ہے کہ علم کے دعوے روح کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکے۔ آج مغرب کے ہر گوشہ سے یہی پکار سنائی دے رہی ہے کہ اس نے روحانیت سے منہ موڑ کر بدترین غلطی کا ارتکاب کیا ہے اور یہی وہ غلطی تھی جس کی وجہ سے اہلِ مغرب آپ ہی عیسائی مذہب

سے گھبرا اٹھے اور انہیں یقین ہو گیا کہ مسیح کی تعلیم میں دل کے سکون کا فقدان ہے انہوں نے کھلم کھلا صلیب کو گلے سے اتار کر پھینکنا شروع کر دیا اور دنیا کے مروجہ تمام ادیان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا لیکن کسی مذہب میں انہیں اپنی بے چینیوں اور اضطراب کا علاج نہ مل سکا۔

آخر مغرب نے "تھیا سونیکل سوسائٹی" کی طرف رُخ پھیر لیا اور اسی میں اپنے دل کا پورا سکون تصور کرتے ہوئے یورپ اور امریکہ کے عیسائی غول کے غول اس میں داخل ہو گئے۔

اگر مسیحیت ان کے مزاج کے مطابق ہوتی اور اس میں جہاد اور مقابلہ کی اس ضرورت کو محسوس نہ کیا جاتا جو ان حالات میں بالکل فطری تھی تو تم دیکھتے کہ مغرب اپنی اس رائے سے خود ہی دست بردار ہو کر یہ سوچتا کہ زندگی کا مادی تصور بھی ان کی روحانی زندگی کو مالا مال کر سکتا ہے۔ تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اگرچہ یہ لوگ اسلام کی طرف مائل نہ ہوتے تاہم عیسائیت سے بھی راہ فرار اختیار نہ کرتے! روحانیت کی تلاش میں ہندوستان کی راہ اختیار نہ کرتے۔ مذہب جو انسانیت کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ سانس زندہ رہنے کے لئے انسانی فطرت کا ناگزیر جز ہے۔ انسان کے رگ و ریشہ میں جاری ساری یہ عنصر اصل میں روحانی زندگی سے ہی عبارت ہے۔

اسلام کے خلاف معرکہ آرائی

چونکہ اسلام ہی ایک ایسی دیوار ہے جو مغربی اقتدار پرستوں کے درمیان حائل ہو سکتا ہے۔ جو ان کے استعمار کا بت شکن ہے لہٰذا انہوں نے محمد ﷺ اور دین اسلام کی تعلیمات کی مخالفت سے اپنے عوام کو بھڑکا دیا۔ جس طرح دین اسلام کی ابتدا میں قریش نے اپنے ہم پیشہ ایرانی مشرکین دوستوں کی طرف داری میں ہرقل اور رومیوں کی پسپائی کو اپنے کفر و شرک کی دلیل بنا لیا۔ اسی طرح مغرب کے سیاسی مداریوں نے شعبدہ بازی سے اپنے اپنے حلقہ میں یہ خیال پھیلا دیا کہ مسلمانوں کی ذلت کا سبب صرف اسلام ہے۔ جس کی وجہ سے وہ دوسری قوموں کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔

کل کی بات ہے کہ جب اسی مغرب نے صدیوں کی جہالت و تباہ حالی سے نکل کر کروٹ لی! مگر آج وہ اسلام پر حرف گیری کرنے بیٹھ گیا۔ درحقیقت اسلام پر لگائے جانے والے تمام الزامات خود مغرب پر عائد ہوتے ہیں۔ جو دین عیسوی کے اختیار کرنے کی پاداش میں اتنی مدت علوم و فنون سے نا آشنا رہا نہ کہ اسلام۔ اسلام نے تو صحرا نشینوں کو علم و

دانش، سیاست و سلطنت کا مرصع تاج پہنا کر دنیا کو حیران کر دیا حتیٰ کہ مغرب کا ایک حصہ اندلس صدیوں تک اس کے زیرِ نگیں رہا۔

دوست نما دشمن

مغربی اہلِ قلم جو مسلمانوں کے سیاسی زوال کا سبب اسلام کو قرار دیتے ہیں۔ کسی حد تک ذہنی معذور ہیں۔ اسی وجہ سے ان کی تصانیف دو اقسام میں بٹی ہوئی ہیں۔

(ا) اسلام کے دوست نما دشمنوں کی تصنیفات!

(ب) اسلام کے نادان دوست مسلمانوں کی تصانیف!

دوسری قسم کے مصنفین نے اسلام میں وہ باتیں داخل کر دیں جن کو اللہ اور اس کے رسولؐ یکسر پسند نہیں فرماتے۔ ان نادان دوستوں کا عالم ہے کہ جس کسی نے ان کی نئی نئی اختراعات سے انکار کیا اس کے حق میں کفر کا حکم صادر فرما دیا۔

اس سے قطع نظر جب ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر مسلمانوں ہی کی لکھی ہوئی کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارے تعجب کی کوئی حد نہیں رہتی کہ ان میں بے شمار ایسی کتابیں ہیں جن میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن میں وہ سب ڈال دیا گیا ہے جسے دیکھ کر عقل شرما جائے۔ تعجب تو یہ ہے کہ اسلام کے ان نادان دوستوں نے اپنی اختراعات و بدعات اور مزعومات کو اثباتِ رسالت میں مددگار سمجھ رکھا ہے۔ حالانکہ ان سے نبوت کی نفی ہونا چاہیے، یہی مخترعات ان مستشرقین کی دستاویز ہیں جو اسلام، بانیؐ اسلام اور مسلمانوں پر طعن کرنا وظیفۂ استشراق سمجھتے ہیں۔ کاش وہ ان بے اصل باتوں پر اکتفا کرتے جو نادان مسلمان مصنفوں نے اندھی عقیدت میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کتابوں میں درج کر دی ہیں۔ مگر مغربی مصنفوں نے ان مندرجات کی نوک پلک سنوارنے میں اپنی فسوں کاری سے ایسا کام لیا کہ ان مصنوعی باتوں پر اصل کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ انہوں نے اپنے اس اندازِ تصنیف کو "تحقیق جدید" کا عنوان دے دیا۔ حالانکہ تحقیق جدید کا تقاضا یہ ہے کہ جس موضوع یا مبحث پر قلم اٹھائی جائے۔ اس کی اچھی طرح چھان بین اسی طرح کی جائے جس طرح ایک منصف عدل و انصاف کو مد نظر رکھ کر زیر غور معاملہ کے تمام واقعات کی پوری طرح معلومات حاصل کرکے اس کے جھوٹے اور سچے اجزا کو الگ تھلگ کر لیتا ہے اور پھر اصل حقائق پر غور و فکر کرکے فیصلہ کرتا ہے۔

لیکن مستشرقین کی تحریروں میں اسلام اور بانیؐ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق عیب جوئی کی بیماری اس حد تک دکھائی دیتی ہے کہ وہ اپنی دروغ گوئی اس شاطرانہ انداز میں پیش

کرتے ہیں کہ اس پر حقیقت کا یقین ہونے لگتا ہے۔ ان خود غرض حسد پیشہ مصنفوں کا مقصد در حقیقت اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنا ہوتا ہے۔

یہ سب کچھ اپنی جگہ لیکن اللہ رب العزت نے طمانیت و سکون کی دولت ان میں بھی بعض آزاد مسیحی مصنفین کی جھولی میں ڈال رکھی ہے جو اسلام اور اس کے بانی صلوٰت اللہ علیہ کے بارے میں انصاف سے چنداں دور نہیں رہے۔

مسلمان مصنّفین اور مغربی افترا پرواز

مسلمان اہلِ قلم نے ان سراسر جھوٹ کے مغربی پلندوں کی تردید کا سلسلہ بلاشبہ جاری رکھا ہے۔ انہوں نے مغربی مستشرقین کے اسلامی تعلیمات اور بانی اسلام پر لگائے ہوئے الزامات کے منہ توڑ جواب دیئے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں شیخ محمد عبدہٗ مصری نظر آتے ہیں جن کی شہرت اقصائے عالم میں پھیل چکی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے اس طبقہ کی طرف سے مدافعت کے صحیح ماننے میں دو رکاوٹیں پیدا ہو گئی ہیں۔

(الف) یہ کہ مسلمان مصنّفین نئے اسلوبِ تحقیق کے معیار پر اپنا مافی الضمیر کہنے میں پورے نہ اترے جس کی آڑ لے کر مسلمانوں کے ازلی و ابدی مستشرق دشمنوں نے ان کی تحریروں کو ٹھکرا دیا۔

(ب) مسلمان اہل قلم کے دوسرے گروہ کو جس میں شیخ عبدہٗ (مصری) جو مقدمۃ الجیش کی حیثیت سے نمایاں نظر آتے ہیں۔ مگر مغربی مستشرقین کی عیارانہ تحریروں نے مسلمانوں کے دل میں ان کے خلاف یہ گمان پیدا کر دیا ہے کہ یہ لوگ ہی الحاد کی آبیاری کر رہے ہیں۔ جس سے مغربی اہلِ قلم کو مسلمانوں کی تحقیق کو غیر مستند کہنے کا جواز مل گیا۔

الزام کا اثر

مسلمانوں کے نوجوان طبقہ نے جب یہ دیکھا کہ ہمارے قدیم مدارس کے علماء نے شیخ محمد عبدہ اور ان کے ہم خیال غیور اہلِ قلم مسلمانوں پر ملحد و زندیق ہونے کا فتویٰ صادر فرما دیا ہے۔ اور یہ نوجوان ان میں سے تھے۔ جو ابتدا سے ہی ان روشن خیال اہلِ قلم کے عقلی دلائل سے متاثر تھے۔ لیکن انہیں یہ شک پیدا ہو گیا کہ ہمارے قدیم علمائے دین ہر اس بات کو الحاد اور گمراہی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کا محور منطق اور فلسفہ ہو لہٰذا نوجوانوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ علمائے قدیم جس بات کو قدیم کہیں گے وہی بات اجتہاد سے اس طرح قریب تر ہو گی جس طرح ایمان اجتہاد سے بے نیاز ہے۔

مستشرقین کی تصانیف

مسلمان نوجوان مستشرقین کی تصانیف پر اس لئے فریفتہ ہو گئے کہ اسلام کی جس جس حقیقت سے مسلمان اہلِ قلم آشنا نہیں کر سکے اسے مغربی اہلِ قلم نے روز روشن کی طرح واضح کر دیا۔

مسلم نوجوان کی فریب خوردگی

مستشرقین سے پہلے کلیسائی اہلِ قلم نے اسلام اور بانی اسلام سے متعلق جو زہر اگلا ہے۔ مسلمان اسے پاپائی تعصب کہہ کر مسترد کر دیتا تھا۔ مگر جب مسلمانوں کا یہ جذبۂ نفرت مغرب کے مستشرقین نے محسوس کیا تو انہوں نے کلیسائی زہر سے کہیں تیز تر زہر تحقیق کی مٹھاس میں حل کر کے پیش کر دیا۔ جسے کبھی خالص فلسفہ ادب کے عنوان سے ان کی رگِ ایمان میں اتارا۔ اور کبھی ادب و شعر کے دلفریب رُوپ میں ان کے دلوں میں سمویا۔ انسان دلائل کے نام سے ہر ایک کے سامنے جھک ہی جاتا ہے۔ جب بھی مسلمانوں کے دل میں یہ خیال آیا۔ کہ ان مسائل کو علمائے قدیم کے سامنے رکھ کر ان کا حل تلاش کریں تو وہ علماء کی جمعیت اور اپنی قلت کے سبب خاموش ہو گئے۔ کہ ان علماء کے معاون و مددگار ہر طرف سے نکل آئیں گے مگر ہمارا مددگار کون ہو گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے تو نفسِ مذہب پر شک کرنے لگے اس کے بعد اسلام اور بانی اسلام سے ہی بدگمان ہو گئے۔

اسلام اور مذہب سے برگشتگی کا سبب یہ بھی ہے کہ مذہب کے بے شمار مسائل ان کے معیار کے مطابق یا موجود وضعی منطق کے اصولوں پر پورے نہیں اترتے۔ نہ اسلام کے وہ مسائل ان کے معیار کے مطابق علمی طور پر صحیح اترتے ہیں۔ جن کی ماوراالطبعات کے ساتھ ملاوٹ بتائی جاتی ہے۔ اس قسم کے مسلمان مغربی دانشوروں کی تصانیف کا گہری نظر سے مطالعہ کرتے ہوئے یہ بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں کہ مغرب میں حکومت اور مذہب دونوں کی راہیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اگر کسی عیسائی ملک میں مذہب کو حکومت میں دخل ہے تو صرف اس قدر کہ کلیسا کی طرف سے حکومت کی تصدیق کر دی جائے۔ چاہے ان کا تعلق پروٹسٹینٹ سے ہو یا کیتھولک سے! اس کے سوا یورپ کو حکومت میں کوئی دخل نہیں۔

لیکن مسلمانوں کی سادہ لوحی نے مغربی قوموں کے تقسیم حقوق سے بھی الٹا ہی سبق لیا۔ مسلمان پوری فراخ دلی سے مغربی حکومتوں کی اس علم دوستی پر ایمان لے آئے جب کہ مغربی حکومتیں اپنی مذہبی رسومات میں قطعاً کوئی حصہ نہیں لے سکتیں۔

اسی قسم کی بے شمار وجوہات ہیں جن کی بنا پر مستشرقین کی تصانیف کے مطالعہ میں کئی

قسم کے محرکات و موثرات مسلمانوں کے دماغوں پر سوار رہتے ہیں اور وہ مغربی اہلِ قلم کو منصف مزاج سمجھ لینے کے بعد مکمل طور پہ ان کی باتوں کو دل میں اتارنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ جس کا ایک ایک حرفِ اسلام اور بانیٔ اسلام سے نفرت پیدا کرنے میں تیر بہدف ہے۔

مستشرقین کی کتابوں کا مطالعہ

صدیوں سے مشرق پر تعصّب و جمود طاری ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے ذوقِ سلیم اور اندازِ فکر پہ جہل و حماقت کی تہیں جم چکی ہیں۔ اس جوڑ کو توڑنے اور اس نقصان کی تلافی کے لئے ضروری ہے کہ اس دور کی تازہ ترین معلومات سے فائدہ اٹھایا جائے تاکہ عصرِ حاضر اور ماضی کی عظمتوں میں پھر سے ربط و تعلق پیدا کیا جائے اور اپنے قدیم ورثے کو پھر سے دنیا کے سامنے سجا سنوار کر پیش کیا جا سکے۔

مستشرقین کی محنت کا اعتراف

مغربی دانشوروں نے جس محنت کے ساتھ مشرق کے بارہ میں معلومات کا ذخیرہ جمع کیا ہے ہمیں ان کی اس محنت کا اعتراف ہے۔ مگر ابھی ان کی تصانیف تمہید و ابتدا کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جنہیں مسلمان اہلِ قلم اور مشرق کے رہنے والوں کے سامنے انہوں نے صفحات پر پھیلا دیا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ پہلے تو اہلِ مغرب کی تصانیف کے اغلاط و زوائد چھان پھٹک کر انہیں صاف کریں۔ اس کے بعد انہیں ضروری اور مناسب اضافوں کے ساتھ مکمل کریں۔ کیوں کہ جس ملک کے مسائل ہوں درحقیقت اسی ملک کے رہنے والے ان کی صحیح صورت حال اور پھر اس کے تدارک کو سوچ سکتے ہیں۔ اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہو جائیں تو ہم روحِ اسلام اور روحِ مشرق دونوں کی حفاظت کا فریضہ ادا کر سکیں گے۔

ہمیں مغرب کے اندازِ فکر یا دلائل پیش کرنے کے انداز پر نکتہ چینی کرنا کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ ہمیں صرف یہ مدنظر رکھنا چاہیے کہ اسلام ہماری میراث ہے اور اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔ ہمیں اپنے موروثی نور سے دوسروں کو بھی منور کرنا ہو گا۔ شکر ہے کہ اس وقت بہت سے مسلمان اسلام کی قلمی اعانت میں مشغول ہیں جو مغربی فکرِ جدید کے اسلوب پر لکھتے ہیں اور جن کی محنت کی مغربی اہلِ قلم بھی داد دیتے ہیں۔

عیسائی تخریب کار

کلیسائی طبقہ بلاشبہ صبح و شام اسلامی تعلیم اور محمد ﷺ پر طرح طرح کی اتہام تراشیوں سے علمی اور فکری تخریب کاری میں مصروف ہے۔ جس طرح ان کے اسلاف مصروف تھے۔ اسلام پر مغربی تخریب کار حملوں کی نوعیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اسے مغربی جمہوریت کے صدقے میں آئین کی حیثیت بھی حاصل ہے اور اس طریقۂ واردات کو مغربی حکومتیں آزادیٔ فکر کا نام دیتی ہیں جب کہ خود ان کلیسائی مذہبی افکار کو ان سلطنتوں نے حکمرانی میں دخل اندازی سے اس طرح نکال دیا ہے۔ جیسے دودھ سے مکھی۔ مغربی استعماریت نے اسلام اور بانیٔ اسلام کے خلاف زبان درازی جاری رکھنے کی صرف کلیسا کو ہی شہ نہیں دے رکھی بلکہ مسلمانوں میں سے بھی چند علماء کو اور کج فہم اہلِ قلم کو اپنی بغلوں میں دبا رکھا ہے۔ جن کی ہر تحریر سے خود اسلام شرمندہ ہے۔ ان علماء نے جو خرافات نبی اکرم ﷺ سے منسوب کر رکھی ہے۔ نہ صرف رُوحِ محمد ﷺ پریشان ہے بلکہ عقل بھی ان سے گریزاں اور ذوقِ سلیم اپنا منہ نوچ رہا ہے۔

کتاب حیاتِ محمد ﷺ

علمی زندگی طے کرنے کے بعد میں نے عملی زندگی میں قدم رکھا تو میں نے محسوس کیا کہ دنیا کے ہر گوشہ کے مسلمان ان مسائل کی الجھن میں مبتلا ہیں۔ جو اسلام اور بانیٔ اسلام کے بارے میں پیدا کئے جا چکے ہیں۔ لہٰذا میں اسلامی ممالک اور وہ ممالک جن میں مسلمان رعایا کی حیثیت سے دن گزار رہے ہیں۔ سب کے مسائل کی تحقیق میں مصروف ہو گیا۔ جن مسائل کی غلط بیانی اور فریب دہی کے چکر میں آکر مسلمان اور مستشرق دونوں پریشان ہیں۔ در حقیقت مغرب کے عیار اہلِ قلم اور مسلمانوں کے جاہل علماء کی اس غلط روش سے محض دین کو ہی خطرہ نہ تھا بلکہ تمام عالم کو علمی حادثہ کی صورت مصائب کا پیش خیمہ تھا۔ مسلمان جو صدیوں تک دنیا کے ہر خطہ میں علم و تمدن کے محافظ رہے۔ اگر ان ہی کے عقیدے اور ان کے بانی کے اطوار و کردار میں ظلم و جہالت کی تیرگی ثابت ہو جائے تو جن قوموں نے ان کی برکت سے علم و دانش کے خزانے حاصل کئے ہیں۔ وہ تہذیب و فنون میں کس حد تک کامیاب ہوئیں۔ اسی سوچ کی روشنی میں میں ان مسائل کی تحقیق و مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔ اور میری تمام تر توجہ حیاتِ محمد ﷺ "صاحب الرسالۃ الاسلامیہ" صلی اللہ علیہ وسلم پر جم گئی اور میں نے مندرجہ ذیل دو طریقے پیش نظر رکھے۔

(الف) مسیحانِ کلیسا اور مستشرقین اور ان کی تمام طعنہ بازیوں کی تحقیق جو انہوں نے اسلام

اور بانیٔ اسلام پر از روئے حسد چسپاں کئے ہیں۔

(ب) ان فریب زدہ غلط اندازِ فکر اور جامد مسلمان مصنفوں کا محاسبہ جنھوں نے جوش عقیدت میں اسلام اور بانیٔ اسلام کے دامن پر بدنما داغ لگائے ہیں۔ اس کتاب کی تدوین و تحقیق جدید مغربی نہج میں ضبطِ تحریر کرنے کا عزم کیا۔ میری یہ تمام کوشش صرف اثباتِ حق اور باطل کی تردید کے لئے ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور مقصد پیشِ نظر ہیں۔

طریقِ کار

اس مقام پر آنحضرت ﷺ کی سیرتِ پاک سے متعلق تمام کتب کا مطالعہ کرنے کے بعد مندرجہ ذیل کتابیں حرفاً حرفاً دوبار پڑھیں۔

(1) سیرت ابنِ ہشام

(2) طبقات ابنِ سعد

(3) مغازی محمد الواقدی

(4) روحِ اسلام (امیر علی)

اور سیرت کے متذکرۃ الصدر اساطینِ اربعہ کے بعد مستشرقین کی ان تالیفات کا مطالعہ کیا

(1) "ورمنگھم" کی سیرت محمد ﷺ

(2) "ارنج" (ہیتیم)

(3) ان مصنفین کی کتابوں کی مراجعت کے بعد موسم سرما "1932" کا پورا وقت میں نے اقصر میں گزارا اور وہیں کتاب "حیاتِ محمد ﷺ" کی بنیاد رکھی۔ اس درمیان میں یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں میرے اندازِ جدید اور اسلوبِ ترتیب کی خبر سن کر جمود پرور خرافاتی مسلمان میرے خلاف ہنگامہ نہ کر دیں۔ میری ہمت ٹوٹ گئی اور میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔

مگر علمی اداروں کے سربراہ جو میرے اندازِ فکر کے ہم نوا تھے۔ کتاب کے کچھ ابتدائی نقوش ان کی نگاہوں سے گزر چکے تھے۔ التوا کی خبر پاکر بضد ہوئے کہ میں حیاتِ محمد ﷺ کو اسی اسلوب سے لکھوں، اس سے میرے ارادہ میں پھر توانائی پیدا ہوئی اور قلم ہاتھ میں لے لیا۔

قرآن مجید میں سیرتِ محمد ﷺ کا پورا نقشہ ہے

مشیت نے اس موقع پر میری راہنمائی فرمائی اور مجھے یقین ہوا کہ قرآن مجید میں سیرتِ محمد ﷺ کی پوری تفصیل موجود ہے۔ اس میں نبی کریم علیہ الصّلوٰۃ و السلام کی

زندگی کے بارے میں تمام واقعات پر ایسے اشارے موجود ہیں۔ جن کی روشنی میں آپ کی سوانح اور کوائف مرتب کرنے میں صحیح راستہ مل سکتا ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ قرآن مجید ہی کو اساس بنا کر آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ مدون کرنے کے لئے احادیث و تفسیر کی کتابوں سے استشہاد (شہادتیں) حاصل کی جاسکتی ہیں۔ لہٰذا میں نے اس حوالے سے قرآنِ کریم سے مطلوبہ آیات کا استخراج شروع کر دیا۔

آقائے احمد لطفی

میری اس مہم کی اطلاع جب "ناظم دارالکتب مصریہ" آقائے احمد لطفی کو ہوئی تو انہوں نے ان آیات کا مجموعہ ایک جگہ جمع کیا ہوا میرے حوالے کر دیا۔ جس سے مجھے اس محنت سے نجات مل گئی۔ اس کے بعد میرے لئے یہ ضروری تھا کہ میں ان آیات پر ایک ایک کرکے پورا پورا غور و خوض کروں جس کے لئے ضروری تھا کہ میں ہر آیت کے سیاق و سباق کے علاوہ اس کے شانِ نزول اور اوقاتِ نزول کی تحقیق و تلاش کروں لیکن کتب تفسیر کی کوتاہ قلمی نے مجھے تھکا دیا کیوں کہ مفسّرین آیات کے شانِ نزول کا پورا استحصا نہیں کرتے البتہ یہ کام ان حضرات نے ضرور کیا ہے۔

(1) واحدی "درکتاب اسباب النزول" (2) ابن السلامہ "درکتاب الناسخ و منسوخ" دونوں حضرات نے مختصر مگر بہت سلیقے اور مکمل غور و فکر، تحقیق و تلاش سے شانِ نزول بیان کئے ہیں۔ راقم السطور نے دوسرے اسفار تفسیر اور سیرت کی کتابوں کے ساتھ انہی دونوں پر اپنی تحقیق کا مدار رکھا ہے۔

تنبیہہ:

لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کیا جائے۔ کہ واحدی اور ابن سلامہ تفسیر اور احادیث کے دفاتر میں تنہا کوئی ایسا مجموعہ نہیں جس پر کسی مسئلہ کی بنیاد تحقیق و تدقیق کے بغیر رکھی جاسکے۔

مراجعت کے دوسرے ذرائع

(1) جامعہ ازہر:

اس ممتاز درس گاہ کے اکابر نے میری معلوماتی مشکلات میں پوری طرح ہاتھ بٹایا جس میں

ازہر کے شیخ الجامعہ شیخ محمد مصطفیٰ المراغی کی عنایاتِ عمیم کے شکریہ سے کبھی عہدہ بر آ نہیں ہو سکتا۔

(2) دار الکتب مصریہ:۔

استاد عبدالرحیم نگران ادب کی مسلسل مہربانیوں نے مجھے ان کا بندہ حلقہ بگوش بنا لیا۔ ان کی کتابوں کے خزانے کے دروازے میرے لئے کھول دیئے گئے۔ بلکہ اس دار الکتب کے آشنا یا نا آشنا ہر عہدہ دار نے اپنے علمی احسانات سے مجھے ممنون فرمایا۔

(3) جعفر پاشا:۔

متعدد کتابیں خصوصاً صحیح مسلم، تواریخ مکہ معظمہ، عاریتاً عنایت فرمانے کے علاوہ اور بھی بہت اہم مسائل میں میری رہبری فرمائی۔

(4) عبید پاشا:۔

(ا) حیات محمد (سر ولیم میور) (ب) الاسلام (مصنفہ پادری لامنس) دونوں کتابیں عطا فرمائیں۔ بقیہ اہم مصادر جن سے استفادہ کیا۔
(5) فجر الاسلام استاد احمد (6) قصص الانبیاء (استاد عبد الوہاب نجار) (7) الادب جاهلی مصنفہ ڈاکٹر طہٰ حسین (8) الیہودی البلاد العرب مصنفہ اسرائیل اور نفنسن۔
حیات محمد ﷺ کی تدوین و تہذیب کے درمیاں ایسی گرہیں آ گئیں۔ جن کو سلجھانے کے لئے پہلی گرہ کے بند کھولنے کے سوا کوئی دوسرا طریقہ کارگر نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی طرح اس رشتے کا ہر ایک عقدہ اپنے گوناگوں الجھاؤ لئے ہوئے سامنے آیا۔
جس طرح اپنے خزانۂ علم میں موجود اپنے ہاں کے اسفار تفسیر اور سیرتوں سے میری مشکلات کا حل ہوتا گیا اسی طرح مستشرقین سے بھی بعض کے علم کے دفاتر میری مہم میں نفع بخش ثابت ہوئے۔

اس راہ میں نئی دشواری یہ پیش آئی کہ سید العرب والعجم ﷺ کی سوانحِ حیات کے ساتھ اکثر و بیشتر آپ ﷺ کے اصحاب و انصار کے کوائف بھی ملے جلے سامنے آئے لیکن میں نے ان میں سے صرف آنحضرت ﷺ کی حیاتِ مبارکہ سے متعلق کو لے لیا ورنہ ضخامت بہت ہو جاتی۔

اس جگہ کو سان اور پر سفال کا تذکرہ نامناسب نہ ہو گا۔ رسالہ تاریخ عرب سے متعلق" کے نام سے جنھوں نے تین جلدیں لکھی ہیں۔ اور میں نے ان سے استفادہ کیا

ہے۔ اس کے ابتدائی دو حصے آنحضرت ﷺ کی سوانح اور تیسری جز شیخین (حضرت ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہ) کے حالات پر مشتمل ہے۔ جس طرح طبقات ابن سعد کی پہلی جلد رسول پاک ﷺ کی سیرت پر اور بقیہ حصے آپ کے صحابہ کے سوانح و کوائف پر پھیلے ہوئے ہیں۔

ابتدائے تسوید میں ہی یہ مدِ نظر رکھا کہ آنحضرت ﷺ کی سیرت سے تجاوز نہ ہونے پائے ورنہ مقصد سے دور رہ جانے کا خطرہ ہو گا۔

سیرت پاک میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہ اجمعین کی سوانح شامل کرنے میں دوسری مصلحت یہ تھی کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کی بے نظیر عظمت و نورانیت کے سامنے کسی اور پر نگاہ نہیں ٹھہرتی۔ اسی طرح حضرت ابوبکر اور جناب عمر رضی اللہ عنہ اپنے اپنے دور میں جلال و جمال کے وہ بلند مینار تھے کہ جن کے سامنے دوسروں کی رفعت نگاہوں میں جچتی ہی نہ تھی۔ اسی طرح ان دونوں شیخین کے بعد سابقین اولین کی منزلت ہے۔ جن کے علم کا مقابلہ صحابہ میں سے کسی سے بھی نہ ہو سکا۔ حتیٰ کہ بعد میں آنے والوں نے اپنے فخر و امتیاز کی عمارت انہیں کی عظمتوں پر کی۔

نہ صرف ابوبکر عمر فاروق رضی اللہ عنہ بلکہ اور بھی سابقون الاولون کے ساتھ ساتھ تمام صحابہ آنحضرت ﷺ کی زندگی میں آپ ہی کی روشنی سے درخشندہ تھے۔ اس لئے ہر مصنف کے آدابِ تصنیف میں یہ شامل ہے کہ وہ رسولِ اکرم ﷺ کی زندگی کے بیان میں دوسری شخصیتوں کو داخل نہ ہونے دے، خصوصاً جب کہ جدید طرزِ تحقیق کے مطابق اس بحث کو پھیلایا جائے۔ (حیاتِ محمد ﷺ) کا اسلوب یہی ہے اور یہی وہ واحد طریقہ ہے۔ جس سے نبی اکرم ﷺ کی عظمت و جلال کو غیر مسلموں کے دل و دماغ میں منعکس کیا جا سکتا ہے اور اسی انداز سے ایمان و یقین میں اضافہ ممکن ہے۔ ان دروغ پیشہ عیسائیوں سے قطع نظر جنہوں نے اپنی حماقت سے آنحضرت کی توہین و تذلیل میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔

اگر آنحضرت ﷺ کی سیرت ان علمائے مستشرقین کی نظر سے دیکھی جائے جنہوں نے آپ کی حیاتِ مبارکہ کو اس انداز سے سپرد تحریر کیا ہے۔ جس سے ایک طرف تو سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت و جلالت نظر آتی ہے۔ تو دوسری طرف اپنی قوتِ ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ ایسے علماء میں یہ مستشرقین لائق تحسین ہیں۔

(1) کارلائل۔ "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" کتاب الابطال در 1846 اس کتاب کی ایک پوری فصل میں تقدسِ خداوندی کا نور اپنے پورے جلوے کے ساتھ مشعلِ ہدایت محمد

ﷺ کے نور کے ساتھ برای العین منعکس ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔ کارلائل نے اسی حکمت سے اس نور کا سراپا قلم بند کیا ہے۔

(2) سر ولیم میور کتاب "سیرت محمد ﷺ" 1861ء

(3) ار فخ سیرت محمد ﷺ 1851ء

(4) اسپرنگر سیرت محمد ﷺ 1851ء

(5) ویل در کتاب محمد پیغمبر ﷺ 1845ء

ہر ایک نے سرتا پا صداقت کی نورانی تصویر کے خدوخال میں کیسی دل کشی پیدا کی ہے۔ بیان نہیں کی جا سکتی اگرچہ ان میں سے بھی بعض مصنفین نے چند امور میں فخرِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ و السلام پر نکتہ چینی سے احتراز نہیں کیا۔ بظاہر جس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسائل جن میں اختلاف ہے ان کا ان دانشوروں کو صحیح طریقہ سے مطالعہ کرنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ انہوں نے ایسی روایات پر بادلِ نخواستہ اعتماد کر لیا ہے۔ جو تفسیر و سیرت کی ان کتابوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جو پہلی دو صدیوں میں مدون ہوئیں۔ اور جن میں اسرائیلیات نے صرف سیرت پاک ہی نہیں بلکہ دوسرے اسلامی مسائل کو بھی خلط ملط کر کے انہیں مسخ کر دیا۔ یہی پہلی دو صدیاں (پہلی اور دوسری صدی) ہیں جن میں دشمنانِ دین کی راہ سے ہزاروں حدیثیں مسلمانوں میں پھیل گئیں۔ جس کا اقرار خود مستشرقین بھی کرتے ہیں۔ مگر اس اعتراف کے باوجود مستشرقین نے ان روایات سے اپنا دامن آلودہ کر لیا۔ حالانکہ وہ معمولی توجہ سے ضعیف و قوی روایات میں امتیاز کر سکتے تھے۔ ان روایات میں مندرجہ ذیل حکایتیں ہیں۔

(الف) داستان غرانیق

(ب) اتہام در واقعہ حضرت زید رضی اللہ عنہ اور جناب زینب رضی اللہ عنہا۔

(ج) افترا در تعددِ ازواج رسول پاک ﷺ اگر یہ مصنفین ان مسائل کے صحیح مصادر تلاش کرتے اور ان پر غور کرتے تو تہمت تراشی کے گناہ سے محفوظ ہو جاتے۔

راقم نے بشمول دوسرے ایسے مسائل کے ان روایات کو علمی تحقیق کے ساتھ جا بجا پرکھا اور لکھا ہے۔

اس کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ محمد ﷺ کی سیرتِ طیبہ لکھنے کا حق میں نے ادا کر دیا ہے۔ سوائے اس کہ اس موضوع پر بطرزِ نو تحقیق کی ایسی بنیاد رکھ دی ہے۔ جس میں اسلام سے متعلق علمی طریق سے بحث کی گئی ہو۔ میری رائے میں جس طرح علماء اور مؤرخین کے ایک گروہ نے تاریخ کے بعض موضوعات کی چھان بین کے لئے زندگیاں

وقف کر دیں مثلاً "اولارے" نے انقلابِ فرانس کی تفصیلات کو بڑی جانفشانی سے مرتب کیا۔ ٹھیک اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو اجاگر کرنے کے لئے علماء کو اپنی تمام تر صلاحیتیں وقف کر دینا چاہئیں۔

خصوصاً اس نہج پر کہ عرب کی جغرافیائی اور ملی حیثیت بیان کرتے ہوئے دنیا کے دوسرے خطوں اور قوموں کے ساتھ بھی موازنہ کیا جائے۔ یہ کام نہ صرف اسلام کی ہمہ گیری میں کار آمد ثابت ہو گا۔ بلکہ یہ اندازِ تحقیق دنیا جہاں کے بے شمار روحانی جسمانی اور نفسیاتی مسائل کو حل کر سکے گا۔ قوموں کے اجتماعی اخلاقی نظام کے وضع کرنے میں معاون ثابت ہو گا۔ اسلام اور مسیحیت میں جن باہم اختلافات کو ابھی تک طے نہیں کیا جا سکا۔ وہ اس اسلوب بیان کے اثر سے خود بخود زائل ہو جائیں گے اور مسیحی مناووں کا یہ ذوق اپنی موت آپ مر جائے گا یا تو مسلمانوں کو مغربی نظر و فکر کا حامل بنا دیا جائے یا انہیں بپسمہ قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔

اسلام ہی موجودہ دور کے کرب کا درماں ہے

اسلام ہی انسانیت کی فلاح و بہبود کا واحد ذریعہ ہے جسے انسان موجودہ دور تمدن کے کونہ کونہ میں تلاش کر رہا ہے۔ مسیحیت صرف تعصب اور کینہ فطرت ہونے کی وجہ سے اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں آنے کے بجائے "تھیا سونیکل" یا ہندو ویدانتا کو ترجیح دینے پر تلی ہوتی ہے۔ مشرق کے مسلمان اربابِ فکر اور یہود و نصاریٰ کے روشن خیال علماء کا فرض ہے کہ اسلام اور بانیٔ اسلام جیسے جلی موضوعات پر ایسی بے تعصبی کے ساتھ قلم اٹھائیں جس سے دنیا کو صحیح راستہ مل سکے۔ میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس دور کے کرب کا مداوا، تمام بحرانوں کا علاج صرف اور صرف رحمت دو عالم کے پیش کردہ نظامِ حیات میں ہے اور یہی نظام دنیا اور خالق دنیا کے ساتھ وابستگی کا متاع گراں ثابت ہو سکتا ہے۔

طبعاً" اسلام ہی کے مسائل میں یہ خوبی ہے کہ وہ روحانی، معنوی ہر دو صورتوں میں انسان کے شرف و احترام کو اس طرح تابندہ کر سکتا ہے کہ جسے دیکھ کر محض علم اس کے سامنے حیرت زدہ ہو کر رہ جائے۔ یعنی وہ علم تنہا کسی کی نفی یا اثبات سے قاصر ہے۔ اسلام کو اس انداز سے پیش کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی ہو گا کہ وہ ہر دور اور عہد کے مطابق انسان کی زندگی اور اس کی مصلحتوں میں قوت بخش ثابت ہو گا۔

چند قابلِ حل علمی مسائل

(1) زندگی کیا ہے؟
(2) انسان اور دنیا کا باہمی ربط؟
(3) طمعِ زندگی؟
(4) وہ عقائد جن پر عمل کرنے سے قوموں کی ہمتیں چھن جاتی ہیں؟
(5) وجودِ باری تعالیٰ؟
(6) وحدتِ وجودی؟
(7) وجود؟
(8) وحدت الوجود (6) میں کون شخص محلول ہے؟

ان میں سے ہر مسئلہ پر منطقی اسلوب سے ادب میں غیر معمولی اضافہ موجود ہے۔ خود مسلمانوں نے بھی ان بحثوں میں منطق اور فلسفہ کے دریا بہا دیئے ہیں۔

کہنا یہ ہے کہ اب تک عقل و حکمت کی یہی قوت جو عباسی دور سے اب تک مذکورہ مسائل میں مصروفِ عمل ہے۔ اسے حضرت محمد ﷺ کی سیرت اور ان کی تعلیم کے افادی پہلوؤں پر صرف کیا جاتا تو آج دنیا کا نقشہ ہی اور ہوتا۔

اس حوالے سے خود مغرب کی رفتار بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ جو سولھویں صدی سے بیسویں صدی تک مسلمانوں کی طرح بے معنی مسائل کے حل کرنے میں مصروف رہا ہے۔

مشرق اور مغرب کے ان ادوار میں علم اپنی جگہ حیران و پریشان تھا کہ میری ذات تو انسانیت کی رفعت کا ذریعہ ہے۔ مگر مسلمان اور یورپ کے دانشور مدعیانِ علم کن چہ میگوئیوں میں الجھ کر رہ گئے ہیں۔

ظاہر ہے کہ علم کا مفید ترین پہلو انسان کی سعادت و خوش نصیبی کی صورت میں ہی نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسا علم جس سے خالق اور اس کے بندوں کے درمیان ایسا واسطہ پیدا ہو سکے جس سے پوری انسانی برادری یگانگت میں منسلک ہو جائے اور یہ سبق یہ تعلیم یہ طریق صرف اور صرف نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ میں ہی ہے بشرطیکہ آنحضرت ﷺ کی سیرت پر علمی طریق سے بحث کی جائے جس کے ثمرات سے دنیا کو موجودہ مادہ پرستی کی مشکلات سے بھی نجات حاصل ہو سکتی ہے۔

بہ ظاہر اس مقصد میں کامیابی بڑی مشکل نظر آتی ہے لیکن جو اربابِ بصیرت موجودہ دور میں مادے کی فرماں روائی کو زوال پذیر سمجھ رہے ہیں۔ وہ ان مسائل کا حل محمد ﷺ کی سیرت کو سامنے رکھ کر حل کریں تو اس کی شعاعوں سے اجماعیت کے

مسائل خود بخود ظلمت کے دھندلکوں سے نکل کر روشنی میں آنا شروع ہو چکے ہیں۔ اب مادہ پرستی کی بے برکتی کا اندازہ آسانی سے سمجھ میں آ رہا ہے۔ امید ہے کہ نوع بشر اپنے فوز و فلاح کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے بارگاہِ رسالت کی طرف متوجہ ہو کر اپنے ارادوں میں کامیاب ہو سکے گی۔

حرفِ آخر

جیسا کہ ابتدائے مقدمہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ کتاب حیات محمد ﷺ ان توضیحات پر ابھی حرفِ اول کی حیثیت میں ہے۔ تاہم میری توقع ہے کہ طالبانِ حقیقت کو اس کے مطالعہ سے تسکین حاصل ہو سکے گی اور اس موضوع پر بالغ النظر محققین آنحضرت ﷺ کی سیرت پر تلاش و جستجو سے قلم اٹھائیں گے۔

(الف) اہلِ قلم محققین اس راہ میں اپنی کاوش صرف کریں۔

(ب) حضرت محمد ﷺ کی سیرت کی روشنی میں انسانیت کے اضطراب اور تھکان کا مداوا تلاش کریں۔

اگر ان میں سے ایک بھی مقصد حاصل ہو سکا۔ تو راقم اسے اپنی کامیابی کا تصور کرے گا۔

مقدمہ مؤلف (طبعِ ثانی)

طبعِ اول کی مقبولیت

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن 10 ہزار کی تعداد میں چھپا۔

(الف):- ایک ثلث کی فرمائش اثناءِ اشاعت ہی میں آ گئی۔

(ب):- بقیہ طبع ہونے سے تین ماہ بعد ہاتھوں ہاتھ بک گئی۔ جو قارئین کے شوقِ مطالعہ کا پیمانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے طبعِ ثانی کے موقع پر مزید غور و تحقیق کی ضرورت محسوس کی گئی اور سب سے پہلے میں نے اپنے آپ سے ہی رائے طلب کی:-

(1) کیا طبعِ ثانی کو نقشِ اول ہی کی صورت میں شائع کرایا جائے؟

(2) یا پہلے ایڈیشن کی کوتاہیوں کی تنقیح و تصحیح ہی کافی ہو گئی؟

(3) یا طبعِ اول میں جو مباحث تشنہ رہ گئے یا احاطۂ تحریر میں نہیں لائے گئے ان کے تدارک پر ہی اکتفا کیا جائے؟

احباب کا مشورہ

میں نے اپنے دوستوں سے اپنی تینوں آراء کا ذکر کیا یہ وہ قدر دان اہلِ علم تھے جن کے مشوروں کی میرے نزدیک بہت اہمیت ہے۔ انہوں نے کہا۔ کہ اگر دوسرا ایڈیشن بالکل اسی طرح طبع اول کی صورت شائع کر دیا جائے تو اس کے دو فائدے ہیں۔

(ا) دونوں اشاعتوں میں یکسانیت کی صورت میں جن اصحاب کے پاس طبعِ اول کے نسخے موجود ہیں وہ اپنے نسخہ میں کمی نہ پا کر بد دل نہیں ہوں گے۔

(ب) اور اس طبعِ ثانی کے بعد آپ کو سکون کے ساتھ تیسرے ایڈیشن کے لئے تصحیح اور اضافوں کے لئے کافی وقت مل جائے گا۔ میں ان مشوروں پر عمل پیرا ہونے پر آمادہ بھی ہو گیا۔ اور اس صورت میں موجودہ ایڈیشن طبعِ ثانی آج سے کئی مہینے بیشتر قدر دانوں تک پہنچ جاتا لیکن مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر ارادہ ترک کر کے ذیل کی تنقیح و اضافے پر متوجہ ہونا پڑا۔

(الف) استاد محمد مصطفیٰ (المراغی) کی تنقیحات جو ممدوح پہلی طباعت کے دوران میں ایک ایک تختہ کاغذ چھپنے پر ساتھ ساتھ اپنے قلم سے لکھتے گئے۔ جنہیں پہلا ایڈیشن شائع ہو جانے کے بعد ہی آپ نے میرے حوالے کیا۔

(ب) طبع اول شائع ہونے کے بعد اہلِ قلم حضرات نے اخباروں، ماہانہ رسالوں اور ریڈیوں میں تبصرے فرمائے جن میں دل کھول کر کتاب کی تعریف کی گئی۔ یہ تبصرے بھی میرے زیرِ نظر تھے۔

گزشتہ اوقات میں رسائل اور اخبارات کے مقالات کے اندر میری سعی و کاوش کے مقابلہ میں ایک طرف میری تعریف کا دامن حد سے زیادہ پھیلا دیا گیا تو دوسری جانب محققین و اہلِ علم نے یہ خواہش ظاہر کی کہ نبیٔ عربی ﷺ کی شان و عظمت کا تقاضہ یہ ہے کہ طبعِ ثانی میں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ مختلف حضرات نے جو مشورے دیئے وہ کچھ یوں تھے۔

(الف) بعض کے نزدیک بعض مقالات کی وضاحت ضروری تھی۔

(ب) کچھ لوگوں کو یہ شکوہ تھا کہ حروفِ صبر کے استعمال میں نظرِ عمیق سے کام لینا چاہیے تھا۔

(ج) بعض کی رائے تھی کہ کچھ مندرجہ الفاظ کو بعض معنوں پر چسپاں کر کے تکلف سے کام لیا گیا لہٰذا وہاں ایسے الفاظ کی ضرورت ہے جو زیادہ واضح ہوں۔

یہی اشارے میرے لئے دوبارہ غور و مراجعت کے محرک بنے۔ یہاں تک کہ جن مباحث کا تذکرہ مضمون نگاروں نے اخبارات اور رسالوں کے مقالات میں نظرانداز کر دیا تھا۔ میں نے ان پر بھی نظرِثانی کرنا ضروری سمجھا تاکہ دوسرے ایڈیشن کا قاری اچھی طرح مطمئن ہو سکے! اگرچہ خاتم النبین علیہ الصلوٰۃ و السلام کی سیرت پر یہ کتاب علمی اور تحقیقی حیثیت سے ہنوز حرفِ اول ہے۔ جیسا کہ پہلی اشاعت کے مقدمہ میں کہا جا چکا ہے۔

طبعِ ثانی میں مزید تحقیق و اضافے کا سبب یہ بات بھی ہوئی کہ دوستوں نے جو مشورے دیئے تھے۔ میں نے انہیں بغور پرکھا، سوچا، اگرچہ ان مشوروں کے مفہوم سے میں پہلے بھی غافل یا لاعلم نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے ان کو اپنا نقطۂ نظر سمجھانے کے لئے دوبارہ تحقیق و اضافہ کی ضرورت کو قبول کر لیا۔ اس مقصد کے لئے میں نے رسول اللہ ﷺ کی سیرت لکھتے وقت جن نکات پر خصوصی توجہ دی وہ اس لائق ہیں کہ ہر سیرت نگار ان کو اپنی نظر اور بصیرت کے سامنے رکھے۔

بحمد اللہ جہاں میں اس بات پر خوش ہوں کہ میں نے پہلے ایڈیشن میں غیر شعوری طور پر ان مشوروں کو پیش نظر رکھا تھا لیکن اب میں نے اس عظیم تر انسان کے بارے میں اتنی زیادہ وسعتِ مطالعہ سے کام لیا ہے کہ ہدایت اور راہنمائی کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملے گی۔ یعنی دوسری اشاعت میں ان مسائل کی مزید وضاحت کی گئی جو طبعِ اول میں بحث و

نقد میں آئے۔

مزید بر آں کتاب کے آخر میں دو فصلیں بڑھا دی گئی ہیں۔ جن میں ایسے مباحث کو پوری تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا جو پہلی اشاعت میں اختصار کے ساتھ ذکر میں لائے گئے تھے۔

میں پھر اپنے مقصد کی طرف لوٹتا ہوں ــــ سب سے پہلے مجھے ایک مصری مضمون نگار کی حماقتوں کو واشگاف کرنا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کا یہ تنقیدی مضمون اس مقالہ کا ترجمہ ہے جو انہوں نے مستشرقین المانیہ کے ایک رسالہ میں چھپنے کے لئے بھیجا تھا۔ میں ان کا یہ احمقانہ مضمون عربی اخبارات میں اس لئے نہیں چھپوا رہا کہ ان کے لگائے گئے الزامات ایسے بے سند اور بے سروپا ہیں جن کا کوئی ثبوت نہیں میں ان کا نام بھی ظاہر کرنا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ ممکن ہے میری اس تنقید کے بعد ان کو خود ہی شرم محسوس ہو۔ ان کی تنقید یہ ہے۔

(1) زیر بحث کتاب حیات محمد ﷺ جدید علمی طریق پر نہیں لکھی گئی۔

(2) مصنف نے اپنی کتاب میں جرمن مستشرقین مثلاً "نیل' جولڈزہر" اور نولد کے افادات سے خوشہ چینی کیوں نہیں کی۔

(3) مصنف نے اس تالیف میں قرآن مجید جیسی کتاب کو کیوں اساس بنالیا۔ جس کی صحت میں جرمن کے مقدس مستشرقین فرماتے ہیں کہ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد اس کتاب قرآن مجید میں تحریف و تغیر ہو گیا ایک ان میں ایک نبی کا نام بھی ہے جو اصل میں "یا قثام" تھا اور آخر میں محمد بن گیا۔ جس کا ثبوت قرآن حکیم کی آیت "ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد" ہے جو محمد ﷺ کی بجائے اس نبی کا نام ہے۔ جس کا نشان انجیل نے اس مفہوم میں دیا ہے کہ وہ نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد آئے گا۔

(4) ان مستشرقین نے یہ بھی فرمایا ہے کہ آنحضرت علیہ الصلوٰۃ و السلام جن باتوں کو وحی کے حوالے سے بتا کر اپنے فرماں برداروں کو ہدایات دیتے وہ ان کے مرض صرع (نعوذ باللہ) کا کرشمہ تھا۔ جس کے دورہ سے وہ لرزنے لگتے اور منہ سے جھاگ اگلنا شروع کر دیتے۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی وحی کے نام سے کلام سنا کر فرماتے کہ اس بے ہوشی میں مجھ پر یہ کلام نازل ہوا ہے۔

یہ مضمون نگار اگر مصری اور مسلمان نہ ہوتا تو میں ان بہتانوں پر توجہ نہ دیتا۔ اگر یہ بہتان مستشرقین یا مسیحی مناد لگاتے تب بھی انہیں نا قابل توجہ سمجھتا اور انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیتا۔ کیوں کہ طبع اول کے مقدمہ میں مسیحی معترضین کے متعلق جو کچھ لکھا

گیا۔ اس میں اضافے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لیکن مصری مضمون نگار آخر تو مسلمان ہی ہیں۔ اپنے ہی بھائی ہیں۔ جنہوں نے ایسا سوچا جس طرح ہمارے ان نوجوانوں اور دوسرے اشخاص کی سوچ ہے مستشرقین کی تحقیق و تحریر صحیح علم پر مبنی ہے۔ اس میں کسی طرح کی کسی قسم کی خطا کا امکان نہیں۔ چنانچہ اسلام کے متعلق مستشرقین کی تحقیق پر آنکھ بند کر کے آمنا و صدقنا کہنے والے مسلمانوں کے لئے چند باتوں کی وضاحت ضروری ہے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ اگر مستشرقین میں سے کوئی نیک نیت یا صحیح بھی ہو تو اس کا علم ناقص ہے۔ جو عربی لغت پر دسترس نہ ہونے کی وجہ سے اس قابل نہیں ہو سکا کہ حقائق کا احاطہ کر سکے پھر ان پر ایک اور بھوت بھی سوار ہے۔ جس کا اولین مقصد یہ ہے کہ اپنے سوا کسی ایک مذہب یا تمام مذاہب کے عقائد کی تردید کی جائے۔ اس جنوں میں وہ اس حد تک انتہا پسند ہو جاتے ہیں کہ الاماں الحفیظ! ان کے اس شدت کے ساتھ انتہا پسندانہ رویے نے تحقیق کی کن خطرناکیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس کا اندازہ اس سے کر لیجئے کہ بعض محققین نے مسیح کے تاریخی وجود ہی سے انکار کر دیا ہے کچھ لوگ اسراف اور غلو (یعنی بہت زیادہ مبالغہ) میں اس حد تک بڑھے کہ انہوں نے مسیح علیہ السلام کو مجنوں تک کہہ دیا۔ یہ غلو یا اسراف دراصل مغرب میں کلیسا اور اربابِ علم و معرفت کی باہمی کشمکش کا نتیجہ ہے جو مدتوں سے برپا ہے۔

اسلام کا دامن ان جھگڑوں سے کبھی آلودہ نہیں ہوا۔ اس لئے مسلمانوں کو اس انداز کی بحث میں الجھنا نہیں چاہیے۔ اور ان تمام افکار و نظریات کو آمنا و صدقنا کہہ کر قبول نہیں کر لینا چاہیے۔ جو مغرب کی ٹکسال میں ڈھل کر ان تک پہنچیں کیوں کہ ان پر صدیوں کے باہم تصادم کی چھاپ یقیناً ہوگی۔

مصری معترض سے

موصوف نے جس نوعیت کے اعتراض فرمائے ہیں یا نکتہ چینی کی ہے۔ اس کا ایک ایک حرف اس قابل ہے کہ اس کا مواخذہ ہو نہیں نہیں بلکہ ضروری ہے کہ مغربی علماء کے اسفار آنکھیں بند کر کے نہ پڑھے جائیں۔ مثلاً یہ اعتراض کہ راقم نے اپنی تصنیف میں اسلام اور عربی مصادر کو اساس قرار دینے کی غلطی کیوں کی ہے؟ بلاشبہ مجھے اس کا اعتراف ہے کہ میں نے ایسا ہی کیا ہے۔ مگر اس معصیت کی شدت کو کم کرنے کی نیت سے میں نے مستشرقین کے اسفار پر اچھی طرح نظر ڈال لی۔ جس کا ذکر میں نے ان کی تصانیف کے حوالوں کے ساتھ اشاریہ میں کر دیا ہے۔ مجھے اس اعتراض کو تسلیم کرنے سے بھی گریز

نہیں کہ میں نے عربی مصادر کو اولین اساس اور اہلِ مغرب کے نوشتوں کو ثانوی درجہ دیا ہے۔ خود مغربی اربابِ تصنیف بھی تو اسلام پر تحقیقات کے لئے قرآن ہی کو اساس بناتے ہیں اور عربی مصادر کا ہی سہارا لیتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ سیرت نبوی ﷺ لکھنے والے کے لئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اس مقصد کے لئے قرآن حکیم کو اساس نہ بنائے۔ خصوصاً جب کہ جدید علمی طریق پر تدوین مقصود ہو یہی گناہ "نول دیکی" نے کیا۔ اس معصیت میں جولڈزہر بھی زہر آلود ہوا۔ یہی ارتکاب ثیل "CELL" سے ہوا ہے۔ اسی طرح اسپرنگر اور میوگر نے بھی رسولِ عربی ﷺ کی سیرت لکھتے وقت قرآن حکیم ہی کو سب سے پہلے سامنے رکھا۔

کہنا یہ ہے کہ نقد و تمحیص کا جو انداز مستشرقین نے اختیار کیا ہے اس طریق کو میں نے بھی اپنی کتاب میں اپنایا۔ جس میں میں نے صرف اسلام کے مصادر بلکہ وہ مسیحی اسفار کتب بھی سامنے رکھے جو اسلام پر لکھتے ہوئے مستشرقین کے پیش نظر ہوتے ہیں۔ البتہ میں نے مسیحی مصادر کی جانچ پڑتال جدید علمی تحقیق کے مطابق کرنے میں کسی قسم کی سستی یا اغماض سے کام نہیں لیا اور مستشرقین کے یہ وہ دفاتر ہیں جنہیں مسیحی تلیسات کا گھناؤنا تودہ کہیں تو بے جا نہ ہو گا۔ اس پر اگر طعنہ دیا جاتا ہے کہ میں نے مستشرقین کے اخذ کردہ نتائج سے اتفاق کیوں نہیں کیا یا ان پلندوں میں درج تحریروں کی تحقیق اور چھان پھٹک میں ان کو مستثنیٰ کیوں نہیں رہنے دیا۔ تو ایسے معترضین کا جواب میں خاموشی سے بہتر کوئی جواب نہیں سمجھتا۔

معترض ایسے علمی جمود کی تبلیغ میں مصروف ہیں جو عقل اور دانشوری کے برعکس ابتذال اور رجعت پسندی کے زیادہ ہم آہنگ ہے جس کی توثیق مستشرقین کی ہمت سے بھی بالا تر ہے البتہ جنہیں علمی جمود گوارا ہے۔ ان کے لئے دینی جمود بھی ہے۔ لیکن علم اور دین دونوں ایسے تاریخی مسائل کے حامل ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی جمود سے کوئی واسطہ نہیں اور میں خود اس خیال میں دوسرے ارتقاپسندوں سے مستثنیٰ نہیں۔

جس طرح میں دوسرے اہلِ علم کی تحقیق پر اپنی تشفی کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں اسی طرح میں اپنی تحقیق پر دوسروں کا استحقاق بھی تسلیم کرتا ہوں۔ نقد و بحث یا چھان بین کے بعد میری علمی تحقیق کو صحیح جانیں تو قبولیت کا شرف بخشیں ورنہ ٹھکرا دیں چنانچہ زیر تنقید مسئلہ کی تحقیق کے حوالے سے بھی میں خود اسی نظریئے پر عمل پیرا ہوں یہ طریق عمل ان نوجوانوں اور ایسے حضرات کے لئے بھی سود مند ہے۔ جو اسلام کے متعلق صرف مستشرقین کی تحقیق پر ہی تکیہ لگا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ راقم نے دورانِ تالیف اسی اصول پر

عمل کیا۔ جس میں اگر میں کامیاب ہوں تو عند اللہ ماجور ہوں اور اگر کسی بحث میں مجھ سے کوئی خطا ہو گئی ہے تو پاداش سے بری کیے جانے کا حق دار اس لئے سمجھتا ہوں کہ میری نیت ہر قسم کے فتور سے پاک ہے۔

مستشرقین اور اصولِ دین

ہم نے کہا تھا کہ مستشرقین کی گمراہی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ ان کا مقصد ہی ہر اصولِ دین کو غلط ثابت کرنا ہے۔ جس کی سب سے بڑی دلیل اس مسلمان مضمون نگار کا مضمون ہے۔ جس میں اس نے کھلے لفظوں میں یہ کہا ہے قرآن حکیم بجائے خود ایسا قابل اعتماد و ثیقہ نہیں۔ جس میں تحریف و تغیّر نہ ہوا ہو بلکہ اس میں نبی ﷺ کی وفات کے بعد تحریف کی گئی اور اس میں کئی ایسی آیات بڑھا دی گئیں جن سے دین اور سیاست میں راہبری درکار تھی۔ میں اس مسئلہ میں مصری معترض سے الجھنا نہیں چاہتا خصوصاً اس لئے بھی کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان بھی کہتا ہے اور جس اسلام کا وہ خود اقرار کرتا ہے۔ وہی اس قرآن حکیم کے بارے میں دعویٰ کرتا ہے۔

لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ (41-42)

یعنی اس قرآن میں باطل کسی طرف سے سامنے یا پشت کہیں سے بھی شامل نہیں ہو سکتا۔

معترض کے مذکورہ اعتراضات میں ان تخریب کار مستشرقین کی نقب زنی اپنا کام کر رہی ہے جو صاف لفظوں میں سرِعام کہتے ہیں کہ قرآن حکیم محمد ﷺ کی اپنی تخلیق ہے جسے وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کی وحی سمجھ کر اس پر ایمان رکھتے تھے۔

لہٰذا میں اسی کے انداز میں جواب دینا چاہتا ہوں کیوں کہ اس نے مسلمان ہونے کے باوجود تحقیق و جستجو کا وہی طریقہ اختیار کیا جو مستشرقین کا جانا پہچانا طریقہ ہے۔

دراصل مصری مقالہ نگار کے اپنے علم کا پورا پورا اعتماد ان مغربی محققین کے علم پر ہے جن کا یہ کہنا ہے کہ سورۂ صف میں ومبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد (61-6)

نبی ﷺ کے ساتھ بڑھا دی گئی۔

تاکہ حضرت محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کتبِ مقدسہ (تورات و انجیل) سے ثابت کی جا سکے۔

کاش تحقیق و علم کے مدعی مستشرقین قرآن پر اس اضافہ کا الزام عائد کرنے سے پہلے

یہ تو غور کر لیتے کہ ان کے موجودہ مقدس صحیفے (تورات اور انجیل) تو پہلے ہی محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کر رہے ہیں اور یہ وہ صحیفے ہیں جنہیں اربابِ استشراق غیر منحرف مانتے ہیں اگر یہ لوگ نا انصاف نہ ہوتے تو تورات و انجیل کی طرح قرآن حکیم کو اضافے یا تحریف سے پاک و صاف مانتے ورنہ انہیں یہ بات تسلیم کرنا ہو گی کہ اگر قرآن حکیم اضافات اور الحاق سے ملوث ہے تو پھر تورات و انجیل کا دامن بھی اس نقصِ صریح سے مبرا نہیں۔ آثار و قرائن یہ کہتے ہیں کہ مستشرقین موجودہ تورات و انجیل کی اصل صورتِ حال سے واقف ہونے کی وجہ سے اپنی کتابوں میں تحریف کے دفاع میں قرآن حکیم پر بھی تحریف کا الزام لگانے میں سبقت اختیار کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ صحابہ کرام نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد قرآن مجید میں آیت "یاتی من بعدی اسمہ احمد (6-61)اس لئے بڑھا دی کہ اس کی نظریاتی قوت سے مسلمانوں کو دینی اور سیاسی مفاد حاصل ہو آپ ہی بتایئے ایسی تضاد بیانی پر علم و دانش کیوں نہ تبرا کریں گے۔

تاریخی استدلال

غور فرمایئے وہ صحابہ کرام جنہوں نے چشم زدن میں قیصر و کسریٰ کو ان کے موروثی تخت سے دھکیل کر اس پر خود تسلط جما لیا ہو' وہ اپنی سیاسی قوت کے لئے انجیل سے ایک آیت کی بھیک کیوں مانگنے لگے؟ یہی نہیں بلکہ ان کے سامنے بلا جبر بقائمی ہوش حواس بے شمار مسیحی صلیب کا پھندا پھینک کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ وہ صحابہ کرام جنہوں نے عیسائیوں کے ساتھ دوسرے ملکوں کو بھی اپنا مطیع و فرماں بردار بنانے میں وقت کی طنابیں اپنے ہاتھوں میں لے لیں تھیں' ان تاریخی دلائل کی روشنی میں ہر عقلِ سلیم کے مالک کو ماننا پڑے گا کہ مسیحی ملکوں پر مسلمانوں کا سیاسی اقتدار علمی طور پر مستشرقین کے اس الزام کا بہترین رد ہے۔

زمانۂ اولیٰ میں عیسائیوں پر مسلمانوں کا اقتدار اور سیاسی اور علمی عروج دونوں حیثیتوں میں نا قابلِ تردید حقیقت ہے۔ اس کے برعکس موجودہ تورات و انجیل کے تقدس کا دعویٰ اور قرآن حکیم میں تحریف' ایسا دعویٰ ہے جس کی کوئی منطقی دلیل نہیں دی جا سکتی۔ اسی طرح ان دونوں کتابوں کے زور بیان سے فائدہ اٹھانے کے لئے قرآن مجید میں اضافہ کرنے کی بھی تاریخ کے حوالے سے کوئی شہادت پیش نہیں کی جا سکتی ہے اور نہ ہی عقل و دانش اس کی تائید کرتے ہیں۔

مستشرقین کی الزام تراشی اور قرآن حکیم

مستشرقین قرآن مجید میں اضافہ کے بارے میں دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔
(الف) وہ مدعیانِ اضافہ جو مذہباً" مسیحی اور عادتاً" سخت متعصب انتہا پسند لیکن تعداد میں بہت کم ہیں۔
(ب) مسلکاً" عیسائی لیکن قرآن مجید میں کسی اضافے کو تسلیم نہیں کرتے لیکن ان کی تعداد اول الذکر لوگوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ ہے۔ اور یہی وہ گروہ ہے جو برملا سرِعام یہ کہتا ہے کہ آج جو قرآن مجید ہمارے سامنے ہے۔ وہ محمد ﷺ نے اپنی زندگی میں ہی مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا البتہ ان علماء کو آیتوں یا سورتوں کی تقدیم و تاخیر میں ضرور اختلاف ہے مگر یہ بحث ہمارے موضوع سے لا تعلق ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ جن مسلمان اہلِ قلم نے علوم قرآن مجید کی شرح اور تفسیر پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے ترتیب آیات اور سورتوں کی بحث کو بھی تشنہ نہیں رہنے دیا۔
اس موقع پر ہماری ذمہ داری صرف اتنی ہے کہ ہم ان مستشرقین کی تحقیق کا خلاصہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیں جو اس مسئلہ میں ہماری ہی تائید کرتے ہیں۔ کیوں کہ مصری ناقد اور ان کے ہم نوا صرف مستشرقین ہی کی علمی تائید سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔
اس جھگڑے میں سر ولیم میور نے اپنی تالیف حیات محمد ﷺ میں جو کچھ لکھا ہے۔ وہ یقیناً ان لوگوں کے لئے سرمایہ تسکین ثابت ہو گا جو تاریخ کے ساتھ اپنے ضمیر کو بھی نا انصافی سے مستثنیٰ رکھنا چاہتے ہیں۔
سر ولیم میور مستشرق ہونے کے باوجود مسیحیت کے اتنے بڑے مبلغ ہیں کہ اگر ان کا بس چلتا تو ساری دنیا کے گلے میں صلیب لٹکا دیتے۔ ان کی اس انتہا پسندی کی گواہ ان کی اپنی تصنیفات ہیں۔ اس سے جتنا بھی ممکن ہو سکا نبی اکرم ﷺ اور اسلام میں نقص اور راہ نکالنے کی کاوش زندگی بھر ترک نہیں کی۔ اس کے باوجود یہی ولیم میور لکھتا ہے۔
"ارکانِ اسلام کی بنیاد اس مقدس وحی پر مبنی ہے۔ جس کا کوئی حصہ روزانہ ہر ایک نماز میں پڑھنا واجب ہے۔ نماز کے بعض ارکان میں اس مقدس وحی کی تلاوت فرض اور بعض میں سنت ہے اور زمانۂ اولیٰ سے ہی اس پر تعامل تھا اور ہے اور دین اسلام کے تمام احکام مسلمان اسی مقدس "وحی" سے مستنبط کرتے ہیں۔
اس طرح نماز میں قرآن حکیم کی آیات یا سورت پڑھنے کے لئے زمانۂ اوّل کا ہر مسلمان قرآن مجید کا کوئی نہ کوئی حصہ حفظ کر لیتا جسے وہ اپنی زندگی کا سب سے زیادہ عظیم سرمایہ سمجھتا۔ عرب کے رہنے والوں کے لئے قرآن حکیم کی آیات حفظ کر لینا اس لئے بھی بہت آسان تھا کہ ان کے حافظے اشعار، نسب نامے اور روایات حفظ کرنے کے زمانہ

جاہلیت سے ہی عادی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لکھنے اور پڑھنے سے بالکل ناواقف تھے۔ ان کے حافظے ان کی کتابوں کے اوراق اور عبارات تحریریں ہوتی تھیں اور محمد ﷺ کے تمام فرماں بردار صحابہ انہیں اوصاف کے مالک تھے۔ انہیں قرآن مجید کی آیات ان کے محلِ نزول کے ساتھ اس طرح حفظ ہوتیں کہ جب وہ چاہتے انہیں حرف بحرف دہرا لیتے۔

مگر ہم عرب کی اس مافوق الفطرت قوتِ حافظہ کو تسلیم کرنے کے باوجود یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ اسی طاقت کے بل بوتے پر پورا قرآن حکیم محفوظ رہ گیا۔ بلکہ ہمارے سامنے دلائل ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ محمد ﷺ کے اصحاب میں اکثر ایسے بھی تھے کہ جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کی اپنی زندگی میں قرآن مجید کی مکی متفرق سورتیں املا بھی کر رکھی تھیں۔ جن کے مجموعہ میں تقریباً سارا قرآن کریم سمٹ آیا تھا یہی نہیں بلکہ نبوت سے پہلے ہی اہلِ مکہ کا لکھنے اور پڑھنے سے واقف ہونا بھی ثابت ہے۔

جنگ بدر میں مکہ والوں میں سے جو لوگ گرفتار ہو کر آئے تھے۔ ان میں کچھ ایسے غریب قیدی بھی تھے۔ جو اپنی رہائی کا ہدیہ مال کی صورت ادا نہیں کر سکتے تھے۔ مگر وہ لکھنا اور پڑھنا جانتے تھے۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ محمد ﷺ نے مکہ کے ایسے غریب پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ تو یہ معاہدہ کیا کہ ان میں سے ہر شخص اتنے آدمیوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دے چنانچہ اس معاہدہ کے تحت مسلمانوں میں سے بے شمار افراد نے لکھنے اور پڑھنے میں مہارت حاصل کر لی۔ کیوں کہ اہلِ مدینہ تہذیب و تمدن میں مکہ والوں سے بہت زیادہ پیچھے تھے۔ اگرچہ ان میں سے بھی چند افراد اسلام لانے سے پہلے فنِ کتابت کے ماہر تھے۔

یہ امر اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ قرآن شریف کی جو آیات اور سورتیں مسلمانوں کے حافظہ میں نقش ہو چکی تھیں۔ وہ کتابت کی شکل میں بھی مسطور ہوتی گئیں۔

پھر یہ بھی تائید ہے کہ بدوی قبیلوں میں سے جو لوگ اسلام قبول کرتے رسول اللہ ﷺ ان کو تعلیم دینے اور دیگر مسائل کی راہنمائی کے لئے اپنے اصحاب ہی سے ایک یا زیادہ جتنے معلموں کی ضرورت محسوس فرماتے ان قبیلوں میں بھیج دیتے۔

اور یہ بھی ثابت ہے کہ محمد ﷺ کے معلمین یا مبلغین اپنے ساتھ ایسی تحریریں بھی لے جاتے جن میں اسلام کے اصول و قواعد لکھے ہوئے ہوتے۔ ظاہر ہے کہ ان مبلغین کی تحریری دستاویز بھی قرآن مجید ہی تحریری صورت میں ہوتا۔ خصوصاً وہ آیات جو اشاعتِ اسلام کے لئے مخصوص ہیں۔ اور وہ آیات بھی جن کا نماز میں دہرانا بہت ضروری ہے۔

چنانچہ قرآن مجید فرقان حمید خود بھی اپنی کتابت کی نص فرماتا ہے کتب سیرت میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔ جیسا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا واقعہ ہے۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ رضی اللہ عنہا کے پاس قرآن مجید کی سورہ طہ املا شدہ شکل میں تھی اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہجرت سے تین یا چار سال پہلے ایمان لائے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب مسلمان تعداد میں کم تھے اور مظلومیت کا بہت بری طرح شکار تھے۔ قرآن مجید کی کتابت اس وقت بھی رائج تھی۔ ان تمام حقائق کی موجودگی میں اس صداقت کو تسلیم کرنے میں کون سی بات مانع ہو سکتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اقتدار کے زمانۂ عروج میں قرآن حکیم کے متعدد نسخے کتابت کرا لئے تھے۔ خصوصاً جب کہ قرآن مجید ہی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قانون بھی تھا اور اس کے اوراق اطراف و اکناف کے ممالک میں بھجوا دیئے ہوں۔

حضرت محمد علیہ الصلوٰۃ و السلام کی زندگی میں قرآن مجید ان دونوں شکلوں میں موجود تھا۔ اور رحلت کے ایک سال بعد تک اسی طرح رہا یعنی (الف) حافظوں کے سینوں میں۔ (ب) مختلف لکھے ہوئے اجزاء میں" اس کے ساتھ دن بدن دونوں طریقوں میں توسیع ہوتی گئی۔

لہذا کیوں کر تسلیم کر لیا جائے کہ قرآن حکیم کی ان دونوں صورتوں (حفظ اور سطر) میں تطابق نہیں تھا۔ جب کہ قرآن مجید حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سب سے عزیز ترین سرمایہ تھا اور مسلمان اسے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کا کلام سمجھتے تھے۔ ایسے حالات میں اگر کسی کو اس کے متن میں شبہ ہوتا تو فوراً بارگاہ رسالت میں حاضر ہو جاتا۔ اور تصحیح و تصدیق حاصل کی جاتی جیسے کہ عمرو بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ کا معاملہ ہے۔

اب اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد صحابہ کرام کا قرآن مجید کی آیات میں اختلاف ہوتا تو وہ اس کا حل تین صورتوں میں کرتے۔

(1) کتابت شدہ اجزاء سے۔

(2) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے زیادہ قریب رہنے والے صحابہ سے مذاکرہ۔

(3) کاتبین وحی سے مراجعہ کرتے

چنانچہ جنگ یمامہ میں جب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کا آغاز تھا۔ دوسرے مسلمانوں کے علاوہ اس جنگ میں بے شمار حفاظ کرام بھی شہید ہو گئے۔ جس سے متفکر ہو کر عمر رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اللہ نہ کرے اگر بقیہ حافظ بھی کسی اور لڑائی میں شہید ہو گئے تو پھر کیا ہو گا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ قرآن مجید کو ایک جگہ جمع کروا

لیں۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس رائے سے اتفاق کرتے ہوئے جن صحابہ رضی اللہ تعالیٰ اجمعین کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی حیات میں وحی کی کتابت پر مقرر کر رکھا تھا۔ ان سب کو بلوایا اور زید بن ثابت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔ آپ مرد عاقل اور نوجوان ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو آپ پر اعتماد ہے۔ آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ان کی ہدایت کے مطابق وحی الٰہی کی کتاب کرتے رہے ہیں۔ براہِ کرم پورے قرآن مجید کو ایک جگہ جمع کر دیجیے۔

لیکن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ سن کر گھبرا گئے۔ انہیں خیال گزرا کیا یہ کام مجھے کرنا چاہیے اور کیا یہ شریعت میں جائز ہے؟ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طریقہ سے ان سے کروایا نہیں؟

لیکن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مسلسل اصرار پر زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس پر رضامند ہو گئے اور انہوں نے اس عظیم مہم کو اس طرح ترتیب دیا کہ جس شخص کی تحویل میں جو جو اجزا تھے۔ ان سے لے کر یک جا کر لئے جائیں۔

ان اجزا کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں۔

(1) کچھ املا کی صورت پتوں پر تھے۔

(2) کچھ املا کی صورت سفید پتھروں پر تھے۔

(3) کچھ حفاظ کے سینوں میں تھے۔

اور بعض روایات میں

(4) وہ چمڑے اور ہڈیوں پر لکھے ہوئے تھے۔

غرض زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک ایک تحریر کو جمع کیا اور حفاظ قرآن کریم کو اپنے گرد و پیش بٹھا کر دو یا تین سال میں یہی قرآن مجید جو ہمارے ہاتھوں میں ہے ترتیب دیا۔

"یہی نسخہ اس ترتیب کے مطابق ہے۔ جو زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ لکھ کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے (روبرو) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنایا کرتے تھے۔

زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مرتب کیا ہوا یہ نسخہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حفاظت کی غرض سے اپنی صاحبزادی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیوی (ام المومنین) حفصہ رضی اللہ عنہا کی سپردگی میں دے دیا۔ اور جب عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تو اسی نسخہ کو مدارِ صحت پر مکمل قرار دیا۔

البتہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے جمع کردہ قرآن حکیم سے پہلے چند آیات میں یا تو اختلاف

قرات یا نسخ کی وجہ سے فرق تھا۔ جس کی وجہ سے بعض مسلمانوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ قرآن حکیم تو ایک ہی ہے پھر یہ فرق تحریر کیوں؟ حتیٰ کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عہد خلافت میں جناب ابو حذیفہ آرمینیہ اور آذر بائی جان کی لڑائی میں شریک ہوئے جہاں عراق اور شام کے مسلمان بعض آیات کی مختلف طریقوں سے قرآت کرتے تھے۔ ابو حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس صورت حال سے پریشان ہو گئے اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے درخواست کی کہ اس معاملہ میں مسلمانوں کی راہنمائی کیجئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بھی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی کتاب میں تغیر و تبدل کا شکار ہو جائیں۔ اس پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں قرآن حکیم کاتب کا فریضہ انجام دیتے رہے ان کو اس سلسلہ میں تعاون کرنے کے لئے فرمایا۔ اور ان کی اعانت کے لئے قریش کے دو اور صاحب بصیرت ان کے سپرد کیے اس کے ساتھ ہی (ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا) کی تحویل میں موجود نسخہ کو حاصل کرکے ان کے سپرد کیا۔

اس نظر ثانی میں علمائے قریش نے مروجہ آیات اور قرائتوں سے ایک ایک آیت کا پہلے نسخہ سے مقابلہ کیا۔ جہاں حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوسروں سے قرائت میں مختلف ہوتے آخری فیصلہ کا حق انہیں کا ہوتا۔

صرف قریش کو اس مہم پر مامور کرنے کا مقصد محض یہ تھا کہ قرآن حکیم ان ہی کے لب و لہجہ میں نازل ہوا تھا۔ اگرچہ کہنے کو کہا جاتا ہے کہ قرآن سات قرائتوں میں نازل ہوا۔ لیکن عہدِ عثمانی میں قرآن مجید پر پھر نظر ثانی ہوئی اور عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کی تکمیل کے بعد آخری فیصلہ شدہ قراتوں کے ساتھ کئی نقلیں کرا کے تمام ممالکِ محروسہ میں ارسال کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے تمام نسخوں کو جلوا دیا۔ جو حضرت حفصہؓ کے نسخہ سے مختلف تھے تاکہ اختلافات کا سلسلہ ہی ختم ہو جائے۔

آخری اعتراض عقل کے سرا سرا خلاف ہے۔ خاص طور پر بنو امیہ اور شیعانِ علی کے مناقشات پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ شدید اختلافات کے باوجود سب اسی قرآن حکیم پر متفق رہے۔ جسے بعد میں لوگوں نے صحیفہ عثمانی نامزد کیا۔ نہ صرف یہ بلکہ آج تک تمام فرقے قرآن مجید کی صیانت اور عصمت پہ متفق ہیں۔

پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جناب عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں عہدوں میں اسی قرآن مجید پر اتفاق کیا گیا اور پھر یہ بھی سب مانتے ہیں کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں موجود تھے یعنی ان دونوں زمانوں میں یہی قرآن حکیم علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قبول کیا اور اس پر کبھی کوئی اعتراض

نہیں کیا۔

سوچئے تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تحرفِ قرآن حکیم سے کیا مفاد ہو سکتا ہے۔ خصوصاً جب کہ ایسے اقدام کے نتیجہ میں مسلمانوں کی برہمی لازمی ہو سکتی تھی۔

علاوہ ازیں عہدِ عثمانی میں جب قرآن حکیم نظرِ ثانی کے بعد شائع کیا گیا۔ تو اس وقت ان مسلمانوں کی کثیر تعداد موجود تھی۔ جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسی طرح قرآن مجید سنتے رہے جس طرح عہد عثمانی میں دوبارہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں شائع کیا گیا اور اس پر صحابہ میں سے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عصمت پر قرآن حکیم میں آیات نازل ہوئی ہوتیں۔ جن پر خود جناب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی مصلحت کی بناء پر خاموش رہے تو ان کے حامی انصار اور دوسرے مسلمان ہی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف اس معاملہ کی بنا پر احتجاج کرتے۔

لہٰذا "ولیم میور" کی ان دو معارضات سے متعلق تحریر کردہ عبارت سے ثابت ہوتا ہے کہ موجودہ قرآن حکیم میں کوئی ایسی آیت نظر انداز نہیں کی گئی جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی عصمت پر دال ہو۔

آپ ہی غور کیجئے جب عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات ہو گئی تو اس کے بعد علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں بیعت ہوئی جو اس بات کی ٹھوس اور ناقابلِ تردید دلیل ہے کہ اس وقت اختیار و اقتدار مکمل طور پر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حاصل تھا۔ اس وقت کیا آپ کی عقل یقین کر سکتی ہے خود علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا ان کے اصحاب ناقص قرآن حکیم پر صبر کر لیتے اور ناقص بھی ایسا جس میں ان کے امام علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فضیلت و عظمت پر مبنی آیات قلم زد کر دی گئی ہوں؟ سوال یہ ہے کہ محبانِ علی اس ناقص قرآن پر متفق ہو گئے جو ان کے پیشواؤں کے مقاصد بیان کرنے میں ناقص قرار دیا گیا تھا۔ بلکہ تاریخ شاہد ہے کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اصحاب اسی قرآن حکیم کو دینی دستاویز سمجھ کر پڑھتے رہے ان کے علاوہ ان کے مخالف فریق بھی اسی قرآن پاک کی تلاوت کرتا لیکن کسی کو کوئی کمی یا زیادتی محسوس نہ ہوئی۔ حقائق صرف یہی نہیں بلکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے عہدِ خلافت میں اسی قرآن حکیم کو پھیلانے کا فرمان جاری کیا اور اس کے بہت زیادہ نسخے نزدیک و دور بھجوائے۔ حتیٰ کہ خود بھی اپنے ہاتھوں سے اسے کئی بار لکھا۔

البتہ یہ اعتراض صحیح ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے وقت کے متفقہ علیہ جمع کردہ

قرآن حکیم کے علاوہ دوسرے تمام نسخے تلف کر دینے کا حکم دیا جسے بے انصافی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اس دور میں کسی نے عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ الزام تو نہیں لگایا کہ انہوں نے قرآن حکیم میں کوئی تحریف کی ہے اگر ایسا ہوتا تو یہ بات راز نہ رہتی۔ شور مچتا۔ جس طرح دوسرے تمام واقعات کے خدوخال تاریخ میں محفوظ ہیں۔ ثابت ہوا کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ الزام بعد کے شیعانِ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے لگایا ہے۔ مذکورہ دلائل کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصحفِ عثمانی اور زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس نسخے میں بالکل کوئی اختلاف نہیں تھا۔ جس میں زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن کی مختلف صورتوں سے ہٹ کر صرف قریش کے لہجہ قرآن کو اولیت دی۔

اس کے بعد ایک اور سوال قابلِ حل رہ جاتا ہے۔ کیا زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ترتیب دیا گیا قرآن حکیم بعینہٖ وہی تھا۔ جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر صورتِ وحی نازل ہوا؟ اس کا جواب اس کے بعد آنے والی چار صورتوں میں ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تدوین کردہ نسخہ اس حد تک صحیح ہے جس حد تک اکمال و صحت دونوں کا امکان ہو سکتا ہے۔

صُورتِ اول

زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ نسخہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نگرانی میں مرتب کیا اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وہ سچے مخلص مطیع و جاں نثار تھے جن کا ایمان یہ تھا۔

(الف) قرآن حکیم آسمان سے نازل شدہ مقدس کلام ہے۔

(ب) وہ النبی خاتم علیہ الصلوٰۃ و السلام کے عہد رسالت میں مسلسل بیس سال شب و روز آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ رہے۔

(ج) خود ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں بے طمع، سادہ اور امتِ مسلمہ کی اصلاح و بہبود کے لئے انتہائی احسن اور حکیمانہ انداز میں اپنا منصب انجام دیا۔ لہٰذا ہمارے پاس ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کردار کی مذکورہ وہ خصوصیات موجود ہیں جن کی موجودگی میں قرآن کریم جمع کراتے ہوئے ان پر کسی قسم کی بدگمانی کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ صدقِ دل سے یہ ایمان رکھتے تھے کہ قرآن کریم اللہ رب العزت کی طرف سے ان کے رسول ان کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر وحی کی صورت میں نازل ہوا۔ یہی ان کا پختہ عقیدہ اس عمل میں بھی محرک تھا جس کی رو سے قرآن حکیم کے جمع کرنے اور ترتیب

دینے میں انہوں نے کمال صحت کے ساتھ مکمل توجہ دی اور یہی عقیدہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سرمایہ ایمان تھا' اسی کے تحت قرآن حکیم (موجودہ میں) مدون ہوا۔ جس زمانے میں قرآن مجید ترتیب دیا گیا۔ اس عہد کے ہر مسلمان کا یہی عقیدہ تھا۔ جن مسلمانوں نے کاتب وحی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے ساتھیوں کی اس سلسلہ میں ہر ممکنہ امداد کی یعنی ہر اس شکل میں جو ان کے پاس موجود تھا۔ وہ انہوں نے پیش کر دیا۔ اور جنہیں جتنا حفظ تھا۔ انہوں نے مذکورہ مجلس میں حاضر ہو کر اسی طرح انہیں سنا دیا۔ جن کی تحویل میں ہڈیوں یا درختوں کے پتوں پر آیات لکھی ہوئی تھیں' انہوں نے وہ ٹکڑے اسی طرح حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں پیش کر دیئے' ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرح یہ مسلمان بھی اپنے دلوں میں اس احساس کو پوری طرح اپنے دلوں میں بسائے ہوئے تھے کہ ان کے سامنے نبی محمد علیہ الصلوٰۃ و السلام نے جو کچھ اللہ تعالیٰ کی وحی کہہ کر پڑھا ہے اس کے بتانے یا ظاہر کرنے میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی نہ ہونے پائے۔ وہ سچے دل سے اسے اللہ تعالیٰ کا مقدس کلام سمجھتے اور مانتے تھے۔ پھر جب یہی قرآن عظیم ایسے لوگوں کو عذاب الٰہی سے ڈراتا ہے۔ جو اللہ تعالیٰ پر من گھڑت الزام لگاتا ہے جھوٹی باتیں منسوب کرتا ہے۔ تو اس پر ایمان رکھنے والے اسے وحی الٰہی ماننے والے اس میں کمی یا زیادتی کرنے کی جرات کیسے کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنا تو ایمان کی نفی ہے۔

دوسری صورت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے دو تین سال بعد ہی قرآن کریم کے انہیں قاریوں کو خلفاء اپنا قومی سرمایہ سمجھتے اور انہیں اپنے زیر نگیں ممالک میں اسلام میں اقامت دین اور تبلیغ کے لئے بھیجتے' کیا عہد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان حفاظ قرآن کریم اور زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان قرآن کریم جمع کرتے وقت واسطہ رہا ہوگا یا نہیں؟ یقیناً رہا اور یہی وہ شواہد ہیں جن سے ہمیں یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت ہر مسلمان ہر فرد انتہائی بے لوث اور انتہائی پر خلوص ہوتا تھا۔ ان سب کی موجودگی کے ساتھ تمام ذرائع اور وسائل بھی موجود تھے۔ ان سب کی اجتماعی مخلصانہ کوششوں نے اپنی لازوال کتاب قرآن حکیم کو پوری صحت اور احتیاط کے ساتھ مکمل کیا۔

تیسری صورت:۔

قرآن مجید کی صحت تدوین و ترتیب میں مذکورہ دونوں صفات کی موجودگی پر ہمارے سامنے یہ دلیل بھی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اطاعت گزاروں نے اپنے نبی

ﷺ کی زندگی میں ہی قرآن مجید کے کسی نہ کسی حصہ کی املا کر لی تھی۔ جس کی دوسری نقلیں ایک دوسرے مسلمان کے پاس ہونا قابل تسلیم ہے۔ غالب گمان یہ ہے کہ اس دور کے جتنے مسلمان بھی نوشت و خواند سے واقف تھے ان کے پاس قرآن مجید کے تحریری نسخے یقیناً ہوں گے۔

اس دلیل کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ قرآن مجید کے ایسے اجزاء زید بن ثابتؓ کے جمع کردہ نسخے میں ضرور شامل ہوئے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ زید رضی اللہ عنہ کا مرتب کیا ہوا نسخہ اسی دور میں قرآن کریم پڑھنے اور لکھنے والوں کے دلوں پر بھی منقش تھا۔ اور مادی چیزوں مثلاً ہڈیوں، درختوں کے پتوں وغیرہ پر پہلے سے لکھا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مرتبہ نسخہ پر اس دور کے ہر جاننے اور پڑھنے والوں نے پورا اتفاق کیا۔ حتیٰ کہ اگر کسی کے پاس قرآن کریم کا لکھا ہوا کوئی حصہ رہ گیا۔ تو اس نے دیکھ کر کہا یہ قرآن حکیم میں شامل ہو چکا ہے۔ اس کی جگہ زید رضی اللہ عنہ کے جمع کردہ نسخہ کو قابل وثوق سمجھا۔

صحابہ کرام میں سے کسی نے بھی یہ نہیں لکھا کہ زید رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھ مل کر جمع کرنے والوں نے قرآن مجید کے فلاں ٹکڑے یا اس آیت یا لفظ جس کی اصل یا نقل ہمارے پاس محفوظ ہے۔ نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ صحابہ کرام میں سے کسی ایک نے بھی زید رضی اللہ عنہ کے مرتب کردہ قرآن حکیم سے کوئی اختلاف نہیں کیا۔ اگر اختلاف ہوتا تو حدیث کی ان کتابوں میں ہمیں ضرور ملتا۔ جن میں محمد ﷺ کے ایسے اقوال و افعال کی تفصیل موجود ہے جن کا تعلق اہم امور سے بھی نہیں۔

چوتھی صورت:۔

قرآن مجید کی ترتیب خود اس کی گواہ ہے کہ جامعین نے اس میں پوری ذمہ داری اور دقت نظر سے کام لیا ہے۔ اس کی مختلف سورتیں اس سادگی سے ایک دوسری کے ساتھ مربوط کر دی گئی ہیں۔ جن کی ترتیب دیکھ کر کسی تصنیفاتی تکلف کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ یہ امر اس بات کا بین ثبوت ہے کہ قرآن مجید جمع کرنے والوں کے پیش نظر تصنیف کی شوخی اور فنی سجاوٹ کی داد تحسین حاصل کرنا نہ تھا بلکہ ان کے دلوں میں ایمان و اخلاص کا سچا اور پکا جذبہ کار فرما تھا۔ اور اسی پر خلوص پختہ تر ایمان کے ولولوں میں وہ نہ صرف سورتوں بلکہ آیتوں کی ترتیب میں بھی تصنع سے اپنا دامن بچا کر نکل گئے۔

حاصل کلام ہم پورے شرح صدر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عہد عثمان رضی اللہ عنہ میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قرآن کریم کی جس صورت میں نظر ثانی فرمائی۔ وہ نہ

صرف حرفاً حرفاً صحیح ہے۔ بلکہ اس کے جمع کرنے کے موقع پر جو اتفاقات یک جا ہوتے گئے۔ ان کی رو سے بھی یہ نسخہ اس قدر صحیح ہے کہ نہ تو اس میں سے کوئی آیت وحی او جھل ہو سکی اور نہ ہی جانبین نے از خود کسی آیت کو قلم انداز کیا۔

ثابت ہوا کہ یہی وہ قرآن حکیم فرقان حمید سے جسے مہبط وحی محمد ﷺ نے پوری دیانت' امانت اور بے انتہا محنت کے ساتھ دوسروں کو سنایا۔ دوسروں تک پہنچایا۔ دوسروں کو سمجھایا۔

سرولیم میور کی تالیف حیات محمد ﷺ سے اس طویل اقتباس کو پیش کرنے کے بعد ہم ان مستشرقین کی رائے نقل کرنے سے مستثنیٰ ہو چکے ہیں۔ جنہوں نے قرآن کریم کی صیانت و کمال و صحت کے متعلق موصوف میور ہی کی تائید کی ہے۔ ان میں سے پادری لامنس اور ون ہامر ہیں دونوں مولف پوری قطعیت کے ساتھ میور کی تصدیق کرتے ہیں۔ کہ یہی قرآن مجید ہے جسے صاحب قرآن محمد ﷺ نے اپنے رب کی وحی صادقہ سمجھ کر دوسروں کو سنایا اور سمجھایا۔

البتہ ان مسیحی مستشرقین کی بڑی مختصر تعداد ایسی بھی ہے جو قرآن مجید کی تحریف پر تو مائل ہے لیکن ان لوگوں کے پاس سرولیم میور اور ان کے سوا دوسرے کثیر التعداد مستشرقین کے دلائل کا کوئی جواب نہیں جو انھوں نے تاریخ اسلام یا علماء سے حاصل کیے ہیں۔

اپنے ہاتھ اپنے دشمن

ان کج فہم لوگوں کا کیا علاج کیجئے جو اسلام اور صاحب رسالت اسلامیہ کے خلاف دلی کینہ سے بے بس ہو کر ایسے الزامات لگانے میں پیش پیش ہیں۔ جو علمی تحقیق کے بل بوتے پر ایسی مذموم حرکتوں کا ارتکاب کرتے ہیں نہ اپنے ان بے تحقیق نظریوں سے عام مسلمانوں کو فریب میں لا سکتے ہیں۔ البتہ چند بے راہ رو نوجوان برائے نام مسلمانوں نے اپنے دلوں میں اس بات کی گرہ لگا رکھی ہے کو تحقیق جدید کو اس سانچے میں ڈھالنا چاہیے جس کی مدد سے اپنی قدیم مسلمات سے انکار کرنا آسان سے آسان تر ہو جائے۔ وہ بھی محض فرضی دلائل اور دور از مقصد اوہام کی سرپرستی میں جن کے بل بوتہ پر وہ دیدہ دلیری سے اسلام پر ایسی تہمتیں تراش لیتے ہیں جن پر تاریخ اور علم دونوں سر پیٹ لیں۔

اغیار کی رائے

قرآن کی صیانت و اکمال پر سرولیم میور اور دوسرے مستشرقین کی بجائے تاریخ اسلام

اور مسلمان ارباب کے دلائل بھی پیش کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان کی جگہ ہم نے ایک مستشرق کے دلائل اس لئے پیش کئے تاکہ ہمارے مصری نوجوان مسئلہ زیر بحث میں علمائے مغرب کی تحقیق سے تسکین دل حاصل کر سکیں؟ جن کی رائے کو وہ بلاچوں و چرا تسلیم کرنے کے عادی ہیں۔ اگرچہ ہر مسئلہ میں دقتِ نظر اور حسنِ نیت کسے ساتھ حقیقت تک پہنچا جا سکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کوئی اہلِ تحقیق ہر قسم کی جانبداری اور اغراض و مقاصد سے علاحدہ ہوئے بغیر اپنی ذمہ داری سے کماحقہ' عہدہ بر آ ہو ہی نہیں سکتا۔ ہر محقق کے لئے خارجی اثرات سے بچ کر منزلِ مقصود تک پہنچنے کا ہی ایک اصول اختیار کرنا لازم ہے۔ مستشرقین کبھی تو اس اصول پر پورے اترتے ہیں اور کبھی ادھر ادھر بھٹک جاتے ہیں اور نشانِ منزل کھو دیتے ہیں۔ خصوصاً ایسے مسائل جن کا تعلق نبیٔ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی سے متعلق ہو اور جنہیں ہم نے اپنی اس کتاب میں پوری تحقیق و تلاش کے بعد واضح کیا ہے۔

اس مقام پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ پہلے محقق کو خود کسی بحث میں نفی یا اثبات دونوں میں سے کسی ایک پر اس حد تک مطمئن ہو جانا چاہیے کہ اس کو اپنی تحقیق اور آموختہ علم پر کوئی شبہ نہ رہے۔ اسی طرح ایک مؤرخ کا بھی فرض ہے کہ دوسرے علوم و فنون میں جس طرح تحقیق کا دامن پھیلانا ضروری ہے۔ اسی طرح وہ بھی کسی امرِ واقعہ کی چھان بین میں تمام اطراف و جوانب پر بنظرِ غائر دیکھے پھر خود رائے قائم کرے۔

اس معاملہ میں مستشرقین کی تالیف کے ساتھ خود علمائے اسلام کی تصانیف بھی شامل ہیں چاہے ان تالیفات کا تعلق علمِ طب، علمِ ہیئت، علمِ کیمیا یا کسی عنوانِ علم سے ہو۔ اربابِ نقد کا فرض ہے کہ ان دونوں طبقوں میں سے جس فریق کا نقص تحقیق میں آئے اس کے اظہار میں کوتاہی نہ کریں اور پیشِ نظر بحث کے مصدقہ مسائل کی تصدیق کرنے سے گریز نہ کریں۔

یہی طریقہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پر غور کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لئے کہ مؤرخ صرف ناقل ہی نہیں۔ بلکہ مؤرخ پر نقل کرنے کے ساتھ ساتھ تنقید کرنے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے تاکہ اس نقد و تبصرہ سے حقیقت کا حال کا انکشاف ہو۔ کیوں کہ تمحیص کا دارومدار ہی تنقید پر ہے۔ ایسے علم و معرفت کا عرفان نقد و بحث سے حاصل ہو سکتا ہے۔ قرآن حکیم کی صحت اور تکمیل کے بارہ میں جو کچھ ہم نے ولیم میور کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ اس کے بعد ہمارا خیال ہے کہ ہم ہر طرح کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے ہیں اور ہمیں یہ بھی یقین ہے کہ اس مصری مسلمان کے اعتراضات کا جواب بھی اسے مل

گیا۔ اسے یہ بھی علم ہو گیا کہ قرآن حکیم میں کوئی تحریف نہیں ہوئی اور اس بات کا علم ہو گیا ہو گا کہ رسول اللہ ﷺ کا اسم مبارک قثم یا قثامۂ تھا یا نہیں۔ ہمارے خیال میں تو مصری مسلمان کے الزامات کی حیثیت یوں بھی ہوائے نفس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں اس مصری مسلمان کے خفقان و خلجان کا علاج کرنا ضروری ہے۔ جس کے پیشِ نظر ہم اسی کے دوسرے الزام کو اپنا ہدفِ تنقید بنا رہے ہیں۔ موصوف اپنے اس الزام کو مستشرقین کی زبان میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

"آنحضرتؐ جن باتوں کو وحی کی باتیں کہہ کر اپنے اطاعت گزار مسلمانوں کو ہدایات دیتے تھے وہ دراصل ان کے مرض صرع کا کرشمہ تھا۔ جس کے دورہ سے وہ لرزنے لگتے منہ سے جھاگ اگلنا شروع کر دیتے۔ لیکن ہوش میں آنے کے بعد اللہ کی وحی کے نام سے کلام پیش کرتے۔ حالانکہ یہ سب صرع کی مرض کا نتیجہ ہوتا تھا۔"

صرع اور وحی کے اثرات میں فرق

رسول اللہ ﷺ پر وحی کے نازل ہونے کی کیفیتوں کو صرع سے تعبیر کرنا عملی طور پر نابکارانہ خطا ہے۔ حکماء اور طبیب اس سے متفق ہیں کہ صرع کے حملہ میں مریض کے ذہن میں کچھ آتا بھی ہے تو ہوش میں آنے کے بعد وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ بلکہ اس دورانیہ میں مصروع کی زبان پر کوئی بات نہیں آتی۔ اثنائے حادثہ میں اس کا شعور و فکر بالکل معطل ہو جاتا ہے۔ صرع کی علمی تحقیق کی وحی سے کوئی مشابہت نہیں۔ بلکہ اس کے برعکس نزولِ وحی کے عرصہ میں آپ ﷺ کی قوتِ مدرکہ جتنی حسّاس اور بیدار رہتی دوسرے انسانوں کے اندر کسی عالم میں اس کے شائبہ تک کے گمان کا بھی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ نبی رحمت ﷺ کے ذہن میں وحی کی تمام واردات پوری طرح محفوظ رہتی۔ جسے آپ عملِ نزولِ وحی کے اختتام پر صحابہ کرام کے سامنے بیان فرماتے۔ یہ ہے اللہ کی وحی جو رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوتی۔

پھر نزولِ وحی کے ہر موقع پر غنودگی لازم نہیں ہوتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات بیداری اور معمول کے حالات میں بھی وحی کا نزول ہوتا۔ جس کی مثال سورہ فتح کا نزول ہے۔ جس کا تذکرہ ہم شروع میں کر چکے ہیں۔ جو حدیبیہ کی صلح کے بعد اس وقت نازل ہوئی جب آنحضرت ﷺ اپنے جان نثار صحابہ کرام کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف لوٹ رہے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی وحی کی متذکرۃ الصدر علامات و کیفیات اور اثرات کی وضاحت کے بعد

نبی اکرم ﷺ کا دامن ان الزامات سے قطعاً مبّرا ہو جاتا ہے۔ اصل میں یہ افترا بھی ان چند عقل کے اندھے مستشرقین نے وضع کر لیا ہے۔ جو ہر قیمت پر جانی بوجھی سازش کے تحت حقیقت کو چھپانا چاہتے ہیں، سچائی کو شکست دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ اس فریب سے مسلمانوں کے دلوں میں رحمت للعالمین کی وقعت (نعوذ باللہ) کم ہو جائے۔ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی وحی کی شان و عظمت کو یہ عیب لگا کر اپنے مذموم ارادوں میں کامیابی حاصل کر سکیں اور لوگوں کو باور کرا سکیں کہ صادق امین محمد ﷺ جس کیفیت کو وحی بتاتے ہیں وہ صرع کی بیماری کا کرشمہ ہے۔

ہوسِ گناہ میں علم کی یہ توہین معاذ اللہ وحی کو صرع سے ملتبس دکھایا جائے! اس گروہ کے رہبرانِ مغرب اگر نیک ہوتے تو ایسی جاہلانہ بات ہی زبان پر نہ لاتے جو علم کے سراسر خلاف ہے۔ یہ عیارانہ الزام اس لئے لگایا کہ عوام تو صرع کے اسباب و نتائج اور کیفیات سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ہمارے منہ سے نکلی ہوئی بات وہ سچ مان لیں گے کیوں کہ ہماری تحقیق و انکشافات کی دھاک ان کے دل پر پہلے ہی بیٹھ چکی ہے۔ ہمارے کہنے کے بعد وہ اطباء اور کتبِ طب کی طرف رجوع کرنے کا خیال بھی دل و دماغ میں نہیں لائیں گے۔

ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ یہ خوش اعتقاد اگر تحقیق کے خوگر ہوتے تو خود ہی اپنے مرشدانِ مغرب کی ان عیّاریوں کا پردہ چاک کر کے کہتے! کہ عقل کے اندھو۔ رومانی نشاط اور عقلی اہزاز کی کیفیتیں صرع کے عالم میں بالکل پردۂ اخفاء میں رہتی ہیں۔ اور مصروع کو اس طرح بے بس اور بے اختیار کر دیتی ہیں کہ وہ مرض کے ہاتھوں کٹ پتلی بن جاتا ہے۔ اگر صرع کا حملہ شدید ہے تو دوسروں کو مارنے پیٹنے میں مصروف ہو جاتا ہے اور اسے احساس نہیں رہتا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ نہ ہی دوسرے پر حملہ کرتے وقت اور نہ ہی اس کے بعد۔ جیسا کہ گہری نیند میں چلنے کے مریض، جنہیں جاگنے کے بعد نیند کی حالت میں سرزد ہونے والی نقل و حرکت یا کلام کا تصور بھی نہیں رہتا۔

نیند میں چلنے اور پر اسرار حرکات کی بیماری مریض سے قتل تک کروا دیتی ہے۔ لیکن وحی کا کیف و سرور صرع اور نیند کی بیماری سے بالکل مختلف ہے۔ وحی کی کیفیت سے گزر کر جب صاحبِ وحی یک سو ہو جاتا ہے تو اثنائے وحی کی ہر کیفیت اس کے ذہن اور دل پر منقش رہتی ہے۔ اس لئے کہ صاحبِ وحی کو مقصدِ وحی کے مضمون کو اس شخص تک پہنچانا ہے۔ جسے ان کیفیات سے براہِ راست کوئی واسطہ نہیں۔

رہی مرگی (صرع) تو یہ انسانی ادراک و شعور کو معطل کر کے مریض سے وہ مقام بھی چھین لیتی ہے جس پر اس کے حملہ کی گھڑیوں میں بیٹھا یا کھڑا ہو سکتا ہے۔ لیکن وحی انسانی

روح کا وہ بلند مقام ہے۔ جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے انبیاء کو چنا ہے۔ جن کو یہ اعزاز اس لئے دیا گیا کہ وہ وحی کے ذریعہ حاصل ہونے والی تعلیم و ہدایات اور یقینی حقائق کو دوسروں تک پہنچائیں۔ جن کے بعض حصے تو ایسے ہیں کہ صدیوں کی علمی کاوشوں کے نتیجے میں ان کی حقیقت کا سراغ مل جاتا ہے اور کچھ ایسے حقائق بھی ہیں کہ قیامت تک ان کی گرہیں نہیں کھلیں گی تاہم ایسے حقائق کا سراغ یقینی مل جاتا ہے۔ جن سے صاحب ایمان حضرات تو لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں مگر جن کے دلوں پر مہر لگی چکی ہے۔ وہ اس سے کیوں کر فیض یاب ہوں؟

اگر مستشرقین وحی کے بارے میں یہ عذر پیش کریں کہ اب تک کوئی ایسا مسئلہ ہمارے سامنے مشاہدات و تجربات میں نہیں آیا تھا قیاس میں نہیں آیا۔ اس لئے علمی طور پر وحی کا تجزیہ کرنے سے ہم قاصر ہیں۔ تو ان کی اس توجیہہ کا منطقی اور علمی جواب یہ ہو گا کہ جس طرح علم کے بعض اجزا اور اجتماعی یا انفرادی طور پر ابھی تک تشنۂ تحقیق ہیں اسی طرح یہ بھی مان لیا جائے کہ وحی کے علمی تجزیئے کے لئے بھی ابھی وقت درکار ہے۔ اس طرح علم کو کسی صورت میں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ خصوصاً جب کہ دن رات کے مشاہدات اور دنیا و جہان کے موجودات ہر لحہ ہمارے سامنے ہیں۔ لیکن ہم ان کی ماہیت اور حقیقت کے چہرہ سے ابھی تک نقاب نہیں ہٹا سکے مثلاً سورج' چاند ستارے آسمان جن کی ماہیت پر دفتر کے دفتر لکھے جا چکے ہیں۔ مگر اس پر بھی ان کرّوں کے متعلق یہ انکشافات ذہنی اور فرضی نتائج کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ حالانکہ ہم آسمان کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور یہ تو دور بین کی مدد سے اس کے مخفیات (پوشیدہ اسرا) بھی لکھنے لگے ہیں۔

اسی طرح جو ایجادیں ایک صدی پہلے ہمارے خیالوں اور گمان میں پوشیدہ تھیں۔ آج وہ محسوس شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ مگر ایسے حقائق کے بارے میں آپ کون سی روش اختیار کریں گے جن کا تعلق صرف وجدان سے ہو؟ اور اب تک اہلِ علم اس حقیقت کے انکشاف کی تڑپ میں سرگرداں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ ان کا تجزیہ قطعیت کے درجہ تک نہیں ہو سکتا۔

علماءِ تحقیق کی تصانیف میں اس قدر مطالعہ کا ہمیں ضرور اتفاق ہوا ہے کہ وہ وحی کے انکشاف کے قریب پہنچ کر یہ اعتراف کر اٹھے کہ علمی طور پر اس مسئلہ کا تجزیہ نہیں کر سکتے۔

وحی کے تجزیہ پر اپنی عاجزی کا اعتراف بالکل اسی طرح ہے جس طرح اب تک بے

۵

شمار مادیات کی ماہیت و حقیقت ان کے گلے میں اٹکی ہوئی ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر ہم اسی طرح زندگی کے ایک جزو کا تجزیہ کرنے میں ڈوبے رہیں تو ہمیں علمی طور پر اسی محنت کا نتیجہ شاید نامرادی کے سوا کچھ نہ ملے۔

وحی کا تجزیہ موجودہ آلات سے ناممکن ہے

حضرت محمد ﷺ پر نزولِ وحی کے زمانہ میں جو مسلمان موجود تھے جب کوئی قرآن حکیم کی آیت اللہ کی طرف سے نازل ہوتی تو اسے سن کر ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو جاتا۔ اس زمانے میں موجود بعض افراد انتہائی دانا دیدہ ور اور صاحبِ فراست بھی تھے۔ یہود و نصاریٰ میں سے بھی کچھ علماءِ اسلام قبول کر چکے تھے۔ جو اسلام لانے سے پہلے نبیؐ کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے علمی مناظرے بھی کر چکے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد انہوں نے قرآن حکیم کو وحی کے ذریعہ اللہ کی طرف سے نازل کردہ اللہ کا کلام مانا' قریش میں سے وہ دانشور جو ابتدا میں نبی اکرم ﷺ کو مجنوں اور جادوگر یا جادو زدہ کہتے تھے۔ آخر اپنے کہنے اور کیے پہ سخت پشیمان ہوئے اور محمد ﷺ کے پیش کردہ دین کے پکے اور سچے اطاعت گزار بن گئے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی وحی کے خلاف کیا مجال جو ان کے دل و دماغ میں کوئی نازیبا خیال بھی آئے۔

ان تمام تاریخی شواہد کی موجودگی میں علم گوارا نہیں کرتا کہ وحی کو اس کی اصلیت اور عظمت و رفعت سے ہٹا کر اسے کسی اور نام سے موسوم کیا جائے یا محمد ﷺ کو رسالت کے بلند ترین منصب و مقام سے اتار کر کسی اور جگہ بٹھایا جائے۔

جس نیک فطرت مصنف کا مقصد حقیقت کی دریافت ہو وہ اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ علم جس طریق سے مادیات کی تحلیل کر سکتا ہے۔ اس انداز سے وحی کا تجزیہ ناممکن ہے۔ علم میں یہ قدرت ہی نہیں۔ وحی کی جو صفت اصحاب نبی ﷺ نے مقرر کی اور جو مرتبہ زمانۂ اولیٰ کے کاتبینِ قرآن مجید نے دیا سر مو بھی انکار نہیں کیا جا سکتا مگر جو شخص وحی کا منکر ہو اور اپنے انکار کو علم و تحقیق کے سہارے غلط وسائل سے کام لینے پر تلا ہو اس کے بد طینت اور دروغ گو ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ علم اور جھوٹ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔

حاسدانِ اسلام

حاسدانِ اسلام اپنے حسد کی آگ میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے اسلام کی بجائے اسلام کو پیش کرنے والی ذات ستودہ صفات علیہ الصلوٰۃ پر ہی حرف گیری پر اتر آئے' یہ اس بات کا

ثبوت ہے کہ دین اسلام کی سربلندی اور اس کے اصولوں کی سادگی اور ہمہ گیری کی وجہ سے دین اسلام کے قلعہ میں تو نقب زنی نہ کر سکے اس لئے دھوکہ باز دشمن کی طرح ادھر سے پینترا بدل کر اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے افضل و برتر نبی ﷺ کی طرف رخ پھیر لیا۔ جو ایک کمزور مقابل دشمن کا بزدلانہ حربہ ہے۔ یہ نہ صرف اربابِ علم کی شان کے منافی ہے بلکہ انسانی طبعی دستور کے بھی خلاف ہے۔ انسانی جبلت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ وہ اپنی ایسی منفعت کو مقدم سمجھے جو اس کے لئے خیر و برکت کا خزانہ بن سکے نہ یہ کہ جو سنے اس کے نفع کے لئے کار آمد ثابت ہو رہی ہے۔ اس کا منبع اور وسیلہ تلاش کرنے کا درد سر مول لے بیٹھے۔

مثلاً کسی نے درخت پر پھل لگا دیا' اس کا پھل پسند آ گیا' اب وہ احمق پھل حاصل کرنے کے بجائے وہ درخت کو زمین پر گرائے تاکہ اس کے ریشوں سے پھل کے ذائقہ کی مناسبت معلوم کر سکے۔ یہی مثال افلاطون اور اس کے فلسفہ' شیکسپیئر اور فن ڈرامہ' رفائیل اور اس کی صنعت و حرفت کے کمال میں پیش کی جا سکتی ہے۔ کہ اگر آپ لوگ مذکور علماء اور اہل فن جن کے کمالات انسانیت کو شرف و بزرگی حاصل کرنے میں راہنمائی کا مرتبہ حاصل کر چکے ہیں ان علماء اور فن کاروں کی ذات پر نکتہ چینی اس لئے نہیں کرتے۔ کہ مصنف اور موجد کا ذاتی نقص اس کی تصنیف یا ایجاد میں طعن کا سبب نہ بنے۔ اگر کوئی نکتہ چین یہ دلیری کر بیٹھے تو یقیناً وہ اپنے مقصد تک پہنچنے میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح ذاتی کینہ اور بغض کو تحقیق کے غلاف میں لپیٹ کر کسی شخصیت کو داغ دار ثابت کرنے کی کوشش کرنے والا کامیاب نہیں ہو سکتا البتہ ایسا حاسد اپنی ساکھ آپ کھو بیٹھتا ہے اور ہر عقلمند سمجھ جاتا ہے کہ یہ حاسد حقیقت کو مٹانے کی طفلانہ حرکت کر رہا ہے۔ ورنہ ہر حقیقت میں بذاتِ خود اتنی قوت موجود ہوتی ہے کہ وہ اپنے حاسد کا پردہ چاک کر کے سب کے سامنے صاف و شفاف جلوہ گر ہو جاتی ہے۔

دوستو! مستشرقین کے دلوں میں نبیؐ عربی خاتم المرسلین صلوٰۃ اللہ علیہ کے لئے ایسا ہی حسد کار فرما ہے۔ جس کی وجہ سے بے باک بے لگام زبان کھولے بیٹھے ہیں مگر ایسی مسلمہ مقدس و اطہر ہستی علیہ الصلوٰۃ و السلام پر اس قسم کے زبان درازوں کی باتوں پر کون عقلمند کان دھرے گا۔

مستشرقین کے بعد مصری دریوزہ گر

اس مصری مسلمان کے اعتراضات کا مصدر مغربی حاسدانِ اسلام ہیں جن کے مطاعن

کا جواب ہم نے پیش کر دیا ہے۔ اب ہمارے پیش نظر ان مسلمان دانشوروں کے خلجان کا علاج پیش نظر ہے۔ جو علوم دینیہ کی تعلیم و تدریس میں مصروف ہیں اور اس مہارت کے زعم میں انہوں نے کتاب حیات محمد ﷺ کے پہلے ایڈیشن کا تعاقب کیا ہے۔

ہمیں امید ہے اس طرح کی دریدہ ذہنی اور الزامات کا اعادہ اب نہیں ہو گا۔ ہم مانتے ہیں کہ ان مستشرقین نے محض عیسائی دنیا کو گمراہ کرنے کے لئے ایسے ایسے الزامات تراشے ہیں۔ مگر آج جب کہ ریڈیو نے تمام دنیا کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے' دوسری طرف صحافت اور پریس کی ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ جو کچھ امریکہ اور یورپ میں شائع ہوا تھوڑی ہی دیر میں مشرق کے چپہ چپہ میں پہنچ گیا۔ لہٰذا ان دونوں ملکوں کے لکھنے والوں پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لکھنے سے پہلے اپنے دلوں کو ٹٹول لیا کریں۔

جب لکھیں تو قومی اور دلی تعصبات سے بلند ہو کر لکھیں اور سوچیں کہ ان کے تعصب اور ان کی غلط بیانی سے قارئین کا طبقہ ان کے متعلق کیا رائے قائم کرے گا جو خود بھی تحقیق سے بہرور ہیں اور ایسے لوگ دنیا کے ہر خطہ میں موجود ہیں۔ ہر مصنف کا ذمہ ہے کہ وہ وطنیت مذہب اور ملک کی عصبیت سے دامن بچا کر لکھے تاکہ بنی نوعِ آدم کے درمیان رشتۂ محبت استوار ہو جو انسانیت کے لئے وجہِ کمال و باعثِ رفعت ہے۔

مصنف پر مسلمانوں کے اعتراضات

ماتم اس کا نہیں کہ مغربی اہلِ قلم اسلام پر کس طرح کی طعنہ زنی اور الزام تراشی کرتے ہیں بلکہ ان کی چیرہ دستیوں کے ساتھ ساتھ اپنوں کی کم فہمی پر بھی ماتم کرنا ضروری ہے۔ جو یہ فرماتے ہیں کہ ہم نے کتاب "حیات محمد ﷺ" میں مستشرقین کے اعتراضات رفع کرنے میں مغربی اہلِ قلم کی بجائے صرف عربی مصادر پر ہی کیوں اکتفا کیا ہے۔ مسلمانوں کا وہ گروہ جو علوم دینی سے مستفیض ہے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ مصنف نے نبی عربی ﷺ کے سوانح بیان کرنے کے لئے سیرت اور احادیث کی کتابوں کو بلا چون و چرا تسلیم کرنے میں کیوں تامل برتا۔

اس گروہ کی دو قسمیں ہیں۔

ایک گروہ جس نے خوشگوار انداز میں اپنا مدعا پیش کرتے ہوئے آیت "جادلھم بالتی ھی احسن" (16:120) پر عمل فرمایا۔

دوسرا گروہ علما کے جادین کا وہ گروہ ہے جنہوں نے اس انداز سے اعتراض کیا کہ جس کسی کو علم سے دور کا واسطہ بھی نہ ہو۔ وہ ایسی سختی آمیز جہالت کے ساتھ زبان نہیں کھول

سکے گا۔

فریق اول کا اعتراض

یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سوانح مبارک صرف اپنے ہاں کی سیرت و حدیث کی کتابوں پر اعتماد کیوں نہیں کیا۔ اس پر قدغن لگا دی یا انہیں میری کتاب "حیات محمد" میں میرے یہ الفاظ محور نقص نظر آئے ہیں۔

فحیاۃ محمد حیات انسانیہ ملنت اسمی ماتستطیع انسان ان یلغع و لقد کان صلی اللہ علیہ وسلم حولقیا علی ان بقید رالمسلمون انہ بشر مثلھمہ لوحی الیہ معجزہ عبنر القر آن بصارح اصحابہ بذالک:

یعنی حضرت محمد ﷺ کا کردار ایسے کامل انسان کی سیرت کا مظہر تھا۔ جو انہی بلندیوں میں اس حد تک پہنچ جائے اور کوئی دوسرا اس کی برابری نہ کر سکے۔

رسول اللہ ﷺ کی تمنا یہ تھی کہ مسلمان آپ کو بشر تسلیم کریں ایسا بشر جو بشریت کے ساتھ ساتھ وحیِ الٰہی کی خلعت سے بھی آراستہ ہے۔ یہاں تک کہ آپ اپنی ذات کے ساتھ قرآن مجید کے سوا کسی دوسرے معجزے کا انتساب کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہ نکتہ آپ نے اپنے صحابہ کرام پر واضح کر دیا تھا۔"

یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی اس کتاب میں ان تمام معجزوں کو شمار نہیں کیا۔ جو سیرت و حدیث میں منقول ہیں چنانچہ میرے ان ناقدین کو میری اس کتاب میں یہ نقص بھی نظر آیا۔

تذکرہ شق القمر کے بارہ میں میں نے طبع اول میں لکھا تھا۔

"انما ید عوا المستشرقین و ید عوا المفکرین من المسلمین الٰی ھذا الموقف من ذالک الحادث ان حیاۃ محمد کانت کلھا حیات انسانیہ سامیہ وانہ لم یلجاء فی اثبات رسالۃ الی مالجاء الیہ من سبقہ من اصحاب الخوارق و ھم فی ھذا یجدون من المور خین العرب والمسلمین العرب و المسلمین سنداً حین ینکرون من حیاۃ النبی العربی کلھا مالا یدخل فی معروف العقل ویرون ماور د من ذلک غیر متفق مع دعا القر آن الیہ من النظر فی خلق اللہ وان ستنۃ اللہ لن تجدلھا تبدیلا غیر متفق مع تعبیر القر آن للمشر کین انھم یفقھون ان لیست لھم قلوب یعقلون بھا"

مطلب یہ ہے کہ مستشرقین اور مفکرین اسلام اس معجزہ کے بارے میں یہ موقف

اس بناء پر انحصار کرتے ہیں یہ مجبور ہیں کہ جس طرح حضرت محمد ﷺ سے پہلے یہ پاک فطرت گروہ نبوت و رسالت کے ثبوت میں خوارق (یعنی معجزات) کا محتاج تھا۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی اپنی نبوت کی تصدیق کے لئے کسی خارجی معجزہ کا سہارا لیں۔ جب کہ آپ ﷺ کی ذات خارجی معجزہ کی دست نگر نہ تھی۔ جس کی وجہ آپ ﷺ کی سیرت و کردار کا انتہائی بلند اور صفاتِ اعلیٰ میں مکمل جامعیت کا مالک ہونا ہے۔ اور لوگ غیر معقول معجزات سے انکار کریں گے تو اس کی تائید میں انہیں مؤرخینِ اسلام کی کتابوں میں سند بھی ملے گی۔ اور یہ بھی لکھیں گے جو روایات اس ضمن میں ذکر کی گئی ہیں ان کو قرآن حکیم کی روح کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں۔ جن میں یہ واضح طور پر کہا گیا ہے کہ کائنات میں غور کرو اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے قاعدوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہو گی۔ نیز یہ کہ قرآن حکیم نے ان مشرکین کو اس بنا پہ ہدف طعن ٹھہرایا کہ وہ سوجھ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔

فریقِ اول:۔ کو رسول اللہ ﷺ کی ذات سے بے انتہا محبت ہے اس بنا پر ان کو مجھ سے یہ بھی شکوہ ہے کہ میں نے اس کتاب میں مستشرقین کے اعتراضات کو کیوں جگہ دی۔

فریق دوم:۔ جو پہلا ایڈیشن بازار میں آنے سے پہلے ہی میرے خلاف صف آراء ہو گئے تھے ان کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ کتاب کو صلوٰۃ و سلام کے بغیر کیوں موسوم کیا گیا۔ راقم مؤلف نے متن میں رسول اللہ ﷺ پر بارہا صلوٰۃ و سلام سے اجرِ دارین حاصل کیا تھا کہ کتاب کے سرورق طبع اول میں یہ آیت

ان اللہ و ملٰئکتہ یصلون علی النبی   اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے نبی پر صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں۔

یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ وسلموا تسلیمًا   اے ایمان والو تم بھی ان پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے رہو۔" (56:33)

لکھ دی۔ میرا خیال تھا کہ لوح کتاب پر اس آیت کو سجا ہوا دیکھ کر ایسے لوگ مجھ پر مہربان ہو جائیں گے لیکن ان کا غصہ مجھ پر بدستور رہا۔ جو ان کے حقائقِ اسلام سے بے خبری کی بنا پر اور اپنے ایسے مشرکوں کی کورانہ تقلید کے سبب ہے۔

درود و سلام کے عدم تکرار کا جواب

سب سے پہلے ہم اس اعتراض پر توجہ کرتے ہیں تاکہ ایسی تحریروں پر نکتہ چینی کا دروازہ بند ہو جائے۔ اس بحث میں ہمارا مرجع' اسلام کی تصریحات ہیں۔ جن سے ثابت

ہے کہ اسلام لفظی قیود سے بالاتر ہے اس بارے میں ذیل کی حدیث ملاحظہ ہو!

ان ھذا الدین متین فادخل فیہ بوفق فان المنبت لا ارضا قطع ولا ظھرا ابقی

دین اسلام ایک سنجیدہ طریق ہے اس میں میانہ روی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ یاد رکھو نہ تو تم زمین کو پھاڑ سکو گے اور نہ ہی تمہاری پشت کی طاقت باقی رہنے والی ہے۔

(1) تحریر میں درود و سلام کی ابتدا

ابوالبقا۔۔۔ اپنی تالیف "کلیات" میں لکھتے ہیں کہ تحریر میں درود و سلام کی ابتدا دولتِ عباسیہ کے عہد میں ہوئی ہے۔

مستشرقین کے اعتراضات نقل کرنے پر عذر

مسلمانوں کے ایک گروہ کو مجھ سے یہ گلہ بھی ہے کہ مستشرقین کے اعتراضات کو نقل کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی منزلت کے منافی ہے۔ ان کے دینی جذبہ کے تحت یہ بات قابلِ تعریف ضرور ہے مگر علمی اور دینی طور پر اس کے لئے کوئی سند نہیں۔ جب کہ قرآن حکیم مشرکوں کے وہ اعتراض نقل کرتا ہے جو انہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیئے۔ قرآن حکیم انہیں اسی لئے نقل کرتا ہے کہ مدافعت کی جائے۔ ظاہر ہے اللہ تعالیٰ کی کتاب تادیب کے لئے سب سے بہتر اور اعلیٰ راہنما ہے اس کے باوجود آپ ہی بتائیے کہ کن وجوہات کی بنا پر وہ مشرکینِ قریش کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسحور و مجنوں کہنے کا بار بار اعادہ کرتا ہے؟

ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشر لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین(16 : 105) اور ہم نے جو کچھ کافر کہتے ہیں۔ کہ جسے وہ (نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کلام الٰہی کہتا ہے۔ وہ کلام اسے ایک عجمی شخص نے سکھایا ہے اور قرآن مجید جو فصیح عربی زبان میں ہے وہ غیر عربی کیسے بول سکتا ہے۔

بلکہ ایسے ہی اور اعتراض بھی ہیں لیکن علمی دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ معترض کا الزام پوری طرح نقل کر دیا جائے۔ راقم مؤلف کا مقصد کتاب کو علمی حیثیت کے ساتھ پیش کرنا ہے۔ تاکہ مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلم اہلِ علم کو بھی اس کے نظریہ اور نتائج سے تسکین ہو سکے اور یہ مقصد اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ صداقت جہاں سے بھی مل سکے اس کے لئے ہاتھ پھیلانے میں عار محسوس نہ کریں۔

دینی ماخذ کا معاملہ:۔ متذکرۃ الصدر طبقات میں فریق اول نے جو علوم اسلامیہ میں دستگاہ رکھتا ہے اور انداز بحث میں اصولوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ "جادلھم بالتی ھی

احسن" (114 - 126) مناظرہ کرتے وقت خوشی کو ہاتھ سے مت جانے دو" کے مصداق فرمایا کہ راقم مولف نے نہ تو کتبِ سیرت و احادیث سے اسناد لیں اور نہ ہی مورخینِ اسلام و محدثینِ کبار کی نہج پر گفتگو کی۔

جواب یہ ہے کہ میرا روئے سخن ان مصنفین کی طرف ہے جو تدوین اور تبیین مسائل میں جدید اسلوب کے مطابق گفتگو کرتے ہیں۔ للٰذا اسی پیرائے میں وہ دوسرے سے بھی مطمئن ہو سکتے ہیں۔ نہ صرف تاریخ بلکہ جملہ علوم و فنون میں ان کا یہی انداز معروف و قائم ہے۔ ان وجوہات کی بنا پر میرے لئے اور کوئی رستہ نہ تھا ورنہ مجھے یہ گوارا تھا کہ میں اپنی تدوین اس قدیم اسلوب پر رکھوں۔ جس کا موجودہ طریق بیان سے کمزور سا واسطہ بھی نہیں رہا۔ کیا ہماری سابقہ کتابوں میں بیان کردہ مطالبہ پر آج کی ضرورتوں کے مطابق تنقید ناجائز ہے جب کہ وہ کتابیں اپنے مقاصد کے پیش نظر مرتب کی گئیں۔ لیکن ہر دور کا مصنف مختار ہے کہ وہ از سرِ نو علمی طور پر تنقید کر سکے امید ہے کہ اس قسم کے اعتراضات پر یہی جواب کافی ہو گا۔

لیکن اگر ہم مسلمانوں کے قدیم اور زمانۂ حال دونوں گروہوں کی احتیاط کا تذکرہ نظر انداز کر دیں تو میں سمجھتا ہوں یہ بحث تشنہ تکمیل رہ جائے گی۔

قدیم مصنفین نے اپنے اپنے دور کے مقتضیات کے مطابق روایتِ سیرت و حدیث میں جو احتیاط اختیار کی اسی کے دامن میں انہیں ہر لغزش اور فتور سے نجات ملی۔

ان سب میں سے ایک نبی نذیر و بشیر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش اور وفات کی تاریخ کا تعین اور معجزات میں باہم ہم آہنگی مفقود ہے۔ ان مسائل میں تفاوت کا سب سے بڑا سبب ایسی کتابوں کے جمع و تدوین کے زمانے پر منحصر ہے جیسا کہ نہ صرف قدیم مولفات میں خوارق و معجزات بعد کے اسفار سے کم پائے جاتے ہیں۔ بلکہ زمانہ اولیٰ کی تالیفات کے بیان کردہ معجزات متاخرین کے جمع کردہ عجائباتِ معجزات سے کہیں زیادہ عقل و دانش کے قریب ہیں مثلاً سیرت کی قدیم کتابوں میں سیرت ابن ہشام ہے جس کی روایات پر آج بھی اعتماد کیا جا سکتا ہے۔

متاخرین میں ابو الفداء قاضی عیاض مولف کتاب الشفا اور دوسرے ارباب ہیں جن کے مقابلہ میں ابنِ ہشام نے کم تر معجزوں کا تذکرہ کیا۔

یہی حال حدیث کی کتابوں کا ہے۔ بعض میں قصص ملتے ہیں اور بعض ان قصوں کے بیان پر مہر بلب نظر آتے ہیں۔ حدیث میں بھی بعض ایسی کتابیں ہیں جن میں قصوں کی خوب بھر مار ہے۔ ان مشکلات کی وجہ سے ہر ناقد اور صاحبِ فن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ

ان روایات کے دو حصوں کا کوئی پیمانہ قائم کرے پھر جن روایات کو اس کے مطابق پائے ان کو بلا دریغ قبول کر لے اور جن کو اس کے مطابق نہ پائے بحث و نظر کی گنجائش رہنے دے۔

داستانِ غرانیق

ان وضعی قصوں میں نمبرا غرانیق کی یہ داستان بھی ہے۔ جسے ہمارے ایسے ہی اسلاف نے اپنے دفاتر میں درج کرنے سے ہاتھ نہیں روکا۔ یعنی جب رسول اللہ ﷺ نے قریش کی موجودگی میں سورہ نجم تلاوت فرمائی تو آیت :۔ افر ائیتم اللات والعزٰی ومناۃ الثالثۃ الاخری (1530 19-20) پر پہنچ کر مندرجہ ذیل (نمبروحی) لفظ الاخریٰ (53:20) کے بعد ملا دیا۔ تلک الغرانیق العلاء وان شفاعتھن لترتجٰی) اور رسول اللہ ﷺ یہ ٹکڑا قرات کرنے کے ساتھ ہی سجدۂ تلاوت میں چلے گئے اور مشرکین جو اس موقعہ پر موجود تھے وہ بھی اپنے معبودوں کی مدح سن کر سجدہ ریز ہو گئے۔ یہ واقعہ مندرجہ ذیل علماءِ تصنیف نے بیان فرمایا ہے۔

(1) ابن سعد نے طبقاتِ کبریٰ میں، مگر اس واقعہ پر کوئی تنقید نہیں کی۔

(2) بعض کتبِ احادیث میں صحیح روایت کے طریق پر لفظ الغرانیق میں اختلاف اتفاق کے ساتھ منقول ہے۔

(3) ابن اسحٰق نے "غرانیق سے اختلاف کے ساتھ اور یہ اضافہ" الھنامن وضع الزنادقہ (یہ لفظ زنادقہ کا داخل کردہ ہے) نقل کیا ہے۔

(4) ابن کثیر مشہور مفسر نے اپنی تاریخی کتاب البدایہ والنھایہ میں اس اضافہ کے ساتھ درج کیا ہے۔ لیکن ہم نے اس اندیشہ سے اس کو نظرانداز کر دیا۔ کہیں کوئی اسے غلط انداز میں پیش نہ کرے۔ غرانیق کی داستان بعض کتابوں میں موجود ہے لیکن ہمیں اس کی تکرار نامرغوب ہے اگرچہ اس واقعہ کی اصل صحیح بخاری میں منقول ہے۔

اس کے بعد ابن کثیر نے بخاری کی یہ حدیث اور واقعہ "غرانیق" بیان کرنے کے بعد یہ لکھا ہے کہ صحیحین میں سے صحیح بخاری میں منقول ہے اور صحیح مسلم اس کے ذکر سے خاموش ہے۔

میرا فیصلہ:۔ لیکن مجھے اس واقعہ کے انکار میں کوئی تردّد نہیں اور ابنِ اسحاق (نمبر3) کی یہ رائے بالکل صحیح ہے۔ کہ غرانیق کا واقعہ زنادقہ نے بڑھا دیا ہے' اور اس بحث میں ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں۔ جن کی روشنی میں اس قسم کے واقعات کا وجود عصمت

نبوت کے بھی منافی ہے۔ جن کی قوت کے بغیر بھی انبیائے کرام تبلیغ رسالت کی مہم سر انجام دے سکتے ہیں۔ اس بحث پر راقم مولف نے جدید علمی طریق پر اختصار سے بھی گفتگو کی ہے فصل ششم (از صفحہ 85 تا 193)

جملہ حدیث کا زمانہ

سیرت النبی میں دوسرا سبب اس زمانہ کے اثرات ہیں جس زمانہ میں منتشر روایات کو یک جا کرنے کی مہم شروع ہوئی۔ جس پر نقد و تمحیص کے بغیر آگے بڑھنا دشوار ہے۔

کتب سیرت میں سب سے پہلی کتاب نبی کریم ﷺ کی وفات سے ایک صدی یا کچھ اور زیادہ مدت گزرنے پر جمع کی گئی۔ جس کے مدون کرنے سے پہلے مسلمان بادشاہوں میں باہم سیاسی کشمکش کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور روایات و احادیث کا دامن اس سیاست کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ وضع حدیث پر زمانۂ اولیٰ میں ہی یہ موثرات کار فرما تھے تو بعد کے زمانہ کا ذکر ہی کیا؟ جب کہ خود حکومت فتنوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ اس عہد میں جامعین کتب نے کیا کیا مصیبتیں جھیلیں، نقد و انتخاب روایات میں انہوں نے کس قدر جاں فشانی سے کام لیا۔ اس حوالے سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی محنت پر ہی نظر ڈالئے حدود اسلام کی وسعت کے ساتھ راویان حدیث ہی تمام دنیا کی اطراف میں پھیل چکے تھے۔ امام بخاری کو دنیا کے گوشہ گوشہ کا سفر کرنا پڑا۔ امام نے اس محنت کے باوجود اپنی کتاب کے لئے چھ لاکھ احادیث جمع کیں۔ جن میں سے خود بخاری رحمتہ اللہ کے نزدیک بھی ان میں سے چار ہزار احادیث صحیح تھیں۔ جن چار لاکھ میں سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں دو ہزار احادیث درج فرمائیں۔ جس کے معنی ہیں کہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ایک سو پچاس روایات میں سے صرف اک روایت قابل قبول قرار پائی۔

امام ابو داؤد از 202/ تا 817 تا 275 / 880 نے پانچ لاکھ احادیث میں سے صرف 4800 احادیث اپنے سنن ابو داؤد میں رکھیں، اسی طرح حدیث کی بقیہ کتابوں کے جامعین کا ماجرا ہے۔ جن میں سے اکثر حضرات نے ایسی حدیثوں کو صحیح سمجھ کر اپنے مولفات میں درج کر لیا۔ جو دوسرے مولفین (حدیث) کے نزدیک حد صحت سے ساقط تھیں۔ حاصل بحث یہی صورت واقعہ غرانیق کی ہے جسے بعد کے آنے والے جامعین نے اپنی تالیفات میں داخل کر لیا لیکن جب زمانۂ اول کے جامعین نقد و بحث سے محفوظ نہیں تو متاخرین کا سیرت کی روائتوں میں کیا حال ہو گا۔ آخر ان کی روایات بغیر تحقیق و تجزیہ کے کیونکر قبول کر لی جاتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ صدرِ اول کے بعد اسلام کے سیاسی خلفشار سے روایات اور احادیث بھی موثرات سے خالی نہ رہ سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ بنو رقیہ کے آخری دور تک حدیث کی کوئی کتاب مدون نہیں کی جا سکی۔ ماسوائے اس کے کہ خلیفہ اموی عمر بن عبدالعزیز 219/101 نے یہ خواہش ضرور کی مگر اس کی تکمیل بنو عباس کے حکمران مامون رشید 833/218 کے زمانہ میں ہوئی۔ بقول امام دار قطنی 918/306 اس زمانہ میں صحیح حدیث کی تعداد سیاہ رنگ گائے کے بدن پر سفید بال کی سی تھی۔ الحدیث الصحیح فی الکذب کالشعرۃ بیضاء فی جلد النور الابیض (متن)

زمانۂ اول میں حدیث کو جمع کرنے کا فقدان

رہا یہ سوال کہ صدرِ اول میں حدیث کی تدوین کیوں نہ ہونے پائی اس کا سبب شاید رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث ہو۔

لاتکتبوا عنی شیئاً غیر القرآن ومن کتب شیئاً غیر القرآن فلیمحہ

رسول اللہ نے فرمایا۔ میری سند کے ساتھ قرآن مجید کے سوا کوئی اور بات املا مت کرو۔ اگر کسی نے کچھ لکھ لیا ہے تو وہ اس کو قلم زن کر دے۔

اس کے باوجود کچھ حدیثیں لوگوں کو زبانوں پر جاری تھیں لیکن اس وقت بھی روایات میں اختلاف تھا۔

عہد فاروقؓ اور احادیث

پہلے تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے احادیث جمع کرنے کا اس خیال سے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ احادیث ایک جگہ جمع ہو جانے سے اختلافات پیدا نہیں ہو سکیں گے۔ اسی خیال کی بنا پر انہوں نے اپنے رفقاء سے استصواب رائے کیا جس کی سب نے تائید کی مگر جب حضرت عمر نے اس کے مخالف پہلو پر نظر کی تو مسلسل ایک مہینہ استخارہ کرتے رہے آخر ان کی رائے تبدیل ہو گئی اور بر سر عام فرمایا۔

انی کنت اریدان اکتب السنن وانی واللّٰہ لااشواب کتاب اللّٰہ لشئی ابداء پہلے تو میرا یہ عزم تھا۔ کہ احادیث کی املا بھی کرالی جائے۔ مگر اب یہ ارادہ ترک کر دیا گیا ہے۔ مبادا کتاب اللہ اور احادیث دونوں میں خلط ملط نہ ہو جائے۔ اس فیصلہ کے مطابق انہوں نے تمام مفتوحہ علاقوں میں تحریری فرمان بھیج دیا کہ فی الحال اگر کسی کے پاس کوئی حدیث املا کی صورت میں ہو تو اس کو ختم کر دیا جائے۔

زمانہ اولیٰ کے بعد تدوین احادیث

لیکن آیاتِ قرآن و احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں باہم اختلاط کا خطرہ ٹل جانے کے بعد اور زمانہ مامون الرشید (833/218) میں تدوینِ حدیث کا آغاز ہو گیا تھا۔ مگر جامعینِ حدیث کے التزام صحت کی کوشش کے باوجود محدثین نے ان کی صحیح تسلیم کردہ احادیث پر بھی جرح کی جیسا کہ نووی (محی الدین ابو زکریا یحیٰ) صحیح مسلم کے مقدمہ میں لکھتے ہیں۔

قد استدر که جماعة علی البخاری و مسلم احادیث اخلا بشر طهما فیهما و نزلت علی درجة مالتزما

ایک جماعت نے بخاری اور مسلم دونوں کی ایسی احادیث پر گرفت کی ہے جو دونوں نے اپنے دعویٰ شرطِ صحت کے باوجود اپنی کتاب میں درج کر دی ہیں اور وہ ان کے نزدیک التزامِ صحت سے خالی ہیں۔

کیوں کہ جامعینِ حدیث نے قبولِ حدیث میں صرف اتصال سند اور راوی کی ثقاہت ہی پر اعتماد کیا ہے جو اپنے اپنے مقام پر اپنی ساکھ رکھتا تھا۔ لیکن صرف انہی دونوں باتوں کا ہونا کافی نہیں۔ ہمارے نزدیک حدیث و خبر کا بہترین معیار اس حدیث میں مذکور ہے۔

انکم ستختلفون من بعد فما جاء کم عنی فاعر ضوہ علی کتاب اللہ فما وافقه فمنی و ما خالفه فلیس عنی

مسلمانو تم میرے بعد گوناگوں اختلافات میں مبتلا ہو جاؤ گے لیکن جب بھی کوئی حدیث میرے نام سے بیان کی جائے تو کتاب اللہ کے ساتھ اس کی جانچ کرنا۔ اگر وہ قرآن کے مطابق ہے تو سمجھنا کہ میں نے ہی فرمایا اور اگر قرآن کے خلاف ثابت ہو تو اسے میرا فرمان نہ سمجھنا۔

تنقیح روایات کا یہی معیار متقدین کے پیش نظر رہا اور اسی اصول پر آج تک ارباب فکر کا عمل ہے۔ جیسا کہ ابن خلدون فرماتے ہیں۔

واننی لا اعتقد صحة سند حدیث و لاقول عالم صحابی یخالف ظاهر القرآن و ان و ثقوا رجاله فرب داؤ یوثق الاغترار بظاهر حاله وهوسئی الظن ولو انتقدت الروایات من جهته فخری متنها کماتنقد من جهته سند ها لقضت المتون علی کثیر من الا ساینذ با النقض و قد قالو ان من علامة الحدیث الموضوع مخالفته بظاهر القرآن اوالقواعد المقررة الشریعه اوللبرهان العقلی الحیان و سائر الیقینیات

مجھے کسی ایسی حدیث یا صحابی کے قول کی صحت کا یقین نہیں جس کا مفہوم ظاہر قرآن

حکیم سے مختلف نظر آئے۔ اگرچہ اس کے راوی معیار ثقاہت میں معروف ہی کیوں نہ ہوں اس لئے کہ بعض راوی اپنے ظاہر حال کی وجہ سے ثقہ مشہور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ان کا باطن بہتر نہیں ہوتا۔ اگر سند کے ساتھ فن حدیث کی تنقید کی جائے تو بے شمار متون ایسے ہو گے جو سند کے اتصال و ثقاہت کے تانے بانے کو بکھیر دیں گے۔ مقنن اصول حدیث ہی فرماتے ہیں کہ موضوع حدیث کا معیار یہ ہے کہ وہ مندرجہ ذیل امور میں سے کسی ایک دفعہ کے ضمن میں آسکے یعنی (1) ظاہر قرآن کے خلاف ہو۔ شریعت کے مقرر کردہ قواعد کے منافی ہو۔ (3) برہان عقلی کے خلاف ہو۔ (4) حس و مشاہدہ اور ہر انداز تعین کے منافی ہو۔ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قبول ورد کا یہی معیار صحیح ہے اور جو حدود ابن خلدون نے متعین کی ہیں انہیں کے اندر جدید علمی تنقید پوری طرح مفید ہے۔

وضعِ حدیث کے محرکات

ہوا یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد مسلمانوں کے اندر باہمی اختلاف کی خلیج پیدا ہو گئی ہر شخص نے اپنے اپنے ملک و رجحان کی تائید میں حدیثیں وضع کرنا شروع کر دیں۔ اور ایک دو نہیں ہزاروں کی تعداد میں موضوع حدیثیں پھیل گئیں۔ ادھر لولو (ابن ہیرہ) کے ہاتھ سے عمر رضی اللہ عنہ نے شہادت پائی اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اجتماع ہوا۔ ادھر بنو ہاشم اور بنو امیہ کی رقابت آپس میں لوٹ آئی جو بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے دونوں کے درمیان چلی آرہی تھی۔ حتیٰ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ میں ان کے مقابلہ میں جناب علی رضی اللہ عنہ صف آراء ہوئے اور حدیث سازی کا میدان گرم ہو گیا۔ جس پر حضرت علی سے یہ روایت منقول ہے۔

ماعندنا کتاب نقروہ علیکم الا مافی القرآن
ومافی ھذہ الصحیفہ اخذ تھا من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفیھا فرائض الصدقہ

میرے سامنے صرف دو تحریریں ایسی ہیں جن سے میں آپ لوگوں کے ساتھ معارضہ کر سکتا ہوں۔

(ا) کتاب اللہ

(ب) اور میری ذاتی تحویل میں یہ بیاض ہے جس کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمودات ہیں اور وہ بھی صدقات کے مسائل پر تھے۔

لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس تنبیہہ کے باوجود واضعین حدیث نے وضعِ روایات سے ہاتھ نہ کھینچا۔ کیوں کہ اس کے بغیر وہ کسی کو اپنے مواقف نہ بنا سکتے تھے۔

مناقبِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں حدیث سازی کا جذبہ

وضعِ حدیث کی یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں کا رجحان آنحضرت ﷺ کی اتباع کی جانب موڑنے کے لئے آپ کے اقوال و افعال میں اضافہ کر لیا گیا۔

بنو امیہ کے طرف داروں اور مناقبتِ علی کی احادیث میں دوڑ

حتیٰ کہ بنو امیہ کے دورِ تغلب میں ایک طرف ان کے طرف داروں نے اور دوسری طرف علی رضی اللہ عنہ کے طرف داروں نے اپنے مقتدا اور اہلِ بیت کے فضائل پر روایات سازی شروع کر دی جنہیں دونوں گروہ نزدیک و دور ہر سمت پھیلاتے گئے۔ اس مشغلہ کا مشہور لطیفہ ابن عساکر نے ابو سعد اسمٰعیل بن مثنیٰ کی حکایت میں اس طرح نقل کیا ہے۔

ابو سعد دمشق میں وعظ فرما رہے تھے۔ (جہاں دوستدارانِ علی ہی رہتے تھے۔ حاضرین مجلس میں ایک شخص نے واعظ ابو سعد) سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث " انا مدینہ العلم و علی بابہا" میں علم کا شہر ہوں اور علی اس شہر کا دروازہ ہے" کے متعلق آپ کیا فرماتے ہیں؟

ابو سعد کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد یوں کہنے لگے۔ کہ اس حدیث کو پہلے زمانہ کے سوا کوئی نہیں جانتا بلکہ یہ روایت ان لفظوں میں ہے۔ انا مدینہ العلم و ابوبکر اسا سہا و عمر حیطانہا و عثمان سقفہا و علی بابہامیں علم کا شہر ہوں ابوبکر رضی اللہ عنہ اس کی بنیاد ہیں۔ عمر رضی اللہ عنہ اس کی فصیل اور عثمان رضی اللہ عنہ اس کی چھت ہے اور علی رضی اللہ عنہ اس کا دروازہ ہیں! حاضرین بہت محظوظ ہوئے اور ابو سعد سے درخواست کی کہ اس روایت کے راوی کون کون ہیں۔ مگر ابو سعد اس کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ بلکہ شرمندہ سا ہو کر بیٹھ گیا۔ حدیث سازی اس سیاسی غلبہ کے اثر سے فروغ حاصل کرتی ہے۔ جس سے مسلمانوں کی پریشانی بڑھتی گئی۔ کیوں کہ ایسی روایات کی زیادہ تر تعداد قرآن حکیم کے خلاف ہوتی تھی۔ لیکن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کی پوری جدوجہد کے بعد صحیح اور وضعی احادیث میں امتیاز نہ کیا جا سکا۔

عباسی دور کی روایات میں عدمِ تنقیح

بنو امیہ کے انحطاط کے بعد جب بنو عباس سریر آرائے سلطنت ہوئے تو خلیفہ مامون رشید کے عہد میں جو آنحضرت ﷺ سے دو صدی بعد کا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں ایسی وضعی حدیثیں عالمِ اسلام میں پھیل چکی تھیں۔ جن میں باہم ایک دوسری روایات سے

کوئی مماثلت نہ تھی۔ بلکہ ایسا تضاد تھا کہ اس تصور سے لرزہ طاری ہوتا ہے۔ اس دور میں حدیث جمع کرنے والوں نے سیرت کے متعلق روایات جمع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ ان میں واقدی ہیں ابن ہشام ہیں اور المدائنی بھی جنہوں نے مامون رشید کے اثر میں رہ کر اپنی اپنی کتابوں کی تدوین کی جس میں یہ لوگ اور اس زمانے کے دوسرے روایات جمع کرنے والے خلیفہ' وقت کے اشاروں سے بال برابر بھی انحراف نہ کر سکے بس حدیث کا ایک ہی معیار ہے اگر رسول اللہ ﷺ ہی سے مروی ہیں اور قرآن کے مطابق ہیں تو اسے رسول اللہ ہی کا ارشاد سمجھئے۔ اور جو روائت قرآن کے خلاف ہو۔ اس کے قبول کرنے سے انکار کر دیجئے۔ اگر قبولِ حدیث میں ایسی دقتِ نظر سے کام لیا جاتا۔ تو ہمارے اسلاف کی تصانیف کا نقشہ کچھ اور ہی ہوتا۔ قبولِ حدیث میں ہمارا پیش کردہ اصول (روایت اور قرآن ہی باہم مطابقت) جدید علمی تحقیق کے بھی خلاف نہیں لیکن ہمارے اسلاف (جامعینِ سیر) زمانہ کے حالات سے متاثر ہو کر اس اصول پر پوری طرح عمل نہ کر سکے۔

ہوا یہ کہ اگر بعض مسائل میں انہوں نے اس کی پابندی کر بھی لی تو دوسرے مسائل میں اس اصول پر پورے نہ اتر سکے جب متاخرین نے سیرتِ رسول ﷺ پر قلم اٹھایا تو انہوں نے بغیر نقد و تمحیص سلف کی کتابوں سے اخذ و استنباط شروع کر دیا۔ کاش یہ مصنفین اسلاف کی روایات پر اعتبار کرنے کے بجائے رد و قبول کرنے کا فیصلہ کرتے۔

البتہ سلف میں ایسے مسلمان بھی گزرے ہیں۔ جنہوں نے اپنی تصانیف میں صرف وہی روایات داخل کی ہیں جو قرآن کریم کے موافق تھیں۔ اور ان کے سوا کسی اور روایت کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھا۔

معجزات کے بارے ہمارے اصول کا منبع مسلمان علمائے سلف کی رائے ہے۔ جس پر دور حاضرہ کے مسلمان اربابِ علم و دانش بھی متفق ہیں۔

شیخ محمد مصطفیٰ المراغی شیخ الازھر فرماتے ہیں۔

(1) قرآن مجید کے سوا محمد ﷺ کا کوئی اہم معجزہ نہ تھا۔ اور یہ معجزہ عقل کے نزدیک بھی قابلِ تسلیم ہے۔

(2) بوصیری فرماتے ہیں۔ لم یمتحنا بما لقما العقول بہ حرصئا علینا فلم نرنب ولم نھم

خلاف عقل معجزات پیش کر کے آنحضرت ﷺ نے ہمیں آزمائش میں نہیں ڈالا' یہ نبی اکرم ﷺ کی مہربانی تھی جس کی وجہ سے ہمارے دلوں میں شکوک و شبہات کے جذبات بھی نہیں ابھرے۔

(3) سید محمد رشید رضا مرحوم مدیر مجلہ "المنار" (مصر) قرآن مجید کی صداقت پر ایک معصر کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

علمائے ازھر اور صوفیا کو ہیکل کی کتاب "حیات محمد ﷺ" پر سب نے بڑا اعتراض یہ ہے کہ مؤلف نے ان خوارق معجزات کا تذکرہ نہیں کیا چہ جائیکہ میں خود اپنی تالیف "الوحی المحمدی" میں لکھ چکا ہوں کہ قرآن مجید تنہا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا ثبوت موجود ہے۔ حتیٰ کہ سابقہ انبیائے کرام جن کی تصدیقِ نبوت کے لئے آج ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں۔ قرآن مجید ان کی صداقت پر مؤید ہے۔

پھر معجزہ بذاتِ خود دلیل کا قائم مقام نہیں بلکہ وہ ایک نشان کے درجہ میں ہے جو نشان گزشتہ زمانوں کی طرح اس زمانے میں بھی ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔

ہر بات میں معجزہ اور کرامت ٹٹولنے والے ہر دور اور جماعت میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور میں نے الوحی المحمدی میں عوام کی خوارق و کرامات پر فریفتگی کی عقلی اور رسمی دونوں حیثیتوں سے بحث کی ہے۔

(4) شیخ محمد عبدہٗ کتاب الاسلام و النصرانیہ میں فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اور اس کی وحدانیت پر اسلام کے ذخیرہ میں وہی عقلی اور طبعی دلائل ہیں جس سے نظامِ عالم کی حقیقتِ ترتیب پر دلیل قائم کی جا سکتی ہے نہ کہ معجزات و کرامات سے اور انہیں پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے چنانچہ اسلام خوارق کے ذکر سے تمہیں حیرت زدہ کرتا ہے نہ تمہاری آنکھوں میں غیرمادی چیزوں کے ذکر سے دھول جھونکنے کی کوشش کرتا ہے نہ تمہاری گویائی کو ان آسمانی ڈاروں سے محروم کرتا ہے اور نہ ہی فکر و نظر کو خدائی چیخ و پکار کے ذریعہ حرکت و جنبش سے روکتا ہے۔

چند نادان افراد کے سوا دنیا کے ہر صاحب عقل انسان کو اس پر اتفاق ہے کہ اللہ پر ایمان لانا نبوت کی تصدیق سے مقدم ہے لیکن ایمان باللہ کے بغیر نبوت کی تصدیق ممکن نہیں۔ لہٰذا یہ غلط ہے کہ اللہ پر ایمان لانے کے لئے انبیاء کے کلام کا سہارا ضروری ہے۔ یا ان پر نازل شدہ کتابوں سے استقامت ضروری ہے۔ عقل اسے باور ہی نہیں کرتی کہ جب تک اللہ پر اس کا ایمان نہ ہو۔ آپ اس کی بھیجی ہوئی کتاب پر یقین کر لیں البتہ اگر اللہ پر پہلے سے ایمان ہے تو اس کے مرسل رسول اللہ ﷺ اور کتاب نازل کرنے والے پر بھی ایمان لایا جا سکتا ہے۔

عجیب گمان یہ ہے کہ سلف اپنے زمانہ کی ضروریات کے مطابق اس پر مجبور تھے کہ وہ معجزات جو قرآن میں موجود ہیں۔ انہیں اپنی تالیفات میں جمع کر دیں۔ مگر متاخرین نے اس

لئے ایسے خوارق کا اعادہ ضروری سمجھا کہ ان کی وجہ سے مسلمانوں کا ایمان مستحکم ہو جائے۔ حتیٰ کہ ان معجزات کے تکرار و بیان میں ان کے نزدیک نقصان کی بجائے صرف نفع ہی مقصود تھا اگر ان کے مدنظر یہ نہ ہوتا۔ تو یقیناً وہ ان کے بیان سے دامن بچاتے کاش ہمارے یہ اسلاف (مولفین) آج زندہ ہوتے اور دیکھتے کہ دشمنان اسلام معجزات کی آڑ میں اسلام پر کس طرح نکتہ چینی کر رہے ہیں تو وہ غیر قرآنی معجزات کو اپنی تصانیف میں کبھی جگہ نہ دیتے۔

ہمارے یہ مفسّرین امام غزالی شیخ محمد عبدہ اور مراغی وغیرہ کی تحقیق کی ہم نوائی میں اپنا فخر سمجھتے جو اس وقت زندہ ہیں (ماسواء غزالی رحمتہ اللہ علیہ) اور دیکھ رہے ہیں کہ معجزات کی روایات ایمان کو تازہ کرنے کے بجائے دلوں میں اضطراب اور عقائد میں تزلزل پیدا کر رہی ہیں۔ اور یہ مصنف بھی انہیں دلائل کے ذکر تک اکتفا کرتے ہیں جو صرف قرآن مجید میں مذکور ہیں اور صحتِ قاطعہ کا درجہ رکھتے ہیں۔

خلافِ عقل روایات

ایسی روایتیں جو عقل اور علم کے خلاف ثابت ہو چکی ہیں جو شخص خود پر یہ فرض عائد کرنا چاہتا ہے کہ اپنے علم و تحقیق کے ساتھ مخلوق کی خدمت اور اسلام کی تعلیمات کے علاوہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوانح بھی پیش کرکے سر انجام دے اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اسی طرح لکھنا چاہئے جس سے انسان کو راہبری حاصل ہو۔

اگر سیرت اور احادیث کی ایسی روایات کو قرآن مجید کے سامنے پیش کیا جائے تو ان علمائے محققین کی رائے سے اتفاق کرنا پڑے گا جو قرآن حکیم کی اساس پر ان روایات کی صحت سے انکار کرتے ہیں جیسا کہ اہلِ مکہ نے اپنے ایمان لانے کی شرط آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معجزات کے ظہور کے ساتھ پیش کی مگر قرآن نے ان کا مطالبہ مختلف دلائل سے ٹھکرایا۔

وقالوا لن نو من لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعا او تکون لک جنۃ من نخیل و عنب فتفجر الانھر خلالھا تفجیرًا او تسقط السماء کما زعمت علینا کسفا او تاتی باللہ و الملئکۃ قبیلا

ترجمہ۔ یا تو ہمارے لئے زمین سے پانی کے چشمے جاری کر دو۔ کہنے لگے ہم تم پر ایمان نہیں لائیں گے جب تک تمہارے لئے باغ ہو کھجوروں اور انگوروں کا اور اس میں نہریں بہا نکالو یا جیسا تم کہا کرتے ہو ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا لا گراؤ یا اللہ اور فرشتوں کو ہمارے سامنے لے آؤ۔

یکون لک بیت من زخرف اوترقی فی السماء ولن نو من لرقیک حتی تنزل علینا کتابا نقرؤہ قل سبحان ربی ھل کنت الا بشرا رسولا (17: 90 تا 93)

یا تمہارا سونے کا گھر ہو یا تم آسمان پر چڑھ جاؤ اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے جب تک کوئی کتاب نہ لاؤ جسے ہم پڑھ لیں کہہ دو میرا پروردگار پاک ہے میں تو صرف ایک پیغام پہنچانے والا انسان ہوں۔

اسی طرح یہ بھی فرمایا۔

واقسمو باللہ جھد ایمانھم لئن جاء تھم آیتہ لیومنن بھا قل انما الآیت عنداللہ وما یشعر کم انھا اذا جاء ت لا یومنون و نقلب افیدتھم و ابصارھم کمالم یومنوا بہ اول مرۃ ونذرھم فی طغیانھم یعمھون ولو اننا نزلنا الیھم لملئکۃ و کلمھم الموتی و حشرنا علیھم کل شیئی قبلا ماکانوا الیومنوا الا ان یشاء اللہ ولکن اکثرھم یجھلون ○

اور یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی سخت قسمیں کھاتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی نشانی آئے تو وہ اس پر ضرور ایمان لے آئیں۔ کہہ دو کہ نشانیاں تو سب اللہ ہی کے پاس ہیں۔ اور مومنو تمہیں کیا معلوم ہے (یہ تو ایسے بدبخت ہیں) کہ ان کے پاس نشانیاں آ بھی جائیں تب بھی ایمان نہ لائیں اور ہم ان کی آنکھوں اور دلوں کو الٹ دیں گے، تو جیسے یہ اس قرآن مجید پر پہلی مرتبہ ایمان نہیں لائے۔ ویسے پھر بھی ایمان نہیں لائیں گے اور ان کو چھوڑ دیں گے تاکہ یہ اپنی سرکشی (خود سری) میں گھومتے رہیں اور اگر ہم ان پر فرشتے بھی اتار دیتے اور مردے بھی ان سے گفتگو کرنے لگتے اور ہم سب چیزوں کو ان سامنے موجود کر دیتے تو بھی یہ ایمان لانے والے نہیں تھے۔ الا ماشاء اللہ حقیقت ہے کہ یہ اکثر نادان ہیں۔"

قرآن مجید خود ہی اپنی گوناگوں صفات کی بنا پر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے ثبوت میں سب سے بڑا معجزہ ہے لیکن اس کے سوا پوری کتاب میں کوئی ایسا خارجی معجزہ مذکور نہیں۔ جو تمام جہاں اور رہتی دنیا کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توثیقِ رسالت کا وسیلہ ثابت ہو سکتا ہے۔

لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سے پہلے انبیاء گزرے ہیں ان سب کے معجزوں کی حکایات مروی ہیں جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تعلق ہے۔ قرآن مجید میں کوئی ایسی بات مذکور نہیں جو فطرت کے خلاف ہو۔

معجزات کے شوق کا سبب

سوال یہ ہے کہ جب قرآن مجید اور احادیث جو اللہ تعالیٰ کی کتاب کے منافی نہیں دونوں اس بات میں خاموش ہیں تو سلف سے لے کر آج تک مسلمان آنحضرت ﷺ کے ذمہ قرآن کریم کے ماسوا دوسرے معجزے کیوں لگا رہے ہیں۔

مسلمان سابقہ انبیائے کرام کے معجزات سے متاثر ہو کر محمد ﷺ کے لئے بھی انہیں ضروری سمجھنے لگے۔ ان کے نزدیک مادی معجزات کے بغیر رسالت کی تکمیل نہیں ہو سکتی تھی۔ انہوں نے معجزات میں روایات کو قبول کر لیا لیکن یہ نہ سوچا کہ جو کچھ روایات میں آ رہا ہے وہ قرآن مجید میں تو ہے نہیں۔ انہوں نے گمان کر لیا کہ رسول عربی (ﷺ) کے معجزوں کی فراوانی لوگوں کے ایمان بر رسالت میں اضافہ کا سبب ہو گی مگر انہوں نے اس حقیقت پر غور نہیں کیا کہ آنحضرت ﷺ کا معاملہ دوسرا ہے۔ آپ ﷺ کو دوسرے انبیاء پر قیاس کرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ محمد ﷺ خاتم الانبیاء خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ و السلام ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پہلے رسول ہیں جنہیں اللہ رب کل کائنات نے تمام عالم کی طرف تا قیامت ہدایت کے لئے معبوث فرمایا۔ دوسرے انبیاء کی مانند اپنی ہی قوم کے لئے نہیں۔ اسی بنیاد پر اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو ایک ایسا معجزہ عطا فرمایا۔ جو سر تاپا طبعی اور عقلی ہے۔ جس کی ہم سری کا دعویٰ جنون ہے اور بنی آدم میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ "ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا" (17 : 9) اور یہ معجزہ قرآن مجید ہے۔ جو اپنی پوری حیثیت میں ممتاز ہے جسے اللہ تعالیٰ نے ایسی

حجت قاطعہ کی حیثیت میں پیش کیا ہے تاکہ خود رسالت مآب ﷺ اپنی زندگی میں قرآن مجید کے معجزہ کی قوت سے نصرت حاصل کر سکیں اور ایسا ہی ہوا۔ اگر آنحضرت ﷺ کی تائید رسالت کے بارے میں کوئی ایک بھی مادی معجزہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کو اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ کرنے میں کیا مانع تھا۔ یوں کہ بعض طبائع صرف وہی حقائق تسلیم کر سکتی ہیں جن کا ربط عقل کے ساتھ ہو۔ اس لئے رسالتِ محمدیہ کے لئے ایسی دلیل پر اکتفا کیا گیا۔ جس کے سامنے بڑے سے بڑا فلسفی بھی سر جھکا لے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو نبی ﷺ کے لئے دلیل "حجتہ بالغہ" کے ساتھ نازل فرمایا۔ جس حجتہ بالغہ نے اپنے ظہور کے بعد اپنے ہی جیسے دو حسی براہین پیدا فرما دیئے۔

(1) دین الٰہی کی نصرت کے سامان

(2) مومنین کے دلوں میں ایمان کی فراوانی۔

جس دین کی بنیاد اس حد تک مستحکم اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ ہر شخص کو بلا قیدِ مکان و زماں اور زبان رہتی دنیا تک اپنی طرف آنے کی دعوت دے۔

آج بھی اگر غیر مسلم جماعت اسلام قبول کر لے اور وہ معجزہ کے باب میں قرآن مجید کے ماسوا کسی اور اعجاز کو تسلیم نہ کرے تو اس انکار پر اس کے ایمان میں کوئی نقص نہیں ہو گا۔ نہ اس کے اسلام میں کوئی کمی ہو گی۔ کیوں کہ وحی الٰہی نے قرآن مجید کے سوا کسی معجزہ کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اس لئے جو شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے اسے حق حاصل ہے کہ وہ قرآن کریم ہی کی رائے کے مطابق معجزوں پر بحث و تمحیص کرے جس کے بعد دلیل قطعی سے کوئی امر ثابت نہ ہو تو اسے تسلیم کر لے ورنہ ایسے شخص پر کوئی ملامت نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک پر ایمان لانا کسی معجزہ کا محتاج نہیں بلکہ کون و مکاں اور اس کے گوناگوں عجائبات دو حقیقتوں کی حجت کے لئے کافی ہیں۔

(1) خالقِ مطلق کی ہستی کا اقرار

(2) رسالتِ احمد ﷺ کی تصدیق۔

جس رسالت نے اپنے رب کی تابعداری کر کے تمام دنیا کے دلوں کو شرک کی آزمائش سے پاک کر دیا۔

نو واردانِ حلقۂ اسلام دو حالتوں میں سے ایک حالت کے حامل ہوں گے یا تو اس طرح جیسے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرح اسلام کی دعوت سنتے ہی اس خلوص کے ساتھ اسے قبول کر لیا کہ دل میں کسی شک و شبہ کا شائبہ تک نہ رہا۔ یا پھر ایسے مسلمانوں کی طرح کی حالت ہو گی جن کے ایمان لانے کا سبب اس عالم کون مکاں کی وسعتیں جن کے مکانی اور زمانی حدود کے ادراک سے ہم قاصر ہیں۔

غور کیجئے کہ وسعت کے باوجود اس عالم کا ہر ایک ذرہ ایک مقررہ نظام کے مطابق مصروفِ عمل ہے ایسے حضرات کے نزدیک قیام عالم اور اس کا نظام عمل دونوں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے دو معجزے ہیں اور خرقِ عادت کی یہ طبعی قسم اکثر ممتاز علمائے اسلام کے استحکام ایمان کا سبب ثابت ہوتی ۔

مومنین کی ایک اور قسم بھی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے عذاب کے خوف سے نجات اور ثواب کے طمع سے دامن بچا کر خلوتِ ایمان سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ ان کا مشغلہ عین ذات میں محویت ہے کہ مقصود تو وہی ہے۔ بمصداق آیت :۔ ان للہ وانا الیہ راجعون جس کی ملکیت ہم سب ہیں اور جس کی طرف ہم سب کو لوٹ کر جانا ہے۔

موجودہ دور کے مسلمان جنہوں نے معجزات کا وقوع اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا اور ایمان پر ثابت قدم ہیں۔ ان کی مثال ان مومنین اولین کی ہے جو نبی اکرم ﷺ کی

زندگی میں آپ پر بلا حیل و حجت ایمان لائے اور ان کے اسلام قبول کرنے کے واقعات میں کسی بھی معجزہ کا ذکر نہیں۔ بلکہ صرف دو محرکات نظر آتے ہیں۔

(1) اللہ تعالیٰ کی وہ دلیل جو عنوانِ وحی سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبانِ گرامی سے ادا ہوئی۔

(2) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شبانہ روز زندگی میں آپ کے اسوہ حسنہ کا وہ اعلیٰ نمونہ جس کے خدوخال اس حد تک جاذبِ توجہ تھے کہ ہر صاحبِ فراست کے لئے وجہِ ایمان ثابت ہوئے۔

واقعۂ معراج

سیرت کی تمام کتابوں میں معراج کے واقعہ کا ذکر ہے۔ کچھ لوگ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلے پہل ایمان لا چکے تھے۔ جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان سے معراج کے بارے میں یہ سنا کہ آپ کی راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے جایا گیا۔ وہاں کے متبرک مقامات کی سیر کرائی تو سننے کے ساتھ ہی اکثر مرتد ہو گئے۔ (واللہ) (اس کی تائید ہمیں کسی اور سیرت کی کتاب میں نہیں ملتی م) سراقہ بن جعشم کا معجزہ دیکھ کر ایمان لانا۔ سراقہ بن جعشم کا واقعہ اس طرح کہ جب نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ و السّلام جب ہجرت فرما ہوئے تو اہلِ مکہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زندہ یا مردہ (خاکم بدہن م) گرفتار کرنے کا اعلان کیا۔ تو سراقہ نہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تعاقب میں کامیاب ہو گیا۔ بلکہ اربابِ سیر نے اس تعاقب میں سراقہ کے گھوڑے کے معجزانہ طور پر گرنے کا جو واقعہ بیان کیا ہے۔ مجھے اس میں یہ کہنا ہے۔ کہ سراقہ یہ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان کیوں نہیں لایا؟

معجزات اور حدیث و سیرت کی کتابیں

چنانچہ جن کتابوں میں معجزات کی حکایات منقول ہیں وہ روایات دو حالتوں سے خالی نہیں۔

(1) اختلافِ شق صدر

(2) محلِ نقد و بحث

نمبرِ 2 میں مثلاً غرانیق العلیٰ کی روایت ہے جس کے متعلق ہم نے مقدمہ اور متن دونوں میں اجمال و تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

شقِ صدر در عہدِ رضاعت

کا جو واقعہ جناب حلیمہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضائی والدہ) نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی حقیقی والدہ سیدہ آمنہ سے بیان کیا۔ اسی روایت کے الفاظ میں اختلاف ہے۔ شقِ صدر کے وقت آپ کے سِن مبارک کی روایات بھی مختلف فیہ ہیں۔

حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جناب زینب رضی اللہ عنہما

اسی طرح جناب زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ام المومنین زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے اسبابِ طلاق میں اختلافِ روایات ہے جس پر ہم نے متن میں تفصیلی بحث کی۔ (م فصل 17 در بحث ازواج النبی)

تبوک میں چشمہ کا پانی:۔ اسی طرح جیش العسرہ تبوک کا یہ واقعہ جسے مسلم نے اپنی صحیح میں معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے۔

قال معاذ انکم ستاتون ان شاء اللہ عین تبوک غداً و انکم لن تاتوھا حتی یضحی النہار فمن جاء منکم فلا یمس من ماء ھا شیاء حتی آتی فجئناہ وقد سبقنا الیھا رجلان والعین مثل اشراک قبض بشئی من جاء قال فسالھما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھل مستما من مائھا شیئاً قال نعم انسیھما النبی صلی اللہ علیہ وسلم و قال لھا ماشاء اللہ ان یقول قال غرفوا بایدیھم من العین قلیلاً قلیلاً حتی اجتمع فی شیئی قال و غسل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیہ یدیہ و وجھہ ثم اعاد فیھا فجرت العین بماء منھم اوقال غزیر شک ابوعلی ایھما قال حتی استقا الناس ثم قال یوشک جاماذ ان طالت بک الحیاۃ ان تری ماھاھنا قد ملی جنانا

ترجمہ:۔ معاذ بن جبل کہتے ہیں میدانِ تبوک سے واپسی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ کل چاشت کے وقت تک انشاء اللہ تبوک کے چشمے پہنچ جاؤ گے مگر خیال رہے کہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے کوئی شخص اس چشمہ کا پانی نہ چھوئے۔ مگر ہم میں سے ایسے عجلت پسند آدمی نکلے جنہوں نے آتے ہی اس چشمہ کا پانی استعمال کر لیا۔ اس وقت یہ چشمہ پانی کی پتلی لکیر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے اور صُورتِ حال دریافت فرمائی انہیں بتایا گیا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت تنبیہ فرمائی۔ پھر ہمیں اس چشمہ سے اوک سے پانی اچک کر ایک جگہ جمع کرنے کے لئے ارشاد فرمایا۔ معاذ فرماتے ہیں اس جمع شدہ پانی سے اوک بھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چہرہ مبارک پر چھڑکا' دوسرا اوک بھر کر چشمہ کی اس نیلی دھار پر انڈیل دیا جو دیکھتے ہی دیکھتے پورے جوش کے ساتھ بہنے لگا۔ اس حدیث کے راوی ابو علی فرماتے ہیں۔ معاذ نے "منھم" کہا یا غزیر دونوں کے معنی ایک ہی ہیں حتی کہ لوگوں نے اپنی اپنی پیاس کے مطابق اس میں سے پانی نکال لیا۔ پھر رسول اللہ

ﷺ نے مجھ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ اے معاذ اگر تم کبھی ان ندہ رہے تو یہاں سے سرسبز و شاداب گلستاں دیکھو گے۔

سیرت کی کتابیں اور قصۂ تبوک

لیکن سیرت کی کتابوں میں تبوک کا قصہ جس عنوان سے ذکر کیا گیا ہے۔ اس میں نہ تو معجزہ کی کوئی حکایت ہے نہ صحیح مسلم کی متذکرۃ الصدر روایت کا سا کوئی اشارہ جیسا کہ "سیرت ابنِ ہشام" میں منقول ہے۔

فلما اصبح الناس ولا ماء معهم شكو اذالک الی رسول الله صلی الله علیه وسلم فدعا رسول الله صلی الله علیه وسلم فارسل الله سحابة فامطرت حتٰی ارتوی الناس فاحتملوا حاجتهم من الماء

دوسرا دن ہوا لوگوں کو پانی نملا تب انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی مصیبت کا اظہار کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی آسمان پر بادل اُمڈ آئے بادل برسا اور لوگوں نے جی بھر کر پانی پیا اور اکٹھے میں بھی بھر لیا۔

قال ابن اسحاق فحدثنی عاصم بن عمر بن قتاده عن محمود بن لبید عن رجال من بنی لا شهل قال قلت لمحمود هل کان الناس یعر فو النفاق فیهم؟ قال نعم ان کان الرجل لیعرفه من اخیه و من عمه و فی عشیرته ثم یلبس بعضهم بعضاً علٰی ذالک

ابنِ اسحاق (مؤلف سیرت) فرماتے ہیں مجھ سے عاصم بن عمر بن قتادہ نے محمود بن لبید سے بحوالہ نامعلوم الاسم اشخاص جو قبیلہ بنو عبد الاشھل سے ہیں۔ روایت کی اور میں نے اس سے پوچھا کیا اس فوج کے منافقوں کو لوگ جانتے تھے محمود نے کہا ہاں ہاں منافقوں کے حقیقی بھائی چچا زاد اور قبیلہ والے ایک دوسرے کو پہچانتے تھے۔

ثم قال محمود قد اخبرنی رجال من قومی عن رجل من المنافقین معروف نفاقة کان یسیر مع رسول الله صلی الله علیه وسلم حیث سارا فلما کان من امر الماء بالحجر ماکان و دعا رسول الله صلی الله علیه وسلما حین دعا فا رسل الله سحابة فامطرت حتی ارتوی الناس قالو اقبلنا الیه نقول ویحک هل بعد هذا شیئی؟ تال صحابة مارة

پھر محمود نے کہا مجھے میری قوم کے بعض لوگوں نے ایک ایسے مشہور منافق کی بھی خبر دی جو اس سفر میں بھی آنحضرت ﷺ نے مینہ کی دعا کی بادل اُٹھا اور اس قدر مینہ برسا کہ لوگوں نے جی بھر کر پانی پی لیا۔ ہم سب اس پر ٹوٹ پڑے اور اس سے کہا کہ اس واقعہ کے

بعد بھی نفاق کی کوئی گنجائش باقی رہ جاتی ہے۔ تو اس نے کہا ابر کا ایک ٹکڑا ہے جو اتفاقاً برستا ہوا نکل گیا۔

صحیح مسلم اور ابنِ سحاق کے اختلافِ روایت پر تحقیقی نظر

مگر ان دونوں روایات کے اختلاف اور واقعہ کی حقیقت نے علمی الجھن پیدا کر دی بہتر یہ ہے کہ روایت کو ترجیح دینے کے بجائے حقیقت الامر پر نگاہ توجہ مرکوز کی جائے۔ کیونکہ محض روایت میں درج اور مرجوح سے امرِ واقعہ کی صحت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اگر راجح روایت صحتِ حقیقت میں حائل ہو تو اس سے نظر ہٹا کر غور کریں کہ حقیقت کس راہ پر چلنے سے منکشف ہو سکتی ہے ورنہ ظنیات پر واقعہ چسپاں کرنا مفید نہ ہوگا۔

یہی علمی اسلوب ہے جس کے مطابق میں نے کتاب "حیات محمد ﷺ" کی تبییض شروع کی اور اسے جدید علمی تحقیق کے اصولوں کے مطابق مدون کیا۔ جس سے میرا مقصد صرف تحقیق ہے۔ اور جس کا ذکر راقم مولف نے طبع اول کے خاتمہ پر کر دیا ہے یہی امید مولف سے کتاب کی تکمیل تک ہے۔

نیز ہر موضوع متعلقہ کتاب پر غائر نظر ڈالنے کے بعد سیر حاصل بحث کی گئی ہے تاکہ زیرِ تحقیق مسائل نفسیاتی تحلیل سے کشف حقیقت میں مدد حاصل کی جا سکے اور انسانیت جو صدیوں سے جدید تمدن کی جستجو میں سرگرداں ہے فخر دو عالم علیہ الصلوٰۃ و السلام کی شخصیت اور ان کی راہبری سے منزل مقصود تک جا پہنچے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس مبحث میں پورے تفحص سے کام لیا جائے تو اس کی مدد سے ایسے بے شمار مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ جن کی تکمیل سے اہل علم ابھی تک قاصر ہیں بلکہ میرے خیال میں ان حل شدہ مسائل کی روشنی سے کئی اور مسائل تحلیل ہو سکیں گے جن کی وضاحت تاہنوز ہماری دسترس سے باہر ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ جدید تمدن کو جس قدر ارتقاء حاصل ہوتا جائے گا محمد ﷺ کے کردار سے انسانیت کا واسطہ اسی قدر مربوط ہوتا جائے گا جیسا کہ مادیات میں کہربا اور "ایٹم" کی دست گیری نے انجانی قوتوں کو بیدار کر دیا۔

یہی نکتہ ہے۔ جس پر پوری توجہ مرکوز رکھنے کے ساتھ حضرت محمد ﷺ کی سیرت نہ صرف مسلمان بلکہ تمام انسانی برادری کے لیئے مفید ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کا مقصد کسی دین ہی کا فروغ نہیں۔ جیسا کہ بعض حضرات کا گمان ہے بلکہ آپ کی مقرر کردہ راہ پر چل کر انسانی زندگی میں ارتقاء حاصل کرتا ہے۔

فراست اور نورِ قلب معرفت اور علمِ صحیح کے شجع ہیں۔ جو شخص ان دونوں کی درستی

اور صحت کے بغیر اس راہ میں قدم رکھے اس کا منزل تک پہنچنا ناممکن ہے۔ اگر فکر کی بنیاد صحیح علم نہ ہو اور علم کی منزل کو اس کی راہوں سے ہٹ کر دوسرے راستوں سے طے کیا جائے تو اس راہ میں جو قدم اٹھے گا۔ اس میں لغزش یقینی ہے اور تحقیقِ علمی کا انحصار اختلافِ طبائع پر مبنی ہے۔ مثلاً۔

(1) اسے وہ اربابِ تحقیق و فکر جو علم و اخلاص میں مساوی مگر مزاج میں مختلف اور ایک ہی مسئلہ میں داد تحقیق دے رہے ہیں ظاہر ہے کہ دونوں کے فکر کا نتیجہ بھی مختلف ہوگا۔

(2) سوداوی مزاج اور عجلت پسند اہل علم! ایسے حضرات کے ذہن میں پہلی بار جو کچھ آ گیا۔ اسے دوسروں کے سامنے رکھ دیا۔ مگر یہ بھی تو صحیح نتیجہ نہیں ہو سکتا۔

(3) صوفی منش' رقیق القلب یا دنیا و جہان سے دل برداشتہ اہلِ علم کی کاوش فکر کا جہاز جس ساحل پر نظر انداز ہو گا وہ ظاہر ہے۔

(4) محض مادہ پرست اہلِ تحقیق! جن کی قوتِ فکر صرف مادیت کا طواف کرنے میں معروف ہے۔ یہ حضرات مادہ سے خارج کسی شے کو اپنے نتائجِ افکار سے بہر اندوز ہونے ہی نہیں دیتے۔

(5) جو پہلی چار قسموں سے مختلف اور عام ہے یہ لوگ دوسری حیثیتوں سے باہم مختلف مزاج ہیں اور ایسے اربابِ کاوش کی فکر میں یگانگت کا تصور ناممکن ہے۔

اختلافِ طبائع نعمت ہیں جہاں یہ اختلافِ طبائع ہی کا کرشمہ ہے کہ صنعت و ایجاد میں گوں ناگوں ایجادات وجود میں آئی ہیں۔ وہاں اختلاف علمی تحقیق کے لئے باعث زوال ہی ہے۔ اس لئے تاریخ میں تحقیق کے لئے قدم اٹھانے سے پہلے ذاتی میدان اور انفعال مزاج سے بچتے ہوئے خود پر ان علمی قواعد کی پابندی لازم کر لیجئے جن کی مدد سے آپ حقیقت کے سوا کسی اور منزل کی طرف رخ نہ کریں۔

جس طرح اہل قلم دوران تصنیف اپنے عقیدہ کے تاثرات سے محفوظ نہیں رہتے اسی طرح مستشرقین میں بھی ایسے اربابِ قلم ہیں جو علمی تحقیقات میں ذاتی رجحانات کی دخل اندازی سے اپنا دامن نہیں بچا سکتے اور یہ مصیبت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب اربابِ تصنیف کی بنیاد ان کی اپنی خواہشات اولیت ترجیح ہوتی ہیں۔

میرا خیال ہے کہ علمی تحقیقات میں اپنے رجحانات کو دخل انداز ہونے دیا جائے اور نہ ہی دوسروں کی مبہم عبارتوں پر بھروسہ کیا جائے۔ تحقیق کا مقصد تو یہ ہے کہ دوسروں کی غلطی کی اصلاح کرتے ہوئے خود کو اس لغزش سے روکا جائے۔

میں چاہتا ہوں کہ اس اجمال کی تفصیلات پر چند اور حروف سپردِ قلم کروں امید ہے کہ میری طرف سے اس حرف گیری میں انصاف ہاتھ سے نہ جائے گا۔

اسلام کی تحقیقات میں مستشرقین کی حسنِ نیت اور دقتِ نظر قابلِ ستائش سہی مگران کے سامنے جو مواقع حائل ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے ناممکن ہے کہ وہ منزل سے سلامتی کے ساتھ نکل سکیں اور اس کی وجوہ مندرجہ ذیل ہیں۔

(1) مستشرقین کی عربی لغت میں عدم دسترس جس کی وجہ سے وہ عربی عبارات کے اسرار رموز پر احاطہ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔

(2) ان کے نقطۂ نظر میں ایک خامی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی عیسائی تاریخ کے علم و دین میں جس طرح کی الجھنیں پاتے ہیں ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اسلامی تاریخ میں بھی ویسی ہی الجھنیں ملیں۔

(3) جدید علوم کی روشنی میں یورپین اقوام کے نفس کی مذہب سے نفرت نے کلیسا اور مستشرقین دونوں کو چراغ پا کر رکھا ہے۔ البتہ ان یورپی اہلِ قلم کو مزید یہ بھی اختیار ہے کہ وہ اسلام پر قلم اٹھاتے وقت اپنی عصبیت میں جوش و خروش پیدا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ حقیقت اور ان کی تحقیق دونوں میں مشرق و مغرب کا سا فاصلہ ہو جاتا ہے۔

اہلِ قلم مسلمانوں سے درخواست

ہر اس اہلِ قلم مسلمان پر یہ ذمہ داری ہے جو بلادِ اسلامیہ میں بود و باش رکھتا ہو۔ اس کے مشاغل صرف دینی علوم تک محدود ہیں یا وہ علومِ دین کے ساتھ علم جدید کی راہوں سے بھی آگاہ ہو اسے چاہیے کہ خامہ فرسائی کے درمیان تو انصاف کو ہاتھ سے جانے دے نہ علمی تحقیق سے اپنا دامن بچائے۔

مسلمان اہلِ قلم جو عربی زبان کے ادراک اور عرب معاشرت سے پوری طرح آگاہ ہیں اگر ان مسائل پر دقّتِ نظر سے قلم اٹھائیں گے تو مستشرقین میں سے زیادہ نہ سہی مگر چند ایک ایسے اہل قلم نکل آئیں گے جو ان مصادر (اسلام کے صحیح ماخذ) کی بنا پر اپنے نظریات کی اصلاح کر سکیں گے اور مسلمان اربابِ تحقیق کے نتائج کو تسلیم کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ میرے خیال میں یہ کام ناممکن نہیں۔ لیکن مسلسل جدوجہد اور تحقیق مطالعہ کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ لیکن مسلمانوں کی طرف سے ایسی معیاری علمی تصانیف شائع ہو جانے سے اسلام اور انسانیت دونوں کا مستقبل درخشاں ہو جائے گا۔

اسلام کے متعلق تحقیقاتِ علمی میں تقسیم کار

(1) اسلاف (اسلام) کی تاریخ دو حصوں میں تقسیم کر دی جائے!

(ا) دور اول :۔ اوائلِ اسلام سے لے کر عثمان رضی اللہ عنہ تک!

(ب) :۔ دورِ ثانی عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت سے لے کر اجتہاد کامل ہونے تک!

خلافتِ اولیٰ و ثانیہ میں مسلمانوں کا اتحاد

اولین دور میں مسلمان آپس میں اس قدر متحد رہے کہ نہ تو خلافت اولیٰ پر ان میں اختلاف پیدا ہوا اور نہ خلیفہ اول کی طرف سے ان جنگوں میں جو ان کے عہد میں مرتدین کے خلاف لڑی گئیں باہم اختلاف رونما ہوا۔ اور نہ خلیفہ ثانی کے عہد میں ان حملوں کے مواقع پر کوئی اختلاف ہوا جو حملے دوسروں کے ملک فتح کرنے کے لئے کئے گئے۔

شہادتِ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے ساتھ مسلمانوں میں اختلاف و اشقاق کی رو چل نکلی جس کا سب سے ہولناک حادثہ حضرت علی اور امیر معاویہ کی لڑائی ہے۔ جس کے بعد یا تو مدتوں خفیہ سیاسی تحریکیں مسلمانوں کی وحدت میں خلفشار کا سبب رہیں یا علانیہ جنگیں۔ حتیٰ کہ دین پر سیاست چھا گئی۔

خلیفہ اول اور عباسی حکمران منصور

ان دونوں حضرات کے دو ابتدائی خطبے بتا رہے ہیں کہ جہاں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا۔ وہاں عباسی بادشاہ (منصور) نے اپنی ذات کو مسلمانوں کی گردنوں کے مالک کی صورت میں جلوہ آرائی کی۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خطبہ

ایہاالناس انی قدولیت علیکم ولست بخیر کم فان حسنت فا تبعونی وان اسات فتقومو نی الصدق' امانۃ والکذب خیانۃ والضعیف فیکم قوی عندی حتی ریح علیہ حقہ ان شاء اللہ والقوی فیکم ضعیف عندی حتی اخذالحق منہ انشاء اللہ لایدع قوم الجہاد فی سبیل اللہ الامربھم اللہ بالذل ولاتشیع الفاحشۃ فی قوم الاعمھم اللہ بالبلاءا طیعونی مااطعت اللہ و رسولہ فان عصیت اللہ و رسولہ فلاطاعۃ لی علیکم قوموا الی الصلوۃ یرحکم اللہ

حضرات مجھے آپ لوگوں کا امیر تو بنا دیا گیا ہے مگر آپ لوگوں پر مجھے کوئی فضیلت نہیں۔ اگر میں بہتر طریق پر چلوں تو میری مدد کیجئے اور جب مجھ سے غلطی ہو تو مجھے راہ

راست پر لائیے حضرات یاد رکھئے صدق امانت ہے اور کذب کا دوسرا نام خیانت! میری امارت میں ضعیف شخص طاقتور ہے۔ کیوں کہ میں جب تک اس کا حق اسے نہ دلا دوں مجھے چین نصیب نہ ہو گا۔

انشاء اللہ اسی طرح کوئی شخص میرے نزدیک اس قدر کمزور ہے کہ جب تک میں اس سے (انشاء اللہ) حق ادا نہ کرواؤں گا مجھے تسکین نہ ہو گی۔

حضرات یاد رکھئے جو قوم جہاد فی سبیل اللہ سے قدم ہٹالیتی ہے اللہ تعالیٰ اسے ذلیل کر کے دھتکار دیتا ہے اور جب کسی قوم میں بے حیائی اور فحش پن عام ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس قوم پر کوئی انجانی مصیبت نازل فرما دیتا ہے۔ اے مسلمانو اس وقت تک میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتا ہوں۔ ورنہ تم بھی میری اطاعت سے آزاد ہو۔ اب نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے۔

عباسی حکمران منصور کا خطبہ

منصور 136 تا 158 میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے 123 سال بعد سریر آرائے سلطنت ہوا۔ اس کے خطبہ کا ایک ایک حرف مسلمانوں پر بزورِ شمشیر حکمرانی کا فرمان سنا رہا ہے۔

ایھا الناس انما انا سلطان اللہ فی ارضہ اسوسکم بتوفیقہ و تائیدہ وحارسہ علی مالہ اعمل فیہ بمیشۃ وارادتہ واعطیہ باذنہ فقد جعلنی اللہ علیہ قفلا ان شاء یفتحنی الا اعطاکم وقسم ارزاقکم وان شاء یقفلنی علیھا اقفلنی۔

حضرات اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ لوگوں پر دنیا میں حکمران بنایا۔ میں اس کی مدد سے ہی تمہیں سیدھی راہ پر چلا سکتا ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے مال کا محافظ قرار دیا ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو میں اس کا دیا ہوا مال تم پر خرچ کروں گا۔ اگر اس کا منشاء نہ ہو گا تو میں یہ مال روک لوں گا۔

اگر ہم ان دونوں خطبوں کا موازنہ اسلام کی ابتدا سے لے کر دوسری صدی کے آخر کے حصہ اول سے کریں تو ہمارے سامنے یہ افسوسناک حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ اسلامی جمہوریت کتنی جلدی شخصی اقتدار میں منتقل ہو کر ختم ہو گئی اور کس طرح اسلام کی یک جہتی میں بتدریج انحطاط آنا شروع ہوا۔ حتیٰ کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کو ابھی دو صدیاں بھی نہیں گزری تھیں کہ اسی زوال کا اثر اپنا رنگ لے آیا۔ جس کے بعد ایک وقفہ تک اکثر نئے ملک مغلوں اور سلجوقیوں کی وجہ سے اسلامی قلم رو میں داخل

ہوئے زمانۂ اولیٰ سے لے کر عہد عثمان رضی اللہ عنہ تک مسلمانوں کی زندگی کے خدوخال میں اسلامی معاشرہ کا اثر غالب تھا۔ جو اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی حیاتِ اجتماعیہ پوری طرح وجیہ اور پر شکوہ تھی۔ مگر یہ اثرات اموی دور خصوصاً عباسی دور میں شعوبی (قبائل) اثرات میں جذب ہو کر غائب ہو گئے۔

باوجودیکہ ان دونوں عہدوں میں علم و حکمت کی فراوانی تھی کیونکہ یہ نئے اثرات دوسری قوموں میں سے آئے تھے مگر اسلام اصولوں کے بالکل منافی تھے۔

یہود و نصاریٰ کے مسلمان ہونے پر نئی افتاد

یہودی و نصاریٰ اور عجمی لوگوں میں جو لوگ بظاہر مسلمان ہو چکے تھے۔ انہوں نے قصرِ اسلام میں عجیب طریقہ سے تخریب کاری شروع کی کہ یہ طائفے نئے اصول وضع کرتے اور ان کی تائید و ترویج کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب کر کے حدیثیں وضع کرتے اور بعض باتوں کی نسبت خلفائے راشدین سے کر دیتے! اس دور کی بیشتر احادیث ذاتی رجحانات کا نتیجہ ہیں۔ اس نے ان کو قبول کرنے میں عجلت سے کام نہ لیا جائے۔ اس بارے میں سب سے مقدم اصول یہ ہے کہ جو حدیث قرآن مجید سے متفق نہ ہو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسوب ہونے کے باوجود تسلیم نہ کی جائے۔

زمانۂ اُولیٰ سے عثمان رضی اللہ عنہ کی روایات

مگر تاریخی واقعات کے متعلق جو روایات ہیں ان کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہ کیا جائے (کیونکہ تاریخی روایات بیان کرنے والے فرشتہ صفت ہوتے ہیں مگر حدیث بیان کرنے والے ناقابلِ اعتماد ہوتے ہیں۔ مولف کا یہی ارشاد ہے م) خصوصاً عہد عثمان کے بعد مرویات کی صحت کے لئے اس دور کی روایات کو معیار صحت قرار دیجئے۔

اگر مسلمان اس کام کو پوری تن دہی اور تدبر و تفکر سے پورا کر سکیں تو اسلام کے اصول اور اس کا نظامِ زندگی جس کی بدولت عرب کے بادیہ نشین بیس سال سے کم مدت میں تمام عالم پر چھا گئے۔ عقلی اور نفسیاتی طور پر دنیا کے سامنے پیش کر کے پھر سے جہاں والوں کو اسلام کی طرف راغب کر سکیں گے۔

اور اگر ہم اس مہم میں کامیاب ہو گئے تو تاریخ کے ان عظیم الشان واقعات کا ہم دنیا کو جو سبق پڑھا سکیں گے وہ عوام کے لئے ایسی دعوت عام ہو گی جسے قبول کرنے سے انسانیت کا معیارِ زندگی بلند ہو گا جس طرح کہربا (بجلی) اور "ایتھر" جیسی مادی قوت سے دنیا نے طرح طرح کے فوائد اور منافع حاصل کئے ہیں۔ بلکہ ان

دونوں سے کہیں زیادہ فلاح و بہبود کا سامان انسانیت کا مقدر بن جائے گا۔ جس سے انسان کی روح اور دل دونوں کی تسکین حاصل کر سکیں گے۔

میں پھر اعادہ کرتا ہوں اگر مسلمان اہلِ قلم زحمت گوارا فرما سکیں تو انہیں اسلام کو اس طرح دنیا جہان کے سامنے پیش کرنا چاہیے۔ جس طرح وہ عرب کے بدوؤں کے سامنے پیش ہوا جنہوں نے اسلام پر عمل پیرا ہو کر بے شمار ملکوں کو اپنے حضور سرنگوں کر لیا۔

حیاتِ محمد ﷺ دنیا کے لئے نمونہ ہے

اس مقصد کے لئے سب سے مقدم رسول اللہ ﷺ کی ایسی سیرت کی تدوین کرنا ہے۔ جو علم و معرفت کے طریقوں پر (مؤلف کی خواہش کے مطابق) مرتب کی جائے تاکہ محمد ﷺ کی زندگی دنیا کے ہر تمدن میں نمونہ ثابت ہو۔ مگر خیال رہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کا سب سے بہتر "اصدق" مخزن قرآن مجید ہے۔ جس میں باطل اور ریب کا شائبہ تک نہیں۔ قرآن کی صداقت کا یہ یہی ثبوت ہے کہ وہ دنیا میں ساڑھے تیرہ سال سے موجود ہے اور روز اول سے لے کر اب تک اس کے کسی شوشہ و نقطہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا۔ اس کا یہ دوام اور عدم تغیر اس امر کا بیّن ثبوت ہے کہ جب تک نظام عالم قائم ہے۔ قرآن مجید بھی لازوال ہے اور باقی رہے گا جو اس کے محفوظ اور من جانب اللہ ہونے کے یقین کے مطابق ہے۔

"انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون" (10:9) ہم اللہ ہی نے قرآن نازل فرمایا اور ہم ہی اس کی صحت اور دوام کے نگہبان ہیں۔

قرآن مجید کی تعلیم اس امر کا واضح ثبوت ہے۔ کہ وہ بذات خود ایسا عظیم معجزہ ہے جو حضرت محمد ﷺ کو دیا گیا۔ اس کا اسلوب اس کا انداز اور ہمہ محاسن محیط کلام اس وقت تک جلوہ آراء رہے گا جب تک یہ نظام مربوط ہے۔ اس لئے مسلمان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو قرآن مجید کے آئینہ میں پیش کریں اور آپ سے متعلقہ روایات میں سے جو قرآن مجید کے موافق ہوں اسے قبول کرنے میں تامل نہ کریں مگر قرآن کے سوا دوسرے ذرائع سے جو ایسے امور آنحضرتؐ کی سیرت طیبہ سے متعلق منقول ہوں کہ وہ قرآن مجید کے معیار پر پورے اتر سکیں ان سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

حرف آغاز

راقم السطور سے جہاں تک ہو سکا یہ نکتہ پیش نظر رکھا اور جب "حیات محمد

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پہلا ایڈیشن طبع ہوا تو میں نے اللہ تعالیٰ کے حضور شکر ادا کرتے ہوئے دعا کی کہ مجھے اس راہ میں مزید تحقیق و تعمق کی توفیق عطا فرمائیں جو دوسروں کے لئے ہدایت اور گمراہی سے دور رکھنے کا ذریعہ بن سکے (آمین) ربنا علیک توکلنا والیک انبنا والیک المصیر) (4:60)

اسلام سے پہلے جزیرہ نمائے عرب

کرۂ ارض پر اوّلین گہوارۂ تمدّن

تہذیب و تمدّن نے ابتدا میں کون سے خطۂ ارض کو اپنی نشوونما کیلئے منتخب کیا؟ اس زمین پر زندگی نے بذاتِ خود کون سی تاریخ کو سب سے پہلا سانس لیا؟ ان تاریخی حقائق کو جاننے کی کوشش میں کی جانے والی بحثیں آج تک کسی یقینی فیصلہ تک نہیں پہنچ سکیں۔ البتہ یہ حقیقت سب نے تسلیم کرلی ہے کہ آج سے چھ ہزار برس پہلے تہذیبِ انسانی کا سب سے پہلا گہوارہ بننے کا شرف خطۂ مصر کو ہی نصیب ہوا۔

اب آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا عراق و شام کے آثارِ قدیمہ کی چھان بین کا مقصد صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ عہدِ فراعنہ کا مصر آشوری اور فنیقی قوموں سے پہلے تہذیب و تمدن کے حسن کا اعزاز حاصل کر چکا تھا؟ یا آشوری اور فنیقی قوم کے زمانے کا مصر تہذیب و تمدن کی رونق سے فیض یاب ہو چکا تھا؟

ماہرینِ آثارِ قدیمہ اس تاریخی حقیقت سے کس حد تک نقاب ہٹا سکیں گے، علم التحقیق کے فیصلہ کن اعلان سے پہلے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جس طرح چین اور مشرقِ اقصیٰ کے متعلق تحقیق و جستجو کے ہاتھ ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکے، اسی طرح مصر اور عراق و شام کے اس مسئلہ تخصیص و امتیاز میں بھی اب تک کوئی قابلِ اظہار دریافت نہیں ہو پائی۔

البتہ علم التحقیق اس بات کو تسلیم کر چکا ہے کہ دریائے روم (بحرہ ابیض) کے ساحل پہ پھیلی ہوئی فراعنۂ مصر اور عراق و شام کی آشوری اور فنیقی بستیاں جہاں آباد تھیں وہی عہد فراعنہ کا خطہ مصری تہذیب و تمدن کا سب سے بڑا اولین مرکز تھا۔

اسی عہدِ فراعنہ کے اس خطہ مصر نے اپنی تہذیب کے دامن میں روم اور یونان کو سمیٹا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ آج کے مصر کا تمدن بھی اسی عہدِ قدیم کے شاندار تمدن کا ثمر تسلیم کر لیا گیا ہے۔

اسلامی تمدّن کا مصر کی تہذیب پر اثر

آثارِ قدیمہ کے ماہرین اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ مصر، آشوری اور فنیقی قومیں اور یونان و روم کا تمدن اپنے ارتقاء میں ایک خاص حد سے آگے قدم نہ بڑھا سکا مگر جیسے ہی اسلام نے اپنی

سرزمین "جزیرہ نمائے عرب" وادئ بطحا سے باہر ان ملکوں میں قدم رکھا تو ان ملکوں کے قدیم تہذیب و تمدن کی خزاں پر بھی بہار چھا گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذکورہ تمام ممالک اسلامی تہذیب و تمدن کے اثر سے فیض یاب ہو کر اپنے جنوب و شمال مشرق و مغرب کی بیمار تہذیبوں کو شفاء اور ارتقاء بخشنے کا سبب بنے!

وہ لقمان و سقراط کے درِ مکنوں وہ اسرارِ بقراط و درسِ فلاطوں
ارسطو کی تعلیم سولن کے قانون پڑے تھے کسی قبرِ کہنہ میں مدفوں
یہیں آ کے مہرِ سکوت ان کی ٹوٹی
اسی باغِ رعنا سے بُو ان کی پھوٹی

روم کا قدیم تمدن ہزاروں برس پہلے

بحرِ قلزم اور اس کے قرب و جوار کے علاقوں یعنی روم کے ساحل اور اس کے گردو پیش کے حصوں میں تمدن کا معیارِ ترقی جس بلندی پر تھا اس پر ابھی تک اہلِ علم و بصیرت حیرت زدہ ہیں۔ ان اقوام نے لوگوں کو صنعت و حرفت تجارت و زراعت کے علوم کے علاوہ اسلحہ سازی اور جنگی فنون میں بھی بے پناہ مہارت حاصل تھی۔ اور اس حیرت ناک عروج تمدن کی اصل روح دین ہی کی ولولہ انگیز قیادت تھی۔ اور اسی بناء پر ان اقوام کا تمدن نہ صرف برقرار رہا بلکہ ہر لحہ ترقی کی طرف گامزن رہا۔ شواہد گواہ ہیں کہ یہ لوگ صنعت و حرفت ہو یا تجارت و زراعت جنگ و جدل کا معاملہ ہو یا امن و آشتی کا سب سے پہلے یہ مذہب ہی سے فتویٰ حاصل کرتے تب عملی قدم اٹھاتے!

مذہب اور تمدن کا باہم تعلق

انتہائی قدیم زمانے سے ہی مصری اور یونانی عوام مختلف معبودوں اور یونانی بتوں کی پوجا میں ایسے گرفتار تھے کہ دونوں قوموں کے خداؤں یا بتوں میں عہد بہ عہد تغیر و تبدل ہونے کے باوجود ایک لحہ بھی ایسا نہیں گزرا جس میں یہ دونوں فریق مذہب کی گرفت سے آزاد ہوئے ہوں یا کسی متبادل کوشش کی طرف انہوں نے رخ کیا ہو۔ واقعات کا یہ غیر منقطع تاریخی تسلسل اس بات کا ٹھوس ثبوت ہے کہ اولاد آدم کو جس تہذیب و تمدن کے عروج سے بہرہ ور کیا ہے وہ تمدن نہ صرف زمانۂ قدیم سے ہی مذہب کی گود میں پل کر جوان سال ہوا ہے بلکہ یہ آج بھی مذہب ہی کے گہوارے میں پرورش پا رہا ہے۔ یقیناً آج کا تمدن مذہب کی گرفت سے نکل جانے کی سرتوڑ

کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ہماری دانست کے مطابق اس کی ایسی تمام کوششوں کے نتائج اس بات کی دلیل ثابت ہو رہے ہیں کہ انسان مذہب سے جتنا فرار پانے کی کوشش کر رہا ہے اتنا ہی مذہب کی گرفت کو اپنے لئے اور مضبوط کر رہا ہے۔ آثار و قرائن کی روشنی میں اس سچائی کا اظہار غلط نہ ہو گا کہ مستقبل قریب یا بعید میں تمدن خود ہی مذہب کے سامنے سرنگوں ہو جائے گا۔

مرسلین کے ظہور کا تسلسل

سطور بالا میں ہم نے جن ممالک کا ذکر کیا ہے۔ ان کا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ہی قریبی تعلق ہے جیسے ہاتھ کی انگلیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ وابستگی ہوتی ہے اور ان ممالک میں چند ہزار سال پہلے جس تمدن کی عظیم الشان تعمیر مذہب کی بنیادوں پر ہو گی اور ان ممالک کے خطوں میں مرسلین کے ظہور کا تسلسل ہمارے دعوے کی ٹھوس شہادت ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک مضبوط کڑی اس خطہ میں موسیٰ علیہ السلام کا ظہور ہے۔

موسیٰ علیہ السلام جنہوں نے اسی مصر ہی کے ایک فرعون نامی بادشاہ کی گود میں پرورش پائی اس بادشاہ کے درباریوں میں ایسے کاہن اور مذہبی پیشوا بھی موجود تھے جن کی گفتگو سے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ جل شانہ کی وحدت اور اس کون و مکاں کی تخلیق کے ایسے سربستہ راز حاصل کر لئے جن سے عام درباری بالکل ناواقف تھے۔ یہاں تک رب العالمین نے موسیٰ علیہ السلام کو اس قوم کی ہدایت کیلئے منصب رسالت کا اعزاز بخشا۔ جو قوم فرعون ہی کے زیر حکومت انتہائی ذلت آمیز زندگی بسر کر رہی تھی۔ لیکن فرعون نے جوں ہی موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے اعلانِ توحید سنا تو اس نے اپنی خود ساختہ خدائی کی مدافعت میں **انا ربکم الاعلیٰ** کا اعلان کرنا ضروری سمجھا۔ فرعونِ مصر اور موسیٰ علیہ السلام کے درمیان طویل کشمکش کے بعد فرعون کے جادوگروں سے فاتحانہ مقابلہ ہوا اور موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم (بنی اسرائیل) کو ساتھ لے کر مصر سے فلسطین کی طرف ہجرت کر گئے!

عیسیٰ علیہ السّلام کا ظہور

اسی سلسلہ مذہب کی ایک کڑی عیسیٰ علیہ السلام کا فلسطین کی سرزمین میں ظہور پانا ہے۔ اللہ جل شانہ نے انہیں "روح اللہ" اور "کلمتہ اللہ" کے خطاب سے مشرف فرمایا۔ اللہ تعالیٰ کے یہ رسول اس وقت تک دین کی تبلیغ میں مصروف رہے جب تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو

آسمان کی طرف اٹھالیا۔ ان کے بعد ان کے حواریوں نے ان کے دین کی تبلیغ کیلئے اپنے آپ کو وقف کردیا۔ جس کی بناء پر انہیں بھی طرح طرح کی اذیتیں سہنا پڑیں۔

مسیحیت اور زردتشت کا ٹکراؤ

دینِ مسیح کی حمایت میں اگرچہ سلطنتِ روما کا جاہ و جلال تھا۔ اسی طرح ایران کے دین زردتشت یا زرتشت کی پشت پناہی میں ایران کے علاوہ مشرقِ وسطیٰ کے ہم نوا ملک اور ہندوستان بھی تھا۔ لیکن ان دو مضبوط طاقتوں کی پشت پناہی اور حمایت کے باوجود دونوں مذاہب میں جنگ کی صورت صف آراء ہونے کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ البتہ ایک دوسرے سے مذہبی نامانوسیت ضرور قائم رہی۔ بظاہر عدمِ تصادم کے دو سبب تھے ایک تو یہ کہ ایک مدت تک عراق اور شام میں آباد مصر اور اس کی ہم عقیدہ آشوری اور فنیقی اقوام مغرب کے رومی عیسائیوں اور مشرق میں رہنے والے زردشتی ایرانیوں کے درمیان حائل رہیں۔ انہوں نے ان دونوں کو باہم الجھنے کے مواقع ہی نہیں دیئے۔ دوسری وجہ ان دونوں کے ملکوں میں فاصلے کی طوالت بھی تھی۔ مگر جب مصری اور فنیقی بھی مسیحی دین کے حلقہ بگوش ہو گئے تو روم اور ایران میں اس نقطہ نگاہ سے فاصلہ کم ہوگیا۔ جس کے نتیجہ میں زردتشت اور عیسائیوں میں معرکہ آرائی شروع ہو گئی جو صدیوں تک چلتی رہی۔ لیکن فریقین اس صورت میں بھی ایک دوسرے کے دین کی تحقیر پسند نہیں کرتے تھے۔ بلکہ جہاں تک ہو سکتا دونوں فریق ایک دوسرے کے دین کی تعظیم و تکریم کر کے اپنے حسن اخلاق و کردار کا مظاہرہ کرتے رہے ———— طبعاً ایک دوسرے کے دین سے دور ہونے کے باوجود نہ تو عیسائی زردشتوں کے سامنے اپنا دین پیش کرتے اور نہ ہی ایرانی (زردشتی) ہی عیسائیوں کی بستیوں میں اپنے مذہب کا پرچار کرتے! گویا دونوں کا مذہبی عقیدہ اپنی اپنی حدودِ مملکت تک ہی مقید تھا۔

یہاں تک کہ جب ایران نے روم، شام اور مصر پر اپنا پرچم لہراتے ہوئے قسطنطنیہ کے دروازے پر دستک دی تب بھی ایران کے فاتح حکمرانوں نے نہ صرف مفتوحہ ممالک میں اپنے مذہب زردتشت کا پرچار کرنے سے اپنا دامن بچائے رکھا۔ بلکہ اس کے برعکس مفتوحہ قوم کے عقیدہ کا احترام کر کے اپنے کردار کا قابلِ تعریف نمونہ پیش کیا۔ انتہا یہ ہے کہ جنگ کے درمیان جن کلیساؤں کو نقصان پہنچا تھا، ان کی دوبارہ مرمت اور تعمیر کے بعد انہیں پوری آزادی کے ساتھ ان میں عبادت کرنے کی اجازت بھی دے دی۔

ایرانیوں کے اس خیر سگالی جذبے کا سب سے بڑا مظہر صلیب کے اس ہیکل کی نگہداشت

تھی جو صدیوں سے مسیحی اقوام کا مذہبی آماجگاہ تھا۔ اور طویل لڑائیوں کے عرصہ میں ان پر ایرانیوں ہی کا قبضہ تھا۔ اس کے باوجود اہلِ ایران نے اس ہیکل کی تعظیم میں حتی الامکان کوئی کمی نہیں آنے دی! مختصر یہ کہ دین زرد تشت اور عیسوی مذہب میں، جب بھی مشرق میں لڑائیاں ہوئیں یا مغرب میں جنگ ہوئی تو دونوں جگہ ،متحارب فریقین نے ایک دوسرے کے مذہب سے دوری کے باوجود ایک دوسرے کے مذہب پر تنقید و بحث تو ایک طرف عام گفتگو کرنے سے بھی گریز کیا۔

قسطنطنیہ اور روما میں اقتدار کی جنگ

چھٹی صدی عیسوی تک تو دونوں زردشتی اور عیسائی اپنی اپنی جگہ برقرار رہے مگر اچانک قسطنطنیہ اور روما میں باوجودیکہ دونوں بادشاہ ایک ہی مذہب کے پیرو یعنی عیسائی تھے اقتدار کی جنگ چھڑ گئی۔ اور سلطنتِ روم جس کی ہیبت کا سایہ شام سے لے کر انگلستان تک پھیلا ہوا تھا' اور روم کے شہنشاہ جولیس کے زمانہ حکومت تک قائم رہا مگر اس کے بعد آہستہ آہستہ زوال آتا گیا۔

روما اور قسطنطنیہ کی معرکہ آرائی کے آخری دنوں میں اردگرد کی زیر نگیں وحشی قوموں نے روما کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے شاہی حقوق غصب کرنا شروع کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ روما شاہی کا رعب و دبدبہ بھی گیا اور مذہبی اقتدار بھی قسطنطینِ اعظم کے ہاتھوں با جگزار ہو گیا۔ روما کی تباہی کے اثر سے وہ مسیحی جاں باز بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جن کی شمشیرِ آبدار نے سلطنت کی حفاظت میں اپنے ہر ممکن جوہر دکھانے میں کوئی کمی نہ کی تھی۔

مسیحی وحدت ٹکڑوں میں

آخری چھٹی صدی عیسوی میں مسیحیت مختلف فرقوں میں بٹ گئی۔ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ مسیحی عقائد میں نئے نئے شگوفے پھوٹنے لگے۔ یہاں تک کہ دین کے بنیادی عقائد کی وحدت بھی پارہ پارہ ہو گئی۔ عقائد کے اختلاف نے ان کے درمیان مذہبی بنیاد کی جگہ ایک دوسرے کے فرقہ کی دشمنی نے لے لی۔ ہر فرقہ اپنے عقیدہ کے مخالف سے دشمنی اپنا جزوِ ایمان سمجھنے لگا۔ گویا روما کے عیسائی اس اخلاقی پستی کا شکار ہو گئے جو زوال پذیر قوموں کا مقدر ہوتی ہے۔

مسیحی فرقوں کے عقائد پر ایک نظر

(1) ایک گروہ کا عقیدہ تھا کہ مسیح کے ظاہری جسم کی حیثیت ایک انسان سے زیادہ نہیں اور ان دیکھنے والی آنکھوں سے اس کا ادراک ناممکن ہے۔

دوسرے گروہ کا ایمان یہ تھا کہ مسیح کی روح اور جسم دونوں ایک ہی جوہر کا کرشمہ ہیں اور اس کا احاطہ ظاہری آنکھ کیلئے ناممکن ہے۔

تیسرے گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ مریم عذرا کی عبادت ہم پر واجب ہے۔

چوتھے گروہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ولادتِ مسیح تک مریم کی بکارت محفوظ رہی مگر بعد میں انہوں نے تزویج سے اپنے آپ کو ملوّث کر لیا۔

چنانچہ عقائد کے باہم اختلافات پر بحث و تکرار کے لفظی ہنگامے برپا ہو گئے۔ جو قوموں کے ضعف و زوال کے مواقع پر عموماً رونما ہو جاتے ہیں۔ پھر ان تمام مباحث کا ما حصل دماغی تفریح کے سوا اس قوم کے فردِ عمل میں کچھ نہیں لکھا جاتا۔ اور ایسے جھگڑوں پر عقل دور کھڑی اپنا منہ نوچتی رہتی ہے۔

ایک مسیحی راہب کا بیان

اس زمانہ میں عیسائیوں کا شوقِ مناظرہ شہروں کے گلی کوچوں سے نکل کر بازاروں میں داخل ہو گیا جہاں جدل و بحث کا یہ عالم تھا کہ اگر آپ نے صراف کے ہاتھ پہ سونے کی ڈلی بیچنے کیلئے رکھی ہے تو وہ اس کی خرید و فروخت کی بات چیت کرنے کے بجائے وہ آپ سے یہ پوچھے گا کہ آپ کے نزدیک مادہ قدیم ہے یا حادث؟ اور اگر کسی روٹی پکانے والے سے آپ نے روٹی کی قیمت پوچھی ہے تو وہ روٹی کی قیمت بتانے کی جگہ یہ پوچھے گا کہ بیٹے (مسیح) کے مقابلہ میں باپ (اللہ) کا مرتبہ کیوں زیادہ ہو گیا؟ اور بیٹے کے ذمہ باپ کی فرمانبرداری کا کیا سبب ہے؟ اور اگر آقا اپنے غلام سے دریافت کرتا کہ حمام میں پانی گرم ہوا ہے یا نہیں تو وہ جواب میں آقا سے سوال کرے گا۔ جناب یہ تو فرمائیے کہ بیٹا (مسیح) کس طرح عدم سے وجود میں آیا؟

مسیحی عوام کے باہم بحث و تکرار کے ہیجان و اضطراب سے عمائدینِ سلطنت بالکل لاپرواہ تھے۔ بلکہ روم کے بادشاہ کا اقتدار اور شوکت رعایا کے اس مشغلہ کے سبب اور مستحکم ہو تا گیا۔ کیونکہ ماتحت فرقے ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ گو اس نزاع کا تعلق صرف لفظوں کی حد تک تھا۔ لیکن بادشاہت ان کی اس غفلت شعاری سے بہرہ ور ہو کر دن بدن عروج پا رہی تھی۔

ان بحثوں کے بے معنی ہونے کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ یہ لوگ مناظروں کی مقررہ حدود سے کبھی آگے نہ بڑھتے اور اگر کبھی کبھار ایسا ہو بھی جاتا تو ایسی مجلسیں منعقد کی جاتیں جن میں دونوں فریق کی بحث سننے کے بعد فیصلہ کیا جاتا کہ کس کا موقف صحیح ہے اور کون غلط ہے۔ خاص کر ان حالات میں اندازِ مناظرہ اس طرح بے کار ہوتا جب ایک گروہ دوسرے گروہ کو اپنا ہم خیال بنانے یا خود اس کے ہم خیال بننے کی صحیح روش کی جگہ اپنی اپنی ضد کا احترام زیادہ کرتا۔

شہنشاہ روم کا چترشاہی مناظرہ کرنے والوں اور ان کے ہم خیال لوگوں پر پوری طرح سایہ فگن رہتا۔ تمام فریق اپنی اپنی جگہ یہی تاثر رکھتے کہ بادشاہ بھی ان کا ہم عقیدہ اور ہم ایمان ہے۔ بلکہ بعض دفعہ تو یہ یقین کر لیا جاتا کہ پس پردہ بادشاہ سلامت بھی ان کے عقیدہ کی نگہبانی فرما رہے ہیں اس کی محض وجہ یہ تھی کہ بادشاہ کی طرف سے ان مناظروں پر کوئی پابندی نہ تھی۔

ملک حبشہ' دریائے روم اور بحیرۂ قلزم کے ساحلوں پر مسیحیت کا نفوذ

روم کا عیسائی بادشاہ اپنے پسندیدہ مسیحی مذہب کو پھیلانے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف رہتا۔ مصر فتح کرنے کے بعد مصری عوام کو بھی تثلیث کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کر کے چھوڑا۔ مصر کی جغرافیائی حدود سے قریب ہونے کی وجہ سے حبشہ کو بھی مسیحیت ہی کو اختیار کرنا پڑا۔ آخر کار ان ممالک میں عیسائی مذہب کے اثر و رسوخ کی بناء پر مسیحیت نے بحیرہ قلزم سے لے کر دریائے روم کے ساحلی علاقوں پر اپنے قدم مضبوطی کے ساتھ جما لئے۔ شام و فلسطین کے عوام تو پہلے ہی سے بپتسمہ کے شرف سے مشرف ہو چکے تھے۔ کیونکہ ان ممالک میں عیسائی قبائل پہلے ہی سے پناہ گزین تھے۔ اس علاقہ پہ عیسائی غلبہ کی وجہ سے حیرہ' قبائل لخم اور مناذرہ 1- کو بھی مسیحیت کا اصطباغ "رنگ" لئے بغیر کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ لوگ کسی زمانے میں صحرائے عرب کی تند و تیز ہواؤں کے تھپیڑوں سے تنگ آ کر دریائے فرات کے ساحل پہ سرسبز و شاداب بستیوں میں آباد ہو گئے تھے۔ لیکن ان آبادیوں کے مکینوں کے کبھی خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ ایک دن ایران کے مجوسی زردشتی ان پر حکمران ہو جائیں گے۔

اہرمن و یزدان

روم کے شہنشاہ کی حدود سلطنت میں مسیحی عوام جس قسم کے مذہبی جنون میں مبتلا تھے۔ اس کا تذکرہ تو آپ سطور بالا میں پڑھ ہی چکے ہیں۔ اسی زمانہ میں ایران کے باشندے یزدان و اہرمن کے پجاری مجوسی بھی عیسائیوں کی طرح مذہبی جنون میں مبتلا تھے۔ یہاں کا ہر فرقہ عقیدہ

کے اختلاف کی بناء پر ایک دوسرے سے دست و گریباں رہتا۔ مگر اس بحث و جدل میں عیسائیوں ہی کی طرح مجوسی بھی صرف زبانی کلامی حد تک ہی رہتے۔ اور جس طرح سلطنتِ روما اپنی رعایا کے مذہبی جھگڑوں سے غیر متاثر رہی بالکل اسی طرح ایران کی مجوسی حکومت بھی اپنی رعیت کے مذہبی مناظروں کے منفی اثرات سے محفوظ رہی۔

جس طرح عوام کی باہم مناظرہ بازی نے رومی حکومت کو زیادہ مستحکم ہونے میں معاونت کی اسی طرح ایرانی عوام کے ذوقِ مناظرہ بازی نے مجوسی حکومت کے رعب و دبدبہ میں دن دگنی رات چوگنی ترقی کا اضافہ کیا۔

اس زمانے کا جزیرہ نمائے عرب

جب تاریخ کی پیشانی چھٹی صدی عیسوی کا عنوانِ درخشاں بنی تب جزیرہ نمائے عرب دو انتہائی طاقتور سلطنتوں میں گھرا ہوا نظر آتا ہے۔ مغرب میں سلطنتِ روما کی سطوت اور مشرق میں ایران کی پرشکوہ حکومت اسے خوفزدہ رکھنے میں کوشاں ہے۔ دونوں حکومتیں ہوسِ جہاں گیری میں ہر سانس پہ کسی دوسرے ملک پر قبضہ جمانے کی منصوبہ بندی کرتی نظر آتی ہیں۔ روم کا عیسائی اور ایران کا مجوسی اپنے اپنے مذہب کے پرچار کا جنوں لئے پھر رہا ہے۔ لیکن ان تمام فکری اور نظریاتی طوفانوں کے باوجود سرزمینِ عرب تمام سازشوں اور زہریلے منصوبوں سے محفوظ ہے۔ نخلستانِ عرب اپنی تمام قومی اور روایتی امتیازات میں بے داغ و سلامت ہے اس کی سرسبز و شاداب وادیوں میں کسی اجنبی کو قدم رکھنے کی جرات نہیں ہوئی۔ البتہ وہ علاقے جو حدودِ عرب کے کناروں پہ واقع تھے اور اہلِ حیرہ اور قبیلہ لخم کے مسکن تھے (جن کا ذکر گذشتہ سطور میں کیا جا چکا ہے) ان میں عیسائی اور مجوسی عربوں کے ہی جذبۂ خیرسگالی کے تحت پناہ گزیں ہوئے تھے۔

اس خطۂ عرب کا فطری مزاج اس لحاظ سے انتہائی قابلِ حیرت ہے کہ روم اور ایران کے انتہائی قریب ہونے کے باوجود ان دونوں سلطنتوں کا رعب و دبدبہ شہنشاہی طمطراق و سطوت ان کو مرعوب نہ کر سکا اور نہ ہی ان دونوں کے مذہبی عقائد اہلِ عرب کو متاثر کر سکے۔ اہلِ عرب زمانۂ قدیم سے جس وضع قطع اور طور طریقہ سے زندگی گزار رہے تھے۔ دنیا کی کوئی خارجی قوت بھی ان میں ذرہ برابر تبدیلی لانے میں کامیاب نہ ہو سکی۔

وادیٔ بطحا کی جغرافیائی حدود

خطۂ عرب کا وجود جغرافیائی ہیئت میں غیر متوازی الاضلاع مستطیل ہے جس کا حدود اربعہ

اس طرح ہے کہ ---- شمال میں فلسطین اور صحرائے شام واقع ہے۔
مشرق میں دریائے دجلہ' فرات اور خلیج فارس ہے۔
مغرب میں بحیرہ قلزم --- گویا پورے ملک عرب کی بیرونی حدود کسی انتہائی محفوظ قلعہ کی فصیل ہیں۔ مثلاً مغرب اور جنوب میں سمندر' مشرق و شمال میں صحرا اور خلیج فارس کا پہرہ موجود ہے۔ لیکن ہمارے خیال میں بیرونی جارحیت پسند قوتوں سے بچاؤ کا سبب اس محل وقوع کے علاوہ اس کی بے کراں وسعت بھی ہے۔

رقبہ

طول تقریباً ایک ہزار کلومیٹر سے بھی زیادہ ہے اور یہی طبعی طوالت دوسری قوموں کو دخل اندازی سے ہراساں کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں تمام ملک میں نہ پانی' نہ گھاس' چاروں طرف پھیلا ہوا صحرا' نہ کہیں دریا' نہ موسمی بارشوں کا کوئی وقت مقرر اور نہ ہی پانی برسنے کی کوئی امید' جس کے سہارے کاشت کاری کی جا سکے' صنعت و حرفت صفر البتہ ملک کے جنوب میں واقع ملک یمن ہمیشہ سرسبزو شاداب اور بارش کا گہوارہ ہے۔

زمینی ناہمواریوں کے ساتھ ساتھ یہاں قطار در قطار طویل ترین پہاڑوں کا سلسلہ بھی ہے۔ لق و دق صحرا بھی اگر کہیں کوئی قطعہ زمین ابھر بھی آیا۔ تو وہ بھی بنجر (غیر ذی ذرع) یعنی ناقابلِ زراعت (شور زدہ)

ظاہر ہے جہاں انسان کسی ایک مقام پر زیادہ مدت تک ٹھہر ہی نہ سکتا ہو وہاں تمدن کے ارتقاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ جہاں صورتحال یہ ہو کہ اگر کسی نے آج یہاں بسیرا کیا تو کل کسی اور جگہ جانے پہ مجبور ہو۔ صحرا اس کیلئے دریا اور اونٹ اس کی کشتیاں ہوں جن کے ذریعہ ہر خانہ بدوش صحرا کی ایک چراگاہ سے اپنا لنگر اٹھا کر دوسرے نخلستان میں ڈیرہ جمانا اس کیلئے لازمی ہو البتہ ---- مشاہدہ یہ بھی کہتا ہے کہ نخلستان کے حسن کا نکھار بھی پانی کے ان چشموں پر ہے۔ جو آسمان پر ہوا کے کندھوں پہ تیرتے اور اڑتے ہوئے اتفاقاً مہربان ہو کر کسی بھی وقت ریگستان کی پیاسی سرزمین کی آبیاری کا ذریعہ بن جائیں۔

جہاں بھی قدرتی چشموں کے اردگرد اگا ہوا سبزہ دلکشی پیدا کر دیتا ہے۔ صحرا کے خانہ بدوش وہیں اپنا عارضی مستقر (ٹھہرنے کی جگہ) بنا لیتے ہیں۔ عرب کی یہ حالت افریقہ کے صحرائے اعظم کی طرح انسانی بسیرے کیلئے ناموزوں ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ جب کوئی ان طویل ترین

صحراؤں میں قدم رکھے گا وہ انہیں جلد سے جلد پار کر جانے میں ہی اپنی جان کی سلامتی سمجھے گا۔ انتہائی بڑے بڑے ریگستانوں میں کہیں کہیں گنتی کے نخلستان ہیں بھی تو ان میں انسانوں کیلئے انتہائی معمولی خوراک اور مویشیوں کیلئے تھوڑی سی مدت کیلئے چارہ دستیاب ہوتا ہے۔ یہی وہ تمام وجوہات ہیں جن کی بناء پر دوسرے ملکوں کے باشندوں نے یمن کے سوا اس خطہ عرب سے لاتعلقی کو برقرار رکھا۔

تجارتی شاہراہ

سرزمینِ عرب جہاں تہذیب و تمدن کے تصور سے بھی زندگی محروم ہو وہاں یہ بھی غنیمت ہے کہ زیادہ نہ سہی کم تعداد میں ہی انسانوں کے قافلے کہیں نہ کہیں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اہل عرب دریائی سفر کو موت کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اس لئے اس کے متبادل کسی راستے کو دریافت کرنا لازمی تھا۔ مشرق و مغرب کے درمیان سوداگروں کی گزرگاہوں سے ملے ہوئے شہروں میں لین دین کا سلسلہ جاری تھا۔ تاجر مال لاتے اور لے جاتے! یہی وہ زمانہ ہے جب سوداگروں کے جتنے قافلے بھی مصر اور خلیج فارس سے آتے یا واپس جاتے انہیں حجاز سے ہو کر ہی گزرنا پڑتا۔ اور یہ بھی ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں عرب کے ان صحراؤں پر عرب ہی کے بادیہ نشین حکمران تھے اور جس طرح کشتی رانی کے ابتدائی زمانہ میں سمندروں پر ان ملاحوں ہی کی حکومت تھی جو اپنی کشتیاں سمندر کا سینہ چیر کر ادھر سے ادھر لے جاتے۔ یہی نہیں بلکہ سمندروں کی بے کراں وسعتوں میں جہتیں بھی مقرر تھیں۔ بالکل اسی طرح صحرا کے سفر کرنے کے راستے بھی مقرر تھے۔

صحرائی نخلستانوں میں اسبابِ قیام

صحرائے عراب میں قافلوں کے راستوں کا تعین بھی کسی انسانی منصوبہ بندی کا ثمر نہیں بلکہ ان وسیع ریگستانوں سے گزرتے ہوئے مسافروں کو تھکن دور کرنے کیلئے جہاں کہیں کھجور کے درخت اور پانی کا چشمہ نظر آتا۔ وہیں خود پانی پیتے' سواریوں کو پلاتے' کچھ دیر ٹھہرتے بس قافلوں کے اسی تسلسل نے ان راہوں کا خود بخود تعین کر دیا۔ اور مذکورہ مقامات تاجروں کی عام گزرگاہ بن گئے پھر مسافروں میں سے کچھ خوش عقیدہ لوگوں نے ان جگہوں پر کہیں کہیں بت خانے بنا دیئے عبادت گاہیں تعمیر کر دیں۔ سوداگر یہاں اترتے تو اپنی تجارت اور ترقی کیلئے ان بتوں کے سامنے رو رو کر التجائیں کرتے اور دوسرے ضرورت مند ان سے اپنی حاجتیں طلب کرتے۔

ریگستان عرب کی مشہور گزر گاہیں

یوں تو ان صحراؤں میں بے شمار راستے تھے لیکن ان میں دو گزر گاہیں سب سے زیادہ استعمال ہوتی تھیں۔

(1) خلیج فارس اور دریائے دجلہ سے ملتی ہوئی راہ۔ صحرائے شام تا فلسطین' یہ راہ عرب کے مشرقی جانب واقع ہونے کے سبب "طریق الشرق" (مشرقی گزر گاہ) سے موسوم کی جا سکتی ہے۔

(2) بحیرہ روم کے قریب سے گزرنے والی راہ بحیرہ قلزم کے عرب کے مغرب میں واقع ہے۔ اس لئے اس کو "طریق الغرب" (مغربی گزر گاہ) کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔

یہی وہ دونوں راستے ہیں جو ان دنوں میں مشرق و مغرب کے درمیان تجارت کا مضبوط واسطہ تھے۔ عرب کے صحرانشیں بدو انہیں سوداگروں سے اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کرتے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ ان کے علاوہ مغرب کے دوسرے لوگ تاجروں کے ان دونوں مشہور راستوں سے انجان تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ان میں سے بہت ہی کم لوگوں کو ان راستوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا۔

یہاں کے صحراؤں اور ان راستوں کو خود اہل عرب میں سے بھی صرف وہی لوگ عبور کر سکتے تھے جنہیں بچپن سے ان راہوں سے گزرنے کا اتفاق ہوا ہو یا یہ کہ انہیں اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی نہ ہو کیونکہ ان میں سے بہت سے لوگوں نے بلامقصد اپنی زندگی ان صحراؤں کی بھینٹ چڑھا دی تھی۔

ظاہر ہے ایک ایسا شخص جس کی زندگی سدا بہار ہو جسے زندگی کی تمام سہولتیں میسر ہوں اس کیلئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے سفر کیلئے آمادہ ہو جائے جسے طے کرنے کیلئے اونٹ سے بہتر کوئی سواری ہی میسر نہ ہو۔ اور پھر سفر بھی بے آب و گیاہ صحراؤں کا۔ چٹیل پہاڑوں اور ان کے درمیان خشک بھیانک دروں کا سفر' سورج کی بے پناہ گرمی سے تپتی ہوئی چوٹیوں کا سفر اسے پسند آئے! وہ شخص جسے شہری (مدنی) آسائشیں اور راحتیں میسر ہوں وہ ان کا عادی ہو اس سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ ایسے صحرا کا سفر کرے جس میں اگر کہیں انسانوں کی تھوڑی بہت بود و باش ملتی بھی ہو تو وہ لوگ اجتماعی ضابطوں سے آزاد ہوں؟ کیا ایسے لوگوں کے قریب سے سلامتی کے ساتھ نکل جانا آسان ہے؟

عرب کے صحرا جن میں مختلف قبیلوں اور خاندانوں کی زندگی کا انحصار محض آپس کی قرابت داری پہ ہو اور ان قبائل کے درمیان کچھ افراد بے بسی کے عالم میں ان کے رحم و کرم سے

زندگی گزار رہے ہوں۔

جن کا اصول معاشرہ اپنے تمام ہم عصر ملکوں کے نظامِ معاشرت سے بالکل مختلف ہو۔ جو کبھی تو قصاص کے نام سے مجرم کو معمولی سزا دینے پہ اکتفا کرے اور کبھی اسی قسم کے جرم کی پاداش میں قاتل اور مقتول کے دونوں قبیلے صدیوں آپس میں قتل و غارت کرتے رہیں اور ان میں بسنے والے دوسرے قبیلے بلاوجہ ان کے درمیان قربانی کا بکرا بنتے رہیں۔ اگر کسی نے رحم و کرم فرمایا بھی تو بس برائے نام جو لوگ اس قسم کی زندگی گزار رہے ہوں دنیا کے تہذیب یافتہ لوگ ان کے قریب سے ہو کر بھی نکل جائیں خلافِ عقل ہے۔ اور یہی متذکرہ بالا اسباب ہیں جن کی بناء پر قدیم زمانہ میں جزیرہ نمائے عرب کو دنیا میں کوئی اہمیت حاصل نہ ہو سکی۔

ظہور اکبر

یہاں تک کہ اسی ملک میں حضرت محمد ﷺ کا ظہور ہوا، جس کا چرچا انہیں راہوں سے گزرنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لایا۔ اور اس ظہور کے تذکروں سے باہر کی دنیا جزیرہ نمائے عرب کے وجود سے آشنا ہوئی۔

زمانۂ قدیم میں یمن کی شہرت

جس زمانے میں عرب کے غیر متمدن ہونے کی وجہ سے دنیا کی کوئی قوم اس سے متعارف نہ تھی۔ اس زمانے میں یمن اور اس کے آس پاس کے خطے جو خلیج فارس کے اردگرد تھے اطرافِ عالم میں اچھی خاصی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ جس کی ہرگز یہ وجہ نہ تھی کہ ان خطوں کو خلیج فارس، بحرِہند اور بحیرہ قلزم کا قرب و جوار حاصل تھا۔ بلکہ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ یمن عرب کے دوسرے خطوں کی طرح بے آب و گیاہ اور ریگستانوں سے بھرا ہوا نہ تھا۔ اس کی ذاتی خوبیاں ایسی تھیں جن کی وجہ سے باہر کے ملک اس سے اپنی نگاہِ محبت ہٹا لیں یہ ممکن ہی نہ تھا۔ ہمسائے ملک اس سے دوستی کے خواہاں تھے کیونکہ سرزمینِ یمن طبعی طور پر سرسبز و شاداب تھی۔ جسے موسم بہ موسم بارش سیراب کرتی، یمن قدرتی طور پہ متمدن بھی تھا، اس کے دامن میں پررونق شہر آباد تھے، آسمان کو چومتی ہوئی عبادت گاہیں تھیں۔ عقل و دانش وری سے فیض یاب قبیلہ حمیر اسی میں آباد تھا۔

سدِّ مارب یا عرم کا تعارف

"سدِّ مارب" ہی کا دوسرا نام "عرم" ہے۔ سدمارب وہ سلسلہ عمارات ہے۔ جسے بند آب یعنی "ڈیم" کہا جاتا ہے۔ حجازی اسے سد اور یمنی عرب عرم کہتے ہیں۔ چونکہ عرب ملکوں میں کوئی مستقل دریا نہیں بلکہ صرف سلسلہ کوہستاں ہے۔ پہاڑوں سے پانی بہہ کر ریگستانوں میں خشک اور ضائع ہو جاتا ہے۔ زراعت کے مصرف میں نہیں آتا اس لئے سبائی قوم کے لوگ مختلف اور مناسب جگہوں پر پہاڑوں اور وادیوں کے پانی روکنے کے لئے بند باندھ دیتے تھے۔ اور وقتِ ضرورت زراعت کے کام میں لاتے۔ مملکتِ سبا میں اس قسم کے سینکڑوں بند تھے لیکن ان میں سے سب سے زیادہ مشہور سدِمارب تھا۔ مگر آج یہ سدِمارب اور شہر دونوں حوادث زمانہ کا شکار ہو چکے ہیں ماہرین ان آثار کے کھنڈرات میں غوطے لگا رہے ہیں تاکہ مزید معلومات حاصل کی جا سکیں۔ ان کھنڈرات سے ملنے والے حمیری کتبوں نے اہلِ علم کو قبیلہ حمیر کی تہذیب و تمدن کے گوہرِ نایاب سے حیران کر دیا ہے۔

قبیلہ حمیر کے دانشوروں کا شاہکار

حمیر قبیلہ کے دانشوروں کو قدرت نے مختلف علوم و فنون میں بڑی مہارت دی تھی۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ سدِمارب نام کے شہر میں سد (Dam) کی تعمیر ہے۔ انہیں دنیا میں سب سے پہلے بارش کے پانی کو محفوظ کرنے کا طریقہ سوجھا۔ انہوں نے بارش کے پانی کو سمندر میں غرق ہونے سے پہلے اپنے باغات اور کھیتوں کے لئے بند باندھ کر ذخیرہ کر لیا۔ یہ بند مارب شہر میں ہی تعمیر کیا گیا۔ پہاڑوں کی آبشاروں کا پانی جو شہر مارب کے نشیبی علاقوں سے گزرتا اسے ذخیرہ کرنے کے لئے 40 کلومیٹر لمبا یہ بند تھا۔ جس کے دونوں کنارے دونوں طرف کے پہاڑوں سے ملا کر بند کے نیچے اور اوپر دہانے تعمیر کر دیئے گئے تھے تاکہ ان دہانوں کے ذریعہ ضرورت کے مطابق پانی حاصل کر کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کیا جا سکے۔

یمن کی تروتازگی اور تمدن لوگوں کو باہر سے کھینچ لایا

عرب کے دوسرے حصے کی زمینیں قدرتی بے سرو سامانی بنجر ہونے کی وجہ سے توجہ کے قابل نہ تھے۔ لہٰذا جس ملک کا سرمایہ ہی لق و دق صحرا ہو اس کی طرف کسی کی نظر کیسے اٹھتی یا کیوں اٹھائی جاتی۔ البتہ یمن جو کئی پشتوں سے شاہانِ حمیر کے زیرِ نگیں رہا ان تمام خوبیوں سے مالا

مال تھا جو دوسروں کے لئے کشش رکھتا ہو شاہانِ حمیر کا مذہب بت پرستی تھا۔ لیکن جیسے ہی ذونواس حمیری کو یمن کی حکومت ملی تو وہ بت پرستی سے متنفر ہو گیا۔ اسی زمانہ میں یہودی باہر سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہو گئے تھے جن سے متاثر ہو کر ذونواس نے بھی دینِ موسوی (یہودی مذہب) اختیار کر لیا۔ چنانچہ اہلِ تاریخ نے قصصِ قرآن میں سے اصحابِ اخدود کا واقعہ اس طرح بیان کیا ہے۔

واقعہ اخدود کا پس منظر

روم سے ایک اللہ کو ماننے والا عیسائی راہب یمن کے قصبہ نجران میں آ کر آباد ہو گیا۔ جس کی توحید و للہیت سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ بستی والوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ جب بادشاہ ذونواس نے یہ سنا تو خود نجران پہنچا اور عیسائیوں کو دوبارہ یہودی مذہب میں آنے کی دعوت دی ورنہ وہ قتل کر دیئے جائیں گے۔ مگر انہوں نے مسیحیت کو چھوڑ کر یہودی مذہب میں آنا قبول نہ کیا اور ذونواس نے انہیں خندق میں دھکیل کر ان پر آگ بھڑکا دی جو کوئی اس آگ سے بچ گیا اس کا "مثلہ" یعنی عضو کاٹ کر اسے قتل کر دیا۔ کتبِ سیرت کی روایات میں ان کی تعداد بیس ہزار ہے۔

شہدائے اخدود کی اطلاع پر شہنشاہ روم کا ردِ عمل

یہودی ذونواس کے ہاتھوں جلنے والے مظلوموں میں سے ایک عیسائی کسی صورت بچ نکلا۔ اور روم کے عیسائی بادشاہ جو سٹنیان کے حضور میں اپنی رودادِ غم سنائی مگر روم اور یمن کے درمیان بہت زیادہ زمینی فاصلہ کی وجہ سے جوسٹیان براہِ راست (یمن کے یہودی بادشاہ) ذونواس سے انتقام لینے سے قاصر رہا۔ یہ چھٹی صدی کا وہ زمانہ ہے جب روم اور حبشہ دونوں کی حکومتیں پورے عروج پر تھیں۔ ان سے ملے ہوئے سمندروں (بحیرۂ قلزم اور ساحلِ قلزم) پر ان دونوں کا ہی قبضہ تھا۔ اور دونوں ملکوں کی تجارت پورے شباب پر تھی۔ روم اور حبشہ کی ہمسایہ قوموں میں سے بعض روم کی باجگزار بھی تھیں اور بعض بزنطینہ کی۔ قیصرِ روم اور بزنطینہ کا حکمران ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ ایک نے بحیرانہ کے ساحلی علاقوں اور دوسرے نے بحیرۂ قلزم سے ملنے والے علاقوں کو مسیحی پرچار کا مرکز بنا رکھا تھا۔

قیصر روم کا فرمان بادشاہِ حبش کے نام

نجران کے مظلوم فریادی کی اندوہناک داستان سن کر قیصر روم نے خود یمن سے طویل مسافت (دور ہونے) کی وجہ سے حبشہ کے عیسائی بادشاہ کو کہا۔ کہ وہ یمن' کے بادشاہ ذونواس سے عیسائی شہیدوں کا بدلہ لے۔

نجاشی (شہنشاہ حبشہ) نے قیصر روم کے سفیر کی معیت میں اپنا لشکر جرار ارباط نامی سپہ سالار کی قیادت میں یمن پر حملہ آور ہونے کے لیئے بھیجا۔ اسی لشکر میں ابرہہ اشرم نامی ایک فوجی سپاہی بھی تھا۔ ارباط نے یمن فتح کر کے اسے حبشہ کی حدود مملکت میں شامل کر لیا۔ کچھ عرصہ تک یہی ارباط یمن پر بطور گورنر مقرر رہا۔ لیکن بعد میں ابرہہ الاشرم نے اس کو قتل کر کے عنان حکومت اپنے ہاتھوں میں لے لی یہی ابرہہ وہ صاحب الفیل ہے جس نے کعبہ کو نیست و نابود کرنے کے لئے ہاتھیوں کے ساتھ مکہ معظمہ پر چڑھائی کی تھی۔ مگر ناکام پھرا جیسا فصل ثانی میں اس کی تفصیل آئے گی۔

ابرھہ کے بعد

اس کے بیٹے یمن پر حکمران رہے۔ مگر ان کے ظلم سے تنگ آکر قبیلۂ حمیر کے سردار سیف بن ذی زن نے قیصر (روم) کے حضور میں فریاد کرتے ہوئے لکھا کہ کسی اور عادل حکمران کو یمن بھیج دیا جائے مگر قیصر روم اور بادشاہ حبشہ کے باہم معاہدہ کی رو سے روم کا بادشاہ اپنا نائب بھیجنے سے قاصر تھا۔

سف بن ذی زن نعمان بن منذر کے دربار میں

ابنِ ذی زن یہاں سے مایوس ہو کر نعمان بن منذر کے دربار میں فریاد لے کر حاضر ہوا جو ان دنوں ہی حرہ اور اس کے نواحی علاقہ عراق پر کسریٰ (ایران) کی طرف سے گورنر کے عہدہ پر فائز ہوا تھا۔ مگر نعمان اپنے بادشاہ کے حکم کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ وہ سیف بن ذی زن کو اپنے ساتھ لے کر دارالسلطنت ایران میں پہنچا۔

دربارِ خسرو کی شان و شوکت

خسرو کے دربار کی شان و شوکت کا یہ عالم تھا کہ سرِ دربار دارا کا وہ تخت جس کے نقش و نگار میں ہیرے اور جواہرات استعمال کئے گئے تھے رکھا تھا اور موسم سرما میں شہنشاہ کو سردی سے محفوظ رکھنے کیلئے چاروں طرف پوستینوں کے دبیز پردے لٹکائے ہوئے تھے۔ شاہی تاج میں

مختلف رنگوں کے، ہیرے، جواہرات، یاقوت، زمرد اور مروارید سونے اور چاندی کی تاروں سے ٹکے ہوئے تھے جو تخت اور سقف ایوان کے درمیان طلائی زنجیر کے سہارے لٹکایا گیا تھا۔ بادشاہ خود زر بفت کے لباس میں ملبوس اور گلے میں سونے کے بیش بہا زیورات پہنے ہوئے تھا دیکھتے ہی نووارد پر سکتہ کا عالم طاری ہو جاتا۔ یہی اثر سیف بن ذی زن حمیری پر ہوا۔ کچھ دیر تک وہ حیرت زدہ سراسیمہ ہو کر مبہوت کھڑا رہا۔

سنبھلنے کے بعد

جب سیف بن ذی زن کچھ سنبھلا اور کسریٰ نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو اس نے حبشیوں کے مظالم کی سرگزشت بیان کی پہلے تو خسرو نے تردد کا اظہار کیا لیکن بعد میں درخواست منظور کرتے ہوئے ایران کے "ہرز" نامی امیرزادہ کو جو شجاعت و جواں مردی کے ساتھ فنِ سپاہ گری میں بھی اپنی مثال آپ تھا اس مہم کیلئے نامزد کیا۔ "ہرز" نے جو حبشیوں کو جو (دو سال) سے یمن پر زبردستی مسلط تھے انہیں نکال کر اسے ایران کے مفتوح ممالک میں شامل کر لیا۔ چنانچہ عرب اور اس کے قرب و جوار کے ملکوں پر مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے تک یمن ایران کا باجگزار رہا۔

ایران شیرویہ اور اس کے بیٹے پرویز

لیکن ایران کے گورنر کبھی بھی مرکز کے پوری طرح مطیع و فرمانبردار نہیں رہے۔ خصوصاً جس زمانہ میں شیرویہ نے اپنے باپ کو سازش کے تحت قتل کروا کے خود تخت شاہی پر قبضہ کر لیا اور رعایا کی فلاح و بہبود کی بجائے شاہی خزانے اپنے عیش و آرام پر لٹانے شروع کر دیئے، اس کے دماغ پر یہ بھوت سوار ہو گیا کہ سلطنت کے تمام خزانے صرف اسی کی ہوس پرستی کیلئے ہیں۔ اور وہ ملکی معاملات سے لاپرواہ ہو کر اپنی عیاشیوں میں مصروف ہو گیا۔ شکار کھیلتے ہوئے بھی اس کے شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کا یہ عالم تھا کہ دائیں بائیں قرمزی قبائیں پہنے ہوئے (جن کے حاشیوں پر بنفشی بیلیں ٹنکی ہوتی تھیں) نوجوانوں کے دستے حاشیہ برداری کرتے۔ شاہی سواری کے پیچھے برقندازوں کے دستے جن کے ہاتھوں پہ شکاری باز ہوتے۔ ان کے بعد دوسری ٹولی شکاری چیتوں کی ہوتی۔ جن کے گلے میں ریشمی ڈوریاں ہوتیں، خاصہ دار شہنشاہ کے ساتھ عطر کے بھرے ہوئے بلوریں کنٹر ہاتھوں میں لئے معمولی سے وقفہ کے بعد کجکلاہ پر عطر بیزی کرتے رہتے۔ خوش آواز حسین ترین پری زادوں کے جھرمٹ شاہی سواری کے مقدمتہ الجیش کے قائم مقام ہوتے جن کے سرود نغمہ سے عالم کون و مکاں تک وجد میں آ جاتے اور موسم سرما میں خزاں کا نعم البدل اسی طرح تیار کیا کہ ایک بہت بڑا قالین جس میں جابجا پھولوں کی کیاریاں، ابھرے ہوئے

گلدستے، کہیں کہیں ہرے بھرے درختوں کا جھنڈ نظر آتا، تو کہیں شفاف پانی کے اُبلتے ہوئے فواروں کا گمان ہوتا، کہیں چمن کی روشوں کے ساتھ ساتھ نہروں میں پانی کی بہتی ہوئی دھاریں محسوس ہوتیں، شیرویہ کے اس انداز سے مملکتِ ایران کی دولت لٹانے کے باوجود خزانوں میں کمی نہ آئی۔

دولتِ ایران کا سب سے بڑا رقیب قیصر روم شیرویہ کی یہ تمام رنگ رلیاں دیکھ رہا تھا اور مسیحی عوام اس کے ادنیٰ اشارہ پر اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار تھے۔ اس کے باوجود اسے ایران سے پنجہ لڑانے کی جُرأت نہ ہوتی تھی۔ مگر آخر کار شیرویہ دولتِ ایران کے شاہی خزانہ کو تباہی میں مقدمتہ الجیش بن کر ہی رہا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں نے حجاز سے باہر بساطِ عالم پر نگاہ ڈالی تو ایران کی زبوں حالی دیکھ کر اس پر حملہ کر کے بڑے مختصر عرصہ میں ایران کی صد سالہ شان و شوکت کو خاک میں ملا دیا۔

سدّ مارب کی تباہی

چوتھی صدی عیسوی سے یمن میں جن سیاسی حادثات نے بسیرا کر رکھا تھا آخر وہ اپنا رنگ لا کر ہی رہیں۔ یہاں کے بدنصیب باشندے وطن چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لینے پہ مجبور ہو گئے۔ تاریخ کی ایک روایت یہ بھی خبر دیتی ہے کہ سدِّ مارب جو حمیری کاریگروں کی صنعت و محنت کا شاہکار تھا ملک کی شادابی و خوشحالی کا وسیلہ تھا۔ وہ "سیلابِ عرم" سے تباہ ہو گیا۔ اس کے بعد یمن کی مسلسل طوائف الملوکی اس کی اصلاح و تندرستی پر توجہ نہ دے سکی۔

سدِ مارب کی تباہی کے بارے میں دوسری روایت یہ بھی ہے کہ قیصر روم نے یمن اور ایران کی باہم سیاسی کشمکش سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایران کی یمن پر بالادستی کی وجہ سے رومی تجارت کو پہنچنے والے نقصانات کی روک تھام کر لی۔ کشتیوں کا ایسا بیڑا تیار کروایا جو بحیرہ قلزم میں مصر اور دوسرے دور دراز مشرقی علاقوں میں بار برداری کرتا۔ دوسرے ملکوں سے روم کیلئے ضروری سامان خریدتا اور روم کو باہر سے سامان لانے اور منہ مانگے دام لینے والے سوداگروں سے نجات مل گئی۔ چنانچہ قیصرِ روم کی اس تدبیر نے یمن کی اقتصادی حالت پر بہت برا اثر ڈالا۔

تیسری روایت

جس میں مورخین محلِ وقوع اور اس کے سبب دونوں کے بارے میں اختلاف رکھتے ہیں ان کی رائے میں پہلی وجہ یہ ہے کہ یمن کی تجارتی کساد بازاری کی وجہ سے یمن کے ازدی قبیلہ کے لوگ ملک کے جنوب سے شمال کی طرف منتقل ہو گئے۔

دوسری وجہ سد مارب کی تباہی۔

الغرض دونوں وجوہات میں سے کوئی بھی وجہ ہو۔ یہ بات مانی گئی ہے کہ ازدی قبیلہ یمن سے ہجرت کر کے عرب کے دوسرے حصوں میں آباد ہو گیا جس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اہلِ یمن عرب کے دوسرے حصوں میں مخلوط ہو گئے۔ لیکن تاریخ و تحقیق ابھی تک ان خطوں اور قبیلوں کا تعین نہیں کر سکی جن میں منجذب ہو کر ازدی قبیلہ بسنے لگا۔ (مترجم)

اس دور میں یمن کے سوا بقیہ عرب ممالک کی سیاسی حالت

جس زمانے میں یمن کا قدیم سیاسی نظام تہ و بالا ہو رہا تھا۔ حمیر کے متمدن شہر اس بحران کا مرکز اور ان شہروں کی وادیاں میدان جنگ بنی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں یمن کے سوا بقیہ عرب سیاسی نظام کی الف و ب سے بھی ناآشنا تھا۔ یہ نظامِ حیات جسے آج ہم سب سیاسی نظم و نسق کا نام دے رہے ہیں۔ تہامہ، حجاز، نجد، عرب کے خطے اور قبیلے اس نظام سے قطعاً ناآشنا تھے۔ ان خطوں کے باشندوں کا زیادہ تر حصہ شہروں اور بستیوں کی جگہ ریگستانوں میں بسر کرتا۔ (یہاں تک کہ آج بھی ان کا یہی دستور ہے) اول تو انہیں شہری زندگی بسر کرنے کا موقع ہی میسر نہ آتا۔ اور اگر اتفاق سے ایسا ہوتا بھی تو یہ خود اس کو ترجیح نہیں دیتے تھے۔ وہ اپنے مویشیوں کے چارہ کی مجبوری کے سبب کسی ایک جگہ پڑاؤ کر ہی نہیں سکتے تھے۔ پھر ریگستان کی تند و تیز ہواؤں کا مقابلہ کرنے کے عادی بے کنار صحراؤں کی وسعتوں میں سانس لینے کے عادی دیواروں میں گھری ہوئی بستیوں میں بسیرا کرنا پسند کیسے کرتے؟ اپنے اپنے قبیلہ میں مل جل کر رہنا بدوؤں کے طریق حیات کا قانونی سہارا تھا۔ عرب کے صحرانشین جو آج یہاں تو کل وہاں ان کیلئے اجتماعی قوانین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ تمام قوانین جو آج ہمارے مہذب معاشرے کیلئے روح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس عربوں کا دستورِ حیات فرد، قبیلہ اور خاندان کی مکمل آزادی کی بنیادوں پر قائم تھا۔

اس کے برعکس تمدن کی آسائشوں کی حریص قومیں اپنی آزادی کا زیادہ تر حصہ ان قوانین کے ہاتھوں گروی رکھ دیتیں جن کو وہ اپنی جان اپنے مال اور اپنے لئے سامانِ تعیش کے حصول کا ذریعہ سمجھتے لیکن بدوی قوم کسی حسین فریب میں آنے کیلئے تیار نہ تھی۔ وہ کسی قیمت پر بھی اپنی انفرادی یا قبیلہ کی اجتماعی آزادی سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھی۔ ان کے ضابطۂ حیات میں قبیلہ کے ایک فرد کی نہیں بلکہ تمام افراد کے جان و مال کی حفاظت مساوی درجہ رکھتی ہے۔ کسی ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ پر جان و مال کے تحفظ یا ضیاع میں کوئی برتری حاصل نہیں تھی۔ ان کا یہ اصول قوانینِ مدنیات کے مرکزی قانون بقائے نفس، حفظِ جان اور دفاع کے عین مطابق تھا اور یہی تینوں اصول عرب کے بادیہ نشین قبیلوں میں مروج تھے، تمام بدوی اقوام ان کا

ہر حالت میں احترام کرتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی نے ان پر ظلم کیا تو وہ اس کی تلافی کئے بغیر چین سے نہیں بیٹھتے تھے۔ ان کی غیرت و حمیت کا یہ عالم تھا کہ اگر وہ کسی سے انتقام لینے سے قاصر رہتے تو پھر وہ نہ صرف اپنا پڑاؤ بدل دیتے بلکہ اس ملک کو ہی چھوڑ کر کسی دوسری جگہ بسیرا کر لیتے۔ اس لئے کہ ان قبائل کیلئے شرف و عزت (خودداری) اور تحفظِ عزت و نفس (انفرادی اور اجتماعی) جان سے بھی زیادہ ضروری تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی جھگڑے کا فیصلہ باہم گفتگو سے نہ ہوتا تو پھر وہ قتل کرنے یا قتل ہونے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتے تھے۔

صحرا نشینی کے برکات

عرب کے صحرا نشیں شجاعت میں اپنی مثال آپ ہونے کے ساتھ ساتھ ہمسایوں کی حمایت میں ان کے دشمنوں سے ہتھیلیوں پہ جان رکھ کر جنگ و قتال پر بھی تیار رہتے۔ اس پر طرہ یہ کہ اپنے ان اصولوں پہ سختی کے ساتھ پابند ہوتے ہوئے بھی دشمن کو معاف کر دینے کا بے پناہ حوصلہ بھی رکھتے۔

یہ وہ انسانی معاشرہ کی صفات ہیں جو صحرائی زندگی میں موثر مگر شہری زندگی میں بے جان ہو جاتی ہیں۔

چنانچہ عربوں کی بے پناہ شجاعت، حوصلہ مندی، اپنی عزّتِ نفس اور خاندان کے شرف و احترام کے تحفظ کا ناقابلِ تسخیر جذبہ دیکھ کر نہ تو قیصر روم نے ان کے ساتھ جنگ کرنے یا ان کو مفتوح بنانے میں اپنا اقتصادی یا سیاسی فائدہ دیکھا۔ اور نہ ہی ایران نے ان کو اپنا مغلوب بنا کر کسی فائدہ کو متوقع سمجھا۔ البتہ ان دونوں حکومتوں (ایران اور روم) کو اس قسم کے فائدے یمن ہی سے حاصل ہو سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مذکورہ دونوں حکومتیں اسے ہمیشہ اپنے اپنے قابو میں لانے کی کوشش میں رہیں۔

صحرا نشینوں کے اخلاقی اوصاف اگرچہ یمنی عربوں میں بھی سرایت کر چکے تھے۔ وہ صحرا نشیں جو شہروں کی مختلف بستیوں میں اپنا بسیرا کر چکے تھے۔ اگرچہ وہ گنتی میں تھوڑے تھے مگر ان کا اثر و رسوخ کافی تھا۔ ان کے علاوہ ان شہروں میں بیرون عرب سے آنے والے تاجر اپنے سفر کی تھکان دور کرنے کیلئے ان کے پاس ڈیرا ڈال دیتے۔ ان کے عبادت خانوں کے دیوتاؤں سے صحرا کے خطروں سے محفوظ رکھنے کی رو رو کر دعائیں مانگتے۔ ان شہروں میں سرِ فہرست شہر مکہ مکرمہ، طائف اور یثرب ہیں۔ یہ وہ شہر ہیں جو کسی زمانہ میں پہاڑوں کے مختصر دروں یا صحرا کے دامن میں کسی بڑے نخلستان کے دامن میں آباد ہو گئے تھے۔ ان شہروں میں رہنے والے اگرچہ طویل مدت سے ایک ہی جگہ پہ بود و باش اختیار کر چکے تھے مگر بدوی تہذیب و تمدن کی خصوصیات عزتِ

نفس اور حریت (آزادی) کے تحفظ میں چاک و چوبند رہنے میں اپنے ہم وطن بادیہ نشینوں کے ساتھ برابر کے شریک تھے ۔

اس موقع پر ذہن میں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ یمن پر مسیحی اور مجوسی غلبوں کے بعد یمنی باشندے ان کے مذہبی عقائد سے متاثر ہوئے؟ نہ صرف اہلِ یمن بلکہ عرب کے ملحقہ خطے بھی روم اور ایران کے عقیدوں کی طرف مائل ہوئے یا نہیں؟

مسیحیت اور عربستان

عیسائی مبلغین جس طرح آج دنیا کے چپہ چپہ میں اپنے دین کی تبلیغ کیلئے گھومتے پھرتے ہیں' اسی طرح قدیم زمانوں میں بھی وہ عیسوی مذہب کی ترویج کیلئے ہر جگہ پہنچ جاتے ۔

صحراؤں میں زندگی گزارنے والوں پر مذہب کے اثر و رسوخ کے امکان اس لئے زیادہ ہوتے ہیں کہ کھلی فضاؤں میں رہنے والے انسانوں کو اللہ عزوجل کی صفات کے مظاہر کا احساس و ادراک آسانی سے ہو جاتا ہے۔ اس کے بے انتہا فیوض و برکات ہر طرف نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن شہری زندگی میں بسنے والے اپنی انفرادی ضروریات کے حصول میں ایسے پریشان رہتے ہیں کہ ادھر ادھر دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملتی اور ہر وقت انہیں اجتماعی نظام کی اطاعت و فرمانبرداری کا بوجھ دبائے رکھتا ہے۔ اگر کوئی شخص ان کے انفرادی بنیادی حقوق میں دخل اندازی کرے تو وہ اجتماعیت سلطان (حاکم وقت) سے فریاد کر کے اپنا حق واپس لے سکتا ہے۔ لیکن صحرا نشین قدرت کے وسیع تر دامن یعنی سائباں میں بود و باش کی برکتوں سے فیض یاب ہو کر مطمئن ہوتا ہے۔ اجتماعیت کے جھمیلوں سے آزاد' ہنگاموں سے الگ تھلگ رہ کر ——— طبعاً مذہبی تصورات سے ہمکنار ہونے پر آسانی سے راضی ہو جاتا ہے۔

لیکن مسیحیت جو اپنے آغاز سے ہی اپنی تبلیغ میں مصروف ہے اس نے عرب میں بھی اپنی تبلیغی جدوجہد میں کوئی کمی نہیں کی۔ کسی کوتاہی سے کام نہیں لیا۔ لیکن پورے عرب میں بشمول یمن اسے برائے نام ہی کامیابی حاصل ہوئی اور ملک کا اکثر حصہ اپنے باپ دادا کے بت پرست مذہب ہی پر قائم رہا۔

اس عہد میں بحیرہ روم و قلزم کے دونوں ساحلی علاقوں پر تمدن اپنے پورے عروج پر تھا۔ ان علاقوں میں مسیحی اور یہودی دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے' آپس میں سماجی روابط بھی رکھتے مگر پس پردہ یہودی ہمیشہ اپنے عیسائی ہمسایوں کے خلاف ہر وقت غصہ سے دانت پیستے انہیں عیسائیوں کے ہاتھوں بیت المقدس سے نکالے جانے کا قلق تھا۔ اسی بناء پر وہ عیسائیوں

سے انتقام لینے کیلئے ہر لمحہ بے قرار رہتے۔
اسی طرح وہ یہودی جو مسیحی قیصرِ روم کی رعایا بن کر زندگی گزار رہے تھے وہ بھی اسی غم میں مبتلا تھے۔
ادھر عربستان میں بھی یہودی آباد تھے' یمن اور یثرب میں تو ان کی کئی بستیاں آباد تھیں۔ مجوسی ایران نے مسیحیت کی دریائے فرات تک ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ عیسائیوں کے بمقابلہ (مجوسی ایران) عربوں کو اس لئے زیادہ پسند کرتا تھا کہ دونوں میں بت پرستی کا عقیدہ ایک سا تھا۔
لیکن جب سلطنتِ روم کے زوال کے بعد عیسویت کا پرچم اور یہاں کا تمدن قسطنطینِ اعظم کے حضور میں باجگزار ہو گیا تو روم کے عیسائیوں کی ذہنیت میں ایسا خطرناک خلل آیا کہ ان کی وحدت کئی فرقوں میں بٹ گئی۔ ان میں ایک دوسرے سے فروعی مسائل پر میدانِ مناظرہ گرم رہنے لگا۔
مثلاً حضرت مریم مسیح کے تولّد کے باوجود بھی کنواری ہے؟
حضرت مسیح مریم سے بہتر ہیں یا مریم حضرت مسیح سے بہتر؟
یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ مذاہب کی باہم لفظی نزاعیں ضعف و نامرادی لائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ مذہب کی اصل حقیقت ان مباحث میں چھپ جاتی ہے اور عوام مغز کی بجائے اس کے چھلکے پر قناعت کر جاتے ہیں۔ بقول اقبال۔

یہ امّت روایات میں کھو گئی
حقیقت خرافات میں کھو گئی

اب آیئے اس معاملہ کے دونوں پہلوؤں پر نگاہ ڈالیں۔
جب شام' حیرہ اور حبشہ تینوں ملکوں کے عیسائی باشندے اپنے اپنے مقام پر ایک دوسرے کے ساتھ مناظروں میں الجھے ہوئے تھے تو یہودی اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ ان کی معرکہ آرائیوں میں ثالثی کے فرائض دے سکتے یا مناظرات و مناقشات کو کسی صورت کم کرنے میں کلیدی کردار ادا کر سکتے۔
(2) مشرکینِ عرب بھی چونکہ ان کی معرکہ آرائیوں کو روز دیکھتے رہتے تھے۔ اس لئے اپنی جگہ مطمئن رہتے اور یہ سمجھتے کہ ہمارے باپ دادا نے بت پرستی کا جو مذہب دیا ہے وہی صحیح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسی زمانے میں بت پرستی کو زیادہ سے زیادہ فروغ ملا۔ یہاں تک کہ ان کے اثر سے نجران کے موحد عیسائی اور یثرب کے یہودی بھی اپنا دامن نہ بچا سکے جنہوں نے بت پرستی کے معاملے میں محض رواداری اختیار کر رکھی تھی۔
جس کی وجہ ان کے آپس میں وہ تجارتی تعلقات تھے جو ان قوموں اور بت پرستوں میں

قائم ہو چکے تھے۔ بت پرست بتوں کی پوجا اس یقین کی بناء پر کرتے تھے کہ یہ ان کے لئے اس اللہ کے تقرب کا ذریعہ ہیں جنہیں موحد مانتے ہیں۔ اس فکری گمراہی کے اثر نے ان موحدوں کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کر دیا تھا۔

ادھر مصر اور یونان دونوں میں بت پرستی دوسرے مذاہب کے عقیدوں میں دبی ہوئی زیر زمیں پہلو بدل رہی تھی۔ خصوصاً عیسائیوں کے بعض فرقے جو مدرسہ اسکندریہ اور اس کے فلسفہ دونوں سے متاثر تھے۔ لیکن اگرچہ بطلیموس اور مسیحیت کے ابتدائی دور کی اثر انگیزی کے مقابلہ میں اب اس فلسفہ کی گرفت بہت کمزور پڑ چکی تھی۔ پھر بھی اس کا اثر ذہنوں میں اب بھی کروٹیں بدلتا رہتا۔ اس فلسفہ اور سفسطائی دلائل سے ہی تو بت پرستی کو جائز قرار دے کر یہ باور کرایا جاتا کہ بتوں کی قوت عام انسانی قوت کے برابر ہے۔

جہاں تک وجدان کی رسائی کا تعلق ہے۔ ہر زمانے میں کمزور طبائع اس قسم کی فکری گمراہیوں کو اپنا عقیدہ بنا کر بت پرستی شروع کر دیتی ہیں۔ ضعیف عقیدہ لوگوں کو اپنی کمزوری کی وجہ سے نفع و نقصان کے پیش نظر بت پرستی کی پستی میں دھکیل دیتا ہے۔

اور وہ اپنی اس اللہ کی دی ہوئی قوت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔ جس کے سہارے وہ اس ذات واجب الوجود' ربِ ذوالجلال کے ساتھ اپنا تعلق پیدا کر سکتا ہے۔ انسان الٹا پستی میں گر پڑتا ہے۔

ایسے ضعیف انسانوں کی مثال سورج' چاند یا آگ سے دی جا سکتی ہے۔ جو ایک میٹر بلندی تک پہنچ کر اور بلندی تک پہنچنے کی بجائے ہمت ہار کر پستی کی طرف رخ کر لیتے ہیں۔

کاش! اس قسم کے انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے کام لیتے تو ذرا سی ہمت کے بعد وحدت الوجود کے راز سے آگاہ ہو سکتے! جن کے دم سے تمام عالمِ کون و مکاں قائم ہے۔ وہ وجودِ کلی اور ابدی جس کی وحدت اور نور ارض و سماء کے ذرہ ذرہ میں زندگی کا وسیلہ ہے۔

ضعیف دماغ و دل کے لوگوں نے اس کا دامن چھوڑ کر بے جان بتوں کو رب ذوالجلال کا مرتبہ دے دیا۔ اس پر ستم تو یہ ہے کہ آج بھی جبکہ علم و تمدن کی ہر طرف روشنی پھیل چکی ہے بت پرستی کا ضعف باقی ہے۔ انسان ان بتوں کو معبودِ حقیقی جیسا احترام دیتے ہیں اور اس میں اپنی بدبختی کی جگہ اپنی سعادت سمجھ رہے ہیں۔

روس میں پطرس کی پرستش کا ایک عجوبہ

کلیسائے روم میں پوجے جانے والوں بتوں کی کہانیوں میں سے ایک کہانی یہ بھی ہے کہ زائرین پطرس کے بت کے قدموں کو بوسے دیتے ان بوسوں کی کثرت یا جوشِ عقیدت میں

چومنے چاٹنے کے سبب جب اس بت کا نچلا حصہ گھس جاتا تو اہلِ کینسہ اس کو نئے مجسمہ سے بدل دیتے۔ لیکن اس مسیحی طبقہ کی یہ کمزوری نظرانداز کرنے کی مستحق اس لئے ہے کہ اب تو مسیحی عقیدہ میں توحید خالص کا ذوق ہی نہیں رہا۔ ان عیسائیوں کے ساتھ دوسرے مذاہب بھی قابلِ معافی ہیں جو ان کے اڑوس پڑوس میں رہتے ہیں۔ اور ان میں رہنے بسنے اور دیکھا دیکھی کی وجہ سے بت پرستی کے عادی ہو گئے ہیں۔ لیکن ہم اس بت پرستی سے اغماض بھی تو نہیں کر سکتے۔ جبکہ یہ رسم ابھی تک دنیا میں کسی نہ کسی طبقہ میں جاری و ساری ہے۔ سب سے زیادہ المیہ تو یہ ہے کہ توحید کے جھولنے میں تربیت پا کر جواں مرد ہونے والے مسلمانوں کی اولاد بھی کسی نہ کسی عنوان سے بت پرستی کے چنگل میں گرفتار ہے۔ وہی مسلمان جو بت پرستی کے خلاف جہاد کا علم لے کر اقصائے عالم میں نکلے اور توحید کے نور سے دنیا کو منور کر دیا۔ وہ مسلمان جن کا طرّۂ امتیاز ہی ایک اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت تھی۔

بتانِ عرب اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم

عرب میں خداوندانِ محسوس (بتوں) کی اتنی قسمیں تھیں کہ جن کا شمار ناممکن ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان بتوں کو خود اپنے ہاتھ سے بھی توڑا اور اپنے اصحاب کو انہیں توڑنے کی حکماً تاکید فرمائی یعنی انہیں جہاں بھی دیکھیں توڑ دیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ان بتوں کے وجود کو اس دنیا سے مٹانے کے بعد ان کا نام اور ان سے وابستہ قصوں کو زبان پر لانے سے بھی پرہیز کرتے۔

تاریخ و ادب کے قاری اس بات کی گواہی میں موجود ہیں۔ قرآن حکیم میں بر سبیل تنبیہہ و تذکرہ یا ان کی حکایتیں بیان کی گئی ہیں یا احادیث میں ان کے بارہ میں جتنی روایات موجود ہیں ان کے ذکر کا ردّ عمل بت پرستی کا اعادہ نہیں ہو سکتا۔

لیکن قبل از اسلام بتانِ عرب کی تقدیس اور اقسام میں جو کچھ مذکور ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ عربوں کے عقائد میں ان بتوں کی تقدیس و عظمت بے حد تھی۔

ہر قبیلہ کا بت الگ الگ تھا۔ لیکن ان کی ظاہری تین صورتیں تھیں جن کے نام بھی جدا جدا تھے۔

مثلاً۔ (1) صنم:۔ (ان بتوں کو کہا جاتا تھا) جو کسی لکڑی یا دھات کو انسانی شکل میں تراش یا ڈھال کر بنائے جاتے۔

(2) وثن:۔ یہ ایسے بتوں کو کہا جاتا جو پتھروں کو انسانی شکل میں تراش کر بنائے جاتے۔

(3) نصب:۔ ان بتوں کو کہا جاتا جو صرف پتھر ہوتے تھے۔ نہ تو ان کو کسی انسانی شکل میں

تراشا جاتا نہ کوئی اور صورت دی جاتی بس وہ محض پتھر ہوتے۔

اگر ان پتھروں میں سے کسی میں چقماق کی قدرتی خوبی ہوتی' رنگت میں کوئی خصوصیت ہوتی' قدرتی ساخت میں اجنبیت ہوتی تو ایسے پتھروں کو آسمان کی طرف سے خصوصی طور پر اتارا ہوا سمجھا جاتا اور اسی عقیدہ کے تحت اس کی پوجا کی جاتی۔

خطۂ یمن کی بت تراشی

عرب کے پوجے جانے والے بتوں میں یمن کے تراشے ہوئے بت مجسمہ تراشی کے حیرت انگیز شاہکار تھے۔ جو اسی بات کا ثبوت ہے کہ حجاز کندہ اور نجد کے مقابلہ میں یمن کا تمدن عروج پر تھا اور اسی وجہ سے یمن کی صنعت بھی بے مثل تھی۔ افسوس ہے جن کتابوں میں عرب کے بتوں کی حکایات ملتی ہیں ان میں ان بتوں کے پوری طرح خدوخال کا بیان ہمیں نہیں ملتا۔ صرف ایک بت جو تحقیق کے پتھر سے انسانی شکل میں تراشا گیا اسے کعبہ میں رکھا گیا۔ اور ھبل کے نام سے پوجا جاتا۔ ایک دفعہ اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ تو قریشِ مکہ نے اسے سونے کی تاروں سے جوڑ دیا۔ "ھبل" عرب کے باقی تمام بتوں سے بھی اپنی منزلت اور رتبہ میں سب سے بلند مانا جاتا۔ دور و نزدیک کے لوگ اس کی زیارت کے لئے آتے اور بندگی کی تمام رسومات اس کے حضور ادا کرتے۔

"ھبل" کے سوا کئی چھوٹے چھوٹے بت بھی بتوں کی صورت وہاں موجود تھے۔ بیت اللہ شریف کے علاوہ بعض بت گھروں میں بھی نصب تھے۔ دستور یہ تھا کہ گھر سے نکلتے وقت بھی اور گھر میں داخل ہوتے وقت بھی ان کے سامنے (ڈنڈوت) اٹھک بیٹھک کرتے۔

سفر میں جانا ہوتا تو پہلے ان سے اجازت حاصل کی جاتی۔ پھر ان کو بھی اٹھا کر اپنے ساتھ لے جایا جاتا۔ یہ بت کعبہ کے اندر بھی اور مکہ معظمہ میں بھی رکھے گئے ہوئے تھے۔ کچھ ایسے بھی بت تھے جو عرب کے خانہ بدوش عربوں کے پاس رہتے۔ کچھ ایسے بھی بت تھے جو عرب کے دوسرے شہروں میں بسنے والوں کے معبود تھے۔

ان کے پوجنے والے بظاہر انہیں اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان قربت ذریعہ بتاتے لیکن حقیقت میں یہ لوگ اللہ وحدہ لاشریک کو بھول کر ان ہی کو اپنا حقیقی مقصود و معبود سمجھتے تھے۔

پھر مکہ معظمہ کا ذکر

جزیرۃ العرب میں خطۂ یمن اپنے تمدن اپنی شادابی اور ذرائع آب پاشی کے حصول کی وجہ سے اپنی جگہ ممتاز و ممیّز ضرور تھا لیکن عرب کے صحرا نشینوں کو اس کی قسمت پر کبھی رشک نہ آیا اور نہ ہی وہ یمن کی فلک بوس عمارتوں کی زیارت کرنا باعثِ فخر سمجھتے۔ ان کو تو عرب کی وادیٔ غیر

ذی زرع ناقابلِ زراعت وہ وادی سب سے زیادہ محبوب تھی جس کا نام مکہ ہے۔ اور اس بستی کا وہ گھر انہیں جان سے زیادہ پیارا تھا جسے اسماعیل علیہ السلام نے (اپنے والد امام الناس ابراھیم علیہ السلام) کی معیت میں حاجیوں کی زیارت کیلئے تعمیر فرمایا۔

جس کی زیارت کیلئے ان کی آنکھیں ہمیشہ ترستی رہتیں اور وہاں پہنچنے کیلئے وہ ہمہ وقت پابہ رکاب رہتے۔ خصوصاً سال کے ان چار مہینوں میں جن میں باہمی جنگ و جدال حرام سمجھا جاتا۔ ان مہینوں میں تجارتی اور مذہبی سفر جاری رہتا۔

مکہ ان اوصافِ جلیلہ کی وجہ سے آج بھی اور اس وقت بھی سب کا مرجع تھا۔ خالقِ کائنات نے مکہ معظمہ کی انہیں خوبیوں کی بناء پر اسے محمد ﷺ کا مولد ہونے کیلئے منتخب فرمایا تا کہ یہ شہر نہ صرف عرب کے بسنے والے دنیا کے ہر گوشہ کے ملکوں میں بسنے والے باشندوں کیلئے قلبی کشش کا مرکز ثابت ہو۔ اس کا اسماعیل (و ابراہیم) کا تعمیر کردہ گھر ہمیشہ کیلئے تعظیم و تکریم تقدیس و تشریف کا حامل رہے۔ مکہ معظمہ اور کعبہ مکرمہ کی برتری کے ساتھ ساتھ قریش کا مقام بھی بلند رہے۔ باوجودیکہ حضرت محمد ﷺ کی ولادت تک قریش کی قدیم سادہ اور بدوی زندگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ جس پر وہ صدیوں سے عمل پیرا تھے۔
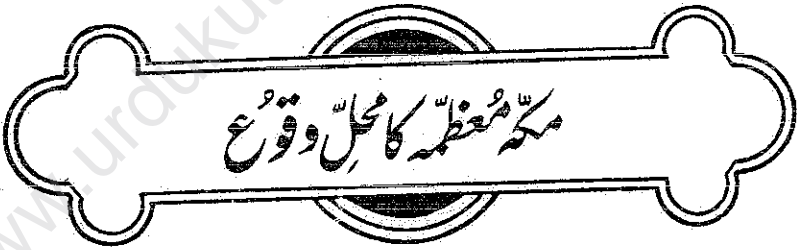
مکہ معظمہ کا محلِ وقوع

مکہ معظمہ کا محلِ وقوع

بحیرہ قلزم (الاحمر) کے مشرق کی جانب سے گزرنے والی عام شاہراہ جس کے ساتھ ساتھ یمن اور فلسطین کے درمیان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ چلا گیا ہے' سمندر سے تقریباً 8 کلومیٹر کے فاصلہ پہ اسی پہاڑی سلسلہ میں ایک درہ ہے جسے یمن' جدہ اور فلسطین تینوں مشہور خطوں کا سنگم کہا جاتا ہے۔ یہی درہ مکہ معظمہ کا محل وقوع ہے۔

مکہ کی بنیاد

یہ بستی (مکہ) آج سے ہزاروں سال پہلے آباد ہوئی مگر اس زمانہ کا تعین نہ ہو سکا۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں فلسطین اور یمن کے درمیان سفر کرنے والے قافلے اسی مقام پر پڑاؤ کرتے۔ جہاں مکہ معظمہ واقع ہے۔ یہاں انہیں پینے کیلئے ٹھنڈے اور میٹھے چشموں کا پانی وافر مل جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ سب سے پہلے اسماعیل علیہ السلام نے اس سرزمین کو اپنی مستقل قیام گاہ بنایا مگر اسماعیل علیہ السلام کے یہاں بسیرا کرنے سے پہلے یہ مقام ان قافلوں کی وجہ سے تجارتی منڈی بن چکا تھا جو یمن و فلسطین کے مابین سفر کرنے والے ادھر سے گزرتے قرآن فرماتا ہے۔

حضرت ابراھیم خلیل اللہ

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے اسماعیل علیہ السلام کے اس جگہ کو اپنی اقامت گاہ بنانے سے پہلے تعمیر کعبہ کی تاریخ نہیں ملتی۔ یہ ممکن ہے کہ ان کی آمد سے قبل یہ جگہ عبادت گاہ بن چکی ہو۔ جس کی وضاحت کیلئے جناب ابراھیم علیہ السلام کا قصہ بیان کرنا ضروری ہے۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کے والد نجار تھے اور اپنے وطن عراق ہی میں لکڑیوں کے بت تراش کر بسر اوقات کرتے۔ جب ان کے فرزند حضرت ابراھیم علیہ السلام سنِّ رشد کو پہنچے تو اپنے باپ کا پیشہ دیکھ کر حیران رہ گئے مگر جب لوگوں کو دیکھا کہ وہ ان کے والد کے کارخانہ میں تراشے ہوئے بتوں کی پوجا میں مگن ہیں تو حضرت ابراھیم علیہ السلام اس الجھن میں پڑ گئے کہ یہ سلسلہ (بت پرستی) کیا چیز ہے؟ پہلے تو انہوں نے اپنے والد ہی سے دریافت کیا۔ یہ بت جو آپ

تراش کر بیچتے ہیں یہ معبود کیسے ہو سکتے ہیں؟ والد ان کو اپنے جواب سے مطمئن نہ کر سکے تو پھر حضرت ابراھیم علیہ السلام نے ان لوگوں سے گفتگو کی جو ان بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ تو وہ لوگ ان کو ان کی معبودیت کے حق میں ٹھوس جواب نہ دے سکے۔

یہ حال دیکھ کر باپ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے ہی بیٹے کی اس بحث بازی میں میرا کارخانہ ہی برباد ہو جائے۔ اس لئے اپنے لختِ جگر کو بہت سمجھایا مگر حضرت ابراھیم علیہ السلام خود صحیح اور پختہ رائے کے مالک تھے۔ پھر ان کے اندر ایک داعیہ موجود تھا کہ وہ دوسروں کو اپنے نظریات سمجھا سکیں۔ انہیں ایک موقع ملا اور وہ عوام کی نظروں سے بچ کر مندر میں داخل ہو گئے اور مندر کے سب سے بڑے بت کو چھوڑ کر باقی سب بتوں کو توڑ پھوڑ دیا۔ لوگوں نے معلوم کر ہی لیا کہ یہ کس کی کارروائی ہے اور حضرت ابراھیم علیہ السلام سے ایک بڑے مجمع میں یوں سوال کیا؟

انت فعلت ھذا بالھتنا یا ابراھیم؟ (21-63)

اے ابراھیم ہمارے ان معبودوں کی یہ درگت تو نے تو نہیں بنائی

جواب۔ بل فعلہ کبیر ھم ھذا فسئلوھم ان کانو ینطقون (21-64)

جس نے بھی کیا ہو۔ ان میں بڑا (معبود) تو ابھی سلامت ہی ہے۔ اس سے دریافت کر لیجئے اگر بت بول سکتے ہیں تو وہ بتا بھی دے گا۔

مگر حضرت ابراھیم علیہ السلام نے ان بتوں کے ساتھ ایسا برتاؤ تب کیا جب ابراھیم علیہ السلام کو ان بت پرستوں کی گمراہی اور معبودِ برحق کی وحدانیت کا پورا پورا یقین ہو گیا تھا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں منقول ہے۔

فلما جن علیہ اللیل راکوکبا قال ھذا ربی فلما افل قال لا احب الافلین

ترجمہ۔ آخر جب حضرت ابراھیم علیہ السلام کو رات کی تاریکی نظر آئی تو انہوں نے آسمان پر ایک چمکتے ہوئے ستارے کو دیکھ کر کہا ارے میں اسے اپنا رب بنا لوں؟

جوں ہی یہ ستارہ ڈوب گیا فرمایا۔ میں غروب ہو جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فلما را القمر بازغا قال ھذا ربی فلما افل قال لئن لم یھدنی ربی لاکونن من القوم الضالین فلما را الشمس بازغہ قال ھذا ربی ھذا اکبر فلما افل قال یقوم انی بری مما تشرکون انی وجھت وجھی للذی فطر السموات والارض حنیفا" وما انا من المشرکین (6:78-79)

ابراھیم علیہ السلام نے چاند کی طرف دیکھا تو فرمایا۔ کیا میں اسے اپنا پروردگار سمجھ لوں۔ جونہی قمر غائب ہو گیا' فرمایا۔ اگر میرا رب مجھے راہِ راست نہ دکھاتا تو میں بھی ان گمراہوں کا ساتھی

ہوتا۔ دن چڑھا اور سورج طلوع ہوا تو ابراہیم علیہ السلام نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ کیا میں اسے اپنا پرورش کرنے والا مان لوں؟ اس لئے کہ یہ سب ستاروں سے بڑا ہے۔ آخر آفتاب بھی روپوش ہو گیا تب انہوں نے فرمایا۔ اے میری قوم میں اس فعل سے مبرا ہوں جو تم شرک کی صورت میں کرتے ہو۔ بلکہ میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس ذات کی طرف اپنا رخ کر لیا جو زمین کا خالق ہے۔ اور میں مشرک نہیں ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش

لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم کو راہ راست پر لانے میں ناکام رہے۔ اس پر لوگوں نے برافروختہ ہو کر انہیں جلتی چتا میں جھونک دیا۔ جس سے اللہ تعالیٰ نے انہیں صحیح و سلامت بچا لیا۔

آخر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں سے دل برداشتہ ہو کر اپنی اہلیہ سارہ کو ساتھ لیا اور فلسطین کی طرف ہجرت کر کے چل دیئے۔ یہاں سے مصر کی طرف لوٹے تو اس وقت مصر میں عمالقہ (اہلکوس) کی حکومت تھی۔ شاہان عمالقہ رعایا کی شوہردار حسیناؤں کو ان کے خاوندوں سے چھین کر اپنے حرم میں داخل کر لیا کرتے تھے۔ حضرت سارہ علیہا السلام ظاہری حسن و جمال میں بھی یکتا تھیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال آیا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم سے یہی برتاؤ کر کے قتل کرا دے آپ نے سارہ کو اپنی بہن بتایا مگر بادشاہ اپنے ارادہ سے باز نہ آیا۔ اس نے بی بی کو اپنے محل میں طلب کر ہی لیا۔

جناب ہاجرہ علیہا السلام

مگر بادشاہ نے اسی شب کو رؤیا میں بی بی سارہ کو شوہردار دیکھا جس سے ڈر کر اس نے حضرت ابراہیم کے حضور میں افسوس ظاہر کرتے ہوئے اور انکی خوشنودی کی سعادت حاصل کرنے کیلئے طرح طرح کے تحائف پیش کیے۔ جن میں اپنی ایک لونڈی بھی تھی جن کا اسم گرامی ہاجرہ علیہا السلام ہے۔

ادھر طویل مدت تک حضرت سارہ علیہا السلام اولاد سے محروم رہیں تو انہوں نے از خود اپنے شوہر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو انہیں اپنی زوجیت کا اعزاز بخشنے کا اصرار کیا۔

ایسا ہی ہوا چنانچہ انہی سیدہ ہاجرہ علیہا السلام کے بطن سے اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں پہ نثار! اب حضرت سارہ علیہا السلام بھی صاحب اولاد ہو گئیں اور آپ کے بطن سے جناب اسحاق پیدا ہوئے۔

ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں یا اسحاق علیہ السلام

اس معاملہ میں یہود اور مسلمانوں کی روایات مختلف ہیں۔ دونوں میں اختلاف یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام پہلوٹھے ہیں یا اسحاق علیہ السلام؟

فریقین اس میں بھی متفق نہیں کہ جس قربان گاہ پر یہ معاملہ پیش آیا وہ حجازِ مقدس میں ہے یا فلسطین میں؟ یہودی مورخین حضرت اسحاق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس اختلافِ رائے میں صحیح کون یا غلط کون اس کی تحقیق ہماری کتاب کا موضوع نہیں۔ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شیخ عبدالوہاب النجار نے اپنی کتاب "قصص الانبیاء" جناب اسماعیل علیہ السلام کو ذبیح ثابت کیا ہے۔ اس کی دلیل میں انہوں نے تورات کی اس نص کو پیش کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے اسماعیل علیہ السلام ہیں اور جب سارہ علیہا السلام کے بطن سے حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے تو دو فرزند ہونے کی وجہ سے ان کا اکلوتا ہونا ختم ہو گیا۔ اس روایت کے مطابق حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ہی ذبیح اللہ قرار دیا جائے گا۔ اور اسی کی روشنی میں قربان گاہ یا فدیہ گاہ کا حجاز میں ہونا تسلیم کیا جائے گا اور اگر اسحاق علیہ السلام کو ذبیح قرار دیا جائے تو لازماً ذبیح گاہ یا فدیہ گاہ فلسطین قرار پائے گی۔ کیونکہ اسحاق علیہ السلام کا حجاز جانا کسی صورت ثابت ہی نہیں۔ اس اصول کے مطابق اگر فدیہ یا قربان گاہ کی جگہ اگر منیٰ کو مان لیا جائے تو بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ہی ذبیح ماننا ہو گا۔ لیکن قرآن مجید اس قصہ میں ذبیح کا نام نہیں لیتا۔ اس لئے مسلمان اور یہودی دونوں میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام میں کون ذبیح ہے' اختلاف قائم ہے۔

قرآنِ مجید میں فدیہ ذبیح کا ذکر

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قربانی میں ان کے بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے کہا ہے اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام کو صبح کے وقت اپنے ساتھ لے کر ایک طرف چل دیئے۔ قرآن مجید میں یہ واقعہ ان لفظوں میں منقول ہے!

فلما بلغ معه السعی قال یابنی انی اری فی المنام انی اذبحك فانظر ماذا تری قال یابت افعل ماتومر ستجدنی ان شاء الله من الصابرین فلما اسلما وتله للجبین ونادینه ان یا ابراهیم قد صدقت الرؤیا انا کذلك نجز المحسنین ان هذا لهو البلوا المبین وفدیته بذبح عظیم (37:101-107)

الغرض جب ابراہیم علیہ السلام اپنے کمسن فرزند کو جائے شہادت کی طرف لے جا رہے تھے تو ان سے فرمایا۔ اے میرے بیٹے مجھے خواب میں اللہ کی طرف سے تمہیں اللہ کی راہ میں ذبح کرنے کا

حکم ہوا ہے۔ تم اپنے متعلق کیا کہتے ہو۔ فرزند نے عرض کیا۔ اے والد بزرگوار! آپ تعمیل حکم کیجئے مجھے اپنے اتباع میں انشاء اللہ صابر پائیں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں زمین پر الٹا پچھاڑ لیا۔ تو ہم (اللہ تعالیٰ) نے آواز دے کر فرمایا۔ اے ابراہیم تم نے اپنی طرف سے خواب کی تکمیل میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ ہم احسان کرنے والوں کیلئے اسی طرح جزا دیتے ہیں۔ یہ طریقہ ہماری طرف سے ان کیلئے ایک امتحان سا ہوتا ہے۔ اور ہم (اللہ تعالیٰ) نے ان کے فرزند کی قربانی کے بدلے "ذبح عظیم" بطور فدیہ ان کے سامنے پیش کیا۔

بعض روایات نے اس قصہ کو جس حد تک شاعرانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اس کا مقتضی ہے کہ اس کو بعینہ نقل کیا جائے! اگرچہ نفسِ مضمون کو اس درجہ تفصیلات کی ضرورت نہیں۔ قصہ یہ ہے۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو خواب میں اپنے اللہ کی طرف سے ذبح کرنے کا حکم ہوا۔ انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ اے میرے بیٹے۔ رسی اور چھری لو تاکہ ہم دونوں جنگل سے ایندھن توڑ لائیں۔ دونوں جنگل کی طرف جا رہے تھے کہ ابلیس نے صاحبزادہ کی والدہ کے پاس آ کر یوں رونا شروع کر دیا۔ بی بی آپ کو معلوم ہے ابراہیم علیہ السلام آپ کے لختِ جگر کو کہاں لے گئے ہیں؟ فرمایا دونوں جنگل میں ایندھن توڑنے گئے ہیں۔ ابلیس نے کہا۔ آپ کو مغالطہ میں رکھا گیا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام تو اس کو ذبح کرنے کی نیت سے لے گئے ہیں۔ فرمایا وہ تو اس کے مہربان باپ ہیں۔ ایسا نہیں کر سکتے اب اس نے یہ چغلی کھائی کہ ابراہیم علیہ السلام کو یہ مغالطہ ہوا کہ ان کے ذبح کرنے کا حکم انہیں اللہ نے دیا ہے۔ بی بی نے فرمایا۔ تب انہیں اپنے رب کی اطاعت کرنا ہی چاہئے۔ یہ سن کر شیطان ندامت سے لوٹ آیا۔

اب اس نے اسماعیل علیہ السلام کا تعاقب کیا اور ان سے بھی وہی چغلی کھائی مگر صاحبزادے بھی ابلیس کی باتوں میں نہ آئے۔ اب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملا اور کہا حضرت آپ کا رویا اللہ کی طرف سے نہیں بلکہ یہ تو شیطانی وسوسہ ہے۔ اپنے نورِ نظر کو ذبح کرنے کے بعد بیحد پچھتاوا ہو گا۔ اور وقت ہاتھ سے نکل جانے کے بعد کچھ بنائے نہیں بنے گا۔

یہ سن کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے شیطان پر لاحول ولا قوۃ پڑھا۔ اور وہ اپنا منہ لے کر لوٹ گیا۔ وہ ان تینوں میں سے کسی کو بھی اپنے فریب میں نہ لا سکا بلکہ اسے الٹا ندامت اٹھانا پڑی۔

اس شاعرانہ تخیل کا یہ حصہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

بیٹے نے التجا کی۔ اے پدرِ بزرگوار ذبح کے وقت میرے ہاتھ پاؤں باندھ لیجئے۔ مبادا خون کے چھینٹے آپ پر پڑیں اور میرا اجر کم ہو جائے۔ اے والدِ مہربان آپ بھی جانتے ہیں موت کڑوا

گھونٹ ہے۔ آپ چھری کو بھی تیز کر لیجئے تاکہ وہ آسانی سے اپنا کام کر سکے۔ باپ کی محبت اولاد کی تکلیف دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتی۔ یہ سانحہ باپ کے ہاتھوں بیٹے کا ذبح ہونا ہے ایسے میں اگر آپ نے مجھے پہلو پر لٹایا تو ممکن ہے میرا چہرہ دیکھ کر پدرانہ شفقت غالب آئے اور تعمیل حکم محال ہو جائے اس لئے مجھے آپ منہ کے بل گرا لیجئے اور میری قمیض میری والدہ کو دے دیجئے گا جو میری یادگار کے طور پر ان کیلئے وجہ تسلی ہو گی۔ یہ سن کر ابراھیم علیہ السلام نے ان سے فرمایا۔ اے میرے فرزند تم جس دلیری اور اطاعتِ فرزندی کے ساتھ میرے اللہ کی اطاعت کرنے میں میرا ساتھ دے رہے ہو اس عظیم خوبی کا صرف تمہیں کو اعزاز حاصل ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کو الٹا پچھاڑ کر ان کی گردن پہ چھری رکھی ہی تھی کہ ندا آئی۔

یاابراھیم قد صدقت الرویا۔ (37-104)

اے ابراھیم (علیہ السلام) تم نے اپنی رویا (خواب) کی تعبیر (عملاً) پوری کر دی۔

اس کے ساتھ ہی غیب سے اس بچے کے عوض ایک ترو تازہ سینڈھا حاضر ہوا۔ جسے ابراھیم علیہ السلام نے ذبح کیا اور اسے جلا دیا۔ یہ فدیہ یا ذبح کا قصہ ہے۔ جس سے سخت سے سخت آزمائش میں بھی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے عملی ثبوت دینے کی تعلیم مقصود ہے۔

حضرت ابراھیم علیہ السّلام کی مکہ مکرمہ میں ہجرت

اسحاق علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام دونوں بھائی ایک ساتھ رہتے تھے۔ دونوں سے ابراھیم علیہ السلام ایک سا پیار کرتے تھے مگر یہ بات حضرت سارہ علیہا السلام کو ناپسند تھی۔ (واللہ اعلم) سارہ علیہا السلام کی نگاہ میں حضرت ہاجرہ علیہا السلام خادمہ تھیں لہٰذا وہ ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مساویانہ درجہ دینا پسند نہیں کرتی تھیں۔ (دروغ بر گردن راوی) ایک دن اسماعیل علیہ السلام نے اسحاق علیہ السلام کو طمانچہ مارا تو سارہ علیہا السلام نے کہا اب میرا ہاجرہ علیہا السلام کے ساتھ رہنا ناممکن ہے۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام اس گھریلو تلخی کو ختم کرنے کیلئے حضرت ہاجرہ علیہا السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو ساتھ لے کر جنوب کی طرف روانہ ہو گئے اور یہ سفر انہوں نے اس درہ کوہ میں آکر ختم کیا جہاں آج مکہ معظمہ ہے۔ (لیکن قرآن میں سارہ علیہا السلام کے اس رویہ کا اشارہ تک نہیں۔ مترجم)

جس کے بارے میں تذکرہ کرتے ہوئے ہم نے پہلی فصل میں بتایا تھا کہ یہاں کوئی مستقل آبادی نہ تھی۔ صرف شام و یمن سے آنے جانے والے قافلے یہاں ستانے کیلئے کچھ دیر کیلئے ٹھہر جاتے اور ان کے جانے کے بعد پھر یہاں ویرانی کا بسیرا ہوتا۔

حضرت ابراھیم کھانے پینے کا جو مختصر سا سامان ساتھ لے کر آئے تھے وہ ان کو سونپ کر خود واپس چلے گئے۔ ہاجرہ علیہا السلام نے یہاں ایک جھونپڑی بنالی مگر جب کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا تو ہاجرہ علیہا السلام نے چاروں طرف کا جائزہ لیا کہ آب و طعام کہیں سے حاصل کیا جائے اسی تلاش میں وہ درہ کے دوسرے کنارے تک پہنچ گئیں غرض اسی کشمکش میں انہوں نے صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان سات چکر لگائے مگر پانی کا نشان تک نظر نہ آیا۔ آخر ایک مرتبہ مایوس ہو کر اپنے کمسن بچے کو دیکھنے کیلئے واپس آئیں تو دیکھا کہ بچہ اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑ رہا ہے اور اس کی ایڑیاں پانی سے تر ہیں۔ ذرا اور آگے بڑھ کر دیکھا تو انہیں پانی کی اور زیادہ مقدار ملی' انہوں نے یہ پانی اسماعیل علیہ السلام کو پلایا' خود بھی پیا اور پانی کے چاروں طرف چھوٹی سی دیوار بنا دی تاکہ پانی ریت میں جذب نہ ہو سکے۔ اس کے بعد حضرت ہاجرہ علیہا السلام کھانے کا سامان سوداگروں سے خرید لیتیں جو اس درہ میں پڑاؤ کرتے۔

جناب ہاجرہ اور اسماعیل علیہ السلام کی مستقل اقامت گاہ

یہ درہ صدیوں سے قافلوں کی سفری آرام گاہ تو تھا ہی چشمہ پھوٹ نکلنے کے بعد اور بھی زیادہ مشہور ہو گیا۔ عرب کے بعض قبیلے یہاں آ کر آباد ہو گئے جن میں سب سے پہلے آنے والوں میں قبیلہ جرھم ہے۔ دوسری روایت کے مطابق یہ قبیلہ (جرھم) حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کی اقامت گاہ سے پہلے ہی آباد تھا۔ (لیکن قرآن حکیم اس سے پہلے اس جگہ کو غیر آباد قرار دیتا ہے مترجم)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بلوغ و تزوج

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب بالغ ہوئے تو اسی قبیلہ (جرھم) کی ایک لڑکی کے ساتھ نکاح کر لیا اور قبیلہ جرہم کے ساتھ یہاں مستقل بستی آباد کر لی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ ان کے اردگرد اور بھی بستیاں آباد ہو گئیں۔ اطراف سے اور بھی بہت سے قبائل یہاں آ کر آباد ہو گئے اس آبادی ہی کا نام آفاقِ عالم میں مکہ مشہور ہوا۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کی تشریف آوری

اس اثناء میں ایک بار ابراھیم علیہ السلام نے حضرت سارہ علیہا السلام کے سامنے اسماعیل علیہ السلام کو ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انہوں نے ان سے اتفاق کیا۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام حضرت اسماعیل کی ملاقات کیلئے جس وقت تشریف لائے اس وقت وہ گھر میں نہیں تھے۔ آپ نے ان کی بیوی سے پوچھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کہاں ہیں؟ تو اس نے کہا۔ شکار کیلئے

تشریف لے گئے جو ہمارے گزر اوقات کا ذریعہ ہے۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اپنے لئے طعام کی خواہش ظاہر کی تو اس نے کہا۔ ہمارے گھر میں کھانے پینے کیلئے کچھ بھی نہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراھیم علیہ السلام اسے اپنا پیغام دے کر چلے گئے۔ پیغام یہ تھا کہ "اپنے شوہر سے میرا سلام کہنے کے بعد یہ کہنا کہ وہ اپنی چوکھٹ بدل دے۔"

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی واپسی پر ان کی بیوی نے انہیں پورا واقعہ سناتے ہوئے ان کا پیغام دیا۔ جسے سن کر اسماعیل علیہ السلام نے اسے طلاق دے کر اسی قبیلہ جرھم کی دوسری لڑکی بنت مضامن (بن عمرو) سے نکاح کر لیا۔

اس نیک طینت بیوی کے زمانہ میں جب دوبارہ ابراھیم علیہ السلام تشریف لائے اور اتفاق سے حسب سابق اسماعیل علیہ السلام اس وقت بھی گھر میں نہ تھے۔ حضرت ابراھیم نے ان سے بھی انجان بن کر ویسی ہی گفتگو کی اور آخر میں یہ پیغام دے کر واپس تشریف لے گئے "اپنے شوہر کو میرا سلام کہنے کے بعد یہ پیغام دینا کہ وہ اپنے دروازہ کی چوکھٹ کو سلامت رکھیں"۔

جب اسماعیل علیہ السلام واپس ہوئے تو اہلیہ محترمہ نے تمام واقعہ حرف بحرف سنایا تو اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا وہ میرے والد امجد و اکرم ابراھیم علیہ السلام تھے۔ اور تم میرے گھر کی چوکھٹ ہو۔ میرے والد نے مجھے حکم دیا کہ میں تمہیں ہمیشہ اپنے شرفِ زوجیت میں رکھوں۔

عرب مستعربہ

اسی بی بی کے بطن سے حضرت اسماعیل کے ہاں بارہ فرزند ہوئے جو اپنے گرامی قدر اعلیٰ مرتبت والد کے نسب کی بناء پر "عرب مستعربہ" کے نام سے متعارف ہوا۔

ان کی والدہ عالیہ محترمہ کے جدِ امجد کا نام گرامی "یعرب بن قحطان" تھا۔ اسی وجہ سے اسماعیل علیہ السلام کی اولاد عرب عاربہ سے بھی موسوم ہے اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنی عظیم الشان عدیم المثال والدہ محترم کی نسبت سے مصر سے بھی منسوب ہیں اور ابراھیم علیہ السلام نے ہجرت کے زمانہ میں فلسطین اور عراق کے جن علاقوں میں قیام کیا ان سے بھی منتسب ہیں۔

جزوی اختلافات

تمام مورخ حضرت ابراھیم علیہ السلام کو اپنے فرزند اسماعیل علیہ السلام اور ہاجرہ علیہ السلام کے ساتھ مکہ مکرمہ میں آنے اور قیام پذیر ہونے پر متفق ہیں مگر بعض مورخین کو چند جزوی نقل میں اختلاف ہے۔

(ا) یہاں پہلے چشمہ جاری تھا۔ (دروغ بر گردن راوی)

(ب) قبیلہ جرہم ان کی آمد سے پہلے یہاں آباد تھا۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی اہلیہ محترمہ اور فرزند اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ یہاں تشریف لائے تو انہوں نے انتہائی مسرت سے ان کو مرحبا کہا۔ اور جب اسماعیل علیہ السلام بالغ ہوئے تو اپنے ہی قبیلہ کی بیٹی سے ان کا نکاح کر دیا۔ جن کے بطن سے ان کے ہاں کئی فرزند پیدا ہوئے جن کی رگوں میں والد گرامی و محترم حضرت ابراہیم علیہ السلام کا عبرانی خون موجزن تھا تو اسماعیل علیہ السلام کی والدہ عالیہ ہاجرہ علیہ السلام کے مصری النسب ہونے کی وجہ سے ان کی رگو ں میں مصری خون بھی رواں دواں تھا اور اسماعیل علیہ السلام کی زوجہ محترمہ (بنت مضامن جرھمی العربی) کے عربی خون کی آمیزش نے ان کی اولاد میں عزیمت، شجاعت، قوت، ہیبت، اور صداقت جیسے اوصاف (عبرانی، مصری، عربی) بدرجہ اتم پیدا کر دیئے تھے۔

(ج) للذا نہ تو یہاں پانی کی عدم موجودگی ہو سکتی ہے جب پانی موجود رہے تو پھر حضرت ہاجرہ علیہا السلام کا پانی کی تلاش میں صفا اور مروہ کے درمیان سات بار بے چین ہو کر آنا جانا بھی بے معنی ہے۔ اور نہ ہی قرآن حکیم کی آیت ---- ان الصفا والمروۃ میں شعائر اللہ (153:2) کے کچھ معنی (نعوذ باللہ) للذا تاریخی روایات کے ان حوالوں کا نتیجہ "زم زم" کے تقدس کو بھی مشکوک کر دیتا ہے۔

شکوک کا تخم ریز ولیم میور ہے

شکوک پیدا کرنے کی پہلی کوشش سر ولیم میور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حضرت اسماعیل اور ہاجرہ علیہ السلام کو حجاز لے کر جانے کی تردید سے کرتا ہے اور اپنی تحقیق کی گلفشانی کرتے ہوئے لکھتا ہے۔

"اسرائیلی گفتار سازوں نے ظہورِ اسلام سے پہلے ہی یہ افسانہ تراشا اور ابراہیم علیہ السلام کے فرزندان کو عرب میں آباد کر دیا۔ جس سے یہودیوں کا مقصد اسماعیل علیہ السلام کے عربی النسل ہونے کی وجہ سے یہودی خود کو اسحاق علیہ السلام کی اولاد ہونا ثابت کر سکیں تاکہ عربوں کے ساتھ عم زاد (چچیرے بھائی) ہونے کی وجہ سے اپنی تجارت کو ترقی دے سکیں"۔

اس کے بعد سر ولیم میور لکھتے ہیں

"اہلِ عرب کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین سے کوئی تعلق نہ تھا۔ عرب بت پرست تھے اور ابراہیم علیہ السلام موحد اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرتے تھے" لیکن معترض کی یہ کمزور سی دلیل تاریخ کے ایک مسلمہ واقعہ کی تردید کیلئے کافی نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابراہیم علیہ

السلام اور ان کے فرزند اسماعیل علیہ السلام کی وفات کے صدیوں بعد بت پرست بن جانا اس بات کی دلیل کیسے بن سکتا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل بیت کو حجاز میں آباد کیا اس وقت سے لیکر دونوں "باپ اور بیٹے" کے ہاتھوں تعمیر ہونے والے کعبہ تک عرب کے رہنے والے بت پرست ہی تھے۔

بفرض محال یہ مان بھی لیا جائے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں عرب بت پرست تھے تب بھی سر ولیم میور کی دلیل اس کے مقصد کی مددگار ثابت نہیں ہو سکتی۔ تاریخ گواہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہم وطنوں کو بت پرستی سے منع کیا۔ انہیں اللہ وحدہ لاشریک کو معبود ماننے کی دلائل کے ساتھ دعوت دی وہ نہیں مانے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حجاز کی طرف ہجرت کر لی تو یہاں بھی انہوں نے بت پرستوں کو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرنے کی تبلیغ کی مگر یہاں کے لوگوں کی اکثریت نے بھی بت پرستی نہ چھوڑی۔ تو اس سے یہ کیسے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حجاز میں آمد ہی نہیں ہوئی۔ خصوصاً" جبکہ عقل اور واقعات کا تاریخی تسلسل ہماری تائید اور میور کی تردید کر رہا ہے۔

(1) جب ابراہیم علیہ السلام عراق سے نکلے تو پہلے فلسطین میں پہنچے' سفر کی مصیبت اور صحرا نوردی کی مشکلات ان کے حوصلوں کو پست کرنے میں ناکام رہیں۔ یہاں انہوں نے شام سے آنے والے تاجروں کو حجاز کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو خود بھی اسی قافلہ کے ساتھ ہو لئے۔

ہماری اس تاریخی دلیل کی مؤید ان مؤرخین کی تحریریں تاریخ کے اوراق پر ضبط شدہ موجود ہیں۔ جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فلسطین سے حجاز آنا بار بار بیان کیا گیا ہے۔

سر ولیم میور اور ان کے ہمنوا

یہ بھی لکھتے ہیں حضرت ابراہیم اور اسماعیل کی وفات کے بعد ان کی اولاد فلسطین سے حجاز میں آکر آباد ہو گئی اور ان کی رگوں میں عراق اور حجاز دونوں کے خون کی آمیزش ہو گئی۔ میرا کہنا یہ ہے کہ جب اولاد کا آنا تسلیم کرتے ہو تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو حجاز آنے میں کون سی چیز مانع ہو سکتی ہے جبکہ تاریخ کا تسلسل کے ساتھ ان کے حجاز آنے کا اعلان موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ قرآن مجید کے علاوہ تمام آسمانی کتابیں بھی اسی اعلان کی تائید کرتی ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ کعبہ تعمیر فرمایا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکا" وھدی للعالمین فیہ ایت بینات مقام ابراھیم ومن دخلہ کان امنا" (3:96 تا 97)

بیشک انسانوں کیلئے اللہ عزوجل کی عبادت کرنے کیلئے سب سے پہلا معبد (عبادت گاہ) مکہ میں ہی ہے۔ جو انتہائی برکت والا بھی ہے اور تمام دنیا کے انسانوں کیلئے ہدایت کا سبق آموز بھی ہے۔ اس میں دینِ حق کی روشن روشن نشانیاں (دلیلیں) بھی ہیں اور انہیں میں سے وہ مقامِ ابراہیم بھی ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراھیم علیہ السلام عبادت کرتے رہے۔ اس گھر میں یہ صفت بھی ہے کہ جو کوئی بھی اس کی مقدس حدود میں داخل ہو گیا وہ امن و حفاظت کے قلعہ میں آ گیا۔

ذرا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد پر توجہ کیجئے!

”واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس و أمنا واتخذوا من مقام ابراھیم مصلی وعھدنا الی ابراھیم و اسماعیل ان طھر بیتی للطائفین والعاکفین والرکع السجود واذ قال ابراھیم رب اجعل ھذا بلدا“ آمنا” وارزق اھلہ من الثمرات من آمن منھم باللہ والیوم الآخر قال ومن کفر فامتعہ قلیلاً ثم اضطرہ الی عذاب النار وبئس المصیر۔ و اذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسماعیل ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔(2: 152 تا 157)

ترجمہ۔ جب ہم نے انسانوں کیلئے کعبہ کو بار بار آنے اور جانے کا پرامن مقام قرار دے دیا اور اعلان فرمایا جس جگہ پر ابراھیم علیہ السلام کھڑے ہو کر نماز پڑھتے رہے ہیں بعد میں آنے والے تمام لوگ اس جگہ کو اپنی عبادت گاہ بنائیں اور جب ہم نے ابراھیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام دونوں کو حکم دیا کہ اس گھر کو طواف اور عبادت کرنے والوں، رکوع اور سجود کرنے والوں کیلئے پاک صاف کر دو۔ ابراھیم علیہ السلام نے ہمارے حضور میں ہمارے حکم کی تعمیل کے بعد یہ دعا کی الٰہی اس بستی کو ہمیشہ امن کا شہر بنائے رکھنا۔ اس بستی میں رہنے والوں کو جو اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لائے ہوں انہیں ہر پیداوار سے مستفید فرماتے رہنا۔ (اللہ تعالیٰ نے اس دعا کے جواب میں ابراھیم علیہ السلام کو فرمایا) ہمیں اور تو سب کچھ منظور ہے مگر جو شخص کفر کو گلے لگائے گا ہم اسے بھی کھانے کو دیتے رہیں گے البتہ آخر کار اس سے کفر کی بازپرس ضرور ہو گی۔ اسے انجامِ کار دوزخ میں جانا ہو گا جو بہت برا ٹھکانا ہے۔

اور جب ابراھیم (علیہ السلام) اپنے فرزند اسماعیل کو ہمراہ لے کر خانہ کعبہ کی بنیادیں تعمیر کر رہے تھے اور ان دونوں کی (مقدس) زبانوں پر یہ دعا تھی۔ ”اے اللہ ذوالمنن ہماری کوشش (تعمیر) کو قبول فرما تو سننے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔“

بت پرستی کا زمانہ اور کعبتہ اللہ

حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اس یقین اور دعا کے ساتھ کعبتہ اللہ کو تعمیر کیا تھا کہ لوگ

یہاں پر ایک اللہ کا تصور معبودیت لے کر آئیں گے۔ یہاں چند روز رہ کر اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کریں گے لیکن اللہ کا گھر بتوں کا گھر بتکدہ کیوں بن گیا؟ کیسے بن گیا؟ اس کے اندر اعلانیہ بت پرستی کیسے شروع ہوئی؟ یہ برائی حضرت ابراھیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی وفات کے بعد بیت اللہ شریف میں کس راہ سے داخل ہوئی؟ ایک اللہ کی عبادت کی جگہ بہت سے بتوں کی پوجا کیسے غالب آئی۔ افسوس تاریخ ان حالات سے زمانے اور وقت کی دبیز چادریں نہیں ہٹا سکی اگر کسی شخص نے اس گھناؤنے عمل کے بارہ میں کچھ لکھا بھی ہے تو بھی ہماری نظر میں وہ صرف خیالی قیاس آرائی ہے جس کے جوابات کو اس نے خود ہی اپنے لئے سامانِ تسلی بنا لیا ہے۔

عرب میں ستارہ پرستی کا عروج

ماضی میں عرب کے اندر ستارہ پرستی کو بڑا عروج حاصل ہوا جس کا آغاز تو اس خیال پر مبنی تھا کہ ثوابت و سیارے اللہ جل شانہ کی عظمت و جلال کے مظہر ہیں لہٰذا ان کی تعظیم کرنا بھی ضروری ہے۔ ورنہ حقیقت میں ہم اللہ جل شانہ ہی کی قدرت کاملہ کو اپنا معبود حقیقی مانتے ہیں۔ لیکن ان کے اس خیال نے آہستہ آہستہ یہ تعیّن کر لیا کہ ستارے بھی بذاتِ خود اللہ جل شانہ کے ہم پلہ قدرت و اختیار رکھتے ہیں۔ اس طرح ان کی پوجا عام رواج پا گئی۔

مکہ مکرمہ میں بت پرستی کی ابتداء

لوگوں نے چماق کے پتھر میں جب آگ کا کرشمہ دیکھا تو یہ باور کر لیا کہ آسمان سے جو ہمارے معبود ستاروں کی بھینٹ چڑھانے کیلئے پتھر گرائے جاتے ہیں وہ یہی پتھر ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بعض نے ستاروں کو چھوڑ کر انہیں ہی اپنا معبود بنا لیا۔ حجر اسود کو تعظیمی بوسہ دینے کا جوش حد سے بڑھ کر ادھر ادھر بکھرے ہوئے پتھروں تک جا پہنچا۔ اور لوگوں نے کعبۃ اللہ کے اردگرد بکھرے ہوئے پتھروں کو سفر میں پہلے پہل بطور تبرک ساتھ لے جانا شروع کر دیا بعد میں یہ تبرک معبود کی طرح پوجے جانے لگے، ہر کام شروع کرنے سے پہلے ان سے اجازت لی جاتی۔ بات یہاں تک بڑھی کہ پتھروں سے تراشے ہوئے بت الگ الگ معبود بنا لئے گئے اور ان پر طرح طرح کی قربانیاں اور چڑھاوے دیئے جانے لگے۔

مؤرخین کعبۃ اللہ کی ابراھیمی تعمیر جس کا مقصد خالص ایک وحدہ لاشریک اللہ کی عبادت کرنا تھا، اسے چھوڑ کر بت پرستی کی ابتداء کیوں اور کیسے ہوئی کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ تاریخ کے سب سے بڑے مصنف ہیرودوت (ابو التاریخ یعنی تاریخ کے باپ کے نام سے مشہور ہے) کی "عرب میں لات کی پرستش" کے عنوان سے اور ایک دوسرے عظیم مورخ

دیو دور صقلی کی "وہ بیت مکہ جس کی سارا عرب تعظیم کرتا ہے" کے زیر عنوان کتابیں اس حقیقت پر تفصیل سے روشنی ڈالتی ہیں کہ عرب میں بت پرستی کا نفوذ کس طرح ہوا جس کے مقابلہ میں یہاں دین ابراھیمی زیادہ مدت تک مقبول عام نہ رہا۔

حضرت ابراھیم علیہ السلام کے بعد جزیرہ عرب میں دوسرے انبیاء کا ظہور

تاریخ جن ادوار کا کھوج نہیں لگا سکی ان ادوار میں بھی عرب میں انبیائے کرام تشریف لاتے رہے اور اولادِ آدم کو اللہ وحدہ لاشریک کی ہی عبادت کرنے کی دعوت دیتے رہے مگر عرب کے عوام انبیاء کی دعوت کو ٹھکراتے رہے اور بدستور بتوں کو پوجتے رہے۔

حضرت ہود علیہ السلام

ان انبیائے کرام میں سے حضرت ہود علیہ السلام قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے۔ قوم عاد حضر موت کے شمال میں آباد تھی۔ ہود علیہ السلام نے انہیں بت چھوڑ دینے اور ایک اللہ کی عبادت کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر یہ قوم اپنی دانشوری اور ہمہ دانی کے تکبرو غرور میں ہی رہی۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نبی کو یہاں تک کہہ دیا۔

یهود ماجئتنا ببنیته وما نحن نبتارکی الھتنا عن قولک وما نحن لک بمومنین (56:11)

اے ہود (علیہ السلام) تمہارے پاس بت پرستی کے خلاف کوئی دلیل تو ہے نہیں۔ پھر ہم تمہاری باتوں میں آکر اپنے خداؤں سے کیسے منہ موڑلیں؟ اور تمہاری نبوت پر ایمان لے آئیں۔

حضرت صالح علیہ السلام

ان کے بعد حضرت صالح علیہ السلام اس قوم کی طرف آئے جو حجر (نامی علاقہ) میں آباد تھی۔ یہ علاقہ حجاز اور شام کے درمیان خلیج عقبہ کے اس کنارے پر واقع ہے جو مدین سے ملحق "حجر" کے نام سے موسوم ہے۔ لیکن آپ کی دعوت بھی ان کو دولتِ ایمان سے آشنا نہ کر سکی۔

حضرت شعیب علیہ السلام

صالح علیہ السلام کے بعد حضرت شعیب علیہ السلام مدین کے پہاڑی علاقوں کے باشندوں میں مبعوث ہوئے۔ انہوں نے وہاں کے رہنے والوں کو دعوتِ توحید دی مگر اس قوم نے بھی ہود علیہ السلام کی بات سنی ان سنی کر دی اور اپنے سے پہلے منکرین انبیاء کی طرح اللہ تعالیٰ کے

عذاب کا لقمہ بن گئے' یہی نہیں بلکہ اور بھی بہت سے انبیائے کرام اس دنیا میں تشریف لائے جن کا تذکرہ قرآن حکیم میں فرمایا ہے۔ اور ان کی دعوت کے نتائج و عواقب بھی بیان فرمائے ہیں۔ ان سے پہلے انبیائے کرام کی دعوت کو ٹھکرانے والوں کا حشر کیا ہوا اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ کر اپنے کانوں سے سن کر بھی عوام کی اکثریت بت پرست ہی رہی۔ ان کے دلوں میں بتوں کی عظمت اسی طرح بس گئی تھی کہ وہ کعبتہ اللہ میں رکھے ہوئے بتوں کے حج (یعنی زیارت) کیلئے ملک عرب کے دور دراز خطوں سے آتے' نذریں نیازیں دیتے۔

انہیں کے بارہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وما کنّا معذبین حتی نبعث رسولا (16:17) ہم کسی شخص کو بھی عذاب میں مبتلا نہیں کرتے جب تک اسے اپنے رسول کے ذریعہ اپنی دعوت پہنچا نہیں دیتے۔

گویا ان تمام مغضوب قوموں کے پاس انبیائے کرام آتے رہے۔ دعوتِ حق دیتے رہے اور یہ انکار کرتے رہے اور عذاب کا شکار ہوتے رہے' اور اب۔

قصیٰ بن کلاب کی سیادت و اعزازات کا ذکر

قصیٰ بن کلاب وہ واحد عظیم شخصیت ہے جسے تعمیرِ کعبہ سے لیکر مکہ میں سیادت و سروری کے مسلسل مندرجہ ذیل اعزازات حاصل رہے۔

یہ نصف صدی پانچویں صدی عیسوی کا زمانہ ہے۔ تقریباً 440ء

(1) حجابتِ کعبہ۔ یعنی بیت اللہ شریف کی کلید برداری کا اعزاز

(2) سقایت۔ یعنی حاجیوں کیلئے میٹھے پانی کا مہیا کرنے کا اعزاز جو اہلِ مکہ کا سب سے پسندیدہ مشروب تھا۔ اس کے علاوہ کھجوروں کا عصارہ مہیا کرنا جو کھانے اور پینے دونوں کی کفایت کرتا ہے۔

(3) رفادت۔ مفلوک الحال حاجیوں کو کھانا مہیا کرنے کے علاوہ ان کی واپسی کیلئے زاد راہ (سفر خرچ) بھی دینا۔ گویا خدمتِ خلق کا اعزاز۔

(4) ندوہ۔ اہلِ مکہ کے روزمرہ مسائل پر ہونے والی مجالس کی صدارت کا اعزاز۔

(5) جنگی لشکر کی سپہ سالاری کا اعزاز۔

اور یہ تمام عہدے کعبہ ہی کی عظمت و برکت کے مرہونِ منّت تھے جو اسے عرب کے باشندوں کی مرکزی عبادت گاہ ہونے کے سبب حاصل تھی۔

خیال رہے مذکورہ تمام اعزازات قصیٰ کو ایک ہی وقت میں یکدم حاصل نہیں ہوئے بلکہ ایک عہدہ میں بہترین کارکردگی دوسرے منصب کا سبب بنی اور دوسرے منصب میں اعلیٰ ترین

کارنامہ کرنے کے بعد کعبتہ اللہ کے دینی شرف کی بناء پر قریش مکہ نے قصی کی غیر معمولی خدمات اور اوصاف کے سبب خود دیئے۔

ہماری تحقیق کے مطابق تعمیرِ کعبہ کے وقت ان تمام مناصب کا وجود ہی نہیں تھا۔ مگر جیسے جیسے ضرورتیں وجود میں آتی گئیں۔ ان کے تدارک کیلئے مناصب بھی وجود میں آتے گئے۔ مذکورہ عہدوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن کا کعبہ کی دینی عظمت سے کوئی واسطہ نہیں لیکن اہل مکہ کے مزاج اور تقاضوں سے انہیں بڑی اہم مناسبت ہے۔

قصی سے پہلے مکہ کی تمدنی حالت

تعمیرِ کعبہ کے زمانے میں مکہ معظّمہ کی شہرت تمدنی لحاظ سے ایسی دلکش نہ تھی جو عمالقہ اور بنو جرہم کیلئے خصوصی کشش رکھتی۔ لیکن اسماعیل علیہ السلام کے اس جگہ کو اپنی رہائش گاہ بنانے کے بعد جب ابراھیم علیہ السلام کے ساتھ مل کر انہوں نے (اسماعیل علیہ السلام) کعبہ تعمیر فرمایا تو پھر ان دو صفات کی برکتوں نے اس بستی کو اولادِ آدم کیلئے مستقل بسیرا بننے کی انتہائی قابلِ رشک صلاحیت بخش دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر طرف سے قبائل قافلہ در قافلہ آتے گئے۔ یہاں بستے گئے۔ پھر یہ بستی ایک عظیم الشان شہر میں تبدیل ہو گئی۔ اس عظیم شہر کے عظیم لوگوں کے بارہ میں چند دشمن یہ کہتے ہیں کہ اخلاق کے نقطۂ نگاہ سے ان قبائلی باشندوں سے بدویت زائل نہ ہو سکی۔ اور کچھ اہلِ تاریخ یہ کہتے ہیں کہ کم از کم قصی میں کلاب کی 440ء سیادت و سروری تک مکہ کے باشندے اپنے بدوی مزاج کو بدل نہ سکے

لیکن عقل یہ باور نہیں کرتی۔ روئے زمین پہ واقع وہ بستی وہ آبادی وہ شہر جسے بیت اللہ کا شہر کہلانے کا انفرادی اعزاز حاصل ہے۔ وہ شہر جسے قبیلہ جرہم کا مسکن بننا نصیب ہوا ہو۔ وہ قبیلہ جرہم جسے حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام جیسی عظیم ہستی کا سسرال ہونے کا شرف حاصل ہوا ہو وہ شہر جو صدیوں سے یمن' حیرہ' شام اور نجد سے آنے والے تاجروں کا مسافری میں آرام گاہ رہا ہو۔ ایسا شہر جو ساحلِ قلزم کے قریب ہو۔ یعنی ایسا شہر جو مدتوں اتنی متمدن قوموں کا مرجع رہا ہو۔ کیا وہ مدنیت سے ناآشنا رہ سکتا ہے۔ یہ دلائل اپنی جگہ بھاری سہی مگر ان سب سے زیادہ مضبوط ترین دلیل یہ ہے کہ جس شہر کا نام حضرت ابراھیم علیہ السلام نے خود رکھا ہو۔ جس شہر کی فلاح و بہبود کیلئے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگی ہو۔ اس پر عظمت یہ کہ وہ ساری دعائیں اور التجائیں بارگاہِ الٰہی سے شرف قبولیت بھی حاصل کر چکی ہوں۔ اس شہر کے بارہ میں یہ کیسے مان لیا جائے کہ وہ قصی بن کلاب کے زمانہ سیادت 440ء میں شرف تمدن نہ پا چکا ہو۔ جبکہ اس شہر میں مسیح سے دو ہزار سال قبل حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے گرامی قدر فرزند اسماعیل علیہ

السلام کو لا کر آباد کیا ہو۔

مکہ معظمہ پر قریش کا قبضہ

قبیلہ جرہم نے عمالقہ کو شکست دے کر مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیا جو مضاض (بن عمرو بن الحارث) کے عہد تک قائم رہا۔ اس زمانے میں مکہ کی تجارت اپنے پورے شباب پر رہی۔ لیکن افسوس بنو جرہم کثرتِ مال و زر کے سبب عیش و آرام کے عادی ہو گئے۔ وہ یہ بھول گئے کہ اس ناقابلِ کاشت (وادی غیرذی ذرع) میں رہ کر محنتِ شاقہ کے بغیر روزی حاصل کرنا ناممکن ہے اور وہ یہ بھی بھول گئے کہ مقبولیتِ دعا کا فیضان صرف ان کیلئے ہے جو احکامِ الٰہیہ کے پابند ہوں گے۔ ان کی غفلت کا یہ عالم ہو گیا کہ چاہِ زم زم کی صفائی اور اس کی دیکھ بھال سے بھی ایسے بے پرواہ ہو گئے کہ اس کے سرچشمے ہی بند ہو گئے۔

خزاعہ کی بالادستی

بنو جرہم کی غفلت اور حماقت کو دیکھ قبیلہ خزاعہ کی اس سازش سے آگاہ کر کے انہیں سنبھلنے کی بہت ترغیب دی مگر سب بے سود رہا۔ مضاض کو بنو جرہم کی ذلت و شکست کا یقین آثار و قرائن کے سبب بڑھتا گیا۔ اس نے دور اندیشی کے طور پہ کعبہ کے خزانے میں سے بیش قیمت سامان اور سونے کے دو ہرن جو کبھی کعبہ کیلئے ہدیہ کے طور پر دیئے گئے تھے دوسروں کی نظروں سے بچا کر انہیں زمزم کے کنوئیں میں دفن کر دیا تاکہ اگر کبھی دوبارہ بنو جرہم کعبہ پہ قابض ہوں تو ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ اس مہم سے فارغ ہو کر مضاض اپنے قبیلہ اور بنو اسماعیل کو ہمراہ لے کر مکہ مکرمہ سے نکل گیا۔ اس کے بعد مکہ معظمہ میں بنو خزاعہ کی حکمرانی تھی۔ جو قصی بن کلاب کے دور تک رہی۔ قصی بن کلاب کا رسول اللہ ﷺ سے پانچویں پشت سے نسبی تعلق ہے۔

تعارف قصی

قصی کی والدہ کا نام فاطمہ بنتِ سعد بن سیل ہے۔ ان کے بطن سے دو بیٹے پیدا ہوئے۔ قصی کے دوسرے بھائی کا نام زہرہ ہے۔ یہ قصی سے بڑے تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے وقت قصی اپنی والدہ کی گود میں تھے۔ فاطمہ نے ربیعہ بن حرام کے ساتھ بعد میں شادی کر لی' ربیعہ بوجوہ وطن چھوڑ کر شام چلے گئے۔ یہاں فاطمہ کے بطن سے ایک اور بیٹا پیدا ہوا اس کا نام دراج رکھا۔ قصی نے ہوش سنبھالا تو وہ ربیعہ ہی کو اپنا والد سمجھنے لگا۔ لیکن ایک دفعہ قصی اور ربیعہ کے خاندان میں جھڑپ ہو گئی تو انہوں نے قصی کو طعنہ دیتے ہوئے کہا۔ کہ تم نہ ہمارے

خاندان سے ہو اور نہ ہی ہمارے نسب سے ہو۔ قصی نے یہ جملے اپنی والدہ کے سامنے بیان کرتے ہوئے اس کا مطلب سمجھانے کیلئے کہا تو اس نے بتایا کہ اے میرے لختِ جگر تم اپنے باپ کے نسب کی وجہ سے ان کے مقابلہ میں زیادہ معزز ہو۔ تمہارے باپ تو کلاب بن مرہ ہیں اور تمہارے خاندان کو بیت الحرام کے قرب میں رہنے کا اعزاز حاصل ہے۔ اس کے بعد قصی مکہ معظمہ چلے آئے۔ جہاں وہ اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے اپنے پورے خاندان میں صاحب احترام بن گئے۔

قبیلہ خزاعہ کے ساتھ سسرالی رشتہ

اس وقت کعبہ کی تولیت جلیل بن حبشیہ کے قبضہ میں تھی' یہ خزاعی تھے اور صاحبِ فراست بھی۔ قصی نے انکی صاحبزادی حبی سے شادی کرلی' قصی تجارت میں بے پناہ قابلیت رکھتے تھے۔ کاروبار کے معاملہ میں ایک لمحہ بھی غفلت سے کام نہیں لیتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ مالدار ہو گئے۔ اللہ کی شان دولت کے ساتھ نرینہ اولاد بھی عطا ہو گئی' ان دونوں نعمتوں نے قصی کو اپنے ہم عصروں میں عزت و وقار میں اعلیٰ مقام دے دیا۔

قصیٰ اور کلید کعبہ

جلیل نے زندگی کے الوداعی سانسوں میں کعبہ کی کنجیاں اپنی بیٹی حبی کے حوالے کر دیں۔ بیٹی نے اتنی بڑی ذمہ داری کو سنبھالنے سے گھبرا کر چابی ابو غبشان خزاعی کے حوالے کر دی' ابو غبشان شراب کا ایسا شیدائی تھا کہ اس نے ایک مشکیزہ شراب کے ہاتھوں کعبہ کی تولیت قصی بن کلاب کے ہاتھوں فروخت کر دی۔ بنو خزاعہ اس واقعہ سے بہت پریشان ہوئے' انہوں نے مجلسِ مشاورت قائم کی اور اس میں بڑے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ قصی بہت مالدار ہے۔ اس کا قبیلہ بھی کافی طاقتور ہے۔ اس حالت میں اگر چابی اس کے پاس رہی تو آہستہ آہستہ کعبہ کے تمام مناصب و اعزاز انہیں کے ہو جائیں گے۔

بنو خزاعہ نے چابی کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے انکار کیا۔ اس پر دونوں میں کشمکش بڑھ گئی۔ قصی کا قبیلہ اپنے سردار کی ہر ممکن امداد کیلئے تیار ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے قبائل بھی جو قصی کی غیر معمولی ذہانت اور اعلیٰ اخلاق کے قائل ہو گئے تھے انہوں نے بھی بنو خزاعہ کے مقابلہ میں صف آرائی کی صورت میں قصی کا ساتھ دینے کا اعلان کر دیا۔ جنگ ہوئی اور خوب ہوئی' فیصلہ بنو جرہم کے حق میں ہوا۔ بنو خزاعہ نے مکہ شہر خالی کر دیا اور بیت اللہ کے تمام اعزازات و مناصب قصی بن کلاب کے ہاتھ آ گئے۔

شہر مکہ کی تعمیر

بنو جرہم کے معاشرتی اصولوں میں یہ اصول بھی تھا کہ وہ ہر کام باہمشورہ اور اتفاق سے کرتے چنانچہ قصی کے ہاتھ سیادت آنے سے پہلے حرمِ کعبہ کے اردگرد کوئی بستی نہ تھی۔ بنو جرہم اور بنو خزاعہ دونوں کے اعتقاد میں حرمِ کعبہ کے آس پاس بستی کا ہونا بیت اللہ کی بے حرمتی کے مصداق تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سب کے سب رات کے وقت حدودِ حرم سے باہر جہاں سے گھاس توڑنا اور جہاں شکار کھیلنا جائز ہے وہاں جاکر بسیرا کرتے! لیکن روایت کے مطابق قصی نے اپنے ہاتھ سیادت آنے کے بعد شہر مکہ میں حرمِ کعبہ کے آس پاس شہر آباد کرنے کا نظریہ پیش کیا۔ سبھی نے اس سے اتفاق کیا۔ اور سب سے پہلے وہ عمارت تعمیر ہوئی جس میں بیٹھ کر یہ لوگ اپنے معاشرتی مسائل حل کرنے کیلئے مجلسیں قائم کرتے تھے اور بعد میں اس کا نام دار الندوہ رکھ دیا گیا۔ چنانچہ نکاح و تزویج جیسے مسائل بھی اسی میں عمل پذیر ہوتے۔

اس مشوراتی عمارت کی تعمیر کے بعد قصی کے منصوبہ کے مطابق کعبہ کے اردگرد وہاں مکان بنائے گئے جہاں کعبہ کا طواف کرنے کیلئے کافی خلا چھوڑ کر جگہ تھی۔ اسی طرح حدودِ مطاف کیلئے بھی کعبہ کے چاروں طرف زمین کا کافی حصہ خالی چھوڑ دیا گیا۔

قصی کے بعد سلسلہ نیابت

قصی کے بیٹوں میں سے عبدالدار سب سے بڑے تھے۔ اور عبدِ مناف ان سے چھوٹے لیکن قوم میں عبد مناف کا وقار زیادہ تھا۔ قصی کی صحت دن بدن خراب ہوتی گئی قویٰ جب جواب دے گئے تو انہوں نے اپنی زندگی میں ہی عبدالدار کو کلیدِ کعبہ کے ساتھ دوسرے تمام اعزازات بھی عبدالدار کے سپرد کردیئے۔ ان اعزازات میں "رفادت" بھی تھی۔ جس کیلئے تمام قریش کے ذمہ سالانہ ٹیکس تھا۔ جو قصی کے ہاں جمع ہوتا اور اسے حج کے دنوں میں غریب مسکین حاجیوں کو کھانا کھلانے اور انہیں زادِ راہ مہیا کرنے کے سلسلہ میں خرچ کیا جاتا۔ اس کارِ خیر کا آغاز قصی نے اس وقت کیا تھا جب انہوں نے خزاعہ کو مکہ سے نکال دینے میں کامیابی حاصل کرلی تھی۔ قصی نے قریش کے ایک عام اجتماع میں ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"یا معشر قریش! انکم جیران اللہ واھل بیتہ واھل حرمہ وان الحاج ضیف اللہ وزوار بیتہ وھم احق الاضیاف بالکرامۃ اجعلو لھم طعاماً وشراباً ایام الحج حتی یصدر واعنکم"

برادران قریش! آپ اللہ کے پڑوسی ہونے کے ناطے اس کے اہل بیت بھی ہو اور اس کے حرم کے مکین بھی۔ یہاں آنے والے حاجی اللہ تعالیٰ کے مہمان ہوتے ہیں اور اس کے گھر کی زیارت

کرنے والے ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کی میزبانی اور مہمان داری اچھی طرح کرنا چاہئے اور اس سلسلہ میں ان کے یہاں رہنے تک ان کے کھانے پینے کا انتظام کرنا ہمارے لئے ضروری ہے۔

بنو عبدالدار اور عبد مناف کے بیٹوں میں ٹکراؤ

عبدالدار اپنے والد قصی کی وفات کے بعد انہی کی طرح اپنے فرائض ادا کرتا رہا لیکن عبدالدار کے ساتھ ساتھ عبد مناف کے بیٹوں کو بھی قریش میں کافی وقار حاصل تھا۔ ایک بار یہ چاروں (ھاشم، عبدالشمس، مطلب، نوفل) بنو عبدالدار سے کعبہ کی چابیاں لینے پہ بضد ہوئے۔ تو اس وجہ سے قریش دو گروہوں میں بٹ گئے۔ اودھر بنو عبد مناف نے حلف المطیبین کی صورت میں اپنی انگلیاں اپنے گھروں سے لاتے ہوئے عطر میں ڈبو دیں پھر اس کے بعد انہوں نے ایک اور حلف اٹھایا کہ وہ اسے کعبہ کی کلید حاصل کرنے کیلئے مکمل کر کے رہیں گے۔

بنو عبدالدار نے بھی حلف الاحلاف اٹھا کر مقابلہ کیلئے تیاری کرلی۔ اگر چند دور اندیش دانا ان کے درمیان نہ آتے تو ممکن تھا اس جنگ میں قریش کی نئی نسل مکمل طور پر ختم ہو جاتی۔ مختصر یہ کہ مصالحت یوں طے پائی۔

(1) (سقایت و رفادت بنو عبد مناف کیلئے) اور کلید برادری
(2) علم اور صداقت (بنو عبدالدار کیلئے)

چنانچہ ظہور اسلام تک فریقین ایک کے بعد دوسرے اپنے اپنے اس عہد کو اچھی طرح نباہتے رہے۔

ہاشم بن عبد مناف

ہاشم اپنے چاروں بھائیوں میں بڑے تھے۔ اللہ کا دیا گھر میں مال و متاع بھی کافی تھا۔ سقایت و رفادت دونوں ذمہ داریاں انہوں نے اپنے کندھوں پہ لیتے ہوئے اپنے دادا کی طرح ایک بار پھر قریش سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

حاجی اللہ کے گھر کی زیارت کرنے والے اللہ کے مہمان ہیں۔ اور اللہ کے مہمانوں کی ضیافت کرنا ہمارے لئے سب سے بڑا شرف بھی ہے اور کار ثواب بھی! چنانچہ ہاشم نہ صرف حاجیوں کی میزبانی ان کے مکہ سے واپس ہونے تک سرانجام دیتے بلکہ مکہ معظمہ کے غریب نادار مسکین لوگوں کی بھی ہر طرح اعانت و امداد کرتے۔ ایک دفعہ مکہ معظمہ قحط کی گرفت میں آگیا تو ہاشم نے اپنا دستر خوان سب کیلئے اس طرح بچھا دیا کہ کسی کو کھانے پینے کی فکر نہ رہی اور ان کیلئے (ثرید) روٹی کے ٹکڑے شوربے میں بھگو بھگو کر پیش کئے۔

حجاز کے قرب و جوار میں ہاشم کی عزت

ہاشم سال میں دو مرتبہ تفریح و سیاحت کیلئے اپنے گھر سے نکلتے، گرمیوں کے موسم میں یمن اور سردیوں کے موسم میں شام کا سفر ان کا معمول تھا۔ اس تفریح و سیاحت نے صرف حضرت ہاشم کی شخصیت کو قرب و جوار کے رہنے والوں میں آشنا کر دیا بلکہ ان کی جائے پیدائش (مکہ معظمہ) بھی ہر اک کے دل و دماغ میں بس گیا۔

نیا معاہدہ

حالات کو جانچ کر عبدِ مناف اور ان کے بھائیوں نے اپنے گردو نواح کے امراء سے باہم امن و سلامتی کے معاہدے کر لئے جن معاہدوں میں قیصر روم اور قبیلہ غسان سرِفہرست تھے لیکن قبیلہ غسان کے معاہدہ میں یہ شرط بھی تھی کہ ہر دو فریق اپنے اپنے ملک کے اندر قریش ہوں یا غسانی ان کے مال و جان کی حفاظت و سلامتی کے ذمہ دار ہوں گے۔ اسی طرح ہاشم کے چھوٹے بھائی عبدِ شمس نے حبشہ کے بادشاہ نجاشی کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور دوسرے دونوں بھائیوں نوفل اور مطلب نے فارس اور یمن کے تاجداران قبیلہ حمیر سے بھی معاہدات کر لئے۔

مکہ معظمہ میں خوشحالی

ان معاہدوں کی وجہ سے مکہ معظمہ کی وجاہت و ثروت میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہو گئی۔ اہل مکہ دن بدن تجارت میں مہارت حاصل کرتے گئے۔ جن ممالک سے معاہدے تھے ان کے سوداگر مکہ معظمہ میں اپنا اپنا مال لے کر آنے لگے۔ شہر (مکہ معظمہ) کے باہر مختلف نوع کے بازار قائم ہو گئے۔ خود اہلِ مکہ ان ممالک میں گرمی سردی دونوں موسموں میں مال لے جانے اور لانے کی وجہ سے تجارت میں مختلف قسم کے داؤ پیچ سے اچھی طرح واقف ہو کر دوسرے ممالک کے تمام تاجروں پر سبقت لے گئے۔

خاص کر تجارت کے اصول نسیہ (ادھار پٹہ) اور سود کی صورتوں سے بھی اچھی طرح آشنا ہو گئے۔ بلکہ یوں کہئے کہ تجارت سے متعلق کوئی پہلو ایسا نہ تھا جو ان کے علم میں نہ ہو۔

ہاشم اپنی آخری عمر تک اپنے منصبِ سیادت کو انتہائی خوبی سے نباہتے رہے۔ اس طویل مدت میں صرف ایک بار ان کے بھائی کے بیٹے امیہ بن عبدالشمس نے ان کو اس عہدہ سے ہٹا کر خود اس عہدہ پہ قابض ہونے کی کوشش کی مگر ناکام ہوئے اور اسی احساسِ ناکامی سے نادم ہو کر شام چلے گئے جہاں انہوں نے زندگی کے دس سال تنہا گزار دیئے۔

تزویجِ ہاشم

ایک بار شام سے لوٹتے ہوئے اتفاق سے یثرب میں ٹھہرے جہاں اتفاقاً" ایک حسین و جمیل عورت ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزری جو قبیلہ خزرج سے تھیں۔ ان کا نام سلمٰی بنت عمرو تھا۔ ان کے مال سے مدینہ کے کئی لوگ تجارت کر کے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔

ایک نگاہ سے دل کا فیصلہ ہو گیا۔ ہاشم نے احباب سے پوچھا یہ محترمہ کون ہیں۔ معلوم ہوا نجیب الطرفین ہیں۔ مگر مطلقہ ہیں۔ دوسرا عقد اس شخص سے کرنے پہ راضی ہو سکتی ہیں جو ان کو حقِ طلاق دے۔

ہاشم اس شرط کو قبول کرنے کیلئے آمادہ ہو گئے۔ پیغام دیا گیا تو معلوم ہوا محترمہ خاتون ان کے اعلیٰ اخلاق و کردار کے تذکرے سن چکی ہیں۔ غائبانہ طور پہ ان کی شخصیت کو پہچانتی ہیں۔ پیغام ملا تو نکاح کیلئے راضی ہو گئیں۔ نکاح ہوا تو ہاشم ان کو اپنے ساتھ مکہ معظمہ لے گئے اور کچھ دنوں کے بعد بقصدِ تجارت فلسطین چلے گئے تو وہاں سے چند ماہ بعد ان کی وفات کی خبر پا کر محترمہ سلمٰی ہاشم --- یثرب واپس چلی آئیں۔ وہیں ان کے بطن سے بیٹا پیدا ہوا۔ اس کا نام شیبہ رکھا گیا اور بقیہ تمام عمر سلمٰی زوجہ ہاشم ام شیبہ یثرب میں ہی رہیں۔

ہاشم کی وفات کے بعد

ہاشم نے فلسطین کے شہر غزہ میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو اس کے بعد تمام مناصب اور اعزازات ان کے چھوٹے بھائی عبدالمطلب کے سپرد کر دیئے گئے! جن کی فضیلت سخاوت اتنی زیادہ تھی کہ قریش ان کو الفیض کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی کی بناء پر مذکورہ تمام اعزازات و مناصب ان کے سپرد کر دیئے گئے اور انہوں نے ان کو اسی خوبی اور اعلیٰ معیار کے ساتھ نبھایا جنکی ان سے توقع کی جا سکتی تھی۔

عبدالمطلب یعنی شیبہ نائبِ عمِ خویش

کچھ عرصہ بعد عبدالمطلب کو اپنے بھائی ہاشم کے بیٹے شیبہ کی یاد نے ستایا۔ تو اسے لینے یثرب تشریف لے گئے۔ اس وقت شیبہ عنفوان شباب میں قدم رکھ چکے تھے۔ ان کی والدہ محترمہ کی رضامندی سے انہیں اونٹنی پہ سوار کر کے اپنے ہمراہ مکہ معظمہ لے آئے۔

جب ان کی سواری مکہ معظمہ میں داخل ہوئی تو شیبہ ان کی پشت کی طرف سوار تھے۔ اہل مکہ نے اس نوجوان کو عبدالمطلب کا غلام سمجھا۔ اسی غلط فہمی میں ایک نے اسے عبدالمطلب (یعنی مطلب کا غلام) کہہ کر پکار بھی لگا دی مگر مطلب نے فوراً" کہا یہ میرا غلام نہیں بلکہ میرے

معزز بھائی ہاشم کا بیٹا ہے لیکن اتفاق کی بات ہے کہ اس وضاحت کے باوجود لوگوں کے ذہن سے ——— شیبہ (اصلی نام) تو نکل گیا لیکن عبدالمطلب جم کر رہ گیا۔

انہیں مکہ معظمہ لانے کے بعد مطلب نے چاہا کہ اس کے والد کی متروکہ جائیداد اس کے حوالے کر دے مگر ان کا بھائی نوفل سختی سے آڑے آیا تو شیبہ کیلئے اس صورتحال کا تقاضا تھا کہ وہ اپنے حصول حقوق کیلئے اپنے ننھال سے امداد حاصل کرے جس کے جواب میں 80 خزرجی نوجوان سر پر کفن باندھ کر مکہ معظمہ آئے نوفل نے جب ایسی خطرناک صورتحال دیکھی تو چپ ——— چاپ اپنے بھائی کا ترکہ اس کے بیٹے شیبہ کے حوالے کر دیا۔

مطلب کے بعد عبدالمطلب کو تفویضِ مناصب

حضرت مطلب کی وفات کے بعد عبدالمطلب (شیبہ) کو تمام اعزازات و مناصب سونپ دیئے گئے لیکن رفادت اور سقایت دونوں کی ذمہ داری کو نباھنا ان کیلئے مشکل تھا۔ اس مشکل میں اگر کوئی ان کا ہاتھ بٹانے والا تھا تو صرف ان کا اکلوتا بیٹا حارث ہی تھا۔

سقایت کی ذمہ داری کو لیجئے تو چاہ زم زم کو مضاض بن عمرو جرہمی بند کر چکا تھا۔ جس کی وجہ سے پانی کے حصول میں بے پناہ مشکلیں حائل تھی' اسے حل کرنے کے لئے ایک تجویز زیر غور لائی گئی وہ یہ تھی کہ کعبہ کے قریب ایک بہت بڑا حوض بنایا جائے اور اس میں دور دراز کے کنوؤں سے پانی لا کر بھر دیا جائے۔ مگر اتنا بڑا کام اس وقت ہی سرانجام پا سکتا ہے جب اس میں قبیلہ کے تمام افراد شامل ہوں یا خود اس منصب دار کے اپنے بیٹے بھی تعداد میں زیادہ ہوں۔

عبدالمطلب اپنے ساتھ اس پریشانی میں اپنے بیٹے کو بھی کھویا کھویا دیکھ کر اور زیادہ پریشان رہنے لگے۔

زمزم کی دوبارہ صفائی

یہ بات تو اب تک سینہ بہ سینہ سب عربوں کے حافظہ میں تھی کہ کعبہ کے دامن میں چاہ زم زم تھا۔ سب کی خواہش تھی یہ کنواں پھر سے دریافت ہو جائے یا اس کے سوتے پھر سے پھوٹ نکلیں لیکن دوسروں سے زیادہ خلوص دل کے ساتھ حضرت عبدالمطلب کا دل اس تمنا میں بے چین رہتا۔ کاش کسی طرح اس کنوئیں کا محل وقوع معلوم ہو جائے ایک رات قدرت نے عبدالمطلب کی مدد کی اور انہیں خواب میں چاہ زم زم کے محل وقوع کی نشاندہی کرائی گئی۔ جس کے بعد تنہا اپنے نور نظر حارث کے ساتھ اس کی کھدائی میں مصروف ہو گئے۔

ابتداً اس محنت میں عبدالمطلب کے مددگاروں میں سوائے ان کے اپنے بیٹے حارث کے اور کوئی نہ تھا۔ لیکن جب قریش نے سونے کے ہرن اور مضاض بن عمرو کی طلائی تلواریں دیکھیں اور

دوسرا زرومال دیکھا تو تمام قریش اپنا اپنا حصہ لینے کے لئے دوڑے اور بقیہ حصہ کی کھدائی میں بھی اپنی خدمات پیش کردیں۔ لیکن عبدالمطلب اب ان کی خدمات حاصل کرنے کے لئے راضی نہ تھے۔ لیکن جھگڑے کی روک تھام کے لئے انہوں نے عربوں کے سامنے ایک تجویز رکھ دی وہ یہ تھی۔ کہ تیروں کی اس طرح قرعہ اندازی کی جائے۔

(1) کعبہ کے نام سے دو تیر ہوں

(2) قریش کے نام سے دو تیر ہوں

(3) عبدالمطلب کے نام سے دو تیر ہوں

قریش اس تجویز پر راضی ہو گئے۔ ہبل کے سامنے قرعہ اندازی ہوئی۔ مگر قریش کے دونوں تیر خالی گئے۔ عبدالمطلب کے نام سے تلواریں نکلیں اور ہرنوں پر کعبہ کا نام نکلا۔ عبدالمطلب نے اپنے نام کی تلواریں بیچ کر کعبہ کے دروازہ کی تعمیر کردی۔ دونوں ہرن کعبہ کی زینت کیلئے کعبہ کے اندر رکھ دیئے گئے اور "زم زم" کے چشمہ سے پانی نکل آنے سے عبدالمطلب کو اپنی ذمہ داری "سقایت" نباہنے میں آسانی ہو گئی۔

عبدالمطلب کی نذر

عبدالمطلب کے دل میں اولاد کی کمی کا احساس دن بدن بڑھتا گیا اس کے ذہن میں یہ بات بار بار کھٹکنے لگی کہ اگر میری اولاد زیادہ ہوتی تو مجھے زم زم کی کھدائی میں اتنی تکلیف نہ اٹھانی پڑتی اس نے نذر مانی اگر میرے ہاں دس بیٹے پیدا ہو گئے تو ان میں سے ایک کو میں کعبہ کے سامنے اللہ کی نذر کردوں گا۔ اللہ کی شان عبدالمطلب کی یہ نذر قبول ہوئی۔ اور تمام بیٹے سنِ بلوغت کو پہنچ گئے تو عبدالمطلب نے اپنی نذر کا عہد تمام بیٹوں کے سامنے رکھا۔ سب نے ایک ساتھ ان کے اس عہدِ نذر کے ایفا میں اپنی اپنی جانیں پیش کردیں۔ لیکن عبدالمطلب نذر کیلئے کسی ایک بیٹے کو خود منتخب کرنے سے گریز کرتے ہوئے ہر ایک بیٹے کا ایک ایک تیر کے پھل پر نام لکھ کر کعبہ کے پجاری کے پاس قرعہ اندازی کیلئے لے گیا تاکہ وہ ہبل کے فیصلہ کے مطابق اپنے اس فکری تنازع سے نجات پا سکے۔ دراصل اس وقت عربوں میں اپنے تمام متنازعہ مسائل کا حل یہی طریق کار تھا۔

مختصر یہ کہ قرعہ عبداللہ کے نام سے نکلا جو اب سب بھائیوں میں کمسن مگر باپ کو سب بیٹوں سے زیادہ پیارا تھا۔ لیکن ایفائے عہد سے مجبور عبدالمطلب عبداللہ کو ہاتھ پکڑے زمزم کے قریب اساف اور نائلہ (دو بتوں) کے درمیان واقع قربان گاہ میں لے گیا۔ عرب اپنی تمام نذر نیاز کی قربانیاں یہیں ذبح کرتے تھے۔ ادھر عرب کے تمام لوگوں کو یہ خبر مل چکی تھی کہ عبدالمطلب

اپنے بیٹے عبداللہ کو قربان گاہ میں اپنی نذر پوری کرنے کی غرض سے ذبح کرنے لائے گا۔ چنانچہ سب نے مل کر عبدالمطلب کو اس کام سے روکتے ہوئے کہا کہ آپ ہبل سے معذرت کر لیجئے۔ یہی کافی ہو گا مگر عبدالمطلب نے کہا۔ یہ تو نہیں ہو سکتا ہاں اگر کوئی اور تدبیر ہو جس سے ہمارے معبود مجھ سے خوش ہو جائیں تو میں بھی رائے بدل سکتا ہوں۔ مغیرہ بن عبداللہ مخزومی نے کہا اگر مالی فدیہ پر آپ مطمئن ہوں تو ہم لوگ اپنی طرف سے اسے فراہم کر دیں گے۔ اس مشورہ پر بحث ہوتے ہوتے بات یہاں تک پہنچی کہ ہم لوگ یثرب کی مشہور کاہنہ (عرافہ) سے پوچھتے ہیں۔ وہ کیا کہتی ہے۔ یہ لوگ عرافہ کے پاس آئے تو اس نے تمام واقعہ سننے کے بعد جواب کیلئے دوسرے دن بلایا۔ دوسرے دن جب یہ لوگ ملے تو اس نے پوچھا۔ کہ اہل مکہ کے ہاں خون بہا (دیت) کی کیا صورت ہے؟ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں دیت میں دس اونٹ ہیں۔ عرافہ (کاہنہ) نے کہا کہ آپ لوگ واپس جائیں اور اپنے طریقہ کے مطابق اس طرح قرعہ اندازی کریں کہ ایک طرف وہ لڑکا اور دوسری طرف دس اونٹ کھڑے ہوں اور قرعہ اندازی کی جائے۔ اگر اس مرتبہ بھی قرعہ لڑکے کے نام ہی نکلے تو اونٹوں کی ہر بار تعداد بڑھاتے جاؤ اور قرعہ اندازی کرتے جاؤ اور یہ عمل اس وقت تک جاری رکھو جب تمہارے معبود تم لوگوں سے راضی نہ ہو جائیں۔

دوبارہ قرعہ اندازی

کاہنہ کی ہدایت کے مطابق پھر قرعہ اندازی شروع ہوئی۔ پہلی مرتبہ بھی پھر عبداللہ کا نام نکلا' دوسری مرتبہ بھی' پھر تیسری مرتبہ بھی' یہاں تک کہ جب اونٹوں کی تعداد سو تک پہنچی تو عبداللہ کی جگہ اونٹوں کا نام نکلا۔ تو تمام حاضرین جو اس وقت اپنے معبودوں سے عبداللہ کیلئے دعائیں مانگ رہے تھے خوشی سے اچھل پڑے اور سب نے کہا۔ اب ہمارے معبود ہم پر خوش ہو گئے ہیں۔ عبدالمطلب اپنے بیٹے عبداللہ کو چھوڑ دو اور ان سو اونٹوں کو قربان گاہ میں لے جا کر ذبح کر دو۔

لیکن عبدالمطلب اس پر مطمئن نہ ہوئے اور کہا کہ جب تک قرعہ میں تین بار اونٹوں کا نام نہ نکلے میں تسلیم نہیں کروں گا۔ چنانچہ تینوں مرتبہ عبداللہ قرعہ کی زد سے بچ نکلے۔ اب عبدالمطلب مطمئن ہو گئے اور تمام اونٹ قربان گاہ پر لا کر ذبح کر کے چلے آئے تاکہ انسانوں یا درندوں میں سے جو چاہے ان کا گوشت اپنے استعمال میں لا سکے۔

عرب کی سیرت اور بیت اللہ کی منزلت

یہ واقعہ جو عرب کی رسوم و عادات کا ترجمان ہے' اس سے عربوں کے عقائد اور بیت اللہ

کے مرتبہ اور منزلت کا ان کے دلوں میں کیا عالم تھا اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ طبری نے اس حادثہ کی تائید میں دورِ اسلام کا ایک فتویٰ پیش کیا ہے۔

ایک مسلمان عورت نے نذر مانی کہ اگر میری فلاں مراد پوری ہو جائے تو میں اپنا لختِ جگر اللہ کی راہ میں قربان کر دوں گی۔ جب اس عورت کی مراد پوری ہوئی تو وہ عورت عبداللہ بن عمر کی خدمت میں حاضر ہوئی اور ماجرا عرض کیا۔ انہوں نے فرمایا۔ اس نذر میں کوئی چیز قابلِ عمل نہیں۔ مگر بی بی اس پر مطمئن نہ ہوئیں اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ سے استفسار کیا۔ انہوں نے فرمایا جس طرح عبدالمطلب کا فدیہ ایک سو اونٹ دیا گیا تھا وہی تم پر واجب ہے۔ اس زمانہ میں مدینہ منورہ میں مروان کی حکومت تھی۔ مروان نے یہ سن کر کہا جس نذر میں معصیت کا پہلو ہو اس کی تکمیل ناجائز ہے

مکہ معظمہ کی محسودیت

حقیقت یہ ہے کہ مکہ معظمہ کے آس پاس کے امراء اور بادشاہ بیت اللہ کی عظمت و علو مرتبت کو دیکھ کر تلملا اٹھے۔ ہر ایک کے سر پہ یہ بھوت سوار ہو گیا کہ مکہ جو اپنے معبد کی وجہ سے تمام دنیا میں ممتاز ہے۔ ہم بھی اپنے ملک میں اس سے زیادہ شاندار معبد تیار کریں تاکہ اس کی شان و شوکت کعبہ کے زائرین کو اپنی طرف مائل کر سکے۔

چنانچہ شمال میں قبیلہ غسان کے سردار نے حیرہ میں اور جنوب (عرب میں) ابرھہ والیٔ یمن نے اپنے اپنے ہاں سر بفلک عبادت گاہیں تعمیر کیں۔ ابرہہ نے تو اپنے ہیکل (معبد) کو اس طرح کے جواہرات سے آراستہ کیا جسے دیکھ کر چاند ستارے بھی منہ چھپا لیں۔ لیکن کعبۂ ابراھیمی کے فدائیوں نے ابرہہ کے بُتِ سیم تن کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا۔

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ کہ عنقارا بلند است آشیانہ

ان کے دلوں میں تو صرف اور صرف ایک ہی ذوقِ نظر ایک ہی شوقِ دل ایک ہی جستجو تھی۔ بیت اللہ صرف بیت اللہ! کعبہ کے شیدائیوں نے حیرہ اور یمن کے معبدوں کو ایک نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اہلِ عرب کے اس مجرمانہ فعل میں یمن کے وہ رہنے والے بھی تھے جس کے شہنشاہ نے اپنے ہاں ایسا معبد تیار کیا تھا جس کی ظاہری شان و شوکت کے سامنے کعبہ ابراھیمی کی فطری سادگی کی کوئی بساط نہ تھی۔ ابرہہ نے چاہا کہ کم از کم اس مملکت یمن کے باشندے ہی اس معبد کا حج کرتے رہیں لیکن کسی کا رخ کعبہ کی طرف سے موڑنے میں اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی اور جب حج کا موسم آتا تو یمن کے حمیر اور ان کے دوسرے حاشیہ نشین قبائل کعبہ

ابراھیمی کی زیارت و طواف کے شوق میں سفر کی صعوبتیں سہنا اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے۔

ابرہہ کی حماقت

ابرہہ اپنی ناکامیوں سے بوکھلا گیا۔ اس کے دل میں شیطان کی طرح حسد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ اس نے ان کو ٹھنڈا کرنے کیلئے کعبۂ ابراھیمی کو گرانے کا مذموم ارادہ کر لیا۔

ابرہہ کا 570 عیسوی میں حملہ

ابرہہ (حبشی) والی یمن ایک کوہ پیکر ہاتھی پہ سوار ہو کر اپنے ساتھ ہاتھیوں پہ لشکر جرار لیکر مکہ معظمہ پر چڑھائی کیلئے نکلا۔ یہ خبر عرب میں آگ کی طرح پھیل گئی قریش نے سنا تو سناٹے میں آ گئے۔ اور کہنے لگے اے ہمارے معبودِ اعلیٰ ایک حبشی ہمارے معبودوں کو مٹانے کیلئے آ رہا ہے۔ یمن ہی میں رہنے والے کعبہ کے معتقد صرف دو شخص زانفرار نفیل بن حبیب الخشعمی اس کی مخالفت میں اپنے ساتھ جتھے لے کر نکلے۔ نفیل کے ساتھ اس کے قبیلہ کی دونوں شاخوں شہران اور ناہس کے نوجوان تھے۔ لیکن دونوں سربراہ راستہ میں ہی ساتھیوں سمیت گرفتار ہو گئے اور نفیل نے صحرا میں ہی ابرہہ کی اطاعت قبول کر لی۔

ابرہہ اپنے مہیب لشکر سمیت طائف میں پہنچا۔ وہاں کے لوگوں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہیں یہ کعبہ کی جگہ ہمارے معبود "لات" ہی کو فنا نہ کر دے۔ اہلِ طائف کا ایک وفد ابرہہ سے ملا اور اسے کعبہ اور طائف میں فرق سمجھا کر مکہ کی راہ بتانے کیلئے ایک راہبر ساتھ کر دیا۔

ابرہہ کی فوجوں کا وادیٔ مکہ میں پڑاؤ

ابرہہ نے اپنے لشکر کو وادیٔ مکّہ میں ٹھہرا کر سواروں کا ایک دستہ مکہ اور اس کے قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں کو ہراساں کرنے کیلئے بھیج دیا۔ لوٹ مار کرتے ہوئے یہ دستہ دوسرے لوگوں کے ساتھ عبدالمطلب بن ہاشم کے سو اونٹ بھی ساتھ ہانک لایا۔ قریش نے یہ صورتحال دیکھ کر مقابلہ کرنے کیلئے آپس میں مشورہ کیا۔ لیکن ابرہہ کے لشکرِ جرار سے جنگ کرنے کی ان میں نہ ہمت تھی نہ طاقت نہ سامانِ جنگ لہٰذا مدافعت کا فیصلہ ہی ترک کر دیا۔

ابرہہ کا آخری فرمان

ابرہہ نے اپنے ایک لشکری جس کا نام حناطہ تھا حمیر کا رہنے والا تھا۔ اسے عبدالمطلب کے پاس یہ فرمان دے کر بھیجا کہ ہم صرف کعبہ ہی کو پامال کرنے آئے ہیں۔ اگر اہلِ مکّہ ہمارے راستے میں حائل نہ ہوں تو ان کے جان و مال سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہو گا۔ یہ فرمان سن کر

عبد المطلب اور اہلِ مکہ کے دل ڈوب گئے۔ وہ اپنے بیٹوں اور دوسرے چند سرداروں کو لے کر سفیر کے ہمراہ ابرہہ کے پاس پہنچ گئے۔ ابرہہ نے اس وفد کی بہت تعظیم کی اور عبد المطلب کے تمام اونٹ واپس کر دیئے۔

عبد المطلب نے ابرہہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ تمام اہلِ تہامہ کے اموال کا ایک ثلث تاوان میں لے لیجئے مگر کعبہ کی پامالی کا خیال ذہن سے نکال دیجئے۔ لیکن ابرہہ نے یہ بات ماننے سے بالکل انکار کر دیا۔ عبد المطلب وہاں سے خاموش چلے آئے اور تمام اہالیانِ مکہ سے کہا کہ تم سب لوگ اردگرد کی پہاڑیوں میں چلے جاؤ تاکہ دشمن کے لشکر کی گزند سے محفوظ رہ سکو' وہ رات انتہائی سیاہ رات تھی۔ عبد المطلب اپنے چند ساتھیوں کو لے کر کعبہ میں حاضر ہوئے اور اس کی چوکھٹ کے بازوؤں پر دونوں ہاتھ رکھ کر اپنے معبودوں سے دعائیں مانگیں۔ "ہمیں ابرہہ کے ظلم و ستم سے نجات دلانا صرف تمہارے اختیار میں ہے" اس کے بعد یہ چند لوگ بھی مکہ سے نکل کر پہاڑیوں میں چلے گئے۔

ادھر ابرہہ کی خواہش یہ تھی کہ وہ جلد سے جلد اپنی مہم میں کامیاب ہو کر واپس ہو کہ اس کے لشکر میں اچانک چیچک پھوٹ پڑی اور لشکر کا ہر سپاہی اس کا شکار ہو گیا۔ انہوں نے اس مرض کو نہ کبھی دیکھا اور نہ اس کا نام سنا تھا۔ سخت گھبرائے یہ وبا بحیرہ روم سے آنے والی ہواؤں کے دوش پر آئی تھی۔ مؤلف کی تحقیق کے مطابق ابرہہ بھی چیچک سے خوفزدہ ہو گیا اور کعبہ پر حملہ کرنے کے بجائے فوجوں کو واپسی کا حکم دیا۔ فوج کے سربراہ پہلے ہی بھاگ گئے تھے۔ فوجیں واپس جاتی ہوئی راستے میں ہی ہر قدم پر دم توڑنے لگیں۔ جو بچتے ان پر بھی مرض کی گرفت بڑھ رہی تھی' یہاں تک صنعاء پہنچنے سے پہلے ابرہہ کی فوج کا زیادہ تر حصہ موت کا شکار ہو گیا۔ خود اس کا اپنا جسم بھی آبلوں سے ایسا چھلنی ہوا کہ وہ اپنے سپاہیوں کے پہلو میں سو گیا۔

اہلِ مکہ اس واقعہ کو تاریخی حیثیت سے عام الفیل کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ اس واقعہ سے مکہ معظمہ کی مستقل تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اس واقعہ پر محیط یہ سورۃ نازل ہوئی۔ جو برحق ہے۔

الم ترکیف فعل ربک باصحاب الفیل الم یجعل کیدھم فی تضلیل وارسل علیھم طیراً ابابیل ترمیھم بحجارۃ من سجیل فجعلھم کعصف ماکول

اصحاب فیل کا انجام دیکھو تمہارے اللہ نے ان کی تدبیریں کیسے ناکام کر دیں' ان پر ابابیل پرندوں سے ایسی کنکریوں کی بوچھاڑ برسائی' جس میں ایک ایک کنکر نشان زدہ تھا' جن کی زد سے ان کا لشکر خشک گھاس کی طرح پامال ہو گیا۔

مکے کی دینی اہمیت اور باشندوں کی بدمستی دونوں میں اضافہ

اصحابِ فیل کی اس عبرتناک تباہی کی جتنی مشہور ہوئی مکہ معظمہ کی اتنی ہی عظمت و مرتبت میں اضافہ ہوا۔ نتیجہ کے طور پر مکہ کی تجارت میں بھی اضافہ ہو گیا۔ اب مکہ والوں کے دل میں ایک ہی جنون تھا کہ ہمارے شہر مقدس پر کسی کی میلی آنکھ نہ پڑے اور اگر ایسا موقع آئے تو ہم سب اس کی حفاظت میں اپنی جان' اپنا مال اور اپنی اولاد تک قربان کر دیں گے لیکن اس سے بھی کہیں زیادہ عملاً انہیں زیادہ سے زیادہ دولت یا سامانِ تعیش حاصل کرنے کا جنون تھا۔ جس کی وجہ سے لاشعوری طور پر' ان کے دلوں سے یہ احساس مٹ چکا تھا کہ چاروں طرف سے بے آب و گیاہ جیسے صحرا گھیرے ہوئے ہیں۔ اس بستی میں رہنے والوں کی یہ معاشی اور اخلاقی گمراہیاں خطرناک نتائج بھی پیدا کر سکتی ہیں۔

چنانچہ اہلِ مکہ کو اس شراب سے فرصت نہیں ملتی تھی جسے وہ کھجور سے نچوڑتے اور منہ سے لگاتے ہی بدمست ہو جاتے تو یا کنیزوں کے گلے میں بانہیں ڈال دیتے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ وہ اپنے عیش و آرام کو جاری رکھنے کے لالچ میں اس شہر مکہ کو دشمنوں سے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

کعبہ کے سامنے بادہ نوشی اور متعہ کی محفلیں

اہلِ مکہ کی اخلاقی پستی کا یہ عالم تھا کہ کعبہ ہی کے سامنے شراب شعر کی محفلیں جمتیں۔ شراب و شعر کے ساتھ ایسی بے پر کی ہوائیاں اڑتیں کہ الاماں۔ کعبہ کے اردگرد تین سو بتوں کا نگارخانہ بنا ہوا تھا۔

ان بتوں نے ان کے معاملات میں کیسے کیسے تصرفات کئے جو جس صحرا نشین نے کہا۔ یمن کے رہنے والے چہرہ کے قبیلہ نے جو داستان سنائی یا کسی نے جو کچھ بھی شام کے غسانی قبیلہ سے سنا' وہی حکایت سارے عرب میں بغیر کسی تحقیقی سند کے حقیقی کی شہرت حاصل کر لیتی۔ مخاطبین میں کوئی سننے والا ہے یا نہیں بس ایک لاسلکی (آلہ خبر رسانی) ہے کہ جو اپنی طرف سے خبروں کو فضا میں دھکیل رہا ہے۔

ان واقعات کے ساتھ ساتھ ہمسایہ ملکوں کے حالات کا ذکر بھی ملتا' صحرا نشینوں سے پیش آنے والے حادثات بھی بیان کئے جاتے۔ محفلیں جب بدمستی کی انتہا کو پہنچ جاتیں تو عقل و خرد کا دامن چھوٹ جاتا' بدمستی میں ایک دوسرے کے سامنے جوڑے ہم جفت ہو جاتے' یہ تماشے ان کے معبود اپنی پتھر کی آنکھوں سے دیکھتے' جس سے وہ یہ سمجھتے کہ ہمارے معبود نے ہماری تفریحات کو حوصلہ افزا نظروں سے دیکھا ہے۔ بلکہ یہ ہمارے مشاغل میں ہمارے معاون و مددگار ہیں۔ کیونکہ خانہ کعبہ قابلِ احترام ہے۔ اور شہرِ مکہ امن و سلامتی کا گہوارہ۔ اس لئے یہاں جو

کچھ کیا جائے قابلِ مواخذہ نہیں ہے۔

اصنامِ کعبہ کے بالمواجہ تفریحات اور بتوں کیلئے معاوضہ

اہلِ مکہ کی یہ کوشش رہی کہ اہلِ کتاب میں کوئی شخص یہاں مستقل قیام نہ کرنے پائے۔ نہ یہاں کوئی اپنے دین اور کتاب کی حکایت بیان کرے اجنبی جو بھی آئے وہ صرف یہاں مزدوری کی غرض سے عارضی قیام کرے۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ معظمہ نہ تو نجران کی نصاریٰ کا وطن مالوف بن سکا نہ یثرب کی مانند اسے بغرضِ یہود بننے کی نوبت آئی۔ بلکہ وہ (کعبہ) محض ان بتوں کی وجہ سے حریمِ قدس بن گیا جو دوسروں کی یلغار سے مکہ کی حفاظت کرتے جس طرح عرب کے بادیہ نشین اپنے محافظ آپ تھے۔ ان کی سب سے بڑی سلطنت ان کا اپنا استقلال تھا۔ انہیں نہ تو دو قبائل کا باہم تصادم پسند تھا۔ نہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینا پسند کرتے۔ نہ آپس میں گٹھ جوڑ کر کے ہمسایہ ممالک روم یا فارس کی طرح دوسری قوموں یا ملکوں پر حکومت کرنے کے منصوبے بناتے یہی وجوہ ہیں کہ ان سب کی ہئیت ایک سی اور سب کا اصول ایک سا' بس صحرا کی وہ زندگی تھی جس کے مطابق وہ ایک نخلستان سے اپنی اونٹنی کی مہار موڑ کر دوسرے نخلستان میں ڈیرہ ڈالنے کیلئے چل پڑتے۔ ان کی زندگی کا جہاز صحراؤں میں قدم قدم صعوبتوں کے تھپیڑے کھاتا رہتا مگر وہ اپنی آزادی قائم رکھنے کیلئے انہیں خندہ پیشانی سے مرحبا کہتے۔

شہرِ مکہ کی تقسیم آبادی کے تین درجات

ان کے سکونتی مکان نزدیک اور دور کی صورت میں مناصب کی ترتیب کے لحاظ سے تین حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔

(1) قریش کے مناصب سقایت و رفادت اور کعبہ سے متعلق جملہ خصوصی خدمات کی بناء پر ان کی حویلیاں کعبہ کی دیواروں سے ملی ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ان مناصب کیلئے باہم ٹکراؤ کی صورت بھی پیدا ہو جاتی جس کا ذکر ہم سابقہ سطور میں کر چکے ہیں۔

لیکن اس قضیہ کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے کی غرض سے بتانِ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر اہل مناصب کی تقرری پر ایک دستاویز لکھ کر کعبہ میں محفوظ کر دی گئی تاکہ خلاف ورزی کرنے والے انہیں معبودوں کے قہر و غضب میں مبتلا ہو جائیں۔

(2) مذکورہ قریش کی حویلیوں کے بعد ان کے مکانات تھے۔ جو شجاعت و وجاہت میں دوسرے درجہ پہ تھے مگر اپنے سوا اوروں سے افضل۔

(3) یہودی اور نصرانی مزدوروں کی جھونپڑیاں تھیں۔ جن کا دوسرا رخ صحرا کا دامن تھا۔ انہیں شہر کے بیرونی حصہ میں اس لئے آباد کیا گیا تھا کہ ان کی مذہبی گفتگو کی آواز قریش یا ان کے

رہنے والوں کے کانوں میں نہ پڑے تاکہ اہلِ کتاب میں سے کسی کے دین کی طرف ان کا میلان نہ ہونے پائے۔ حالانکہ اہلِ مکہ سیرو سیاحت یا تجارت کے سلسلہ میں ادھر سے ادھر آتے جاتے۔ ان کے کلیساؤں اور کنیساؤں کے پاس سے گزرتے ہوئے ایسی تمام مذہبی باتیں سنتے چلے آ رہے تھے۔

ابوسفیان کی آنے والے نبی کے تصور سے برہمی

لیکن قریش کا اہلِ کتاب کو شہر سے باہر رہنے کی اجازت دینے کا یہ مقصد نہ تھا کہ وہ انہیں ان کی باتیں سن کر یہودی یا نصاریٰ ہو جانے کا ڈر تھا بلکہ یہ خود یہودی اور نصاریٰ دونوں آنے والے پیغمبر کے منتظر تھے، جس کا ذکر وہ اکثر ایک دوسرے سے کیا کرتے تھے۔ اور کہا کرتے تھے کہ اس رسول کا عربوں میں ہی ظہور ہو گا۔ خود عرب بھی ان سے اس حقیقت کا اظہار ان کی زبان سے سن چکے تھے۔ ایک دن امیہ بن ابی الصلت اسی (بشارتِ عظمیٰ) نبی اکرم ﷺ کے ظہور کا بیان کسی راہب کے حوالے سے کر رہے تھے جسے ابوسفیان نے سن لیا اور ان سے خفا ہو کر کہا۔

آپ کو معلوم نہیں مسیحی راہب یہ تذکرہ اپنے دین سے ناواقف ہو جانے کی وجہ سے کرتے ہیں تاکہ ایک اور نبی آئے اور ان کو پھر ان کا دین سمجھائے لیکن ہمیں نبی کی کیا ضرورت ہے۔ ہم اپنے بتوں کے حضور سرنگوں ہیں۔

لیقربونا الی اللہ زلفی تاکہ یہ معبود ہمیں معبودِ اعلیٰ (اللہ) کے قریب کر دیں

اس لئے ہمیں اس بات کی مخالفت کرنی چاہئے جس میں کسی نبی کے آنے کی خبر ہو۔ ابوسفیان جن کی جائے ولادت مکہ معظمہ تھی اور بتوں کی محبت ان کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ کاش ان کو معلوم ہو تا کہ ہدایت کا زمانہ قریب ہو چکا ہے۔ ظہورِ اکبر کا وقت آ ہی چکا ہے جس نور کے سامنے بتوں کی تاریکی اپنا منہ چھپائے گی نہ صرف مکہ اور عرب بلکہ تمام عالم اس نورِ ہدایت سے فیض یاب ہو گا۔ دنیا میں توحید کی ضیاء پھیلے گی الحق سے لوگوں کو قوتِ ایمان نصیب ہو گی۔

حضرت عبداللہ

جوں ہی حضرت عبداللہ نے جوانی میں قدم رکھا ان کے حسن و جمال کے چرچے عورتوں میں شروع ہو گئے۔ خصوصاً جب مکہ کی عورتیں یہ تصور کر لیتیں کہ حضرت عبداللہ کی جان ہمارے معبود ہبل کی نظر میں کتنی قیمتی تھی کہ انہوں نے ایک سو اونٹ سے کم ان کی جان کا سودا کرنا پسند ہی نہیں کیا۔ تو ان کے دلوں میں حضرت عبداللہ کی عزت دوبالا ہو جاتی ان تمام

خوبیوں کے باوجود کسے خبر تھی کہ حضرت عبداللہ اس عظیم و برتر بیٹے (علیہ الصّلوۃ والسلام) کے والدِ گرامی ہونے کا شرف پانے والے ہیں۔ جن کا نام تاریخ بڑے فخر کے ساتھ دہراتی رہے گی۔ اور اس عظیم الشان قریشی نونہال کی والدہ ماجدہ ہونے کا شرف و امتیاز صرف اور صرف آمنہ بنتِ وھب کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ ان دونوں کا عقد ہو گیا۔ لیکن عبداللہ بن عبدالمطلب نکاح کے چند ماہ بعد ایسے بیمار ہوئے کہ انہیں موت کے منہ سے بچانے کیلئے فدیہ کی کوئی نوعیت ہی نہ تھی۔ آہ عبداللہ آسودہ ہو گئے۔ جناب آمنہ اپنے نورِ نظر جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فداہ ابی و امی) کے ظہور تک زندگی کے جھولنے میں جھولتی رہیں مگر اجل کا فرشتہ ان کی بھی تاک میں تھا۔ اور اپنے عظیم فرزند صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن میں ہی عالمِ بقا کو روانہ ہو گئیں۔

ازدواجی زندگی سے آغازِ بعثت تک

ازدواجی زندگی سے آغازِ بعثت تک

آپ ﷺ نے بصورتِ حق مہر دو سو اونٹ ادا کر دیئے اور سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی درخواست قبول فرماتے ہوئے ان کے ہاں ہی رہائش اختیار کر لی۔

آج سے آپ نے بحیثیتِ شوہر اور بحیثیتِ باپ مثالی کردار پیش فرمانے کا آغاز فرما دیا۔ آج سے آپ کی زندگی کا وہ باب شروع ہوا جس کے اس ورق سے پہلے پچیس سال کی زندگی کا ہر ورق بد عنوانی کے داغ سے صاف و شفاف ہے۔ 25 سالہ کتابِ زندگی کے کسی حرف پر عہد جوانی کا کوئی فتنہ اثر انداز نہ ہوا۔ وہ بے لوث، منزہ، پاک و صاف شباب بھی اپنی مثال آپ قائم کرتے ہوئے ازدواجی زندگی کا عنوان بنا۔

سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطن سے دو فرزند (بعض اربابِ انساب سے تین اور بعض سے چار فرزندوں کی روایت بھی ہے) قاسم اور عبداللہ پیدا ہوئے، جن کے القاب طاہر و طیب تھے۔ لیکن یہ دونوں بچپن ہی میں دائمی مفارقت دے گئے۔ ان دونوں کے بعد چار صاحبزادیاں سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بطن مبارک سے پیدا ہوئیں۔ جن پر شفقت و الطافِ پدری کا دامنِ حیات پھیلا رہا۔ اسی طرح ان کے دلوں میں بھی والدِ محترم کی تعظیم و تکریم پرورش پاتی رہی۔

حلیہ مبارک

حسین چہرہ، بوٹا قد، نہ زیادہ طویل نہ پست، سیاہ گھنگریالے بال، جبیں کشادہ، بھنویں بالوں سے بھری ہوئیں اور خمیدہ سی، دونوں بھنوؤں کے اندرونی کنارے ایک دوسرے سے ملے ہوئے، آنکھیں سیاہ اور بڑی بڑی جن کی سیاہی کے بعد نہایت کھلی ہوئی سفیدی اور سفیدی کا حلقہ سرخ گول سا ہالہ جس نے جاذبیت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا، آنکھوں سے زود فہمی کے آثار نمایاں، لمبی اور سیاہ پلکیں، ناک ستواں اور سیدھی، دانتوں میں ہلکا ہلکا خلا جیسے باریک خط کھینچ دیئے گئے ہوں۔ ریش مبارک گھنی، گردن لمبی مگر خوبصورت، سینہ مبارک کشادہ، بدن کی رنگت کھلی ہوئی، ہاتھ کی ہتھیلیاں اور پاؤں کے تلوے نرم و گداز، بدن ذرا آگے کو جھکا ہوا، رفتار میں تیزی مگر ہر قدم اپنی جگہ پر جم جاتا۔ چہرہ مبارک سے تدبر و تفکر کی علامات نمایاں،

نگاہوں میں حاکمانہ انداز ایسا جو دوسروں کے سرکش دل اپنے سامنے جھکا لے۔ (علیہ الصلوٰۃ والسلام)

ان صفات کے ہوتے ہوئے سیدہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دل میں آنحضرت ﷺ کی محبت اور آپ کی رسالت پر ایمان لانے کا جذبہ قابلِ تعجب نہیں اور یہ بھی خلاف عقل نہیں کہ آپ ﷺ کو آئندہ کیلئے مال و تجارت کے جھمیلوں سے سبکدوش کر کے (یعنی کسی اور شخص کو یہ کام سونپ کر) آپ ﷺ کو پوری توجہ کے ساتھ منصبِ رسالت کی ذمہ داریاں پوری کرنے میں آپ کی معاونت کی جائے۔

جناب محمد ﷺ جس طرح نسبت میں ممتاز تھے ازدواج کے بعد اسی طرح وہ ثروت و دولت میں بھی ممتاز و ممیز ہو گئے۔ اہلِ مکہ تو پہلے ہی آپ ﷺ کو انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن اب تو اس میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ اہلِ وطن کی طرف سے آپ ﷺ کیلئے عزت و احترام کا یہ اضافہ ان کیلئے قابلِ فخر نہ تھا۔ آپ ﷺ کو تو اپنے گھر بار پہ ناز تھا۔ رفیقۂ حیات نے آپ کو نویدِ تولید سے مسرور فرما دیا۔ آپ کی تمنا تھی کہ آپ اولاد کی خوشی سے دل بہلائیں۔

لیکن دولت و عزت کی فراوانی کے باوجود آپ ﷺ اپنے ہم عصروں کے ساتھ فخرو امتیاز کا سلوک نہیں فرماتے تھے جس قدر اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں آپ کا وقار اور آپ کی عزت روز بروز بڑھتی اسی قدر آپ ﷺ میں تواضع اور ملنساری بڑھتی جاتی۔

ذکاوتِ فہم اور شرافتِ نفس کا یہ عالم تھا کہ دوسروں کے دکھ درد کو پوری توجہ سے سنتے۔ اپنی کم گوئی کے باوجود لوگوں کی لمبی لمبی کہانیاں سنتے ہوئے دل میں میل نہ آنے دیتے۔ علیہ الصلوٰۃ والسلام۔

گفتگو میں مزاح بھی تھا لیکن یہ مزاح حقیقت کے خلاف نہیں ہوتا تھا۔ ہنسنے پر کبھی دندان مبارک نظر نہیں آتے تھے۔ غصہ میں کبھی زبان پر سخت الفاظ نہ آتے' صرف پیشانی پر ابروں کے کنارے پسینے کے دو ایک قطرے ابھر آتے جو غصہ کا تلخ گھونٹ پینے کا نتیجہ ہوتے۔ علیہ التحیۃ والسلام۔

الغرض آپ ﷺ پر شکوہ' صاحب ارادہ' وفا' خلوص' سراپا خیرو برکت' جُودو کرم میں برستا بادل علیہ الصلوٰۃ والسلام۔ عزیمت و استقلال اور روحانی کمالات میں ایسی مثال جس کے خدوخال پر کسی ماں جائے کو تردید کی جرات ہی نہ ہو' ان صفات کی وجہ سے آپ کی رفیقۂ حیات ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی محبت و وفا میں دن بدن اضافہ ہو تا گیا۔

اس زمانے میں کسی کو آپ ﷺ سے عداوت تو ایک طرف ہر شخص آپ پر اپنی جان نچھاور کرتا لیکن آنحضرت ﷺ کے اپنے دل میں کعبہ کی عمارت کے پرانا پن کا

احساس کروٹیں لیتا رہتا جو کسی وقت بھی دور نہ ہوتا۔ یہ احساس اس وقت تو اور بھی زیادہ باعثِ تشویش ہو گیا جب کعبہ کے ارد گرد کوئی دیوار یا پشتہ (اوٹ) نہ ہونے کے سبب سیلاب کا پانی اس کی دیواروں سے ٹکرانے لگا۔ جس کی وجہ سے عمارت دن بدن کھوکھلی ہوتی جا رہی تھی اور عمارت کی خرابی کے ساتھ ساتھ کعبہ میں جمع شدہ تحائف کے سرقہ کا خوف بھی بڑھنا شروع ہو گیا تھا۔

آج سے پہلے ایک بار قریش نے کعبہ کو مسقف (چھت ڈالنا چاہا) بنانا چاہا تو اسے خطرناک بدعت سمجھ کر عذابِ الٰہی سے ڈر کر ارادہ بدل دیا گیا۔ کیونکہ جاہلیت کے زمانہ سے کعبہ سے متعلق اس قسم کے اقدام سے آسمان سے نازل ہونے والی آفتوں کی کئی کہانیاں ہر ایک عرب کی زبان پر تھیں۔ یہ لوگ اسی کشمکش میں تھے کہ اچانک سیلاب آیا اور اس نے کعبہ میں شگاف ڈال دیا۔ ہزاروں خطروں کے باوجود انہیں کچھ نہ کچھ کرنا ضروری ہو گیا۔ مکہ میں خبر مشہور ہوئی کہ مصر کے ایک تاجر کی کشتی سمندر کے تھپیڑے کھاتی ہوئی ساحلِ جدہ پہ آن پڑی ہے۔ اس کا مالک باقوم نامی وہیں موجود ہے' اہلِ مکہ نے ایک وفد ولید بن مغیرہ کی سربراہی میں باقوم کے پاس بھیجا جس نے کشتی کے تمام تختے اس سے خرید لئے' باقوم نجاری بھی جانتا تھا تعمیر کا معاملہ طے کر کے اسے بھی اپنے ہمراہ لے آئے۔ مکہ" معظمہ میں ایک قبطی بڑھئی پہلے ہی سے موجود تھا۔ اسے باقوم کی اعانت کیلئے اس کا معاون بنا دیا گیا۔

شکست و تعمیر اور تقسیم کار

قریش نے اطرافِ کعبہ کو چار حصوں میں تقسیم کر کے اسے الگ الگ گروہوں میں بانٹ دیا لیکن اللہ کے عذاب سے ڈر کر دیواروں کو گرانے کی کسی کو بھی جرات نہیں ہو رہی تھی۔ بڑی جرات اور تردد کے بعد ولید بن مغیرہ اپنے معبودیت کا نام پکار کر آگے بڑھا اور رکن یمانی کا کچھ حصہ گرا دیا۔ ادھر چاروں طرف سہا ہوا ہجوم ولید بن مغیرہ پر عذابِ الٰہی کا منتظر تھا لیکن کچھ دیر تک ولید بن مغیرہ کو صحیح سلامت دیکھ کر سب کے حوصلے بڑھے اور ہر گروہ نے اپنے اپنے حصے میں آئے ہوئے حصہ کو گرا دیا۔ اور سلیں ہٹانی شروع کر دیں۔ ان میں جناب محمد ﷺ بھی موجود تھے۔ اچانک زمین میں ایک سبز رنگ کا پتھر گڑھا ہوا ملا جس پر جب بھی کدال ماری جاتی تو کدال الٹی لوٹ آتی۔ بہت کوشش کے باوجود پتھر اپنی جگہ سے ہٹایا نہ گیا تو اسی کو کعبہ کی بنیاد قرار دے کر کعبہ کی تعمیر شروع کر دی گئی اور دیواروں کی تعمیر کیلئے قریب ہی کی ایک پہاڑی سے نیلے رنگ کے پتھروں کو تراش کر لایا گیا۔

حجرِ اسود کی تنصیب پر اختلاف

جب دیواریں قد آدم تک پہنچ گئیں تو حجرِ اسود کے نصب کرنے میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ ہر

قبیلہ اپنے لئے اس کی تنصیب میں اپنے آپ کو خصوصی حقدار ثابت کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہاں تک کہ جنگ کے شعلے بھڑکنے کی واضح صورت سامنے آ گئی۔ بنو عبدالدار اور بنو عدی ہر دو خاندان کے افراد نے حلف اٹھا کر کہا کہ اگر ہمارے سوا کسی نے اس سلسلہ میں پیش قدمی کی تو ہمیں یہ گوارا نہ ہو گا۔ نہ صرف حلف پہ اکتفا کیا بلکہ معاہدہ کو مضبوط کرنے کیلئے جاہلیت کی پرانی رسم کے مطابق ایک پیالے میں خون بھر کر ایک نے اس میں انگلیوں کے پورے ڈبو دیئے ایسا حلف قدیم زمانے سے "لعقتہ الدم" سے موسوم ہے۔ یہ رنگ دیکھ کر ستر سالہ ولید بن مغیرہ نے جن کا احترام قریش کا ہر ایک فرد کرتا تھا۔ ان لفظوں میں اپنا مشورہ پیش کیا۔

اجعلو الحکم فیھا بینکم اول من یدخل من باب الصفا۔

"کل صبح پہلا جو شخص باب الصفاء کی جانب سے کعبہ میں داخل ہو اس کا فیصلہ تسلیم کر لیا جائے"

جسے سن کر سب نے اپنی اپنی تلواریں نیام میں لے لیں، دوسرے دن صبح کے وقت سب سے پہلے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ دیکھتے ہی سب بیک زبان پکار اٹھے۔

ھذا الامین رضینا بحکمہ

یہ امین ہے ہمیں اس کا فیصلہ منظور ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر فریق کا بیان غور سے سنا۔ سب نے اپنے حق تفوق کے دلائل بیان کیئے دیکھا کہ ہر قبیلہ کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف خاندانی دشمنی کی آگ بھڑک رہی ہے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد دانائے سبل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فیصلہ صادر فرمایا۔

ایک چادر لاؤ جو حاضر کی گئی۔ تب آپؐ نے چادر زمین پر بچھا کر حجر اسود اپنے ہاتھ سے اٹھا کر اس پر رکھ دیا اور فرمایا۔ ہر خاندان کا سردار چادر کو کنارے سے پکڑ کر محلِ نصب کے قریب لے آئے، ایسا ہی ہوا۔ حجر اسود اپنے مقام کے قریب پہنچ گیا تو سید البشر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے اٹھا کر اس کے محلِ نصب پر رکھ دیا اور ایک بہت بڑا فتنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احسن ترین تدبیر سے ختم ہو گیا۔

کعبہ کی تعمیرِ جدید میں آپؐ کی منزلت

جس زمانہ میں کعبہ از سرِ نو تعمیر ہوا اور سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک سے حجر اسود اس کے محل نصب پر رکھا گیا۔ اس وقت آپ کا سن کیا تھا؟ مورخین کی دو روایتیں ہیں پچیس برس، یا پینتیس برس، دونوں میں سے کوئی مدت سہی اصل موضوع کو اس سے کوئی تعلق نہیں۔

لیکن یہ واقعہ بلا اختلاف مسلّم ہے کہ حجر اسود کے نصب کرنے کیلئے قریش کا یہ فیصلہ تھا کہ

جو شخص کل صبح سب سے پہلے "باب الصفاء" کی راہ سے حدودِ کعبہ میں داخل ہو اس کے سر پہ عزت کا تاج رکھ دیا جائے۔ اس طرح یہ امر بھی مسلم ہے کہ مشیتِ الٰہی نے یہ اعزاز جناب محمد ﷺ کو ہی بخشا۔ جن کے حکم سے زمین پر چادر پھیلا کر حجرِ اسود اس میں رکھا گیا اور آخر میں چادر پر سے اٹھا کر اسے سیدنا محمد ﷺ ہی نے اس کے اصل مقام پر نصب فرمایا جس سے اہلِ مکہ کے نزدیک محمد ﷺ کی عظمت کے ساتھ فراست واضح ہو گئی۔

تعمیر کعبہ کے زمانہ میں قریش کے باہمی اختلاف

اس دور میں قریش کے باہمی اختلاف کا اندازہ کرنے کیلئے یہ کافی ہے کہ حجرِ اسود کے الجھاؤ میں قریش میں کیسے کیسے خطرناک ارادوں نے سر اٹھایا۔ ایک فریق نے خون میں پورے تر کر کے اپنی موت کا قبالہ خونِ رگِ جاں سے لکھ دیا۔ حالات نے یہاں تک خطرناک نوعیت اختیار کر لی کہ پوری قوم میں کسی ایک شخص کو حقِ سیادت حاصل نہ تھا۔ ان کے جد اعلیٰ قصیٰ کی عظمت، ہاشم کی وجاہت اور عبدالمطلب کا رعب و دبدبہ ایک ایک کر کے ان کا دامن جھٹک کر رخصت ہو چکا تھا۔ عبدالمطلب کی وفات کے بعد تو یہ خطرات عالمِ عروج کو پہنچ گئے بنو ہاشم اور بنو امیہ میں اقتدار کی کشمکش جواں ہو گئی۔ اہلِ مکہ کیلئے یہ حوادث مصائب در مصائب بنتے چلے گئے۔ قرب و جوار کے ملکوں میں گر کعبہ کی تقدیس کا سکہ دلوں پر نہ جما ہوتا تو کوئی نہ کوئی حریف آگے بڑھ کر مکہ معظمہ پر قبضہ کر لیتا۔

جس شہرِ مکہ میں کل تک یہ قانون رائج تھا کہ وہ اپنے اپنے مسلک کی تائید میں اپنی زبان کو جنبش نہ دے آج اس شہر میں یہود و نصاریٰ کھلم کھلا بتوں کی مذمت کر رہے ہیں۔ قریش کے بے شمار افراد اپنے آبائی خداؤں سے باغی ہو گئے ہیں۔ صرف وہ لوگ باقی رہ گئے ہیں جو کعبہ کے مناصب پر مسلط ہیں یا جن کے عقیدے میں بتوں کا تصرف اور ان کے کمالات بری طرح جمے ہوئے تھے۔ ان کو یقین تھا کہ مکہ کی تجارت کو فروغ ان بتوں نے دیا ہے یہاں تجارت پیشہ لوگ ابھی تک سوداگری میں خوب ہاتھ دکھاتے تھے تاہم اس طبقہ کے عقائد میں بھی پہلے کی سی شدت نہ تھی۔

قریش کا قدیم عقیدے سے فرار

عقیدے کے اسی تغیر کے ثبوت میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر نخلہ کے مقام میں قریش کا اجتماع ہوا۔ اس میں یہ چار اشخاص ایک طرف خفیہ طور پہ تنہائی میں مل بیٹھے۔

وہ چاروں شخص تھے۔ (1) زید بن عمرو (2) عثمان بن حویرث (3) عبیداللہ بن جحش

(4)ورقہ بن نوفل ہر ایک نے اپنے عقیدے پر تنقید کرتے ہوئے کہا۔

ہم کیسی گمراہی میں پھنسے ہوئے ہیں۔ جن پتھروں کا ہم طواف کرتے ہیں وہ نہ تو سننے پر قادر ہیں' نہ ہمیں دیکھ سکتے ہیں' نہ ہی وہ ہمیں کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں اور ہماری ان سے عقیدت مندی کا یہ حال ہے کہ یہ ہماری طرف سے دی جانے والی قربانیوں کے خون میں تیرتے رہتے ہیں آؤ سب مل کر کسی اور دین کی پناہ لیں۔

تبدیلِ مذہب

ان میں سے ورقہ بن نوفل عیسوی مذہب میں داخل ہو گئے ان کا علمی کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے انجیل کا کچھ حصہ عبرانی زبان سے عربی میں ترجمہ کیا ہے۔ عبداللہ بن جحش ابتدائی دور میں کچھ دیر تک متردد رہے مگر جلد ہی اسلام قبول کر لیا اور مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے مگر وہاں جا کر نصرانی ہو گئے اور اسی پر اس کا خاتمہ ہوا۔ اسی سفر میں ان کی اہلیہ سیدہ ام حبیبہ بنتِ ابوسفیان بھی اپنے شوہر کے ہمراہ تھیں حبشہ سے واپس تشریف لے آئیں اور حرمِ نبوی میں داخل ہو کر امہات المومنین رضی اللہ عنہا کے مقدس گروہ میں شامل ہو گئیں۔

تیسرے صاحب زید بن عمرو ہیں۔ یہ اپنی اہلیہ اور چچا سے ناراض ہو کر اپنا وطن چھوڑ کر شام اور عراق میں گھومتے پھرے مگر وہاں کے مذاہب اہلِ کتاب یہودیت اور نصرانیت دونوں میں سے کسی کو بھی اختیار نہیں کیا اور اپنے پرانے مذہب بت پرستی سے بھی لاتعلق رہے۔ جیسا کہ انہوں نے ایک بار کعبہ کے سامنے دعا کرتے ہوئے کہا۔

یا اللہ! اگر مجھے علم ہو جائے کہ تو فلاں دین سے خوش ہے تو میں اسی مذہب کو اختیار کر کے تیری عبادت کروں لیکن مجھے کچھ علم نہیں کہ تو کس دین سے خوش ہے۔

ان میں چوتھے عثمان بن حارث ہیں جو سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے رشتہ داروں میں سے تھے۔ انہوں نے مکہ چھوڑا روم چلے گئے وہاں پہنچ کر نصرانی ہو گئے۔ قیصر روم نے انہیں اپنے مصاحبین میں شامل کر لیا۔ اب عثمان کو یہ شرارت سوجھی کہ اہلِ مکہ کو قیصر روم کا باجگزار بنا کر خود وہاں کا گورنر بن جائے۔ لیکن قریش اس کے فریب میں نہ آئے۔ عثمان روم چھوڑ کر حیرہ میں غسان کے پاس چلا گیا اور اسے مکہ جانے والوں کی ناکہ بندی پر اکسایا۔ قریش کو جب یہ اطلاع پہنچی کہ قریش نے غسان کو کچھ تحائف دے کر اپنی طرف مائل کر لیا اور عثمان کو وہیں زہر دے کر مار دیا گیا۔

اولاد

سیدنا محمد ﷺ نے زندگی کے کئی سال اپنے ہم وطنوں میں گزارے۔ اس اثناء میں

انہیں اپنی شریک حیات خدیجتہ الکبریٰ کی گود ہری بھری دیکھنے کی بیحد خواہش تھی۔ ان کے بطن سے دو فرزند اور چار صاحبزادیاں پیدا ہوئیں۔ صاحبزادوں میں ایک کا نام سیدنا قاسم اور دوسرے کا نام سیدنا عبداللہ۔ دونوں کے القاب طاہر اور طیب تھے۔ بیٹیوں کے نام زینب' رقیہ' ام کلثوم اور فاطمہ ہیں۔ دونوں صاحبزادے بعثت سے پہلے ہی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

جن کی موت کا ماں اور باپ دونوں کو بیحد صدمہ ہوا ہو گا۔

باپ کا اپنی جگہ اور ماں کی ممتا کا ان دونوں کی جدائی کے بعد کلیجہ منہ کو آیا ہو گا۔ بلا تردید کہا جا سکتا ہے کہ خدیجتہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے ان صدموں پر بتوں کے حضور میں فریاد کی ہو گی۔

اے میرے معبودو! تم سب نے مجھ پر کیوں ترس نہیں کھایا۔ اگر ان کو مجھ سے چھین ہی لینا تھا تو میرے دل کو ڈھارس بھی دی ہوتی۔ میرے دل کو اب کسی صورت میں بھی چین حاصل نہیں۔

اس دور میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کی رسم سے پتہ چلتا ہے کہ عرب معاشرہ میں فرزندوں سے اپنی زندگی سے زیادہ پیار تھا۔ بیٹوں کے متعلق اس عام جذبہ کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو فرزندوں کو یکے بعد دیگرے لقمہ اجل بنتے ہوئے دیکھ کر ان پر کیا گزری ہو گی؟

فرزندوں کی موت پر زید کو متبنّیٰ بنانا

اس صدمہ کے ردِ عمل پر غور کرنے سے بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دور میں اپنے لئے بیٹے کی جگہ خالی دیکھنا پسند نہ کی چنانچہ زید بن حارثہ کے واقعہ سے یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی خریداری کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رفیقہ حیات رضی اللہ عنہا سے اشارہ فرمایا اور بعد میں زید کو آزاد کر کے اپنا متبنّیٰ قرار دیا۔ جس کے بعد وہ ابنِ حارثہ کی بجائے ابنِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام سے مشہور ہو گئے۔ یہی زید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد میں مخلص صحابی اور بہترین پیرو ثابت ہوئے۔

پھر آپ کے تیسرے فرزند ابراھیم بھی زمانہ طفولیت میں ہی لقمہ اجل بن گئے۔ اس صدمہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دلِ حزیں کو اور بھی زخمی کر دیا۔ ابراھیم کی رحلت کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب اسلام میں دختر کشی کو حرام قرار دے دیا گیا تھا اور عورت کا مقام بلند تر کر دیا گیا۔ جس میں عورت کا اونیٰ ترین مقام و مرتبہ اس کے ماں ہونے کی حیثیت ہے اور اس کے قدموں تلے جنت ہے۔

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بیٹوں کی پے بہ پے وفات سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کتنی آلام

و غم کا ملجا بن گئی ہو گی اور یہ بھی ناقابل انکار ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو خاک میں ملتے ہوئے دیکھ کر بتوں کے سامنے جس طرح واویلا کیا ہو گا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے اپنے دل پہ کیا اثر لیا ہو گا۔ ان حوادث سے پہلے بھی جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رفیقہ حیات رضی اللہ عنہا کو بتانِ کعبہ کے حضور سرنیاز زمین پر رکھتے ہوئے دیکھا ہو گا آپ نے انہیں اپنی اہلیہ کو لات و عزیٰ' ہبل ولات منات میں ہر ایک کے چہرے پر قربانی کے خون سے غازہ کرتے دیکھا ہو گا اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سمجھے ہوں گے کہ ان کی اہلیہ کا ان بتوں کی ناز برداری سے تو ان کا مقصد صرف اپنے غم کی تلافی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محسوس کر لیا کہ سیدہ خدیجہ کو بتوں کے تقرب سے کوئی دلچسپی نہیں وہ تو محض اپنے غم کی تلافی میں سرگرداں تھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ محسوس کر لیا سیدہ خدیجہ کو نہ تو بتوں کے تقرب سے کچھ ملا نہ انہیں قربانی کے خون میں تیرانے پر رفیقہ حیات کے دکھوں میں کوئی کمی واقع ہوئی۔ مختصر یہ کہ اپنی شریکِ حیات کو ان معبودوں کیلئے اتنی نیاز مندیوں کا صلہ صفر دیکھ کر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمندِ فکر و تدبر کہیں سے کہیں جا پہنچی۔

صاحبزادیاں اور ان کے بیٹے

اپنی بیٹیوں کے رشتے بہت ہی مناسب اشخاص کے ساتھ کیے۔ سب سے بڑی صاحبزادی زینب کا عقد ابو العاص بن ربیع (ابن عبد شمس) کے ساتھ ہوا۔ یہ خدیجہ کے ہمشیرہ زاد تھے اور معزز تاجر' سیدہ زینب کو ان کے ہاں کبھی تکلیف نہ پہنچی۔ سوائے اس موقع کے جب بی بی زینب ہجرت فرما کر مدینہ جانے لگیں جس کی تفصیل دوسرے مقام پر آئے گی۔

دوسری اور تیسری صاحبزادی بی بی رقیہ اور ام کلثوم کا رشتہ عتبہ اور عقبہ سے ہوا۔ یہ دونوں آپ کے چچا ابولہب کے بیٹے تھے۔ بعثت کے بعد اس کی اسلام دشمنی اور کفر کی بھرپور حمایت کی وجہ سے یہ رشتے ٹوٹ گئے اور اس کے بعد دونوں کے نکاح یکے بعد دیگرے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ہوئے۔ چوتھی صاحبزادی خاتونِ جنت سیدہ فاطمہ کی شادی علی ابن ابی طالب سے ظہورِ اسلام کے بعد ہوئی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا یہ حصہ رفیقۂ حیات ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی محبت و وفا اور ان کے بطن سے پیدا ہونے والی اولاد اور خوشگوار ماحول کی وجہ سے انتہائی پرسکون تھا۔ البتہ فرزندان محترم کی وفات کا دوبار صدمہ ضرور باعثِ غم بنا لیکن موصوف جن صفاتِ اعلیٰ کے مالک تھے ان کی بناء پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر معاملہ پر غور و تدبر میں گم رہنا لازمی امر تھا۔ آپ اپنی زندگی کے آس پاس ہی نہیں بلکہ خود سے یا خود پر بیتی جانے والی ہر بات پہ گہرا غور فرماتے۔

اپنے آس پاس رہنے والوں کی زبان سے بتوں کی تعریفیں بھی سنتے اور اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کی زبان سے ان بتوں کی مذمت اور تفصیلات بھی سنتے لیکن آپ ﷺ ان سب سے کہیں زیادہ گہرے غور و فکر کے ساتھ اس معاملہ کی تحقیق میں رہتے۔ قدرت نے آپ ﷺ کو اس لئے پیدا کیا تھا اور آپ کو ایسے حالات سے اسی لئے گزارا جا رہا تھا تاکہ آپ کی ذاتِ گرامی ﷺ متحمل وحی ہونے میں پختہ تر ہو جائے۔ جس کی روشنی سے آپ ﷺ نے تمام دنیا کے جن اور انسانوں کو گمراہیوں کے گہرے اندھیروں سے نکالنا ہے۔ غرض آپ ﷺ کی روح صبح و شام غور و تدبر میں مشغول رہتی۔ آپ کو ایک دن اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچانا تھا۔ دنیا کو حق و باطل میں فرق سمجھانا تھا۔ ایسی صورت میں آپ کا بت پرستی کو دیکھ کر قانع رہنا ناممکن تھا۔ آپ ﷺ کی زندگی کے تقاضہ کے ماتحت حق و صداقت کی تلاش آپ کیلئے ضروری تھی۔ ان تمام تقاضوں میں رہ کر یہ بھی ضروری تھا کہ آپ ﷺ کا شمار عرب کے کاہنوں میں نہ ہو۔ آپ ﷺ کا مقصد ورقہ بن نوفل کی طرح حکیم و فیلسوف بننا بھی نہیں تھا۔ آپ کا ارادہ ان سب سے بلند تھا۔ آپ ﷺ اس خصوصی اعزاز و اکرام کے منتظر تھے جس میں از خود اللہ جل شانہ کی طرف سے تاجِ انتخاب و امتیاز عطا ہوتا ہے۔ آپ ﷺ سب کچھ خود ہی سوچتے مگر کسی سے اپنے دل کی بات نہ کہتے۔

گوشۂ تنہائی غار حرا

اس زمانہ میں رضائے الٰہی اور مکاشفہ کے خواہش مند حضرات سال میں ایک بار دور کسی گوشہ تنہائی میں بیٹھتے اور اپنے اپنے طریقہ سے عبادت میں مصروف ہو جاتے۔ ان کا مقصد بتوں کا تقرب ہوتا۔ جس کی بناء پر وہ ان کے کرم و بخشش کا حقدار بننے کے زعم میں ڈوبتے۔ اس طریقِ عبادت کو "تحنث" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔

سیدنا محمد ﷺ نے بھی اس طریقِ عبادت کو بہترین سمجھ کر جس حقیقت کی دریافت کے لئے وہ اپنے قلب و شعور میں ہر لمحہ بے قراری محسوس فرماتے تھے' اس سوال کا جواب پانے کے لئے آپ ﷺ نے مکہ معظمہ سے دو میل دور اس غار کو منتخب فرمایا جس کا نام غارِ حرا ہے۔ غار حرا کا وہ مقام جس کے خلا سے بیت اللہ شریف ایسے نظر آتا ہے جیسے آنکھ کی پتلی میں کسی شے کا عکس! ٹھیک اسی جگہ آپ ﷺ رمضان المبارک میں خلوت نشین ہوتے۔ مہینہ بھر کے لئے گھر سے سامان خورد و نوش ساتھ لے کر وہاں تشریف لے جاتے اور دنیا و مافیہا سے بالکل لاتعلق ہو کر غور و فکر میں ڈوب جاتے۔ اس زمانے میں آپؐ کو کھانے پینے تک کا ہوش بھی نہ رہتا۔

آپ ﷺ کے لئے اہلِ مکہ کی رسوماتِ عبادت اور معاشرت سے بیگانگی کے سبب یہ

تنہائی بذاتِ خود ایک انجمن تھی۔ جہاں وہ اپنے خیالات کے مختلف پہلوؤں کی محفل سجاتے، ان کے ہر پہلو پر غور و فکر فرماتے اور ان کے مقابلہ میں بت پرستوں کی بت پرستی جو تخمین و ظن کے سوا کچھ نہ تھی اپنی تلاش میں حقیقت شناسی کی لذت محسوس فرماتے۔

سچائی کی تلاش

حضرت محمد ﷺ حرا میں اس حقیقت کے متلاشی تھے جو نہ تو آپ کو یہود کے اسفار (عہد عتیق) میں مل سکی اور نہ ہی عیسائی راہبوں کے زاویوں میں اس کا کھوج ملا بلکہ اس حقیقت کا صحیح چہرہ آپ کی نظر کے سامنے یہ وسیع و عریض کائنات تھی۔ اوپر نظر اٹھائیں نیلگوں آسمان کے حسنِ حیرت زا کو بڑھانے والے جگمگ کرتے ستارے ٹکے ہوئے ہیں اور ان میں ان سب کا رئیس اعظم چاند اپنی ضیا پاشی میں کمال و جمال کا مظہر نظر آتا ہے۔

رات کا حسن و جمال اپنی قسم قسم کی حیرت زائیوں کے ساتھ جاتے ہی اپنے بعد مہرِ عالم تاب کو بڑھاوا دے جاتا ہے۔ اس کی شعاعیں صحرائے بے پایاں پر روشنی کی چادر پھیلا دیتی ہی۔ اتنی سفید اور چمکتی ہوئی چادر جس کی مثال نہیں ملتی جس کے اثرات کیوں؟ کیسے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

دن میں اسی آفتاب کے بھڑکتے ہوئے شعلے چاروں طرف لپکتے ہیں تو رات دن کو چھپا لیتی ہے اور پھر چاند کی خوشگوار چاندنی دلوں میں سرور کے باغ کھلا دیتی ہے۔ تاروں کی جھلملاہٹ رات کے سہاگ کو اور زیادہ حسین بنا دیتی ہے۔ دریائے نور اور اس کی متلاطم موجوں کا وجود ایک دوسرے سے ایسا مربوط ہے کہ کوئی بھی اپنے ساتھی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایک کی زندگی دوسرے کی زندگی کے لئے لازم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک "وحدتِ وجود" ہے۔ جس کے طرح طرح کے مظاہر باری باری ہر طرف گردش کر رہے ہیں اور آنحضرت ﷺ ہر ایک منظر کی پیشانی پہ نگاہیں جمائے حقیقت کے پسِ پردہ خدوخال کی جستجو میں مصروف ہیں۔

آنحضرت ﷺ اس غارِ حرا کی تنہائی میں بیٹھ کر حقیقت کی تلاش میں روح کو اتنی بلندی پر لے جاتے کہ نچلی سطح پر چھائی ہوئی ظلمتوں کا ایک ایک گوشہ نظر آ جاتا تو حقیقت آپ ﷺ پر منکشف ہو جاتی۔

اسی خلوت میں آپ ﷺ معاشرہ کے مذہبی عقائد کا جائزہ لیتے اور اہالیانِ شہر کی گمراہئ منزل سے اتنے متاثر ہوتے کہ آپ کے نزدیک بت پرستوں کے مسلماتِ مذہب میں اس سے زیادہ کوئی گنجائش نہ تھی کہ ان کے معبود ایسے بت ہیں جنہیں نہ تو کسی کے نفع و نقصان کی قدرت حاصل ہے نہ ان میں کسی چیز کو پیدا کرنے یا ایجاد کرنے کی صلاحیت ہے۔ نہ ان میں کسی کو رزق پہنچانے کا اختیار ہے۔ بالکل بے حس، بے جان، بے اختیار، بے عمل، بہرا

یہ عزیٰ جو کعبہ کے درمیان میں گڑے ہوئے ہیں اور وہ بت جو کعبہ کے اندرونی حصہ میں چاروں طرف کناروں پہ رکھے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک نے مکھی تک تو پیدا نہیں کی۔ نہ یہ اہلِ مکہ کی کسی مصیبت میں کبھی کام آئے۔ حقیقت اگر ان میں کہی جاتی ہے تو یہ عجیب سے عجیب تر ہے۔

کہیں یہ حقیقت اس کھلے عظیم، وسیع تر جہان، بچھی ہوئی زمین، چاروں طرف کو گھیرے ہوئے آسمان، اور اس کے چمکتے ستاروں میں پنہاں تو نہیں؟ جن سے رات کو روشنی اور ان میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور اپنے قرب و جوار میں بسنے والے بادل اپنے زیرِ نگیں زمین اور اس پر رہنے والوں کے لئے مینہ برسانے کا حکم دیتے ہیں؟ کیا وہ حقیقت انہیں آسمان کے روشن ستاروں میں پوشیدہ ہے جو زمین ہی کی مانند کرہ کی شکل میں ہیں؟ یا وہ حقیقت ان کرّوں کے علاوہ پتھر کے اس ذرے میں ہے جس کے جوہر کی کوئی حد نہیں لیکن خود پتھر کی کیا حقیقت کیا ہے؟

یا ہماری اور ہماری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ جو آج ہے تو کل نہیں۔ اس زندگی کا معمہ بھی تو اب تک حل نہیں ہوا۔ کیا یہ زمین کسی حادثہ کا نتیجہ ہے۔ جس کے برگ و بار سے فائدہ حاصل کرنے کیلئے انسان کا ظہور بھی اتفاق ہی کا نتیجہ ہے؟

کیا انسان خیر و شر دونوں پہ مختار ہے؟ یا ان میں سے ہر ایک کو انجام دینے میں اتنا مجبور و بے بس کہ کسی ایک بات یا عمل کا ظہور اس کے اختیار سے باہر ہے؟

جناب محمد ﷺ غارِ حرا میں عبادت کے درمیان اسی قسم کے مسائل پر غور فرماتے رہے۔ ان کا مقصد حقیقت تک پہنچنا اور زندگی اور موت کے معمہ کو حل کرنا تھا۔ (کسی ذریعہ سہی) غار حرا کی صبح و شام کے ایک ایک لمحہ میں آپ کی روح و قلب اور وجدان کی جستجو صرف حقیقت کی دریافت تھی۔

رمضان المبارک کا مہینہ ختم ہوتے ہی آپ ﷺ واپس اپنے دولت کدہ پر تشریف لے آتے مگر وہ تصورات بدستور ان کے ساتھ ساتھ رہتے۔

اپنی رفیقۂ حیات خدیجہ رضی اللہ عنہا پر اپنے اس غور و فکر کی پریشانیاں از خود ظاہر ہونے سے احتیاط فرماتے۔ آپ ﷺ سے جب بھی رفیقۂ حیات مزاج پرسی فرماتیں تو آپ جواب میں فرماتے۔ میں خوش و خرم ہوں۔

غارِ حرا میں غور و تدبر میں مضامین کیا تھے؟

آپ ﷺ غارِ حرا میں کس شریعت کے مطابق عبادت فرماتے؟ اس معاملہ میں علماء کی مختلف رائے ہے۔ ابنِ کثیر نے اپنی تاریخ (البدایہ والنہایہ) میں متعدد اقوال نقل فرمائے

ہیں۔

(1) حضرت نوح علیہ السلام کی شریعت کے مطابق؟

(2) حضرات ابراھیم علیہ السلام کی شریعت کے مطابق؟

(3) حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق؟

(4) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے مطابق؟

(5) اپنی مقرر کردہ شریعت کے مطابق زیادہ قابلِ قبول نظر آتا ہے۔

اس میں آخری قول نمبر 5 اس لئے کہ یہی آپ ﷺ کے غور و تدبر کا منتہائے مقصود تھا۔

قدرتِ کاملہ کی جلوہ افروزی

سال بہ سال رمضان المبارک میں غار حرا کی خلوت نشینی اور فکرو تعمق کا تسلسل اس کمال درجہ تک پہنچ گیا کہ یہی غورو تدبر آنحضرت ﷺ کا ہمزاد بن گیا! حتیٰ کہ حرا میں وہ حقیقت جلوہ افروز ہوئی جس کی تلاش میں ابتدائے شعور سے کوشاں تھے اور جس کے نور و روشنی میں دنیا کا جاہ و جلال اور ثروت و دولت حقیر نظر آتے تھے۔ اب آپ ﷺ کی نگاہ میں ان حقائق کی پوری طرح وضاحت ہو گئی کہ اہلِ مکہ کا معاشرہ گمراہ کیوں ہے؟ بتوں کی پرستش ان کے عقیدہ اور عمل پر کس قدر مسلط ہے اور یہود و نصاریٰ کے علماء نے اپنی تعلیم کو اوہام اور شخصیت پرستی سے کس قدر ملوث کر رکھا ہے؟ بات واضح ہو گئی کہ ان دونوں شریعتوں کے علماء حقیقتِ مطلق اور بسط کو سمجھانے سے قاصر ہیں۔ جو جھگڑوں اور اوہام سے بالکل پاک اور صاف ہے۔ غرض آپ ﷺ جوہر حقیقت کی سچائی کو اس حد تک پہچان گئے کہ اس پوری کائنات کو پیدا کرنے والا اور اسے عالَمِ ظہور میں لانے والا صرف اور صرف ایک ہی پروردگار ہے۔ جو رحمان اور رحیم ہے۔ دوجہاں کا پیدا کرنے والا ہے جس کے سامنے ہر شخص کو جواب دینا ہے اور ہر شخص کے اعمال کے مطابق اسے جزا یا سزا پانا ہے۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرًا یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرًّا یرہ (7,8:99)

نیک اور بد اعمال ذرہ کے برابر ہوں گے تو بھی ان کی جزا و سزا مل کر رہے گی۔

یہ بھی منکشف ہو گیا کہ جنت اور جہنم برحق ہیں اور جو لوگ اللہ کو چھوڑ کر بڑے انسانوں یا بتوں کی پوجا کریں گے ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔ انہا ساءت مستقرًا و مقامًا (66:25) جو نہایت تکلیف دہ مقام ہے۔

تسلسلِ انوار

40 ویں سال میں آنحضرت ﷺ کا سنِ مبارک پہنچنے تک غارِ حرا میں عبادت و

ریاضت کا سلسلہ جاری تھا۔ اس اثناء میں رویا (خوابوں) میں جو انکشافات ہوتے رہے ان سے آپ ﷺ کے ایمان میں اور توانائی آتی گئی۔ باطل کی خرابیاں اور واضح ہوتی گئیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کی تربیت اپنے کمالات کو پہنچی اور اب اللہ تعالیٰ کی اپنی خاص توجہ کے عظیم ترین لمحات آ گئے۔

آپ ﷺ کا ابتدائے شعور سے لیکر اب تک غورو تدبر کرنا اللہ عزوجل کی تربیت ہی کا ثمر تو تھا۔ دورانِ تربیت نبی اکرم ﷺ نے اپنے اللہ سے اپنی قوم کو گمراہیوں سے نکالنے کیلئے دعائیں مانگیں۔ اسی فکر میں رات رات بھر اللہ عزّوجل کے حضور کھڑے ہوئے دل و دماغ کو صرف اسی طرف جما دیا۔ دن میں روزوں کی مدد سے برکتیں حاصل فرما کر اپنے غورو تدبر میں وسعتیں پیدا فرماتے۔ کبھی کبھی غارِ حرا کی تنگی سے نکل کر وسیع و فراخ صحرا میں تشریف لے آتے تو کھلی فضا میں بھی وہی تصورات ہمراہ ہوتے۔ صحرا سے پھر غار عجیب سا عالم یہاں اور وہاں غورو تدبر سے حاصل شدہ انکشافات کا جائزہ لیتے پھر ان دونوں کے باہم ربط پر غور فرماتے۔ اسی طرح کی کشمکش میں غارِ حرا چھ مہینے تک آپ ﷺ کا قدم بوس رہا۔ معاملہ کے انجام سے گھبرائے ہوئے دولت خانہ پر تشریف لائے اور غارِ حرا میں قیام مسلسل کے درمیان ہونے والے انکشافات و محسوسات کو اپنی رفیقۂ حیات سے بیان کرتے ہوئے دریافت فرمایا۔ "بی بی یہ کسی جن کی کارستانی تو نہیں؟"

بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔ نہیں نہیں آپ تو مردِ "امین" ہیں۔ آپ ایسے عظیم اور پاکیزہ انسان سے جن کبھی الجھتے۔ اس مقام پر مجھے حیرت ہے کہ دونوں عظیم ہستیوں کے دلوں میں یہ خیال کیوں نہ گزرا؟ کہ آپ ﷺ کی روحانی ریاضت و تربیت آپ کو ایسے منصب پر دیکھنے کیلئے بے قرار ہے جس کا یومِ ورود دنیا کا سب سے بڑا دن ہے اور اس منصب کی اطلاع تمام عالم کیلئے بہت بڑی چیز ہے۔ نزولِ وحی کا وہ دن جس دن آنحضرت ﷺ رسالت کے منصبِ اعلیٰ سے معزز و مکرم ہوں گے۔

اوّلین وحی (610ء)

نزولِ وحی کی مبارک گھڑی آ ہی گئی۔ آنحضرت ﷺ محوِ خواب تھے۔ ایک فرشتہ جس کے ہاتھ میں لکھا ہوا ایک ورق تھا اور عالمِ رویا میں آنحضرت ﷺ کے سامنے اسے کھول کر کہا۔ اقراء اسے پڑھئے! آپ ﷺ گھبرائے اور فرمایا۔ ما اقراء کیا پڑھوں؟ اب نبی اکرم ﷺ نے محسوس فرمایا کہ فرشتے نے زور سے آپ کے ساتھ معانقہ کیا ہے اور پھر کہا "اقراء" اسے پڑھئے۔ آپ ﷺ نے پھر وہی جواب دیا۔ فرشتہ نے دوسری مرتبہ پہلے کی طرح زور سے معانقہ کرنے کے بعد ورق سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ اقراء اس مرتبہ آپ

ﷺ اس خیال سے کہ کہیں یہ پھر تکلیف وہ معانقہ نہ کریں فرمایا۔ ما ذا اقراء میں کیا پڑھوں؟

فرشتے نے کہا۔

اقراء باسم ربک الذی خلق ○ خلق الانسان من علق ○ اقراء وربکُ الاکرم الذی علم بالقلم علم الانسان مالم یعلم ○ (96-1 تا 5)

"پڑھیے اپنے رب پیدا کرنے والے کا نام لے کر پڑھیے۔ جس نے انسان کو جمے ہوئے لہو سے پیدا کیا۔ ہاں پڑھیے کہ آپ کا پروردگار وہ صاحبِ کرم ہے جس نے قلم کے ذریعہ انسان کو ایسا علم سکھایا جسے وہ پہلے سے نہ جانتا تھا"

آپ نے فرشتہ کے سامنے یہ تمام کلمات دہرائے جو فرشتے کے واپس جانے سے پہلے آپ کی لوحِ دل پر منقش ہو گئے۔

ایک عجیب و غریب اضطراب

خواب ختم ہوتے ہی آنکھ کھلی' حیرت زدہ ہو کر سوچنے لگے آخر میں نے کیا دیکھا۔ چاروں طرف نظر دوڑائی یہاں کہیں کوئی جن تو نہیں۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ گھبراہٹ بڑھتی گئی۔ اور ذرا دیر بعد بدن پر کپکپی پیدا ہو گئی۔ جس غار میں یہ واقعہ پیش آیا۔ اس سے بھی بے چینی بڑھی۔ یہاں سے چلے جانے میں اپنی خیر سمجھی۔ اور تیز تیز قدم اپنے گھر کی طرف تشریف لے چلے۔ ہر قدم پر یہ خیال ساتھ تھا۔ یہ کون تھا۔ جس نے مجھ پڑھنے پر یوں مجبور کیا۔ ان سوالوں کے ہجوم میں پہاڑیوں سے چلتے رہے۔

یوں تو واقعہ مکاشفہ سے پہلے خلوت میں غور تدبر تفکر و تجسس کی وجہ سے رویائے صادقہ میں بت پرستوں کی پوری دنیا اندھیرے میں غرق نظر آ چکی تھی۔ سامنے بحدِ نگاہ ایسا نور بکھرا ہوا نظر آ چکا تھا۔ جس کی چمک دمک سے بتوں نے شرم کے مارے اپنے منہ چھپا لئے تھے اور نور کی لو جس حقیقت کی نشان دہی کر رہی ہے وہ اصل میں عز و جل کی تجلیات ہیں۔

دوسری مرتبہ فرشتۂ مکرم کا نزول

اس منزل پر آ کر تصور نے پھر پلٹا کھایا' کہ یہ نصیحت کرنے والا کون تھا۔ جس نے مجھے اللہ عزوجل کی خبر دی اور کہا۔ انسان کا پیدا کرنے والا وہی ہے۔ جس کی منزلت کی کوئی حد نہیں اور اس کے معنی کیا ہیں؟ کہ اللہ تعالیٰ ہی نے انسان کو قلم کے ذریعہ علم سکھایا۔؟

اسی طرح گھبرائے' سہمے ہوئے دماغ میں طرح طرح کے تصورات لئے ابھی پہاڑ کے درمیان پہنچے ہی تھے تو کسی نے اچانک آواز دی۔ آسمان کی طرف نظر اٹھائی تو انسان کی شکل میں

ایک فرشتہ آپ کو پکار رہا تھا۔ وہیں رک گئے اور فرشتے کا تصور دماغ سے دور کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن عظیم فرشتے کے وجود نے حد نگاہ تک پوری فضا کو گھیر لیا تھا۔ جو کبھی آگے قدم اٹھاتا اور کبھی پیچھے ہٹ جاتا ہے غرض فرشتے کی حسین و جمیل شکل نظر سے ہٹا نہ سکے اور دیر تک اسی مقام پر کھڑے رہے؟

سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا اضطراب اور تلاش

ادھر بی بی نے آپ کی تلاش میں ایک شخص کو حرا میں بھیجا مگر آپؐ وہاں تشریف فرما نہ تھے۔ تلاش کنندہ مایوس لوٹا۔ ادھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت کہ فرشتے کے غائب ہونے سے نئی نئی کیفیتیں پیدا ہو گئیں وحی کی کیف سے روح سراپا انبساط پر سرور سے بھرپور تھی مگر دل ابھی تک کانپ رہا تھا۔

دولت کدہ پر واپسی

گھر واپس تشریف لائے اور اپنی مہرباں بیوی رضی اللہ عنہا سے فرمایا۔ مجھے جلدی سے کپڑا اوڑھا دیجئے۔ بدن پر کپکپی تھی جیسے بخار آ گیا ہو۔ ذرا دیر بعد سکون آیا۔ تو اپنی اہلیہ رضی اللہ عنہا سے ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا۔

"اے خدیجہ رضی اللہ عنہا مجھ پر کیا بیتی؟ سارا ماجرا بیان کیا اور آخر میں پھر فرمایا۔ کہیں یہ میری لغزش یا کسی دشمن کی جادوگری کا کرشمہ تو نہیں۔

جناب خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جو اس سے پہلے بھی حرا میں ایک خواب دیکھنے کے بعد اپنے شوہر کو خوف و ہراس سے نجات دلانے میں فرشتہ رحمت ہونے کا ثبوت دے چکی تھیں۔ اسی صاحبِ فراست نے حیرت و تعجب کا ردِ عمل دکھائے بغیر اپنے شوہر کی طرف احترام سے دیکھتے ہوئے کہا۔

البشر یاابن عم واثبت فواللہ نفس خدیجہ بیدہ انی لارجو ان تکون نبی ھذہ الامتہ: واللہ لایخزیک اللہ ابدا انک لتصل الرحم وتصدق الحدیث وتحمل الکل وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق۔

اے میرے عم زاد شاد باش و شادزی۔ میں اس ذات کی قسم کھا کر کہتی ہوں جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یقیناً آپ کو اس امت کی نبوت نصیب ہو گی۔ واللہ آپ کبھی ناکام نہ ہوں گے اس لئے کہ ہم آپ ہر انسان کے ساتھ بھلائی کرتے ہیں سچ بات فرمانا آپ کا دستورِ حیات ہے۔ مہمان کی تواضع میں آپ سرِفہرست رہتے ہیں۔ دوسروں کی مصیبت کو اپنے ذمہ لینا آپ کا شعارِ مستقل ہے۔

نیند سے ایک وقفہ کے بعد زندگی کا دوسرا رخ

جناب خدیجہ کی تسکین دینے سے آپ کے دل کو سکون ہوا آپؐ نے ان کی طرف محبت و پیار، اطمینان و تشکر کی نگاہ سے دیکھا۔ مگر تمام جسم اب بھی تھکان سے چور چور تھا۔ سو گئے تاکہ آپ پہلے کی تھکن اتار کر تازہ دم ہو کر خود کو ایسی زندگی پر گامزن کر سکیں جس میں تمام روحانی کمالات جمع ہوں کہ ان کا ایک رخ تو اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی تعمیل (رضا جوئی) اور دوسرا پہلو بندوں کے حقوق ادا کرنے میں مصروف عمل ہو۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اللہ کی عطا کردہ رسالت کا حق اور تبلیغ و ہدایت میں ایسا احسن طریق اختیار فرمایا کہ وہ اپنی مثال آپ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی کے علم النور سے نسلِ انسانی کو منور کرنے میں جس کمالِ عمل کی مثال قائم فرمائی منکرین اس سے چاہے کتنا انکار کریں وہ سچ سب پر آپ بھی غالب ہے۔

واللہ متم نورہ' ولو کرہ الکافرون (61-8)

اللہ تعالیٰ اپنا نورِ ہدایت تمام عالم پر غالب کرنے کو ہے۔ اگرچہ کفار کو برا ہی کیوں نہ محسوس ہو

ولادت اور طفولیت

ولادت اور طفولیت

عبداللہ بن عبدالمطلب کا نکاح

یمن کے حبشی بادشاہ ابرہہ نے جب مکہ معظمہ پر چڑھائی کی تھی اور کیفرِ کردار کو پہنچا اس وقت حضرت عبدالمطلب کی عمر 70 سال تھی اور ان کے لختِ جگر جناب عبداللہ گلستانِ زندگی کی چوبیسویں بہار میں تھے۔ والدِ محترم نے ان کی شادی کا فیصلہ کیا جو سیدہ آمنہ بنتِ وھب سے طے پائی۔ سیدہ آمنہ بھی قبیلہ قریش میں سے ہی ہیں۔ شجرہ مبارک یہ ہے۔

ایک دن جناب عبدالمطلب جناب عبداللہ کو ساتھ لے کر بنو زھرہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ اور ــــــ وھب سے ان کی صاحبزادی آمنہ کا عبداللہ سے رشتہ مانگا۔ (بعض مؤرخین کے نزدیک اس وقت وھب کا انتقال ہو چکا تھا اور عبدالمطلب نے یہ مانگ (خطبہ) ان کے بھائی وھیب سے کی تھی جو ان کے سرپرست تھے) سیدہ آمنہ کے بزرگوار نے اسے بخوشی شرفِ قبولیت دے دیا۔ نکاح کے بعد مسلسل تین دن تک عربوں میں رائج رسم کے مطابق ان کے گھر میں ہی رہے۔ چوتھے روز دولہا اور دلہن جناب عبدالمطلب کے دولت خانہ میں تشریف لے آئے۔ جس دن جناب عبداللہ کی رسمِ نکاح عمل میں آئی' اسی دن جناب عبدالمطلب نے جناب آمنہ کی پھوپھی اھالہ (وھب و وھیب کی ہمشیرہ) سے عقد کیا۔ اور جس سال حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی اسی سال بی بی اہالہ کے بطن سے بھی فرزند ارجمند پیدا ہوا۔ جن کا نام سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عم بزرگوار اور برادرِ رضاعی بھی ہیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جناب عبداللہ تجارت کے سلسلہ میں شام تشریف لے گئے اس وقت سیدہ آمنہ کا نخلِ امید بار آور ہو چکا تھا اور جناب عبداللہ اس خوشخبری کو اپنے ساتھ اپنے سفر میں لے گئے تھے۔

سیدنا عبداللہ اپنی زندگی میں کسی دوسری بیوی سے (آمنہ کے سوا) نکاح یا کسی عورت کا ازخود اپنا نفس ہبہ کرنے کی روایات میں اختلاف ہے۔

جناب عبداللہ جس قدر حسین و جمیل نوجوان تھے اس کے پیش نظر عورتوں کا خود ان کی طرف رجوع کرنا بعید از قیاس نہیں ہو سکتا۔ لیکن تاریخ میں اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ سیدہ آمنہ سے پہلے ان کے گھر میں کوئی بیوی تھی یا یہ جفتی (کسی زمانہ میں بھی) مختصر مدت میں ہی ہوئی ہو۔ یہ بھی ممکن ہو سکتا ہے کہ ان کے حسن و جمال کی مشتاق عورتیں ان کا شام سے واپسی تک انتظار کر رہی ہوں۔

جناب عبداللہ کی شام سے واپسی اور مدینہ منورہ میں قیام

جناب عبداللہ نے کچھ عرصہ غزہ (فلسطین) میں رہنے کے بعد مکہ معظمہ کو واپس ہوتے ہوئے کچھ عرصہ مدینہ منورہ قیام فرمایا۔ یہاں ان کے ننہال تھے۔ سفر کی تھکن بھی دور کرنا مقصود تھی۔ لیکن جناب عبداللہ وہاں بیمار پڑ گئے۔ ان کے ساتھ ان کا چند روز انتظار کر کے مکہ معظمہ روانہ ہو گئے اور عبدالمطلب کو ان کی بیماری سے آگاہ کیا تو انہوں نے ان کی خبر لینے کیلئے اپنے بڑے بیٹے حارث کو مدینہ روانہ کیا۔ مگر جناب عبداللہ اپنے ساتھیوں کے جاتے ہی ایک ماہ کے

اندر اندر اس جہان فانی سے کوچ فرما چکے تھے۔

حارث اس سانحہ کی خبر لئے مکہ پہنچے تو بی بی آمنہ جو اپنے شوہر کیلئے چشم براہ تھیں یہ خبر سن کر دم بخود ہو کر رہ گئیں۔ عبدالمطلب بھی اس خبر سے غمزدہ ہو گئے۔ آہ عبداللہ ان کے سب سے زیادہ پیارے بیٹے جن کی زندگی کی قیمت میں انہیں سو اونٹ قربان کرنے پڑے اور انہوں نے بخوشی قبول کر لیا۔

عبداللہ کے بعد ان کا اثاث البیت

ان کا کل اثاثہ ---- پانچ اونٹ۔ بکریوں کا ایک ریوڑ اور ام ایمن بطور کنیز تھیں۔ محترمہ آمنہ کے بعد انہیں عالیہ نصیب کو آپ کی کھلانے والی بننے کا شرف نصیب ہوا۔

حضرت عبداللہ کا اتنا اثاثہ ان کی دولت مندی کی ثبوت تو نہیں بن سکتا مگر ان کی غریبی کا مظہر ضرور کہلا سکتا ہے۔ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ جناب عبداللہ نے اپنی زندگی کے اس میدان میں قدم رکھا ہی تھا جس میں اپنی مالی حالت سدھاری جا سکتی ہے کہ وہ اس جہان فانی سے رخصت فرما گئے۔

ولادت مبارک

570ء میں سیدہ آمنہ کے بطن سے ھادی انس و جان ﷺ کی ولادت ہوئی۔ خبر جناب عبدالمطلب تک پہنچائی گئی وہ فوراً محل سرائے تشریف لائے۔ انہیں اپنے مرحوم فرزند عبداللہ کی نسل جاری ہونے پر بیحد خوشی ہوئی۔ مولود مکرم ﷺ کو اپنے دونوں ہاتھوں پہ اٹھایا۔ کعبہ میں لے گئے جہاں ان کا نام محمد ﷺ رکھا گیا۔ اس نام نامی میں انوکھا پن یہ تھا کہ اہل عرب اس نام سے آشنا ضرور تھے لیکن اس سے پہلے یہ نام کسی کے نصیب میں نہیں آیا تھا۔

سن، ماہ، یوم ولادت اور وقت میں اختلاف

ربیع الاول کی تائید کرنے والے اس ماہ کی تاریخ 3 2 1 اور ابن اسحاق مولف سیرت کی روایت میں 12 ہے۔

اسی طرح تولد میں دن تھا یا شب، دو مختلف آراء ہیں۔ کوسان برسگال "تاریخ عرب" میں 2 اگست 570 (عام الفیل) کے دولت خانہ میں تقریب ولادت باسعادت کا ذکر کرتے ہیں۔

رسم عقیقہ اور اسم گرامی کی مناسبت

عبدالمطلب نے آپ ﷺ کی ولادت کے ساتویں دن بعد قریش کو دعوت دی۔ سبھی

حاضرین نے آپ ﷺ کا اسمِ گرامی سن کر پوچھا۔ آپ نے محمد (ﷺ) نام میں کیا خوبی دیکھی جو اپنے تمام بزرگوں کے نام نظرانداز کر دیئے؟ جواب دیا۔ اس امید پر کہ زمین و آسمان میں میرے فرزند کی مدح و ثنا ہو۔

دایہ

عرب کے معزز گھرانوں میں شیرخوار بچوں کو دایہ کے سپرد کرنے کا رواج تھا۔ چنانچہ اس رسم کے مطابق سات دن کے بعد آنحضرت ﷺ کو دایہ کے سپرد کر دیا گیا۔ اس وقت عرب کے اشراف میں یہ بھی رواج تھا کہ جب بچہ دایہ کے سپرد کرایا جاتا تو پھر 8 سال سے 10 سال سے پہلے وہ والدین کے پاس نہ آتا۔ دودھ پلانے والی محترمات بادیہ نشین قبائل میں سے ہوتیں اور ہر سال مکہ معظمہ اسی غرض سے آتیں۔

سیدہ آمنہ قبیلہ بنی سعد کی کسی دایہ کیلئے چشم براہ تھیں جن کی محترمات کو بچوں کی دیکھ بھال اور تربیت میں خصوصی ملکہ حاصل تھا۔ لیکن اس وقفہ کے دوران سیدہ آمنہ نے آنحضرت ﷺ کو دودھ پلانے کیلئے محترمہ ثویبہ کے سپرد کر دیا۔ ثویبہ ابولہب کی کنیز تھیں۔ انہیں محترمہ کو جناب حمزہ رضی اللہ عنہ کو بھی دودھ پلانے کا اعزاز حاصل ہے۔ جو آنحضرت ﷺ کے عم بزرگوار (چچا محترم) تھے اور اس دن سے دودھ میں شرکت کی وجہ سے رضائی برادر بھی بن گئے۔

ثویبہ نے گو آنحضرت ﷺ کو چند روز ہی دودھ پلایا تھا لیکن آنحضرت ﷺ کی محبت ان کے دل میں ایسی جم گئی کہ جب تک زندہ رہیں آپ ﷺ کو دیکھنے کیلئے تشریف لاتی رہیں۔ تو آنحضرت ﷺ ہمیشہ ان سے بہترین سلوک فرماتے۔ ثویبہ کا انتقال ہجرت کے ساتویں سال میں ہوا۔ ان کے بطن سے ان کے ایک بیٹے مسروح تھے جنہوں نے آپ ﷺ کے ساتھ دودھ پیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعد ان کی مالی امداد کرنے کی کوشش کی مگر معلوم ہوا کہ ان کا انتقال ہو چکا ہے۔

حلیمہ سعدیہ

بنو سعد کی بہت سی دایائیں اس سال مکہ معظمہ میں پہنچ گئیں۔ لیکن وہ یتیم بچوں کو مالی منفعت کے پیشِ نظر لینے کیلئے تیار نہ تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی بیوہ مائیں ان کا معاوضہ کیا اور کہاں سے دے سکیں گی۔ بی بی آمنہ کے اس عظیم ترین مولود (ﷺ) کے یتیم ہونے کی وجہ سے کسی دایہ نے یہاں آنے کی تکلیف ہی نہ کی۔ یہاں تک کہ حلیمہ سعدیہ بھی پہلی بار آپ ﷺ کو یتیم جان کر چھوڑ گئیں۔

لیکن----- سعادت جب مقدر میں لکھی جا چکی تھی تو ٹلتی کیسے۔ انہیں کوئی دوسرا شیرخوار بچہ نہیں ملا۔ اور اس کے ساتھی قافلہ نے واپسی کی تیاریاں بھی کر لیں۔ تب حلیمہ سعدیہ نے اپنے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ (جو اس سفر میں ان کے ہمراہ تھے) سے کہا۔ مکہ مکرمہ سے خالی ہاتھ جانا انتہائی ندامت کا باعث ہو گا۔ اگر آپ مشورہ دیں تو میں بنو ہاشم کے یتیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) ہی کو لے لوں؟ تو انہوں نے جواب میں کہا۔ لاعلیک ان لا تفصلی اعثی اللہ ان یجعل لنافیہ برکتہ اس فیصلہ کے بغیر تم کوئی اور فیصلہ کیا کر سکتی ہو۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لئے باعث برکت بنا دے۔ چنانچہ حلیمہ آئیں اور بی بی آمنہ کے در یتیم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو ساتھ لے کر اپنے قافلہ کے ساتھ صحرا کی طرف روانہ ہو گئیں۔

ابتدائے برکات

حلیمہ فرماتی ہیں میں نے جیسے ہی رحمت دوعالم ﷺ کو گود میں لیا اس گھڑی سے برکات کی بارش ہونا شروع ہو گئی۔ گھر پہنچی تو میری بکریاں پہلی غذا ہی سے فربہ ہو گئیں اور ان کے تھن دودھ سے بھر گئے۔

آپ ﷺ نے شیر خوارگی کے ابتدائی دو سال صحرا کی وسعتوں میں گزارے۔ حلیمہ سعدیہ ان کو دودھ پلاتیں ان کی بیٹی شیما ان کو کھلاتیں۔ بیابان کی صاف و شفاف کھلی فضا اور گرم ہوائیں آپ ﷺ کے جسم کی نشوونما کا اعزاز حاصل کرتی رہیں۔ صحرا کی زندگی میں ان ﷺ کے اعضاء انتہائی اعلیٰ تناسب کے ساتھ ابھرے۔

رضاعت کے پورے دو سال گزرنے کے بعد حلیمہ سعدیہ آپ ﷺ کو ان کی والدہ ماجدہ کے پاس حسبِ دستور واپس لائیں مگر سیدہ آمنہ کی درخواست پر حلیمہ سعدیہ انہیں پھر واپس لے گئیں۔ ایک روایت کے مطابق جناب آمنہ نے نہیں بلکہ سیدہ حلیمہ سعدیہ نے ہی انہیں اپنے ساتھ واپس لے جانے کیلئے اصرار کیا' ان کا مقصد یہ تھا کہ آنحضرت ﷺ ذرا اور بڑے ہو جائیں اور شہر مکہ میں پھیلی ہوئی وبا سے بھی محفوظ رہیں۔ جو اس وقت مکہ میں کئی جانوں کی ہلاکت کا سبب بنی ہوئی تھی۔ بہرحال اس بار آنحضرت ﷺ نے دوسرے دو سال بھی اسی صحرا کے وسیع دامن میں گزارے جس سے آپ کی ذہنی اور جسمانی توانائی اور بھی مضبوط تر ہو گئی۔

شقِ صدر اور اختلاف روایات

ایک دن آپ اپنے رضاعی بھائی کے ساتھ اپنے خیمہ کے پیچھے بکریوں کے ریوڑ میں کھیل رہے تھے کہ دو سفید پوش شخص آئے انہوں نے انہیں اٹھایا ایک طرف لٹایا ان کے سینے کو چیر

کر اس میں سے کچھ نکالا' یہ سب دیکھ کر ان کا رضائی بھائی بھاگا ہوا خیمہ کے اندر آیا اور سارا ماجرا سنایا۔ اس کے بعد حلیمہ اپنا اور اپنے شوہر کا بیان ان الفاظ میں روایت کرتی ہیں۔

"جب ہم وہاں پہنچے تو آپ (ﷺ) کھڑے تھے۔ آپ ﷺ کے چہرہ پہ ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ پہلے میں نے پھر ان کے باپ نے انہیں اپنے سینے سے لگایا اور دونوں نے ایک ساتھ ان سے دریافت کیا: اے ہمارے فرزند! یہ کیا معاملہ تھا؟" جواب دیا۔ دو سفید پوش براق سوار اجنبی میرے پاس آئے اور مجھے زمین پر لٹا کر میرا سینہ چیرا پھر وہ میرے سینے کے خلا میں سے کچھ تلاش کرتے رہے۔ وہ کیسا تھا مجھے نہیں معلوم! یہ سن کر حلیمہ اور ان کے شوہر اپنے خیمہ میں واپس ہو لیے۔ شوہر نے خوفزدہ ہو کر کہا کہیں اس بچہ کو آسیب تو نہیں ہو گیا؟ اسی خوف میں وہ آپ ﷺ کو سیدہ آمنہ کے پاس "مکہ" لے آئے۔ یہ روایت ابنِ اسحاق نے روایت کی ہے اور اس کی تائید میں فرماتے ہیں کہ آپ کا مکہ معظمہ لے جانا تو ثابت ہے لیکن شقِ صدر کی وجہ سے نہیں بلکہ حلیمہ نے سیدہ آمنہ سے کہا۔

اب ہمارے لئے آپ (ﷺ) کو اپنے پاس رکھنا بہت مشکل ہو گیا ہے۔ حبشہ کے نصاریٰ کا قافلہ ہمارے خیمہ کے پاس سے گزرا تو آپ ﷺ کو دیکھ کر سب نے اپنے اپنے اونٹوں کی مہاریں کھینچ لیں اور آپ کو بڑے غور کے ساتھ دیکھنے کے بعد مجھ سے طرح طرح کے سوالات بھی کئے۔ آخر میں مجھ سے کہا ہم کو اس بچے کو اپنے ملک میں لے جانے کی اجازت دیجئے۔ اس بچہ کی ذات کے ساتھ ایک عظیم الشان ظہور وابستہ ہے۔ جسے ہم اہلِ کتاب سمجھتے ہیں۔

اسی طرح طبری نے شقِ صدر کا واقعہ بیان کرنے کے بعد اس میں شک پیدا کر دیا ہے کیونکہ طبری اس واقعہ کو ایک بار تو کمسنی میں بیان کرتے ہیں اور دوسری بار 40 سال کے سن میں بعثت سے ذرا قبل۔

مستشرقین، مسلمان اور شقِ صدر

شقِ صدر کی روایت پر (رسول اللہ ﷺ) کی تصدیق کرنے والے مسیحی مستشرق مطمئن نہیں' اور نہ ہی کچھ مسلمان اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اسی طرح دو سفید پوشاک والے براق سوار فرشتوں کی روایت بھی ہمارے مستشرقین اور کچھ مسلمانوں کے نزدیک سنداً ضعیف ہے۔ اربابِ سیرت کہتے ہیں کہ واقعہ شقِ صدر آپ کی صغر سنی میں رونما ہوا اور یہ اس وقت پیش آیا جب آپ کی عمر دو سال سے تھوڑی ہی بڑی تھی۔

مگر دوسری روایتوں میں آپ کا بنی سعد میں 5 سال تک رہنا بیان کیا گیا ہے۔ پس اگر شقِ

صدر پہلے دو سالوں میں ہوا تو بی بی حلیمہ کا انہیں فوراً مکہ میں لے جانا ان دونوں روایتوں میں تناقص پیدا کرتا ہے۔ اس بناء پر بعض اہلِ قلم کہتے ہیں کہ جناب حلیمہ نے آپ کو تیسری بار مکہ لانے پر ہی انہیں واپس کر دیا۔

اور ولیم میور (انگریز) دو سفید پوش فرشتوں سے پہلوتہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ "شاید یہ کسی ایسے عصبی مرض کا اچانک حملہ ہو جس کا اثر آپ کے مضبوط بدن پر نہ ہو سکا مگر اس واقعہ سے حلیمہ اور اس کے شوہر دونوں گھبرا کر آنحضرت ﷺ کو آمنہ کے پاس لے آئے ہوں کہ آپ انہیں واپس ہی لے لیجئے۔

شقِ صدر میں ایک اور وجہ انکار

ایک اور اہلِ علم کا کہنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو منصبِ رسالت ہی کیلئے پیدا کیا ہے تو پھر شقِ صدر کی کیا ضرورت باقی رہ گئی۔

بر منکہم کے نزدیک واقعہ شقِ صدر اس آیت کی بناء پر وضع کر لیا گیا ہے۔

الم نشرح لک صدرک ووضعنا عنک وزرک الذی انقض ظہرک

ترجمہ۔ کیا ہم نے تمہارا سینہ فراخ نہیں کر دیا؟ اور وہ بھاری وزن نہیں ہٹا دیا جس نے تمہاری کمر جھکا رکھی تھی۔

یہ بات تو مسلم ہے کہ آپ ﷺ روحانی کمالات کا حیرت انگیز نمونہ تھے۔ البتہ شقِ صدر سے آپ کے دل کی پاکیزگی مطلوب ہو سکتی ہے تاکہ تمام دوسرے کاموں سے اپنا دامن بچا کر صرف رسالت کے مقدس فریضہ کی تبلیغ میں مصروف ہو جائیں۔

مستشرقین اور مسلمان اربابِ علم (دونوں) شقِ صدر کے اس لئے بھی خلاف ہیں کہ آپ کی پوری زندگی جن مصائب و حادثات کی آماجگاہ بنی رہی، ان کی برداشت سے ان کا انسانِ کامل ہونے کا اندازہ آسانی سے ہو سکتا ہے جس خصوصیتِ اعلیٰ کی بناء پر آپ ﷺ رسالت کی قابلیت اور تکمیل کیلئے دوسرے انبیاءِ کرام کی طرح کسی معجزہ کے دست نگر نہ تھے۔

ان کے پاس عرب و عجم ہر جگہ کے مسلمان مؤرخوں کی یہ سند بھی موجود ہے کہ سیرتِ نبوی ﷺ میں جو بات خلافِ عقل ہو اسے تسلیم نہ کیا جائے کیونکہ آپ ﷺ کی ذات کے ساتھ جن خوارق (یعنی معجزات) کا تعلق پیدا کیا گیا ہے نہ تو ان کی روایت میں تمام راوی متفق ہیں اور نہ وہ ان معجزات کو "خلق میں اصول قرآنی" ولن تجد لسنتہ اللہ تبدیلا 33-62 ہی کے مطابق پاتے ہیں اور قرآن تو مشرکین کی اس وجہ سے مذمت کرتا ہے کہ یہ سوچ بوجھ سے کام نہیں لیتے۔

اَفَلَم یسیروا فی الارض فتکون لھم قلوب یعقلون بھا اور اذان یسمعون بھا فا نھا لاتعمی الابصار ولکن تعمی القلوب التی فی الصدور (46:22)

منکرینِ توحید زمین پر تو چلتے پھرتے ہیں۔ ان کے پہلو میں دل بھی موجود ہیں مگروہ عقل سے کام نہیں لیتے ان کے کان بھی ہیں مگروہ آوازۂ حق سنتے ہی نہیں۔ بات یہ ہے کہ ظاہری آنکھیں تو خطا نہیں کرتیں ان کے دل بھی اندھے ہوگئے ہیں۔

منشائے الٰہی اس آیت کے مطابق یہ ہے کہ لوگ فہم و ادراک سے کام لیتے ہوئے اپنا پہلو کیوں بچاتے ہیں۔

صحرائی بودوباش میں جسم کی توانائی

آپ نے بنی سعد کے قبیلہ میں زندگی کے ابتدائی پانچ سال گزارے۔ اس اثناء میں صحرا کی کھلی فضا اور پاکیزہ فضا نے آپ کے بدن میں استقلال کی بے پناہ قوت پیدا کردی۔ بنو سعد کی فصیح زبان عرب کے فصیح تر لوگوں میں بولی جاتی تھی۔ جس میں آپ کو پوری پوری مہارت حاصل تھی۔ جس کا اظہار آپ نے صحابہ کے سامنے یوں فرمایا۔

انا عربکم انا قرشی واسترضعت فی بنی سعد بن بکر

"میں عرب ہونے کی حیثیت سے تم سب سے کامل ہوں' مجھے اپنے قریشی ہونے پر بجا طور پر فخر ہے۔ اور اس پر بھی نازاں ہوں کہ میری رضاعت بنی سعد میں ہوئی"۔

صحرا کی پانچ سالہ زندگی میں آپ پر کیا اثر ہوا' حلیمہ اور ان کا پورا خاندان آپ کی محبت و تکریم میں ڈوبے رہے۔ ایک دفعہ مکہ اور اس کے نواح میں قحط نمودار ہوا۔ جناب حلیمہ آپ کے ہاں تشریف لائیں۔ اس آنحضرت ﷺ کی سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا سے شادی ہو چکی تھی۔ آپ ﷺ نے اپنی بیوی کے مال میں سے ایک اونٹ' جس پر پانی کے بھرے ہوئے مشکیزے چھلک رہے تھے' چالیس بکریوں کا ریوڑ اپنی رضاعی والدہ کو تحفہ میں پیش کیے۔ جناب حلیمہ جب بھی تشریف لاتیں تو ان کی نشست کیلئے اپنی چادر بچھاتے۔ اسی طرح جب قبیلہ ہوازن کے قیدیوں میں آپ ﷺ کی رضاعی بہن' شیما گرفتار ہو کر آئیں۔ تو آنحضرت ﷺ نے ان کی اس درخواست پر ان کو رہا کردیا۔ آپ کو یاد ہو گا زمانۂ رضاعت میں بھی شیما نے آپ ﷺ گم ہو گئے (ناممکن) چاروں طرف بہت تلاش کیا مگر جب کوئی سراغ نہ ملا تو مکہ معظمہ آکر جناب عبدالمطلب کو اطلاع دی۔ انہوں نے بھی کئی اشخاص تلاش کیلئے بھجوائے مگر انہیں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی لیکن ورقہ بن نوفل آپ کو تلاش کرکے عبدالمطلب کے پاس لے آئے۔

عبدالمطلب کی توجہ

عبدالمطلب اپنے پوتے کی تربیت میں ذاتی توجہ دیتے جس میں انہوں نے کبھی کمی نہیں آنے دی۔ وہ خود قریش کے سردارِ مکہ کے حکمران تھے۔ کعبہ کے سامنے قریش کیلئے جو فرش بچھائے جاتے' اس کے درمیان میں عبدالمطلب تشریف فرما ہوتے اور کناروں پر ان کے دوسرے صاحبزادے ادب اور قرینہ سے تشریف فرما ہوتے مگر جب حضرت محمد ﷺ تشریف لاتے تو بلا جھجک حلقہ سے گزر کر دادا کے پاس چلے آتے اور وہ انہیں اپنے قریب جگہ دیتے' غرض یہ کہ عبدالمطلب اپنی تمام زندگی آپ ﷺ سے بے پناہ محبت کرتے رہے۔

کامل یتیمی

اس حادثہ کے بعد تو عبدالمطلب کے دل میں آپ ﷺ سے شفقت و محبت اور زیادہ عروج پر پہنچ گئی جب سیدہ آمنہ آپ ﷺ کو ہمراہ لئے ہوئے اپنے میکے قبیلہ نجار میں لائیں۔ (اس سفر میں بی بی اُمِّ ایمن بھی ان کے ہمراہ تھیں) مدینہ پہنچ کر سب سے پہلے آپکی والدہ نے وہ مکان دکھایا۔ جہاں ان کے والد گرامی نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس کے بعد ان کے مزار پر انہیں لے گئیں۔ جس سے آنحضرت ﷺ کو پہلی بار احساس یتیمی نے اداس کیا۔ اگرچہ سیدہ آمنہ اس سے پہلے بھی آپ ﷺ کے والد گرامی کے حالات اکثر سنایا کرتی تھیں۔ آنحضرت ﷺ نے خصوصاً اس سفر کے تمام واقعات صحابہ کرام کو بھی اپنی زبان مبارک سے سنائے۔

مدینہ سے واپسی اور سیدہ آمنہ کی رحلت

مدینہ میں ایک مہینہ قیام کے بعد جناب آمنہ مکہ معظمہ واپس ہوتے ہوئے مدینہ سے 43 میل پر اور جحفہ کے درمیان واقع ابوا نامی مقام پر پہنچ کر سخت بیمار ہو گئیں۔ اور اسی بیماری میں اسی مقام پر ملک بقا کو روانہ ہو گئیں۔ انہیں ابواء میں ہی سپردخاک کر دیا گیا۔ اب صرف اِمِ ایمن باقی رہ گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے اپنی نظروں کے سامنے اپنی والدہ ماجدہ کو دفن ہوتے دیکھا۔ آئینہ دل پر آج سے مکمل یتیمی کی چوٹ ایسی لگی کہ تمام دنیا تاریک ہو گئی۔

مصائب میں مشیت کی دستگیری

مذکورہ المیہ کے بعد اگرچہ جناب عبدالمطلب کی شفقت و محبت میں اور اضافہ ہو گیا۔ مگر پ اور ماں دونوں کی موت کا صدمہ ایسا نہ تھا کہ جلد بھولا جا سکتا۔ لیکن ان مصائب میں اللہ

تعالیٰ نے آپ کی تشفی دل کیلئے جو سامان مہیا فرمایا۔ قرآن مجید میں دو واقعات کا تذکرہ بایں الفاظ ملتا ہے۔

الم یجدک یتیمًا فاوی ووجدک ضالًا فھدی

ترجمہ۔ کیا اللہ نے تمہیں یتیم دیکھ کر اپنی حمایت میں نہ لیا تھا۔ اسی طرح آپ گم نہیں ہو گئے تھے؟ پھر اللہ نے راہ سجھائی۔

ایک اور داغ

ابھی آنحضرت ﷺ اس صدمہ سے نڈھال ہی تھے کہ آپ ﷺ کو ایک اور ناقابلِ تلافی صدمہ سے دوچار ہونا پڑا۔ جناب عبدالمطلب زندگی کی 8ویں منزل تھی کہ اجل نے آن دبوچا۔ اس وقت آنحضرت ﷺ نے گلزارِ حیات کی آٹھویں بہار میں قدم ہی رکھا تھا۔ ماں باپ کا سایہ تو پہلے ہی اٹھ گیا تھا۔ اب جد امجد کی سرپرستی بھی گئی۔ الٰہی یہ کیا ہو رہا ہے۔ اس بے بس یتیم کے سرپرست ذرا ذرا سے وقفے کے بعد کیوں بدلے جا رہے ہیں؟

آپ ﷺ نے اپنی والدہ ماجدہ کو اپنے سامنے دم توڑتے دیکھا۔ اسی طرح شفیق و رفیق دادا کی روح بھی دیکھتے ہی دیکھتے ان کے دامنِ حیات سے ہاتھ جھٹک کر غائب ہو گئی۔

ابھی والدہ کے غم میں آنسو بند نہ ہونے پائے تھے۔ کہ دادا کی مفارقت سے غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ رونے کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ برستی آنکھوں سے دادا کی میت کے ہمراہ چلے اور لحد میں رکھنے تک اس "پیر لاشہ" کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کئے۔ (یہ مصنف کا اپنا تاثر ہے)۔۔۔۔۔۔۔

ابوطالب کی کفالت

جناب عبدالمطلب کی وفات کے بعد آپ ﷺ کی کفالت عبدالمطلب کے صاحبزادے ابوطالب نے اپنے ذمہ لی۔ اگرچہ انہوں نے محمد ﷺ کی ہر ممکن دل جوئی کی لیکن ایسا کوئی لمحہ نہ ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ جناب عبدالمطلب کا ذکر نہ کرتے۔

ابوطالب کی کفالت نہ صرف زمانہ طفولیت تک بلکہ بعثت و تبلیغ کے ابتدائی زمانہ تک رہی۔ یہاں تک ابوطالب بھی قبر میں جا سوئے۔

ابوطالب کے چھوڑ کر جانے سے بنوہاشم کو ایسی کاری ضرب لگی۔ ان کے عزت و وقار کی بہاروں میں خزاں آ گئی۔ اور وہ تمام سہارے ٹوٹ گئے جن پر خاندان اپنا فخر محسوس کر سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عبدالمطلب کے بیٹوں میں نہ تو کسی میں اپنے والد گرامی جیسا حوصلہ تھا۔

نہ ذہانت، نہ سخاوت و بخشش، نہ ہی کسی کا اہلِ عرب پر ان جیسا رعب و دبدبہ۔

عبدالمطلب حاجیوں کو دعوتیں کھلاتے، ان کے پینے میٹھے پانی کا انتظام کرتے، اہلِ مکہ پر ان کی شفقت و محبت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی ان میں سے کسی پر مشکل پڑتی تو یہ ان کیلئے سینہ سپر ہو جاتے۔ مگر ان کے بیٹوں میں سے کوئی بھی ان کے پایہ کا جانشین بن سکا۔ بعض اپنی مفلسی کی وجہ سے بے بس تھے تو بعض دولت کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے میں ان رات غرق تھے۔ ان برادران کی یہی کمزوری دیکھ کر خاندانی حریف بنو امیہ جو مدتوں سے ان کے مناصب پر قبضہ کرنے کی فکر میں تھے حالات نے آج خود ہی ان کی امداد میں ہاتھ بڑھا دیئے اور وہ کسی مزاحمت کے بغیر ہاشمیوں کے اعزازات پر قابض ہو گئے۔ جو مدت سے ان کیلئے وقف تھے۔ صورتحال یہ تھی۔

(1) ابوطالب سب سے چھوٹے تھے۔ مفلوک الحال بھی تھے لیکن اپنے برادر زادے کی کفالت کا بار خندہ پیشانی سے سنبھال لیا۔

(2) حارث سب سے بڑے مگر متوسط الحال تھے۔

(3) عباس صاحبِ ثروت تھے۔ مگر بروقت دولت کی ہوس میں مشغول ہونے کی وجہ سے والد کے مناصب میں سے صرف سقایت (آب شیریں بہم پہنچانا) کا عہدہ قبول کیا۔ مگر رفادت دعوتِ حجاج سے مالی خرچ کی وجہ سے ہاتھ کھینچ لیا۔

(4) ابوطالب غربت کے باوجود عربوں میں انتہائی عزت و احترام سے دیکھے جاتے۔ اسی وجہ سے جناب عبدالمطلب نے نبی ﷺ کی کفالت ان کے ذمہ کر دی۔

ابوطالب نے انتہائی کم مدت میں یہ جان لیا کہ ذہانت، نیکی، شرافتِ نفس اور حسن کردار میں سے کوئی ایسا جوہر نہیں جو آنحضرت ﷺ میں بدرجہ اتم موجود نہ ہو۔ بلکہ ان کی اولاد سے کہیں زیادہ آپ ﷺ کے یہ اوصاف ہی ابوطالب کے دل میں ان کی اہمیت و عزت، محبت و شفقت کے اضافہ کا سبب بنتے گئے۔

ملکِ شام کی طرف پہلا سفر

آپ ﷺ کی عمر اس وقت 12 سال کے قریب ہو گی جب جناب ابی طالب نے تجارت کی غرض سے شام کا سفر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ سفر کی اذیتوں اور صعوبتوں کے پیش نظر ان کو اپنے ساتھ لے جانا پسند نہ کیا۔ لیکن آپ ﷺ نے ان کے تمام خدشات کو غلط ثابت کر دیا۔

عیسائی راہب بحیریٰ سے ملاقات

اس ضمن میں سیرۃ کی کتابوں میں دو روایتیں بیان کی گئی ہیں۔

(1) بصرہ میں راہب موصوف نے دیکھتے ہی کہا کہ آپ ﷺ میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں ——————— جو آنے والے نبی کی ہماری کتاب میں بیان کی گئی ہیں۔

(3) راہب بحیریٰ نے ابی طالب سے باصرار کہا کہ آپ ان کو (نبی اکرم ﷺ) کو شام میں نہ لے جایئے کہیں ایسا نہ ہو کہ یہودی ان میں نبوت کے آثار بھانپ لیں اور ان کے درپے آزار ہوں۔

سفرِ شام اور قدرتی مناظر

اس لمبے اور مہینوں کے سفر میں آپ ﷺ نے صحرا کی بے پایاں وسعتیں دیکھیں۔ مدین شہر دیکھا۔ وادی القریٰ کے بالکل قریب سے گزرے، قومِ ثمود کی تباہ شدہ بستیوں کے عبرتناک کھنڈر دیکھے۔ منزل بمنزل بادیہ نشینوں کی پرلطف بولی "عربی مبین" میں ان کے ماضی و حال کی داستانیں ان کے کانوں میں آویزاں ہوئیں۔ سرزمینِ شام کے گھنے اور میوہ دار باغوں نے طائف کے پربہار باغیچوں کی منزلت تو پہلے ہی سے کم کردی تھی۔ لیکن چمنستانِ شام کے مقابلہ میں مکہ کی وادی (غیر ذی زرع) اس کی خشک اور بے آب و گیاہ پہاڑیاں اور گردوپیش کے لق و دق صحرا جن میں آپ کا منظر نظر آتا تھا۔ انہیں آپ ﷺ کسی مقام پر بھول نہ سکے۔

شام کی مذہبی تقریبات

شام میں آکر آپ نے سب سے پہلے مسیحی پیشواؤں کو دیکھا، آتش پرست زرتشت علماء کے ساتھ ان کے مکالمات سنے۔ بارہ سال کے سن میں روحانی ملکہ، وفورِ ذکاوت، کمال فراست، دقتِ نظر اور قوتِ حفظ ہر ایک صفت اس حد تک پہنچ چکی تھی جو رسالت جیسے اہم منصب کے اہل کے بغیر کسی اور شخص میں جمع نہیں ہو سکتی۔

مراجعتِ مکہ

ابی طالب اس تجارتی سفر سے کچھ مدت بعد واپس آئے تو اس میں ان کو خاص مالی فائدہ حاصل نہ ہوا بلکہ اس کے بعد تجارت کی غرض سے انہوں نے کوئی سفر ہی نہیں کیا۔ مکہ میں رہ کر ہی جو تھوڑی بہت پونجی تھی اسی پر اپنے کثیرالعیال گھرانے کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ اور حضرت محمد ﷺ بھی پوری قناعت کے ساتھ زندگی کے یہ دن گزارتے تھے۔ اس اثناء میں

ابی طالب کی معاونت میں جو کام بھی ان کے قابل ہوتا اسے سرانجام دیتے رہے۔

ماہ ہائے حرم

عربوں میں ۴ مہینے حرمت والے ہوتے ہیں۔ ذی قعدہ' ذوالحجہ' محرم' رجب۔ ان میں کبھی تو سیدنا ابی طالب گھر میں رہتے کبھی ایسا ہوتا کہ شہر سے باہر ان مہینوں میں جو موسمی رونقیں جمتیں ان میں سیرو تفریح کے لئے تشریف لے جاتے۔ اس تفریح میں ان کے تمام عزیزوں کے علاوہ برادر زادہ (ﷺ) کی ذاتِ گرامی بھی اپنے چچا کے ساتھ ہوتی۔ یہ رونقیں بصورت بازار تین مقامات پر جمتیں۔

(1) سوق العکاظ: مقام نخلہ جو شہر طائف کے درمیان میں واقع ہے یہ یکم ذی قعدہ سے لیکر بیسویں ذی قعدہ تک رہتا۔

(2) سوق ذی المجاز: یہ بازار عرفات سے ایک فرسخ اور موضع کبکب کے پڑوس میں جمتا۔

(3) سوق المجنۃ: ان تمام بازاروں کی رونقوں میں مکہ کے قرب و جوار کے مشہور راوی (روایتیں بیان کرنے والے) اپنے اسلاف کے کارناموں کو بیان کرتے اور شعراء اپنا معرکۃ الآراء کلام سناتے جن کا ایک ایک مصرع سننے کے بعد احساسات میں ایک آگ سی سلگ جاتی۔

ان خاموش مجموعوں میں بادیہ نشینوں کی سادہ ترنم کے ساتھ نغموں کی لہریں جب کانوں سے ٹکراتیں تو سننے والوں پر عجیب و غریب کیفیت پیدا ہو جاتی۔

عرب کے شعراء کو اپنی فرضی عشق کی داستانیں مرتب کرنے کا خاص ملکہ تھا۔ وہ اپنے اپنے شاہکار کی نمائش کا بہترین موقع سوق احکاظ' مجنہ اور ذوالمجاز کو سمجھتے جن میں وہ اپنی اپنی مفروضہ محبوبہ کی خودساختہ کہانیاں جھوم جھوم کر سناتے اور سننے والوں کے دل تڑپ تڑپ کر رہ جاتے۔

اسی طرح انہیں اپنی بہادری اور فنونِ جنگ میں مہارت و برتری کو بیان کرنے میں مبالغہ در مبالغہ انتخابِ الفاظ اور فصاحت و بلاغت کی زبان میں یکتا انداز میں پیش کرنے کا ایسا ملکہ حاصل تھا کہ سننے والوں کے مردہ دِلوں میں بھی زندگی کا گرم خون کھولنے لگتا۔ اسی طرح کا انداز (بڑے بول) میں وہ اپنے اسلاف کی محبت' شجاعت' شرافت و نجابت' سخاوت و بخشش کے واقعات بھی بیان کرتے۔ محمد ﷺ ان تمام بازاروں کی رونقوں کے قریب سے گزرتے اور ان محفلوں کی معقول باتوں کو ذہن نشین کر لیتے۔ فاما الزبد فیذھب جفاء اس کے علاوہ جو بیہودگیاں تھیں وہ ویسے ہی آپ ﷺ کے صاف و شفاف دل میں اترنے سے قاصر تھیں۔

ان بازاروں میں یہود و نصاریٰ کے علماء بھی ان بازاروں میں اپنے اپنے مسلک کی تبلیغ کرتے۔ ان خطبوں میں بت پرستی کی مذمت اور تورات و انجیل کی تعلیم پر زور دیا جاتا۔ سیدنا محمد

(ﷺ) یہ خطابات بڑے غور سے سنتے بت پرستی کے مقابلہ میں ان کی تعلیم ان کی نگاہوں میں زیادہ جچتی۔

لیکن آپ کا ذوقِ تجسس و طلب کسی کی تعلیم سے اطمینان حاصل نہ کر سکتا۔ لیکن ان تمام فکری مبادیات نے آپ کی بعثت کی ابتدائی آنجہانی کیفیات کے متحمل ہونے کے قابل بنا دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی رسالت کی تبلیغ کا عہدۂ جلیلہ عطا فرمایا جس کے سبب آپ نے تمام دنیا کو قیامت تک راہِ ہدایت پر چلنے کا پیغام پہنچایا جس طرح محمد ﷺ کو اپنے چچا کے ساتھ عرب کے لق و دق صحرا سے گزرتے ہوئے ان کی بے جا سختیوں سے معاملہ پڑا' اسی طرح آپ ﷺ کو عرب کے بلند ترین شعراء کی شیریں بیانی سے آپ کو اپنی کلفتیں دور کرنے کا موقع بھی میسر آیا۔ یہی نہیں بلکہ یہود و نصاریٰ کے فصیح ترین خطیبوں کے وعظ اور مذاکرات سے بھی آپ ﷺ کے کان ان سے اچھی طرح آشنا ہوئے۔

اسی طرح سنِ رشد کے قریب ہی آپ ﷺ کو ایک جنگ میں بھی شرکت کا موقع ملا۔ جس میں ایک طرف تو آپ کے اجداد قریش تھے اور دوسری طرف دوسرے قبائل۔ اس خونی معرکہ کو تاریخ "حرب الفجار" کا نام دیتی ہے۔ جو ان محترم مہینوں میں شروع ہوئی جن مہینوں میں عرب کے دستور کے مطابق جنگ تو ایک طرف بحث و تکرار بھی حرام تھی۔ انہیں مہینوں میں عکاظ' مجنہ اور ذوالمجاز کے موسمی بازار مکہ سے باہر عرفات و نخلہ کی کھلی فضا اور کھلے میدانوں میں سجتے۔ جن میں ایک طرف الگ سودا سلف کی خرید و فروخت کی سرگرمیاں ہیں تو دوسری طرف شعر و سخن کے ساتھ سخاوت و بخشش کی حکایتیں بیان ہو رہی ہیں۔ دوسرے حلقے میں اپنے اپنے اسلاف کے جنگی کارناموں میں شجاعتِ مبارزت کے فسانے بیان کئے جا رہے ہیں۔ غرض شاعری' تجارت' داستان گوئی' سخاوت و بخشش کی حکایت بیانی ہر بزم میں ہر ایک ایک دوسرے سے بازی لے جانے میں کوشاں ہے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا رہا ہے۔ یہ صفیں اٹھنے کے بعد یہ سب بتوں کا حج ادا کرتے اور اس کے بعد اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے۔

ان میلوں میں سرِفہرست عکاظ کا میلہ ہوتا۔ عرب کے بلند پایہ شعراء اسی میں اپنے قصیدے سناتے اپنے زمانے کا مشہور جادو بیان خطیب قیس بن ساعدہ اپنے سحر آفریں خطبے عکاظ میں سناتا۔ یہود و نصاریٰ اسی بازار میں اپنے اپنے مسلک کی تائید میں آزادانہ بحث و مباحثہ کرتے' اسی بازار میں بتوں کے پجاری اپنے عقائد کے مطابق بتوں کے کمالات و تصریفات پر رنگ چڑھا چڑھا کر انہیں بیان کرتے اور اہلِ کتاب کو مات دینے کی کوشش کرتے اور عکاظ میں یہ سارے اختلافات پر مبنی مباحث اس لئے گوارا کر لئے جاتے تھے کہ ان میں آپس میں لڑائی یا تلخ تکرار حرام تھی۔

حرب الفجار

لیکن براض بن قیس (کنانی) نے حرمت والے مہینے کی حرمت کو نظرانداز کر کے عروہ بن عتبہ ہوازنی کو قتل کر دیا۔ حرب الفجار کا بانی ' نعمان بن منذر والی غسان کی طرف سے ہر سال "مشک" کستوری لے کر عکاظ کے میلے میں شامل ہوتا اور یہاں سے واپسی میں چمڑا' رسی اور یمن کے زربفت کے کپڑے تھان کے تھان خرید کر حیرہ لے جاتا۔ لہٰذا براض بن قیس نے لقمان کی طرف خط بھیجا کہ وہ اس قافلہ کی نگرانی کا قبالہ انہیں لکھ دے۔ اس طرف عروہ بن عتبہ ہوازنی نے امیر غسان سے اس قافلہ پر اپنی نمبرداری جمانے کیلئے لکھا کہ یہ میں اسے نجد کی راہ سے حجاز پہنچا دیا کروں گا۔ نعمان نے براض کی درخواست رد کر دی اور عروہ ہوازنی کو راہداری سونپ دی۔ براض نے اس سے طیش میں آکر عروہ کو اس کی غفلت میں قتل کر دیا۔ اور قافلہ کا تمام سازو سامان اس کے افراد سمیت اپنے قبضہ میں کر لیا۔

براض نے صرف اسی پر بس نہیں کی بلکہ ابو حازم کی زبانی قریشِ مکہ کو مخبری کروا دی تاکہ عروہ کے قبیلۂ والے ہوازن جو اپنے مقتول کا بدلہ لینے کیلئے قریش پر حملہ کرنے والے ہیں ادھر قریش کو یہ خبر پہنچی تو ہوازن کا ایک گروہ قریش پر ٹوٹ پڑا۔ مگر قریش اس مقابلہ کیلئے تیار نہ تھے وہ آنکھ جھپکنے کی مدت میں حدودِ حرم میں داخل ہو گئے۔ ہوازن کا حملہ ناکام رہ گیا۔ لیکن ہوازن لوٹتے ہوئے قریش کو اگلے سال عکاظ کے موقع پر جنگ کی دھمکی دے گئے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ لڑائی تقریباً چار سال تک مسلسل ایامِ حرب میں جاری رہی لیکن آخر کار خانہ بدوش قبائل کی پیش کردہ ان شرائط پہ ختم ہوئی۔

(1) فریقین کے مقتولین کی برابر تعداد میں زائد کو نکال کر ان قتل ہونے والوں کی دیت فریق قاتل کو ادا کرنا ہو گی۔

(2) شمار کرنے کے بعد ہوازن کے مقتول بیس کی تعداد تک زیادہ تھے۔ قریش نے ان کی دیت ادا کر دی مگر آج سے ہر امن شقاوت و بدبختی کی علامت بن گیا اور قریش کے حریفوں کے تاجرانہ رویہ کی وجہ سے اس لڑائی کا نام حرب الفجار رکھا گیا۔

حرب الفجار میں نبی اکرم ﷺ کا سن مبارک

اس جنگ میں آپ کی عمر مبارک دس کی تھی۔ یا بیس کی؟ اس میں دو رائے ہیں۔ تاریخ قطعیت کے ساتھ ایک رائے قائم کرنے میں قطعاً ناکام ہے۔ لیکن میرے خیال میں (مصنف) پندرہ اور بیس سال دونوں میں صورت تطبیق یہ ہو سکتی ہے کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو آپ کا سن دس سال تھا اور جب جنگ چار سال بعد ختم ہوئی تو آپ کا سن مبارک 14 سال تھا۔

حرب الفجار میں نبی اکرم ﷺ کا سن مبارک

اس جنگ میں آپ کی عمر مبارک دس کی تھی۔ ابلیس کی؟ اس میں دو رائے ہیں۔ تاریخ قطعیت کے ساتھ ایک رائے قائم کرنے میں قطعاً ناکام ہے۔ لیکن میرے خیال میں (مصنف) پندرہ اور بیس سال دونوں میں صورت تطبیق یہ ہو سکتی ہے کہ جب لڑائی شروع ہوئی تو آپ کا سن دس سال تھا اور جب جنگ چار سال بعد ختم ہوئی تو آپ کا سن مبارک 14 سال تھا۔

جنگ میں شرکت

آپ ﷺ نے عملاً جنگ میں شرکت فرمائی یا نہیں۔ اس میں بھی دو رائے ہیں۔
(1) ہوازنیوں سے جو تیر آتے تھے۔ آپ انہیں صرف چن چن کر اپنے بزرگوں کے حوالے کرتے تھے' تاکہ وہ ان تیروں کو ہوازن کے سینوں میں پیوست کر سکیں۔
(2) آپ نے خود بھی ہوازن پر تیر برسائے۔

ان دونوں صورتوں میں صورتِ تعلق یہ ہے کہ آپ جنگ کے آغاز میں سن بلوغت میں کمی کی وجہ سے جنگ میں عملاً حصہ نہ لے سکے صرف تیر جمع کر کے بزرگوں کے حوالے کرتے رہے۔ مگر جنگ کے آخری سال میں جو تقریباً ۴ سال مسلسل جاری رہی پختہ عمر کو پہنچنے کے سبب خود بھی لڑائی میں عملاً حصہ لینے لگے جیسا کہ حرب الفجار کے تذکرہ میں رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔

قد حضرته مع عمومتی و رمیت فیه باسهم وما احب انی لم اکن فعلت

"میں خود بھی اپنے عم ہائے بزرگوار کے ساتھ حربِ الفجار میں شامل تھا اور میں نے اپنے ہاتھوں سے دشمنوں پر تیر برسائے اور مجھے اس پر کوئی پچھتاوا نہیں"

حلف الفضول

قریش نے حربِ فجار سے فارغ ہونے کے بعد اپنا اجتماعی جائزہ لیا تو خاندان کے بعض افراد میں ہوسِ جاہ و منصب کا جنون نظر آیا تو سب کے سب اسے قوم کے زوال کی اولین علامت سمجھ کر دل گرفتہ ہو گئے۔ قریش میں یہ بدذوقی ہاشم اور عبدالمطلب کی وفات کے بعد پیدا ہوئی۔ انہیں محسوس ہوا کہ اغیار بھی بری طرح مکہ معظمہ پر نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ ایک دن عبدالمطلب کے صاحبزادے زبیر کی تحریک پر تمام قریش جمع ہوئے۔ اس اجتماع میں بنو ہاشم' بنو زہرہ' بنو تیم قریش کی سبھی شاخیں شامل ہوئیں۔ یہ نشست عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ہوئی تناولِ طعام کے بعد سب نے بیک زبان عہد کیا کہ "ہم ہر مظلوم کی اس وقت تک مدد

کریں گے جب تک اسے اپنا حق نہ مل جائے"

اس عہد میں نبی اکرم ﷺ بھی شریک تھے۔ جیسا کہ آپ ﷺ نے اپنے عہدِ رسالت میں اس کے بارہ میں بھی فرمایا۔

ما احب ان لی یحلف حضرته فی دار ابن جدعان حمر النعم و لو عیت لاجبت۔

میں ابن جدعان کے ہاں جس معاہدہ میں شامل تھا اگر اس میں شرکت سے منع کرنے میں مجھے سرخ اونٹوں کا ریوڑ بھی دیا جاتا تو اسے قبول نہ کرتا۔ آج بھی اسی قسم کے معاہدہ کی مجلس ہو اور اس میں مجھے بلایا جائے تو میں اس میں شرکت کی دعوت قبول کرنے میں تامل نہیں کروں گا۔

اس دور کے مشاغل

حرب الفجار کی چار سالہ لڑائی میں چند دنوں میں جنگ کرنے کے بعد اور پہلے سب کا مشغلہ، شراب نوشی، تجارت، سودی کاروبار اور عیش و آرام کی محفلیں گرم کرنا رہتا۔ بقول شخصے

بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس ماحول میں رہنے کی وجہ سے محمد ﷺ بھی ایسی ہی دنیاوی لذات و خرافات میں شریک رہے یا اپنے عم بزرگوار ابو طالب کے زیر سایہ غریبانہ زندگی بسر کرنے کی وجہ سے نگاہِ حسرت سے یہ سب کچھ دور ہی سے دیکھتے رہتے! (نعوذ باللہ) نبی اکرم ﷺ اسی شہرِ مکہ اور انہیں میں رہنے کے باوجود ان مشاغل سے بخوشی و رضا دور تھے۔ وہ ان لوگوں کے علم و دانش کدہ سے بالکل مختلف اور اعلیٰ ترین علم و حکمت کی جستجو میں ایسے ڈوبے رہتے کہ کسی اور طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔

آپ ﷺ میں فطرتاً طبعاً وضع داری اور سلیقہ مندی تھی جس میں قریش کے ذی شعور انسانوں کی تربیت نے اور چمک دمک پیدا کر دی تھی۔

یہ آپ ﷺ کی زندگی کا وہ حصہ ہے جس کی گواہی میں تاریخ کے کئی اوراق موجود ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ آپ ﷺ کو سامانِ تعیش حاصل کرنے میں غریبی یا مفلوک الحالی مانع نہ تھی۔ مکہ میں بے شمار ایسے مفلوک الحال تھے جو سامانِ تعیش کی فراہمی کا سامان کسی نہ کسی طرح پیدا کر ہی لیتے اور ایسے غریب و نادار بھی تھے جو اپنی دانشوری اور ذہانت سے متمول قریش سے زیادہ دادِ عیش دینے میں اپنا جواب آپ تھے۔

جناب محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس عظمت و شرافت کا وہ بے مثال نمونہ تھا جس نے بعد

میں ایسا ناقابلِ زوال اور ممتاز مقام حاصل کر لیا جس کا پرتو آج تک ساری دنیا کو نظر آتا ہے۔

حضرت محمد ﷺ اپنی ذاتی عظمتِ نفس کی تاثیر کے سبب اہلِ مکہ کے تمام غیر اخلاقی مشاغل سے دور رہتے۔ اور اپنی تمام تر توجہ مظاہرِ کائنات کے پسِ پردہ قوت کو سمجھنے کی کوشش میں ہر لحہ محوِ تدبّر و تفکّر رہتے۔

یہی وہ اسباب تھے جن کی بناء پر بچپن میں ہی آپ کی صیانت و مردانگی اور امانت و دیانت کے جوہر آپ کی ذاتِ اقدس میں پرورش پاتے رہے۔ جنہیں اہلِ مکہ نے دیکھا، تسلیم کیا اور بے ساختہ پکارا "آپ ﷺ امین ہیں"

بحیثیتِ داعی

جن مشاغل میں آپ کے غور و تدبر نے تقویتِ حق حاصل کی ان میں ایک "چرواہا" پن بھی تھا جس سے آپ ﷺ کو سنِ بلوغت کے آغاز میں پالا پڑا۔

قریش اور دوسرے اہلِ مکہ کی بکریاں مزدوری پر چرائیں اور عہدِ رسالت میں اپنے اسی شغل کی اہمیت کی وضاحت میں فرمایا۔

مابعث اللہ نبیا الا راعی غنم بعث موسیٰ و هو راعی غنم بعث داؤد و هو راعی غنم و بعثت و انا ارعی غنم باجیاد

اللہ تعالیٰ نے جس کو نبوت کے منصب سے سرفراز فرمایا اس نے بکریاں ضرور چرائیں۔ حضرت موسیٰ اور داؤد علیہ السلام نے یہ کام کیا۔ میں بھی اپنے خاندان کی بکریوں کے ریوڑ کو مکہ معظمہ کی اجیاد نامی پہاڑی پر چراتا رہا۔

گلہ بانی ہی سہی، دل زندہ ہے، حساس ہے تو اس مشغلہ میں بھی مظاہرِ فطرت پر غور و تدبر، قدرت کے مختلف النوع پوشیدہ راز سے شعور آگاہ ہو سکتا ہے۔ دل لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ آبادی سے دور روزِ روشن میں کھلی فضا اور رات اس گنبد نیلگوں پر ستاروں کی تابانی جن کی ہر ایک کرن بزبانِ حال کہتی سنائی دیتی ہے۔ کہ ان حسین و جمیل حیران کن مظاہر کے پس پردہ کوئی ہے تنہا۔۔۔ بالکل وحدہ لاشریک!

یہ ظاہری نقوش تخلیقِ عالم کی تہ تک پہنچنے کا بہترین ذریعہ ہیں۔ ہر ذی الحس دانشور ایسی فضا میں رہ کر آسانی سے اس نتیجہ پہ پہنچ سکتا ہے کہ ان مظاہر اور اس کی اپنی ذات ایسا ہی ربط ہے جیسے کہ دوسرے عجائباتِ عالم کا اس سے ربط ہے۔ اسے محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کے اپنے وجود کی بقا اور سانس کا آنا جانا اس سے ایسا ہی تعلق رکھتا ہے۔ جیسے سانس رک جائے تو اس کی زندگی کا تمام نظام درہم برہم ہو جائے۔

ایک سوال

کیا کھلی فضاؤں میں چلتے پھرتے دن میں آفتاب کی روشنی اور رات کے وقت ماہِ تاباں کے نور کا پھیلاؤ، کسی ان دیکھی قوت کو سمجھنے کی رفعت سے آشنا نہیں کر سکتا؟ یہ وسیع فلک اور اس کے نیچے دوسرے مظاہر جو ہروقت اس چرواہے کی نظروں کے سامنے اپنے اپنے فرائض کی تکمیل میں مصروف ہیں اور ہر ایک کا ایک دوسرے ساتھ کبھی نہ ٹوٹنے والا ربط موجود ہے کہ

لاالشمس ینبغی لھاان تدرک القمر ولا الیل سابق النھار(40:36)

آفتاب چاند کی گردش میں حائل نہیں ہو سکتا۔ نہ رات دن پر غالب آ سکتی ہے۔

اور جس طرح بکریوں کا یہ ریوڑ آنحضرت ﷺ کی نگہبانی کا محتاج ہے کہ کس ایسا نہ ہو کہ کسی بکری کو کوئی بھیڑیا کھا جائے یا صحرا میں گم ہو جائے اسی طرح آپ ﷺ اس تصور میں ڈوب جاتے کہ اتنے بڑے عالم کی چوبانی (نگہبان) کیلئے کوئی طاقت تو ضرور ہے جو رات کو دن اور دن کو رات سے اور چاند کو اور سورج کو آپس میں ٹکرانے نہیں دیتی۔

اب آپ ہی غور کیجئے۔ جس شخصیت نے ان مظاہر کے قیام اور ان کے باہم ربط پر کسی ماورا ہستی کے اختیار و قدرت کی طرف اپنی تمام تر توجہ مبذول کر دی ہو۔ اپنے غور و تدبر اور قوتِ فکر و خیال کو اس عمل کیلئے وقف کر دیا ہو، اسے گھٹیا خواہشوں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت کہاں؟ اس کے کمال ذوق و تجسّس کو دنیاوی لذتوں کی خواہشوں سے کیا واسطہ؟

آپ ﷺ میں مذکورہ صفاتِ اعلیٰ نے آپ کے نام (محمد ﷺ) اور کردار کو ایک دوسرے سے ایسا وابستہ کر دیا تھا کہ اہلِ مکہ جب بھی آپ کو اس نام سے پکارتے تو ان کے ذہن میں مذکورہ تمام صفات کو تسلیم کرتے ہوئے ایک لفظ ہمیشہ مربوط ہوتا اور وہ تھا امین۔ گویا آپ کی ذاتِ اقدس ﷺ صداقت و امانت کی علامت تھی۔

اپنی عہدِ چوپانی کا ایک واقعہ عہد رسالت میں بیان فرمایا۔ جس میں ایک رات آپ نے اپنی رات شہر (مکہ) میں گزارنے کا فیصلہ فرمایا تاکہ شہر کے ہنگاموں سے لطف اندوز ہوں۔ بکریوں کا ریوڑ ایک دوسرے چرواہے کے سپرد کیا اور خود تشریف لائے تو بستی میں قدم رکھتے ہی ایک مقام پر جشنِ شاعری منایا جا رہا تھا۔ وہاں رکے تو دفعتاً نیند غالب آ گئی۔ اسی جگہ محوِ استراحت ہو گئے اور کچھ بھی دیکھ سن نہ پائے۔ دوسری رات پھر شہر میں تشریف لائے تو اس میں موسیقی کی ایک محفل بپا تھی۔ خوش آواز حسین گانے والیوں پر ملاء اعلیٰ کی راگنی کا گمان ہوتا تھا مگر اس موقع پر بھی نیند کے جھونکے آنے لگے اور وہیں آرام فرما ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ مکہ کے جشنِ عروسی یا رقص و سرود کی محفلیں آپ ﷺ کے پاکیزہ جذبوں کو کیسے متاثر کر سکتی تھیں جبکہ کم درجہ کے اشخاص بھی اس قسم کی زہر شکن خرافات سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس بناء پر آپ جیسے پاک و مطہر نفس کا مزاج ان سے کیسے موافقت کر سکتا تھا۔ اپنے انہیں پاک و مطہر جذبوں کے ساتھ آپ ﷺ تمام ہنگاموں سے دور اپنی قوت و تدبر کو صرف ایک ہی مصرفِ اعلیٰ کی طرف منہمک رکھتے۔

ذرا گلہ بانی کی اجرت کا اندازہ کیجئے۔ مادی طور پہ اس کی اہمیت کیا ہے' اس سے آمدن کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ آپ کی قناعت کی بے مثال سنت ہے۔ آپ ﷺ دنیا کے سامانِ تعیش سے لاتعلق رہے۔ اس لئے دولت مندی یا غریبی کی کشمکش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب آپ ﷺ زندہ رہے مایحتاج کے سوا دولت سے کنارہ کش رہے۔ عہد رسالت میں ایک مرتبہ فرمایا۔

نحن قوم لا ناکل حتیٰ نجوع واذا کلت لا نشبع

"ہمارا تعلق اس طبقہ سے ہے جو بھوک سے پہلے کھانے پر ہاتھ نہیں ڈالتے اور کبھی شکم سیر ہو کر نہیں اٹھتے۔"

یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ آپ ﷺ نے خود بھی تمام عمر سختیاں جھیلیں' مصیبتیں سہیں اور دوسروں کو بھی تحفظ حق کیلئے ایسی ہی زندگی گزارنے کی تلقین فرمائی۔ اس کے برعکس انسان اپنی نفسانی خواہشوں کی تکمیل کیلئے دولت و ثروت حاصل کرنے کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ ایسی خواہشوں کی طرف کبھی نبی اکرم ﷺ نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا تھا جو شخص مظاہر عالم کے حسن کا فدائی ہو اور اس کے پس منظر پر غور و تدبر کرنے کا خوگر ہو۔ جس سے عام لوگ محروم ہیں۔ اس کی نظر نہ ہی حسن کے نظاروں کیلئے رک سکتی ہے اور نہ ہی وہ اس قسم کے جمال سے تسکین حاصل کرنے کیلئے حصولِ دولت و ثروت پر غور کر سکتا ہے۔ اس کی لذت' اس کی دولت' اس کی ذات کا فخر اور شان اسی میں ہے کہ اس قسم کی تمام عارضی رعنائیوں سے آنکھ بند کر کے آگے بڑھ جائے۔

آپ ﷺ کو مصائب و آلام میں لذت محسوس ہوئی۔ جنہیں وہ اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ سوچئے جب اپنی والدہ ماجدہ کی زبان سے اپنے مہربان باپ کی وفات کا مرثیہ سنا ہو گا اس وقت آپ کے دل پر کیا بیتی ہو گی۔ مگر جب والدِ گرامی کی مفارقت میں صبر و رضا کی بدولت آپ کے نفس نے طمانیت و سکون کو اپنا لیا تو ابھی باپ کی وفات کے سانحہ کا حرفِ آخر والدہ کی زبان پر تھا کہ والدہ ماجدہ کی شمعِ حیات کو موت کا جھونکا بجھا دیتا ہے۔ ایسے میں آپ ﷺ کیسے صدمہ سے دوچار ہوئے ہوں گے۔ اس المیہ کے بعد ہی جناب عبدالمطلب جنہوں نے

آپ کی کفالت کا ذمہ لیا تھا تھوڑے ہی وقفہ کے بعد قبر میں جا سوئے۔

ان تمام مصائب، سانحات اور المیوں نے آپ کی روح کو کس قدر بالیدگی بخشی اور دنیا کے تمام لذائذ سے طبیعت کو کتنی بیزاری دی کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ تمام حوادث نے آپ کا مزاج اس طرح بنا دیا کہ مال و ثروت کی اہمیت نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئی۔ اور ان حضرات کی طرح اپنے نفس کی نگہبانی و تربیت میں مصروف ہو گئے جو آپ ﷺ سے پہلے اس معاملہ میں دنیا کو حیرت میں ڈال چکے تھے۔ وہ لوگ جو دنیا کے انمول خزانے صرف اپنے نفس میں جمع کیے ہوئے رہتے ہیں۔

شغلِ تجارت

آپ کے چچا ابو طالب کثیر العیال اور قلیل المال تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ بھتیجا جوان ہو گیا ہے اور ہر قسم کی صلاحیتِ ارفع و اعلیٰ ہدایت و سیادت بھی اس میں موجود ہے گلہ بانی سے اتنی آمدنی نہیں ہوتی کہ گزر اوقات ہو سکے لہٰذا انہیں کسی ایسے کام میں لگایا جائے جس سے متعلقین کی روزی کا مناسب گزارہ ہو سکے۔

خویلد کی بیٹی ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا

اس زمانہ میں آپ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا قریش کے بعض اشخاص کو وکیل تجارت کے طور پر سوداگری کے لئے باہر کے ملکوں میں بھیجتی تھیں۔ شرافت و ثروت کی مالک تھیں۔ خاندانی تعلق قبیلہ اسد (قریش) سے تھا۔ وہ یکے بعد دیگرے دو مردوں کے گھر کی زینت بن چکی تھیں دونوں سے زندگی نے وفا نہ کی۔ دونوں قبیلہ مخزوم میں سے تھے۔ جن کے ترکہ سے ام المومنین رضی اللہ عنہا کو کافی مال حاصل ہوا۔ انہوں نے اپنے والد محترم اور دوسرے قابلِ اعتماد قریش کے ساتھ تجارت شروع کر دی۔ اس اثناء میں کئی اکابر قریش نے آپ سے شادی کی درخواست کی مگر آپ نے انکار کرتے ہوئے کہا۔ ان سب کی نظر میرے مال پر ہے حتیٰ کہ سیدہ نے اپنی تمام تر توجہ تجارت پر مرکوز کر دی۔

حضرت ابو طالب نے سنا کہ سیدہ خدیجہ کچھ لوگوں کو مزدوری پر مال دے کر شام کی طرف بھیج رہی ہیں تو نبی ﷺ سے کہا۔ میرے معزز بھتیجے۔ میری تنگ دستی اور حالات کی ناساعدت کا تمہیں علم ہے۔ بی بی خدیجہ نے ہر مزدور کی مزدوری دو دو بار اونٹ مقرر کی ہے۔ اگر تم بھی یہ کام پسند کر لو تو میں بی بی خدیجہ سے بات کروں لیکن ہم اتنے معاوضہ پر معاملہ نہیں کریں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ عم بزرگوار آپ مختار ہیں۔ مجھے کام کرنے میں کوئی عذر نہیں۔

ابو طالب بی بی خدیجہ کے ہاں تشریف لائے ماجرا بیان کیا اور فرمایا ہم دو اونٹوں پر مزدوری نہیں کر سکتے۔ اگر تم میرے بھتیجے کے لیئے چار اونٹ مقرر کر دو تو وہ بھی چلے جائیں گے۔ سیدہ خدیجہ نے کہا۔ اگر آپ کسی ایسے شخص کے لیئے فرماتے جو میرا دشمن اور قبیلہ غیر سے ہوتا تو بھی میں تعمیلِ حکم سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ یہ تو ہمارے ہی قبیلہ کے فرد ہیں اور تمام خاندان کے نزدیک پسندیدہ۔

ابو طالب نے تمام واقعہ گھر آکر آپ ﷺ سے بیان کیا تو آپ نے فرمایا آپ کو یہ ذریعۂ رزق اللہ تعالیٰ کی عنایت سے حاصل ہوا ہے۔

روانگئ سفر

اس سفر میں سیدہ خدیجہ نے اپنے غلام میسرہ کو آپؐ کے ہمراہ کر دیا۔ جناب ابو طالب نے آپؐ کے متعلق ضروری ہدایت میسرہ کے ذہن نشین کرا دیں۔ اور قافلہ انہی راہوں پر چل دیا۔ جن راہوں سے 12 سال کی عمر میں آپ ﷺ گزرے تھے۔ وہی صحرائے شام' وادی القریٰ' مدین اور قومِ ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات' ماضی کے تمام نقوش آپ ﷺ کے ذہن میں منقش تھے۔ جو قدم قدم پر آپؐ کے ساتھ چلے۔ اسی طرح یادوں میں وادی مکہ کے موسمی میلے' بازار عکاظ' ذوالمجاز' مجنہ کے ہنگامے' شعرو سخن کی محفلیں' اہلِ کتاب اور بت پرستوں کے اپدیش' اہلِ مکہ و اہالیانِ شام کے عقائدو عبادات میں اختلاف' مذاق و مزاج میں تفاوت' غرض اب تک یہاں اور وہاں جو کچھ دیکھا اور سنا ذہن میں گردش کرتا گیا۔ (یہ سب مصنف کا مفروضہ ہے) بصریٰ میں تشریف لائے تو نصاریٰ کو قریب سے دیکھا۔ ان کے رہبان و علماء سے باتیں ہوئیں۔ آتش پرستوں کے ایک راہب سے بھی گفتگو کا اتفاق ہوا۔ اس سفر میں مناظرہ کی ایک روایت مشہور ہے۔ شاید اس مجوسی راہب سے ہوئی۔ بعض کے نزدیک آپ کا یہ مبارزہ ایک مسیحی عالم کے ساتھ تھا۔ وہ نصاریٰ جنکی وحدت کئی فرقوں میں بٹ چکی تھی۔

منافعِ تجارت

اس سفر میں آپ نے تین قسم کے منافعات حاصل کیئے۔

(1) مالی منفعت اس قدر زیادہ حاصل ہوئی کہ سیدہ خدیجہ کے سابقہ اور اس سال کے وکلاء نے تجارت میں اس قدر منافع کبھی نہ کمایا۔

(2) خدمت گزار میسرہ سے آپ ﷺ کا حسنِ سلوک' محبت اور لطف و مہربانی کا لازوال تاثر۔

(3) سفر سے واپسی پر مالی فائدہ کی کثرت دیکھ کر آپ ﷺ کی شخصیت پر سیدہ خدیجہ کی

زیادہ توجہ مرکوز نہ ہو گئی۔

مراجعت مکہ

اس سفر سے مکہ معظمہ کی طرف لوٹے اور جب شہر کے قریب مرالظہران پر سواری پہنچی تو میسرہ نے مشورہ دیا اے گرامی قدر جہاں تک ہو سکے جلد سیدہ خدیجہ سے کاروبار میں منافع کا تذکرہ کیجئے۔ وہ اس کیلئے راہ تک رہی ہوں گی۔

جناب محمد ﷺ میسرہ کے اس مشورہ پر دوپہر کی شدت میں سیدہ کے ہاں روانہ ہوئے۔ وہ خود بھی قافلے کے انتظار میں بالاخانہ کے دریچہ میں بیٹھی تھیں۔ سیدنا محمد ﷺ کو شتر پر سوار انہیں کی طرف آتے دیکھا تو دروازے پر آ کر استقبال کیا۔ بی بی اپنے مال میں نفع کی بات چیت سننے کیلئے بے قرار تھیں۔ جسے آپ ﷺ نے اپنی روداد سفر اور شام کے واقعات و اتفاقات کو بڑی فصیح و بلیغ زبان میں بیان فرمایا۔ ممدوحہ پوری توجہ اور سکوت کے ساتھ سنتی رہیں۔ اتنے میں میسرہ بھی آ گئے جنہوں نے اپنے مخدوم کے حسنِ اخلاق، کمال اوراک اور تجارتی معاملات میں بہترین رویوں کی تفصیل سنائی جس کی وجہ سے سیدہ خدیجہ پہلی ہی بار آپ ﷺ کی اعلیٰ شخصیت سے متاثر ہو گئیں۔

عقد و مناکحت

سیدہ خدیجہ نے اپنے وکیلِ تجارت، مکہ کے نوجوان، شریف زادے میں صلح و فراست شرافت و نجابت کے جوہر گراں بہا پائے، دل میں فیصلہ کیا جسے وہ تین ماہ تک زبان پر نہ لا سکیں۔ اس وقت سیدہ خدیجہ نے زندگی کے چالیسویں سال میں قدم رکھا تھا۔ جب ان کے دوسرے شوہر آغوشِ قبر میں آرام فرما ہو گئے۔ قریش ہی میں سے کئی معزز افراد کی درخواست ٹھکرا چکی تھیں لیکن اب انہوں نے التوائے عقد مناسب نہ سمجھا۔ اور اپنی ہمشیرہ یا بروایتِ دیگر ایک منہ بولی بہن نفیسہ سے اپنا ارادہ ظاہر فرما دیا۔ وہ ان کا پیغامِ عقد لے کر حضرت محمد ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا۔ آپ کو نکاح کر لینے میں کیا مانع ہے۔

فرمایا: تنگ دستی۔

نفیسہ: اگر آپ ایسی شریف زادی کی درخواست قبول کر لیں جو اس قسم کے اخراجات کی کفالت خود کر سکے؟

فرمایا: وہ کون بی بی ہے؟

نفیسہ: صرف ایک لفظ میں "خدیجہ"

فرمایا: وہ میرے ساتھ کیوں عقد کرنے لگیں۔

چہ جائے کہ آپ بھی دل سے خواہشمند تھے۔ مگر خطبہ کی سبقت اس لئے نہ کر سکے کہ جناب خدیجہ رضی اللہ عنہا کئی اشرافِ قریش کے پیغام رد کر چکی تھیں۔ بی بی نفیسہ نے آپؐ کے اس ارشاد پر عرض کیا۔ ان کی طرف سے میں ذمہ داری لیتی ہوں اور آپؐ نے منظور فرما لیا۔

سیدہ خدیجہ نے اپنے خاندان کو دعوت بھیج کر جمع کیا اور ان کے عم بزرگوار عمرو بن اسد نے ولی کے فرائض انجام دیئے۔

سیدہ خدیجہ کے والدِ بزرگوار خویلد بن اسد حرب الفجار میں انتقال کر چکے تھے۔ جن کے بارے میں کذب پیشہ راوی یہ کہتے ہیں کہ خویلد زندہ تھے مگر وہ اس پر ناخوش تھے اور انہوں نے شراب سے ہلاکت پائی۔ الٰہی یہ افترا

اس عقد کے بعد جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے۔ تو وہ کبھی صلبی اولاد کو گود میں لے کر باپ ہونے کے تصور سے لطف اندوز ہوتے اور کبھی اپنی گود میں کھیلے ہوئے لختِ جگر کو اپنے سامنے موت کے چنگل میں گرفتار دیکھ کر بچشمِ پرنم آسمان کی طرف دیکھتے۔

بعثت سے عمر رضی اللہ عنہ کے مشرف باسلام ہونے تک

بعثت سے عمر رضی اللہ عنہ کے مشرف باسلام ہونے تک

منصبِ رسالت کے اعلیٰ ترین اعزاز سے عمر رضی اللہ عنہ کے مشرف باسلام ہونے تک سیدِ کل عالم محمد رسول اللہ اس وقت خوابِ استراحت میں تھے اور پاس ہی تشریف فرما ام المومنین کی احترام و محبت سے بھرپور نگاہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ اقدس کو اپنی پتلیوں میں سمیٹے ہوئے تھیں۔ کچھ دیر کے بعد آپ رضی اللہ عنہا کے تصور میں آنے والا وہ زمانہ ابھرا جس میں اپنے شوہر بلند مرتبہ (علیہ التحیتہ والسلام) کو عرب و عجم کے رسول محتشم علیہ الصلوٰۃ و اسلام کی صورت اپنی تابانیوں کے ساتھ جلوہ افروز دیکھا۔ نگاہِ تصور نے یہ بھی دیکھا۔ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم راہِ حق سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو صراطِ مستقیم کی طرف آنے کی پرزور دعوت دے رہے ہیں۔ اچانک دل میں خوف نے سر اٹھایا اور کہا۔ اللہ نہ کرے کہیں اس دعوت کے عظیم کام کی وجہ سے ناقابلِ برداشت مصیبتوں میں گھر جائیں ؟

اس کے ساتھ ہی ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اس حسین و جمیل فرشتے (علیہ السلام) کو بھی اپنے تصور میں دیکھا۔ جن کے نزول کا واقعہ بیان فرماتے ہوئے نبی کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا تھا کہ اس عظیم تر فرشتے (وحی) علیہ السلام کے وجودِ پُر عظمت کا یہ حال تھا کہ "میری نگاہ جس طرف اٹھتی وہی دکھائی دیتا"

اسی لمحہ آپ رضی اللہ عنہا کے کانوں میں وحی محترم علیہ السلام کی زبان سے نکلے ہوئے وہ کلمات بھی گونجے جنہیں اس عظیم المرتبہ فرشتے (وحی) علیہ السلام نے آپ کے رفیقِ زندگی کے دل پر نقش فرما دیا تھا۔

اقراء باسم ربک الذی خلق ○ خلق الانسان من علق ○ اقراء وربک الاکرم ○ الذی علم بالقلم ○

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے سارے عالم کو پیدا کیا۔ جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے پیدا کیا۔ پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے۔ جس نے قلم کے ذریعہ سے علم سکھایا۔

خوف و امید کے اس (نفسیاتی) تلاطم میں کبھی تو وہ اپنے شوہر محترم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی کامیابیوں کے تصور سے مسرور ہوتیں اور کبھی خطروں میں گھر جانے کے خوف سے پریشان ہو جاتیں لیکن آخر کار انہوں نے اپنی ان نفسیاتی کیفیات اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نزولِ وحی کے

واقعات کو کسی حکیم یا دانشمند کے سامنے بیان کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

(ام المومنین خدیجہ الکبریٰ اور رسول رحمت ﷺ کی تنہائیوں میں ان کی سوچ کی ترجمانی کرنا مولف کی نازیبا جرات ہے) (مترجم)

ایک عظیم دانشمند کی خدمت میں

ام المومنین رضی اللہ عنہا اپنے وقت کے عظیم دانشور اور عالم و فاضل چچا زاد بھائی ورقہ بن نوفل کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

ورقہ بن نوفل کچھ مدت پہلے بت پرستی چھوڑ کر نصرانی مذہب اختیار کر چکے تھے۔ عبرانی اور عربی زبان پر عبور ہونے کی وجہ سے آج کل انجیل کا عبرانی زبان سے عربی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ان کے سامنے پوری روداد وحی بیان فرمائی۔ غار حرا کا واقعہ' وحی مکرم علیہ السلام کا گلے لگانا' نبی اکرم ﷺ کا سوال جواب! غرض وحی کے نازل ہونے اور رسول اللہ ﷺ پر ردِ عمل کے بارے میں جو کچھ بھی آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سنا تھا' سب بیان کر دیا۔ اس کے بعد وہ اپنے دل میں امید و خوف کے تلاطم کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکیں۔

ورقہ بن نوفل سب کچھ تفصیل سننے کے بعد کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

قدوس! قدوس! والذی نفس بیده لئن کنت صدقتنی باخدیجه لقد النامو س الاکبر الذی کان یاتی موسیٰ وانه لبنی هذه الامته فقولی قلیثبت!

پاک ہے اللہ عزوجل اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اے خدیجہ اگر یہ سب سچ ہے جو تم نے کہا ہے تو یہ وہی "ناموس اکبر" ہے۔ یعنی وہی فرشتہ مکرم علیہ السلام ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوا تھا۔

اے خدیجہ آپ کے شوہر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اس امت کے نبی ہوں گے ۔ ان سے میری طرف سے عرض کر دیجئے کہ مصائب میں ثابت قدم رہیں۔ ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ گھر واپس تشریف لے آئیں۔ آنحضرت ﷺ تاحال محوِ خواب تھے۔ آپ کے چہرہ اقدس پر سیدہ رضی اللہ عنہا نے ابھی ایک لمحہ نظر بھر کر دیکھا ہی تھا کہ آنحضرت ﷺ کے جسدِ مبارک پر کپکپی سی طاری ہو گئی۔ پیشانی سے پسینے کے قطرے ٹپکنے لگے اور پھر اچانک جاگ اٹھے۔

گویا یہ نزولِ وحی مکرم علیہا لسلام کا رد عمل تھا۔ اس بار فرشتہ مکرم علیہ السّلام نے مندرجہ ذیل

آیات پڑھیں اور یاد کرائیں۔

یا ایھا المدثر ہ قم فانذر ○ وربک فکبر ○ وثیابک فطھر ○ والرجز فاھجر ○ ولا تمنن تستکثر ○ ولربک فاصبر ○ (۷۴: ۱-۷)

○ اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چادر اوڑھ کر سونے والے

○ اٹھو اور ہدایت کرو۔ (لوگوں کو عذاب آخرت سے ڈراؤ)

○ اور اپنے پروردگار کی بڑائی بیان کرو

○ اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور خود کو ہر برائی سے دور رکھو۔

○ اور اس نیت سے کسی پر احسان نہ کرو اس سے زیادہ کے طالب ہو۔

○ اور اپنے پروردگار کے لئے صبر کرو۔

عورتوں میں سے تصدیقِ رسالت کا سب سے پہلا اعزاز

سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اپنی آنکھوں سے اس روشن سچائی کو دیکھ رہی تھیں۔ انہوں آنحضرت کو حوصلہ افزا محبت بھرے لہجہ میں عرض کیا۔ کچھ دیر اور سو جائیے تاکہ پوری طرح آرام حاصل ہو۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا۔

انقضی یا خدیجہ عھد النوم والراحہ فقد امرنی جبریل ان انذر الناس وادعوھم الی اللہ والی عبادتہ فماذا ومن ذا یستجیب لی

ترجمہ۔ یہ نیند اور آرام کا زمانہ ختم ہوا جبریل (علیہ اسلام) نے مجھے اللہ عز وجل کا پیغام دیتے ہوئے کہا ہے۔

کہ اللہ جل شانہ کا حکم ہے۔ کہ میں لوگوں کو اس وحدہ شریک کی طرف آنے کی دعوت دوں انہیں سمجھاؤں کہ عبادت کے لائق صرف وہی ذات وحدہ' لا شریک ہے۔ لیکن خدیجہ۔۔ ۔۔ میں یہ بات کس سے کہوں اور کیسے کہوں' کون سنے گا؟

پہلی صدائے آمنت و صدقت

زمین و آسمان کے درمیان نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر سب سے پہلے عورتوں میں سے جس عظیم عورت نے کہا۔ میں آپ کی صداقت کو تسلیم کرتی اور تصدیق کرتی ہوں اس کا قابلِ صد احترام نام خدیجۃ الکبریٰ ام المومنین رضی اللہ عنہا ہے۔

اس کے بعد خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے ورقہ بن نوفل سے گفتگو کی تفصیل بتاتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو استقلال کی طرف توجہ دلائی اور حوصلہ افزائی فرمائی۔

آپ رضی اللہ عنہا کا ایمان لانا فطری تھا' کیونکہ آپ نے زندگی کے دس سال اس صادق و

امین ہستی علیہ الصّلوٰۃ والسلام کے ساتھ گزارے تھے۔ آپ ﷺ کی ہر بات میں سچائی دیکھی، طبیعت میں روحانی تقدس دیکھا، حُسنِ سلوک کا بے مثال عملی اظہار دیکھا، دوسرے لوگ تو بتوں کی عبادت کرتے اور بزعم خود ان کا تقرب حاصل کرنے کیلئے پاگل ہو رہے تھے۔ اپنے ہی ہاتھوں بنائے ہوئے پتھر، لکڑی سے تراشے معبودوں کو نفع اور نقصان کا مالک سمجھ رہے تھے۔ ان کی عبادت کرنا فرض سمجھتے تھے۔ انہیں اپنا حاجت روا اور فریادیں سن کر امداد کرنے والے مانتے تھے مگر رسول اللہ ﷺ ان تمام سالوں میں صرف اور صرف اللہ جل شانہ کی صفات کے مظاہر پر غور و تدبر کرنے میں گم دیکھا۔ آپ ﷺ کی روح اور دل کو سچے معبود کی تلاش میں کفار کے مقابلہ میں بے انتہا فعال دیکھا۔

غارِ حرا کی تنہائیوں کے معمول سے پہلے اپنے گھر میں آپ ﷺ کی مشغولیتوں کا عالم بھی دیکھا تھا اور پھر غار حرا میں پہلی بار جبریل امین علیہ السلام کے نازل ہونے اور نبی اکرم ﷺ سے ہم کلام ہو کر ان کو اللہ کی طرف سے عطا کردہ رسالت کے منصبِ عظیم کی اطلاع دینے کی روداد بھی حرف بحرف سنی۔ جس کے بعد ام المومنین رضی اللہ عنہا کے دل میں وحی معظم علیہ السلام کو دیکھنے کا شوق پیدا ہوا تھا۔

اس کے بعد ہی آنحضرت ﷺ کے دولت کدہ پر جب جبریل علیہ السلام تشریف لائے تو نزولِ وحی کی حالت میں آپ ﷺ کی اضطرابی کیفیت کو دیکھ کر فرطِ جذبات میں آپ رضی اللہ عنہا نے آپ کا مبارک سر پہلے اپنی داہنی ران پر اور پھر اپنی آغوش میں لے لیا۔ اور اسی حالت میں فرشتہ معظم علیہ السلام کے ساتھ نبی اکرم ﷺ کا ہم کلام ہونا دیکھا اور سنا۔ ان حیران کن لمحات میں آپ کے سر سے چادر مبارک سرک گئی تو جلدی سے اسے سر پہ اوڑھتے ہوئے فرشتہ معظم کی طرف دیکھا کہیں انہوں نے آپ رضی اللہ عنہا کو ننگے سر تو نہیں دیکھ لیا۔ مگر اس وقت فرشتہ معظم علیہ السلام کی توجہ کسی دوسری طرف تھی۔ مختصر یہ کہ ان تمام روشن روشن مشاہدات نے ان کو یقین دلا دیا تھا کہ آپ ﷺ پہ اللہ کے احکامات لے کر نازل ہونے والی مقدس ہستی جبریل امین علیہ السلام ہی ہیں کوئی جن یا شیطان نہیں۔

دورانِ طواف ورقہ بن نوفل سے پہلی ملاقات

دینِ اسلام کی خاتون ام المومنین رضی اللہ عنہا کے ایمان لانے کے بعد آنحضرت ﷺ طواف کعبہ کے لئے حرم بیت اللہ میں تشریف لائے، یہاں ورقہ بن نوفل سے ملے اور آپ ﷺ سے خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے سنی ہوئی نزولِ وحی اور ہم کلام ہونے کی بطورِ تحقیق گفتگو کی اور آنحضرت ﷺ سے تصدیق پا کر فوراً کہا۔

والذی نفسی بیدہ انک نبی ھذہ الامۃ ولقد جائک الناموس الاکبر الذی جاء موسیٰ ولتکذبن لتوذین ولتجرجن ولتقاتلن ولئن انا ادرکت ذالک الیوم الانصرن اللہ نصراً یعلمہ

اللہ جل شانہ کی قسم آپ اس امت کے نبی ہیں۔ یہ وہی ناموس اکبر (وحی) ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ وہی ناموس اکبر آپ پر نازل ہوئی۔ مگر دیکھئے یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں گے' آپ کو تکلیفیں پہنچائیں گے۔ انتہا یہ کہ آپ کو مکہ مکرمہ سے نکلنے پر مجبور کر دیں گے۔ اس کے بعد اہلِ مکہ آپ سے لڑائی بھی کریں گے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس وقت تک زندگی عطا فرمائی تو میں انشاء اللہ ہر قدم پر آپ کی نصرت و مدد کروں گا۔

یہ سب کچھ کہہ کر ورقہ بن نوفل نے آپ کی پیشانی مبارک کو بوسہ دیا۔

ورقہ بن نوفل کی تصدیق نے احساسِ ذمہ داری کو اور جگا دیا

ورقہ بن نوفل کی زبان سے مستقبل میں اہلِ مکہ کے رویہ کی تشویش ناک صورتحال سن کر آپ ﷺ کچھ متفکر ہو گئے۔ دل میں دعوتِ حق کے ردِ عمل کے طور پر مکہ کے کفار کا رویہ کتنا سنگین ہو سکتا ہے؟ قریش کو باطل معبودوں کی عبادت سے باز رکھنا تو ایک طرف یہ تو اپنی توہم پرستی میں اس قدر سخت ہیں کہ اس کے لئے اپنی جان کی بازی بھی لگا دینے سے گریز نہیں کریں گے۔ ایسا وقت آ ہی گیا جس طرح کہ ورقہ بن نوفل نے کہا ہے تو پھر کیا ہو گا! اور پھر میرے اپنے قریبی رشتہ دار اور عزیز بھی مجھ سے ایسا ہی بدترین برتاؤ کریں گے؟

سچائی دلیر ہوتی ہے

سچائی اور پھر وہ بھی اللہ عزوجل کی بیان کردہ سچائی جس کا اپنے نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے اعلان کرنے کا فیصلہ ہو چکا ہو وہ خاموش رہے تو کیسے؟

آپ ﷺ نے سب سے پہلے اپنے خاندان کو دعوتِ حق دینے کا پروگرام ان خیالوں کے ساتھ مرتب فرمایا۔ میں ان سے کہوں گا وہ مکمل طور پہ گمراہ ہیں۔ ان کے تمام معبود جھوٹے ہیں۔ میں جس ذات کی انہیں دعوت دے رہا ہوں وہ عین حق ہے۔

میں ان کے مختلف وہموں میں لپٹے ہوئے دلوں اور روحوں کو پاک و صاف کر کے اس باری تعالیٰ کے ساتھ ان کا تعلق جوڑوں گا جو ان کا اور ان کے باپ دادا کا بھی خالق و مالک ہے۔

میں ان سے کہوں گا کہ وہ اپنے دلوں سے بتوں کی عظمت نکال کر ایک اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت کریں۔

میں انہیں حسب و نسب کے ذریعہ نہیں بلکہ اچھے اعمال کے ذریعہ اپنے اللہ جل شانہ سے

رابطہ قائم کرنے کا درس دوں گا۔

میں انہیں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد یعنی اپنے نزدیکی رشتہ داروں کے حقوق کو ادا کرنے کیلئے کہوں گا۔ مفلس مسافروں کے ساتھ اچھے سلوک کی تلقین کروں گا۔ میں انہیں اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوئے بتوں کی عبادت کے ذریعہ نجات حاصل کرنے اور بتوں کو نذرانے اور چڑھاوے پیش کرنے کے بعد ہر قسم کے فساد اور گناہوں سے بخشش کی امید کے خوفناک فریب سے نکالوں گا۔ میں انہیں سمجھاؤں گا کہ پتھر کے بتوں کی عبادت تو دل کو پتھر سے بھی زیادہ سخت اور بدبخت بنا دیتی ہے۔ میں ان کو سود خوری اور یتیموں کے مال پر قبضہ جمانے سے منع کروں گا۔

میں ان کو زمین و آسمان کے درمیان پھیلے ہوئے مظاہرِ قدرت اور طرح طرح مخلوقات کی طرف غور و فکر کرنے کی دعوت دوں گا۔ جس سے ان کے دماغ اعلیٰ سوچ سوچنے کے عادی ہو جائیں۔ جب ان کا رشتہ خالقِ ارض و سما کی عبادت سے مضبوط ہو جائے تو وہ خود معمولی سی محسوسات کو اپنا معبود ماننا چھوڑ دیں اور جب اس سعادت کو خود پالیں تو پھر غرورِ زہد میں گمراہوں کے لئے عذاب نہ بنیں بلکہ انہیں محبت اور دلیل سے صراطِ مستقیم کو اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کی جدوجہد کریں۔ میں انہیں یتیم و بے سہارا اور ضعیف و کمزور لوگوں سے بہترین سلوک سے پیش آنے کی دعوت دوں گا۔

(مؤلف کے اپنے تصور کے مطابق) رسول اللہ ﷺ اپنے آپ سے مخاطب ہوتے ہیں! مجھے اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کا مکلّف فرمایا ہے۔ لیکن افسوس اہلِ مکہ پتھر دل جن کی روح پاکیزگی سے محروم ہے اور اپنے باپ دادا کی گمراہی پہ پاگل بن کر بتوں کی پوجا پہ جانیں چھڑک رہے ہیں اور اپنے تجارتی بازاروں میں رونق اور حاجیوں کے دور دراز کے ملکوں سے مکہ معظمہ آنا انہیں بتوں کی وجہ سے سمجھ رہے ہیں۔

1۔ میرے اللہ کیا یہ لوگ اپنے باپ دادا کی گمراہیوں کو چھوڑ دیں گے؟ ان کا یہ شہر جسے بت پرستی میں مرکزی مقام حاصل ہے اسے ایک وحدہ لاشریک کیلئے فنا کر دینے پر تیار ہوں گے؟

انسان جس کے دلوں میں بے حساب خواہشیں ہمیشہ انسان کو اپنا غلام بنائے رکھتی ہیں کیا ان کے دل ان شیطان دوست خواہشوں سے اپنے آپ کو پاک کر سکیں گے۔ انہیں انجامِ کار کے نتائج سے آگاہ کرنے بت پرستی اور خواہشات پرستی سے منع کرنے پر بھی یہ لوگ باز نہ آئے تو پھر کیا ہوگا؟۔۔۔۔۔ سب سے اہم اور مشکل مرحلہ یہی ہے۔

1۔ یہ سب مولف کی اپنی انفرادی سوچ ہے۔ آنحضرت ﷺ کی سوچ سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ مترجم

التوائے وحی

انتظار کی گھڑیاں بڑی پر آشوب ہوتی ہیں۔ نبی اکرم ﷺ اگلے احکام کیلئے نزول وحی کے منتظر تھے مگر مصلحتِ الٰہی سے جبریل علیہ السلام تو تشریف لائے ۔ مگر بہت دیر سے۔ اس درمیانی وقفہ میں آپ نے خاموشی اختیار کرلی۔ آپ کی حالت نفسیاتی طور پہ بالکل ایسی ہی ہو گئی جیسی کہ نزولِ وحی سے پہلے غار حرا میں خلوت نشینی میں ہوا کرتی تھی۔ آپ کو اس ذہنی پریشانی میں دیکھ کر اسرارِ نبوت سے محرم ام المومنین رضی اللہ عنہا نے آپ ﷺ سے عرض کیا!

ماری ربک الاقد قلاک

کیا آپ کو یہ شبہ ہے کہ آپ کے پروردگار نے ناراض ہو کر آپ کو بھلا دیا ہے؟

اس حوصلہ افزا مشورہ کے باوجود آنحضرت ﷺ کی پریشانی میں کمی کی بجائے اضافہ ہو گیا اور دوبارہ غار حرا میں گوشہ نشینی میں سکون محسوس فرمانے لگے اور تنہائی میں اللہ جل شانہ سے عرض کرتے۔ لم قلاہ بعد ان اصطفاہ اللہ سبحانہ کیا (اس بندہ کو) کو تبلیغ رسالت کیلئے منتخب کرنے کے بعد ناراض ہو کر بھلا دیا؟

ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی رسول اللہ ﷺ کو سخت پریشان حالت میں دیکھ کر گھر میں مبتلائے غم رہنے لگیں۔ رسول اللہ ﷺ کی حالت اور زیادہ تشویشناک ہو گئی۔ مگر پھر اپنے منصب و اعزاز کا خیال آیا اور مکمل طور پہ اللہ تعالیٰ کی طرف یکسو راضی برضا ہوئے! ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ 1۔ انتہائے اضطراب میں کوہ حرا یا کوہ ابو قیس کی چوٹی سے خود کو گرانے کا ارادہ بھی کیا کہ ایسی عظیم نعمت و اعزاز ملنے کے بعد اس سے محرومی کی زندگی میں کیا لطف؟

آنحضرت ﷺ اسی کشمکش میں تھے کہ نزول وحی (ان آیات پر مشتمل) ہوا۔

والضحٰی ○ والیل اذا سجٰی ○ وما ودعک ربک وما قلٰی ○ وللاخرۃ خیر لک من الاولٰی ○ ولسوف یعطیک ربک فترضٰی ○ الم یجدک یتیمًا فاوی ○ ووجدک ضالا" فھدی ○ ووجدک عائلا" فاغنی ○ فاما الیتیم فلا تقھر ○ واما السائل فلا تنھر ○ واما بنعمۃ ربک فحدث (93-1-11)

1۔ رسول اللہ ﷺ سے ناامیدی اور خودکشی کے احساس کو وابستہ کرنا خلافِ شریعت ہے۔ (مترجم)

آفتاب کی روشنی کی قسم' اور رات کی تاریکی کی قسم' اے محمد (ﷺ) تیرے پروردگار نے نہ تم کو چھوڑا اور نہ تم سے ناراض ہوا' اور آخرت تمہارے لئے پہلی حالت یعنی دنیا سے کہیں بہتر ہے' اور تمہیں پروردگار عنقریب وہ کچھ عطا فرمائے گا کہ تم خوش ہو جاؤ گے' بھلا اس نے تمہیں یتیم پا کر جگہ نہیں دی (بے شک دی) اور راستہ سے ناواقف دیکھا تو سیدھا رستہ دکھایا اور تنگ دست پایا تو غنی کر دیا۔ تو تم یتیم پر ستم نہ کرنا' اور مانگنے والے کو جھڑکی نہ دینا' اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کو بیان کرتے رہنا ○

تجدیدِ وحی نے آپ کے دل کو کتنی مسرتیں بخشیں' روح کو کتنا اطمینان اور سکون نصیب ہوا' اداس ہونٹوں پر مسکراہٹوں نے بسیرا کر لیا۔ یاس و امید کی قلبی کشمکش اللہ جل شانہ کی حمد و ثنا میں مشغول ہو گئی۔ جسدِ مبارک کا رواں رواں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے اس جملہ نے "کیا آپ کو یہ شبہ ہے کہ آپ کے پروردگار نے ناراض ہو کر آپ کو بھلا دیا ہے" پریشانی میں جتنا اضافہ کیا تھا اب وہ پریشانی بالکل کالعدم ہو گئی۔ یوں کہیے کہ تجدیدِ وحی سے اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر از سرِنو اپنی محبت و رحمت کی بارش فرما دی۔ رسول اللہ ﷺ کے دل سے تمام خدشات دور فرما دیئے۔

اعلانِ رسالت کا اہتمام

اس کے بعد لوگوں کو اس اللہ وحدہ لاشریک کی طرف دعوت دینے کا اہتمام کیا جانے لگا! جس کے سامنے زمین و آسمان ہر لحہ سر بسجود ہیں۔ لوگو حیرت ہے اس ذات کو چھوڑ کر ان بتوں کی پوجا کرتے ہو جن کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ افسوس گمراہ انسان اس ایک خالقِ کل مختارِ مطلق کی اطاعت میں دل لگانے کے بجائے بتوں کی پوجا میں زندگی فنا کر کے جہنم کا سزاوار بن جاتا ہے۔ یہی خیال آپ ﷺ کے دماغ میں گردش کر رہا تھا۔

اس وحی سورہ والضحیٰ میں وللاٰخرۃ خیر لک من الاولیٰ "اور آخرت تمہارے لئے پہلی حالت یعنی (دنیا) سے کہیں بہتر ہے" یعنی فی الحقیقت اس بات کی نشاندہی ہے کہ انسان جب دنیا کے تمام فوائد اور تعلقاتِ نفسانی سے لاپرواہ ہو کر خود کو اس ذات میں فنا کر دے جس کے بعد مکان و زمان اور زندگی بطور اعتبار کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ اسی "آخرت" میں تو نور "ضحیٰ" کی تابانی آفتاب درخشاں کے جلووں میں صاف دکھائی دیتی ہے اب یہ خیال بار بار ذہن میں آتا۔ کہ آخرت کیا ہے؟ یہ روشن ترین دن' تاریک رات' آسمان' زمین اور پہاڑ ایک دوسرے سے علیحدہ علیحدہ حقیقتیں ہیں یا ایک ہی حقیقت کے مختلف روپ ہیں جن کے اندر پاک دل کی روح

خوشی سے اٹھکیلیاں کرتی ہے۔ کیا ہی دلکش و پر فرحت مقام (آخرت) مقصد ہے اس حقیر زندگی کے سفر کی کیا یہی حقیقت ہے۔ اس کے سوا ہر شے کی صورت بے معنی' تب اسی حقیقت نے اپنے پرتو سے جناب محمد ﷺ کی روح کو منور فرما دیا اور اسی حقیقت نے آپ ﷺ کو لوگوں کی ہدایت کے لئے دعوت کی ذمہ داری کو عملاً" سرانجام دینے پہ آمادہ کیا۔

اسی "آخرت" کی حقیقت نے آنحضرت ﷺ پر لباس کی پاکیزگی اور جسم کی طہارت واجب قرار دی' اسی حقیقت "آخرت" نے آپ ﷺ کو ہر قسم کی برائی سے دور رہنے پر آمادہ کیا اور اسی نے آپ کو راہِ حق میں مصائب و آلام پر برداشت و تحمل کا خوگر بنا دیا اور اسی حقیقت ہی نے آپ کو گم کردہ راہوں کے لئے نورِ علم کی مشعل روشن کرنے کی ہمت بخشی۔ اس حقیقت و مقصد "آخرت" نے ہی رسول اللہ ﷺ کو مانگنے والوں اور یتیم کو ڈانٹنے سے روکتے۔ اس بات کا احساس دلا دیا کہ آپ مقام و مرتبہ کے لحاظ سے دنیا و جہان کے مال و دولت سے کہیں زیادہ عظیم ہیں۔ گویا عظمتِ منصب کا تقاضہ ہے کہ آخرت کی فکر ایک لمحہ بھی آپ کے ذہن سے سرکنے نہ پائے۔ ضروری ہے کہ آپ ﷺ اس نعمتِ عظمیٰ کے حصول پر اللہ عزوجل کا شکر ادا کرتے رہیں۔ قرآن حکیم کی اس آیت واما بنعمت ربک فحدث "اپنے رب کی نعمتوں کو ہمیشہ بیان کرتے رہنا" کا مقصد ہی یہی ہے۔ اگرچہ اس نعمت کے علاوہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی اور بھی بہت سی نعمتوں کا سلسلہ موجود ہے مثلاً آپ یتیم تھے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دادا عبدالمطلب کی سرپرستی عطا فرمائی۔ اس کے بعد آپ کے بزرگوار چچا کی کفالت عطا فرمائی۔ آپ کی غریبانہ زندگی کا تدارک متمول' باوفا' حوصلے اور کردار میں عظیم رفیقہ حیات ام المومنین خدیجۃ الکبریٰؓ کی صورت میں فرمایا۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نجیب الطرفین اور صائب الرائے تھیں۔ ان کے مشوروں میں دور اندیشی اور حسنِ تدبیر کا جمال مکمل طور پہ ہوتا رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ اللہ تعالیٰ کا احسانِ عظیم اور نعمتِ عظمیٰ کا عالم تو دیکھئے آنحضرت ﷺ کو رسالت و نبوت کے اعلیٰ ترین منصب کا علم نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سے آگاہ فرمایا۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ کو چاہئے کہ وہ دوسروں کو احسان جتائے بغیر انہیں توحید کی نعمت قبول کرنے کی دعوت دیں۔ یہ ہے اللہ تعالیٰ کا وہ امر جس کے لئے اس نے محمد کو

- منصب رسالت کے لئے منتخب فرمایا اور اس (لا الہ الا اللہ) یعنی اس خاص معبود وحدہ لاشریک نے ان کو فراموش نہیں کیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ ماودعک ربک وما قلیٰ ○ تیرے پروردگار نے نہ تم کو چھوڑا اور نہ ہی ناراض ہوا۔

قیام الصلوٰۃ کا حکم اور علی رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا

یہ وہ لمحات ہیں جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو قیام الصلوٰۃ (نماز قائم کرنے) کا

حکم دیا اور ام المومنین رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس فریضہ کو ادا کرنا شروع کر دیا۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس زمانہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت میں تھے۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ قریش کے کاروبار میں سخت مندا آگیا۔ اور جناب ابی طالب کثیر العیال ہونے کے سبب کاروبار کی خراب حالت میں اپنے گھرانے کی کفالت پر قادر نہ تھے۔ البتہ بنو ہاشم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے بزرگوار چچا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کافی امیر تھے۔ اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔

ان اخاک ابا طالب کثیر العمال وقدا صاب الناس ماتری من ھذہ الا زمۃ فانطلق بنا فلنحفف من عیالہ اخذمن بنیہ رجلا وتاخذ انت رجلا فنکفلھا عنۃ

اے عم بزرگوار آپ کے بھائی ابی طالب کی اولاد زیادہ اور قریش کی مالی حالت کا آپ کو علم ہے۔ میرے خیال ہم دونوں مل کر ان کا بوجھ ہلکا کریں۔ ان کے ایک بیٹے کو آپ اپنے گھر لے آئیں اور دوسرے بیٹے کو میں ساتھ لے آتا ہوں۔

اس فیصلہ کے نتیجہ میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے گھر اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ہاں لے آئے۔ اس دن سے لیکر بعثت کے بعد تک علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ ہی کے گھر رہے۔ اس اثناء میں ایک دن جب ام المومنین رضی اللہ عنہا اور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فریضہ صلوٰۃ ادا کر رہے تھے تو علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھر میں داخل ہوئے۔ دونوں کو رکوع و سجود کرتے ہوئے بڑے غور اور حیرت سے دیکھ کر دم بخود دیکھتے رہے۔ جب آپ دونوں فارغ ہوئے تو ان سے عرض کیا۔

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ آپ دونوں کس کے سامنے سجدہ کر رہے تھے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ہم اس اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو سجدہ کر رہے تھے جس نے مجھے منصبِ نبوت و رسالت کا اعزاز عطا فرمایا اور مجھے لوگوں کو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرنے کی دعوت دینے کی ذمہ داری بخشی! اس گفتگو میں مزید ایک حرف بھی شامل کئے بغیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دعوت دیتے ہوئے فرمایا۔ ''اے میرے چچا زاد بھائی علی۔ تم بھی اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرو۔ میری نبوت کو تسلیم کرو اور لات و منات کو پوجنا چھوڑ دو۔ اس کے ساتھ ہی بلاتوقف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کی چند آیات بھی تلاوت فرمائیں جن سے بیحد متاثر ہو کر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ کہ مجھے جواب کے لئے اتنا وقفہ دیجئے کہ میں اپنے والدِ محترم سے مشورہ کر سکوں۔ وہ رات علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بڑی بے چینی میں گزاری اور صبح ہوتے ہی اپنے ایمان لانے کا اعلان کرتے ہوئے کہا۔ اس معاملہ میں مجھے والد بزرگوار سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں۔

لقد خلقنی اللہ من غیران یشاور ابا طالب فما حاجتی الٰی مشاور تہ لا عبداللہ
بلاشبہ اللہ تعالٰی نے مجھے ابی طالب سے مشورہ کیئے بغیر پیدا فرمایا للہذا مجھے اللہ جل شانہ کی عبادت کرنے کے لئے ان کے مشورہ کی ضرورت نہیں۔

یوں اظہارِ ایمان کے بعد مردوں (بچوں) میں ایمان لانے والے پہلے مسلمان ہیں۔

غلاموں میں سے سب سے پہلے ایمان لانے والے غلام

یہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کے زر خرید غلام زید بن حارثہ ہیں جنہیں غلاموں میں سے سب سے پہلے ایمان لانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اب اس روئے زمین پر صاحب ایمان چار ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے علاوہ۔۔۔ ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا۔ جناب علی رضی اللہ عنہ اور حضرت زید رضی اللہ عنہ!

اب رسول اللہ ﷺ نے سوچا کہ قریش میں سلسلۂ دعوت کا آغاز کس طرح کیا جائے؟ انہیں خطرہ تھا کہ یہ لوگ اپنے باپ دادا کے دین کو آسانی سے ترک کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔

عظیم دوست ابنِ ابی قحافہ تیمی

آپ ﷺ کو جس نگاہ نے پہلی ہی نظر میں نیک دل، امین و صادق، نیک سیرت و نیک خو دل سے مانا وہ تھے ابوبکر بن ابی قحافہ تیمی رضی اللہ عنہ۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو بھی آپ کے خلوص، وفا اور صداقتِ عمل پر پورا اعتماد تھا۔ اس لئے اپنے گھر سے باہر سب سے پہلے ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کے سامنے وحی کے نزول اور اعزازِ رسالت کے حصول سے لیکر اب تک کی پوری روداد بیان کرنے کے بعد ایمان لانے کی دعوت دی تو جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک ساعت بھی رکے بغیر فوراً تصدیقِ رسالت فرماتے ہوئے فرمایا۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ!

سچ تو یہ ہے کہ دنیا میں کون ایسا باشعور ہے جس کو حق کی تلاش ہو۔ ذاتِ حق کی عبادت کرنا چاہتا ہو! تو اس کی راہنمائی پاتے ہی پتھر کی مورتیوں کو توڑ کر اس وحدہ لاشریک کی عبادت قبول نہ کرے! اس طرح اللہ تعالٰی کی اس اخلاقی راہنمائی کی عظمت سے کیسے انکار کی جرات ہو سکتی ہے جس میں ارشاد ہے۔ اپنے لباس کی صفائی اور پاکیزگی میں غفلت نہ برتیں۔ مانگنے والا مانگے تو اس کو خالی ہاتھ لوٹایا نہ کرو۔ اور یتیم بچوں کے ساتھ بہترین سلوک روا رکھو! (سورہ مدثر کی ابتدائی آیات)

ایمان لانے والوں میں سے تبلیغ کا سب سے پہلا اعزاز پانے والے

اس حوالہ سے بھی جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ سرفہرست ہیں۔ سب سے پہلے انتہائی رعب داب کی مالک شخصیت پر کشش صورت کے مالک عبداللہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بن قحافہ تیمی ہیں جو قریش کے علاوہ دوسرے قبائل کے بھی ہر دلعزیز تھے۔

مزید برآں قریش میں علم الانساب کے عالم، تجارت کے اصول و ضوابط کے ماہر، فراست و دانشمندی میں تسلیم شدہ، احسان و مروت کا سرچشمہ۔ ان خصوصیات کی بناء پر قریش میں خصوصاً اور دوسروں میں عموماً ان کی شخصیت قابلِ احترام مانی جاتی تھی۔

اس شخصیت نے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو دل سے مانا۔ اسے دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت مانا، جانا اور سمجھا۔ اور اب وہ اس نعمت کو اپنے دوستوں اور ہم عصروں کے دلوں میں دیکھنے کی تمنا رکھتے تھے۔ اس لئے جو بھی ملتا، جس سے بات ہوتی اسے دعوت توحید و رسالت دیتے۔

چنانچہ ان کی دعوت سے قریش کی بڑی اہم شخصیتوں میں سے مندرجہ ذیل نے ایمان کی نعمت قبول فرمائی۔ عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ، اور کچھ دنوں کے بعد ابو عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ۔ اب مکہ معظمہ کی اندرونی حدود کے علاوہ اس سے باہر بھی بہت سے لوگ ایمان کی نعمت سے انہیں کی دعوت کے سبب فیض یاب ہوئے۔

عہدِ اول میں ایمان لانے والے

عہدِ اول میں معمول یہ رہا کہ جو بھی ایمان لاتا وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے ایمان لانے کا اظہار و اقرار کرتا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بنیادی مسائل، عقائد اور اعمال کی تعلیم حاصل کرتا۔ لیکن یہ سب قریش سے اپنے مسلمان ہونا پوشیدہ رکھتے۔ انہیں ڈر تھا کہ بتوں سے بیزاری یا ان کی پوجا پاٹ چھوڑ دینے کا علم ہوتے ہی قریش ان کی جان کے دشمن ہو جائیں گے، یہی وجہ تھی کہ تمام مومنین فریضہ صلوٰۃ پہاڑوں میں چھپ چھپ کر ادا کرتے۔ سلسلہ تعلیم و تدریس بھی خفیہ طور پر ہی چلتا۔ غرض اسی حال میں تین سال کا عرصہ گزر گیا۔ مسلمانوں کی تعداد دن بدن بڑھتی گئی اور اس درمیان میں جتنی بھی آیات نازل ہوئیں انہوں نے ان سب کے ایمان کو اور پختہ کر دیا۔

دعوت کی مقبولیت اور اسوۂ رسول رحمت ﷺ

دعوتِ اسلام کی مقبولیت اور اثر آفرینی میں جو سرِفہرست سبب تھا وہ آنحضرت ﷺ

کا بے مثال حسنِ اخلاق تھا۔

(1) انسانی فطرت میں جتنی خوبیاں انسان بیان کر سکتا ہے اس سے بھی زیادہ خوبیاں آپؐ کی طبیعت میں تھیں، مزاج میں تھیں، خو اور رویہ میں تھیں۔ دوسروں پر رحم و کرم کرنا آپؐ کا معمول تھا۔ تواضع، ملنساری انتہائی اعلیٰ معیار تک تھی، شجاعت، حکمت، عدالت اور عفت و مردانہ شرافت میں اپنی مثال آپؐ گفتگو میں ٹھہراؤ، پیارا پن، لہجہ میں نرمی دلربائی کی حد تک، عدل و انصاف میں بے پناہ نڈر اور مخلص، حقوق العباد کے محافظ اور عملاً پابند، غریبوں، مسکینوں، بے سہارا بیوہ، بوڑھوں اور بچوں پر اتنے شفیق و مہربان کہ ماں کی ممتا سے زیادہ دوستوں کے ساتھ احسان و بخشش، مروت و مودت میں منفرد و ممتاز، یہ صفات تو جلوت یعنی معاشرہ سے عام کھلے ہوئے اخلاق و رویہ کی خوبیوں سے متعلق ہیں۔ تنہائیوں یعنی خلوت میں بھی معیارِ کردار یہ تھا کہ جیسے ہی سورج ڈوبتا، رات چھا جاتی تو آنحضرت ﷺ بسترِ راحت پر آرام فرمانے کے بجائے اللہ رب العزت کی عبادت میں مشغول ہو جاتے خود پر نازل ہونے والی آیات پر غور و تدبر فرماتے۔ کبھی زمین و آسمان کی وسعتوں کو دیکھ کر خالقِ کائنات کے کمالات پر توجہ مرکوز فرماتے اور پھر کائنات کے ذرہ ذرہ پر حکمرانی کرنے والے اللہ وحدہٗ لاشریک سے زندگی کے مقصد کو سمجھنے اور سمجھ کر اسے مفید تر بنانے کی توفیق و اعانت مانگتے۔ کبھی اللہ تعالیٰ سے حق کی پہچان اور حق کی حفاظت کرنے اور حق پر چلنے کی راہنمائی مانگتے۔

اپنے امام و راہنما پیشوا کے اس اعلیٰ ترین اخلاق کو دیکھ کر مومنین کے دل میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔ اس خطرہ سے لاپرواہ کہ قریش ہمیں اپنے باپ دادا کے دین بتوں کی پرستش سے منحرف ہونے پر مشتعل ہو جائیں اور ہمیں تکلیفیں پہنچانے لگیں، ستانے لگیں۔ اپنے ایمان میں اور مستحکم ہو رہے تھے۔ یہاں تک کہ مکہ کے معزز تجارت پیشہ اور اہم ترین دوسرے اشخاص کے ساتھ ساتھ کچھ غریب اور بے سہارا لوگ بھی دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔ ان السابقین اولین یعنی سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں بہت سی خوش نصیب محترمات بھی تھیں۔

توقعات الٹ نکلیں

اب آنحضرت ﷺ کا ذکر خیر مکہ معظمہ کی گلیوں، محلوں اور گھروں میں صبح و شام

ہونے لگا' آپ ﷺ کے ذکر کی خوشبو ان اہلِ مکہ کی خصوصی محفلوں میں پہنچ گئی جن کے دلوں پر بدبختی کے پردے پڑے ہوتے تھے۔ بدبو کے عادی خوشبو سے بیزاری کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اس دین کا حال بھی قس' امیہ اور ورقہ بن نوفل کے دین کا سا ہو گا جو کچھ مقبولیت کے بعد اپنی موت آپ ہی مر گیا۔ جس طرح دوسرے مذہبی راہنماؤں اور علماء کی محفلیں آج ویران پڑی ہیں یہ بھی ویران ہو جائے گا اور پھر آج مسلمان کہلانے والے پھر اپنے اصل دین بت پرستی کی طرف لوٹ آئیں گے' اور پھر ہبل اور لات جیسے دیوتا' و عزیٰ جیسا غیرت مند معبود اور ان سب سے بڑھ کر اساف ونائلہ جیسا غضب ناک دیوتا' جسے قربانی کے خون میں تیرایا جاتا ہے۔ اپنے منکروں کو یوں ہی آزاد تھوڑا چھوڑ دیں گے' یقیناً وہ ایک دن ان سب کو اپنے حضور میں سرنگوں کر کے ہی رہیں گے۔

ان انتہا کے جاہل اور نادان لوگوں کی عقل کو اس حقیقت کی ہوائے چھوا تک بھی نہ تھا کہ سچے ایمان پر کوئی طاقت غالب نہیں آ سکتی اور فتح و کامرانی صرف اور صرف سچائی کی تقدیر میں لکھی جا چکی ہے۔

تین سال بعد

مسلسل تین سال در پردہ سلسلہ تبلیغ چلتا رہا اور اب وہ گھڑیاں بھی آ پہنچیں ہیں جن میں لوگوں کو کھلے عام دعوت و تبلیغ کا حکم نازل ہوا۔

وانذر عشیرتک الاقربین و اخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین فان عصوک فقل انی برئ مما تعملون ○ (26:214 تا216) فاصدع بما تومر و اعرض من المشرکین (94:15)

اے ہمارے رسول (ﷺ) اپنے رشتہ داروں کو عذاب آخرت سے ڈراؤ اور اپنی تابعداری کرنے والوں کیلئے اپنے حسنِ سلوک کو عام کر دو اور جو لوگ آپ کا کہنا نہ مانیں تو ان سے کہہ دیجئے' تمہارے اعمال سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ اپنی دعوت کا سلسلہ کھلے عام کر دیجئے اور مشرکین سے (دامن بچا لیجئے) توجہ ہٹا لیجئے۔

پہلی کوشش

اللہ تعالیٰ کے رسولِ معظم ﷺ نے اپنے تمام رشتہ داروں کو اپنے نبوت خانہ میں

کھانے پینے کی دعوت دی۔ تقریباً سب جمع ہوئے تو مبلغ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کیوں اور کس لئے حق پہ مبنی ہے سمجھایا۔ اس درمیان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچا ابو لہب آگ کے شعلے کی طرح بھڑک اٹھا اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی اکسا کر اس خانۂ رحمت و برکت سے نکل گیا۔

دوسری کوشش

ایک بار پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے کاشانۂ نبوت علیہ السلام میں سب کو دعوتِ طعام پر مدعو کیا جب لوگ کھانے سے فارغ ہوئے تو فرمایا۔

ما اعلم انسانا فی العرب جاء قومه بافضل مما جئتكم به من جئتكم بخیر الدنیا والاخرۃ وقد امرنی ان ادعوکم الیه فایکم یوازرنی علی ھذا الامر ○

اہلِ عرب میں سے آج تک کوئی انسان بھی مجھ سے بہتر تعلیم لے کر نہیں آیا۔ یہ تعلیم دین اور دنیا دونوں کی راہنما ہے یہ تعلیم دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کا علم مہیا کرتی ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ میں آپ کو اس کی طرف بلاؤں کون ہے جو میری دعوت پہ لبیک کہتا ہے؟

یہ سنتے ہی تمام حاضرین نے منہ پھیر لئے۔ اٹھے اور اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔ لیکن اسی بھری مجلس میں تنہا علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ تھے جو کم سن ہونے کے باوجود ہمت و جاں نثاری کے جذبہ میں جواں سال اٹھے۔ اور عرض کیا۔

انا یارسول اللہ عونک انا حرب علی من حاربک!

یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں آپ کی معاونت کروں گا جو آپ سے جنگ کرے گا میں اس سے جنگ کروں گا۔

بنو ہاشم کے بعض مغرور اشخاص حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس جراتِ مندانہ اعلان پر حقارت آمیز نگاہ ڈال کر مسکرائے اور بعض نے حقارت آمیز قہقہہ لگایا۔

کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چہرہ کو دیکھا۔ اور پھر ابوطالب کے چہرہ پہ نظریں جمائیں، غرض نادانوں کا ٹولہ اس انداز سے اپنی جہالت کا مظاہرہ کرتے ہوئے آستانۂ نبوتِ علیہ اسلام سے نکل گیا۔

کوہِ صفا پہ منادی

اس کے بعد ایک بر پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ ساتھ اہلِ مکہ کے عام قبائل کو دعوت دینے کا آغاز فرماتے ہوئے ایک دن ان کو کوہِ صفا پہ چڑھ کر ندا لگائی۔

قریش، قریش۔ پکار سنتے ہی سب کے سب جمع ہو گئے اور آپ سے پکارنے کی وجہ دریافت کی تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا۔

ارئیتھم لواخبرتکم ان خیلا بسفح ھذاالجبل اکنتم تصدقونی

''اگر میں تمہیں اطلاع دوں کہ اس پہاڑ کے پیچھے ایک لشکرِ جرار چھپا بیٹھا ہے تو کیا تم میری بات کو سچ مان لو''

تو سب نے بیک زبان جواب دیا۔

نعم انت عندنا غیر منہم وما جربنا علیک کذبا قط!

ہاں ہم آپ کی بات کو سچ مانیں گے کیونکہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

اس حقیقتِ واقعہ کو مولانا حالی نے اپنی مسدس میں اس طرح بیان کیا ہے۔

کہا سب نے قول آج تک کوئی تیرا   کبھی ہم نے جھوٹا سنا اور نہ دیکھا

کہا تیری ہر بات کا یاں یقیں ہے   کہ بچپن سے صادق ہے تو اور امیں ہے

جواب میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔

فانی نذیر لکم بیں یدی عذاب شدید یا بنی عبدالمطلب یا بنی عبدمناف یا بنی زھرہ یا بنی تیم یا بنی مخزوم یا بنی اسد ان اللہ امرنی ان انذر عشیرتی الاقربین وانی لا املک لکم من الدنیا منفقہ ولا من الاخرۃ نصیبا الا ان تقولو لا الہ الا اللہ

میرے عزیزو اور دوستو، میں نے یہ پکار اس لئے لگائی کہ میں تمہیں ایک سخت عذاب میں مبتلا ہونے سے پہلے اس سے خبردار کروں! اے بنی عبدالمطلب، اے بنی عبدمناف، اے بنو زہرہ، اے بنی تیم، اے بنی مخزوم اور اے فرزندانِ اسد سب بگوشِ ہوش سنو۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنے قریب و دور کے رشتہ داروں کو عاقبت سے ڈراؤں۔ یعنی تمہیں اس بات کی دعوت دوں کہ تم بتوں کو چھوڑو اور ''کہو نہیں کوئی معبود مگر اللہ وحدہ لاشریک'' تمہارے انکار کی صورت میں میری رشتہ داری دنیا اور آخرت میں تمہارے کسی کام نہ آسکے گی۔

قبیلہ ہاشم کا سردار ابولہب

پہلے ہی کی طرح تیخ پا ہو کر گستاخانہ انداز میں ابولہب نے کچھ کہنا چاہا تو آنحضرت ﷺ نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر اس بدبخت نے اپنی بدنصیبی کو خود آواز دیتے ہوئے کہا۔

تبالک سائر ھذا الیوم الھذا جمعتنا

"اس کام کیلئے تم نے ہم سب کو جمع کیا تھا؟"

نبی رحمت ﷺ نے جواب میں توقف فرمایا ہی تھا کہ اللہ "جل شانہ" کی طرف سے وحی نازل ہوئی۔

تبت یدا ابی لھب وتب ○ ما اغنی عنه ماله وما کسب ○ سیصلٰی نارا ذات لھب ○

"اے ہمارے رسول (ﷺ) ابولہب کے ہاتھ ٹوٹیں، وہ خود برباد ہو، نہ ہی مال اس کے کام آیا اور نہ ہی جو اس نے کمایا ○ وہ جلد ہی بھڑکتی آگ میں داخل ہو گا"

اپنی تباہی اور بربادی پر اللہ تعالیٰ کی مہر لگوا کر گستاخ رسول ﷺ سب کو ساتھ لئے وہاں سے چل دیا۔ اس کے بعد ابولہب کی ساری تدبیریں ناکام ہو گئیں۔ اہل مکہ کی تمام سازشیں جو انہوں نے لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکنے کیلئے کیں تھیں سب فنا ہو گئیں اور کوئی پل، گھڑی یا دن ایسا نہ ہوتا کہ نبی اکرم ﷺ کی دعوت پہ لبیک کہہ کر کوئی نہ کوئی حلقہ اسلام میں داخل نہ ہوتا۔ اس پہ کمال یہ ہے کہ اسلام کے قلعہ میں داخل ہونے کے بعد نہ ہی کسی کے دل میں تجارت کے برباد ہو جانے کا ڈر انہیں احکامات الٰہیہ کی تعمیل سے روکتا اور نہ ہی خرید و فروخت میں رکاوٹیں ان کے تقویٰ اور خلوص کو متزلزل کر پاتیں۔

اب ان سب کی زندگی کا مقصد ان کی مسکراہٹ اور غم سب کی روح صرف اور صرف اللہ کے رسول ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل کرنا تھا۔

نبی اکرم ﷺ کے فرماں برداروں نے اپنے ہادیٔ برحق کو اچھی طرح جانچ لیا پرکھ لیا کہ آپ ﷺ کو نہ تو اپنی رفیقۂ حیات رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی دولت سے کوئی طمع ہے، نہ مال و زر جمع کرنے کی ہوس بلکہ ان کی سب سے بڑی دولت نسل آدم کے ساتھ شفقت و محبت سے پیش آنا ہے۔ مصیبت کے ماروں کی غم خواری کرنا، ہر انسان کو اس دنیا اور آخرت کی بھلائی کی دعوت دینا ہے۔ ان کے گناہوں سے درگزر کرنا ہے۔ انہیں نیک راہ پر چلانا ہے۔ اس اثناء میں نبی اکرم ﷺ پر وہ آیات اتریں جن میں انفرادی طور پہ مال جمع کرنے کو روحانیت کا روگ قرار دیا گیا ہے۔

ارشاد ہے۔

الھٰکم التکاثر ○ حتٰی زرتم المقابر ○ کلا سوف تعلمون ○ ثم کلا سوف تعلمون ○ کلا لو تعلمون علم الیقین ○ لترون الجحیم ○ ثم لترونھا عین الیقین ○ ثم لتسئلن یومئذ عن النعیم ○

"لوگو تمہیں بہت سے مال حاصل کرنے کے لالچ نے غافل کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ تم قبروں کو

جا دیکھو! دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا! پھر دیکھو تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ اگر تم جانتے یعنی علم الیقین رکھتے تو غفلت نہ برتتے۔ تم ضرور دوزخ دیکھو گے! پھر تم اسے ایسا دیکھو گے کہ علیم الیقین ہو جائے پھر اس روز تم سے ہماری نعمتوں کو کہاں صرف کیا اس کی پوچھ گچھ ہو گی"

آنحضرت ﷺ نے نسلِ انسانی کو جس لازوال نعمت سے مالا مال کرنا چاہا اس سے بہتر کون سا مال اور دولت ہو سکتی ہے۔

یہ نعمت انسان کو دوسروں کی غلامی سے آزادی دلانے کی نعمت ہے۔ یہ حریت کی لازوال نعمت ہے جسکے اردگرد کوئی دیوار نہیں رہتی۔ جس کے اردگرد سارے قلعے مسمار ہو جاتے ہیں۔ یہی حریت نسلِ آدم کی عزتِ نفس اور بقائے دوام کی ضامن ہے۔

کیا اس حریت نے انسانوں کو ان کے ہاتھوں تراشے ہوئے بتوں کی اندھی غلامی اور عقائد کی زنجیروں سے آزادی نہیں دلائی؟

یہ بت جو اللہ وحدہٗ لاشریک اور انسان کے حقیقی خالق و محسن کے درمیان آڑھ بنے ہوئے انہیں اب ملیا میٹ نہیں کیا؟

انسانوں کے دلوں کو لات و عزیٰ جیسے مفروضہ معبودوں کے خوف سے نجات نہیں دلائی۔ مجوس کے صدہا سال سے جلتے ہوئے آتش کدوں کو اس نعمت نے نم آلود نہیں کیا؟ کیا اس نعمتِ توحید نے عصر کی آفتاب پرستی کے ولولوں کو ختم نہیں کیا؟ دنیا نے دیکھا کہ ستاروں کے پجاری اس نعمتِ عظمیٰ کے پاتے ہی ایک اللہ ایک خالق و مالک کے حضور میں سجدہ ریز ہو گئے۔

فرشتوں اور جنوں کی تقدیس کے تصور میں جن کی پرستش کی جاتی تھی' اس نعمتِ توحید کے نور نے اسے پاش پاش کر دیا۔ صدیوں سے بندوں اور معبودِ حقیقی کے درمیان حجابِ اکبر بنے ہوئے انسانوں کے خود ساختہ معبودوں کو زمیں بوس کر دیا۔

محمد ﷺ کی تعلیم نے انسان کو اپنے اعمال پر مختار ہونے کا درس دیا۔ ایک ذاتِ مطلق سے حقیقی تعلق سے آگاہ کیا۔ انہیں بتایا کہ تمہارے اعمال کی پرسش ہو گی اور یہ بھی بتایا کہ تمہاری وہ نیکیاں جو اس کی عدالت کے ترازو میں بھاری ہوں گی تمہاری شفاعت کریں گی۔ انسان کو بتایا کہ خود ہر انسان کا ضمیر اس کے ایک ایک سانس پر اس کا محاسبہ کرتا ہے اور آخرت کا محاسبہ بھی اسی ضمیر کی روشنی میں ہو گا۔

یہی وہ غیر فانی نعمت حریت ہے جس کی دعوت محمد ﷺ نے دی۔ اگر اس تعلیم کی افادیت' عظمت اور لازوال ہونے میں کسی کو تردد ہو تو اپنی آزادی کی حدود اور معاملات کا تقابلی جائزہ لے کر دیکھ لے۔

کیا یہ سچ نہیں کہ ابولہب اور اس کے ہمنوا ہم آہنگ لوگوں کو غیر اللہ کی پرستش پر قائم رہنے کی تعلیم دینے والے اور انہیں اور خود کو بھی ہلاک نہیں کر رہے تھے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ صدیوں سے ان کے تمام دلائل اور مفروضہ خرافات نورِ حق اور ضیاء ہدایت کے درمیان حجاب بنے ہوئے تھے؟ جن کا ٹوٹنا ہی نسلِ انسانی کے لئے اخروی نجات کا موجب تھا۔

کفر بوکھلا گیا

اسلام کی شانِ اثر خیزی اور نفوذ کو دیکھ کر کفر کے سرغنہ' ابولہب' ابوسفیان اور دوسرے اکابرین قریش سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اگر محمد ﷺ کو اسی طرح کامیابیاں ہوتی گئیں تو ہماری سیادت تباہ' دولت مندی ختم اور کھیل تماشوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

طے ہوا کہ نبی اکرم ﷺ کی توہین ہر قدم پر کی جائے جس سے نبوت و دعوت کی تکذیب خود بخود ہوتی رہے گی۔ چوراہوں' گزرگاہوں اور مجلسوں میں ہجویہ (مذمت یا برائی کرنے والے) قصیدے تسلسل کے ساتھ پڑھے پڑھائے جائیں۔ جن میں سرفہرست تین اپنے وقت کے بہت بڑے شاعر ابوسفیان بن حارث' عمرو بن العاص اور عبداللہ بن زبعری کی تقرری عمل میں آئی۔ چنانچہ ان تینوں شعلہ بیان شاعروں کے ہر شعر میں رسالت و نبوت اور آنحضرت ﷺ پر ہتک آمیز حملوں کا تواتر ہوتا گو ان کے جواب میں مسلمان شعراء بھی شعر کہتے اور سناتے لیکن آنحضرت ﷺ کو اس علمی دھاندلی سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

صداقت کی دلیل

اس اثناء میں بعض اہلِ مکہ نے نبی اکرم ﷺ سے آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کی صداقت میں معجزات طلب کیے جن کی فہرست درج ذیل ہے:۔

(1) کوہ صفا اور مروہ کی پہاڑیاں سونے کی بن جائیں۔

(2) وحی کتابت شدہ صورت میں آسمان سے ہمارے سامنے نازل ہو۔

(3) جس فرشتے جبرئیل (علیہ السلام) سے آپ ہم کلام ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اس فرشتے (جبرئیل علیہ السلام) سے ہمارے روبرو آپ کی گفتگو ہونی چاہیے۔

(4) (عیسیٰ علیہ السلام کی طرح) مردوں کو زندہ کر کے دکھایا جائے۔

(5) اور یہ پہاڑ جنہوں نے مکہ شہر کو چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے انہیں اٹھوا کر دور پھنکوا دو تاکہ لوگوں کو آزاد آب و ہوا سے لطف اندوز ہونا نصیب ہو۔

(6) مکہ معظمہ کے چاروں طرف ایسے چشمے پھوٹ نکلیں جن کا پانی زمزم سے زیادہ خوشگوار ہو۔

حقیقت یہ تھی کہ تمام گفتگو کا محرک ایک ہی مقصد یعنی آپ ﷺ کا تمسخر اڑانا تھا۔

اس پر ایک اور مطالبہ یہ بھی تھا۔
(7) تجارت کی ترقی کے لئے اپنے اللہ سے پوچھ کر روز کا بھاؤ بھی ہمیں بتا دیا کرو۔
چنانچہ اہلِ مکہ ان احمقانہ گفتگو کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔
قل لا املک لنفسی نفعا ولا ضرا الا ماشاء اللہ ولو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء ان انا الا نذیر وبشیر لقوم یومنون ○ (سورہ اعراف۔ 188)

"(اے رسول ﷺ) ان سے کہہ دیجئے کہ میں اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر خود اپنے فائدہ اور نقصان پر قادر نہیں ہوں۔ اگر میں اتنا ہی صاحبِ اختیار ہوتا تو خود اپنے لئے بہتری کے ذخیرے جمع کر لیتا۔ اور کوئی تکلیف اور مصیبت اپنے پاس بھی پھٹکنے نہ دیتا۔ مگر ان میں سے کوئی امر میرے اختیار میں نہیں۔ میں تو ایمان لانے والوں کیلئے (ان کے برے اعمال کے نتیجوں سے دلائل کے ساتھ) ڈرانے والا اور (اچھے اعمال کے نتیجوں سے) دلائل کے ساتھ خوشخبری دینے والا ہوں"

ان عقل کے اندھوں کو کون سمجھائے نبی اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ جس منصب کا اعزاز بخشتا ہے اس کی رو سے ان کا کام لوگوں کو ان کے برے اعمال کا حشر ان کے لئے کیا ہو گا اس سے ڈرانا اور اگر اچھے اعمال کریں گے تو پھر اس کا انجام کتنا اچھا ہو گا اس کی خوشخبری بہم پہنچانا ہے۔

یہ لوگ نبی اکرم ﷺ کی سچائی کی گواہی کے لئے ایسے احمقانہ ثبوت مانگتے ہیں جن سے عقل کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کے برعکس انکار کرنے والوں سے رسول اللہ ﷺ کا مطالبہ عقل و دانش کے مطابق تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی صداقت کی گواہ ہر ایک کے اندر وحی نفس جیسی قوت موجود تھی۔ اس کے علاوہ قرآن حکیم جیسے مرقعِ ہدایت کے ہوتے ہوئے کسی اور معجزے کی طلب حیران کن رجحان تھا۔ افسوس انہوں نے قرآن حکیم پر غور و تدبر نہ کیا۔ جو بذاتِ خود معجزات کا عظیم شاہکار ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے ان لوگوں نے معجزوں کو تصدیقِ رسالت کے لئے ضروری کیوں سمجھ لیا۔ بڑی حیرت ہے اور اگر ان کے مطالبات معجزات کی صورت مکمل ہو بھی جاتے تو بھی ان کے وسوسوں کا دور ہونا ممکن ہی نہیں تھا۔ بلکہ اغلب امکان یہ تھا کہ اگر معجزات پورے ہو جاتے تو یہ انکار کے لئے کوئی دوسری راہ نکال لیتے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے جن بتوں کو ان لوگوں (کافروں) نے اپنا مختارِ کل مان لیا ہے اپنی تقدیر کا مالک مان لیا ہے۔ یا جن کے ذریعہ یہ اللہ العالمین تک پہنچنے کی امید لگائے ان کے سامنے

سجدے کرتے ہیں۔ نذریں چڑھاتے' نیازیں دیتے ہیں' ان کو اپنا الہ ماننے سے پہلے ان کے معبود ہونے کے حق دار ہونے کی کون سی دلیل دیکھی تھی۔ کون سا معجزہ مانگا یا دیکھا تھا۔ صرف اس لئے اسے اٹھا کر بت خانوں میں سجا دیا کہ وہ صحرا میں گڑھا ہوا تھا۔ الٰہ مان لیا خود ہی تراشا اور خود ہی گھڑ کر بت خانوں میں اٹکا دیا۔

جب کہ ہر بت کی بے کسی کا یہ عالم کہ وہ خود اپنے نفع و نقصان پر قدرت نہیں رکھتا۔

دعوتِ حق سے انکار اور خود ساختہ بتوں سے بغیر دلیل مانگے معبود مان لینا کیسی عقلمندی ہے؟ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان بتوں سے دلیل طلب کرنا حماقت ہے۔ اگر ان سے دلیل مانگنے کے لئے سب مل کر لاکھوں التجائیں بھی کرتے تو بھی یہ سوکھی لکڑی اور بے حس پتھر جو زندگی کی بو سے بھی محروم ہیں نہ چل پھر سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں۔ دوسروں کو نقصان یا فائدہ پہنچانا تو ایک طرف خود ان پر کوئی مصیبت آ جائے تو اس کا دفاع بھی نہیں کر سکتے۔ اپنی اس بے بسی کے ہوتے ہوئے وہ اپنی دلیل کیا دے سکتے ہیں؟

دعوتِ حق اپنے دلائل کے ساتھ

اب نبی اکرم ﷺ نے بتوں کی بے بسی' بے چارگی کی دلیلیں عام طور پر سب کے سامنے بیان فرمانا شروع کر دیں۔ ان دلیلوں کا جواب تو تھا نہیں مگر قریش جھنجلا گئے۔ ان کے سینے پہ سانپ لوٹنے لگا۔ انہیں اپنا مستقبل تباہ ہوتا دکھائی دینے لگا۔ اس سے پہلے تو وہ آنحضرت ﷺ کا مذاق اڑانا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اپنی مشاورت گاہوں میں' اپنی عام اور ذاتی مجلسوں میں' کعبہ کے پاس بیٹھ کر بتوں کی پوجا کرتے تھے۔ ہر موقع پر آپ کا تمسخر اڑا کر دل کے پھپھولے پھوڑتے رہتے تھے۔ تنہائیوں میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے لات و عزیٰ کے بیکار ہونے کی دلیلیں سن سن کر اپنے معبودوں کی غم خواری کے غم میں انگاروں پر لوٹتے تھے۔

لیکن اب معاملہ ان کے اختیار سے بہت آگے نکل چکا تھا۔

ان حالات میں انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ اگر محمد ﷺ مکہ کے عوام کو قریش کے خلاف بھڑکانے میں کامیاب ہو گئے یا مکہ معظمہ کے اردگرد کے لوگ بت پرستی چھوڑ کر مسلمان ہو گئے تو نہ صرف مکہ کا دینی تشخص تباہ ہو جائے گا بلکہ بیرونی تجارت اور بہت بڑی منڈی ختم ہو جائے گی۔

دباؤ کی ایک صورت

اگرچہ یہ بات سب کو معلوم تھی کہ جناب ابو طالب اسلام سے کنارہ کش ہیں مگر اپنے بھائی

کے بیٹے کی حمایت سے کسی صورت دست بردار نہیں ہوں گے۔ پھر بھی انکی مجلسِ شوریٰ نے تین بار اپنا وفد ان کے پاس نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دباؤ ڈالنے کے لئے بھیجا

پہلا وفد

ابو سفیان بن حرب کی صدارت میں پہلے وفد نے ابو طالب کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔

سیدِ محترم! آپ کے بھائی کے بیٹے نے ہمارے خلاف محاذ قائم کر رکھا ہے۔ ہر وقت سرِبازار ہمارے بتوں کی توہین کرنا ان کا مشغلہ ہے کئی بار منع کرنے کے باوجود ہمارے دین میں نقص نکالنا نہیں چھوڑا' قریش کے اسلاف پہ نکتہ چینی کرنا ان کا شعار بن چکا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہمارے بزرگوں کو برملا گمراہ کہتے ہیں۔ ہماری قوم کے بزرگوں کے بارہ میں ان کی باتیں سن سن کر ہمارے دلوں میں ناسور ہو گیا ہے' لہٰذا آپ سے درخواست ہے کہ

(1) ان کو ان باتوں سے روکئے (2) یا ان کی حمایت چھوڑ دیجئے۔ ہم خود ان سے نپٹ لیں گے۔ ہمارے لئے آپ کا اپنے دین پر قائم رہنا بڑے اطمینان کا باعث ہے۔

ابو طالب نے انہیں مناسب جواب دے کر روانہ کر دیا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تبلیغ دین کا فریضہ انجام دیتے ہوئے بتوں کی بے بسی کا ذکر لوگوں کے سامنے کرتے رہے۔ ماشاء اللہ اسلام لانے والوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اس صورتحال نے قریش کے دل کے ناسور کو اور گہرا کر دیا۔

ایک بار پھر

غصہ میں تلملائے ہوئے قریش نے ایک بار پھر مجلسِ شوریٰ میں فیصلہ کیا کہ ایک اور بااثر وفد جناب ابو طالب کی خدمت میں حاضر ہو۔ چنانچہ اس دفعہ یہ وفد قریش کے ایک انتہائی خوبصورت نونہال' حسن و جمال میں یکتا' شجاعت و وجاہت میں بے مثال نوجوان عمارہ بن ولید بن مغیرہ کو اپنے ہمراہ لے گیا اور ان سے درخواست کی۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہمارے حوالے کر دیجئے اور ان کے بدلے میں عمارہ کو اپنی فرزندگی میں لے لیجئے۔

مگر جناب ابو طالب نے ان کی اس تجویز کو مسترد کر دیا اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدستور اپنا فریضہ رسالت و نبوت سرانجام دیتے رہے۔

تیسری بار ایک اور وفد

پھر ایک بار مجلسِ شوریٰ قائم ہوئی اور پھر وفد کی صورت جناب ابو طالب کے حضور میں یہ مطالبہ پیش کیا گیا۔

اے ابو طالب! ہمیں اعتراف ہے کہ آپ عمر میں بھی ہم سب سے بڑے ہیں اور عزت و وقار کے لحاظ سے بھی قریش میں ممتاز و سربلند ہیں۔ اسی وجہ سے ہم نے پہلے بھی آپ سے دو بار درخواست کی کہ آپ اپنے برادر زادہ کو منع کر لیجئے لیکن افسوس آپ نے ابھی تک انہیں نہیں روکا۔

سردارِ قریش۔۔۔ اب معاملہ ہماری قوّتِ ضبط سے باہر ہو چکا ہے۔ آپ کے برادر زادہ اب بھی ہر وقت ہمارے بزرگوں کی توہین ہمارے اسلاف کی تذلیل اور بتوں کی مذمت میں مشغول ہیں۔

اب بھی اگر آپ نے ہماری بات پر توجہ نہ دی تو پھر ہمیں آپ سے جنگ کرنا ناگزیر ہو گا تا کہ معاملہ کسی آخری فیصلہ کن نتائج کو پہنچ جائے۔

قریش کے یہ تیور دیکھ کر ابو طالب کو بہت زیادہ احساس ہوا۔ اب انہیں کیا جواب دینا چاہئے کیا کرنا چاہئے اس فکر میں ڈوب گئے۔

ابو طالب اگرچہ اپنے برادر زادہ کے دین میں داخل نہیں ہوئے تھے، لیکن انہیں اپنے برادر زادہ کی توہین بھی تو کسی قیمت پہ گوارا نہیں تھی۔ البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلوا کر قریش کے مطالبے کا ایک ایک حرف بیان کرتے ہوئے کہا!

اے میرے برادر زادہ! میری اور اپنی زندگی کی بقا کو سامنے رکھتے ہوئے مجھے ایسی مصیبت نہ ڈالئے جسے میں برداشت نہ کر سکوں!

مہربان چچا کے خطرہ بردوش جملے سننے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ دیر خاموش رہے۔ لیکن ذرا سی دیر کے بعد ان کے تخیل میں پہلے کی سی روانی پیدا ہو گئی اور مستقبل کی سرزمین پر دو الگ الگ راہیں نظر آنے لگیں۔ کامیابی۔۔۔ اور شکست!

اب انسان اپنی زندگی میں راہ راست پر چل کر عزت و وقار کے ساتھ جئے گا۔

یا راہِ حق سے بھٹک کر ہلاک ہو جائے گا۔ اس کے بعد دو ہونٹوں میں حرکت ہوئی اور مدھم آواز میں جسے کوئی نہ سن سکے جو الفاظ پیدا ہوئے وہ دنیا کی آنے والی تاریخ کا رخ طے کر گئے۔ (مؤلف) یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان تاریکی میں مارا مارا پھرے، مرجھایا ہوا اور بے جان دین مسیح بھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ دنیا پر آتش پرستی کا قبضہ رہے۔ بے بنیاد اوہام کی پیداوار بت پرستی بھی قائم و دائم نہیں رہ سکتی۔

ضروری ہے کہ سچائی اپنی پوری چمک دمک کے ساتھ بے نقاب جلوہ افروز ہو۔

اب تو عقل و شعور کو بتوں کی غلامی سے آزاد ہونا ہو گا۔ دلوں کو وہم کی اندھیری کوٹھڑیوں سے نکلنا ہو گا۔ توحید ہی وہ قوت ہے جس کے سہارے انسان اپنی اڑان میں ملا ئکہ مقربہ سے ہم

دوش ہو سکتا ہے۔

میں جانتا ہوں میرے عم محترم! اپنی کمزوری کے سبب میری امداد نہیں کر سکتے' میرے مسلمان ساتھی بھی اپنی بے بسی کی وجہ سے میری حمایت سے قاصر ہیں۔ یہ لوگ قریش جیسے متحد کثیر التعداد اور مال دار گروہ کے مقابلہ میں جنگ کی جرات کیسے کر سکتے ہیں ـــــ کوئی میری مدد نہ کرے' وہ طاقتِ حق وہ قوتِ مطلق وہ مختارِ کل تو میری نصرت پر ہے۔ اس کے اچھے ناموں میں سے ایک نام "نصیر" ہے۔ جو ہمیشہ ایمان و یقین کے مالک لوگوں کی حمایت کرتا ہے۔ مدد کرتا ہے اور یہ جو چند روز پہلے مجھے وحی کے ذریعہ حکم ملا وللاخرۃ خیر لک من الاولیٰ (4) تو آخرت کی بھلائی فلاح و کامرانی میرے لئے تبھی ممکن ہے اللہ عزوجل نے مجھ پر جو ذمہ داری عائد کی ہے اس ذمہ داری میں میرے قدم ڈگمگانے نہ پائیں' اس کا حق ادا کرنے میں بال برابر سے بھی کم غفلت نہ ہونے پائے۔ اس حکمِ ربانی کے مطابق "خیر" جب ہی حاصل ہو سکتی ہے کہ میں وحیِ الٰہی کی تعمیل قم فانذر میں بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اپنی جان تک نثار کر دوں۔

دھمکی کا جواب

رسولِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دل میں یہ فیصلہ کر لینے کے بعد اپنے عمِ مہربان سے کہا۔

یا عم! واللہ! لو وضع الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علیٰ ان اترک ھذا الامر یظہر اللہ او اھلک فیہ ما ترکتہ

"اے عمِ محترم! اللہ جل شانہ کی قسم اگر اہلِ مکہ میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند بھی رکھ کر کہیں کہ چاند سورج کے بدلے میں تبلیغ رسالت کا فریضہ ادا کرنا بند کر دوں تو بھی مجھے منظور نہ ہو گا اور اگر اس راستہ میں مجھے ہلاکت نظر آئے تو بھی میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

ابو طالب کا استقلال

سبحان اللہ' سچائی کی عظمت اور ایمان کے جذبہ میں کتنی جرات و شجاعت ہوتی ہے کتنا اثر ہوتا ہے کہ اپنے برادر زادہ کا جواب سن کر ابو طالب کے دل میں خوف کی جگہ خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ ابو طالب کے روبرو پاکیزہ قوت اور ناقابلِ شکست عزیمت کا پیکر عظیم کھڑا تھا۔ جن کے بغیر عم بزرگوار کو نہ تو زندگی میں لطف محسوس ہوتا اور نہ ہی موت میں کڑواہٹ!

اپنا مذکورہ جواب دے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں سے تو ہٹ گئے مگر عم محترم کی بیان کردہ صورتحال کو سوچ کر مبارک آنکھیں نم آلود ہو گئیں مگر عزائم میں وہی جولانی تھی۔ کچھ لمحوں

کے بعد ابو طالب کی سوچ میں بھی ایک تلاطم سا پیدا ہوا اور وہ اپنے برادر زادہ کے موقف اور ان کے خلاف پوری قوم کے غیض و غضب کے تصور سے لرز گئے۔ اور آپ ﷺ کو دوبارہ اپنے پاس بلا کر کہا۔ میرے بھائی کے لخت جگر (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تمہیں لوگوں سے جو بات کہنا ہو بے دھڑک کہہ دیا کرو' مجھے کسی حال میں بھی تمہاری تکلیف گوارا نہیں! اس کے بعد ابو طالب نے بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کے تمام افراد کو اپنے گھر میں جمع کر کے ان کے سامنے اپنے برادر زادہ (علیہ السلام) کا موقف پیش کر دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو ان کی ذاتی بات چیت ہوئی تھی وہ بھی حرف بحرف کہہ دی۔ یہاں تک نبی اکرم ﷺ کے چہرہ پر آنے والے ان تاثرات کو بھی بیان کر دیا جو ان سے بات کرتے ہوئے ان کے چہرہ پرانوار "علیہ التحیہ السلام" پر نظر آئے تھے۔ گفتگو کا حاصل یہ تھا کہ جس طرح بھی ہو سکے ہم سب کو نبی اکرم ﷺ کی حمایت کرنا ہو گی۔

ابتدا میں تو نبی اکرم ﷺ قریش کی ایذا رسانی سے اس طرح ہی محفوظ رہے جس طرح ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے قیام پذیر ہونے کے بعد حصولِ معاش کے فکر سے آزادی حاصل ہو گئی تھی۔ علاوہ ازیں ام المومنین رضی اللہ عنہا اپنے ایمان اور وفا کی بناء پر عظیم القدر جلیل الشان شوہر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دانشمند وزیر بھی تھیں۔ جو اپنے آقا علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہر امکانی مصیبت کا توڑ تلاش کرنے میں بڑی معاون و مددگار ثابت ہوئیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے اصحاب کسی وقت اپنی کمزوری کی وجہ سے دشمن کے نرغہ میں پھنس جاتے تو ام المومنین رضی اللہ عنہا اس سے نجات دلانے کے لئے کوئی نہ کوئی راہ نکال لیتیں۔

مسلمانوں پر مشکلات کی یلغار

اب دشمنانِ حق غصہ میں زخمی شیر کی طرح بپھر گئے۔ ان کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی! اسلام لانے والوں کو پھر اپنے مذہب میں لوٹانے کی کوشش میں انہوں نے اپنے عیش و آرام کو لات مار دی! لیکن اور کوئی بس نہ چلا تو ہر قبیلہ نے اپنے میں سے مسلمان ہونے والے دور و نزدیک کے رشتہ داروں کو انتہائی دردناک تکلیفیں پہنچانا شروع کر دیں۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حبشی غلام تھے۔ اسلام لانے کے بعد انہیں انتہائی ظالمانہ سزاؤں کا تختہ مشق بنا دیا گیا۔ (1) انہیں کڑکتی دھوپ میں گرم ریت پر لٹا کر سخت گرم اور وزنی سل آپ کے سینے پر رکھوائی جاتی۔ انہیں مجبور کیا جاتا کہ وہ اسلام چھوڑ دیں یا موت قبول کر لیں مگر ایمان کی لاثانی عظمت و ہمت اور عزیمت کے مینار حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی زبان مبارک سے ہر نئی

اذیت کے جواب میں ایک ہی اعلان کا اعادہ ہوتا۔ ھو اللہ احد، ھو اللہ احد

حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر مصیبتوں اور اذیتوں کا حملہ ایک دن یا دو دن نہیں بلکہ کئی مہینوں اور سالوں تک رہا۔ آخر ایک دن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا گزر ادھر سے ہوا تو ان کا دکھ دیکھ کر برداشت نہ کر سکے اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو خرید کر آزاد کر دیا۔ اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اور بھی کئی کفار کے ہاتھوں اذیتیں سہتے ہوئے غلاموں کو خرید کر آزاد فرمایا۔ انہیں میں عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی ایک کنیز بھی تھی۔ قریشیوں کے جور، جبر و تشدد سے ایک مسلمان عورت شہادت کا مرتبہ پا گئی جسے کفار نے ہر قسم کے تشدد سے اسلام چھوڑنے پہ مجبور کیا مگر اس مومنہ نے جان دے دی لیکن اسلام کا دامن نہیں چھوڑا۔

ایک اور رُودادِ ستم

جبر و تشدد کا یہ سلسلہ غلاموں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ کفّارِ مکہ اور قریش نے آزاد مسلمانوں پر بھی ہر طرح کا ظلم و تشدد کرنے میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ یہاں تک کہ سرور دو عالم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بھی جو بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب دو قبیلوں کی پناہ میں تھے۔ ان کے جور و ستم سے محفوظ نہ رہ سکے۔ چنانچہ ابولہب کی بیوی (ام جمیل) نے معمول ہی بنا لیا تھا کہ گھر کی نجاست سمیٹ کر رسول دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہ میں پھیلا دیتی۔ اور کوہِ صبر و حلم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس گندگی کو راستے سے ہٹاتے ہوئے بغیر کچھ کہے نکل جاتے۔

ابوجہل کا نصیب پھوٹا۔

ایک دن ابوجہل کے نصیبوں میں تاقیامت ذلیل کن حرکت سوجھی اور ٹھیک اس وقت جب سید البشر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت اللہ شریف کے سامنے فریضۂ صلوٰۃ ادا کرنے میں مصروف تھے کہ ابوجہل نے قربان گاہ سے بکری کی اوجھ اٹھوا کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشت پر اس وقت رکھ دی جب آپ بارگاہِ الٰہی میں سجدہ کر رہے تھے۔ یہاں سے رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم اسی حالت میں کاشانہ نبوت علیہ السلام ہو گئے اور آپ کی صاحب زادی خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا نے آپ کی پوشاک کو دھویا صاف کیا۔

قریش کی طرف سے نہ صرف جسمانی سزا رسانی کا سلسلہ زوروں پر چلتا رہا بلکہ زبانی بھی انتہائی دل دکھانے والے جملے بھی آندھی کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نہیں بلکہ اس وقت تک یا جس وقت بھی کوئی لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کا اعلان کرتا۔ یعنی اس کی زبان سے ”اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اس کے رسول ہیں“ نکلتا تو اسی لمحہ قریش اور کفار مکہ کی طرف سے طرح طرح کی ہوش ربا تکلیفیں پہنچانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا لیکن ہر قسم کے جبر و تشدد کے باوجود یہ لوگ مسلمانوں کو ان کے

دین سے برگشتہ کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے بلکہ دین برحق پر قائم رہنے والے مسلمانوں کے استقلال، ثابت قدمی اور ایمان میں اور استحکام پیدا ہوتا گیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ رسول ﷺ کے تمام صحابہ اور صحابیات ایمان کی حفاظت میں ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے بروقت تیار رہتے اور اس میں اپنی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

مکی دور

مکہ معظمہ کا یہ دور آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کے لئے بڑا ہی المناک اور حیرت انگیز واقعات کا مرقع ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھی رضی اللہ تعالیٰ عنہم ایمان کے مقابلہ میں دنیا کی دولت و سطوت، منصب و مقام حتیٰ کہ بادشاہت کو بھی پائے حقارت سے ٹھکرا دینے کو دل و جان سے عزیز مانتے ہیں ان کے نزدیک دین و ایمان ایسی نظر نہ آنے والی البتہ محسوس کی جانے والی نعمت تھی کہ جو لوگ بھی ان اسلام لانے والوں پر وحشیانہ تشدد کرتے یہ ان کو بھی اس دینِ اسلام میں لانے کی کوشش کرتے، ان کے دل چاہتے تھے کہ ہمیں دکھ دینے والے خود بت پرستی کے نتیجہ میں جہنم کے دکھ سہنے سے آزاد ہو جائیں۔ اس عذاب سے نجات پا جائیں جس سے انسان کی روح ہمیشہ ذلت و پستی میں ڈوبی رہتی ہے۔

اور کتنا عجیب ماجرا ہے کہ جن لوگوں کی فلاح و بہبود، بھلائی اور سکون کے لئے نبی ﷺ نے منصبِ نبوت سنبھالا تھا، جن کی اصلاح اور ہدایت کے لئے اپنا آرام و سکون چھوڑ دیا تھا۔ انہیں کے ہاتھوں ان کے سچے ہمدرد و غم خواروں سے ایسا وحشیانہ سلوک! توبہ توبہ! جن کی بھلائی کے لئے نبی رحمت ﷺ کی آنکھیں نمناک رہتیں، دل سے دعائیں نکلتیں، انہیں میں سے کچھ لوگ اپنے شعروں میں رسولِ کل عالمؐ کی برائیاں کرتے، قریش نے ایک بدبخت کو اکسایا کہ وہ مصلحِ اعظم ہادی برحق ﷺ کو کعبہ کے سامنے قتل کر دے۔ آستانہ نبوت علیہ السلام پر پتھر برسائے جانے لگے۔ شمعِ رسالت ﷺ کے پروانے اور انصار دونوں گروہ مصیبت میں پھنس گئے مگر تاریخ کے اوراق پر آج جلی اور واضح تحریر لکھی ہوئی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے حوصلوں میں کمی نہ آئی، بلکہ آئے دن ہمت و استقلال میں اضافہ ہوتا گیا۔ اسی طرح فرماں بردارانِ محمد ﷺ کے صبر و رضا کی عظیم الشان مثالیں آج بھی تاریخ کے اوراق پر درخشندہ لفظوں میں کندہ ہیں۔ ان کی روح اور کردار میں بھی وہی جرات و

جسارت ہے۔ وہی شجاعت و وجاہت ہے۔ جو ان کے ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد میں

لو وضع الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علی ان اترک ھذا الامر، حتی یظھرہ اللہ او اھلک فیہ ما ترکتہ

"اللہ کی قسم اگر اہلِ مکہ میرے دائیں ہاتھ پہ سورج اور بائیں ہاتھ پہ چاند رکھ کر کہیں کہ منصبِ رسالت کو ترک کر دوں تب بھی میں اسے ترک نہیں کروں گا۔ یہاں تک کہ دین غالب ہو جائے"

جراتِ ایمانی سے لبریز ایسے ہی حوصلوں سے لبریز اصحابِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی کفار سے پہنچنے والی اذیتوں میں لطف محسوس ہونے لگا۔ اس راہ میں موت ان کو زندگی کی خوبصورت دلہن نظر آنے لگی، جب مکہ کے لوگ ان کو اذیتیں دیتے جب ان پر جسمانی اور روحانی تکلیفوں کی بھرمار کرتے تو یہ ان کو توحید کا وعظ سنانا شروع کر دیتے، جو ان کے دلی سرور و راحت کی واضح علامت ہوتی۔

غور فرمایئے ان واقعات کی تفصیل کتنی حیرت افزا ہے۔ مکہ میں اسلام لانے والے مسلمانوں کے دلوں میں ایمان کا ایسا عظیم الشان بسیرا جبکہ نہ تو ابھی دین مکمل ہوا تھا اور نہ ہی قرآن حکیم کی آیات زیادہ تعداد میں نازل ہوئی تھیں۔ لہٰذا ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ اس کی وجہ صرف اور صرف یہی ایک تھی کہ ان مسلمانوں کے خلوص، ثبات و استحکام کے عوامل میں رسول امین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاص، محبت، حسنِ اخلاق، صداقت، مستحکم قوتِ ارادی، ثابت قدمی اور قوتِ عزیمت جیسے جوہر الجواہر کا عمل دخل تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ اثرات بھی جن کی روئیداد کچھ اس طرح سے بیان کی جا سکتی ہے۔

اس دور میں مکی زندگی کا نظام

رسول اللہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سرزمین میں آنکھیں کھولیں جہاں کا نظام شخصی حکومت کے بجائے جمہوری نظام کے مشابہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی خاندانی وجاہت کی بناء پر بذاتِ خود بھی ممتاز و موقر تھے۔ ضروریات میں دوسروں کے محتاج نہ تھے، سیادت و عظمت کے اعتبار سے اس قبیلہ کے فرد تھے جو کعبہ کی حجابت اور حاجیوں کی سقایت (پانی پلانے یا فراہم کرنے) میں تمام ہم عصروں میں سرفراز تھے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذاتی صلاحیت و قابلیت اور اخلاق کی بناء پر پوری قوم سے "امین و صادق" کے اعلیٰ ترین القاب و خطاب حاصل کئے تھے۔ اس لئے یہ سوال پیدا ہی نہیں ہوتا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال و جاہ یا دینی اور سیاسی برتری حاصل کرنے کے محتاج ہوں جبکہ بعض سابقہ انبیائے کرام سے ایسے امکانات کی جھلکیاں

نظر آتی ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعوت سیاسی انقلاب پر مبنی تھی

مثلاً موسیٰ علیہ السلام مصر میں ظہور فرما ہوئے جہاں کے باشندے فرعون کو اپنا رب ماننے پر مجبور تھے اور فرعون نے انہیں اپنی حکمرانی کے چکر میں گرفتار کر رکھا تھا۔ مصر کے کاہن اور بادیہ نشین بھی دنیوی طمع اور لالچ کی وجہ سے فرعون کی ستم رانی میں اس کے معاون بن گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ احکم الحاکمین نے (بقول مولف) حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جس انقلاب کے لئے مامور فرمایا۔ وہ اصلاً" سیاسی انقلاب تھا۔ اور ضمناً دینی! حضرت موسیٰ چاہتے تھے کہ فرعون اور غریب باشندے دونوں اپنے اللہ کے سامنے ایک مقام پر کھڑے ہوں مگر اس ملک مصر میں امیر اور غریب میں اس وقت تک مساوات قائم نہیں ہو سکتی جب تک فرعون کی آمرانہ عنان حکومت خود تہہ و بالا نہ ہو جائے۔ اور اس کے لئے سیاسی انقلاب بہت ضروری تھا۔ (شریعت میں کوئی نبی سیاسی انقلاب کے لئے نہیں آیا بلکہ صرف دینی انقلاب کے لئے آیا ہے۔ مترجم)

فرعون نے اپنی آمرانہ حکومت کو انقلاب کی زد سے بچانے کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ اپنی پوری قوت کے ساتھ کرنا چاہا مگر اللہ کے رسول جو بادشاہ کے سامنے کسی ہیبت و شوکت کا مظاہرہ کرنے سے قاصر تھے۔ انہوں نے نبوت و رسالت کے شانِ شایاں لوگوں کو ایک معجزہ دکھایا کہ جب فرعون کے جادوگروں کی رسیاں سنپولے بن کر سرسرانے لگیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا زمین پر لٹا دیا۔ جو اژدھا بن کر ان سنپولوں کو نگل گیا۔ مگر اس پر بھی موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کے مقابلہ میں مقصد برآری حاصل نہ ہوئی۔ وہ مصر سے ہجرت پر مجبور ہو گئے۔ اور ہجرت میں بھی ان سے ایک اور معجزہ رونما ہوا۔ جب سمندر کی ایک لکیر جناب موسیٰ اور ان کے ایک ہم سفر کے لئے پگڈنڈی کی شکل میں پایاب ہو گئی اس راہ سے انہوں نے اپنی منزل طے کر لی۔ (مؤلف ترقی پسندی میں زیادہ ہی بڑھ گئے ہیں۔ فرعون کی افواج کے غرق ہونے کا ذکر گوارا نہیں فرماتے۔ مترجم)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت

حضرت موسیٰ کے بعد فلسطین کے نواح میں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کا ظہورِ قدسی ہوا' ان کی جائے پیدائش کا نام "ناصرہ بستی" ہے۔ اس زمانے میں فلسطین قیصر روم کے ماتحت ہونے کی وجہ سے شاہی حکام کے ظلم و ستم کا تختہ مشق بنا ہوا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کو عمالِ شاہی کے مظالم پر صبر کی تلقین کرتے رہے۔ اور اللہ العالمین کے حضور میں اپنے گناہوں کی معافی اور ان پر اللہ تعالیٰ کی بے حدو حساب نعمتوں کے اعتراف میں شکر اور دعاؤں کا درس دیتے رہے

چنانچہ حکومتِ وقت اور اس کے کارندوں نے مومنین میں اتنی سی تبدیلی بھی اپنی سیاست و اقتدار کے لئے خطرہ کی گھنٹی سمجھی۔

جناب مسیح علیہ السلام نے لوگوں پر اپنی تعلیم کا اثر قائم رکھنے کے لئے یکے بعد دیگرے معجزات دکھائے۔

کئی مردوں کو دوبارہ زندگی اور کہیں موت کے قریب لوگوں کو مہلک بیماریوں سے نجات دی۔ اسی طرح کئی اور معجزات جن کے ذریعہ وحدہ لاشریک نے روح القدس نبی اللہ (مسیح ابن مریم) کی امداد فرمائی۔ لوگوں کو دکھائے۔

ہمیں اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی حیل و حجت نہیں کہ جناب موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور رسولِ آخر الزماں سب کی تعلیم کا اصل ایک ہی جوہر ہے۔

البتہ فرق ان جزئیات کا ہے، جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ لیکن جناب موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور رسول الثقلین سیدنا محمد ﷺ کی دعوت کے مقدمات مختلف ہیں۔

جناب موسیٰ اور جناب ابنِ مریم دونوں کی دعوت سیاسی انقلاب کے لئے تھی (مؤلف کو اپنی دانشوری پہ حد سے زیادہ اعتماد ہے)

جناب محمد ﷺ کی دعوت خالص عقلی و روحانی تھی۔

دعوت محمدیہ کا ہر پہلو جمالِ معنوی اور حسنِ ظاہری کا دلکش مرقع تھا، اس لئے اہل مکہ کے سیاسی اور جمہوری انقلاب سے ٹکرانا آپ کا اصل مقصد نہ تھا۔

دعوتِ محمدیہ اور جدید علمی تجزیہ

اگر جدید علمی طریقہ سے دعوتِ محمد ﷺ کا تجزیہ کیا جائے تو حضرت محمد ﷺ کی دعوت کے نتائج بالکل موجودہ عقلی اور فکری تقاضوں کے مطابق ہیں۔ کیونکہ تحقیق کا موجودہ اسلوب یہ ہے کہ پہلے آپ اپنے سابقہ عقائد و نظریات سے بالکل الگ ہو جائیں اس کے بعد نفسِ مسئلہ کی از سرِنو تحقیق کیجئے پھر پیشِ نظر سوال کے حل پر جہاں نظر رکھے، اس کے تحت موازنہ اور ترتیب کے بعد نتائج اخذ کیجئے۔ آپ کے اس نتیجہ کو تب صحیح تسلیم کیا جائے گا، جب آپ خود ہی دوسری مرتبہ یا کوئی اور محقق اسی اسلوب سے مطلوبہ مسئلہ کے لئے ایسے ہی مقدمات ترتیب دے کر آپ کے اخذ کردہ نتیجہ کے خلاف استنباط نہ کرے۔

گویا فکرِ انسانی کو صحیح طور پر سانچے میں ڈھالنے کی تدبیر صرف یہی ہے۔ اور یہی طریق

آنحضرت ﷺ کی اساس دعوت کی تحقیق کے لئے ضروری ہے۔

یہ معلوم کیا جائے کہ ان کے پیروکار ان پر ایمان کن اسباب کی بناء پر لائے؟

انھوں نے اپنے سابقہ عقیدہ سے کیوں اجتناب کیا؟

عرب قبائل جن کے ہر ایک قبیلہ کا بت جدا جدا تھا۔ ان بتوں میں سب کے سب جھوٹے معبود تھے یا کوئی ان میں کوئی ایک حق و صداقت کا پہلو بھی لئے ہوئے تھا؟

عرب اور اس کے گردونواح میں صابی مذہب چل رہا تھا اور کہیں آتش پرست مجوسیوں کی گرم بازاری تھی۔ ان میں بھی کوئی اپنے مسلک میں حق بجانب تھا یا دونوں باطل کے علم بردار تھے؟

آیئے اس تمیزو تفریق سے الگ ہو کر لوح دل سے ان حروف کو مٹا کر گہری نظر سے غور کریں کہ روحِ حقیقت کس مذہب میں پوشیدہ ہے؟

ناقابلِ انکار حقیقت

کائنات کا ہر فرد حلقہ زنجیر کی صورت ایک دوسرے سے وابستہ ہے۔ نوع انسان کا دوسرے حیوانات سے ربط و تعلق اور دونوں کا جمادات و نباتات سے تعلق تاباخر زمین تک یہ سلسلہ مربوط ہے۔ چاند اور سورج کا آسمان سے ربط اور ان سب کا۔ زمین سے ربط۔ سبھی اسی ربط کی بناء پر اپنے محور میں گردش کر رہے ہیں۔ ان میں سے جس تناسب تک ایک کو دوسرے (کرہ) کے ساتھ تعلق واسطہ ہے۔ وہ اسے نباہنے میں مجبور و پابند ہے۔

اگر ان اجرام میں سے کوئی ایک بھی اپنے عمل میں ذرہ برابر بھی کمی یا زیادتی کر جائے تو پورا نظام درہم برہم ہو جائے۔ سورج اگر معمول کے مطابق اپنی روشنی اور حرارت میں بخل سے کام لے تو نتیجہ میں تمام کائنات کا شیرازہ بکھر جائے۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ عالم کا ذرہ ذرہ اپنے مقررہ عمل میں سرگرم ہے۔ اسی وجہ سے کائنات میں خلل رونما ہونے نہیں پاتا۔

جس طرح مذکورہ حقائق مسلم ہیں۔ اسی طرح اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سورج، چاند اور اس کے دوسرے فلکی ثوابت و سیار اور ارض و فلک حتیٰ کہ کائنات کے ہر ذرہ کا جس طرح ایک دوسرے سے ربط ہے اسی طرح ان سب کا ربط ایک ایسی قوت غالب کے ساتھ ہے جو نہ صرف ان کے ایک دوسرے ساتھ ربط و تعلق کی نگہبان ہے بلکہ وہی قوت ان کے آپس میں تصادم پر بھی کڑی نگاہ رکھتی ہے۔ اور یہ وہی قوت ہے جس کی نگاہ کرم کے طفیل اجرام کائنات وجود میں آئے۔ وہی ذات احکم الحاکمین، خالقِ کل، غالب و قوی جس کی توجہ اور حکم کی اطاعت میں تمام اجرام میں سے ہر ایک اپنی اپنی راہ پہ گامزن ہے۔

لیکن ایسا وقت بھی آنے کو ہے جب یہ اجرام اسی ذات کے اشارے پہ اپنی ہستی ختم کر

دیں گے۔ اس قطرہ باراں کی طرح جو دریا میں غوطہ لگا کر اپنے اس کل (دریا) کے جلوہ میں داخل ہوتے ہی خود کو بھول جاتا ہے۔ انسان کو بھی اسی روحِ جاوداں کی پیروی کرنا چاہئے۔ جس کے حضور تمام کائنات سر بسجود ہے۔
(مؤلف کا یہ نظریہ بھی قرآن و حدیث سے ٹکراتا ہے۔ مترجم)

انسان اور کائنات اور زمان و مکان جو بظاہر دیکھنے میں لباس و شکل میں ایک دوسرے سے الگ ہیں لیکن کائنات کے قیام اور ٹھہراؤ میں بہت زیادہ اثر رکھنے کی وجہ سے ایک دوسرے سے مربوط رہ کر ایسی ذات کے مظاہر ہیں جو ان تمام اجرامِ کائنات (فلاں و فلاں) کا منبع و مصدر ہیں۔ (مؤلف کا یہ خیال بھی قرآن' حدیث' تمام انبیاء' صحابہ کرام اور ائمہ کے خلاف ہے وہ منبع و مصدر نہیں بلکہ سب کا خالق و باری ہے) اس لئے وہ ذات وحدہ لاشریک تنہا عبادت کے لائق ہے۔ جس طرف فطرتاً روح اور دل قطب کی سوئی کی طرح بروقت اپنا رخ کئے ہوئے ہے اس حقیقت کو پا جانے کے بعد ہر قسم کے بت' بادشاہ' فرعون' آگ' سورج یا اس قسم کے تمام معبود ناکارہ ثابت ہو جاتے ہیں اور اس کی ذات اور خالق و باری کے سامنے سجدہ کئے بغیر کوئی راہ فرار نہیں رہتی۔ جبکہ انسان کی اپنی ذاتی استعداد اور اس کی عقل و فہم کو "سنت اللہ" کو گہری نظر سے مطالعہ کرنے پر قدرت حاصل ہے۔ اس چیزوں کی پرستش کوئی معنی ہی نہیں رکھتی۔

دعوتِ محمد ﷺ کا یہی وہ جوہر ہے جسے مکہ معظمہ کے ان خوش بخت لوگوں نے خوب پرکھ جانچ کر قبول کیا اور انتہائی اولین زمانہ میں مسلمان ہوئے۔ وحی نے جسے فصاحت و بلاغت کے ساتھ صاف اور واضح انداز میں بیان کیا۔ جسے معجزہ کہئے تو بے جا نہ ہو گا اور ذیل کی آیات میں جس کامل بیان کے ساتھ اس سچائی کی حسین و جمیل تصویر کھینچی اسے دیکھ کر مکہ کی پاک روحوں نے اسے اپنے دلوں میں اتار لیا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو یقین دلا دیا کہ اس حقیقت کو سمجھنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ جس کسی نے آنحضرت ﷺ کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق نیکی کی' وہ اس حقیقت تک رسائی کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔ سیدنا محمد ﷺ نے ان مسلمانوں پر یہ بات بھی واضح کر دی کہ اگر وہ سچے دل سے اس راہ پر چلیں گے تو انہیں آج بھی اس نیکی کا پھل ملے گا اور اس روز بھی وہ اس کے اثرات سے فیض یاب ہوں گے۔ جب ہر نفس کو اس کے اعمال کی جزا ملے گی۔ یوم تجزی کل نفس ماکسبت (17-40)
اس دن ہر شخص اپنے کئے کی جزا پائے گا۔

فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا" یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا" یرہ (7، 8-99)
ترجمہ۔ اس روز جس نے ذرہ برابر بھی نیک عمل کیا ہو گا اسے بھی دیکھ لے گا۔ اور جس نے

ذرہ برابر بھی برا عمل کیا ہو گا اسے بھی دیکھ لے گا۔ گویا انسان اپنے اعمالِ حسنہ یا اعمالِ بد کے مطابق فیصلہ پائے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ صرف اور صرف اسلام ہی کے پیش کردہ دستورِ حیات نے انسانی معاشرہ کی ترقی اور انسانیت کو اعلیٰ مقام دلانے کی واضح اور بے نقص راہیں معین کی ہیں اور صدیوں سے نہ معلوم کتنی اور کیسی کیسی ذلت آمیز غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے انسان کو ان سے نجات دلائی ہے۔ اسے آزادی اور عزتِ نفس سے متعارف کرایا ہے اور دلائل کے ساتھ سمجھا دیا کہ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانا اور اس حقیقی معبود کو ہی اپنا معبود مان لینے میں ہی انسان کا اپنا وقار ہے' عزت ہے اور اس کے پیش کردہ دستورِ حیات (شریعت) کے مطابق زندگی بسر کرنے سے ہی اسے اپنا بلند تر مقام و عظمت رفتہ حاصل کرنا ممکن ہے۔ رہا اس راہ پہ چلتے ہوئے ابتدا کی مشکلیں تو انجامِ کار عظیم کامیابی پہ نظر ہو تو یہ بھی خوشگوار اور مسرت بخش محسوس ہونے لگتی ہیں۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا ایمان لانا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کی صداقت و استقامت کا اثر دیکھ کر بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت کا جذبہ اور زیادہ ہو گیا۔

ایک دن ابوجہل نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سربازار بدکلامی کی' رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو بغیر کوئی جواب دیئے وہاں سے چلے گئے مگر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جو آپ کے برادر رضاعی بھی تھے اور عم بزرگوار بھی۔ انہیں شکار کا بہت شوق تھا۔ اس کے ساتھ انکا یہ بھی معمول تھا کہ شکار گاہ سے لوٹتے تو گھر جانے سے پہلے بیت اللہ کا طواف ضرور کرتے۔

اس روز جیسے ہی حمزہ رضی اللہ عنہ شکار سے واپس آئے اور بیت اللہ شریف میں طواف کے لئے بڑھے تو کسی نے راستہ میں ہی ابوجہل کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر زیادتی کا پورا احوال بیان کر دیا۔ جسے سنتے ہی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کسی اور شخص کی طرف دیکھے بغیر سیدھے کعبہ شریف میں پہنچے اور ٹھیک اس وقت جب ابوجہل وہاں آلتی پالتی مارے بیٹھا شیخیاں بگھار رہا تھا' حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے جاتے ہی اس کے سر پر اس زور سے کمان ماری کہ اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ اور قبیلہ مخزوم کے لوگ جو اس وقت وہاں موجود تھے۔ اپنے سردار کی حمایت کے لئے بڑھے مگر ابوجہل نے یہ کہہ کر معاملہ رفع دفع کرایا کہ زیادتی کی پہل میری طرف سے ہوئی تھی۔

اس کے بعد ہی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ایمان لانے کا اعلان فرماتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔ آج سے آپ کی نصرت و حمایت میرے لئے میری جان سے زیادہ

عزیز ہو گی۔ انشاء اللہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور قریش کے سفیر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثابت قدمی اور دین اسلام کی مسلسل بڑھتی ہوئی مقبولیت سے قریش کے دل لرز گئے۔ انہوں نے اچھی طرح ہر طرح کا جبرو تشدد کر کے دیکھ لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی اسلام کا دامن نہیں چھوڑتے اب تو ہمارے سامنے اعلانیہ طور پر نمازیں پڑھنے سے بھی نہیں جھجکتے۔

قریش نے سدِباب کے لئے پھر مجلس شوریٰ قائم کی۔ جس میں سب کے سب ایک منصوبہ پر متفق ہو گئے۔ لیکن ہمارے خیال میں انہیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ان کی سیاست و حکمرانی غبارِ راہ سے بھی کم حیثیت رکھتی تھی۔ ان کا مطمعِ نظر تو اللہ جل شانہ کے کلمہ کو سربلند کرنا تھا۔ توحید سے روحانیت کو سرشار کرنا تھا۔

چنانچہ قریش نے اپنے منصوبہ کے مطابق باہم مشورہ کے بعد بیت اللہ شریف میں ہی حلقہ نشیں ہو کر عتبہ بن ربیعہ کو بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اپنا سفیر بنا کر بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ عتبہ بن ربیعہ نسب میں انتہائی ممتاز مقام رکھنے کے علاوہ بیحد فراست کے بھی مالک مانے جاتے تھے۔

ان کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو اس وقت کعبہ میں ہی ایک کونہ میں تنہا مشغولِ عبادت تھے' ان کے پاس جائیں اور انہیں دعوتِ دین سے دست بردار ہونے کے بدلے میں ان کی منہ مانگی دولت پیش کریں۔ اس پر بھی نہ مانیں تو اس قبیلہ قریش کی قیادت و سیادت کا منصب پیش کریں۔ چنانچہ عتبہ بن ربیعہ نبیِؐ کل عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔

یا ابن اخی انک مناحیث قد علمت اتیت من المکان فی النسب۔ وقد اتیت قومک بامر عظیم فرقت بہ جماعتھم۔

"اے میرے چچیرے بھائی! ہمیں اعتراف ہے کہ آپ قریش میں سے عالی نسب ہیں لیکن آپ نے اپنی ہی قوم کے اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے"

فاسمع منی اعرض امورا" لعلک تقبل بعضھا؟

میں آپ کے سامنے چند تجاویز پیش کرتا ہوں۔ ہو سکتا ہے ان میں سے کوئی ایک آپ قبول فرما لیں۔ تجویزیں یہ ہیں۔

(1) کنت انک ترید بھذا الامر مالا جمعنا لک من اموالنا حتٰی تکون اکثرنا مالاً"!
(1) اگر اس دعوتِ دین کا مقصد بہت سا مال جمع کرنا ہے۔ تو ہم لوگ آپ کے لئے اتنی دولت جمع کرسکتے ہیں کہ عرب میں آپ سے زیادہ کوئی دولت مند نہ ملے۔

(2) وان کنت تریداً" تشریفا" سودناک علینا فلنقطع امراً" دونک

(2) اور اگر یہ ارادہ ہو کہ آپ کی سیادت و قیادت مانی جائے تو بھی ہم خوشی سے آپ کی سیادت و قیادت ماننے کو تیار ہیں۔

(3) وان کنت ملکا ملکناک علینا

اور اگر آپ بادشاہت چاہتے ہیں۔ تو ہمیں یہ بھی منظور ہے۔

(4) وان کان الذی یاتیک رئیا تراہ لا تستطیع ردہ عن نفسا۔

اگر آپ آسیب زدہ ہیں۔ اور اس کا علاج کرانے سے معذور ہیں تو ہمیں فرمائیے۔

طلبناک الطب وبذلنا فیہ اموالنا حتٰی تبرا"

ہم آپ کے لئے معالج اور علاج پہ ہونے والے تمام اخراجات آپ کے شفایاب ہونے تک خود برداشت کریں گے۔

جواب — جب عتبہ اپنی معروضات پیش کر کے خاموش ہو گیا! تو نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ اے عتبہ کچھ اور بھی کہنا ہے؟

عتبہ نے عرض کیا۔ جی نہیں۔۔۔ اتنی ہی معروضات تھیں جو پیش کر دیں۔

تب رسول اللہ ﷺ نے جواب میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر سورہ "حم سجدہ" کی ابتدائی 38 آیات تلاوت فرمائیں۔

حم۔ تنزیل الرحمٰن الرحیم۔ کتٰب فصلت آیاتہ قرآنا" عربیا" لقوم یعلمون ایک سے لیکر 38 آیات فھم لا یسئمون تک

"یہ آیات اللہ جو بیحد مہربان اور بے حساب رحم کرنے والا ہے اس نے نازل فرمائی ہیں۔ ایسی کتاب کی صورت جو عربی زبان میں ہے اور ان لوگوں کے لئے سودمند ہے جو سمجھنا چاہیں"

ادھر سیدِ عرب و عجم ﷺ تلاوت فرما رہے تھے۔ ادھر عتبہ اپنی کمر پہ دونوں ہاتھ رکھے حیرت میں گم غور سے سنتا رہا۔ نگاہیں جلال و جمال نبوت پہ جمائے سوچتا رہا۔ کتنی عظیم سے عظیم تر ہے یہ ہستی، جسے نہ ہی دولت کا لالچ ہے اور نہ ہی کسی دنیوی منصب کی خواہش۔ بلکہ فرماں روائی یا حکومت و سروری تو اس ہستی کی نگاہوں میں تنکے جیسی قیمت بھی نہیں رکھتی۔ (علیہ التحیۃ والسلام) اب دل ہی دل میں اسے اس اللہ تعالٰی کے بعد بزرگ و اعلیٰ ہستی

کو آسیب زدہ کہنا اپنے لئے باعث ندامت محسوس ہونے لگا۔ اس سید العرب و عجم علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے نکلنے والے کلام الٰہی کا ہر لفظ بے کنار حقیقتوں کا سمندر ہے۔ یہ تو انسانی معاشرہ کو نیکی کا عادی بنانا چاہتا ہے اور اللہ عزوجل کی امداد حاصل ہونے کے باوجود وہ اس عمل کی تبلیغ انتہائی نرمی اور شفقت سے کرنا چاہتا ہے۔ اس کی تلاوت کی ہوئی آیات تو فصاحت و بلاغت میں بے مثال ہیں۔ عتبہ کا دل و دماغ آنحضرت ﷺ کی عظمتوں کے سامنے خاموش تلاطم میں غرق کھڑا تھا کہ نبی ﷺ نے فرمایا۔ میرا جواب یہی ہے عتبہ! اور خود دوسری طرف چل دیئے۔ عتبہ اپنے منتظر ساتھیوں کی طرف بڑھ گیا اور نبی آخر الزماں ﷺ کے جمال و جلالِ نبوت سے بے انتہا متاثر اور قرآنِ حکیم کی آیات ان کی فصاحت و بلاغت سے مسرور ان کے پاس پہنچا اور کہا۔

ان تترک للعرب محمدا" فان تغلبت علیه استراحت قریش وان اتبعته فلما فخارها

محمد ﷺ کو مہلت دی جانا چاہیئے۔ اگر عرب ان پر غالب آ گئے تو قریش کو ان سے خود بخود نجات مل جائے گی۔ اور اگر عرب ان کے تابع ہو گئے تو فخر قریش کے لیئے ہو گا۔

لیکن قریش کو اس دانشور کا مشورہ پسند نہ آیا۔ ان کی دشمنی بڑھ گئی اور انہوں نے آنحضرت ﷺ پر اور ان کے ساتھیوں پر جبرو تشدد کرنے کی مہم اور تیز کر دی البتہ خود رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کی نصرت اپنے خاندان اور عم بزرگوار کے اقبال کی وجہ سے کفار سے کے مظالم سے محفوظ رہے۔

ہجرتِ حبشہ

جب قریش کے ظلم و ستم بے انتہا ہو گئے وہ جب چاہتے کسی مسلمان کو مار پیٹ لیتے۔ جب چاہتے مسلمان کو قتل کر دیتے۔ صورتحال کی نزاکت مدنظر رکھتے ہوئے آنحضرت ﷺ نے مظلوم مسلمانوں کو عرب سے باہر پناہ لینے کا مشورہ دیا۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی یا رسول اللہ دنیا میں کون سا ملک ہم کو پناہ دے سکتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا۔ حبشہ کی مسیحی سلطنت میں تمہیں آرام مل سکتا ہے۔

فان بها ملكا لا يظلم عنده احد وهى ارض صدق حتى يجعل الله لكم فرجا" معا انتم فيه!

"اس بادشاہت میں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔ وہ سچائی کی سرزمین ہے۔ جب تک یہاں کے حالات سازگار نہیں ہوتے تم لوگ تب تک ہجرت کر کے وہاں چلے جاؤ"

چنانچہ مسلمان دربارِ حبشہ میں ہجرت فرما ہوئے۔

تعداد

پہلی بار مہاجرین کی تعداد مرد گیارہ اور محترمات عورتیں چالیس تھیں جو چھپ چھپا کر مکہ معظمہ سے ہجرت کر گئے اور حبشہ میں امن سے دن گزارنے لگے۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ قریش نے مکہ میں مسلمانوں کو ستانا' ان پہ ستم ڈھانا بند کر دیا ہے۔ اس افواہ کو سچ مان کر وہ لوگ حبشہ سے واپس آ گئے۔ (اس کی تفصیل آگے آئے گی) لیکن جب یہاں پہنچے تو انہیں پہلے سے بھی زیادہ اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسری بار

لہٰذا مجبوراً انہیں دوبارہ حبشہ لوٹ جانا پڑا۔ اس مرتبہ عورتوں اور بچوں کے علاوہ 80 مرد تھے۔ یہ گروہ آنحضرت ﷺ کے مدینہ منورہ ہجرت کرنے تک حبشہ میں ہی رہا۔

ہجرت الاولیٰ

مسلمانوں کے پہلی بار حبشہ ہجرت کرنے کو ہجرۃ اولیٰ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

ہجرت کا مقصد

آنحضرت ﷺ کی سیرت و حیات پر اگر تحقیق مقصود ہو تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کر دینے کا مشورہ آنحضرت ﷺ نے صرف اس لئے دیا تھا کہ مسلمانوں کو کفار کی اذیتوں سے نجات مل جائے یا کوئی اور مقصد بھی آپ ﷺ کے پیشِ نظر تھا؟

آنحضرت ﷺ کی سیرت پہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ رسالت کی ہر منزل پر اپنے روحانی کمالاتِ وحی کے تابع ہونے کی وجہ سے تمام معاملات میں دور اندیشی اور گہری نظر اور چھان بین سے کام لیتے تھے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم آپ کو ہجرتِ حبشہ کے مقاصد سے آگاہ کر دیں۔ لیکن ابھی نہیں چند اور واقعات کے بعد تفصیل عرض کریں گے۔

اس مسئلہ میں ایک بحث تو بڑی عام ہے کہ مسلمانوں کے حبشہ ہجرت کر جانے کے باوجود قریش کے دل سے اسلام دشمنی کی بھڑکتی آگ نہ بجھی بلکہ یہ لوگ بادشاہ نجاشی کے پاس بہت ہی قیمتی تحفے لے کر گئے اور اس سے مسلمانوں کو ان کے حوالے کر دینے کی درخواست کی۔ خیال رہے نجاشی اور اس کی رعایا دونوں عیسائی تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر قریش کے دل میں یہ کھٹکا نہ تھا کہ اہلِ حبشہ کا دین اسلام قبول کرنے کا امکان ہے؟ تو پھر انہوں نے نجاشی سے مسلمانوں کو واپس کس مقصد کے لئے مانگا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ قریش اس بات سے خائف تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ مسلمان حبشہ میں رہ کر اتنی قوت حاصل کر لیں کہ وطن لوٹ کر مال اور فوج کی مدد سے محمد ﷺ کی حمایت میں ہمارے سامنے صف آرا ہو جائیں۔

بادشاہِ حبشہ نجاشی کے دربار میں حاضر ہونے والے مکی وفد میں قریش کے بڑوں میں سے دو ممتاز شخص شامل تھے۔ (1)عمرو بن العاص (2)عبداللہ بن ربیعہ۔ یہ لوگ حبشہ کے دارالسلطنت میں پہنچے تو سوچے سمجھے منصوبہ کے تحت پہلے بادشاہ اور اس کے درباریوں کی خدمت میں تحفے تحائف پیش کئے۔ اس کے بعد دربار شاہی میں حاضر ہو کر درخواست کی:۔

بادشاہ سلامت ہماری قوم کے چند پریشاں دماغ لوگ اپنے دین کو چھوڑ کر آپ کی سلطنت میں آکر رہنے لگے ہیں۔ اگر وہ آپ ہی کا مذہب بھی اختیار کر لیتے تو بھی ہمیں ناگوار نہ ہوتا۔ مگر انہوں نے ایسا مذہب ایجاد کیا ہے جسے ہم اور آپ دونوں سمجھنے سے قاصر ہیں۔ شہنشاہِ عالم ہمیں مکہ کے سربرآوردہ دانشوروں اور حکماء نے آپ کی خدمت میں اس لئے بھیجا ہے کہ آپ ان کو ہمارے حوالے کر دیں تاکہ ہم ان کو اپنے ساتھ واپس لے جائیں' اس لئے کہ ہم ان مسلمانوں کی برائیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔

اگرچہ کفارِ قریش کے اس وفد نے نجاشی کے درباریوں کو تحفے تحائف دے کر اپنا ہمنوا بنا لیا ہوا تھا لیکن بادشاہ مسلمانوں کو ان کے سپرد کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس نے اپنا خادم بھیج کر مہاجرین کو اپنے دربار میں بلوایا اور ان سے سب کے سامنے پوچھا!

بادشاہ: آپ لوگوں کا مذہب کیا ہے؟

اور اگر آپ لوگوں کو پہلا دین چھوڑنا ہی تھا تو پھر مسیحیت یا سابقہ مذاہب میں سے کسی ایک مذہب کو کیوں اختیار نہ کیا؟

ان سوالات کے جواب میں حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے بھرے دربار میں جواب دیا۔ "بادشاہ سلامت! ہم لوگ زمانہ جاہلیت کی وہ یادگاریں ہیں جن کا مذہب بتوں کو پوجنا اور ان کی خوراک مردار جانوروں کا گوشت کھانا تھا۔ ہم اپنی خواہشات کو انتہائی بے شرمی سے سب کے سامنے پورا کرتے ہمیں صلہ رحمی سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ پڑوسیوں کے حق ادا کرنا تو ہم جانتے ہی نہ تھے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے سے کمزور کا مال دبا لینے میں ماہر تھا۔ صدیوں سے ہم لوگ ایسی ہی وحشیانہ زندگی گزار رہے تھے کہ اچانک رحمتِ الٰہی نازل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے ہم خودسر' بدقماش لوگوں میں سے ہی ایک ایسے شخص کو منصب رسالت کا اعزاز بخشا جس کی پاک دامنی' خاندانی وجاہت اور صادق و امین ہونے کی عظیم صفات کو ہم اس منصبِ رسالت (علیہ الصلوۃ والسلام) سے پہلے ہی جانتے تھے۔ اس نے ہمیں اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرنے کی دعوت دی اور ہم نے بتوں کو پوجنا چھوڑ کر خالقِ کائنات اللہ وحدہ لاشریک کی فرماں برداری (عبادت) کو اپنا مقصد حیات بنالیا"

اس عظیم الصفات ہستی علیہ الصلوۃ والسلام نے ہمیں ہر حال میں سچ بولنے کی تعلیم دی' جرات دی' ہم نے اس پر عمل کیا۔ اس نے ہم کو دوسروں کی امانت کی حفاظت کرنے صلہ رحمی کرنے پڑوسیوں کے حقوق ادا کرنے' ایک دوسرے کے ساتھ انصاف اور حسنِ سلوک سے پیش آنے کا حکم دیا۔ ہم نے اس کی تعمیل کی۔ اس نے کہا۔ ایک دوسرے کی تذلیل اور قتل کرنا بد ترین اخلاق کا مظاہرہ ہے اسے چھوڑ دو ہم نے اسے چھوڑ دیا———— اس نے ہمیں ایک دوسرے کو گالیاں بکنے اور جھوٹ بولنے سے منع کیا ہم نے مان لیا۔ اس ایمان و اخلاقِ حسنہ کے مبلغ علیہ الصلوۃ والسلام نے ہمیں پاک دامن عورتوں پر بہتان لگانے سے روکا ہم رک گئے۔ ہم نے اپنی زبانوں پر مہر لگادی۔ اس نے کہا۔ یتیموں کا مال کھانا ناجائز ہے۔ ہم نے اس دن کے بعد سے یتیم کے مال کی حفاظت کرنا اپنی جان سے زیادہ عزیز جانا۔ اس نے "علیہ الصلوٰۃ والسلام" ہمیں ایک اللہ کی عبادت قیامِ صلوٰۃ کی ہدایت فرمائی اس نے ہمیں اپنے مال میں سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا اس نے ہم کو ماہ رمضان میں روزہ رکھنے کی تاکید کی۔ ہم نے اس کے ہر ایک حکم کو اپنے اعمال کی روح بنالیا۔ غرض حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم میں سے اور بھی کئی امور کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

بادشاہ سلامت! ہم نے اس رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کی اس پر ایمان لائے۔ اس نے "علیہ الصلوٰۃ والسلام" اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی جتنی ہدایات ہمیں دیں ہم نے ان سب کی تعمیل کی۔ بادشاہ سلامت ہمارے اپنے مہربان ہم وطنوں نے ہم پر کیسے کیسے ظلم کئے یہ کہانی تو بہت لمبی ہے۔ مختصر یہ کہ ان لوگوں نے ہمیں وحشتناک سزائیں صرف اس لئے دیں کہ ہم اس وحدہ لاشریک کو اپنا معبود ماننا چھوڑ دیں اور پھر بے حیائی اور فحش کلامی کو اپنا وطیرہ بنالیں لیکن ہم نے ان کا ہر ستم سہنا گوارا کیا لیکن اپنے ہادی بر حق اللہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن چھوڑنا پسند نہ کیا۔ اس وجہ سے انہوں نے بھی ہمارا پیچھا نہ چھوڑا آخر تنگ آکر ہمیں ہجرت کے سوا کوئی راہ نہ سوجھی۔ ہم نے اپنے آس پاس کے تمام ملکوں کے بارے میں ہی سوچا مگر آپ کے سوا کوئی دوسرا انصاف پسند بادشاہ ہماری نگاہوں میں نہ جچا۔ جس کے ہاں ہم پناہ لے لیں

بادشاہ سلامت ہمیں امید ہے کہ آپ کے ہاں ہم پر ظلم نہیں ہو گا۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی تقریر سن کر نجاشی نے کہا۔ آپ کا رسول (علیہ الصلوٰۃ السلام) تم لوگوں کو اپنے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو فرمان سناتا ہے۔ اگر یاد ہوں تو ان میں سے کچھ مجھے بھی سناؤ۔ جعفر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ مجھے ان میں سے بہت کچھ یاد ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے سورۂ مریم کی ابتدائی آیات سر دربار سنانا شروع کر دیں۔

اختصار کے ساتھ (مولف) فاشارت الیه قالو کیف تکلم من کان فی المهد صبیا قال انی عبداللہ اتانی الکتب وجعلنی نبیا وجعلنی مبارکا۔ این ماکنت اوصنی بالصلوۃ والزکوۃ مادمت حیاوبرا بوالدتی ولم یجعلنی جبارا شقیا

والسلام علی یوم ولدت ویوم اموت ویوم ابعث حیا○ 23:29:19 نجاشی نے ابھی تک کوئی بات زبان سے نہیں نکالی تھی کہ درباری بے ساختہ بیک زبان بول اٹھے اللہ کی قسم مسیح کے کلام اور اس کلام کا متکلم ایک ہی ہے۔ نجاشی نے یہ سنا اور کہا۔ بے شک مسیح اور آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی وحی ایک ہی مشکوٰۃ نور سے روشن ہوتی ہے۔ اس کے بعد بادشاہ نے عمرو بن العاص سے فرمایا۔ آپ یہاں سے واپس وطن چلے جائیں میں ایسے لوگوں کو آپ کے سپرد نہیں کر سکتا۔ مگر دوسرے روز عمرو بن العاص نے پھر بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر کہا کہ یہ لوگ تو مسیح علیہ السلام کے بارے میں بڑی ناشائستہ باتیں کرتے ہیں۔ نجاشی نے پھر اسی وقت عمرو بن العاص کے سامنے جعفر طیار کو طلب کر کے ان سے دریافت کیا۔ تو انہوں نے فرمایا ہم عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ میں وہی کہتے ہیں جو ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب رسالت عطا کیا اور وہ اللہ کی روح اور اس کے کلمہ کے ملقب ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے جناب مریم کی علامت عظمت پر القا فرمایا"

یہ جواب سن کر جناب نجاشی نے زمین پر اپنے عصا سے لکیر کھینچی اور خوشی سے بھرپور لہجہ میں کہا۔ "اے جعفر میرے اور تمہارے دین میں اس ایک لکیر سے زیادہ فرق نہیں" قریش ناکام ہوئے اور نجاشی کو اطمینان ہو گیا کہ مسلمان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت کے معترف نصرانیت کے موید اور اللہ وحدہ ذوالجلال کی عبادت کرنے والوں میں سے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان وہاں امن و امان سے رہنے لگے۔

یہ واقعات ہجرتِ اولیٰ کے زمانہ میں ہوئے جس کے بعد مہاجرین حبشہ میں رہے۔ اس کے بعد قریش نے افواہ قصداً" بھیجی گئی کہ اب مکہ میں مسلمان بالکل امن سے رہتے ہیں۔ جس پر یقین کر کے سب مکہ معظمہ لوٹ آئے مگر جب یہاں پہنچ کر مظالم کا وہی پہلے کا سا رنگ دیکھا تو پھر واپس ہو گئے۔

ایک سوال

سوال یہ ہے کہ مکہ سے دو دفعہ ہجرت ایذا سے فرار تھا یا کوئی اور مصلحت پیش نظر تھی۔ اگر کسی تاریخ دان کے خیال میں ان دونوں ہجرتوں کے پس پردہ رسول اللہ ﷺ کا کوئی سیاسی مقصد تھا تو مورخ کو اپنا خیال پیش کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔

اس ہجرتِ حبشہ سے ایک سوال اور بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ یعنی حضرت محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کو حبشہ بھیجتے ہوئے نئے مسلمان ہونے والوں کی اعتقادی حیثیت سے کیسے مطمئن ہو گئے۔ جبکہ حبشہ میں مسیحی دین رائج تھا اور اسلام نے بھی جناب مسیح علیہ السلام کی نبوت کو تسلیم کر لیا تھا۔ پھر عرب کے خشک پہاڑوں اور صحراؤں کے مقابلہ میں حبشہ کی سرزمین نسبتاً سرسبز و شاداب تھی۔ لہٰذا ان کا وہاں کے مذہب اور زمین کی شادابی سے متاثر ہو کر مسیحیت قبول کرنے کا امکان بھی ہو سکتا تھا۔ جبکہ ایک شخص عبداللہ بن جحش نے حبشہ جا کر عیسائی مذہب اختیار بھی کر لیا تھا۔ ان تمام حالات کی روشنی میں مورخ کہہ سکتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ذہن میں یہ اندیشہ بھی ہو؟ جبکہ آنحضرت ﷺ اپنے ساتھیوں کو قریشِ مکہ کے مظالم سے بچانے سے بالکل بھی قاصر تھے۔

یہ ہے وہ اعتراض جو ایک مورخ کی طرف سے کیا جا سکتا ہے۔

حبشہ کی ہجرت اور رسول اللہ ﷺ کے پیشِ نظر امکانی صورتحال یہ ہو سکتی ہے کہ آنحضرت ﷺ کی ذکاوت اور دور اندیشی اور دوسرے اوصافِ جلیلہ کے ہوتے ہوئے یہ خیال آیا ہو لیکن خود رسول اللہ ﷺ کو اس موقع پر یا اس سے پہلے زندگی کے ہر لمحہ پر اسلام کی ہمہ گیری اور قوتِ نفوذ پر اس حد تک یقین تھا کہ اس قسم کے امکانی خدشات کا اثر انداز ہونا ناممکن تھا۔ پھر اس وقت اسلام ایسا گلِ ناشگفتہ تھا جسے نسیم صبح گاہی اپنے جھولے میں جھولا دے رہی ہو اور وہ ہر قسم کی آمیزش سے پاک و صاف تھا۔

لیکن حبشہ میں عیسائی مذہب کی بدحالی کا یہ حال تھا کہ جس طرح نجران اور یثرب کے نصاریٰ آپس میں مذہبی جھگڑوں کے مرض میں مبتلا تھے یہی حال عیسائیت کا حبشہ میں ہو رہا تھا۔ ایک طبقہ مریم علیہا السلام کو معبودہ مانتا تھا اس کے برعکس دوسرا گروہ جناب مسیح کو اپنا معبود مان رہا تھا۔ اس صورت میں یہ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ رسالتِ محمد ﷺ سے تعلیم پانے والے مسلمان ایسے مذہب میں شامل ہو جائیں گے جس میں اختلاف کا یہ عالم ہو۔

دنیا کے زیادہ تر مذاہب زمانے کی طویل گردش کا شکار ہو کر اپنے اصل کو چھوڑ کر بت پرستی پر مطمئن ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اگرچہ ہر دین میں عرب جیسی برملا بت پرستی نہ سہی مگر ہر قوم کے

تحت الشعور میں بت پرستی کا رجحان واضح طور پر محسوس ہوتا رہا ہے۔

لیکن اسلام واحد وہ دین ہے جو ظاہر اور باطن دونوں قسم کی بت پرستی کے تصور کو بھی جڑ سے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ اس لئے اس نے بت پرستی کے خلاف ہر رخ سے جنگ لڑی ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس زمانہ میں (دورِ رسالت) مسیحی طبقہ بھی بت پرستی کی طرف اس قدر مائل تھا کہ لوگوں نے علماء اور زاہدوں کو بھی وہی مقام دے رکھا تھا جو بت پرست اپنے بت کو مقام دیتے ہیں۔ لیکن اسلام میں کسی شخص کے لئے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے یہ جائز ہی نہیں۔

گویا اسلام انسان کو انسان کی غلامی سے کلیتہً آزادی دلانے کا علمبردار ہے۔ اس کے برعکس ہر عمل کو شرک قرار دیتا ہے۔ اسلام ہر ایک انسان کو وہم کے اندھیرے غاروں سے نکال کر کسی اور عالمِ دین یا رہنما کی تعظیم و تکریم کے سامنے سر جھکانے کی اجازت ہی نہیں دیتا بلکہ خود اس شخص کو ایسی اخلاقی اقدار کا مالک بننے کی دعوت دیتا ہے جو قابلِ تعظیم ہوں۔

اسلامی تعلیم کے مطابق انسان اور اللہ جل شانہ کے درمیان پیر، فقیر، مذہبی پیشوا اور گوشہ نشیں ایسی تعظیم کے مستحق نہیں البتہ ان سے تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے اور حدِ شریعت تک احترام بھی۔

عمل صالح، تقویٰ اور جس قسم کی بھلائی مسلمان کو اپنے لئے پسند ہے اسی کی مانند اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لئے کوشش کرنا یا بھلا کرنا اسلامی تعلیم کا جمال اخلاق ہے۔

اسلامی تعلیم کے مطابق اللہ اور اس کے بندوں کے نزدیک بتوں، حاضرات بنانے والوں اور نجومیوں کی وقعت تنکے کے برابر بھی نہیں۔ اس راہ میں ہر وہ عمل جو عرفاً نیکی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے وہی کام آ سکتا ہے اور بت پرستی کا گناہ اس نیکی کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ہے۔

اعمالِ حسنہ کا واسطہ انسان کو اس حقیقت کی روح کے قریب لے جاتا ہے جس کی روشنی کی موجیں زمان و مکان کی حدود سے ہر وقت جلوہ فگن رہتی ہیں۔

اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے صالح لوگوں نے اپنے اعمال ہی کو اپنی کوششوں کا ذریعہ بنایا اور آخر کار اس مقام کو پہنچے جہاں انسان اور اللہ کے درمیان سے حجاب خود بخود اٹھ جاتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے کہ یہاں تک رسائی میں کامرانی کا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو اختیار ہے۔ کسی ولی یا گوشہ نشیں کو کوئی اختیار نہیں۔

بت پرستی اور اس قسم کی راہوں پر چلنے والے، دولت مند لوگ، مضبوط و توانا جسم کے پہلوان لوگ ہوں یا شہوت پرست ابو الہوس سب کے سب چاہے اپنی تمام دولت صرف کر دیں،

قوت و طاقت اور ارادوں کو خطروں کے گرداب میں ڈال لیں۔ اپنے آپ کو تکلیفیں پہنچانے میں انتہا کر دیں پھر بھی ان کی رسائی حقیقت کی روح تک ہر گز نہیں ہو سکتی۔ وہ روحِ حقیقت جو زمانہ اور مادیت کی قید سے آزاد ہے۔ فیصلہ دو ٹوک الفاظ میں موجود ہے۔

انسان کو اس کے اعمال کا بدلہ اس روز مل کر رہے گا۔

الیوم تجزی کل نفس بما کسبت (17:40)

یوماً لا یجزی والد عن ولدہ ولا مولود ھو جاز عن والدہ (33:31)

"وہ دن جس دن دولتِ جسمانی اور زبانی قوت کوئی خوبی کام نہ آسکے گی۔ صرف نیکی اور بدی کا معاوضہ ملے گا۔ یہ وہ دن ہو گا جس دن ازل سے لیکر دنیا کا آخری انسان تک سب ایک جگہ جمع ہوں گے"

"عدل و حساب کا دن، جس میں کسی پر ظلم نہ ہو گا۔ ہر ایک اپنے کیے کی سزا پائے گا"

الیوم تجزون ما کنتم تعملون (28:45)

اب آپ ہی سوچئے رسول کریم ﷺ نے جن لوگوں کو اسلام کی تعلیم کی تعمیل کرنا عملاً سکھا دی جن کے دلوں کو ہدایت کے نور سے منوّر کر دیا ان سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ سرزمینِ حبشہ کی شادابی کو دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں گے۔

اور پھر وہ لوگ جنھوں نے عملاً ثابت کر دیا۔ ایک دن نہیں، مہینوں نہیں، سالوں کفار کی شدید ترین اذیتوں کو برداشت کر کے اپنے عہد وفا کو قائم رکھا! جنھوں نے اپنے راہنما کی محبت کو اپنے مال و دولت اولاد وطن اور اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز جانا۔

ایسا عظیم و بے مثل راہنما علیہ الصلوٰۃ والسلام جس نے خود دینِ اسلام کے عقیدے اور تعلیم کی تبلیغ پر ارض و سما کی حکومت شمس و قمر جیسی دولت کو ٹھکرا دیا ہو۔

یا عم واللہ لو وضعوا الشمس فی یمینی والقمر فی یساری علی ان اترک ھذا لامر حتی یظھر اللہ او اھلک فیہ ما ترکتہ

اور پھر اس عظمتِ کردار کا سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے فرماں برداروں کو بھی مکمل طور پر علم ہو ایسا عظیم انسان جو بھی ایمان، حکمت، عدالت، عدل، حقیقت جوئی اور حسنِ اخلاق کے کمال و جمال کا پیکر عمل ہو، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ حبشہ کی طرف اپنے تابعداروں کو ہجرت کی اجازت دیتے وقت ان کے ثباتِ ایمان اور راسخ العمل ہونے پر مکمل یقین رکھتے تھے۔

چنانچہ نجاشی کی حکومت میں مہاجرین کو درحقیقت مکمل اطمینان و سکون کے ساتھ رہنے کا موقع میسر آیا۔ قریشِ مکہ کے مقابلہ میں ایسے لوگ جن کا نہ تو ان سے کوئی رشتہ تھا نہ ہی مذہبی

تعلق۔ اس کے باوجود ان کا ان سے بہترین سلوک تھا۔ مہاجرین کو اپنے دینی اور دنیوی اعمال میں مکمل آزادی تھی۔ اس کے باوجود مہاجرین کے عقیدوں میں فرق نہ آیا۔ جب قریش کو اس کی اطلاع ملی تو انہیں اپنے ہم وطن بھائیوں سے بلکہ قرابت داروں سے اپنا کیا ہوا بدترین سلوک ہر لحہ احساس ندامت بن کر پریشان کرنے لگا۔

فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ

عمر بن الخطاب نے اس وقت اپنی زندگی کے پنتیسویں سال میں ابھی قدم رکھا ہی تھا۔ چند لفظوں میں ان کا تعارف یوں کیا جا سکتا ہے۔ وہ ماشاء اللہ قوی ہیکل' پرشکوہ' بے باک' دلاور اور اپنے اہل و اقربا پہ بہت ہی شفیق و مہربان تھے۔ کبھی کبھی شرفاء کے مروجہ معمولات سے بھی بہرہ اندوز ہو جاتے تھے اور قریش کے ان افراد میں سے تھے جن کے ہاتھوں سے مسلمانوں کو تکلیفیں بھی پہنچیں۔

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کچھ تو مسلمانوں کا حبشہ ہجرت کر جانا ناگوار تھا۔ کچھ قریش اور اہلِ مکہ میں اصلِ وجہ اختلاف و اختلاج شخصیتِ رحمت و برکت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نعوذ باللہ اس کے برعکس سمجھے ہوئے تملا رہے تھے۔ ایک دن جب ہادیِ کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام صفا پہاڑی کے ساتھ ملے ہوئے ایک مسلمان کے گھر تشریف فرما تھے۔ جہاں اس وقت سیدنا حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی موجود تھے۔ اس اجتماع کی خبر نے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بیحد مشتعل کر دیا اور اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا تہیہ کر لیا تاکہ قریش کے باہم جھگڑے ختم ہو جائیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو ہر وقت مذمت کرتے رہتے ہیں اور ان کے کہنے سننے پر ہم میں سے چند احمقوں نے گمراہی اختیار کر لی ہے۔ اس کا سلسلہ خود بخود آئندہ کے لئے بند ہو جائے گا۔

عمر اپنے ہاتھ میں تلوار لئے تیز قدم اس مکان کی طرف بڑھ رہے تھے کہ راستہ میں نعیم بن عبداللہ (جو ان کے ہی خاندان میں سے تھے) سے ملاقات ہو گئی۔ وہ ان کے تیور دیکھ کر سمجھ گئے اور ان کے دریافت کرنے پر عمر نے بھی صاف صاف طور پہ اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔ جواباً" نعیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ عمر تم کس دھوکہ میں مبتلا ہو گئے ہو۔ اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے ہاتھ سے قتل ہو گئے تو عبد مناف والے تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے پھر ذرا اپنے گھر کی خبر تو لو۔ تمہارے اپنے قرابت داروں میں سے کون کون مسلمان ہو چکا ہے۔

نعیم بن عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود بھی مسلمان ہو چکے تھے (مگر ابھی تک اعلان نہ فرمایا تھا) اور عمر کی ہمشیرہ جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے نیک فطرت شوہر سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی

اسلام قبول فرما چکے تھے۔ عمر یہ سب سن کر الٹے پاؤں اپنے گھر کی طرف چل دیئے۔ گھر پہنچے تو قرآن حکیم کی تلاوت ہو رہی تھی۔ ہمشیرہ نے قدموں کی آہٹ سنی تو قاری کو الگ کر دیا اور صحیفہ چھپا دیا۔ عمر نے پوچھا۔۔۔ یہ آواز کیسی تھی، دونوں نے بات ٹال دی۔ حتیٰ کہ عمر کے اصرار پر بھی دونوں میں سے کسی نے اعتراف نہ کیا۔ مگر عمر بضد ہوئے اور کہا میں نے سب سن لیا ہے۔ تم دونوں محمد ﷺ کا دین اختیار کر چکے ہو۔ یہ کہہ کر پہلے تو وہ سعید پر پل پڑے، بیگم اپنے شوہر کو بچانے کے لئے بڑھیں تو عمر فاروق نے ان کو بھی لہولہان کر دیا۔ دونوں مظلوم پکار اٹھے اور عمر سے کہا۔ جاؤ ہم مسلمان ہو چکے ہیں جو چاہو کر لو۔ اب یہ نعمت ہم سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس اثناء میں بہن کے سر سے بہتا خون دیکھ کر دل پسیج گیا۔ اور فطری لطف و کرم مزاج میں انگڑائیاں لینے لگا۔ اب انتہائی شکستہ آواز میں کہا۔ ذرا مجھے بھی تو وہ بیاض دکھاؤ۔ ہمشیرہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے طہارت کی شرط پیش کی۔ عمر فاروق طہارت کے بعد حاضر ہوئے، صحیفہ لیا پڑھا اور پھر رقت قلب طاری ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آیات کا اثر روح و بدن میں ایسا اتر گیا کہ آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ ندامت سے سر جھک گیا۔ ہمشیرہ اور بہنوئی کے دل کو ہر ممکن الفاظ میں تسلی و تشفی دینے کے بعد وہاں سے چلے۔ ان کا اپنا دل قرآن حکیم معجز نمائی سے آشنا ہو چکا تھا۔ تعلیم محمد ﷺ کی حقیقت سے لطف اندوز ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے کا عمر اب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں بدل چکا تھا۔ اسی کیفیت میں عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بے جان لاشے کی طرح عجیب سی لذت محسوس کی جس کے لئے کوئی زبان کوئی بیان بھی قوت اظہار نہیں رکھتا۔ وہ۔۔۔ اس گھر کی طرف جا رہے تھے جس گھر میں اس برگزیدہ و بلند تر ہستی رحمت دو عالم محمد ﷺ کو قتل کرنے کی غرض سے داخل ہونا چاہتے تھے۔ لیکن اس وقت وہ خود اپنی تمام شیطانی صفات و عادات کو قتل کر کے آپ کے حضور (علیہ الصلوۃ والسلام) میں حاضر ہو کر سرنگوں کھڑے ہو گئے۔ ڈبڈبائی آنکھوں اور تھرتھراتے ہونٹوں سے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی آواز کے ساتھ کلمہ طیبہ پڑھا۔ نبی اکرم ﷺ اور خالقِ کائنات کے ہر حکم کی تعمیل کا عہدِ وفا باندھا۔ سید العالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے دعائیں لیں اور پھر خود ہی ہر گلی کوچہ، محلے اور بازار میں نبی اکرم ﷺ کے ہاتھوں پر اسلام لانے کے اعزاز کا اعلان کرنا شروع کر دیا۔

چنانچہ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اسلام لانے کے بعد اہلِ ایمان کی ہمتوں میں اور اضافہ ہو گیا۔

اس واقعہ سے قریش کی صفوں میں اور شگاف پڑ گیا۔ آج سے قریش اور مسلمان دونوں کا موقف بدل گیا۔ ادھر کفار کو اپنے سیاسی اقتدار کے زوال کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ ادھر مسلمانوں کی مکہ سے (یثرب) مدینہ منورہ ہجرت کرنے کے اسباب نے محمد ﷺ کی سرفرازی نے ایسا نقشہ

قائم کر دیا کہ اس پر گامزن ہو کر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی اقتدار سے بھی خود بخود بہرہ یاب ہو گئے۔

☆☆ ☆☆ ☆☆

واقعہ غرانیق

واقعہ غرانیق

پہلی بار حبشہ ہجرت کرنے والوں کو تین مہینے بعد سید المومنین عمر ابن الخطاب کے ایمان لانے کی اطلاع مل گئی تھی اور کسی نے یہ افواہ بھی وہاں اڑا دی تھی کہ اب کفارِ قریش نے آنحضرت ﷺ اور مسلمانوں کو ستانا بند کر دیا ہے جسے سن کر چند مہاجرین (اور ایک دوسری روایت کے مطابق) سبھی مہاجرین مکہ معظمہ واپس آ گئے۔ لیکن یہاں آ کر دیکھا کہ مسلمانوں پر تو پہلے سے بھی زیادہ ظلم کئے جا رہے ہیں تو ان میں سے بعض تو مکہ معظمہ قدم رکھے بغیر ہی الٹے پاؤں لوٹ گئے۔ بعض چھپ چھپا کر رہنے لگے اور بعض کفار کی نگہبانی میں رہنے لگے۔ لیکن جو مہاجرین کچھ دن یہاں رہنے کے بعد حبشہ لوٹے وہ اپنے ساتھ اور بھی بہت سے مسلمانوں کو لے گئے۔ یہاں تک کہ مدینہ منورہ ہجرت کرنے کی اجازت ملی تو حبشہ کے مہاجرین براہ راست مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

غرانیق سے متعلق کہانی

اس کہانی کا تعلق مہاجرینِ حبشہ کے تین ماہ قیام کے بعد مذکورہ افواہ کی بناء پر واپس مکہ معظمہ آنے سے ہے اور اس افواہ کا پس منظر حسب ذیل ہے۔

ابنِ سعد اور طبری دونوں نے طبقات اور تاریخ الرسل و الملوک میں علی الترتیب یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ دوسرے مفسرین اور اربابِ سیر نے بھی انہی کی مانند اور اس کے بعد ان ہی مصنفین سے مغربی مستشرقین نے یہ واقعہ نقل کر کے رائی کا پہاڑ بنا دیا ہے۔

یہ کہانی یوں ترتیب دی گئی کہ جب محمد ﷺ نے قریش کے جبر و تشدد کا سلسلہ اپنے لئے اور اپنے اصحاب کے لئے ختم ہوتے نہ دیکھا تو پھر اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ایک ترکیب نکالی تاکہ کفار کے ساتھ مل کر رہ سکیں۔

ترکیب یہ تھی۔ کہ کفار کے ایک مجمع کے سامنے کعبہ میں سورہ نجم سنانا شروع کر دی۔

افرئیتم اللات والعزی ومنوۃ الثالثۃ الاخری (53:19-30)

اے مشرکو تم نے لات و عزیٰ اور وہ جو تیسری دیوی مناۃ ہے ان کی بے بسی پر غور کیا؟ پر پہنچے تو "الاخریٰ" کے بعد یہ جملے آپ ﷺ کی زبان مبارک سے آپ ہی کے لہجہ میں نکلے۔ تلک الغرانیق العلا وان شفاعتهم الترتجیٰ! ان حسین و سربلند بتوں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک شفاعت حاصل کی جا سکتی ہے" اس جملہ کے دخول کے ساتھ رسول اللہ ﷺ نے پوری سورہ نجم پڑھی اور پوری سورہ کے اختتام پر جب رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا تو مشرکین بھی اس سجدہ میں شریک ہو گئے۔ سجدہ سے فارغ ہونے کے بعد مشرکین نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ ہم مانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ زندگی دینے والا ہے' روزی دینے والا ہے۔ لیکن آج آپ نے مان لیا کہ ہمارے یہ بت اس سے ہماری شفاعت کر سکتے ہیں۔ آپ کے اس اعتراف کے بعد اب ہماری آپ کی کوئی لڑائی نہیں رہی۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جھگڑا عملاً ختم ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ خبر عرب میں آگ کی طرح پھیلا دی گئی۔ یہاں تک کہ حبشہ میں بھی یہ افواہ سنی گئی۔ مہاجرین نے سوچا چلو اچھا ہوا' اپنے رشتے دار' قبیلے والوں سے ہمارے بھی دل اداس ہیں' چلو مل لیں۔ مگر یہ لوگ ابھی مکہ معظمہ سے کچھ میل دور تک پہنچے تھے تو صحرا میں ہی ان کی ملاقات کنانہ کے ایک کارواں سے ہوئی۔ اس سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے بھی ان کو یہی کہا کہ ہاں تمہارے نبی ﷺ نے ہمارے بتوں کی تعریف کی تھی جس پر قریش نے ان سے صلح کر لی تھی مگر بعد میں محمد ﷺ پھر انکار کر گئے۔ پہلے ہی کی طرح بتوں کی مذمت شروع کر دی' اس کی وجہ سے اہلِ مکہ نے بھی پہلے ہی کی طرح ان پر جبرو تشدد شروع کر دیا ہے۔

یہ سن کر انہوں نے آپس میں مزید آگے بڑھنے سے پہلے مشورہ کیا۔ اس میں طے پایا کہ اپنے اپنے عزیز و اقارب کو مل کر واپس چلے جائیں گے۔

حضرت محمد ﷺ سے منسوب "بتوں کی تعریف" کا یہ واقعہ مختلف روایات میں موجود ہے۔

(ا) پہلی روایت میں یوں ہے۔ ما ان جعلت لالهتنا نصيبا" فنحن معك!

کفارِ قریش نے رسول اللہ ﷺ سے کہا اب جبکہ آپ نے ہمارے معبودوں کی برتری مان لی ہے تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔

(ب) دوسری روایت۔

سورہ نجم کے نزول سے دو دن بعد جبریل امین علیہ السلام تشریف لائے اور حسبِ معمول آنحضرت ﷺ کی زبان مبارک سے سورہ نجم اعادۃ سنی اور جب آپ ﷺ کی زبان سے تلک الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترتجی

ترجمہ۔ "ان باوقار حسین و جمیل دلوں سے بیشک اللہ تعالیٰ کے نزدیک شفاعت کی توقع کی جاسکتی ہے" سے سنا تو جبریل علیہ السلام نے فوراً" کہا۔ یہ آیتیں میں تو نہیں لایا تھا"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا۔ ہو سکتا ہے "میں نے ہی یہ بڑھادی ہوں"

اس واقعہ کے بعد یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

وان کادو لیفتنونک عن الذی اوحینا الیک لتفتری علینا غیرہ واذالا تخذوک خلیلا ولولا ان ثبتنک لقد کدت ترکن الیھم شیئا" قلیلا۔ اذ الاذقناک ضعف الحیوۃ وضعف الممات ثم لا تجد لک علینا نصیرا۔ (۱۷: ۷۳، ۷۵)

ترجمہ۔ اے نبی اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے جو وحی تمہاری طرف بھیجی ہے قریب تھا کہ یہ کافر لوگ تم کو اسی سے بھلوا دیں تاکہ تم اس کے سوا اور باتیں ہماری نسبت سے بنالو اور اس وقت وہ تم کو دوست بنا لیتے اور اگر ہم تم کو ثابت قدم نہ رہنے دیتے تو تم کسی قدر ان کی طرف مائل ہونے ہی لگے تھے۔ اس وقت ہم تم کو زندگی میں بھی دگنا عذاب دیتے اور مرنے پر بھی دگنی سزا دکھاتے۔ پھر تم ہمارے مقابلہ میں کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے! (بنی اسرائیل (73 تا 75)

یہ آیت نازل ہونے پر آپ از سرِنو قریش اور ان کے بتوں کی مذمت پر اتر آئے۔ مستشرقین نے ہمارے نادان اور بے مایہ سیرت نویس اور اربابِ تفسیر کی زبان سے یہ روایات لپک لیں اور ان پر دل کھول کر حاشیہ آرائی کی لیکن اس فرضی کہانی کے بخئیے اودھیڑنے کے لئے معمولی سی توجہ ہی کافی ہے۔

سب سے پہلے تو یہ واقعہ انبیاء کی عصمت کے ہی منافی ہے۔ اس پر ہمارے جامعین کا اپنی کتابوں میں نقل کرنا ہی بوالعجبی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ابنِ اسحاق (سیرت ابن ہشام) سے اس کی صحت کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ انہ من وضع الزنادقہ "یہ واقعہ زندیقوں کا گھڑا ہوا ہے"

دوم۔ واقعہ کو صحیح تسلیم کرنے والے جامعین کتب نے آیت وان لیفتنونک عن الذی اوحینالک کے ساتھ سورہ حج کی مندرجہ ذیل آیت کو بھی اپنے استدلال میں شامل کر دیا۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولا نبی الا اذا تمنی القی الشیطن فی امنیتہ فنسخ اللہ ما یلقی الشیطن ثم یحکم اللہ اٰیتہ واللہ علیھم حکیم۔ لیجعل ما یلقی الشیطن فتنتہ للذین فی قلوبھم مرض والقاسیۃ قلوبھم وان الظالمین لفی شقاق بعید۔ (52:23-53)

اے ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم نے آپ سے پہلے کوئی نبی یا رسول نہیں بھیجا۔ مگر اس کا یہ حال تھا کہ جب وہ کوئی آرزو کرتا تھا تو شیطان اس کی آرزو میں وسوسہ ڈال دیتا تھا۔ تو

جو وسوسہ شیطان ڈالتا تھا اللہ تعالیٰ اس کو دور کر دیتا تھا۔ اور پھر اللہ ہی اپنی آیتوں کو مضبوط کر دیتا ہے۔ اور اللہ عزوجل ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ غرض اس سے یہ ہے کہ جو وسوسہ شیطان ڈالتا ہے اس کو ان لوگوں کے لئے جن کے دلوں میں بیماری ہے جن کے دل سخت ہیں ذریعۂ آزمائش ٹھہراتے۔ بیشک ظالم پرلے درجے کے مخالفت میں ہیں۔

غرانیق اور لفظ "تمنیٰ" سے جوڑ

لفظ "تمنیٰ" کی تفسیر میں دو گروہ ہیں۔ دونوں اپنی اپنی مرضی سے معنی کرتے ہیں۔

الف۔ تمنیٰ قراء جب نبی ﷺ نے وہ آیات پڑھیں جو ابھی ابھی نازل ہوئی تھیں۔

ب۔ تمنیٰ بمعنی اس نے خواہش کی۔

ہوا یہ کہ ان معنوں کی بے محل تادیلیں کی گئیں۔ مسلمانوں کے نادان، ناسخن، فہم، کوڑ مغز جامعین نے روایات ترتیب دیں اور ایسے اربابِ تفسیر کی بات مان کر مستشرقین بھی ان کے ساتھ ہو لیئے۔

ان کی دلیل یہ ہے کہ مسلمانوں پر کفار کا جبر و تشدد اس انتہا کو پہنچ چکا تھا کہ وہ جب چاہتے کسی مسلمان کو قتل کر دیتے، جس کو چاہتے کڑکتی دھوپ میں گرم ریت پر لٹا دیتے، اس غریب کے سینے پہ پتھر بھی رکھ دیتے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے جتنا وحشیانہ سلوک ہوا کسی کو نہیں معلوم۔ حد یہ ہے کہ مسلمان ان ناقابل برداشت مظالم سے تنگ آ کر حبشہ ہجرت کر گئے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ چونکہ قریش کی ہدایت اور بتوں سے نجات ہر قیمت پر چاہتے تھے اس لئے انہوں نے کفار سے قرب حاصل کرنے کے لئے (نعوذ باللہ) سورہ نجم میں دو آیتوں کا اضافہ کر لیا۔ تلک الغرانیق العلی وان شفاعتهن لترتجی۔

یہی وجہ ہے کہ جب سورہ النجم کے آخر میں رسول اللہ ﷺ نے سجدہ کیا تو کفار نے بھی ان کے ساتھ سجدہ کیا۔ کیونکہ اس طرح رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے ساتھ بتوں کا تقرب تسلیم کر لیا۔

سر ولیم میور اس روایت سے یہ استدلال کرتے ہیں۔

کہ واقعہ غرانیق ان دلائل کی روشنی میں صحیح ہے کہ مہاجرین جو نجاشی کی سلطنت میں آرام و سکون سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر ان کو محمد ﷺ اور کفار کی باہم مفاہمت کی اطلاع نہ ملتی تو وہ حبشہ ترک کر کے مکہ میں اپنے عزیزوں کے ساتھ رہنے کے لئے واپس نہ آتے! لہٰذا قریش اور محمد ﷺ کی آپس میں مصالحت اس کے سوا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ قریش محمد ﷺ کے مقابلہ میں بہت زیادہ طاقتور تھے۔ یہاں تک کہ ان کے جبر و

تشدد سے ان کے اپنے دوست بھی بعض دفعہ بچ نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا قریش کو دوستی کا یہ ایک اچھا بہانہ ہاتھ آگیا تھا۔

سر ولیم میور کے استدلال میں نقص ہے

درحقیقت مسلمانوں کے حبشہ سے مکہ مکرمہ واپس آنے میں دو اسباب محرک تھے۔

(1) سب سے پہلا اور سب سے زیادہ قوی اور ناقابلِ انکار حقیقت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مسلمان ہونا تھا۔ جو مہاجرین کے واپس آنے سے کچھ عرصہ ہی پہلے وقوع پذیر ہوا۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے پہلے جس سختی سے مخالفت کرتے رہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ مگر کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھنے کے بعد وہ جس دلیری' جرات اور شجاعت کے ساتھ اسلام کی حمایت میں نکل آئے یہ بھی سب مؤرخوں پر واضح ہے۔ تاریخ کے اوراق اس کے گواہ ہیں کہ انہوں نے اپنا اسلام لانا ایک لمحہ کے لئے بھی پوشیدہ نہیں رکھا۔ یہ عمر رضی اللہ عنہ ہی ہیں جنہوں نے کفار کے بڑے بڑے فرعونوں کے سامنے اپنے ایمان لانے کا اظہار کیا۔ اور جس مخالف نے تکرار کرنے کی کوشش کی تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ شجاعانہ انداز سے بھی جواب دینے کے لئے سربکف میدان میں اتر آئے۔ انہوں نے کھلے بندوں نمازیں پڑھیں اور بغیر کسی کے خوف یا ڈر کے اللہ وحدہ لاشریک کے ہر آنے والے حکم کی تعمیل کی۔

قریش کا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بے خوفی اور جرات سے متاثر ہونا فطری امر تھا۔ وہ متاثر ہوئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ اگر مسلمانوں کو ایذائیں دینے کا سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تو اب اس سے باہم لڑائی (خانہ جنگی) کے دروازے کھل جائیں گے۔ جس کے بارہ میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ پھر کب ختم ہو اور کس کس کے جنازے اٹھیں۔

قریش نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ خود ان کے قبائل اور گھرانوں میں سے کئی افراد (مردوں' عورتوں اور بچوں) نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اب ان میں سے کسی کو بھی قتل کیا تو ہو سکتا ہے ان سے متعلقہ قبائل ان کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں۔

اس لئے ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا کہ وہ خود صلح کی کوئی راہ نکالیں۔ لہٰذا۔۔۔ ان حالات میں قریش میں پائے جانے والے عام احساسات کی خبر سن کر مہاجرین حبشہ کی سوچ اپنی جگہ درست تھی۔ کہ جب قریش اب درپے آزار نہیں رہے تو ہم اس سے فائدہ کیوں نہ اٹھائیں!

مسلمان اربابِ سیر اور تفسیر کا تجزیہ

ہمارے جامعینِ سیرت اور اربابِ تفسیر مندرجہ آیات سے واقعہ غرانیق کے امکان کو ثابت

کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلی آیت

وان کادوا لیفتنونک عناالذی اوحینا الیک لفتری علینا غیرہ واذا لا تخذوک خلیلا ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئا" قلیلا۔ اذلا ذقنک ضعف الحیوۃ وضعف الممات ثم لا تجدلک علینا نصیرا۔

(75-73:17)

اے نبی قریب تھا کہ مشرکین آپ کو فریب دے کر کلام الٰہی کی تبلیغ سے روک دیتے اور اپنی اس کامیابی میں آپ کی دوستی کا بھرم بھرنے لگتے مگر ہم نے کرم فرمایا کہ آپ کو ان کی طرف ذرّہ برابر مائل نہ ہونے دیا۔ اگر آپ سے یہ لغزش ہو جاتی تو دونوں جہان میں آپ کو طرح طرح کی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا اور مقابلہ میں کوئی بھی آپ کی مدد نہ کرتا۔

دوسری آیت

وما ارسلنا من قبلک من رسول ولانبی الا اذا تمنی القی الشیطان فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطن ثم یحکم اللہ آیتہ واللہ علیم حکیم! (52:22)

اے نبی۔ ہم نے آپ سے پہلے جتنے بھی نبی بھیجے سب کا معاملہ ایک سا رہا۔ ادھر انہوں نے لوگوں کی ہدایت کے لئے ان سے کچھ فرمایا۔ ادھر شیطان نے ان کی تبلیغ میں لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈال دیئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے شیطان کی اس دخل اندازی کا اثر مٹا کر اپنی نشانیوں کو اور زیادہ ابھار دیا۔ کہ وہ تو سب کچھ جاننے والا صاحب حکمت ہے!

ان مفسرین کی یہ سند استاد ولیم میور عیسائی کی آشفتہ سری سے کہیں زیادہ حیرت انگیز ہے۔ ان کی سند میں پیش کی ہوئی اس آیت کا ایک ہی ٹکڑا لیجیے۔

ولولا ان ثبتناک لقد کدت ترکن الیھم شیئا قلیلا اذلا ذقنک ضعف الحیوۃ وضعف الممات ثم لاتجدلک علینا نصیرا (74:17)

(شرط واضح ہے) اگر آپ سے یہ لغزش ہو جاتی تو دارین میں آپ کو زیادہ سے زیادہ عذاب سے دوچار ہونا پڑتا۔ اور ہمارے مقابلہ میں کوئی آپ کا مددگار نہ بن سکتا۔

بات واضح ہے کہ "اگر" شیطان کسی رسول کی تلاوت میں دخل انداز ہو سکتا ہے اور خود رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بھی اس دخل اندازی سے متاثر ہونا تو ایک طرف ذرا توجہ کا بھی امکان ہوتا تو ہم اللہ بنیاد قرار اس رسول کو دنیا میں بھی عذاب سے دوچار کرتے اور آخرت میں بھی۔ اور وہ بھی عام عذاب نہیں بلکہ عام مجرموں سے کہیں زیادہ خطرناک۔

حادثہ غرانیق کو تراش کر مشرکین کا مقصد عظمتِ رسالت و نبوت پر ایسی کمزوری کاالزام لگا کر کردار کشی کی مذموم کوشش ہے جس کی مثالیں آج بھی ہمیں ملحدین میں ملتی ہیں۔

ان کا حاصلِ مقصد رسول اللہ ﷺ کی گھبراہٹ کو ثابت کرنا اور مشرکین کا تقرب حاصل کرنے کی طرف مائل ہونا ثابت کرتا ہے۔ حتیٰ کہ مشرکین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے آپ کی زبان مقدس پر غرانیق العلیٰ کا حادثہ چپکا دیا گیا۔ حالانکہ یہ ٹکڑا قرآن حکیم کا نہیں تھا۔

اور پھر متذکرہ آیات (1) اور نمبر (2) کے سیاق و سباق واضح طور پر چلا چلا کر کہتے ہیں کہ نبی کو مشرکین کی طرف اس قسم کے سمجھوتہ کے قریب تو ایک طرف اس کا خیال بھی اللہ تعالیٰ نے نہیں آنے دیا۔

اور پھر ۔۔۔ ایسے کم فہم و ادراک کے مالک مفسرین کے پاسِ خاطر آیات کے شانِ نزول کے غلط تعین کو نظرانداز کیسے کر دیں۔ ایسے بے فہم کے ساتھ ہمارا تعلق کیسے رہ سکتا ہے۔ جبکہ رسول اللہ ﷺ کا اصول اولین توحید باری تعالیٰ کی بار آوری ہو۔

اور پھر واضح بات یہ ہے کہ وما ارسلنا من رسول ولا نبی الا اناتمنیٰ القی الشیطان فی امنیتہ۔ "کہ داستانِ غرانیق سے اس آیت کو کیا نسبت! اس آیت میں تو یہ وضاحت کی گئی ہے۔ ربِ دوعالم مومنین کے دل پر ابلیس کا القا ہونے ہی نہیں دیتا۔ ہاں تھڑ دلے یا سنگدل اس القا کو خود قبول کر لیتے ہیں۔ پھر اسی آیت کے آخری حصہ جس میں ارشاد ہے۔ یحکم اللہ اٰیتہٖ واللہ علیم حکیم۔ (22:-53) پر غور کر لیا جائے تو کافی ہے۔

باندازِ تخلیق جدید

اگر واقعہ (غرانیق) کا جدید علمی طریق سے تجزیہ کیا جائے تو ان روایات میں لفظاً" بھی تطابق نہیں پایا جاتا۔

(1) ایک روایت کے الفاظ ہیں۔ تلک الغرانیق العلا وان شفاعتھن لترتجیٰ۔

دوسری روایت کے الفاظ ہیں۔ تلک الغرانقتہ العلیٰ وان شفاعتھن ترتجیٰ

تیسری روایت کے الفاظ ہیں۔ الغرانقتہ العلا وان شفاعتھن ترتجیٰ

چوتھی روایت کے الفاظ ہیں۔ انہا لھی الغرانیق العلا وان شفاعتھن

پانچویں روایت کے الفاظ ہیں۔ وانھن الغرانیق العلا وان شفاعتھن لھی التی ترجیٰ

یہ روایت کے موضوع ہونے کی کافی بین دلیل ہے جیسا کہ ابن اسحٰق نے فرمایا انہ من وضع الزنادقہ یہ ملحدوں کی وضع کردہ روایت ہے" اس روایت کا مقصد محمد ﷺ کی

صحت رسالت میں شک پیدا کرنا ہے۔

سورہ النجم کی آیات کا سیاق بجائے خود واقعہ کے غلط ہونے کے ناقابلِ تردید دلیل ہے۔

لقدرای من ایت ربه الکبری۔ افرائیتم اللات والعزی ومنوٰۃ الثالثه الاخری الکم الذکر وله الانثی تلک اذاً قسمة ضیزی۔ ان هی الا اسماء سمیتموها انتم واباؤکم۔ ماانزل اللّٰه بهامن سلطان۔ ان یتبعون الا الظن وما تهوی الانفس۔ ولقد جائهم من ربهم الهدی۔ (۵۳ : ۱۸-۲۳)

بیشک رسول (ﷺ) نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں اور اے مشرکین تم تو صرف لات اور عزیٰ کے مجسمے اور زیادہ سے زیادہ مناۃ دیوی دیکھ کر ان کی الوہیت پر امید لگائے بیٹھے ہو اور تم نے یہ تقسیم بھی تو عجیب کی ہے کہ اللہ کی جھولی میں تو بیٹیاں ڈال دیں اور اپنے لئے بیٹے پسند کر لئے۔ یہ تقسیم تو بہت ہی ناانصافی کی ہے۔ وہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ لوگ محض ظن (فاسد) اور خواہشاتِ نفس کے پیچھے چل رہے ہیں۔ حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آ چکی ہے۔

یہ آیت وضاحت کے ساتھ دلالت کرتی ہے کہ لات' عزیٰ اور منات اپنی وضع قطع کے اعتبار سے بھی اس قدر بے معنی ہیں کہ تمہیں نے انہیں تراشا اور تمہیں نے اپنے باپ دادا سے سن کر ان کے نام رکھ لئے۔ اور کچھ خود ہی تجویز کر لئے۔ کیا اس وحدہ لاشریک نے بھی ان کی الوہیت پر تمہیں کوئی دلیل دی ہے۔

نتیجہ یہ نکلا

کہ اگر ہم مان لیں کہ ان آیات میں غرانیق کا دخل ہے تو صورت یہ ہو گی۔

افرئیتم اللات والعزی۔ ومنوٰۃ الثالثه الاخری وتلک الغرانیق العلاء ان شفاعتهن لترتجی الکم الذکر وله الانثی تلک اذاً قسمته ضیزی ان هی الاسماء سمیتموها انتم واباؤکم ما انزل اللّٰه بهامن سلطان۔ (23:53)

اس صورت میں اس آیت کے معنوں میں تضاد ہو گا کیونکہ اس طرح پہلے تو ایک جملہ میں ان کی تعریف ہو گی اور اس کے بعد مسلسل چار آیتوں میں مذمت!

اب آپ ہی غور فرمایئے انصاف کیجئے کہ قرآن اس اضطراب' تناقص اور آشفتہ بیانی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ جس کی بلاغت کمال کی لاانتہا بلندیوں پر ہے۔

قرآن تو قرآن کیا کوئی سمجھدار انسان بھی اس حرکت کا مرتکب ہو سکتا ہے کہ ایک

ہی سانس میں دو مختلف المعنی متضاد باتیں کہے؟

ثابت ہوا کہ یہ تداخلِ غرانیق ملحدوں کا من گھڑت ہے۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

لفظ غرانیق پر

شیخ محمد عبدہ کا مواخذہ! اہلِ عرب نے کبھی بھی اپنے اشعار، اپنے خطبوں یا ادب پاروں میں لفظ "غرانیق" اپنے معبودوں کے متعلق استعمال نہیں کیا۔ کیونکہ غرانیق اور غرنوق دونوں لفظ سیاہ سفید رنگت والے حسین آبی پرندہ کیلئے مستعمل ہوتے ہیں۔ مثلاً" کانگ و فاز! یا یہ الفاظ حسین نوجوان کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔ لیکن بتوں کے ساتھ ان لفظوں کی تطبیق احمقانہ سوچ ہے۔

بتوں کی شفاعت سے متعلق رسول اللہ کی زندگی سے استدلال

رسول اللہ ﷺ کے عہدِ طفولیت زمانۂ رشد اور دورِ شباب غرض کسی میں بھی جھوٹ کا ظہور نہیں ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے پچیسویں سال میں قدم رکھا تو مکہ والوں کی زبان پر یہ سچائی عام تھی کہ آپ ﷺ صادق و امین ہیں اور اس خوبی کا چرچا اس قدر عام اور دن بدن ہمہ گیر ہوتا گیا کہ بعثت کے بعد جب آپ ﷺ نے کوہ صفا پر تشریف فرما ہو کر قریش سے سوال کیا۔

ارائیتم لو اخبرتکم ان خیلا ۔ بفسح ہذا الجبل اکنتم تصدقونی؟

اے قریش اگر میں کہوں کہ اس پہاڑ کے اس طرف ایک لشکرِ جرار تم پر حملہ کرنے کے لئے چھپا ہوا ہے تو تم میری بات مان لو گے؟

بیک زبان جواب ملا۔

نعم انت عندنا غیر متھم وما جربنا علیک کذبا۔

اے محمد (ﷺ) ہم آپ کی یہ بات اس لئے صحیح تسلیم کریں گے کہ آپ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔

ایسے امین و عظیم سید البشر ﷺ کی طرف ایسا بہتان منسوب کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ اس نے بندوں کی بجائے رب العالمین سے ایسی بات منسوب کی ہو جو اس ذاتِ واحد القہار نے فرمائی ہی نہ ہو اور وہ بھی اللہ کے خوف سے نہیں بلکہ بندوں سے ڈر کر بندوں کی قربت حاصل کرنے کے لئے استغفر اللہ، استغفر اللہ ایسی تدبیر سوچی ہو۔ حالانکہ ہر رسول اللہ

کے سوا کسی اور سے خائف نہیں ہوتا۔

اور پھر اس شخصیت سے اس قسم کا خیال عقل و شعور سے کتنے دور کی بات ہے جسے اس پر چلنے والوں کی ثابت قدمی اور استحکام کی اہمیت کو پہچانتا ہو۔ اور اسے اس بات کا بھی شعور ہو کہ اس راہ میں تن آسانی اور غفلت موت کے مترادف ہے۔

یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

جس شخص نے انہی قریش کی جانب سے سورج اور چاند کو اپنے دائیں اور بائیں ہاتھ کا مطیع و فرماں بردار ہونے پر بھی اپنے دعوائے توحید کو ترک کرنے پہ رضامندی کا اظہار نہ کیا ہو یہاں تک کہ اس نے اپنے مدعا کو دوسروں تک نہ صرف پہنچانے بلکہ دلیل کے ساتھ منوانے کا تہیہ کر لیا ہو۔ آج وہی شخص بتوں کی وجہ سے اپنی تمام کوششوں پر پانی پھیر دے۔ اللہ تعالیٰ نے جس دین کی تبلیغ کے لئے اسے مبعوث فرمایا ہو اسی دین کی بنیادیں اپنے ہاتھ سے اکھاڑ کر پھینک دے۔ نعوذ باللہ!

اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بتوں کی (یہ مفروضہ) بزرگی بیان کرنے کا زمانہ بعثت سے دس برس بعد آیا ہو۔ جبکہ آنحضرت ﷺ کے مطیع و فرماں بردار انہیں قریش کے ہاتھوں طرح طرح کے ہولناک جبرو تشدد برداشت کر چکے تھے۔ اس دور کی بجائے آج ان بتوں کی شفاعت کو تسلیم کیا گیا جبکہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جیسی بہادر شجیع اور جرات مند شخصیتیں علی الاعلان ایمان لا چکیں! اس کے علاوہ مکہ میں دین اسلام کی عام مقبولیت سے خوفزدہ ہو کر اہلِ مکہ نے ان پر جبرو تشدد کرنے سے ہاتھ روک لیا ہو۔ یہی نہیں بلکہ جس دور میں اہلِ مکہ کے ظلم و ستم کے واقعات خطہ عرب سے نکل کر فضائے عالم میں گونجنے لگے ہوں۔

قرائن سے ثابت ہوا کہ واقعہ غرانیق کا کوئی وجود نہیں۔ اسے دشمنانِ دین' دشمنانِ رسول ﷺ نے وضع کیا۔ یہ ان کی شیطانی دماغ کی پیداوار ہے مگر اس کے چہرہ پہ ایسا غازہ ملا کہ حقائق شناس نگاہ نے اسے فوراً" پہچان لیا۔ یہ کاغذ کی ناؤ ہے جیسے کہ الزام لگانے والے کہتے ہیں کہ محمد ﷺ قریش کی باتیں سنتے رہے یہاں تک کہ خود ان کی زبان سے بھی بتوں کی شفاعت کے بارہ میں کلمہ نکل گیا۔ لیکن جب وہ وہاں سے اٹھ کر اپنے آستانہ نبوت (علیہ السلام) پر تشریف لائے تو پشیمان ہوئے اور اللہ کے حضور میں توبہ پیش کی جس پر جبریل علیہ السلام حاضر ہوئے۔

الزام لگانے والوں نے غرانیق کے رخ پر ملمع چڑھا کر خوشنمائی کی کوشش کی مگر نفسِ واقع کی نفی کے لئے یہ ملمع سازی خود ٹھوس شہادت ہے۔

اس لئے کہ اگر آنحضرت ﷺ کی زبانِ اقدس پر یہ الفاظ آ جاتے تو فوری رد عمل کے طور پر وہیں اللہ کے حضور معذرت یا توبہ کرنے میں کون سا امر مانع تھا۔ ذرا سے پچھتاوے پر اگر گھر میں وحی آ سکتی ہے تو وہاں بھی آ سکتی ہے جہاں سے اس غلطی کو منسوب کیا جاتا ہے۔
اس سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے زمانہ اولیٰ میں کسی کو اس واقعہ کا خیال و گمان بھی نہ تھا۔ صرف حاسدانِ اسلام نے اسے افواہ کی صورت پھیلا کر اپنی دشمنی کا غبار نکالنے کی نئی ترکیب لڑائی۔ یہ افتراء عائد کرنے والوں کی جرات پر اور بھی حیرت ہے۔ انہوں نے الزام تراشی کے لئے کون سی بات تراشی۔ وہ توحید جو کہ رسالت کا اولین مقصد ہے جس کی تبلیغ کے لئے آپ کی بعثت وجود میں آئی اور جس کی تبلیغ کے لئے بعثت کے پہلے سانس سے لیکر کسی لمحہ میں بھی سہل انگاری یا تساہل سے کام نہیں لیا گیا۔

وہ تبلیغ جس سے منع کرنے کے لئے قریش کی طرف سے مال و منصب اور حسینۂ عرب دلانے کا لالچ دیا گیا یہ سانحہ اس وقت کیوں پیش ہوا جب آپ کے فرماں برداروں کی تعداد بھی معمولی تھی۔

نہ اس وقت صادر ہوا جب محمد ﷺ کے ہر صحابی رضی اللہ عنہم پر قریشِ مکہ کے بے انتہا شدید قسم کے ظلم و ستم کا سلسلہ شباب پر تھا۔

دشمنانِ محمد ﷺ کا آپ ﷺ پر اس بہتان کا لگانا خود کفار کا چھچھورا پن اور نبی اکرم ﷺ کے تبلیغِ توحید میں ثابت قدم ہونے کا بیّن ثبوت ہے۔

دوسری طرف بہتان لگانے والوں کی یہ جرات کس قدر حیرت افزا ہے کہ پھر اس واقعہ کو عام کرنے کے لئے تحقیق کا بہانہ تراش کر اسے خوب ہوا دی اور ثابت کرنے کی کوشش کی۔ رسولِ کل عالم ﷺ جس توحید کے داعی تھے اسی کو اپنے ہاتھوں سے تہس نہس کرنے بیٹھ گئے۔

مہاجرین کی مکہ میں مراجعت کا ایک بار پھر ذکر

جس طرح تصدیق سے زیرِ بحث مسئلہ عاری ہے اسی طرح اس سے مہاجرینِ حبشہ کا تعلق بھی محال ہے۔

بلکہ ان کی ہجرت کے اسباب اور ہی تھے جن کا ہم سابقہ سطور میں کر چکے ہیں۔

جو بات واضح ہے کہ عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اسلام قبول کرنے کے بعد قریش کے ہاتھ مسلمانوں پر ستم کرنے سے خود ہی رک گئے تھے۔

مزید برآں خود نجاشی کے دل میں مسلمانوں کی جمیعت و قوت کا خوف پیدا کرنے کی کوشش

کی گئی، مسلمانوں کے دل میں ردعمل کے طور پر یہ خیال بھی ممکن ہے آیا ہو کہ کہیں ہم اس خوف کی لپیٹ میں نہ آجائیں اور اس سے پہلے مکہ معظمہ لوٹ جائیں۔

لیکن جب مہاجرین دوبارہ حبشہ میں جا کر آباد ہو گئے سکون سے رہنے لگے تو اب قریش کے دل اس خوف سے دھڑکنے لگے کہ کہیں مسلمان حبشہ میں رہ کر طاقت و قوت حاصل نہ کر لیں۔

اس کے انسداد کے لئے قریش نے ایک اور منصوبہ بنایا۔ سب نے باہم مشورہ سے ایک دستاویز لکھی، جس میں بنو ہاشم سے شادی بیاہ، لین دین، نشست و برخواست غرض ہر قسم کے تعلق کو توڑ دینا طے پایا۔

منصوبہ کے دوسرے مرحلہ میں یہ بھی ان لوگوں نے آپس میں طے کیا کہ سب لوگ مل کر ایک ہی لمحہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی شمع اسلام کو بجھا دیں۔ نعوذ باللہ من ذالک!

☆☆ ☆☆ ☆☆

نیا منصوبہ بنو ہاشم سے سوشل بائیکاٹ

نیا منصوبہ بنو ہاشم سے سوشل بائیکاٹ

جیسے کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ایمان لانے کے بعد قریش کی کمر ٹوٹ چکی تھی۔ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ زمانہ جہالت میں یا اسلام لانے سے پہلے جس شدت کے ساتھ مسلمانوں اور اسلام کی مخالفت کرتے تھے اس سے بہت زیادہ شجاعت و ہمت کے ساتھ وہ اسلام اور مسلمانوں کی حمایت میں سرگرم ہو گئے تھے۔

ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اپنے اسلام لانے کو صیغہ راز میں رکھنا تو ایک طرف کھل کر بڑی جرات اور دلیری کے ساتھ قریش کے بڑے بڑے لوگوں کے سامنے بھری محفل اور بھرے مجمعوں میں اپنے اسلام لانے کا اعلان کرتے اور اگر کسی نے آپ سے تکرار کی یا اس معاملہ میں آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو اس کے ساتھ لڑنے مارنے کے لئے بھی تیار ہو جاتے۔ آپ یہ بھی پڑھ چکے ہیں کہ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ساتھ دوسرے مسلمان بھائیوں کو بھی اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے کی ہمت بڑھاتے' حالت یہ ہو گئی کہ پہاڑیوں میں چھپ چھپ کر صلوٰۃ کا فریضہ ادا کرنے والے اب کھل کر' نڈر ہو کر کعبہ میں قیام الصلوٰۃ کرتے اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی پشت پناہی کرتے۔

قریش نے محسوس کیا کہ اب ہم نے اگر اپنا سلسلہ جبرو تشدد جاری رکھا تو اس کا نتیجہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لوگ ضد میں دوڑ دوڑ کر مسلمان ہونے لگیں۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے جنگ و قتال کے ماہر میدان میں اتر آئیں۔ ہو سکتا ہے حبشہ سے ان کو کمک آ جائے پھر یہ بھی ممکن ہے کہ یہاں کے لوگ جو ان کے قرابت دار ہیں ان کی حمایت میں سر بکف نکل آئیں۔ حالات کے تمام منفی پہلو سوچ کر ان سب نے ایک دستاویز تیار کی۔

ایک تاریخی دستاویز مقاطعہ

اس دستاویز میں کفار نے مکمل اتحاد کے ساتھ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب سے تمام معاشرتی تعلقات کو توڑ دینا طے کیا اور لکھا گیا کہ ان کے ساتھ رشتہ داری' لین دین' علیک سلیک سب ختم! مکمل ترکِ موالات! اس دستاویز پر مکہ کے بڑوں کے علاوہ باہر کے ستم گروں نے دستخط

ثبت کر دیئے۔

دستاویز بطور اعلام کعبۃ اللہ میں لٹکا دی گئی۔ قریش اپنی طرف سے اس منصوبہ کی کامیابی کو یقینی سمجھ کر یہ سوچ بیٹھے کہ بنو ہاشم اس سیاسی حربہ سے شکست خوردہ ہو کر بھوک اور پیاس سے بلک اٹھیں گے۔ ان کی یہ سیاسی چال ان کی سابقہ ایذا رسانی کے مقابلہ میں زیادہ موثر ثابت ہو گی لیکن اس کے باوجود اس زمانے میں بھی جہاں کہیں اکا دکا مسلمان ان کے ہاتھوں چڑھ جاتا اس پر تشدد کرنے سے باز نہ آتے۔

کم و بیش تین سال تک یہ سوشل بائیکاٹ جاری رہا۔ وہ شیطان کے اس فریب میں مبتلا تھے کہ مسلمان نبی اکرم ﷺ کو اس حالت میں اکیلا چھوڑ کر ان کے قدموں میں آگریں گے۔ اسلام کی تبلیغ کا سلسلہ خود بخود بند ہو جائے گا۔ لیکن اس قطع تعلق سے تو محمد ﷺ اور ان کے جانثار مسلمانوں کی استقامت اور قوتِ ایمانی اور دوبالا ہو گئی اپنے راہنما علیہ الصلوٰۃ والسلام کی فرماں برداری میں انہیں اور زیادہ راحت و لطف محسوس ہونے لگا۔

قریش نے ان کو مکہ معظمہ کے محلوں اور گلیوں سے نکال دیا تو انہوں نے پہاڑیوں میں رہ کر تبلیغ کا سلسلہ شروع کر دیا جس دین کی دعوت کل تک مکہ معظمہ کی بستی تک محدود تھی اب دشت و جبل میں آزاد اس کی آوازیں گونجنے لگیں۔ مکہ کی حدود سے نکل کر وادیٔ بطحا (علیہ السلام) کے گوشہ گوشہ میں بادِ صبا کی طرح اسلام کی تعلیم پھیلنے لگی۔ بادیہ نشیں (بدو) اور آس پاس کی دور و نزدیک بستیوں سے لوگ جوق در جوق آستانہ نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں حاضر ہونے لگے اور پہلے سے زیادہ بلند آواز میں ہر طرف کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ گونجنے لگا۔ قریش کے دل میں حسد کی آگ اور بھڑک اٹھی۔ انہیں محسوس ہونے لگا کہ ہمارے بتوں کی توہین کرنے والوں کا تو سیلاب امڈنے ہی والا ہے۔ اب انہیں یہ غم ستانے لگا کہ ان بادیہ نشینوں کو اسلام قبول کرنے سے کس طرح روکا جائے۔ گویا کل تک جو دوسروں کو تڑپا رہے تھے آج اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے حالات میں جکڑ دیا جس میں وہ خود انتہائی کرب میں تڑپنے لگے۔ اگر مکہ کے باہر کے لوگ اس تیزی کے ساتھ حلقۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تو ہمارا مذہبی اقتدار ختم ہو جائے گا۔ ہماری تجارت ختم ہو جائے گی۔

قریش کا سرورِ دوعالم ﷺ کو دھمکانا' ہر وقت ان کے خاندان اور گھر والوں کو ڈراتے رہنا' دینِ اسلام کی تحقیر و تذلیل اور ھادیٔ دوعالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پر پھبتیاں کسنا' تمسخر اڑانا اور ان کے جانثاروں اسلام کے حلقہ بگوشوں کی ہنسی اڑانا' شعراء اور اہلِ قلم کو بروقت اسلام کی برائیاں کہنے پہ لگائے رکھنا' غرض جس طرح بھی ممکن ہو جیسے بھی ہو مبلغ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے فرماں برداروں کو اذیتیں دے کر اپنے دل کا غبار نکالنا۔ سب آزما چکے اور منہ

کی کھا چکے- ہر طرف سے ناکامی نے طمانچہ مارا تو رسول اللہ ﷺ کو رشوتوں سے منوانا چاہا- خود کو ان کی رعایا اور ان (محمد ﷺ) کو مطلق حکمران ماننے کا قبالہ لکھ کر دینا چاہا اس پر نہ مانے تو مال و دولت کے انبار لگا دینے کی پیشکش کی- جب آپ ﷺ نے اسے بھی پائے حقارت سے ٹھکرا دیا تو حسینۂ عرب پیش کرنے کی درخواست پیش کی- جب آنحضرت ﷺ نے اس کی بھی دھجیاں اڑا کر ان کے ہوش و حواس کے حوالے کر دیں تو مسلمانوں کو ترکِ وطن کرنے پر مجبور کر دیا- شیطان کا یہ آخری مشورہ بھی جب ناکام ہوا تو ترکِ موالات سوشل بائیکاٹ معاشرتی مقاطعہ کا فیصلہ کر دیا- شیطان نے انہیں فریب دیا تھا کہ اس آخری حربہ کے نتیجہ میں ہر مسلمان ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے کھڑا ہو جائے گا اور کہے گا- حضور ہماری غلطی معاف کر دیجئے ورنہ ہم بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے- لیکن- شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن--- نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی-

کفار کا یہ حربہ بھی ناکام ہو گیا-

رسول اللہ ﷺ اپنی تمام یکسوئی کے ساتھ حالات کی مخالفتوں سے بے نیاز منصب و مقصدِ رسالت کی تکمیل میں مصروف رہے- جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو "بشیرو نذیر" دونوں خوبیوں کے ساتھ مبعوث فرمایا تھا- اور قریش کو پے بہ پے ناکامیاں دیکھنا پڑیں- پھر بھی انہیں رسول اللہ ﷺ کے خلاف فتنہ و فساد پھیلانے سے باز آنے کا خیال نہ آیا- وہ سیدالبشر علیہ الصلوٰۃ والسلام جس نے اپنے حسنِ کردار کا ایسا مظاہرہ کیا کہ خود ان ہی سے امین ہونے کا خطاب حاصل کیا-

وہ لوگ دینی امانت میں ان کی صداقت سے کیوں منہ پھیر گئے؟ توحید کے حوالے سے انہوں نے ان کو صادق و امین کیوں نہ مانا؟

عقلمندی کا تقاضہ یہ تھا کہ اب وہ ان شیطانی ہتھکنڈوں کو چھوڑ دیتے اور مبلغِ اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے اور اس عظیم صادق و امین ہستی پر ایمان لے آتے جن کو وہ شروع سے جانتے ہیں- جس کے بارہ میں وہ ہمیشہ نیک گمان رکھتے رہے-

لیکن شیطانی فریب کے مارے لوگ سوچتے رہے کہ اسلام کے خاتمہ کے لئے کوئی اور حربہ استعمال کریں تاکہ عرب پر ان کی سیادت و قیادت قائم رہے- ان کے بتوں کے بارہ میں مفروضہ توہمات کی قوت میں ضعف نہ آنے پائے- ان کے شہر کو بتوں کی وجہ سے جو عظمت و تقدس حاصل ہے وہ ختم نہ ہونے پائے- چنانچہ اہلِ مکہ کی بدنصیبی نے بدستور انہیں اپنے شکنجے میں جکڑا رکھا- شاید ان میں سے بعض کی تقدیر میں آنحضرت ﷺ کی اطاعت و سعادت تھی ہی نہیں- انہیں الٹا یہ غم کھائے جا رہا تھا کہ محمد ﷺ کی دعوتِ مکہ سے نکل کر دور تک

پھیلتی کیوں جا رہی ہے۔ انہوں نے دینِ اسلام کی دعوت کے خلاف مکہ میں اپنی روایتی مہم کو اور موثر اور تیز تر کرنے کا منصوبہ بنایا۔

(1) دینِ اسلام کی دعوت کو روکنے کے لئے جھگڑا کرنا پڑے تو جھگڑا کرو۔

(2) دلیل سے کام نکلے یا گالیاں دینے سے۔۔ کام نکالو۔ غرض جس طرح سے بھی دعوت کی روک تھام ہو سکے کرو۔

اپنے مزعومہ دشمن محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمتہ للعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خلاف بہتان طرازی' ان کی ہر دلیل کے خلاف توڑ' ان کے عقیدے کے مقابلہ میں اپنے عقیدہ کی برتری دلائل یا جھوٹ سے جس طرح بھی ممکن ہو ثابت کرو۔ غرض دعوتِ کفر کو مکہ معظمہ میں اس انداز سے پھیلایا جائے کہ مکہ سے باہر رہنے والے نہ صرف بادیہ نشیں بلکہ تمام جزیرہ عرب میں یہ دعوتِ کفر مقبول ہو جائے۔

قریش کو اب سمجھ میں آ گیا کہ مکہ کے رہنے والوں پہ تو زیادتی یا تشدد کر سکتے ہیں مکہ سے باہر رہنے والے ہزاروں انسانوں پر تو جابرانہ ہتھیار استعمال نہیں ہو سکتے۔ ہر سال مکہ میں حج کرنے کی غرض سے آنے والے ہوں یا کبھی کبھی تجارتی لین دین کے سلسلہ میں جنہیں مکہ آنا پڑتا ہے۔ کبھی عکاظ و مجنہ اور ذوالمجاز کے میلوں کی کشش انہیں ادھر لے آتی ہے۔ اس بناء پر یہ لوگ حج کے لئے کعبہ بھی آ جاتے ہیں۔ ہمارے بتوں کو تقربِ الٰہی کا ذریعہ سمجھ کر ان کے ناموں کی قربانیاں بھی دیتے ہیں' نذر نیاز بھی دیتے ہیں۔۔ اور ہم سب ان کی برکت اور بخشش سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ ان سب کو دعوت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اثر سے کیسے روکا جائے۔ اگرچہ یہ کوشش اسی دن سے کی جا رہی تھی جس دن سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوتِ توحید کا آغاز کیا تھا۔ مگر اب ان کے دل میں ایک اور تحریک پیدا ہوئی۔

کفر کے منصوبے اپنی جگہ مگر اللہ جل شانہ کے اپنے فیصلے اٹل۔۔ اب تک سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صرف اپنے رشتہ داروں کو دعوتِ دین دینے کے مکلف تھے۔ آیت وانذر عشیر تک الاقوبین۔ جس کی تعمیل کے نتیجہ میں بعض تو مسلمان ہو گئے اور بعض ظلم و ستم کرنے پر تل آئے! مگر آج وحیِ الٰہی نے سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو حکم دیا کہ وہ سارے عرب کو دین اسلام کی دعوت دیں۔

وھذا کتاب انزلناہ مبارک مصدق الذی بین یدیہ ولتنذر ام القریٰ ومن حولھا (92:6)

یہ وہ بابرکت کتاب ہے جو پہلی آسمانی کتابوں کی بھی تصدیق کرتی ہے (اور اس لئے نازل ہوئی ہے) کہ تم وادی مکہ اور اس کے تمام نواح کو عذابِ آخرت سے ڈراؤ۔

اور کچھ دنوں کے بعد ہی تمام عالم کو دینِ اسلام کی دعوت دینے کی ذمہ داری سے بھی سید دوعالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نواز دیا گیا۔

پہلے حکم کی تعمیل میں نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام حج کے دنوں میں حاجیوں کے خیموں میں جاتے اور ان کو دعوتِ توحید دیتے۔ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانے کا درس دیتے۔

قریش دعوتِ دین کی اس وسعت سے اور گھبرائے' ان کے سینوں پہ سانپ لوٹنے لگے' ان کی ایک ٹولی مغیرہ بن ولید کے پاس پہنچی اور انہیں نئی صورتحال کا رونا رویا۔ اور کہا کہ ہم اپنے دشمن کی کامیابیاں روکنے کے لئے اپنے مذہب کا پرچار کرنا چاہتے ہیں۔ مغیرہ نے بھی ان سے اتفاق کیا۔ بحث مباحثہ کے بعد طے یہ ہوا کہ اصولی طور پہ سب لوگ محمد ﷺ کے خلاف کوئی ایک بات کہنا مقرر کر لیں۔ مثلاً" ہم میں سے جو شخص بھی جس کو بھی ملے اسے کہے کہ محمد ﷺ کاہن ہے مگر مغیرہ بن ولید نے یہ تجویز یہ کہہ کر رد کر دی کہ نہ تو محمد ﷺ کاہنوں کی طرح گنگنا کر بات کرتا ہے۔ نہ اس کے کلام میں تک بندی ہے۔ دوسرے نے کہا کہ دیوانہ کہا جائے۔ ولید نے کہا مگر اس میں جنون کا بھی کوئی اشارہ تک نہیں۔ ہم ایسی بات اس کے ذمہ لگا کر خود کو دیوانہ کہلائیں گے۔ تیسرے نے کہا جادوگر کہا جائے۔ ولید نے کہا اس کی بھی دلیل نہیں۔ نہ تو اس نے کبھی گرہیں لگا کر نہ ان پر دم پھونک کیا ہے اور نہ ہی کبھی سحر کیا ہے۔

غرض بہت سی بات چیت کے بعد مغیرہ بن ولید نے یہ مشورہ دیا کہ ہم سب حاجیوں کے سامنے یہ ثابت کریں کہ محمد (ﷺ) کی جادو بیانی نے باپ کو بیٹے سے' بیٹے کو باپ سے جدا کر دیا ہے۔ بھائی بھائی سے جدا ہو چکا ہے۔ میاں بیوی میں پھوٹ ڈلوا دی ہے۔ خاندانوں اور قبیلوں میں دشمنی کی آگ سلگ گئی ہے۔ ولید نے ان کو مزید یہ بھی مشورہ دیا کہ ان باتوں کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اہلِ مکہ کے اتفاق اور یکجہتی (جو عرب میں ضرب المثل تھی) کی پرانی داستانوں کا بھی ذکر کرو اور بتاؤ کہ آج وہ اتفاق ختم ہو گیا ہے۔ اس جادوگر کے جادو نے سب میں ایسی تفریق پیدا کر دی ہے کہ سب لوگ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ یہ مشورہ طے ہونے کے بعد قریش نے باہر سے آنے والوں کے خیموں میں جانا شروع کر دیا اور قرارداد کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی سحربیانی کا خوف پھیلانے کی کوشش کرنے لگے۔ ہر ایک اس سلسلہ میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگا۔ درحقیقت یہ ان کا اپنا ہی پیدا کردہ خوف تھا کہ توحید کے مقبول ہونے سے ان کے بتوں کے خلاف ہر طرف آگ بھڑک اٹھے گی۔

لیکن قریش ہی نے جس دعوت کو سحربیانی کا نام دیا ہو' اس کے سامنے ان کی اپنی بچگانہ دعوت کیسے قدم جما سکتی تھی۔ یہ ناممکن ہے کہ حق بات کو مؤثر انداز میں پیش کیا جائے اور لوگ اس کا اثر قبول نہ کریں۔ ہو سکتا کہ اس کے برعکس اپنے حریف کی عظمت اور اپنی بے بسی کا

اعتراف ان کے لئے زیادہ مفید ہوتا۔ لیکن ضد کا کیا علاج؟

نضر بن حارث

اب قریش اپنے ابلیس نضر بن حارث سے مدد کے طلبگار ہوئے نضر کچھ مدت تک حیرہ میں رہ کر شاہانِ فارس رستم و اسفندیار کے واقعات اور مجوس کی عبادت کے طور طریقے سنا کر لوگوں کو کہتا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی باتیں میرے قصوں کے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہیں۔ وہ تو ماضی میں گزر چکے لوگوں کے قصے سناتا ہے۔

قریش نضر کی داستانیں ہر اس شخص کے پاس بیان کرتے جس کے پاس جاکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے عاقبت کے عذاب سے ڈراتے اور اللہ وحدہ لا شریک پر ایمان لانے کی دعوت دیتے۔

گویا ثقافتی یلغار کا سلسلہ چلتا رہا۔ چنانچہ مکہ میں ایک جبر نام کا غلام عیسائی جو صفا پہاڑی کے پاس رہتا تھا۔ عجم کا رہنے والا تھا۔ کبھی کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس جاکر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ قریش نے یہ بات اڑا دی کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ کہتے ہیں وہ جبر نصرانی کی تعلیم کا اثر ہے کبھی کبھی کفار یہ بھی کہہ دیتے کہ اگر تم کو اپنا دین چھوڑنا بھی پڑا تو بھی ہم عیسائی مذہب اختیار کرلیں گے لیکن اسلام کے قریب تک نہیں پھٹکیں گے! اس پر آیت نازل ہوئی:۔

ولقد نعلم انھم یقولون انما یعلمہ بشر لسان الذی یلحدون الیہ اعجمی وھذا لسان عربی مبین ○

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے رسول کو ایک اور انسان یہ قرآن تلقین کرتا ہے مگر وہ شخص تو عجمی ہے۔ اور قرآن فصیح عربی زبان میں ہے۔ نتائج جیسے بھی تھے لیکن قریش اپنے ان جدید حربوں (ثقافتی یلغار) سے کچھ مطمئن ضرور ہو گئے۔ اور یہ خیال پختہ ہو گیا کہ مسلمانوں کو اذیتیں دینے اور ستانے سے کہیں زیادہ یہ حربہ بہتر ہے لیکن حقائق اس کے برعکس تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تبلیغ میں موجود حقیقت کی پوری قوت ہر طرح جلوہ فرما ہو کر کفار کے باطل پر چھا رہی تھی' اسلام کا دائرہ دن بدن وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا اور ان کی کھوکھلی مخالفت اپنی موت آپ مر رہی تھی۔

طفیل بن عمرو دوسی کا ایمان لانا

طفیل بن عمرو دوسی حج کعبہ کے لئے مکہ تشریف لائے تو قریش نے ان کا استقبال مکہ سے باہر جا کر کیا یہ اپنے وقت کے مانے ہوئے شاعر تھے۔ دانش مند تھے اور مؤثر شخصیت کے مالک بھی قریش کی خواہش یہ تھی کہ انہیں اسلام کی دعوت اور رسول الامین علیہ الصلوٰۃ السلام سے

پہلے ہی مخالف کر دیا جائے۔ انہوں نے انہیں ڈراتے ہوئے کہا اس شخص کی باتوں میں جادو بھرا ہے' میاں بیوی میں لڑائی کروا دیتا تو ایک طرف خود انسان اور اس کی ذات میں بھی لڑائی کروا دیتا ہے۔ ہمارے معزز مہمان ہمیں آپ کی قوم کے بارہ میں اندیشہ ہے کہیں وہ شخص آپ یا آپ کی قوم کو بھی ہم مکہ والوں کی طرح آپس نہ لڑوا دے۔ اس لئے بہتر ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات بھی نہ کریں۔ نہ ان کی بات کانوں میں پڑنے دیں۔

الٹا اثر ہوا

طفیل مختلف اوقات میں جب تک ان کا قیام رہا کعبہ میں آتے اور عبادت کے بعد چلے جاتے۔ ایک دن رسول امین علیہ الصلوٰۃ السلام پہلے سے وہاں موجود تھے کسی کو تبلیغ فرما رہے تھے۔ طفیل کے کانوں میں دو ایک جملے پڑ گئے جو انہیں بھلے معلوم ہوئے' اس کے بعد انہوں نے خود سے کہا کہ میں دانا ہوں' بالغ العقل ہوں' شاعر ہوں' اچھی اور بری بات میں تمیز کر سکتا ہوں' مجھے اس شخص کی بات سننے میں کیا حرج ہے؟ اگر اچھی بات ہو گی تو قبول کر لوں گا ورنہ چلا جاؤں گا۔ طفیل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں رہے جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کعبہ سے نکلے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم بہ قدم چل کر آپ کے دولت خانہ پر آ پہنچے! اپنا حال دل کہا۔ یہاں کے لوگوں نے جو کہا تھا اس کے رد عمل کا ذکر بھی کیا۔ رسول الامین علیہ الصلوٰۃ نے سب کچھ سنا اور جواب میں قرآن حکیم کی تلاوت فرمائی۔ طفیل عمرو دوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قرآن حکیم سن کر اسلام قبول کر لیا اور یہاں سے واپس جا کر اپنے قبیلہ (دوس) میں دین اسلام کی مسلسل تبلیغ کرتے رہے اور ان کا تمام قبیلہ اسلام لے آیا۔ فتح مکہ کے بعد یہ قبیلہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہو کر سعادتِ زیارت سے مستفید ہوا۔

مکہ سے باہر عرب کے دوسرے لوگوں میں صرف طفیل دوسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تبلیغ اسلام کی برکت سے فیض یاب نہیں ہوئے بلکہ مقامی بت پرست اور اہلِ کتاب میں سے بھی بہت سے خوش نصیب لوگوں نے رسالتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصدیق کر کے اپنی قسمت سنوار لی۔ چنانچہ یمن کے نصاریٰ کا ایک وفد اپنی قوم کی طرف سے رسول اللہ کی دعوت کو جانچنے پرکھنے اور معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کئی باتیں بطور پرکھ پوچھیں۔ اطمینان بخش جواب پایا تو بس ایک ہی مجلس میں حلقہ بگوش اسلام ہو گیا۔

قریش کو جب یہ اطلاع ملی تو کلیجہ مسل کر رہ گئے اور ان کے پاس آ کر کہا۔ تم کیسے بد اندیش لوگ ہو۔ تمہاری قوم نے تمہیں اس شخص کے حالات معلوم کرنے بھیجا تھا اور تم ایک ہی ملاقات میں اپنا دین چھوڑ کر اس کی تصدیق کر بیٹھے۔

ان حضرات پر قریش کی بد زبانی کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا۔

کیونکہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرنے سے پہلے وہ عیسائی مذہب کے پیرو تھے اور بتوں کی جگہ اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کرتے تھے۔

قریش کے تین بڑے

قریش کی انسدادی کوششوں کے باوجود حق کا نور پھیلتا ہی گیا۔ آنحضرت ﷺ کی دعوتِ حق کے جواب میں چاروں طرف سے لبیک لبیک کی آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ اب تو قریش کے تین بڑوں کے ضمیر نے ان کے اپنے اندر دلوں میں یہ خواہش ابھار دی کہ جس چیز سے "آنحضرت ﷺ" ہم کو ڈراتا اور جس چیز کا وعدہ کر رہا ہے کیا وہ واقعہ صحیح ہے؟ اس سوال کے احساس نے ہر ایک کو ابوسفیان بن حرب' ابوجہل اور اخنس بن شریق کو اتنا ستایا کہ تینوں ایک دوسرے کو بتائے بغیر بیک وقت اپنے اپنے گھروں سے رات کے وقت نکلے تاکہ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں چھپ کر بیٹھا جائے اور رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے وہ کلام سنا جائے جس نے اتنے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔

اتفاق یہ ہوا کہ تینوں نے علاحدہ علاحدہ سوچا اور رات کے اندھیرے میں تینوں اپنی اپنی کمین گاہ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔ رسول اللہ ﷺ مصدرِ حق شب زندہ دار تھے' صلوٰۃ الّیل (رات کی نماز) کی نیت باندھ کر کھڑے ہوتے تو ایسے سوز و ترتیل کے ساتھ قرآن پڑھتے کہ سننے والوں کے دل میں اتر جاتے۔ اس رات تینوں اپنی اپنی جگہ صاحبِ قرآن کی آواز میں قرآن سنتے رہے۔ فجر ہوئی تو تینوں اپنی اپنی کمین گاہ سے نکلے گھروں کی طرف چلے اتفاقاً تینوں ایک موڑ پر جمع ہو گئے۔ تینوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تینوں ایک دوسرے کو زبان سے بتائے بغیر سمجھ گئے۔ سب نے بیک زبان اپنی اپنی غلطی کا اقرار کر لیا اور پھر اظہار افسوس کرتے ہوئے طے ہوا کہ جو ہونا تھا سو ہوا۔ آئندہ ایسی حرکت نہیں ہو گی اور پھر اگر یہاں آتے ہوئے ہمیں کسی نے دیکھ لیا تو وہ ہمارے اتحاد سے نکل کر حضرت محمد ﷺ کی جماعت میں داخل ہو جائے گا۔ لیکن جیسے ہی دوسری رات نے فضا پر اپنی گہری کالی چادر پھیلا دی تو ابوسفیان بن حرب' ابوجہل اور اخنس تینوں کو اس کلام و آواز کی کشش نے کھینچنا شروع کیا۔ تینوں کے دل اسی لہجہ اور اسی زبان سے کلام کو سننے کے لئے بے قرار ہو گئے۔ کل کی طرح آج بھی چھپ چھپا کر اپنی اپنی کمین گاہوں میں جا بیٹھے اور ساری رات حاملِ وحی کی زبان مبارک سے اللہ کا کلام سن کر محظوظ ہوتے رہے اور فجر کے وقت واپس ہوئے تو پھر کل ہی کی طرح اسی موڑ پر تینوں کی ملاقات پھر ہو گئی۔ ہر ایک اپنے آپ کو ملامت اور دوسرے کو تنبیہہ کرتے ہوئے کہنے لگا کہ اب سے ادھر کا خیال تک نہ کیا جائے لیکن تیسری شب کو بھی پہلی اور راتوں کی طرح ان کے دل ہاتھ سے نکلے جا رہے تھے۔ تینوں بے اختیار ہو کر اپنی اپنی گھات میں آ بیٹھے اور

رات بھر وحی الٰہی بزبانِ صاحبِ وحی سن سن کر وجد میں جھومتے رہے اور پہلے دو موقعوں کی طرح اس فجر کو بھی تینوں اسی موڑ پر جمع ہو گئے۔

آج ان تینوں نے ایک دوسرے سے یہاں اس کے بعد ہرگز نہ آنے کا پکا عہد کر لیا لیکن ان تین راتوں میں قرآن حکیم کے سننے نے ان کے دل پہ کیا اثر چھوڑا اس نے ان کی نگاہوں میں مستقبل کا جو نقشہ دکھایا اس سے ان کی روحیں کانپ اٹھیں' انہیں یقین ہو گیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلہ میں ہماری کوئی حقیقت نہیں۔ ایک نہ ایک دن ہمیں بھی مغلوب ہونا پڑے گا اور ہماری مغلوبیت سے تمام عرب' محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابعداری میں اپنا فخر محسوس کرے گا۔

لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے ضمیر کی اس آواز کے بعد انہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت اور قبولِ اسلام میں کون سا امر مانع تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ تو ان سے مال طلب فرمایا نہ اپنی سیاسی سیادت کے طلبگار ہوئے۔ نہ ان کے دل میں حکومت کرنے کی تمنا تھی۔ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر ایک سے تواضع سے پیش آتے' قوم سے دلی محبت رکھتے' ہر شخص سے نیکی سے پیش آنا آپ کا دستور تھا ہر ایک کو دینِ اسلام کی ہدایات قبول کرانے میں ان کا ذاتی فائدہ نہ تھا بلکہ دعوت قبول کرنے والے سے ہمدردی جتانا آپ کا اخلاقِ حسنہ تھا۔ اپنے آپ کا خود محاسبہ کرنا آپ کا شعار تھا۔ دوسروں کے ساتھ سختی اور بے رحمی سے پیش آنے کے بجائے دوسروں کی زیادتیوں کو بھی معاف فرما دیتے اور ان تمام کاموں میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دلی راحت محسوس ہوتی۔

صرف ایک واقعہ

ایک روز قریش کا سردار ولید بن مغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسلام کے بارہ میں کچھ گفتگو کر رہا تھا کہ اس درمیان میں ابنِ ام مکتوم (نابینا) رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور قرآن حکیم کی کسی آیت کے بارے میں دریافت فرمایا۔ لیکن اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے پہلے مغیرہ بن ولید کی طرف مکمل توجہ کے ساتھ محوِ گفتگو تھے۔ ممدوح رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے سوال کے جواب پر اصرار کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ناگوارِ خاطر گزرا۔ چہرہ مبارک پر کچھ ناپسندیدگی کے اثرات ابھرے اٹھے اور گھر پہنچے تو تنہائی میں ابن مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کچھ اپنے رویہ کے متعلق محاسبہ کیا۔ شرمندگی ہوئی تو اس وقت وحی نازل ہوئی۔

عبس وتولی۔ ان جاءہ الاعمیٰ۔ وما یدریک لعله یزکی او یذکر فتنفعه الذکری۔ اما من استغنی۔ فانت له تصدی۔ وما علیک الا یزکی۔ واما من جائک یسعی۔ وهو یخشی۔ فانت عنه تلهی کلا انها تذکرة فمن شاء ذکره۔ فی

صحف مکرمہ۔ مرفوعۃ مطہرہ۔ بایدی سفرہ۔ کرام بررہ۔

محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ترش ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے کہ ان کے پاس ایک نابینا آیا۔ اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی اختیار کرتا یا سوچتا اور سمجھانا اسے فائدہ دیتا جو پرواہ نہیں کرتا۔ اس کی طرف تم توجہ کرتے ہو۔ حالانکہ اگر وہ راہِ راست پر نہ آئے تو تم پر کچھ الزام نہیں۔ اور جو تمہارے پاس دوڑتا آیا۔ اور اللہ سے ڈرتا ہے۔ اس سے تم بے رخی کرتے ہو۔ دیکھو یہ قرآن نصیحت ہے۔ پس جو چاہے اسے یاد رکھے قابلِ ادب ورقوں میں لکھا ہوا جو بلند مقام پر رکھے ہوئے اور پاک ہے۔ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں۔ جو سردار اور نیکوکار ہیں۔

اندازہ کیجئے کہ قریش کو راہِ راست پہ لانے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوششوں کا یہ عالم کہ اللہ تعالیٰ کو یہ فرمانا پڑے کہ آپ ان کے بارے میں اتنے فکرمند نہ ہوں' جب ایسا موقع آئے کہ ایک طرف تو (ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ) کی طرح آپ کی رسالت کی تصدیق اور ہماری وحدانیت پر ایمان لانے والا ہماری آیات کو سمجھنے آئے اور فریقِ ثانی مغیرہ بن ولید جیسا باتونی ہو تو ترجیح صاحبِ ایمان کو دیجئے۔

بہرحال سوال یہ ہے کہ اسلام کی نعمت سے محروم انسانوں کو اسلام کی نعمتِ عظمیٰ کا مالک بنانے کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس قدر تن دہی اور خلوص کے ساتھ کوشش کرنے کے باوجود بت پرستوں کی سردمہری کے اسباب کیا ہیں؟

سرِفہرست ایک ہی سبب نظر آتا ہے۔ صدیوں پرانا باپ دادا کا عقیدہ بت پرستی جو ان کے دل و دماغ میں مضبوط جڑیں پکڑ چکا تھا اور رسم و رواج مذہبی زنجیروں کی طرح انہیں اپنی گرفت میں لئے ہوئے تھے۔

دوسرا سوال یہ ہے۔ کیا انسان کے لئے وقت گزرنے اور حقائق کا علم حاصل ہونے کے بعد مذکورہ اسباب کی گرفت سے بچ نکلنا ممکن بھی ہے یا نہیں۔

تجربہ کہتا ہے وراثت میں ملے ہوئے عقائد اور رسم و رواج کا زنگ ان لوگوں کے دلوں سے صاف ہونے کا امکان تو ہوتا ہے جنہیں زمانے کے پیش کردہ حقائق کو سمجھنے کا شعور اور انہیں تسلیم کرنے کا مزاج نصیب ہو۔ اس لئے کہ ان لوگوں کا دل اور شعور اس کٹھالی کی طرح ہوتا ہے جس میں سونا اور چاندی پگھل رہا ہو۔ آگ کی شدت جس کے کھوٹے اجزاء کو جلا کر جوہرِ خالص سونا باقی رہنے دے ایسے ہی لوگ حق کو جلدی یا بدیر نکھارنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور یہی لوگ حقیقت کی تلاش میں ہر چیز کا تجزیہ کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ہر زبان میں حقیقت پر مبنی الفاظ کی تاثیر کو اپنے دل میں اتار لیتے ہیں۔ یہ ایک اور بات ہے کہ ایسے لوگ خال خال ہی ہوتے ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس کے برعکس جو لوگ مذکورہ صفات سے محروم ہیں وہ پتھر کی طرح جامد۔ بے حس۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پہ کلامِ نرم و نازک بے اثر

لیکن دولت مند لوگ جاہ و جلال کے مالک سلطان و بادشاہ ایسے ہی دانا لوگوں کو جو حقائق آشنا ہوتے ہیں اپنے راستے کی دیوار سمجھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کا باہم مقابلہ جاری رہتا ہے۔ تونگر و سلطان اس خوف سے لرزہ براندام رہتے ہیں کہ اگر عوام نے ان کا اثر قبول کر لیا تو اس کی پہلی ہی ضرب ان کی تونگری اور سلطانی پر ہی پڑے گی۔ جس دولت اور حکومت پر یہ لوگ نسل در نسل قبضہ جمائے بیٹھے ہیں۔ یہ بادشاہت کے ٹھیکیدار ہر اس تحریک کے استقبال کے لئے آمادہ رہتے ہیں جو ان کی دولت اور اقتدار میں اضافہ کر سکے لیکن جس تحریک نے ان کی شہنشاہی کے تابوت کو پاؤں تلے روندنا ہو۔ ایسی اصلاح یا تجدید ان کے نزدیک عین باطل کہلاتی ہے۔ اسی طرح جس مذہب میں وہ اپنی خواہشاتِ نفسانی' ہوس پرست میلانات کو اپنی مرضی کے مطابق پائیں وہ مذہب ان کے نزدیک سراپا صداقت ہے۔ لیکن جو دین ان کی شہوات جمع مال و زر اور حصولِ جاہ و منصب میں حائل ہوتا نظر آئے ان کے نزدیک ایسے دین کے باطل ہونے میں کوئی کلام نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ ہر نئی تحریک سے لرزہ براندام ہو جاتے ہیں اور اپنے مرہونِ کرم عوام کو اس تحریک کے خلاف ابھار کر اپنی بقا اور توانائی کی راہیں نکالنے کی فکر میں سرگرم ہو جاتے ہیں۔ یہ دلدادگانِ ثروت اپنے دستِ نگر لوگوں کے سامنے قدیم رسوم کے بوسیدہ محلوں کی مفروضہ تقدس کی روح تابناک رکھنے کی تدبیروں میں لگے رہتے ہیں۔ کاش وہ اتنا ہی سمجھ سکتے کہ ان محلوں کی کھوکھلی بنیادیں گرنے ہی والی ہیں۔

لیکن آہ ـــــ ان بوسیدہ عمارتوں کا تقدیس کے پتھر اور چونے سے کیسا عجیب ہیکل کھڑا کیا جاتا ہے' مٹی کے ڈھیر میں رُوحِ مقدس کا وجود فرض کر کے کس دلیری سے بے روح احیاء کو تقدیس کا مظہر بنایا جاتا ہے۔

عوام جن کی نظریں ایسی ضرورتوں پر جمی رہتی ہیں جو ایسے اربابِ ثروت سے وابستہ ہیں۔ جو ہر لحہ ان سرمایہ داروں کو زندہ باد پکارنے میں پیش پیش ہیں۔ انہیں اس تفتیش کی مہلت ہی نہیں ملتی کہ حقیقت کا بتوں کے ہیکل اور بت خانوں میں محصور ہونا کیا معنی رکھتا ہے نہ انہیں اس پر غور کرنے کی فرصت ہے کہ حقائق نہ صرف اس چار دیواری اور پابندی سے آزاد ہیں بلکہ روحِ انسان کے ہم نشین بھی ہیں اور فطرت بھی انسان کے ظرف کے مطابق اسکی ترتیب کرنے میں فیاض ہے' حقائق کی پرورش غلام اور آزاد دونوں کے لئے ایک سی ہے۔ ان کے

نزدیک دونوں میں شمہ برابر بھی فرق نہیں۔ لیکن کوئی نظام کسی نگران قوت کی پوری گرفت کے بغیر چل بھی تو نہیں سکتا۔

لہٰذا ایسے لوگ جنہیں تین راتوں تک جس قرآن حکیم کی آیاتِ سلاست و بلاغت اور نبی اکرم ﷺ کی تلاوت و ترتیل کی کشش نے مسلسل تین رات تک نرم بستروں پر سونے نہ دیا ہو۔ ان سے یہ کیسے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی جاہ و ثروت پر لات مار کر ایسا ایمان قبول کر لیں۔ قرآنِ حکیم کی تعلیمات کو اپنا لیں جو ان کے بہت سے اعمال کو قابلِ محاسبہ قرار دیتا ہے۔ اور تمام انسانوں میں پوری پوری مساوات کی حمایت کرتا ہے۔ اس کی پرواہ نہیں کرتا کہ ایک شخص ابنِ ام مکتوم کی طرح نابینا اور مفلس ہے اور دوسرا ولید بن مغیرہ کی طرح سرمایہ دار اور غنی ہے۔ وہ اس کے کبرو غرور کے پردے چاک کرتا ہے اس کے سامنے یہ زریں اصول ہے۔

ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔ 12:49

اللہ کے نزدیک تم میں سے وہی باعزت ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہے۔

اسلام کے نزدیک غنی یا غریب ہونا بادشاہ یا غلام ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا' نہ ہی دین اسلام کسی کے خلاف کسی انسان کو مشتعل کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کوئی بادشاہ ہے ہوا کرے' سرمایہ دار ہے ہوا کرے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس کے اعمال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق ہوں' اس کا دولت کی تقسیم اور اختیار کا استعمال اسلامی اصولوں کے مطابق ہو! (مترجم)

ابوسفیان اور ان کے یارانِ طریقت کا اپنے باپ دادا کے دین پر جمے رہنے کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ بت پرستی کے مذہب پر یقین رکھتے تھے یا اپنے مذہب کی صداقت پر ان پر پوری طرح ظاہر ہو چکی تھی۔ بلکہ ان لوگوں کو اپنے مذہب پر استقامت کے بجائے اپنی ثروت و برتری کا قائم رہنا زیادہ عزیز تھا۔ جس کی بقاء کے لئے وہ ہر اس طاقت سے ٹکر لینے کے لئے تیار تھے جو انہیں اس دولت و ثروت سے محروم کرتی ہو۔ قریش نے حضرت محمد ﷺ کی فرماں برداری کی جگہ ان کے ساتھ ہر قسم کا بغض و عناد صرف اسی بناء پر قائم رکھا۔

مثلاً امیہ بن صلت ہی کو لیجئے۔ جو حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے آنے والے نبی کے لئے چشم براہ تھا۔ حتیٰ کہ یہی امیہ خود اپنے لئے خلعتِ نبوت کی امید لگائے بیٹھا تھا لیکن جب ظہورِ اکبر امیہ کی بجائے بعنوان محمد ﷺ (فداہ امی وابی) جلوہ افروز ہوا تو امیہ ہی کا کلیجہ حسد سے چھلنی ہو گیا۔ اس کے باوجود کہ امیہ بن صلت نے اپنے اشعار کو حکمت و دانش کی علامت ہونے کا اعزاز حاصل کر لیا تھا۔ لیکن جب آپ ﷺ کے سامنے اس کا ایک شعر پڑھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا امن شعرہ وکفر قلبہ امیہ کا شعر مومن ہے دل کافر ہے۔

یہی ذہنیت ولید بن مغیرہ کی ہے جو دل سے نبوت کا اقرار کرتا ہے۔ لیکن جونہی رسول اللہ

ﷺ کو اس مسند پہ جلوہ آراء پاتا ہے تو دل پکڑ کہہ اٹھتا ہے۔

اینزل علی محمد واترک انا کبیر قریش۔ و سیدھا و ینترک ابو مسعود عمرو بن عمیر الثقفی سید ثقیف ونحن عظیما القریتین!

عطا کا یہ محلِ نبوت محمد (ﷺ) کو مل جائے اور مجھ ایسا قریش کا سرغنہ محروم ہو جائے' میری ہی طرح ابو مسعود' عمرادر ابن عمیر ثقفی جو طائف کے بہت بڑے آدمی ہیں۔ ان کو بھی نبوت کا اہل نہ سمجھا جائے۔ جبکہ مکہ اور طائف دونوں بستیوں کے کرتا دھرتا ہم دونوں ہی تو ہیں۔

قرآن حکیم نے اسی واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

وقالوا لولا نزل ھذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم۔ اھم یقسمون رحمته ربک نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ الدنیا (34:43)

اور یہ بھی کہنے لگے یہ قرآن ان دونوں بستیوں (یعنی مکہ اور طائف میں) کسی بڑے آدمی پر کیوں نہ نازل کیا گیا۔ کیا یہ لوگ تیرے پروردگار کی رحمت کو بانٹتے ہیں۔ ہم نے تو ان میں انکی معیشت کو دنیا کی زندگی میں ہی تقسیم کر دیا ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے اپنی سابقہ سطور میں ابوسفیان ابوجہل اور اخنس کو متواتر تین راتیں چھپ چھپ کر قرآن حکیم سننے کا ذکر کیا ہے جس کے بعد اخنس نے ابوجہل کے گھر آ کر کہا۔

اے ابو الحکم ان راتوں میں ہم نے جو کچھ محمد ﷺ کی زبان سے سنا اس کے بارے میں تمہاری رائے کیا ہے؟

ابوجہل نے کہا: قرآن پر میری رائے کیا ہے؟ یہ نہ پوچھو۔ بات یہ ہے کہ عبدِ مناف کے ساتھ سیادت کا جھگڑا آج کا نہیں بلکہ مدت سے چل رہا ہے۔ انہوں نے اس پر قبضہ قائم رکھنے کے لئے اپنا دسترخوان وسیع کر دیا۔ تو ہم نے بھی ان کے مقابلہ میں مہماتی جدوجہد شروع کر دی۔ جب انہوں نے میدانِ جنگ میں اپنے جوہر دکھائے تو ہم نے بھی اپنی شجاعت کا شباب دکھایا۔ اگر انہوں نے سخاوت کے دریا بہائے تو ہم نے بھی اپنی (چمڑے کے تھیلے) ہمیانوں کے منہ کھول دیئے۔ یہاں تک کہ ہم ہر موقعہ پر ان کے دوش بدوش چلے ہیں۔ جیسے دو گھوڑے قدم بہ قدم ایک دوسرے کے برابر دوڑتے چلے آ رہے ہوں۔

لیکن جب عبدِ مناف یہ کہا۔ کہ ہم میں سے ایک نبی کا ظہور ہوا ہے اور اس پر آسمانوں سے وحی نازل ہوتی ہے۔ تو اس میں ہم ان کی برابری کرنے میں پیچھے رہ گئے۔ کیونکہ ہم اپنے قبیلہ میں کوئی نبی پیدا نہ کر سکے۔

اے اخنس اب تو نہ ہم ان کے نبی پر ایمان لا سکتے ہیں نہ ان کے اس نبی کی تصدیق کے لئے زبان کھول سکتے ہیں۔ اور جیسا کہ عرب کے ان بدوؤں کی روایتی باہم کشمکش' حسد' کینہ کے

اثرات کی گرفت سے انکار کرنا غلط فیصلہ کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح بدوؤں کے سوا جن قوموں میں یہ عادت پرانی ہو چکی ہے ان کا بھی یہی حال ہے۔ اور ایسے اثرات سے دل کو پاک کرنے کے لئے بہت لمبی اور محنت بھری تربیت درکار ہے۔ ضروری ہے کہ نفسانی شہوات کا فیصلہ عقل کی قوت سے کیا جائے اور اپنے اندر اس قسم کی استعداد بڑھائی جائے۔ جو اپنے مقابل بلکہ دشمن کی زبان سے بھی حقیقت کی داستان سنے تو بیان کرنے والے کو اپنا دوست اور خیرخواہ سمجھے۔ یہاں تک کہ قارون کی دولت، سکندر کی حشمت اور قیصر کی شہنشاہیت بھی حقیقت کے مقابلہ میں تنکے کے برابر بھی اس کی نگاہ میں نہ سما سکے لیکن اخلاقی معیار پر وہی انسان پہنچ سکتا ہے جس کے دل میں قبول حق کا ولولہ موجود ہو۔ ایسے لوگ نہ ہوں جو ایسے مال و نعمت کی کثرت پر اپنی جانیں قربان کرتے ہوں جو اپنا جلوہ دکھا کر چشم زدن میں اوجھل ہو جاتے ہیں۔

من کی دنیا ہاتھ آتی ہے پھر جاتی نہیں

تن کی تن کی دنیا چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے

ایسے لوگ اس دنیا کی دولت کو لازوال نعمت سمجھ کر اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انہیں چند لمحوں کے لئے رہنے والی دولت کے لئے خود کو میدان قتل و غارت گری میں نہیں گرانا چاہیے بلکہ لازوال نعمت کے حصول کی جدوجہد کرنی چاہیے۔ دولت و حکومت کے حریص لوگوں کے مقابلہ میں دور اندیش اور جواں حوصلہ مردوں کو حقیقت اور نیکی سے مضبوط دوستی کرنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی' ان کے سامنے ہر وہ دیوار جو حقیقت اور نیکی کی راہ میں حائل نظر آئے اسے اپنے پاؤں تلے روندتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھ جانا بہت آسان ہوتا ہے۔

اس معاملہ میں قریش مکہ کی ذہنیت پر جتنا ماتم کیا جائے کم ہے۔ جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ انصار کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ رہے ہیں۔ یہ حقیقت بھی سامنے ہے کہ ایک نہ ایک دن انہیں کائنات کی سب بڑی اور لازوال سچائی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا لیکن ضد میں ایک ایک قدم اٹھانا ان کیلئے موت کے مترادف ہے۔ بلکہ عالم یہ ہے کہ اس سچائی کو تسلیم کرنے والوں کی گردنیں اڑا رہے ہیں اور اس غالب آنے والی دعوت کو روکنے کے لئے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بنو ہاشم سے ترک موالات (سوشل بائیکاٹ) مقاطعہ اور نظربندی کر رہے ہیں۔ لطف یہ کہ ان لوگوں کو دکھ دینے اور اپنے جبر و تشدد کو شہرت دینے میں انہیں شرم تک نہیں آتی۔

ایک اور سبب

قریش اس لئے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت کو ماننے سے بھاگتے تھے کہ انہیں حشر، یوم الحساب عذاب دوزخ سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ عیش و عشرت کے دلدادہ تھے' تجارت میں اونے

پونے اور سود در سود سے دولت بڑھانے میں مگن رہنے کے عادی تھے۔ ان میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں تھا جسے آمدن کا مکروہ سے مکروہ طریقہ بھی معیوب محسوس ہوتا ہو۔

مذہبا" وہ اپنے تمام چھوٹے بڑے گناہوں کو معاف کروا دیتے ہیں۔ بتوں پر پورا یقین رکھتے تھے۔ ھبل کے سامنے قرعہ اندازی کرتے اور نتیجہ کو ھبل کا فرمان سمجھتے۔ بتوں کی مہربانیوں پر پکا یقین رکھتے ہوئے قتل' بدکاری اور بدگوئی پر غیبی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے تھے۔

اس کے مقابلہ میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو ایسی آیتیں سناتے جن کو سن کر عاقبت کے خوف سے بڑے بڑے بہادروں کا پتہ پانی پانی ہو جائے۔

ان ربک لبا المر صاد (14:89)۔ تیرا پروردگار مجرموں کو سزا دینے کے لئے گھات میں لگا ہوا ہے۔

وقالوا ءاذا کنا عظاما" ورفاتا ائنا لمبعوثون خلقا" جدیدا" ۵ قل کونو حجارۃ او حدیدا" او خلقا" مما یکبر فی صدورکم فیسقولون من یعیدنا قل الذی فطر کم اول مرۃ (49:17)

اور کہتے ہیں کیا جب ہم ہڈیاں اور چورہ چورہ ہو جائیں گے کیا سچ مچ نئے سرے سے پیدا ہو کر اٹھیں گے؟ آپ فرما دو کہ پتھر بنو یا لوہا یا کوئی مخلوق جو تمہارے خیال میں بڑی ہوا تو اب کہیں گے ہیں کون پیدا کرے گا؟ فرما دیجئے۔ جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا۔

اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں یہ بھی فرماتے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تمہاری سفارش صرف تمہارے اعمال کریں گے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اور یہ بھی صاف فرما دیا۔ فما تنفعھم شفاعتہ الشافعین۔ "کسی ایسے معبود کی سفارش ان کو کوئی کام نہیں دے گی" یوم جزا' قبروں سے اٹھنے' حشر کے میدان میں حاضر ہونے اور اعمال کے حساب اور جزا و سزا کی تفصیل بتاتے ہوئے فرمایا۔

فاذا جاۃ الصاخہ۔ یوم یفر المرء من اخیہ۔ وامہ وابیہ وصاحبتہ وبینہ لکل امری منھم یومئذا" شان یغنیہ وجوہ یومئذ مسفرہ ضاحکۃ مستبشرہ ووجوہ یومئذ علیھا غبرۃ ترھقھا فترۃ اولئک ھم الکفرۃ الفجارہ۔ (80:33-42)

اور جب قیامت کا غل مچے گا اس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا۔ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹے سے۔ ہر شخص کو اس روز ایک ہی فکر ہو گا جو اسے مصروفیت کے لئے کافی ہو گا اور کتنے منہ اس روز چمک رہے ہوں گے۔ خنداں و شاداں۔ (نیکوکار) اور کتنے چہروں پر گرد پڑی ہو گی اور سیاہی چڑھی ہو گی' یہ کفار بدکار ہیں۔

معزّز قارئین

آپ نے اس سے پہلے وعید کی یہی آیتیں پڑھی ہوں گی یا ان کے سننے کا اتفاق بھی ہوا ہو گا؟ اگر ان دونوں مواقع میں سے ایک موقع بھی ان آیات پر غور کرنے کا میسر آیا ہو تو کیا آپ کے دل میں خوف پیدا نہیں ہوا؟ اور یہ بھی تصور کر لیجئے یہ آیات ان آیتوں کا ایک حصہ ہیں جن کے ذریعہ محمد ﷺ مخاطبین کو قیامت کے ہولناک مناظر بیان کیا کرتے تھے۔ تاکہ انسان عذاب کے ڈر سے بدکار، ظلم، بدعہدی اور بے رحمی سے باز آ جائے۔

کیا آپ قرآن حکیم کی تلاوت کرتے وقت جہنم کے اس وصف کو جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائے ہیں پوری طرح اپنے تصور میں لا سکتے ہیں۔

(1) یقوم نقول لجہنم ھل امتلئت وتقول ھل من مزید۔ 30:50

اس دن ہم دوزخ سے پوچھیں گے کیا تو بھر گئی؟ وہ کہے گی کچھ اور بھی ہے؟

(2) کلما نضجت جلودھم بدلنا ھم جلودا غیرھا لیذوقو العذاب۔ (50:4)

عذاب کی ہر نوبت پر ان کے بدن کی کھال گل جائے گی۔ مگر ہم دوسری کھال پہنا کر انہیں عذاب سے دوچار کریں گے۔

قارئین کرام! جب مسلمان ہونے کی وجہ سے ایمان کی دولت اور آخرت کا زادِ راہ اپنے دامن میں رکھنے کے باوجود قیامت کے تیور اور جہنم کے ڈر سے آپ کی روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے تو پھر قریش ---- خاص کر ان کے سرغنوں کے تاثرات کا کیا عالم ہو گا جب ان کے کانوں میں یہ آیتیں پڑتی ہوں گی تو ان کے دلوں پر کس قدر خوف طاری ہوتا ہو گا جو قرآن حکیم کے نازل ہونے سے پہلے خود کو بتوں کی نگہبانی میں رہنے کی وجہ سے عذاب و حسلب سے بری سمجھتے تھے۔

یہ تصور بھی کر لیجئے جب کفار نے رسول اللہ ﷺ سے یہ آیتیں سنی ہوں گی، اپنے گناہوں کا تصور کیا ہو گا تو طیش میں آ کر کس شدید ردِ عمل کا اظہار کرتے ہوئے آنحضرت ﷺ کے خلاف آمادۂ جنگ ہوئے ہوں گے۔

اکثر قریش درحقیقت موت کے بعد کی زندگی کے نہ تو قائل تھے اور نہ ہی اس کی ہولناکیوں پہ یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سنا تھا کہ دنیوی اعمال کی سزا انہیں موت کے بعد ملے گی۔ انہیں صرف یہ ڈر تھا کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم بیمار ہو گئے تو ہماری دولت کم ہو جائے گی۔ کہیں ہمارے بیٹوں کی زندگی پر کوئی وبال نہ آ جائے یا کسی ایسی ہی صورت سے دوچار نہ ہونا پڑے جس سے ہماری عزت و قار رعب و دبدبہ پر زوال آ جائے۔ غرض انکی تمام زندگی کا مقصد صرف دنیا کے فائدے حاصل کرنا تھا یا انہیں ان راہوں کو بند کرنا

تھا جو ان کے دنیاوی مفاد میں رکاوٹ ثابت ہوں۔

اگر انہیں کبھی یہ خیال بھی آتا کہ غیب سے انہیں ان کے اعمال کی جزا اور سزا بھی ملنا ہے کوئی معاوضہ بھی ملنا ہے۔ تو ان خدشات کو دور کرنے کے لئے انہوں نے کئی ڈھنگ اختیار کر رکھے تھے۔ وہ تیروں کنکروں اور پرندوں سے فالیں لیتے' پرندے فال لینے کے لئے وہ یا تو زور سے چلا دیتے یا کنکری مار کر پرندے کو اڑا دیتے۔ اگر وہ ان کے دائیں جانب سے نکل گیا تو وہ اسے نیک شگون سمجھتے اور بائیں جانب اڑ کر نکل گیا تو اسے نحوست سمجھتے۔

بتوں کے نام سے قربانیاں دیتے اور بزعم خود یہ سمجھتے کہ یہ ہمیں تمام خطرات سے محفوظ رکھیں گے لیکن نہ تو انہیں مرنے کے بعد جزا و سزا پر یقین تھا نہ حشرو نشر پر بھروسہ' نہ اس جنت کا تصور جس کا وعدہ اربابِ تقویٰ سے کیا گیا اور نہ اس دوزخ کا کھٹکا جو ظالموں کے لئے بڑھکایا جا رہا ہے۔ ان امور میں ان کا رجحان ہی نہ تھا۔

قریش اور دوزخ کا تصور

یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ قریش یہود اور نصاریٰ کی زبان سے سنتے تو چلے آ رہے تھے کہ اعمالِ بد کی سزا جہنم ہے لیکن جس مؤثر اور حقیقت افروز انداز میں محمد ﷺ نے وحی الٰہی کی زبانی انہیں بتایا۔ اس میں یہود و نصاریٰ سے کہیں زیادہ اثر تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے کھلے لفظوں میں واضح کر دیا تھا کہ اگر زندگی شہوات نفسانی کی غلامی میں گزار دی گئی یا کمزوروں اور مجبوروں پر ظلم کرنے میں گزار دی یا یتیموں کا مال کھانے میں زندگی تمام کر دی' مسکینوں کی بربادیوں کو دیکھ آنکھیں پھیر کر چل دیئے تمام عمر سود خوری کا سلسلہ سینے سے لگائے رکھا تو ان میں سے کسی ایک جرم کے بدلے میں انہیں اس "ھاویہ" دوزخ میں پھینک دیا جائے گا جس کے تصور سے بھی روح اور جسم کانپ اٹھتے ہیں۔ پھر یہ جہنم اس قدر قریب ہے کہ زندگی کی منزل ختم ہونے کے بعد پہلا قدم اسی کے کنارے پہ جا کر رکتا ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔ وان منکم الا واردھا کان علیٰ ربک حتما مقضیا۔ (71:19)

ترجمہ۔ اور تم میں سے کوئی ایسا نہیں جس کا گذر دوزخ پر نہ ہو تمہارے ربّ کے ذمہ ضرور ٹھہری ہوئی بات ہے۔

جسے ظاہری آنکھیں تو نہیں دیکھ سکتیں لیکن بصیرت کی روشنی میں ہر وقت سامنے نظر آتا ہے۔

قریش اور جنّت کا تصور

اللہ تعالیٰ کے اس وعدہ کو بھی نبی اکرم ﷺ نے قریش کے سامنے پیش کیا۔ جو پرہیزگار لوگوں کے لئے بطور انعام ہے۔ ارشاد ہے۔

سارعوا الی مغفرۃ من ربکم وجنتٍ عرضہا السموات والارض اعدت للمتقین۔
(133:3)

اور جلدی سے اپنے پروردگار کی بخشش اور بہشت کی طرف دوڑو جس کی چوڑائی زمین و آسمان کے برابر ہے اور جو اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

جنت کی خوبیوں کی مزید وضاحت فرماتے ہوئے فرمایا۔

لا یسمعون فیہا لغو ورا تاثیما الا قیلا سلما" سلما" (26:56)

وہاں نہ بے ہو وہ بات سنیں گے نہ گالی گلوچ ہاں ان کا کلام ہو گا۔ السلام۔ السلام۔

جنت کا اور تعارف پیش فرمایا۔

ادخلو الجنۃ انتم وازواجکم تحبرون ویطاف علیہم بصحاف من ذھب واکواب وفیہا ما تشتہیہ الانفس وتلذ الاعین وانتم فیہا خالدون۔ (43) (70-71)

ان سے کہا جائے گا تم اور تمہاری بیویاں عزت و احترام کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ اس پر سونے کی طشتریوں اور پیالوں کا دور چلے گا۔ اور وہاں جو جی چاہے اور جو آنکھوں کو اچھا لگے موجود ہو گا اور اے اہلِ جنت تم اس میں ہمیشہ رہو گے!

نادان قریش کو اس جنت کے بارہ میں شبہ تھا اس شبہ کی بنیاد دنیا کے لالچ اور دلہن کی طرح سجی ہوئی بے وفا دنیا کی محبت تھی۔ جس کے مقابلہ میں وہ جنت' یومِ جزا و سزا یا یومِ حساب کا انتظار کرنا حماقت سمجھتے۔ بقول غالب۔

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

میں حیران ہوں

موت کے بعد کی زندگی اور خیرو شر کی جزا و سزا سے اہلِ عرب کے دل و دماغ کیوں ناآشنا رہے۔ مجھے حیرت ہے جب کہ روزِ ازل سے ہی نیکی اور بدی کی باہم جنگ کا نظارہ پہلے انسان سے لیکر آج تک کے ہر انسان نے دیکھا ہے۔ دیکھ رہا ہے اور دیکھتا رہے گا۔ مثلاً

(1) مصر اور عاقبت کا تصور

مصر کے رہنے والے آج سے ہزارہا سال پہلے سے دوسری دنیا پہ یقین رکھتے تھے۔ وہ میت کے ساتھ اس کے آخرت میں کام آنے کے لئے توشہ رکھ دیتے' کفن میں ایسی تحریریں ملفوف کر دیتے جن میں دعائیں اور گیت لکھے ہوتے!

(2) اہلِ ہند

ہندوؤں کے ہاں بھی قدیمی عقیدہ یہی ہے کہ نیک لوگوں کی آتما (روح) کو مکتی (نجات) حاصل ہو جاتی ہے۔ مگر بدوں کی آتما (روح) کو یکے بعد دیگرے تناسخ (یعنی ہربار کسی دوسری جنس میں پیدائش لینے کے بعد) لاکھوں سال اپنے اعمال کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔ اس بار بار پیدائش کے چکر میں اسے کتے بلے' گدھے (یا) عمال کے مطابق پیدا ہونا اور مرنا پڑتا ہے' یہاں تک کہ وہ بداعمالی کی سزا بھگتنے کے بعد پھر اس کی روح کسی انسان کے جسم میں داخل ہوتی ہے اور پوتر (یعنی پاک ہونے کے بعد) مکمل نجات پاتی ہے۔

(3)فارس کے مجوس اور آخرت

فارس کے آتش پرستوں کے ہاں نیکی اور بدی کے دو الگ الہ ہیں۔ اہرمن اور یزداں (اہرمن بدی کا الہ یزداں نیکی کا الہ) دونوں میں مسلسل جنگ رہتی ہے۔ تاکہ ایک دوسرے کو شکست دی جا سکے۔

(4)یہود اور نصاریٰ

یہودی اور نصاریٰ دونوں موت کے بعد کی دائمی زندگی پہ یقین رکھتے ہیں اور اس زندگی کے خوشگوار انجام کو حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم اور قہر و غضب دونوں کے درمیان امید و خوف کے عقیدے پہ عمل پیرا ہیں۔

پھر ہمیں یہ کیسے یقین آئے کہ جزیرہ عرب کے رہنے والے جو دنیا کے تمام مذاہب کے لوگوں سے تجارت کے سلسلہ میں میل ملاقات کا طویل المدت سلسلہ رکھتے ہوں اور آخرت کے عقیدے سے ناواقف ہوں۔

وہ عرب جو بے کنار صحراؤں کی وسعتوں میں زندگی گزار رہے ہوں' جس کی چلچلاتی دھوپ اور رات کے بہت گہرے اندھیروں میں نیک یا بد روح کی سرسراہٹ محسوس کرتے ہوں۔ کسی کو انہوں نے نیک روح اور کسی کو بدروح قرار دے کر اس سے واقعات کا تانا بانا بن رکھا ہو۔

اور پھر انہیں روحوں کا ان کے بتوں میں اتر جانا (حلول) یقینی سمجھتے ہوں اور پھر ان روحوں کی بناء پر انہیں اللہ تعالیٰ کی قربت کا ذریعہ بھی مانتے ہوں۔ بلاشبہ ایسا عقیدہ یا ذہن رکھنے والوں پر اعمال کے جزا و سزا کا تخیل یقیناً اثرانداز ہو گا لیکن بات پھر وہی قریش سوداگر تھے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کے قائل تھے۔ یعنی نفع حاصل کرنے میں وہ ایک لمحہ بھی دیر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اور شراب کے رسیا ہونے کی بناء پر قیامت اور روز جزا کے محاسبہ سے خود کو دور سمجھنے پہ بضد تھے۔

یہی وجہ ہے کہ جب انہیں خوشی یا غم دونوں میں سے کسی ایک کے ساتھ واسطہ پڑتا تو اسے بھی اپنے کسی سابقہ عمل کی ہی جزا و سزا سے تعبیر کر کے (قصہ زمین بر سر زمین) کے مطابق دنیا میں ہی ختم کر دیتے! اور یومِ حساب کی فکر میں خود کو مبتلا رکھنے میں اپنے معمولات تجارت، مشاغل ناؤ نوش پر بوجھ سمجھتے۔

ابتدائے وحی اور تذکرہ جنت و جہنم

قریش کے اسی فکرو عمل کی وجہ سے قرآن حکیم کی مکی زندگی میں نازل ہونے والی آیات میں جنت اور جہنم کے تذکرہ کو زیادہ سے زیادہ بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ اہلِ مکہ کو بتوں کی پرستش اور عیش کوشی اور ستم رانی سے باز رکھا جا سکے! ان کا تزکیہ نفس ہو سکے جس کے لئے محمد ﷺ اس دنیا میں مبعوث ہوئے۔

وہ جہنم جس سے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم اپنی قوم اور تمام عالم میں موجود تاقیامت نسلِ آدم کو نجات دلانے کی کوشش میں سرگرم رہے۔ اور اس عظیم تر کوشش میں انہوں نے طرح طرح کی مصیبتیں بھی برداشت کیں خود کو ہر لمحہ ہر قربانی کیلئے بھی پیش کیا۔ دشمن جسمانی دکھ دینے پر آئے تو بھی دکھ جھیلے، روحانی اذیتیں دینے پہ آئے تو بھی صبرو رضا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا یہاں تک کہ دشمنوں نے جلاوطنی پر مجبور کیا تو بھی ہجرت پہ کمر باندھ لی اور اہلِ وطن سے کہا۔

خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

گھر سے دامن جھاڑ کر نکل پڑے، ان کے بیوی بچوں کو ان کے سامنے تختہ ستم بنایا گیا۔ تو وہ سامنے کھڑے بڑی ہمت سے دیکھتے رہے۔ ان کی جبینوں پر شکن نہ آنے پائی۔ جیسا کہ مختصراً" اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں تک کہ آنحضرت ﷺ اور آپ کے جانثار وفا شعار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر کفار جتنا زیادہ جبرو تشدد کرتے رسول اللہ ﷺ کے دل میں ان کی اصلاح و نجات اخروی کی حرص اتنی ہی بڑھتی گئی۔

ان کی بھلائی اور کامرانی کے لئے ان کے ذہنوں میں موت کے بعد کی زندگی اور اس کے بعد کے اعمال کے محاسبہ کا ڈر پیدا کرنا سب سے زیادہ اہم پہلو تھا۔ جس کے اثر سے وہ خود کو بت پرستی اور شرک کے فتنہ سے اور گناہوں کے بھنور سے نکال سکتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کے نزول کی ابتداء میں قیامت سے ڈرانے والی آیات پے بہ پے نازل ہوتی رہیں تاکہ وہ لوگ (قریش) چشمِ بصیرت سے کام لیں لیکن افسوس اہل مکہ روز حشر

اور یومِ حساب سے انکار کی ضد پہ ایسے اڑ گئے جس کا نتیجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کی مسلسل خوفناک جنگوں کی صورت رونما ہوا۔ اور اس تصادم کا اختتام دینِ حق کی دنیا پر فتح و نصرت پر!

هوالذی ارسل رسوله　　وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور
بالهدی ودین الحق　　سچے دین کے ساتھ بھیجا۔
لیظهره علی الدین کله　　تاکہ اسے تمام ادیانِ عالم پر غالب و فتح کرے
ولو کره المشرکون　　چاہے مشرک برا ہی مانیں!

زخم خوردہ قرارداد سے معراج تک

کرم خوردہ قرارداد سے معراج تک

حرمت کے چار مہینے اور دعوتِ اسلام

بنو ہاشم، رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے قریش نے تین سال تک مکمل قطع تعلق رکھا۔ لین، دین، حیات و موت، تجارت، عبادت یہاں کہ تک علیک سلیک تک حرام قرار دی گئی۔ البتہ حرمت کے چار مہینے (رجب، ذیقعدہ، ذوالحجہ اور محرم) جن میں دشمنی دل کی گہرائیوں میں ڈوب جاتی ہے، ڈاکہ، قتل اور ایذا رسانی سے ہاتھ روک لیا جاتا۔ اور لوگ بے خوف دور دراز سے مکہ میں حج و زیارت کے لئے آتے۔ انہیں چار مہینوں میں رسول اللہ ﷺ دعوت دین کے لئے گھاٹیوں کے قید خانہ سے باہر تشریف لاتے۔ کعبہ کے زائرین کو دعوتِ اسلام دیتے۔ انہیں برے اعمال کی سزا میں جہنم سے ڈراتے اور اچھے اعمال کی جزا میں جنت کی خوشخبری سناتے۔

زائرین مسلمانوں اور رسول اللہ ﷺ پر قریش کے ظلم و ستم کے واقعات وہاں کے رہنے والوں کی زبان سے سن کر بہت متاثر ہوتے اس سے لوگوں کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کے لئے اور محبت بڑھ جاتی اور ان میں سے اکثر اسلام قبول کر لیتے۔ حتیٰ کہ اس قطع تعلق اور گھاٹیوں میں نظربندی کے درمیان آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے صبرو رضا سے اہلِ مکہ میں سے بھی کافی لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے خصوصاً وہ لوگ جو ابو جہل اور ابولہب کی طرح سنگدل نہ تھے۔

شعب ابی طالب میں نظربند

شعب ابی طالب میں نظربند مسلمان اہلِ مکہ کے لئے بیگانہ نہ تھے۔ ان میں سے ہر ایک مسلمان قریش خاندان کے کسی نہ کسی فرد کا رشتہ دار تھا۔ اس کے باوجود اتنا شدید قسم کا قطع تعلق اور تین سال کی لمبی مدت، بعض لوگوں کے دل میں ابتدا ہی سے اس جبر کا احساس تھا۔ اور

ان لوگوں کی موجودگی نے بہت سے غریب و نادار کو بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرنے سے بچالیا بلکہ پتھروں میں پھول اگانے والے اللہ تعالیٰ نے ان پتھر دل مکہ والوں میں سے چند ایک کے دل میں ان لوگوں کے لئے لطف و مہربانی کا احساس پیدا کر دیا۔ انہیں رحم دل لوگوں میں سے ہشام بن عمرو سرفہرست تھے۔ وہ رات کے وقت پکا ہوا کھانا اور کبھی اناج کی بھری ہوئی سربند بوریاں اونٹ پر لاد کر لاتے اور درے کے قریب جا کر اونٹ کی نکیل کھول دیتے اور اسے اس زور سے چھڑی مارتے کہ وہ بھاگ کر درے کے اندر چلا جاتا۔ اور محبوس مسلمان اونٹ کو پکڑ کر اس سے سامان اتار کر اونٹ کو واپس بھگا دیتے۔ اس طرح مسلمانوں کو کھانے کا سامان مل جاتا۔ بعض روایات میں راتوں کو چھپا چھپا کر کھانا پہنچانے والے حکیم میں حزام تھے۔

ہشام بن عمرو نے آخر کار مسلمانوں کی اس تکلیف دہ صورتحال کو دیکھ کر فیصلہ کیا کہ کسی صورت مسلمانوں کو اس جابرانہ قید سے آزاد کرایا جائے۔ اس مصمم فیصلہ کے بعد وہ زہیر بن ابی امیہ جو عبدالمطلب کی صاحبزادی عاتکہ کے فرزند تھے ان کے پاس پہنچے۔ ہشام نے ان سے کہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی زہیر یہ کیا انصاف ہے۔ کہ آپ تو پیٹ بھر کر کھائیں اچھے سے اچھا لباس نہیں، گھر میں پورے عیش و آرام سے رہیں۔ لیکن آپ کے بھائی قریش کی قید میں نہ خریدو فروخت کر سکیں، گھریلو زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم ہوں! واللہ اگر اس قسم ظالمانہ قطع تعلق ابو جہل کے بھائیوں سے کیا جاتا تو وہ آپ کی طرح کبھی خاموش نہ بیٹھتا۔

دونوں نے ایک دوسرے سے متفق ہو جانے کے بعد قرارداد کے اوراق ضائع کر دینے کا منصوبہ بنایا۔ طے پایا کہ کچھ اور لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا جائے۔ تاکہ وقت پڑنے پر وہ ہمارے کام آ سکیں۔ چنانچہ مطعم بن عدی، ابوالبختری بن ہشام اور زمعہ بن اسود تینوں ان سے متفق ہو گئے، ان پانچوں آدمیوں نے فیصلہ کیا کہ جس طرح بھی ہو سکے منحوس قرارداد کی دھجیاں اڑا دی جائیں۔

زہیر کی پیش قدمی

دوسرے دن زہیر بن امیہ کعبہ میں آئے اور پورے سات طواف کر لینے کے بعد باآواز بلند حاضرین سے مخاطب ہوئے۔

اے اہل مکہ--- کتنی شرم کی بات ہے کہ ہم سب تو عیش و آرام کی زندگی گزاریں اور بنو ہاشم کھانے کے لئے ایک ایک دانہ کو ترسیں، پہننے کے لئے کپڑوں کے محتاج ہوں، کفن تک نصیب نہ ہو، ہمارا ان کے ساتھ لین دین، خرید و فروخت کا تعلق ہی ختم ہو۔

سن لو! میں جب تک اس ظالمانہ قرارداد (قطع تعلق) کو پھاڑ کر نہ پھینک لوں چین سے

نہیں بیٹھوں گا۔ ابو جہل نے سنا تو آگ بگولہ ہو گیا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر چلاتے ہوئے کہا۔

زہیر۔۔۔۔۔۔ آپ قرارداد کو پارہ پارہ نہیں کر سکتے' آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔

یہ سن کر مطعم بن عدی نے ابو جہل کو ڈانٹتے ہوئے کہا زہیر سچ بول رہے ہیں۔ ابو جہل کان کھول کر سن لو یہ قرارداد پھٹے گی اور ضرور پھٹے گی! ایک طرف سے ابوالبختری نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ اس قراردادِ ظلم کی دھجیاں اڑا دی جائیں۔ اسی طرح ہشام بن عمرو نے ان سب کی تائید کرتے ہوئے ابو جہل سے کہا: اب یہ ظالمانہ تحریر ختم ہو کر رہے گی۔ دوسری طرف سے زمعہ بن اسود کی آواز آئی اب اس قرارداد کو ختم کرنے سے دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔

سب کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ابو جہل سمجھ گیا اور اس خوف سے کہ کہیں ضد بازی میں یہ کام ابھی نہ ہو جائے وہ خاموش ہو گیا۔ لیکن مطعم بن عدی ایک لمحہ رکے بغیر قرارداد کو پھاڑنے کے لئے آگے بڑھے تو دیکھا کہ قرارداد کا وہ حصہ سلامت ہے جس پر "باسمک اللھم" لکھا تھا۔ باقی تمام کاغذات کو دیمک چاٹ گئی ہے۔

جبر کی دیواریں زمیں بوس ہو گئیں

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اپنے صحابہ کرام اور قبیلہ بنو ہاشم کے ہمراہ شعب ابی طالب سے نکل آئے جبر کی دیواریں زمین بوس ہو گئیں۔ قطع تعلق ختم تو ہوا لیکن قریش کے رویہ میں بظاہر کوئی فرق نہ آیا دلوں میں کینہ تھا۔ ہر وقت مسلمانوں کو نیچا دکھانے کی کوشش میں رہتے اور مسلمان اپنی مدافعت کے لئے ہر وقت فکر مند رہتے۔

قرارداد پھاڑنے سے پہلے

سیرۃ اور اصحابِ مفسرین نے اس دورانیہ میں دو واقعات نقل کئے ہیں۔ (1) یہی ارکانِ خمسہ (پانچوں افراد جنہوں نے قرارداد کو پھاڑنے کا فیصلہ کیا تھا) خود بھی بتوں کے پرستار تھے' اس لئے اپنے فیصلہ کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے وہ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے قرارداد کو پھاڑ دینے کا فیصلہ سناتے ہوئے درخواست کی کہ ہمارے بتوں کا کچھ نہ کچھ حق تسلیم کر لیجئے اور کچھ نہیں تو آپ انگلیوں کے اشارہ سے ہی ان کا طواف فرما لیا کیجئے۔ یہ سن کر نبی اکرم ﷺ کے دل میں خیال آیا کہ اتنی سی بات مان لینے میں کیا مضائقہ ہے جبکہ میری نیت نیک ہے اور اللہ جانتا ہے۔

(2) دوسری روایت میں ہے کہ پانچوں اشخاص ہشام بن عمرو' ابوالبختری' زہیر بن امیہ' مطعم بن عدی' زمعہ بن اسود چند قریش کو اپنے ساتھ لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں اس دن کی رات کو حاضر ہوئے۔ اپنے فیصلہ کا ذکر کرنے کے بعد صبح کی پو پھٹنے تک نبی اکرم

ﷺ کو یہ کہتے ہوئے کہ آپ ہمارے آقا ہیں۔ ہمارے پیشوا ہیں، مگر ہماری بھی یہ بات مان لیجئے (جس کا ذکر پہلی روایت میں کیا گیا ہے) چنانچہ ان کے اصرار کرنے پر رسول اللہ ﷺ ان کی شرائط قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

پہلی روایت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اور دوسری قتادہ رضی اللہ عنہ سے ہے۔ (دونوں حضرات صحابی ہیں) اور دونوں اپنی اپنی روایت کے بعد آخر میں اس جملہ پر متفق ہیں۔

"ان اللہ عصم محمد ﷺ بعد ذالک"

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ محمد ﷺ کو بتوں کی طرف میلان یا شرائط ماننے سے بچالیا"

سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اور قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے اسی ترکِ میلان یعنی شرائط کو ماننے کی طرف مائل نہ ہونے کے بعد ہی یہ آیات نازل ہوئیں۔

وان کادو لیفتنوک عن الذی اوحینا الیک لتفتری علینا غیرہ واذا لقد الاتخذوک خلیلا" ولولا ان ثبتانک لقد کدت ترکن الیھم شیئا" قلیلا! اذا لاذقناک ضعف الحیوۃ وضعف الممات ثم لاتجدلک علینا نصیرا۔

(73-70:17)

اس سے پہلے انہیں آیات کا شانِ نزول آپ واقعہ (غرانیق) میں پڑھ چکے ہیں۔ لیکن یہاں وان کادو الیفتنونک تا۔ لاتجدلک علینا نصیرا"

کا شانِ نزول سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اور قتادہ رضی اللہ عنہ ایسے محدثین نے اسے "قرارداد" کو ختم کرنے سے متعلق مربوط کیا ہے۔

آیہ سورہ اسراء

وان کادو لیفتنونک تا آخر کا شانِ نزول، عطا تابعی، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اسی آیت کے شان نزول کے بارہ میں فرماتے ہیں۔

طائف و ثقیف کا جو وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اس نے منجملہ کئی امور کے یہ مطالبہ بھی پیش کیا تھا کہ مکہ معظمہ کی طرح وادی طائف کو بھی حرم قرار دیا جائے۔ وہاں کے درخت، پرندے اور چوپایوں کی حرمت بھی وادیٔ مکہ کے حرم کی طرح تسلیم کی جائے۔ ان کے ان مطالبات کو سننے کے بعد آنحضرت ﷺ نے تھوڑی دیر سوچا تو اس وقت یہ آیت ـــــ وان کادو لیفتنونک اور ثبتناک نازل ہوئی۔

بہرحال مذکورہ یعنی وان کادو الیفتنونک کا شان نزول کچھ سہی، بحث رسول اللہ کے اس کردار کی ہے جس میں آپکے خلوصِ دل کے ساتھ روحانی عظمت بھی جلوہ گر ہے۔

جیسا کہ ابنِ ام مکتوم کے حوالے سے سورہ عبس وتولی ـــــ کے نزول سے ثابت ہے۔ اور جس طرح کہ جناب محمد ﷺ کے ایک ایک حرف سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ آپ

ﷺ نے پوری وضاحت کے ساتھ دوسرے انسانوں کی مانند اپنا "بشر" ہونا واضح فرما دیا ہے۔

اور اس حقیقت کا اعلان بھی فرما دیا ہے کہ میری اعلیٰ ترین بشریت کا ثبوت مجھ پر وحی کا نازل ہونا ہے۔ قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی (4:53)

اور یہ بھی واضح فرما دیا کہ بشر ہونے کی وجہ سے دوسروں کی مانند ان سے بھی غلطی کا امکان ہو سکتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے مواقع پر آپکی معاونت نہ فرمائیں جیسا کہ حضرت ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کے معاملہ میں بار بار التجا پر آپ کی جبین مبارک پر غصہ کے آثار نظر آنے لگے۔

سورہ بنی اسرائیل کی آیت

کے حوالے سے اگر تجزیہ کیا جائے تو آنحضرت ﷺ بھول کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن وحیِ الہٰی نے آپ ﷺ بروقت بچا لیا جس طرح کہ نابینا ابنِ ام مکتوم کے معاملہ میں آپ سے بے اعتنائی ہو چکی تھی۔ خاکم بدھن اس موقع پر اگر لغزش ہو جاتی تو قریش نے آپ کو اپنی طرف مائل کر ہی لیا تھا۔

انبیاء کا بلند ترین اخلاق

رسول اللہ ﷺ کی یہ اخلاقی جرات کتنی عظیم اور بے مثال ہے کہ آیت ان کادو لیفتنونک (76:7) سورہ بنی اسرائیل) اور آیات سورہ عبس (نمبر80) کو لوگوں کے ساتھ اس دیانت و امانت کے سامنے پیش کیا جس طرح قرآن حکیم کی دوسری آیتوں کو دنیا کے بڑے کہلانے والے نابغہ روزگار کہلانے والوں کی طرح اپنے ہی خلاف اللہ جل شانہ کی طرف سے آنے والی وحی کو بیان فرمانے میں اپنی شانِ رسالت یا منصبِ عظیم کے منافی نہیں سمجھا۔ دوسرے لفظوں میں آنحضرت ﷺ کا یہ عمل خود آنحضرت ﷺ کی صداقت و امانت کی ٹھوس دلیل ہے۔

مسلمہ دستور کے مطابق دنیا کا کوئی بڑا کہلانے والا آدمی یا دنیا والوں کی نگاہ میں بلند مرتبہ سمجھا جانے والا انسان اپنی کسی کمزوری یا اپنے خلاف کی جانے والی کسی بات کو دوسروں سے سننا تو ایک طرف اپنی زبان پر لانا بھی پسند نہیں کرتا۔ مشاہدہ یہی کہتا ہے کہ ایسے لوگ دنیا بھر کی تکلیفیں برداشت کر لیتے ہیں مگر نہ تو اپنی کمزوری کسی پر ظاہر ہونے دیتے ہیں اور نہ ہی عام لوگوں کو اپنے قریب آنے دیتے ہیں بلکہ انتہائی خوبی اور چالاکی کے ساتھ اپنی خامیاں چھپاتے رہتے ہیں اور اگر ایسے لوگ بہت ہی دور اندیش ہوں تو خود کو غلطی میں پڑنے ہی نہیں دیتے۔ اس کے برعکس وہ عظیم ہستی جو اپنے مرتبہ میں لاثانی ہو اللہ تعالیٰ کے بعد بزرگ تر ہو اپنی غلطی

پوری جرأت کے ساتھ کہہ دے جبکہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اس کی مقدس زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سورج کی کرنوں کی طرح انتہائی تیزی کے ساتھ پوری دنیا کی فضاؤں میں گونج اٹھیں گے۔اس خلوص اور بے ریائی کو دیکھ کر کون صاحب عقل ایسی ہستی کے مقامِ نبوت و رسالت کی بلندی و عظمت سے انکار کرسکتا ہے۔

مختصر یہ کہ صحیفہ مقاطعہ کے پارہ پارہ ہو جانے کے بعد نبی کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے رفقاء اور خاندان کے ساتھ۔

ساتھ واپس مکہ میں اپنے اپنے محلوں' گلیوں اور مکانوں میں آبسے' اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے منصب عظیم کے مطابق تبلیغ دین کا تسلسل قائم رکھتے ہوئے ان قبائل میں اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں جو حرمت کے مہینوں میں کعبہ کی زیارت کے لئے مکہ آتے۔ اب نبی اکرم ﷺ کی رسالت و نبوت کا تمام عرب میں بڑی دھوم کے ساتھ چرچا ہو چکا تھا' لیکن بیرون مکہ ابھی جاں نثاران رسالت مسلمانوں کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین پر قریش نے پھر ظلم و تشدد شروع کر دیا اور پہلے کی طرح آج اللہ تعالیٰ کے سوا ان کا کوئی مددگار و ناصر نہیں تھا۔

وفات ابو طالب

شعب ابی طالب سے نکلے ہوئے ابھی ایک سال ہی ہوا تھا کہ اس میں ایک کے بعد دوسرا حادثہ رونما ہوا۔ سب سے پہلا حادثہ تو یہ تھا کہ جناب ابو طالب نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اس وقت ان کی عمر 80 سال سے کچھ زائد تھی۔ لیکن اس سانحہ موت سے پہلے جب قریش نے جناب ابی طالب کی صحت بہت بگڑتی ہوئی دیکھی تو ان کے دل میں آنحضرت ﷺ اور ان کے وفا شعار مسلمانوں خصوصاً" حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شجاعت سے ٹکراؤ کے مزید خطرہ کا احساس پیدا ہو گیا اور اس احساس کے ساتھ قریش کا ایک وفد جناب ابی طالب کی خدمت میں حاضر ہوا' اور عرض کیا!

جناب ابی طالب ہم آپ کا جتنا احترام کرتے ہیں وہ آپ کو معلوم ہے' اور اس وقت آپ کی طبیعت کا جو عالم ہے اس سے انجام کا صاف پتہ چلتا ہے اس سے پہلے کہ آپ ہم میں نہ ہوں بہتر یہ ہے کہ آپ اپنے برادر زادے کے اور ہمارے درمیان جو سنگین اختلاف چلا آ رہا ہے وہ بھی آپ سے چھپا ہوا نہیں۔ انہیں بلا کر ہمارے اور اس کے درمیان کوئی معاہدہ کروا دیجئے تاکہ ہم اور وہ دونوں ایک دوسرے سے مطمئن ہو جائیں۔

اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ ہمارے مذہب سے لوگوں کو برگشتہ کرنے سے باز آ جائے اور ہم ان کے ساتھیوں سمیت ان کے دین سے ان کو ہٹانے کی کوشش چھوڑ دیں۔

یعنی جو جس جگہ ہے وہیں رہے! اس اثناء میں رسول اللہ ﷺ خود تشریف لے آئے۔ قریش کے وفد نے خود ہی ان کے سامنے اپنے معاہدہ کی شرائط پیش کیں تو آنحضرت ﷺ نے سب سن کر فرمایا۔

نعم کلمۃ واحدہ تعطونھا تملکون بھا العرب وتدین لکم بھا العجم

(آپ نے جو کہا میں نے سنا) اب آپ لوگ اگر میری ایک بات مان لو تو تمام عرب تمہارے زیر نگیں اور عجم کا چپہ چپہ تمہارا باج گزار ہو جائے۔

ابوجہل نے جواباً" کہا۔ ایسی بالادستی حاصل کرنے کے لئے دس کلمے بھی کہنا پڑھیں تو ہمیں منظور ہیں۔ تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو پھر تقولون لا الہ الا اللہ وتحلعون ماتعبدون من دونہ

"لا الہ الا اللہ کہو اور بتوں کی عبادت کا جوا گردنوں سے اتار کر پھینک دیجئے۔

جواب میں ایک شخص نے کہا۔

آپ تو ہمارے اتنے بہت سے معبودوں کے بدلے میں ایک معبود کی عبادت کرنے کے لئے کہتے ہیں۔ "یہ نہیں ہوگا" اس کے بعد دوسرے شریک وفد نے کہا۔ یہ شخص ہماری کوئی شرط قبول نہیں کرے گا۔ ہم خود نبٹ لیں گے' چلو۔ اپنا یہ فیصلہ سنا کر قریش کا وفد وہاں سے چلا گیا۔

اس واقعہ کے چند دن بعد ہی جناب ابی طالب کی وفات ہوگئی اور قریش نے اور زیادہ جبرو تشدد شروع کر دیا۔

ام المومنین سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

کچھ ہی عرصہ بعد ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا بھی اس دار فانی سے دارالبقاء کو تشریف لے گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون یہی وہ دوسرا حادثہ ہے جو پہلے حادثہ سے زیادہ دردناک تھا۔

نیک دل وفا شعار رفیقۂ حیات جو اپنے حسنِ سلوک اور مہروفا میں اپنی مثال آپ تھیں' پاک طینت اور جوہر ایمان کا خزینہ' اوصاف حمیدہ سے آراستہ' آنحضرت ﷺ کا سامان تسکین تھیں۔ جن کی حسنِ رائے سے' حوصلہ افزا کلمات سے' آپ ﷺ کے قلب سے خوف و ہراس کے آثار مٹ جاتے جیسے کسی فرشتۂ رحمت نے آپ کے دل پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ جب رسول ﷺ ان کے چہرہ اقدس پر ایمان و وفا کی تابندگی دیکھتے تو آپ ﷺ کے حوصلے اور بڑھ جاتے' آج اس رفیقۂ حیات نے آخری رختِ سفر باندھ لیا۔ جب کہ ان سے پہلے ابو طالب اس دنیا سے رخصت ہو گئے جو ہمیشہ آپؐ کے دشمنوں کے

سامنے سینہ سپر ہوتے۔

ان دونوں حادثوں کا اثر رسول ﷺ کی روح پر کیا ہوا؟ تردید کے بغیر کہا جا سکتا ہے کہ ایسے حادثات سے بڑے بڑے جاہ و منصب کے لوگوں کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو جاتی ہے (لیکن حضور اکرم ﷺ دنیا کے تمام مناصب سے بھی اور جرأت و استقلال میں بھی اتنے بلند تھے کہ آپ کی نگاہ مبارک پر تاریکی حرام تھی۔) (مترجم)

اب قریش پھر بے لگام ہو گئے

اب قریش نے تذلیل و ایذا پہنچانے میں انتہا کر دی کم از کم اذیت کی صورت یہ تھی کہ ایک نادان نوجوان نے سرور دو عالم کے سر مبارک پر مٹی ڈال دی مگر نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ و السلام کا جواب یہ تھا۔ انتہائی صبر و سکون کے ساتھ گھر تشریف لائے صاحبزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے دیکھا تو آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ آپ کے مبارک سر کو دھونا شروع کیا۔

اب آپ ہی سوچئے ہم تو اپنے بیٹے کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر برداشت نہیں کر سکتے تو آپ ﷺ کے دل پر بیٹی کا رونا کس قدر کرب و اضطراب کا سبب ہوگا اور پھر رسول اللہ ﷺ تو بیٹوں سے زیادہ بیٹیوں سے زیادہ محبت و شفقت فرماتے' سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کی والدہ محترمہ ابھی ابھی آپ کو روتا ہوا چھوڑ کر آسودہ لحد ہو گئیں۔ آنحضرت ﷺ نے جب انہیں یوں سسکیاں لے کر روتے ہوئے دیکھا' تو اس تاثر سے آپ کی توجہ اللہ ذوالجلال والا کرام کی طرف اور زیادہ ہو گئی۔ کامیابی کا یقین اور درخشاں ہو گیا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور لختِ جگر کو سینے سے لگا کر فرمایا۔

لاتبکی یا بنیہ فان اللہ مانع ابیک

میری بیٹی! رومت اللہ تعالیٰ تمہارے باپ کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔

بار بار یہی کلمہ دہرانے کے بعد آخر میں فرمایا۔ میرے ساتھ یہ حادثہ عم محترم کی رحلت کے بعد ہوا۔ ورنہ ان کی زندگی میں مجھ سے ایسے بدترین سلوک کی کسی کو جرات نہ تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ قریش کی ایذا رسانی اور بڑھ گئی۔

طائف کا سفر

کسی دوست یا بیگانہ سے مشورہ کئے بغیر بالکل تنہا طائف میں تبلیغ کے لئے تشریف لائے' اور شہر کے سب سے زیادہ باعزت اور بارسوخ قبیلہ میں جا کر اسلام کی دعوت پیش کی' لیکن ان لوگوں کی قسمت میں بدنصیبی لکھی جا چکی تھی۔ انہوں نے سننے سے انکار

کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے درخواست کی، کہ میرا یہاں آنا صیغۂ راز میں رکھا جائے (ایسا نہ ہو کہ قریشِ مکہ میری ناکامی کی خبر سن کر اور دلیر ہو جائیں طائف کے سرغنہ لوگوں کی جھولیاں دین اسلام کی رحمت سے بھر دینے کی خواہش تھی) لیکن ان بدنصیبوں نے اپنی قسمت کی جھولیوں میں انگارے بھر لئے۔ آنحضرت ﷺ نڈھال ہو کر ایک باغ میں انگور کی بیل کے سائے میں آ بیٹھے! تھوڑی دیر سکون کے بعد رسول ﷺ نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی اور کپکپاتے ہونٹوں سے انتہائی رقت اور پرسوز انداز میں اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر فرمایا:۔

اللھم الیک اشکوا ضعف قوتی وقلة حیلتی و ھوانی علی الناس یا ارحم الرحمین انت رب المستضعفین وانت ربی الی من نکلنی الھی بعید یتجھمتی اوالی عدو ملکة امری ان لم بک علی غضب فلا ابالی ولکن عافیتک وسع لی

اے اللہ میں اپنی بے بسی اپنی توہین اور تدبیر کی ناکامی کا شکوہ صرف آپ کے حضور میں ہی کرتا ہوں۔ اے ارحم الراحمین تو کمزوروں کا رب ہے اور میرا بھی۔ اے پروردگار! تو مجھے چھوڑ کر کسے سونپ رہا ہے جو مجھے اور بھی کمزور بنا دے؟ یا مجھے میرے دشمن ہی کے حوالے فرما دیا؟

اے اللہ اگر تو میری اس حالت میں بھی خفا نہیں تو میں مطمئن ہوں، لیکن تیری عنایات تو بے پایاں ہیں۔

اعوذ بنور وجھک الذی اشرقت له الظلمات وصلح علیه امر الدنیا والاخرة من ان ینزل بی غضبک اوتحل علی سخطک لک العبتی ترضی لا حول ولا قوة الا باللہ!

ترجمہ: اللہ میں ترے اس نور کی روشنی میں رہنا چاہتا ہوں جس نے ظلمات کو منور بنا رکھا تھا اور جس کے پرتو سے دنیا اور دین دونوں اپنا اپنا فریضہ ادا کرنے کی صلاحیت لئے ہوئے ہیں۔ الٰہی مجھے اپنے غضب اور خفگی سے محفوظ رکھ۔

دو صاحبِ دل

نبی رحمت ﷺ سے طائف کے لوگوں کا وحشیانہ سلوک قریش مکہ کے دو رئیس زادوں عتبہ اور شیبہ (ربیعہ کے بیٹے) نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انکارِ اسلام کے باوجود ان کا دل پسیج گیا۔ اپنے غلام عداس نصرانی کے ہاتھ انگوروں کا خوشہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ آنحضرت ﷺ نے اسے قبول فرمایا اور "بسم اللہ الرحمن

الرحیم" پڑھ کر کھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ غلام نے بسم اللہ سنتے ہی تعجب کے ساتھ دریافت فرمایا۔

اے صاحب یہ کیا کلمہ ہے؟ اس بستی کے رہنے والوں کی زبان پر تو کبھی یہ حرف نہیں آیا۔ رسول اللہ نے عداس سے اس کا وطن اور دین دریافت فرمایا تو اس نے جواباً" عرض کیا میرا وطن نینویٰ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا جہاں اللہ کے نیک بندے یونس بن متیٰ پیدا ہوئے تھے؟

عداس ۔ آپ نے انہیں کیسے پہچانا؟

فرمایا ۔ ذلک اخر کان نبیا" وانا نبی" یونس میرے بھائی ہیں اور میں بھی نبی ہوں۔

عداس آپ ﷺ کے اس تعارف کے بعد انتہائی خوش ہوا' اور ختم المرسلین ﷺ کے سر مبارک کو چوما ہاتھ چومے اور قدموں کے بوسے لئے۔

ربیعہ کے بیٹے عتبہ اور شیبہ اپنے غلام عداس کی ایک ایک حرکت کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ مگر یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اپنے باپ دادا کے مذہب کو نہ چھوڑا۔ عداس جب ان کے پاس واپس آیا تو الٹا اسے سمجھایا۔ عداس تمہارا دین تو اس سے بہتر ہے۔ دیکھنا کہیں یہ تمہارے دین سے تم کو بہکا نہ دے۔ یہاں یہ کہنا بھی غلط نہ ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ کی اس زبوں حالی کو دیکھ کر خود اہل طائف میں سے اکثر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے مگر ابھی توحید کی رحمت ان کے نصیبوں میں نہ تھی وہ بت پرستی کے پرانے مذہب پر ہی اڑے رہے۔

مکہ والوں کو جب طائف والوں کی بد سلوکی کا علم ہوا اور نبی الخاتم علیہ الصلوٰۃ والسلام واپس آئے تو انہوں نے طعن و تشنیع اور جبر و ستم کی رفتار اور تیز کر دی۔

لیکن حق کے پاؤں مضبوط ہوتے ہیں جھوٹ اکھڑ جاتا ہے حق اور سچ کا علم' حق اور سچ کا مینار لازوال! آنحضرت ﷺ نے اس سے کہیں زیادہ زور شور سے تبلیغ دین کا سلسلہ جاری رکھا۔ آنحضرت ﷺ کا معمول یہ تھا کہ حج کے زمانہ میں عرب کے بادیہ نشیں جب مکہ میں آتے تو آپ ان سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے فرماتے "میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں اور اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک معبود ہیں۔ تم لوگ اللہ کی وحدانیت اور میری رسالت کی تصدیق کرو"

لیکن جہاں آپ ﷺ جاتے آپ کے پیچھے پیچھے آپ کا حقیقی چچا ابو لہب سایہ کی طرح لگا رہتا' اور جن لوگوں کو ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام دین اسلام کی دعوت دیتے ان کو فوراً" ابو لہب چلا چلا کر کہتا۔ اس کی بات مت سنو۔ مت سنو! ابو لہب کی یہ کوشش بھی

رائیگاں جاتی رہی اور شمع رسالت کی روشنی اور بڑھتی گئی۔ رسول کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک ایک قبیلہ کے پاس جاتے کبھی قبیلہ کندہ کے خیموں میں تو کبھی نبی کلب کے خیموں میں، کبھی بنو حنیفہ، بنو عامر، ابن صعصعہ، غرض کوئی ایسا نہ تھا جس کے ضمیر کے دروازہ پر آپ ﷺ نے دستک نہ دی ہو۔

مگر بعض نے تو صاف انکار کر دیا۔ بنو حنیفہ انتہائی بدتمیزی سے پیش آئے اور بنو عامر نے اس شرط پر اسلام قبول کر کے مدد کرنے کی پیشکش کی کہ آپؐ کے بعد خلافت کے حق دار ہم لوگ ہوں گے۔

مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! یہ معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے اہل سمجھے' یہ جواب سن کر بنو عامر برگشتہ ہو گیا۔

اب یہاں پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ مکہ کے قریش' عرب کے بادیہ نشیں اور ان کے نواحی بستیوں کے لوگ اسلام دشمنی میں کیوں جمے رہے؟

معزز قارئین! اس سوال کا ایک واضح جواب تو بنو عامر کے مطالبہ میں موجود ہے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی سلطنت و حکومت کی مانگ کی۔ طائف کو سرسبز و شاداب وادیوں اور باغات کی وجہ سے مکہ مکرمہ کے برابر مرتبہ دیا جائے! جس طرح مکہ بتوں کی وجہ سے باوقار شہر سمجھا جاتا ہے' اسی طرح لات کی برکت کو تسلیم کرتے ہوئے طائف کی عظمت کو برقرار رکھا جائے۔ ان کے دل میں یہ خوف تھا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی فرماں برداری سے لات کی معبودیت ختم ہو جائے گی اور قریش کو اپنے شہر کی مذہبی مرکزیت کی وجہ سے مزید فوقیت حاصل رہے گی۔ مکہ والے اپنی تجارتی منڈی کی وجہ سے پہلے ہی ہم پر بالادستی حاصل کیے ہوتے ہیں۔

غرض یہ کہ ان لوگوں کے دلوں میں اپنے باپ دادا کی رسموں اور دیوتاؤں کی برتری کا جنون تھا' اس کے علاوہ عرب کا ہر قبیلہ اپنی اقتصادی ضرورت' مقامی اور نسلی برتری کے بخار میں مبتلا خود کو اسلام قبول کرنے سے بچاتا رہا۔

ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

قریش کی مسلسل اذیتوں نے رسول اللہ ﷺ کے احساسِ غم کو اور ہوا دی۔ اس پر تنہائی نے مزید اضافہ کیا۔ جب تک ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا زندہ تھیں' ہر غم کا مداوا تھیں' ہر دکھ میں تسکین کا سامان تھیں' مصائب و آلام میں حوصلہ افزا اور زوال میں اترنے والی مسرت تھیں مگر آپ رضی اللہ عنہا کے آسودہ لحد ہونے کے بعد وہ کمی

شدت سے محسوس ہونے لگی۔ وقت گزرا اور ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا زمانہ تعزیت بھی ختم ہوا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے شرف زوجیت کے لئے انتخاب کا اعزاز ان عظیم عورتوں کو بخشا جنہوں نے اسلام قبول کرنے میں سبقت کا شرف و اکرام حاصل کیا۔ ان حضرات میں سے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اولیت حاصل تھی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کی صاحب زادی عائشہ الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ فخر بخشا۔ ان کا سن ابھی سات برس سے زیادہ نہ تھا جس کے دو سال کے بعد رخصتی ہونا تھی۔ اس مدت میں مونسہ غم بننے کے لئے جناب سودہ کو یہ عزت نصیب ہوئی جو حبشہ کی ہجرت کے بعد مکہ واپس آ چکی تھیں اور ان کے پہلے شوہر یہاں آ کر وفات پا چکے تھے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے زمانہ نکاح سے لیکر ان کی رخصتی تک دو سال کے وقفہ میں جنابہ سودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے نکاح کا پس منظر ذہن نشیں کر لیجئے گا۔ کیونکہ ان دونوں حرم کے بعد دوسری بی بیوں (امہات المومنین رضی اللہ عنہا) سے ترویج کا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔

معراج

621 عیسوی میں آپ ﷺ کو شرف معراج نصیب ہوا۔

اس رات صاحب معراج علیہ الصلوۃ و السلام اپنی چچا زاد بہن ہندہ کے گھر میں آرام فرما تھے۔ آپ کی کنیت "ام ہانی" ہے۔ وہ فرماتی ہیں کہ اس رات رسول اللہ ﷺ میرے ہاں تشریف فرما تھے۔ نماز عشاء ادا کرنے کے بعد ہم سب سو گئے۔ فجر ہوئی تو ہم آپ ﷺ نے ہم سب کو جگایا۔ سب کے ساتھ نماز فجر ادا کی۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے فرمایا۔ ام ہانی عشاء کی نماز تو میں نے آپ لوگوں کے ساتھ ادا کی لیکن اس کے بعد بیت المقدس پہنچا اور وہاں بھی نماز ادا کی۔ اب وہاں سے لوٹ کر تم لوگوں میں شامل ہو کر نماز فجر ابھی ادا کی ہے۔

ام ہانی نے عرض کیا۔ للہ ـــ کسی سے اس کا ذکر نہ کیجئے گا ورنہ لوگ آپ کو جھوٹا کہیں گے!

آپ ﷺ نے فرمایا ـــ واللہ لاحد ثنتمو ہ اللہ کی قسم میں لوگوں سے اس کا تذکرہ ضرور کروں گا۔

معراجِ جسمانی اور روحانی میں اختلاف

اس میں دو گروہ ہیں۔

(1) روحانی معراج کو ماننے والوں کا ثبوت ام ہانی کی یہی روایت ہے جو اوپر بیان کی گئی ہے۔

(2)عائشہ ام المومنین رضی اللہ عنہا کا یہ قول ہے!
مافقد جسد رسول اللہ ﷺ ولکن اللہ اسری بروحہ۔
رسول اللہ ﷺ کا جسدِ مبارک معراج کی رات غائب نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روح کو یہ سیر دکھائی۔
(ج)معاویہ بن سفیان کا یہ جواب ہے! جب ان سے رسول اللہ ﷺ سے واقعہ معراج کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔ کانت رؤیاء من اللہ صادقہ یہ رویائے صادقہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تھی۔
(د)ان کی دلیل کا مرکز یہ آیت تھی۔ وما جعلنا الرؤیا التی اریٰنک الافتنۃ للناس (17-2) اے نبی (ﷺ) ہم نے آپ کے خواب (رؤیا) کو لوگوں کے امتحان کا ذریعہ بنایا۔
(2)بیت المقدس تک جسمانی معراج ماننے والوں کے دلائل۔
جن کا مرکزِ استدلال اسراء میں صحرا کی بعض پیش آمدہ اشیاء کا تذکرہ ہے۔ جن کی تفصیل ہم بعد میں پیش کریں گے بہرصورت آسمانی معراج روحانی ہی تھی۔
لیکن دوسرے گروہ کے نزدیک سیر اور معراج دونوں جسمانی تھے اور متکلمین نے معراج کی دونوں صورتوں (جسمانی اور روحانی) پر بڑی تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔ جنہیں ایک جگہ جمع کیا جائے تو تقریباً دس ہزار صفحات درکار ہوں گے۔
معراج کے بارے میں ہمارا نظریہ دوسروں سے مختلف ہے ہم سے پہلے شاید ہی کسی مبصر نے اس نظریہ کو اپنایا ہو لیکن اپنا نظریہ پیش کرنے سے پہلے ہم آپ کی خدمت میں سیرت کی کتابوں سے معراج کا پورا نقشہ نقل کرتے ہیں۔

معراج کا مرقع

جسے مشہور مغربی مسیح (مستشرق) ورمنگھم نے سیرت کی مختلف کتابوں سے ایک جا کیا ہے۔ جب آدھی رات گئے پوری کائنات پر خاموشی کا سناٹا چھا گیا پرندے اپنے گھونسلوں میں پروں میں سر چھپائے چپ چاپ بیٹھے تھے' زمین پر چلنے پھرنے والے چوپائے بے حس و حرکت محو خواب تھے۔ ہوا کی سرسراہٹ اور بہتے ہوئے پانی کا شور پرسکون آوا میں بدلنے کو تھا۔ اس وقت نبی اکرم ﷺ جاگے تو ان کے سامنے جبرئیل علیہ السلام حاضر تھے! جن کی نورانی شکل برف کا تودہ بال گھنگھریالے بدن پر زربفت کی پوشاک جس پر موتی اور جواہرات ٹکے ہوئے تھے۔ دونوں بازوؤں میں قوسِ قزح کی رنگت کے پر لگے ہوئے تھے' ایک عجیب و غریب سواری

کی لگام تھامے تھے' اس سواری کا نام سے تعارف کروایا گیا۔ براق کے دونوں بازوؤں میں پر لگے ہوئے تھے۔ براق نے آنحضرت ﷺ کو دیکھتے ہی اپنی پشت کو سکیڑ لیا۔ سوار ہونے کا اشارہ پا کر آنحضرت ﷺ اس پر سوار ہو گئے۔ براق ہوا میں تیرنے لگا۔ اس کی اڑان کا رخ مکہ سے شمال کی طرف تھا اور جبریل امین علیہ السلام اس کے دوش بدوش محوِ پرواز تھے۔ آنکھ جھپکنے سے پہلے براق مکہ کی پہاڑیوں اور صحراؤں کو پیچھے چھوڑتے ہوئے کوہ سینا کے اس پہاڑ پر رکا جہاں اللہ جل شانہ نے موسیٰ علیہ السلام کو ہم کلامی کا اعزاز بخشا تھا۔ اور اس براق کا دوسرا قدم بیت اللحم کے اس مقدس مقام پر تھا جہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی تھی۔

یہاں براق نے ایک طویل جست لی' راستے میں قدم قدم پر رسول اللہ ﷺ کو روکنے کے لئے پراسرار مدھم آوازیں آتی رہیں۔ لیکن نبی الخاتم علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی خوبیٔ رسالت کی وجہ سے بالکل پرسکون تھے کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقام پر مجھے ٹھہرانا ہے وہاں براق خود بخود رک جائے گا۔ حتیٰ کہ بیت المقدس آ پہنچے۔ یہاں براق خود بخود رکا' رسول اللہ ﷺ نیچے اترے اور اس کی لگام ایک پتھر میں اٹکا دی۔

بیت المقدس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام' عیسیٰ علیہ السلام' موسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ ہیکل سلیمانی پہ کھڑے ہو کر نماز ادا کی۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے پتھریلے تکیہ سے پشت لگائی' اس کے بعد پھر پرواز شروع ہوئی اور اس کی پہلی منزل پہلا آسمان تھا۔ یوں نظر آ رہا تھا کہ جیسے چاندی کا سفید فرش بچھا ہوا ہے اور ستارے سونے کی ہلکی زنجیروں سے لٹکائے گئے ہیں۔ دروازے پر فرشتے نگرانی کے لئے کھڑے کئے گئے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان داخل ہو جائے یا ادھر ادھر جنات گھات لگائے بیٹھے ہوں اور ملائکِ اعلیٰ کی گفتگو سن لیں۔

یہاں آنحضرت ﷺ کی ملاقات آدم علیہ السلام سے ہوئی۔ رسول اللہ ﷺ نے ہدیۂ سلام پیش کیا۔ یہاں بہت سی مخلوق مصروف تسبیح دیکھی۔

یہاں سے دوسرے آسمان پر تشریف لے گئے' جہاں حضرت نوح علیہ السلام' ابراہیم علیہ السلام' داؤد علیہ السلام' سلیمان علیہ السلام' ادریس علیہ السلام' یحییٰ علیہ السلام' ہارون علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ اسی آسمان پر ملک الموت اسرافیل علیہ السلام کو دیکھا۔ اس کا دبدبہ الاماں! اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان ستر ہزار یوم کا فاصلہ ہے۔ ایک لاکھ فرشتے سامنے موجود ہیں۔ ہر ایک فرشتے کے سامنے بڑے بڑے دفتر (کھاتے) رکھے ہیں جن میں وہ آسمانی پیدائش اندراج کر رہے ہیں۔

ان میں ہی ایک ایسا فرشتہ دیکھنے میں آیا۔ جو ہر وقت انسانوں کے گناہوں' پہ رو رہا ہے۔ ایک عذاب کا فرشتہ بھی موجود ہے جس کا جسم تانبے کی مانند ہے۔ آگ کے تخت پر بیٹھا ہوا

ہے۔ آگ اس کی فرماں بردار ہے۔ ایک اور فرشتے کو آپ ﷺ نے دیکھا جس کے جسم کا آدھا حصہ آگ کا ہے اور دوسرا حصہ برف کا ہے اور اس کے اردگرد فرشتے ہالہ بنائے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ثنا میں مصروف ہیں۔ عبادت خواں کی دعا ہے۔ اے اللہ تو نے آگ اور برف کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ ہر ایک بندہ تیرا فرماں بردار ہے۔

اور ساتواں آسمان جو عدالت پیشہ انسانوں کا وطن ہے۔ وہاں ایک فرشتہ نظر آیا۔ جس کے بدن کا پھیلاؤ زمین سے بھی زیادہ ہے۔ ستر ہزار اس کے سر ہیں۔ ہر ایک سر میں ستر ہزار مہینہ ہر مہینہ میں ستر ہزار زبان اور ہر ایک زبان پر الگ الگ الفاظ ہیں جن سے اللہ کی تعریف کا اظہار ہوتا ہے اور اس کے سوا کسی زبان پر کوئی کلمہ نہیں آتا۔

رسول اللہ ﷺ۔ یہ سارے عجائبات دیکھتے ہوئے سدرۃ المنتہیٰ پر تشریف لے گئے۔ جو عرش کے دائیں طرف ہے اور عرش پر ارب ہا فرشتوں کا سایہ پڑ رہا ہے۔ یہاں سے ذرا نظر ہٹی تو ایک دریا اُٹھتا ہوا دیکھا۔ جس کے ایک طرف تاحدِ نظر نور اور ظلمت دونوں کا ایک منطقہ ہے۔ اس کے بعد ایک آگ کا منطقہ ہے' دوسرا پانی اور تیسرا منطقہ ہوا پر مشتمل ہے۔ اور ان تمام منطقوں میں ایک دوسرے کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔

آنحضرت ﷺ پردۂ جمال میں سے ہو کر گزرے۔ کمال کا حجاب اٹھا کر دیکھا' چہرے سے نقاب اٹھا اسی طرح جلال اور سب سے آخر وحدت کی چلمن ہٹا کر نظارہ کیا۔ یہاں ستر ہزار ملائکہ گروہ در گروہ سر بسجود مستغرق ہیں' ہیبت الٰہی کے سامنے سب کی زبان سے طاقت گفتار سلب ہو چکی ہے۔ یہاں اس مقام پر یہ احساس پیدا ہوا کہ اب مقام اللہ ذوالجلال والاکرام قریب ہے۔ اس کے ساتھ ہی نبی اکرم ﷺ رعب و دبدبہ سے تھرتھرا اٹھے۔ زمین و آسمان کے درمیان اندھیرا ہی اندھیرا نظر آیا۔ جیسے فنا کے مقام پر پہنچنے کو ہیں یا ایک دانہ ہے جو مزرعہ زمین پر دکھائی دے رہا ہے۔ خیال گزرا کہ انسان کو اللہ کے حضور میں اسی طرح مطیع و فرماں بردار رہنا چاہئے' حتیٰ کہ عرش کے قریب دو ایک کمان یا ان سے بھی کم۔ بمصداق وکان قاب قوسین اوادنیٰ فاصلہ پر جا پہنچے اور دیدۂ بصیرت سے عین ذاتِ برحق کا مشاہدہ کیا۔ یہاں کچھ ایسی کیفیتیں محسوس ہوئیں جن کی تعبیر وہ خود بھی نہ کر سکے الہ العالمین نے اپنا ایک ہاتھ آپ ﷺ کے سینے پر اور دوسرا کندھے پر رکھا۔ جس سے نبی ﷺ نے ٹھنڈک محسوس کی جیسے برف کی سل پشت سے لگا دی گئی ہو۔ سرور و راحت کا یہ عالم کہ خود کو فنا کے مقام پر سمجھ لیا۔

باہم جو بات چیت ہوئی اس کے اکثر حصہ کی صحت میں اسلام کی معتبر کتابیں تردید کرتی ہیں۔ الا یہ کہ ------- ہر مسلمان پر دن میں 50 نمازیں فرض کی گئیں۔ آنحضرت

ﷺ جب یہ حکم لے کر واپس ہو رہے تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ صورتحال سے آگاہی ہوئی تو موسیٰ علیہ السلام نے آپ ﷺ کو اپنی قوم پر کیے ہوئے تجربے کو سامنے رکھتے ہوئے خطرہ ظاہر کیا اور مشورہ دیا کہ واپس جا کر کمی کروا لیجیے۔ اس مرتبہ گئے اور چالیس منظور ہوئیں۔ پھر روایات کے مطابق اسی طرح گھٹتے گھٹتے صرف پانچ رہ گئیں۔

اب جبریل آپ کو بہشت کی سیر کراتے ہوئے انہیں اس مقام پر واپس لے آئے جہاں سے آپ ﷺ براق پر سوار ہوئے تھے۔ پہلے بیت المقدس اور پھر بعد میں مکہ معظمہ!

اس موضوع پر درمنگھم و عیسائی مستشرق نے مختلف کتبِ سیرت سے معراج کا واقعہ یک جا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر ان واقعات میں وہ سیرت ابنِ ہشام کی روایات کے یہ ٹکڑے نظرانداز کر گیا ہے۔

پہلے آسمان پہ حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کے درمیان ایسے آدمی نظر آئے جن کے چہرے اونٹ کے چہروں کی مانند ہیں اور ان کے ہاتھوں میں آگ کے انگارے ہیں جنہیں وہ نگلتے جا رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی یہ انگارے ان کی مقعد (دبر) سے نکلتے جا رہے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے دریافت کرنے پہ جبریل علیہ السلام نے بتایا یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں یتیموں کا مال جبراً کھاتے رہے' یہ اس کی سزا ہے۔

ایک اور ٹولی دیکھی ان کے پیٹ فرعونیوں کی طرح ڈھول جیسے بڑے بڑے تھے۔ جنہیں بدمست لوگ روندتے ہوئے گزر رہے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کے دریافت کرنے پر جبریل علیہ السلام نے فرمایا۔ یہ سود خور لوگ ہیں جنہیں یہ سزا مل رہی ہے۔

ایک اور گروہ دیکھا جن کے سامنے دو قسم کا گوشت پڑا ہوا ہے۔ تر و تازہ اور سڑا ہوا لیکن وہ لوگ تازہ گوشت چھوڑ کر گندہ سڑا گوشت کھا رہے ہیں۔ جبریل علیہ السلام نے بتایا یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی منکوحہ بیویوں کو چھوڑ کر حرام کاری بدکاری کرتے پھرتے تھے۔

پھر ایسی عورتوں کے ہجوم سے گزر ہوا جو اپنی چھاتیوں کے سہارے لٹک رہی تھیں۔ جبریل علیہ السلام نے ان کے بارہ میں بتایا۔ یہ عورتیں اپنی حرام اولاد کو اپنے شوہروں کے نام منسوب کرتی تھیں۔

یہاں سے جبرئیل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ کو جنت میں لے گئے۔

وہاں ایک کنیز کو دیکھ کر آپ ﷺ حیرت زدہ ہو گئے۔ تو جبریل علیہ السلام نے بتایا۔ یہ زید بن حارثہ کی کنیز ہیں۔ چنانچہ معراج سے واپس آنے کے بعد یہ خوشخبری نبی اکرم

ﷺ نے زید بن حارثہ کے بیٹے کو سنائی۔

معراج سے متعلق سیرت ابن ہشام کے علاوہ بھی بہت سی تفسیروں اور سیرت کی کتابوں میں مختلف واقعات پائے جاتے ہیں۔ مؤرخ کو جن میں سے ہر ایک واقعہ کے متعلق تحقیق کا حق ہے اور ایسی روایات صحیح سند کے حوالے سے قائم ہوں نہ یہ کہ صرف صوفیانِ خوش جمال کے حسنِ ظن کا کرشمہ ہوں لیکن یہ موقعہ روایاتِ معراج کی تنقیح و تنقید کا نہیں، نہ معراج کی ایسی تعین کا یہ مناسب وقت ہے۔ کہ معراج اور اسراء روحانی تھا یا جسمانی یا معراج کو روحانی مان لیا جائے اور اسراء کو (بیت المقدس تک) جسمانی تسلیم کر لیا جائے یا دونوں روحانی یا جسمانی تھے چھپانے کی بات نہیں۔ روحانی اور جسمانی ماننے والے دونوں فریق کے پاس دلائل موجود ہیں اور ان دونوں میں سے کسی ایک نوعیت کو ماننے یا نہ ماننے پر کوئی مواخذہ بھی نہیں۔ اس بناء پر جو معراج اور اسراء دونوں کو روحانی مانتا ہو، اس کے پاس بھی سند موجود ہے۔

دلائلِ مذکورہ کے علاوہ قرآنِ حکیم میں بھی کچھ ایسے دلائل موجود ہیں جنہیں صاحبِ معراج علیہ الصلوۃ والسلام نے اپنی زبان سے فرمایا ہے۔ مثلاً

انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد۔

میں بشریت میں تمہارے ہی جیسا ہوں۔ اگر کوئی فرق ہے تو وحیِ الٰہی کا فرق ہے۔ یاد رکھو تم سب کا اللہ ایک ہی ہے۔ اور یہ کہ کتاب اللہ کے ہوتے ہوئے کسی اور معجزہ کی ضرورت نہیں۔

وان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر مادون ذالک لمن یشاء 48:4

اللہ تعالیٰ شرک کو معاف نہیں کرتا اور اس کے سوا جس کو چاہے اس کے تمام گناہ معاف فرما دے!

قرآن کے سوا دوسرے معجزات سے انکار کرنے والے پر بہت زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ (جیسے کہ مؤلف قرآن حکیم کے علاوہ کسی معجزے کو تسلیم نہیں کرتا) کہ وہ معراج اور اسراء کی توضیح کرے جس پر ہم یہ کہتے ہوئے قلم اٹھاتے ہیں کہ اس پر ہم سے پہلے لکھنے والوں نے جو لکھا ہے ہمیں اس کا علم نہیں۔ البتہ ہمارا نقطۂ نگاہ یہ ہے!

معراج وحدتِ وجود

ہمارے خیال میں (مؤلف کے خیال میں) رسول اللہ ﷺ کا روحانی معراج ہر پہلو سے بدرجہا بلند ہے۔ جو دوسرے گروہ (یعنی جسمانی معراج کے قائلین) کے تصور میں ہے اور پر خلوص متکلمین (عقلی دلائل سے گفتگو کرنے والے) کے ہاں اس روحانی معراج کی بلندیوں کا نقشہ دیکھا جا سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسراء اور معراج میں رسول اللہ ﷺ کی روح جسدِ عنصری سے آزاد ہو کر پہلے تو وحدتِ کلی میں جذب ہو گئی۔ پھر تمام کائنات پر اس طرح رواں دواں ہو گئی۔ کہ اس دنیا میں جتنی رکاوٹیں ہمارے ادراک کے تصرف کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ سب ختم ہو گئیں۔

اب وہ حالات و امتیازات سے بالا ہو جاتے ہے۔ یہ جہاں اور اس کے تمام اجزاء (ازل سے ابد تک پیدا ہونے والے) روح محمد ﷺ کے آئینہ میں منعکس ہو جاتے ہیں۔ اس آئینہ میں رسول ﷺ نے دیکھ لیا کہ نیکی اور حسن و حقیقت کمال کی طرف لے جاتے ہیں۔ برائی' رزالت' خباثتِ نفس اور باطل پر نیکی' بھلائی اور صداقت و امانت کا کمال و جمال آخر کار غالب ہو کر رہتا ہے۔ جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ قدرت پیدا فرما دی ہے۔ اس مقام پر ان کے سوا کسی دوسرے کا قدم پہنچ نہیں سکتا اور یہ لوگ انبیائے کرام ہیں۔ جن میں عام انسانوں سے الگ مافوق البشر روحانی کمالات ہوتے ہیں۔ اس لئے جو لوگ محمد ﷺ کے مطیع و فرماں بردار ہو کر بھی اس مقام پر نہیں پہنچ سکے ان پر کوئی تعجب کی بات نہیں۔ کیوں کہ عظمتِ ادراک اور قوتِ فکر (یعنی عقل و شعور) کے اعتبار سے ہر انسان ایک دوسرے کے مقابلہ میں کوئی کمتر ہے۔ اور کوئی بالاتر۔ لہٰذا اس معیار میں ہر فرد بشر کامیاب نہیں ہو سکتا بلکہ ہر ایک کو اپنی طبعی استعداد اور قوتِ ادراک کے مطابق کامیابی حاصل ہوتی ہے۔

ظاہری نظر اور باطنی بصیرت

اپنے مذکورہ دعوے کی دلیل میں ہم ان لوگوں کی حکایت بیان کرتے ہیں جو ظاہری نظر رکھتے ہیں مگر باطنی بصیرت سے محروم ہیں۔ یہ لوگ ہاتھی کی ان پہچان کرنے والوں میں سے ہیں۔ ان میں سے ایک کا ہاتھ اس کی دم پر پڑا ہے۔ انہوں نے اسے صرف ایک لمبی رسی جانا۔ جس کے ہاتھ اس کی ٹانگوں پر پڑے اس نے اسے درخت کا تنا سمجھا۔ جس کے ہاتھ اس کے دانتوں سے پھسل گئے ان کی نظر میں وہ ایک نیزہ ہے۔ اور جو شخص اس کی صرف سونڈ سہلاتا رہا اس نے سڈول لرزتا ہوا ستون تعبیر کیا۔ چنانچہ ہاتھی ہی کی مانند معراج کی حقیقت بیان کرنے والوں میں اندھی آنکھ والوں اور صاحبِ بصیرت لوگوں میں اختلاف ہے۔ جو معراج کے واقعات بیان کرتے ہی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

معراج کی حقیقت آپ کے سامنے اس طرح واضح ہو گئی کہ ازل اور ابد دونوں زمانوں کا فاصلہ ختم ہو گیا۔ حدود ٹوٹ گئیں اور رسول اللہ ﷺ نے مکان کی حد سے آزاد ہو کر سدرۃ المنتہیٰ کے اس پار اس طرف دیکھا تو کائنات کی کوئی شے نظر سے اوجھل نہ رہ سکی یہ ہیں وہ

حقیقتیں جو معراج میں حضور اکرم ﷺ کو نظر آئیں لیکن اندھی آنکھ کے عوام کی نگاہیں کچھ نہ دیکھ سکیں۔

ابھی روحانی معراج کے مدرکات اور ان کے مقابلہ میں جسمانی معراج کے محسوسات میں نمایاں فرق اور اس کے درجات کی نوعیت تو ایسی ہے جیسے کہ اس جسم میں حرکت قلب کی وجہ سے روح سرسراہی ہو۔ یہ روحانی معراج کی مثال ہے جس کے مقابلہ میں جسمانی معراج ایسے ہی ہے جیسے ایک بے قدر ذرہ ۔

یہی اسراء کا معراج مرتبہ ہے۔ جسے رفعت منزلت' جمالِ صورت اور کمال معنیٰ' جلال حقیقت کے اعتبار سے معراج روحانی کا مبتدا سمجھ لیجئے جو ازل سے لیکر ابد تک ایسے کمالات کی مکمل تصویر اور ازل سے لیکر ابد تک عالم کون و مکان پر محیط ہے۔ اور انہیں حقائق میں سے ایک حقیقت اثنائے اسراء رسول اللہ ﷺ کا کوہِ سینا سے گزرنا ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوئے تھے۔ اسی طرح مولدِ مسیح یعنی بیت اللحم پر سے ہوتے ہوئے آگے بڑھنا بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ صاحبِ اسراء علیہ الصلوۃ والسلام کا حضرت عیسیٰ' موسیٰ اور ابراھیم علیہم السلام کے ساتھ مل کر ادائے صلوٰۃ انبیائے کرام کا وحدتِ دین میں منسلک ہونے کی واضح علامت ہے۔ اس لئے کہ تمام انبیائے کرام کے ادیان کی اصلی روح ہر وقت ایک ہی مرکزِ کمال کی طرف گامزن ہے۔

معراج اور جدید علوم

معراج کے بارے میں اس دور کا علم روحانی اور جسمانی دونوں کو تسلیم کرتا ہے کیونکہ قوائے سلیمہ اپنے اپنے مصرف کے مطابق جتنے ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے جائیں گے یا قریب ہوتے جائیں گے اسی قدر حقیقتوں کا انکشاف ہوتا جائے گا۔

مارکونی کو اس کائنات میں پوشیدہ قوتوں نے اس وقت یہ بات سجھائی جب اس نے اپنی کشتی سے جو بندرگاہ میں لنگرانداز تھی۔ اس سے برقی تار کا سرا باندھ کر دوسرا سرا آسٹریلیا کے شہر سڈنی کے ساتھ جوڑ دیا تاکہ وہ ایتھر کی موجوں کی قوت سے سڈنی کو روشن کردے۔

علومِ جدیدہ نے ہمارے ذہنی افکار کے مطالعہ میں عملی طور پر ایسے ثابت کر دیا ہے۔ جس طرح ریڈیو کے ذریعہ ایتھر پر آوازیں سنی جاسکتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ گفتگو کرنے والے کی صورت بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ جب یہ تمام حقیقتیں آج سے پہلے ہمارے خیال و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھیں اور نہیں کہا جاسکتا کہ کائنات ایسی اور نہ معلوم کتنی پوشیدہ قوتیں اسی طرح منکشف ہو کر ہمارے علم میں اضافہ کرتی جائیں گی۔

مقصد یہ ہے کہ جب محمد ﷺ کی روح نے یہ مقام حاصل کر لیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک رات آپ ﷺ کو بیت اللہ سے لیکر بیت المقدس تک سیر کرائی جس میں آیہ کریمہ میں ارشاد کے مطابق لنریہ من آیات ہم نے رسول کو (ﷺ) کو اپنی نشانیاں دکھائیں، سے واضح ہوتا ہے اور سائنس جس طرح اوپر کے بیان کردہ معجزات کو تسلیم کرتی ہے۔ اسی طرح اسراء اور معراج کو بھی تسلیم کرتی ہے۔ انسان کو چاہئے کہ وہ حقیقتِ کائنات کو زمان و مکان کی قید سے آزاد سمجھے۔ بشرطیکہ اس ناپائیدار زندگی کی خیالی اقدار سے اپنے آپ کو آزاد کر سکے، موجودات سے اپنا اصلی ربط معلوم کرنا اسے گوارا ہو اور خود اپنے آپ سے اصلی حقیقت کی پہچان کا خواہاں ہو۔ صرف اسی حالت میں اس پر اصلی حقیقت کا ادراک کرنا آسان ہو سکتا ہے۔

عربوں میں اسراء کا تصور جو ہم نے بیان کیا ہے۔ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے ان کی سمجھ سے بالا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے جب ان سے اس حقیقت کا تذکرہ کیا۔ تو انہوں نے مادی تصورات کے مطابق اس کے امکان اور عدمِ امکان پر بحث شروع کر دی۔ یہاں تک کہ جو لوگ پہلے سے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کر چکے تھے آج وہ بھی اسراء کی صداقت کے بارہ میں متذبذب ہو گئے۔ بعض نے یہاں تک کہا کہ بیت المقدس تک پہنچنے میں تو ایک مہینہ لگتا ہے اور دوسرا مہینہ واپس ہونے میں۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک رات میں بیت المقدس پہنچ بھی گئے اور لوٹ بھی آئے؟ اس تذبذب نے بعض مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر دیا۔ (یہ علم صرف مؤلف کو ہے) حقیقتِ حال جو سیرت کی کتابوں میں ہے وہ یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس جا کر اس واقعہ کی تصدیق کرنے کے لئے پوچھا۔ تو انہوں نے فرمایا۔ کیا آپ لوگ اسے جھوٹ سمجھتے ہیں۔ انہوں نے جواب دیا ہاں۔ آپ ہمارے ساتھ چلئے رسول اللہ ﷺ مسجد میں بیٹھے ہیں۔ خود دریافت کر لیجئے تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا۔ اگر رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں تو بالکل سچ ہے۔ اللہ کی قسم وہ جب آسمان سے وحی کے زمین پر نزول کے بارے میں دن یا رات کسی وقت میں بھی مجھے بتاتے ہیں تو میں بلا تامل اس کی تائید کرتا ہوں۔ اس کے مقابلہ میں اسراء کے واقعہ کو آپ لوگوں کا نہ ماننا میرے لئے بڑی حیرانی کی بات ہے۔

آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آنحضرت ﷺ بیت المقدس کے ان مقامات کا ذکر فرما رہے تھے جن مقامات سے آپ شب معراج گزرے تو جوں ہی آپ ﷺ نے مسجد اقصیٰ کی جغرافیائی حیثیت کا ذکر فرمایا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فوراً فرمایا صدقت یا رسول اللہ آپ نے سچ

فرمایا یا رسول اللہ ﷺ۔ کیونکہ وہ خود اپنی آنکھوں سے بیت المقدس کو اس سے پہلے دیکھ چکے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس تصدیق پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں "صدیق" کا لقب عطا فرمایا۔ لہٰذا آج تک اور تاقیامت صدیق کہلوائے جائیں گے۔

جسمانی اسراء جو لوگ اسراء (معراج) کو جسمانی مانتے ہیں ان کے دلائل یہ ہیں کہ جب آنحضرت ﷺ نے یہ واقعہ بیان فرمایا تو بعض مسلمانوں اور قریش نے بھی آپ سے سفر کے نشانات دریافت فرمائے کیونکہ انہوں نے آج تک اتنی جلدی سفر کی حقیقت حال نہ سنی تھی نہ دیکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک کاررواں کا ذکر فرمایا جن کا ایک اونٹ گم ہو گیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ وہ فلاں فلاں مقام پر تھا۔ ایک اور کاررواں کا تذکرہ فرمایا۔ جن کے برتن سے رسول اللہ ﷺ نے خود پانی انڈیل کر پیا تھا۔ بعد میں برتن سرپوش سے ڈھانک دیا تھا۔ یہ واقعات سننے کے بعد قریش نے باقاعدہ جستجو کی' ان دونوں قافلوں کی تحقیق کی اور آنحضرت ﷺ کے حرف حرف کو صحیح اور سچا پایا تو صداقت کی تصدیق کی۔

اگر ان واقعات کو ہی ہم اسراء روحانی پر معمول کر لیں تو کوئی بعید از عقل نہیں۔ اس لئے کہ نیندمیں دور دراز مقامات اور ان کے حوادث دیکھنے میں آتے ہیں۔ یہ معاملہ تو عام لوگوں کا ہے لیکن ایسے مخصوص نفوس (شخصیتیں) جن کی روحانی اور معنوی وحدت تمام عالم کو اپنے اندر احاطہ کئے ہوئے ہو اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے سہارے ان کی یہ قوت اس حد تک وسعت اختیار کر چکی ہو جس میں ازل اور ابد دونوں ایک نقطہ کی شکل میں ان کی نگاہ میں ہوں۔

بیعتِ عقبہ

بیعتِ عقبہ

اسراء و معراج

کافر تو کافر خود مسلمانوں میں سے بھی بعض مسلمان ایسے تھے جو "معراج اور اسراء" کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔ دراصل معراج اور اسراء کو شبہ کی نظروں سے دیکھنے یا اپنی مرضی کے مطابق اسے تاویل کے ساتھ سمجھنے والے اللہ جل شانہ کے کمالِ اختیار پر شبہ کرتے ہیں۔ جب ہم اللہ تعالیٰ کو مان لیں۔ ھو اللہ علی کل شئی قدیر وہ ہر چیز پر قادر ہے تو پھر روحانی اور جسمانی دونوں کے چکر میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور صادق و امین رسول اللہ ﷺ نے جن الفاظ میں اس کو بیان فرمایا ہے اسی طرح مان لینے کا نام ہی تصدیقِ رسالت ہے۔

بہرحال اس کے بعد صورتحال یہ تھی کہ کفارِ مکہ نے مسلمانوں کو دکھ پہنچانے کا عمل اور تیز کر دیا۔ جسے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کا دل بہت رنجیدہ ہوا۔

ادھر طائف (برس 414-415) میں آنحضرت ﷺ سے بدسلوکی کا واقعہ بھی تازہ تھا۔ واپسی پر قبیلہ کندہ' بنو عامر اور بنو حنیفہ سے موسم حج پر جو کچھ پیش آیا' ان تمام حوادث سے رسول اللہ ﷺ قریش کی بدنصیبی پر بہت زیادہ افسوس ہوا۔

عرب کے مختلف دور اور نزدیک سے تجارت کے سلسلے میں آنے والے عرب مسلمانوں کی حالت دیکھتے' قریش نے مسلمانوں کو اپنی ستم رانیوں کا تختہ مشق بنا رکھا ہے۔ اگر کوئی قبیلہ یا فرد مسلمانوں کی حمایت کرنے کا اظہار بھی کرتا ہے تو قریش (کفارِ مکہ) ان پر بھی وحشیوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔

اگرچہ جناب حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے شجاع اسلام میں داخل ہو چکے ہیں۔ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب اسلام نہ لانے کے باوجود ہر وقت مسلمانوں کی امداد کے لئے

جان ہتھیلیوں پہ لئے پھر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بالکل نہ ہونے کے برابر تھی۔ وقت پڑنے پر اللہ تعالیٰ کی مدد نہ ہو تو یہ لوگ اپنے بچاؤ کے لئے بالکل بے بس تھے۔ ان حالات میں یہ بھی ممکن تھا کہ مسلمان ہمت ہار کر (نعوذ باللہ) اسلام چھوڑ کر بت پرستی شروع کر دیں۔ ادھر رسول اللہ ﷺ اس فکر میں پریشان تھے ادھر کفارِ مکہ کا حسد و کینہ جبر و تشدد اور بڑھتا جا رہا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسے دشوار ترین حالات میں نبی اکرم ﷺ کا صبر و ضبط (یا بقول مولف) عزلت نشینی ان کے عزائم میں تزلزل کا موجب بننے والی تو نہیں تھی؟ نہیں ہر گز نہیں۔

بلکہ آپ ﷺ جو دین لائے تھے اس کی تبلیغ کے لئے آپ کے حوصلے، آپ کے ارادے ناقابلِ شکست حد تک پختہ تر تھے۔ جبکہ عام ذہن کے لوگ ایسی دشواریوں سے گھبرا کر اپنے مقصد سے ہٹ بھی جاتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس بڑی ہمت و جرات کے لوگ ایسے مواقع پر اپنے مقصد کی صداقت سے اپنے اندر ایمان و یقین کی قوت کو اور دوبالا کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد کے لئے اپنی جان قربان کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔

اسی طرح محمد ﷺ جو صداقت، شجاعت، عدالت و قیادت، سیادت سب میں تمام انسانوں سے اعلیٰ ترین ہیں۔ اپنے رفقاء اور خود کو ایسے روح فرسا ماحول میں بھی قائم رکھا اور اس یقین کا دامن کبھی نہیں چھوڑا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی وقت بھی نصرت آئے گی اور اسلام دوسرے تمام باطل ادیان پر غالب آ کر رہے گا۔ اس یقین کی قوتِ لازوال کے سبب وہ اپنے مقصد سے دست بردار نہ ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس نازک حالت میں بھی ایک سال تک مکہ معظمہ میں قیام فرمایا۔ جبکہ آپ کے پاس نہ تو اپنا اثاثہ رہا اور نہ ہی اپنی مونسہ ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا متروکہ مال کچھ بچا مگر آپ ﷺ نصرتِ الٰہی پر یقین رکھتے ہوئے دعوتِ دین پہ ثابت قدم سرگرمِ عمل رہے۔ موسم حج میں اطرافِ عرب سے مکہ آنے والے زائرین کے سامنے دینِ اسلام کی دعوت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور اس کوششِ پیہم میں کبھی ان کے دل میں یہ خیال نہیں آیا کہ میرے مخاطب شاید میری دعوت قبول کریں یا نہ کریں یا انکار کر دیں گے تو کیا ہو گا۔ جبکہ اس تبلیغ کے درمیان کفار قدم بہ قدم سایہ کی طرح پیچھا کرتے ہوئے ساتھ ساتھ چلتے۔ آپ کا مذاق اڑاتے اور دعوت کو بے اثر کرنے کے لئے ہر کمینی حرکت کر گزرتے لیکن اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی عزیمت میں تنکے کے برابر کمی نہ آئی۔ اس لئے کہ محمد ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و مدد کا یقین تھا۔

بہترین اندازِ خطاب:۔۔۔۔۔۔ اللہ جل شانہ نے اپنے نبی کو ہدایت فرمائی کہ آپ لوگوں

کے ساتھ گفتگو کرتے وقت محبت بھرا نرم لہجہ اختیار فرمائیں۔ ایسا اچھا طریق اختیار فرمائیں کہ آپ کی بات مخاطب کے دل میں اتر جائے۔

ادفع بالتی ھی احسن فاذالذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔ (34:41)

وحی کے ذریعہ یہ بھی ہدایت فرمائی کہ گفتگو میں نرمی برتنے کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس کا خوف پیدا ہوتا ہے اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ آپ دوسروں کے جبرو تشدد پر صبر فرمائیں اور یقین رکھیں فتح آخر میں صبر کرنے والوں کو ہی نصیب ہوتی ہے۔

غرض مکہ میں آنحضرت ﷺ نے بڑی ہی کشمکش کے ساتھ اس دن کی امید پر کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت آئے گی کئی سال گزارے۔ چنانچہ۔۔۔ افق یثرب سے فتح و نصرت کے آثار نظر آ ہی گئے۔ یثرب سے رسول اللہ ﷺ سے تجارتی تعلقات تو نہیں تھے البتہ یہاں آپ کا ننہال ضرور تھا۔ آپ ﷺ کی والدہ ماجدہ ہر سال تشریف لاتیں۔ یہاں بنو نجار کے قبیلہ سے آنحضرت ﷺ کے دادا سیدنا عبدالمطلب کا ننہالی رشتہ تھا۔ اور انہیں کے قبرستان میں رسول اللہ ﷺ کے والد محترم عبداللہ بن عبدالمطلب کی قبر تھی، جس کے لئے رسول اللہ ﷺ کی والدہ یہاں تشریف لاتیں۔

یہ وہی یثرب ہے۔ جہاں آپ کے دادا عبدالمطلب اپنے اس بیٹے کی بیماری کی خبر سن کر تشریف لائے جس نے ابھی شباب کی بہاریں بھی نہ دیکھی تھیں۔ ابھی اس کے رخ و عارض پر سبزۂ خط بھی نمودار نہیں ہوا تھا وہی یثرب جس میں محمد ﷺ اپنی چھ سال کی عمر میں اپنی والدہ ماجدہ کے ساتھ تشریف لائے۔

اور جب اپنے والد محترم کی قبر کی زیارت کے بعد مکہ کی طرف لوٹے تو راستے میں مکہ اور یثرب کے وسط میں آپ کی والدہ نے داعئی اجل کو لبیک کہا اور مقامِ ابواء میں راحت فرما ہوئیں۔ ان حوادث کی تفصیل سابقہ ابواب میں گزر چکی ہے۔

پھر نماز میں (بیت المقدس اور یثرب) کی سمت یکجہتی سے بھی اس طرف کی رغبت غیر یقینی نہیں ہو سکتیں کہ لوحِ تقدیر میں بھی یثرب کی قسمت میں یہ لکھا جا چکا تھا کہ جناب محمد ﷺ کو اس شہر سے نصرت حاصل ہو گی اور اسلام کو اسی یثرب میں پہنچ جانے کے بعد قوت و اشاعت کا موقع نصیب ہو گا۔ یثرب میں تبلیغ اسلام کی ابتدائی کامیابیوں کو تقدیر کا قلم صدیوں پہلے تحریر کر چکا تھا جن کی روشنی میں واقعات کا سلسلہ چلتا رہا۔ اوس و خزرج دونوں قبیلے یثرب میں یہودیوں کے دوش بدوش رہتے تھے لیکن یہود کے ساتھ ان کے روابط ہمیشہ ناہموار تھے۔ کبھی کبھی جنگ و جدال تک نوبت پہنچ جاتی۔ تاریخ کہتی ہے کہ اس زمانے میں شام کے

عیسائی جو مشرقی روم کے ماتحت تھے یہودیوں سے ان کی دشمنی کا سبب یہ خیال تھا کہ اسی قبیلہ نے مسیح علیہ السلام کو پھانسی چڑھایا۔ یہی لوگ ان کی بے حرمتی کا سبب بنے۔ اسی جذبہ انتقام میں انہوں نے یثرب کے یہود پر حملہ کر دیا۔ مگر ان سے شکست خوردہ ہونے کے بعد اوس و خزرج کو بھی اپنے ساتھ ملا کر یہودیوں پر حملہ کر کے دل کھول کر بدلہ لیا۔ لاتعداد یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کے بعد یہود کا ستارہ گہنا گیا۔ ان کی جگہ مقام و مرتبہ اوس و خزرج کو مل گیا جو اس حصولِ اقتدار سے پہلے صرف محنت مزدوری کر کے پیٹ پالتے تھے۔

اس واقعہ کے بعد ایک مرتبہ عربوں نے بھی چاہا کہ مدینہ کے یہودیوں کو ختم کر کے ان کے ذرائع آمدن ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا جائے' عربوں کو اس کوشش میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہو گئی۔ لیکن یہود ایسی قوم نہ تھی جو اپنے انجام کو محفوظ رکھنے سے غافل رہتی۔ انہوں نے اوس و خزرج دونوں کے اقتدار سے بچنے کی خفیہ تدبیریں شروع کر دیں۔

یہود نے ایک ایسی چال چلی جس سے جنگ و جدال سے بچ کر خود کو ان پر غالب کر سکتے تھے۔ اس چال سے انہوں نے اوس و خزرج کو آپس میں صف آرا کروا دیا۔ دونوں میں ایسی پھوٹ ڈلوا دی کہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو گئے اور یہودی اپنی مدافعت سے بے نیاز ہو کر دن رات اپنی تجارت میں لگ گئے۔ اس طرح انہوں نے اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا اور ان کی جتنی زمینیں یا جائیدادیں عربوں کے قبضوں میں تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ ان سے واپس لے لیں۔ یثرب میں عرب اور یہود میں اقتدار اور سرمایہ داری ہی کی کشمکش کا بکھیڑا نہیں تھا بلکہ ان کے علاوہ ایک اور امر بھی حائل تھا۔ جس میں نہ صرف اوس و خزرج بلکہ پورا عرب یہودیوں کے سامنے دبا ہوا تھا۔ یہود کو اپنے اہلِ کتاب ہونے کی وجہ سے اپنی مذہبی برتری کا احساس تھا۔ وہ توحید پر بھی قائم تھے' مگر ان کے ہمسائے بتوں کی عقیدت و محبت میں دیوانے ہو رہے تھے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کے حضور میں تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ یہود ان کو ایک آنے والے نبی کی بعثت سے ہمیشہ ڈراتے اور کہتے کہ اس نبی کے ذریعہ سے یہودیت سب پر غالب آئے گی۔

لیکن یہود کی دینی دعوت کو دو اسباب کی بناء پر عرب میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی تھی۔

(1) یہود خود کو اللہ کی پسندیدہ جماعت سمجھنے کی وجہ سے دوسروں کو اپنا ہم مرتبہ سمجھنے کے روادار نہ تھے۔ انہیں یہ بھی گوارا نہ تھا کہ کوئی دوسرا ان کے دین میں داخل ہو کر ان کا ہم مرتبہ بن جائے۔ یہود اور اوس و خزرج کو یہودیوں کا ہمسایہ ہونے کی وجہ سے بھی اور تجارتی تعلقات کے سبب بھی دوسرے عرب باشندوں سے زیادہ یہودیوں کی زبان سے ان کی مذہبی گفتگو سننے کے مواقع میسر آتے تھے۔ جو اس بات کی دلیل ہو سکتی ہے کہ عرب کے دوسرے علاقوں

کے مقابلہ میں یثرب کے رہنے والوں میں دینِ اسلام کی دعوت زیادہ مقبول ہو۔

سوید بن الصلت

یثرب میں قبیلہ اوس کی بہت ہی باوقار شخصیت سوید بن الصلت تھے جو اپنی شرافت و نجابت شعر گوئی اور شجاعت میں لاجواب ہونے کی وجہ سے اپنی قوم میں "کامل" کا خطاب پا چکے تھے۔ یہی سوید بن الصلت نبی اکرم ﷺ کے زمانہ بعثت میں زیارتِ کعبہ کے لئے مکہ آئے تو رسول اللہ ﷺ نے حسبِ معمول انہیں دعوت دین پیش کی۔ سوید نے کہا شاید آپ کے پاس وہی چیز ہو جو میرے پاس پہلے سے موجود ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا۔۔۔ وہ کونسی شے ہے؟

اس نے کہا۔ میرے پاس لقمان کے اقوال ہیں!

نبیِ رحمت ﷺ نے ان میں کچھ کلام ان کی زبانی سنا اور فرمایا۔ یہ اچھی باتیں ہیں لیکن میرے پاس ان سے بہتر اللہ عزوجل کا کلام ہے جو مجھ پر لوگوں کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا گیا ہے۔

انتہائی نورانی کلام! یہ فرما کر نبیِ کل عالم ﷺ نے قرآن حکیم کی ایک سورۃ تلاوت فرما کر دعوت دین دی۔ کلام حق سوید بن الصلت کے دل میں اتر اور اس نے کہا۔ "یہ کلام تو بہت بہتر ہے" اس کے بعد جب سوید بن الصلت واپس ہوئے تو ان کے ذہن میں قرآنِ حکیم کی عبادت اور مفہوم کی عظمت کے سوا کچھ نہ تھا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ!

جب سوید خزرج کے ہاتھوں قتل ہوئے تو ان کی قوم نے کہا کہ سوید مسلمان ہو کر مرے ہیں لیکن یہود کے پڑوس میں رہنے والوں میں سے صرف سوید بن الصلت ہی کے دل و دماغ پر قرآن حکیم کی حکمرانی نہ تھی بلکہ اور بھی کئی خوش نصیب لوگ تھے۔

لیکن یہود نے اوس و خزرج میں دشمنی کی ایسی دیواریں کھڑی کر دی تھیں کہ دونوں اپنی اپنی مدافعت اور برتری حاصل کرنے کے لئے عربوں کی حمایت میں مارے مارے پھرنے لگے تھے۔

اس سلسلہ میں یثرب انس بن رافع (ابو الحسبہ) اپنے ساتھ وفد لیکر مکہ آئے اسی وفد میں ایاس بن معاذ بھی شامل تھے تاکہ قریش کو اپنے قبیلہ خزرج کا حلیف بنائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو آپ ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اسلام کی دعوت پیش کی اور قرآن حکیم کا کچھ حصہ انہیں سنایا۔ ایاس موصوف جنہوں نے ابتدائے شباب میں چوری اور ڈاکے کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ قرآن کریم سن کر حیران و ششدر رہ گئے اور اپنی قوم

سے کہا۔

یا قوم! هذا واللہ خیر مما جئتم فیہ! برادران قوم! جس مقصد کے لئے تم یہاں پہنچے ہو۔ اللہ کی قسم اس کے مقابلہ میں یہ چیز زیادہ بہتر ہے۔

لیکن ان لوگوں پر دوسرا ہی جنون غالب تھا۔ وہ اس دعوتِ نعمت و برکت پر توجہ نہ دے سکے' انہیں آنے والی جنگ (بعاث) کا خطرہ کھائے جا رہا تھا جس میں فتح پانے کے لئے وہ قریش سے مدد طلب کرنے آئے تھے۔ ایاس بن معاذ رضی اللہ عنہ تو اسلام کی رحمت و برکت سے فیض یاب لوٹے لیکن دوسروں کے دلوں میں مکمل نہ سہی مگر کچھ نہ کچھ قرآن حکیم کا اثر ضرور ہوا۔

جنگِ بعاث

یہود کی عیاری اور سیاسی چال بار آور ہو گئی' قبیلہ اوس اور خزرج ایک دوسرے کے سامنے صف آرا ہو گئے۔ ابو الحسیر ایاس بن معذ) اور ان کے ساتھیوں کے واپس آتے ہی کچھ مدت کے بعد اوس و خزرج کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا اس دنیا سے نام و نشان مٹانے پر تل آیا۔ ہر حملہ پر اپنے ساتھیوں کا سختی سے جائزہ لیا جاتا کہ ان میں سے کوئی شخص میدانِ جنگ میں نرمی یا بزدلی کا ثبوت تو نہیں دے رہا۔ اس کے بعد حملہ اور جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا۔

قبیلہ اوس کے ایک دستہ پہ ابو اسید حضیر کمان کر رہے تھے۔ جو خزرج دشمنی میں انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ اتفاق سے اوس کے قدم اکھڑ گئے اور وہ بدحواسی میں میدان چھوڑ کر بھاگنے لگے مگر خزرج نے ان کا پیچھا کیا۔ ان میں ابو اسید بھی تھے جو سواری سے نیچے اترے۔ اپنا نیزہ خود اپنی ران میں پیوست کیا۔ زمین پر بیٹھ گئے اور بآواز بلند کہا۔

اب میں اس جگہ سے پیچھے ہٹ نہیں سکتا۔ مجھے خود قتل کر دو یا خزرج کے حوالے کر دو! اوس قبیلہ نے جب اپنے سردار کی یہ حالت دیکھی تو طیش کھا کر پلٹے اور خزرج پر ٹوٹ پڑے۔ اب یہ یثرب کی طرف بھاگ نکلے۔ اوس نے ان کے گھروں تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا۔ ان کے باغات روندتے ہوئے خزرج کے گھر جلانے شروع کر دیئے۔ خزرج نے سعد بن معاذ اشہلی کی پناہ لی۔ (یہ قبیلہ اوس کے سردار تھے) ابو اسید نے اعلان کر دیا کہ خزرج کے ہر گھر کو آگ لگا دی جائے اور ان کے باغوں میں ایک پودا بھی سلامت نہ رہنے پائے لیکن ابو قیس ابن الصلت نے آگے بڑھ کر کہا۔

یہ تمہارے ایسے بھائی ہیں جو یہودیوں سے بہتر ہیں۔

اس کے بعد اوس کی تلواریں نیاموں میں داخل ہوئیں۔ (ابو قیس بھی قبیلہ اوس ہی کے فرد تھے) لیکن اوس و خزرج کی جنگ کے نتیجہ میں یہود کی کھوئی ہوئی عظمت لوٹ آئی اور انہیں پہلے کی طرح یثرب کی قیادت میسر آ گئی۔ لیکن جب اوس و خزرج کے فاتح اور مفتوح دونوں نے اپنے اپنے گریبانوں میں جھانکا تو دونوں کے دلوں میں ندامت و شرمساری کا تلاطم پیدا ہو گیا۔ انہوں نے دیکھا کہ آج اوس و خزرج کی جگہ قیادت و سیادت یہودیوں کے ہاتھوں چلی گئی پھر دونوں قبیلے سر جوڑ کر بیٹھے۔ کسی ایک شخص کو سردار بنانے کا معاہدہ دونوں میں طے پایا۔ اس کے لئے عبداللہ بن ابی کا نام پیش کیا گیا جو انتہائی دانش مند اور باوقار شخصیت کے مالک تھے اور شکست خوردہ قبیلہ خزرج کے چشم و چراغ! لیکن قیادت و سیادت کا یہ چکر ایک نئی صورت اختیار کرنے والا تھا۔ جس کا کسی کو علم نہ تھا۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ اب یثرب میں بنی اسرائیل یا اوس و خزرج کی قیادت و سیادت کی گنجائش ہی نہیں رہی۔

اسلام کا ورود

حسبِ معمول موسم حج میں زیارتِ کعبہ کے لئے خزرج کا ایک قافلہ مکہ پہنچا تو رسول اللہ ﷺ ان کے پاس تشریف لائے۔ گفتگو کے درمیان معلوم ہوا کہ یہ لوگ یہود کے ہمسایہ ہیں، صحبت یافتہ ہیں، اہلِ عرب میں اگر کبھی یہود اور عرب میں تلخ کلامی ہو جاتی تو یہود ان کو یہ کہہ کر ڈراتے کہ

ذرا صبر کرو، آنے والے نبی کا زمانہ قریب آ چکا ہے۔ تم سے پہلے ہم اس کے مطیع و فرماں بردار بن کر تمہیں عاد و ارم کی طرح بے نام و نشان کر دیں گے۔

آج مکہ میں یثرب کے عرب باشندوں نے اس نبی (ﷺ) کو اپنے روبرو دیکھ لیا اور ایک دوسرے سے اشاروں میں کہہ گئے۔

واللہ انہ النبی الذی تواعدکم بہ یہود۔ فلا یسبقنکم الیہ! واللہ یہ تو وہی نبی ہے یہود جس کی خبر سنایا کرتے تھے۔ جلدی کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہود تم سے سبقت حاصل کر لیں۔

خزرج نے اسلام قبول کرتے ہوئے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ ہم اپنے پیچھے ایسی قوم اوس و خزرج کو چھوڑ آئے ہیں جن کی باہم دشمنی کی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ امید ہے کہ آپ کی تعلیم کی وجہ سے ان کی دشمنی باہم اتحاد پختہ سے بدل جائے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ان دونوں قبیلوں کی نگاہ میں، دل میں آپ سے زیادہ کوئی دوسرا باعزت نہیں ہو گا۔

اس قافلہ میں بنو نجار کے بھی دو ایسے آدمی تھے جو رسول اللہ ﷺ کے دادا سیدنا عبدالمطلب کے رشتہ دار تھے۔ جنہوں نے آنحضرت ﷺ کے بچپن میں آپ کی پرورش کی تھی۔

یہ لوگ واپس مدینہ آ گئے اور علی الاعلان دوسروں کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کا اظہار کرنے لگے۔ جس نے سنا اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اوس و خزرج کا کوئی گھر ایسا نہ تھا جس گھر میں دو ایک اشخاص نے (بلا تخصیص مرد و زن) اسلام قبول نہ کیا ہو! اور ان کی زبانوں پر نبی رحمت ﷺ کا ذکر مبارک نہ ہو۔ انہیں فخر تھا کہ وہ یہودیوں کی طرح موحد بن گئے اور ان سے بہتر دین کو قبول کر لیا۔

عقبۂ اولیٰ کی بیعت

یہ سال گزر گیا تو آنے والے سال کے موسم حج میں یثرب سے 12 خوش نصیب زیارتِ کعبہ کے لئے مکہ تشریف لائے۔ رسول اللہ ﷺ نے مقامِ عقبہ پر ان سے ملاقات کی' جہاں سب نے نبی رحمت و برکت صداقت و شجاعت علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مبارک ہاتھوں پر بیعت کی جو "بیعتِ عقبہ" کے نام سے مشہور ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان سے مندرجہ ذیل احکامات پر عہد لیا۔

(1) وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گے۔

چوری نہیں کریں گے۔ زنا کے قریب بھی نہیں جائیں گے۔ اولاد کو قتل نہیں کریں گے۔ ایک دوسرے پر بہتان نہیں لگائیں گے اور معروف (نیکی کے کاموں) میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے منہ نہیں پھیریں گے اور ان سے یہ عہد لینے کے بعد فرمایا۔ اگر تم نے اپنا عہد پورا کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تم جنت کے مستحق قرار دیئے جاؤ گے۔ ورنہ معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ وہی عذاب و ثواب دونوں کا مختار ہے۔

مدینہ کی پہلی تربیت گاہ

رسول اللہ ﷺ نے ان کی دینی تربیت کے لئے جناب مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ کر دیا جو ان کو قرآن مجید پڑھاتے اور اس کے مطالب سمجھاتے' ارکانِ اسلام کی تعلیم دیتے' دین کی حقیقت ان کے ذہن نشین کرتے۔

تربیت گاہ کی کامیابی

اس بیعت (بیعتِ عقبۂ اولیٰ) کے بعد یثرب میں اسلام کا نور روز بروز پھیلنے لگا۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اوس و خزرج کی تربیت میں دن رات مصروف رہے۔ انہیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انصار اپنی خوشی اور کھلے دل سے اسلام قبول کرتے جا رہے ہیں۔ دوسرا سال آیا تو مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رجب کے مہینہ میں مکہ تشریف لے آئے اور یثرب میں اسلام کے فروغ کے واقعات کی تفصیل عرض کی اور یہ اطلاع بھی دی کہ یثرب کے مسلمان متحد اور بہادر ہیں اور خوشخبری سناتے ہوئے فرمایا کہ اب کے موسم حج میں بہت سے لوگ حج کے لئے مکہ معظمہ آ رہے ہیں۔

یثرب کے بارے میں یہ خبر سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل میں یہ خیال آیا کہ یثرب میں مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ وہ یہود کے آزار سے بھی محفوظ ہیں۔ انہیں وہاں کے مشرکین بھی نہیں ستاتے۔ مکہ کے مسلمانوں کی طرح جو ہر لمحہ ایک سے ایک بڑھ کر ظلم کا سامنا کر رہے ہیں۔ مکہ کے مقابلہ میں یثرب میں زندگی کے وسائل بھی بہت زیادہ ہیں۔ وہاں کی زمین قابلِ کاشت ہے۔ وہاں کھجوروں کے جھنڈ ہیں۔ انگوروں کے باغ ہیں۔ آخر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اگر مکہ کے مسلمان ہجرت کر کے یثرب کے ان بھائیوں کے پاس چلے جائیں تو امن کی زندگی گزار سکیں گے۔ قریش کے فتنوں سے بھی بچ جائیں گے اور ان کا دین یہاں کی طرح یثرب میں ہدفِ ملامت نہیں بنے گا۔ اسی سوچ بچار میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذہن میں یثرب کے پہلے قافلہ کی وہ کہانی گھومنے لگی جب انہوں نے مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اوس و خزرج کی باہم دشمنی کا ذکر کیا تھا تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا تھا۔ مشرف بہ اسلام ہونے کے بعد اب دونوں قبیلوں کے نزدیک ہر ایک اپنے سے زیادہ دوسرے کو باعزت سمجھے گا۔ اس سوچ میں ہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خیال ابھرا کہ اگر میں مکہ سے ہجرت کر کے یثرب چلا جاؤں تو بہتر نہ ہو گا؟ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ میری وجہ سے اوس و خزرج دونوں متحد ہو جائیں۔ آخر یہاں رہ کر کب تک حالات کی موافقت کا انتظار کیا جائے اور پھر ---- خود قدرت حاصل ہونے پر میں اہلِ مکہ سے ان کے مظالم کا بدلہ لے سکوں۔

حیرت ہے فاضل مؤلف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر عمل کو ان کی اپنی سوچ کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور سوچ بھی وہ جو مؤلف کی اپنی سطح کی سوچ ہے جبکہ قرآن و حدیث دونوں گواہ ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو بات بھی کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کرتے ہیں۔ پھر آپ سوچیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دماغ میں (نعوذ باللہ) طاقت حاصل کر کے کسی سے بدلہ لینے کا خیال کیا آ سکتا ہے؟ جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے جان کے دشمنوں کو بھی دعائیں دیں! پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوچ تو تمام دنیا کے دانشوروں، عقلمندوں سے کہیں زیادہ

ناقابلِ مثال اعلیٰ مرتبہ کی سوچ ہے۔ اس سوچ کو کوئی شاعر، مصنف، ادیب، عاقل و دانا اپنی تحریر، اپنی عقل، اپنی ہوش، اپنے شعور میں احاطہ ہی نہیں کر سکتا۔ (مترجم)

مولف آگے لکھتے ہیں۔ آپ نے سوچا میرے ضعف کا تو یہ حال ہے کہ اب تک میں اپنی مدافعت بھی نہیں کر سکتا۔ پھر آپ کے ذہن میں یہ خیال گزرا کہ بنوہاشم اور بنوعبدالمطلب زیادہ سے زیادہ میری اتنی مدد کر سکتے ہیں کہ مجھ پر قریش کے ظلم کو روک لیں۔ لیکن اگر میں کسی سے اس کے ظلم کی تلافی لینا چاہوں تو اس معاملہ میں وہ میری مدد کرنے سے قاصر ہیں۔ پھر میری ذات کو ہی قریش کے ظلم و ستم سے بچانا مقصود نہیں بلکہ میرے ساتھ بھی تو قریش کے ظلم و ستم سے آزاد ہونا چاہئیں۔

قوتِ ایمان ہومن کی ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے۔ اس راہ میں مال و آرام آزادی حتیٰ کہ اس کے لئے زندگی نثار کرنا بھی بے حد آسان ہوتا ہے۔ کیونکہ راہِ حق میں مصیبت کے برداشت کرنے سے بھی ایمان کو اور زیادہ قوت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے باوجود اگر تکالیف کا سلسلہ طویل ہو جائے تو جینا مشکل ہو جاتا ہے۔ اسے یہ موقع نہیں ملتا کہ وہ ادراکِ حقیقت کے لئے یک سوئی سے غور و فکر کر سکے! (مولف کی یہ سوچ بھی اپنی سوچ ہے)

رسول اللہ ﷺ نے اب سے پہلے بھی اپنے جانثاروں کو حبشہ ہجرت کرنے کی ہدایت فرمائی تھی جہاں کا حکمران عیسائی عادل بادشاہ تھا۔ اس حبشہ کے مقابلہ میں یہ کہیں بہتر ہے کہ مسلمان مکہ سے ہجرت کر کے یثرب چلے جائیں۔ جہاں کے ایسے مسلمان بھائی موجود ہیں جو ایک دوسرے کی مدد کر سکتے ہیں۔ ایک دوسرے کے تعاون سے دشمنوں کے حملوں کی مدافعت بھی کر سکتے ہیں۔ گویا یثرب میں یہ لوگ نہ صرف اپنے دین پر آزادی سے عمل کر سکیں گے بلکہ دعوتِ اسلام پیش کرنے کا موقع بھی انہیں مل سکے گا۔

عقبہ میں دوسری بیعت

اسی سال (632ء) میں یثرب میں سے ایک کارروان زیارتِ کعبہ کے لئے روانہ ہوا۔ جس میں 76 مسلمان تھے۔ ان میں بی بیاں بھی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ملی تو آپ کے دل میں بیعت کے نفسِ مضمون میں ایک تبدیلی کا خیال آیا۔ چنانچہ اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ گذشتہ تیرہ سال کی طرح مہربانی، شفقت، تحمل، درگزر اور صرف برداشت پر اکتفا کرنا اسلام کے لئے اب فائدہ مند نہیں ہو گا۔ مسلمان کب تک دوسروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنتے رہیں گے۔ اب زیادتی کو روک کر ظلم کا مقابلہ کیا جائے گا۔

عقبہ اولیٰ پر دوسری ملاقات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یثرب کے مسلمانوں سے خفیہ ملاقات کی ان کے ولولہ ایمان و تحمل کا اندازہ فرمایا اور ان سے طے پایا کہ زیارت حج کے بعد ایام تشریق میں عقبہ میں ہی ملاقات ہو گی۔ سب لوگ رات کے آخری حصہ میں وہاں جمع ہو جائیں۔ یثرب سے مسلمان کے ساتھ مشرکین بھی زیارت کعبہ کے لئے آئے تھے۔ مسلمانوں نے ان سے یہ راز پوشیدہ رکھا اور وعدہ کے مطابق طے شدہ وقت پر ایک ایک مسلمان مقررہ جگہ (عقبہ) پہ پہنچ گیا۔ یہاں تک کہ وہ دو بیبیاں بھی پیچھے نہ رہیں جو اس نیت سے یہاں تشریف لائی تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی مقررہ وقت پر اپنے بزرگوار چچا سیدنا عباس بن عبدالمطلب کے ہمراہ وہاں پہنچ گئے۔ سیدنا عباس گو ابھی تک اپنے پرانے مسلک پر قائم تھے لیکن ہاشمیت کی وجہ سے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کا وعدہ کر رکھا تھا اس لئے وہ ہر وقت اس امکان کا احساس رکھتے تھے کہ شاید اہلِ یثرب کی آمد کو بہانہ بنا کر قریش ہاشمیوں سے جنگ پر آمادہ نہ ہو جائیں اور وقت پڑنے پر اہلِ یثرب ہمارا ساتھ نہ دیں۔ اس لئے وہ ساتھ آئے تھے اور خود ہی بات شروع کرتے ہوئے خزرج سے مخاطب ہوئے!

خزرجی دوستو! آپ لوگوں کو معلوم ہے کہ ہاشمی قبیلہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کس قدر و منزلت سے دیکھتا ہے۔ ان کی کتنی تعظیم کرتا ہے حالانکہ ان کے عقیدہ اور ہمارے عقیدہ میں زمین و آسمان کا فرق ہے لیکن ہم نے ان کی امداد نصرت میں آج تک کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے قبیلہ میں قابل احترام ہیں۔ اپنے شہر میں معزز ہیں لیکن اب ان کا میلان آپ لوگوں کی طرف ہو گیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ یہ آپ لوگوں کے پاس آپ کے شہر میں مستقل بسیرا کر لیں۔ اگر آپ لوگ ان کی وجہ سے قریش کا دباؤ برداشت کرنے کی ہمت رکھتے ہیں' وقت پڑنے پر دشمنوں سے ان کے بچاؤ کی جنگ لڑ سکتے ہیں تو ہمیں کوئی عذر نہیں اور اگر وہاں لے کر جا انہیں دشمنوں کے حوالے کرنا ہے تو ہمیں ان کی تکلیف گوارا نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ آپ لوگ انہیں مکہ میں ہی رہنے دیں۔

اہلِ یثرب کا جواب تھا۔

اے عباس۔ آپ نے جو کچھ کہا ہم نے سن لیا۔

اس کے بعد انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے التجا کی! یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آپ کو اختیار ہے۔ آپ اپنے اور ذاتِ باری سے متعلق جس طرح کا عہد

لینا چاہتے ہیں ہم سے لے لیجیے۔

رسول اللہ ﷺ نے پہلے تو قرآن حکیم کی آیات تلاوت فرمائیں۔ اس کے بعد انہیں اسلام کی تعلیمات سے سرفراز فرمایا اور آخر میں فرمایا۔

ابالعکم علیٰ ان تمنعون مما تمنعونی منہ نسائکم وابنائکم!

میں تم سے اس شرط پر بیعت لیتا ہوں کہ میری معاونت اپنے بیوی بچوں کی طرح کرو گے۔

اصحابِ مدینہ میں سے ایک صاحب براء بن عازب تھے۔ یہ بیعتِ عقبہ اولیٰ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے تھے۔ لیکن نماز میں ابتدا ہی سے بیت المقدس کی بجائے کعبہ کی طرح رخ کر کے ادا کرتے تھے۔ جبکہ جناب رسالت مآب محمد ﷺ اور دوسرے مسلمانوں نے اس کی کچھ مدت تک بعد اور اب بھی بیت المقدس ہی کو جہت قبلہ بنا رکھا تھا۔ انہوں نے اس موقع پر رسول اللہ ﷺ سے پہلی ملاقات پر پہلا ہی سوال یہ کیا کہ کیا میں کعبہ کی جہت قبلہ قائم رکھوں یا بیت المقدس؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مسجد اقصیٰ ہی کو قبلہ بناؤ۔

حضرت براء رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے حکم پر عمل کرنا شروع کر دیا۔ جناب رسول اللہ ﷺ کی تقریر کے بعد حضرت براء رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے حضور پیش ہو کر عرض کیا۔

بایعنا یا رسول اللہ فنحن واللہ ابناء الحروب اوھل الحلقہ ورثناھا کابرا" عن کابرا!

اے اللہ کے رسول آپ جو کچھ چاہتے ہیں۔ ہم اسی پر آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ ہم نے جنگوں کی گود میں آنکھیں کھولیں۔ ہتھیار ہمارے کھیل کے سامان ہیں۔ جنہیں ہم نے اپنے باپ دادا سے وراثت میں پایا ہے۔

براء رضی اللہ عنہ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ابوالہیثم بن تیہان نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ ﷺ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ ہم آپ کے لئے یہود کے ساتھ کیے ہوئے معاہدہ کی تجدید نہ کریں۔ ادھر آپ قوت حاصل ہونے کے بعد ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ کر اپنے ملی بھائیوں کے گلے آملیں؟

یہ سن کر رسول اللہ ﷺ مسکرا دیے اور فرمایا۔

بل الدم الدم! والھدم الھدم انتم منی وانا منکم احارب من حاربتم واسالم من سالمتم!

جہاں تمہارا خون گرے گا وہاں میرا لہو بھی بہے گا۔ میں تم میں سے ہوں اور تم میرے ہم قوم ہو۔ تم جس سے جنگ کرو گے میں تمہارے ساتھ شریک ہوں گا اور جس کے ساتھ تمہاری صلح ہو گی اس کے ساتھ میری بھی صلح ہو گی۔

یہ جواب سن کر سب کے سب اٹھ کر آگے بڑھے تو عباس بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آگے بڑھ کر اپنی قوم کو کہا۔

برادرانِ خزرج! بیعت کرنے سے پہلے اچھی طرح اس کے نتائج پر غور کر لو۔ سوچ لو۔ عین ممکن ہے کالے گورے دونوں قسم کے لوگوں سے لڑنا پڑے۔ اگر لڑائی میں اپنے مال کی تباہی اور اپنے افراد کو قتل ہوتے دیکھ کر آپ نے ہمت ہار دینا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دشمن کے سپرد کر دینا ہے تو پھر بیعت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں بلکہ اس کے بعد تم دین و دنیا دونوں میں رسوا ہو جاؤ گے اور اگر آپ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت میں اپنا سر کٹانا مال اور اولاد کو نثار کرنا خوشی سے منظور ہے۔ تو پھر شوق و خلوص سے بڑھو' بیعت کرو' اللہ کی قسم اس سے تمہاری دین اور دنیا دونوں میں سرخروئی حاصل ہونا یقینی ہے۔ ابو الہیثم کی تقریر سن کر لوگوں نے عرض کیا!

ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت میں اپنے اموال اپنے افراد سب کچھ قربان کر دیں گے لیکن اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کا معاوضہ کیا ہو گا۔

جواب میں رسول محترم و مکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جنت الفردوس۔

اس جواب کے بعد اہلِ یثرب نے ہاتھ بڑھائے۔ ادھر رسول الاولین و الآخرین علیہ الصلوۃ والسلام نے بھی اپنا ہاتھ بڑھایا اور تکمیلِ بیعت کے بعد فرمایا۔

اپنی جماعت میں 12 ایسے اشخاص منتخب کر لو۔ جو تم سب پر نگرانی کے ذمہ داریوں کے جوابدہ ہوں اور "میں" اپنی جماعت مسلمانانِ مکہ کی طرف سے ان کا نگران اور جواب دہ ہوں۔

اہلِ یثرب نے قبیلہ خزرج سے 9 اور تین کا انتخاب قبیلہ اوس سے کر کے انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم لوگ میرے لئے عیسیٰ بن مریم کے حواریوں کی طرح ہو اور میں اپنی قوم کی طرف سے تمہارے سامنے جواب دہ ہوں۔

عقبہ ثانیہ کی اس بیعت میں بیعت کرنے والوں نے مزید یہ الفاظ بھی فرمائے۔

بایعنا علی السمع والطاعته فی عسرنا ویسرنا ومنشطنا ومکرھنا وان نقول الحق اینما کنا لا نخاف فی اللہ لومته لائم

ہم نے آپ کے ہاتھوں پر بیعت کی ہے آرام ہو یا دکھ تنگی ہو یا فراخی خوف ہو یا امید کامیابی ہو یا ناکامی ہم ہر حال میں آپ کی صداقت کا ساتھ نہیں چھوڑیں گے۔ ہم کسی کی ملامت سے متاثر نہیں ہوں گے۔

یہ مہم عقبہ کی گھاٹی میں رات کے سناٹے میں سکون و اطمینان کے ساتھ ختم ہوئی۔ سب کو یقین تھا کہ اہلِ مکہ میں سے کسی کو اس کی خبر نہیں ہو گی۔ لیکن یہ لوگ تمام کارروائی کے بعد منتشر ہونے کو تھے کہ اچانک کسی شخص نے قریش کی دہائی پکارتے ہوئے بلند آواز سے پکار لگائی۔ غضب ہو گیا۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں نے تمہارے ساتھ جنگ کرنے کا منصوبہ بنا لیا۔ یہ شخص دراصل کسی ذاتی ضرورت کی بناء پر شہر سے باہر نکلا تھا۔ اتفاق سے اس نے کچھ باتیں سن لیں اور مسلمانوں کی اس تدبیر کو ناکام کرنے کے لئے جنگ کی صورتحال سے ڈرا کر اہلِ یثرب کو اپنے عہد سے پھر جانے پہ آمادہ کرنا چاہا لیکن اوس و خزرج کے اشخاص اس کے شور و شغب سے کوئی اثر لئے بغیر رکے رہے۔ حتیٰ کہ عباس بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔

اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس ذاتِ مطلق کی قسم جس نے آپ کو رسول صادق (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنا کر بھیجا ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو ہم دن نکلنے کے ساتھ تلواریں سونت کر اہلِ مکہ پر چڑھائی کر دیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کی طرف سے ہمیں یہ حکم نہیں دیا گیا۔ اب آپ لوگ اپنے اپنے خیموں میں چلے جاؤ۔ اہلِ یثرب نے فرمان کی تعمیل کی اور صبح تک اپنے خیموں میں آرام سے سوئے رہے۔

قریش کی بدحواسی

صبح ہونے تک قریش کے کانوں میں اس بیعت کی بھنک پڑ گئی اور ان کی ایک ٹولی گھبرائی ہوئی خزرج کے خیموں میں داخل ہوئی اور کہا کہ ہم لوگ آپ سے ہرگز جنگ کرنا نہیں چاہتے! مگر آپ لوگوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہمارے خلاف جنگ کا معاہدہ کیوں کر لیا۔

یثرب سے قبیلہ خزرج کے مشرکین جو زیادہ تعداد میں یہاں آئے تھے انہیں اس بات کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے قسمیں کھا کھا کر ان کو یقین دلایا کہ ہم نے ایسا کوئی معاہدہ نہیں کیا۔

مسلمانوں نے جب دیکھا کہ مشرکینِ مکہ اپنے مشرک بھائیوں سے ہی مخاطب ہیں تو وہ اپنی اپنی جگہ خاموش کھڑے رہے۔ لہٰذا قریش یہاں سے اس تذبذب میں لوٹے کہ یہ

یقینی ان پر غالب تھی یعنی معاملہ کے اثبات یا نفی دونوں میں سے کسی پر ان کو یقین نہیں تھا۔ لیکن وہ تحقیق و جستجو میں ضرور رہے۔ ادھر اہل یثرب نے ان کی اسی بے یقینی کو غنیمت جانا اور اس سے پہلے کہ قریش کو معاملہ کی صداقت کا یقین ہو جائے اپنی اپنی سواریوں پہ بیٹھے اور وطن کی راہ لی۔

لیکن کچھ دیر بعد ہی قریش نے واقعہ کی تصدیق کر لی اور مسلمانوں کے تعاقب میں دوڑے۔ ان کی بدنصیبی انہوں نے حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ پر قابو پالیا۔ انہیں مکہ لے جا کر سخت تکلیفیں پہنچائیں لیکن اہل مکہ میں سے جبیر بن مطعم اور حارث بن امیہ نے مداخلت کر کے انہیں یہاں سے نجات دلوا دی۔ کیوں کہ یہ دونوں شخص شام کی طرف تجارتی سفر کرتے ہوئے ان کی پناہ میں رہتے تھے۔

قریش کی پریشانی کا آغاز

اب تک قریش کے دل میں کسی قسم کا کوئی خوف نہیں تھا۔ حتیٰ کہ اہل یثرب کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس بیعت میں کیے ہوئے عہد کا علم بھی انہیں خائف نہ کر سکا۔ جس میں اہل یثرب نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت ہی میں ان کے دشمنوں کے جنگ کرنے کا عہد کر لیا تھا۔

لیکن آج قریش کو مستقبل ڈراؤنے خوابوں کی طرح نظر آنے لگا۔ وہ تیرہ سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دعوت دین کی بناء پر جبر و تشدد کرتے رہے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ مبلغ اسلام علیہ الصلوۃ والسلام منصب رسالت کو ادا کرنے میں ایسے ہمہ تن مصروف ہیں کہ اس راہ میں طرح طرح کی تکلیفیں انہیں تھکا نہیں سکتیں۔ انہیں روک نہیں سکتیں۔
وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ ہم نے کون سی ایسی تکلیف ہے جو ان کو نہیں دی ہم نے مسلمانوں کا سانس لینا مشکل کر دیا۔ انہیں مسلسل تین سال تک گھاٹی میں نظر بند کر دیا۔ اہل مکہ کو ان کا ہم دردی اور پیروی سے روکے رکھا مگر ہمارے ترکش میں جتنے تیر تھے ختم ہو گئے۔ یقین تو یہ تھا کہ یہ لوگ گھاٹی میں نظر بندی سے گھبرا کر ہمارے قدموں میں سر رکھ دیں گے' اس دین کو دور سے سلام کہہ کر ہمارے ساتھ بت پرستی میں شریک ہو جائیں گے۔
لیکن آج تو ہوا کا رخ ہی پلٹ گیا۔ اہل یثرب کے ساتھ رات کی تاریکی میں ہونے والے معاہدہ نے مستقبل میں ہمارے لئے خطروں کے دریا بہا دیئے ہیں۔ ہمارے دشمن کی کامیابی کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے دشمن (اہل مکہ) سے انتقام

لینے کے لئے اچانک حملہ کر دیں۔

چلئے اگر ایسا نہ بھی ہو تو بھی وہ اپنے دین کی تعلیم کو زیادہ پھیلانے اور ہمارے بتوں کی مذمت دونوں کام دل کھول کا یقیناً کر سکیں گے۔

وہ کیسا عالم ہو گا جب وہ ہماری نظروں کے سامنے اہلِ یثرب کی مدد لے کر اپنے دین کی عبادات آزادی سے ادا کر سکیں گے اپنے دین کی دعوت بلا خوف کرنے لگیں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ہمارے دشمن کو جزیرہ عرب میں کہاں تک کامیابی حاصل ہو۔ ہمیں یقین ہے کہ اوس و خزرج نصرت و مدد میں کوئی کمی اٹھا نہیں رکھیں گے پھر قریش جو اپنے دشمن کی دعوت کو ابتدا میں ہی نہیں روک سکے وہ اب جب کہ اس کا پھیلاؤ اتنا وسیع ہو گیا ہے اس کا سد باب کیسے کر سکیں گے؟

غرض ادھر قریش اس غم میں غرق کہ رسول اللہ ﷺ کی جمعیت اور دعوت دین کو کیسے ختم کریں۔ ادھر رسول اللہ ﷺ کے سامنے یقین کہ اللہ تعالیٰ نے میری دعوت کے لئے یثرب کی سرزمین پر میری مکمل کامیابی کی بنیاد رکھ دی ہے اب دین کی سر بلندی ہو کر رہے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ قریش کے ساتھ سخت جنگ کا سامنا کرنا پڑے۔

اور اب کے ان کی تمام زیادتیاں اپنے ہاتھوں خود موت کی گھاٹ اتر جائیں۔ یہ معرکہ دونوں کی موت و حیات کا سبب بھی ہو سکتا ہے لیکن اس معرکہ میں وہ گروہ ہی کامران و فاتح ہو گا جس کے ہاتھ صداقت کا پرچم ہو گا۔ لہٰذا مجھے آئندہ کی فکر سے آزاد نہیں رہنا چاہئے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کی امداد پر پورا پورا بھروسہ کرنا چاہئے اور امید رکھنی چاہئے کہ انشاء اللہ قریش کی تمام تدبیریں پہلے ہی کی طرح ناکام ہو جائیں گی۔ مجھے قدم آگے بڑھانا چاہئے مگر احتیاط کے ساتھ! اپنے ساتھیوں سے شفقت و محبت' لطف و کرم کا سلوک کرتے ہوئے حکمت و دانشمندی کے ساتھ' یہ لمحات گذشتہ تمام حالات سے زیادہ اہم اور نازک ہیں۔

اذنِ ہجرت

نبی اکرم ﷺ نے مکہ کے مسلمانوں کو قریش سے نظریں بچا کر یثرب ہجرت کر جانے کا حکم دے دیا۔ مسلمان ایک ایک دو دو کر کے مدینہ جانے لگے۔ قریش نے بھانپ لیا اور بعض کا تعاقب شروع کر دیا۔ بعض کو پکڑ بھی لائے اور ان کو جتنی زیادہ سے زیادہ تکلیفیں دے سکتے تھے' دیں۔ اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے ہر طرح کے عذاب دیئے۔

اگر کسی قریشی بیوی کا شوہر جو اس کے غیر کفو سے ہے اس کی ہجرت کا ارادہ سن پاتے تو مرد سے پہلے اس کی بیوی کو بطور ضمانت نظربند کر دیتے۔ اتنی خیریت رہی کہ ان مسلمانوں میں سے کسی کو قتل نہیں کیا گیا۔ وہ بھی اس خوف سے کہ کہیں خانہ جنگی نہ شروع ہو جائے، اس قسم کی تمام سخت ترین تدبیروں کے باوجود مسلمانوں کو یثرب کرنے سے روک نہ سکے

چنانچہ کافی زیادہ مسلمان ہجرت کر گئے لیکن خود رسول اللہ ﷺ مکہ میں ہی بدستور قیام پذیر رہے، کسی کو اس کا علم نہیں تھا کہ آپ خود ﷺ بھی ہجرت کرنا چاہتے ہیں یا مکہ میں ہی مستقل رہنا چاہتے ہیں۔ مکہ والے ابھی تک اس بات کو نہیں بھولے تھے کہ اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے ساتھی تو حبشہ ہجرت کر گئے تھے مگر آپ ﷺ مکہ میں ہی رہے اور یہیں رہ کر لوگوں کو دعوتِ اسلام دیتے رہے۔

آخر ایک روز ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے ہجرت کی درخواست کی تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جلدی نہ کیجئے، شاید اس سفر کے لئے آپ کو کوئی اچھا ساتھی مل جائے۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رازدارِ نبوت تھے۔ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔

قریش پر ہجرت کا رد عمل

مسلمانوں کی مکہ سے ہجرت کا ردِ عمل انتہائی شدید ہوا۔ ان کے دماغوں میں خطروں کی ہر لحہ گھنٹیاں بجنے لگیں اور ان خطروں کو وہ خود تصورات میں آباد کرتے اور بیقراری میں تڑپ تڑپ کر رہ جاتے۔

وہ سوچتے۔۔۔۔۔ افسوس یہ مسلمان مدینہ میں ترقی کر جائیں گے۔ دولت مند بن کر عزت کی زندگی گزاریں گے۔ کبھی ان کے تصور میں آتا کہ مکہ کے یہ مہاجر یثرب والوں کے ساتھ مل کر افرادی قوت کا ایک بہت بڑا لشکر لے کر ہم پر چڑھائی کر دیں گے اور پھر ان کے دل میں یہ خوف بار بار سر اٹھاتا کہ محمد ﷺ بھی اگر ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے تو آپ ﷺ کی حسنِ تدبیر اور ثبات قدمی یقیناً ہمارے لئے تباہ کن صورتحال پیدا کر دے گی۔ کبھی وہ یہ سوچتے کہ ایک دن یہ لوگ اہلِ مکّہ اور شام کی درمیانی لائن ضرور کاٹ دیں گے جو ہماری معاشی شہ رگ ہے۔ پھر ہماری تجارت کا کیا ہو گا۔ ہم تو بھوکوں مرنے لگیں گے۔ جس طرح محمد ﷺ کو ہم نے شعبِ ابی طالب میں قید کر دیا تھا۔ یہ بھی ہمارے ساتھ ایسا ہی قطع تعلق جیسی صورت پیدا کر دیں۔

اگر ہم نے محمد ﷺ کو مکہ سے نکلنے سے روک لیا تو ہو سکتا ہے یثرب والے

اپنے رسولؐ کی حمایت میں ہمارے خلاف صف آرا ہو جائیں! غرض ان کے اپنے ہی مظالم آج انہیں سانپ بن کر ڈسنے لگے۔

آخر کار انہوں نے ایک منصوبہ بنایا کہ اس مصیبت سے نجات کا ایک ہی راستہ ہے کہ جمال و کمالِ انسانیت محمد ﷺ کے مقدس خون سے اپنے ہاتھ رنگ لئے جائیں لیکن اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے میں بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کی طرف سے خانہ جنگی کے اندیشہ نے روکا اور پھر یہ بھی سوچتے کہ ہاشمیوں اور بنو عبدالمطلب کے لئے یثرب سے کمک بھی آسکتی ہے۔

اب ایک ہی تجویز رہ گئی جس پر مختلف آراء دی گئیں۔

(1) رسول اللہ ﷺ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال کر انہیں قید خانہ میں ڈال کر دروازہ مقفل کر دیا جائے تاکہ یہ سابقہ شعرائے عرب زہیر اور نابغہ کی طرح قید خانہ کی صعوبت سے گھبرا کر جان دے دیں مگر اس رائے پر سب متفق نہ ہوئے۔

(2) دوسری رائے یہ تھی کہ ان کو جلاوطن کر دیا جائے مگر اس پر بھی انہیں اتفاق نہ ہوا اور وہی خطرہ طوفان بن کر ان کے سامنے ابھرا۔ یہ یثرب جا کر افرادی قوت حاصل کر کے ہم پر حملہ کر دیں گے۔

(3) تیسری تدبیر یہ تھی کہ ہر قبیلہ کا ایک ایک فرد تلوار لے کر نکلے اور بیک وقت سب کے سب نورِ علم و حکمت علیہ الصّلوٰۃ والسلام پر حملہ کر دیں۔ اس طرح مقتول کا خون تمام قبیلوں پر تقسیم ہو جائے گا۔ بنو ہاشم اور بنو عبدالمطلب کس کس سے بدلہ لیتے پھریں گے آخر مجبور ہو کر خون بہا پہ فیصلہ کر لیں گے۔ اس بدبختی میں نام لکھوانے میں سب راضی ہو گئے۔ تدبیر کے مطابق ہر خاندان کا ایک ایک نوجوان چن لیا گیا۔ تلواریں تیز کر لی گئیں۔ اب قریش کو یقین ہو گیا کہ اب ہم اس الجھن سے ہمیشہ کے لئے نجات حاصل کر لیں گے۔ چند دنوں میں اس نورِ علم و حکمت کی روشنی وقت کے اندھیروں میں دب جائے گی۔

یثرب میں ہجرت کر کے جانے والے مسلمان خود بخود وطن (مکہ) واپس آجائیں گے۔ دعوتِ دین ختم ہو چکی ہو گی اور یہ لوگ پھر سے ہمارے ساتھ مل کر بت پرستی شروع کر دیں گے۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

ہجرت

سازش کی اطلاع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دارالندوہ میں کفار کی طے شدہ سازش سے آگاہ فرما دیا۔ علاوہ ازیں محسنِ انسانیت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قریش کے دلوں میں کروٹیں لیتے ہوئے ان خطرات کا بھی علم ہو گیا جن کا ذکر ہم پچھلی سطور میں کر چکے ہیں۔

ادھر قریش کو یقین تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موقع پاتے ہی ضرور یثرب تشریف لے جائیں گے لیکن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک کو بھی خبر نہ تھی جبکہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اشارہ پا کر دو اونٹنیوں کا سواری کے لئے انتظام کر رکھا تھا اور چند دن پہلے ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔ ابوبکر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) جلدی نہ کیجئے شاید اس سفر کے لئے آپ کو کوئی ساتھی مل جائے۔ البتہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس جواب سے یہ جان سکے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت ضرور فرمائیں گے۔

الغرض ابھی تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت سے متعلق اللہ تعالیٰ کے حکم (وحی) کے منتظر تھے۔ انہیں قتل کی سازش کا علم بھی ہو چکا تھا۔ مکہ میں مسلمانوں کی نفری بھی بہت کم رہ گئی تھی۔ آخر وہ وقتِ سعید آ ہی گیا۔ جب کل تک یثرب کہلانے والا شہر (یعنی دکھوں کا شہر) آج مدینہ طیبہ کے نام سے مشرف ہونے کو تھا۔ وحی نازل ہوئی ہجرت کا حکم ملا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لے گئے، انہیں خبر سنائی، ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ساتھ چلنے کی اجازت مانگی۔ خوش نصیبی سے ان کو مل گئی۔

ہجرت

آج ایک ایسے واقعہ کا ظہور ہونے کو ہے جس سے تاریخِ مکہ ہی نہیں، خطۂ عرب ہی

نہیں بلکہ تمام دنیا کے مسلمان انسانوں کی تاریخ بدلنے کو ہے۔ اس واقعہ سے دنیا میں صداقت و ایمان کی عظمت و شکوہ کا نمونہ قائم ہونے کو ہے۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دو اونٹ عبداللہ بن اریقط کے سپرد کر رکھے تھے۔ اور سفر سے متعلق اس کی مزید ذمہ داریوں سے بھی اسے مطلع کر رکھا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اب تک اپنے قدیم مذہب پر ہی قائم تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یقین تھا کہ قریش ہمارا تعاقب کریں گے لہٰذا ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ احتیاطاً کوئی تدبیر کرتے۔

(1) ایک تو یہ کہ عام شاہراہوں سے ہٹ کر سفر کا راستہ منتخب کرتے۔

(2) عام اوقات کے علاوہ دوسرے وقت میں سفر کرتے۔

ادھر قریش کے شمشیر زن اپنے ہاتھوں میں ننگی تلواریں لئے محاصرہ کئے ہوئے تھے۔ اپنی طرف سے چاک و چوبند کہیں شکار ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ ادھر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے چچیرے بھائی علی ابن ابی طالب کو حکم دیا کہ وہ ان کے بستر پہ ان کی خصوصی چادر اوڑھ کر سو جائیں اور میرے بعد مکہ والوں نے جتنی امانتیں میرے پاس رکھی ہیں وہ ان سب کو پہنچا دیں۔

آستانۂ نبوت کے باہر

شمشیر زن گھات میں بیٹھے رہے۔ رات نے اپنا سفر جاری رکھا۔ جب رات کا تیسرا حصہ گزر گیا تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتہائی سکون کے ساتھ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ جو پہلے ہی سے چشم براہ تھے۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شرفِ معیت پا کر مکان کے پچھلے دروازہ سے نکل کر شہر کے جنوب کی طرف چل پڑے۔ یمن کی طرف جانے والے اس راستہ پر ہی غار ثورِ واقع ہے۔ اس میں مصلحتاً چھپ گئے اور یہ بات کسی کے ذہن میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنوب کی طرف سرگرم سفر ہوئے ہوں گے۔

رازدارانِ ثور

یہ راز ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر والوں کو ہی معلوم تھا۔ ان کے صاحبزادے عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ام المومنین سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا' اسماء اور ایک غلام عامر بن فہیرہ سب امانت دار راز تھے۔ عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ دن بھر شہر مکہ میں قریش کی سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھیں اور شام کے وقت اس کی اطلاع غارِ ثور کے مقیموں تک پہنچائیں۔

عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے غلام کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ دن بھر بکریاں چراتے اور شام کو ان کا دودھ اور بھنا ہوا گوشت رفیقانِ غار کو پہنچائیں اور جب عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ واپس جائیں تو ان کے قدموں کے نشان پر بکریوں کا ریوڑ چلاتے ہوئے مکہ جائیں تاکہ وہ سب مٹ جائیں۔

تین دن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تین دن تک غار ثور میں چھپے رہے۔ قریش نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلاش میں رات دن ایک کر دیئے۔ انہیں یہ خوف تھا کہ آج اگر سید الکونین علیہ الصلوٰۃ والسلام ہمارے ہاتھوں سے بچ کر نکل گئے تو کل ہمارا کیا حشر ہو گا۔

ادھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یاد میں ڈوبے ہوئے آزادی اور گرفتاری کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کئے ہوئے ہیں اور ابوبکر رضی اللہ عنہ باہر سے آنے والی آوازوں کے لئے ہمہ تن گوش بنے ہوئے ہیں اور متفکر ہیں کہیں مکہ والوں کو ہمارے یہاں چھپنے کا پتہ تو نہیں چل گیا۔

دشمن غار ثور کے دہانہ پر

ہوا یہی کہ قریش کی ایک مسلح ٹولی غار ثور کے دہانہ پر آ پہنچی۔ جس کے قریب ہی ایک گڈریا اپنی بکریاں چرا رہا تھا۔ انہوں نے چرواہے سے پوچھا جس نے جواب دیا۔ ممکن ہے اس غار میں ہوں! لیکن میں نے اپنی آنکھوں سے یہاں کسی فرد بشر کو نہیں دیکھا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ تو گوش بر آواز تھے ہی۔ چرواہے کا جواب سن کر پسینہ پسینہ ہو گئے۔ خوف سے دم گھٹنے لگا اور اللہ پر معاملہ چھوڑ کر بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک قریشی نوجوان غار تک آ پہنچا لیکن وہ غار کے اندر جھانکے بغیر ہی لوٹ گیا۔ اس کے ساتھیوں نے اس سے پوچھا غار کے قریب پہنچ کر بھی تم نے غار کے اندر نہیں جھانکا؟ اس نے جواب دیا کیسے جھانکتا ہے بہ غار کے دہانہ پر تو مکڑی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیدائش سے بھی پہلے کا جالا بنا ہوا ہے۔ اور غار کے منہ پر دو جنگلی کبوتروں نے اپنے گھونسلے بنا رکھے ہیں۔ غار کے اندر چاروں طرف سوکھی گھاس پڑی ہے۔ ان علامات سے میری سمجھ میں یہی آیا کہ یہاں کسی فرد بشر کا ہونا ہی ناممکن ہے، اس لئے میں اندر جھانکے بغیر چلا آیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سکون ہیں

اس اضطرابی کیفیت اور کشمکش کے ماحول میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پرسکون ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلوٰۃ اور دعا سے اپنی توجہ ہٹنے نہ دی۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے رابطہ جاری رکھا۔ مگر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خوف سے اس قدر نڈھال تھے کہ انہوں نے خود کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت ہی قریب کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ اگر ان پر کوئی حملہ ہو تو ان پر زد آ جائے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بال بیکا نہ ہو۔ اس اثناء میں نبی الثقلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لاتحزن ان اللہ معنا "مت گھبراؤ ابوبکر اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہیں"

یہ واقعہ احادیث میں اس طرح مروی ہے کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کھوج لگانے والوں کے قدموں کی آہٹ سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سرگوشی کے انداز میں عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر ان میں سے کسی نے نیچے کی طرف جھانک لیا تو وہ ہمیں دیکھ لے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ابوبکر گھبراؤ نہیں ہم دونوں کے ساتھ تیسرا ہمارے ساتھ اللہ تعالیٰ ہے۔

قریش نے جب دیکھا کہ غار کے منہ پر درخت کی شاخیں اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ ان کو کاٹے بغیر کوئی اندر نہیں جا سکتا تو انہیں یقین ہو گیا کہ غار کے اندر کوئی فرد بشر نہیں۔ وہ جدھر سے آئے تھے ادھر ہی لوٹ گئے۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے پلٹنے کی آہٹ سنی تو ان کا ایمان و یقین اور توانا ہو گیا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بآوازِ بلند فرمایا۔ الحمد للہ۔ اللہ اکبر

معجزۂ غار

غار کے منہ پر مکڑی کا جالا' جنگلی کبوتروں کا گھونسلا اور درختوں کا ایسا پھیلاؤ کہ جسے کاٹے بغیر انسان غار کے اندر نہیں جا سکتا۔ اربابِ سیر نے اسے معجزہ قرار دیا ہے۔ ان کی توجیہہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غار میں تشریف لے جانے سے پہلے ان تینوں مناظر کا کوئی نام و نشان نہ تھا مگر جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار میں اترے مکڑی نے جالا بنا۔ کہیں سے دو کبوتر اڑتے اڑتے وہاں آ پہنچے۔ انہوں نے غار کے منہ پر اپنا گھونسلا بنایا۔ اس میں انڈے دیئے۔ دہانے میں ہی سے ایک پودے نے سر نکالا اور ذرا سی دیر میں شاخیں غار کے دہانہ پر اس طرح پھیل گئیں جیسے اسے کسی سرپوش نے ڈھانک دیا ہو۔ درمنگھم (مستشرق) لکھتے ہیں کہ فقط یہی تین معجزے اسلامی تاریخ میں قطعیت کے ساتھ مذکور ہیں۔ مکڑی کا جالا' کبوتر کا گھونسلا اور درخت کی شاخوں کا پھیلاؤ۔ مگر یہ چیزیں تو معمول کے طور پر وجود میں آتی ہی رہتی ہیں۔

معجزات سے انکار

بعض قدیم اربابِ سیر میں سے سیرت ابنِ ہشام میں یہ معجزات مذکور نہیں بلکہ یہ فقرہ بایں صورت بیان کیا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ دونوں غار ثور کی جانب تشریف لے گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ حکم دیا کہ وہ دن بھر میں شہر میں گھومیں اور قریش کی جتنی باتیں معلوم ہوں۔ شام کو ان کی خبر غار میں آکر دے جایا کریں اور اپنے آزاد کردہ غلام فہیرہ بن عامر کو تاکید کی کہ دن بھر بکریوں کا ریوڑ غار حرا کے اردگرد چراتے رہیں مگر شام ہوتے ہی غار (ثور) کے دہانہ پہ آجائیں اور آپ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی اسماء رات کی تاریکی میں دونوں کا کھانا لایا کریں۔ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ تین روز تک غار میں چھپے رہے۔ جب قریش تلاش کر کے تھک گئے تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کو گرفتار کر کے لائے۔ اسے ایک سو اونٹ انعام میں ملیں گے۔ عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کفار کے اس اعلان کی اطلاع بھی دے دی۔

ابوبکر کے غلام عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ شام کے وقت غار ثور کے دہانے پر آئے۔ تازہ دودھ اور گوشت دونوں کے لئے پیش کرتے اور شام کو جب عبداللہ بن ابوبکر رضی اللہ عنہ غار سے شہر کی طرف جاتے تو ان کے قدموں کے نشان مٹانے کے لئے عامر اپنا ریوڑ اس راستے سے گھر واپس لے جاتے۔ جہاں جہاں سے عبداللہ رضی اللہ عنہ خود گزرتے تاکہ ان کے قدموں کے نشان بے نشان ہو جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ تین روز تک متواتر غار میں چھپے رہے۔ اب ان کے نئے ساتھی صحراؤں کے راستوں کے ماہر کی باری آئی۔ اس سے اجرت پر معاملہ طے ہو چکا تھا۔ دونوں کے لئے دو اونٹنیاں اور اپنے لئے ایک اونٹ لیکر حاضر ہوا۔

رسول اللہ ﷺ کے اعلانِ قتل اور واقعۂ غار میں نزول کے بارہ میں ان آیات میں ذکر موجود ہے۔

(1) واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک ویمکرون ویمکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔ (8:3)

اور اے نبی ﷺ وہ وقت یاد کرو جب کافر تم پر داؤ چلانا چاہتے تھے تاکہ تم کو گرفتار کر رکھیں یا تم کو مار ڈالیں یا تم کو جلاوطن کر دیں۔

اور حال یہ تھا کہ کافر اپنی تدبیر کر رہے تھے اور اللہ تعالیٰ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور وہ سب سے بہتر تدبیریں کرنے والا ہے۔

(2)الا تنصروه فقد نصره اللہ اذ اخرجه الذین کفروا ثانی اثنین اذ هما فی الغار اذ یقول لصاحبه "لا تحزن ان اللہ معنا" فانزل اللہ سکینته علیه وایده بجنود لم تروها وجعل کلمة الذین کفروا السفلیٰ وکلمة اللہ هی العلیا واللہ عزیز حکیم (40:9)

اگر تم رسول کی مدد نہ بھی کرو تو کوئی پرواہ کی بات نہیں۔ اللہ ان کا مددگار ہے اور اس نے اپنے رسول کی مدد اس وقت کی جب کافروں نے ایسا بے سرو سامان گھر سے باہر کیا کہ صرف دو آدمی (ان دو میں دوسرے نبی) اس وقت یہ دونوں غار ثور میں تھے اور اس وقت رسول اللہ اپنے ساتھی کو سمجھا رہے تھے۔ کچھ فکر نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اپنے رسول پر اطمینان و سکون اتارا اور ان کی مدد ایسے فرشتوں سے کی جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے اور کافروں کی بات کو نیچا دکھا دیا اور حقیقت یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ ہی کا نام بلند و بالا ہے۔ اللہ ہی ہمیشہ غالب اور صاحب تدبیر ہے۔

ذات النطاقین

تین دن کے بعد دونوں حضرات کو یقین ہو گیا کہ اب قریش کی ہمت ٹوٹ گئی ہے۔ اب ہمیں اپنا سفر شروع کر دینا چاہئے۔ معاہدہ کے مطابق عبداللہ بن اریقط صحرا کے رستوں کا ماہر تین کا قافلہ تین اونٹنیوں کو لے کر پہنچ گیا۔ ادھر سیدہ اسماء بنت ابوبکر رضی اللہ عنہا توشہ لے کر تشریف لے آئیں۔ سوار اپنی اپنی سواریوں (اونٹنیوں) پر بیٹھ چکے تھے لیکن توشہ کو کجاوہ کے ساتھ باندھنے کے لئے اس وقت کوئی رسی نہ مل سکی تو بی بی اسماء نے اپنی کمر کی پٹی (نطاق) اتاری۔ اس کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور دوسرا حسبِ دستور اپنی کمر میں لپیٹ لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اسماء رضی اللہ عنہا کا یہ ایثار بہت پسند آیا۔ انہیں ذات النطاقین کے خطاب سے نوازا۔ اب سے بی بی اسماء اسی نام سے مشہور ہو گئیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا توشہ اپنے کجاوہ کے ساتھ باندھا اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنا اپنے کجاوہ کے ساتھ باندھ لیا۔ اب رہروِ دشت عبداللہ بن اریط کے ہمراہ ناقہ کی مہار پھیر دی گئی۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس 5 ہزار درہم بھی تھے۔ یوں کہئے کہ ان کی یہی کل پونجی تھی جسے لے کر وہ مکہ سے نکلے تھے۔

وقت اور شاہراہِ شام کی تبدیلی

غار میں مسلسل خبریں پہنچتی رہتی تھیں کہ قریش نے آپ کی تلاش میں تمام راہوں کا چپہ چپہ چھان مارا ہے اور اب بھی لوگ انعام کے لالچ میں اسی تاک میں لگے ہوئے ہیں جس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور زیادہ محتاط ہو گئے۔ عام شاہراہ کو چھوڑ کر اس راستہ پہ ہو لئے جو بالکل ہی غیر معروف اور لوگوں کے لئے انجانا سا راستہ تھا۔ صحرا نورد عبداللہ بن اریقط اس راہ سے واقف تھا۔ مکہ معظمہ سے نشیب کی طرف سے ہوتے ہوئے وادی تہامہ کی جانب ہو کر بحرِ احمر کے ساحل کے نزدیک مصروفِ سفر رہے۔ جب عام شاہراہ سے بالکل ہی الگ ہو گئے۔ تو ساحل سے ذرا دور ہٹ کر مگر اس کے بالکل متوازی ڈگر اختیار کر لی جس سے عام لوگ بالکل واقف نہ تھے۔ تینوں ھسفر رات بھر چلتے رہے۔ دن کے ابتدائی حصہ میں بھی دیر تک یہ تکلیف دہ سفر جاری رہا۔ مگر سفر کی مشقت سے بے نیاز تھکان سے لاپرواہ بے فکر مطمئن منزل بمنزل چلے جا رہے تھے۔ پھر ان حضرات پہ یہ صعوبت اور تھکن کیا معنی رکھتی تھی جبکہ ان کے سامنے قریش کی ان کوششوں کا خوف بھی تھا۔ جن کا مقصد نبی اکرم ﷺ کو ان کے منزل مقصود تک پہنچنے سے ہر قیمت پر روکنا تھا۔ ادھر خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے شریکِ سفر ابوبکر رضی اللہ عنہ جس مقصد کے لئے اپنی ہتھیلیوں پر جانیں رکھ کر مکہ سے نکلے تھے۔ اس مقصد تک پہنچنا اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا پیش نظر تھا۔ بلاشبہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے اللہ تعالیٰ پر پورا بھروسہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ حکم بھی پیش نظر تھا۔

ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ۔

بلاوجہ خود کو ہلاکت میں مت ڈالو۔

وہ اس سے بھی غافل نہ تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی مدد فرماتے ہیں جو خود اپنی امداد کے لئے کوشش کرتا ہو اور اپنے ساتھ اپنے دوسرے بھائیوں کی امداد کے لئے بھی کوشش کرتا ہو۔ بیشک دونوں حضرات غار سے سلامت نکل آئے لیکن قریش کا گراں بہا انعام عرب کے ان لوگوں کے لئے کتنا بڑا لالچ ہو گا جو معمولی سے لالچ میں بڑے سے بڑے جرائم کا ارتکاب کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ ان کا تعاقب اپنی جگہ یقینی تھا۔

پھر قریش اور اہلِ عرب تو رسول اللہ ﷺ کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ ان میں سے ہر شخص صحرا نشینی کے اثر سے قتل و خون کا ایسا دلدادہ تھا کہ ان کا مدمقابل اگر نہتا بھی ہے تو بھی ان کی آتش غضب انہیں قتل کئے بغیر نہیں بجھتی تھی۔ یہ تھیں وہ وجوہات جن کی بناء پر رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ انتہائی محتاط طریقہ سے سفر فرما رہے تھے۔ یوں کہئے کہ ان کی آنکھیں، کان اور دل سب کے سب انہیں خطروں پر حفاظتی نگاہ

رکھے ہوئے تھے۔

سراقہ بن جعشم

رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ پورے حفظ و احتیاط کے ساتھ محو سفر تھے کہ کسی مسافر نے قریش کو خبر دی کہ ابھی ابھی فلاں راستہ پر تین اونٹنیاں سوار اس طرف جاتے ہوئے دیکھ آیا ہوں۔ کہیں یہ رسول اللہ ﷺ اور ان کے ساتھی نہ ہوں؟ اس موقع پر سراقہ بن جعشم بھی تھا۔ خبر سنتے ہی اس کی نیت بدل گئی۔ مگر دوسروں کو بہکانے کے لئے کہا۔ میں ابھی ابھی ادھر سے ہی آیا ہوں وہ راہیں فلاں قبیلہ کی راہگزر ہیں۔ غرض سراقہ کا مقصد سو اونٹ خود حاصل کرنا تھا۔ وہ تھوڑی دیر دوسروں کو اپنی بات سچ ثابت کرنے کے لئے وہیں بیٹھا رہا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ لوگوں کو میری بات کا یقین آگیا ہے وہ گھر آیا اور مسلح ہو کر اپنے ہوا رفتار گھوڑے پر سوار ہوا۔ دوسروں کی نظروں سے بچ بچا کر گھوڑے کو اس راہ پر ڈال دیا جس کی نشاندہی مسافر نے قریش کے سامنے تھوڑی دیر پہلے کی تھی۔

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اریقط ایک چٹان کے سایہ میں بیٹھے ہوئے تھے تاکہ کھانا تناول فرمالیں اور ہو سکے تو کچھ دیر آرام فرما کر تازہ دم ہو لیں۔ سورج زوال سے نکل کر مغرب کی طرف محو سفر ہو چکا تھا۔ سید الکونین علیہ الصلوٰۃ والسلام اور ان کے ساتھی سفر کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک دونوں نے سراقہ کو حد نظر تک دیکھا۔ سراقہ کا گھوڑا اس سے پہلے بھی دو بار راستے میں ٹھوکر کھا کر گر چکا تھا لیکن سراقہ کے دماغ میں سو اونٹوں کا لالچ ناچ رہا تھا۔ کامیابی سامنے دیکھی تو دل میں سوچا کہ اول تو دونوں کو قید کر کے ساتھ لے جاؤں گا اور اگر انہوں نے مدافعت کی تو موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ اس نے پورے جوش کے ساتھ گھوڑے کو چابک مارا تاکہ وہ تیز ہو کر ہوا کی طرح ان پر لپکے لیکن گھوڑا اس طرح الف ہوا کہ سراقہ اس کی پشت سے گر کر زمین پہ اوندھا گرا۔ اس موقعہ پر سراقہ کے اسلحہ نے بھی اسے تکلیف دی۔

اب کے سراقہ کی نگاہوں میں گھوڑے کا پہلے بھی دو مرتبہ گرنا گھوما۔ اس کے دماغ میں اچانک خیال آیا کہ فال اچھی نہیں۔ میرے دیوتا اس بات پہ خوش نہیں جس بات کی تکمیل کے لئے میں یہاں آیا ہوں۔ اب اس کے دل نے کہا۔ اب تم نے ان پر ہاتھ ڈالا تو تمہاری اپنی جان کی خیر نہیں۔ اس کے ساتھ ہی انتہائی ادب کے ساتھ ہاتھ باندھے سامنے کھڑے ہو کر بلند آواز سے کہا۔

صاحب ۔۔۔۔۔۔ میں سراقہ بن جعشم ہوں۔ مجھے کچھ عرض کرنے کی اجازت دیجئے۔ واللہ میں آپ کو کسی فریب میں نہیں ڈالنا چاہتا۔ نہ ہی آپ کو کوئی تکلیف دینا چاہتا ہوں۔

سراقہ کو دیکھتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کھڑے ہو گئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سراقہ کو بات کرنے کی اجازت دی۔ اس نے عرض کیا۔ مجھے آنے والے وقت میں امان کا وثیقہ لکھ دیجئے تاکہ میرے اور آپ کے درمیان تمسک کے طور پہ کام آسکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہڈی یا چمڑے پر وثیقہ لکھ کر سراقہ کے حوالے کیا۔ وہ الٹے پاؤں واپس ہوا اور راستے میں جو بھی اسے ملا۔ اسے بھی سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ لے لیا تاکہ کوئی بھی شخص ان عالی مرتبت مہاجروں کے درپے آزار نہ ہو سکے۔ گویا تھوڑی دیر پہلے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دشمن جان تھا' اب وہ ان کی جان کا محافظ بن چکا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وادی تہامہ کی کڑکتی چلاتی دھوپ میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ منزل بہ منزل محوِ سفر تھے۔ ریت آگ کے شعلوں کی طرح تپ رہی تھی۔ دور دور تک نہ کوئی ڈھلوان نہ سایہ نہ کوئی سایہ دار درخت دور دور تک نظر آتا تھا۔ دشمن اگر ادھر آ نکلے تو سر چھپانے کی کوئی جگہ بھی نہیں۔ اگر کوئی سہارا تھا تو صرف صبر و رضا جو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں دیا تھا یا ایمان کی اس سربلندی کے سبب جو اس وحی کی بدولت نصیب ہوئی جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اتارا۔

مسافر لگاتار سات دن تک جھلسا دینے والی دھوپ کی گرمی میں چلتے رہے اور اسی طرح پوری سات راتیں صحرا کی تہہ پر ان کا سفینہ ریت (اونٹ) چلتا رہا۔ اور وہ شب کی تاریکی میں آسمان پر چمکتے تاروں کو دیکھ کر اپنے آپ کو یہ کہہ کر تسکین دیتے کہ ایک نہ ایک دن ہماری دعوت بھی اس اندھیرے خاکدان (سرزمین پر) نورِ کامل بن کر پھیل جائے گی۔

قبیلہ بنی سعد

چلتے چلتے یہ دو نفوس مقدسہ پہ مشتمل قافلہ بنی سہم کے خیموں کے قریب پہنچ گیا۔ قبیلہ کے سردار بریدہ اسلمی نے تو خندہ پیشانی سے استقبال کیا۔ جس سے دونوں کے دلوں کا خوف اطمینان و سکون میں بدلا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے آنے والی غیبی مدد کا اور یقین

بڑھ گیا۔ اب مدینہ یہاں سے "قاب قوسین او ادنیٰ" سے بھی زیادہ قریب تر تھا۔

مسلمانانِ مدینہ کا شوق انتظار

کل تک یثرب کہلانے والی بستی اب مدینہ منورہ کے نام سے بدل گیا ہے۔ اب اس بستی سے دکھ جڑ سے اکھڑ کر تباہ ہو گیا۔ اب یہ مدینہ طیبہ ہے۔ اس مدینہ طیبہ میں ہجرت کر کے آنے والے مسلمان اور انصار کو مکہ سے مسلسل خوفناک خبریں آ رہی تھیں۔ ان میں یہ خبر بھی پہنچ چکی تھی کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی گرفتاری یا قتل کا انعام سو اونٹ دینے کا اعلان کیا ہے چنانچہ اس بنا پر مسلمان رسول اللہ ﷺ اور ان کے رفیقِ سفر ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے چشم براہ تھے۔ ایک اور شخ ایک ذرہ زیارت اور بات چیت کے شوق میں گھڑیاں گن گن کر گزار رہا تھا۔ جن لوگوں نے ابھی تک نبی اکرم ﷺ کی زیارت نہ کی تھی صرف تبلیغ کی بنا پر اسلام لے آئے تھے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کی جرات، شجاعت، مکارم اخلاق، اسوہ حسنہ سن سن کر اور زیادہ دیدار کے مشتاق تھے۔

مدینہ منورہ میں اسلام کی ترقی

اس کی وضاحت کے لئے دو واقعات لکھے جاتے ہیں۔ جناب سعد بن زرارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جناب معصب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے چند مسلمانوں بھائیوں کے مجمع میں بنی ظفر کے باغ میں تشریف فرما تھے۔ سعد بن معاذ اور اسید بن حضیر کو جب ان کی یہاں موجودگی کی خبر ملی تو حسد کی آگ ان کے دلوں میں بھڑک اٹھی۔ سعد اور اسید اپنی قوم میں ممتاز مقام بھی رکھتے تھے۔ سعد نے اسید سے کہا کہ ان دونوں مسلمانوں نے ہمارے ضعیف الاعتقاد بھائیوں کو ورغلا کر اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔ سعد بن زرارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرے خالہ زاد بھائی ہوتے ہیں۔ میں رشتہ داری کی وجہ سے ان کے سامنے زبان نہیں کھول سکتا آپ وہاں جا کر سعد کو سمجھایئے۔ کہ اس کا انجام ان کے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔ اسید نے ایسا ہی کیا۔

معصب رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ ذرا تشریف رکھیں میں ان کو جو کچھ سمجھا رہا ہوں آپ بھی سنئے۔ اگر پسند آئے تو قبول کیجئے گا ورنہ آپ کی مرضی لیکن سب کچھ سننے کے بعد اسید کے منہ سے بے ساختہ نکلا بے شک آپ نے انصاف کی باتیں کیں۔ اسکے بعد اسید اپنا عصا زمین میں گاڑ کر زمین پہ ہی بیٹھ گئے اور اس کے بعد اٹھے تو مسلمان ہو کر اٹھے! سعد کے پاس واپس آئے تو چہرے پر غصہ کی جگہ دوسرا ہی رنگ تھا۔ پہلے وہ صرف سعد تھے اب وہ مستقبل میں رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن گئے۔ سعد نے سمجھ لیا۔ ان پر بگڑے اور خود معصب بن عمیر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حلقہ کی طرف بڑھے تاکہ انہیں تبلیغ دین سے روکیں لیکن معصب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہر حرف صداقت کی روح تھا ان کے دل میں بھی اتر گیا اور وہ بھی وہاں سے اٹھے تو مسلمان ہو کر اٹھے۔

قبیلہ بنی عبدالاشہل

سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہاں سے اسلام لانے کے بعد سیدھے اپنے قبیلہ کے پاس پہنچے اور ان سے ہم کلام ہو کر ان سے دریافت فرمایا

اے بنی عبدالاشہل تم لوگ مجھے کیسا آدمی جانتے ہو؟

سب نے بیک زبان کہا۔ سعد آپ ہمارے سردار ہیں اور ہم پر مہربان آپ ہم سب سے زیادہ صائب الرائے ہیں، ہمارے نگہباں ہیں!

یہ سب سن کر سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔ تو سن لو اگر تم لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے تو میرے لئے تم لوگوں کے ساتھ بات چیت سلام و کلام حرام ہے۔

اپنے سردار کا یہ اعلان سن کر قبیلہ بنی عبداللہ شہل بچے، بوڑھے، جوان مرد اور عورتیں کے سب کے سب اسلام لے آئے اسی طرح ہجرت سے پہلے اس خوش نصیب بستی مدینہ طیبہ کے رہنے والوں میں اسلام کی مقبولیت اور مسلمانوں کے وقار و اکرام کا جو سکہ بیٹھ رہا تھا۔ وہ قریش کے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ سابقہ یثرب کے مشرکین کو مسلمان بتوں کی حقیقت سمجھانے کے لئے کیا کیا انداز اختیار کرتے تھے ایک واقعہ کی وضاحت کے لئے کافی ہے!

عمرو بن الجموع کے معبود منات کا حشر

مدینہ کے معزز لوگوں میں عمرو بن الجموع کا شمار ہوتا ہے۔ وہ قبیلہ بنی سلمہ کے سردار تھے، لکڑی کا بت دستور کے مطابق ان کے گھر میں گڑھا رہتا تھا۔ چند مسلمان نوجوانوں نے انہیں بہت سمجھایا بزرگوار یہ منات کا مجسمہ' یہ بت' بے جان ہے۔ اس کی پوجا چھوڑ دیجئے مگر وہ نہیں مانے، نوجوانوں کو نئی ترکیب سوجھی ایک رات وہ اس بت منات کو ان کے گھر سے اٹھا لائے اور شہر کے بیت الخلا کی گندگی میں الٹا گاڑ دیا۔ صبح ہوئی تو عمرو بن الجموع بہت پریشان ہوئے اس کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا' ڈھونڈ لیا۔ مگر دھو دھلا کر پھر رکھ دیا۔ دن بھر ان کے منات کو چرا کر لے جانے والوں کو دل ہی دل میں کوستے رہے۔ دوسری رات پھر نوجوانوں نے یہی کیا اور گندگی میں الٹا گاڑ دیا۔ اب عمرو کو بہت غصہ آیا۔ مگر کسی

کو کہیں کیا آخر کار ایک روز تنگ آکر عمرو بن الجموع نے اس بت کے گلے میں تلوار لٹکا دی اور سامنے کھڑے ہو کر عرض کیا۔ ان کان فیک خیرا" فامتنع انهذالسیف معک

"اے میرے معبود اگر تمہارے اندر کوئی غیرت ہے قوت ہے تو ان نابکاروں سے بدلہ لیجئے۔ میں یہ تلوار آپ کے گلے میں لٹکا دیتا ہوں" صبح کو اٹھے تو منات پھر غائب تھا۔ آج ان کا مجسمہ منات ایک کنوئیں میں کتے کی لاش کے ساتھ پڑا ہوا ملا۔ تلوار غائب تھی۔ لوگ ادھر ادھر سے جمع ہوئے۔ مسلمانوں نے عمرو بن الجموع کو پھر سمجھایا۔ وہ مسلمان ہو گئے۔ عمرو کی سمجھ میں آگیا کہ بت پرستی انسان کو اس پستی کے بھنور میں پھنسا دیتی ہے۔ جس سے وہ اپنی انسانی قدر و عظمت کو کھو دیتا ہے۔

مدینہ منورہ اور اسلام

ان واقعات سے آپ مدینہ منورہ میں دین اسلام کی مقبولیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایسے میں یہاں کے مسلمان کس قدر وفورِ شوق سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کے لئے بے قرار ہوں گے۔ جب سے انہوں نے کہ سرور کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام مکہ سے مدینہ طیبہ آنے کا فیصلہ فرما چکے ہیں تب سے وہ لوگ ہر روز فجر کی نماز کے بعد شہر سے نکل کر بلند ٹیلوں پر کھڑے ہو کر بیٹھ کر ادھر ادھر دیکھتے رہتے لیکن جب دھوپ پورے شباب پر آجاتی تو مجبوراً گھروں کو لوٹ آتے۔

ورودِ مسعود

مدینہ طیبہ (شہر) سے 6 میل باہر ایک علیحدہ بستی کا نام قبا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب سے پہلے وہاں تشریف لائے۔ یہاں چار روز تک قیام فرمایا اس وقفہ قیام میں یہاں ایک مسجد تعمیر فرمائی۔ مسجدِ قبا اسی کا نام ہے۔

علی ابنِ طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آمد

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جن لوگوں کی امانتیں ان لوگوں کو لوٹانے کے لئے دی تھیں، ان سب کو امانتیں ادا کر کے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی قبا میں ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچ گئے۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ تھکا دینے والا سفر دو ہفتوں میں طے کیا۔ دن میں کہیں چھپ کر بیٹھے رہتے، صرف رات کی تاریکی میں چلتے اور اسی راہ پر چل کر آئے جس راہ کے ذروں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قدم بوسی کا شرف

حاصل ہوا تھا۔ گویا آج علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ اپنے مسلمان بھائیوں میں آ ملے۔

مدینہ طیبہ میں تشریف آوری

یثرب (اب مدینہ منورہ) کے مسلمان بدستور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے انتظار میں آنکھیں اور دل بچھائے راہ تک رہے تھے کہ سب سے پہلے ایک یہودی کی نگاہ پڑی اور اس نے بلند آواز سے کہا۔ یا بنی قیلہ ھذا صاحبکم قد جاء اے بنی قیلہ (اوس و خزرج پہ مشتمل قبیلہ کا نام) کے لوگو۔۔۔۔ تمہارے سردار تشریف لے آئے! جمعہ المبارک کا دن تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وادی رانونا کی مسجد میں صلوٰۃ جمعہ پڑھائی۔ سابقہ یثرب آج سے مدینہ طاہرہ طیبہ۔ مدینہ الاسلام مدینہ المحمد کے لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کے لئے گھنے بادلوں کی طرح امڈ آئے۔ آج ان کی بستی میں صداقت و امانت دیانت و سیادت اعلیٰ صفات و عادات اخلاقِ حسنہ کا مصدر و منبع ہستی وارد ہو گئی جس کی رسالت پر اسے دیکھے بغیر اس خوش نصیب بستی کے لوگ ایمان لے آئے تھے اور جس پر ہر صلوٰۃ میں ہر لمحہ درود و سلام بھیجتے تھے۔ آج مدینہ کے لوگوں کو اپنے محبوب رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت نصیب ہو گئی۔

قیام و دعوت کا اصرار

گو یہاں کے ہر مسلمان نے اپنے غریب خانہ پہ قیام اور دعوت کی التجا فرمائی مگر نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا یہ میرے اختیار میں نہیں، راستہ چھوڑ دو۔ میرے اللہ کا حکم جہاں ہو گا وہیں میری اونٹنی بیٹھ جائے گی اور اسی زمین کے مالک میرے میزبان ہوں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عصباء نامی اونٹنی کی مہار اس کی گردن پہ رکھ دی۔ اونٹنی نے مدینہ منورہ کی گلیوں میں ایک خاص انداز سے قدم اٹھانے شروع کئے۔ مسلمان اسے چاروں طرف سے حلقہ میں لئے ہوئے راستہ چھوڑتے جا رہے تھے۔

مشرکینِ مدینہ اور یہود حیرت زدہ تھے

یثرب کے یہود اور مشرکین اپنے شہر کے ایک طبقہ کی حیاتِ نو کی تمہید دیکھ کر حیرت میں ڈوب گئے۔ انہیں تعجب تھا کہ اوس و خزرج جو کل تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، آج وہ اس ہستیٔ عظیم کے مبارک قدموں سے لپٹنے کے لئے ایک دوسرے سے شیر و شکر بن کر کس طرح فرشِ راہ بن رہے ہیں۔

آہ مدینہ طیبہ کے کچھ نامحرمان، رازِ فطرت کے اس کمالِ جمال کو دیکھ کر بھی کچھ سمجھ

نہ سکے کہ آج سے صفحۂ ہستی پر تاریخ کا وہ باب لکھنا شروع ہوا ہے جو دنیا کے تمدن و ارتقاء کی اصل روح ثابت ہو گا۔ آج سے خود ان کے شہر مدینہ کی عزت، عظمت وجاہت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ جب تک اس دنیا کا قیام ہے تب تک اس شہر اس مدینہ الرسول ﷺ کا نام جس زبان پر آئے گا اس کا دل عقیدت سے جھک کر اس پر سلام کا ہدیہ پیش کرے گا۔ چنانچہ "عصباء" اونٹنی اپنی ہی موج میں جھوم کر چلتے ہوئے جس طرف چاہا قدم بڑھاتے ہوئے چلی۔ آخر ایک باڑے میں آ کر رک گئی۔ جو قبیلہ بنو نجار کے دو یتیم بچوں کی ملکیت تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ خود بخود بیٹھ گئی۔ رسول ﷺ کجاوہ سے اترے۔ ارشاد فرمایا۔ اس باڑہ کا مالک کون ہے؟ معاذ بن عفرا نے عرض کیا۔ قبیلہ بنی عمرو کے دو یتیم بچے سہل اور سہیل اس کے نالک ہیں۔ لیکن میں انہیں آپ کے لئے رضامند کر لوں گا۔ انہیں امید تھی کہ رسول اللہ ﷺ اس باڑہ میں مسجد تعمیر فرمائیں گے۔ چنانچہ نبی رحمت ﷺ نے یتیموں سے یہ زمین خریدی اور اس میں مسجد اور اپنی رہائش کے لئے حجرے تعمیر فرمائے!

ابتدائی دور مدینہ منوّرہ

ابتدائی دور مدینہ منورہ

عظیم المرتبت رسول اللہ ﷺ کا عدیم المثال استقبال

گزشتہ یثرب اور آج سے مدینہ طیبہ کا رہنے والا ہر مشرک، مسلم، منافق، یہود، عیسائی سب محمد ﷺ کے استقبال کے لئے گھروں سے نکل آئے۔ کہیں مردوں کا ہجوم ہے تو کہیں عورتوں کا جمگھٹا۔ ہر ایک نگاہوں کو فرش بنائے کھڑا ہے۔ اہلِ مدینہ میں ہجرت کی وجوہات سے آگاہ ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو ہجرت سے روکنے کے لئے قریش نے کیسی ہولناک کوششیں کیں، آپ ﷺ کی گرفتاری اور قتل پر انعام دینے کا اعلان کیا اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ کو سفر میں کتنی مصیبتیں سہنا پڑیں۔ اہلِ مدینہ کو اس بات کا بھی علم تھا کہ تہامہ کی آگ برساتی چٹانیں جو سورج کی گرمی سے دوزخ کا نمونہ بن جاتی ہیں، ان سے گزر کر مہاجر عظیم علیہ الصلوٰۃ والسلام مدینہ طیبہ میں تشریف لائے ہیں۔

آج رسول اللہ ﷺ کی زیارت کے لئے اہلِ مدینہ کے دل میں کیسے کیسے خیر سگالی جذبات کے دریا ابل رہے ہیں، ضبطِ تحریر نہیں ہو سکتا مدینہ طیبہ کا ہر شہری اپنے اپنے انداز سے ہجرت کے مقصد کو متعین کر رہا ہے۔ ہر صاحب عقل و ہوش کو اس بات کا بھی علم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ دین نے لوگوں کے آبائی عقیدہ کو بدل دیا ہے۔ آپ کے حسنِ اخلاق، تقدس تعلیم کا ہر شہری معترف ہے، لیکن میرے خیال میں اہلِ مدینہ کے والہانہ استقبال کی وجہ صرف یہی بات نہیں بلکہ یہ احساس بھی تھا کہ آپ ﷺ اپنے باپ دادا کا وطن چھوڑ کر اس شہر کو اپنا وطن بنانے آئے ہیں۔ مدینہ کا ہر باشندہ سیاسی، اجتماعی اور دوسرے ایسے ہی تصورات کی روشنی میں آپ کی زیارت کو ضروری سمجھ رہا ہے۔ ذرا ان کی رسالت اور آثار کو دیکھا جائے، ان کے متعلق ہمارے خیالات کس حد تک صحیح ہیں۔ مہاجرین انصار کے مجمع میں یثرب کے یہود اور اربابِ شرک کے تصورات بھی اسی خیال کے ارد گرد گھوم رہے ہیں، ہر ایک شخص کے دل کی دھڑکن اس کے ضمیر سے پوچھ رہی ہے کہ وہ اس پر شکوہ مہاجر کی زیارت کے

لئے اس قدر بے قرار کیوں ہے؟

اور جب رسول اللہ ﷺ نے اپنی ناقہ (اونٹنی) کی مہار ہاتھوں سے چھوڑ کر اپنی اونٹنی کی گردن پہ رکھ دی تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے جہاں حکم ملے وہیں خود بیٹھ جائے! تو ہجوم کا نظامِ رفتار بدل گیا۔ لوگ دوسری گلیوں سے گزر کر ناقہ کے سامنے آئے تاکہ لوگ اس مقدس چہرہ کو جلدی دیکھیں جو اپنی جائے پیدائش مکہ میں عقبہ الکبریٰ کی بناء پر جو ہمارے شہر کے رہنے والوں سے یہ عہد (بیعت) لے چکا ہے کہ اگر اس کی حفاظت میں بلاحیل و حجت کسی قوم سے لڑنا بھی پڑے تو وہ قدم پیچھے نہیں ہٹائیں گے اہل مدینہ ایسی مافوق البشر (سید البشر) علیہ الصلوٰۃ وسلام ہستی کی زیارت کے لئے بے چین تھے جس نے توحید کی ترویج کے لئے اپنے وطن و یاران وطن دونوں کو چھوڑ دیا۔ یہی نہیں بلکہ تیرہ برس تک نعمتِ توحید اہلِ مکہ کی قسمت کو مالا مال کرنے کے بدلے ان کا جبرو تشدد سہا۔

مدینہ منورہ میں تعمیر مسجد

سرورِ دو عالم ﷺ کی ناقہ (اونٹنی) سہل و سہیل کے باڑہ میں پہنچ کر خود بخود بیٹھ گئی اور یہ زمین رسول اللہ ﷺ نے مالکانِ اراضی سے خرید کر اس میں مسجد کی تعمیر شروع کر دی! رسول اللہ ﷺ خود پتھر اور گارا سر پہ اٹھاتے مہاجرین کے ساتھ انصار بھی اس مشقت میں آپؐ کے قدم بقدم شریک رہے۔

مسجد تیار ہو گئی تو اس کے ساتھ ہی رہنے کے لئے حجرے بھی تعمیر کئے گئے ان کی تعمیر کے دوران کسی پر معاونت کے لئے دباؤ نہیں ڈالا گیا بلکہ یہ رسول اللہ ﷺ اور انصار مہاجرین کے خلوص کا نتیجہ تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے سب کچھ تعمیر ہو گیا اور یہی صداقتِ اخلاص ہی تعلیمات اسلامی کی اصل روح ہے۔

مسجدِ نبوی ﷺ

پتھر کی سلیں گارے سے جما دی گئیں۔ چھت کی باری آئی تو کھجوروں سے اسے دو حصے میں تقسیم کر دیا گیا ایک حصہ پہ چھت ڈال دی گئی اور دوسرے حصہ کو بغیر چھت کے چھوڑ دیا گیا۔ ایک بہت بڑا صحن جس کا ایک حصہ بے گھر مہاجر مسلمانوں کے رہنے کے لئے مخصوص کرایا گیا۔ کئی سال تک مسجد نبوی میں چراغ جلانے کی نوبت نہیں آئی بعض دفعہ کھجور کے خشک پتے جلا کر روشنی کی جاتی البتہ آخری عہد میں مسجد کے ستونوں میں چھوٹے چھوٹے خانے کھود کر ان میں چراغ رکھ دیئے گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے جن حجروں میں سکونت اختیار فرمائی تھی ان کی بھی یہی حالت رہی۔ البتہ حجروں میں پردوں کا اہتمام ضرور کر لیا گیا تھا۔

جب تک یہ سب مکمل نہیں ہوا تب تک نبی اکرم ﷺ ابو ایوب (خالد بن زید) انصاری کے ہاں فرد کش رہے۔

تبلیغ توحید کا مرحلہ

اب رسول اللہ ﷺ نے اس مرحلہ پہ تبلیغ توحید پر توجہ دینا شروع کی جو آپ کے مدینہ منورہ آنے کا اصل مقصد تھا۔ لیکن یہاں آنے کے بعد مدینہ میں رہنے والوں میں کچھ انتشار سا محسوس فرمایا۔ قریش کے بر خلاف مدینہ کے مسلمان قبائل ایسی زندگی کے پیاسے تھے جس میں سکون اطمینان ہو۔ اس پر کوئی خارجی یا داخلی حادثہ اثر انداز نہ ہو۔ وہ اپنے سابقہ جنگ وجدال کے نتائج سے ڈرے ہوئے تھے اور اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ عزت عظمت اور دولت کے اعتبار سے مکہ کے مقابلہ مدینہ منورہ کو مقام ملے۔ رسول اللہ ﷺ اس قسم کے امتیاز کو ذہن میں لانا تک گوارا نہیں فرماتے تھے۔ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ کا اول و آخر مقصد صرف اور صرف منصبِ رسالت کو کما حقہٗ ادا کرنا تھا۔ جس کا عہد وہ اپنے اللہ عزوجل سے کر چکے تھے۔ جس کے لئے نبی اکرم ﷺ نے اہلِ وطن کے ساتھ بعثت کے پہلے لمحہ سے لیکر مسلسل تیرہ سال تک ہولناک اذیتوں کا مقابلہ کیا۔ اہلِ مکہ کے ظلم و جبر سے ڈر کر وہاں کے عوام توحید کی نعمت قبول کرنے سے کتراتے رہے۔ جس کی وجہ سے ان کے دل جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ اور سچ پوچھو تو ایمان کا مزاج یہی ہی ہے کہ اگر وہ دل میں پوری طرح نہ اترے تو معمولی سے معمولی تکلیف اور امتحان بھی اسے شکست دے سکتا ہے۔

جب تک مسلمان خود امن کی زندگی نہ گزارے غیر مسلم بھی امن کی زندگی نہیں گزار سکتا لہٰذا سب سے پہلے مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ اس کی زندگی پر امن ہو۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جو شخص ہدایتِ نبوی ﷺ کا فرماں بردار ہو کر دین اسلام میں داخل ہو جائے وہ ہر قسم کے فتنہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ جب مسلمان عملاً اس حقیقت کا حصہ بن جاتا ہے تو پھر اس کا ایمان مزید طاقتور ہو جاتا ہے اور جو لوگ ایمان لانے میں متردد ہونے کی وجہ سے ڈر کر اظہار ایمان نہ کر سکیں ان کا ایمان بذات خود ضعف کا شکار ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انہیں ایمانی قوت کے حصول کی تعلیم دی جائے۔

رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ کے ابتدائی ایام میں ہی اس مسئلہ پر غور فرماتے رہے کہ مستقبل قریب بعید میں دعوت دین کا مرکز یہی شہر رہے گا۔ لہٰذا ہمارے لئے آنحضرت ﷺ کی سیرت لکھتے وقت اسی کی اتباع لازم ہے۔

ظاہر ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلطنت' منصب اور مال میں سے کسی ایک کے حریص نہیں تھے۔ بلکہ ان کا بنیادی مقصد حیات یہ تھا کہ جو لوگ ان کی رسالت و توحید پر ایمان لائیں' پورے اطمینان و سکون کے ساتھ اپنی زندگی بسر کریں۔ انہیں بھی اپنے عقیدہ پہ قائم رہنے کی اتنی ہی آزادی ہو جتنی دوسرے لوگوں کو اپنے عقیدہ پہ قائم رہنے کی آزادی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیال میں اختیار و اظہار عقیدہ میں مسلمان' یہودی اور عیسائی سب برابر رہیں۔ لہٰذا جس طرح غیر مسلم افراد و طبقات کو اپنے عقیدے کی دوسروں کو دعوت دینے کا استحقاق ہے اسی طرح مسلمان بھی دنیا میں جہاں بھی ہیں اس استحقاق سے محروم نہ رہیں کیونکہ حقیقت کو اگر آزادی کے سائے میں فتح و نصرت حاصل ہو تو دنیا میں امن و امان کو فروغ حاصل ہو سکتا ہے۔ حقیقت کی آزادی کے خلاف سختی اور دباؤ دراصل باطل کی حمایت ہے اور اس دباؤ سے اندھیرے بادل پیدا ہو کر انسان کے دلوں کو ڈھانپ لیتے ہیں۔

آزادی انسان کا وہ استحقاق ہے جس کے ذریعہ وہ ازل سے لیکر ابد تک تمام کائنات سے اپنا رابطہ رکھ سکتا ہے اور عقیدہ کی آزادی انسانی معاشرہ میں اجتماعیت' محبت اور وحدت کا ایسا مضبوط واسطہ ہے جس کے بغیر یہ نعمت معاشرہ کو نصیب نہیں ہو سکتی اور اگر یہ نہ ہو تو معاشرہ جنگ و جدل اور قتل و غارت گری سے بچ نہیں سکتا۔

اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وحی الٰہی نے سب سے پہلے جس حقیقت کی اطلاع دی وہ صلح و آشتی کے لئے میلان اور جنگ و قتال سے نفرت تھی۔ البتہ اگر ایسی مجبوری ہو کہ مسلمان کو دوسروں کی طرح آزادیٔ رائے یا اظہار عقیدہ اور دعوتِ عقیدہ کی آزادی حاصل نہ ہو تو جنگ ضروری ہو گی۔

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں جنگ کرنے سے بچتے رہے۔ جس کی مثال مکہ میں بیعتِ عقبہ کا واقعہ ہے ــــــــــــ آپ کو سابقہ سطور کا متن یاد ہو گا جب اہلِ مکہ میں سے کسی نے اس بیعت کو چپ چاپ چھپ چھپا کر سنا اور پھر قریش کو دہائی دی شور مچایا۔ اس اعلان جنگ کی صورت میں بیعت کرنے والوں میں سے عباس بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس ذات پاک نے آپ کو اپنا سچا نبی بنا کر اس دنیا میں بھیجا ہے اس کی قسم اگر آپ فرمائیں تو ہم دن نکلنے کے ساتھ ہی اہلِ مکہ پر تلواریں سونت کر چڑھائی کر دیں؟ جس کے جواب میں نبی شفقت و محبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

اللہ کی طرف سے ہمیں حکم نہیں دیا گیا۔

چنانچہ بعد میں بھی "جہاد" کا پہلا حکم "مدافعت" ہے۔ "حملہ" نہیں ارشاد ہے۔

اذن للذین یقاتلون بانهم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر (29:22)

اس کے بعد اس مدافعانہ جہاد کے بارہ میں ایک دوسری آیت نازل ہوئی، ارشاد ہے۔

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنہ ویکون الدین کلہ للہ (39:8)

اس حکم ہی کی اتباع میں رسول اللہ ﷺ اپنے متحارب ہم عصر لوگوں سے اپنے فرماں برداروں کے لئے اظہار و اختیارِ عقیدہ میں آزادی کے طالب تھے۔ جب تیرہ سال تک یہ حق نہیں دیا گیا تو مجبوراً" اس مقصد یا حق کو حاصل کرنے کے لئے جنگ کو جائز قرار دیا گیا۔ بلکہ فرض کر دیا گیا تاکہ غیر مسلم ان کے فرماں برداروں کو ان کے عقیدہ سے باز رکھنے کی جابرانہ کوششوں سے باز آ جائیں۔

قیامِ مدینہ کے بعد

مکہ سے ہجرت فرمانے کے بعد جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ میں مقیم ہو گئے اور اہلِ مدینہ جنھوں نے آنحضرت ﷺ کا انتہائی خندہ پیشانی سے استقبال کیا تھا وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ تو اس وقت جتنے گروہ وہاں موجود تھے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

(1) مسلمانوں میں مہاجرین اور انصار

(2) اوس و خزرج میں سے مشرک اور بت پرست جن میں باہم ایک دوسرے کے قبیلہ سے دشمنی تھی۔

(3) یہود جو چار حصوں میں مشتمل تھے۔

الف۔ مدینہ کے اندر بنی قینقاع

ب۔ فدک میں بنو قریظہ

ج۔ شہر سے باہر ایک ملحقہ آبادی میں آباد بنو نضیر

د۔ مدینہ سے شمال کی سمت خیبر میں دوسرے قبیلوں کے یہود

مہاجر اور انصار تو دینِ اسلام کے رشتے میں پرو چکے تھے ان میں مضبوط اتحاد تھا بلکہ وحدتِ فکر اور وحدتِ عمل کی وجہ سے سیسہ پلائی دیوار کی طرح تھے مگر رسول اللہ ﷺ ان کے معاملہ میں فطرتِ انسانی کے تقاضوں کی روشنی میں اکثر متفکر رہتے تھے وہ سوچتے تھے کہ کہیں ان کی پرانی دشمنی پھر ابھر نہ آئے جیسے کہ ایک دفعہ ہوا۔

صورتحال یہ تھی کہ مشرکینِ اوس و خزرج کو ماضی کی باہم لڑائیوں نے تھکا رکھا تھا لیکن اب ان کی حیثیت یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان دیوار کی سی تھی۔

لیکن مشرکین و یہود اپنے اپنے نقطہ نگاہ سے اپنی خیریت کے خواب دیکھ رہے تھے، اوس و

خزرج کے مشرکین کی نگاہ میں مسلمانوں اور یہودیوں میں جنگ ان کے لئے مفید تھی۔

اور یہودی جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا تھا ان کے دل میں یہ منصوبہ پرورش پا رہا تھا کہ آنحضرت ﷺ کو اپنا حلیف بنا کر عرب کے ان مسیحیوں سے بدلہ لیں جنہوں نے ان کی برگزیدہ جماعت کو ارضِ مقدس (فلسطین) سے دھکیل کر باہر نکال دیا ہے۔

فراستِ نبوت علیہ الصّلوٰۃ والسلام

لیکن فراستِ نبوت سب سے منفرد و ممیّز ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی فراست سابقہ تمام انبیاء کرام سے الگ تھی۔ انہوں نے اسے بڑی گہری نگاہ اور دور اندیشی کے بعد اس انداز سے مرتب فرمایا کہ اس کی عملی صورت دیکھ کر کوئی صاحب عقل و ہوش اسے خراج تحسین پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

آپ ﷺ کی فراستِ نبویہ نسل آدم و حوا کو ایسی وحدت میں منسلک کرنا چاہتی تھی جس کا عرب کو کبھی وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ سوائے اس کے کہ زمانہ ماضی میں یمن کا خطہ ایک مرتبہ وحدت کی جھلک دیکھ چکا تھا۔ مگرچہ نسبت خاک را باعالم پاک! رسول اللہ ﷺ کی فراست وحدت صرف عرب کے خطہ تک محدود نہیں تھی۔ آپ ﷺ تاقیامت تمام دنیا کے انسانوں اور جنوں کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ لہٰذا انکی نگاہ فراست نسل آدم و حوا جہاں کہیں بھی ہو سب کو وحدتِ عقیدہ توحید و رسالت میں مضبوط و مربوط دیکھنا چاہتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے خصوصی مشیر جن کو اپنا وزیر بھی فرمایا کرتے تھے، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ دونوں کو فرمایا۔

میری تمام جدوجہد اس لئے ہے کہ تمام مسلمان بلاتفریق وطن اور قبیلہ اسلام کے رشتہ میں تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے جائیں اور سابقہ تمام عداوتیں دلوں سے نکال کر پھینک دیں۔

قیامِ مواخات

چنانچہ سب سے پہلے نبی اکرم ﷺ نے انصار اور مہاجرین کو ایک جگہ جمع کیا اور ان مواخات (بھائی بندی) قائم فرما دی۔

سب سے پہلے خود کو علی ابن ابی طالب کا بھائی بنایا۔ یہ مواخاۃ تو دراصل مکہ میں ہی طے تھی۔ اسی طرح حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ مکہ میں ہی اپنے غلام زید کو اپنے بھائی کا اعزاز دے چکے تھے۔ اسی طرح کچھ اور بھی تھے جو مکہ معظمہ میں منہ بولے بھائی بن چکے تھے۔ ان کو اسی طرح قائم رکھا گیا لیکن مدینہ منورہ میں انصار اور مہاجرین میں بھائی بندی (مواخات) اس طرح

ہوئی۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ---------- حضرت خارجہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ---------- حضرت عتبان بن مالک انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مختصر یہ کہ بھائی بندی کو الگ الگ درجوں میں تقسیم کیا گیا۔ مواخات کے دوسرے درجہ میں مہاجر و انصار کے درمیان بھائی بندی کا رشتہ قائم فرمایا۔ یہ رشتے ایک نسل اور ایک نسب ہونے کے مترادف تھے۔ چنانچہ اس قیام مواخات سے سب مسلمان ایک وحدت میں بندھ گئے۔

مہاجرین کی غیرت مندی

انصارِ مدینہ مہاجرین سے انتہائی اعلیٰ حسن سلوک سے پیش آئے۔ ان کے پاس جو کچھ تھا وہ مہاجرین کی خدمت میں پیش کرتے۔ مہاجرین قبول تو مجبوراً کر لیتے لیکن دل میں اللہ سے دعا مانگتے۔ اللہ ہم کو بھی اس قابل بنا کہ ہم بھی اس کا عوض ان بھائیوں کو دے سکیں اس کی وجہ یہ تھی کہ مہاجرین میں ایسے لوگ بھی تھے جو مکہ کے رئیس کہلاتے تھے مگر جب یہ مدینہ میں چھپ چھپا کر آئے تو بالکل کنگال تھے البتہ مہاجرین میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ساتھ سب کچھ لے آئے تھے لیکن بعض دوسروں کا حال تو یہ تھا کہ ایک ایک دانہ کو ترستے تھے۔ جیسے کہ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا۔ میرے پاس سدِ رمق یعنی آخری سانس بچانے کے لئے بھی کچھ نہیں لہٰذا آپ مدد فرمائیے! مہاجرین میں سے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور انصار میں سے سعد بن الربیع میں بھائی بندی قائم ہوئی تو سعد بن الربیع نے اپنے مال کا پورا پورا نصف لا کر سامنے رکھ دیا مگر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔

آپ مجھے اس مال کی جگہ بازار کا راستہ بتا دیجئے۔ چنانچہ انہوں نے بازار میں پنیر اور مکھن کا خوانچہ لگانا شروع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کی دین ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف چند ہی دنوں میں اس قدر امیر ہو گئے کہ ان کے اونٹ مالِ تجارت لیکر مدینہ منورہ سے باہر شام وغیرہ آنے جانے لگے۔ چنانچہ عبدالرحمٰن بن عوف نے یہاں اسی اثناء میں نکاح بھی کر لیا۔

یہ ایک ہی کیا مہاجرین میں اکثر تجارت میں اتنے ماہر تھے کہ مدینہ منورہ کے انصار خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی تاجرانہ مہارت کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے۔ "آپ لوگ تو صحرا کی ریت کو سونے میں بدل سکتے ہو"

مہاجرین کی مشقت و زراعت

اور اہلِ مکہ میں جو حضرات مدینہ تشریف لا کر تجارت شروع کرنے سے رہ گئے انہوں نے

انصار کی زمینوں میں کاشت کاری اور زراعت شروع کر دی۔ مثلاً ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سب نے کاشت کاری اور زراعت کا پیشہ اختیار کر لیا۔ ان کے علاوہ جن حضرات کے ساتھ ان کے غلام تھے وہ ان کی مدد سے زراعت کر کے ان کے لئے اور اپنے لئے روزی حاصل کرتے۔ مہاجرین کا تیسرا گروہ جو تجارت اور زراعت دونوں میں سے کسی پر بھی حاوی نہیں تھا نہایت تنگدستی اور غریبی میں دن گزارنے لگا۔ لیکن غیرت کا یہ حال تھا کہ اپنی ناداری یا مفلسی کسی پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ وہ اس بات پہ خوش تھے کہ مسلمان ہونے کے بعد مکہ میں انہیں جتنے دکھ دیئے گئے ان کے مقابلہ میں مدینہ میں آکر اطمینان و سکون کی زندگی اللہ تعالیٰ نے بخشی ہے۔ اس کا شکر ہے۔ یہاں ان کے عقیدہ کی وجہ سے ان پر کوئی نکتہ چینی تو نہیں کر سکتا۔

اصحابِ صفہ

چوتھا گروہ وہ تھا جو عربستان کے مختلف حصوں سے مسلمان ہو کر مدینہ منورہ پہنچے یا مدینہ پہنچ کر مسلمان ہوئے۔ ان کی مفلسی کا یہ عالم تھا کہ سر چھپانے کی جگہ تک نہ تھی۔ ان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد میں ہی ایک جگہ مخصوص کر دی تھی جس کی چھت پڑ چکی تھی۔ چونکہ اسی حصہ کا نام ہی صفہ تھا اس لئے اس میں رہنے والوں کا لقب ہی اصحابِ صفہ مشہور ہو گیا۔ ان لوگوں کا بسیرا بھی یہیں ہوتا۔

مواخات کے فوائد کا تجزیہ

(1) رسول عالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو قیامِ مواخات کے سبب مکمل اطمینان قلب حاصل ہو گیا۔

(2) مدینہ کے منافق اور یہود جو اوس و خزرج کے درمیان پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کر رہے تھے وہ سب ناکام ہو گئیں۔

(3) مدینہ کے انہی منافقوں نے مہاجرین اور انصار میں بھی پھوٹ ڈلوانے کی مذموم کوششیں شروع کر دی تھیں۔ قیامِ مواخاۃ نے ان کی سازشوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

یہودِ مدینہ سے تعلقات

مدینہ کے یہودی اور علماء اور باعزت اشخاص کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اچھے تعلقات استوار فرمائے تھے جس کی بنیاد ان کا اہلِ کتاب اور موحد ہونا تھا۔ چنانچہ ایک خاص تقریب صوم جسے یہود اہلِ کتاب پابندی سے ادا کرتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ان کے دلوں میں اور

قربت پیدا کرنے کے لئے اس روز کا صوم اختیار فرمالیا۔ اس طرح ایک اور وجہِ اشتراک قبلہ کی سمت بھی تھی۔ ایک مدت تک مسلمان بھی قیامِ صلوٰۃ میں بیت المقدس کو جہتِ قبلہ مانتے تھے جو یہودیوں کی نگاہ میں دینی برکات کا مبداء اور منتہیٰ ہے۔

اور اہلِ کتاب یا مشرکین کی مسلمانوں کی طرف قربت یا دوستی کے لئے پیش قدمی کی سب سے بڑی وجہ رسول اللہ ﷺ کا حسن سلوک تھا۔ آپ کی ملنساری' انکساری' تواضع' ہر فرد سے لطف و محبت مہربانی اور مسکراتے چہرہ سے پیش آنا تھا۔

اہلِ کتاب یہود مدینہ سے بڑھتے ہوئے روابط کے بعد نبی اکرم ﷺ نے یہ سوچا کہ یہاں مکمل امن و امان کے لئے ان کے ساتھ ایک تحریری معاہدہ ہونا چاہئے جو طرفین (یعنی مسلمانوں اور غیر مسلمان) دونوں کے لئے فائدہ مند ہو اور دونوں کے حقوق کا منصفانہ محافظ بھی۔

نبی اکرم ﷺ کی یہ سوچ اپنے دامن میں کتنی عظیم افادیت لئے ہوئے تھی اس کا اندازہ انسانی دماغ کی رسائی سے باہر ہے جس کا ثبوت اس کے بعد آنے والے زمانے کی تاریخ نے پیش کیا۔

خاتم المرسلین ﷺ اور آپ کا طریق ہدایت

رسول اللہ ﷺ اور آپ سے پہلے کے انبیاء و رسل کے طریق ہدایت میں کافی واضح فرق ہے۔ مثلاً نبی اکرم ﷺ سے پہلے انبیاء و رسل کے طریقِ ہدایت کی دو صورتیں ہوتی تھیں۔

(1) سب سے پہلی صورت جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کا مناظرہ فرعون سے اور ابراھیم علیہ السلام کا نمرود سے ہوا یا اپنی قوم اور باپ سے۔

(2) دوسری صورت تھی معجزہ۔ موسیٰ علیہ السلام کا عصا اور ید بیضاء اور ابراھیم علیہ السلام کا نمرود کی آگ کا آرام دہ بن جانا۔

سابقہ انبیاء کرام اپنے بعد اپنے قابلِ اعتماد افراد کو ان کی شریعت کی ترویج و اشاعت سونپ جاتے اور وہ اسے پوری تندہی سے سرانجام دیتے بلکہ بعض حالات میں سیاسی حربوں کا بھی استعمال اپنے دین و عقیدہ کی حفاظت کے لئے کر گزرتے۔ اکثر دفاعی صورت میں خونریزی یا جیسا بھی موقع ہوتا اس میں کودنے سے گریز نہ کرتے۔

حضرت مسیح کے حواری

مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد آپ کے حواریوں نے دین کی تبلیغ میں کافی صعوبتیں

جھیلیں۔ یہاں تک کہ روم کا عیسائی بادشاہ ان کا معاون بن کر سینہ سپر ہو کر آگے بڑھا اور اس نے عیسویت کے عقیدہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ اس کی شریعت کی ترویج کا فرض ادا کرنے میں بھی کوئی دقیقہ فرو گزاشت نہ کیا بلکہ میرے خیال میں دنیا کے تمام مذاہب کی ترویج کچھ اسی انداز سے ہی ہوئی ہے۔ اس سلسلہ میں مشرق و مغرب کسی ملک کی کوئی تخصیص نہیں، سب جگہ یہی حال رہا۔

لیکن خاتم المرسلین ﷺ کی وہ واحد شخصیت ہے جسے خصائص نبوت کے ساتھ یہ خصوصیت بھی حاصل ہے کہ اللہ کے دین اسلام کی ترویج و اشاعت دونوں کی بیک وقت ذمہ داری آپ ہی کی مرہونِ منّت ہے۔ اور آپ ہی کے ہاتھوں سے بغیر کسی اور کی معاونت کے کلمۂ حق کو نصرت و یاوری نصیب ہوئی۔ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے رسول بھی تھے۔ دور اندیش عادل سیاست دان، ماہر نفسیات، مجاہد اور فاتح بھی تھے۔ بلاشبہ وہ اللہ تعالیٰ کے دین کی ترویج کے لئے کلمہ حق کی بلندی کے لئے مبعوث ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک ایک صفت آپ کی ذات میں بدرجۂ کمال موجود تھی۔ جس کا ثبوت آپ کے قول و فعل سے واضح ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حالات کی تمام نزاکتوں کے پیشِ نظر مہاجر اور انصار کے درمیان ایک تحریری معاہدہ (میثاق مدینہ) مرتب فرمایا۔ اس معاہدہ میں یہود کو بھی شامل کر لیا گیا۔ جس کی رو سے انہیں اپنے دین پر قائم رہنے میں پوری آزادی دی گئی اور ان کے مال و جائیداد کی باہمی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈال دی گئی۔

معاہدہ کا متن

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ معاہدہ محمد ﷺ کی نگرانی میں مندرجہ ذیل طبقات اور قبائل میں ضابطۂ تحریر میں آیا۔

مہاجر مسلمان (قریش مکہ) اور انصار (مدینہ کے مسلمان اور مذکورہ فریقین کے ساتھ جتنے بھی غیر مسلم طبقات یا گروہ ملحق ہیں) ان کے درمیان مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ یہ معاہدہ طے پایا۔

1۔ مہاجرین و قریش ایک ہی جماعت ہیں۔

2۔ مہاجرین جو قریش مکہ میں سے ہیں یہ فوجداری جرائم کے ارتکاب پر اپنے آدمیوں کی طرف سے (دوسروں کو اور خود آپس میں بھی) مقررہ دیت یا خون بہا ادا کرنے کے پابند ہوں گے۔

3۔اور اگر ان کے کسی آدمی پر کسی شخص نے ایسا ظلم کیا جو فوجداری کی شق میں آ سکتا ہے تو وہ اس کی دیت یا خون بہا وصول کرنے کے مستحق بھی ہوں گے۔

اور فدیہ یا دیت کی صورت میں قریش اور ان کے مقابل ہر دو فریق کو ادا کردہ رقم یا مال کے عوض میں اپنے آدمی کو قید سے رہا کرانے کا حق ہو گا۔

4۔مدینہ کے رہنے والوں میں بنو عوف کے حقوق کا ویسا ہی لحاظ رکھا جائے گا جیسا ان میں پہلے سے رائج ہے۔ جس کے مطابق انہیں دیت اور خون بہا لینے اور ادا کرنے کی پابندی کرنا ہو گی۔ اس معاملہ میں کسی فریق کو کسی پر ترجیح یا برتری حاصل نہیں ہو گی۔

(اس کے بعد نبی اکرم ﷺ نے انصارِ مدینہ کے ہر قبیلہ کا نام فرداً فرداً لکھوایا۔ مثلاً بنو حارث' بنو ساعدہ' بنو حشم' بنو نجار' بنو عمرو بن عوف اور بنو السیب)

5۔ادائے دیت اور خون بہا دینے کی صورت میں مسلمان اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے کوئی اور راستہ نکالنے کی کوشش نہ کریں گے۔

6۔کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے غلام پر قبضہ نہیں کرے گا۔

7۔مسلمانوں کا فرض ہے کہ اگر ان میں سے کوئی مسلمان کسی اپنے یا بیگانے پر زیادتی کرے تو سب مل کر ایسے شخص کو سزا دیں گے اگرچہ سزا دینے والوں میں سے مجرم کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو

8۔ مسلمان ایک دوسرے کو کسی کافر کی طرف داری میں قتل نہ کریں گے' نہ مسلمان کے خلاف کسی کافر کی نصرت کریں گے۔ اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری سب کے لئے برابر (مساوی) ہے۔

9۔یہودیوں میں سے جو شخص ہمارے معاہدہ کی پابندی کا وعدہ کرے ہماری نصرت اور تعاون اس کے لئے بھی ہے۔ اس کے دشمن کے مقابلہ میں ہم اس کے کندھے سے کندھا ملا کر مقابلہ میں شریک ہوں گے۔

10۔مسلمانوں میں سب کا درجہ مساوی (برابر) ہے۔ اگر جہاد میں ایک مسلمان کسی دشمن سے صلح کرلے تو یہ صلح تمام مسلمانوں کو منظور ہو گی لیکن کوئی مسلمان عدل و انصاف کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ صلح نہیں کر سکتا۔

11۔غیر مسلمین کا جو لشکر ہمارے ساتھ شریک جہاد ہو گا وہ حسب نوبت مورچہ پہ آنے کا پابند ہو گا۔

12۔کافروں سے بدلہ لینے کے لئے مسلمان ایک دوسرے کی مدد کرنے کی پابند ہوں گے۔

13۔مشرکینِ مدینہ میں سے جو لوگ معاہدہ میں شریک ہیں ان میں سے کوئی شخص قریشِ مکہ میں سے کسی کے مال اور جان کو نہ تو پناہ دے گا اور نہ مسلمان کے مقابلہ میں مکہ کے کسی قریش کی

حمایت کرے گا۔

14۔اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو اس کے خلاف گواہی حاصل ہوئے بغیر قتل کر دے گا تو اس شخص سے قصاص لیا جائے گا یہ اور بات ہوگی کہ مقتول کے وارث قاتل کو معاف کر دیں یا دیت لینے پر رضامند ہو جائیں۔ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے ہمدردی کرنے سے ہاتھ نہیں روکنا چاہئے۔ تمام مومن ایک دوسرے کے دوست دار ہیں۔

15۔تمام مسلمان اس معاہدہ پر متفق ہیں اور وہ اس میں سے کسی دفعہ کا انکار نہیں کر سکتے جس مسلمان نے اس معاہدہ کا اقرار کر لیا وہ اللہ جل شانہ اور رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہے۔

16۔کسی مسلمان کو جائز نہیں کہ وہ کسی مجرم کو پناہ دے ایسے شخص پر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی لعنت اور غضب ہو گا اور اس کی کوئی نیکی قابل قبول نہ ہو گی اور نہ ہی قیامت کے روز اس شخص سے ایسے گناہ کے عوض میں کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا۔

17۔مسلمان اپنے باہمی اختلاف میں اللہ اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کے پابند ہیں۔

18۔اگر مسلمان جہاد میں اپنا مال خرچ کریں تو یہود کو بھی ان کے ساتھ اپنا مال خرچ کرنا ہو گا۔

19۔قبیلہ بنی عوف کے یہود بھی اس معاہدہ میں شامل ہیں۔ اگرچہ مسلمان اور یہودی ہر ایک اپنے اپنے مذہب پر قائم رہنے کا مجاز ہو گا لیکن مشترکہ مقاصد میں دونوں ایک جماعت کے حکم میں داخل ہوں گے۔

20 یہ مسلمان اور یہود دونوں کے غلام اپنے اپنے آقاؤں کے مطابق معاہدے میں داخل شمار کئے جائیں گے۔ شرکائے معاہدہ میں جو شخص ان دفعات کی خلاف ورزی کرے گا وہ اپنی ذات اور اپنے گھر بار کے نقصان کا خود ذمہ دار ہو گا۔

21۔(دفعہ نمبر 19 کے مطابق) مندرجہ ذیل یہودی قبائل بھی اس معاہدہ میں شامل سمجھے جائیں گے۔ یعنی بنو نجار۔ بنو حارث۔ بنو ساعدہ۔ بنو جشم۔ بنو اوس۔ بنو ثعلبہ۔ بنو جفنہ۔ بنو شغیبہ اور وہ لوگ بھی جو ان میں سے کسی قبیلے کے ساتھ مربوط ہیں۔ اس معاہدہ میں شامل سمجھے جائیں گے۔

22۔بنو ثعلبہ کے غلام بھی اس معاہدے میں شریک متصور ہوں گے۔

23۔اس معاہدے میں کوئی شخص جناب محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر مستثنیٰ قرار نہ دیا جائے گا۔

24۔ہر قاتل سزا کا مستحق ہو گا۔

25۔جو شخص کسی کو فریب سے قتل کرے گا اس کا ذمے دار اس کا اصل قاتل ہی ہو گا اور اگر وہ مفرور ہو گیا تو قاتل کے ورثاء سے انتقام لیا جائے گا۔

26۔ لیکن جب کوئی ظالم کسی مظلوم کے ہاتھ سے قتل ہو جائے تو یہ قتل پہلی صورت نمبر 25 سے مختلف ہو گا۔ (یعنی اس پر مواخذہ کم کر دیا جائے گا یا بالکل ساقط ہو گا)

27۔ کسی شخص کو اپنے حلیف کے جرم کی وجہ سے پکڑا نہیں جائے گا لیکن مظلوم کی داد رسی بہر صورت کی جائے گی۔

28۔ مسلمانوں کی لشکر کشی کی حالت میں یہود کو بھی ان کی مالی اعانت کرنا ہو گی کیونکہ حلیف کے لئے دفاع اپنے نفس کی حفاظت کے مطابق کرنا چاہئے جہاں تک کہ اس کی جانب سے ضرر نہ پہنچے یا اس سے کوئی جرم سرزد نہ ہو۔

29۔ حلیف کے مقدمات خود انہی کی طرف سے قابلِ سماعت متصور کئے جائیں گے۔

30 اس معاہدے کے مطابق طبقات و افراد میں سے جس شخص سے بھی خلاف ورزی ہوئی یا اس سے کوئی خطرہ لاحق ہو تو اسے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سامنے جوابدہ ہونا پڑے گا اور نفسِ معاہدہ کی حقیقی پابندی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر منکشف نہیں ہو سکتی۔

31۔ اس معاہدہ کے مطابق نہ تو قریش کو پناہ دی جا سکتی ہے نہ ان کے کسی مددگار کو۔

32۔ اگر مدینہ منورہ پر کوئی قوم حملہ کرے تو دشمن کی مدافعت میں سب کو مل کر حصہ لینا ہو گا۔

33۔ اگر مدینہ پر حملہ کرنے والا لشکر مسلمانوں سے صلح کرنا چاہے تو معاہدے کے شرکاء کو متفق ہو کر دشمن سے صلح کرنا ہو گی۔

34۔ اسی طرح اگر مسلمانوں کے سوا دوسرے شرکاءِ معاہدہ پر حملہ ہو اور وہ لوگ جن کی وجہ سے حملہ ہوا ہے دشمن سے صلح کرنا چاہیں تو مسلمان ان کے ساتھ اس معاہدہ کے پابند ہوں گے۔ الا یہ کہ اس معاملہ کے سوا جس میں شرکاءِ معاہدہ میں سے کسی کے دین پر زد پڑتی ہو۔

35۔ شرکائے معاہدہ میں ہر شخص کو اسی قدر استحقاق ہو گا جتنا حق اس کی قوم یا اس کے گروہ کے ساتھ طے کیا گیا ہے۔

36۔ قبیلہ اوس کو یہود اور ان کے غلاموں پر کوئی ترجیح نہ ہو گی۔

37۔ معاہدہ میں شریک ہونے والوں میں سے اگر کوئی شخص مدینہ میں اپنی سکونت رکھے یا اس کے باہر بسیرا کرے تو ارتکابِ جرم کے بغیر اس پر کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔

خاتمہ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر اس شخص کے لئے امن اور سلامتی ہے جو نیکی کا طالب اور اللہ عزوجل سے ڈرنے والا ہو!

یہ ہے وہ تحریری معاہدہ جس کا ہر لفظ انسانی معاشرہ کے سچے اور مخلص ہمدرد محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت و برکت عطا کرنے والی سوچ کا مرہون منت ہے۔ آج سے 1415 سال پہلے جس معاہدہ کی تحریر نے انسانی معاشرہ کو تاقیامت ایسا امن و سکون بخش ضابطۂ حیات دیا

جس کی پناہ میں رہنے والے ہر گروہ کو اپنے عقیدہ پہ قائم رہنے کا حق حاصل ہے۔ ایک ایسا ضابطۂ حیات جس نے انسانی زندگی کی حرمت قائم کر دی' انسانی معاشرہ میں ایک دوسرے کے مال و اسباب کو تحفظ بخشا ایسا ضابطۂ حیات جو ارتکاب جرم پر گرفت اور مواخذہ کا دباؤ قائم کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس معاہدہ میں شریک بستی (شہر مدینہ) اور اس میں رہنے والوں کیلئے امن کا گہوارہ بن گئی۔ غور فرمایئے اس معاہدہ نے معاشرہ کی سیاسی اور مدنی زندگی کو ارتقاء کی کتنی بلندیوں سے ہم کنار کر دیا۔ وہ معاشرہ جس کی سیاست و مدنیت پر ابھی تک لاقانونیت اور جبر و قہر کا ہاتھ مسلط تھا ہر طرف فساد و بلا کا دور دَورہ تھا۔۔۔ اب وہاں باہم رواداری' بھائی چارہ' مروت' ایثار اور وفا کے باغ لہلہانے لگے۔

ابتداء میں یہود مدینہ کے تین خاندان شریک معاہدہ نہ تھے۔ بنو قریظہ' بنو نضیر اور بنو قینقاع۔ لیکن کچھ دنوں کے بعد یہ بھی معاہدہ میں شریک ہو گئے۔

معاہدہ کی پابندی نے شہر مدینہ اور اس کے آس پاس کی بستیوں والوں کے لئے حدود معاہدہ کی زمین امن کی جگہ (حرم) بن گئی۔ ہر ایک کے دل میں یہ جذبۂ راسخ موجزن ہو گیا کہ اگر کسی نے ہمارے شہر پر حملہ کیا تو ہم میں سے ہر ایک اس کی حرمت کو قائم رکھنے کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے سے گریز نہیں کرے گا اور ہر ایک ہر اس معاملہ میں ایک دوسرے کی مدد کرے گا جس سے اس شہر کی عزت و رفعت کا دفاع ہو سکے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس معاہدہ کے بعد ایک طرف سے مطمئن ہو گئے۔ مسلمانوں کو بھی سکون حاصل ہو گیا۔ ہر شخص اپنے اپنے عقیدہ کے مطابق بغیر کسی کے دباؤ یا مخالفت کے عبادت کرنے میں مصروف ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے لئے پھر مکہ چلیں جہاں بعثت کا دسواں سال ہے۔ رمضان کا مہینہ ہے۔ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اللہ کو پیاری ہو چکی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی دو بیٹیوں اُم کلثوم رضی اللہ عنہا اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کی دیکھ بھال کی ذمہ داری ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن مظعون کی بیوی خولہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان بچیوں کی دیکھ بھال کے مدِ نظر دوسرے نکاح کا مشورہ دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبول فرمایا۔ اس کے فوراً بعد ام المومنین سودہ بنت زمعہ رضی اللہ عنہا (بیوہ) کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زوجیت کا شرف حاصل ہو گیا۔ اب وہ ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ چکی ہیں اور اسی طرح اس کے بعد مکہ معظمہ میں حضرت عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا جنہیں کمسنی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاح میں آنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ ان کی رخصتی ہوئی اور آپ کو اُم المومنین سودہ بنت زمعہ کے حجرہ میں اتارا گیا۔ اس وقت آپ کی عمر دس یا گیارہ سال ہو گی۔ آستانۂ نبوت علیہ

السلام پہنچے، تو بھی بچپن کے کھیلوں کا شوق ان میں موجود تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ ان کے بچپن کے شوق دیکھ کر نہ تو کبیدہ خاطر ہوتے اور نہ ہی ان میں دخل اندازی فرماتے۔

زکوٰۃ روزہ اور حدود

اس درمیان میں مسلمانوں کو امن و عافیت سے زندگی گزارنے کا موقع ملا۔ زکوٰۃ، روزہ اور حدود (تعزیرات) بھی فرض کر دیئے گئے۔ جن سے مدینہ منورہ میں اسلام کی شوکت کا سماں بندھ گیا۔

اذان

قیامِ صلوٰۃ کا حکم تو پہلے ہی سے نافذ ہو چکا تھا لیکن مدینہ منورہ میں آنے کے بعد بھی مسلمان قیامِ صلوٰۃ کے لئے وقت پر ایک جگہ جمع ہو جاتے لیکن اب رسول اللہ ﷺ کے دل میں خیال آیا کہ مسلمانوں کو قیامِ صلوٰۃ کے لئے جمع کرنے کی غرض سے بوق (بگل) استعمال کر سکتے ہیں۔ مگر یہ خیال فوراً ترک کر دیا گیا اور ناقوس کی تجویز پیش ہوئی۔ جس سے نصاریٰ اپنی عبادت کا اعلان کرتے ہیں۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے مسلمانوں کے مشورے سے اسے بھی ترک کر دیا گیا۔ دوسری روایت میں ہے کہ وحی کے اشارے سے ناقوس کا خیال تبدیل ہوا اور "اذان" کا مشورہ متفقہ طور پہ مقبول ہوا جس کے لئے آنحضرت ﷺ نے

قم مع بلال! فالقہا علیہ اے صیغہ الاذان فلیوذن بہا فانہ اندی صوتا منک

اے عبداللہ! بلال سے کہئے وہ اذان کہیں اور آپ ان کے قریب کھڑے ہو کر کلماتِ اذان دہراتے جائیں، تمہاری آواز کے مقابلے میں بلال رضی اللہ عنہ کی آواز زیادہ گونج دار ہے۔

مکبر مسجد سے باہر

مسجد نبوی ﷺ سے ملا ہوا بنو نجار کی ایک محترمہ کا مکان تھا۔ جو مسجد سے اونچا بھی تھا۔ اس وجہ سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اس کی چھت پر کھڑے ہو کر اذان دی۔ اس طرح مدینہ منورہ کے مسلمان ہر فجر کو اسلام کی دعوتِ صلوٰۃ اذان کی صورت سنتے۔ ایک خوش گو شخص جو اپنی انتہائی رسیلی آواز میں رک رک کر اذان کے کلمات ادا کرتا اور فضا میں گھومنے والی لہریں ان کلمات کو مدینہ منورہ کے ہر شخص کے کانوں تک پہنچا دیتیں۔

اذان۔ اللّٰہ اکبر۔ اللّٰہ اکبر، اشہد ان لا الہ الا اللّٰہ۔ (دو بار) اشہد ان محمد رسول اللّٰہ، (دو بار) حی علی الصلوٰۃ، حی علی الفلاح۔ (دو بار) اللّٰہ اکبر اللّٰہ اکبر، لا الہ الا اللّٰہ

اذان کے ہر لفظ کے مفہوم نے مسلمانوں کے دلوں میں اتر کر ان کے عقیدے اور عمل کو اللہ

تعالیٰ کے سوا باقی سب سے نڈر بنا دیا۔ اب وہ دن بھی آ گیا جب یثرب کا نام مدینہ منورہ مدینہ طیبہ مشہور ہو گیا اور شہر کے غیر مسلم باشندوں کو یقین ہو گیا کہ مدینہ منورہ کے رہنے والے سب سے زیادہ طاقتور ہیں اور ان کی طاقت کی بنیاد ان کا ایمان ہے جس ایمان کی حفاظت کے لئے وہ ہر وقت سینہ سپر رہتے ہیں۔

ہجرت سے پہلے جن خوفناک حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مسلمانوں نے اپنے ایمان کی حفاظت کی تھی غیر مسلموں کے ذہن میں موجود تھا۔ اب مدینہ منورہ کے رہنے والے غیر مسلموں کے سامنے وہی لوگ اپنی پوری قوتِ ایمان اور استقامت کے ساتھ احکامات اسلام بجا لاتے نظر آ رہے تھے۔ خود مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات اچھی طرح نقش ہو چکی تھی کہ کسی انسان کو کسی انسان پر کوئی برتری حاصل نہیں، عبادت کا حقیقی مستحق اللہ وحدہ لاشریک ہی ہے۔ تمام انسان، تمام قوتیں اس کے سامنے بے حقیقت ہیں۔ البتہ وہ لوگ یقیناً قابل احترام ہیں جنہوں نے حسن نیت کے ساتھ اچھے اخلاق کا عملی مظاہرہ سابقہ زندگی میں کیا۔ مذکورہ وقفہ میں رسول اللہ ﷺ کو دین اسلام کی تعلیم پھیلانے میں سازگار مواقع میسر آئے۔ خصوصاً آپ کے کردارِ اعلیٰ سے جو آپ کی گفتار کا عملی مظاہرہ تھا اور اسے ہم بلامبالغہ اسلام کی اساس قرار دے سکتے ہیں۔

اسلامی تمدن کا پہلا پتھر

رسول اللہ ﷺ نے اسلامی تمدن کی بنیاد باہم ایثار و محبت قرار دیتے ہوئے فرمایا۔ لا یومن احدکم حتی یحب الاخیر ما احب لنفسہ۔

تم میں سے کسی شخص کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں کہلا سکتا جب تک وہ کسی دوسرے بھائی کی خیر خواہی ایسی ہی نہ کرے جیسی وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

حتیٰ کہ نبی اکرم ﷺ نے اس محبت و ایثار میں ایسی مہربانی اور لطف کی تعلیم سمو دی کہ اس پر عمل پیرا ہوتے ہوئے کسی کو کسی قسم کی تکلیف و زحمت کا احساس نہ ہو۔ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت فرمایا۔ اسلام میں پسندیدہ عمل کون سا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔

تعطم الاطعام و تقرء السلام علی من عرفت و من لم تعرف (حدیث)

بھوکوں یا حقداروں کے لئے کھانا کھلانے کا بندوبست کرنا اور جانے یا انجانے کو اسلام علیکم کہنے میں پہل کرنا۔

مدینہ منورہ میں پہلے خطبہ کا ایک حرف یہ ہے۔

من استطاع ان یقی وجہہ من النار ولو بشقہ فلیفعل ومن لم یجد فیکلمتہ فان بھا تجزی الحسنۃ عشر امثالھا

جو شخص اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچانا چاہتا ہے تو کھجور کے ایک دانہ سے بھی بچا سکتا ہے۔ اگر یہ بھی نہ ہو تو ایک میٹھا بول ہی سہی! ہر ایک نیکی کا اجر دس گنا ملے گا۔ (حدیث)

ایک اور حدیث پہ غور فرمایئے جو مدینہ منورہ کے دوسرے خطبہ کا حصہ ہے۔

اعبد اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا" واتقوہ حق تقاتہ واصدقو اللہ صالحا" ماتقولون وتحابو بروح اللہ بیاکم ان اللہ یغضب ان بینکث عہدہ۔

اللہ کے بندو صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس طرح کہ کسی اور کو اس کا شریک نہ جانو نہ مانو! اس وحدہ لاشریک ذات سے ڈرتے رہو۔ اس کی راہ میں سچائی کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ایک دوسرے سے پر خلوص محبت کرو۔ (یاد رکھو) اللہ تعالیٰ اس پر غضب ناک ہوتا ہے جو اس سے خود کیئے ہوئے عہد کو خود ہی توڑ ڈالے۔ (حدیث)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام صحابہ کرام کے فکرو عمل کی تربیت اسی تعلیم سے فرماتے۔

خطبہ میں قیام کا انداز

مدینہ منورہ میں ابتدائی دنوں خطبہ دیتے وقت قیام کی یہ صورت ہوتی تھی کہ حضورؐ مسجد کے دالان میں ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو جاتے۔

کچھ ایام کے بعد منبر بھی بنا لیا گیا جس کے تین درجے (تین سیڑھیاں نما) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیچے کے درجہ پہ کھڑے ہوتے اور تشریف فرما ہونے کی صورت میں اس کے اوپر دوسرے درجہ پر بیٹھ جاتے اور تیسرے درجہ کی دیوار سے ٹیک لگا لیتے۔

جیسے کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذریعہ تعلیم و تبلیغ صرف زبانی وعظ و نصیحت یا ہدایت و دعوت نہ تھی بلکہ اس کی اصل روح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ہر سانس، ہر حرکت و عمل، تبلیغ کا جامع اور کامل ترین نمونہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہونے کا اعزازِ اعلیٰ پانے کے باوجود دوسروں کے مقابلہ میں تفوق و برتری کے ہرگز خواہاں نہ تھے۔ ایک مرتبہ اسی بارہ میں فرمایا۔

لا تطرونی کما اطرت النصاری ابن مریم انما انا عبداللہ فقولو عبداللہ و رسولہ

جس طرح نصاریٰ نے ابن مریم کو تعریف میں مبالغہ کر کے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے متعلق بھی تم یہی طریقہ اختیار کر لو۔ یاد رکھو میں اللہ تعالیٰ کا بندہ ہوں، مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہو!

ایک دن آستانۂ نبوت علیہ السلام سے ٹیک لگائے ہوئے تشریف لائے۔ اصحاب دیکھتے ہی استقبال کے لئے سروقد کھڑے ہو گئے۔ فرمایا۔

لاتقوموکماتقوم الاعاجم یعظم بعضھم بعضا

ایک دوسرے کے لئے استقبال کی خاطر عجمیوں کی طرح کھڑے ہو جانا اچھا نہیں ایسا مت کرو۔

اصحاب اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب بھی کسی مجلس میں تشریف لاتے تو جہاں جگہ مل جاتی وہیں تشریف فرما ہو جاتے۔

کبھی کبھی اصحاب کے ساتھ مزاح بھی فرماتے۔ ان کی گفتگو میں بھی شریک ہو جاتے' کمسن بچوں کے ساتھ ان کے کھیل میں شریک ہو جاتے۔ بچوں کو اکثر گود میں بٹھا لیتے۔ عوام کے ساتھ حسنِ سلوک اشراف ہوں یا غلام کنیز ہو یا مسکین جو شخص بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہم کلام ہونا چاہتا' خندہ پیشانی سے پیش آتے۔ شہر میں دور سے دور تیمار داری کے لئے تشریف لے جاتے۔ دوسروں کی طرف سے دعوت قبول فرمانے میں مائل نہیں فرماتے تھے۔ ملاقات کے وقت مصافحہ کرنے اور السلام علیکم کہنے میں پہل فرماتے۔ قیام صلوٰۃ میں مشغول ہیں اور کوئی شخص قریب آ کر بیٹھ گیا تو اس خیال سے کہ بیٹھنے والے کی کوئی ضرورت نہ ہو' قیامِ صلوٰۃ میں کمی فرما دیتے۔ دریافت فرماتے اور اس کی ضرورت پوری کرنے کے بعد پھر قیام صلوٰۃ میں مشغول ہو جاتے۔ نزولِ وحی' تذکیر اوقاتِ خطبہ کے سوا ہمیشہ عوام سے گھل مل کر باتیں کرتے۔

گھریلو زندگی

اپنے اہلِ خانہ میں بھی آپ کا کردار مثالی اور عظیم ہے۔ ان کے کاموں میں ہاتھ بٹاتے۔ اپنی پوشاک خود دھو لیتے۔ پیوند لگانا ہوتا تو خود اپنے دستِ مبارک سے لگا لیتے' بکری کا دودھ دوہ لیتے' اپنے جوتے سی لیتے' اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرتے' اپنی اونٹنی کو خود باندھتے' خادم کے ساتھ کھانا کھا لیتے' اپنے گھر یا اپنی ضرورت پر دوسروں کی ضرورت کو ترجیح دیتے۔ چاہے خود کو کتنی ہی تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہو۔ گھر میں کوئی چیز خوردنی ہو یا نقدی جمع نہیں فرماتے تھے۔ اور تو اور وفات کے بعد معلوم ہوا سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی ذرہ بکتر گھریلو ضروریات کے لئے ایک یہودی کے ہاں گرو فرما چکے تھے۔

تواضع اور تالیفِ قلوب اور مکافات کا یہ عالم کہ نجاشی کی طرف سے ایک وفد آیا تو ان کی خدمت کاری مہمان نوازی کا بوجھ خود اٹھایا۔ جب اصحاب نے اپنی خدمات پیش کیں تو فرمایا۔

انھم کانو الاصحابنا مکرمین وانی احب ان اکافئھم

اہل حبشہ نے میرے اصحاب پر مہربانی کی' میں اس مہربانی کا معاوضہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا ذکر خیر

ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد ان کا تذکرہ آ جاتا تو نہایت عمدہ پیرائے میں سیدہ رضی اللہ عنہا کے محاسن کا ذکر فرماتے' جس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتیں!

ماغرت من امراۃ ماغرت من خدیجہ لما اسمعہ بذکرھا

نبی اکرم ﷺ کی زبان مبارک سے خدیجۃ الکبریٰ کی تعریف سن کر مجھے جس قدر رشک آتا ہے کبھی کسی اور حرم رسول پر ایسا رشک نہیں آتا۔

ایک بار ایک محترمہ تشریف لائیں تو محمد رسول اللہ ﷺ اس سے انتہائی تواضع سے پیش آئے۔ اس کے چلے جانے کے بعد فرمایا۔ یہ بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ہاں آیا کرتی تھیں۔ پرانے تعلقات کا نباہ ایمان کی علامت سے ہے۔

بچوں کے ساتھ شفقت و محبت

قیام صلوٰۃ کے درمیان آپ کے نواسے آپ کے ساتھ کھیلتے رہتے اور آپ ان سے دامن بچانے کی کوشش تک نہ فرماتے۔ انہیں ناراض نہیں ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ جناب زینب کی دختر کو کندھے پر بٹھا کر صلوٰۃ کا قیام فرمالیا اور سجدہ میں جاتے ہوئے اس بچی کو زمین پر بٹھا دیتے پھر اٹھا لیتے۔

حیوانات کے لئے رحمت

بلاشبہ رسول اللہ ﷺ نے اولاد آدم و حوا کے درمیان برادری اور بھائی چارے کی روح سے بھرپور آفاقی معاشرہ کا آغاز فرمایا لیکن آپ کے لطف و کرم سے نسلِ انسان ہی فیض یاب نہیں بلکہ آپ کے الطاف و عنایات جانوروں پر بھی اسی طرح ہیں۔ بلی پناہ لینے کے لئے دروازہ کھٹکھٹاتی تو خود اٹھ کر دروازہ کھول دیتے۔ ایک مرتبہ پالتو مرغ بیمار پڑ گیا تو اس کی دیکھ بھال فرماتے رہے۔ اپنی سواری کی نشست کی پشت اپنی آستین سے خود سہلایا کرتے۔ جب ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے اپنی اونٹنی کو سختی سے تیز ہانکنا چاہا تو فرمایا۔ علیک بالرفق اس سے نرم سلوک کیجئے! اسی طرح جس سے بھی آپ کو معاملہ پڑتا وہی تادم آخر آپ کا مداح بن جاتا۔ علیہ الصلوۃ والسلام۔ رحمتِ دوعالم ﷺ کے مزاج مقدس میں مہربانی' نرمی اور لطف و کرم کا سبب آپ کی مالی زبوں حالی یا درماندگی ہرگز نہ تھی بلکہ تکلف اور تصنع آپ کی

فطرتِ عالیہ میں تھا ہی نہیں علیہ الصلوٰۃ والسّلام! یہی حال آپ کے ان تمام غلاموں کا تھا جنہوں نے رسالت مآب ﷺ کے دامنِ تعلیم و تربیت کو تھام لیا تھا۔

اسلامی تہذیب اسلامی تمدن دوسری قوموں کی تہذیب و تمدن سے بالکل مختلف ہے۔ اسلام ایسے تمدن کی تعبیرو تفسیر ہے جس میں عدل کو اخوت پر غالب کیا گیا ہے۔

فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم! (۲ : ۱۹۴)

اگر کوئی شخص تم پر زیادتی کرے تو اس زیادتی کو اس زیادتی کے برابر تم بھی اس سے بدلہ لے سکتے ہو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

ولکم فی القصاص حیوۃ یااولی الالباب۔ (179:2)

اے اربابِ دانش! جان کے بدلے میں جان لینا معاشرہ میں زندگی کی اہمیت رکھتا ہے۔

آپ کی تعلیم کا خاصہ یہ بھی ہے کہ اخوت اور ایک دوسرے پر احسان باہم رواداری کا دارومدار اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لئے ہونا چاہئے اور اس قسم کے خصائل و اطوار کا ظہور ایسے شخص سے مشاہدہ میں آنا چاہئے جس کا شعارو مزاج تقویٰ اور پرہیز گاری ہو۔

رسول اللہ ﷺ اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کا بحکمِ الٰہی ہجرت کا مقصد قریش مکہ کے دباؤ سے نکل کر ایسی آزاد فضا میں زندگی گزارنا تھا جس میں ہر مومن کسی دباؤ کے بغیر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کر سکے۔ کبھی کبھی نفس پر خواہشات کا غلبہ مادیت کی طرف جھکا دیتا ہے جس کی وجہ سے عقل پر شہوت چھا جاتی ہے اور اسی کے نتیجے میں زندگی کا رخ اصل مقصد سے ہٹ جاتا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو انسان طبعاً نفسانی خواہشات سے بے نیاز ہے بلکہ اس کی خواہش خود اس کی فرماں بردار ہے۔

آنحضرت ﷺ کی قوتِ حیات

نبی اکرم ﷺ کی زندگی کی قوت آپ کا مثالی کردار تھا۔ جس کی بناء پر ایک شخص آپ کی سخاوت اور عطا کو دیکھ کر یہ کہنے پہ مجبور ہے۔

ان محمد یعطی عطاء ومن لا یخشی فاقہ

رسول اللہ ﷺ کو تو سخاوت و عطا کے وقت اپنے فقرو فاقہ کا بھی خیال نہیں رہتا!

میں کہتا ہوں سرورِ کائنات پر خواہشات کا غلبہ ہونا ممکن ہی نہ تھا۔ آپ تو خواہشات پر قادرو حاکم تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ ﷺ کو مادیت سے کوئی لگاؤ ہی نہ تھا بلکہ

آپ میں تو یہ خوبی کارفرما تھی کہ آپ ہر لمحہ آس پاس کے عناصرو اشیاء کے حقائق پر تدبر فرماتے۔ ان کا ادراک و احاطہ کرنے میں لگے رہتے۔ آپ دیکھ لیجئے آپ کے پاس زندگی کے تعیش و آرام کے تمام سامان موجود تھے لیکن !

ا۔ بستر پر چمڑے کی توشک تھی جس میں کچھ سوکھی پتیاں بھری ہوئی تھیں۔

ب۔ پیٹ بھر کر کھانا جانتے ہی نہ تھے۔

ج۔ متواتر دو روز تک جو کی روٹی بھی دسترخوان پہ نہ آتی۔

د۔ عام غذائیں کھجوریں اور خاص مواقع پر جو کے ستو!

ہ۔ ثرید۔ (شوربے میں ڈوبے ہوئے روٹی کے ٹکڑے) جو آپ ﷺ اور اہلِ بیت کو کم نصیب ہوئے۔

و۔ اکثر فاقہ کی نوبت آجاتی جس کی وجہ سے بارہا شکم پر پتھر کی سلوٹی باندھ لیتے۔

بھوک کے غلبہ سے نجات حاصل کرنے کے لئے یہ (از الف تا واؤ) تو آنحضرت ﷺ کے عام معمول میں سے تھا۔ البتہ کبھی کبھی ان سے تیز غذا بھی تناول فرماتے۔ مثلاً بکرے کی ران، کدو، شہد اور حلوہ۔

لباس

سادگی اور کم کھانے کا معمول صرف طعام و غذا ہی کی حد تک محدود نہ تھا بلکہ لباس کے معاملہ میں بھی یہ عالم تھا کہ کسی بی بی نے آپ کی ضرورت دیکھ کر ایک چادر پیش کر دی اور اسی وقت ایک صاحب نے اپنی میت کے لئے مانگ لی تو آپ ﷺ نے فوراً اتار کر دے دی۔

لباس میں ایک قمیض اور اون یا سوت یا سنی (ٹاسہ) کی چادر اور ایک یمنی قبا تھی جسے آپ ﷺ صرف وفود سے ملاقات کے وقت زیب تن فرماتے۔ البتہ نجاشی نے ایک مکلّف جوتا اور سراویل (از قسم شلوار) ہدیہ کے طور پر ارسال کیا تھا۔ کبھی کبھی ان دو کا استعمال بھی فرما لیتے تھے۔ اگرچہ اس قسم کا زہدو تقویٰ احکاماتِ دین میں شامل نہیں۔ (لیکن امت کے لئے سادہ زندگی گزارنا اتباعِ سنت کے تحت دین ہی کی حیثیت رکھتا ہے۔ مترجم)

ارشاد ہے۔ کلوا من طیبات ما رزقناکم۔ ہماری عطا کی ہوئی پاکیزہ چیزوں کو کھایا کرو۔ (81:20)

وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الاخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک۔ (77:28)

حدیث میں فرمانِ نبوی ہے۔

احرث لدنیاک کانک تعیش ابدا واعمل الاخرتک کانک تموت غدا"
دنیا سے جائز فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ خیال کر لو کہ تمہیں ہمیشہ ہی زندہ رہنا ہے۔ مگر آخرت کو بھی مت بھولو اور یاد رکھو کہ کل تمہیں مرجانا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا دلی ارادہ اپنے کردار سے ایسی مثالی زندگی گزارنے کا نمونہ پیش کرنا تھا جسے ہر قسم کا انسان اختیار کر سکے۔ چاہے وہ ضعیف ہو یا توانا۔ میری زندگی اور میرے کردار کو دیکھ کر اسے اختیار کرے تو اس پر احساسِ محرومی غالب نہ آئے۔ اور دنیا کا مال و اسباب زیب و زینت اور جاہ و منصب جو عام حالات میں غیر مقبول لوگوں کی برتری کا سبب سمجھے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے دل میں ان سب کو حاصل کرنے کا شوق ہی ابھرنے نہ پائے۔ جب معاشرہ اخلاقی طور پہ اتنا بلند ہو جائے اور اس معیارِ بلندی کو نبی رحمت ﷺ نے اپنے عمل اور اعلیٰ کردار سے بنیادی سہارا دیا ہو جو خلوص و اتحاد پر قائم ہو۔ ریا اور فریب سے بالکل پاک و صاف ہو۔ عدل اور محبت دونوں سے ایک دوسرے کو امداد ملتی ہو۔ ظاہر ہے کہ انسان کی فطرت عدل و محبت دونوں کی حریص ہے اور اسلام میں عدل و محبت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ اس کے بعد عفو کا درجہ ہے' یعنی درگزر کا مقام ہے۔

لیکن اسلام ایسے عفو (یا معافی) کی اجازت نہیں دیتا جس سے عدل و انصاف غیر یقینی ہو جائے۔ اسلام ایسی مہر و محبت کا قائل نہیں جس کا استعمال صحیح اور درست موقعہ محل پر نہ ہو۔ جس سے صحیح اصلاح اور صحیح توازن کا قیام زخمی ہو جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے جس معاشرہ کو قائم فرمایا۔ اسے آپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اس روایت کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ ایک بار علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ آپ کی سنت کیا ہے۔ فرمایا۔

فتہ راس مالی لعقل اصل دینی والحب اساسی والشوق مرکبی وذکر اللہ والقتہ کمری والحزن رفیقی والعلم سلاحی و دائی وا ضاء غنیمتی والفقر فحری والزھذقتی والیقین قوتی والصدق فیعی والطاعتہ حسبی والجہاد خلقی وقرتہ عینی فی الصلوٰۃ!

میری دولت معرفت ہے۔ میرے دین کی بنیاد عقل ہے۔ محبت میرے کام کی اساس ہے۔ شوق میرا مرکب (سواری) ہے۔ اللہ کی یاد میری ہم دم ہے۔ اعتماد میرا خزانہ ہے۔ غم رفیقِ زندگی ہے۔ علم اسلحہ ہے۔ صبر چادر ہے۔ رضا مالِ غنیمت ہے۔ فقر فخر ہے اور زہد میری صفت۔ یقین میری قوت ہے۔ صداقت میری شافع ہے۔ عبادت میرے لئے سببِ کفایت ہے۔ جہاد میری فطرت ہے۔ اور قیامِ صلوٰۃ میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے!

نور اسلام پھیل گیا

اب مدینہ اور اس کے گردو نواح میں رسول اللہ ﷺ کی نورانی تعلیم کے اجالے پھیلنے لگے۔ لوگ جوق در جوق دین اسلام میں داخل ہونے لگے تو مشرکین اور منافقین کے دلوں پر ہیبت چھانے لگی۔ ان کے دل میں چھپا ہوا باطل پسندی کا چور گھبرایا۔ انہوں نے معاہدہ کے بارہ میں دوبارہ سوچنا شروع کر دیا۔ انہیں اپنے ارادوں کی لاش نظر آنے لگی جن کے تحت انہوں نے مستقبل میں مسلمانوں کی امداد حاصل ہونے کے بعد عیسائیوں سے انتقام لینے کے منصوبے بنائے تھے۔ اس کے علاوہ یہ غم ان پر سوار ہونے لگا کہ مسلمانوں کی قوتِ اتحاد تو دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور ہم اس کے سامنے صفر ہوتے جا رہے ہیں۔

تقابلی جائزہ

رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کسی کے بارہ میں بھی بدگمانی سے دور رہتے ہوئے اپنے ماضی پر غور فرمانے لگے۔ تقابلی جائزہ لیتے ہوئے آپ نے غور فرمایا کہ مسلمانوں کے ساتھ قریش مکہ کا رویہ کتنا المناک تھا۔ مجھے اور میرے متبعین (فرماں بردار مسلمانوں) کو وطن سے نکلنے پہ مجبور کیا۔ مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کے لئے کیسے کیسے ظلم کئے بعض کو برگشتہ کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔ یہ سوچتے سوچتے نبی اکرم ﷺ کی سوچ میں یہاں کے یہودی بھی ابھرنے لگتے۔ انکا رویہ دین اسلام کے بارہ میں کیسا ہوگا؟ کہیں یہ بھی قریش کی طرح دین اسلام کی تعلیم کے لئے سدِّ راہ تو ثابت نہیں ہوں گے یا مسلمانوں کے سائے میں رہ کر یکسوئی کے ساتھ اپنی تجارت اور دولت کمانے میں ہی مصروف رہیں گے۔ رسول اللہ ﷺ کے دل میں اکثر یہ خیال بھی آتا کہ یہود کو میری نبوت کا یقین کیسے آئے؟ جبکہ انہوں نے دل میں یہی گانٹھ باندھ رکھی ہے کہ بنی اسرائیل کے سوا کسی اور قوم میں نبی آ ہی نہیں سکتا۔

عبداللہ بن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اس اثناء میں یہودِ مدینہ کے سب سے بڑے علامہ عبداللہ بن سلام نے نبی رحمت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ دین اسلام قبول کر لیا اور اپنی قوم کی کج فہمی کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ میرے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے سے پہلے آپ میری قوم کو بلا کر ان سے میرے متعلق دریافت فرمائیے ان کی میرے بارہ میں کیا رائے ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کے قبیلہ کے لوگوں کو بلوایا اور پوچھا کہ عبداللہ بن سلام کے بارہ میں تم سب کی رائے کیا ہے۔ تو سب نے بیک زبان ہو کر کہا۔

سیدنا وابن سیدنا وحیدنا وعالمنا

وہ خود ہمارا سردار ہے۔ اس کا باپ بھی ہمارا سردار تھا۔ اور ہم میں سے سب سے بڑا عالم ہے!

مگر جوں ہی حضرت عبداللہ نے ان کے سامنے اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کیا تو یہودیوں کے دلوں میں اپنی جماعت کے وقار کی تباہی کا احساس ابھرا۔ انہوں نے اسی اشتعال میں عبداللہ بن سلام کو واہی تواہی بکنا شروع کر دیا۔ شہر کے ہر یہودی قبیلہ میں عبداللہ کی برائیاں ہونے لگیں۔ یہودیوں کی یہ حالت دیکھ کر مشرک اور قبیلہ اوس و خزرج کے منافقین بھی یہود کے ساتھ مل گئے تاکہ یہود کے ساتھ مل کر مسلمانوں پہ یلغار بول دیں اور ان کا مالِ غنیمت ہمارے ہاتھ نہ بھی آئے تو بھی اہلِ قرابت اور شجاعت پیشہ بہادروں کے دوش بدوش جنگ کرنے کا اعزاز تو ملے گا۔

یہود نے آستینیں چڑھالیں

مدینہ کے یہودی پورے جوش و خروش کے ساتھ آستینیں چڑھائے رسول اللہ ﷺ کے سامنے مجادلہ پر اتر آئے۔ (ان یہودیوں کی سنگین واردات کے سامنے قریشِ مکہ کے مظالم بے معنی تھے) یہودیوں نے اپنی کتابوں میں مکر و فریب کے ساتھ ایسی تبدیلیاں کر لیں۔ جو رسول اللہ ﷺ کے منصبِ رسالت کو مشکوک بنا سکتی ہوں۔ نہ صرف آنحضرت ﷺ کو بلکہ یہودیوں نے آپ ﷺ کے ساتھیوں سے بھی طرح طرح کے سوالات پوچھ پوچھ پریشان کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے مدینہ ہی کے رہنے والوں میں سے ایسے لوگوں کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ جو منافق تھے اور جھوٹ موٹ کی پرہیز گاری اور نکوکاری کا ڈھونگ رچائے ہوئے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں پر اسلام کے بارہ میں طرح طرح کے اعتراض کرنا شروع کر دیئے۔ ان تمام گروہوں کا مقصد مسلمانوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اللہ ﷺ پر اعتماد متزلزل کرنا تھا۔

یہودیوں کی امداد کے لئے وہ منافق بھی تیار ہو گئے جو بظاہر اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے۔ مگر دل میں کھلم کھلا اسلام دشمنوں سے زیادہ درپردہ اسلام کے دشمن تھے۔

یہود کی بددیانتی

یہودیوں نے اسلام دشمنی کے پاگل پن میں اپنی مقدس کتاب تورات کے عقائد (یعنی بنیادی غیر متنازعہ حقائق) کو بھی ماننے سے انکار کر دیا۔ باوجودیکہ تمام گروہ (یہود، مشرکین، اور

منافقین اللہ تعالیٰ کی ہستی کو ماننے میں ایک دوسرے کے پیش پیش تھے۔ بلکہ ان میں اکثر بت پرست ایسے بھی تھے جو اللہ کو ماننے کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔ اور بتوں کو قرب کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اپنے اسی اعلانیہ عقیدہ کے زیر اثر سب نے مل کر رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا۔

اللہ تعالیٰ نے تو تمام مخلوق کو پیدا کیا۔ مگر اللہ کو کس نے پیدا کیا ہے؟ جس کا جواب رسول اللہ ﷺ نے وحی الٰہی کی زبان میں دیا۔

قل ھو اللہ احد اللہ الصمد

ان سے کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک اور بے نیاز ہے۔

لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد

نہ اس کا کوئی شریک ہے نہ وہ کسی کی اولاد اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے۔

آہستہ آہستہ مسلمانوں کو بھی ان اسلام دشمنوں کی پہچان ہو گئی۔ اس اثناء میں ایک دن ان میں سے چند منافق مسجد نبوی میں بیٹھ کر دبی زبان سے اسلام پر شکوک ظاہر کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو ان کو فوراً مسجد سے نکلوا دیا لیکن اسلام دشمنوں کے لئے یہ معمولی سی سزا کیسے اثر انداز ہوتی؟

ایک روز شاس بن قیس (منافق) نے دیکھا کہ اوس و خزرج مسلمان مل کر بیٹھے ہوئے اور ایک دوسرے کے ساتھ انتہائی خوشگوار انداز میں محو گفتگو ہیں۔ تو اس کے کلیجے کا ناسور ابھر آیا۔ اف آج دونوں قبیلے آپس میں ایسے شیر و شکر ہیں کہ ان میں مداخلت یا نشست کی ہمت بھی نہیں ہو سکتی؟۔۔۔۔۔۔ کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ ان کی پرانی دشمنی کو ابھارا جائے۔

چنانچہ اس کام کے لئے اس نے ایک زبان دراز نوجوان یہودی کو منتخب کیا۔ کام یہ تھا کہ کسی موقع پر اوس و خزرج کے درمیان جنگ بعاث (جن کا ذکر گزر چکا ہے) کو ان میں پھر سے ابھار دے جس میں قبیلہ اوس نے خزرج کو دبا کر ان کو ان کے گھروں میں قید کر دیا تھا۔

یہودی شیطان نے یہ موقع پیدا کر ہی لیا اور چشم زدن میں دونوں قبیلے کے نوجوانوں کا خون کھول گیا۔ ایک دوسرے پر تہمت بازی اور تفاخر کا سیلاب امڈ آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک شخص نے روایتی انداز جنگ میں کہا۔ اگر ارمان باقی ہو تو نکال لو۔ ہم جواب دینے کے لئے تیار ہیں یہ خبر رسول اللہ ﷺ کے حضور پہنچی تو آپ ﷺ فوراً موقع پر تشریف لے آئے۔ انہیں دین اسلام کی محبت انگیز امن و سکون سے سیراب کر دینے والی تعلیم کا احساس دلایا تو شیطان نے منہ کی کھائی اور نبی رحمت کے رحمت نچھاور کرنے والے وعظ نے ایسا اثر کیا کہ سب کی آنکھوں میں ایک دوسرے کی محبت کا جوش آنسوؤں میں بدل گیا۔ سب ایک دوسرے کے گلے مل گئے لیکن یہودیوں کی مجادلہ بازی نے یہ بدترین صورت اختیار کر لی کہ قرآن مجید نے

سورہ بقرہ میں مسلسل کئی آیات میں ان کی نشاندہی فرمائی۔ ایک مجادلہ کی حکایت تو سورہ نساء میں بیان فرمائی گئی۔ ان آیات میں یہود اور نصاریٰ دونوں اہلِ کتاب کا ضد و تکبر میں ان کی اپنی کتابوں (توریت اور انجیل) میں رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو تسلیم کرنے کے احکامات کو ماننے سے انکار کی نشاندہی کے ساتھ ان پر لعنت کا ذکر تک موجود ہے۔

ولقد اتینا موسی الکتاب وقفینا من بعدہ بالرسل واتینا عیسی ابن مریم البینت وایدنہ بروح القدس افکلما جاء کم رسول بمالا تھوی انفسکم استکبرتم ففریقا کذبتم و فریقا تقتلون۔ قالوا قلوبنا غلف' بل لعنھم اللہ بکفرھم فقلیلا مایومنون۔ ولما جاء ھم کتب من عنداللہ مصدق لما معھم وکانوا من قبل یستفتحون علی الذین کفروا فلما جاء ھم ما عروفوا کفروا بہ فلعنۃ اللہ علی الکافرین۔ (87:2)

اور ہم نے موسیٰ کو کتاب عنایت کی۔ اور ان کے پیچھے یکے بعد دیگرے ہم رسول بھیجتے رہے۔ اور عیسیٰ بن مریم کو کھلے نشانات عطا کئے۔ اور روح القدس یعنی جبریل سے ان کو مدد دی تو جب کوئی رسول تمہارے پاس ایسی باتیں لے کر آئے جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا تو تم باغی ہو جاتے رہے۔ اور ایک گروہ تو انبیاء کو جھٹلاتا رہا ار ایک گروہ انہیں قتل کرتا رہا۔ اور کہتے ہیں ہمارے دل پردے میں ہیں (نہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر کے سبب ان پر لعنت کر رکھی ہے۔ پس یہ تھوڑے پر ایمان لاتے ہیں اور جب اللہ کے ہاں سے ان کے پاس کتاب آئی جو ان کی آسمانی کتاب کی بھی تصدیق کرتی ہے اور وہ پہلے ہمیشہ کافروں پر فتح مانگا کرتے تھے تو جس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے۔ جب ان کے پاس آ پہنچی تو اس سے کافر ہو گئے۔ تو بس کافروں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

فخاص یہودی اور ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

مسلمان اور یہودیوں کے درمیان معاہدہ کے باوجود یہودیوں نے اپنے عہد کو بالائے طاق رکھ کر ایسی سرد جنگ شروع کر دی اور وہ اس حد تک بڑھ گئیں کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے نرم خو' رقیق القلب مسلمان کے ساتھ فخاص یہودی ایسا الجھا کہ آپ اس کی زبان درازی سے بے قابو ہو گئے۔ واقعہ یوں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تبلیغ اسلام کر رہے تھے کہ فخاص یہودی نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے طعنہ زنی کرتے ہوئے کہا۔ اگر ہم اللہ کے محتاج ہوتے تو کوئی بات بھی بنتی مگر تمہارے نبی (ﷺ) تو کہتے ہیں کہ۔

من ذالذی یقرض اللہ قرضا" حسنا فیضا عفہ اضعافا" کثیرا۔

کون ہے جو (انسان کی جگہ اللہ سے معاملہ کرتا ہے اور) اللہ تعالیٰ کو خوش دلی کے ساتھ قرض دیتا ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اس کا قرض دوگنا سہ گنا زیادہ کرکے ادا کرے۔ (یعنی حقیر مال اللہ کی راہ میں خرچ کرکے دین و دنیا کی بے شمار برکتوں اور سعادتوں کو حاصل کر سکے۔)

فخاص نے کہا اللہ الٹا ہمارے آگے ایسے ہاتھ پھیلاتا ہے جیسے ہم تونگر ہیں اور وہ فقیر۔ پھر وہ ہمیں تو سود خوری سے منع کرتا ہے مگر خود سود دینے کا وعدہ فرما رہا ہے۔ جناب ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس کو سمجھایا مگر جب اس نے زیادہ واہی تواہی بکنا شروع کر دیا تو ان سے ضبط نہ ہو سکا اور یہودی کے منہ پر طمانچہ مارتے ہوئے فرمایا۔ اے اللہ کے دشمن اگر تمہارے قبیلہ سے معاہدہ نہ ہوا ہوتا تو میں تم کو قتل کر دیتا۔

فخاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی مگر اپنی بے ہودہ گفتگو کا حصہ حذف کر گیا۔ اس واقعہ پر آیت نازل ہوئی۔

لقد سمع اللہ قول الذین قالوا ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء سنکتب ما قالوا وقتلھم الانبیاء بغیر حق ونقول ذوقوا عذاب الحریق۔

بلاشبہ اللہ نے ان لوگوں کا کہنا سن لیا ہے جنہوں نے یہ بات کہی کہ اللہ محتاج ہے اور ہم دولت مند ہیں۔ (کہ بار بار اس کے نام پر ہم سے مال طلب کیا جاتا ہے) سو قریب ہے کہ جو بات انہوں نے کہی ہے ہم ان کے لئے لکھ دیں۔ (یعنی یہ انفاق فی سبیل اللہ کی دعوت کی ہنسی اڑاتے ہیں اور اللہ کو محتاج کہتے ہیں تو عنقریب یہ اس کی پاداش میں خود محتاج اور تباہ ہو جائیں گے اور ان کا نبیوں کو ناحق قتل کرنا) یہ ان کے نامۂ اعمال میں سب سے بڑی شقاوت ہے اور اس وقت جب ان کی شقاوت کا نتیجہ پیش آئے گا تو ہم کہیں گے اب پاداش عمل میں عذاب جہنم کا مزا چکھو۔

یہود مدینہ اپنے سابقہ کردار کے مطابق اپنی سازشوں میں یہیں تک محدود نہ تھے کہ مہاجرین اور انصار میں پھوٹ ڈلوا کر مسلمانوں کو کمزور کر دیں اوس و خزرج کو دین اسلام سے ہٹا کر بت پرستی پر لگا دیں۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی کسی نہ کسی فریب میں مبتلا کرکے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (نعوذ باللہ) نقصان پہنچانا چاہتے تھے۔

ایک بار ان کے علماء اور سرداروں کے وفد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا۔ آپ کو معلوم ہے قوم میں ہماری کتنی عزت اور کتنا وقار ہے۔ اگر ہم ایمان لے آئیں تو تمام یہودی آپ کے فرماں بردار بن جائیں گے لیکن شرط یہ ہے کہ ہمارا ایک گروہ کے ساتھ تنازعہ ہے ہم دونوں فریق مقدمہ آپ کے پاس لائیں گے۔ اگر آپ فیصلہ ہمارے حق میں کر دیں گے تو ہم سب آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس حوالہ سے یہ آیت نازل ہوئی۔

وان احکم بینھم بما انزل اللہ ولا تتبع اھواءھم واحذرھم ان یفتنوک عن بعض

ما انزل اللّٰہ الیک فان تولو فاعلم انما یرید اللّٰہ ان یصیبھم ببعض ذنوبھم- وان کثیراً من الناس لفسقون- افحکم الجاھلیۃ یبغون- ومن احسن من اللہ حکم لقوم یوقنون-

"اور پھر ہم تاکید کرتے ہیں کہ جو حکم اللہ نے نازل فرمایا ہے اسی کے مطابق ان میں فیصلہ کرنا اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا اور ان سے بچتے رہنا کہ کسی حکم سے جو اللہ نے تم پر نازل فرمایا ہے- یہ کہیں تم کو بہکا نہ دیں- اگر یہ نہ مانیں تو جان لو کہ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے بعض گناہوں کے سبب ان پر مصیبت نازل کرے اور اکثر لوگ تو نافرمان ہیں-

کیا یہ لوگ زمانہ جاہلیت کی عدالتوں کے فیصلوں کے خواہش مند ہیں اور جو یقین رکھتے ہیں ان کے لئے اللہ تعالیٰ سے اچھا (منصفانہ) حکم کس کا ہے" -

گویا ان کی یہ مذموم چال ناکام ہو گئی تو پھر انہوں نے ایک اور جال بچھایا- جس سے ان کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہر بدر کرنا تھا- انہوں نے اس فریب کو اس طرح ترتیب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا-

سابقہ انبیاء میں سے ہر ایک نبی نے بیت المقدس کو اپنا مستقر (ٹھکانہ) بنایا- اگر آپ اللہ جل شانہ کے رسول ہیں تو سابقہ انبیاء کی روش کو اختیار کیجئے- مدینہ کو مکہ اور بیت المقدس دونوں کی حد اوسط کے درجے میں رہنے دیجئے' اس چال کو سمجھنے میں زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہ تھی- آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں پہنچنے کے بعد بھی سترہ ماہ تک مسجد اقصیٰ کی طرف رخ فرما کر قیام صلوٰۃ فرمایا- آج اس کی جگہ کعبہ ابراھیمی کو جہت بنانے کا حکم ہوا-

قدنری تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضھا فول وجھک شطر المسجد الحرام وحیث ماکنتم فولو اوجوھکم شطرہ (144:2)

اے ہمارے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہم تمہارا آسمان کی طرف منہ پھیر پھیر کر دیکھنا دیکھ رہے ہیں- سو ہم تم کو اسی قبلہ کی طرف جس کو تم پسند کرتے ہو منہ کرنے کا حکم دیں گے تو اپنا منہ مسجد حرام (یعنی خانہ کعبہ) کی طرف پھیر لو- اور تم لوگ جہاں ہوا کرو (نماز پڑھنے کے وقت) اسی مسجد کی طرف منہ کر لیا کرو-

یہود نے ایک اور چال چلی ادھر قبلہ کی تبدیلی کا حکم ہوا تو ادھر یہود نے ایک اور فریب دینے کی کوشش کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا-

اگر آپ پہلے کی طرح مسجد اقصیٰ کی طرف رخ پھیر لیں تو ہم سب مسلمان ہو جائیں گے-

اس پر وحی نازل ہوئی-

سیقول السفھاء من الناس ماولھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا- قل للہ المشرق

والمغرب- یھدی مین یشاء الی صراط مستقیم- وکذالک جعلنکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا وما جعلنا القبلۃ التی کنت علیھا الالنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ ان کانت لکبیرۃ الا علی الذین ھدی اللہ- 132-133

احمق لوگ کہیں گے کہ مسلمان جس قبلہ پر پہلے سے چلے آتے تھے اب اس سے کیوں منہ پھیر بیٹھے تم کہہ دو کہ مشرق اور مغرب سب اللہ ہی کا ہے- وہ جس کو چاہتا ہے سیدھے رستے پر چلاتا ہے اور اسی طرح ہم نے تم کو امت معتدل بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہ بنو- اور نبی آخر الزماں (ﷺ) تم پر گواہ بنیں اور جس قبلہ پر تم پہلے تھے اس کو ہم نے اس لئے مقرر کیا تھا کہ معلوم کریں کہ کون ہمارے رسول ﷺ کا تابع رہتا ہے- اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے- اور یہ بات انہیں (تحویل قبلہ) لوگوں کو گراں معلوم ہوئی' ان کو چھوڑ کر جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت بخشی-

علمائے نجران کا وفد

نجران کے رہنے والے ایسے عیسائیوں کا ایک وفد مدینۃ الرسول میں رسول ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جن میں بڑے بڑے علماء شامل تھے جن کو پیشوائی کا مقام حاصل تھا- یہ علماء انجیل کے ماہر تھے- دینی مسائل میں انہیں مکمل دسترس تھی- نجران میں علماء کا یہ طبقہ زمانہ قدیم سے نسل در نسل چلا آ رہا تھا جن کے تقدس اور علم کی وجہ سے روم کے عیسائی بادشاہ ان کی عزت و تکریم کرنا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے- چنانچہ نجران میں کئی مسیحی گرجے شاہان روم کی عقیدت کے مظہر نظر آتے ہیں-

منصوبہ کیا تھا

نجران کے مسیحیوں کو جب یہ خبر پہنچی کہ یہودیوں اور مسلمانوں میں سرد جنگ چھڑ گئی ہے تو انہوں نے موقع غنیمت سمجھ کر یہودیوں اور مسلمانوں میں دشمنی کو اور پائیدار کرنے کا منصوبہ بنایا تاکہ اس منصوبہ کی کامیابی سے یمن کے نصاریٰ اور یہودی عرب کے دباؤ سے نکل آئیں-

اس منصوبہ کے ماتحت مدینہ منورہ میں تینوں اہل کتاب مسلمان-- یہود اور نصاریٰ کا اجتماع ہوا- گفتگو شروع ہوئی' عیسائیوں نے رسول اللہ ﷺ کے مقابلہ میں مناظرہ کی بنیاد رکھی اور تینوں گروہ ایک دوسرے سے افہام و تفہیم کے خواہاں ہوئے-

(ا) یہود نے حضرت مسیح علیہ السلام اور جناب محمد ﷺ دونوں کی رسالت کی نفی کر دی اور

بر سرعام "عزیر" کے ابن اللہ ہونے کا اقرار کر لیا۔
(ب) نصاریٰ نے اقرارِ تثلیث اور الوہیت مسیح کا دعویٰ پیش کیا۔
(ج) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف اللہ وحدہ لاشریک کی وحدانیت کا اقرار کیا۔

اس گفتگو کے بعد یہود اور نصاریٰ نے مل کر سوال کیا۔ "آپ گذشتہ انبیاء میں سے کس کس کی رسالت کو تسلیم کرتے ہیں۔ جس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وحی الٰہی کے مطابق ارشاد فرمایا۔

امنا باللّٰہ وما انزل الینا وما انزل الٰی ابراھیم و اسماعیل و اسحاق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسٰی وعیسٰی وما اوتی النبیون من ربھم لانفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون۔ (2-136)

مسلمانو!۔۔۔۔۔ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے' اور جو کتاب ہم پر نازل ہوئی اس پر اور جو (صحیفے) ابراھیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر نازل ہوئے اور جو کتابیں موسیٰ اور عیسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئیں اور ان پر جو اور نبیوں کو ان کے اللہ سے ملیں ان سب پر ایمان لائے' ہم ان نبیوں اور رسولوں میں سے کسی میں بھی فرق نہیں کرتے۔ ہم اسی اللہ وحدہ لاشریک کے فرماں بردار ہیں۔

اس بحث کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر اس بات کی انتہائی سختی سے مخالفت فرماتے جس بات سے عقیدہ توحید پر حرف آتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہودو نصاریٰ دونوں کو مخاطب ہو کر فرمایا۔

ا۔ تم دونوں اپنی اپنی کتابوں میں تحریف کرنے کے مرتکب ہو۔
ب۔ تم جن انبیاء پر ایمان لانے کا دعویٰ کرتے ہو عملاً ان تم ان میں سے کسی ایک کے بھی پیروکار نہیں۔ تمہارا قول و فعل دونوں نبی کی تعلیم کے خلاف ہیں۔
ج۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم میں بال برابر بھی فرق نہیں۔

کیونکہ اسلام ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ تمام انبیاء کی تعلیم کی اصل وہ ازلی اور ابدی حقیقت ہے جس نے ہر اس شخص کے لئے اپنا دامنِ رحمت پھیلا رکھا ہے جو اپنے آپ کو غیر اللہ کی پرستش اور تعظیم سے مکمل طور پہ پاک رکھنا چاہتا ہے۔

اسے یہ یقین بھی ہو کہ دین اسلام انسان کو ہر قیدوبند اور شہواتِ نفسانی سے ہٹا لینے پہ پوری طرح قادر ہے اور ایسا ہی مسلمان اعتقادی اوہام اور باپ دادا کے عقائد کو ٹھکرا کر آگے نکل جاتا ہے۔

کانفرنس۔ مدینہ منورہ میں تمام ادیان (مذاہب) کی کانفرنس منعقد ہوئی جس پر تمام لوگوں کی

نگاہیں جمی ہوئی تھیں لیکن مبلّغ اسلام محمد ﷺ کے سوا باقی مذاہب کے پیشواؤں کا فی الجملہ سیاسی مقصد بھی تھا۔ لیکن بظاہر اپنے اپنے مذہب کی برتری ثابت کرنے کی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ البتہ یہ کانفرنس آج کل کے اقتصادی اجتماع کی طرح نہ تھی نہ ان سب کے پیشِ نظر اس معیار کے اقتصادی اغراض تھے جنھوں نے آج کی دنیا کو اپنا گرویدہ بنا رکھا ہے۔ اس کانفرنس کا بنیادی مقصد تو اپنے اپنے مذہب کے روحانی موقف کو واضح کرنا تھا۔ اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں کے پیشِ نظر حصولِ اقتدار اور مالی منفعت بھی تھی مگر بظاہر ان کا دعویٰ اپنے اپنے مذاہب کی اخلاقی اور روحانی قدروں کی برتری ثابت کرنا تھا لیکن رسول اللہ ﷺ کے سامنے وہ روحانی اور اخلاقی معیار تھا جسے اختیار کرنے کے بعد انسان کو بلا تفریق مذہب و ملت برتری حاصل ہوتی ہے۔ اپنے اس مفہوم کو نبی اکرم ﷺ نے ان ہدایات کے مطابق بیان فرمایا جو بذریعہ وحی آپ پر نازل ہوئیں۔ ارشاد ہے۔

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون۔ (64:3)

کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب جو بات ہمارے اور تمہارے دونوں کے درمیان متحدہ طور پر تسلیم شدہ ہے اس کی طرف آؤ۔ وہ یہ ہے کہ آؤ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوا اپنا کارساز نہ سمجھے اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو ان سے کہہ دو تم گواہ رہنا ہم اللہ تعالیٰ کے موحد فرماں بردار ہیں۔

کتنی ہمہ گیر آفاقی دعوت ہے جس پر کسی باشعور یہودی یا نصرانی کو اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ آپ ہی بتائیے کیا یہ بات کہ صرف ایک اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور بندوں میں سے کسی کو معبود کے مقام پر نہ پہنچایا جائے۔ اسلام کے یہ اصول قابلِ اعتراض ہو سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ وجدان یہی کہتا ہے ہر وہ انسان جو عقل کی رہبری میں ٹھوس دلائل کا طالب ہو کسی طاقت کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہیں سمجھ سکتا۔ ہاں جن لوگوں کے سامنے کچھ مادی منافع ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ سے وہ غیر اللہ کے سامنے جھک کر اپنی روحانی عظمت اور قوتِ غور و فکر دونوں کو ذلیل و خوار کر لیتے ہیں۔ وہ ضمیر اور عزتِ نفس دونوں کو تھوڑے سے فائدوں کے عوض سستا بیچ دیتے ہیں۔ گویا بغیر مول تول کے اپنا ایمان بھی ہاتھ سے کھو دیتے ہیں۔

انسان کے لئے یہ فریب کس قدر خطرناک ہے کہ اس کی عقل و دانش پر مادیت اس طرح

غالب آ جاتی ہے کہ توحید کے مقابلہ میں یہ نفع کبھی مال و زر کی صورت اس کی بصیرت پر پردہ ڈال دیتا ہے۔ کبھی منصب و جاہ کے روپ میں اس کے ہوش و حواس کو ایسا نکما کر دیتا ہے کہ وہ نعمتِ توحید کو ان پر نچھاور کر دیتا ہے اور کبھی القاب و خطاب کا لالچ اسے محروم توحید کر دیتا ہے۔

جیسا کہ نجران کے اسی وفد میں ابو حارثہ نصرانی اپنی زبان سے اپنی اس لغزش کا اقرار کرتا ہے۔ ابو حارثہ اور علماء سے زیادہ عالم تھا مگر جب اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پہ غور کیا تو اسی مجلس میں اپنے ایک ساتھی کے کان میں کہا۔

جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو فرماتے ہیں وہ صحیح فرماتے ہیں تو اس کے ایک رفیق نے اس سے

یمنعنی ما منع بنا هولاء القوم شرفوما وموّلونا واکرمونا وقد ابو اخلافه فلو فلعت نزعوامناکل ماتری

مجھے اپنی قوم کا شعار منع کرتا ہے مگر وہ خود اسلام کی منکر ہے۔ اگر میں مسلمان ہو گیا تو میرے سب اعزازات ختم ہو جائیں گے۔

اہل نجران سے آخری فیصلہ

الغرض کانفرنس کا انجام یہ ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں فریق یہود اور نصاریٰ سے کہا۔ اگر تم ایمان نہیں لائے میری صداقت پہ یقین نہیں کرتے تو آؤ مباہلہ کر لیں۔ جس میں جھوٹے پر لعنت کی بددعا کی جائے۔ اس پر یہود تو معاہدہ کی آڑ لے کر ایک طرف ہو گئے مگر نصاریٰ نے باہم مل کر مشورہ کیا کہ مباہلہ اور اسلام دونوں سے ہٹ کر اطاعت کر لینا بہتر ہے۔ اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی۔ آپ اپنی طرف سے ایک "امین" صحابی ہمارے ساتھ نجران جانے کے لئے مقرر کر دیجئے جو ہمارے درمیان واقع جھگڑوں کو سنے اور عادلانہ فیصلے کرے۔

چنانچہ رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو عبیدہ بن جراح کو نجران میں عہدۂ قضاۃ پر فائز کر کے ان کے ساتھ بھیج دیا۔

مکہ کی یادیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ کے معاشرہ میں اپنے جس فکر و کردار کی بنیاد رکھی تھی۔ ہجرت سے لیکر اب تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اس کی توسیع کے عمل سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ بارہا ان کے دل میں خیال آتا کہ قریش کو کسی طرح نعمتِ توحید سے مالا مال کیا جائے۔ اس کے علاوہ اور بھی چند محرکات مکہ کی یادوں کے چراغ جلاتے رہتے۔

بطور مثال (ا) مکہ معظمہ میں بیتِ ابراھیمی بیت اللہ اور اس سے متعلقہ مناسک تھے جہاں مسلمانوں کے علاوہ تمام عرب سے لوگوں کو مناسک حج ادا کرنے کی کھلی اجازت تھی۔ مگر نبی اکرم ﷺ اور ان کے رفقاءِ عظام اس کا جواز نہیں رکھتے تھے، یہ فکر ان کو ہر وقت پریشان رکھتی کہ ہم کب تک اس مقدس دینی فریضہ کو ادا کرنے سے محروم رہیں گے۔

(ب) مکہ معظمہ میں مہاجرین کے عزیز و اقارب اور بعض کے اہل و عیال رہ گئے تھے جن کی یاد انہیں ہر وقت ستاتی رہتی اور ان سب غموں پر بھاری یہ غم تھا کہ کہیں انہیں قریش پھر شرک پر مائل نہ کرلیں۔

(ج) مہاجرین مکہ معظمہ میں گھریلو سامان کے علاوہ تجارتی مال و اسباب بھی وہیں چھوڑ آئے تھے۔

(د) مہاجرین تبدیلیٔ آب و ہوا کی وجہ سے نوبتی بخار میں مبتلا ہو گئے تھے۔ فریضۂ صلوٰۃ تھی بیٹھ کر ادا کرتے۔ وہ سمجھتے کہ وطن چھوٹ جانے اور غیر وطن کی بود و باش نے ہماری صحت خراب کر دی ہے۔ (یہ مؤلف کا خیال ہے ورنہ وہ لوگ ایسے توہمات سے بالاتر تھے۔ مترجم) انہوں نے خوشی سے وطن نہیں چھوڑا تھا۔ قریش کے مظالم نے انہیں وطن چھوڑنے پر مجبور کیا تھا۔ لہٰذا وہ ایسے دشمنوں پر غلبہ حاصل کرنے سے کب تک تساہل سے کام لے سکتے تھے۔

(ہ) ان امور کے ساتھ ساتھ انہیں وہ گلیاں یاد آتیں جن میں ان کا بچپن گزرا' وہ محلّہ و بازار جہاں انہوں نے ہوش سنبھالا سب کی یاد آنا فطری تقاضہ تھا۔

انہیں اپنے وطن کے ذرہ ذرہ سے والہانہ محبت تھی۔ فطری تقاضا ہے کہ انسان کو شعور آتے ہی سب سے پہلے اس کا محبوب اس کا وطن ہوتا ہے۔ جس طرح کہ ہم اور آپ اپنے وطن سے محبت کرتے ہیں۔

وطن ـــــ جس سرزمین پر ہم نے بچپن گزارا' جس کی وادیوں میں کھیلے' جوانی کی امنگوں سے لیکر بڑھاپے تک اس کے ذرہ ذرہ سے ہماری دوستی رہی' اس کی محبت ہمارے دل و دماغ پر ایسی چھائی کہ مرتے وقت بھی دفن اسی وطن میں ہونا چاہا۔

اسی طرح مہاجرین کے دلوں میں اپنے وطن کی محبت جوش مارتی رہتی تھی۔ جہاں انہوں نے مسلسل تیرہ سال تک دشمنوں کی سختیاں برداشت کیں اور پھر اپنے دین کے لئے انہوں نے اپنے وطن کو چھوڑنا بھی گوارا کرلیا۔

دین اسلام جس میں مایوسی نہیں ناامیدی نہیں۔ دین اسلام جس کے سفر میں نہ تھکان نہ ضعف نہ گھبراہٹ' دین اسلام مکمل سکون و راحت! ایسا دین جو کسی کے دین پر زیادتی کرنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ دوسرے مذاہب کے ساتھ رواداری اور حُسنِ سلوک کرنے کی ہدایت فرماتا

ہے۔ اور ساتھ ہی اس دین کی دوسروں کو بھی دعوت دینے کو لازمی سمجھتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی اس دین کے ماننے والوں کی عزتِ نفس، حفاظتِ عقیدہ اور اشخاص وطن کا احترام بھی ضروری تھا جیسا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیعتِ عقبہ (مکہ) میں مدینہ منورہ کے بیعت کرنے والوں کے سامنے اظہار فرمایا تھا۔

مہاجرین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے یہ سوال بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کردہ فرائض کو ادا کرنے اور اس کے گھر (کعبہ) کی حفاظت اور اپنے وطن کی آزادی کے حقوق کو حاصل کرنے کے لئے کون سا راستہ اختیار کیا جائے۔

دوستو۔۔۔۔۔ یہ امور تھے جنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا۔ حتیٰ کہ اس توجہ کا نتیجہ اللہ کے فضل و کرم سے فتحِ مکہ کی صورت میں رونما ہوا۔ تاکہ دینِ اسلام کا اجالا پوری دنیا کو اپنی رحمت میں سمیٹ لے۔

☆☆ ☆☆ ☆☆

ابتدائی ٹکراؤ اور سراپا

ابتدائی ٹکراؤ اور سرایا

مسلمانوں کو ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں کئی مہینے گزر گئے لیکن مکہ کی یاد نے انہیں ہمیشہ بے قرار رکھا۔ اسلام لانے کے بعد قریشِ مکہ نے ان پر جتنا جبر و تشدد کیا اس کی یاد آتے ہی ان کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی۔ وہ اکثر سوچتے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔

مؤرخین کی اس بارہ میں مختلف آراء ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم مدینہ منورہ میں ٹھہرنے کے بعد قریشِ مکہ سے انتقام لینے کے لئے بے چین رہے تھے۔ (یہ مستشرق انگریز) مؤرخ ہیں جو نعوذ باللہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سوچ کو اپنی طرح کی سوچ سمجھتے ہیں) دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ مہاجرین نے مدینہ پہنچتے ہی قریش سے بدلہ لینے کا فیصلہ کر لیا تھا لیکن اپنے استحکام تک اسے ملتوی رکھا۔ جس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں عقبہ پر پہلی بیعت میں وعدہ کیا گیا کہ ہم اسلام کے لئے ہر قوم سے لڑیں گے۔ (یہاں مؤرخ تحفظ کا لفظ حذف کر جاتے ہیں) جب بھی عسکری طاقت حاصل ہو گی۔ وہ سب سے پہلے مکہ کی طرف رخ کریں گے جس کا خطرہ خود قریشِ مکہ کو بھی تھا۔ جیسا کہ مکہ میں ہی عقبہ کے مقام پر ہی دوسری بیعت کا راز کھل جانے کے بعد قریشِ مکہ نے اوس و خزرج سے بیعت کرنے والوں کے ارادوں کے بارہ میں جواب طلبی کی۔

(1) اس دعویٰ کے مؤرخ اپنی تائید میں جناب حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس "سریہ" کا ذکر کرتے ہیں جو 35 مہاجرین کا دستہ لے کر ساحلِ سمندر تک گشت کرنے کے لئے بھیجے گئے جہاں ان کی مڈبھیڑ ابو جہل سے ہو گئی۔ سیدنا حمزہ ابو جہل پر حملہ کرنے ہی والے تھے کہ مجدی بن عمرو الجہنی نے فریقین کو سمجھا کر معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ کیونکہ مجدی دونوں گروہوں کا حریف تھا۔ یہ واقعہ "غیض" نام کی پہاڑی کے دامن میں ہوا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ ابو جہل نے اپنے سابقہ رویہ کے مطابق اسلام دشمنی میں مہاجرین پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا مگر مجدی بن عمرو الجہنی نے مداخلت کر کے معاملہ کو سلجھا دیا۔ (مترجم)

(2) مؤرخین کا یہ بھی کہنا ہے کہ حضرت عبیدہ بن حارث کی قیادت میں (60) مہاجرین مکہ کا دستہ بھیجا گیا۔ ان کا آمنا سامنا وادی رابغ میں ابوسفیان سے ہوا جن کے ساتھ دو سو شمشیر زن تھے لیکن طرفین نے لڑائی سے خود کو روک لیا۔ البتہ سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تیر چھوڑا۔ گویا اسلام میں سب سے پہلا تیر سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چلایا۔

(3) حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کی قیادت میں آٹھ یا ایک روایت کے مطابق بیس مہاجرین کا ایک دستہ مدینہ سے چل کر حجاز تک گشت لگا آیا۔ لیکن کسی جگہ کفار کا آمنا سامنا نہ ہوا۔ بعض مؤرخین کا خیال ہے کفارِ مکہ مسلمانوں کے مدینہ منورہ ہجرت کر جانے کے بعد بھی اسلام دشمنی میں اسی طرح تعاقب کرتے رہے جس طرح حبشہ ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی دشمنی میں باقاعدہ وفد کی صورت حبشہ پہنچ گئے تھے۔ اسی طرح مسلمانوں کے مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد بھی یہودیوں اور منافقوں کو ان سے دشمنی کے لئے اکساتے رہتے اور خود حملہ آور ہونے کی افواہیں اڑواتے رہتے! جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے حفاظتی دستوں کا گشت ضروری ہو گیا تھا۔

(4) غزوہ ابوا

ایک بار بنفسِ نفیس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دستہ لے کر نکلے (اور شہر پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نائب مقرر فرمایا) اس دستہ میں صرف مہاجرین ہی تھے۔ نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام اس خیال سے ابوا (مقام) پر تشریف لائے۔ اطلاع یہ تھی کہ اہلِ مکہ کا ایک تجارتی قافلہ ادھر سے گزرنا ہے مگر وہ کاوا کاٹ کر دوسرے راستہ سے نکل گیا۔ البتہ اس غزوہ میں عمرو بن الضمری سے تحریری معاہدہ ہو گیا۔

(5) غزوبواط

اس میں بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بذاتِ خود دو سو مسلمانوں کا دستہ جس میں مہاجر اور انصار دونوں شامل تھے اپنے ساتھ لے کر مقام "بواط" تک پہنچے جو رضوی نام کی پہاڑی کے دامن میں واقع وادی ہے۔ خبر یہ تھی کہ قریشِ مکہ کا سردار امیہ بن خلف ایک سو شمشیر بکف بہادروں کو ساتھ لئے اڑھائی ہزار اونٹوں کا گلہ لے کر آ رہا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اگر اس کی نیت میں خرابی ہو تو اسے وہیں گھیر لیا جائے لیکن جب اس نے سنا تو وہ بھی جھول دے کر دوسرے راستہ سے نکل گیا۔

(6) بواط سے واپسی پہ دو یا تین ماہ بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو سلمہ بن عبداللہ کو مدینہ میں اپنا نائب مقرر فرمایا اور خود سو مسلمانوں کا دستہ لے کر وادی ینبع میں مقام عشیرہ تک

تشریف لائے۔ اس وقت یہ اطلاع تھی کہ ابوسفیان تجارتی سامان لے کر شام کی طرف جا رہے تھے۔ یہ واقعہ آخر جمادی الاولیٰ اور ابتدائے جمادی الاخریٰ (2ھ) 623ء اکتوبر کا ہے۔

اس غزوہ میں قبیلہ بنی مدلج اور ان کے حلیفوں سے معاہدہ ہو گیا۔ یہ لوگ بنی ضمرہ کے معاہد اور حلیف تھے۔

(7) بدر اولیٰ

رسول اللہ ﷺ کے غزوہ عشیرہ نمبر 6 سے واپسی کے دس دن بعد اہلِ مکہ میں سے کرز بن جابر الفہری (جو بعد میں مسلمان ہو گئے) دل میں مسلمانوں پر شبخون مارنے کی نیت سے مدینہ منورہ کی وادی تک آ پہنچے اور ایک چراگاہ سے مسلمانوں کے کئی اونٹ گھیر کر ساتھ لے گئے۔ رسول اللہ ﷺ اس غزوہ میں مدینہ میں زید بن حارثہ کو نائب مقرر فرما کر خود کرز بن فہری کے تعاقب میں وادی صفوان جو بدر کے قریب ہے' پہنچے۔ اسی مناسبت سے اسے غزوہ بدر اولیٰ کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ لیکن کرز آنحضرت ﷺ کی گرفت سے بچ کر صاف نکل گیا۔

مؤرخین کے خیالات کا تجزیہ

عسکری نقل و حرکت کے مذکورہ واقعات جن کا سلسلہ رسول اللہ ﷺ کے مدینہ منورہ میں چھ ماہ قیام کے بعد سے شروع کیا جاتا ہے اور ان کی ابتدائی عسکری نمائشوں میں صرف مہاجرینِ مکہ ہی نظر آتے ہیں۔ کیا اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ مسلمانوں کا مقصد قریشِ مکہ کے ساتھ جنگ و جدل یا قافلوں پر دست درازی کرنا تھا؟

(1) جبکہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے گشتی دستہ میں تیس سے زیادہ نوجوان نہیں تھے اور جناب عبید بن حارث رضی اللہ عنہ کے ہمراہ (نمبر 2) صرف ساٹھ افراد تھے اور سیدنا سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں کی تعداد صرف آٹھ اور دوسری روایت میں بیس تک تھی۔

(2) ادھر اگر ہم قریشِ مکہ کے قبائلی تعلقات پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے زمانۂ قدیم سے ہی جن لوگوں سے اپنے تجارتی قافلوں کی حفاظت کے معاہدے کر رکھے تھے۔ ان کی تعداد بے شمار تھی۔ مزید براں جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لے آئے تو قریش نے احتیاطاً رہے سہے قبائل کے ساتھ بھی معاہدے کر لئے۔

(3) پھر دیکھئے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ اور حضرت سعد رضی اللہ عنہ کتنے ہی بہادر سہی وہ اپنے ساتھیوں کی اتنی کم تعداد کی موجودگی میں اپنی شجاعت کے کتنے جوہر دکھا سکتے تھے۔ ان بیان کردہ واقعات میں غور طلب بات یہ ہے کہ دشمنوں کی ہر بار نفری زیادہ ہونے کے

ﷺ نے بواط اور عشیرہ کے مقامی قبائل کے ساتھ گشتی دستوں کی نمائش کے زیر اثر کئے۔ جبکہ آپ کے ہمراہ ساتھیوں کی تعداد بہت کم تھی اور جتنی تعداد تھی وہ بھی ان انصار پر مشتمل تھی جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عقبہ ثانیہ کی بیعت میں صرف دفاعی جنگ میں شریک ہونے کا عہد کیا تھا جارحانہ (حملہ آور) جنگ میں شامل ہونے کا نہیں۔ جس کی وضاحت آپ کو آنے والے صفحات میں غزوہ بدر کبریٰ کے ابتدائی حالات کے ذکر میں ملے گی۔

آپ پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جنگ بدر میں سے رسول اللہ ﷺ نے خود بچنے کی بہت کوشش کی لیکن جب اہلِ مدینہ نے خود شریک ہونے کا رضاکارانہ طور پر اصرار کیا تو آپ نے بھی ارادہ کر لیا جبکہ انصار کی تابع داری کا یہ عالم تھا کہ آنحضرت ﷺ نے جن جن قبائل سے معاہدے کئے انصار نے کبھی ان پر سوال تک نہ کیا۔ لیکن اس کے معنی یہ بھی نہیں تھے کہ اگر رسول اللہ ﷺ اہلِ مکہ پر لشکر کشی کا ارادہ کریں تو انصار یقینی طور پر آپ ﷺ کی نصرت پہ آمادہ ہوں! خصوصاً جبکہ اہلِ مکہ اور اہلِ مدینہ کے درمیان ایسے محرکات بھی مفقود ہوں جو عرب کے دستور کے مطابق حملہ آوری کا بہانہ بنا سکیں اور نہ ہی ان دونوں کے درمیان کینہ و نفاق ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے قبائل کے ساتھ جو معاہدے ابھی ابھی کئے تھے۔ وہاں ان معاہدوں میں جہاں اہلِ مدینہ کے وقار میں اضافہ کرنا مقصود ہوتا وہاں رسول اللہ ﷺ کے پیشِ نظر یہ بات ضرور ہوتی کہ اہل مکہ کو تجارتی قافلوں کی آمدورفت میں خطرہ محسوس ہو۔ لہٰذا ان معاہدوں کی روشنی میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا گشتی دستوں کا بھجوانا اور کبھی کبھار خود بھی ان کی کمان کرنا جنگ یا محرکاتِ جنگ میں شمار نہیں کیا جا سکتا لیکن ان مصنفوں کو کیا کہا جائے جو حضرت حمزہ و عبیدہ بن حارث اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے گشتی دستوں کو بھی جنگی اغراض کا پیش خیمہ ثابت کرنے میں لطف محسوس کرتے ہیں۔

بگوشِ ہوش اور نگاہِ بصیرت سے کام لیجئے

جن سیرت نگاروں نے ان گشتی دستوں کو غزوات کے عنوان سے پیش کیا ہے وہ بالکل غلط ہیں اس لئے کہ گشتی دستوں کی نقل و حرکت کو غزوہ یا غزوات کا عنوان دینا ویسے ہی بے محل ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ابوا' بواط اور عشیرہ تشریف لے جانے کو غازیانہ اقدام کہنا بھی صحیح نہیں ہے بلکہ ایسے تمام مفروضات صرف دماغی اختراع ہیں۔ اس بارے میں اصحابِ سیر کی لغزش کے مختلف اسباب ہیں۔

(ا) یہ مصنف آنحضرت ﷺ کے بعد دوسری صدی کے آخر میں آکر سیرت لکھنے بیٹھے۔
(ب) ایسے مصنفین ان غزوات سے متاثر تھے جو بدر کبریٰ کے بعد پیش آئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ان چھوٹی چھوٹی جھڑپوں کو بھی سرایا یا مغازی کے نام سے تعبیر کر دیا جن سے جہاد یا حرب کا دور سے بھی کوئی واسطہ نہ تھا۔

اسی طرح مستشرقین میں سے بھی کئی اہل قلم کا رجحان مسلمان مؤرخین کے استدلال سے متاثر ہے۔ انہوں نے اپنی تصانیف میں واضح طور پہ اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ لیکن بلاشبہ انہوں نے ایک اور رائے خود بخود قائم کر لی کہ مدینہ میں ٹھہرنے کے بعد مہاجرین اور رسول اللہ ﷺ مکہ والوں کے ساتھ جنگ کا موقع تلاش کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ یہ مستشرقین اپنی فطرت کے مطابق ان گشتی دستوں کے بارہ میں تجارتی قافلوں پر لوٹ مار کرنے کے علاوہ کسی احسن مقصد کو ماننے کے لئے تیار ہی نہیں جس کی دلیل میں وہ بادیہ نشینوں کا روایتی پیشہ لوٹ مار پیش کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں مدینہ کے مسلمانوں کی بیعت عقبہ رسول اللہ کے سایہ میں مالِ غنیمت اور لوٹ مار کے پیش نظر تھی۔ (نعوذ باللہ)

میرے خیال میں مستشرقین کے یہ خیالات مندرجہ ذیل وجوہ سے "مردود" ہیں۔
ا۔ اہلِ مدینہ بھی اہلِ مکہ کی طرح ایسی ہی تمدنی زندگی کے خوگر تھے جس میں لوٹ مار اور غارت گری کا شائبہ نہ ہو۔
ب۔ مدینہ کے رہنے والے زراعت پیشہ کھیتی باڑی کرنے میں اپنی زندگی کا سکون محسوس کرتے تھے۔ اس لئے جب تک جنگ ان کے سر پر تھونپ نہ دی جائے وہ لڑائی کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتے تھے۔

لیکن مہاجرین کی حالت اپنے انصار دوستوں سے بالکل الگ تھلگ تھی، ہو سکتا ہے کہ وہ غاصب جبراً (چھیننے والے) مکہ والوں سے اپنا مال اسباب واپس لینے کا سوچتے ہوں لیکن انہوں نے بھی اس معاملہ میں کسی جلد بازی سے کام نہیں لیا۔ (لیکن ان کا یہ خیال بھی لذتِ ایمان سے ناآشنا ہونے کا سبب ہے ورنہ ان کے دل میں ساری کائنات کے خزانوں اور اموال و دولت سے زیادہ قیمتی رسول اللہ ﷺ کی رفاقت اور ہروقت ان کی خوشنودی تھی) بہرحال رسول اللہ ﷺ کا گشتی دستے بھیجنے کا مقصد تجارتی قافلوں کی لوٹ مار ہرگز نہ تھا۔ دین اسلام میں جہاد کا جو مفہوم مستشرقین سمجھے ہیں اور اپنی سمجھ پر اڑے ہوئے ہیں وہ ہرگز نہیں۔ رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے کبھی بھی جہاد میں پہل نہیں کی۔ نہ ہی دین اسلام میں جہاد بدوی ذہنیت یا مزاج کے تحت ہے۔ البتہ رسول اللہ ﷺ یا اصحاب رسول ﷺ کو اپنے ان حقوق کو واگزار کرانے کا اخلاقی اور دینی حق تھا۔ ان کا یہ تقاضا کہ

ہمارے دین اسلام کو اختیار کرنے کی وجہ ہمیں جبرو تشدد کا تختہ مشق نہ بنایا جائے بلکہ دوسروں کی طرح ہم کو بھی اپنے عقیدہ کی تبلیغ کا حق ہونا چاہیے۔ ان کا جائز مطالبہ تھا۔ اسی طرح مدینہ کے گردو نواح میں جو معاہدے کیے اور ان میں مدینہ منورہ کی عظمت و برتری بھی ملحوظ رکھی وہ بھی احتیاطی تدبیر تھی، جس کا انہیں ہر حالت میں حق تھا۔ وہ اس دن کو نہیں بھولے تھے جب اہلِ مکہ نے حبشہ کے مہاجرین کے بارہ میں جبیبا راستہ اختیار کیا تھا۔ ان کا یہ سوچنا بھی حق بجانب تھا کہ اہلِ مکہ حبشہ کی طرح مدینہ منورہ میں بھی مہاجرین کا بدنیتی سے تعاقب کر سکتے ہیں لہٰذا اس کے دفاع کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ ان حقائق کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ کی رائے میں بھی ضروری تھا کہ اہلِ مکہ کے ساتھ جنگ نہیں بلکہ پرامن معاہدہ ہو جائے۔ جس کی وجہ سے اللہ جل شانہ کے دین کو اس حد تک آزادی مل جائے کہ اس کے راستہ میں کوئی شے حائل نہ ہو ۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نازل ہوا۔

وقاتلوهم حتى لاتكون فتنة ويكون الدين كله لله۔ 39:8

ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب اللہ تعالیٰ ہی کا ہو جائے۔

تھوڑی سی اور تفصیل

مدینہ اور اس کے اطراف میں یہودی پھیلے ہوئے تھے جنہیں مسلمانوں کو اپنی جاہ و حشمت اتحاد و قوت سے متاثر کرنا ضروری تھا۔ ابتدا میں جب مسلمانوں نے مدینہ منورہ میں بسیرا کیا تو یہود نے اُسے اس نقطۂ نگاہ سے غنیمت سمجھا کہ آنے والے وقت میں ان کی مدد سے ہم اپنے نصرانی دشمنوں سے انتقام لے سکیں گے۔ اسی لالچ میں کچھ دنوں بعد مہاجرین' انصار اور اہالیانِ مدینہ میں جو خیر سگالی معاہدہ ہوا اس میں یہود بھی شامل ہو گئے لیکن جیسے ہی انہوں نے دینِ اسلام کے اجالوں کو پھیلتے دیکھا' عظمتِ رسول ﷺ کو زیادہ سے زیادہ لوگوں کے دلوں میں بسیرا کرتے دیکھا۔ تو یہود کی کینہ پروری نے رنگ دکھایا۔ نقضِ عہد کے الزام سے بچنے کے لئے عیارانہ چالوں کا جال بچھانا شروع کر دیا۔ پھر انہیں یہ بھی خطرہ تھا کہ نقضِ عہد کے ظاہر ہو جانے سے مدینہ منورہ میں خانہ جنگی کے امکان کے ساتھ ساتھ ان کی تجارت ٹھپ ہو جائے گی۔ ساہوکارہ تباہ ہو جائے گا جس کا جال یہودیوں نے مدینہ اور اس کے گردونواح میں صدیوں سے پھیلا رکھا تھا۔ لہٰذا انہوں نے اپنی مذموم کوششوں کو زیرِ زمین شروع کر دیا۔ ان کوششوں میں سرِفہرست مسلمان مہاجرین اور انصار میں پھوٹ ڈلوانا' اس کے ساتھ ہی کسی طرح اوس و خزرج کی جنگِ بعاث کی تلخ یادوں کو پھر ان لوگوں کے دلوں میں تازہ کر کے ان میں جنگ

شروع کروانا بھی تھا۔

وہ مشتعل کرنے والے شعروں کا استعمال کرتے! خصوصاً وہ اشعار جو جنگ بعاث میں جذبات بھڑکانے کے لئے پڑھے گئے تھے۔ انہیں یہودی ہر محفل میں اٹھتے بیٹھتے' چلتے پھرتے گنگناتے رہتے تاکہ فریقین میں سے جو بھی سنے اس کے زخم پھر تازہ ہوں اور اوس و خزرج پھر سے صف آراء ہو جائیں۔

مسلمان یہود کی نیت کو بہت جلد بھانپ گئے۔ انہوں نے منافقین کی طرح یہود کو بھی ایک طرف دھکیل دیا بلکہ ان سے خود سردمہری کا رویہ اختیار کر کے انہیں اپنی مجلسوں سے اٹھوا دیا۔ حتیٰ کہ مسجد میں آنے سے بھی منع کر دیا۔

ابتدا میں رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کو سمجھانے اور دین اسلام کی تعلیم دینے میں بڑی جانفشانی سے کام لیا۔ لیکن ان کے کرتوت دیکھ کر کنارہ کشی کرلی لیکن انہیں بے لگام چھوڑ دینا بھی خطرناک تھا۔ وہ شہر میں ہر طرف فتنہ کی آگ بھڑکا دیتے۔ ایسے خطرناک دشمنوں سے صرف سردمہری ہی کافی نہیں تھی بلکہ ان یہود پر اپنی شوکت و قوت کا مظاہرہ بھی ضروری تھا تا کہ ان کو یہ یقین ہو جائے کہ اگر انہوں نے امن دشمن ریشہ دوانیاں کیں تو ان کا قلع قمع کیا جا سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ان کو محتاط رکھنے کے لئے گشتی دستوں کو ادھر ادھر پھرانے کی تادیبی کارروائی ضروری تھی مگر اس کے ساتھ اس بات کا بھی خاص خیال رکھا گیا کہ گشتی دستے دشمن کے ساتھ الجھ کر بلاوجہ اپنی قوت نہ کھو بیٹھیں۔ ورنہ جس طرح اہلِ مکہ نے ہمیں کمزور دیکھ کر ہمارے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا اسی طرح مدینہ میں ہمیں بے سروسامان پا کر یہودیوں کے ناپاک حوصلہ نہ بڑھ جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان گشتی دستوں میں سے ایک دستے کی کمان سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ جیسے سریع الغضب شجاعت پیشہ کو سونپی گئی جنہیں ہدایاتِ نبویہ ﷺ کے سوا کوئی طاقت حملہ کرنے سے روک نہیں سکتی تھی۔ حاصلِ گفتگو یہ ہے کہ گشتی دستوں کی نمائش کا مقصد یہودیوں کو دباؤ میں رکھنا اور اہلِ مکہ سے بغیر کسی مقابلہ یا مقاتلہ کے اپنے عقیدہ کے اظہار اور اختیار کو تسلیم کروانا تھا۔

اسلام میں جنگ کن حالات میں جائز ہے

اوپر کی سطور میں جو کچھ بار بار کہا گیا ہے اس کا مقصد یہ نہیں کہ اسلام میں اپنے دفاع یا اپنے عقیدے کی حفاظت و اختیار کے لئے جنگ کرنا جائز ہی نہیں بلکہ اسلام نے اس وقت سے لیکر تاقیامت دفاعی جنگ پورے جوش و خروش سے کرنا فرض قرار دیا ہے۔ شرط یہ ہے کہ

دشمن کے ساتھ زیادتی نہ کی جائے۔

ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۔ (19:12)

کسی طرح کی دوسروں پر زیادتی نہ کرو۔ (چاہے دوست ہو یا دشمن) اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

فرضیتِ دفاع کی پہلی دلیل

جناب عبداللہ بن جحش اسدی کا نمائشی دستہ جسے حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کے دوسرے سال رجب کے مہینہ میں گشت کے لئے بھیجا۔ ان کے ساتھ صرف بیس مہاجرین تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر دستہ جناب عبداللہ کو ایک سربمہر تحریر دے کر فرمایا کہ یہ فرمان دو روز سفر کرنے کے بعد پڑھنا۔ عبداللہ اور ان کے ساتھی بغیر اس کوشش کے کہ اس فرمان میں کیا لکھا ہے اسے دیکھنا تو چاہئے' اپنا سفر طے کرتے رہے۔ دو دن گزر چکے تو فرمانِ رسالت پڑھا گیا تو اس میں لکھا تھا۔

واذ نظرت فی کتابی ھذا فامض حتی تنزل نخلہ فترصد بھا قریشا تعلم لنا من اخبارھم

اے عبداللہ جب میرا یہ فرمان پڑھو تو نخلہ میں پہنچنے کی کوشش تیز کر دو اور وہاں پہنچ کر قریش کی نقل و حرکت یا منصوبوں کا کھوج لگا کر ہم تک خبر پہنچاتے رہو۔

افرادِ دستہ نے مضمون پڑھ کر یہ سمجھا کہ خود ان میں سے کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ وہ بدستور امیرِ دستہ کے ساتھ سرگرم سفر رہے۔

دورانِ سفر جناب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عتبہ بن غزوان رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں اپنے ہمراہیوں سے بچھڑ گئے جن کی اونٹنیاں گم ہو گئیں تھیں۔ ان کی تلاش میں وہ دونوں اپنی اونٹنیوں سمیت قریش کے ہاتھوں گرفتار ہو گئے اور ادھر امیر دستہ جناب عبداللہ بن جحش رضی اللہ تعالیٰ عنہ حسب فرمان نخلہ پہنچ گئے۔

قریش پر مسلمانوں کا پہلا حملہ

اسی اثناء میں قریشِ مکہ کا ایک تجارتی قافلہ نخلہ کی راہ سے گزرتا نظر آیا۔ ماہ رجب کا آخری دن تھا۔ قافلہ کا سردار عمرو بن حضرمی تھا۔ دیکھتے ہی مسلمانوں کا خون کھول گیا کہ انہیں لوگوں نے ہمیں اپنے گھر اور مال و متاع سے جبراً محروم کیا۔ تاہم مسلمانوں نے آپس میں مشورہ ضروری سمجھا۔

(ا) واللہ لئن ترکتم القوم ھذہ اللیلۃ لیدخلن الحرام فلیمتنعن منکم بہ۔

واللہ اگر تم نے انہیں چھوڑ دیا تو یہ شب بھر میں حرم مکہ میں داخل ہو جائیں گے پھر ان پر تصرف کجا!

(ب) ولئن قتلتموھم لتقلھم فی الشھر الحرام

اور ان پر حملہ کیا تو یہ جنگ حرمت کے مہینے میں ہو گی۔

مسلمان اس کشمکش میں پڑ گئے لیکن ذرا دیر توقف کے بعد ان کے ذہن صاف ہو گئے اور ان پر ٹوٹ پڑے۔ ایک مسلمان کے تیر سے عمرو بن الحضرمی مارا گیا۔ دو آدمی مسلمانوں نے گرفتار کر لئے جن کے ساتھ قافلہ کا مال و اسباب بھی ہاتھ آیا۔

تفسیر آیتہ الفتنۃ اکبر من القتل

امیر دستہ جناب عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ اپنے ساتھ قریش کے دونوں قیدی اور ان کا مال و اسباب لے کر مدینہ واپس آئے دونوں قیدیوں کے اسباب میں خمس پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا لیکن جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو علم ہوا تو آپؐ نے انتہائی غصہ میں فرمایا۔

ما امرتکم بقتال فی الشھر الحرام

میں نے تمہیں حرمت والے مہینے میں جنگ کی اجازت تو نہیں دی۔

یہ سن کر امیر اور دونوں قیدی اپنی اپنی جگہ دم بخود رہ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیدی اور اسباب دونوں میں سے ایک کو بھی قبول نہیں کیا۔ چنانچہ مال و اسباب اور قیدی امیر ہی کے قبضہ میں رہے۔

لیکن قریش کو مسلمانوں کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے اور نفرت پیدا کرنے کا موقع مل گیا۔ انہوں نے تمام ملک میں چاروں طرف اپنے ڈھنڈورچی پھیلا دیئے تاکہ وہ چلا چلا کر کہتے پھریں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور ان کے ساتھیوں نے حرمت کے مہینے میں ہم پر حملہ کر دیا۔ خون بہایا۔ ہمارے آدمیوں کو مال سمیت پکڑ کر لے گئے۔ اس کے جواب میں مکہ معظمہ میں گھرے ہوئے مسلمان ان کو یہ جواب دیتے کہ مسلمانوں نے رجب میں نہیں بلکہ شعبان کی رات کے پہلے حصہ میں یہ سب کیا ہے۔

یہود مدینہ کو جب اطلاع ملی تو انہوں نے بھی مسلمان پر حرمت کے مہینے میں خلافِ شرع اس عمل پر طعن و تشنیع شروع کر دی۔ اسی بہانے انہوں نے بھی مسلمانوں کے خلاف فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانا شروع کر دی۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ قل قتال فیہ کبیر۔ وصد عن سبیل اللہ وکفر بہ والمسجد الحرام واخراج اھلہ منہ اکبر عنداللہ والفتنۃ اکبر من القتل۔ ولا

یزالون یقاتلونکم حتی یردوکم عن دینکم۔ (217:2)

اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگ تم سے حرمت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجد حرام یعنی کعبہ میں جانے سے بند کرنا اور اہلِ مسجد کو اس میں سے نکال دینا (جو یہ کفار کرتے ہیں) اللہ کے نزدیک اس سے بھی بڑا گناہ ہے اور فتنہ انگیزی خونریزی سے بھی بڑھ کر جرم وگناہ ہے۔ اور یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے۔ یہاں تک کہ اگر ان کے بس میں ہو تو تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں!

چنانچہ حضرت عبداللہ بن جحش کے گشتی دستے کے نتائج اور مذکورہ آیت میں اللہ تعالیٰ نسلِ انسانی کو ایسا نظامِ سیاست پیش کرتا ہے۔ یسئلونک عن الشهر الحرام (214:12) جس سے انسانی زندگی کی اہمیت و رفعت کے کئی پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور زندگی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کا توازن قائم رکھنے کے لئے بہترین اصول کی راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

قرآن حکیم مشرکین کے اس گلہ کو حق بجانب قرار دیتا ہے کہ حرمت کے مہینے میں یقیناً جنگ و قتال حرام ہے لیکن قرآن حکیم کو خود مشرکین سے جو شکوہ ہے اس کا جواب بھی طلب کرتا ہے۔

غرض جس گناہ کا شکوہ تمہیں ہے۔ کچھ تمہارے گناہ جو اس سے بھی زیادہ خطرناک اور بڑے ہیں ان کا کیا؟ ذرا تفصیل سے سنو۔ (ا) انسان کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکنا (وصد عن سبیل اللہ)

(ب) خود کفر پہ جمے رہنا (وکفر به)

(ج) زائرین کو کعبہ کی زیارت سے منع کرنا۔ (والمسجد الحرام)

(د) لوگوں کو ان کے وطن سے نکال دینا۔ (واخراج اهله منه)

(ھ) لوگوں کو طرح طرح کے جبرو تشدد سے ان کے دین سے برگشتہ کرنا۔ (والفتنه اکبر من القتل)

اور یہ تمام گناہ از الف تا ھ جیسے حرمت کے مہینوں میں حرام ہیں۔ اسی طرح باقی دنوں میں بھی تو حرام ہیں۔

قریش جو آج گھر گھر منادی کر رہے ہیں کہ مسلمانوں نے حرمت کے مہینے میں قتل و غارت گری کی ہے ذرا اپنے گریبانوں میں بھی جھانکیں کہ انہوں نے حرمت کے مہینوں میں مسلسل تیرہ سال تک مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لئے کون سا ظلم نہیں کیا۔ کیا مشرکین اور کفارِ قریش کے لئے دوسروں کو دین کی وجہ سے ستانا مباح (جائز) ہے۔ اور خود ان

کو کفر پر قائم رہنے کا حق کس نے دیا؟ کیا مسجد حرام کے پاسبانوں کو ان کے گھروں سے نکال دینا ان کے لئے واجب ہے۔ کیا ان کے لئے دین کی وجہ سے مسلمانوں کا کھانا پینا حرام کر دینا جائز ہے؟

پھر وہ شخص کیسے مجرم قرار دیا جا سکتا ہے جو اسی بیت اللہ کے پڑوسی اور اسی حرم اور انہیں حرمت والے مہینوں میں قریش اور مشرکین کے ساتھ وہی برتاؤ کرے جو انہوں نے اس شخص کے ساتھ انہیں مہینوں اور انہیں مقدس مقامات پر کیا؟

سب سے بڑا گناہ تو یہ ہے کہ کسی حرمت والے دن ایسے لوگوں سے برا سلوک نہ کیا جائے جن کے دلوں میں دوسروں کے ساتھ برائی کرنے کا مصمم ارداہ موجود ہو۔

بلا شبہ فتنہ بپا کرنا ارتکاب قتل سے زیادہ برا ہے مگر جو قوم دوسروں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے میں کوشاں ہو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے ہٹانے کی مرتکب ہو اس کے خلاف جنگ کرنا واجب ہے۔ اور ایسی جنگ سے اللہ کا مقصد یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو کسی کے دین سے برگشتہ کرنے کی اس کے بعد جرات نہ ہو۔

مسیحیوں کا پرانا نعرہ

اس آیت ویسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ (2-217) کو سامنے رکھ کر مسیحی حضرات نے شور مچا دیا ہے کہ اسلام جہاد کی دعوت دیتا ہے۔ یعنی دین پھیلانے کے لئے جنگ ضروری قرار دیتا ہے۔ مسیحی حضرات کا یہ بہت پرانا نعرہ ہے کہ "اسلام تلوار کے زور سے اپنا سکہ منوانا چاہتا ہے"

دوستو ـــــ صاف بات تو یہ ہے کہ نعرہ لگانا تو اس کو زیب دیتا ہے۔ جس نے اپنا دین پھیلانے میں کبھی تلوار کو چھوا نہ ہو۔ اس کا اپنا دامن مذہبی حملوں سے بالکل پاک صاف ہو۔ اس نے خود سلامتی کی راہ اختیار کی ہو اور دوسروں کو بھی سلامتی کا مستحق قرار دیا ہو۔ جس کا اپنا نعرہ اور عملی مظاہرہ صلح و آشتی ہو۔ انسانیت کے درمیان اللہ اور سیدنا مسیح علیہ اسلام کے تعلق سے اخوت کے رشتہ کو قائم رکھنا جن کا دستور رہا ہو۔

میں اس کے جواب میں انجیل کی اس تشریح کو پیش کرنا نہیں چاہتا۔ جس میں لکھا ہے۔ میں زمین پر صلح کرانے نہیں آیا۔ تلوار چلانے آیا ہوں اور نہ میں انجیل کی اس آیت کی تفسیر میں جانا چاہتا ہوں جو سیدنا مسیح کے بعد ان کے ماننے والوں نے تلوار کی زبان سے دوسروں کے سامنے فرمائی۔ کیوں کہ مسلمان خود حضرت مسیح علیہ السلام کی نبوت کے قائل ہیں لیکن میں اسلام کی طرف

سے مستشرقین اور ان کے مبلغین کا یہ اعتراض دور کرنا چاہتا ہوں کہ بانی اسلام نے تلوار کے زور سے اسلام کی بنیاد رکھی۔ قرآن حکیم ان کے اس الزام کی تردید ان الفاظ میں فرماتا ہے۔

لا اکرہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی۔

دین اسلام میں زبردستی نہیں ہے۔ ہدایت صاف طور پہ ظاہر اور گمراہی سے الگ ہو چکی ہے اس کے علاوہ بات واضح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔256:2

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۔

"اور جو لوگ تم سے لڑتے ہیں تم بھی اس کی راہ میں ان سے لڑو مگر زیادتی نہ کرنا اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا" ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیات ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہیں کہ اسلام قبول کرانے میں اکراہ (یعنی دباؤ زبردستی یا لالچ) کا کوئی دخل ہی نہیں۔

جہاد کی اسلامی توجیہہ

مذکورہ آیات نمبر256 اور 190 سورہ البقرہ اور وہ آیت جو جناب عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے حوالے سے نازل ہوئی اس میں جہاد کی واضح توجیہہ یہی ہے کہ جنگ کرنا انہیں لوگوں کے ساتھ جائز ہے جو مسلمانوں کو ان کے دین سے روکیں۔ جنگ صرف اپنے اس عقیدہ کی آزادی اور حفاظت کے لئے جائز ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے دین سے مربوط ہے جیسے کہ عہد حاضر کے اسلوب میں ہم اسے ان الفاظ میں پیش کر سکتے ہیں۔

(ا) اگر کسی شخص کو اس کے عقیدے سے رشوت، دباؤ یا جبرو تشدد سے قطع نظر دلیل اور منطق سے ہٹانے کی کوشش کی جائے تو مقابل کو حق حاصل ہے کہ ایسے شخص کو یہ بھی منطق و علم سے جواب دے۔

(ب) اگر کسی شخص کو اس کے اس عقیدے سے علمی دلائل یا منطق سے ہٹ کر قوت، دباؤ، ڈراوے یا عذاب کے ذریعے روکا جائے تو ایسے شخص کو علمی جواب دلیل اور منطق کو چھوڑ کر طاقت، ڈراوا اور جبرو تشدد سے ہی دینا ہو گا۔ اس لئے کہ انسان کو اس کا شرف و بزرگی اسے اپنے عقیدے کی حفاظت کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور جو شخص انسانیت کے مفہوم کو ذرہ برابر بھی سمجھتا ہے اس کے نزدیک عقیدہ کی حفاظت مال و دولت اور جاہ و منصب بلکہ جان سے بھی زیادہ افضل ہے۔

ورنہ انسان اور حیوان ذی روح ہونے کی حیثیت سے دونوں ایک سے ہیں، اسی طرح کھانے پینے نشوونما اور حفاظتِ بدن میں دونوں کے احساسات ایک سے ہیں لیکن عقیدہ جسے

معنوی حیثیت حاصل ہے اس میں ایک انسان دوسرے انسان کے ساتھ ہی مربوط ہے۔ یہی نہیں بلکہ عقیدہ ہی انسان اور اس کے خالقِ حقیقی اللہ عزوجل کے درمیان واحد ربط و تعلق ہے۔ لیکن انسان اور حیوان میں عقیدہ کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ معلوم ہوا عقیدہ ہی انسان کو حیوان پر شرف و اکرام کا اعزاز دیتا ہے۔

عقیدے ہی کی بناء پر انسان جو اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی دوسرے انسان کے لئے بھی پسند کرتا ہے۔ یہ عقیدہ ہی کے تعلق کا کرشمہ ہے کہ انسان خود نادار اور مفلس ہو کر بھی اپنے ہم عقیدہ انسان کی ضروریات کو پورا کرنے میں لطف و انبساط محسوس کرتا ہے۔ اور اس ربط و ہمدردی سے انسان کا مقصد ان کمالات کو حاصل کرتا ہے جنہیں اللہ تعالیٰ نے عالمِ کون و مکاں کے ہر ذرے کو اس کی منفعت کے لئے مقدر فرما رکھا ہے۔

یہی عقیدۂ توحید جب انسان کی روح میں نفوذ حاصل کرلیتا ہے تو اس کے بعد مخالف فریق اس کو اس عقیدے سے ہٹانے کے لئے چاہے کتنے ہزارہا مظالم استعمال کر دیکھے مگر وہ اپنے ارادہ میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ غریب چاہے اس کے جور و ستم کو روک بھی نہ سکتا ہو، تمام سختیاں برداشت کرلیتا ہے لیکن اپنے عقیدے کو ترک نہیں کرتا۔ جیسے کہ مکہ میں ہجرت کرنے سے پہلے مسلمانوں کا معاملہ سب کو معلوم ہے۔ ان مسلمانوں نے ہر قسم کے مظالم برداشت کئے لیکن صبر کا دامن نہیں چھوڑا، شدتِ بھوک سے جان ہونٹوں تک آگئی مگر عقیدۂ توحید کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھی۔

عہدِ اولیٰ کے مسیحی حضرات

بلاشبہ مسیح علیہ السلام کی آواز پر سب سے پہلے لبیک کہنے والے جنہوں نے سب سے پہلے دینِ مسیح اختیار کیا۔ انہوں نے بھی مکہ کے مسلمانوں کی طرح اپنے دین کے لئے ہر قسم کے ظلم برداشت کئے جن کی تعداد مکہ کے مسلمانوں جتنی نہ تھی۔ صرف چند ہی افراد تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے ان کی قوتِ ایمانی کی وجہ سے پسند فرمایا۔ وہ اپنے عقیدے اور ایمان کی حفاظت میں کسی قوت کے سامنے شکست خوردہ نہیں ہوئے۔ ایسے لوگوں کی اپنے عقیدہ پر ثابت قدمی، استقلال اور ایمان کی مضبوطی کی گواہ خود انجیل بھی ہے کہ اگر وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے ہٹ جانے کا حکم دیں تو وہ ہٹ جائے۔

ایک اور شخص جسے دشمن اس کے عقائد سے ہٹانا چاہتا ہے اس پر ہر طرح کے ظلم کرتا ہے اور یہ شخص اپنے مخالف کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ اسے اس بات کی ہرگز اجازت نہیں کہ وہ مقابلہ کرنے میں ذرہ برابر بھی کوتاہی کرے اگر اس نے مقابلہ نہیں کیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ

اس کا ایمان اور عقیدۂ توحید ابھی پکا نہیں۔

یہی عمل حضرت محمد ﷺ اور ان کے رفقاء رضی اللہ عنہم اجمعین نے مدینہ میں مستقل قیام کے بعد کیا جیسا کہ مسیحوں نے شام قسطنطنیہ پر قبضہ ہو جانے کے بعد عیسائیت کے دشمنوں پر روا رکھا' روم کے بعض بادشاہ جو رقیق القلب بھی تھے لیکن انہوں نے بھی اپنے عقیدہ کی حفاظت میں نرم دلی کو بالائے طاق رکھ کر دشمنوں پر دل کھول کر ظلم کئے۔

آج مسیحی منادی کرنے والے کہتے پھرتے ہیں کہ دینِ مسیح جنگ کرنے کو مطلق طور پر منع کرتا ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ ان کا دین کیا کہتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی وہ تاریخ جو آج ہمارے سامنے معتبر گواہ ہے وہ کیا بتاتی ہے ـــــ اس کا کہنا ہے کہ جونہی مسیحیت نے آنکھیں کھولیں' مذہب اور عیسویت کے لئے اس نے زمین کو انسانی خون سے رنگ دیا۔ کیا مملکتِ روم میں انسانی خون سستا نہیں ہوا؟ کیا یورپ میں عیسویت کی خاطر خون کے دریا نہیں بہائے گئے؟ کیا صلیبی جنگوں کو مسیحیت کے پرستاروں نے ہوا نہیں دی؟ کیا یورپ سے ان کے لشکر صلیبیں اٹھا کر وسط ایشیاء کے مسلمانوں پر وحشیوں کی طرح حملہ آور نہیں ہوئے؟ اور ارضِ مقدس پر صدیوں تک انسانی خون کا سمندر ٹھاٹھیں نہیں مارتا رہا؟ کیا ان جنگوں میں مقدس پاپائے روم نے فوج کے مسیحی سپاہیوں کو برکت عطا کر کے انہیں بیت المقدس فتح کرنے کی تلقین نہیں فرمائی تھی؟ جو اس وقت مسلمانوں کے زیرِ اقتدار تھا۔ کیا پاپایان مقدس کو اس بات کا علم نہ تھا کہ مسیحیت تو انسان کی خونریزی سے منع کرتی ہے یا قرونِ وسطیٰ کا یہ دور بربریت اور وحشت کا دور تھا اور اس دور کے حوادث کو دینِ مسیح کے ساتھ کوئی واسطہ نہیں؟

اگر مسیحی کرم فرما اس بات پر بضد ہیں کہ جس زمانہ میں صلیبی جنگیں برپا ہوئیں وہ ظلمت و وحشت کا دور تھا مگر صلیب کے پرستاروں نے بیسویں صدی میں جبکہ تہذیب و تمدن کی روشنی انسانوں کی آنکھوں کو تاریک کر رہی ہے اتحادیوں کے مشترکہ نمائندہ لارڈ اللسی نے 1918ء میں بیت المقدس پر صلیب لہراتے ہوئے نہایت فخر کے ساتھ نہیں کہا تھا کہ آج صلیبی جنگوں کی تکمیل ہوئی۔

اگرچہ گذشتہ زمانہ میں مسیحوں کے اندر ایسے پاک باطن لوگ بھی پیدا ہوئے جو جنگ و قتال سے نفرت اور انسانی محبت کے قیام و آرام سے محبت کرنے والے تھے۔ ہمیں ان سے بھی انکار نہیں لیکن مسلمانوں میں ایسے لوگ ان کی نسبت زیادہ پیدا ہوئے جو روحانی عظمت کا نمونہ' اختلاف سے بالاتر' جنگ و جدال سے یکطرفہ اور انسانی برادری اور اخوت قائم رکھنے کے فریفتہ تھے۔

عیسائی اور مسلمانوں میں ایسے مقدس لوگوں کی کمی نہیں رہی لیکن انسانی زندگی صدیوں سے جس کمال کو حاصل کرنے کے لئے دوڑ دھوپ کر رہی تھی اس کے لئے اسلام سے پہلے اس مطلوبہ منزل کو حاصل کرنے کی کوئی راہ نہ تھی۔ تقریباً 1401 سال پہلے رسول اللہ ﷺ نے اپنی جائے ولادت کو چھوڑ کر مدینہ منورہ کو اپنا وطن بنایا تو اس وقت تک بھی دنیا کے ہر خطہ میں بسنے والی قوتیں آپس میں مصروف جنگ تھیں اور طرح طرح کے جہنمی آلات کی ایجادات میں مشغول تھیں۔

ہمیں اس بات سے بھی انکار نہیں کہ اس وقت جنگجو قومیں ایک دوسرے سے خیر سگالی معاہدے کرتی ہی نہ تھیں بلکہ آج کی طرح اس زمانے میں بھی صلح کرتے لیکن صلح کے پس پردہ مہلک ہتھیاروں کی تیاری کے لئے وقت مطلوب ہوتا۔ گویا حرمتِ جنگ اور تخفیفِ اسلحہ کو اپنے عیار ارادوں کی تکمیل کے لئے استعمال کیا جاتا۔

لیکن دنیا نے پہلی بار ایک ایسی آواز سنی جس میں جنگ کی کھلم کھلا مذمت تھی۔ ایک ایسی آواز جو سچائی سے نکلی، سچ کا نور بن کر تمام دنیا کے انسانوں کے کانوں سے ٹکرائی۔ یہ دین اسلام کی آواز تھی لیکن اہلِ مغرب آج تک کسی ایسے طریق کار پہ قادر نہیں ہو سکے جس سے جنگ رک سکے اور نسل انسانی کو مسلح جنگوں کے بدلے امن و سلامتی کا گہوارہ نصیب ہو۔

دین اسلام کی بنیاد صرف خیالی عقائد و اوہام پر نہیں۔ نہ ہی دین اسلام انفرادی زندگی کو چالاکیاں سکھاتا ہے بلکہ دین اسلام دینِ فطرت ہے جس کی پیروی فرد اور جماعت سب پر ایک سی فرض ہے۔ دین اسلام مسلمہ حقیقتوں اور طبعی تقاضوں کے استقلال کا مرکزِ اولیٰ ہے۔

جہاں تک جنگ و جدال کا تعلق ہے دین اسلام اس کی اہمیت کو مشروط کر دیتا ہے۔ لیکن انسانیت کے احترام کو ہر حالت میں قائم رکھنے کی سخت تاکید فرماتا ہے۔ البتہ جب کوئی گروہ یا فرد انسانیت سے بغاوت کر جائے بربریت اور وحشت پہ اتر آئے تو جنگ کو لازم قرار دیتا ہے۔ دین اسلام میں اپنا ہو یا بیگانہ۔ دشمن ہو یا دوست اس سے جنگ کرتے وقت بھی جس نرمی کی تلقین کرتا ہے۔ وہ جنگ کے اصولوں کی اصلاح کے لئے ہی سب سے زیادہ موثر اور عظیم تر تبدیلی ہے جو انسان کو نیکی اور کمالِ ضبط حاصل کرنے کی ترغیب ثابت ہوتی ہے۔

دین اسلام "جنگ" صرف دو حالتوں میں جائز قرار دیتا ہے۔

(ا) انسانی زندگی کی حفاظت کے لئے۔

(ب) عقیدۂ توحید کی حفاظت کے لئے۔ دین اسلام نے جس قسم کے جہاد کو جائز قرار دیا ہے اور قرآن حکیم میں اس کی تلقین و تاکید فرمائی ہے۔ اس کی چند مثالیں ہم پچھلے صفحات میں بیان کر چکے ہیں اور ان کی مزید تفصیل انشاء اللہ آنے والے صفحات میں پیش ہو گی۔

غزوۂ بدر

غزوہ بدر

ایک نئی راہ

عبداللہ بن جحش کے گشتی دستے نے اسلام کا رخ ایک نئی راہ کی طرف موڑ دیا جس میں روسائے مکہ میں سے ایک رئیس کی موت حضرت واقد بن عبداللہ رضی اللہ عنہ (التیمی) کے تیر سے واقع ہو گئی۔ تاریخی طور پر مسلمانوں کے ہاتھ سے یہ پہلا قتل ہوا۔ جبکہ اس سے پہلے کئی مسلمانوں کا قتل قریش یا کفارِ مکہ کے ہاتھوں ہو چکا تھا۔ نہ معلوم سیرت نگار اس قتل کا ذکر کرتے ہوئے کفار کے ہاتھوں مسلمان مقتولین کی تعداد لکھنا کیوں بھول جاتے ہیں؟ یہ وہ واقعہ ہے جس پر معترضین کو اللہ تعالیٰ نے خود جواب دیتے ہوئے فرمایا۔ یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ (217:2) نازل ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد کفارِ مکہ نے حضرمی کے قتل اور حرمت والے مہینے میں واقع ہونے کی وجہ سے تمام عرب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے رفقاء رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے خلاف بھڑکانے کا ذریعہ بنا لیا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یقین ہو گیا کہ قریشِ مکہ سے سمجھوتے کی توقع رکھنا بے سود ہے۔

کفارِ مکہ کے اس رویہ کے پیش نظر مسلمانوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ کفارِ مکہ کے خلاف جہاد کے لئے تیار ہو جائیں۔ کفارِ مکہ جو کئی سالوں سے مسلمانوں کے صرف اس لئے دشمن تھے کہ انہوں نے بت پرستی چھوڑی اور ایک اللہ اور ایک رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ایک کتاب (قرآن حکیم) پر ایمان لے آئے، تاریخ گواہ ہے کہ کفارِ مکہ ان مسلمانوں کو اللہ کی راہ پر چلنے سے روکنے کے لئے ہر طرح کا جبرو تشدد کرتے رہے۔

ایک تجارتی قافلہ

2 ہجری کی بات ہے۔ مسلمانوں کو یہ اطلاع ملی کہ ابوسفیان تجارتی سامان لے کر شام کی

طرف جا رہا ہے۔ مسلمانوں نے اسے گھیرنے کا فیصلہ کیا۔ (مسلمانوں کے اس سفر کا نام جیش العشیرہ) ہے لیکن مسلمانوں کے مطلوبہ جگہ پہنچنے سے پہلے اتفاق سے ابوسفیان دو روز پہلے ہی آگے نکل چکا تھا اور مسلمان اسی روز سے ہی اس قافلہ کی واپسی کے منتظر بیٹھے رہے۔ جیسے ہی اس کے لوٹنے کا وقت آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قافلہ کے بارہ میں معلومات حاصل کرنے کے لئے طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سعید بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمایا۔ وہ خور نامی مقام پر پہنچ کر کشد الجہنی کے گھر گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ جب کارروان وہاں سے گزرا دونوں اصحاب تیز رفتاری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور اطلاع دینے کے لئے روانہ ہو گئے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کے مدینہ پہنچنے سے پہلے خبر مل چکی تھی۔

اس کارروان کی تجارت میں مکہ کے تمام مرد اور عورتیں شریک تھے۔ جس کی مجموعی مالیت پچاس ہزار دینار تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطرہ تھا کہ پہلے کی طرح ابوسفیان کا قافلہ انتظار ہی انتظار میں نکل نہ جائے۔ آپ نے مسلمانوں کو جمع کر کے حکم فرمایا۔

ھذہ عند قریش فاخرجو الیھا لعک اللہ ینفعکموھا۔

قریش کا قافلہ واپس جا رہا ہے۔ اے مسلمانو! ہمت کرو امید ہے کہ اللہ تمہیں تمہارے اموال و متاع سے جو تم سے چھینے گئے زیادہ دے۔

کچھ مسلمان تو آمادہ ہو گئے کچھ الجھن میں پڑ گئے۔ البتہ کافروں نے مالِ غنیمت کے لالچ میں ساتھ دینے کی آواز لگائی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ہم ایمان کے بغیر ان کے تعاون کے محتاج نہیں۔

ابوسفیان پھر بچ نکلا

شام کو جاتے ہوئے ابوسفیان کو مسلمانوں کے ارادہ کی اطلاع مل چکی تھی اس لئے وہ واپسی میں محتاط ہو کر مسلمانوں کی نقل و حرکت کی اطلاعیں حاصل کرتے ہوئے سرگرم سفر رہا۔

ادھر کشد جہنی جس کے گھر میں ہی مسلمان گھات لگائے بیٹھے تھے ابوسفیان نے اس سے کسی صورت مسلمانوں کے موجودہ ارادوں کی خبر حاصل کرنا چاہی تو اس نے مسلمانوں کے ارادوں سے تو مطلع نہیں کیا لیکن اس نے اس خیال سے کہ قریش کا مال و متاع جس کے ہمراہ 30-40 آدمیوں سے زیادہ نہیں۔ کہیں مسلمان اسے لوٹ نہ لیں۔ ابوسفیان اور مسلمانوں سے چوری ایک شخص جس کا نام ضمضم بن عمرو الغفاری تھا۔ اسے کچھ رقم دے کر قریش مکہ کو خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے بھیج دیا۔

ضمضم چلایا

ضمضم نے مکہ کے قریب پہنچ کر اپنی اونٹنی کے کان اور ناک کاٹ لئے اور پھر جیسے شہر کے کنارے پہنچا تو اپنی قمیض کا گریبان اور پیچھے سے دامن پھاڑ کر زور زور سے چلایا۔

مکہ والو تمہارا قافلہ خطرہ میں ہے۔ مسلمان ابوسفیان کے قافلہ پہ حملہ کرنے والے ہیں۔ امید نہیں کہ تم اپنا مال اسباب بچا سکو۔ کون بہادر ہے جو ابوسفیان کی امداد کے لئے نکلے۔

ابوجہل نے ابھارا

ابوجہل نے سنا تو پہلے کعبہ کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے باپ، دادا کے بتوں سے امداد طلب کی پھر لوگوں کو ابھارا ابوجہل نازک مزاج، فصیح الزبان اور ذہین بھی تھا۔ مگر قریش کو ابوجہل نہ بھی اکساتا تو بھی چونکہ ابوسفیان کے قافلہ کا سامان سب کا تھا۔ اس لئے ابوجہل کی ایک ہی آواز نے سب کے تن بدن میں آگ لگا دی۔

البتہ مکہ کے رہنے والوں میں کچھ لوگوں کے دلوں میں مسلمانوں کی حالتِ زار کی وجہ سے ہمدردی تھی۔ انہیں مظلوم مسلمانوں کا پہلے حبشہ ہجرت کرنا اور کفار کے ظلم و ستم سے تنگ آ کر اپنے وطن کو چھوڑ کر مدینہ جانے پر مجبور ہونا سب یاد تھا۔ لہٰذا وہ ان کے ساتھ نکلنے میں ہچکچا رہے تھے لیکن دوسری طرف ان کو یہ بھی خطرہ تھا کہ ہم نے ابوسفیان کی مدد نہ کی تو ہمارا مال و متاع لٹ جائے گا۔

پرانی دشمنی

ان میں سے اکثر قریش اور بنو کنانہ کی دشمنی کی وجہ سے یہ خطرہ محسوس کرتے تھے کہ جب ہم محمد ﷺ کے سامنے صف آرا ہوں تو کہیں بنو کنانہ اپنا پرانا بدلہ لینے کے لئے ہم (قریش) پر پشت سے حملہ نہ کر دیں؟ قریش کے دلوں کا یہ خوف اپنا اثر دکھانے ہی کو تھا کہ مالک بن جعشم (المدلجی) نے جو کنانہ کا بڑا چودھری تھا' قریش کے اس خوف کی خبر سنتے ہی وہ فوراً قریش کے مجمع میں پہنچا اور کہا۔

انا جار لکم من ان تاتیکم کنانہ من خلفکم بشئی تکرھونہ

میرے دوست قریشیو! اگر بنو کنانہ تمہارے ساتھ غداری کریں تو میں اس کا ذمہ دار ہوں۔

مالک بن جعشم کی حوصلہ افزا تقریر نے ابوجہل اور عامر حضرمی کی اور ہمت بندھا دی۔ ابن جش کے ہاتھوں اسی کا بھائی عمرو الحضرمی نخلہ کے مقام پر مارا گیا تھا' اس لئے ابوجہل کے ساتھ یہ بھی مسلمانوں پر یلغار کرنے کا سخت حامی تھا۔

اہل مکہ میں سے جو شخص خود جنگ کے قابل تھا اس نے روانگی کی تیاریاں شروع کر دیں۔

مگر جو شخص کسی وجہ سے معذور تھا اس نے معاوضہ دے کر اپنی جگہ کسی کو مقرر کر لیا البتہ ابولہب نے ساتھ نکلنے کی طاقت رکھتے ہوئے بھی اپنے چار ہزار دینار کے مقروض عاص بن ہاشم کو اس قرض کی رقم کے عوض اپنی جگہ مقرر کر دیا۔

امیہ بن خلف اور ابوجہل

امیہ بن خلف بہت زیادہ موٹاپے کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور تھا۔ اور ویسے بھی جان بچانے کا لالچی بھی۔ وہ اپنی جان بچانے کی غرض سے بچنے چھپنے کی کوشش میں تھا کہ ابوجہل اور عقبہ بن ابی معیط دونوں امیہ کے پاس آئے۔ وہ اس وقت کعبہ کے اندر بیٹھا ہوا تھا اس کے قریب ہی رکھی ہوئی انگیٹھی میں لوبان سلگ رہا تھا۔ ابوجہل نے آتے ہی سرمہ دانی اور سلائی اپنی جیب سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دی اور عقبہ بن ابی معیط نے قریب رکھی انگیٹھی اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دی اور کہا تم عورت ہو گھر میں بیٹھے بیٹھے خوشبو سونگھو۔ ابوجہل نے کہا۔ اے عورت سرمہ حاضر ہے۔ امیہ مجبور ہو گیا اور مکہ معظمہ کا سب سے زیادہ قیمتی اونٹ خرید کر اپنے دوستوں کے ساتھ مکہ سے چل نکلا۔ غرض یہ کہ مکہ میں کوئی ایسا فرد باقی نہ رہا جس میں چلنے پھرنے کی طاقت ہو اور ابوجہل کے ساتھ چلنے سے باز رہا ہو۔

8ویں رمضان المبارک

2 ہجری کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ سے سفر شروع فرمایا اور اپنی عدم موجودگی میں نیابتِ صلوٰۃ (یعنی امام) جناب ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نابینا کو سونپی! لیکن مقام روحا پہ پہنچے تو ابو لبابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مدینہ منورہ پہ اپنا قائم مقام مقرر فرما کر واپس بھیجا۔

مسلمانوں کے اس دستے کے دو سیاہ رنگ کے علم تھے۔ سواری میں 70 اونٹ جس پر ایک ایک (باری باری) کر کے دو دو سے لیکر چار چار تک سوار ہوتے۔ خود ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ آپ کی سواری پہ جناب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مرثد الغنوی سوار تھے اور ایک اونٹ پر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سوار تھے۔ اس دستہ میں کل 305 افراد تھے۔

مہاجرین (از مکہ) 83

اوس 61 از انصار مدینہ

خزرج 16 از انصار مدینہ

کل تعداد۔ 305

مسلمان تیز رفتاری سے چلے کہ کہیں ابوسفیان ان کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ ہر قدم پر وہ

قافلہ کے بارہ میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑھتے رہے۔ جب روحا سے تین میل دور عرق انطبیہ کے مقام پر پہنچے تو ایک بدو ملا مگر اس سے کوئی اطلاع نہ مل سکی۔ وہاں سے بڑھ کر جب وادی ذفران تک پہنچے تو پتہ چلا کہ قریشِ مکہ قافلے کی حمایت میں سیلاب کی طرح بڑھ رہے ہیں۔

صورت اب مختلف ہو گئی اب مسلمانوں کا مقابلہ (ابوسفیان کے 30 - 20 آدمیوں کی بجائے تمام مکہ والوں سے تھا جن کی قیادت مکہ کے چوٹی کے سردار کر رہے تھے۔ جو شمشیر زنی اور بہادری میں اپنا مقام رکھتے تھے۔ یہ بھی سنا گیا کہ یہ سب سر پہ کفن باندھ کر اپنے اپنے مال کی حفاظت کے لئے گھروں سے نکلے ہیں۔ اب مسلمانوں کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات ابھرنے لگے۔

(ا) ابو سفیان پہ غلبہ حاصل کرنے کے بعد مال و متاع کا منافع اور بقیتہ السیف (جنگی قیدی) قریش کی گرفتاری سے مزید منافع یقینی ہو گا۔

(ب) لیکن جب قریش کو یہ معلوم ہو گا۔ تو وہ بہت بڑی فوج لے کر ہم پر حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ جس کے بعد اگر وہ ہم سے مغلوب ہو گئے تو ہم اپنا مال و اسباب واپس لینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

(ج) اگر ہم ابو سفیان کا خیال چھوڑ کر مدینہ واپس چلے جائیں۔ تو قریش اور کفارِ مکہ کے علاوہ مدینہ کے مشرکین کفار اور یہود کی نگاہوں میں ہم بے حیثیت ہو جائیں گے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ قریش مکہ کی طرح مدینہ کے یہود بھی ہمیں بے سہارا سمجھ کر ظالمانہ برتاؤ شروع کر دیں گے۔ اس طرح دین اسلام کی پوری شان و شوکت پر حرف آ جائے گا۔

مجلسِ مشاورت

وادیٔ ذفران میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریشِ مکہ کے ارادوں کی یقینی معلومات حاصل ہونے کے بعد مجلسِ مشاورت قائم فرمائی۔ جس میں سب سے پہلے ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ اس کے بعد حضرت مقداد بن عمرو انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔

یا رسول اللہ: امض لما اراک اللہ فنحن معک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل فرمانے میں ہماری طرف سے دل میں کوئی خدشہ نہ لائیں ہم اسرائیل کی مانند آپ سے اذهب انت وربک فقاتلا (جاؤ تم اور تمہارا رب جنگ کرے) نہیں کہیں گے بلکہ ہم کہتے ہیں انا معکما مقاتلون ہم آپ کے دائیں بائیں دشمنوں سے جنگ کریں گے۔

اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حضرات کی طرف نگاہ توجہ فرمائی جنہوں نے عقبہ میں بیعتِ کبریٰ میں اپنے ساتھ اپنے عیال و اولاد کو بھی آپ کے حکم پر نثار کر دینے کا وعدہ کیا تھا اگرچہ اس عہد میں جارحانہ حملہ کی وضاحت نہ تھی پھر بھی جب انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ سوال کو اپنی طرف متوجہ دیکھا تو ان کے لشکر کے علم بردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ تعالٰی عنہ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔

انک تریدنا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کی نگہ کا سوال ہم سے ہے؟ رسول اللہ نے فرمایا۔ ہاں تمہاری طرف ہی ہے۔

سعد بن معاذ رضی اللہ تعالٰی عنہ نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ لقد امنابک و صدقناک و شہد نا ان ماجئت بہ ھو الحق و اعطیناک علٰی ذلک عھودنا و مواشیقنا علی السمع و طاعتہ فا مض لما اردت فنحن معک ہم آپ کی رسالت پر ایمان لے آئے ہم نے آپ کی صداقت کی گواہی دینے میں سبقت کی۔ ہم نے قرآن حکیم کی توثیق کی' آپ کی اطاعت پر پکا عہد کیا' آپ نے جو بھی ارادہ فرمایا ہے۔ آپ اللہ تعالٰی کے حکم کی تعمیل فرمائیں' ہم آپ کے ساتھ ہیں' ہماری طرف سے کوئی خدشہ دل میں نہ لائیں

فوالذی بعثک او استعرضت بنا ھذالبحر فخضتہ لخضناہ معک ماتخلف منا رجل واحدو مانکرہ ان تلقی بنا عدو ناغدا" انا لمنصبر فی الحرب صدق اللقاء لعل اللہ یریک منا ما تقر بہ عینک فسر بنا علٰی برکتہ اللہ!

اس اللہ جل شانہ کی قسم جس نے آپ کو مبعوث فرمایا۔ اگر آپ سمندر میں قدم رکھیں تو ہم بھی بلا دریغ اس میں کود پڑیں گے اور ہم سب میں سے ایک بھی پیچھے نہیں رہے گا اور نہ ہم دشمنوں سے شمشیر آزما ہونے سے دریغ کریں گے۔ ہم لڑائی کے میدان میں صابر اور مقابلہ کے مواقع پر ثابت قدم رہنے والے ہیں۔ ہمیں امید ہے ہماری وجہ سے اللہ تعالٰی آپ کے دل کو راحت کا موجب بنائے گا۔ بہتر یہ ہے کہ آپ دشمن کو گھیرنے کے لئے جلد کوچ فرمائیے۔

سعد رضی اللہ تعالٰی عنہ کی تقریر جاری تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرہ مبارک پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے اور فرمایا۔

سیرو و بشرو فان اللہ قد وعدنی احدی الطائفتین۔ واللہ کانی انظر الٰی مصارع القوم۔

دوستو اب یہاں سے کوچ کرو' اللہ کی طرف سے تمہارے لئے فتح کی بشارت ہے۔ اللہ تعالٰی نے دشمن کے دو قافلوں میں سے ایک پر نصرت کا وعدہ فرمایا ہے۔ اللہ کی قسم مکہ والوں میں سے ہر

ایک کی قتل گاہ میری نگاہوں کے سامنے ہے۔

مقام بدر

سفر شروع ہوا اور منزلیں طے کرتے ہوئے جب مسلمانوں کا قافلہ مقام بدر کے قریب پہنچا تو آنحضرت ﷺ نے اپنے رفقاء کو وہیں چھوڑا اور اکیلے گشت کے لئے نکلے ذرا فاصلہ پر ایک بوڑھے شخص سے ملاقات ہوئی جس سے آپ ﷺ اجنبیوں کی طرح قریش کے ساتھ اپنے اور مسلمانوں کے بارے میں دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اہل مکہ نے قریب ہی پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے آئے اور علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔ زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کو ایک دستہ دے کر دشمن کے بارے میں پوری معلومات کے لئے بدر کے کنوئیں کی طرف بھیجا۔ یہ دستہ تعمیل ارشاد کے بعد جب واپس آیا تو ان کے ہمراہ دو نوعمر لڑکے تھے۔ جن سے گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ مکہ والے اس ٹیلہ کے پیچھے پڑاؤ ڈالے ہوئے ہیں۔ مگر یہ لڑکے ان کی نفری کی تعداد کے بارہ میں کچھ نہ بتا سکے۔

رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا وہ لوگ روزانہ کتنے اونٹ ذبح کرتے ہیں؟

لڑکوں نے جواب دیا۔ ایک روز نو۔ اور دوسرے دن دس اونٹ ذبح کرتے ہیں۔ اس سے رسول اللہ ﷺ کی فراست نے قریش کی تعداد کا اندازہ نو سو سے لیکر ایک ہزار تک بتا دیا۔ ان لڑکوں سے حاصل شدہ معلومات سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ مکہ کے تمام سرغنہ قریش مکہ سے نکل آئے ہیں۔ یہ سن کر سید البشر ﷺ نے فرمایا۔ ھذہ مکہ قد القت علیکم افلاذ کبدھا۔

مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہارے کچلنے کے لئے اگل دیئے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی رسول اللہ ﷺ کی تسلی اور اطمینان اس یقین پر تھی کہ میرے ساتھیوں رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کے دلوں میں ایمان و یقین اور استقلال کی موجودگی اللہ تعالیٰ کی نصرت و امداد کی ضامن ہے۔

پہلے اصحاب ثلاثہ (علی رضی اللہ عنہ' زبیر رضی اللہ عنہ اور سعد رضی اللہ عنہ) کی طرح سراغ رسانی کے لئے رحمۃ للعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کچھ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھیجا۔ یہ حضرات مقام بدر پہ پہنچے تو اپنی سواریوں کو ایک کھلی جگہ بٹھا کر خود مشکیزے لے کر قریبی چشمہ پر پہنچے تو وہاں پر پہلے سے پانی بھرتی ہوئی دو لڑکیاں ایک دوسری سے باتیں کر رہی تھیں۔ ایک لڑکی دوسری کو کہہ رہی تھی۔ ''کل یا پرسوں تک ایک قافلہ یہاں آنے والا ہے۔ میں ان

کی مزدوری کر کے تمہارا قرض چکا دوں گی" یہ خبر ملنے کے بعد دونوں نے واپسی پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس خبر سے مطلع فرما دیا۔

ابوسفیان پھر بچ کر نکل گیا

قریشِ مکہ اپنے ارادوں کی تکمیل کے منصوبے بنانے میں مصروف رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کے منتظر کہ اس اثناء میں ابوسفیان اپنے قافلہ کو دور چھوڑ کر خود بدر کے کنوئیں کے پاس پہنچا تو اسے مجدی بن عمرو ملا' اس نے ابوسفیان کے پوچھنے پر بتایا کہ ابھی ابھی دو شتر سوار مسلمان ادھر آئے۔ اپنی سواریاں اس جگہ پر بٹھائیں۔ یہ سن کر ابوسفیان فوراً اس جگہ پہ پہنچا اور اونٹ کی مینگنیاں اٹھا کر جائزہ لیا تو ان میں مدینہ منورہ کے عام چارہ کی علامت پائیں تو فوراً الٹے پاؤں بھاگا اور قافلہ کا راستہ بدل کر سمندر کے کنارے کنارے سفر اختیار کر کے خود کو مسلمانوں کی دستبرد سے بچا لیا۔

دوسرے دن

مسلمانوں کا خیال تھا کہ دوسرے روز ان کی مڈبھیڑ ابوسفیان کے قافلہ سے ہو جائے گی۔ مگر جب ان کو یہ خبر یقینی طور پہ مل گئی کہ ابوسفیان تو چالاکی سے راہ بدل کر نکل گیا ہے لیکن اس ٹیلے کے پیچھے مکہ والوں کا لشکر ابھی بھی مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی نیت سے پڑاؤ ڈالے پڑا ہے تو مسلمانوں کے قافلہ میں جو لوگ محض مالِ غنیمت کے لالچ میں ساتھ آئے تھے وہ تو مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔ ان میں سے دو چار آدمیوں نے تو مدینہ واپس جانے کی اجازت بھی مانگ لی تا کہ انہیں اہلِ مکہ سے مقابلہ کرنے کا موقع ہی نہ آئے' اس موقع پر اللہ تعالیٰ کی آیات نازل ہوئیں!

واذیعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکة تکون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق بکلمة ویقطع دابر الکافرین۔(7:8)

اور اس وقت کو یاد کرو جب اللہ تعالیٰ تم سے وعدہ کرتا تھا کہ ابوسفیان اور ابوجہل کے دو گروہوں میں سے ایک گروہ تمہارا مسخر ہو جائے گا اور تم چاہتے تھے کہ جو قافلہ بے شان و شوکت یعنی بے ہتھیار ہے۔ وہ تمہارے ہاتھ لگ جائے اور اللہ جانتا تھا کہ اپنے فرمان سے حق کو قائم رکھے اور کافروں کی جڑ کاٹ کر پھینک دے تا کہ سچ کو سچ اور جھوٹ کو جھوٹ کر دے چاہے مشرک ناخوش ہی کیوں نہ ہوں۔

قریش کا لشکر

قریش کے لشکریوں کو جب یہ معلوم ہو گیا کہ جس کی حفاظت کے لئے ہم لوگ آئے تھے وہ تو بچ کر نکل گیا ہے تو انھوں نے سوچا کہ جنگ کئے بغیر ہمیں واپس چلے جانا چاہئے۔ مسلمانوں کے لئے اب اپنی ناکامی کا افسوس ہی کافی ہے۔ اسی اثناء میں خود ابوسفیان نے بھی پیغام بھیجا کہ تم لوگ میرے بچاؤ کے لئے وہاں پہنچے تھے اور میں بچ کر مکہ معظمہ پہنچ گیا ہوں۔ لہٰذا آپ لوگ واپس مکہ پہنچ جایئے۔ ابوسفیان کی اس رائے سے اکثر افراد نے اتفاق کیا لیکن جب ابوجہل نے سنا تو انتہائی غصہ میں شدتِ جذبات سے لبریز اعلان کیا۔

واللہ لا نرجع حتی نرد بدرا فنقیم علیہ ثلاثا فننحر نا الجزر و تطعم الخمر و تصرف القیان و تسمع بنا العرب بمسیرنا و جمعنا فلا یزالون بھابوننا ابدا بعدھا۔

جب تک تین روز تک ہم بدر میں رکیں نہیں اور اس شان سے رنگ رلیاں نہ منائیں کہ موٹے تازے اونٹ ذبح کئے جائیں، گرم گرم کبابوں کے ساتھ شرابِ ناب لنڈھائی جائے، طوائفوں کے رقص و نغمہ سے محفلیں گرم کی جائیں یہاں تک کہ ہماری بزمِ عیش و عشرت کی شہرت مدینہ اور مکہ کے گھر گھر تک پہنچ جائے اور سب کے دلوں پر ہمارا خوف مسلط ہو جائے۔

ابوجہل کے اس خیال کا پس منظر یہ تھا کہ مقامِ بدر عرب کی مشہور میلہ گاہ تھی اور ابوجہل کے خیالات کے مطابق اس میدان سے بغیر کوئی مرعوب کن تاثر چھوڑے یہاں سے لوٹ جانے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ تمام ملک کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ ہم اہلِ مکہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے ڈر کر میدان سے بھاگ گئے ہیں۔ اس خبر کا انجام یہ بھی ہو گا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے رفقاء کا رعب چاروں طرف پھیل جائے گا۔ اور ان مسلمانوں کے حوصلے اور بڑھ جائیں گے ایسے جارحانہ حوصلے جس کی ابتداء عبداللہ بن جحش کے گشتی دستے کے ہاتھوں ابنِ حضرمی (عمرو) کے قتل اور اس کے مال و اسباب کی ضبطی سے ہو چکی ہے۔

بعض ابوجہل کے ساتھی متردد تھے۔

(ا) اگر ابوجہل کی ہمنوائی کی جائے تو بزدلی کے الزام سے بریت ہو جائے گی۔

(ب) مکہ معظمہ لوٹ جانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس لئے کہ ہم جس قافلہ کی حفاظت کے لئے گھر سے نکلے تھے وہ بخیر و عافیت مکہ معظمہ پہنچ گیا ہے۔

لیکن صرف بنو زہرہ اپنے سردار اخنس بن شریق کے مشورہ کو مانتے ہوئے اس کے ساتھ مکہ معظمہ لوٹ گئے۔ اس کے بعد جتنے بھی باقی رہے سب نے ابوجہل کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے مسلمانوں کے ساتھ جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا اور فوراً ہی ایک ٹیلے کے پاس باقاعدہ جنگی

مورچے قائم کر دیئے۔

مسلمانوں کے ارادے

مسلمان ابوسفیان کا قافلہ بچ کر نکل جانے کی خبر پا کر مدینہ لوٹ جانا چاہتے تھے مگر جونہی وادیٔ بدر میں پہنچے تو پانی کی ایک کھائی دیکھی جو اسی رات مینہ برسنے سے بھر گئی تھی۔ یہاں آ کر رک گئے۔ مسلمانوں میں حباب بن منذر بن الجموع رضی اللہ تعالیٰ عنہ وادیٔ بدر کی مکانی حیثیت کو سمجھتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں ہی مورچہ بنانا چاہتے ہیں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر آپ نے اس مقام کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے پسند فرما لیا ہے تو ہم یہاں کے علاوہ ادھر ادھر مورچہ بندی نہیں چاہتے۔ لیکن اگر آپ اپنی رائے اور موقعہ کی اہمیت اور تدبیر کے پیش نظر تجویز فرما رہے ہیں تو۔۔۔۔۔۔!

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ صرف اپنی رائے موقع کی اہمیت اور تدبیر کی وجہ سے یہاں مورچہ قائم کرنا چاہتا ہوں۔ اللہ کے حکم سے نہیں۔

حباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ میرے خیال میں یہ مقام مناسب نہیں بلکہ مسلمانوں کو حکم دیجئے کہ وہ پانی کے اس حوض کے پاس مورچہ قائم کریں جو دشمن کے بالکل قریب ہے۔ اس کے بعد اس حوض کے پانی سے کنوئیں کو بھر لیا جائے جو بچ جائے اس سے اس کنوئیں کے قریب حوض تعمیر کر کے اس میں محفوظ کر لیا جائے جس سے ہم کو ہر وقت پانی دستیاب ہوتا رہے گا اور کفار اس سے محروم رہیں گے۔ اس تدبیر کے بعد ہمیں مقابلہ کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حباب بن منذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ تجویز پسند آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود کو بشر ہی سمجھتے تھے اور دوسروں کی مخلصانہ رائے پہ بغیر کسی انا کے غور فرماتے تھے۔

ایک اور مشورہ

حوض کی تعمیر ہو گئی۔ مورچہ کے ابتدائی مراحل انجام کو پہنچ گئے تو سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک اور مشورہ دیا۔

یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر آپ کے لئے پتھروں کو ایک دوسرے سے ملا کر ایک برجی تعمیر کر لی جائے جس میں بیٹھ کر آپ جنگ کے احکامات صادر فرماتے رہیں اور آپ کے اس عرشہ کے قریب ہی ایک سواری کو مستقل طور پر باندھ دیا جائے۔ اگر دشمن پر کامیابی حاصل ہو جائے تو فبہا سبحان اللہ! ورنہ آپ اس سواری پہ بیٹھ کر مدینہ منورہ واپس تشریف لے جائیں۔ جنہیں آپ اور ہم پیچھے چھوڑ آئے ہیں اور جن کے دلوں میں جناب کی محبت ہماری ہی مانند موجزن

ہے۔ جب بھی جہاد کا موقع آئے گا وہ لوگ آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے بلکہ آپ کے زیرِ سایہ وہ دشمنوں سے لڑیں گے اور اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی عطا فرمائیں گے۔

دعا

رسول اللہ ﷺ نے سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبان سے محبت و خلوص کے یہ جملے سن کر ان کے لئے دعا کی اور انہیں بہت سراہا۔

(برجی) عرشہ تیار ہو گیا۔ آنحضرت ﷺ اس میں تشریف فرما ہو کر کمان کرنے کی تدبیروں پر غور فرمانے لگے۔ اس منصوبہ کے ساتھ کہ اگر دشمن غالب آ جائے تو رسول اللہ قریش کے ہاتھ گرفتار نہ ہونے پائیں اور اپنے ساتھیوں کے پاس مدینہ پہنچ جائیں۔

(فاضل مولف کو شاید یہ علم نہیں اللہ کا رسول یا نبی میدان سے فرار کی راہ سوچ ہی نہیں سکتا اور پھر حیرت ہے کہ پچھلی ہی چند سطور پہلے جہاں رسول اللہ ﷺ نے سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر کا جواب دیا۔ لکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ واللّٰہ کانی النظر الٰی مصارع القوم۔ واللہ مکہ والوں میں سے ہر ایک کی قتل گاہ میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس ارشاد کو فرمانے کے بعد نبی اکرم ﷺ کا یہ سوچنا کہ میں قریش کے ہاتھوں گرفتار ہونے سے بچنے کے لئے مدینہ پہنچ جاؤں اللہ تعالیٰ کے بعد سب سے سچی، سب سے نڈر، سب سے اعلیٰ اخلاق کی ذات اقدس کی شان میں جاہلانہ فکر کے مترادف ہے) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے اس موقعہ پر رسول اللہ ﷺ کی ذات کے ساتھ جس خلوص اور محبت کا عملاً اظہار کیا انہیں رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس پر پورا یقین تھا۔

وہ اپنی کمتر تعداد کے مقابلہ میں قریش کی تین گنا زیادہ فوج کو دیکھ رہے تھے۔ وہ خون کے دریا میں اُتر چکے تھے۔ عجیب معاملہ یہ ہے کہ تھوڑی دیر پہلے انہیں اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ابوسفیان کے مالِ غنیمت سے لدے ہوئے اونٹ صحیح و سلامت مکہ پہنچ چکے ہیں۔ اس کے بعد بھی وہ رسول اللہ ﷺ کے لئے سینہ سپر ہونے کے لئے تیار تھے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا مقصد مال و دولت حاصل کرنا نہیں تھا بلکہ فرمانِ رسول ﷺ کی اطاعت اور وفائے عہد تھا۔ انہیں فتح و شکست دونوں میں سے کسی واضح صورت کا یقین نہ تھا۔ اس کے باوجود وہ نبی ﷺ کی امداد کے لئے سربکف تھے۔ انہیں صرف ایک ہی اندیشہ تھا کہ آنحضرت ﷺ دشمنوں کے نرغہ میں نہ آ جائیں۔ اسی لئے انہوں نے ناکامی کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کے لئے مدینہ پہنچنے کا بندوبست کر دیا تھا ان سے زیادہ قوی ایمان والے لوگ کہاں ملیں گے۔

مولف کے اس خیال سے بہت سے سیرت نگاروں کا اختلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ انصار و مجاہدین بدر کے پیش نظر رسول اللہ ﷺ کا تحفظ بھی تھا اور دین اسلام کا تحفظ بھی اور خود رسول اللہ ﷺ سے اللہ تبارک وتعالیٰ کا وعدہ موجود تھا۔ واللہ یعصمک من الناس اس کے بعد بھی مولف کی یہ سوچ کہ نبی اکرم ﷺ خود اور ان کے جانثار بھی شکست کی صورت من خود یا صحابہ رضی اللہ عنھم بچا کر بھگانے میں کامیاب ہوں۔ خلاف قیاس سوچ ہے۔ (مترجم)

قریش میدان جنگ میں اتر آئے

جنگ کے میدان میں اترنے سے پہلے قریش مکہ نے ایک جاسوس مسلمانوں کے حالات جاننے کے لئے بھیجا۔ اس نے واپس آکر بتایا۔

"وہ کم و بیش تین سو کی تعداد میں ہیں۔ میدان میں ان کی تلواروں کے سوا ان کے لئے کوئی پناہ گاہ نہیں۔ مگر ان کے تیور بتا رہے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی اپنے اوپر وار نہیں ہونے دے گا"

گھبراہٹ باطل کی فطرت

یہ اطلاع پا کر باطل پرستوں میں سے بعض کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی' ان کے دل میں نامعلوم اسباب کا خوف سانپ کی طرح ڈسنے لگا۔ ان کے دل میں بار بار یہ خیال آتا کہ مکہ کے تمام سرغنہ سردار چودھری یہاں آ گئے ہیں۔ نامعلوم کس کس کی گردن کٹ جائے' کون کون موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ مسلمان ان کا صفایا کریں گے اور پھر مکہ کی عظمت خاک میں مل جائے گی۔ لشکریوں میں سے اکثر کی دماغی حالت اسی خوف کی گرفت میں تھی لیکن یہ لوگ ابو جہل کی زبان درازی سے خائف تھے۔ بایں ہمہ عتبہ بن ربیعہ سے نہ رہا گیا۔ اس نے برملا کہہ دیا۔

یا معشر القریش! انکم واللہ ما تصنعون! ان تلقوا محمدا و صحابہ شیئا" واللہ لئن اصبتموہ لایزال الرجل ینظرنی وجہ رجل قتل ابن عمہ او ابن خالہ او رجلک من عشیرتہ فارجعوا و خلو محمد و سائر العرب و ان کان غیر ذالک لم تعرض منہ لما تکرھون

اے یاران قریش اللہ کے لئے محمد (ﷺ) اور ان کے صحابہ کرام سے جنگ نہ کرو۔ اگر تم غالب بھی آ گئے تو اپنے ہی چچیرے بھائی' خالہ زاد بھائی یا دوسرے اہل قرابت کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرو گے۔ اس ارادہ سے باز آ جاؤ اور محمد (ﷺ) اور اہل عرب دونوں کو ان کے حال پہ چھوڑ دو۔ اگر عرب ان مسلمانوں پر غالب آ گئے تو آپ لوگوں کا مقصد از خود پورا ہو جائے گا

گا اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) عرب پر چھا گئے تو ان کے ہاتھ سے ہمیں کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔

ضدی ابو جہل

عتبہ کے اس مشورہ سے ابو جہل تلملا اٹھا۔ اور عامر حضرمی کو پیغام بھیجا کہ اپنے حلیف عتبہ کو دیکھو۔ یہ تمہارے بھائی عمرو بن حضرمی جو عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں نخلہ میں قتل ہو گیا۔ اس کے خون کو مٹی میں ملا دینا چاہتا ہے۔ عتبہ چاہتا ہے کہ مسلمانوں سے اس کے خون کا بدلہ لئے بغیر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں۔ اے عامر تمہیں معلوم ہے تمہارے بھائی پر کتنا ظلم ہوا۔ تمہیں چاہئے کہ تم لشکر کے سامنے اپنے مقتول بھائی کی یاد تازہ کرو۔

چنانچہ عامر بن الحضرمی لشکر کے سامنے کھڑے ہو کر زور زور سے واعمرہ' واعمرہ کہہ کر چلانے لگا۔ جس سے قریش کا خون کھول گیا۔ جس کے نتیجہ میں قریش مکہ میں سے اسود بن عبدالاسعد المخزومی مسلمانوں کے حوض کی منڈیریں گرانے کے لئے مسلمانوں کی صفوں میں جا گھسا' ادھر سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حمزہ رضی اللہ عنہ بجلی کی طرح کوند کر اس پر جھپٹے۔ اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ اسود اوندھے منہ گرا دوسرے وار میں اسود جہنم پہنچ گیا۔

میدان جنگ میں جس طرح زخمیوں کے خون سے زیادہ کوئی شے تلوار کی کاٹ سے خوف و ہراس پیدا کرنے میں موثر ثابت نہیں ہوتی۔ اسی طرح دشمن کے ہاتھوں سے اپنوں کی موت سے زیادہ کوئی شے بہادروں کے دلوں میں جوش و حرارت پیدا کرنے میں کارگر نہیں ہو سکتی۔

خون کھول گئے

اسود کے زمین پر گرتے ہی کفار میں سے عتبہ بن ربیعہ اپنے دائیں اور بائیں اپنے حقیقی بھائی اور فرزند شیبہ اور ولید کو لے کر نکلا۔ تینوں نے مسلمانوں سے اپنا اپنا مقابل طلب کیا۔ ادھر سے انصار کے دو مسلمان بڑھے' لیکن عتبہ نے ان کو اپنا ہم پلہ نہ مانتے ہوئے ان سے جنگ کرنے کو ٹھکرا دیا۔

ہم صرف اپنے قبیلہ داران (یعنی قریش) سے نبرد آزمائی کر سکتے ہیں آپ لوگوں سے نہیں۔ قریش کے ایک نوجوان نے عتبہ کی بات کاٹ کر کہا۔ یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اخرج علینا اکفاءنا من قومنا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے مقابلہ کے لئے کوئی ہمارے برابر کا اور ہماری قوم کا آدمی بھیجو۔

جواب

حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی ابن ابی طالب اور عبید بن حارث قریشِ مکہ کے بہادروں سے مقابلہ کرنے کے لئے بڑھے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چند منٹوں میں شیبہ اور ولید کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر عتبہ عبیدہ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاؤں اکھاڑنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ دیکھ کر علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں عتبہ پہ ٹوٹ پڑے۔ قریش اسے برداشت نہ کر سکے جونہی باطل پرست کفار نے حرکت شروع کی مسلمانوں نے آگے بڑھنا شروع کر دیا۔

17 ویں رمضان 2 ہجری اور جمعتہ المبارک کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مجاہدینِ بدر کی خود صفیں درست فرمائیں۔ دشمنانِ اسلام کی طرف دیکھا تو ان کی تعداد مجاہدین سے کہیں زیادہ تھی۔ جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم متاثر ہو کر خیمہ میں لوٹ آئے۔ اس موقع پر جناب ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فکر انجام میں ڈوبے ہوئے تھے۔ فکر یہ تھی کہ آج مجاہدینِ اسلام کو فتح نہ ہوئی تو دینِ اسلام کا کیا حشر ہو گا۔ اسی حالت میں وہ رو بقبلہ ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دعا فرماتے ہیں

اور اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو یاد دلاتے ہوئے فتح و کامرانی کے لئے دعا فرمائی۔

اللھم ھذہ قریش قد انت بخیلائھما تحاول ان تکذب رسولک اللھم فنصرک الذی وعدتنی اللھم ان تہلک ھذہ العصابة الیوم لاتعبد۔

اے اللہ یہ قریش تیرے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی تکذیب کے لئے اڈ کر آ گئے ہیں۔ اے اللہ آپ کا فتح و کامرانی کا مجھ سے کیا ہوا وعدہ کب پورا ہو گا۔ اے اللہ اگر آج یہ مٹھی بھر (مسلمان) مجاہدین ہلاک ہو گئے تو ان کے بعد تیری عبادت کون کرے گا؟

بار بار یہی دعا دہراتے رہے۔ دونوں ہاتھ اللہ کے حضور میں اس خشوع و خضوع کے عالم میں پھیلائے رہے کہ اس عالم میں آپ کی ردائے مبارک کندھے سے گر پڑی۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کی پشت کی طرف ازراہِ عقیدت کھڑے تھے۔ چادر مبارک اٹھا کر کندھوں پہ ڈالی اور عرض کیا۔

یانبی اللہ۔ قد سمع اللہ مناشدتک ربک فان اللہ منجز لک ماوعدک

اے اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اللہ تعالیٰ نے آپ کی التجا سن لی ہے۔ وہ اپنا وعدہ پورا ہی کرے گا۔

لیکن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسی کیفیتِ گریہ و زاری میں اللہ تعالیٰ سے اپنی عرض

کرتے رہے۔ مجاہدین بدر کی فتح و کامرانی کی دعا مانگتے رہے۔ اسی عالم میں ہلکی سی اونگھ کی کیفیت چھائی تو فتح و نصرت کی بشارت ہوئی بس پھر کیا تھا۔ انتہائی خوشی کے عالم میں عریشہ (برج) سے نکلے اور مجاہدین اسلام کے سامنے کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا۔

والذی نفس محمد بیدہ لا تقاتلھم الیوم رجل صابرا" محتسبا" مقبلا" غیر مدبر الا ادخلہ الجنہ

اس ذاتِ کبریا کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے آج جو شخص کفار کے ساتھ صبر استقلال اور رضائے الٰہی کے لئے جنگ کرتا ہوا شہید ہو گا اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل کرے گا۔

اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کی روحانی قوت (جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں بہت ہی بے حد و حساب ملی تھی) مجاہدین اسلام پر واضح ہوئی تو جو پہلے ہی سے آپ کی صداقت و عظمت کا اقرار کر چکے تھے ان کا ایمان و یقین اور توانا ہو گیا اور اب یہ عالم تھا کہ کافروں کے مقابلہ میں ایک مسلمان دو دو بلکہ دس کافروں پر بھی بھاری تھا۔

قوتِ معنوی کے محرکات! اگر صحیح ہوں تو یہ معنویت ہمارے تصورات سے کہیں زیادہ اثر پیدا کر سکتی ہے۔ اسی طرح جذبۂ حب وطن روح میں اس قدر قوت پیدا کر سکتا ہے جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مجاہدینِ بدر کے دلوں میں (بخیال مولف) وطن لوٹنے کی امیدیں بھی تھیں۔ جس سے ان کا جوش اور بھی بڑھ گیا تھا۔ وطن ہی تو ہے جس کی محبت بچوں کے دلوں میں پیدا کرنے کے لئے قومیں کیسے کیسے طریقے اختیار کرتی ہیں۔ پھر جب وطن کی حفاظت کے لمحات آتے ہیں تو پھر یہی بچے جو اب جوان ہو چکے ہوتے ہیں وطن پر جان قربان کرنے کے لئے کس طرح خود کو مصیبتوں میں ڈال دیتے ہیں۔ یہ تو وطن کی محبت کی بات ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان اور قیامِ عدل و حصول آزادی کا معاملہ وطن کی محبت سے کہیں بڑھ کر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ محبت مجبور و بے کس انسانوں کی روحانی قوت میں ناقابلِ تسخیر اضافہ کر دیتی ہے۔

صرف مادی تعلقات کی نگاہ سے تجزیہ کیجئے تو دوسری جنگِ عظیم میں اتحادیوں نے جرمنی کے خلاف انسانیت کی آزادی اور مظلوم کی حمایت کے نام سے اپنی فوجوں کو ابھارا۔ اس سے ان کی فوج کی قوت کے استقلال اور قوت میں کافی اضافہ ہوا حالانکہ اس جنگ میں صرف مادی منافع مقصود تھے۔ لیکن جنگِ عظیم کی اصل وجہِ نزاع کے مقابلہ میں نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام اور قریش (بت پرستوں) کا مسئلہ صرف انسانیت ہی تک محدود نہ تھا۔ نبی الکریم ﷺ وطن اور انسانی برادری میں صلح و امن کے داعی تھے بلکہ ہر بنی نوعِ بشر میں پورا اتحاد قائم کرنا

آپؐ کا مقصد تھا۔ جس کے حصول کے بعد خیر و برکت اور ہر قسم کی نعمت و دولت انسان کے قدموں میں گر پڑتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصدِ جہاد

دین اسلام کے دشمن سے قتال و جنگ' کافروں اور مشرکوں کو دین اسلام کی دعوت دینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جہاد کے بنیادی اجزاء ہیں۔ اس کے مقابلہ میں موجودہ دور کی جنگیں جن کو صلح و امن کا نام دیا جاتا ہے جہاد سے دور کا واسطہ بھی نہیں ۔ مجھ سے پوچھا جائے تو میں کہوں گا انسانی برادری کے ساتھ محبت کی لگن انسان کو بنی نوعِ بشر سے مربوط کر کے اس کی معنوی قوت کو اس قدر بلند کر دیتی ہے کہ وہ اپنی ذات کے لئے ہر بشر کے ساتھ صلح و دوستی کو لازم سمجھتا ہے۔ جس سے اس کی روح میں علم پیدا ہوتا ہے اور اگر ان مقدمات کے ساتھ اس شخص کا اللہ پر بھی ایمان ہو تو ایسے مقصد کی اہمیت میں کسے شبہ ہو سکتا ہے۔

وطنیت اور انسانی ہمدردی (اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان کے بغیر) لاکھ نعمت و دولت سہی لیکن ان دونوں کے ساتھ اگر اللہ تعالیٰ کی رضامندی شامل ہو جائے اور اس رضا طلبی میں ایمان والوں کے اس خلوص کو بھی پیشِ نظر رکھا جائے جو مدتوں دینِ حق کی وجہ سے شدید طور پر ستائے گئے ہوں۔ حدِ ستم یہ ہو کہ جب یہ لوگ اپنے گھر مجبوراً چھوڑ رہے ہوں تو بھی اس میں رکاوٹیں ڈالی جائیں اور انہیں بت پرستی جیسے احمقانہ عمل کے لئے مجبور کیا جائے۔ ان دونوں سمتوں میں کتنا فرق ہے۔ جس طرح جذبہ ایمان کے بغیر حب الوطنی ایک حد تک مفید ہو سکتی ہے بالکل اسی طرح ایمان کے ساتھ انسانی ہمدردی کا بھی تعلق ہے۔ یعنی جس کے دل میں ایمان نہ ہو اس کی انسانی ہمدردی ایک حد پر جا کر رک جاتی ہے۔

لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان کے بعد انسان کے اندر جس قسم کی روحانی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قوت سے وہ پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہلا سکتا ہے۔ پورا عالم اس کے اشارے پہ حرکت میں آ سکتا ہے لیکن جو لوگ ایمان کی صفت میں ادنیٰ درجہ پہ ہوتے ہیں۔ وہ مادیت کے غلام (با جگزار) بن جاتے ہیں۔ اور ایمان باللہ میں جو اعلیٰ درجہ پہ فائز ہوتے ہیں وہ مادیت پر غالب آ جاتے ہیں۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

غزوہ بدر سے پہلے مسلمانوں میں اختلاف کی وجہ سے معنوی برتری درجۂ کمال تک نہ پہنچی تھی جس کی وجہ سے ان کی مادی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

مسلسل تربیت نے آج ان کی معنوی قوت کو انتہائی عروج تک پہنچا دیا اور اسی کی وجہ سے ان کے ہاں مادی اسباب کی فراوانی کا وقت قریب آ گیا۔

مذکورہ تمام باتیں درمیان میں آ گئیں۔ اب ہم پھر وہیں آتے ہیں: جب رسول اللہ ﷺ کی مضطرب دعا قبول ہوئی۔ آپ ﷺ کو نیند کی جھپکی آئی اور پھر اسی میں فتح و کامرانی کی بشارت ملی تو عریشہ سے باہر آ کر نبی ﷺ نے مجاہدینِ بدر کے سامنے کھڑے ہو کر فرمایا جو ارشاد ربانی آیت کی صورت میں اس طرح ہے۔

یایها النبی حرض المومنین علی القتال- ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین وان یکن منکم مائة یغلبوا الفا" من الذین کفروا بانهم قوم لا یفقهون- الئن خفف الله عنکم وعلم ان فیکم ضعفا"- فان یکن منکم مائة صابرة یغلبوا مائتین وان یکن منکم الف یغلبوا الفین باذن الله والله مع الصابرین-

اے رسول (ﷺ) ایمان والوں کو (جہاد) کا شوق دلاؤ۔ اگر تم میں بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دو سو کافروں پر غالب آئیں گے اور اگر سو ایسے ہوں گے تو ہزار پر غالب رہیں گے" اس لئے کہ کافر ایسے لوگ ہیں کہ کچھ بھی سمجھ نہیں رکھتے۔ اب اللہ تعالیٰ نے تم پر بوجھ ہلکا کر دیا اور بتا دیا کہ ابھی تم میں کسی قدر کمزوری ہے۔ پس اگر تم میں ایک سو ثابت قدم رہنے والے ہوں تو دو سو پر غالب رہیں گے اور اگر ایک ہزار ہوں گے تو اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب رہیں گے اور اللہ تعالیٰ ثابت قدم رہنے والوں کا مددگار ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے جوں ہی مجاہدینِ بدر کے سامنے ان آیات کی تلاوت فرمائی تو ان کی قوتِ مدافعت اور جذبہ جہاد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا اور رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

"آج جس شخص نے جم کر کفر کا مقابلہ کیا اس کا صلہ جنت ہے"

مجاہدینِ بدر نے کفار کے ایک ایک سرغنہ کو تاک لیا کہ انہوں نے ہی تو ہمیں اللہ کے گھر میں اس وحدہ لاشریک کی عبادت سے روکا تھا۔ آج انہیں اس کا مزا چکھنا ہے۔

ایک اہم قتل

قریش کے سرداروں نے امیہ بن خلف کو بچانے کے لئے ان مسلمانوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا جو اسلام سے قبل اس کے حلیف تھے۔

یہ وہی ناخلف امیہ بن خلف ہے جو سیدنا بلال رضی اللہ عنہ کو ہجرت سے پہلے مکہ میں دوپہر کے وقت تپتی ہوئی ریت پر لٹا کر ان کی چھاتی پر پتھر بھاری پتھر رکھ دیتا تاکہ وہ دین اسلام کو چھوڑ

کر پھر بت پرست بن جائیں لیکن اس تکلیف دہ حالت میں بھی بلال کی زبان سے "احد۔ احد" کے سوا کچھ نہیں نکلتا تھا۔

جب ان کی نظر مذکورہ مسلمانوں کے اس رویہ پر پڑی تو انہوں نے چلا کر کہا۔ امیہ کافروں کا سردار ہے۔ آج اگر یہ سلامت نکل گیا تو کل پھر مجھے مصیبت میں پھنسا دے گا۔

امیہ کے بہی خواہ مسلمانوں کی خواہش تھی کہ وہ اسے قتل کرنے کے بجائے قید کر لیں مگر حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر ایک مرتبہ پکار کر کہا کہ۔

اگر آج امیہ کو زندہ چھوڑ دیا گیا تو وہ کل پھر مجھے مصیبت میں ڈال دے گا۔

حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس وقت تک چین نہ آیا (دروغ بر گردن راوی) جب تک مسلمانوں نے امیہ کو کیفرِ کردار تک پہنچا نہیں دیا۔

ابو جہل موت کے نرغہ میں

ادھر ابو جہل کو معاذ بن عمرو (ابن الجموع) رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واصلِ جہنم کر دیا۔ جناب حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جناب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے پاک فطرت مجاہدینِ بدر اس تن دہی سے مصروف جہاد ہوئے کہ اپنی اپنی جان کا خوف نہ تھا۔ نہ ہی اپنی تعداد کی کمی کا خوف اور نہ ہی کافروں کی اکثریت کا ڈر۔ میدانِ کارزار میں تاحدِ نظر گرد اڑ رہی تھی۔ تمام فضا غبار آلود اور فضا میں کفار کی کھوپڑیاں اڑ رہی تھیں، موت کفار کے ایک ایک سرغنہ کا گلا دبوچ رہی تھی۔ مجاہدینِ بدر کے دلوں میں جذبۂ ایمان کا اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ فرطِ مسرت سے باآواز بلند "احد۔ احد" کے نعرے لگا رہے تھے۔ زمان و مکان کے حجاب ان کی نظروں سے ہٹ چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی فتح کی بشارت دے کر فرشتے بھیجے تاکہ ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو۔ جب بھی کوئی مجاہد کافر پر تلوار اٹھاتا تو اللہ تعالیٰ اس کے بازوؤں میں قوت کی بے پناہ لہر دوڑا دیتا۔

نگرانی

غزوۂ بدر اپنے انتہائی عروج پر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم معرکۂ کارزار میں چل پھر کر نگرانی میں مصروف اور فرشتۂ اجل کافروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کی زندگی کی شہ رگ کاٹنے میں مشغول تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی مٹھی میں کنکریاں اٹھائیں اور انہوں نے کفار کے منہ پر پھینکا اور زبان سے فرمایا۔ ان کا منہ کالا ہو اور اس کے ساتھ ہی مجاہدین بدر کو پوری قوت کے ساتھ حملہ آور ہونے کا حکم دیا۔ مجاہدینِ بدر اپنی قلت کو نظرانداز کرتے ہوئے ان پر فاتحانہ حملوں کی صورت حملہ آور ہوتے۔ اب ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ایسی قوت

موجزن ہو گئی کہ اسکے سامنے کوئی قوت زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ ورنہ وہ کسی کافر کو قتل کرنے کے قابل تھے اور نہ ہی ان میں کسی کو قید کرنے کی طاقت تھی۔ اللہ تعالیٰ کی اس نصرت مدد پہ مبنی یہ آیات آسمان سے نازل ہوئیں۔

اذیوحی ربک الی الملائکۃ انی معکم فثبتوا الذین امنوا سالقی فی قلوب الذین کفروا الرعب فاضربو فوق الاعناق واضربوا منھم کل بنان (12:8)

جب تمہارا پروردگار فرشتوں کو ارشاد فرماتا تھا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم مومنوں کو تسلی دو کہ ثابت قدم رہیں۔ میں ابھی ابھی کافروں کے دلوں میں رعب و ہیبت ڈالے دیتا ہوں تو ان کے سر مار کر اڑا دو اور ان کا پور پور مار کر توڑ دو۔

دوسری آیت میں ارشاد فرمایا۔

فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمی (17:8)

تم لوگوں نے ان کفار کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انہیں قتل کیا اور اے محمد جس وقت تم نے کنکریاں پھینکی تھیں تو وہ تم نے نہیں پھینکی تھیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھیں

رسول اللہ ﷺ کو اب یقین ہو گیا کہ مجاہدین بدر کی فتح کا وعدہ پورا ہونے کا وقت قریب آ گیا ہے۔ مجاہدین کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا کہ وہ بڑھ بڑھ کر کافروں کو موت کے گھاٹ اتار رہے ہیں تو آنحضرت ﷺ واپس اپنے عریشہ (برج) میں آئے۔ اتنے میں کفار کے پاؤں اکھڑ گئے اور مجاہدین بدر نے ان کا تعاقب کر کے گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ کافروں نے بھاگنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر جتنے بھی مجاہدین کے قبضہ میں آ چکے تھے وہ ان کی گرفت سے اپنے آپ کو آزاد نہ کرا سکے۔

فتحِ کامل

غزوہ بدر دراصل دین اسلام کی فتح کامل تھی۔ جس کے بعد مسلمانوں کو عرب میں ٹھہراؤ اور سکون ملا۔ اور عرب کی مرکزیت کا علَم اسلام کے زیرِ نگیں آیا۔ آج تمدن اسلام کی سطوت کی بنیاد پڑ گئی۔ جس کی شان و شوکت آج بھی ہمارے تمدن کے خدوخال کا حسن و جمال ہے۔ جو کبھی بھی اسلامی تہذیب و تمدن کے چہرہ سے الگ نہیں ہو سکتا۔

کفارِ مکہ کے ساتھ برتاؤ میں استثنیٰ

اس موقع پر یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور مجاہدین بدر جو دشمنانِ اسلام کو انتہائی بے دردی سے قتل کرنے میں مشغول تھے اور نبی اکرم ﷺ بار بار ان کو جہاد کے جذبہ سے گرما رہے تھے اس وقت بھی دو قسم کے دشمنوں سے رعایت برتنے کی ہدایات

فرمادیں کہ ان پر ہاتھ نہ اٹھایا جائے!
(ا) بنو ہاشم پر۔
(ب) قریش کے فلاں و فلاں سردار پر۔
باوجودیکہ ہاشمی اور نشان زدہ سردار مجاہدین کے خون کے پیاسے ہو رہے تھے۔
بات یہ تھی کہ نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے قبیلہ کی محبت نے یہ کہلوایا اور نہ دور و نزدیک کی قرابت داری ہی اس کی محرک ہوئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے میلانات و احساسات اس سے بہت بلند تھے کہ عدل و انصاف اور حسنِ معاملہ کی بجائے قرابت و تعلقات کو ترجیح دیں۔ بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ
(1) بنو ہاشم نے زمانۂ بعثت کے آغاز سے لیکر تیرہ سال تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امداد کی' یہاں تک کہ مکہ میں اوس و خزرج کی بیعت الکبریٰ (عقبہ) جو آدھی رات کو منعقد ہوئی اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا سایہ کی طرح ساتھ لگے رہے۔
(2) جب اہلِ مکہ نے آپ کی وجہ سے بنو ہاشم کے پورے قبیلہ کی قراردادِ مقاطعہ پر دستخط کیے جس بناء پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کا قبیلہ شعب ابی طالب میں محبوس ہونے پر مجبور ہوا۔ اس وقت قریش میں سے انھوں نے اس پر دستخط نہیں کیے تھے۔
(3) اور انہیں اشرافِ مکہ میں سے بعض وہ اشخاص جنہوں نے اختلافِ عقائد کے باوجود قریش سے قرارداد کے قرطاس کو چاک کرنے کا مطالبہ کیا تھا جس کی بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے قبیلہ کو شعب ابی طالب میں محبوس ہونے پر مجبور ہونا پڑا تھا۔ لہٰذا ان دونوں طبقوں کے سابقہ احسانات کا بدلہ غزوۂ بدر میں چکانا چاہا جو ان کے احسان سے کئی گنا زیادہ تھا۔ یعنی مجاہدین بدر نہ تو بنو ہاشم پر ہاتھ اٹھائیں اور نہ ہی ان لوگوں پر جنہوں نے قراردادِ مقاطعہ میں مسلمانوں اور بنو ہاشم سے ہمدردی کا اظہار کیا تھا۔
لیکن ان اشراف میں ایسے بدنصیب بھی تھے جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس رعایت کا فائدہ اٹھانے سے گریز کیا اور ابو البختری کی طرح زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

واپس مکہ میں

غزوۂ بدر سے جان بچا کر واپس مکہ بھاگ جانے والے شرم سے کسی کی آنکھ سے آنکھ نہیں ملا سکتے تھے۔ اول تو گھر سے نکلنے سے کتراتے اور اگر نکل بھی جاتے تو سر جھکا کر بازار میں چلتے۔
مجاہدینِ بدر جنگ ختم ہونے کے بعد غروبِ آفتاب تک میدان میں ٹھہرے رہے۔ کفار کی لاشوں کو بے حرمتی سے بچانے کے لئے ایک گڑھا کھود کر اس میں ان کو گاڑ دیا گیا اور ایک

طرف کفار کا چھوڑا مال و متاع اکٹھا کیا گیا اور کچھ غازیانِ اسلام قیدیوں کی نگہبانی میں لگے رہے۔

لاشوں سے خطاب

اس رات نبی اکرم ﷺ مجاہدین کی کم تعداد اور بے سرو سامانی کے باوجود مشرکین کی کثرتِ افواج اور اسلحہ و اسباب کے ان پر فتح و کامرانی پر غور فرماتے رہے۔

رسول اللہ ﷺ اس نتیجہ پہ پہلے ہی پہنچ چکے تھے کہ ایسے موقع پر فتح و کامرانی کا اصل سبب قوتِ ایمان ہے۔ مجاہدین اس لازوال نعمت سے مالا مال تھے اور کافر اس قوت سے محروم۔ بس مجاہدین کی فتح اور کفار کی شکست کا اصل سبب یہی تھا۔ اس رات رسول اللہ ﷺ کو بعض مجاہدین سے یہ کہتے سنا گیا کہ وہ کنوئیں میں پھینک دی جانے والی بعض لاشوں کا نام لے کر فرما رہے تھے۔

یا اھل القلیب ---اے کنوئیں والو

یا عتبہ بن ربیعہ------اے عتبہ

یا شیبہ بن ربیعہ------اے شیبہ

یا امیہ بن خلف------اے امیہ

یا ابا جہل بن ہشام------اے ابو جہل

آنحضرت ﷺ ان لوگوں کے نام بار بار لے کر فرما رہے تھے۔ یا اھل القلیب هل وجدتم ما عد ربکم حقا۔ فانی وجدت ما وعدنی ربی حقا

اے کنوئیں والو کیا تم سے اللہ تعالیٰ نے جو وعدے کئے تھے وہ پورے ہوئے؟ میری طرف دیکھو مجھ سے میرے پروردگار نے جس نصرت و مدد کا وعدہ فرمایا تھا اس کی تکمیل ہو چکی۔

اصحاب رضی اللہ عنہم نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ (ﷺ) آپ تو مردوں سے خطاب فرما رہے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ہاں مگر آج یہ لوگ جتنے سننے پہ قادر ہیں اتنے تم نہیں ہو۔ یہ الگ بات ہے کہ جواب دینے سے قاصر ہیں۔

رسول رحمت ﷺ کی نگاہِ مبارک جونہی ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے چہرہ پر پڑی تو ان کا چہرہ کچھ مرجھایا ہوا دیکھا تو فرمایا شاید تم اپنے والد عتبہ بن ربیعہ کے انجام سے پریشان ہو۔

ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ مجھے اپنے والد کا افسوس تو نہیں مگر افسوس یہ ہے کہ وہ بہت دور اندیش بھی تھے اور رقیق القلب بھی۔ مجھے امید تھی وہ ایک دن ضرور اسلام لے آئیں گے۔

یہ سن کر نبی اکرم ﷺ نے بھی عتبہ بن ربیعہ کی تعریف فرمائی اور ابو حذیفہ رضی اللہ عنہ کے لئے صبرو تحمل کی دعا مانگی۔ صبح ہوتے ہی مدینہ کی طرف واپسی کی تیاریاں ہونے لگیں تو اس وقت مالِ غنیمت پر بھی کچھ چہ مگوئیاں ہونے لگیں اور تین گروہ بن گئے۔

(1) اموال و متاع جمع کرنے والوں نے صرف اس صلہ میں ہی تمام مال غنیمت پہ اپنا حق سمجھا۔

(2) جہاد میں سب سے بڑھ کر حصہ لینے والوں نے کہا۔ اگر ہم نہ ہوتے تو فتح ہوتی نہ مال حاصل ہوتا۔ انہوں نے مالِ غنیمت کو صرف اپنی ہی حد تک محدود رکھنا چاہا۔

(3) جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی پاسبانی کر رہے تھے۔ انہوں نے فرمایا تم دونوں کوئی شے نہیں۔ اگر ہم چاہتے تو دشمن کو بھگا بھی سکتے تھے اور مال سمیٹ کر بھی یکجا کر سکتے تھے۔ مگر ہم آنحضرت ﷺ کی نگہبانی کی وجہ سے قدم اٹھانے سے مجبور رہ گئے' ایسا نہ ہو کہ دشمن آپ ﷺ کو گھیر لے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام سامان ایک جگہ کر دو۔ سب کے مشورہ سے معاملہ طے کیا جائے گا یا جو بھی اللہ تعالیٰ کا حکم صادر ہو گا اس کی تعمیل ہو گی۔

اہلِ مدینہ کے نام پیغامِ فتح و نصرت

رسول اللہ ﷺ نے عبداللہ بن رواحہ اور زید بن حارثہ کو حکم دیا کہ آپ دونوں حضرات مدینہ پہنچ کر مسلمانوں کو فتح و کامرانی کی خوشخبری سنائیں۔ ان کو روانہ کرنے کے بعد نبی اکرم ﷺ اور فاتح مجاہدین نے منزل بہ منزل مدینہ منورہ کا سفر شروع کیا۔ جنگی قیدی آپ کے ساتھ تھے اور مالِ غنیمت کی نگرانی عبداللہ بن کعب فرما رہے تھے۔

تقسیم غنیمت

کوہ صفرا کے درہ میں آپ نے توقف فرمایا۔ اور یہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک ٹیلہ پر بیٹھ کر مال غنیمت تقسیم فرمانا شروع کیا۔ غزوہ میں شریک ہر مجاہد کو ایک سا برابر حصہ عطا فرمایا۔ بعض مؤرخین لکھتے ہیں۔ اس تقسیم سے قبل رسول اللہ ﷺ نے اپنا خمس نکال لیا۔ تقسیم سے پہلے یہ آیت نازل ہو چکی تھی۔

واعلمو انما غنمتم من شئی فان للّٰہ خمسہ وللرسول ولذی القربی والیتمی والمساکین وابن السبیل۔ ان کنتم امنتم باللّٰہ وما انزلنا علٰی عبدنا یوم الفرقان یوم التقی الجمعان واللّٰہ علٰی کل شئی قدیر۔ (41:8)

اور جان رکھو جو چیز تم (کفار سے) لوٹ کر لاؤ اس میں سے پانچواں حصہ اللہ کا اور اس کے رسول کا اور اہلِ قرابت کا یتیموں کا اور محتاجوں کا اور مسافروں کا ہے۔ اگر تم اللہ تعالیٰ اور اس کی

نصرت پر ایمان رکھتے ہو جو حق و باطل میں فرق کرنے والے دن یعنی جنگِ بدر کے دن جب دونوں فوجوں میں مُڈبھیڑ ہو گئی اپنے بندے (محمد ﷺ) پر نازل فرمائی اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

بیشتر اربابِ سیر خصوصاً قدما کی تحقیق یہ ہے کہ آیہ مذکورہ الصدر واعلمو انما غنمتم۔ (41:8) نہ صرف واقعہ بدر بلکہ تقسیمِ غنیمت کے بعد نازل ہوئی اور سواروں کو دوگنا حصہ دیا گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے مال (غنیمت میں) مندرجہ ذیل طبقات کا حصہ بھی محفوظ کرا دیا۔

ا۔شہدائے بدر کے وارثوں کے لئے مقتولین کا حصہ۔

ب۔ نائبینِ انتظام کا حصہ جن کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ میں بدر کی طرف آتے ہوئے اپنے بعد کسی منصب پر مقرر فرمایا۔ مثلاً ابنِ ام مکتوم رضی اللہ عنہ و ابو البابہ رضی اللہ عنہ۔

ج۔جو لوگ کسی معقول وجوہات کی بناء پر غزوہ بدر میں شریک نہ ہو سکے' یعنی نہ صرف شرکاءِ غزوہ بلکہ اس شخص کو غنیمت میں سے حصہ دیا گیا جو اس کا مستحق تھا۔

نضر اور عقبہ کا قتل

اس اثناء میں ابھی قیدیوں کی رہائی' قتل' فدیہ یا غلامی میں سے کوئی فیصلہ طے نہیں ہوا تھا کہ مقام اثیل پر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں قیدیوں کو پیش کیا گیا تو رسول اللہ ﷺ نے نضر بن حارث کو دیکھا وہ تھرا اٹھا اس کی وجہ اس کا اپنا ماضی تھا۔ مکہ معظمہ میں مسلمانوں کے خلاف یہ ہر وقت بھڑکتا ہوا شعلہ تھا۔ مکافاتِ عمل سے گھبرا کر اپنے ساتھ کے قیدی سے کہنے لگا۔ مجھے محمد (ﷺ) قتل کرا دیں گے۔ جب انہوں نے میری طرف دیکھا تو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے ان کی آنکھیں مجھے موت کا پیغام دے رہی ہیں۔ اس کے ساتھی نے کہا کہ تم خود ہی گھبرا رہے ہو ورنہ مجھے تو کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی۔ نضر بن حارث کی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ سے قرابت داری تھی۔ اس نے ان سے کہا۔ اے مصعب رضی اللہ عنہ اللہ کے لئے اپنے صاحب سے میری سفارش کر دیجئے کہ وہ مجھے اپنے رفقاء کے اندر شامل کر لیں۔ ورنہ وہ مجھے ------ مصعب رضی اللہ عنہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ تم نے قرآن اور رسول اللہ ﷺ کی توہین میں کیا کچھ نہیں کہا اور کیا کچھ نہیں کیا؟ تم نے رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کو کونسی اذیت نہیں دی۔

نضر: مصعب (رضی اللہ عنہ) اگر میری طرح آپ کو قریش گرفتار کر لیتے تو میرے جیتے جی وہ

آپ کو تہ تیغ نہ کر سکتے تھے۔

مصعب (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) : تمہارا یہ خیال بھی غلط ہے اور نہ میں اور آپ دونوں ایک سے ہیں۔ اسلام نے جاہلیت کے تمام معاہدے ختم کر دیئے ہیں۔

نضر بن حارثہ کو حضرت مقداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے قیدی بنایا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے وارثوں سے فدیہ میں بہت سا مال حاصل کریں گے مگر انہوں نے دیکھا کہ لوگ ان کے قتل کی ادھیڑ بن میں لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے باآواز بلند کہا۔ نضر میرا قیدی ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی وقت نضر کو قتل کرنے کا حکم دے دیا۔ حضرت علی آگے بڑھے اور ایک ہی وار میں اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقداد کی خوشحالی کی دعا فرمائی۔

مجاہدین یہاں سے کوچ کر کے عرق الظبیہ (مقام) میں پہنچے تو عقبہ بن ابی معیط (قریشی) کے قتل کا حکم عطا فرمایا۔ عقبہ فوراً چلایا۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میرے بعد میری لڑکی کی خبر گیری کون کرے گا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ تمہاری لڑکی کی خبرگیری آگ کرے گی۔

عقبہ کی گردن علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا عاصم بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ماری۔

آپ پچھلی سطور میں پڑھ چکے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دن پہلے فتح کی خوشخبری مدینہ منورہ پہنچانے کے لئے زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن رواحہ کو روانہ فرما دیا تھا۔ دونوں حضرات ایک راستہ سے مدینہ منورہ میں داخل ہوئے۔ عبداللہ بن رواحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ سے ملنے والی نصرت و امداد کا ذکر کرتے اور ساتھ ہی قریش کی شکست کا حال سناتے جاتے اور مقتولین کے نام بھی بتاتے جاتے۔ اسی طرح زید بن حارثہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصی اونٹنی قصویٰ پر سوار تھے' اس کی تائید کرتے جاتے' مجاہدین اسلام کی فتح کی خبر سن کر مسلمان گھروں سے نکل آئے اور فضا میں نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی آوازیں گونجنے لگیں۔

لیکن مشرکین' یہود اور منافقوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ سب اس غیر یقینی بحران میں مبتلا ہو گئے اور کوشش یہ کرنے لگے کہ اپنی طرح مسلمانوں کو بھی اس فتح کا یقین نہ آنے پائے۔ وہ سب شہر میں ادھر ادھر پھیل گئے۔ ان میں سے ایک بدبخت نے افواہ اڑا دی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قتل ہو گئے ہیں۔ مسلمان شکست کھا کر واپس آ رہے ہیں۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ناقہ (اونٹنی) کو ہم پہچانتے ہیں۔ زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی پہ سوار واپس آیا ہے۔ اگر مارے نہ جاتے تو ان کی سواری اس کے پاس کیسے ہوتی؟ زید خوف سے دماغی توازن کھو بیٹھا ہے اور شکست کو نصرت کا

نام دے رہا ہے۔

لیکن مسلمانوں کو فتح کی خبر کے سچا ہونے میں ذرہ برابر بھی شبہ نہ تھا اور مسلمان خوشی میں سرشار ہو رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی رقیہ رضی اللہ عنہا کا اچانک انتقال ہو گیا جو روانگی سے پہلے ہی علیل تھیں اور جناب عثمان رضی اللہ عنہ کو ان کی تیمار داری کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ ہی چھوڑ گئے تھے۔ الغرض مشرکین و منافقین اور یہود مدینہ کو بھی مجاہدین اسلام کی فتح کا یقین کرنا ہی پڑا۔ اب انہوں نے اپنا موقف دیکھا تو انہیں اس میں ہی اپنی موت نظر آئی۔ یہودیوں کے سب سے بڑے سرغنہ کعب بن اشرف نے کہا۔ ساداتِ قریش جو حرم کے نگہبان اور عرب کے بادشاہ تھے ان کی موت کے بعد ہم لوگوں کا زمین پر چلنے پھرنے سے مر جانا بہتر ہے۔

فاتحینِ غزوۂ بدر کی مدینہ میں آمد

اسلامی لشکر کے فاتح مسلمان اسیرانِ جنگ سے ایک روز قبل مدینہ میں آ پہنچے اور دوسرے روز جب قیدی شہر میں داخل ہوئے تو ام المومنین جناب سودہ بنت زمعہ (رضی اللہ عنہا) جو اپنے قرابت دار عفرا کے فرزندوں کی شہادت سے متاثر تھیں۔ انہوں نے ابو سہیل بن عمرو قریشی کو اس حالت میں دیکھا کہ مشکیں کسی ہوئی ہیں اور دونوں ہاتھ گردن کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں۔ ان سے ضبط نہ ہو سکا فرمایا۔ اے ابو زید تم نے ایسی بے غیرتی کے ساتھ خود کو حوالے کر دیا۔ اس سے تو عزت کی موت مر جاتے تو اچھا ہوتا"۔ یہ جملے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سن لئے تو فرمایا۔ اے سودہ تمہیں اللہ اور اس کے رسول کے خلاف (لوگوں کو شہ دینے میں بھی باک نہیں) عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس ذات کبریا نے آپ کو نبوت بخشی ہے اسی کی قسم ہے کہ میں ابو زید جیسے سرفراز شخص کی مشکیں کسی ہوئی دیکھ کر حیران رہ گئی اور زبان سے یہ الفاظ بے اختیار نکل گئے۔

قیدیوں کے بارہ میں مشورہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوری طور پر تو قیدیوں کو اپنے اصحاب پر تقسیم کر دیا۔ اور ہر ایک کو ان قیدیوں سے بہتر سے بہتر سلوک کرنے کی تاکید فرما دی اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کی سوچ و بچار فرمانے لگے۔ "ایک صورت تو یہ ہے کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مدینہ میں لے جا کر ان کو رہا کر دیا جائے۔ فدیہ کی صورت کا خیال آتے ہی یہ بھی خیال آیا ان قیدیوں میں بڑے بڑے بہادر اور نامور جنگجو ہیں اگر ان کو رہا کر دیا گیا تو یہ اپنی شکست اور قیدی ہونے کی بناء پر چین سے نہیں بیٹھیں گے

اور انتقام کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنے کی کوشش کریں گے۔ اور اگر انہیں قتل کرا دیا جائے تو ان کے وارثوں کا کینہ ابھر آئے گا وہ ان کے خون کا بدلہ لینے پہ اتر آئیں گے تو مشکل ہو گی" (حیرت ہے کہ مؤلف موصوف ہر مقام پر نبی ﷺ کی سوچ کو اپنی سطح کی سوچ میں پیش کرتے ہیں۔ مترجم)

بہرحال آخر میں رسول اللہ ﷺ نے اصحاب کرام سے مشورہ طلب کیا اور حکم فرمایا کہ جس کی جو رائے ہو وہ بلا جھجک کہے۔ کچھ مجاہدین قیدیوں کی رہائی پر دو وجوہات سے مائل تھے۔

ایک تو ان کی ان قیدیوں سے قرابت داری تھی دوسرے بہت زیادہ رقم کی صورت فدیہ حاصل ہونے کی امید۔ چنانچہ ان لوگوں نے کہا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مشورہ کر لیں۔ ان کی رائے لینا بہت بہتر ہو گا۔

(الف)۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی کفار قریش سے قرابت داری ہم سب سے زیادہ ہے۔

(ب)۔ رحم دل اور محسن ہیں۔

(ج)۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ ہم سب سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک قابلِ عزت ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنا ایک وکیل ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا جس نے ان الفاظ میں یہ معاملہ پیش کیا۔

اے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ان قیدیوں سے ہر ایک کی کسی نہ کسی طرح رشتہ داری ہے۔ کوئی کسی کا برادر زادہ ہے تو کوئی ہمشیرہ زادہ' کسی کے ساتھ بھائی کا رشتہ ہے کوئی پھوپھی اور ماموں کی طرف سے عزیز و عم زاد ہے۔ براہ کرم رسول اللہ ﷺ سے سفارش کیجئے کہ اگر آپ ان کا فدیہ لے کر انہیں رہا فرما دیں تو اس کا احسان ان پر بھی ہو گا۔ چنانچہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کا یہ مشورہ قبول کر لیا اور رسول اللہ ﷺ سے سفارش کرنے کا وعدہ فرما لیا۔

اگرچہ یہ لوگ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے خائف تھے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اس بات میں مخالفت کر کے معاملہ بگاڑ دیں۔ اس کا سدباب کرنے کے لئے انہوں نے ان کے پاس بھی اپنا وکیل بھیجا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے ان کی پوری بات سنی۔ ایک غضب ناک نگاہ سے انہیں دیکھا۔ مگر زبان سے کچھ نہ کہا۔ اس کے بعد وکیل کو کچھ کہنے کی جرات نہ ہوئی۔ غرض یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے یہ مشیرانِ خاص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اس انداز سے اپنا مشورہ پیش کیا کہ آپ ﷺ پر گراں نہ گزرے۔

عرض کیا! اے رسول اللہ ﷺ آپ پر میرے ماں باپ قربان' کفارانِ قریش میں سے قید ہو کر آنے والوں میں سے ہر ایک کا ہم میں سے کسی نہ کسی کے ساتھ کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ اگر آپ ان پر احسان فرما کر رہا فرما دیں اور اس کے عوض فدیہ قبول فرما لیا جائے تو امید

ہے کہ یہ لوگ آپ کے کرم سے متاثر ہو کر اسلام لے آئیں گے اور فدیہ کی رقم سے مسلمانوں کو تقویت حاصل ہو گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سن لیا مگر مثبت و منفی کوئی جواب نہ دیا اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ واپس تشریف لے آئے۔

جناب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حاضر خدمت ہوئے اور قیدیوں کے بارے میں عرض کیا! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ لوگ اللہ کے دشمن' آپ کو جھوٹا کہنے والے' آپ کو مکہ معظمہ سے نکالنے والے' جو جنگ کے لئے خم ٹھونک کر نکلے' آپ کو ہم سب کو پریشانی میں ڈالا' یہ لوگ کفر کے ستون اور گمراہی کے علم ہیں۔ ان کی پامالی سے اسلام کو فروغ ہو گا اور مشرکین تباہ اور دل شکستہ ہو جائیں گے۔ ان کی گردنیں اڑانے میں توقف نہ فرمائیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی باتیں بھی غور سے سنیں اور کوئی جواب مرحمت نہیں فرمایا۔ مگر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوبارہ تشریف لائے اور اپنی سابقہ سفارش دہراتے ہوئے رحمت و شفقت کی درخواست پیش کی اور ان قیدیوں کے مستقبل میں مسلمان ہونے کی امید ظاہر کی۔ ان کے ساتھ ہی عمر بن الخطاب کسی رعایت و رواداری کے بغیر اس انداز سے اپنا مطمع نظر پیش کرتے رہے جیسے وہ ترازو کے دونوں پلڑوں پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں۔ جناب ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب اپنا اپنا نقطۂ نگاہ پیش کر چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھوڑی دیر کے لئے اپنے خیمے میں تشریف لے گئے اور سب مجاہدین فیصلہ کے منتظر رہے۔ جب باہر تشریف لائے تو فیصلہ کے لئے چشم براہ مسلمانوں میں سے بعض کا خیال تھا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے منظور ہوئی اور بعض کے خیال میں عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتفاق تھا۔ لیکن ایک بار پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے مشورہ طلب فرمایا۔ اس بار بھی مسلمانوں نے پہلے ہی کی طرح دونوں رائے پیش کیں۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمرِ فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ملائکہ سے مشابہت

اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ (شیخین) کو فرشتوں اور نبیوں کی مشابہت سے نوازا۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو میکائیل علیہ السلام کے مشابہ فرمایا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبیوں کے لئے اس کی رضا و عفو کا پیغام لے کر آتا ہے اور انبیاء میں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور جناب مسیح علیہ السلام کے ساتھ۔ اس تشبیہ میں حضرت ابراہیم کے متعلق فرمایا کہ وہ اپنی قوم کے لئے شہد سے زیادہ نرم و شیریں تھے مگر مشرکوں نے انہیں آگ میں جھونکنے سے بھی دریغ نہ کیا۔ جس پر ابراہیم نے انہیں صرف اتنی سی تنبیہہ کی!

اف لکم ولما تعبدون من دون اللہ افلا تعقلون (67:21)

تف ہے تم پر اور جن کو تم اللہ تعالیٰ کے سوا پوجتے ہو ان پر۔ کیا تم عقل نہیں رکھتے۔
یہاں تک کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے ان لوگوں کے لئے یہ دعا بھی فرمائی۔

فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانک غفور رحیم (36:14)

جس شخص نے میرا کہا مانا وہ میرا ہے۔ جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔

اور جناب ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تشبیہ جناب عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اس حوالے سے مرحمت فرمائی کہ وہ اپنی قوم کے لئے ہر لمحہ اس طرح مصروف التجا رہے۔

ان تعذبھم فانھم عبادک وان تغفر لھم فانک انت العزیز الحکیم۔ (118:5)

اگر تو ان کو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر بخش دے تو تیری مہربانی ہے۔ بیشک تو غالب اور حکمت والا ہے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مشابہت ملائکہ میں جبریل علیہ السلام کے ساتھ دی جو اللہ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے دشمنوں پر عذاب لے کر نازل ہوتا ہے اور انبیاء میں سے جناب نوح اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تشبیہ ان حوالوں سے دی۔

جیسے کہ نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کے رویہ سے گھبرا کر دعا کی۔

رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا (118:5)

اے پروردگار کسی کافر کو روئے زمین پر زندہ نہ رہنے دے۔

اور موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے عاجز آ کر یہ دعا کی۔

ربنا اطمس علٰی اموالھم واشدد علٰی قلوبھم فلا یومنوا حتٰی یروا العذاب الالیم۔ (88:10)

اے پروردگار ان کے مال کو برباد کر دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ ایمان نہ لائیں۔ جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔

فدیہ لے کر رہائی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا۔ مسلمانو! تم ضرورت مند ہو۔ قیدیوں میں سے جو شخص فدیہ ادا کر دے اسے رہا کر دو اور جو شخص فدیہ دینے سے انکار کرے اس کی گردن اڑا دو۔

اسی اثناء میں قیدیوں میں سے ایک شاعر ابو عزہ (عمرو بن عبداللہ بن عمیر الجمحی) نے جب مسلمانوں میں اختلافِ رائے دیکھا تو موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے عرض کی۔ میری پانچ لڑکیاں ہیں جن کا میرے بعد نہ کوئی کفیل ہے نہ ان کے پاس گزر بسر کے لئے کوئی اثاثہ۔ اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اگر آپ میری ان بچیوں پر ترس کھا کر رہا کر دیں تو میں آپ کے خلاف کسی کو

نہ ابھاروں گا۔ نہ خود آپ کے مقابلہ میں آؤں گا۔ غرض شاعر ابوعزہ اپنا داؤ چلا گیا۔ بدر کے قیدیوں میں سے یہی ایک قیدی تھا جسے بغیر فدیہ کے رہا کیا گیا۔ لیکن برا ہو بد فطرت کا بدعہد ابوعزہ دوسرے ہی سال غزوہ احد میں کفار کی حمایت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جنگ میں شریک ہوا اور اسی میں واصلِ جہنم ہوا۔

اس فیصلہ کے بعد مسلمانوں نے ذرا دیر فکری کشمکش کے بعد قیدیوں کا تبادلہ فدیہ کے عوض شروع کر دیا جس پر ناراضگی کا اظہار لئے ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ آیات نازل ہوئیں۔

ماکان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرہ واللہ عزیز حکیم۔ (68:8)

نبی کے لئے یہ شایانِ شان نہیں کہ اس کے قبضہ میں قیدی رہیں جب تک کافروں کو قتل کر کے زمین میں کثرت سے خون نہ بہا دے تم لوگ دنیا کے مال کے طالب ہو اور اللہ آخرت کی بھلائی چاہتا ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

مستشرقین کے اعتراض

بعض مستشرقین بدر کے قیدیوں میں سے نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط کے قتل پر بھی اور قیدیوں کو فدیہ کے بدلے رہا کر دینے پر بھی معترض ہیں۔ ان کے لئے تو بدر کی فتح اور مالِ غنیمت کا حصول ہی نکتہ چینی کے لئے کافی تھا۔ مگر انہوں نے زیادہ زور مذکورہ دونوں شخصوں کے قتل پر دیا ہے اور تاثر یہ دینے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کی تلوار دوسروں کا خون چاٹنے میں بڑی حریص ہے۔

جواب۔ مستشرقین کو اسلام پر اعتراض کرتے وقت نہ تو حالات کے تقاضوں کا علم ہوتا ہے نہ ہی واقعہ کے حقیقی اسباب و علل سے آگاہی۔ ان کا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے اسلام کے خلاف عوام کے جذبۂ شفقت و ترحم کو ابھارا جائے۔ خود ان کے ہاں جیسے جنگ کے موقع پر خونریزی ہوتی ہی نہیں۔

آج سے 1410 سال پہلے کے واقعات پر حاشیہ آرائی' بدر کے مقتولین نضر و عقبہ کے قتل کو جہان والوں کے سامنے اچھالنا قابلِ حیرت بات ہے۔ انہیں اس بات کا احساس بھی نہیں کہ اس دور میں عرب تمدن کا چلن کیا تھا۔ چلئے نہ سہی ذرا اپنے گھر کی طرف دیکھیں۔ پیروانِ مسیحت کی صدیوں سے مسلسل خوں آشنائی کے تقابل میں ان دو مقتولین کا خون اتنی اہمیت کا مقام کیوں پا گیا یورپ فرانس اور دوسرے مسیحی ممالک میں سیاسی حادثات میں انسانی خون سے لہو لہان زمین ان کی نظروں سے اوجھل کیوں ہوتی ہے۔ جنگِ عظیم میں ان مسیحی

یاران عقیدہ کے ہاتھوں انسانیت کے ساتھ جو سلوک ہوا بدر کے ان دو مقتولین کے خون سے موازنہ کرکے بتائیں کہ اسلام نے نفرو عقبہ پر زیادہ ظلم کیا ہے یا یورپ اور امریکہ کے پرستاران صلیب نے؟

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنے رفقاء کے ساتھ مل کر بت پرستی اور شرک سے بنی نوع انسان کو نجات دلانے کا آغاز فرمایا۔ اس تحریک کی ابتدا مکہ معظمہ سے کی گئی، اور اس جدوجہدِ توحید کے صلہ میں انہیں تیرہ سال تک بے انتہا ظلم و قہر کا تختۂ مشق بننا پڑا، وطن جیسی نعمت چھوڑ کر مدینہ منورہ میں بسنا پڑا جہاں انہیں اللہ تعالیٰ نے سکون بخشا۔ یہاں تک کہ سچائی خود ایک طاقت بن کر ابھری، مکہ میں قریش اور مدینہ میں مسلمان دونوں کو اس تحریکِ اصلاحِ عقیدہ کا احساس تھا۔ مسلمانوں نے مدینہ کے یہود سے بھی معاہدہ کر لیا اور اس غزوہ بدر سے پہلے مسلمانوں کے نمائشی دستے نواحِ مدینہ میں دو چار جگہ اپنا رعب بھی جما آتے تھے۔ بیشک دینِ اسلام کے استحکام کا ایک سبب غزوہ بدر ہی تھا لیکن اسے بنیاد قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اس کے ذرائع میں بدر بڑا ذریعہ ضرور ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے جاں نثاروں نے جس تحریک کو جاری رکھا وہ در حقیقت دین اسلام کے ان اصولوں کی پابندی تھی جو ان کے سامنے اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اللہ عزوجل کے حکم ہی سے ان کے سامنے پیش کیے تھے۔

بنظرِ غائر دیکھیں تو تحریک کے اس کے مباوی دو مختلف حیثیتیں ہیں۔ مگر اسلام نے جس تہذیب و تمدن کی بنیاد رکھی وہ اخوت سے موسوم ہے۔ جن کو ابتدائی دور میں طے کرنے کے لئے مشقیں کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ ذرا فرانس کی خوں ریزی پر نگاہ ڈالو جو عیسائیت کی تاریخ کا شرمناک باب کہلاتی ہے۔ اور اسلام کی تاریخ پر نگاہ ڈالو اور بتاؤ اس میں بھی کوئی ایسی مثال پائی جاتی ہے۔ سان بار تلمی کی خون ریزی جس میں کیتھولک عیسائیوں نے پراٹسٹنٹ کی گردنیں اڑا دیں اور سازش کی صبح تک پراٹسٹنٹ زندہ نہ رہا۔ اس کے مقابلہ میں بدر کے 150 قیدیوں میں سے صرف دو قیدیوں کا قتل اور وہ بھی اسی بنا پر کہ ان دونوں نے مکہ میں مسلمانوں پر خود تو برسوں روح فرسا جبر و تشدد کیا ہی تھا۔ اپنے ساتھیوں کو بھی اس کے لئے اکساتے رہے۔ ان پہ اتنا گراں کیوں؟

ان دونوں کا قتل اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس رحم اور مالی فائدے کا مقابلہ میں زیادہ مفید سمجھا گیا جو رحم فدیہ لے کر رہا کئے جانے والوں پہ کیا گیا۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:۔

ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض تریدون عرض الدنیا واللہ یرید الاخرہ (67:8)

نبی کے یہ شایانِ شان نہیں کہ اس کے قبضہ میں قیدی رہیں جب تک کافروں کو قتل کر کے زمین

میں کثرت سے خون نہ بہا دے تم لوگ تو دنیا کے مال کے طالب ہو مگر اللہ آخرت کی بھلائی چاہتا ہے اور اللہ ہی غالب حکمت والا ہے۔

مکہ اور شکست کا ردِّ عمل

ادھر مسلمانانِ مدینہ مالِ غنیمت اور فتح کی خوشیاں منا رہے تھے۔ ادھر جیسان (بن عبداللہ خزاعی) ایک برق رفتار سواری پر مکہ پہنچ کر قریش کے سامنے سرداروں کی ہلاکت اور شکست کا حال بیان کر رہا تھا۔ سب سے پہلے مکہ میں یہی شخص کفار کی شکست کی خبر لے کر آیا۔ سنتے ہی قریش بد حواس ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک تو یہ کہہ کر دل کو تسلیاں دیتے رہے ناممکن! یہ ہو ہی نہیں سکتا، یہ غلط کہتا ہے۔ ہمارے اتنے نامی گرامی شمشیر زن بہادر شکست کھا سکتے ہیں ------ نہیں ناممکن!

لیکن تابہ کے ------ آخر جیسان بن عبداللہ انہیں یقین دلانے میں کامیاب ہو ہی گیا لوگ سرد آہیں بھرنے لگے، ابولہب جس نے اپنا قائم مقام لڑائی میں بھیج دیا تھا وہ کپکپا کر گر پڑا اور تپ محرقہ کی گرفتاری ہی میں ساتویں دن موت کے چنگل میں جا پھنسا۔

لیکن قریش (کفار) پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور فی الحال دو تجویزوں پر اتفاق کیا۔

(الف) ہماری کوئی عورت مقتولین پر نالہ و شیون نہ کرے۔ جناب محمد ﷺ کے اور ان کے رفقاء نے اگر سن لیا تو ہمارا مذاق اڑائیں گے۔

(ب) ہمیں اپنے قیدیوں کی رہائی کے لئے مسلمانوں سے بات چیت نہیں کرنا چاہئے ورنہ وہ فدیہ کی رقم کی بڑھا دیں گے۔

سہیل بن عمرو اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ

کفارِ مکہ کچھ مدت تک تو چپ سادھے رہے۔ آخر اپنے اپنے قیدیوں کو رہا کروانے پہ مجبور ہو گئے مکرز بن حفص (قریش سے بالا بالا) سہیل بن عمرو کی رہائی کے لئے مدینہ پہنچ گئے۔

مکرز کو دیکھ کر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا کہ سہیل بن عمرو رہائی کے بعد پھر دین اسلام اور آپ ﷺ کے خلاف شعلہ بیانی شروع کر دے گا لہٰذا نبی رحمت ﷺ سے عرض کیا۔

یا رسول اللہ! دعنی انزع ثنیتی سہیل بن عمرو فیدلع لسانہ فلا یقوم علیک فی موطن ابد

یا رسول اللہ ﷺ مجھے سہیل کے سامنے کے دو دانت نکال دینے کی اجازت دیجئے تاکہ وہ پہلے کی طرح آپ کے خلاف زبان درازی نہ کر سکے۔

اس کے جواب میں جو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا! اس سے رسول اللہ ﷺ کی

وسیع القلبی کا ثبوت ہے۔

لا امثل به فیمثل الله بی وان کنت نبدیا۔

اگر میں کسی شخص کا مثلہ کروں گا تو میرے نبی ہونے کے باوجود میرا مثلہ کیا جائے گا۔

سیدہ زینب کے شوہر کا معاملہ

مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لختِ جگر سیدہ زینب تھیں۔ انہوں نے اپنے شوہر ابو العاص رضی اللہ عنہ (بن ربیع) کے فدیہ میں اپنا ہار بھیجا جو ان کو ان کی والدہ ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے رخصتی کے وقت تحفہ دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ مبارک اس ہار پر پڑی تو آبدیدہ ہو کر فرمایا۔

"اگر مناسب سمجھا جائے تو ہار اور قیدی دونوں کو واپس کر دیا جائے" اس کی تعمیل کی گئی۔

اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو العاص سے یہ وعدہ بھی لے لیا کہ وہ بی بی زینب کو خود سے الگ کر دیں۔ کیونکہ میاں بیوی میں سے ایک کے مسلمان اور دوسرے کے کفر پر قائم رہنے سے رشتۂ ازدواج کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ابو العاص نے اسے منظور کر لیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زید بن حارثہ اور ایک دوسرے شخص کو ان ساتھ مکہ بھیجا اور یہ دونوں حضرات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورِ نظر کو مدینہ منورہ لے آئے۔

ابو العاص دوبارہ گرفتار ہو گئے

جب سیدہ زینب رضی اللہ عنہا مدینہ تشریف لے آئیں تو ابو العاص اہلِ مکہ کے وکیل تجارت کی حیثیت سے شام کو جانے کے لئے نکلے تو مدینہ کے قریب مسلمانوں کے گشتی دستی نے انہیں لوٹ لیا مگر یہ راتوں رات بچتے بچاتے بھاگ کر کسی طرح مدینہ پہنچ گئے اور سیدہ زینب سے درخواست کر کے ان کی پناہ لے لی تا کہ انہیں حربی ہونے کی وجہ سے قتل نہ کر دیا جائے۔ مسلمانوں نے انکا لوٹا ہوا مال واپس کر دیا اور یہ سارا مال لے کر واپس مکہ پہنچ گئے اور وہاں جا کر جس جس کا مال تھا اس کو واپس کرنے کے بعد سب سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے مجھے جو جو کچھ دیا تھا اس میں سے کوئی چیز واپس کرنے سے رہ تو نہیں گئی۔ سب نے بیک زبان کہا۔ جزاک اللہ خیرا آپ بڑے ایماندار اور قابل اعتماد ہیں۔ اس کے بعد ابو العاص رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا۔ میں مدینہ میں مسلمان ہو چکا تھا لیکن اس خیال سے وہاں اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان نہ کر سکا کہ آپ لوگ مجھ پر اپنا مال غصب کرنے کا الزام نہ لگا دیں۔ اب میں اپنی ذمہ واری پوری کرنے کے بعد اعلان کرتا ہوں۔

اشہد ان لا الہ الا اللہ واشہد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ اس کے بعد ابو العاص رضی اللہ عنہ مدینہ تشریف لے آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت سے پھر سیدہ زینب رضی اللہ عنہا

ان کے گھر کی زینت بنیں۔

پھر وہی بدر کے قیدی

بات اصل میں بدر کے قیدیوں کی چل رہی تھی۔ جس کا ایک حصہ بیان کرنے سے رہ گیا تھا کہ قریش اپنے اپنے قیدیوں کا فدیہ مدینہ بھیجتے رہے۔ فدیہ کی رقم متعین نہ تھی البتہ کم از کم چار سو درہم اور زیادہ سے زیادہ ایک ہزار درہم تھی لیکن نادارو بے بس قیدیوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احسان فرما کر رہا کر دیا۔

کفار اور ماتم

کفارِ مکہ اپنے اس المیہ کے بعد بھی صلح و امن کی طرف نہ آئے بلکہ جہاں تک ضبط ہو سکا گریہ و ماتم سے باز رہے لیکن جس جس کا پیمانہ چھلک گیا وہی نالہ وشیون پہ اتر آیا۔

عورتوں کا تو یہ عالم تھا کہ جہاں کہیں کوئی اونٹ یا گھوڑا ذبح کیا جاتا تو یہ زخم خوردہ عورتیں سینہ کوبی کرتی ہوئی اس کی لاش پر حلقہ بنا لیتیں اور دل کھول کر روتیں، پیٹتیں، سینہ کوبی کرتیں۔

ھندہ خاموش آگ

ہر ایک عورت نے اپنے بال نوچ کر ہوا میں اڑا دیئے لیکن ابوسفیان کی بیوی ھندہ اس بارے میں سب سے مختلف تھیں۔ وہ رونے پیٹنے سے الگ تھلگ ہو کر بیٹھ گئیں۔ ایک دن قریش کی مجروح دل عورتیں ھندہ کے پاس آئیں اور ان سے کہا۔

حیرت ہے بدر میں تمہارا ایک عزیز نہیں بلکہ باپ مارا گیا۔ عم بزرگوار قتل ہوا، بھائی کی گردن کٹی، کئی اور عزیزوں کی جانیں گئیں مگر تعجب ہے آپ گریہ و ماتم سے کنارہ کش چپ سادھ کر بیٹھ گئی ہیں۔ یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

ھندہ نے جواب دیا۔ کیا میں بھی تمہاری طرح اپنے عزیزوں کو رو کر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اس کے ساتھیوں (رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین) کو اپنے آپ پر ہنسنے کا موقع دوں اور خزرج کی عورتوں کے لئے خوشی کا سامان بنوں! مجھ سے ایسا ہر گز نہ ہو گا۔ میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے ساتھیوں سے اپنے پیاروں کا بدلہ لے کر رہوں گی اور جب تک میرا یہ قول پورا نہ ہو مجھ پر اپنے بالوں میں تیل لگانا اور شوہر دونوں حرام ہیں۔

بہنو! اگر مجھے یقین ہو جائے کہ میرے رونے پیٹنے واویلا کرنے سے مجھے تسکین ہو سکتی ہے تو میں ایسا کرتی لیکن میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ نوحہ و ماتم سے میری تسکین نہ ہو سکے گی۔ ——— مجھے تسکین میرے عزیزوں کے قتل کرنے والوں کا کلیجہ چبا کر ہو گی۔

ھندہ نے اپنے دونوں قول پورے کرکے دکھا دیئے۔ نہ تو بالوں میں تیل لگایا نہ شوہر سے تعلقات قائم کئے۔ وہ قریش کو ایک اور لڑائی کے لئے اکساتی بھڑکاتی رہی۔ وہ لڑائی جس کو غزوہ احد کہا جاتا ہے۔ بدر کے بعد اس کا شوہر ابوسفیان بھی اسی خیالِ انتقام میں الجھ گیا۔ اس نے نذر مان لی۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انتقام لئے بغیر غسل واجب نہیں ہونے دوں گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔

غزوۂ بدر کی فتح کے بعد ردِّ عمل

غزوۂ بدر کی فتح کے بعد ردِّ عمل

مکہ والوں پر شکست کا جو ردِّ عمل ہوا وہ سابقہ سطور میں آپ کی نظر سے گزر چکا۔ آپ کو معلوم ہو گیا انہوں نے جلد سے جلد غزوۂ بدر میں قتل ہونے والوں کا بدلہ لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے دن رات انتقامی کارروائیوں کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔

ادھر مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی اہمیت لوگوں کے دلوں پر قابض ہو گئی۔ شہر کے تینوں فریق یہود، مشرک اور منافق اب اس منفی انداز میں سوچنے لگے کہ کل ہمارے شہر میں پناہ لینے والے مسلمانوں کا آج اقتدار اور غلبہ کہیں مستقبل میں ہمارے اقتدار کا صفایا ہی نہ کر دے۔

اگرچہ غزوۂ بدر سے پہلے ہی یہودیوں نے صلح و امن کا معاہدہ ہونے کے باوجود مسلمانوں کی تحقیر و تذلیل کا سلسلہ شروع کر دیا تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غزوۂ بدر میں فتح عطا فرما دی تو پھر صرف یہود ہی کیا بلکہ مسلمانوں کے دوسرے دشمنوں کے دلوں میں خوف سا بیٹھ گیا۔

انہوں نے مسلمانوں کے خلاف لوگوں کے دلوں میں نفرت و حقارت پیدا کرنے کی مہم شروع کر دی ان کی کردار کشی ہر محفل میں شروع کر دی، شعروں میں اسلامی شعار کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ جس کی بناء پر رسول اللہ ﷺ کے لئے مدافعتی اصلاحِ حال کی تحریک چلائے بغیر کوئی راستہ نہ تھا۔ تبلیغ دین اور ترویجِ دین کے لئے تدبرو تفکر کے ساتھ پرامن انقلاب کی کوششوں کو تیز تر کر دیا گیا۔

ابھی تک یہودی مسلمانوں کے ساتھ صرف دین اسلام کے مسائل پر ہی کج بحثی کا میدان گرم رکھتے تھے۔ مگر اب اپنے اقتصادی اور معاشرتی اعتبار سے قائم شدہ اقتدار کی دیواروں کو گرتا ہوا محسوس کرنے لگے اور دن بدن ان کے دلوں میں یہ خوف بڑھتا گیا کہ مسلمانوں کا وجود ان کے وجود کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ لہٰذا اس خوف سے انہوں نے طے کر لیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو رسول اللہ ﷺ کی مخالفت ہر سطح پر جاری رکھی جائے۔ اس سرد جنگ میں یہودی جتنی سازشیں کرتے، رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع مل جاتی اور نبی ﷺ حسنِ تدبرو حکمت سے ان کا اثر زائل کر دیتے اور یہودی اپنی ہر ناکام سازش کے

بعد از سرِنو سازشوں کا جال پھیلانے میں مصروف ہو جاتے۔

فتح بدر سے پہلے مسلمانوں کے مظلوم ہونے کی یہ حالت تھی کہ اگر مشرکین اور یہود میں سے کوئی انہیں قتل بھی کر دیتا تو مسلمان صبر سے کام لیتے لیکن غزوۂ بدر کی فتح کے بعد حالات کی تبدیلی نے ان میں مدافعت کی جرات پیدا کر دی۔ (یا یوں کہہ لیجئے کہ غزوۂ بدر سے پہلے اللہ تعالیٰ نے مکہ اور مدینہ دونوں میں مسلمانوں کو واستعینوا باالصبر والصلوٰۃ کا حکم دیا تھا اور غزوۂ بدر کے بعد مدافعت اور جہاد کا حکم دے دیا۔ مترجم)

چنانچہ مدینہ کے سہ فریقی گروپ یہود' مشرک اور منافقین کی اسلام دشمن تحریک کی ناقابلِ برداشت حد تک زیادتیوں کی وجہ سے مندرجہ ذیل واقعات رونما ہوئے۔

(1) ابو عفک کا قتل

ابو عفک قبیلہ بنی عمرو بن عوف سے تھا۔ اپنے وقت کا عوامی شاعر تھا۔ غزوۂ بدر سے پہلے بھی وہ اپنے اشعار میں اسلام دشمنی کی انتہا کر دیتا تھا لیکن غزوۂ بدر کے بعد تو وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور دین کے خلاف یاوہ گوئی میں اتنا بڑھ گیا کہ جانثارانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدِ برداشت سے باہر ہو گیا۔ چنانچہ ایک رات سالم بن عمیر (اوسی) رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پیمانہ صبر چھلک گیا۔ وہ رات کے وقت عفک کے گھر پہنچے۔ دیکھا کہ وہ صحن میں سو رہا ہے۔ تیر کی نوک اس کے سینے میں اس زور سے ماری کہ وہ اس پار نکل گئی اور ابو عفک ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

دوسرا واقعہ

مدینہ ہی کے رہنے والے مروان بن زید نامی شخص کی بیٹی تھی جس کا نام عصماء تھا۔ بدنصیبی نے اسے شاعرہ بنا دیا۔ مزید بد نصیبی یہ ہوئی کہ اس کی شاعری کا رخ دین اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف لوگوں کو اکسانے اور دشمنی کے لئے بھڑکانے کی طرف ہو گیا۔ وہ اپنے شعر کے ہر مصرع میں لوگوں کو مسلمانوں کی دشمنی اور غارت گری پہ اکساتی اور گرماتی۔ اگرچہ غزوۂ بدر سے پہلے بھی اس کا یہی آوارہ چلن تھا لیکن غزوۂ بدر کی فتح کے بعد بھی اس کی عقل ٹھکانے نہ آئی بلکہ اس نے اپنی شاعری کو اور شعلہ نوا کر دیا۔

جناب عمیر بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غیرتِ ایمانی سے برداشت نہ ہوا۔ ایک رات جبکہ عصماء اپنے افرادِ خانہ کے درمیان اپنے بچہ کو دودھ پلاتے ہوئے سو گئی تھی۔ عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دبے پاؤں داخل ہوئے۔ بینائی کچھ کمزور تھی پھر بھی سب کے پلنگ ٹٹولتے ہوئے عصماء کے پلنگ تک پہنچ گئے بچی کو الگ کیا اور عصماء کے سینے میں اس زور سے خنجر مارا کہ پھر وہ دوسرا سانس نہ لے سکی نہ شعر کہہ سکی۔ صبح کے وقت جب عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رات

کے وقت کا واقعہ سنا کر واپس اپنے گھر جا رہے تھے تو اس وقت عصماء کے بیٹے اسے دفن کر رہے تھے۔ ایک نے دیکھ کر کہا۔ اے عمیر! تم نے ہماری والدہ کو قتل کر دیا۔ انہوں نے جواب میں کہا۔

نعم۔ فکیدونی جمعیا ثم لا تنظرون! فوالذی نفسی بیدہ لو قلتم باجمعکم ما قالت لضربتکم بسیفی حتی اموت واقتلکم

ہاں ہاں میں ہی قاتل ہوں۔ تم میں انتقام لینے کا دم خم ہے تو ابھی اسی وقت لے لو اور یاد رکھو اگر تم بھی اپنی مقتولہ ماں کی طرح (ہمارے دین اور ہمارے ہادیٔ برحق رسول اللہ ﷺ) کی اور ہماری توہین کرو گے تو میں تمہیں بھی قتل کرنے میں دریغ نہیں کروں گا۔ چاہے مجھے تمہارے ہاتھوں خود بھی قتل ہونا پڑے۔

عصماء کے قتل نے عصماء ہی کے قبیلے بنی خطمہ کو اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے کی جرات دی جو اب تک اسی کے ڈر سے اپنے دین کو چھپائے ہوئے تھے۔ آج وہ کھلم کھلا دینِ اسلام کی صف میں شامل ہو گئے۔

(3) کعب بن اشرف کا قتل

کعب بن اشرف بھی نابکار شاعر تھا۔ وہ شیطان دوستی اور اسلام دشمنی میں اپنا جواب آپ تھا۔

(1) کعب بن اشرف نے غزوۂ بدر میں کفارِ مکہ کی شکست پر کف افسوس ملتے ہوئے کہا تھا۔

ہولاء اشراف العرب وملوک الناس واللہ لئن کان محمد اصاب ہولاء القومؓ لبطن الارض خیر من ظہرھا!

آہ وہ سردار جو حرم کے نگہبان اور عرب کے بادشاہ تھے ان کی موت کے بعد تو ہمارے جینے سے ہمارا مر جانا بہتر ہے۔

(2) کعب بن اشرف بھی انہیں میں سے ایک کفر کا شیدائی تھا جنہیں مکہ کے کافروں کی شکست کا یقین نہیں آتا تھا۔ وہ اس شکست کی تصدیق کے لئے خود مکہ معظمہ پہنچا۔ اچھی طرح تحقیق کی، تصدیق ہوئی تو اسی لمحہ سے اس نے بدر میں (ایک ہی گڑھے میں دفن کئے جانے والے کفار جس گڑھے کا نام قلیب ہے) میں سے ایک ایک کا نام لے کر اس کی بے بسی کا اس انداز سے ذکر کرنا شروع کر دیا کہ سننے والے بے ساختہ آہ و بکا کرنا شروع کر دیتے۔ اپنے ان اشعار میں وہ (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ اور دینِ اسلام کے خلاف خوب زہر اگلتے اشعار ایسے انداز میں پڑھتا کہ عوام اس سے مشتعل ہو جاتے۔

(3) مکہ سے شکست کا یقین لے کر جب نڈھال، زخمی اور مشتعل ہو کر لوٹا تو اس نے مسلمانوں کے دل دکھانے والے ایسے ایسے طریقے اختیار کئے جسے مسلمان تو کیا کوئی شریف النفس ان کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی بیویوں کے نام لے لے کر ان کی تشبیب کرتا۔ یوں تو دنیا کے ہر کونہ میں اپنی بیویوں کو اپنی ناموس سمجھتا ہے لیکن عربوں میں تو خصوصاً اور مسلمان ہونے کے بعد تو اور زیادہ حفاظتِ ناموس پہ اپنی جان قربان کر دینے کو معمولی ایثار کا نام دیا جاتا ہے۔

کعب بن اشرف کی اس بے ہودہ گوئی نے مسلمانوں کی نیندیں حرام کر دیں۔ آخر چند جانثارانِ شرافت و انسانیت "شمع الرسول ﷺ" نوجوانوں نے مل کر اسے کیفرِ کردار تک پہنچانے کا فیصلہ کر لیا۔

ان میں سے ایک جانثارِ محمد ﷺ کعب کے پاس گیا اور اس سے اس انداز سے بات چیت کی کہ اسے یقین آ گیا کہ یہ شخص رسول اللہ ﷺ کا سخت مخالف ہے۔ اس نے کعب سے فریاد کے انداز میں کہا کہ یہ شخص جب سے مدینہ میں آیا ہے اس نے ہم کو بڑی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہمیں تمام عرب سے دشمنی مول لینی پڑ رہی ہے۔ ہر طرف سے ہمارے راستے بند ہو گئے ہیں۔ اہل و عیال ضائع ہو گئے ہیں اور دل ہر وقت تھراتے رہتے ہیں۔

صحابی رضی اللہ عنہ نے گفتگو کے دوران کعب کو اپنی دوستی کا پکا یقین دلا دیا۔ اس کے بعد صحابی رضی اللہ عنہ نے کعب سے اپنے اور چند دوستوں کے لئے ادھار غلہ مانگا اور اس کے عوض اپنی زرہیں گروی رکھنے کا وعدہ کیا۔ کعب نے اسے قبول کر لیا۔

کعب بن اشرف کی حویلی مدینہ منورہ سے باہر ایک گڑھی میں تھی۔ جہاں دوسرے ہی روز مذکور ابو نائلہ صحابی رضی اللہ عنہ اپنے ہم نواؤں کو ساتھ لے کر حسبِ پروگرام پہنچ گئے۔ رات کافی گزر چکی تھی۔ ابو نائلہ رضی اللہ عنہ نے اپنے دو ساتھیوں کو ایک خاص جگہ پر چھپا دیا اور خود کعب کے دروازے پہ دستک دی۔ کعب اٹھ کر دروازہ کھولنے جا رہا تھا، بیوی نے روکا۔ "رات کافی ہو چکی ہے مت جاؤ" مگر کعب نے سنی ان سنی کر دی۔ دروازہ کھولا تو ابو نائلہ رضی اللہ عنہ ان سے ملے اور باتوں میں لگا کر اس کے گھر سے دور لے آئے۔ اپنی پریشانیاں بیان کر کے اس کے دل میں اپنا ایسا اعتماد پیدا کر دیا کہ اسے ان کے بارے میں کوئی کھٹکا نہ رہا۔ چہل قدمی کرتے کرتے ابو نائلہ رضی اللہ عنہ نے کعب کے بالوں کی تعریف کی۔ انہیں چھوا تو ان میں بسی ہوئی خوشبو کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں آج جیسا خوشبودار تیل آپ نے کبھی استعمال نہیں کیا ہو گا" کعب اپنی تعریف سن سن کر جھوم رہا تھا۔ اپنی مقررہ جگہ پر آ کر ابو نائلہ رضی اللہ عنہ نے جھپٹ کر کعب کی کنپٹی کے بالوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اپنے ساتھیوں کو آواز

دی۔ "نکلو اور دشمن دین کو ختم کر دو" جو موت کے فرشتے کی طرح گھات لگائے بیٹھے تھے۔ دونوں بجلی کی طرح کوند کر لپکے اور ایک ہی لمحہ میں اسے واصلِ جہنم کر دیا۔

ہراس و وحشت

کعب بن اشرف جیسے بااثر اور ان کے معاشرہ میں باوقار آدمی کی موت نے یہودیوں کے ہر چھوٹے بڑے مرد اور عورت کے دل میں سراسیمگی پیدا کر دی۔ اب ہر ایک کو اپنی جان غیر محفوظ محسوس ہونے لگی۔ لیکن ان کی زبانیں اب بھی قینچی کی طرح رسول اللہ ﷺ کے خلاف چل رہی تھیں۔ جس کے منہ میں جو آتا وہی بک دیتا۔

برقع پوش مسلمہ اور یہودی

انہیں مذکورہ واقعات کے درمیان ایک اور سنگین واقعہ رونما ہوا۔ ہوا یوں کہ انصار میں سے ایک مسلمان عورت رضی اللہ تعالیٰ عنہا' یہودیوں کے بازار قینقاع میں زیور بنوانے کے لئے گئی۔ یہودی اور اس کے آس پاس کے حواریوں نے چاہا کہ یہ محترمہ کسی صورت چہرہ سے نقاب اٹھا کر ان کی نگاہِ ہوس کو تسکین دے! لیکن جب یہ پاک دامن بی بی ان کی باتوں میں نہ آئی تو ایک خارش زدہ یہودی نے اس کے برقعہ کو کانٹے میں اٹکا دیا۔ محترمہ بے خبری میں اٹھیں تو اس کا نقاب الٹ گیا۔ محترمہ نے ان یہودیوں کی اس بے جا حرکت پہ واویلا کیا۔ تو ایک مسلمان جو اس واقعہ کو دیکھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھا اور ایک ہی وار میں یہودی سنار کو ختم کر دیا جس کے جواب میں بہت سے یہودیوں نے مل کر اس صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی شہید کر دیا۔ اس کے بعد یہودی اور مسلمانوں کے درمیان کھلم کھلا دشمنی ہو گئی۔

رسول اللہ ﷺ کا اعلان

مذکورہ واقعہ کی روشنی میں نبیؐ رحمت ﷺ نے یہودیوں پر واضح فرما دیا۔ اگر تم لوگوں نے مسلمانوں کو اذیت دینا بند نہ کیا' اپنے کئے ہوئے معاہدہ پر عمل پیرا نہ رہے' تو تمہارے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک ہو گا جس طرح کفارِ مکہ کے ساتھ ہوا' لیکن یہود کو تکبر نے ایسا خود سر بنایا ہوا تھا کہ انہوں نے آپ ﷺ کو جواب میں کہلا بھیجا۔

لا یغرنک یا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) انک لقیت قوما لا علم لھم بالحرب فاصبت فرصۃ انا واللہ لئن حاربناک لتعلمن انا نحن الناس۔

"محمد (ﷺ) فخر میں نہ آؤ۔ تم نے ایسی قوم کے ساتھ جنگ کی جو لڑائی کے فنون سے ناواقف تھے۔ اللہ کی قسم اگر تم ہم سے جنگ کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ تمہیں کیسے فولادی

لوگوں سے پالا پڑا ہے"۔

یہودیوں کے اس جواب میں اگر مسلمان دفاعی جنگ کے لئے تیار نہ ہوتے تو ان کی حالت بھی اتنی ہی پریشان کن اور ذلت آمیز ہو جاتی جتنی مکہ معظمہ میں تیرہ سال تک رہی۔ اب مسلمان اپنے بارے میں وہ سب سننے کے لئے تیار نہ تھے جو شکستِ بدر کے بعد کفارِ مکہ کے بارے میں گھر گھر ایک زبان پر تھے۔

بنو قینقاع کا محاصرہ

بنو قینقاع کے یہودیوں کے شوقِ پنجہ آزمائی کا جب مثبت جواب دیا گیا تو یہودی بھاگ کر قلعہ میں دبک گئے۔ مسلمانوں نے ان کی رسد بند کر دی۔ لیکن پندرہ دن ہی کے محاصرہ کے بعد یہودی اطاعت پر راضی ہو گئے' دروازے کھول دیئے گئے اور تمام مجرم رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کیے گئے۔ آنحضرت ﷺ نے سب کے قتل کا حکم دیا مگر مدینہ کا مشہور منافق عبداللہ بن ابی بن سلول دخل انداز ہوا۔ یہ عیار مسلمان اور یہودی دونوں کا حلیف تھا۔ اس نے عرض کیا! یا رسول اللہ ﷺ میرے دوستوں پر احسان کیجئے مگر رسول اللہ ﷺ نے اس کی درخواست پر توجہ نہ فرمائی۔ آخر اس نے آپ ﷺ کے دامن کو ایک ہاتھ سے پکڑ کر انتہائی آہ و زاری کے ساتھ التجا کی۔ اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ نے توجہ نہ فرمائی' بلکہ آپ ﷺ نے غصہ کا اظہار فرمایا۔ "مجھے چھوڑ دو" عبداللہ بن ابی بن سلول نے اپنی ایکٹنگ اور زیادہ موثر کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں رسول اللہ ﷺ نے پہلے سے زیادہ سختی سے اسے ہاتھ ہٹانے کے لئے کہا مگر عبداللہ نے اسی طرح بچوں کی طرح بلکتے ہوئے کہا۔ آپ جب تک میرے دوستوں کو نہیں چھوڑیں گے میں ہاتھ نہیں چھوڑوں گا۔ میری مصیبتوں میں انہیں لوگوں نے تین سو بکتر بند اور چار سو با زرہ سپاہیوں کی مدد سے میری حفاظت کی ورنہ میرے دشمن مجھے جان سے مار ڈالتے۔ اگر میرے سامنے ان سات سو بہادروں کو قتل کر دیا جائے گا تو پھر میرا کیا ہو گا۔ عبداللہ بن ابی کی مکار سیاست اگرچہ کافی حد تک بے اثر ہو چکی تھی پھر بھی اوس و خزرج دونوں قبیلوں کے مشرکین میں چودھری بنا ہوا تھا۔ مختصر یہ کہ عبداللہ کی آہ و زاری سے التجا کی بناء پر آنحضرت ﷺ کے غصہ میں کمی واقعہ ہوئی' اسی اثناء میں جناب عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے بھی یہود کی سفارش کی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ میں عبداللہ اور مشرکین کی درخواست پر ان لوگوں کی جاں بخشی کرتا ہوں لیکن اس شرط پر کہ یہ لوگ مدینہ خالی کر دیں اور یہ لوگ انتہائی قصوروار ہیں۔

عبداللہ منافق نے ان کی جلاوطنی بھی معاف کرانے کی کوشش کی۔ اس مرتبہ ایک مسلمان

نے آگے بڑھ کر عبداللہ کو روکنا چاہا اس میں وہ زخمی بھی ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بنو قینقاع نے از خود کہہ دیا کہ "جس شہر میں ہماری عزت نہیں وہاں رہنے کا فائدہ کیا۔ جہاں ہماری بے بسی کا عالم یہ ہو کہ ہمارا ہمدرد زخمی ہو جائے تو ہم اس کی مدد نہ کر سکیں" یہ کہہ کر یہود اپنا اسلحہ اور زیورات جو ان کی صنعت و تجارت کا ذریعہ تھے' سب چھوڑ کر یہاں سے نکل گئے۔ کچھ دن وادی القریٰ میں اقامت گزیں رہے مگر یہاں سے وہ اذرعات نام کی بستی میں منتقل ہو گئے۔ اس خیال سے کہ یہود کو جس ارضِ موعود کا وعدہ کیا گیا ہے یہی سرزمین ہے۔ اور جس کے لئے ہر زمانے میں ہر یہودی کا دل تڑپتا رہتا ہے۔

سیاسی وحدت

بنو قینقاع کے مدینہ سے نکل جانے کے بعد مدینہ منورہ فساد سے پاک ہو گیا۔ یہودی اگرچہ مدینہ منورہ سے قیام گاہ کی نسبت رکھتے تھے لیکن ان کی تمام سیاسی سرگرمیوں کے مراکز ام القریٰ اور خیبر کی بستیاں تھیں۔ جو مدینہ منورہ سے اچھے خاصے فاصلہ پہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے سیاسی اثر و رسوخ کو ختم کرنے کے لئے ہی انہیں جلاوطنی کی سزا دی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معاملہ فہمی کا بہترین نمونہ تھا۔ چنانچہ اس کے بعد جتنے بھی سیاسی واقعات رونما ہوئے بڑی حد تک وہ اسی اقدام کا نتیجہ تھے' ظاہر ہے ایک شہر میں دو مختلف العقائد قوموں کے درمیان روز روز کے جھگڑے سے کب تک امن و سلامتی کا وجود باقی رہ سکتا تھا۔ آخر ایک فریق کا دوسرے فریق پر غالب آنا لازمی تھا۔ یہی حالات مدینہ میں رونما ہوئے اور اسی سیاست کی بناء پر فریقین کے جھگڑوں کا نتیجہ یہ نکلا۔۔ جس پر مسیحی مؤرخ حرف گیر ہیں۔۔

فرض کریں مسلمہ کی بے حرمتی پر مقامی مسلمان یہودی سنار کو قتل نہ بھی کرتا اور اس کا مداوا کوئی اور بھی ہو جاتا۔ تو بھی عرب قوم کا تاریخی کردار اس بات کا گواہ ہے کہ عرب اس قسم کے واقعات کے بعد انتقاماً کئی سالوں تک خونریزی کرنا اپنا کھیل سمجھتے ہیں۔ عرب تاریخ میں اس کی بے گنت مثالیں بھی موجود ہیں۔

مسلمان عورت کی بے حرمتی اور چیکوسلواکیہ کے شہزادہ کے واقعات میں مشابہت

چیکوسلواکیہ کے شہزادہ کا واقعہ یوں ہے۔ کہ 1914ء میں شہزادہ مذکور کو قتل کر دیا گیا۔ جس کی بناء پر جنگ عظیم کا آغاز ہوا اور پھر اس آگ نے پورے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اسی طرح اس مسلمان عورت کی بے حرمتی یہودیوں اور مسلمانوں کے درمیان جنگ کا پیش

خیمہ ثابت ہوئی، جن میں دشمنی کی آگ پہلے سے سلگ رہی تھی۔ گویا یہ ایک آتش فشاں تھا جو ذرا سی مداخلت سے ابل پڑا۔ جیسا کہ بعد کے واقعات سے ثابت ہوتا ہے۔

غزوۂ سویق

بنو قینقاع کی جلاوطنی کے بعد مدینہ کے غیر مسلم (کفّار) نے اس طرح سنبھالا لیا جس طرح ہوا سے اڑنے والی گردوغبار کے رک جانے کے بعد انسانی طبائع مطمئن ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایک مہینہ ہی گزرا تھا کہ ابوسفیان جو مکہ کے متکبرین اور سرداروں میں سے باقی رہ گیا تھا اس نے سر اٹھایا۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی کہ میں جب تک محمد ﷺ سے انتقام نہیں لے لوں گا تب تک اپنے آپ پر غسل واجب نہیں ہونے دوں گا۔ جس سے اس کا مقصد کفارِ مکہ کے دامن پہ لگے ہوئے شکست کے دھبہ کو دھونا مقصود تھا تاکہ کفّارِ مکہ کی کھوئی ہوئی دھاک اور شوکت و عظمت دوبارہ قائم ہو جائے۔ اسی ارادہ کی تکمیل کے لئے وہ دو سو یا چار سو بہادروں کے ساتھ مدینہ کی طرف بڑھا اور مسلمانوں کی گرفت کے خوف سے قدم قدم پر راستے بدلتا ہوا آخر مدینہ منورہ کے قریب ہی عریض نامی مقام پر آ پہنچا۔۔۔ جہاں اس کے وحشی مزاج دستے نے ایک انصاری اور اس کے ساتھی کو شہید کر دیا۔ یہ دونوں جنگل میں ریوڑ چرا رہے تھے۔ قریشی سپہ سالارِ اعظم کی فوج نے بستی عریض کے دو جھونپڑے دو چار بوٹے بھی جلا دیئے۔ جس کے بعد اس نے اپنے دل کو یہ کہہ کر تسلی دے لی۔ میں نے بدر کے مقتولین کا انتقام لینے کی جو قسم کھائی تھی وہ پوری کر لی۔

حقیقت یہ ہے کہ ابوسفیان کے دل میں مسلمانوں کی دہشت اس حد تک مسلط تھی کہ وہ ہر لمحہ سوچتا کہ اگر میں ان کے ہاتھ آ گیا تو میرا حشر کیا ہو گا۔ اس نے اپنی سواریوں کا رخ مکہ کی طرف موڑ لیا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ ابوسفیان رات کی تاریکی میں چوروں کی طرح شہر میں آیا۔ حی بن اخطب کے ہاں گیا مگر اس نے اپنے ہاں ٹھہرانے سے معذرت کر دی۔ پھر سلام بن مشکم کے ہاں آیا۔ اس نے شراب بھی پلائی اور مسلمانوں کے تمام حالات بھی بتا دیئے۔

مسلمانوں کو جب ابوسفیان کے بہادروں کے کارنامے کا پتہ چلا تو ان دونوں مسلمانوں کے قاتل کفار کے تعاقب میں ایک دستہ لے کر روانہ ہوئے اور مقام قرقرۃ الکدر تک پہنچ گئے۔ ابوسفیان اور اس کے ساتھی مسلمانوں کے خوف سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ رہے تھے۔ یہاں تک کہ اپنی سواریوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے اپنی رسد کے ستو جو تھیلوں میں بھر کر لائے تھے گرانا شروع کر دیئے۔ جنہیں مسلمان راستے میں سے اٹھاتے گئے۔ چونکہ ستو کو عربی میں سویق کہتے ہیں اس لئے اس کا نام غزوۂ سویق پڑ گیا۔ آنحضرت ﷺ نے جب قرقرۃ الکدر پہ آ

کر دیکھا کہ حملہ آور بھاگ گیا ہے تو مدینہ کی طرف واپس ہو گئے اور ابو سفیان جو بدر کی تلافی کے لئے غراتا ہوا مکہ سے نکلا تھا اسی طرح ایک روایت کے مطابق چھپتا چھپاتا مدینہ پہنچا اور پھر اسی طرح چھپتا چھپاتا واپس مکہ مکرمہ پہنچ گیا۔

ادھر سچائی عرب کے چاروں طرف پھیل گئی۔ کہ کفار مکہ نے غزوۂ بدر سے پہلے جن لوگوں کو مکہ سے ہجرت کرنے پہ مجبور کر دیا تھا وہ مدینہ منورہ میں پناہ گزیں ہوئے انہیں لوگوں نے مقامِ بدر میں کفارِ مکہ کے حملہ آوروں کا صفایا کر کے فتح مبین حاصل کر لی۔ یہی نہیں بلکہ قینقاع جیسے مضبوط یہود قبیلہ کو بھی مسلمانوں نے اپنی حاصل کردہ قوت سے مدینہ سے جلاوطن کر دیا۔ مدینہ کے سب سے بڑے اور بااثر عبداللہ بن ابی بن ابی سلول نے بھی مسلمانوں کی ہیبت کے سامنے سر جھکا دیا ہے اور مکہ کا چودھری ابوسفیان مسلمانوں سے خوفزدہ مکہ میں دبک کر بیٹھ گیا ہے۔

ناکہ بندی

اس زمانہ میں مکہ اور شام کے درمیان تجارتی قافلوں کی شاہراہ بحیرہ احمر کے کنارے سے ہو کر گزرتی تھی جس کے قریب آباد بستیوں کے لوگ تاجروں کی آمدورفت سے مالی فائدہ بھی اٹھاتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی تعلیم و تبلیغ کے زیر اثر ان بستیوں کے لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے معاہدے کر لئے جس کی وجہ سے ان کی ناکہ بندی ہو گئی لیکن انہیں قبائل کو مستقبل میں اپنی معاشی بدحالی کے خوف سے دن کو تارے نظر آنے لگے۔ وہ سوچنے لگے کہ ایسے بنجر علاقوں سے اگر کبھی قبائلیوں کے تجارتی قافلوں کی آمدورفت بند ہو گئی تو ان کا جینا محال ہو جائے گا۔ مدینہ میں آنے سے پہلے ان دشواریوں کا تصور تک بھی نہ تھا۔

پھر بدر میں کفارانِ مکہ کی شکست نے ان قبائل کو بری طرح دہشت زدہ کر رکھا تھا۔ کبھی سوچتے کہ سب مل کر مدینہ پہ یلغار کر دیں مگر ان کی بے ہمتی اور بزدلی قدم اٹھانے نہ دیتی۔

قبیلہ غطفان اور سلیم

اس دوران غطفان اور قبیلہ سلیم کے مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی خبر آئی تو رسول اللہ ﷺ اپنے ہمراہ ایک دستہ لے کر مدینہ سے نکلے اور مقام قرقرۃ الکدر پر آکر ان کی ناکہ بندی کی تو معلوم ہوا۔ یہاں بے شمار اونٹ چر رہے ہیں مگر ان کا چرواہا کوئی نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس ریوڑ کو قبضہ میں لے لیا۔ اور ایک جماعت قریب کی بستی میں ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بھیجی۔ جہاں انہیں ایک یسار نامی ایک لڑکا ملا۔ اس نے بتایا کہ تھوڑی دیر پہلے ایک گروہ بھاگتا ہوا سمندر کی طرف نکل گیا ہے۔ اس اطلاع کے بعد رسول اللہ ﷺ نے یہ اونٹ اپنے ساتھیوں میں بانٹ دیئے اور یہ تقسیم قرآن مجید کے

حکم سے ہوئی۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا خمس نکالنے کے بعد ہر ایک غازی کے حصہ میں دو دو اونٹ آئے۔ کل پانچ سو اونٹوں کا گلہ تھا۔

کچھ عرصہ بعد

کچھ دنوں کے بعد اطلاع آئی کہ بنو ثعلب اور بنو محارب "مقام ذی امر" میں جمع ہو رہے ہیں۔ ان کا ارادہ مدینہ کے مسلمانوں پر یلغار کرنے کا ہے۔ رسول اللہ ﷺ تقریباً چار سو یا پانچ سو مجاہدوں کا قافلہ لے کر نکلے۔ راستے میں بنو ثعلبہ کا ایک شخص مل گیا اور اسی نے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع دی کہ وہ لوگ فلاں مقام پر چھپے بیٹھے ہیں لیکن اے محمد ﷺ جیسے ہی انہوں نے آپ کے آنے کی خبر سنی وہ یقیناً بھاگ کر پہاڑوں میں چھپ جائیں گے۔ آپ آیئے میرے ساتھ تشریف لایئے۔ ان پوشیدہ جگہ پر میں آپ کو خود لے کر چلتا ہوں۔ چنانچہ واقعہ بھی یہی ہوا جو بنو ثعلبہ کے اس فرد نے کہا تھا۔ جونہی انہوں نے مسلمانوں کی آہٹ سنی تو چوہوں کی طرح بھاگ کر پہاڑوں میں روپوش ہو گئے۔

بنو سلیم کی دوسری کوشش

چند دنوں بعد ہی اطلاع ملی کہ بنو سلیم دوبارہ حملہ آور ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ رسول اللہ ﷺ تین سو ساتھیوں کا دستہ لے کر مقام بحران پر پہنچے تو اسی رات کو قبیلہ سلیم ہی کے آدمی نے آکر خبر دی کہ یہ لوگ آپ کی آمد کی خبر ملتے ہی بھاگ گئے ہیں۔

الغرض اسی طرح عرب کے قبائل آنحضرت ﷺ سے خائف تھے۔ جو رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی صداقت کا ثبوت ہے کہ

نصرت بالرعب میسرۃ شہر۔

میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک ماہ کی مسافت کے سفر تک رعب و دبدبہ عطا گیا ہوں" یعنی آپ ﷺ سے دشمن دور ہی سے خوفزدہ ہو کر بھاگ جاتا تھا۔ تاریخ گواہ ہے کہ بعض لوگ تو بڑے بڑے خطرناک منصوبے بنا کر بڑی ہمت کر کے حملہ آور ہونے کے لئے گھروں سے نکلتے مگر جیسے ہی انہیں اپنے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کے نکلنے کی اطلاع ملتی تو الٹے پاؤں بھاگ جاتے۔

یہودیوں کی بدحواسی

کعب بن اشرف کے قتل نے مدینہ اور اس کے گردونواح میں بسنے والے یہودیوں پہ خوف طاری ہو گیا تھا۔ ہر ایک اس خوف میں مبتلا تھا کہ کہیں میرا حشر بھی کعب بن اشرف کی

طرح نہ ہو۔ بنو قینقاع کا محاصرہ اور ان کی جلاوطنی نے اس خوف و ہراس میں اور اضافہ کر دیا۔ ایک بار یہودی رسول اللہ ﷺ کے پاس یہ شکایت لے کر بھی آئے کہ آپ نے کعب بن اشرف کو کس جرم میں قتل کروایا۔ جواب میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کعب ہمارے خلاف مکہ معظمہ والوں کو بھڑکانے کے لئے وہاں پہنچا۔ کعب نے اپنے اشعار میں عوام کو ہمارے خلاف جنگ کرنے اور ہمیں قتل کرنے کے لئے اکسایا۔ کعب نے اپنے قصیدوں میں اللہ تعالیٰ کے دین اور رسول (ﷺ) کی ہجو کی۔ اگر وہ بھی دوسروں کی طرح صرف اپنے عقیدہ تک محدود رہتا تو ہماری طرف سے اسے گزند نہ پہنچتی۔ غرض اس سلسلہ میں کافی بحث مباحثہ کے بعد ایک بار پھر یہودیوں اور مسلمانوں میں خیر سگالی معاہدہ ہوا مگر حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کے دل سے اسلام کے خلاف کینہ نہ گیا۔

تجارتی بدحالی

کفار مکہ اپنی تجارتی ناکہ بندی سے سخت پریشان تھے۔ ان کی تجارتی لائن کٹ چکی تھی۔ اہل مکہ کی معیشت کا انحصار ہی ان تجارتی قافلوں پر تھا۔ وہ اس پریشانی میں رہتے کہ اگر کچھ مدت تک اور موجودہ رکاوٹیں رہیں تو ان کا جینا مشکل ہو جائے گا۔ بھوک اور قحط ان کو کھا جائے گی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ محمد ﷺ ان کی تجارت ختم کر کے انہیں مکہ میں محصور کر دیں گے۔

ایک روز کفارِ مکہ کے ایک مجمع میں صفوان بن امیہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ہمارے حریف محمد (ﷺ) نے ہماری ناکہ بندی کر رکھی ہے۔ کوئی ایسی صورت نظر نہیں آتی کہ ہم شام کی راہ عبور کر کے ان کے ہاتھ سے صحیح سلامت نکل جائیں۔ اس راہ پر رہنے والے قبائل بھی مسلمانوں کے ساتھ خیر سگالی معاہدہ کر چکے ہیں۔ اب ہمارا حشر کیا ہو گا۔ اگر ہم اسی طرح گھروں میں بیٹھے رہے تو بیٹھے بیٹھے راس المال کھا کر کنگال ہو جائیں گے۔ ہمیشہ گرمی کے موسم میں شام کی طرف اور سردیوں میں حبشہ کی طرف سے تجارتی قافلے گزر کر روزی کما لاتے! مگر اب ناممکن ہے اس وقت اسی مجمع میں سے ایک شخص اسود بن مطلب نے کھڑے ہو کر کہا۔ شام جانے کے لئے ساحلِ سمندر سے ہٹ کر عراق ہوتے ہوئے بھی تو ہمارے قافلے سلامت نکل سکتے ہیں۔ اس راستے کے جاننے والے فرات بن حیان (بنی ابی بکر بن وائل) ہم میں موجود ہیں۔

فرات نے خود اٹھ کر کہا۔ کہ جہاں تک میرا خیال ہے محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں میں سے کسی ایک نے بھی آج تک یہ رستہ نہیں دیکھا۔ کیوں کہ اس راہ میں پراسرار پہاڑوں اور بیابانوں اور صحراؤں کا طویل سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے یہ بھی ہے اگر یہ سفر

سردیوں میں کیا جائے تو کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ پیاس بھی کم لگے گی۔ معاملہ طے ہو گیا اور قافلے تیار ہونا شروع ہو گئے۔

پہلے تجارتی قافلہ میں چاندی اور دوسرا سامانِ تجارت ایک لاکھ درہم کے لگ بھگ تھا۔ قافلہ چل پڑا۔ جس وقت قریشِ مکہ میں تجارت سے متعلق بحث ہو رہی تھی تو اس مجمع میں اشجعی قبیلہ کا ایک فرد جس کا نام نعیم بن مسعود تھا وہیں موجود تھا ـ وہ مدینہ لوٹا تو یہ بات اس نے برسبیلِ تذکرہ کسی مسلمان کے کان میں ڈال دی۔ جب اس بات کا علم نبی ﷺ کو ہوا تو انہوں نے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سو مجاہدوں کی معیت میں روانہ فرمایا جو مقام فردہ پہ پہنچے تو ایک پہاڑی چشمہ کے قریب مذکورہ قافلہ انہیں مل گیا۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے چھاپہ مارا۔ تمام سامان قبضہ میں کر لیا۔ قافلہ کے لوگ بھاگ گئے۔ پہلی بار مسلمانوں کو اتنا بھاری مالِ غنیمت حاصل ہوا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے خمس حصہ نکالنے کے بعد بقیہ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی مجاہدین میں تقسیم فرما دیا۔ نعیم بن مسعود بعد میں مسلمان ہو گئے۔ ”بحوالہ اصابہ“

اس چھاپہ کے دوران فرات بھی گرفتار کر لئے گئے مگر انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور رہا کر دیئے گئے۔

سعی و تدبیر اور انجامِ کار

سوال یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں مستحکم قیام کے بعد رسول اللہ ﷺ کو حاصل ہونے والی فتوحات مطمئن ہو کر بٹھا دینے کے لئے کافی نہ تھیں کیا؟ قبائل کے ساتھ معاہدوں' قریش سے حاصل ہونے والے بہت زیادہ مالِ غنیمت کے پس منظر میں رسول اللہ ﷺ کا یہ سوچنا کہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ اور رسول ﷺ کو جس قدر کامرانی اور بلند ترین مقام حاصل ہونا تھا وہ ہو گیا۔ اب آئندہ دینِ اسلام کی ترویج و تبلیغ اللہ تعالیٰ خود فرما لیں گے؟ نہیں ہر گز نہیں۔ ایسے تصورات نبی کریم ﷺ کی عزیمت و عظمت سے بہت نیچے کی سطح کے ہیں۔ بلاشبہ ہر چیز کا دارومدار اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہے۔ وہ ہر چیز پر قادرِ مطلق ہے لیکن اسی کا یہ فرمان۔

ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (62-123) رسول اللہ ﷺ کی نگاہوں میں' دل میں' خیالوں میں' اور تصور میں موجود تھا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون جو کبھی تبدیل نہیں ہوتا یہ ہے کہ ہر کام کے لئے سعی و تدبیر ضروری ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسانی طبائع میں بعض خصوصیات بھی ودیعت فرما رکھی ہیں۔ ان سے بھی انکار ناممکن ہے کہ طبیعت کے اوصاف پر انسان کی کامیابی کا

کافی حد تک دارومدار ہے۔

پھر وہی کفار کا قصہ ختم

مدتوں سے کفارِ مکہ (قریش) کا وقار' برتری اور رعب پورے ملک عرب میں مانا جاتا تھا۔ ان کیلئے اب یہ ناممکن تھا کہ وہ آئے دن رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل ہوں اور اپنی کھوئی ہوئی شان و شوکت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش چھوڑ دیں اور انتقام کی ممکنہ تدبیروں کو ترتیب نہ دیں۔ صفوان بن امیہ کے قافلہ کا لٹ جانا تو ان کے لئے سنگین سانحہ تھا جس نے ان کو اور برافروختہ کر دیا۔ طے ہوا کہ جس طرح ہو سکے اپنے دشمن سے انتقام لیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ بھی ان کے ان ارادوں سے غافل نہ تھے۔

ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے ساتھ تعلقات کو زیادہ سے زیادہ فروغ اور استحکام دینے کے لئے ضروری سمجھا کہ رشتہ داری قائم کی جائے۔ اگرچہ دین اسلام (کلمۂ طیبہ) نے آپ کے جانثاروں میں پہلے سے مضبوط تر تعلق قائم کر رکھا تھا۔ مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ سیسہ پلائی دیوار کی طرح مربوط تھے۔ تاہم دین کی ترویج کے لئے رسول اللہ ﷺ نے نئی طرح ڈالی تاکہ یہ قوتیں اور بھی توانا ہو جائیں۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ روابط میں اور استحکام پیدا کرنے کے لئے مندرجہ ذیل کوششوں میں کامیابی حاصل فرمائی۔

(1) حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا کو اپنے شرفِ مناکحت سے سرفراز فرمایا۔ آپ رضی اللہ عنہا (حفصہ) حضرت خنیس کے عقد میں تھیں۔ جو سب سے پہلے اسلام لانے والوں میں سے تھے مگر سات مہینہ پہلے اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے تھے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی کو شرفِ نکاح بخشنے سے پہلے اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صاحبزادی ام المومنین عائشہ الصدیقہ کو بھی شرف مناکحت بخشا تھا۔ چنانچہ جس طرح رسولِ رحمت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرما کر ان کے والدِ بزرگوار سے اپنے روابط کے استحکام کو مزید قوت دی' اسی طرح اپنے چچا زاد بھائی علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو دوسرے تمام مسلمانوں سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کو پیارے تھے اپنی نورِ نظر سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ عقد کی عزت بخشی اور انہیں اپنے زیادہ سے زیادہ قریب لے آئے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سسرال

اسی طرح اپنے رفقاء میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے اور قریب تر لانے کے لئے اپنی صاحبزادی ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا عقد ان سے فرما دیا۔ اس سے پہلے جناب عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عقد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورِ نظر بی بی رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا تھیں۔ جن کا حال ہی میں انتقال ہو چکا تھا۔

مختصر یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرابت داری کی گرہوں کو اور مضبوط کرنے کے لئے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے قریب تر کر لیا۔ جو ایمان و عزیمت اور اصابتِ رائے (خلوص اور پختہ رائے) میں دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ بہتر تھے اور اگر تحمل ممکن ہو تو یہ کہنے میں کوئی خوف نہیں کہ یہ چاروں ہی قوت و دبدبہ میں دوسروں پر غالب و فائق تھے۔

جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کو غزوات میں شریک ہونے کی بناء پر انہیں اموالِ غنیمت سے مستفیض فرمایا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چاروں دوستوں میں سے ہر ایک کے ساتھ قرابت داری کے رشتے و روابط قائم فرما کر مسلمانوں کی قوت اور جمعیت کے لئے ان کو بے پناہ کمک مہیا فرمائی۔ اور جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر ان روابط کے بڑھانے میں مصروفِ عمل تھی۔ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہوں میں کفارِ مکہ (قریش) کے مذموم ارادے بھی اچھی طرح واضح تھے۔ جو ایک طرف تو مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے تلملا رہے تھے۔ دوسری طرف شام کی تجارتی راہ کی ناکہ بندی ختم کرنے کی کوششوں میں مصروف تھے تاکہ مکہ کی دینی عظمت (بت پرستی) اور تجارتی شان و شوکت دونوں اسی طرح قائم ہوں جس طرح قدیم زمانے سے چلی آ رہی تھی۔

غزوۂ اُحد

غزوہ اُحد

زبردست انتقامی مہم

کفارِ مکہ کے دلوں سے غزوۂ سویق کا غم تو نکل گیا لیکن بدر کا زخم کسی صورت مندمل نہ ہو سکا' اس سے بھی زیادہ گہرا زخم انہیں زید بن حارثہ نے لگایا۔ جس کی وجہ سے ان کی وہ تجارتی راہ بھی بند ہو گئی جو انہوں نے بحیرہ احمر کے ساحلی کنارے کو چھوڑ کر عراق کی شاہراہ پر گامزن ہو کر اختیار کی تھی۔ اس کے بعد تو قریشِ مکہ حادثۂ بدر اور نئے تجارتی راستے کی ناکہ بندی سے مشتعل ہو کر رہ گئے۔

بدر کا صدمہ وہ بھول بھی کیسے سکتے تھے جبکہ اس میں ان کے بڑے بڑے بہادر اور بڑے بڑے سردار و سرغنہ تہ تیغ کر دیئے گئے جن کی یاد میں قریش کی عورتیں صبح و شام نوحہ و ماتم کر رہی تھیں۔ کوئی اپنے لختِ جگر کے لئے سینہ پیٹتی تو کوئی اپنے سگے بھائی کے لئے سر کے بال نوچتی۔ کسی کا دل باپ کا سایہ اٹھ جانے کی وجہ سے گھائل تھا تو کسی کا سرتاج غائب' کسی کا کوئی اور قرابت دار نیست و نابود ہو گیا تھا۔ جس پر رونا اور سینہ کوبی کرنا ان عورتوں کا مقدر بن چکا تھا۔ ہر ایک اپنے نصیب کو بھگت رہی تھی۔ ان کا نوحہ ایسا پرسوز اور پردرد ہوتا تھا جسے کفار مکہ سنتے اور مسلمانوں سے انتقام لینے کے لئے حواس باختہ انسانوں کی طرح ایک دوسرے کا منہ تکنے لگتے۔

ابتدائی مراحل

ادھر مکہ میں ابوسفیان کا وہ قافلہ شام سے لوٹ کر آ پہنچا جو غزوۂ بدر کا محرک تھا۔ ادھر معرکۂ بدر کے بقیۃ السیف' (تلواروں سے بچے ہوئے) مغرور کفار شہر میں داخل ہوئے تو شہر کے بڑے بڑے پانچ لوگوں نے طے کیا۔ جن میں جبیر بن مطعم' صفوان بن امیہ' عکرمہ بن ابوجہل' حارث بن ہشام' حویطب بن عبدالعزیز تھے' سب کا متفقہ فیصلہ یہ تھا کہ اس رقم کا سامان جنگ

خریدا جائے اور محمد (ﷺ) سے انتقام لیا جائے۔ فوجی قوت بڑھائی جائے اور تمام عرب قبائل کو مسلمانوں اور خاص کر محمد (ﷺ) کے خلاف بھڑکایا جائے۔ اس لئے کفار کی ایک ٹولی کا سردار ابوعزہ شاعر کو چنا گیا۔ (یہ وہی شخص ہے جو غزوۂ بدر میں قید ہوا اور رسول اللہ ﷺ کو اپنی چھ بیٹیوں کی دیکھ بھال کا بہانہ بنا کر رہائی پائی) اب یہ اپنے اسی محسن کے خلاف گاؤں گاؤں، محلّہ محلّہ جا کر لوگوں کو جنگ میں شامل ہونے کے لئے مشتعل کرے گا۔ اس ٹولی کے ہمراہ مذکورہ لوگوں نے اپنے اپنے غلام اس کی مدد کے لئے روانہ کئے۔

عورتوں کی پیشکش

جوشِ انتقام میں پریشان دماغ عورتیں بھی شامل ہو گئیں، ساتھ جانے کے لئے اصرار کرنے لگیں۔ ایک شخص نے مجلسِ مشاورت میں یہ بات کہی کہ ہم لوگ کفن سر پر باندھ کر جا رہے ہیں۔ اگر اپنے مقتولین کا بدلہ نہ لے سکے تو واپس نہیں لوٹیں گے۔ عورتوں کا ساتھ ہونا ہمارے لئے مفید ثابت ہو گا۔ یہ ہمارے جذبات کو بھڑکائیں گی۔ دوسرے نے کہا یہ ہماری آبرو ہیں۔ اگر ہمیں شکست ہوئی تو ہماری آبرو خاک میں مل جائے گی۔ اس موقعہ پر ہندہ ابوسفیان کی بیوی بھی موجود تھی۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا۔

"حاضرینِ مجلس------ یہ تصور بھی نہ کریں کہ آپ بچ کر واپس نہیں آئیں گے۔ آخر معرکہ بدر سے بھی تو آپ لوگ زندہ بچ کر نکل آئے، اپنی عورتوں کو آ کر دیکھ لیا۔ آپ لوگوں نے جنگِ بدر میں جس غلطی کا ارتکاب کیا تھا اسے پھر نہ کیجئے۔ آپ لوگوں نے جحفہ سے نوجوان لڑکیوں کو واپس کر دیا تھا۔ اگر وہ معرکہ میں موجود ہوتیں تو تم لوگوں کو جوش دلاتیں، غیرت دلاتیں، گرماتیں، آگے بڑھاتیں آہ وہ بدر جس میں ہمارے سب سے پیارے بہادر مرد مارے گئے"۔

خروج

مکہ کے باہر ایک جرار لشکر جمع ہوا۔ جس کے ساتھ وہ عورتیں بھی تھیں جن کے عزیز و اقارب بدر میں مارے گئے تھے۔ اس لشکر میں طائف کے رہنے والے بنوثقیف کے دو سو شمشیر زن شامل تھے مکہ کے مقامی لوگوں میں سے اٹھائیس سو شمشیر زن شامل ہوئے۔ علاوہ اس کے قریش کے اشراف و سادات کے ساتھ قبائل کے حلیف بھی تھے۔ حبشیوں کا بھی ایک دستہ بے شمار رسد و آلاتِ حرب کے ساتھ شامل تھا۔ تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

(الف) تین علم تھے۔ جن میں سب سے بڑا جھنڈا طلحہ بن ابو طلحہ کے ہاتھ میں تھا۔ یہ علم دارالندوہ میں بیٹھ کر بنائے گئے تھے۔

(ب) گھوڑے دو سو۔

(ج) تین ہزار اونٹ۔

(د) سات سو زرہیں۔

(ہ) اسلحہ حساب و شمار سے فزوں تر اور لشکر مدینہ کی طرف نکلا۔

عباس رضی اللہ عنہ کی خبر رسانی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابھی تک اپنے آبائی دین پر قائم تھے۔ ابھی تک مکہ میں ہی مقیم تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قریشی جتنی سازشیں سوچتے ان کا تجزیہ کرتے جس کی دو وجہیں تھیں۔

(1) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قرابت داری۔ (2) اپنے بھائی کے صاحبزادہ کا اخلاقِ حسنہ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اس حسنِ سلوک کی یادیں بھی شامل تھیں جو ان کے ساتھ بدر کے قیدیوں کی حیثیت میں کیا گیا تھا۔

عباس رضی اللہ عنہ اپنی محبت کا ثبوت اس سے پہلے اس رات بھی دے چکے تھے جب ہجرت سے پہلے شب کی تاریکی میں ہونے والی بیعت (جو عقبۃ الکبریٰ کے نام سے ملقب ہے) میں ساتھ دیا تھا۔ اس رات حقیقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا اپنے گھر سے عقبہ جانے کے لئے نکلے تھے لیکن حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنے عم زادہ کی حفاظت کے لئے دبے پاؤں ان کے پیچھے پیچھے ہو لئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقامِ عقبہ پہنچ گئے اور اوس و خزرج کے بیعت کرنے والوں سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

"آپ لوگ میرے برادر زادہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں مگر خیال رہے ان کی حفاظت اگر اپنے بال بچوں کی طرح کر سکتے ہو تو بہتر ورنہ انہیں یہیں چھوڑ جایئے۔ ان کے اپنے قبیلہ بنو ہاشم نے جس طرح آج تک ان کی حفاظت کی ہے آئندہ بھی اسی طرح جان ہتھیلی پر رکھ کر کی جائے گی۔"

آج حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنی قرابت داری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حسن اخلاق و کردار اور اسیر بدر ہونے کے درمیان کی گئی مراعات کی وجہ سے ایک خط میں قریش کے تازہ جنون، ان کے لشکر کی تعداد اور سامانِ جنگ کی پوری تفصیل قلمبند کر کے ایک غفاری ہرکارہ کے ہاتھ مدینہ بھیجی جو مکہ سے چل کر تیسرے روز مدینہ منورہ پہنچا۔

مقامِ ابوا

کفارِ مکہ کا لشکر ابوا کے مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ کا مزار ہے۔

جوش انتقام میں بھرے ہوئے چند کوتاہ اندیش نوجوان جناب آمنہ رضی اللہ عنہا کے مزار کی بے حرمتی کرنے پر آمادہ ہو گئے تو انہیں ان کے بڑوں نے یہ کہہ کر روک دیا کہ اگر تم نے ایسا کیا تو پورے عرب میں ایک وبا پھیل جائے گی۔ ابوبکر اور بنو خزاعہ ہمارے باپ دادا کے مردوں کی قبریں کھود کر رکھ دیں گے۔ اس بناء پر وہ نوجوان باز آ گئے۔

جبلِ احد

کفار یہاں سے کوچ کرنے کے بعد وادیٔ عقیق میں آ پہنچے اور احد پہاڑی کے دامن میں ایک ہموار میدان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ یہ مقام مدینہ منورہ سے 5 میل کے فاصلہ پر ہے۔

حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط کی آمد

ادھر سیدنا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بھیجا ہوا غفاری ہرکارہ مدینہ میں پہنچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس وقت مسجدِ قبا کے دروازہ پر اپنے گھوڑے پہ سوار ہونے والے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ خط کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پڑھوا کر سنا اور ان کو رازداری کی تاکید فرما کر خود مدینہ میں سعد بن ربیع رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ انہیں خط کے مضمون سے آگاہ فرمایا۔ ان سے بھی رازداری کی تلقین فرمائی لیکن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہلیہ نے بالا خانہ پہ بیٹھے ہوئے سن لیا اور ضبط نہ کر سکیں۔

اقدام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جناب انس اور مونس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فضالہ کے بیٹوں کو جاسوسی کے لئے بھیجا۔ ان کی واپسی کے بعد حباب رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن منذر بن الجموع کو سراغ رسانی پہ مامور فرمایا۔ پہلے دونوں بھائیوں نے کفارِ مکہ کے گھوڑوں اور اونٹوں کو مدینہ کے کھیتوں میں چرتے دیکھا۔ واپس آ کر اطلاع دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خط کی اب تصدیق ہو گئی۔

اس کے بعد دشمن کا جائزہ لینے کے لئے حضرت سلمہ بن سلامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نکلے اور کفار کے ایک دستہ کو شہر کے اس قدر قریب دیکھا جیسے وہ جلد ہی شہر میں داخل ہونے کو ہیں۔ سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھاگے ہوئے آئے اور پوری صورتحال سے سب کو آگاہ کیا۔ ان خبروں سے اوس و خزرج کے مسلمان اور دوسرے لوگ بہت متاثر ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب کی تاریخ میں آج تک جنگ کے لئے ایسی زبردست تیاری سننے اور دیکھنے میں کبھی نہیں آئی تھی۔ کفار اپنی پوری قوت اور لشکر جرار لے کر حملہ آور ہونے کو آئے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لئے بے شمار مسلح مسلمان رضی اللہ تعالیٰ عنہم مسجدِ نبوی میں رات بھر پہرہ دیتے رہے اور ایک دستہ رات بھر شہر کی حفاظت کرتا رہا۔

مشورہ

رسول اللہ ﷺ نے صبح ہوتے ہی صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے ساتھ ان لوگوں میں سے صائب الرائے کہلانے والوں کو طلب فرمایا جو خود کو مسلمان ظاہر کرتے مگر قرآنِ حکیم ان کو ان کے اعمال و اقوال کی روشنی میں منافق کہتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارادہ یہ تھا کہ دشمن سے مدافعت کے لئے متفقہ طور پر کوئی لائحہ عمل طے کرلیا جائے مگر سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔

(1) مہاجرینِ قریش شہر سے باہر نگرانی کریں۔

(2) اہلِ مدینہ شہر میں قلعہ بند ہو کر موقع کا انتظار کریں۔ دشمن حملہ کرے تو بھرپور مدافعت کریں۔

مشہور منافقین کا سردار

عبداللہ بن ابی بن ابی سلول نے مشورہ دیا۔ یا رسول اللہ ﷺ مدینہ والوں نے ہمیشہ اپنی حفاظت اس طرح کی ہے کہ۔

(الف) عورتوں اور بچوں کو کسی محفوظ قلعہ میں بند کرکے ان کے چاروں طرف پتھروں کے ٹکڑے جمع کر دیئے۔

(ب) شہر کے باہر فصیل کھڑی کر کے نگرانی کے لئے تھوڑے تھوڑے فاصلہ پہ چوکیاں تعمیر کر دیں۔

(ج) اگر دشمن حملہ کر دیتا تو ادھر عورتیں پتھر برساتیں اور ادھر مرد تلواریں سونت کر دشمنوں پر ٹوٹ پڑتے۔

یا رسول اللہ ﷺ مدینہ کی مثال اس زنِ باکرہ سی ہے جس کی بکارت کبھی زائل نہ ہوئی ہو' آج تک کسی دشمن نے ہم پر فتح حاصل نہیں کی' ہم لوگ جب بھی شہر میں رہ کر دشمن کے مقابلہ میں آئے کبھی ناکام نہیں ہوئے! یا رسول اللہ ﷺ دشمنوں کو اپنے حال پر چھوڑ کر میری تجاویز پر عمل کیجئے۔ مدینہ کی حفاظت کے یہ طریقے مجھے اپنے باپ دادا سے وراثت میں ملے ہیں اور میرے اسی زمانہ کے عقلمندوں نے بھی مجھے یہی گر بتائے ہیں۔

(3) مہاجرین اور انصار بھی رسول اللہ ﷺ کی اس رائے سے متفق تھے کہ شہر میں بند رہ کر دشمن کی مدافعت کی جائے۔

(4) جو گروہ کھلے میدان میں دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے حق میں تھا اس میں دو قسم کے لوگ تھے۔

(الف) وہ نوجوان جو بدر میں شرکت سے محروم رہ گئے تھے اور اب موقع دیکھ کر شہادت حاصل کرنے کے خواہاں تھے۔

(ب) وہ شیر فطرت بہادر جنہیں بدر میں بھی شرکت کا موقعہ مل چکا تھا اور معرکہ کار زار میں اللہ تعالیٰ کی بروقت نصرت کو آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ ایمان اور توانا ہو چکا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ دنیا کی کوئی باطل طاقت ان پر غالب نہیں آ سکتی' یہ حضرات شہر میں بند ہونے کو بزدلی پر محمول کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے دشمن کو ہماری بزدلی کا یقین زیادہ ہو جائے گا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ غزوۂ بدر میں شہر سے دور رہ کر اللہ نے ہم کو فتح دی اور آج تو ہم شہر سے قریب تر ہیں۔ احد ہمارے شہر کا دہانہ (منہ) ہی تو ہے۔ اس کے نشیب و فراز ہمارے دیکھے بھالے ہیں۔ اس گروہ کے ایک نوجوان نے کہا۔

مجھے یہ گوارا نہیں کہ کفار یہاں سے واپس جا کر کہیں کہ محمد ﷺ ہم سے ڈر کر مدینہ شہر اور اس کے قلعوں میں بند ہو گئے۔ شہر میں ہمارے بند ہو جانے سے دشمن کی جرات اور بھی زیادہ ہو جائے گی۔ "دوستو........ جن دشمنوں نے ہمارے کھیت' پھل اور پودے تاراج کر دیئے ہیں۔ اگر ہم نے انہیں اپنے باغات کی بربادی سے نہ روکا تو ان درختوں کا پھل ہمیں کیسے نصیب ہو گا"۔

"ہمارا دشمن غزوۂ بدر کی شکست کے بعد ایک سال تک دوڑ بھاگ میں لگا رہا۔ تب جا کر مٹھی بھر عرب اور ان کے حبشی غلاموں کو اپنے ہمراہ لانے میں کامیاب ہوا ہے۔ کفار کی یہ جرات نظرانداز نہیں کی جا سکتی کہ وہ اپنے گھوڑے اور اونٹ ہمارے شہر کی حدود میں لے آئے ہیں"۔

آپ لوگوں کو یہ پسند ہے کہ وہ ہمیں شہر اور قلعوں میں بند کر کے اور خود بغیر زخم کھائے لوٹ جائیں اور یہ بات مشہور کر دیں کہ ہم نے مسلمانوں کو قلعوں میں بند کر دیا ہے۔ اللہ نہ کرے ایسا ہوا تو ہمارے دشمنوں کے حوصلے بہت بڑھ جائیں گے۔ اور وہ آئے دن اسی طرح ہمارے سرسبز و شاداب باغ اور کھیت برباد کرتے رہیں گے۔ کبھی کسی طرف سے ہمیں اپنے نرغہ میں لینے کی کوشش کرتے رہیں گے اور کبھی کسی طرف سے ہمیں گھیرے میں لے لیا کریں گے۔ ان کے جاسوس ہر وقت ہماری خبریں ان تک پہنچایا کریں گے اور ہمارا شہر ان کی گھات سے کبھی بھی محفوظ نہیں رہا کرے گا۔ حتیٰ کہ ایک نہ ایک دن کفار ہم پر غالب آ جائیں گے" اس تقریر نے مجاہدین کے ولولوں کو نئی زندگی دی۔ شوقِ شہادت کو اور توانائی بخش دی۔ ہر شخص کی

زبان پہ نعرہ تھرایا۔ "ہم میدان میں دشمن سے لڑیں گے"۔

جو لوگ محمد رسول اللہ ﷺ کے اردگرد جمع تھے جن کے دل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت سے سرشار تھے۔ انہیں اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن حکیم اور رسول اللہ ﷺ اور آخرت کے حساب کتاب پر پورا پورا یقین تھا۔ انہیں دشمن کی ناکامی کا پورا پورا یقین تھا۔ انہیں اپنے اللہ تعالیٰ پر پورا پورا بھروسہ تھا کہ ان کی تلواریں دشمن کی تکہ بوٹی اڑا دیں گی۔ اور اگر ان میں سے دس پانچ بچ بھی گئے تو ہماری ہیبت سے ادھر ادھر بکھر جائیں گے اور ہم میں سے جو مجاہد شہید ہو گا وہ سیدھا جنت میں جائے گا۔ جس کا وعدہ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

ان الذین قالوا ربنا اللّٰہ ثم استقاموا تتنزل علیھم الملئکتہ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون نحن اولیائکم فی الحیوۃ الدنیا وفی الاخرۃ ولکم ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا تدعون۔ (41-30-31)

"جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اس پر قائم رہے۔ ان پر فرشتے اتریں گے اور کہیں گے کہ نہ خوف کرو اور نہ غمناک ہو اور بہشت جس کا تم سے وعدہ کیا ہے۔ (اس میں) خوشی مناؤ۔ ہم دنیا کی زندگی میں بھی تمہارے دوست تھے اور آخرت میں بھی تمہارے رفیق ہیں۔ اور وہاں جس نعمت کو تم چاہو گے تم کو ملے گی اور جو چیز طلب کرو گے وہاں موجود ہو گی"۔

ان نوجوانوں کے دلوں میں یہ یقین ان کے شوقِ شہادت کو اور گرما رہا تھا کہ شہادت پانے کے بعد وہ اپنے بچھڑے ہوئے بھائیوں سے ملیں گے۔ وہ عزیز وہ دوست جو غزوۂ بدر میں شہید ہوئے ان سے جنت میں ملاقات ہو گی۔ ایسی جنت جس کی تعریف یہ ہے کہ:۔

لا یسمعون فیھا لغواً ولا تاثیما" الا قیلاً سلاما" سلاماً۔ (25:56)

وہاں نہ بے ہودہ بات سنیں گے نہ گالی گلوچ۔ ہاں ان کا کلام السلام السلام ہو گا۔

اس کے بعد ایک بزرگ خیثمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

عسی اللّٰہ ان یظفر نابھم اوتکون الاخری الشہادۃ لقد اخطائتنی وقفتہ بدر وکنت علیھا حریصاً" حتی بلغ من حرصی علیھا ان ساھمت ابنی فی الخروج فخرج سھمہ فارزق الشہادۃ وقد رائیت ابنی البا حۃ فی النوم وھو یقول الحق بنا ترا فقنا فی الجنہ فقد وجدت ما وعدنی ربی حقا وقنو اللّٰہ یا رسول اللّٰہ اصبحت مشتاقا" الی مرافقتہ فی الجنہ وقد کبرت سنی ورق عظمی واحییت لقاء ربی!

اول تو ہمیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کامیاب فرمائیں گے یا شہادت نصیب فرمائیں گے

جس شہادت سے غزوۂ بدر میں محروم رہ گیا۔ میں غزوۂ بدر میں الگ رہنے پر راضی نہ تھا۔ مگر بیٹا سعد بھی اس شہادت کے لئے مصر تھا۔ آخر دونوں نے قرعہ اندازی کی۔ مگر میرے بیٹے کی قسمت بیدار ہو گئی۔ وہ اس معرکہ میں شہید ہو گیا۔ اسی رات میرے خواب میں اس نے کہا۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سے جو وعدے کئے تھے وہ سب سچے ہو گئے۔ آپ بھی ہمارے ساتھ آکر رہئے یا رسول اللہ ﷺ اللہ کی قسم میں تو اسی لمحے سے اپنے بیٹے کے ساتھ رہنے کے لئے تڑپ رہا ہوں۔ یوں بھی بوڑھا ہو گیا ہوں "میری ہڈیوں میں دم نہیں رہا۔ اب میں اپنے رب سے ملاقات کرنے کو زیادہ پسند کرتا ہوں"۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے مقابلہ کرنے والوں کی اکثریت دیکھ کر اس سے اتفاق کر لیا اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نظامِ زندگی کو مربوط رکھنے کے لئے مجلسِ شوریٰ کی رائے کو ترجیح دینا پسند فرماتے۔ الا یہ کہ وحی نازل ہو کر کسی حکم کی تعمیل کو لازم قرار دے دے۔

جمعۃ المبارک کا دن

اس دن جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ صلوٰۃِ جمعہ ادا کرنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے خطاب فرمایا۔

مسلمانو! اگر تم نے صبرو استقامت کا ثبوت دیا تو فتح تمہاری ہو گی۔ جہاد کے لئے تیاریاں مکمل کر لو۔ صلوٰۃِ عصر کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کو اپنے ساتھ لے کر بیت النبوت علیہ اسلام میں داخل ہوئے۔ شیخین (صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ) نے آپ ﷺ کو عمامہ باندھنے میں تعاون فرمایا۔ زرہ پہنوائی' تلوار حمائل کی مگر جب تک رسول اللہ ﷺ بیت النبوت میں تشریف فرما رہے' تب تک صحابہ کرام میں "قلعہ بندی یا میدان میں مقابلہ" دونوں آراء مزید زیر بحث رہیں۔

اسید بن حضیر اور سعد بن معاذ نے جو قلعہ بندی کے حامی تھے اپنی دلیل دیتے ہوئے کہا۔ آپ لوگوں کو معلوم ہے۔ کہ نبی اکرم ﷺ قلعہ بندی چاہتے ہیں اور آپ لوگ میدان میں نکلنے پہ مصر ہیں۔ اب بھی وقت ہے رسول اللہ ﷺ کی خوشی ملحوظِ خاطر رکھی جائے۔ آپ ﷺ جو حکم فرمائیں اس کی اطاعت کریں۔

قلعہ بندی کا مخالف گروہ اس لئے پریشان تھا کہیں آپ ﷺ کی نافرمانی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیاتِ ناراضگی نازل نہ ہو جائیں۔ جوں ہی نبی اکرم ﷺ زرہ پہن کر تشریف لائے تو سب نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔

یا رسول اللہ ﷺ ہمارا مقصد مخالفت نہیں تھا۔ آپ ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل میں ہماری دنیا کی بھلائی ہے۔ اگر قلعہ بند ہو کر مداخلت کرنا ہے تو بھی اگر میدان میں حکم جہاد ہے تو بھی آپ ﷺ کا ہر حکم ہمارے لئے واجب العمل ہے۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جب میں نے مشورہ دیا تھا تو آپ ﷺ لوگوں نے کہا کہ قلعہ بند ہونے سے میدان میں اترنا بہتر ہے۔ اب کسی نبی کی شان کے خلاف ہے کہ وہ زرہ پہن کر اسے اتارے۔ تم میرے حکم پر عمل کرو' اگر تم نے صبر کیا استقامت سے کام لیا۔ تو تمہاری فتح ہو گی۔

اس طرح آنحضرت ﷺ نے اس شوریٰ کی بنیاد رکھی جس پر نظام کی تعمیر کا انحصار ہے۔ کہ جس مسئلہ کو بحث و تمحیص کے بعد طے کر لیا جائے اسے کسی رائے کے خلاف ہونے کی بناء پر مسترد نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہی بہتر ہوتا ہے کہ طے شدہ مشورہ کے مطابق عمل کیا جائے۔ اس معاملہ کو جلد کر لینا چاہئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے نتیجہ کا انتظار کرنا چاہئے۔

انکار

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر مجاہدینِ اسلام انصار اور مہاجرین احد کی طرف چل پڑے۔ شیخین کے مقام پر دیکھا کہ وہاں ایک دستہ پڑاؤ ڈالے بیٹھا ہے۔ نبی رحمت ﷺ نے پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ لوگ مشہور منافق عبداللہ ابن ابی اور یہود کے حلیف ہیں جو مسلمانوں کی نصرت کے لئے نکلے ہیں تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔

لا یستنصر باھل الشرک علیٰ اھل الشرک مالم یسلموا

اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ ایک طرف تو مشرکوں سے صرف ان کے شرک کی وجہ سے جنگ کرے اور دوسری طرف وہ ویسے ہی مشرکوں کی امداد لے البتہ اگر یہ لوگ سچے دل سے مسلمان ہو جائیں تو مرحبا۔

یہ سن کر یہودیوں کا دستہ دم دبا کر مدینہ بھاگ گیا۔ راستے میں ان کو عبداللہ بن ابی کا دستہ ملا تو انہوں نے گلہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے تو اپنے باپ دادا کی تجربہ شدہ رائے رسول اللہ ﷺ کو دی تھی پہلے وہ مانے بھی پھر وہ اپنے ناتجربہ کار نوجوانوں کے کہنے پر میدان میں جا پہنچے۔

ابن ابی نے جواب میں کہا' آپ نے درست کہا۔ اب میں بھی جا کر کیا کروں گا۔ یہ کہہ کر اپنے منافقوں کے ساتھ واپس ہو گیا۔

صفیں آراستہ ہو رہی ہیں

خالص اور سچے مسلمان مجاہدین نبی اکرم ﷺ کی کمان میں جبلِ اُحد پہنچ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے اس طرح صف آراستہ فرمائی کہ پہاڑ کی پشت اس طرف رہے جس طرف درہ ہے تا کہ کہیں دشمن پیچھے سے حملہ نہ کر دے۔ اس درہ پہ پچاس تیر اندازوں کو کھڑا کیا اور ان کو خصوصی ہدایات دیتے ہوئے فرمایا۔

"ہو سکتا ہے دشمن آپ کے عقب سے حملہ آور ہو۔ لہٰذا ان کی مدافعت کرتے ہوئے تم لوگوں کے قدم ہٹنے نہ پائیں اور خیال رہے اگر ہم دشمن پر غالب بھی آ جائیں۔ کفار کے قدم اکھڑ بھی جائیں وہ بھاگنے بھی لگیں تو بھی تم لوگ یہاں سے ہر گز نہ ہٹنا اور اگر اللہ نہ کرے ہم کسی مشکل میں آ جائیں تو بھی تم لوگ یہ جگہ نہ چھوڑنا اور یہیں سے ان کے گھوڑوں پر تیر برساتے رہنا۔ گھوڑے تیروں کے سامنے نہیں جمتے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے صفوں کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا۔ جب تک میں حکم نہ دوں کوئی مجاہد اپنا حربہ استعمال نہ کرے۔"

لشکرِ کفار صف آرا ہو رہا ہے

کفار نے اپنی صفیں اس طرح جمائیں۔

میمنہ (دائیں جانب) پر خالد بن ولید کو مقرر کیا گیا۔ میسرہ (بائیں جانب) پر عکرمہ بن ابو جہل کو کمان دی گئی۔ لشکر کا علم عبدالعزیٰ طلحہ بن ابو طلحہ کو سونپا گیا۔ لیکن کفار کے سب سے بڑے مورچے کی کمان تو عورتوں کے ہاتھ میں دی گئی کسی کے ہاتھ میں دف ہے تو کسی کے ہاتھ میں ڈھول۔ ہر عورت سولہ سنگھار کیے ہوئے اتراتی ہوئی چل رہی ہے۔ کبھی اس قطار کے آگے اور کبھی اس صف کے پیچھے جائزہ لیتی اور اکساتے پھر رہی ہیں۔ ان کی سپہ سالار ابو سفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ ہے۔ کفار کے زنانہ لشکر کا سب سے بڑا اسلحہ رجزیہ اشعار تھے جس کا ایک بند ملاحظہ ہو!

ویھا نبی عبدالدار ویھا حماۃ الا دبار

بنی عبدالدار ذرا ہماری طرف دیکھو ہم نے زہرہ اور مشتری کی کوکھ سے جنم لیا ہے۔

ضرباً بکل تبار ان تقبلوا نعانق

ہم نرم قالینوں پہ ناز و نزاکت سے خراماں خراماں چلنے والیاں ہیں۔

ونفرش النمارق

اگر آج تم لوگوں نے آگے بڑھ کر دشمن کا مقابلہ کیا تو کل ہم تمہیں سینے سے چمٹا لیں گی۔

او تدبروا نفارق فراق غیر وامق

اور اگر تم نے قدم پیچھے ہٹایا تو یاد رکھو ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔

اس طرح لشکر کفار کے بڑے کماندار بدر میں ہلاک ہونے والے ہر ایک سرغنہ کا نام لے لے کر ان کا انتقام لینے کے لئے اپنے سپاہیوں کے لہو گرمائیں۔ لیکن مسلمان مجاہدین کے دلوں میں صرف اور صرف اللہ عزوجل کی محبت تھی اور نبی اکرم ﷺ کی اطاعت کا جذبہ اور نصرت کا یقین تھا۔

رسولِ کائنات ﷺ نے ان لمحات میں یہ خطبہ دیا۔ "مجاہدینِ اسلام اگر تم نے صبرو استقامت سے کام لیا تو فتح تمہارے قدم چومے گی۔ انشاء اللہ" اس کے بعد نبی تاقیامت ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنی میان سے تلوار نکالی اور پھر مجاہدین سے مخاطب ہو کر بلند آواز سے فرمایا۔ مجاہدینِ اسلام تم میں سے کون ہے جو اس تلوار کا حق ادا کر سکے۔ مجاہدین میں سے کئی آگے بڑھے مگر آپ ﷺ نے کسی کی درخواست منظور نہ فرمائی۔

خوش نصیب ابو دجانہ

یہ عزت (ابو دجانہ رضی اللہ عنہ سماک بن خرشہ) کے حصہ میں آئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ اس تلوار کا حق کیا ہے؟ نبی اعلیٰ و عظیم ﷺ نے فرمایا۔ اس کا حق یہ ہے کہ کفر کے ٹکڑے بکھرتی ہوئی ٹیڑھی ہو جائے۔ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ تو گھر سے ہی سر پر سرخ پٹی باندھ کر آئے تھے۔ (وہ سرخ پٹی جس کو عرب والے موت کا تسمہ کہتے ہیں) انہوں نے عرض کیا انشاء اللہ ایسا ہی ہو گا' ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے ایک ہاتھ سے تلوار کو مضبوطی سے تھاما اور دوسرے ہاتھ سے موت کے تسمہ کو مضبوطی سے کس دیا اور فاخرانہ چال سے قدم اٹھاتے دشمن کی طرف بڑھے' سچ تو یہ ہے کہ اتنے مجاہدین میں سے سب کو چھوڑ کر ابو دجانہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ رضی اللہ عنہ کی تلوار کا ملنا فخر کے جذبہ کو ابھارے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ پھر بھی رسول اللہ عدل علامتِ و احسان ﷺ نے فرمایا۔ "اس موقع کے سوا یہ فاخرانہ چال اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔"

کفار کا پہلا حملہ

قبیلہ اوس کا ایک فرد جس کا نام ابو عامر (عبد عمرو بن صفی الاوسی) تھا۔ مدینہ منورہ کا ہی رہنے والا تھا۔ اسلام دشمنی میں خود مکہ پہنچا اور کفارِ مکہ سے کہا آؤ سب مل کر دین اسلام کے مینارِ نور کو مسمار کر دیں۔ وہ بدر کے معرکہ میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اس کی کمان میں اس وقت اس کے اپنے قبیلہ کے پندرہ شمشیر زنی کے ماہر تھے اور اہلِ مکّہ کے چند غلام بھی۔ ابو عامر نے دل میں یہ ٹھان رکھی تھی کہ جیسے ہی وہ میدان جنگ میں اترے گا تو قبیلہ اوس کو آواز دے گا تو قبیلہ کے تمام لوگ معلمِ کتاب و حکمت محسنِ انسانیت محمد ﷺ کو چھوڑ کر اس کے ساتھ

ٹل جائیں گے۔ اسی غم میں ابو عامر نے میدانِ جنگ میں اترتے ہی قبیلہ اوس کو بآوازِ بلند پکار کر کہا۔

قبیلہ اوس کے بہادرو------ میں تمہارا بھائی ابو عامر ہوں-----

جواب میں فضا میں تمام اوسی مجاہدین کی آواز گونجی۔ او بدکردار ہم خوب جانتے ہیں۔ اللہ عزو جل تیری مدد نہیں کرے گا۔ عکرمہ بن ابو جہل جو لشکرِ کفار کے بائیں جانب کمان کر رہا تھا اپنے غلاموں کا دستہ لے کر مجاہدین کے ہراول دستے (مقدمتہ الجیش) پر حملہ آور ہوا اور چند لمحوں میں ہی فدایانِ توحید نے پتھر مار مار کر اس کو بھگا دیا۔ عکرمہ کے ساتھ ابو عامر بھی الٹے پاؤں بھاگا۔

سید الشہدا اور امیر حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ببر شیر کی طرح غراتے ہوئے میدانِ جنگ میں اس انداز سے نکلے جیسے کہہ رہے ہوں کہ کون ہے جسے شوقِ تیغ آزمائی ہے میرے سامنے آئے پہلے ہی حملہ میں جدھر لپکے جدھر گئے ادھر ہی کفار کے لاشے اس طرح گرنے لگے جیسے خزاں میں درختوں سے سوکھے پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گرتے ہیں۔

ادھر طلحہ بن ابو طلحہ نے بڑا بول بولا تو علی ابن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آگے بڑھ کر وار کیا' دو ایک بار تیغ آزمائی ہوئی آخر میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک ضرب کاری نے اس کی کھوپڑی میں شگاف ڈال دیا۔ جس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نعرہ لگایا۔ اللہ اکبر! کفار نے فضا میں خوف و ہراس محسوس کیا مجاہدین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس آواز کے ساتھ اپنی آوازیں ملا کر نعرہ بلند کیا! اللہ اکبر۔

ابو دجانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اب ابو دجانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطا کی ہوئی تلوار تھی اور سر پر موت کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ جدھر بڑھتے کفار کو جہنم رسید کرتے بڑھتے ہی جاتے۔ ابو دجانہ مشرکین کو قتل کرتے ہوئے ان کی فوج کے بالکل قلب (درمیان) میں پہنچ گئے۔ اتفاق سے اس اثناء میں ان کی نظر اس پر پڑی جو دوسرے انسان کے اعضاء کاٹ رہا ہے۔ ابو دجانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تلوار اٹھائی ہی تھی کہ بے رحم قاتل نے واویلا مچانا شروع کر دیا۔ غور سے دیکھا تو یہ ابو سفیان کی بیوی ہندہ تھیں۔ ابو دجانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس خیال سے لوٹ آئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عطا کی ہوئی تلوار کو عورت پر چلانا زیب نہیں۔

قریش کے تمام سرغنہ تو اصل میں غزوہ بدر میں ختم ہو چکے تھے۔ آج انہوں نے اللہ تعالیٰ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اپنی طرف سے فیصلہ کن جنگ چھیڑی تھی۔ غزوہ بدر کی طرح اس جنگ میں طرفین کی عسکری تعداد اور سامان میں دور کا بھی توازن نہیں تھا۔ اسی طرح دونوں

فریقین کی جنگ کے مقاصد میں بھی مشرق و مغرب سا فرق تھا۔ ایک فریق (کفارِ مکہ) جوشِ انتقام میں لڑ رہا تھا تو دوسرا فریق (مجاہدین اسلام) اپنے ایمان و اعتقاد کے تحفظ کے لئے مدافعت کر رہا تھا۔ انتقام میں پاگل ہونے والوں کی تعداد مجاہدین کے مقابلہ میں بہت زیادہ تھی۔ جن کا مقابلہ مجاہدینِ اسلام کے لئے انتہائی دشوار تھا۔ کفار کے ساتھ حسین ترنازنین سولہ سنگھار کئے ہوئے رزمیہ گیتوں سے ان کے دلوں میں انتقامی آگ کو بھڑکا رہی تھیں۔ یہ وہی خونخوار حسین عورتیں تھیں جن میں سے ہر ایک نے اپنے غلاموں کے ساتھ دلنوازی کے وعدے کر رکھے تھے۔ ان مہ وشوں میں سے کسی کا بھائی غزوۂ بدر میں قتل ہو چکا تھا۔ کسی کا خاوند واصل جہنم ہو چکا تھا۔ کسی کا باپ اس دہکتی ہوئی آگ میں جھونکا جا چکا تھا۔

غزوۂ بدر میں جن مجاہدینِ اسلام کی پتھر شکن تلواروں نے کفار کے بڑے بڑے ناموروں کے قلب و جگر کو چیر کر انہیں موت کے گہرے غار میں دھکیل دیا تھا ان مجاہدین میں سے سب سے افضل ترین مجاہد حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ تھے۔ جن کی تلوار کی ضرب نے مذکورہ نازنینوں کی ملکہ ابوسفیان کی بیوی ہندہ کے باپ عتبہ کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔ اسی کا ایک بھائی اور دوسرے عزیز و اقارب بھی اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ چکے تھے اور انہیں میدانِ بدر ہی کے ایک گڑھے (قلیب) میں اوندھے منہ مٹی کے نیچے دبا دیا گیا تھا۔

حمزہ رضی اللہ عنہ ' اسد اللہ رضی اللہ عنہ ' سیف اللہ رضی اللہ عنہ آج احد میں اپنی ہاشمی شجاعت و ہیبت کے سائے میں کفار کو موت کے پہلو میں دھکیل رہے تھے۔ کفار کا مشہور تیغ زن ارطاۃ بن عبد شرجیل بھی حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں ختم ہوا۔ ساع بن عبدالعزیٰ نے (انفسانی) انہیں کی تلوار سے گلا کٹوایا۔ غرض جس پر بھی حمزہ رضی اللہ عنہ کا سایہ پڑتا اس کی روح اس کے جسم سے ڈر کر نکل جاتی۔

شہادتِ سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ

غزوۂ بدر میں جبیر بن مطعم قرشی کے چچا اور ہندہ ابوسفیان کی بیوی کے باپ حمزہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے۔ جبیر نے اپنے حبشی غلام سے وعدہ کیا کہ اگر تم حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ اسی وحشی کو ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے مزید یہ لالچ دیا کہ اگر تم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا تو میں تم کو سونے اور چاندی میں لاد دوں گی۔ چنانچہ سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ اسی حبشی کے ہاتھ شہید ہوئے۔ جس کی پوری کہانی وحشی نے اسلام قبول کرنے کے بعد اس طرح بیان کی۔ مجھے غزوۂ احد میں کفارِ مکہ کے ساتھ خروج کرنا پڑا' مجھے نیزہ پھینکنے میں اتنی مہارت تھی کہ میرا نشانہ کبھی غلط نہیں بیٹھا

تھا۔

اپنے لالچ میں غزوۂ احد میں جب جنگ شباب پر تھی' میں اپنے شکار کی تلاش میں لگ گیا۔ حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رنگت گندمی تھی۔ میں نے ہجوم معرکہ میں بھی ان کی شناخت کرلی۔ اس وقت وہ کفار مکہ کے قلب یعنی فوجوں کے بالکل درمیان میں پہنچ کر اپنے چاروں طرف حملہ آور ہونے والوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ میں نے اپنا نیزہ تول کر ان کی طرف پھینکا جو ان کی ناف میں سے ہوتا ہوا آرپار ہوگیا۔

حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ میری طرف لپکے ضرور مگر گر پڑے۔ میں نے ان کے ٹھنڈے جسم سے اپنا نیزہ کھینچ لیا اور ان کی موت کا یقین آنے پر اپنے فوجی پڑاؤ میں آکر بیٹھ گیا۔

میری شرکت کا مقصد صرف حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کرنا تھا جس کے بعد مجھ پر کوئی ذمہ داری نہ تھی۔ یہ بھی میں نے اپنی آزادی کے لالچ میں کیا چنانچہ جب ہم مکہ واپس پہنچے تو مجھے آزاد کر دیا گیا۔

قزمان کون تھا؟

قزمان درحقیقت منافق تھا جو غزوۂ احد میں مجاہدین کے ساتھ شامل جہاد ہونے کے بجائے گھر میں دبک کر رہ گیا لیکن اسی دن کی صبح کو عورتوں نے قزمان کو گھر میں دیکھ کر کہا۔ تمہیں شرم نہیں آتی' عورتوں کی طرح گھر بیٹھ گئے ہو اور قوم کے باقی مرد میدانِ جہاد میں نکل کر اپنی جانیں قربان کر رہے ہیں۔ قزمان عورتوں کے طعنے سن کر جوش میں آگیا۔ تیرو ترکش لیا اور اسی وقت گھر سے نکلا۔ میدانِ جہاد میں پہنچا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جہاد میں مصروف تھے۔ قزمان فطرتاً بہادر تھا۔ تیراندازی کا ماہر بھی۔ صفیں چیرتا ہوا مجاہدین کی اگلی صف میں جا پہنچا۔ اب قزمان کے نیزوں کے پھل پیغامِ اجل بن کر کافروں کے سینے میں پیوست ہونے لگے۔ عالم یہ تھا کہ اس کے نیزہ کا پھل جسم سے نکلتا تو جان لے کر نکلتا۔ دوپہر تک اس نے کافروں کی کافی تعداد کو بے جان کر دیا۔ لیکن تیسرے پہر یک وقت دشمنوں کے سات آدمیوں کو فنا کی گود میں سلانے کے بعد اسنے خودکشی کرلی۔ جب وہ مرتے وقت نزع کے عالم میں تھا تو ابو الغیداق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے سکرات کے عالم میں دیکھا تو قزمان کو شہادت کی مبارکباد دی تو اس بدبخت نے جواب دیا۔ دوست میری موت دین کی حمایت میں لڑتے ہوئے نہیں ہوئی بلکہ میں صرف اس جذبہ سے سرشار ہو کر گھر سے نکلا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کفار ہمارے کھیتوں کو ویران کر دیں۔ ہماری عورتیں ان کے ہاتھوں ذلیل ہوں۔ واللہ میں صرف قومی عصبیت سے

لڑنے کے لئے خود کو نثار کر رہا ہوں۔ اگر یہ جذبہ نہ ہوتا تو میں گھر سے کسی صورت نہ نکلتا۔

مجاہدین کی ثابت قدمی

مجاہدین کی تعداد غزوۂ احد میں سات سو سے زیادہ نہ تھی۔ دشمن ان سے چار گنا زیادہ تھا۔ کفار کی اکثریت اور بہادر فوج کے مقابلہ میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے جس ثابت قدمی کا ثبوت دیا اس سے آپ مجاہدین کی ایمانی قوت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ان کے سامنے قوی ہیکل دشمنوں کے جسم بید کی طرح لرزنے لگے۔ وہ کفار (قریش) جن کی بہادری اور مہارتِ جنگ کے سامنے سارا عرب کانپ جاتا تھا ان کی ہمت و جانثاری کا اندازہ اس سے لگا لیجئے کہ جونہی کفار کا علم ایک کے ہاتھ سے گرنے لگتا تو لپک کر دوسرا اس سے لے لیتا۔ مثلاً ان کا قومی جھنڈا سب سے پہلے طلحہ بن ابو طلحہ کے پاس تھا۔ جب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اسے ٹھکانے لگا دیا تو فوراً عثمان بن ابو طلحہ نے اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔ عثمان حمزہ بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں سے مرا تو ابو سعد بڑھا جو مقتول ہی کا بیٹا تھا۔ علم ہاتھ میں لیتے ہی مجاہدین کو للکارنا شروع کر دیا۔ ابو سعد نے مجاہدین کو مخاطب ہو کر کہا۔

"تم سب اس لالچ میں ہم سے لڑ رہے ہو کہ تمہارے قتل ہونے والے اس کے بعد جنت میں بسیرا کر چکے ہوں گے اور ہمارے قتل ہونے والے جہنم کا ایندھن بن چکے ہوں گے۔ لات و عزیٰ کی قسم تم غلطی پر ہو۔ اگر تمہارا یہ گمان صحیح ہے تو آؤ تم میں سے کون مجھے قتل کر سکتا ہے"۔

ابو سعد قرشی (کافر) کے اس متکبرانہ چیلنج کو سن کر سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ آگے بڑھے۔ اور ایک ہی ضرب میں اس کے سر کے دو ٹکڑے کر کے اسے ڈھیر کر دیا۔ ابو سعد کے بعد قبیلہ عبدالدار کے نو شجاعت پیشہ بہادر ایک کے بعد دوسرا آتے چلے گئے۔ ان کا آخری تیغ زن اسی قبیلہ کا حبشی غلام صواب تھا۔ جب اس کا دایاں ہاتھ قزمان کی ضرب سے کٹ گیا تو اس نے علم بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ قزمان نے اس کا یہ ہاتھ بھی قطع کر دیا تو صواب نے اسے اپنی دونوں کہنیوں کے سہارے سنبھالے رکھا۔ آخر زخموں کی شدت سے نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑا مگر اس حالت میں بھی اپنے علم کی حرمت بچانے کے لئے اسے اپنی پیٹھ کے نیچے دبائے رہا۔ ہوتے ہوتے اس کی زبان سے یہ جملے نکلے! اے بنو عبدالدار صواب قزمان یا سعد بن ابی وقاص کی ضرب سے قتل ہوا۔

شکست

جب کفار کا کوئی علم اٹھانے والا نہ رہا تو وہ شکست کھا کر بھاگ نکلے۔ اس بھگدڑ میں انہیں

اپنی ان ماہ پارہ نازنینوں کا خیال بھی نہ رہا جو مکہ سے ان کے ساتھ معرکۂ کارزار میں اپنے حسن و جمال کی گرمی سے انہیں قومی غیرت دلا کر جنگ کے لئے مشتعل کرنے کے لئے آئی تھیں۔ جنہیں مجاہدین نے نرغے میں لے لیا۔ کفار ان مہ پاروں کو بھی اپنے ساتھ نہ لے جا سکے۔

کفار ------ اپنے معبود کو بھی نہ بچا سکے

کفارِ مکہ مسلمانوں سے جنگ کی غرض سے نکلتے وقت اپنے ساتھ جس معبود کی برکت حاصل کرنے کے لئے اسے کعبہ سے اٹھا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے وہ تنہا ایک ہودج میں براجمان تھا۔ کفار کا یہ بے بس و بے اختیار پروردگار بھی اس افراتفری میں اپنے ہودج سے منہ کے بل آ گرا اور دوست دشمن سب کے پاؤں تلے پامال ہوتا رہا۔

پہلی فتح

مجاہدین کی یہ پہلی فتح مجاہدین کی جنگی مہارت و قابلیت کا ناقابلِ تسخیر معجزہ ہے۔ جسے بعض اہلِ نظر رسول اللہ ﷺ کی جنگی مہارت سے تعبیر کرتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی جنگی مہارت کے ثبوت میں درہ پہ مجاہدین کی محدود تعداد کو متعین فرما دیا تھا۔ اس دستہ کا ہر ایک فرد تیر اندازی میں اپنا جواب آپ تھا۔

مگر ان کی تعداد کو مدِنظر رکھ کر اگر ان پر دو تین سو کے قریب حملہ آور ہو جاتے تو ان کا ثابت قدم رہنا ناممکن تھا۔ لیکن کثرت کے مقابلہ میں سب سے بڑی قوت وہ ہے جس کی روح صحیح فکر ہے۔ عقیدہ ہے۔ اللہ عزوجل پر پختہ ایمان ہے۔ ایسے لوگوں کی کم سے کم تعداد پر بھی غالب آنا انتہائی مشکل ہوتا ہے۔ بشرطیکہ ان کا مقصد صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ مجاہدین کی سات سو نفری کے مقابلہ میں تین ہزار تیغ زن بہادر جنگجو سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگنے پہ مجبور ہو گئے۔ نرغہ میں آئی ہوئی کفار کی عورتوں کو مجاہدین گرفتار کرنے کی تیاریاں کر ہی رہے تھے کہ مجاہدین کا ایک گروہ بھاگتے ہوئے کفار کا تعاقب کرتے ہوئے انہیں کافی دور تک چھوڑ آیا۔ مگر یہی دستہ واپس آ کر مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف ہو گیا۔ جیسا کہ فاتح لشکریوں کی عادت ہے۔ گویا مجاہدین دشمن کی گھات سے غافل ہو کر دنیا کے لالچ میں پھنس گئے۔

اب لڑائی رخ بدلتی ہے

لڑائی کا پہلا رخ رسول اللہ ﷺ کی اس صداقت کا ثبوت تھا کہ اگر تم ثابت قدم رہو گے صبر کرو گے تو فتح تمہارے قدموں میں ہو گی۔ لڑائی کا دوسرا رخ اس بات کا ثبوت ہے

کہ اگر مسلمان کسی حال میں بھی رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کرنا چھوڑ کر مخالف رخ اختیار کر لیتا ہے تو اس کا انجام بدتر ہوتا ہے۔

یہی ہوا کہ درہ پر مقرر کردہ دستہ کو رسول اللہ ﷺ نے سختی سے تاکیداً حکم فرمایا تھا کہ اگر دشمن ہم کو قتل بھی کر رہا ہو تو بھی میرے حکم ثانی تک اس مورچہ سے تم قدم مت ہٹانا مگر اس مورچہ پر کھڑے مجاہدین نے جب دیکھا کہ دوسرے مجاہدین مالِ غنیمت سمیٹ رہے ہیں تو ان کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کی جگہ دنیا کی محبت نے لے لی۔ انہوں نے آپس میں ایک دوسرے سے کہا۔ دشمن شکست کھا کر بھاگ چکا ہے۔ اب یہاں پہرہ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ مجاہدین ان کے کیمپوں میں گھس کر مالِ غنیمت لوٹ رہے ہیں۔ چلو ہم بھی ان کے ساتھ مالِ غنیمت لوٹیں۔ دوسرے گروہ نے انہیں یاد بھی دلایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں تاکید سے فرمایا تھا کہ اگر آپ رسول اللہ ﷺ پر حملہ ہوتے بھی دیکھو تو بھی اس مورچہ سے قدم نہ ہٹانا۔ دوسرے گروہ نے یہ کہا کہ آنحضرت ﷺ کا یہ مقصد نہیں تھا کہ مشرکین کی شکست ہو جانے کے باوجود بھی ہم یہ جگہ نہ چھوڑیں۔

ہر شخص کی اپنی اپنی رائے تھی۔ آخر میں دستہ کے امیر عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ رسول اللہ ﷺ کی حکم عدولی جائز نہیں۔ اس کے باوجود دس سے کم حضرات کے سوا بقیہ تمام لشکری مورچہ چھوڑ کر دوسرے مجاہدین کے ساتھ مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گئے۔

رسول اللہ ﷺ کی حکم عدولی کا ثمر

خالد بن ولید نے دیکھا کہ وہ مجاہدین جنہیں اس درہ پہ متعین کیا گیا تھا۔ سوائے دس گیارہ کے سب ہٹ گئے ہیں تو اس نے سب سے پہلے ان پر اچانک حملہ کر کے عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ سمیت سب کو شہید کر دیا۔ پھر جب دیکھا کہ باقی مجاہدین اس تبدیلی سے غافل مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہیں تو ان پر بھی اچانک حملہ کر دیا۔ ہر ایک سے مال غنیمت رکھوا لیا۔ اور کفارِ مکہ کو اس انداز سے پکارا جیسے اس نے تمام مجاہدین کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ مشرکوں نے بھی یہی سمجھ لیا اور مجاہدین پر پلٹ کر زور دار ہلہ بول دیا۔ ہر چند مجاہدین نے مال غنیمت پھینک کر تلواریں سونت لیں مگر صف بندی ٹوٹ چکی تھی اور تھوڑے سے مجاہدین کو کافروں کی کافی تعداد نے گھیر لیا۔ افسوس تھوڑی دیر پہلے جو مجاہدین کلمۂ حق کی سرفرازی اور عقیدۂ توحید کی حفاظت کے لئے مربوط صف بندی اور ترتیب کے ساتھ جنگ کر رہے تھے ان کی صف بندی ختم ہو گئی۔ ترتیب ٹوٹی ہوئی تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئی۔ سب کے سب موت کی

دلدل میں پھنس گئے۔ بربادی اور ہلاکت کے چنگل میں دم توڑنے لگے۔ جو مجاہد تھوڑی دیر پہلے اس کائنات کے عظیم راہنما علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نگرانی میں بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ باطل کے ساتھ نبرد آزما تھے۔ اس لمحہ انہیں اپنے اس عظیم و بے مثال قائد و ہادی ﷺ کہاں ہیں' اس کی بھی خبر تک نہ تھی۔ اس افراتفری میں مجاہدین آپس میں ایک دوسرے پر حملہ آور ہونے لگے۔

افواہ

اچانک جبلِ احد کی فضاؤں نے سنا کہ سرورِ کائنات نبیؐ کل زماں تا قیامت رسول اللہ ﷺ شہادت پا گئے۔ مجاہدین کے اوسان خطا ہو گئے۔ انہوں نے سمجھ لیا کہ اب عساکر کا کوئی راہنما نہیں رہا۔ مجاہدین میں پہلے ہی انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ مصیبتوں نے ہر طرف سے گھیر لیا۔ اگرچہ دشمن کا مقابلہ کیا جا رہا تھا لیکن سردارِ لشکر کی سربراہی کے بغیر۔ اس ہراس و خوف کی صورت میں وہی ہوا جس کی توقع ہو سکتی تھی۔ یہاں تک کہ مہاجرین کے ہاتھ سے ان کے ہم وطن حذیفہ کے والد حسیل بن جابر شہید ہو گئے۔ جنہیں حملہ کے وقت پہچانا نہ جا سکا۔ ایسا وقت بھی آ گیا کہ چند مجاہدین کے سوا جن میں علی ابن ابی طالب اور ان جیسے اور لوگ بھی تھے ہر مجاہد کو اپنی جان کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ (یہ روایت مشکوک ہے) جیسے ہی کفارِ مکہ کے کانوں میں سرورِ کائنات کی شہادت کے الفاظ گونجے سب اس جگہ پر حملہ آور ہو گئے جہاں نبی اکرم ﷺ نگرانی فرما رہے تھے۔ کفارِ مکہ کا ارادہ یہ تھا کہ فخرِ کائنات ﷺ کے گوش و بینی کاٹ کر ہم دوسروں پر فخر حاصل کریں گے! نعوذ باللہ من ذالک۔

جب کافروں کا لشکر اُمڈ آیا تو قریب کے مجاہدین نے جمال و جلالِ آدمیت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دائرہ بنا کر اپنے حصار میں لے لیا۔ ایمان از سر نو لوٹ کر ان کے سینوں میں بس گیا۔ اس وقت اسی موت سے انہیں محبت ہو گئی۔ جس کے خوف سے وہ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے' دنیا کی اس زندگی کی خواہشیں آرزوئیں سب نکل گئیں۔ جن کے لئے وہ چند لمحہ پہلے جان توڑ کوشش میں تھے۔ اور جب مجاہدین نے دیکھا کہ کافروں کے پھینکے ہوئے پتھروں سے نبی اکرم ﷺ کا چہرہ مبارک لہولہان ہو گیا۔ دو دندان مبارک شہید ہو گئے۔ مبارک و مقدس ہونٹوں پر زخم آ گیا اور خود کے دو حلقے آنحضرت ﷺ کے رخسار مبارک میں گھس گئے تو مجاہدین کی نظر میں دنیا اندھیر ہو گئی۔ ان کی قوتِ ایمان ہزار درجہ بڑھ گئی۔ ہر مجاہد نڈر ہو کر موت کے ساتھ کھیلنے لگا۔

یہ پتھر جس سے نبی اکرم ﷺ کا چہرۂ مبارک زخمی ہوا تھا۔ عتبہ بن ابی وقاص نے

پھینکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے یہاں سے ہٹ جانا مناسب سمجھا اور جو مجاہدین آنحضرت ﷺ کو اپنے حصار میں لئے ہوئے تھے ان کے ساتھ ہی اسی طرف بڑھ گئے۔ ذرا دور چل کر اس کھائی میں گر پڑے جو ابو عامر نے مجاہدین کی ہلاکت کے لئے کھود کر اس پر گھاس بچھا دی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ کو گرنے سے پہلے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سنبھال لیا۔ طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آپ ﷺ کو سنبھالا دے کر کھائی کی حدود سے نکال لیا۔ اور یہاں سے نبی اکرم ﷺ جبلِ احد کے اس مقام پر تشریف لے گئے جہاں دشمنوں کی نگاہوں سے قدرتی طور پر حفاظت تھی۔

مجاہدین کی سرفروشی

مجاہدین جنہیں اپنی جانوں سے ہزار گنا سے بھی زیادہ رسول اللہ ﷺ کی حفاظت عزیز تھی انہوں نے اپنے آپ ﷺ کو اپنے حصار میں لے لیا۔

امِّ عمارہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

صالح فطرت صاحبِ ایمان ام عمارہ انصار کے خاندان سے تھیں۔ دوپہر تک ان کا مشغلہ زخمی مجاہدین کو پانی پلانا' زخموں پر مرہم پٹی کرنا تھا' دوپہر کے بعد دیکھا کہ مجاہدین کفار کے نرغہ میں پھنس گئے ہیں تو مشکیزہ پھینکا' تلوار سونت لی اور کفار پر ٹوٹ پڑیں' تیر اندازی کا موقع آیا تو ان کے پاس تیر اور ترکش بھی تھے' تیروں سے کفار کی تواضع کرنے لگیں۔ اس طرح نبی اکرم ﷺ کو کفار سے بچاتے ہوئے خود زخمی ہو کر گر پڑیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک اور غزوہ کے لئے زندہ رکھا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔

ابو دجانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

رسول اللہ ﷺ سے والہانہ محبت کا یہ عالم تھا کہ ابو دجانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس معرکہ میں رسول اللہ ﷺ کی حفاظت میں اپنی پشت کو ڈھال بنا لیا۔ جو تیر بھی نبیؐ رحمت ﷺ کی طرف آتا ابو دجانہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کو اپنی پشت پر روک لیتے۔

سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ

سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ آنحضرت ﷺ کے قریب کھڑے ہوئے دشمنوں پر تیر برسا رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ اپنے دستِ مبارک سے تیر دیتے ہوئے فرماتے اور ارم فداک امی وابی اے سعد یہ لو کافروں پر تیر چلاؤ تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کی تیر اندازی

سعد بن وقاص کے آپ ﷺ کے قریب پہنچنے سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے کافروں پر اس شدت کے ساتھ تیر برسائے کہ کمان کا چلہ بھی ٹوٹ گیا۔ مجاہدین میں جن لوگوں کو آنحضرت ﷺ کے شہید ہونے کا یقین ہو گیا تھا ان میں ابوبکر رضی اللہ عنہ اور اور عمر رضی اللہ عنہ تھے (مخدوش روایت) جب شہادت کی افواہ ان تک پہنچی تو یہ دونوں گھبرا کر پہاڑ کے کنارے جا بیٹھے۔ یہاں ان کو انس بن نضر نے دیکھ کر پوچھا۔ آپ یہاں خاموش کیوں بیٹھے ہیں تو ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کہا۔ کہ ہم لوگ حضرت ﷺ کی وفات کی خبر سن کر حیران ہیں۔ انہوں نے کہا۔ اگر آنحضرت ﷺ واقعہ ہی شہادت فرما گئے ہیں۔ تو آپ لوگ زندہ رہ کر کیا کریں گے۔ اُٹھیئے جس مقصد کے لئے رسول اللہ ﷺ نے اپنی زندگی نثار کی ہے آپ لوگ بھی اس مقصد کے لئے زندگی قربان کر دیجئے۔ اس کے بعد تینوں حضرات انس بن نضر رضی اللہ عنہ، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کفار پر ٹوٹ پڑے چنانچہ انس بن نضر رضی اللہ عنہ دشمنوں کے ہجوم میں لڑتے لڑتے گھس گئے اور اپنی بے مثال شجاعت کی یادیں چھوڑ کر شہید ہو گئے۔ میدان کا زار میں کفار کو ان سے زیادہ کفار کش نہ ملا ہو گا۔ زخموں کی کثرت سے ان کی شناخت اتنی ناممکن ہو گئی تھی کہ ان کی حقیقی بہن نے اپنے بھائی کی انگلی پر ایک نشان کی وجہ سے پہچانا۔

افواہ نے انتقام کی آگ فرو کر دی

کفار کو رسول اللہ ﷺ کی وفات کی افواہ سے انتہائی مسرت ہوئی۔ ابو سفیان مقتولین میں رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرنے لگا۔ ابوسفیان کے ساتھیوں یا کفار کو اس ذات والا صفات نبیؐ رحمت و برکت محمد ﷺ کی وفات کا یقین اس لئے بھی آ گیا کہ اس افواہ کی تردید میں ایک لفظ بھی ان کے کانوں نے نہیں سنا۔

لیکن مجاہدین نے تو رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے آپ ﷺ کی زندگی کے بارے میں خاموشی اختیار کر لی۔ اس کی دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ہو سکتا ہے کفار ان پر ٹوٹ پڑیں اور مغلوب ہونا پڑے۔ اتفاق سے جب کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کے دستہ سے آگے بڑھے تو آپ ﷺ کے چہرۂ اقدس پر نظر پڑی، خود میں چہرہ چھپا ہوا تھا، دو نورانی آنکھیں چمکتی ہوئی دیکھیں پہچان لیا۔ خوشی سے بے قابو ہو کر نعرہ لگایا۔ یا معشر المسلمین ھذا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم) اے مسلمانو رسول اللہ ﷺ تو یہاں تشریف فرما ہیں۔

کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانے کے باوجود ضبط نہ کر سکے تو جس جس مجاہد کے کانوں میں یہ آواز پڑی آنکھ جھپکتے ہی اڑ کر آواز کی طرف لپک آئے آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم پا کر پہاڑی کے موڑ کی طرف چلے گئے۔ اس مقام پر جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے حصار میں رکھا تھا۔ وہاں دوسرے صحابہ کرام کے ساتھ جناب ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ابی بن خلف

ویسے تو کفار کو پہلے ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کا یقین تھا۔ وہ اسے مجاہدین کی چال سمجھتے تھے تاکہ مجاہدین اپنی جان کی بازی لگا دیں۔ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی موت کا پیش خیمہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر اپنی پوری قوت سے حملہ کر دیا۔ ان کے اسی دستہ کا سپہ سالار ابی بن خلف تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں چھوٹی برچھی لے کے آگے بڑھا اور کہا۔ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میرے سامنے کراؤ میں اس سے تم سب کو نجات دلاتا ہوں۔ سب کی تمنا پوری کرتا ہوں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب حارث بن الصمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ سے ان کا نیزہ لے کر اس مردود کی طرف پھینکا تیر لگتے ہی گھوڑے کی زین پر ہی اوندھا ہو گیا۔ اس کا گھوڑا جس طرف سے آیا تھا۔ اسی طرف چل دیا۔ ابی راستے میں ہی واصل جہنم ہو گیا۔

دندانِ مبارک

ادھر علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی ڈھال میں پانی بھر کر لاتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رخسار مبارک کے زخم دھوتے۔ بقیہ پانی سے سر مبارک دھویا۔ ابو عبیدہ الجراح نے رخسار سے خود کے حلقے کھینچ کر نکالے مگر ساتھ ہی سامنے کے دو دانت مبارک بھی نکل آئے۔

کفار کی ایک اور ناکام کوشش

خالد بن ولید نے ایک بار پھر اپنی قوت کو جمع کر کے مینار نور کی طرف بدنیت کے ساتھ حملہ کیا لیکن عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور مجاہدین نے اس کا رخ پھیر دیا۔ لیکن اس کوشش میں مجاہدین کو یہاں سے ہٹنا ہی پڑا۔ اب وہ جبلِ احد کے ایک بلند ٹیلہ پر جا پہنچے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زخموں کی شدت کی وجہ سے بیٹھ کر قیامِ صلوٰۃ فرما رہے تھے۔ مجاہدین نے بھی آپ کی اقتداء میں یہاں بیٹھ کر ہی قیامِ صلوٰۃ کا فریضہ ادا کیا۔

اگلے سال کی امید

کفار اپنی فتح کے نشہ میں ایسے سرشار ہوئے جیسے غزوۂ بدر کا انتقام لے لیا گیا ہے ابو سفیان نے اسی جوش کامرانی میں چلا کر کہا۔

یوم بیوم والموعد العالم المقبل

آج بدر کا انتقام لے لیا گیا لیکن اگلے سال ایک بار پھر آمنا سامنا ہو گا۔

ہندہ کی درندگی

ہندہ کے دل میں انتقام کی سلگتی آگ نہ تو فتح کی خبر سن کر بجھی، نہ ہی حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت سے اس کے کلیجہ میں ٹھنڈک پڑی۔ اس نے جاہلیت کی رسم کے مطابق اپنا کام جاری رکھا۔ اس نے شہداء کی لاشوں میں سے ہر ایک کے ناک کان کاٹنے شروع کر دیئے۔ اور ان کو اپنے گلے کا ہار بنایا۔ جو بچے ان کو کانوں کے دوسرے بالوں کے پھول بنائے اور الاماں اس پر بھی غضب کم نہ ہوا تو عم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کلیجہ چبایا۔ پہلے لاش ڈھونڈھوائی پھر کلیجہ نکلوا کر چبوایا مگر نگلا نہ گیا اگلنا پڑا۔ اس پر بھی معاملہ بس نہیں کیا اپنی سولہ سہیلیوں کے ساتھ مجاہدین کی لاشوں کی ہر طرح توہین کی۔ (واللہ اعلم بالصواب)

یہ حرکت کفارانِ قریش کی عورتوں نے ہی نہیں کی بلکہ مردوں نے بھی اپنی طرف سے کوئی کمی نہ رہنے دی۔ البتہ ابو سفیان نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ اس نے کہا۔ نہ تو میں نے ان حرکات کا حکم دیا نہ ہی اسے ناگوار سمجھا۔ یہاں تک کہ اس نے مجاہدین میں سے ایک مجاہد کے سامنے کہہ دیا کہ تمہاری لاشوں کا مثلہ کرنے میں نہ خوش ہوں نہ بیزار نہ میں نے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور نہ ہی منع کیا۔

اظہارِ غم

کفار مکہ اپنے مرنے والوں کی لاشیں دفن کر کے جب مکہ لوٹ گئے تو مجاہدین اپنے شہیدوں کی لاشیں جمع کرنے کے لئے میدان میں آئے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے چچا جناب حمزہ رضی اللہ عنہ کا پیٹ چاک اور مثلہ دیکھا تو اس پر غم زدہ ہوئے اور فرمایا اللہ تعالیٰ نہ کرے آئندہ ایسی مصیبت دیکھوں۔ آج تک میں اس قسم کے دکھ سے کبھی آشنا نہ ہوا اور فرمایا ــــــ کہ

اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی فتح دی تو میں بھی ان کی لاشوں کا مثلہ کروں گا۔
اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به لئن صبرتم خیر للصابرین واصبر وما صبرک الا باللہ ولا تحزن علیهم ولا تک فی ضیق مما یمکرون

اگر تم ان کو تکلیف دینا چاہو تو اتنی دو جتنی تکلیف تم کو دی گئی اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہت اچھا ہے اور صبر ہی کرو اور تمہارا صبر بھی اللہ تعالیٰ ہی کی مدد سے ہے۔ ان کے بارہ میں غم نہ کرو۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنے دل سے مذکورہ خیال (یعنی مثلہ) کو نکال ہی دیا اور مجاہدین اور مسلمانانِ عالم کو حکم فرمایا کہ کوئی کسی کی لاش کا مثلہ نہ کرے۔

تدفین

رسول اللہ ﷺ نے اپنی چادر مبارک کا کفن حمزہ رضی اللہ عنہ کو پہنایا اور ان کی نماز جنازہ پڑھی اس اثناء میں حمزہ رضی اللہ عنہ کی ہمشیرہ تشریف لے آئیں اور اپنے محترم بھائی کی لاش سے کفار کا یہ سلوک دیکھ کر دم بخود رہ گئیں۔ آخر میں دعائے مغفرت فرمائی۔ انہیں دفن کر دیا گیا۔ اسی طرح دوسرے شہداء کو بھی مقامِ شہادت پر ہی دفن کر دیا گیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ مجاہدین کے ساتھ مدینہ تشریف لے گئے۔ (غزوۂ احد میں ستر مسلمان شہید ہوئے)

رسول اللہ ﷺ کی سوچیں

اس پیراگراف میں فاضل مصنف و مؤلف رسول اللہ ﷺ سے منسوب کر کے عام انسانی سطح کی تفصیل بیان کرتا ہے، جو نبی ﷺ کی تمام انسانوں سے بلند تر سوچ کی شان کے بالکل خلاف ہے (مترجم)

نبی اکرم ﷺ نے بیت النبوّت علیہ السلام میں تشریف لائے اور مختلف تصور میں ڈوب گئے۔ کبھی خیال گزرتا کہ منافقین یہود اور مشرکین کو ہماری شکست سے بڑی خوشی ہوئی ہو گی۔ کبھی یہ خیال بھی آتا کہ کل تک مدینہ منورہ میں کوئی شخص مسلمانوں کے سامنے بدتمیزی نہیں کر سکتا تھا مگر اب نہ معلوم کیا ہو گا۔ شاید عبداللہ بن ابی سلول اس لئے اپنی جماعت کو احد سے واپس لے آیا کہ میں نے اس کی رائے مسترد کر دی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ مدینہ میں بند ہو کر کفار سے جنگ لڑی جائے۔ عبداللہ بن ابی سلول کو ہم سے یہ شکایت بھی ہوئی کہ ہم نے اس کے حلیف یہودی قبیلہ کو شہر سے جلاوطن کر دیا۔ کبھی یہ خیال گزرتا کہ اگر مسلمان غزوہ احد کی

شکست کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ گئے تو میرے صحابہ تمام عرب کی نظروں سے گر جائیں گے۔ مدینہ منورہ میں ہمارا وقار ختم ہو جائے گا اور قریش (کفار) اپنے نمائندے عرب کے ہر قریہ میں بھیج کر ہر جگہ ہمیں ذلیل کروائیں گے۔ ہم پر تمسخر اڑا کر ہمیں خوب ذلیل کریں گے' ہمارے خلاف ان طریقوں سے مشرکین اور بت پرستوں کی جرأت قیامت برپا کردے گی۔ اب رسول اللہ ﷺ نے یہ ارادہ مستحکم کرلیا کہ جس طرح ہو سکے احد کی شکست کا داغ مٹا کر مسلمانوں میں ایسی قوت کو توانا کیا جائے جس کے دبدبہ سے یہود اور مشرکین کے حوصلہ بڑھنے نہ پائیں اور اپنے صحابہ کرام کے ساتھ پہلے کی طرح عزت و شان سے زندگی گزاری جا سکے۔

17 شوال

غزوۂ احد کے دوسرے ہی دن رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرما دیا کہ مجاہدین کفار کا تعاقب کریں۔ چنانچہ غزوۂ احد میں شامل ہونے والے تمام مجاہدین تعاقب کے لئے روانہ ہو گئے۔

ابوسفیان گھبرایا

جب رسول اللہ ﷺ کی معیت میں مجاہدین تعاقب کرتے ہوئے حمراء الاسد تک پہنچے تو ابوسفیان چند میل آگے روحاء تک پہنچ گیا تھا۔ حمراء الاسد مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلہ پر ہے۔ عبدالخزاعی حمراء الاسد سے اتفاقاً گزرے اور مجاہدین کے لشکر کو دیکھا۔ آگے بڑھ گئے' راستے میں ابوسفیان سے ملاقات ہوئی تو ابوسفیان نے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ محمد ﷺ اپنے ساتھ بے مثال لشکر لے کر تعاقب کرتے ہوئے حمراء الاسد تک پہنچ گئے ہیں۔ ان کے لشکر میں وہ لوگ بھی غالباً شامل ہیں جو غزوۂ احد میں شامل تھے اور انہوں نے جوشِ انتقام میں ننگی تلواریں ہاتھوں میں لے رکھی ہیں۔ یہ سن کر ابوسفیان طرح طرح کے تفکرات میں غرق ہو گیا۔ کبھی اس کے دماغ میں یہ خیال ابھرتا کہ جبلِ احد میں حاصل کی گئی کامیابی کے بعد مقابلہ سے فرار ہی بہتر ہے۔ کہیں مقابلہ کی صورت میں جیتی ہوئی بازی ہار میں نہ بدل جائے۔ عرب کیا خصوصاً میرے رفقاء ہی مجھے ذلیل کریں گے۔ اس کے دماغ میں یہ خیال بھی آتا کہ شکست کی صورت میں قضا و قدر کا یہ آخری فیصلہ ہو گا جس کے بعد ہم کبھی سنبھل نہیں سکیں گے! آخر ہمیں کیا کرنا چاہئے کہ ہم ملک میں سرخرو ہو کر جی سکیں؟

ابوسفیان کو ایک ترکیب سوجھی۔ جب قبیلہ عبدالقیس کا ایک کارروان مدینہ کی طرف جاتے ہوئے اس نے دیکھا اس سے ملا اور اسی کی زبانی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ دھمکی بھیجی کہ ابوسفیان آندھی کی طرح آ رہا ہے تاکہ مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ دے۔ چنانچہ حمراء

الاسد (قیام گاہ رسول اللہ ﷺ) پر پہنچ کر اس نے یہی الفاظ دہرا دیئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی کمزوری یا بے بسی کا اظہار کئے بغیر وہیں اپنے قدم جمائے رکھے اور کفارِ مکہ کو اپنی استقامت و شجاعت ثابت کرنے کے لئے مسلسل تین رات تک آگ کا بہت بڑا الاؤ جلائے رکھا۔ ابوسفیان بھی الاؤ کو جلتا دیکھتا رہا۔ آخر اس کی ہمت مقابلہ کے خیال سے جواب دے گئی تو وہ احد ہی کی نیم فتح کی پر فریب مسرت لئے ہوئے مکہ کی طرف کوچ کر گیا۔

منافقین

مدینہ کے منافقین کو تو بہانہ چاہئے تھا۔ رسول اللہ ﷺ جب واپس تشریف لائے تو منافقین نے اپنے مخصوص انداز میں مسلمانوں کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک شوخ چشم منافق نے سوال کیا۔ بدر کی فتح اگر تمہارے محمد ﷺ کی رسالت کی تصدیق کرتی تھی تو غزوۂ احد کی شکست کو کس طرح تعبیر کرو گے؟

غزوۂ اُحد کے بعد

غزوہ اُحد کے بعد

غزوہ احد کے بعد ابوسفیان کی واپسی

یوں تو غزوہ احد میں مسلمانوں کی شکست کی خبر پہلے ہی سے مکہ میں پھیل چکی تھی۔ لیکن ابوسفیان غزوہ احد میں کامیابی کا غرور لے کر سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہوا اپنے باپ دادا کے معبود ہبل کے حضور میں حمد و ثناء کا تحفہ پیش کیا۔ بت پرستی کی مروجہ رسم کے مطابق کانوں کی لو سے بڑھے ہوئے بال کٹوائے۔

آج ابوسفیان کی وہ قسم بھی پوری ہو گئی جس کی رو سے اس نے بدر کا انتقام لئے بغیر بیوی کو خود پہ حرام کر لیا تھا۔ آج وہ خوشی خوشی اپنے گھر میں داخل ہوئے۔

مجاہدین کی واپسی

مجاہدین جب مدینہ منورہ میں واپس آئے تو اپنے خلاف طرح طرح کی باتیں سنیں۔ اس کے باوجود کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلسل تین راتیں آگ کا الاؤ جلائے رکھا۔ دشمن دیکھتا رہا مگر اسے حملہ کرنے کی جُرأت نہ ہوئی۔ خود مسلمانوں کی پہلی فتح و کامرانی کے ہوتے ہوئے بھی مسلمانوں کو مدینہ میں رہنے والے منافقوں اور کافروں سے سخت دل دکھانے والی باتیں سننا پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود اب بھی مدینہ منورہ میں اقتدار رسول اللہ ﷺ ہی کا تھا۔ تاہم رسول اللہ ﷺ انتہائی غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پہ پہنچے کہ مدینہ منورہ اور اس کے باہر رہنے والے قبائل جو کل تک ہمارے مطیع و فرماں بردار تھے۔ وہ غزوہ احد کے بعد ہمارے خلاف کوئی سازش نہ کر لیں۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے مدینہ اور بیرونی

قبائل کی خبریں حاصل کرنے کا انتظام کر لیا تاکہ مسلمانوں کی سطوت و عظمت بحال رکھنے میں کوئی کمی نہ آنے پائے۔

سریہ

غزوۂ احد سے دو ماہ کے بعد اطلاع ملی کہ بنو سعد کے سرغنہ طلیمہ اور سلمہ خویلد کے بیٹے اپنے قبیلہ کو لئے ہوئے مدینہ منورہ پہ حملہ آور ہونے والے ہیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کا سارا مال و اسباب لوٹ لیا جائے۔ مسلمانوں کے مویشی جتنے بھی یا جو بھی مدینہ سے باہر ہوں ان کو ختم کر دیا جائے۔ جو سرسبز و شاداب گھاس کھا کھا کر موٹے ہو رہے ہیں۔ بنو اسد کی بغاوت کا سبب غزوۂ احد کی شکست ہی تو تھی۔ جس کی بناء پر یہ سمجھ لیا گیا کہ اب مسلمانوں میں مقابلہ کی ہمت ہی نہیں رہی۔ یہ خبر ملتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو سلمہ بن عبدالاسد کو ان کے خاتمہ کی غرض سے نامزد فرمایا۔ علم اپنے مبارک ہاتھوں سے تیار فرمایا۔ اس دستہ میں ایک سو پچاس مجاہدین تھے جن میں سرِفہرست ابو عبیدہ (الجراح) رضی اللہ تعالیٰ عنہ، سعد بن وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو الوداع کرتے وقت یہ نصیحتیں فرمائیں۔

الف۔ اہلِ دستہ رات میں سفر کریں اور دن میں کسی محفوظ جگہ میں چھپے رہیں۔
ب۔ رات کو بھی عام شاہراہ سے ہٹ کر سفر کریں تاکہ کسی کو ان کا کھوج نہ مل جائے۔
ج۔ دشمن پر اچانک حملہ کریں۔

سالار دستہ حضرت ابو سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی پابندی کرتے ہوئے صبح کے وقت مطلوبہ مقام پر پہنچ کر دشمن پر حملہ کر دیا۔ کفار سنبھلنے سے پہلے مجاہدین کی گرفت میں آ گئے۔ کچھ بھاگ نکلنے پہ مجبور ہو گئے۔ امیرِ لشکر نے دو فریق ان کے تعاقب کے لئے بھیجے اور ہدایت فرمائی کہ دشمن اور اس کے مال و اسباب دونوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ امیرِ لشکر خود اسی مقام پر رکے رہے۔ یہاں تک کہ مجاہدین دشمنوں کا سامان لے کر واپس آ گئے۔ امیرِ لشکر نے شریعت کے مطابق پہلے خمس الگ کر لیا اور بقیہ مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا اور فاتح بن کر مدینہ منورہ واپس تشریف لائے۔ اس فتح سے مسلمانوں میں از سرِ نو ہمت باندھ دی اور غزوۂ احد کی شکست کا احساس کچھ کم ہوا۔ لیکن امیر لشکر نے غزوہ احد میں کھائے ہوئے زخم کے دوبارہ کھل جانے کی وجہ سے چند دنوں بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

سریہ 2

مذکورہ سریہ کے بعد چند دنوں میں ہی ایک اور اطلاع موصول ہوئی کہ خالد بن سفیان بن

نبیح الہلی نخلیا نامی جگہ پر مدینہ منورہ پر حملہ آور ہونے کے لئے لشکر جمع کر رہا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحقیق کے لئے عبداللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جاسوسی پر متعین فرمایا۔ جناب عبداللہ جب مذکورہ شخص کے سر پہ جا پہنچے تو وہاں ان کی ملاقات براہ راست اس سے ہوئی۔ وہ وہاں اسی جگہ پر اپنی بیویوں کو ساتھ لے کر اپنے لشکر کے لئے جمع ہونے کی جگہ کی تلاش کر رہا تھا۔ جناب عبداللہ بن انیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے پوچھا' سنا ہے کہ آپ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرنے کے لئے لشکر جمع کر رہے ہیں۔ اس نے جواب میں کہا۔ بے شک میں مدینہ پر حملہ کرنے کے لئے لشکر جمع کر رہا ہوں۔ عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب اس کے کفر اور کافرانہ ارادوں کا یقین ہو گیا تو اسے ان عورتوں کے سامنے ہی قتل کر دیا اور وہ عورتیں اس پر روتی رہ گئیں۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واپس آ کر پورا واقعہ بیان کر دیا۔

انتقام

مقتول خالد بن سفیان کے قبیلہ (بنو لحیان) والے کچھ دن تو خاموش رہے۔ لیکن آخر کار انہوں نے انتقام لینے کا ایک خوفناک منصوبہ تیار کر لیا۔ اور نبی الخاتم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر درخواست کی۔ ہم سب اسلام قبول کر چکے ہیں' مہربانی فرما کر ہمارے ساتھ کچھ ایسے مسلمان بھیجئے جو ہم کو دین کی تلقین کریں اور قرآن حکیم کی تعلیم سے ہمیں سرفراز فرمائیں۔

غزوہ رجیع

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ مبارکہ تھا کہ جب بھی کوئی شخص دین اسلام کی تعلیم حاصل کرنے کی تمنا لے کر آتا۔ اس کی درخواست کبھی مسترد نہیں فرماتے تھے۔ تاکہ لوگ دین اسلام کی تعلیم و تبلیغ کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ راہِ حق کی طرف آئیں اور رفتہ رفتہ تبلیغ کے ذریعہ اسلام قبول کرنے والوں کے تعاون سے دشمنانِ اسلام اور حاسدانِ اسلام کے خلاف موثر کارروائی عمل میں لائی جا سکے۔ جیسا کہ مکہ میں بیعت الکبریٰ کے موقع پر اوس و خزرج کی ایسی ہی درخواست پر یثرب میں اپنے معلمین اور داعی اسلام مقرر فرمائے تھے۔

قبیلہ ھذیل کے لئے چھ صحابہ رضی اللہ عنہم کا تقرر

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے درخواست کرنے والوں کی خواہش کے مطابق چھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دین اسلام کی تعلیم و تربیت کے لئے ان کے ساتھ روانہ فرما دیا لیکن جیسے ہی ھرلی عیار ان چھ معلمین کو لے کر حجاز کے مقام رجیع پر پہنچا تو عیار ھذیل نے مسلمانوں سے غداری کی۔ اپنے قبیلہ ھذیل کو پکارا' انہوں نے ان چھ معلمینِ اسلام کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ مکار

ھذیل کے قبیلہ والوں کی نیت دیکھ کر مسلمانوں نے بھی تلواریں سونت لیں لیکن ان لوگوں نے کہا ہم خود تو تم لوگوں کو قتل کرنا نہیں چاہتے بلکہ قید کر کے مکہ لے جانا چاہتے ہیں۔ یہ سن کر مسلمانوں نے اشاروں میں طے کر لیا کہ مکہ والوں کے ہاتھوں قید ہو کر جانے سے بہتر ہے کہ ہم شہید ہو جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے آپ کو ان کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا اور مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ ھذیل نے ان میں سے تین کو شہید کر دیا اور تین حضرات کو گرفتار کر کے مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں جناب عبداللہ بن طارق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کفار کے ہاتھوں سے نکل گئے اور تعاقب کرنے والوں کا مقابلہ کرنے کے لئے تلوار سونت کر کھڑے ہو گئے لیکن کافروں نے ان کو پتھر مار مار کر شہید کر دیا۔ حضرت زید اور خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہم جب مکہ والوں کے حوالے کر دیئے گئے۔ تو زید بن دثنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزوۂ بدر میں امیہ بن خلف کو قتل کیا تھا۔ انہیں امیہ کے بیٹے صفوان نے خرید کر قتل کرنے کے لئے اپنے غلام قسطاس کے حوالے کر دیا۔

زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ابو سفیان کا مکالمہ

جب زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مقتل گاہ میں پہنچا دیا گیا تو ابو سفیان نے ان سے سوال کیا۔ زید (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) کیا تمہیں یہ پسند ہے کہ اس مقتل میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گردن ماری جاتی اور تم اپنے اہل و عیال میں آرام سے ہوتے؟

زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ واللہ واللہ واللہ مجھے یہ پسند نہیں کہ میری جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوں اور ان کے پاؤں میں کانٹا بھی چبھے اور میں اپنے اہل و عیال کے جھرمٹ میں بیٹھا رہوں!

ابو سفیان (حیرت زدہ ہو کر) میں نے کوئی ایسا شخص آج تک نہیں دیکھا جس کے خیر خواہ محمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خیر خواہ ہوں اور محبت کرنے والوں سے زیادہ ہوں!

اس کے بعد قسطاس کی تلوار نے زید بن دثنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقدس خون کو مکہ کی گرم زمین نے چوم لیا۔ حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جس انداز اور شان سے جان دی اس سے ثابت ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں جان دینا کتنا آسان ہے چونکہ ایمان کی اصل ہی محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت

حضرت خبیب کو پہلے تو کئی دن تک قید میں رکھا گیا اس کے بعد ان کو شہادت گاہ میں لایا گیا۔ آج انہیں سولی پہ لٹکایا جانا ہے۔ حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کافروں سے دو رکعت قیام

صلوٰۃ کی اجازت مانگی ادائے صلوٰۃ کے بعد فرمایا۔

اما واللہ لولا ان تظنو انی انما طولت جزعا" من القتل لاستکثرت من الصلوۃ
اللہ تعالٰی کی قسم اگر مجھے تمہارے دلوں میں اس گمان کا شبہ نہ ہوتا کہ میں موت کے ڈر سے قیامِ صلوٰۃ کو لمبا کر رہا ہوں تو میں ابھی قیام و قعود میں اور اضافہ کرتا۔

حضرت خبیب رضی اللہ تعالٰی عنہ کی بد دعا سے کافروں کے بدن لرز اٹھے

ایک بدبخت جب ان کے گلے میں پھانسی کی رسی ڈالنے لگا تو آپ رضی اللہ تعالٰی عنہ نے غصہ میں بلند آواز ہو کر یہ بددعا مانگی۔

اللھم احصھم عددا" واقتلھم بددا" ولا تغادر ینھم احدا"

اے میرے اللہ عزوجل ان میں سے ہر ایک کو اپنے گھیرے میں لے لے۔ سب کے سب تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر جائیں۔ ان میں سے کوئی زندہ نہ بچے۔

یہ سن کر کافروں کے دل کانپ گئے۔ ایسا نہ ہو کہ واقعہ ہی انہیں غیبی عذاب اپنی گرفت میں لے لے۔ سب پہلو کے بل زمین پر لیٹ گئے۔ ذرا سنبھلے تو حضرت خبیب رضی اللہ تعالٰی عنہ کے گلے سے پھانسی کی رسی کھول کر انہیں شہید کروادیا۔

مرحبا صد مرحبا۔۔۔ اپنے پیشرو زید بن دثنہ رضی اللہ تعالٰی عنہ کی طرح حضرت خبیب رضی اللہ تعالٰی عنہ نے بھی دینِ اسلام' اللہ عزوجل اور رسول اللہ صلی اللہ تعالٰی علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و محبت میں اپنی جان قربان کر دی۔

یہ شہادت گہہِ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

اب ناقابلِ تصور سرعت کے ساتھ زید بن دثنہ رضی اللہ تعالٰی عنہ اور حضرت خبیب رضی اللہ تعالٰی عنہ کی پاک روحیں آسمانوں سے گزرتی ہوئی جنت الشہداء میں پہنچ گئیں۔ اگر یہ دونوں دینِ اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف لوٹ آتے تو انہیں اپنی جانیں بچانے کا بہترین موقع میسر تھا۔ لیکن انہیں اپنے اللہ تعالٰی کے وعدوں پر پورا یقین تھا' انہیں اس موت کے بعد ہمیشہ کی زندگی یوم حساب پر پورا پورا یقین تھا۔

الیوم تجزی کل نفس بما کسبت۔ (17:40)
آج کے دن ہر ایک اپنے کئے کا بدلہ پائے گا۔

الا تزر وازرۃ وزر اخری۔ (38:53)
کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ اپنی گردن پر نہیں لے گا۔

اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کا زید بن دشنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کو یقین تھا۔ دونوں نے جب موت کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو فیصلہ کر لیا کہ زندگی کا یہ رشتہ ایک نہ ایک دن ٹوٹنے ہی والا ہے۔ کیوں نہ اسے اللہ تعالیٰ کی محبت میں نثار کر دیا جائے۔ انہیں اس بات کا بھی پورا یقین تھا کہ یہ مکّہ کی زمین جو آج ہمارے لہو کی پیاسی ہے' انشاء اللہ چند ہی روز کے بعد اسی سرزمین پر ہمارے دینی بھائی فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ قدم رنجہ فرمائیں گے اور کعبہ کے ان بتوں کو اپنے پاؤں تلے روند دیں گے۔ اللہ کے گھر کو ان بتوں اور لوگوں کے دلوں سے شرکت کی نجاست سے پاک کر دیں گے اور اس مقدس گھر کی خدمت میں توحید کا وہ تحفہ پیش کریں گے جو اس کے شایانِ شان ہے۔ جس کے بعد اللہ کا یہ عظیم و مقدس گھر کبھی بت پرستی اور شرکت کا گہوارا نہیں بن سکے گا۔

اندھے مستشرقین

میں حیران ہوں کہ مسلمانوں کے ہاتھوں دو اشخاص (نضر بن حارث اور عقبہ بن ابی معیط) غزوۂ بدر کے دو قیدیوں کا قتل مستشرقین کی نگاہوں میں زمین و آسمان کے درمیان واویلا اور آہ بکا کا مستحق ٹھہرا مگر مکہ والوں کے ہاتھوں قتل کئے جانے والے حضرت زید بن دشنہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جناب خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہمدردی میں ان کے انصاف پسند قلم کو حرکت تک نہ ہو۔ جبکہ یہ دونوں شہداء جنگی قیدی بھی نہ تھے بلکہ دھوکہ دے کر لائے گئے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کر کے بنو ہذیل کو دینِ اسلام کی تعلیم دینے کے لئے ساتھ لائے گئے تھے۔ جن میں سے چار مظلوم مسلمانوں کو ہذیل نے ہی شہید کر دیا۔ اور دو کو کفارِ مکہ کے ہاتھوں فروخت کر دیا گیا۔ اور انہیں اہلِ مکہ نے انتہائی سخت دلی کے ساتھ شہید کر دیا۔

انصاف تو یہ ہے کہ مستشرقین نے جس شدومد کے ساتھ نضر اور عقبہ بدر کے قیدیوں کے قتل پر واویلا مچایا زید اور خبیب رضی اللہ عنہم کے قتل پر بھی اسی طرح واویلا کرتے! کچھ تو لکھتے۔ آہ ان دو مسلمانوں کے ناحق قتل پر جنہیں ہذیل خود دین سیکھنے اور ان کو سکھانے کے لئے فریب دے کر لائے تھے ان میں سے چار کے خون سے اپنا دامن رنگین کیا اور دو کو مکہ کے خونخوار وحشیوں کے سپرد کر دیا۔

بدقماش ہذیل نے جس مکرو فریب کے ساتھ ان چھ مومنین کو شہید کیا مسلمانوں کے لئے وہ انتہائی اذیت وہ المیہ تھا۔ صحابہ میں سے شاعرِ رسول حسان بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت خبیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر رقت انگیز مرثیہ لکھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ اگر اس حادثہ سے شہہ پا کر یا راہ پا کر عرب مسلمانوں کو پامال کرنے کے لئے

جمع ہو گئے تو کیا ہو گا؟ اللہ کافی!

بئرِ معونہ کا المیہ

اس اثناء میں قبیلہ کلاب کا سردار ابو براء عامر بن مالک جس کا لقب ملاعب الاسنہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس نے بھی ہذیل کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں درخواست کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انکار کیا مگر اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ میں اسلام کا دشمن نہیں ہوں۔ آپؐ میرے ہمراہ ایک وفد صوبہ نجد میں بھیج دیئے جو وہاں دین اسلام کی تبلیغ کرے۔ مجھے امید ہے وہ لوگ مسلمان ہو جائیں گے۔

ہذیل کا لگایا ہوا زخم تازہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے براء کو منفی یا مثبت کوئی جواب نہ دیا۔ ابو براء نے پھر عرض کیا۔ میں اس علاقہ کا ذمہ دار فرد ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا وفد بھیجیے جو وہاں دینِ اسلام کی دعوت پیش کرے۔ ابو براء وہاں کی ان باوقار شخصیتوں میں سے تھا کہ وہ جسے امان دے دیتا اس پر کسی کو ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔

مختصر یہ کہ ابو براء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب بہت زیادہ مصر ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب منذر بن عمرو بنو ساعدہ کے بھائی کی نگرانی میں چالیس عالم و فاضل افراد کا وفد روانہ فرما دیا۔ چنانچہ یہ وفد جب بئر معونہ پر پہنچا جو بنو عامر اور بنو سالم کے حلقے پر مشتمل تھا تو سب سے پہلے امیر وفد نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گرامی نامہ جو عامر بن الطفیل کے نام اور اسے جناب حرام بن ملحان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ بھیجا تھا۔ دشمن اللہ عزوجل اور دشمن رسول مردود عامر بن الطفیل نے اس گرامی نامہ کو کھول کر دیکھے بغیر ہی حرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شہید کر دیا اور اسلام دشمنی میں اس نے ابو براء عامر بن مالک کے ہی قبیلہ کو اپنی مدد کے لئے پکارا تاکہ ان کے ساتھ مل کر اسلام کے عالم فاضل اراکین کو شہید کر دیا جائے مگر انہوں نے اپنی دی ہوئی ضمانت کی بناء پر اس کی مدد کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن اس بدبخت نے دوسرے قبیلے والوں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کو اپنے نرغہ میں لے لیا۔ مجاہدین نے اس صورتحال میں اللہ توکل اپنی مدافعت کے لئے تلواریں سونت لیں لیکن ان چالیس اور بروایت بخاری ستر مجاہدین میں سے صرف دو کو اللہ تعالیٰ نے زندہ رہنے دیا۔ ان میں سے ایک کعب بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے جنہیں بدبخت عامر بن الطفیل نے مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ دوسرے عمرو بن امیہ ضمری جو قیدی بنا لئے گئے جب عامر کو ان کے ضمری ہونے کا پتہ چلا تو ان کی چوٹی کے بال کاٹ کر غلام کی حیثیت سے آزاد کر دیا کہ ایک غلام آزاد کرنے کا قرض اس کی ماں کے ذمہ تھا جو عامر نے اس صورت میں ادا کر دیا۔ کعب بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ پہنچ گئے اور تمام حالات کی اطلاع نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کر

دی۔ جناب عمرو بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب مدینہ کی طرف آ رہے تھے تو ایک مقام (قرقرہ) پر پہنچ کر ایک سایہ دار درخت کے نیچے آرام کرنے کے لئے بیٹھ گئے۔ مدینہ کی طرف سے آنے والے دو شخص بھی اتفاق سے اسی درخت کے نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ گفتگو میں جناب عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ معلوم ہو گیا کہ دونوں شخص اسی کے خاندان سے ہیں جن کا سردار ابوبراء ان کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ جب یہ دونوں ٹھنڈی چھاؤں میں گہری نیند سو گئے تو جناب عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

مگر جب جناب عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ پہنچے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں واقعہ بیان فرمایا تو پتہ چلا کہ وہ دونوں واقعہ ہی ابوبراء کے خاندان سے ہی تھے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی امان پا چکے تھے اس لئے ان کی دیت ادا کرنا واجب تھی وہ ادا کر دی گئی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم غمزدہ ہو گئے

بئر معونہ کے سنگین المیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بہت زیادہ غمگین بنا دیا۔ ارشاد فرمایا یہ سب ابوبراء کی شیطانی حرکت ہے۔ میرے دل میں پہلے ہی سے کھٹکا تھا۔ ابوبراء درحقیقت عامر بن الطفیل کا حقیقی بھائی تھا۔ اس کو اس سے یہ شکایت تھی کہ عامر نے میری ضمانت میں مداخلت کر کے میرا بھرم خاک میں ملا دیا اور اسی شکوہ کی بناء پر ابوبراء نے اپنے بیٹے ربیعہ کے ہاتھ سے عامر بن الطفیل کو جہنم رسید کروا دیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پورا ایک مہینہ فجر کی قیام صلوٰۃ کے بعد دعائے قنوت میں ان کے حق میں بددعا کرتے رہے۔ تمام مسلمانوں کے دل بئر معونہ کے صدمہ سے انتہائی غمزدہ تھے۔ اگرچہ ان کا حوصلہ یہ یقین بھی تھا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جاتے ہیں ان کے لئے فوراً جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔

کفار کے گھر خوشیوں کے ڈھول بجے

منافقین و مشرکین اور کفارِ مدینہ اور یہود جن کے گھروں میں مسلمانوں کی ہر مصیبت پر شادیانے بجانا معمول تھا وہ تو غزوہ احد کے بعد بئر معونہ کے سانحہ جانگداز کو سن کر اور خوشی سے ناچنے لگے۔ اگرچہ حمراء الاسد کا زخم ان کے دلوں میں رستے ناسور کی طرح اب بھی موجود تھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہیبت ان کے دلوں پر اب بھی غالب تھی۔

بنو نضیر کے یہودیوں کا امتحان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دور اندیش مفکر کی حیثیت سے یہ فیصلہ کر لیا کہ اہل مدینہ کے دلوں میں مسلمانوں کی عظمت اور ہیبت ازحد ضروری ہے۔ ورنہ یہودی قبائل یا دوسرے اسلام

دشمن مدینہ میں داخل ہو کر خانہ جنگی کی وبا پھیلا دیں گے لہٰذا ایسا موقعہ آنے سے پہلے ہی شہر میں رہنے والوں کا امتحان لے لیا جائے۔

چنانچہ مدینہ کے یہودی بنو نضیر قبیلہ بنو عامر کے بھی حلیف تھے جن کے دو آدمی شبہ میں حضرت عمرو بن امیہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔

لیکن صورتحال یہ تھی کہ بنو نضیر اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان خیر سگالی معاہدہ بھی تھا۔ اس بناء پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ سے چھ میل کے فاصلہ پر واقع بنو نضیر کی گڑھی میں تشریف لائے تاکہ ان سے مذکورہ مقتولین کی دیت کے متعلق مشورہ کرلیں۔

اس وقت نبیؐ رحمت کل عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ دس صحابی جن میں سرفہرست ابوبکر رضی اللہ عنہ' عمر رضی اللہ عنہ' علی رضی اللہ عنہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو نضیر کو یہ بتائے بغیر ان سے مشورہ طلب کیا کہ بنو عامر کے ایک مقتول کی کیا دیت ہونا چاہئے۔ پہلے تو بنو نضیر اپنی اہمیت اور عزت افزائی سمجھ کر خوشی سے پھول گئے مگر تھوڑی دیر بعد ان کے رویہ میں تبدیلی نظر آنے لگی۔ ان میں سے ایک ٹولہ الگ ہو کر سرگوشیاں کرنے لگا۔ چند ہی لمحوں میں ان سرگوشیوں سے ان کے مقتول سرغنہ کعب بن اشرف کا زخم پھوٹ نکلا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خاموش جائزہ لیتے رہے' نسل آدم میں سے سب سے زیادہ ذہین و عاقل سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام دیکھ رہے تھے کہ یہ لوگ پراسرار انداز میں آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو مشورہ دے رہے ہیں' خطرناک مشورے۔ اس اثناء میں عمرو بن حجاش بن کعب اس گھر میں داخل ہوا جس کی دیوار کے ساتھ سرور دوعالم ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ اس کی آمد اور مشکوک حرکات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیال کو بعض روایتوں کے مطابق وحی نے یقینی بنا دیا۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کو اطلاع دیئے بغیر وہاں سے اٹھ کر مدینہ منورہ واپس تشریف لے گئے۔ اصحاب نے سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قضائے حاجت کے لئے تشریف لے گئے ہیں۔ لیکن یہودی سمجھ گئے کہ ان کا ناپاک منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اب بنو نضیر صحابہ کرام پر اپنے شیطانی منصوبہ کو استعمال کریں یا نہ کریں اس ذہنی کشمکش میں مبتلا ہو گئے۔ اگر ہم نے ایسا کیا تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انتقام لئے بغیر نہیں رہیں گے۔ بنو نضیر کو اب یہ خطرہ بھی تھا کہ اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سلامت لوٹنے کے بعد ہماری سازش کا پول کھول دیں گے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کو اس سازش کا علم ہی نہ ہو۔ بہتر یہ ہے کہ ان کو سلامت جانے دو تاکہ مسلمانوں کے ساتھ ہمارا امن معاہدہ بھی قائم رہے۔ اب بنو نضیر نے مسلمانوں کی چاپلوسی شروع کر دی لیکن وہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے چشم براہ تھے۔ ان کی باتوں پر توجہ دیئے بغیر وہاں سے اٹھے اور مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ راستے میں ان کو مدینہ منورہ سے اس

طرف آتے ہوئے ایک صاحب ملے' ان سے انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے بارے میں دریافت فرمایا تو انہوں نے بتایا۔ وہ مدینہ منورہ کی مسجد میں پہنچ چکے ہیں' تب جا کر ان سب کی جان میں جان آئی اور وہ خوشی سے تیز قدم چلے اور مسجدِ نبوی میں حاضری سے شرف یاب ہوئے۔

اعلانِ جنگ

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کے سامنے بنو نضیر کی سرگوشی اور ایک دوسرے کے ساتھ اشاروں کنایوں اور اس سے ان کی بدنیتی کے مظاہر پر تبادلہ خیال فرمایا۔ سب کے موقع پر موجود ہونے کی وجہ سے صحابہ کرام کے سامنے بھی وہی حقیقت واضح ہو کر سامنے آ گئی۔ جس کا اظہار نبی اکرم ﷺ نے فرمایا اور وحی الٰہی نے جس کی تصدیق فرمائی۔

رسول اللہ ﷺ نے اسی وقت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کے ذریعہ پیغام جنگ بھیجا۔

ان اخرجوا من بلادی لقد نقضتم العھد الذی جعلت لکم بما ھممتم بہ۔ لقد اجلتکم عشراً فمن ریٔ بعد ذلک ضربت عنقه

"ہمارے شہر سے نکل جاؤ۔ تم لوگوں نے اپنے عہد کی خلاف ورزی کی ہے۔ ورنہ دس روز کے بعد تم میں سے جو شخص بھی مدینہ منورہ میں دیکھا گیا اس کی گردن ماری جائے گی"۔

بنو نضیر یہ پیغام سن کر سکتہ میں آ گئے۔ انہیں اس کے سوا اور کوئی جواب سمجھ میں نہ آیا۔ اے ابن مسلمہ رضی اللہ عنہ قبیلہ اوس کے کسی فرد سے ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اپنے حاکم عادل کی طرف سے ایسا پیغام پہنچائے گا۔

بنو نضیر کا یہ اشارہ اس معاہدہ کی طرف تھا جس کی رو سے رسول اللہ ﷺ کے مدینہ میں تشریف لانے سے پہلے قبیلہ خزرج کے خلاف یہود اور اوس ایک دوسرے کے حلیف تھے۔ چنانچہ اس کے جواب میں مسلمہ رضی اللہ عنہ نے یہ فرمایا۔ دلوں کی حالت وہ نہیں رہی۔۔۔۔۔!

منافق ابنِ ابی کی شرارت

بنو نضیر مقابلہ میں آنے پر آمادہ ہو گئے۔ ابن ابی نے موقع دیکھا تو یہود کو شہ دینے کے لئے ان کے پاس اپنے دو ایلچی بھیجے اور کہلا بھیجا۔ خبردار تم ڈر کر مال اور گھر بار چھوڑ کر جلاوطن ہونا منظور نہ کر لینا۔ بلکہ ثابت قدمی سے اپنے قلعوں میں جمے رہنا۔ میرے دو ہزار ماہرین شمشیر بہادر جنگجو اور آس پاس کے قبائل انہی قبیلوں میں تمہاری امداد کے لئے پہنچ رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا شخص نہیں ہوگا جو اپنی زندگی میں مسلمانوں کو تم پر غالب آنے کا موقع دے۔

باطل بوکھلایا

عبداللہ بن ابی کے اس حمایت بھرے پیغام نے بنو نضیر کو اور پریشان کر دیا۔ سب نے مشورہ کیا تو آپس میں فیصلہ کن رائے یہ طے پائی کہ عبداللہ بن ابی بہت جھوٹا ہے۔ اس کے وعدوں کا اعتبار نہ کیا جائے' اس نے بنو قینقاع کو بھی ایسی ہی شہہ دی اور جب وہ نرغہ میں پھنس گئے تو ان کو بے یارو مددگار چھوڑ کر بھاگ گیا۔

انہوں نے اپنے یارانِ ہم مشرب بنو قریظہ کی طرف نگاہ دوڑائی مگر رسول اللہ ﷺ اور بنو قریظہ کے درمیان موجود معاہدہ نے انہیں اس طرف سے مایوس کر دیا۔ انہوں نے یہ بھی سوچا کہ اگر انہیں شہر سے نکلنا پڑا تو وہ خیبر یا مدینہ کے قریب ہی کی کسی بستی میں بسیرا کر لیں گے۔ تاکہ ہم یثرب کے باغات سے پھل حاصل کرتے رہیں۔ ایسی صورت میں اپنے دل میں اپنے لئے خزرج کو زیادہ نقصان وہ نہ سمجھا۔

بنو نضیر کا چودھری بولا

حی بن اخطب بنو نضیر کے سب سے بڑے چودھری نے کہا۔ یہ ہرگز نہیں ہو گا کہ ہم شہر خالی کر دیں۔ ہمیں محمد ﷺ کو جواب میں صاف صاف لکھ دینا چاہئے۔ ہم شہر اور اپنے اموال دونوں میں سے کسی سے بھی دستبردار نہیں ہو سکتے۔ ہمارے خلاف جو چاہیں کر لیجئے۔

اس کے بعد انہوں نے قلعہ بند ہونے کی تیاریاں زور و شور سے شروع کر دیں اور اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ سب اپنے اپنے قلعہ مضبوط کر کے ان میں جم کر بیٹھ جائیں۔ محاصرین پر پتھراؤ کے لئے چھتوں پر زیادہ سے زیادہ پتھر جمع کر کے رکھ لیں۔ یاد رکھو ہمیں اپنے گھراؤ سے کوئی خطرہ نہیں' غلہ کی کوٹھڑیاں بھری پڑی ہیں' جن میں ایک سال تک کی اجناس موجود ہیں۔ پانی کے قدرتی وسائل ہمارے پاس موجود ہیں۔ محمد ﷺ میں اتنی سکت نہیں کہ وہ سال بھر ہمارا محاصرہ رکھ سکے۔ بنو نضیر اپنے سرغنہ حی بن اخطب کے حکم کے مطابق اپنے اپنے قلعوں میں بند ہو گئے مگر مجاہدین نے اپنے وعدہ کے مطابق ان کو دیئے ہوئے دس دن کی مہلت گزرنے کے بعد ہلہ بول دیا۔ ان کے جس گھر پہ مجاہدین حملہ آور ہوتے' وہ اپنے ہی گھر کو خود تباہ کر کے ساتھ کے گھر میں جا چھپتا۔ آخر مجاہدین نے ان کے کھجوروں کے درخت کاٹ کاٹ کر جلانا شروع کر دیئے تاکہ مدینہ سے ان کی اقتصادی دلچسپیاں ختم ہو جائیں۔ جن کی وجہ سے وہ جنگ جاری رکھنے کے لئے یوں قدم جمائے بیٹھے تھے۔

شکست اور اخراج

اس پر یہودی منتیں کرنے پہ اتر آئے اور کہنے لگے اے محمد ﷺ آپ تو دوسروں کو

فساد کرنے سے منع فرماتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ کا ہمارے ہرے بھرے پودوں کو کاٹنا کہاں کا انصاف ہے۔ اس کے جواب میں آیات نازل ہوئیں۔

ماقطعتم من لینۃ او ترکتموھا قائمۃ علی اصولھافباذن اللہ ولیخزی الفاسقین۔ (5:59)

مومنو کھجور کے جو درخت تم نے کاٹ ڈالے یا ان کو اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے تھا اور مقصد یہ تھا کہ وہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔

ادھر ان کی کمک میں نہ تو عبداللہ بن ابی کے دو ہزار شمشیرزن نکلے' نہ قبائل حمایت کو آئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ مقابلہ جاری رکھنے کی صورت میں وہ کہیں کے نہیں رہیں گے۔ اپنے انجام سے خوفزدہ ہو کر خود ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں درخواست پیش کی۔ "رحم فرما کر ہماری اور ہمارے بچوں کی جاں بخشی فرمائی جائے۔ منقولہ سامان ہمیں ساتھ لے جانے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ ہم شہر خالی کر دیتے ہیں"۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ درخواست اس شرط پر منظور فرمائی کہ فی کس ایک اونٹ پر جتنا سامان لاد کر لے جا سکتا ہے لے جائے۔ چاہے وہ کھانے پینے کا ہو یا سامان اور مال کی صورت میں۔

یہود نے اپنے سردار حی بن اخطب کے زیر سایہ مقررہ شرائط کے مطابق مدینہ خالی کر دیا۔ یہاں سے نکلنے کے بعد کچھ لوگ خیبر میں آباد ہو گئے اور کچھ شام کی بستی اذرعات میں منتقل ہو گئے۔

بنو نضیر کے جلاوطن ہونے کے بعد غلہ کی بھری ہوئی کوٹھڑیوں اور باغات و اراضی کے سوا پچاس زرہیں اور تین سو چالیس تلواریں حاصل ہوئیں لیکن یہ اموال اور اراضی اس مد نہیں آ سکتی تھیں جس میں مجاہدین کی شرکت ہو۔ لہٰذا ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کو فیصلہ کرنے کا اختیار تھا۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے غرباء اور مساکین کے لئے زمین کا ایک حصہ وقف فرما دیا۔ اس سے زیادہ جو مال' زمینیں یا باغات بچے وہ سب سے پہلے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لانے والوں میں تقسیم فرما دیا۔ جس کی وجہ سے یہ مہاجرین انصار کی محتاجی سے آزاد ہو گئے البتہ انصار میں سے ابو دجانہ اور جناب سہیل بن حنیف کو ان کی مفلوک الحالی کا حال سن کر مہاجرین کے برابر کا حصہ دے دیا۔ اس موقع پر بنو نضیر میں سے دو حضرات مسلمان ہوئے لہٰذا ان کے مال اور زمین پر کوئی تصرف نہیں کیا۔

رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق بنو نضیر کا جلاوطن ہونا مسلمانوں کی کامیابی کا

سنہری باب ثابت ہوا۔ ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ مدینہ میں بنو نضیر کا وجود فتنوں کا سرچشمہ ہے۔ یہاں تک کہ ماضی میں منافقین جب بھی مسلمانوں کو کسی سیاسی بحران میں مبتلا دیکھتے تو یہود کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے میں کوئی کمی نہ چھوڑتے۔ اس خیال کے مدنظر بھی یہود کا مدینہ سے خروج ضروری تھا کہ اللہ نہ کرے اگر کوئی خارجی قوت اسلام دشمنی میں مدینہ میں داخل ہو گئی تو یہود معاونت سے مدینہ منورہ کا ہر گھر جنگ کا میدان بن جائے گا۔ قرآن حکیم میں ایسے ہی امور کی نشاندہی ان آیات میں فرمائی گئی ہے۔

الم ترالی الذین نافقوا یقولون لاخوانھم الذین کفروا من اھل الکتاب لئن اخرجتم لنخرجن معکم ولا نطیع فیکم احداً ابداً و ان قوتلتم لننصرنکم- واللہ یشھدانھم لکذبون- لئن اخرجو الایخرجون معھم ولئن قوتلو الا ینصرونھم ولئن نصروھم لیولن الا دبار ثم لا ینصرون- لاانتم اشد رھبۃ فی صدورھم من اللہ ذالک بانھم قوم لا یفقھون (59:11 تا 13)

کیا تم نے ان منافقوں کو نہیں دیکھا جو اپنے کافر بھائیوں سے جو اہل کتاب ہیں کہا کرتے ہیں کہ اگر تم جلاوطن کیے گئے تو ہم بھی تمہارے ساتھ نکل چلیں گے اور تمہارے بارے میں کبھی کسی کا کہا نہیں مانیں گے اور اگر تم سے جنگ ہوئی تو تمہاری مدد کریں گے۔ مگر اللہ تعالیٰ ظاہر کر دیتے ہیں کہ یہ جھوٹے ہیں۔ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور اگر ان سے جنگ ہوئی تو ان کی مدد نہیں کریں گے اور اگر مدد کریں گے تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے پھر ان کو کہیں سے بھی مدد نہیں ملے گی۔ مسلمانو تمہاری ہیبت ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ سے بھی بڑھ کر ہے۔ یہ اس لئے کہ یہ لوگ سمجھ نہیں رکھتے۔

سورۃ حشر میں ان آیات سے ذرا بعد اللہ عزوجل کے ساتھ ایمان الہ العالمین کی حکمرانی سے متعلق جو آیات ہیں جب تک ان کا مفہوم ایمان کا جزو لاینفک نہ بن جائے ان کی قدر و قیمت واضح نہیں ہو سکتی۔

ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو عالم الغیب والشھادہ ھو الرحمن الرحیم- ھو اللہ الذی لا الہ الا ھو الملک القدوس السلام المومن المھیمن العزیز الجبار المتکبر سبحان اللہ عما یشرکون- ھو اللہ الخالق الباری المصور لہ الاسماء الحسنی- یسبح لہ ما فی السموات والارض وھو العزیز الحکیم- (59:20 تا 24)

وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں پوشیدہ اور ظاہر کو جاننے والا وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔ وہی اللہ تعالیٰ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ حقیقی بادشاہ ہر

عیب سے پاک ذات سلامتی اور امن دینے والا نگہبان' غالب' زبردست لڑائی والا۔ اللہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔ وہی اللہ تمام کائنات و مخلوقات کا خالق' ایجادو اختراع کرنے والا صورتیں بنانے والا اس کے سب اچھے سے اچھے نام ہیں۔ جتنی چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اس کی تسبیح کرتی ہیں وہ غالب حکمت والا ہے۔

رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے یہودی محرر

اب تک رسول اللہ ﷺ کا محرر یہودی نوجوان تھا جو آنحضرت ﷺ کی طرف سے سریانی اور عبرانی زبانوں میں خط و کتابت کیا کرتا تھا۔ اس خیال کے پیش نظر کہیں یہ ہمارے رازوں سے واقف نہ ہو جائے ایک مسلمان کو اپنا محرر مقرر فرمایا۔

گویا کسی غیر مسلم پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا گیا۔ اسے مصلحت کے خلاف سمجھ کر رسول اللہ ﷺ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو عبرانی اور سریانی زبانیں سیکھنے کا حکم دیا اور انہوں نے چند ہی دنوں میں یہ قابلیت حاصل کر لی۔ زید رضی اللہ عنہ کاتب وحی بھی تھے۔ عہد صدیقی میں انہیں کی نگرانی میں قرآن مجید مدون ہوا۔ اور جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں بعض الفاظ کی قرآت میں اختلاف کا اندیشہ محسوس کیا گیا تو جناب زید رضی اللہ عنہ ہی نے وقتِ نظر کے بعد قرآن مجید کے ایک ایک حرف کی جانچ پڑتال کی۔ متعدد نقلیں خلافت کی طرف سے دوسرے صوبوں میں بھجوا دیں اور صحیح نسخوں کے سوا باقی نسخے جلوا دیئے گئے۔ (صحیح سے مراد اختلافِ قرآت ہے عبارت نہیں)

مدینہ منورہ میں سکون

الغرض یہودیوں (بنو نضیر) کا مدینہ سے نکل جانا امن و سکون کی بہار ثابت ہوا۔ اب نہ مسلمانوں کو منافقوں کا ڈر تھا نہ مہاجرین کو افلاس کا ڈر تھا۔ انہیں بنو نضیر کی زمینوں اور باغات نے خوشحال کر دیا اور انصار کے دل خوشی سے اس لئے لبریز تھے کہ ان کے مہاجر بھائی اب بے فکری کی زندگی بسر کرنے پہ قادر ہو گئے ہیں۔ یوں کہئے کہ اب انصار اور مہاجر دونوں ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر مساویانہ مسرتوں بھری زندگی بسر کر رہے تھے۔

پھر کفار کا پیغام جنگ

پرسکون حالات گزر رہے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے تصور میں غزوہ احد کے بعد گزرنے والے وقت کی مدت ابھری تو معلوم ہوا سال گزرنے کو ہے اور اس کے ساتھ ہی ابوسفیان کا وہ جملہ بھی کانوں سے ٹکرایا جو اس نے غزوہ احد سے جاتے ہوئے بلند آواز میں کہا

تھا۔

یوم بیوم بدر والموعد العالم القبل۔

بدر کا انتقام تو لے لیا گیا۔ آئندہ سال پھر معرکہ ہو گا۔

اس اثناء میں ابو سفیان نے مکہ سے نعیم کو ایسی پٹی پڑھا کر بھیجا کہ اس افواہ سے مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں۔ اس نے گھر گھر میں جا کر یہ کہنا شروع کر دیا کہ اب کے قریش نے ایسا لشکر جمع کیا ہے کہ عرب میں موجود کوئی قوم اس لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ابو سفیان نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب کے مسلمانوں پر غزوۂ احد سے بھی زیادہ سختی کی جائے۔

مسلمان کچھ حیران ہو گئے۔ بہت سے مسلمان اس بات کے خواہشمند تھے کہ اس دفعہ مقام بدر کو آنکھوں سے بھی نہ دیکھا جائے مگر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسلمانوں کی پست ہمتی کا پتہ چلا تو ناراضگی کا اظہار فرماتے ہوئے اللہ عزوجل کی قسم کھا کر فرمایا۔ اگر مجھے میدانِ بدر میں تنہا بھی جانا پڑا تو انشاء اللہ قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔

مجاہدین کو بدرِ ثانی میں جانے کی تاکید

ہادیٔ برحق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اتنی سختی اور تاکید کا ردِ عمل یہ ہوا کہ تمام مجاہدین اسلحہ کی فراہمی میں مشغول ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ پر عبداللہ بن ابی سلول کو امیر مقرر فرمایا اور بدر کی طرف کوچ فرمایا جہاں جھنڈے گاڑ کر کفار کا انتظار کیا جائے گا۔

کفار کا بدرِ ثانی میں آنا

ابو سفیان کفار کا تقریباً دو ہزار اشخاص پہ مشتمل لشکر لے کر نکل آیا۔ لیکن سب کی بہادری کی ہمت کا یہ حال تھا کہ دو روز کا سفر طے کرنے کے بعد ہر ایک پاؤں توڑ کر بیٹھ گیا۔ ابو سفیان نے اپنے جانثار دوستوں سے کہا۔

یا معشر قریش انه لایصلحکم الاعام خصیب وان عامکم هذا جدب فانی راجع فارجعوا۔

اے قریشیو۔ تم لوگ خوشحالی کے زمانہ میں جنگ کر سکتے ہو۔ یہ سال خشک سالی کا ہے۔ میں تو واپس جا رہا ہوں۔ آؤ تم بھی واپس ہو جاؤ۔

ابو سفیان تو اپنے لاؤ لشکر کو لے کر چلا گیا لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مجاہدین کے ساتھ آٹھ دن تک بعد میں بھی انتظار کرتے رہے ہو سکتا ہے کفار لوٹ آئیں مگر جب کوئی نہ لوٹا تو وہاں سے کوچ فرمایا۔ بدر ان دنوں میں تجارت کا بازار بھی تھا۔ مجاہدین نے ان آٹھ دنوں میں کم یا زیادہ تجارت میں منافع بھی کمایا۔ اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے مجاہدین مدینہ منورہ میں خوش

اور مسکراتے ہوئے داخل ہوئے۔ ان کا سب کچھ اللہ کا فضل و کرم اور اس کی نعمتیں ان کے ساتھ تھیں۔ اس واقعہ کے بارہ میں آٹھ آیات نازل ہوئیں۔

(1)الذین قالوا لاخوانھم وقعدوا لو اطاعونا ما قتلوا۔ قل فادرءوا عن انفسکم الموت ان کنتم صادقین۔ (3-168)

وہ لوگ (جو خود تو گھروں میں بیٹھے رہے) لیکن اپنے بھائیوں کو کہتے ہیں اگر ہماری بات مان لی جاتی تو کیوں مارے جاتے۔ اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ) ان سے آپ کہہ دیجئے اگر تم واقعہ ہی سچے ہو تو موت کو اپنے اوپر سے ٹال دینا۔

(2)ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتاً بل احیاء عند ربھم یرزقون۔ (3-169)

جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے انہیں مردہ نہ سمجھنا (وہ مرے ہوئے نہیں ہیں) بلکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک زندہ ہیں اور ان کو رزق مل رہا ہے۔

(3)فرحین بما اتٰھم اللہ من فضلہ ویستبشرون بالذین لم یلحقوا بھم من خلفھم الا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔(۳ : ۱۷۰)

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان کو بخش رکھا ہے اس میں خوش ہیں اور جو لوگ ان کے پیچھے رہ گئے (اور شہید ہو کر) کہ قیامت کے دن ان کو بھی نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی وہ غمناک ہوں گے۔

(4)یستبشرون بنعمۃ من اللہ وفضل وان اللہ لا یضیع اجر المومنین۔(۳ : ۱۷۱)

اللہ تعالیٰ کے انعامات اور فضل سے خوش ہو رہے ہیں اور اس حقیقت کو دیکھ کر کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

(5)الذین استجابوا للہ والرسول من بعد ما اصابھم القرح۔ للذین احسنوا منھم واتقوا اجراً عظیم۔

اور وہ لوگ جنہوں نے زخم کھانے کے باوجود اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ) کا حکم مانا۔ ان میں جو لوگ نیکوکار اور پرہیزگار ہیں ان کے لئے بڑا ثواب ہے۔

(6)الذین قال لھم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایماناً وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

جب ان لوگوں نے آ کر بیان کیا کہ کفار نے تمہارے مقابلہ کے لئے بہت بڑا لشکر جمع کر رکھا ہے سو ان سے ڈرو تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔

(7)فانقلبوا بنعمۃ من اللہ وفضل لم یمسسھم سوء واتبعوا رضوان اللہ واللہ ذو فضل عظیم۔

پھر وہ اللہ کی نعمتوں اور اس کے فضل کے ساتھ خوش و شاداں واپس آئے ان کو کسی طرح کا ضرر نہ پہنچا اور وہ اللہ تعالیٰ کی خوشی کے تابع رہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل کا مالک ہے۔

(8)انما ذلکم الشیطان یخوف اولیاءہ فلا تخافوھم وخافون ان کنتم مومنین۔

یہ خوف دلانے والا تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے۔ تو اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرنا اور مجھ سے ہمیشہ ڈرتے رہنا۔ (۳ : ۱۷۴ تا ۱۷۵)

کفارِ مکہ جو مسلمانوں سے ہیبت کھا کر لوٹ گئے تھے اس سے مجاہدین کے غزوۂ احد کا کچھ غم ہلکا ہوا۔ کافروں کا اس طرح لوٹ جانا ان کے لئے بدر کی پہلی شکست کے ہی مترادف تھا لیکن اس کے باوجود کافر آنے والے سال میں جنگ کرنے کے منصوبہ سے غافل نہ تھے۔

ذات الرقاع

رسول اللہ ﷺ بدرِ ثانیہ سے واپسی کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و نصرت پر پورے مطمئن تھے۔ آنحضرت ﷺ کے دل میں قریشِ مکہ (کفار) پر ایمان والوں کا رعب بیٹھ جانے سے بھی بے حد خوشی تھی لیکن ساتھ ہی تحفظِ دین سے بھی غافل نہ تھے۔ اور ہر طرف اپنے جاسوس پھیلا دیئے تھے۔

اس اثناء میں خبر ملی کہ بنو غطفان مدینہ پہ حملہ کرنے کے لئے نجد میں جمع ہو رہے ہیں۔ ایسے مواقع پر رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل یہ تھا کہ دشمن کی ایسی غفلت میں اس پر حملہ آور ہوتے کہ اسے مدافعت کا موقع ہی نہ ملتا۔ چنانچہ یہ خبر ملتے ہی رسول اللہ ﷺ چار سو مجاہدین کو ساتھ لے کر بنفسِ نفیس نکلے۔ جہاں دشمن نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا وہاں تشریف لائے تو دیکھا کہ بنو محارب اور بنو ثعلبہ (غطفانی) دونوں جمع ہو رہے تھے، جیسے ہی ان کی نظر مجاہدین پر پڑی تو سامان ایک طرف رہا عورتوں کو بھی چھوڑ کر اپنے گھروں کو بھاگ نکلے۔ ان کے مال میں سے (عورتوں کو چھوڑ کر) جتنا مجاہدین اٹھا سکے اٹھا کر مدینہ کی طرف کوچ فرمایا۔ مجاہدین دشمنوں کے خوف کی مدافعت میں صلوٰۃ خوف ادا فرماتے۔ جس کا طریق یہ ہوتا کہ مجاہدین کا ایک حصہ رسول اللہ ﷺ کے اقتداء میں نیت باندھ کر مصروفِ قیام ہوتا تو دوسرا نگرانی کرتا۔ اس کے بعد نگرانی کرنے والے مجاہدین قیامِ صلوٰۃ کرتے پہلے مجاہدین نگرانی کرتے۔ پندرہ دن کا سفر کرتے ہوئے نبی اکرم ﷺ اور مجاہدین واپس مدینہ میں تشریف لے آئے۔

غزوہ دومتہ الجندل

دومتہ الجندل بحیرہ احمر (قلزم) سے خلیج فارس کی طرف اور شام حجاز کے مقامِ اتصال پر واقعہ ہے۔ جہاں اطلاع ملنے پر رسول اللہ ﷺ مجاہدین کے ساتھ اچانک تشریف لے گئے۔ مجاہدین کا آمنا سامنا ہوتے ہی سب کے سب سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگے۔ ان پر ایسی وحشت چھائی کہ اپنا سامان بھی وہیں چھوڑ دیا۔ مجاہدین نے اسے اپنے قبضہ میں لے لیا۔

جغرافیائی حیثیت سے اگر جائزہ لیا جائے تو دومتہ الجندل کا فاصلہ اور محلِ وقوع دشمنوں کے حق میں زیادہ بہتر ہونے کے باوجود ان کا ڈر کر بھاگنا اس بات کا ثبوت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی دھاک کفار کے دلوں پر کیسی بیٹھ گئی تھی۔

عرب کا بچہ بچہ قسم کھانے پر مجبور ہو گیا کہ مجاہدین اسلام دینِ اسلام کے تحفظ اور اشاعت کے لئے انتہائی استقلال اور ثابت قدمی میں اپنی مثال آپ ہیں۔ مسلمان اپنے اس فریضہ کو انجام دیتے ہوئے نہ تو موسم کی شدت سے گھبراتے ہیں نہ خشک سالی ان کے راستے کی دیوار بنتی ہے۔ نہ ہی پانی کی کمی ان کے حوصلوں کے آڑے آتی ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ ان کے بے مثال استقلال اور استحکام کا سب سے بڑا اور مرکزی ذریعہ ان کی وہ معنوی قوت تھی جس نے ان کا ایمان اللہ وحدہ لاشریک سے ایسا مربوط کر دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کسی کو قولاً' فعلاً' خیال یا تصور میں بھی کسی کو شریک نہیں ٹھہراتے تھے۔ بس یہی عقیدہ ان کی سب سے بڑی قوت تھی۔ آج 5 ہجری سے رسول اللہ ﷺ کو مدینہ منورہ میں اللہ تعالیٰ نے سکون و اطمینان بخشا ہے۔ اس میں صرف کفارِ مکہ کی طرف آنے والے سال میں حملہ کی دھمکی کا خیال کبھی کبھی ضرور آپ ﷺ کو متردّد کرتا۔ لیکن اس زمانہ میں نبی الخاتم ﷺ اس اسلامی اجتماعی نظام کو ترتیب دینے میں مشغول رہے۔ جس میں ابھی محدود تعداد شامل تھی لیکن اس نظام کو مستقبل میں کئی کروڑوں انسانوں مشتمل معاشرہ کی اساس بننا تھا۔ اور اسے رسول اللہ ﷺ نے اپنی کمال حکمت و تدبر تفکر و ذہانت سے ترتیب دے لیا۔ اس ترتیب میں وحی الٰہی کی راہنمائی اور تعلیم بھی بنیادی طور پر شریک تھی تاکہ اگر کوئی معاملہ اللہ تعالیٰ کی چاہت کے خلاف ہو تو رسول اللہ ﷺ کو فوراً آگاہ کر دے۔ چنانچہ ایسے مواقع پر رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں آنکھ جھپکنے جتنی بھی دیر نہ فرماتے۔

وانہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ تنزیل من حکیم حمید۔ (42:41)

یہ ایک عالی مرتبہ کتاب (قرآن) ہے۔ اس پر جھوٹ کا دخل نہ آگے سے ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ یہ دانا اور خوبیوں والے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل فرمائی گئی ہے۔

ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن

ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن

گزری ہوئی دو فصلوں (پندرہ اور سولہ) میں جن واقعات و حادثات کا ذکر گزرا ہے ان ہی واقعات کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "ایک کے بعد ایک" زوجہ کو اپنے حبالہ عقد میں

آنے کا شرف بخشا۔ (1) ام المومنین زینب بنت خزاعہ رضی اللہ عنہا
(2) ام المومنین ام سلمہ بنت امیہ ابن المغیرہ رضی اللہ عنہا
(3) ام المومنین زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا

زینب بنتِ جحش کی پہلی شادی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے مشورہ سے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ہوئی تھی لیکن زید بن حارثہ غلام تھے' ام المومنین خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے مال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خرید کر آزاد کر دیا تھا اور آزاد کرنے کے بعد اس کی شادی زینب بنت جحش سے کر دی گئی۔ اس شادی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنا متبنیٰ بنا لیا تھا۔

شادی کے بعد حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کا آپس میں نباہ نہ ہو سکا۔ اور حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو طلاق دے دی۔ اس کے بعد (شرعی اصول کے تحت) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو اپنی زوجیت میں لینے کا شرف بخشا۔ اس پر مسیحی مبلغین نے بہت یاوہ گوئی کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں تھے تب تک وہ بہت زیادہ قناعت کے علمبردار تھے۔ زبردست زہد کے حامل' توحید کے مدعی' اور خواہشاتِ دنیا سے لاتعلق تھے۔ لیکن مدینہ پہنچ کر یہ حالت نہ رہی۔ اب عورتیں ان میں اپنی رغبت و شوق کو ابھارنے میں کامیاب رہیں۔ حتیٰ کہ پہلی تین بیویوں پر بس نہیں بلکہ ان تین کے بعد اور تین حرم میں داخل کر لیں۔ نہ صرف یہ کہ ایسی عورتوں سے نکاح کئے جن کے سر پر شوہر نہ تھے بلکہ شوہر والی بیوی سے طلاق دلوا کر اپنے حبالہ عقد میں لانا شروع کر دیا' جیسے کہ زینب بنت جحش کا واقعہ ہے۔

حقیقت حال

اس واقعہ کی حقیقت اس طرح ہے کہ ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ وہ گھر میں موجود نہ تھے۔ ان کی اہلیہ زینب رضی اللہ عنہا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا۔ اس وقت یہ پر تکلف لباس میں تھیں۔ انہیں اس لباس میں دیکھ کر (دروغ برگردن راوی) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنگاہ تحسین فرمایا۔ "سبحان اللہ

مقلب القلوب" اور واپس تشریف لے آئے۔ یہ کلمہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے بھی سن لیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس پر مہربان ہیں تو انہوں (زینب رضی اللہ عنہا) نے اپنے دل میں ایک آرزو پیدا کرلی۔ جب حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھر تشریف لائے تو انہوں نے پورا واقعہ حرف بحرف سنا دیا۔ زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔ میں زینب رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کو تیار ہوں۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرو طلاق نہ دو۔ لیکن اس وقت سے زینب رضی اللہ عنہا حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لاتعلق ہو گئیں جس سے مجبور ہو کر حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو طلاق دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دل سے اگرچہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے عقد کے خواہاں تھے مگر اس معاملہ میں کوئی بات زبان پر نہیں لاتے تھے۔ (دروغ برگردن راوی) وحی نازل ہوئی۔

واذ تقول للذی انعم اللہ علیہ وانعمت علیہ امسک علیک زوجک واتق اللہ وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس واللہ احق ان تخشاہ فلما قضیٰ زید منہا وطر زوجنکہا لکی لا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیائہم اذا قضوا منہن وطرا ؕ وکان امر اللہ مفعولا۔

اور جب تم اس شخص سے جس پر اللہ تعالیٰ نے احسان کیا اور تم نے بھی احسان کیا یہ کہتے تھے کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دو اور اللہ تعالیٰ سے ڈر اور تم اپنے دل میں وہ بات پوشیدہ رکھتے تھے جس کو اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اس سے ڈرو۔ پھر جب زید نے اس سے کوئی حاجت متعلق نہ رکھی (یعنی اس کو طلاق دے دی) تو ہم نے تم سے اس کا نکاح کر دیا تاکہ ایمان والوں کے لئے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (کے ساتھ نکاح کرنے کے بارہ میں) جب وہ ان سے اپنی حاجت متعلق نہ رکھیں (یعنی طلاق دے دیں) کچھ تنگی نہ رہے اور اللہ کا حکم واقع ہو کر رہنے والا تھا۔

(دوسری کی کتابوں میں ثابت کیا گیا ہے۔ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حضرت زینب کو اعلیٰ لباس میں ملبوس دیکھ کر رغبت کرنا اور ان سے نکاح کی خواہش کرنا سب غلط ہے "مترجم) (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی کے گھر جاتے تین بار دستک دیتے کوئی جواب نہ ملنے پر واپس آ جاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی عورت کو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے۔)

مستشرقین اس کے بعد ------- لکھتے ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمالیا۔ اور انہیں دار النبوت علیہ السلام میں لے آئے۔ سوال یہ ہے کہ آپ عجیب قسم کے نبی ہیں جو خود تو دوسروں کو معاملات میں منصفانہ توازن کو ترجیح

دینے کا حکم دیتے ہیں۔ آخر وہ خود اس قانون کی پابندی کیوں نہیں کرتے جس قانون سے متعلق انہیں مرسل من اللہ ہونے کا دعوی ہے۔ ان کے حرم سرائے میں عورتوں کا ہجوم۔ جو صرف ہوس ناک امراء کے محلوں میں ہو سکتا ہے۔ نہ کہ انبیاء کے حرم میں۔ جو خود نیک طینت ہونے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی اصلاح کے داعی ہوں تعجب ہے کہ نبوت کی خلعت کا اعزاز رکھتے ہوئے زینب رضی اللہ عنہا کی محبت کے اس قدر دل دادہ کیوں ہو گئے کہ آپ کی وجہ سے آپ کے غلام زید بن حارثہ کو اپنی بیوی سے آئینی علیحدگی اختیار کرنا پڑی۔ اور اسے اپنے حبالہ نکاح میں لے آئے۔ اپنے متبنٰی کی بیوی سے زمانہ جاہلیت میں نکاح کی اجازت نہ تھی لیکن مسلمانوں کے نبی نے ان تمام حدوں سے گزر کر اپنے لئے جائز قرار دے لیا جو صرف نفسانی متابعت پر مبنی ہو سکتا ہے۔

مستشرقین کو جواب

مسیحی منادیا مستشرقین اعتراض کرتے وقت خود تراشیدہ تصورات میں ایسے اندھے ہو کر بسنے لگے ہیں۔ جیسے آندھی کے سامنے تنکا! معترضین کا ایک ٹولہ سے کہتا ہے کہ آنحضرت ﷺ نے انہیں نیم برہنہ دیکھا۔ یا بالکل عریاں دیکھ لیا۔ اس حالت میں کہ ان کی سیاہ زلفیں ان کے سیمیں بدن پر بکھری ہوئی تھیں، جس سے ان کے دل میں ان کی محبت پیدا ہو گئی۔

دوسرا ٹولہ کہتا ہے۔ کہ جس وقت انہوں نے از خود زینب رضی اللہ عنہا کا دروازہ کھولا تو شب باشی کا لباس پہنے پلنگ پر سو رہی تھیں۔ آنحضرت نے انہیں دیکھ لیا مگر راز دل میں چھپائے رکھا لیکن تا کیے

اگرچہ ولیم میور، درمنگھم، واشنگٹن ارونگ، لامینس (وغیرہ) اور واغطین کلیسا میں سے ہر ایک مسیحی علمبردار ہے! لیکن جب ان اعتراضات کی تحقیق اور عدل و انصاف سے علم و دانش کی روشنی میں معاملات جانچنے والے کرتے ہیں تو انگشت بدنداں نظر آتے ہیں۔ مستشرقین نے بقول ان کے سیرت اور حدیث کی کتابوں کو اپنا ماخذ تو بنایا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ اور آپ کے حرم کے بارے میں ایسی مرویات کو اختیار کیا جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اور جن پر عدل و تحقیق دونوں نے سر پیٹ لیا۔ ان نکتہ چینوں کو رسول اللہ ﷺ کا ایک اصولی جواب یہ دے سکتے ہیں کہ اس میں مضائقہ بھی کیا ہے؟ اس میں خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ و السلام کی عظمت میں کیا فرق آ سکتا ہے۔ جب کہ قانون میں بعض مستثنیات ایسی بھی تسلیم کی جاتی ہیں۔ جیسے کہ ہر کلیہ میں استثناء تسلیم شدہ اصول ہے۔ جو عوام کی طرح

خواص یا جلیل المنزلت پر چسپاں نہیں ہو سکتیں۔

(1)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک اسرائیلی اور قبطی کو ہاتھا پائی کرتے دیکھا تو غصہ میں قبطی کو مکہ مارا وہ ہلاک ہو گیا۔ ظاہر ہے اس قسم کا قتل جنگ یا جنگ جیسی کی حالت میں بھی روا ہو سکتا ہے۔ کیا فرماتے ہیں جناب محمد ﷺ پر اعتراض کرنے والے کیا موسیٰ علیہ السلام کے لئے قتل روا تھا یا ناجائز؟ کیا حضرت کلیم اللہ کی نبوت و عظمت اس طرح داغدار نہیں ہو سکتی۔ جس طرح آپ نبی اکرم ﷺ علیہ السلام پہ طعن کر رہے ہیں۔

(2)۔ اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا معاملہ لیجئے یا موسیٰ علیہ السلام کا متذکرہ واقعہ تصور کیجئے بلکہ جناب محمد ﷺ پر اعتراض کا معاملہ، تمام انبیاء اور مرسلین کے کوائف سب حیران کن نہیں اور نہ ہی ان اعتراضات کی کسی قانون و شریعت اور حدود معاشرہ میں جواز کی دلیل مل سکتی ہے۔ چنانچہ مسیح ابن مریم کی ولادت کی صفائی میں مسیحیوں نے دلیل پیش کرتے ہوئے جو کچھ کہا وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تعالیٰ کی پاک روح انسانی روپ میں مریم عذرا سے یہ کہہ کر ہم کنار ہوئی کہ وہ ان کے رحم میں ایک پاک نہاد بچے کا نطفہ رکھے گا جسے سن کر مریم نے روحِ رحمانی سے کہا۔ سبحان اللہ میرے بطن سے فرزند متولد ہو گا؟ جسے مرد نے چھوا تک نہیں۔ روح رحمان نے کہا۔ "مرد نے بیشک چھوا تک نہیں مگر خداوند خدا کا ارادہ یہی ہے کیونکہ وہ اس مولود کو اپنی خاص نشانی بنانا چاہتا ہے۔

جب مریم علیہ السلام پر وضعِ حمل کی کیفیت طاری ہوئی تو وہ حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔ اس ندامت کے عالم میں ان کی زبان سے یہ جملے بھی نکلے۔ "کاش ان لمحوں سے پہلے مجھے موت آ جاتی۔ اور دنیا نے مجھے بھلا دیا ہوتا۔ اس وقت بھی روح مقدس (رحمٰن) نے مریم علیہ السلام کے کانوں میں یہ بات پہنچائی۔ آپ اس قدر غمگین کیوں ہو رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قدموں تلے پانی کا چشمہ جاری کر دیا ہے۔

پھر جب مریم علیہ السلام بچے کو لیکر باہر نکلیں تو لوگوں کو دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ ان کے سر پر شوہر تو ہے نہیں یہ بچہ کہاں سے آ گیا؟ لوگوں نے اس حیرانی میں مریم علیہ السلام سے کہا۔ سبحان اللہ یہ انہونی شے آپ کہاں سے لے آئیں۔ اس کا جواب مریم علیہ السلام کی بجائے اس نومولود نے دیا۔ "میں اللہ تعالیٰ کا غلام ہوں جس نے مجھے اپنی کتاب انجیل عطا فرمائی اور میں جہاں بھی رہوں مجھے بابرکت بنایا اور جب تک زندہ رہوں مجھے نماز و زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا"

یہود کا حضرت مسیح پر اعتراض

یہ ہے مسیحی مسلمات کے مطابق حضرت عیسیٰ ابن مریم کی داستانِ ولادت جس پر یہودیوں

نے برملا کنواری مریم پر یوسف نجار کا الزام تھوپ دیا۔ جیسا کہ "رنیان" اور موجودہ زمانہ کے دوسرے یہودی مصنفوں کا حال ہے۔ ان کے دشمن کچھ کہیں لیکن عیسیٰ علیہ السلام کی عظمت و رسالت اس امر کی ضامن تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے اثبات کے لئے قانونِ فطرت میں تبدیلی کر دی۔

لیکن ایک طرف تو مسیحی مبلغین کا یہ تقاضہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلافِ فطرت پیدا ہونے کے معجزہ کی بناء پر تمام عالم صرف انہی کو اللہ تعالیٰ کا آخری نجات دہندہ تسلیم کرلے اور اگر اس قسم کی استثنائی صورت جناب محمد ﷺ کے متعلق پائی جائے اور عام قانون سے مختلف نظر آتی ہو تو مسیحی حضرات اس پر اعتراض اور مواخذہ کرنا اپنا فرض منصبی قرار دے لیں حالانکہ دنیا کی ممتاز شخصیتیں بعض حالات میں معاشرہ کے عام قانون سے مستثنیٰ ہیں۔ ہم اس دعوے کا پھر اعادہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حاسدانِ محمد ﷺ کے اعتراضات کے اور جواب بھی دیئے جا سکتے ہیں لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ ہے کہ مسیحی مبلغین اور ان کے مستشرقینِ اہلِ قلم دونوں کا ایسا اندازِ کفر تاریخ کا سب سے بڑا گناہ ہو گا۔ جس سے جناب محمد ﷺ کی عظمت و رسالت کی ناقابلِ تسلیم توہین کا ارتکاب ہو گا۔ خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام معترضین کے تصورات کے مطابق ایسے نہ تھے کہ آپ کی عقل و دانش بے جا محبت کا شکار ہو جاتی۔ جبکہ نبی اکرم ﷺ نے کسی بی بی کو صرف محبت کی بنا پر اپنے حرم سرا میں شامل نہیں ہونے دیا۔ ممکن ہے بعض مسلمان سیرت نگار رسول اللہ ﷺ کے متعلق اس قسم کے مفروضہ تصورات پیش کرتے ہوں تو پھر اسے ان کے ذاتی دیوالیہ پن کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔ ایسے مسلمانوں نے بھی دشمنانِ اسلام کے ہاتھ مضبوط کر دیئے۔ اگرچہ ان میں ان کی نیک نیتی ہی سہی۔ اس قسم کے مسلمان مصنفوں نے اس درجہ کی گھٹیا باتیں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ قدس سے منسوب کر کے عشقِ رسول میں حاصل کردہ کمال کا تحفہ حاصل کرنا چاہا۔ حتیٰ کہ شہوت دنیا جیسی ادنیٰ خصلت بھی رسول پاک ﷺ سے منسوب کر دی گئی حالانکہ رسول اللہ ﷺ کا دامن اس سے "قطعاً" مبرا ہے۔

یعنی نبی اکرم ﷺ کا رات کے وقت حضرت زید رضی اللہ عنہ کے گھر جانا اور خود ام المومنین زینب رضی اللہ عنہا کا ایسے لباس میں آپ ﷺ کے سامنے آنا ایسا جھوٹ ہے جو انسانی تاریخ میں سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ طلاق کے واقعات کی نوعیت اور تھی۔ البتہ نکاح کے لئے اللہ تعالیٰ کا حکم معاشرہ میں اصلاح کی بنیاد قائم کرنا تھا اور بتانا تھا کہ کسی دوسرے کی اولاد تمہاری اولاد نہیں کہلا سکتی۔ تمہاری مائیں وہی ہیں جنہوں نے تمہیں اپنی کوکھ سے جنا ہو۔

انتخابِ حرم اور رسول اللہ ﷺ

زندگی کی تیسویں بہار میں آنے پر براہ راست نہیں بلکہ نفیسہ کے کہنے پر ام المومنین خدیجتہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا۔ اس وقت عمر کے اعتبار سے آپ ﷺ عالم شباب میں تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ام المومنین رضی اللہ عنہا کے ساتھ اٹھائیس سال گزارے۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا کی وفات کے وقت آپ ﷺ کی عمر پچاس سال سے آگے بڑھ چکی تھی۔ عرب میں تعدّدِ ازدواج کا عام رواج تھا مگر آنحضرت ﷺ کے حرم میں صرف ایک خاتونِ محترم تھیں۔ ان کے بطن سے کئی فرزند پیدا ہوئے مگر کوئی زندہ نہ رہ سکا۔ چار بیٹیاں پیدا ہوئیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے چاروں زندہ رہیں اور بیٹے زندہ نہ رہنے کی وجہ سے دوسری شادی کرنے میں کوئی امرِ شرعی یا اخلاقی مانع نہ تھا۔ جبکہ عرب میں بیٹیوں کو زندہ درگور کر دینے کا دستور شرافت و نجابت میں داخل تھا۔ عرب بیٹوں کی زندگی پر اپنی جان نچھاور کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے خدیجہ رضی اللہ عنہا کی معیت میں نبوت سے پہلے سترہ سال اور بعثت کے بعد گیارہ سال زندگی گزاری۔ کل مدت اٹھائیس برس ہوتی ہے۔ صدی کے اس چوتھائی حصہ میں بھی نبی اکرم ﷺ نے کسی دوسری عورت کو اپنے حرم میں رکھنا گوارا نہ فرمایا۔ نہ کبھی اس 28 اٹھائیس سالہ زندگی میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس قسم کے خیال کا اظہار ہی ہوا۔ حالانکہ وہ زمانہ جو آنحضرت ﷺ کا خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رفاقت میں گزرا عورتوں کی بے حجابی کے فتنوں کا زمانہ تھا۔ جو گھروں سے نکلتیں تو اس طرح بن ٹھن کر نکلتیں کہ دیکھنے والے تڑپ جاتے لیکن دینِ اسلام نے اس کو حرام قرار دے دیا۔ اسے حرام قرار دینے والے اللہ کے حکم کو نافذ فرمانے والے خود رسولِ کائنات محمد ﷺ تھے۔ آپ خود ہی سوچئے مذکورہ سطور میں مسیحی اہلِ قلم کا نبی اکرم ﷺ پر بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے بارے میں رغبت کا اتہام نہیں تو کیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کے سن کا پچاسواں سال اور ایسا خیال غیر طبعی نہیں تو کیا ہے؟ اور پھر بی بی زینب رضی اللہ عنہ نے اس پچاس سالہ مقدس ہستی کے بارے میں اپنی جگہ متصور کر لیا ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس نظر سے دیکھا۔ (نعوذ باللہ من ذالک) وہ بھی اس صورت میں جبکہ حرم نبوی میں پانچ بیویاں موجود ہوں۔ جن میں حضرت عائشہ جیسی نیک نہاد اہلیہ جن کی درازی عمر کی تمنا نبی اکرم ﷺ کے دل میں ہمیشہ رہی ہو لیکن زینب رضی اللہ عنہا کے بارے میں آپ کے قدم ڈگمگا گئے ہوں، بالکل غیر طبعی امر ہے۔ جبکہ پانچ سال میں آپ کے حرم میں 5 بیویاں اور سات برس میں 9 بیویاں ہوں۔ غرض مذکورہ تمام اعتراضات جاہل مسلمان سیرت نگار اور عیار فرنگی مؤرخین دونوں کی طرف سے آنحضرت ﷺ کی ایسی تشویق پر کیے گئے ہیں صورتِ حقیقت ان سب کی

نفی کرتی ہے۔ ایسی تشویق (شوق) تو پست ذہن کے آدمیوں میں بھی نہیں پائی جا سکتی۔ چہ جائے کہ ایسی عظیم المرتبت شخصیت جس نے تمام دنیا میں انقلاب کی لہر پیدا کر دی ہو۔ اور آج کے بعد جلد ہی یہ توقع ہو کہ اب رسول اللہ ﷺ کی بدولت دنیا میں ایک عظیم الشان انقلاب آئے گا۔

سرورِ کائنات کی زندگی کے اس پہلو پر نظر ڈالئے۔ سن گرامی 50 برس تھا۔ جب جناب خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے اولادیں پیدا ہوئیں۔ یا حضرت ماریہ قبطیہ کے ہاں ایک فرزند (ابراھیم رضی اللہ عنہ) متولد ہوئے۔ اس وقت آپ ﷺ کا سن مبارک ساٹھ سال کا تھا۔ کہنا یہ ہے کہ ان دو حرم (جناب خدیجہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ماریہ رضی اللہ عنہا) کے ماسوا سات یا نو بیویوں میں سے کسی کے بطن سے اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ باوجودیکہ ان تمام بی بیوں میں سے ہر ایک کا سن گرامی تیس چالیس برس کا تھا جو تولید کا مناسب زمانہ ہو سکتا ہے۔

انہیں ازواجِ مطہرات کے ہاں ان کے پہلے شوہروں کے صلب سے اولاد پیدا ہو چکی تھی لیکن رسول اللہ ﷺ کے حرم میں داخل ہونے کے بعد پھر ایسا اتفاق نہیں ہوا۔

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا واقعہ ان طبعی قوانین کے خلاف نہ تھا جن کا طعنہ نبی ﷺ اور ام المومنین زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے سبب کے عنوان سے دیا جاتا ہے۔ بلاشبہ محمد ﷺ انسان تھے۔ جس سے آپ کی ذات میں اولاد کا میلان بھی ہو سکتا ہے۔ جو ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ (اگرچہ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ ہونے کے اعتبار سے آپ تمام امت کے روحانی باپ ہیں۔ ﷺ)

تاریخ اور مسیحی بہتانات

مسیحی مناد اور مستشرقین کے کارخانہ الزامات میں رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جو جو الزام عائد کئے جاتے ہیں ان میں تعددِ ازدواج کے بارے میں تاریخ ہی تردید کے لئے کافی ہے۔

(1) ام المومنین خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اٹھائیس سال تک زندہ رہیں۔ اس دوران میں ممدوحہ کے ساتھ کسی اور بی بی کو شرفِ زوجیت نصیب نہیں ہوا۔

ان کی رحلت کے بعد ام المومنین سودہ بنت زمعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے عقد فرمایا جو اس سے پہلے سکران (بن عمرو) کی بیوی تھیں اور جو مسیحی کارخانۂ بہتانات کے بالکل الٹ حسن و جمال میں صفر تھیں۔ نہ ہی ثروت و عالی مرتبت ہونے کے اعتبار سے قابلِ رشک تھیں۔ انھیں یہ عظمت نبی اکرم ﷺ نے اس لئے مرحمت فرمائی کہ انہوں نے عورتوں میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا اور عورتوں میں سب سے زیادہ تکلیفیں اٹھائیں۔ اپنے شوہر کے ساتھ پہلی

بار حبشہ میں ہجرت فرمائی۔ اس سفر میں دوسرے مہاجرین کے ساتھ ہر قسم کے دکھ سکھ میں شریک رہیں۔ اسی حالت میں ان کے شوہر انتقال کر گئے۔ ان کے دین کی خاطر بے مثال ایثار و استقلال کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں ام المومنین کہلانے کا شرف بخشا رضی اللہ عنہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ جذبہ کس اعلیٰ اخلاقی معیار کا ہے۔ کتنی ستائش کا مستحق ہے اسے فراموش کیا جائیں۔

(2۔3) ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی منکحت کے وجوہات!
دونوں امہات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہر دو وزراء کی صاحب زادیاں تھیں۔ ان سے تزویج کا مقصد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ دوراندیشی تھی جس میں دونوں حضرات کو اور قریب کرنا مد نظر تھا۔ جیسا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور علی رضی اللہ عنہ کو اپنی دامادی میں لینے سے اپنے قریب تر رکھنا مطلوب ہے۔

بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بے حد محبت تھی۔ لیکن نکاح سے پہلے ان سے محبت کا شائبہ تک نہیں ملتا۔ غور کیجئے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے لئے خطبہ فرمایا تو بی بی کا سن مبارک سات برس تھا۔ رخصتی نو سال کی عمر میں ہوئی۔ ظاہر ہے اس سن میں رغبت کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔

ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ بھی نکاح سے پہلے کوئی ایسی نوبت نہ آئی تھی۔ جیسا کہ ان کے والد عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

واللّٰہ انا کنا فی الجاھلیہ ما نعد للنساء حتی انزل اللّٰہ فیھن ما نزل و قسم لھن ما قسم قال انا فی امر اتمرہ اذ قالت لی امراتی لو صنعت کذا و کذا فقلت لھا و مالک انت ولما ھاھنا و ما تکلفک فی امر اریدہ فقالت لی عجبا لک یا ابن الخطاب ما ترید ان تراجع انت و ان ابنتک لتراجع رسول اللّٰہ حتی یظل یومہ غضبان۔ قال عمر فاخذت ردائی ثم احرج مکانی حتی ادخل علی حفصہ فقلت لھا یا بنیتہ انک لتراجعین رسول اللّٰہ حتی یظل غضبان؟ فقالت حفصہ واللّٰہ انا لنراجعہ' فقلت تعلمین انی احذرک عقوبت اللّٰہ و غضب رسولہ یا بنیہ لا یغرنک ھذی التی قد اعجبھا حسنھا و حب رسول اللّٰہ اباھا وقال واللّٰہ لقد علمت ان رسول اللّٰہ لا یحبک و لا انا لطقک۔

اللہ عز و جل کی قسم اسلام سے پہلے عورتوں کی ہمارے نزدیک کوئی وقعت نہ تھی۔ مگر اسلام آیا تو اس نے ان کو ترکہ میں شریک کیا (تب ہم نے سمجھا) چنانچہ ایک مرتبہ میں اپنے گھر میں بیٹھا ہوا کسی معاملہ میں صلاح مشورہ کر رہا تھا کہ میری اہلیت نے ایک بات کی۔ میں نے اپنی بیوی کو

ڈانٹا۔ اس پر میری بیوی نے کہا۔ اے ابن الخطاب آپ گھر میں کسی کو بولنے کا حق نہیں دیتے لیکن آپ کی صاحبزادی نے رسول اللہ ﷺ کو ان کے کاموں میں دخل اندازی سے پریشان کر رکھا ہے۔ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں میں اپنے کندھے پر چادر رکھ کر حفصہ کے گھر پہنچا اور پوچھا۔ کیوں بی بی تم نے آنحضرت ﷺ سے جھگڑا کر کے انہیں پریشان کر رکھا ہے اور وہ تم سے دن بھر ناراض رہتے ہیں؟ حفصہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا۔ کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے کہا (عمر رضی اللہ عنہ) بی بی میں تم کو اللہ عزوجل اور اس کے رسول ﷺ کے غضب سے ڈرانے آیا ہوں۔ اے حفصہ آپ کو اس معاملہ میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی برابری نہیں کرنا چاہئے۔ ان سے تو رسول اللہ ﷺ بہت محبت کرتے ہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی سے کہا۔ اے بیٹی میں جانتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کو تم سے کوئی لگاؤ نہیں۔ اگر میرا واسطہ نہ ہوتا تو تمہاری عادت کی وجہ سے انہوں نے تم کو طلاق ہی دے دی ہوتی!

(4) ام المومنین سودہ رضی اللہ عنہا

ان کو شرفِ نکاح بخشنے کی وجہ یہ تھی کہ اگر مجاہدین میں سے کوئی اللہ کی راہ میں شہید ہو جائے تو اسے اپنے ہی پسماندگان کے لئے اس وجہ سے نہیں ڈرنا چاہئے کہ اس کی وفات کے بعد وہ فاقوں سے مر جائیں گے۔ گویا آپ رضی اللہ عنہ سے نکاح سرفروشانِ اسلام کی دلجوئی مقصود تھی۔

(5) ام المومنین جناب زینب بنتِ خزیمہ عبیدہ بن حارث بن عبد المطلب کے عقد میں تھیں۔ وہ غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے۔ آپ رضی اللہ عنہا دوسروں کے دکھ درد میں عطا و بخشش میں کھلا ہاتھ رکھتی تھیں۔ اسی وجہ سے آپ رضی اللہ عنہا کا ام المساکین لقب تھا۔ نیک خو' صاف دل تھیں نہ حسن و جمال میں شہرہ تھا' نہ ہی جوان' شباب کی حدوں سے گزر چکی تھیں۔ ام المومنین زینب رضی اللہ عنہا (بنت خزیمہ) حرمِ نبوی ﷺ میں شامل ہونے کے دو یا ایک سال بعد جنت کو سدھار گئیں۔ جناب خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رحلت کے بعد حرمِ رسول میں سے آپ نے ہی رحلت فرمائی۔

(6) ام المومنین جناب ام سلمہ۔ یہ بی بی حضرت ابو سلمہ کی اہلیہ تھیں جن کے صلب سے کئی فرزند بقیدِ حیات موجود تھے۔ ابو سلمہ غزوہ احد میں مجروح ہو گئے۔ ان کے زخم ابھی پوری طرح بھرے نہ تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے آپ کو حمراء الاسد میں امیرِ لشکر بنا کر بھیج دیا تھا۔ جس میں وہ کامیاب ہو کر واپس تشریف لائے مگر زخموں کا منہ کھل جانے کی وجہ سے ملائے اعلیٰ

سے ملاقات فرما گئے۔

اس وقت رسول اللہ ﷺ ابو سلمہ کے سرہانے تشریف فرما تھے۔ ادھر ان کے جسدِ مبارک سے روح پرواز کر رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ ابو سلمہ کے لئے دعا فرما رہے تھے۔ اور آپ کی مبارک آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے۔

بی بی امِ سلمہ کی عدت پوری ہونے کے بعد آنحضرت ﷺ نے ان سے خطبہ فرمایا۔ تو امِ سلمہ نے کثرتِ عیال کے ساتھ اپنے بڑھاپے کا بھی عذر پیش کیا۔ نکاح کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان کے بچوں کی تعلیم و تربیت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ اس کے باوجود اگر مشرکین اور مستشرقین کے کارخانۂ تہمت سے ہوائیاں اڑتی رہیں کہ آنحضرت ﷺ نے امِ سلمہ سے صرف ان کے حسن و جمال کی وجہ سے نکاح فرمایا تھا تو آپ ہی انصاف کیجئے۔ انہیں کیا کہا جائے۔

کیا انصار و مہاجرین کے ہاں ایسی عورتیں نہ تھیں جو حسن و جمال میں بے مثل تھیں۔ ثروت و شہرت میں امِ سلمہ سے بدرجہا بہتر ہوں اور ان میں کسی کی گود میں پہلے شوہر کی اولاد بھی نہ ہو؟

امِ سلمہ سے نکاح کرنے کا محرک وہی جذبۂ ترحم و خلوص تھا جو حضرت زینب بنت خزیمہ کو شرفِ زوجیت بخشنے کا سبب بنا۔ مسلمانوں کے ساتھ مزید قرابت ان کے دلوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی عظمت و محبت کو زیادہ پیدا کرنا' مسلمانوں کو نبی اور رسول ﷺ ہونے کے ساتھ خود کو امت کا روحانی باپ باور کرانا بھی ان کے پیش نظر تھا۔ ہر ایک مسکین و بے نوا' کمزور اور محتاج بے کس و بے سہارا سے باپ ایسا سلوک فرمانا آپ کا شعار تھا۔ اور وہ بچے جن کے باپ اللہ تعالیٰ کی راہ میں شہید ہو جانے کی وجہ سے ان کو تنہا چھوڑ گئے ہیں ان سے ان کے سگے باپ کی طرح پیش آنا ان کی تسلی و تشفی کا سامان تھا۔

اوپر بیان کئے گئے حقائق سے کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ یہ کہ ملک و ملت کے عام حالات میں ایک بیوی پر بھی اکتفا کیا جا سکتا ہے جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ اٹھائیس برس گزارے اسی طرح قرآن مجید اموال و ظروف کے مطابق ایک سے لیکر چار بیویوں کی اجازت دیتا ہے۔

تعددِ ازدواج

فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورُبع فان خفتم الا تعدلوا فواحدة او ما ملکت ایمانکم۔ (3:4)

عورتوں میں سے جو تمہیں پسند آئیں ان سے نکاح کر لو۔ دو دو یا تین تین یا چار چار! اور اگر اس

بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک ہی عورت کافی ہے یا کنیز جس کے تم مالک ہو۔ اس سے تم بے انصافی سے بچ سکو گے۔

ولن تستطیعوا ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقة۔ (129:4)

اور تم کتنا ہی چاہو تم عورتوں میں برابری کسی صورت قائم نہیں رکھ سکو گے تو ایسا بھی نہ کرنا کہ ایک ہی طرف جھکاؤ کر لو اور دوسری کو ایسی صورت میں چھوڑ دو جیسے آدھ میں لٹکی ہوئی ہو۔

یہ دونوں آیات ہجرت کے بعد آٹھ سال کے عرصہ میں نازل ہوئیں۔ جن سے پہلے ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام ازواج مطہرات سے عقد فرما لیا ہوا تھا۔ اب چار عورتوں کی حدود فرما دی گئی لیکن اس سے پہلے کوئی حد بندی نہ تھی۔ اس سے عقلمند معترضین کا یہ اعتراض خود بخود رفع ہو جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس چیز کو دوسروں کے لئے ناجائز قرار دیا ہے وہ اپنے لئے کیسے جائز قرار دے دیا! لیکن چار کی تعداد بھی اسی صورت میں جائز ہے جب ان سب سے مساویانہ عدل و انصاف قائم رکھنے کا صرف مالی نہیں بلکہ جسمانی تعلق میں بھی عدل و انصاف کی قوت ہو۔ اس آیت میں اس بات کی نشاندہی واضح ہے کہ بیویوں کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔ اگرچہ ایک ہی عورت عام حالات کے مطابق قطعاً مناسب ہے مگر قوم و ملک کے حالات میں تبدیلی بھی تو ممکن ہے۔ جن حالات اور زمانے میں ایک مرد کے لئے چار عورتوں کے ساتھ عقد جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔ لیکن عدل و انصاف ہر حالت میں ضروری ہے۔ اور ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہی اس تعداد کو یعنی چار بیویوں کو عام کر دیا گیا۔ کیونکہ جنگوں میں مردوں کے شہادت پا جانے یا قتل ہو جانے کی صورت میں عورتیں بے سہارا ہو جاتی ہیں اس کی وجہ سے تعددِ ازدواج کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں ہوتا۔ کیا لوگ اس چار دو یا تین کی تعداد کے فوائد سے اس حالت میں انکار کر سکتے ہیں جب کسی ملک میں عالمگیر جنگ وبائے عام یا دوسرے ایسے حادثات رونما ہو جائیں جس کے نتیجہ میں لاکھوں مرد موت کا لقمہ بن جائیں۔ کیا ایسے حالات میں صرف ایک ہی عورت پہ اکتفا لازم ہو گا؟ کیا ایسے اربابِ مغرب یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ عالمگیر جنگ کے بعد ان کا یہ قانون "ایک بیوی" قابلِ عمل ہے؟ یا انہوں نے اسے عملاً اس وقت جاری رکھا؟

ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسری شادی کا خیال بھی قطعاً" ثابت نہیں ہے۔ نہ یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح سے پہلے بھی کسی عورت سے لگاؤ کا اظہار فرمایا ہو۔ جبکہ قبیلہ کے بڑے بڑے سردار ان سے یہ اصرار کرتے رہے کہ اگر کسی خوبصورت سے خوبصورت، امیر سے امیر عورت سے نکاح مقصود ہو تو ہم

تمہاری مدد کو تیار ہیں مگر آنحضرت ﷺ نے اس وقت بھی ٹھکرا دیا۔ میرا مقصد اللہ کی عظمتوں کو تمہارے دلوں سے تسلیم کرانا ہے۔ فقط!

میں پھر کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ کا زمانۂ بعثت ایسا زمانہ تھا جس میں عورتیں ایسے تمام بناؤ سنگار میں بہت ہی آزاد تھیں جنہیں دیکھ کر فولاد دل مرد بھی موم ہو جائے۔ اسلام نے ان کے اس قسم کے بناؤ سنگار پر پابندی لگا دی' اسے حرام قرار دے دیا۔ ان حالات و حقائق کی روشنی میں یہ کہنا قطعی کم عقلی اور حماقت ہے کہ رسول اللہ ﷺ پچاس سال کے سن سے آگے نکل کر بھی ایسے خیالات میں مبتلا ہو گئے اور سیدہ زینب بنتِ جحش کے معاملہ میں دل گرفتہ ہو گئے۔ جبکہ حرم میں پانچ ازواجِ مطہرات موجود ہوں۔ جن میں سیدہ طاہرہ جیسی مونسہ ہوں جو تادمِ رحلت رسول اللہ ﷺ کی معتمد علیہا رہی ہوں۔ ان حالات میں کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ آنحضرت ﷺ دن رات سیدہ زینب رضی اللہ عنہا کے غم میں مبتلا رہے تھے؟

یہ ایسے حقائق ہیں جو ان مسلمانوں کے مفروضات کے لئے ضربِ کاری ہیں جنہوں نے اپنی طرف سے انصاف فرما کر مستشرقین کے سامنے ایسی روایات رکھ دیں جو مادہ پرست انسان کے لئے بھی شایان نہیں۔ چہ جائے کہ ایسی عظیم المرتبت ہستی جس نے نئی دنیا بسانے کے لئے تاریخِ عالم میں اپنا مقام بنی نوعِ بشر سے بلند حاصل کر لیا ہو۔ حضرت زینب بنتِ جحش سے نکاح کے مبادی ہیں۔ بعض مسلم اور بعض بے شمار مسیحی واعظین اور مستشرقین نے جو اضافات فرمائے ہیں ان سے یہ واقعہ عشقیہ داستان بن گیا (نعوذ باللہ من ذالک) جبکہ اس نکاح سے ایک عظیم المرتبت اور اصلاحِ معاشرہ کی روح کا ظہور ہوا۔ ایک ایسے کامل الایمان انسان کی مانند جس نے اپنے لئے بھی وہی اختیار فرمایا جو دوسروں کے لئے پسند فرمایا۔

لایکمل ایمان المرء حتی یحب لاخیہ مایحب لنفسہ

کوئی انسان اس وقت تک کامل ایمان کا مالک نہیں ہو سکتا جب تک وہ اپنے لئے بھی وہی پسند نہ کرے جو دوسروں کے لئے کرتا ہے!

رسول اللہ ﷺ نے جاہلیت کی ایک رسم توڑنے کے لئے سب سے پہلے خود قدم اٹھایا تاکہ اس نئے نظام میں جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے رحم و کرم سے اپنے بندوں پر عائد فرمایا ہے کوئی خامی نہ رہ جائے۔

اس الزام تراشی کو غلط ثابت کرنے کے لئے یہ بھی کافی ہے کہ زینب بنتِ جحش رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی زاد بہن بھی تھیں جو بچپن میں آنحضرت ﷺ کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں۔ ان معنوں میں وہ آپ ﷺ کے سامنے وہ بیٹی یا چھوٹی بہن کے مقام پر بھی

ہوئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انہیں پہچانتے بھی تھے۔ زید سے نکاح کرنے سے پہلے ان کو دیکھا بھی تھا۔ بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے بچپن سے لیکر جوانی کے ہر ہر ماہ و سال ماہ و یوم سب ان کی نظر میں تھے۔ زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خطبہ نکاح بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ہی پڑھایا تھا۔ اس کے بعد تمام افترا بازوں پر جھوٹی تہمت دھرنے والوں پر نظر ڈالئے تو دو باتیں کہی جاتی ہیں۔

الف۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زید کے ہاں تشریف لے گئے وہ گھر میں موجود نہ تھے اور آپ زینب رضی اللہ عنہا کے حسن و جمال پر فریفتہ ہو کر سبحان اللہ مقلب القلوب کہتے ہوئے وہاں سے نکل آئے۔

ب۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس وقت ان کے ہاں تشریف لے گئے اس وقت بی بی ایک باریک عبا زیب تن فرما تھیں۔ کیا اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذہن سے اپنی چھ بیویوں کا وجود بھی محو ہو گیا۔ خصوصاً خدیجۃ الکبریٰ کا تصور جن کے متعلق حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ "میں نے خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی بیوی پہ رشک نہیں کیا۔ جب کبھی ان کا ذکر آتا آپ ان کی بہت تعریف فرماتے" بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے بارہ میں ذرا بھی ارادہ ہوتا تو ان سے زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جگہ خود نکاح کر لیتے۔

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی اتنی قریبی رشتہ داری ہی ان اعتراض بازوں کی تردید کے لئے کافی ہے۔ اگر بی بی زینب رضی اللہ عنہا کا حسن و جمال آپ کے دل میں اتنا ہی جاگزیں تھا' تو آپ کو زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جگہ اپنا پیغامِ نکاح پہنچانے میں کون سی قوت مانع تھی؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور زینب رضی اللہ عنہا کی خصوصی قرابت اور بی بی کے طفولیت سے لیکر سنِ بلوغت تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب رہنا افترا بازوں کی خیالی قلابازیوں پر کاری ضرب ہے جس کے سامنے ان کے اتہامات کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔

خطبہ برائے زید

اس معاملہ میں تاریخ ہماری راہنمائی کرتے ہوئے بتاتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پھوپھی زاد بہن سیدہ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آزاد کردہ غلام زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نکاح خود کیا۔ جن سے ان کے بھائی عبداللہ بن جحش نے اس وجہ سے انکار کر دیا تھا کہ ان کی ہمشیرہ قرشیہ' ہاشمیہ ہیں اور انہیں ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی زاد بہن ہونے کا شرف و فخر بھی حاصل ہے۔ کیا اس نجیب الطرفین خاتون کا نکاح اس شخص سے کر دیا جائے جسے قریش ہی کی

ایک خاتون نے خریدا اور رسول اللہ ﷺ نے اسے آزاد کر دیا ہو۔ ان کا موقف یہ تھا کہ یہ امر نہ صرف زینب رضی اللہ عنہا بلکہ تمام عرب کے اشراف کے لئے عار و شرم کا موجب ہو گا کہ شرفاء کی صاحبزادی کو غلام کے حبالۂ عقد میں دے دیا جائے۔

عرب کی عجم پر فضیلت

مگر رسول اللہ ﷺ اس قسم کے نسلی امتیازات عملاً ختم کرنے والے تھے۔ عربی النسل ہونا اس بات کی ضمانت نہیں کہ ہر عجمی النسل پر اسے برتری حاصل ہے۔ قرآن مجید کا واضح ارشاد ہے۔

ان اکرمکم عند اللہ اتقکم۔ (13:49)

"اللہ عزوجل کے نزدیک تم میں سے برتر صرف وہی ہے جو پرہیزگار ہے"

فخر دو عالم ﷺ نسلی برتری کو مٹانے کی غرض سے اپنے خاندان کے سوا کسی اور کو اس امر کے لئے اتنا مجبور نہ فرما سکتے تھے۔ یہ آنحضرت ﷺ کے اخلاقِ اعلیٰ کی لاثانی مثال ہے کہ آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن زینب رضی اللہ عنہا کو عرب میں نسلی امتیاز ختم کرنے کے لئے منتخب فرمایا۔ اور ثابت فرمایا کہ دینِ اسلام میں ایک شریف زادی کا عقد اس شخص سے بھی ہو سکتا ہے جو عام نظروں میں اس قدر کم درجہ سمجھا جاتا ہو کہ کان یہ سننا بھی گوارا نہ کریں۔

جناب زید رضی اللہ عنہ کو سرورِ دو عالم ﷺ کے آزاد کردہ غلام کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ آنحضرت ﷺ کا متبنیٰ بننے کی عزت بھی حاصل ہوئی اور عرب کے دستور کے مطابق دوسرے عصبات اور ذوی الفروض کے ساتھ اپنے منہ بولے والدِ گرامی ﷺ کے ورثہ میں شریک بھی تھے جسے دینِ اسلام نے بعد میں ختم کر دیا۔ مختصر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے بیحد اصرار پر آپ کے پھوپھی زاد بھائی اور زینب رضی اللہ عنہا کے سگے بھائی عبد اللہ بن جحش مان گئے۔ جن کی تعریف میں یہ آیت نازل ہوئی۔

وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبینا (36:33)

"اور کسی مومن مرد یا مومن عورت کو حق نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کوئی امر مقرر فرما دیں تو اس کام میں اپنا بھی کچھ اختیار سمجھیں اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کرے وہ صریحاً گمراہ ہے"

عقدِ زینب رضی اللہ عنہا میں جبری رضامندی

مذکورہ آیت کے نازل ہونے کے بعد عبد اللہ رضی اللہ عنہ اور زینب رضی اللہ عنہا دونوں بہن بھائی نے رضامندی دے دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حق مہر مقرر فرما دیا۔ لیکن زینب کے فخرِ نسب اور زید سے نفرت میں کسی طرح کی کمی نہ ہوئی۔ زینب رضی اللہ عنہا بار بار زید رضی اللہ عنہ کے سامنے فرماتیں۔ "میں آزاد شدہ نہیں ہوں" ہر گھڑی اس طعنہ بازی نے زید رضی اللہ عنہ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ کچھ اور سوچے اپنی عزتِ نفس کے احترام کو باقی رکھے۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کئی بار دکھڑا رویا اور طلاق کی اجازت بھی طلب فرمائی مگر ہر بار بارگاہِ رسالت سے جواب ملتا۔ امسک علیک زوجک والق اللہ لیکن زید رضی اللہ عنہ کا ان کے ساتھ زندگی گزارنا ناممکن ہو گیا۔ آخر کچھ مدت برداشت کرنے کے بعد طلاق دے کر الگ ہو گئے۔

مُتبنّٰی کی اسلام میں کیا حیثیت ہے؟

عرب منہ بولے بیٹوں کے معاملہ میں حد سے زیادہ بڑھ چکے تھے۔ انہیں صلبی اولاد کے برابر حق دے چکے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معلم کتاب و حکمت فطری تقاضوں سے واقف تھے۔ وہ بلا حجاب ان کا گھروں میں آنا ناپسند فرماتے تھے۔ انہیں یہ بھی پسند نہ تھا کہ ان کو صلبی اولاد کے ہم پلہ قرار دیا جائے اس لئے اسلام دینِ فطرت ہے۔ اور متبنّٰی فطرتاً ماں کے لئے اس کی اپنی کوکھ سے جنے ہوئے کے برابر ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اور نہ ہی متبنّٰی فطرتاً اس کو ماں کا مقام دے سکتا ہے۔ لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ضروری سمجھا کہ منہ بولے بیٹوں کے حقوق ایک دوست یا دینی بھائی سے زیادہ نہ رہنے پائیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی وضاحت و تاکید فرماتے ہوئے آیت نازل فرما دی۔

وماجعل ادعیائکم ابنائکم ذٰلکم قولکم بافواھکم واللہ یقول الحق وھو یھدی السبیل۔ (4:33)

اور نہ ہی ہم نے تمہارے لے پالکوں (متبنّٰی) کو تمہارے بیٹے بنایا۔ یہ سب تمہارے منہ کی باتیں ہیں اور اللہ تعالیٰ سچی بات فرماتے ہیں اور وہی سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے مفہوم کے مطابق پرانی رسم کو توڑنے کے لئے خود ہی ایسا اقدام کرنا چاہئے تھا کہ سب سے پہلے باپ اپنے منہ بولے بیٹے کی بیوی سے نکاح کرے اور متبنّٰی کو اپنے منہ بولے باپ کی زوجہ سے عقد گوارا ہو۔ لیکن کس کی یہ مجال تھی کہ وہ جہالت کی صدیوں پرانی رسم کے خلاف قدم اٹھاتا جو ان کی تہذیب و تمدن میں داخل ہو چکی تھی۔ سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جن کی قوت، عزیمت اور حکمتِ الٰہیہ پر گہرے ادراک و فکر نے اس عمل کا

مظاہرہ اپنے اوپر واجب کر لیا تھا۔ اس لئے کہ آپ کی بعثت کا مقصد ہی جاہلیت کی تمام رسموں کو ختم کرنا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے۔۔۔ اللہ تعالیٰ کے اس حکم کو نافذ کرنے کے لئے بی بی زینب رضی اللہ عنہا کے ساتھ زید کے طلاق دینے کے بعد خود نکاح فرما کر عملاً اس کی بنیاد رکھ دی حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا پورا پورا علم بھی تھا کہ جاہلیت کی اس رسم کا بت توڑنے کے بعد لوگ کیسی کیسی باتیں کریں گے۔ خائف کرنے والی انہی باتوں کی نشاندہی فرماتے ہوئے اللہ جل شانہ نے فرمایا۔

وتخفی فی نفسک ما اللہ مبدیہ وتخشی الناس واللہ احق ان تخشہ (37:33)

تم اپنے دل میں اس بات کو پوشیدہ رکھتے تھے جسے اللہ تعالیٰ ظاہر کرنے والا تھا اور تم لوگوں سے ڈرتے تھے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا حقدار ہے' اس سے ڈرو۔

رسالت مآب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے احکامات کی تعمیل میں سب سے پیش پیش تھے اور ان احکامات کی دوسروں کو تبلیغ کرنے کے ذمہ دار تھے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کی تمام باتوں سے بے نیاز ہو کر اپنے آزاد کردہ غلام اور منہ بولے بیٹے کی طلاق دادہ بیوی حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کر کے ثابت کر دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سوائے اللہ تعالیٰ کی ذات کے اور کسی سے نہیں ڈرتے۔ گویا شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو عملاً جاری کر دیا۔ جو منہ بولے بیٹے اور باپ دونوں کی وجہ سے باطل ہو رہا ہے جیسا کہ اس آیت سے ثابت ہے۔

فلما قضی زیداً منھا وطراً زوجنکھا لکی لا یکون علی المومنین حرج فی ازواج ادعیائھم اذا قضوا منھن وطراً وکان امر اللہ مفعولا۔ (37:33)

جب زید نے اس سے کوئی حاجت متعلق نہ رکھی (یعنی اس کو طلاق دے دی) تو ہم نے اس کا تم سے نکاح کر دیا۔ تاکہ مومنوں کے لئے ان کے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (کے ساتھ نکاح کرنے کے بارے میں جب وہ ان سے اپنی حاجت متعلق نہ رکھیں یعنی طلاق دے دیں) کچھ تنگی نہ رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا حکم واقع ہو کر رہتا ہے۔

ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے واقعات صرف اتنے ہیں کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی زاد ہیں۔ اس رشتہ کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے نکاح میں آنے سے پہلے ہمیشہ دیکھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی نے حضرت زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خطبۂ نکاح پڑھا۔ زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ان کا عقد ہو جانے کے بعد جب تک آیۂ حجاب نازل نہ ہوئی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے درمیان قرابت داری کی وجہ سے ایک دوسرے کے سامنے آنے میں کوئی چیز مانع نہ تھی۔ اور نہ ہی ایک دوسرے کے گھر آنے

جانے میں کوئی تکلف تھا۔ کہ زینب آپ کے منہ بولے بیٹے کی اہلیہ تھیں بلکہ رسول اللہ ﷺ کو ان دونوں میں ہمیشہ ان بن ہونے کی وجہ سے صلح کروانے کے لئے اکثر جانا پڑتا تھا اور اس لئے بھی کہ اس معاملہ میں احکامِ الٰہیہ کا نزول شروع ہوا جن میں اس طلاق کے بعد رسول اللہ ﷺ کے عقد میں آنے کا اشارہ بھی تھا۔

غلام اور حقوقِ شہریت

یہی احکام دوسری حیثیت سے آزاد شدہ غلام کو شہریت کے حقوق دلانے کا سبب بنے اور یہی احکام منہ بولے بیٹے کے ان حقوق کو ختم کرنے کا سبب بنے جن حقوق کی وجہ سے منہ بولے بیٹوں کو صلبی بیٹوں کے برابر حقوق کا مستحق قرار دیا جاتا تھا اور انہی احکام نے آئندہ کے لئے منہ بولے بیٹوں کے لئے کوئی ایسی گنجائش نہ چھوڑی جس کے وہ مستحق نہ ہوتے ہوئے ان سے مستفید ہو رہے تھے۔

سوال یہ ہے کہ اس قدر واضح احکام اور صحیح واقعات کے ہوتے ہوئے ان فسانوں کی اہمیت کیا رہ جاتی ہے۔ جو اس عقد میں وضع کئے گئے اور مستشرقین نے ان کی فسانوی حیثیت کو جانتے ہوئے بھی ان سے اپنی تالیفات میں استفادہ کیا؟

ان محققین میں سرِفہرست میور، ارفنج، اسپرنگر، سیل، درمنگھم اور لامسن وغیرہ ہیں جنہوں نے تحقیق کی آڑ میں مسیحیت کی تبلیغ کے سلسلہ میں بڑے بڑے گل کھلائے ہیں۔ ان مصنفین کے دلوں میں صلیبی جنگوں کی صدیوں سے جو آگ سلگ رہی ہے اس کی جلن میں ہروقت جلتے رہنا ان کا مقدر ہو چکا ہے۔ وہ مجبور تھے کہ ختم المرسلین ﷺ کے بارے میں ایسی کتابیں لکھیں جن میں آپ کے ازدواج خصوصاً زینب رضی اللہ عنہا کے عقد کی وجہ سے پانی پی پی کر کوسنے دیں۔ وہ لوگ تاریخ کے کتنے بڑے مجرم ہیں جنہوں نے جان بوجھ کر ضعیف اور موضوع روایات پر اپنی علمی تحقیقات کی عمارت تعمیر کی۔ اگر یہ تحقیق صحیح روایات پر ہوتی پھر ہمیں یہ کہنے کا حق ہوتا کہ دنیا کے بلند ترین اشخاص عوام کی طرح ہر قانون کے پابند نہیں ہوتے جیسا کہ۔

(الف) موسیٰ علیہ السلام نے ایک مصری کو قتل کر دیا اور ان پر سزا وارد نہ ہو سکی۔ ان کے رسول ہونے کی حیثیت سے ان پر نازل شدہ کتاب (تورات) مسیحیت کا دستور شریعت قرار پائی۔

(ب) جناب مسیح باپ کے بغیر پیدا ہوئے اور مسیحیت کی رو سے انہیں روح القدس اور کیا کیا نام دیئے گئے اور کیا کیا نہ کہا گیا؟ بلکہ مسیح کا اس طرح متولد ہونا ہی ان کے لئے وجہِ تقدس بن گیا۔

جنگِ خندق اور یہودِ بنو قریظہ

جنگِ خندق اور یہود بنو قریظہ

یہودیوں کے تین بڑے قبیلے مدینہ منورہ میں آباد تھے۔
الف۔بنو قینقاع۔ سب سے پہلے انہیں کو نکالا گیا۔
ب۔بنو نضیر۔ دوسرے نمبر پر ان کو شہر بدر کیا گیا۔
ج۔بنو قریظہ۔ اس فصل میں ان ہی کی تفصیلات آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہیں۔

اپنی حرکتوں کی وجہ سے بنو قینقاع کے بعد بنو نضیر کو بھی مدینہ منورہ سے نکال دیا گیا۔ غزوۂ بدر ثانیہ میں ابوسفیان بدر تک آیا مگر ناکام لوٹ گیا۔ قبائل نے بھی غزوۂ غطفان اور دومۃ الجندل میں اپنی فوج کشی کا خمیازہ بھگت لیا۔ تمام واقعات کے بعد مسلمانوں کو مدینہ منورہ میں کچھ سکون ملا۔ اگرچہ تجارت کے لئے ان کا نکلنا اب بھی دشوار تھا۔ کھیتی باڑی بھی آزادی کے ساتھ کرنا قدرے محال تھا البتہ اس زمانہ میں مالِ غنیمت پانے کی صورت جو کچھ حصہ آیا اسی پر ہر گز بسر کر کے زندگی کے یہ دن گزارے۔

فکرِ تحفظ

لیکن اسی دوران غم خوارِ امت مہربان و شفیقِ امت محمد ﷺ پر ہر وقت دشمن کی چالوں پہ نگاہ رکھے رہے۔ آپ ﷺ نے اس سلسلہ میں چاروں طرف خبریں پہنچانے والوں کو پھیلا دیا تاکہ وقت سے پہلے مداخلت کی تیاری کی جا سکے۔ مسلمانوں کے لئے تحفظ کا اس کے سوا کوئی راستہ بھی تو نہ تھا۔ قریشِ مکہ اور مختلف قبائل نے جو ان کے خلاف قیامت پا کر رکھی تھی وہ بھی کسی تشریح کی محتاج نہیں۔ ہر ایک رسموں میں اندھی تقلید اور جمود کے باوجود ایک بات میں سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے تھے شہری ہوں یا بدو سب میں ایک ہی قسم کا جمہوری نظام مروج تھا۔ لباس، عادت، اطوار، رویے اور عادتیں بلکہ مذہب میں بھی ان میں وحدت و اتحاد تھا۔ عرب کے رہنے والے ایک دوسرے سے بہت دور رہنے کے باوجود ایک دوسرے کے اتنے قریب تھے کہ اس کی مثال دنیا کی کسی قوم میں نہیں ملتی۔

جناب محمد ﷺ عرب نژاد ہونے کی وجہ سے اپنے ملک کے رہنے والوں کی نفسیات

کو اچھی طرح جانتے تھے۔ ان کے کعبہ بردار ہونے کی وجہ سے جانے یہ لوگ کب مسلمانوں پر حملہ کر دیں رسول اللہ ﷺ کے خیال میں یہ بات ہر وقت رہتی۔ کفارِ مکہ بدر کے مقتولین کے خون کا بدلہ لینے کے لئے ان کے خون کے پیاسے تھے۔ بنو قینقاع اور بنو نضیر کو شہر بدر کر دینے کی وجہ سے ان کے دشمن، بنو غطفان اور بنو ہذل ان سے انتقام لینے کے لئے بے قرار تھے۔ باقی قبائل بھی عصبیت کی بنا پر ایک دوسرے کی مدد میں کمربستہ تھے۔ عرب کا ایک دشمنِ رسول اللہ ﷺ سے کئی وجوہات کی بنا پر انتقام لینے کے لئے سر ہتھیلی پر رکھ کر پھر رہا تھا۔ بعض کو یہ غم کھا رہا تھا کہ کل صرف اپنے ساتھ اللہ پر ایمان لانے کے سوا خالی ہاتھ آیا تھا۔ اس مقدس ذات علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مدینہ منورہ میں اتنی بڑی قوت حاصل کر لی ہے کہ اطراف و جوانب کے تمام بڑے شہر اور صحرائے عرب کا ہر ایک قبیلہ اس سے مرعوب ہو چکا ہے۔

سب سے بڑا دشمن

یہودیوں کو رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ دشمنی اور حسد تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی عملی بصیرت کی بنا پر انہیں اس بات کا یقین تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ توحید کے سامنے ان کی علمی قیادت کا بت زمین بوس ہونے ہی والا ہے۔ حیرت تو یہ ہے کہ نصاریٰ سے ان کا تصادم توحید کی بنا پر ہی تھا اور صدیوں سے نصاریٰ پہ غالب آنے کی امید لئے ہوئے جی رہ تھے ان کو یقین تھا کہ توحید پہ قائم انسان طبعاً بلند حوصلہ اور اخلاقاً بلند مرتبہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسیحوں کی شکست انہیں کبھی بھی اپنی طرف مائل نہیں کر سکی۔

لیکن آج توحید کے دشمن نصرانیوں کے مقابلہ میں یہودیوں سے زیادہ توانا قوت داعی توحید محمد ﷺ کا ظہور ہوا جو عالی نژادگی میں بے مثل اور دنیا کی تمام عظیم ترین شخصیتوں سے برتر تھے۔ انہوں نے توحید کی دعوت اس عملی انداز سے پیش کی کہ سب کے دلوں میں بستی چلی گئی جسے قبول کرنے والوں نے اپنے اندر غیر معمولی تبدیلی محسوس کی لیکن یہودی جو توحید کے داعی کہلاتے تھے سب سے زیادہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی سخت مخالفت کی، نتیجہ کے طور پر رسول اللہ ﷺ کو یہود کے قبیلہ قینقاع کو مدینہ سے باہر نکل جانے کا حکم نافذ کرنا پڑا۔ اس قبیلہ کے بعد ہی دوسرے یہودی قبیلے بنو نضیر کی کھلم کھلا دشمنی کی وجہ سے مجبور ہو کر انہیں بھی شہر بدر کر دیا گیا۔

اب سوال یہ ہے کہ یہود کے یہ دونوں ٹولے شہر بدر ہونے کے بعد جب اپنے آبائی وطن بیت المقدس کی طرف لوٹے تو کیا اپنے دلوں میں غیض و غضب لئے بغیر چلے گئے؟ کیا اس کے

ردِّ عمل میں انہوں نے انتقاماً عربوں کو رسول اللہ ﷺ کے خلاف بھڑکانے کا فیصلہ نہ کیا ہو گا۔

بنو قریظہ کی مشرکین سے فریاد

بنو قریظہ کے دلوں میں حسد اور غصہ کی چنگاریاں سلگ رہی تھیں' انہوں نے اور کفار مشرکین کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا اور بنو نضیر کے تین سرغنہ ابو الحقیق کے دو بیٹے سلام اور کنانہ تیسرے حی بن اخطب چوتھا اور پانچواں بنو وائل سے ھودہ بن قیس اور ابو عمارہ ان پانچوں کا وفد قریش کے پاس مکہ پہنچا تو انہوں نے حی بن اخطب سے پوچھا تم لوگوں کے ارادے کیا ہیں؟

حی۔ سب خیبر اور مدینہ کے درمیان پڑاؤ ڈالے بیٹھے ہیں۔ تمہاری راہ تک رہے ہیں تاکہ تمہارے ساتھ مل کر محمد ﷺ اور مسلمانوں پر حملہ کیا جائے۔

قریش۔ بنو قریظہ کا کیا حال ہے؟ (یہ لوگ ابھی تک مدینہ میں تھے)

حی۔ بنو قریظہ رسول اللہ ﷺ کو فریب دینے کے لئے ابھی تک مدینہ میں ہی موجود ہیں اور تمہارے حملہ کا انتظار کر رہے ہیں لیکن اس وقت کفار کی مجلسِ شُوریٰ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ ہمارا اور محمد ﷺ کا اختلاف ایمان باللہ کی وجہ سے ہے اور ان کی دعوت کا حلقہ روز بروز موثر اور وسیع تر ہوتا جا رہا ہے کہیں وہ حق پر تو نہیں اور ہمارا حملہ مناسب بھی ہے یا نہیں۔

قریشِ مکہ نے اسی خیال کے زیر اثر ایک اور سوال کیا۔

برادرانِ یہود! آپ اہلِ کتاب کہلاتے ہیں۔ اس لحاظ سے بقول تمہارے تمہیں فوقیت بھی حاصل ہے۔ ہمارے اور محمد ﷺ کے درمیان اختلاف کی وجہ کا بھی آپ لوگوں کو علم ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ ہمارا دین بہتر ہے یا محمد رسول اللہ ﷺ کا دین بہتر ہے۔

یہودیوں نے جواب میں جھوٹ کہہ دیا۔ صاحبو! آپ کا دین اسلام سے بہتر ہے۔ آپ لوگ حق بجانب ہیں اس پر قرآنِ حکیم کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

الم ترا الی الذین اوتوا نصیبا" من الکتاب یومنون بالجبت والطاغوت ویقولون للذین کفروا ھولاء اھدی من الذین آمنوا سبیلا۔ اولئک الذین لعنھم اللہ ومن یلعن اللہ فلن تجد لہ نصیرا۔ (4: 51تا54)

"بھلا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب سے حصہ دیا گیا ہے کہ بتوں اور شیطان کو مانتے ہیں اور کفار کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ لوگ مومنوں کی نسبت سیدھے راستے پر ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ لعنت کرے تو تم اس کا کسی کو مددگار نہ پاؤ گے"۔

مستشرقین صفائی پیش کرتے ہیں

قریشِ مکہ بت پرستوں کے سامنے توحید کے مقابلہ میں بت پرستی کے مذہب کی تعریف کرنے والے یہودی علماء کے اس جھوٹ سے اپنے آپ کو لاتعلق ثابت کرنے کے لئے مشہور مستشرق ڈاکٹر اسرائیل ولنسفون اپنی کتاب "تاریخ الیہود فی العرب" میں لکھتے ہیں۔ بت پرست قریشیوں کے سامنے توحید اسلامی کی مخالفت کر کے علمائے یہود نے کتنا بڑا ظلم کیا۔ انہیں توحید کے معاملہ میں ذاتی دشمنی کو فوقیت نہیں دینا چاہیے تھی کہ حقیقت اور سچائی سے ہی انحراف کر لیں۔ انہیں مشرکین کے روبرو ہرگز یہ نہیں کہنا چاہیے تھا کہ بت پرستی توحید کے مقابلہ میں بہرحال اعلیٰ ہے' چاہے اس کے نتیجہ میں انہیں اپنی حمایت کے حصول میں ناکامی ہی کیوں نہ ہوتی۔

وہ بھول گئے کہ ان کے مورثِ اعلیٰ بنی اسرائیل نے بت پرستی کے خلاف کس طرح قوموں سے جنگیں جاری رکھیں اور توحید پھیلانے کے جرم میں ہی ان کے کتنے ہی بزرگوں کو جامِ شہادت نوش کرنا پڑا۔ ان میں سے کتنے ہی لوگ اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانے کی وجہ سے زخمی ہوئے۔ یہود کو چاہیے تھا کہ بت پرستوں کو نیچا دکھانے کے لئے اپنی زندگی کا ایک ایک سانس لگا دیتے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو جس قدر مال و دولت دیا تھا سب کا سب اسی کی راہ میں قربان کر دیتے مگر انہوں نے تو بت پرستوں کے عقیدہ کو سراہا۔ گویا اپنے ہی عقیدہ کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا جبکہ ان کو معلوم تھا کہ تورات میں بت پرستی کے خلاف تعلیم موجود ہے بلکہ بت پرستوں سے نفرت اور ان کے ساتھ جنگ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

سازش میدانِ عمل میں

تمام دشمنانِ اسلام نے طے کیا کہ حملہ کیا جائے۔ تیاری کے لئے چند مہینوں کا وقت مقرر کر لیا گیا۔ حی بن اخطب اس کے دوسرے ہم سازش دوستوں نے قریشِ مکہ ہی کے ساتھ معاہدہ کافی نہ سمجھا بلکہ مندرجہ ذیل قبیلوں کے پاس گئے۔

غطفان قبیلہ قیس بن عیلان' بنو مرہ' بنو فزارہ' اشجع' سلیم' بنو سعد' بنو اسد اور ان کے ہر اس شخص کے پاس گئے جس سے تعلق رکھنے والے دور یا نزدیک کا رشتہ دار مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا۔ ہر ایک قبیلہ کو ہر ایک شخص کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکایا۔ ساتھ ہی یہود نے بت پرستی کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیئے اور اب کے بار حملہ کے نتیجہ میں ان کو فتح کا یقین دلانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

بنو نضیر یہودی اپنے ان ارادوں میں کامیاب ہو گئے۔ چاروں طرف کفار کا سیلاب مدینہ

منورہ اور صاحب مدینہ منورہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تاراج کے لئے امڈ آیا۔

ابوسفیان مکہ سے چار ہزار جنگجو تیغ زن لے کر نکلا جس میں تین سو کمیت گھوڑوں پر سوار تھے اور ایک ہزار ہوا کی رفتار کے ساتھ چلنے والی سانڈنیاں تھیں۔ لشکر کا علم دارالندوہ میں بیٹھ کر سیا گیا۔ بانس پر چڑھایا گیا اور عثمان بن طلحہ جس کا باپ غزوۂ بدر میں علمبرداری کے منصب پر ہی مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا' اسے علمبردار بنایا گیا۔

بنو فزارہ

بنو فزارہ کے ان گنت نوجوان نکلے جن کے پاس سواری میں ایک ہزار تیز تر چلنے والی سانڈنیاں تھیں۔ ان کا سپہ سالار عینیہ بن حصن بن حذیفہ تھا۔

قبیلہ اشجع اور مرہ سے ہر ایک کے چار چار سو بہادر شامل ہوئے۔ جن کے امیر لشکر مسعر بن رخیلہ اور حارث بن عوف بالترتیب تھے۔ قبیلہ بنو سلیم جنہوں نے بمقام قرقرہ اپنے خروج کی سزا پائی تھی۔ سات سو سوار لے کر آ پہنچے۔ اسی طرح بنو اسد سب کی مجموعی تعداد دس ہزار کے قریب ہو گئی۔ لشکر کے سپہ سالار اعظم ابوسفیان بن حرب تھے۔ محاصرہ کے درمیان عرب باری باری لڑتے۔ اگر آج ان میں سے ایک مورچہ پہ آتا تو دوسرے دن دوسرا میدان میں اترتا۔ ہر ایک قبیلہ کا سردار اپنے سپاہیوں کو ہر وقت جنگ کے لئے اکساتا رہتا۔

مسلمانوں کی گھبراہٹ

مدینہ میں یہ تمام خبریں پہنچ رہی تھیں۔ بحیثیت انسان مسلمان ڈر رہے تھے کہیں اتنا بڑا عسکری سیلاب انہیں صفحہ ہستی سے مٹا نہ دے؟ کبھی ان کے دل میں غزوہ احد کا وہ واقعہ یاد آ جاتا کہ وہاں تو ان کو اس سے کم فوج نے شکست دی تھی۔ اب اتنے بڑے لشکر کے سامنے وہ کس طرح ثابت قدم رہ سکیں گے جو تعداد' سواری' اسلحہ اور رسد میں اس قدر قوت کا مالک ہے؟

مجلسِ مشاورت اور خندق

طے یہ پایا کہ مدینہ منورہ میں رہ کر مدافعت کی جائے۔ کھلے میدان میں مقابلہ کرنے کا مشورہ مسترد کر دیا گیا۔ لیکن اس مجلسِ مشاورت میں سلمان فارسی بھی تھے۔ جو جنگ کے ماہر بھی تھے اور مدافعتی جنگ میں "خندق" کے فوائد سے بھی آگاہ تھے۔ عرب خندق سے ناواقف تھے۔ انہوں نے مشورہ دیا سب نے قبول کیا تو ان کے نقشہ کے مطابق خندق کی کھدائی شروع کر دی گئی۔ جس میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی شامل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پتھر توڑتے۔ کھدائی میں نکلنے والی مٹی کو ٹوکریوں تگاروں میں بھرتے' سر پر اٹھاتے باہر پھینکتے اور مسلمانوں

کے حوصلے بڑھاتے۔ صحابہ جدوجہد کو اور تیز کر دیتے۔ بنو قریظہ کے یہود اب تک مدینہ منورہ میں ہی تھے۔ ان کے ساتھ خیر سگالی معاہدہ بھی تھا کھدائی کا تمام سامان کدالیں، پھاوڑے، گیندارے اور تگارے ٹوکریاں سب یہودیوں سے ہی لئے گئے۔

خندق مکمل ہو گئی

چھ روز میں خندق مکمل ہو گئی۔ اس عرصہ میں ان مکانوں کی مرمت بھی کر ڈالی گئی جو دشمنوں کی زد میں آ سکتے تھے۔ اور خندق سے باہر دو فرلانگ کے فاصلہ کے اندر تھے۔

بچوں اور عورتوں کو محفوظ حویلیوں میں یکجا کر دیا گیا اور خندق کے اندرونی کناروں پر پتھروں کے ایسے چھوٹے موٹے ٹکڑے جمع کر دیئے گئے جو وقت پڑنے پر دشمنوں پر برسائے جا سکیں۔

کفار کی جھنجلاہٹ

کفار اور ان کے مددگاروں نے اس ٹیلے کے کنارے مورچہ بنا لیا۔ جس کے پاس وادی رومہ کا پانی سمٹ کر جمع ہوتا تھا۔ غطفان اور ان کے جگری دوستوں نے مدینہ کی وادی نقمی کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔

صرف تین ہزار مجاہدین

کفار کے اتنے بڑے سیلاب کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ صرف تین ہزار مجاہدین تھے۔ خندق سے شہر کی طرف سلع نامی پہاڑی کی پشت کی طرف مجاہدین کا مورچہ تھا جس میں فخرِ کائنات ﷺ کے لئے سرخ رنگ کا خیمہ نصب کیا گیا تھا۔

10 ہزار کفار اور تین ہزار مجاہدین کے درمیان خندق حائل تھی، قریش اور ان کے فریب خوردہ لشکروں کو خندق کا عبور کرنا موت سے کھیلنے کے مترادف محسوس ہوا۔ انہوں نے تیر برسانا شروع کر دیئے جن کے جواب میں ادھر سے بھی تیروں کی برسات ہوئی۔

غیبی فوج کی یلغار کا ایک حملہ

سخت سردی کا موسم اور انتہائی شدید جاڑا جس میں اللہ تعالیٰ نے اور توانائی بخش دی۔ اس پر ٹھنڈی ہوا اللہ کے حکم سے اور تیز ہو گئیں۔ ادھر ابو سفیان اور ان کے ساتھیوں کو یہ یقین کہ خندق انہیں مدت تک کامیاب نہیں ہونے دے گی۔ ہوا کی سرد لہریں تیز چابک بن کر ان پر برس رہی تھیں۔ ہر شخص سخت سردی میں ٹھٹھرا جا رہا تھا۔ کفار اپنے اپنے گھروں میں لاکھ بے سرو سامان سہی مگر اہلِ مکہ اور غطفان کے گھر اور خیمے تو سرد خانہ نہ تھے۔ اس پر سردی نے ان پر ایسا خوف طاری کر دیا کہ اگر ہم سب کی روحیں شدید سرد لہروں کی گرفت میں آ گئیں تو یہ

یثربی خیمے ان کو موت سے بچا نہیں سکیں گے۔ جبکہ یہاں آنے سے پہلے وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہم غزوۂ احد کی طرح ایک ہی دن میں میدان مار لیں گے۔ مجاہدین کے مالِ غنیمت سے مالا مال ہو کر فتح و کامرانی کے شادیانے بجاتے ہوئے دوسرے دن اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جائیں گے۔

بنو نضیر کے یہودیوں نے غطفان قبیلہ کے لوگوں سے یہ وعدہ کر رکھا تھا کہ فتح کے بعد خیبر کے سرسبز و شاداب باغات کے میووں کی پوری فصل تمہاری خدمت میں پیش ہو گی۔ بنو غطفان کے دماغوں پر یہ بھوت سوار تھا کہ فتحِ مدینہ کے بعد فخر و غرور کے ساتھ پھلوں کی بھری ہوئی ٹوکریاں بھی ان کے ساتھ ہوں گی۔

ایک طرف تو امیدوں کے انبار اور سامنے خندق حائل۔ جس کا عبور کرنا ان کی ہمت سے باہر۔ یہ دیکھ کر کفار کو اپنی ناکامی کا یقین ہو گیا۔ اب بنو نضیر کو یہ کھٹکا بھی لگا ہوا تھا کہ اگر قبیلہ غطفان نے سردی کی شدت سے گھبرا کر خیبر کے پھلوں کا لالچ چھوڑ دیا اور سرد لہروں سے جان بچانے کے لئے بھاگ گئے تو کیا ہو گا۔ کفارِ مکہ کو غزوۂ بدر میں لگے ہوئے زخم اب بھی رس رہے تھے۔ خندق اور مدینہ کے قلعوں نے ان کے زخموں پر نمک چھڑک دیا۔ حملہ آوروں کو یثرب میں رہنے والے یہود بنو قریظہ کی وجہ سے یہ خطرہ بھی تھا کہ ان کی طرف سے معاہدہ کے تحت مسلمانوں کی امداد میں محاصرہ کی طویل مدت تک کمی نہیں آنے پائے گی۔ کبھی ان کے دل میں یہ خیال آتا کہ حملہ سے دستبردار ہو کر لوٹ جانے میں کیا حرج ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آتا کہ آج کے بعد شاید پھر کبھی اتنی فوج ہمارا ساتھ دینے کے لئے جمع نہ ہو۔

اس مرتبہ حی بن اخطب کے کہنے سے یہودی اپنے برادرانِ ملت بنو قینقاع کی بناء پر انتقام کے لئے تیار ہو گئے۔ انہوں نے سوچا اگر یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا اور لشکری اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تو یہ محمد ﷺ کی فتح مبین ہو گی۔ جس کے بعد ہمیشہ کے لئے یہود کا کوئی ٹھکانہ نہ رہے گا۔ چنانچہ بنو نضیر کے سرغنہ حی بن اخطب کے دماغ میں ایسے کئی خطرات کروٹیں لینے لگے اپنا انجام سوچ کر وہ تھرتھرانے لگا۔ اس نے اپنا آخری داؤ چلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس نے سوچا جس طرح بھی ہو یہود بنو قریظہ کو مسلمانوں کے ساتھ عہد شکنی پہ آمادہ کیا جائے۔ اگر اس میں کامیابی ہو گئی تو رسول اللہ ﷺ کی رسد ختم ہو جائے گی۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ فتح ہمارے قدموں میں ہو گی۔ اس خوش فہمی میں حی بن اخطب نے جب کفارِ مکہ کے سامنے اپنی تجویز پیش کی تو سب کے سب خوشی کے مارے اچھل پڑے۔

دو یہودی ملے

حی بن اخطب کے اس منصوبہ کی خبر جب بنو قریظہ کے سردار کعب بن اسد تک پہنچی تو

اس نے حی بن اخطب کے واپس آنے سے پہلے اپنے قلعہ کی فصیل کا بڑا دروازہ مقفل کر دیا۔ ہرچند اسے یقین تھا کہ عہد شکنی کے بعد اگر مسلمان مغلوب ہو گئے تو تمام یہود کو بہت زیادہ فائدہ پہنچے گا مگر حملہ آوروں کی شکست بنو قریظہ کو کہیں کا نہیں رہنے دے گی۔ لیکن حی بن اخطب نے انتہائی اصرار کے بعد کعب بن اسد کو دروازہ کھولنے پر راضی کر ہی لیا۔

حی نے کعب سے کہا۔ کعب تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ میں نے تو تمام جہان کا بہترین لشکر جمع کر لیا ہے۔ کفار (قریش) اور بنو غطفان اپنے اپنے سرداروں کی سرکردگی میں تلواریں سونتے کھڑے ہیں۔ ان کا آپس میں عہد ہو چکا ہے کہ وہ محمد ﷺ اور ان صحابہ کرام کا اس دنیا سے نام و نشان مٹا کر ہی پیچھے ہٹیں گے۔ یہ سب سن اور دیکھ کر بھی اللہ کی شان کعب متردد تھا۔ اس نے رسول اللہ ﷺ کے ایفائے عہد اور صداقت گفتار کی تعریف کی اور کہا ان کا حسن اخلاق عہد شکنی میں حائل ہے۔ جاؤ تم اپنا کام کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارا حشر بھی خراب ہو۔

اس کورے جواب کے بعد بھی حی بن اخطب نے کعب کو منوانے کی جان توڑ کوشش کرتے ہوئے اپنے رنگ میں محمد ﷺ کے ہاتھوں سے یہودیوں کو پہنچنے والی تکلیفوں کو ڈرامائی انداز میں دہرایا اور کہا کہ اگر یہ لشکر ناکام ہوا تو تمہارا بھی وہی حشر ہو گا جو اس سے پہلے تمہارے یہودی بھائیوں کا ہوا ہے۔ ہوش سے کام لو۔ حی نے حملہ آور لشکر کی تعداد اور جمعیت کی تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور کہا اگر خندق ہمارے درمیان حائل نہ ہوتی تو ہم نے اب تک اپنے ارادوں میں شاندار کامیابی حاصل کر لی ہوتی۔

آخر کار کعب نرم پڑ گیا۔ اس نے پوچھا فرض کرو اگر حملہ آور ناکام لوٹے تو پھر ہمارے تحفظ کی صورت کیا ہو گی۔ حی نے کہا ہم سب تمہارے ہی قلعہ میں آ جائیں گے اور تمہارے ساتھ دکھ سکھ میں شریک ہوں گے۔

یہودی کی عہد شکن فطرت ابھری

کعب بن اسد میں عہد شکن فطرت نے انگڑائی لی۔ اس نے اپنے یہودی بھائی حی بن اخطب کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر تحریری معاہدہ ختم کر دیا۔ باہم وفاداری کے عہد و پیمان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

دانائے سبل علیہ الصلوٰۃ والسلام

رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے کسی صورت بنو قریظہ اور حملہ آوروں کی سازشوں سے مطلع فرما دیا تو فوراً" وفائے عہد اور معیارِ اخلاق کی لازوال ہستی محمد ﷺ نے تصدیق کے لئے کعب بن اسد سے گفتگو کے لئے ایک وفد بھیجا۔ جس میں اوس و خزرج کے

سربرآوردہ یعنی دو دو ممتاز ترین فرد (1) حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ یہ قبیلہ اوس (2) قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ (3) جناب خوات بن جبر رضی اللہ عنہ اوسی اور (4) حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا اور ساتھ ہی ہدایت فرمائی کہ وہاں سے واپسی پر اپنے مسلمان بھائیوں سے وہاں کی گفتگو کو مبہم انداز میں بیان کریں۔

کعب کے پاس پہنچے تو اس نے اپنی اوقات کا بھرپور مظاہرہ کیا۔ خوب اناپ شناپ بکا مگر وفد کے حکیمانہ اصرار پہ اس نے یہ شرط پیش کر دی کہ "پہلے بنو نضیر کو شہر میں دوبارہ آباد کیا جائے"۔

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کا بنو قریظہ کے ساتھ ذاتی معاہدہ بھی تھا۔ انہوں نے ازراہ ہمدردی کعب سے فرمایا کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کا حشر بھی بنو نضیر سا ہو۔ مگر بنو قریظہ کے دل بدل چکے تھے۔ انہوں نے الٹا یہ جواب دیا "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون ہے؟ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کے ساتھ ہمارا کوئی معاہدہ نہیں۔ یہاں تک کہ فریقین میں سخت کلامی ہوتے ہوتے رہ گئی۔

مسلمانوں کے سفیر رضی اللہ عنہم واپس تشریف لے آئے۔ بنو قریظہ کی عہد شکنی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت متاثر کیا۔ خطرات بڑھ گئے' منفی سوچ کا اندیشہ لاحق ہو گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عہد شکن بنو قریظہ کفار کو شہر میں داخل ہونے کا راستہ نہ دے دیں۔ جس سے کفار مسلمانوں کو پیس کر رکھ دیں۔ یہ خیال و وہم میں بھی نہ تھا کہ مسلمانوں کو بنو قریظہ کے رسد بند کرنے کا خطرہ بھی اس نئی صورتحال میں شامل ہے۔

حی بن اخطب کی واپسی پہ کفار کا جوش و خروش

بنو قریظہ کے ہاں حی بن اخطب کی کامیاب واپسی نے قریش اور غطفان کے حوصلے بڑھا دیئے۔ کعب اور حی دونوں میں طے ہوا تھا کہ ادھر بنو قریظہ دس روز تک جنگ کی تیاری کر لیں۔ اس مدت میں بلاتامل حملہ آوروں کو مسلمانوں پہ حملہ کر دینا چاہیے۔

جنگی مورچوں کی صورتحال

الف۔ مشرق (فوق الوادی) کی طرف بنو اسد اور بنو غطفان بڑھے' مالک بن عوف النصری اور عنیبہ بن حصن الفزاری دونوں ان کی کمان کر رہے تھے اور طلیحہ بن خویلد الاسدی بنو اسد کی کمان کر رہا تھا۔

ب۔ مغرب کی طرف بطن وادی ۔ بمصداق قرآن حکیم و من اسفل منکم 33۔ (تمہارے نیچے کی طرف سے) کی سمت پر قریش اور بنو کنانہ جن کی کمان ابو سفیان کے ہاتھ میں تھی۔

ج۔ خندق کی طرف سیدھے رخ عمرو بن سفیان ابو الاعور سلمی۔

کفار کے لشکر اور مومنین (مجاہدین) دونوں کے موقف پر یہ آیات نازل ہوئیں۔

اذ جا ؤکم من فوقکم ومن اسفل منکم واذ زاغت الابصار وبلغت القلوب الحناجر وتظنون باللہ الظنونا۔ ھنالک ابتلی المومنون وزلزلوا زلزالا شدیدا"۔ واذ یقول المنافقون والذین فی قلوبھم مرض ماوعدنا اللہ ورسولہ الاغرورا" (33:10-12)

اور جب وہ تمہارے اوپر اور نیچے کی طرف سے تم پر چڑھ آئے اور جب آنکھیں پھر گئیں اور دل مارے دہشت کے گلوں تک پہنچ گئے اور تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگ گئے وہاں مومن آزمائے گئے اور سخت قسم کے طور پہ ہلائے گئے اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری ہے کہنے لگے کہ اللہ اور اس کے رسول نے تو ہم سے غلط وعدہ کیا تھا!

واذ قالت طائفۃ منھم یا اھل یثرب لامقام لکم فارجعوا ویستاذن فریق منھم النبی یقولون ان بیوتنا عورۃ وماھی بعورۃ ان یریدون الافرارا"

اور جب ان میں سے ایک جماعت کہتی تھی کہ اے اہل مدینہ یہاں تمہارے ٹھہرے کا مقام نہیں' لوٹ چلو۔ اور ایک گروہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے اجازت مانگنے لگا اور کہنے لگا۔ ہمارے گھر کھلے پڑے ہیں حالانکہ وہ کھلے نہیں تھے۔ وہ تو صرف بھاگنا چاہتے تھے!

پریشانی اور مسلمان

بظاہر مصیبتوں نے مسلمانوں کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ان کے دل دشمنوں کے ہجوم کو دیکھ کر گھبرا گئے۔ محصورین میں سے منافقوں کے جس گروہ کے منافقانہ کارنامے ہزار شکووں کے لائق تھے انہوں نے الٹا مجاہدین کو کہنا شروع کر دیا۔ کہ ہم سے تو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسریٰ اور قیصر کے خزانوں پہ قابض ہونے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر اب تو یہ حالت ہے کہ ہم قضائے حاجت کے لئے بھی شہر سے باہر نہیں جا سکتے۔

ان میں سے ایسے لوگ بھی تھے جن کی آنکھیں دشمنوں کے ہجوم کو دیکھ کر پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ بعض ایسے تھے جن کے دلوں میں خوف نے بسیرا کر لیا تھا۔ یہ لوگ کفار اور غطفان کی تلواروں کی چمک اپنے لئے اچک لے جانے والی بجلی کے مترادف سمجھتے تھے۔ کچھ لوگوں کے دلوں کو بنو قریظہ کی عہد شکنی نے پارہ پارہ کر دیا تھا۔ وہ کہتے اے یہود تم پر اللہ کی لعنت ہو۔ کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنو نضیر کو جلاوطن کرنے کی بجائے ان کو قتل کر دیتے۔ تو آج ان کے ہاتھوں یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ افسوس ہو حی ابن اخطب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی دن کے لئے اسے زندہ رہنے دیا کہ تو قریش اور قبائل عرب کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا دے۔ کاش جس زمین پر آج ہم نے خندق کھود کر اپنا بچاؤ کیا ہے زمین کا یہ ٹکڑا حی بن اخطب اور اس کے حاشیہ برداروں کے خون سے سیراب ہو جاتا تاکہ اس کے دل میں مسلمانوں کا لہو پینے کی

تڑپ نہ رہتی۔ آہ! اے بہت بڑی آفت۔

اور صد بار آہ۔ صد افسوس بہت بڑا صدمہ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میدانِ محشر قائم ہے۔

مختصر یہ کہ حی بن اخطب کی واپسی پر کفار کا جوش شباب پر آگیا اور خندق کا ایک کنارہ سمٹا ہوا دریافت کر لیا گیا۔ لہٰذا یہاں سے خندق پار کرنے کا فیصلہ ہوا۔

سب سے آگے قریش کی صفیں تھیں۔ ان میں سے سب سے بڑا سورما عبدود آگے آیا۔ اس کے ساتھ عکرمہ بن ابوجہل اور ضرار بن الخطاب وغیرہ نے خندق کے کنارے پہ گھوڑے کو ایسی ایڑھ لگائی کہ آنکھ جھپکتے ہی مسلمانوں کے روبرو پہنچ گئے۔ ادھر سے علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور حملہ آوروں کا راستہ روکا۔ یہ دیکھ کر عبدود نے مدِمقابل مانگا تو علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھے۔ عمرو بن عبدود نے کہا۔ اے عزیز من میں تجھے قتل نہیں کرنا چاہتا مگر علی رضی اللہ عنہ آگے بڑھ کر کہا لیکن میں تو اپنی ذوالفقار تمہارے خون سے تر کرنا چاہتا ہوں۔ دونوں بہادروں کا آمنا سامنا ہوا۔ آخر علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں عبدود واصلِ جہنم ہوا۔ عمرو بن عبدود کے ساتھی نے اپنے سب سے بڑے پہلوان کو ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مرتے دیکھا تو اس طرح بھاگے کہ پھر مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

غروبِ آفتاب کے بعد

حملہ آوروں میں سے نوفل بن عبداللہ بن حمزہ خندق کو عبور کرنے کے لئے آگے بڑھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو ایسا چابک رسید کیا کہ اپنے ہاتھ گھوڑے کو بھی موت کے اندھیرے کنوئیں میں اوندھے منہ گرا لیا۔ ابو سفیان نے نوفل کی لاش حاصل کرنے کے لئے دیت میں ایک سو اونٹ پیش کئے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھکراتے ہوئے فرمایا' خبیث کی دیت ناقابلِ قبول ہے اس کی لاش مٹی میں دبا دی گئی۔

بنو قریظہ کی حرکتیں

حملہ آوروں نے رات کے وقت بہت بڑا الاؤ دھکایا۔ جس کے شعلوں سے مسلمانوں کو ڈرانا مقصود تھا۔ اسی رات بنو قریظہ کے بہادر قلعوں اور برجیوں سے نکل کر شہر میں گشت کرنے لگے۔

سیدہ صفیہ رضی اللہ عنہا کی بہادری

شاعرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حسان بن ثابت کی حویلی میں مسلمان عورتوں کو یکجا کر دیا گیا تھا۔ ان میں سیدہ صفیہ بنت عبدالمطلب بھی تھیں۔ انھوں نے ایک یہودی کو حویلی کے اردگرد

گھومتے دیکھا تو حسان بن ثابت کو اطلاع دی' ذرا اس یہودی نامراد کو تو دیکھو کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری جاسوسی کر کے حملہ کروا دے! رسول اللہ ﷺ کی توجہ دوسری طرف ہے لہٰذا حسان آپ جائیے اور اس کا خاتمہ کر دیجئے حسان نے جواب دیا۔ اے بنتِ عبدالمطلب اللہ تعالیٰ آپ کو معاف فرمائے میں وہ مرد نہیں جسے کسی پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت ہو۔

حسان کا یہ جواب سن کر خود لاٹھی لے کر بڑھیں اور یہودی کو قتل کرنے کے بعد فرمایا۔ میں تو مرد کے بدن سے اسلحہ اور پوشاک نہیں اتار سکتی یہ کام تو آپ کر لائیے۔ مگر حسان بن ثابت میں یہ جرأت بھی نہ تھی۔ جواب دیا مجھے ان چیزوں کی ضرورت ہی نہیں۔

سیرت نگاروں کی ایک غلطی

بعض سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ محصور مسلمان خائف ولرزاں تھے اور رسول اللہ ﷺ نے بنو غطفان کو محاصرہ سے دست بردار ہونے کے بدلہ پیداوار کا ایک تہائی حصہ پیش کرنے کا پیغام بھیجا ادھر غطفان اپنی جگہ پشیمان تھے۔ کہ انہوں نے یہود کی باتوں میں آ کر کیا حاصل کیا۔

نعیم رضی اللہ عنہ بن مسعود اشجعی کی تدبیر

ابھی ان کے مسلمان ہونے کی خبر عام نہیں ہونے پائی تھی کہ نعیمؓ نے ایک مہم کا آغاز کیا۔ بنو قریظہ سے پرانی رسم و راہ ہونے کی بنا پر ان کے پاس گئے۔ اور اپنے دیرینہ تعلقات میں مزید گرمی پیدا کر کے کہا۔ آپ لوگوں نے تو بڑا کمال کیا۔ قریش مکہ اور بنو غطفان کو محمد ﷺ کے خلاف ایک جھنڈے تلے جمع کر دیا لیکن اب حالات کے تیور بتا رہے ہیں کہ کفار مکہ (قریش اور بنو غطفان) دونوں کا مزید رکنا محال ہے۔ اگر ایسا ہوا وہ لوگ محاصرہ چھوڑ کر چلے گئے تو محمد ﷺ کے غصہ کا نشانہ تو آپ لوگ بنیں گے اور وہ آپ سے بدلہ لئے بغیر چھوڑیں گے نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ جب تک آپ قریش مکہ (کفار) اور بنو غطفان دونوں کے چند آدمی بطور یرغمال اپنے قبضہ میں نہ لے لیں لڑائی میں ان کی مدد نہ کریں۔ بنو قریظہ کو نعیم کی یہ تجویز بہت پسند آئی۔

نعیم رضی اللہ عنہ قریش کے ہاں

نعیم بنو قریظہ کے ہاں سے اٹھ کر قریش (کفار) کے پاس پہنچے اور ان سے اس طرح گفتگو فرمائی۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بنو قریظہ محمد ﷺ کے ساتھ اپنی عہد شکنی پر پشیمان ہیں اور انہیں خوش کرنے کے لئے مختلف تدبیریں سوچ رہے ہیں جس میں سے ان کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اگر ان کے ہاتھ میں قریش کے کچھ آدمی آ جائیں تو وہ محمد ﷺ کو خوش کرنے کے

لئے ان آدمیوں کو قتل کرنے کی غرض سے پیش کر دیں۔

نعیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بنو غطفان کے پاس

یہاں سے نعیم بن مسعود سیدھے غطفان کے پاس پہنچے اور جو کچھ قریش سے کہا تھا ان سے بھی وہی کہا اور قریش کی طرح انہیں ہوشیار کرتے ہوئے تاکید کی کہ وہ اپنے آدمی بنو قریظہ کے حوالے نہ کریں۔

نعیم کی تجویز نے قریش اور بنو غطفان کے دلوں میں شبہ پیدا کر دیا۔ لہٰذا ابوسفیان نے اپنے قاصد کے ذریعہ کعب بن اسد یہودی کو پیغام بھیجا۔

کعب ہمیں اس شخص (محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا محاصرہ کئے ہوئے اتنی مدت گزر گئی کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ میری تجویز یہ ہے کہ آپ کل صبح حملہ کر دیں اور ہم آپ کی کمک پر ہوں گے۔

بنو قریظہ کا جواب

کل یوم السبت (ہفتہ کا دن) ہے اس روز دنیا کا کوئی کام ہو یا جنگ نہیں کیا جا سکتا۔

ابوسفیان کا دوسرا پیغام

(یہ یقین کر لینے کے بعد کہ نعیم نے ان کے بارے میں صحیح کہا ہے) ابوسفیان نے دوسرا پیغام بھیجا۔ اے دوست اس سبت کی عبادت کسی دوسرے سبت میں کر لیجئے گا مگر کل کے روز محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر حملہ کرنا ضروری ہے۔ کل ہم جنگ کے لئے نکلے اور آپ نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہم سمجھیں گے آپ نے ہم سے معاہدہ توڑ کر محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حلیف بن گئے ہو۔

جواب ملا، سبت کے روز ہم کسی طرح بھی جنگ میں شریک نہیں ہو سکتے کیونکہ جن لوگوں نے اس دن کی عظمت سے منہ پھیرا ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور خنزیر بنا دیئے گئے۔

اس کے ساتھ ہی بنو قریظہ نے ابوسفیان سے اپنے چند آدمی بطور یرغمال اپنی تحویل میں رکھنے کے لئے مانگ لئے۔ یہ جواب ملتے ہی ابوسفیان کو نعیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بات کا پورا پورا یقین ہو گیا۔ ادھر کوئی بات بنتی نظر نہ آئی۔ اب اس نے بنو غطفان سے مشورہ کیا مگر وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے مدینہ کی پیداوار میں حصہ لینے کے فراق میں تھے۔ جسے بعد میں سعد بن عبادہ سے صاف صاف جواب ٹل گیا۔ بہرحال ابوسفیان کی حوصلہ افزائی کا کوئی سامان نہ بنا۔

اللہ کی افواج حرکت میں آئیں

اسی رات تیز آندھی اپنے ساتھ موسلا دھار بارش کا طوفان لے کر کفار پہ چھا گئی۔ بادلوں کی ہولناک گرج، بجلی کی کڑک، چمک، کفار کے خیمے زمین سے اکھڑ کر ہوا میں معلق ہو گئے۔

کھانے کی دیگیں اوندھی ہو کر چولہوں میں گر گئیں، ہر کافر کے جسم پر خوف کا رعشہ طاری ہو گیا۔ انہیں اس خطرہ نے بدحواس کر دیا کہ اگر اس حالت میں مجاہدین نے حملہ کر دیا تو ہمارا حشر کیا ہو گا؟

قبیلہ اسد کے سپہ سالار طلیحہ بن خویلد نے بلند آواز سے پکار کر کہا۔ دوستو۔۔۔ یہ مصیبت محمد ﷺ کی بھیجی ہوئی آئی ہے۔ یہاں سے بھاگ کر نجات حاصل کرو۔

ابوسفیان کا پتہ بھی پانی ہو گیا۔ وہ بھی چلا اٹھا۔ برادرانِ قریش طوفان نے ہماری سواری کے گدھے، گھوڑے، اونٹ سب بھگا دیئے۔ بنو قریظہ پہلے ہی سے بدعہدی کر کے ہم سے الگ ہو چکے ہیں۔ اس پہ آسمانی آفت خوفناک طوفان بادو باراں اب ہمارا ایک لمحہ بھی یہاں ٹھہرنا محال ہے۔

بدنصیب اتنے سراسیمہ ہو چکے تھے کہ بھاگتے ہوئے اپنا سامان بھی اٹھا کر نہ لے جا سکے۔ ان کے فرار پر بھی ہوا نے ان کے قدم زمین پر جمنے نہ دیئے۔ اب بھاگنے میں سب سے آگے کفارِ مکہ تھے، ان کے پیچھے بنو غطفان اور ان کے پیچھے دوسرے قبائل۔ اتنی درگت ہونے پر بھی تقدیم و تاخیر کی ترتیب نظرانداز نہ ہوئی۔

صبح صادق ہوئی تو نبی رحمت للعالمین ﷺ نے مورچہ دشمنوں سے خالی پایا تو شہر میں لوٹ کر ایک ایک مسلمان نے اللہ تعالیٰ کے حضور میں ہدیہ شکر اور احسان پیش کیا کہ انہیں اس آفت سے نجات ملی۔ قرآن حکیم میں اس کا ذکر یوں ہے۔

ورد الذین کفروابغیظھم لم ینالواخیرا ؕ وکفی اللہ المومنین القتال۔ (35:33)

اور جو کافر تھے ان کو اللہ عزوجل نے پھیر دیا۔ وہ اپنے غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔ کچھ بھلائی حاصل نہ کر سکے اور اللہ تعالیٰ ایمان والوں کے لئے لڑائی کے بارے میں کافی ہوا۔

شامتِ اعمال صورت نادر گرفت

دشمنوں کے لوٹ جانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو اطمینانِ قلب نصیب ہوا تو مستقبل کا جائزہ لیا۔ یہودی جو اس مرتبہ کفار کو اور عرب قبائل کو اکسا کر لے آئے تھے کیا وہ آئندہ بھی ایسا کر سکتے ہیں؟ یا سخت جاڑے کے موسم سے احتیاط بھی برت سکتے ہیں۔ خصوصاً بنو قریظہ کے رویہ نے آپ کا ذہن اس طرف منتقل کر دیا۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ کفار اور غطفان میں اختلاف کی صورت پیدا نہ فرماتے اور انہوں نے کفار کو رستہ دے دیا ہوتا تو مسلمانوں کا بالکل قلع قمع ہو جاتا۔

اس وقت بنو قریظہ ہمارے دباؤ میں سہی مگر یہ دباؤ ایسا ہے جیسے سانپ کی دم زخمی ہو گئی اور باقی صحیح سلامت ہے۔ ایسا سانپ کسی وقت بھی ڈس سکتا ہے اس لئے بنو قریظہ کی سرکوبی ضروری ہے۔

اعلان کر دیا گیا

رسول اللہ ﷺ نے اعلان کروا دیا۔

من کان سامعاً مطیعاً فلا یصلین العصر الا ببنی القریظہ

جو شخص ہمارا وفادار ہے اسے حکم دیا جاتا ہے کہ وہ عصر کی نماز محلہ بنو قریظہ میں ادا کرے۔

اور اس اعلانِ عام کے ساتھ ہی علی رضی اللہ عنہ کی تحویل میں مجاہدین کا دستہ دے کر بنو قریظہ کے محلّہ میں بھجوا دیا۔ اگرچہ مجاہدین طویل محاصرہ کی وجہ سے ذہنی اور جسمانی تناؤ سے تھکے ہوئے تھے لیکن بنو قریظہ کے معاملہ میں انہیں اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

اگرچہ دشمن مضبوط قلعوں میں محفوظ تھے۔ لیکن مجاہدین اس سے پہلے اسی طرح کے قلعوں میں بنو قریظہ کے ہراول بنو نضیر کا حشر دیکھ چکے تھے۔ دونوں میں اگر فرق تھا تو صرف اتنا کہ بنو نضیر کے مقابلہ میں ان کے قلعے ذرا مضبوط تھے۔ مسلمانوں کو اب بنو قریظہ کی طرف سے گو حملہ کا خطرہ نہ تھا۔ کفارِ مکہ بھاگتے ہوئے سامانِ رسد اتنا چھوڑ گئے تھے کہ مجاہدین کو قلتِ رسد کی فکر ہی نہ تھی۔

محاصرہ

مجاہدین علی رضی اللہ عنہ کے پیچھے پیچھے خوش و خرم جانا شروع ہوئے' جب مطلوبہ مقام پہ پہنچے تو حی بن اخطب اور دوسرے یہودی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں بدزبانی کر رہے تھے۔ کبھی نبی ﷺ کو کچھ کہا جاتا' کبھی کچھ بکواس کی جاتی۔ کبھی حرمِ مطہرات کی شان میں زبانیں آلودہ کی جا رہی تھیں۔ کفار کے لشکر کی ناکام واپسی نے ان کو مخبوط الحواس بنا دیا تھا۔ وہ اپنا حشر جان چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

بنو قریظہ سے سوال

اس اثناء میں نبی اکرم ﷺ تشریف لے آئے۔ علی رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر عرض کیا۔ آپ ﷺ ان کے سامنے نہ جائیے۔ آپ ﷺ نے پوچھا کہ یہ لوگ میرے بارے میں زبان درازی کر رہے تھے؟ علی رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یہی بات ہے یا رسول اللہ ﷺ۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ فکر نہ کرو ان میں اتنی ہمت نہیں کہ میرے روبرو بکواس کریں۔ آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر باآواز بلند کہا۔

یا اخوان القردہ ھل اخزاکم اللہ وانزل بکم نقمہ۔

اے بندروں کی برادری کیا اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذلیل نہیں کیا؟ اور تم پر اپنا غضب نہیں بھیجا تھا۔

یہود نے جواب دیا- یا ابو القاسم ماکنت جہولا اے ابو القاسم آپ ہماری تاریخ سے بے خبر نہیں ہیں- اب مجاہدین آتے جا رہے تھے اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے محاصرہ کا حکم نافذ فرما دیا-

مسلسل پچیس روز

بنو قریظہ کا مسلسل 25 روز تک محاصرہ رہا- اس درمیان میں ایک آدھ مرتبہ ان کی طرف سے اور مجاہدین کی طرف سے تیروں کا تبادلہ ہوا- مگر بنو قریظہ کو باہر نکل کر لڑنے کی ہمت نہ ہوئی- اب یہ لوگ گھبرا گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ ایک نہ ایک دن مجاہدین ان پر قابض ہو ہی جائیں گے اور ہماری قلعہ بندی ہمیں موت کے کنوئیں میں دھکیل کر ہی ہمارا پیچھا چھوڑے گی-

درخواست :- بنو قریظہ نے رسول کریم ﷺ کے پاس اپنا قاصد بھیجا اور درخواست کی کہ ابو لبابہ رضی اللہ عنہ کو ہمارے پاس بھیج دیجئے- ہم صلح کے معاملہ میں ان کے ذریعہ بات چیت کرنا چاہتے ہیں- ابو لبابہؓ قبیلہ اوس سے تھے- بنو قریظہ سے ان کا ذاتی معاہدہ بھی تھا- یہ ان کے پاس پہنچے تو یہودیوں کے بچے اور عورتیں سب ان کے اردگرد جمع ہو گئیں- سب نے رو رو کر کہرام مچا دیا جس سے ابو لبابہؓ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے- یہود نے کہا کیا آپ کو اس بات سے اتفاق ہے کہ ہم اپنے آپ کو محمد ﷺ کے حوالے کر دیں؟ ابو لبابہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں تم سے اتفاق کرتا ہوں اور اپنی گردن پر ہاتھ پھیر دیا- جس کا یہ مطلب تھا کہ اب جو چاہو کر لو تمہیں قتل ہونا ہی ہے- بروایت اربابِ سیرت بعد میں ابو لبابہ رضی اللہ عنہ اپنے اس اظہارِ حق پر نادم ہوئے اور خاموش چلے آئے-

تین مشورے

کعب بن اسد نے اپنی قوم کو تین مشورے دیئے- مگر انہوں نے ایک پر بھی آمادگی کا اظہار نہ کیا-

پہلا مشورہ- بہتر ہے کہ آپ لوگ مسلمان ہو کر اپنی جان مال اور اولاد کو تباہ ہونے سے بچا لو-

جواب- ہم تورات کو چھوڑ کر دوسری شریعت قبول نہیں کر سکتے-

دوسرا مشورہ- اپنے بچوں اور عورتوں کو خود قتل کر کے مقابلہ کے لئے نکل آؤ- پھر جو ہو سو ہو- اگر ہم ہلاک ہو گئے تو اپنی اولاد اور بیوی کی ہلاکت کا غم لے کر نہیں مریں گے- اگر زندہ بچ گئے تو اپنے اپنے گھر پھر آباد کر لیں گے-

جواب۔ اپنی اولاد اور بیویوں کو قتل کرنے کے بعد ہم زندہ بھی رہ گئے تو ہماری زندگی کا کیا فائدہ!

تیسرا مشورہ۔ تو پھر خود کو محمد ﷺ کے حوالے کر دیجئے لیکن ابولبابہ رضی اللہ عنہ کے اس اشارے کو نہ بھولئے کہ اپنے آپ کو ان کے سپرد کرنے کے بعد حشر کیا ہو گا۔

بنو قریظہ کی مشاورتی مجلس

بنو قریظہ کی عام آدمیوں پہ مشتمل مجلس مشاورت قائم ہوئی جس میں کعب بن احبار شامل نہیں ہوا۔ آپس میں مشورہ کے بعد ایک شخص نے یہ تجویز پیش کی گھبراتے کیوں ہو' ہمارا معاملہ زیادہ سے زیادہ بنو نضیر سے بڑھ کر کیا ہو گا۔ ہمیں امید ہے قبیلہ اوس کے بہت سے ہمدرد اس معاملہ میں ہماری مدد بھی کریں گے۔ لہٰذا ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیئے کہ ہم کو شام کی طرف جانے دیا جائے۔ اس عوامی فیصلہ کے ساتھ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے قاصد بھیج کر درخواست کی۔ ہمیں اپنا مال اور سامان لے کر شام کی بستیوں میں جانے دیجئے۔ مگر آنحضرت ﷺ نے مسترد کرتے ہوئے انہیں خود سپردگی کا حکم فرمایا۔

بنو قریظہ نے فوراً اپنا وکیل قبیلہ اوس کے مسلمانوں کے پاس بھیج کر ان سے درخواست کی۔ ہمارے اوسی بھائیو۔ جس طرح خزرج نے کل اپنے معاہدین بنو نضیر کی سفارش کی تھی۔ آپ بھی ہماری سفارش کیجئے اوس نے منظور کر لیا اور سرورِ دوعالم ﷺ میں پیش ہو کر عرض کیا۔ یا نبی ﷺ آپ نے خزرج کے حلیفوں کی سفارش قبول فرمائی تھی۔ اب بنو قریظہ ہمارے حلیف ہیں۔ ان کی سفارش کرنے کی ہمیں اجازت دیجئے۔ انہیں مال و اسباب لے کر مدینہ سے نکل جانے کی اجازت مرحمت ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا۔ کیا آپ لوگوں کو یہ بات پسند ہو گی کہ میں اپنے اور بنو قریظہ کے معاملہ میں کسی ایک شخص کو ثالث مقرر کر لوں؟ اوس نے فوراً قبول کرتے ہوئے عرض کیا۔ بے شک! تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا۔ بنو قریظہ کے ہاں جاؤ اور ان سے کہو میں اپنا اختیار بھی ان کو دیتا ہوں کہ وہ جس شخص کو چاہیں اسے میرے اور ان کے درمیان ثالث مقرر کر لیں۔

اس پر بنو قریظہ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو اپنا ثالث منتخب کر لیا۔ لیکن وہ یہ بات بھول گئے کہ جب یہی سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ ان کے پاس محاصرہ کے درمیان گئے تھے تو انہوں نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو کیا جواب دیا تھا۔ اس وقت انہوں نے نہ صرف مسلمانوں کی توہین کی بلکہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں بھی بکواس کی تھی۔

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ

سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پہلے دونو فریقوں سے اپنے فیصلہ پر پابند رہنے کا عہد لیا۔ پھر فیصلہ سنایا کہ

(الف) بنو قریظہ کے بالغ مرد قتل کئے جائیں۔

(ب) عورتیں اور بچے گرفتار کر لئے جائیں۔

(ج) ان سب کا مال اسباب ضبط کر کے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔

سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فیصلہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کی قسم سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپ کا فیصلہ ربِ دو عالم اور مسلمانوں کی مرضی کے مطابق حرف و بحرف صحیح ہے۔ مجھے بھی اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ یہی حکم دیا تھا۔

بازار کے وسط میں گہرے گڑھے کھودے گئے۔ مجرموں کو ٹولیوں کی صورت لایا گیا۔ ایک ایک کی گردن اڑائی گئی اور گڑھوں میں پھینک کر اوپر میں مٹی ڈال دی گئی۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ بنو قریظہ کے اسی انجام کی نشاندہی فرمائی ہو۔

وانزل الذیس ظاھرواوھم مں اھل الکتاب مں صیاصیھم وقذفی فی قلوبھم الرعب فریقاً تقتلوں وتاسروں فریقاً۔ واورثکم ارضھم دیارھم واموالھم وارضالم تطوھا وکان اللہ علی کل شئی قدیرا۔

(27 26:33)

اور اہل کتاب میں سے جنہوں نے ان کی مدد کی تھی۔ ان کو ان کے قلعوں سے اتار دیا اور ان کے دلوں میں دہشت ڈال دی تو کتنوں کو تم قتل کر دیتے تھے اور کتنوں کو قید کر لیتے تھے اور ان کی زمین اور ان کے گھروں اور ان کے مال کا اور اس زمین کا جس میں تم نے پاؤں بھی نہیں رکھا تھا۔ تم کو وارث بنا دیا اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

بنو قریظہ کو سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایسی امید نہ تھی بلکہ انہیں یہ یقین تھا کہ جس طرح ماضی میں عبداللہ بن ابی منافق نے بنو قینقاع کی سفارش کر کے ان کا خون معاف کروا دیا تھا۔ اسی طرح سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہماری بھی جان بخشی کروا دیں گے۔ لیکن بنو قینقاع اور قریظہ دونوں کا معاملہ بالکل متضاد تھا۔ سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے وہ حقیقی منظر تھا۔ جب یہی لوگ کفار کو مدینہ منورہ میں چور دروازے سے داخل ہونے کا راستہ دے رہے تھے۔ اگر اس وقت یہ لوگ کامیاب ہو جاتے تو مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی پود بھی نہ رہتی۔ ایک ایک مسلمان موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا اور کسی کی لاش مثلہ کے بغیر نہ چھوڑی جاتی۔ جیسا کہ کفارِ مکہ نے غزوۂ احد میں کیا تھا۔

مقتل اور یہود

جب حی بن اخطب کو جلاد کے سپرد کیا گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے مخاطب ہو

کر فرمایا۔ اے حی بن اخطب کیا اللہ تعالیٰ نے تم کو رسوا نہیں کیا؟

جواب۔ موت سے کون بچ سکتا ہے جس قدر میری عمر مقرر تھی مجھے مل چکی' اس موت پر بھی مجھے آپ کی دشمنی کا ملال نہیں۔ اس کے بعد حی بن اخطب نے دوسروں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ اے لوگو اللہ کے حکم سے گھبرانا مردانگی نہیں۔ ہم بنی اسرائیل کے نصیبوں میں یہ مصیبت بھی لکھی جا چکی تھی۔

اسی طرح زبیر بن باطا قرظی کا معاملہ ہے۔ جس نے یوم بعاث میں ثابت بن قیس (بن شموس خزرجی) کی جان بچائی تھی۔ آج ثابت رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا فیصلہ سن کر زبیر کے احسان کا بدلہ اتارنا چاہا۔ ان کی سفارش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زبیر کا خون معاف فرما دیا۔ مگر مجرم نے کہا۔ میں ذمہ دار مرد ہوں۔ اپنے اہل عیال کے بغیر زندگی پسند نہیں کرتا۔ حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی دوسری سفارش پر مجرم کے لڑکوں کا خون معاف کر دیا اور اس کی بیوی کو بھی آزادی دی گئی۔ اب زبیر نے ان سے ابن اخطب' عزال بن سموال اور دوسرے قرظی سورماؤں کے بارہ میں دریافت کیا۔ ان کے انجام کی تفصیل بتائی گئی تو مجرم نے کہا۔ آج کے دن میں احسان کا بدلہ یہ چاہتا ہوں کہ مجھے میری قوم کے پاس فوراً پہنچا دیا جائے میں اپنے دوستوں سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ جس کے لئے میں اتنا بے تاب ہوں کہ جتنا عرصہ کنوئیں میں ڈول رہ سکتا ہے اس سے بھی جلدی ان سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ بدنصیب مجرم کی یہ درخواست بھی قبول کر لی گئی ہے۔

اسی طرح ایک یہودی عورت کا واقعہ قابل ذکر ہے۔ سب کو معلوم تھا کہ مسلمان جنگوں میں عورتوں اور بچوں کو قتل نہیں کرتے تھے۔ مگر آج کے دن انہیں اس یہودیہ کے خون سے ہاتھ رنگنا پڑے جس نے ایک مسلمان کے سر پر چکی کا پاٹ گرا کر اسے شہید کر دیا تھا۔

مجرمہ نے کس دیدہ دلیری سے جان دی' ام المومنین حضرت عائشہ الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں۔

واللہ میں اس عورت کو نہیں بھلا سکتی جو مقتل میں خوش و خرم آئی اور ہنستے ہوئے اپنی گردن جلاد کے سامنے رکھ دی۔

یہود میں سے چار حضرات نے مسلمان ہونے کی آمادگی ظاہر کی' ان کا خون معاف کر دیا گیا۔

یہودی بنو قریظہ کا قتل

دراصل بنو قریظہ کا قتل ان کے دینی پیشوا حی بن اخطب کی گردن پر ہے جو خود بھی مسلمانوں کے ہاتھوں سے قتل ہوا۔ حی وہ مجرم تھا جس نے پہلے وہ معاہدہ ختم کیا جو اس نے اپنی

قوم بنو نضیر کو ساتھ لے کر مدینہ سے جلاوطن ہونے پر کیا تھا اور جس معاہدہ کی بدولت بنو نضیر میں سے ایک متنفس بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے قتل نہیں کیا گیا۔ لیکن حی بن اخطب نے عہد شکنی کی۔ قریش مکہ کے کفار کو ابھارا۔ بنو غطفان کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لئے اکسایا۔ تمام عرب میں ایک طرف سے لیکر دوسری طرف تک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف آگ لگا دی۔ حی بن اخطب کی ان ہی سازشوں سے مسلمان اور یہودیوں کے درمیان دشمنی کا پودا پلا' بڑھا' تناور درخت بنا اور چاروں طرف پھیل گیا۔ یہود کے دلوں کی حالت اسی طرح ہو گئی جیسے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو ملیامیٹ کئے بغیر ان کا دم گھٹ رہا ہو۔ پھر تمام عرب قبائل کو مسلمانوں کے خلاف اکسانے بھڑکانے کے بعد بنو قریظہ نے عہد شکنی کا وہ ناقابلِ معافی جرم کیا۔ جس کی مثال عرب میں کیا دنیا میں نہیں ملتی۔

اگر بنو قریظہ مذکورہ سازشوں کے محرک نہ ہوتے تو ان سے مسلمانوں کے الجھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر یہ قلعہ بند ہو کر جنگ شروع نہ کر دیتے یا اس موقع پر اپنے آپ کو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سپرد کر دیتے۔ تو ان کی گردنیں مارے جانے کی کوئی وجہ نہ تھی۔

لیکن حی بن اخطب کی فطرت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو دشمنی سمو دی گئی تھی وہ دشمنی بنو قریظہ تک متعدی مرض بن گئی۔ اس کی وجہ سے ان کے حلیف (سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی یقین ہو گیا تھا کہ اگر انہیں زندہ چھوڑ دیا گیا تو کل یہ پھر تمام عرب کو اکسا بھڑکا کر مدینہ منورہ پہ یلغار کروا دیں گے۔ اس لئے سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ فیصلہ جو بظاہر ناگوار نظر آتا ہے لیکن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی دانست اور یقین کے مطابق یہود کو زندہ رکھنا مسلمانوں کی پوری نسل کو ختم کروانے کے مترادف تھا۔

اموال کی تقسیم

بنو قریظہ کے اموال میں سے خمس علیحدہ کرنے کے بعد غازیوں میں سب تقسیم کر دیا گیا۔ ایک سوار کو تین حصہ دیئے گئے مگر پیادہ کو صرف ایک حصہ۔ بنو قریظہ پر چڑھائی کے موقعہ پر صرف چھتیس سوار تھے۔

بنو قریظہ کے قیدیوں کے لئے سعد بن زید انصاری کو حکم دیا گیا کہ انہیں نجد کی طرف لے جائیں۔ ان کی قیمت سے دشمنانِ اسلام کے حملوں کی مدافعت کے لئے اسلحہ خرید لائیں۔

بی بی ریحانہ

ان قیدیوں میں بی بی ریحانہ خمس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حصہ میں آئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اسلام کی تبلیغ فرمائی۔ جسے انہوں نے نامنظور کر دیا۔ اس کے بعد نبی

ﷺ نے ان سے فرمایا۔ تمہارے مسلمان ہونے پر میں تم سے عقد کرلوں گا۔
بی بی نے کہا۔ جناب کے عقد میں آنے کے بجائے میں کنیز کی مانند آپ کی خدمت کرتی رہوں گی۔ یہ فریقین کے لئے بہتر رہے گا۔ بی بی ریحانہ کا شادی سے انکار اپنی قومی عصبیت کی وجہ سے تھا۔ اسی وجہ سے وہ مسلمانوں اور نبی رحمت ﷺ سے تاحیات ناخوش رہیں۔ ریحانہ کے حسن و جمال کی تعریف جناب زینب بنت جحش کے خدوخال کی طرح نہیں کی گئی۔ اگرچہ وہ اس نعمت سے بہرہ مند تھیں۔
سیرت نگاروں نے ان کے پردہ میں رہنے سے اختلاف کیا ہے۔ لیکن وہ تاحیات رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہی رہیں۔
مدینہ سے کفار کی ناکام واپسی اور بنو قریظہ کے حشر سے مسلمانوں کو ایک طرح کا سکون ہو گیا۔ منافقین مرعوب ہو گئے۔ عرب کے گھر گھر میں مسلمانوں کی شان و شوکت کے چرچے ہونے لگے۔ مگر رسول کل عالم ﷺ کی حد تبلیغ صرف مدینہ منورہ تک محدود نہ تھی۔ اس لئے ضروری تھا کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین دنیا کے گوشہ گوشہ میں اللہ تعالیٰ کے دین کی تبلیغ کا سلسلہ جاری رکھتے اور اس کے آڑے آنے والے بد سرشت لوگوں سے راستہ صاف کرنے کی کوشش میں رات دن ایک کر دیتے۔

بنو قریظہ کے خاتمے سے صلح حدیبیہ تک

بنو قریظہ کے خاتمہ سے صلح حدیبیہ تک

کفار کی ہزیمت کے بعد

اٹھارویں فصل کی آخری سطور میں بیان کیا جا چکا ہے کہ مدینہ منورہ سے لشکر کفار کی ہزیمت اور بنو قریظہ کے صفایا سے خیرالرسل ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو اخلی سکون و اطمینان نصیب ہو گیا اور عرب کے گھر گھر میں مسلمانوں کے رعب کی دھاک نے اپنے پرچم گاڑ دیئے۔

سوچ کا انداز بدلا

ادھر کفارِ مکہ (قریش) کی سوچ میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اب وہ اس انداز سے سوچنے لگے کہ محمد ﷺ اور ہم ایک دوسرے کے قرابت دار ہیں۔ اگر ان سے تنازعہ چھوڑ دیا جائے تو کیا برا ہے جبکہ مہاجرین میں سے بھی اکثر ہمارے ہی بڑوں اور سربراہانِ قوم میں سے ہیں۔

اس بناء پر کچھ خارجی دباؤ کم ہوا تو دوسری طرف یہود کا صفایا ہونے سے داخلی زندگی بھی خطرات سے محفوظ ہو گئی۔ اس اثناء میں رسول اللہ ﷺ اپنے منصب رسالت کی ذمہ داریوں کو پوری تندہی اور یکسوئی سے سرانجام دینے کے لیے ہر لحہ مصروف رہے اور رسول اللہ ﷺ کے فرماں بردار اپنی پوری توجہ اور خلوص کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل سے اپنے ایمان کو اور زیادہ توانا کرنے میں ہر لحہ کوشاں رہے۔

اجتماعی نظام

ان چھ مہینوں میں رسول اللہ ﷺ اور ان کے فرماں بردار صحابہ کرام رضوان اللہ تعالٰی اجمعین اللہ تعالٰی کی طرف سے عطا کردہ اجتماعی نظام کے نفاذ کے لئے جدوجہد کرتے رہے۔

عرب آج سے پہلے اس نظام سے نا آشنا تھے۔ لیکن عرب جیسی دانشمند متمدن قوم کو ایسے اجتماعی نظام کی اشد ضرورت تھی جو دینِ اسلام پر عمل پیرا ہوئی اور اس کے دائرہ عمل اور مسائلِ دین

و معاشرت میں دن دگنی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ اسلام کا یہ جدید نظامِ اجتماعی جسے ابھی ابتدائی خاکہ سے زیادہ اہمیت حاصل نہ تھی۔

اللہ کے رسول ﷺ اور ان کے جانثار رضوان اللہ علیہم اجمعین اس کی تکمیل میں اس حد تک کوشاں تھے کہ یہ اجتماعی نظامِ تمدن اپنے دور کے ایرانی، رومی، مصری، ہندی غرض دنیا کے تمام نظامہائے اجتماعی کو کالعدم قرار دے کر بتدریج اس کمال کو پہنچ جائے جس کے بعد یہ آیت نازل ہونے کا محل پیدا ہو۔

الیوم اکملت دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا"۔ (3:5)

آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور پسند کر لیا ہم نے تمہارے لئے دین اسلام۔

عرب کے شہر اور تمدن

اسلام سے پہلے ملک کی بدویت یا تمدن کے بارے میں جو رائے بھی ہو لیکن مجموعی طور پر یہ بات ضرور کہی جاتی ہے کہ مکہ، مدینہ اور ملک کے دوسرے بڑے بڑے شہر یا بستیوں کے مقابلہ میں زیادہ متمدن تھے۔ لیکن نہ صرف قرآن بلکہ ایک دوسرے تاریخی آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ ان شہروں کے رہنے والے مرد اور عورتوں کے جنسی میلانات کا طریق چارپاؤں سے بہتر نہ تھا۔ قبل از اسلام عورتیں بناؤ سنگار کرتیں۔ زینت کے مقامات کے ابھار میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتیں۔ قضائے حاجت کے لئے صحرا میں دور نکل جاتیں۔ ٹولیوں کی صورت، دو دو، یا تنہا، بہرحال وہاں ان کے قدردان پہلے سے موجود ہوتے۔

اس دور میں زنا پر کوئی پرسش نہ تھی۔ عشق و ہوس دونوں ان کی گھٹی میں تھے۔ عام دستور تھا کہ ایک ایک مہ پارہ کے دسیوں باقاعدہ شوہر ہوتے، اور جب ایسی عورت کے ہاں بچہ پیدا ہوتا تو صرف نسب متعین کرنے کے لئے ان شوہروں میں سے جس سے اس بچہ کا حلیہ ملتا، مولود کو اس سے منسوب کر دیا جاتا۔

ادھر ایسے مرد اپنے گھروں میں باقاعدہ بیویوں اور کنیزوں کا جمگھٹا بھی رکھتے۔ لطف یہ ہے کہ ان کی بیویاں اور کنیزیں بھی ادھر ادھر مبتلا رہتیں۔ جس کی شوہروں اور مالکوں کو بھی اطلاع ہوتی مگر انہیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ غرض ایک طرف تو یہ حالت تھی کہ مردوں نے عورت کے معاشقوں کے بارہ میں ایک دوسرے کے ہر عیب اور برائی کو چھپا رکھا تھا یا یہ حالت کہ دشمنی ہوتے ہی اپنی محبوبہ کے راز فاش کرنے پہ اتر آتے۔ عرب ہمیشہ سے آسمان کی چھت کے نیچے زندگی بسر کرنے والی قوم ہے اور ہمیشہ سے ہی فکرِ معیشت کے لئے پریشان دروغ

گوئی اور اپنی تعریف آپ کرنے سے انہیں نفرت نہیں۔ صلح ہو دوستی ہو دشمنی ہو یا جنگ ہو دونوں حالتوں میں مبالغہ آرائی ان کی سرشت میں ہے۔ محبت کا زمانہ ہے تو اپنی محبوبہ کے حسن اور اس کی عصمت و عفت کا راگ الاپا جاتا۔ اسے تقدیس کی دیوی ثابت کیا جاتا۔ اور جیسے ہی دشمنی ہوئی تو اسی پیکر عصمت و عفت کے ننگے پن اور بے حیائی کے دفتر کھول دیئے جاتے جسے برائی کے سوا اس میں کچھ اور ہے ہی نہیں۔ اس کی صاف و شفاف گردن کا نقشہ اس کے ابھرے ہوئے سینہ کا خاکہ ایسے لفظوں میں بیان کیا جاتا کہ شرم اپنا منہ نوچ لے' اسی طرح کمر اور اس کی چوڑائی لمبائی جس کے بعد اس کی سرین (پیٹھ) کا پھیلاؤ غرض بدن کا کوئی حصہ نہیں جس کی ہجو اور مذمت نہ کی جاتی۔

ان قصیدوں میں شاعر ایک عورت کو صرف عورت ہی تصور کرتا اور اس کی عزت و حرمت کا پاس کئے بغیر جو دل میں آتا بک جاتا۔

جو لوگ عرب کے تمدن پر فریفتہ ہیں یہاں تک کہ وہ عرب کے زمانہ جاہلیت کے سر پر بھی تمدن کا تاج رکھنے سے باز نہیں آتے شاید ہمارے ان الفاظ کو مبالغہ پر محمول فرمائیں۔

ہمارے نزدیک جو لوگ آجکل کے رسوم و کوائف کے انداز کو اس زمانے کے رسم و رواج کے نہج پر قیاس کرتے ہیں' وہ اپنی جگہ معذور ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ قیاس بے محل ہے۔ آج کل کے حالات کا مطالعہ کرنے والے اس دور کے صحیح حالات کا موازنہ کر ہی کیسے سکتے ہیں۔ خصوصاً مرد اور عورت کے تعلقات ان کے باہمی روابط و ازدواجی زندگی یا طلاق سب آج سے مختلف تھے۔ اس کے علاوہ بھی مرد و عورت کے دوسرے تعلقات و معاملات کو اور دوسرے مشاغل کو لیجئے' اگر ان کو آج کے معیار پر پرکھا جائے تو یہ موازنہ و مقابلہ انتہائی غلطی کے مترادف ہو گا۔ خصوصاً ان عرب قبائل کا موازنہ جن کی بود و باش کی جھلک ہم "ساتویں صدی مسیحی عرب کا تمدن" کے تحت بیان کر چکے ہیں۔

ہمارے خیال میں مناسب ہے ساتویں صدی مسیحی قوموں کے ساتھ بھی اس کا موازنہ کیا جائے اس دور میں عرب نیم وحشی زندگی بسر کرنے کے باوجود یورپ اور شام میں بسنے والی مسیحی قوموں سے بدرجہا بہتر تھے۔ (اس موازنہ میں چین و ہند کے تمدن سے ناواقف ہونے کی وجہ سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا) شمالی اور مغربی یورپ میں مسیحی قومیں تہذیب و تمدن سے اتنی دور تھیں کہ اگر انہیں صرف وحشی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔

ساتویں صدی اور مسیحی روم

ساتویں صدی عیسوی میں روم کے تمدن کا یہ حال تھا کہ ایک طرف ان کو حامل شریعت

ہونے کا فخر تھا اور سیاسی غلبہ کا غرور بھی۔ کیونکہ ایران بھی ان کے ہی زیر نگیں تھا۔ اس کے باوجود ان کے ہاں عورت کا شہری درجہ دور کی بات ہے۔ بدوی عورت کے مساوی بھی نہ تھا۔

روم میں عورت

ساتویں صدی کے مسیحی رومیوں کے ہاں بیوی مرد کی ایسی ملکیت تھی جس کا استعمال اس کا شوہر ہر طرح کر سکتا تھا۔ وہ اسے قتل بھی کر دے تو مواخذہ سے بری تھا۔ شوہر کا اپنی بیوی کو بیچ دینا تو کوئی بات ہی نہ تھی۔ خاوند کا یہ سلوک رومی شریعت کے خلاف نہیں تھا۔ ایک ہی وقت میں وہ اپنے حقیقی باپ کی بیٹی بھی ہے اور اس کی باندی بھی۔ کل جب وہی قسمت کی ماری شوہر کے گھر آ گئی تو وہاں یہ بیگم بھی ہے اور کنیز بھی۔ اس کی کوکھ سے جنا ہوا بیٹا جب جوان ہوا تو شوہر کو اختیار ہے کہ وہ اس کی ماں کو اس کی باندی بنا دے۔ گویا عورت ایسی بے قیمت جنس تھی کہ بیگم اور ماں بننے کے باوجود کنیز بھی ہے اور کنیز بھی صرف خدمت گار ہی نہیں بلکہ اسے مال مویشیوں کی طرح بیچا بھی جا سکتا تھا۔

عورت ہر حال میں مردوں کے جنسی جذبات کی محرک رہی ہے اور ہے۔ لیکن وہ اپنی عصمت و عفت کی خود مالکہ نہیں تھی۔ عورت صدیوں تک ناقابلِ اعتبار سمجھی جاتی رہی ہے' اس کا مالک یا شوہر جب سفر میں کہیں جاتا تو اسے زنا سے زبردستی روکنے کے لئے عصمت کا غلاف پہننا پڑتا' جس کی صورت یہ ہوتی تھی کہ اس کی کمر سے لیکر دونوں پیروں تک وہ غلاف جکڑے رکھتا۔ اور جب مالک یا شوہر واپس آتا تو اس غلاف کے بند کھولتا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب عرب میں عورت آج سے بھی کہیں زیادہ بہتر زندگی بسر کر رہی تھی۔ اس وقت بھی روم میں قائم شدہ مسیحیت کے بانی حضرت عیسیٰؑ نے مریم مجدلیہ کو رجم کرنے کی تجویز پر فرمایا۔ ''جو تم میں بے گناہ ہو وہی اس کو پہلے پتھر مارے''

مسیحی یورپ میں عورت سے بدسلوکی

اس زمانہ میں یورپ کے بت پرستوں اور عیسویت کے پجاریوں میں عورت کے ساتھ بدسلوکی کرنا کوئی عیب نہ سمجھا جاتا۔ حوا کی بیٹی کو یا تو شہوت رانی کا ذریعہ سمجھا جاتا یا خدمت گار اور کنیز۔ سب سے زیادہ تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس دور میں مسیحی علماء میں یہ بحث شروع ہو گئی کہ عورت میں انسانی روح ہے بھی یا نہیں۔ مردوں کی طرح عورت کا حساب کتاب بھی ہو گا یا نہیں۔

ذرا سوچئے کیا عورت' ایسا ہی حیوان تھی کہ اس میں انسان کی سی روح نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں وہ سزا و جزا کی مستحق نہ ہو؟

محمد ﷺ اور اصلاح و تجدید

اسی عورت سے متعلق رسول اللہ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی وحی کے ذریعہ سمجھا کہ اجتماعی فروغ و ارتقا کے لئے مرد اور عورت کا دوش بدوش چلنا ضروری ہے کیونکہ دونوں ایک ہی جسم کے دو ایسے حصے ہیں جو باہم مودت و محبت کے رشتے میں منسلک ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کو وحی کے ذریعہ یہ بھی معلوم ہو گیا یوں تو دونوں کے ایک دوسرے پر مساوی حقوق ہیں لیکن بعض صورتوں میں عورتوں کے حقوق مرد کے ذمہ زیادہ ہیں۔ لیکن مرد اور عورت کو ایک مقام دینا آسان کام نہ تھا۔ صدیوں کی مزمن بیماریوں کا علاج بتدریج ممکن ہے۔ اگرچہ اہلِ عرب کا قرآن حکیم اور رسول اللہ ﷺ پر مضبوط و مستحکم ایمان تھا جو بتدریج بڑھتا گیا اور جانثارانِ اسلام کی تعداد بڑھتی گئی اور اللہ تعالیٰ نے اپنے محمد ﷺ کے ذریعہ سے جو اجتماعی اصلاحات نافذ فرمائیں وہ آہستہ آہستہ حدِ کمال تک پہنچیں۔ عبادات میں قیام صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج اور حرام شدہ امور شراب، جوا، اور خنزیر وغیرہ کے احکامات کے نفاذ میں بتدریج سختی کی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے میاں بیوی کے تعلقات میں اس انداز کی اصلاح فرمائی جس کی مثال آپ ﷺ کا اپنے حرم سے ہر ایک کے ساتھ حسنِ سلوک تھا اور مسلمان اسے دیکھتے رہتے تھے۔ اس لئے پردہ کے احکامات 5 ہجری شوال کے مہینہ میں غزوہ خندق کے بعد نازل ہوئے۔ اسی طرح چار بیویوں کی حد عدل و انصاف سے مشروط کر کے غزوہ خیبر کے ایک سال بعد مقرر کی گئی۔ رسول اللہ ﷺ نے میاں بیوی کے درمیان جس توازن کا خیال رکھا دراصل وہ قرآن حکیم کے اس حکم کی تمہید تھی جس میں مرد اور عورت کو مساوی حقوق عائد کر دیئے گئے بلکہ دونوں میں طبعی تفاوت ہونے کی وجہ سے مردوں پر ذمہ داریاں زیادہ عائد کر دی گئیں۔

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں بھی کچھ مدت عورت اور مرد کے ظاہری میل ملاپ میں جاہلیت کے کچھ طور طریقہ رہے۔ جیسا کہ سابقہ سطور میں بیان کیا جا چکا ہے۔ مثلاً عورتیں بناؤ سنگار کر کے مردوں میں جنسی ہیجان پیدا کرنے کے لئے گھروں سے نکلتیں۔ ان کی زیب و زینت مردوں کے لئے زبردست کشش کا سبب تھی لہٰذا مرد اور عورتوں کے اس چال چلن کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ مرد اور عورت کے باہمی تعلقات میں شرفِ انسانی اور روحانی اشتراک کا وجود سلگتی ہوئی دیا سلائی سے بھی کم تھا۔ عورتوں کی بے حیائی اور بناؤ سنگار ہی کے اشتعال اور گرمانے پر مدینہ ہی کا ایک واقعہ لکھا جا چکا ہے۔

مدینہ منورہ میں رہنے والے یہود اور منافقین کی مسلمانوں سے دشمنی اس انتہا کو تھی کہ دونوں گروہ مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کرنے سے باز نہ آتے جس کی وجہ سے مدینہ کے یہود

بنو قینقاع پر مسلمانوں کو حملہ کرنا پڑا۔ اور ان کے قلعہ بند ہونے کے بعد محاصرہ کیا اور پھر انہیں شہر بدر کر دیا گیا۔ ظاہر ہے یہ سب معاشرتی فساد عورتوں کی بے حجابی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ کاش مسلمان بی بیاں جاہلیت کے سنگار سے باز آ جاتیں تو بے حرمتی کے واقعات نہ ہوتے۔ آخر دین اسلام نے مرد اور عورت کے درمیان مساواتِ حقوق کی بنیاد رکھ دی۔ باوجودیکہ خود مسلمانوں میں اس طرف فکر و خیال نہ تھا۔ ارشاد ربانی ہے۔

والذین یوذون المومنین والمومنات بغیر ماأکتسبوا فقد احتملوا بھتانا" واثما" مبینا۔

اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایسے کام (کی تہمت) سے جو انہوں نے نہ کیا ہو ایذا دیں تو انہوں نے بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اپنے سر پر رکھا۔

یا ایھا النبی قل لازواجک وبناتک ونساء المومنین یدنین علیھن من جلا بیبھن ذالک ادنٰی ان یعرفن فلا یوذین وکان اللہ غفور رحیما۔

اے رسول اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ (باہر نکلا کریں تو) اپنے (مونہوں) پر چادر (گھونگھٹ نکال) لیا کریں۔ یہ امران کے لئے موجبِ شناخت و امتیاز ہو گا تو کوئی ان کو ایذا نہ دے گا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

لئن لم ینتہ المنافقون والذین فی قلوبھم مرض المرجفون فی المدینۃ لنغرینک بھم ثم لا یجاورونک فیھا الاقلیلا۔ ملعونین اینما ثقفوا اخذوا وقتلوا تقتیلا۔

اگر منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے اور جو مدینے (کے شہر) میں بری بری خبریں اڑایا کرتے ہیں۔ (اپنے کردار سے) باز نہ آئیں گے تو ہم تم کو ان کے پیچھے لگا دیں گے پھر وہاں تمہارے پڑوس میں نہ رہ سکیں گے مگر دن تھوڑے (وہ بھی) پھٹکارے ہوئے جہاں پائے گئے پکڑے گئے اور جان سے مار ڈالے گئے۔

سُنۃَ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ (33:58-58)

جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان کے بارے میں بھی اللہ کی یہی عادت رہی ہے اور تم اللہ کی عادت میں تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔

مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے ان احکامات کی تعمیل میں جاہلیت کی ان رسوم کو پاؤں تلے روند ڈالا جو عورتوں کے نکھار اور عریانی و فحاشی کا سرچشمہ تھیں۔ یہ سب اللہ کے رسول ﷺ کی منشاء کے مطابق تھا۔ جن کی بناء پر آنحضرت ﷺ معاشرہ کو ایسی تمام خرابیوں سے پاک کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ زنا کو سنگین تر جرم قرار دیتے ہوئے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ

مسلمان عورتیں غیر محرم مردوں کے سامنے بن سنور کر نہ آیا جایا کریں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قل للمومنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ذٰلک ازکیٰ لھم ان اللہ خبیر بما یصنعون وقل للمومنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن او آبائھن او آباء بعولتھن او ابنائھن او ابناء بعولتھن او اخوانھن اوبنی اخوانھن او بنی اخواتھن او نسائھن اوما ملکت ایمانھن او التابعین غیر اولی الاربۃ من الرجال او الطفل الذین لم یظھروا اعلی عورات النساء ولا یضربن بارجلھن لیعلم ما یخفین من زینتھن وتوبوا الی اللہ جمیعا" ایھا المومنون لعلکم تفلحون۔ (24:30-31)

مومن مردوں سے کہہ دو کہ اپنی نظریں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں۔ یہ ان کے لئے بڑی پاکیزگی کی بات ہے (اور) جو کام یہ کرتے ہیں اللہ ان سے خبردار ہے۔ اور مومن عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کیا کریں اور اپنی آرائش (زیور کے مقامات) کو ظاہر نہ ہونے دیا کریں مگر جو اس میں سے کھلا رہتا ہو اور اپنے سینوں پر اوڑھنیاں اوڑھے رہا کریں اور اپنے خاوند اور باپ اور بیٹوں اور خاوند کے بیٹوں اور بھائیوں اور بھتیجوں اور بھانجوں اور اپنی (ہی قسم کی) عورتوں اور لونڈی غلاموں کے سوا نیز ان خدام کے جو عورتوں کے پردے کی چیزوں سے واقف نہ ہوں (غرض ان لوگوں کے سوا) کسی پر اپنی زینت (اور سنگار کے مقامات کو) ظاہر نہ ہونے دیں۔ اور اپنے پاؤں (ایسے طور سے زمین پر) نہ ماریں کہ (جھنکار کانوں میں پہنچے اور) ان کا پوشیدہ زیور معلوم ہو جائے اور مومنو سب اللہ کے آگے توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

عادات میں توارث

اسلام نے مرد اور عورتوں کو فتنہ کی زد میں آنے سے بچانے کے لئے ایک دوسرے سے دور رہنے کے اصول کی پابندی عائد فرمائی لیکن قرآن حکیم میں عائد کردہ پابندیوں یا نشاندہی کے علاوہ ایک دوسرے کو دور رہنے کی کوئی ہدایت نہیں فرمائی کیونکہ دونوں کو مساویانہ مقام عزت حاصل ہے۔ دونوں ایک ہی اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ دونوں نیک کاموں میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے کے پابند ہیں۔ ان دونوں میں سے اگر کوئی بھی جنسی میلان کی زد میں آ جائے تو اسے فوراً ہی اللہ تعالیٰ کے حضور رجوع کرنا چاہئے توبہ کرنی چاہئے اور اللہ تعالیٰ توبہ قبول فرمانے میں پس و پیش نہیں فرماتا۔

لیکن عرب جو صدیوں سے برے رسم و رواج کے عادی ہو چکے تھے وہ اتنی جلدی اپنے

اندر ایسا انقلاب پیدا نہیں کر سکتے تھے۔ جس کا تقاضہ اللہ وحدہ لاشریک کی وحدت پر ایمان اور ترکِ شرک ان سے کرتا تھا۔ ان کی یہ کمزوری طبعی تھی۔ جس طرح مادہ بتدریج ارتقائی منزلیں طے کرنے کا آئینی طور پہ پابند ہے۔ اسی طرح انسانی زندگی بھی انقلاب کے لئے بتدریج قانونِ ارتقا کی پابند ہے' جب وراثت میں ملنے والی عادتیں انسان کے رگ و ریشہ میں سما جائیں تو اسے ان سے نجات حاصل کرنے کے لئے آہستہ آہستہ منزلیں طے کرنا ضروری ہوتی ہیں پھر جیسے ہی طبیعت ان کے دباؤ یا گرفت سے نجات پاتی جائے انسان کو اپنا مزاج بدلنے میں تاخیر نہیں کرنا چاہئے۔

انسانی مزاج کو اللہ تعالیٰ نے یہ ملکہ ضرور بخشا ہے کہ وہ اپنے ماحول کی تبدیلیوں کے مطابق اپنی زندگی کے ڈھانچے کو صورت دے سکے جیسا کہ اسلام نے مسلمانوں کے اندر توحید باللہ رسالت پر ایمان اور یومِ آخرت پر یقین کی بناء پر غیر معمولی انقلاب پیدا کر دیا۔

لیکن اس کے باوجود بعض ایسے رسوم جو ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکے تھے اسلام لانے کے بعد بھی کچھ عرصہ تک وہ مکمل طور پر ان سے نجات پانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

ان صحرا نوردوں کی صدیوں پرانی عادت کی طرح کہ جب صحرا میں سفر شروع کیا تو تھکاوٹ اور رکاوٹ کے باوجود رکے نہیں۔ اسی طرح صدیوں سے عورتوں کے ساتھ بے تکلف زندگی گزارنے کے عادی فوری طور پر عورتوں سے اجتناب کے اصول کو مکمل طور پر اپنا نہ سکے۔

تاہم وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دین اسلام نے عورتوں کے ساتھ روابط میں ان کے رجحانات میں اصلاح پیدا کر لی لیکن اس معاملہ میں عربوں کے بعض رجحانات پہلے ہی نہج پر قائم تھے۔ بسا اوقات ایک مسلمان پردہ کے حکم سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے دارِ نبوت علیہ السلام میں حاضر ہوتا تو امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور رسول اللہ ﷺ سے خوش گفتاری میں مصروف رہتا۔ جبکہ پردہ سے قطع نظر رسول اللہ ﷺ کے مشاغل پر ان کے زیادہ بیٹھنے کی وجہ سے اثر پڑتا۔ اور رسول اللہ ﷺ اپنی منصبی مہمات پر یکسوئی سے توجہ نہیں دے سکتے تھے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ ہم اپنے رسول ﷺ کو ایسے مشاغل سے نکال کر یکسوئی مہیا فرما دیں۔ حکم نازل فرمایا۔

یا ایھا الذین آمنوا لاتدخلوا بیوت النبی الا ان یوذن لکم الی طعام غیر نظرین انہ ولکن اذ دعیتم فادخلوا فاذا طعمتم فانتشروا ولا مستانسین لحدیث ان ذلکم کان یوذ النبی فیستحی منکم واللہ لا یستحی من الحق واذا سالتموھن متاعا فسئلوھن من وراء حجاب ذلکم اطھر القلوبکم وقلوبھن وما کان لکم ان توذوا رسول اللہ ولا ان تنکحوا ازواجہ من بعدہ ابدا ان ذلکم کان عنداللہ

عظیما (53:33)

مومنو! رسول کے گھروں میں جایا کرو مگر اس صورت میں کہ تم کو کھانے کے لئے اجازت دی جائے اور اس کے پکنے کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے لیکن جب تمہاری دعوت کی جائے تو جاؤ اور جب کھانا کھا چکو تو چل دو اور باتوں میں جی لگا کر نہ بیٹھ رہو یہ بات رسول کو ایذا دیتی تھی اور وہ تم سے شرم کرتے تھے (اور کہتے نہیں تھے) لیکن اللہ سچی بات کہنے میں شرم نہیں کرتا۔ اور جب رسولؐ کی بیویوں سے کوئی سامان مانگو تو پردے کے باہر مانگو۔ یہ تمہارے اور ان کے دونوں کے دلوں کے لئے بہت پاکیزگی کی بات ہے اور تم کو یہ شایاں نہیں کہ رسول اللہ کو تکلیف دو اور نہ یہ کہ ان کی بیویوں سے کبھی ان کے بعد نکاح کرو۔ بیشک یہ اللہ کے نزدیک بڑا (گناہ کا کام) ہے۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے سورہ احزاب کی آیت نمبر 53 میں امہات المومنین کے احترامات و حقوق کے بارہ میں ہدایات فرمائیں اسی طرح مومنین کے حقوق کی پاسداری کے لئے امہات المومنین کو بھی ہدایات دیتے ہوئے فرمایا

(1) یا نساء النبی لستن کاحد من النساء ان اتقیتن فلا تخضعن بالقول فیطمع الذی فی قلبہ مرض وقلن قولا" معروفا"

اے رسول کی بیویو! تم اور عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم پرہیزگار رہنا چاہتی ہو تو (کسی اجنبی شخص سے) نرم نرم باتیں نہ کیا کرو تاکہ وہ شخص جس کے دل میں کسی طرح کا مرض ہے کوئی امید (نہ) پیدا کرے اور (ان سے) دستور کے مطابق بات کیا کرو۔

(2) وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاھلیۃ واتین الزکوۃ الاولی واقمن الصلوۃ واطعن اللہ و رسولہ انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیرا" (33-32:33)

اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جس طرح (پہلے) جاہلیت (کے دنوں) میں اظہار تجمل کرتی تھیں اس طرح زینت نہ دکھاؤ اور نماز پڑھتی رہو اور زکوٰۃ دیتی رہو اور اللہ اور اس کے رسول کی فرماں برداری کرتی رہو۔ اے (رسول کے) اہلِ بیت اللہ چاہتا ہے کہ تم سے ناپاکی (کا میل کچیل) دور کردے اور بالکل پاک صاف کردے۔

دین اسلام نے انسانی معاشرہ اعلیٰ اخلاقی اقدار سے آراستہ کرنے کے لئے جس نظام جدید کی بنیاد ڈالی' مرد اور عورت کے درمیان جنسی ملاقات کو اخلاقی حدود میں مقید کرنا اسی کا ابتدائیہ ہے کہ عورت اور مرد کی توجہ جو صرف جنسی عمل تک ہی محدود ہے اسے دونوں کے دل سے نکال دیا جائے اور اسے کائنات کے دوسرے حسین مناظر کی طرح ہی سمجھے۔ یہ ایسا طریقہ ہے جس پر

چل کر انسان اپنی منزل مقصود کو پا سکتا ہے۔ زندگی کے مادی ثمرات سے لطف اندوز ہو سکتا ہے اگرچہ اس منزل پر پہنچ کر بھی انسان کو اپنا وقار برقرار رکھنے کے لئے جنسی میلانات کا مقابلہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ الغرض انسان اپنے کمال مراتب کی وجہ سے کائنات کے تمام زراعت و صنعت اور گردو پیش کے دوسرے فنون سے بہرہ اندوز ہو کر ایسا بلند مقام حاصل کر سکتا ہے کہ نیک اعمال انسانوں بلکہ ملائکہ مقربین کے حلقہ میں شامل ہو سکتا ہے کیونکہ وہ صنعت و زراعت اور دوسرے علمی اور عملی مشاغل کے ساتھ قیام صلوٰۃ کا بھی پابند ہے۔ صوم (روزہ) بھی رکھتا ہے۔ زکوٰۃ بھی نکالتا ہے۔ غرض اس قسم کے تمام حقوقِ الہیہ کی پابندی اس کے لئے آسان ہو جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے وہ خود بخود زنا اور ایسی بدکاری سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ بے حیائی اور فحاشی کے ارتکاب سے اس کا مزاج انکار پہ مائل ہو جاتا ہے اور قلب و نفس اللہ کے سوا باقی سب کی محبتوں سے پاک ہو جاتا ہے جس سے ایسا پاک فطرت انسان ایک طرف مومنین سے دوستی اور محبت کے رشتہ میں پرویا جاتا ہے اور دوسری طرف انسانیت اور کائنات کے درمیان وجہِ تعلق ثابت ہونے لگتا ہے۔

غرض اس مذکورہ وقفہ میں نظام اجتماعی کی ترتیب و تشکیل کا سلسلہ جاری رہا جو آنے والے عالمگیر انقلاب کا پیش خیمہ تھا' جس کا وجود انسان کی فلاح و بہبود کی ضمانت تھا لیکن قریش اور قبائل اب بھی اسلام دشمنی میں متحرک تھے' وہ جتنی جلد ہو سکے محمد ﷺ کی تعلیم و توقیر کے اثرات ختم کرنا چاہتے تھے۔ ادھر اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کو اس بات کا خیال تھا کہیں توحید و رسالت کے دشمن پھر ہجوم اکٹھا کر کے مدینہ پہ یلغار نہ بول دیں اس لئے ایسی مدافعتی تیاری بھی ضروری تھی کہ دشمن کو منہ توڑ جواب دیا جا سکے۔

غزوہ بنو لحیان

سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسلام کا معمول یہ بھی تھا کہ عسکری مصلحت کی بناء پر جو بھی منزل مقصود ہوتی اس کو اپنی ذات تک محدود رکھتے تاکہ دشمن کو قبل از وقت اطلاع نہ ہو جائے' مدینہ سے کوچ کے وقت آپ ﷺ نے شام کا رخ اختیار فرمایا۔

اصل مقصد اپنے ان مقتولوں کا قصاص لینا تھا جنہیں فریب دے کر لے گئے' مقام رجیع پہ قتل کر دیا' ان میں سے حضرت خبیب بن عدی کو قید کیا اور جس مقام پر پہنچ کر ان کو یقین ہو گیا کہ کفار کے جاسوسوں کو آپ ﷺ کے اصل رخ کا علم نہیں ہو سکا' اچانک مکہ کی طرف رخ کر لیا۔ رفتار تیز کر لی' بنو لحیان کی وادی میں آ پہنچے جو غران کے نام سے مشہور ہے۔ لیکن نبی اکرم ﷺ نے جس منزل پر اپنا رخ شمال سے جنوب کی طرف پھیر لیا تھا' اسی وقت بنو

لحیان میں سے کسی نے دیکھ لیا اس نے انتہائی تیزی کے ساتھ اطلاع دی اور بنو لحیان اپنے مویشی اور سامان لے کر پہاڑیوں میں جا چھپے جس کی وجہ سے حملہ ناکام ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے تعاقب میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی قیادت میں 200 مجاہدین کو بھیجا جو مقام عسفان تک گئے مگر ان کا کہیں پتہ نہ چلا۔ گرمی اس بلا کی تھی کہ الاماں الحفیظ۔ سورج گویا سوا نیزے پر تھا' مدینہ منورہ واپس آئے اور داخل ہوتے وقت آپ ﷺ کی زبانِ اقدس پر یہ کلمات تھرتھرا رہے تھے۔

آئبون تائبون لربنا حامدون اعوذ باللہ من وعثاء السفر و کابۃ المنقلب وسؤ المنظر فی الاھل والمال۔

ہم واپس آنے والے ہیں' توبہ کرنے والے ہیں' عبادت کرنے والے ہیں' اپنے رب کی تعریف کرنے والے ہیں۔ میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں سفر کی تکلیف سے اور پریشان حالت کے دیکھنے سے اور سفر سے پلٹنے کی برائی سے مال اور گھر میں۔

غزوۂ ذی قرد

رسول اللہ ﷺ کے غزوۂ لحیان سے واپسی کے چند دنوں بعد ہی عینیہ بن حصن الفزاری نے مدینہ کی چراگاہ پر ڈاکہ ڈالا۔ رسول اللہ ﷺ کے چرواہے کو قتل کر ڈالا۔ اور مقتول کی بیوی کو اونٹوں کے ریوڑ سمیت قید کر کے واپس ہونے کو تھا کہ جناب سلمہ بن عمرو بن اکوع نے دیکھ لیا۔ ڈاکو بھاگ رہے تھے اور سلمہ ان پر تیر برسا رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ سلمہ بن عمرو بن اکوع شہر کی طرف منہ کر کے آواز دیتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ نے آواز سنی اور فوراً" مدینہ منورہ میں منادی کرا دی گئی' تمام مجاہدین سمٹ کر جمع ہو گئے۔ ہر شخص مسلح تھا۔ رسول اللہ ﷺ اپنی کمان میں مجاہدین کو لئے ہوئے جلد ہی قرد نامی پہاڑی پر پہنچ گئے۔ عینیہ ڈاکو تیز رفتاری سے بھاگ کر قبیلہ بنو غطفان تک پہنچ کر اپنے آپ کو گرفت سے بچانا چاہتا تھا۔ مگر مجاہدین نے دستہ کے آخری حصہ کے اونٹوں پر قبضہ کر لیا۔ اتنے میں رسول اللہ ﷺ بھی آپہنچے۔ ذرا دیر کے بعد وہ بی بی بھی تشریف لے آئیں جس کو ڈاکو گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔

مجاہدین نے درخواست کی کہ اب ہمیں تعاقب کی اجازت مرحمت فرمائیے۔ لیکن آپ ﷺ نے فرمایا اب وہ بنو غطفان میں پہنچ چکے ہوں گے' اس لئے تعاقب مناسب نہیں۔ واپس مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔

قیدی مسلمان بی بی نے منت مان رکھی تھی کہ اگر یہ ناقہ جس پر سوار تھی صحیح سلامت

مدینہ منورہ لے کر پہنچ گئی تو میں اسے اللہ کی راہ میں قربان کردوں گی۔

اس عورت کی نذر کے بارے میں نبی رحمت ﷺ نے سنا تو آپ ﷺ نے ایسی قربانی سے منع فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

بئسس ماجزیتھا ان حملک اللہ علیھا ونجاک بھا ثم تنحر ینھاانہ لانذر فی معصیتہ اللہ ولا فیما لاتملیکن۔

اتنا برا بدلہ دینا چاہتی ہے جبکہ اس اونٹنی نے اس کو دشمنوں سے نجات دلوائی' اسے ہی ذبح کرنے پر تیار ہو گئی۔ یہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ ایسی نذر کوئی معنی نہیں رکھتی۔ پھر نذر تو اس شے کی کی جاسکتی ہے جو نذر کرنے والے کی اپنی ملکیت میں ہو۔ اور یہ اونٹنی تو مجاہدین کی ملکیت ہے۔

غزوۂ بنی المصطلق (یا مریسیع)

تقریباً دو ماہ قیام کے بعد قبیلہ بنی مطلق مریسیع کے مقام پر یہ غزوہ پیش آیا۔ یہ غزوہ ہر اس اہل قلم کی توجہ کا مستحق ہے جو رسول کل عالم ﷺ کی سیرت مبارکہ کا آغاز کرے۔ نفس پہ معرکہ صعوبت و محنت کی وجہ سے نہیں۔

(الف) مسلمانوں میں ناکردہ اسباب کی بناء پر خلفشار پیدا ہو گیا جس کی وجہ سے آئندہ بہت برے نتائج کا خطرہ لاحق ہو گیا مگر رسول اللہ ﷺ کی احسن تدبیر نے اسے سلجھا دیا۔

(ب) اور اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے جناب جویریہ بنت حارث کو نکاح کی عزت بخشی جس کے نتائج بڑے حیرت انگیز رونما ہوئے۔

(ج) اور اسی غزوہ کے درمیان ام المومنین عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا پر ناگفتنی افترا تراشا گیا۔ حضرت صدیقہ رضی اللہ عنہا کا سن 16 سال سے زیادہ نہ تھا بھرپور جوانی کے پہلو بہ پہلو ایمان کی فراوانیاں بھی شباب پر تھیں۔ لہٰذا کسی کو جرأت نہ تھی کہ صورت اور سیرت کے اس پیکر عصمت و عفت تقدیس و جلال کے سامنے لب کشائی کر سکے۔

اطلاع ملی کہ قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو مصطلق نے مکہ سے اس طرف فوجیں جمع کر لی ہیں۔ ان کا سردار حارث بن ابو ضرار تھا۔ اس نے اپنے لشکر کے ہر سپاہی کو رسول رحمت ﷺ پر حملہ آور ہونے کی ہدایت دے رکھی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے یہ راز ایک بدو اسلمی رضی اللہ عنہ سے معلوم کیا۔ رسول اللہ ﷺ فوری طور پر مجاہدین کو لے کر نکلے' تاکہ دشمن پر غفلت میں حملہ کیا جا سکے جیسا کہ عام معمول تھا۔ لشکر میں مہاجرین کا علم ابوبکر رضی اللہ عنہ اور انصار کا جھنڈا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو دیا۔ مجاہدین بنو مصطلق کے اس تالاب پر اترے جس کو مریسیع کے نام سے پکارا جاتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں دشمنوں کو گھیرے میں

لے لیا۔ اس عرصہ میں وہ لوگ تو بھاگ نکلے جو ادھر ادھر سے ان کے ساتھ مل گئے تھے۔ مجاہدین کے ہاتھوں سے دشمنوں کے دس آدمی قتل ہوئے۔ اسی معرکہ میں ایک مسلمان ہشام بن صبابہ رضی اللہ عنہ ایک مسلمان کے ہاتھ مغالطہ میں شہید ہو گئے۔

قبیلہ بنو مصطلق کے محصورین دیر تک تیروں سے مقابلہ کرتے رہے۔ مگر جب اپنے سے طاقتور دشمن سے کوئی راہ فرار نظر نہ آئی تو خود کو مسلمانوں کے سپرد کر دیا۔ ان کے مرد، عورتیں، بچے، اونٹ اور مویشی تمام سامان مسلمانوں کے قبضہ میں آ گیا۔

حادثہ

جس کا اشارہ "الف" میں کیا گیا۔ وہ یہ ہے کہ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے ساتھ اس غزوہ میں ایک سائیس بھی تھا۔ معرکہ ختم ہونے کے بعد گھاٹ پر پانی بھرنے گیا تو قبیلہ خزرج کے ایک انصاری سے اس کی توں توں میں میں ہو گئی، بات ہاتھا پائی پہ پہنچی تو سائیس نے مہاجرین اور انصاری نے خزرج کی دہائی پکاری۔ (فریقین جمع ہو گئے) مدینہ کا بدنام منافق عبداللہ بن ابی جو اس غزوہ میں مال غنیمت کے لالچ میں شامل ہوا تھا۔ اس کے دل میں جس قدر کینہ بھرا ہوا تھا مسلمانوں کے خلاف سب اگل دیا۔ "مہاجر ہمارے شہر میں اڈ کر آ گئے ہیں ہمیں ان کی روک تھام کے لئے داناؤں کے اس مقولہ پہ عمل کرنا ہی ہو گا کہ اگر اپنے کتے کو فربہ کر دیا گیا تو وہ سب سے پہلے اپنے مالک ہی کا گلا دبوچے گا" اور قسم کھا کر بولا۔

لن رجعنا الی المدینۃ لیخرجن الاعز منہ الاذل

اگر ہم پھر مدینہ لوٹے تو عزت والا ذلیل کو وہاں سے نکال باہر کرے تو سہی۔

اور انہی الفاظ میں آیت 8۔ سورہ نمبر 63 نازل ہوئی۔

اس ابن سلول نے اپنے ہم مشربوں سے یہ بھی کہا۔ تم نے یہ مصیبت ان کو پناہ دے کر خود مول لی ہے۔ اپنے مال اسباب سے تم لوگوں نے ان کی مدد کی، واللہ جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اردگرد جمع ہوئے ہیں ان پر اپنا پیسہ خرچ نہ کرو۔ تو تنگ آ کر خود ہی تتر بتر ہو جائیں گے۔

قرآن حکیم نے اسی کے الفاظ کو دہرایا۔ ھم الذین یقولون لا تنفقوا علی من عند رسول اللہ حتی ینفضوا۔ ابن ابی کی بکواس کی اطلاع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو اس وقت عمر فاروق رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ انہوں نے ازراہ غیرت عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بے ایمان کے قتل کا حکم دیجئے۔ مگر خاتم المرسلین رحمت للعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس موقع پر اپنی متانت، دور اندیشی اور تحمل و حلم کے ماتحت فرمایا۔

"اے عمر رضی اللہ عنہ۔ اگر ایسا کیا گیا تو دنیا کہے گی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا"

اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سوچا اگر فوری طور پہ اس معاملہ کا تدارک نہ کیا گیا تو ہو سکتا ہے ابن ابی کا پیدا کردہ فتنہ کوئی رنگ لے آئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً فوج کی منادی فرما دی اگرچہ موسم کے لحاظ سے یہ وقت سفر کے لئے ہرگز موزوں نہ تھا۔ ابن ابی نے باریاب ہو کر حسبِ عادت اپنی صفائی میں بہت قسمیں کھائیں لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفر ملتوی نہ کیا۔ کوچ کے دن لشکر تمام دن چلتا رہا۔ رات کو بھی یہ سفر جاری رکھا گیا۔ دوسرے دن بھی ظہر تک سفر جاری رکھا گیا۔ اس کے بعد پڑاؤ ڈالا گیا تو جسد مبارک زمین کو چھوتے ہی نیند کی گرفت میں آگیا۔ آنکھ کھلی تو ابن ابی کے طعنوں کا اثر دماغ سے نکل چکا تھا۔ اور جب مدینہ میں داخل ہوئے تو بنو مصطلق کے قیدی، اموال اور مویشی ساتھ تھے۔ انہیں قیدیوں میں دشمنوں کے سردار حارث بن ابی ضرار کی صاحب زادی جویریہ بھی تھیں۔ ابن ابی بھی مدینہ میں پہنچ گیا اگرچہ اپنے اسلام اور ایمان کا وہ ہر بات پہ چرچا کرتا مگر اس کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں کے حسد کا سانپ بدستور پھنکارتا رہا۔

مریسیع کے مقام پر جو کچھ اس نے کہا تھا۔ قسمیں کھا کھا کر انکار کرنے لگا جس پر قرآن حکیم کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

هم الذين يقولون لا تنفقوا على من عند رسول الله حتى ينفضوا ولله خزائن السموات والارض ولكن المنافقين لا يفقهون يقولون لئن رجعنا الى مدينة ليخرجن الاعز منها الأذل ولله العزة ولرسوله وللمومنين ولكن المنفقون لا يعلمون (63:7-8)

"یہی ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس (رہتے) ہیں ان پر (کچھ) خرچ نہ کرو۔ یہاں تک کہ یہ (خود بخود) بھاگ جائیں حالانکہ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ ہی کے ہیں لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔ کہتے ہیں اگر ہم لوٹ کر مدینے پہنچے تو عزت والے ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کریں گے۔ حالانکہ عزت اللہ کی ہے اور اس کے رسول کی اور مومنوں کی لیکن منافق نہیں جانتے"۔

ان آیات کے نزول کے بعد مسلمانوں کو ابن ابی کے قتل ہونے کا یقین ہو گیا جن میں اس کے مسلمان فرزند بھی تھے۔ یہ نیک محضر عبداللہ بن عبداللہ بن ابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض گزار ہوئے یا رسول اللہ سنا گیا ہے۔ آپ میرے والد (ابن ابی) کو قتل کرانا چاہتے ہیں۔ اگر حکم ہو تو میں ہی اپنے باپ کا سر آپ کے سامنے پیش کر دوں؟

یا رسول اللہ قبیلہ خزرج میں کوئی ایسا شخص نہیں جو مجھ سے زیادہ اپنے باپ سے نیک سلوک کرتا ہو۔ لیکن مجھے خود سے خطرہ ہے کہ اگر آپ نے میرے سوا کسی اور شخص کے ہاتھ سے میرے باپ کو قتل کروایا تو میں اپنے باپ کے قاتل کو چلتا پھرتا نہیں دیکھ سکوں گا' اسے قتل کیے بغیر مجھے چین ہی نہیں آئے گا اور کافر کے بدلے کسی مسلمان بھائی کو قتل کر کے جہنم کا ایندھن بننا مجھے گوارا نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عبداللہ ابن ابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو کچھ عرض کیا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ دلی اضطراب کا اظہار اس سے زیادہ بلیغ پیرایہ میں بھی ہو سکتا ہے۔ آہ ایسا اضطراب ایک طرف محبتِ پدری اور دوسری طرف حفاظتِ ایمان کا جذبہ!

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کو یہ بھی خطرہ تھا کہ فطری نخوت اور غرور عود نہ کر آئے اور اسلامی اخلاق پر غالب آکر مسلمانوں میں انتقام در انتقام کی آگ نہ سلگا دے' بلندیٔ کردار دیکھئے بیٹا باپ کو واجب القتل سمجھ رہا ہے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی جان بخشی کی درخواست نہیں کرتا کیوں کہ اسے یقین ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر قول و عمل اللہ تعالیٰ کے زیرِ فرمان ہوتا ہے۔

اسے اپنے باپ کے کفر کا یقین بھی ہے اس کے ساتھ ہی اسے یہ غم بھی ہے کہ باپ کے قتل ہونے پر اس کی محبتِ فرزندانہ اور عربوں کی انتقامی عادت عود نہ کر آئے۔ اس نے خود ہی باپ کے قتل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اگرچہ اسے یہ بھی دھڑکا ہے کہ باپ کو قتل کرنے پر اس کا اپنا دل خون بن کر بہ جائے گا۔ آج حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ اس ذہنی اذیت کو اس لئے برداشت کر رہے ہیں کہ ان کا باپ اگر کسی دوسرے مسلمان کے ہاتھوں قتل ہوا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے باپ کے قاتل کو قتل کر کے جہنم کا مستحق نہ ٹھہرایا جاؤں۔ حضرت عبداللہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ بن ابی بن سلول کس کشمکش میں مبتلا ہے کہ ایک طرف ایمان ہے۔ تو دوسری طرف محبتِ فرزندانہ اس کے ساتھ ہی اخلاقی قوت آہ اس سے زیادہ روحانی قوت کیا ہو سکتی ہے۔ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب عبداللہ کو ان کے اپنے باپ کو قتل کرنے کی اجازت طلب کرنے پر کیا جواب دیا۔ فرمایا۔ ہم قتل کی بجائے ان کے ساتھ مہربانی' اپنی مجلس میں نشست و برخواست کا موقع دیتے ہیں' ان کی اصلاح کی کوشش میں کمی نہ رہنے دیں گے۔

اللہ اللہ یہ عفوو رحمت اور وہ بھی ایسے شخص کے ساتھ جو ہمیشہ مدینہ کے ہر مسلم اور غیر مسلم کو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے صحابہ کرام رضوان اللہ الرحمٰن کے خلاف مشتعل کرتا رہتا ہے۔ لطف یہ ہے کہ آج بد نصیب پر رحمتِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ و السلام کے چہرہ کا پلہ اس کے دشمن کی طرف سے ایذا رسانی کے مقابلہ میں بھاری ہے۔

اس منافق کی جاں بخشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں کوئی بات کرنے لگتا تو سننے والے لعن طعن کرتے ہوئے کہتے "ارے بے شرم ان کے خلاف یہ زبان درازی جنہوں نے تیری جاں بخشی فرمائی"۔

اس واقعہ کے بعد ایک روز حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رحمت پناہ ﷺ میں حاضر تھے تو ابن ابی کی زبان درازی اور مسلمانوں کے جوش و خروش کا تذکرہ چل نکلا تو رحمتِ دو عالم علیہ الصلوٰۃ و السلام نے فرمایا۔ اے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اگر اس روز میں اسے قتل کرا دیتا تو مخالفین غراتے ہوئے اٹھ آتے لیکن آج میں اس کے قتل کا حکم دوں تو کوئی بات پیدا نہیں ہو گی۔ ابن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ، عرض کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میری رائے کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کی ذات میں بہت برکت ہے۔

ام المومنین عائشۃ الصدّیقہ کا واقعہ

(الف) سابقہ سطور میں بیان کئے گئے واقعات غزوۂ بنو مصطلق سے واپسی پر رونما ہوئے، اموال اور سامانِ جنگ کی تقسیم کے فوراً" ہی بعد ایک ایسا حادثہ پیش آیا۔ جس کا اثر ابتدا میں تو اتنا گہرا نہ تھا مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس نے عبرتناک صورت اختیار کر لی۔ نبی اکرم ﷺ کا معمول تھا وہ جب بھی کسی غزوہ پر تشریف لے جانے کا قصد فرماتے تو حرم پاک میں سے کسی ایک بی بی کو قرعہ اندازی سے مشایعت (ساتھ) میں لے لیتے۔ چنانچہ غزوۂ مصطلق میں یہ اعزاز عائشۃ الصدّیقہ رضی اللہ عنہا کو حاصل ہوا۔ سفر کے موقع پر حجرہ سے ہودج لگا دیا جاتا اور آپ کی تشریف فرمائی کے بعد ہودج کو اٹھا کر ساربان شتر پر رکھ دیتا۔ اور ام المومنین کی کم باری سے اسے بالکل وزن محسوس نہ ہوتا۔

معرکۂ مریسیع سے رسول اللہ علیہ وسلم کی بتقاضائے حالات فوری واپسی اور پریشانی کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کوچ کے بعد پہلی منزل پر پڑاؤ کیا اور رات کا کچھ حصہ آرام رمانے کے بعد پھر روانگی کا حکم فرمایا۔

اس منزل ہی میں کوچ کے موقع پر ام المومنین رضی اللہ عنہا رفع حاجت کے لئے تشریف لے گئی تھیں، واپسی پر محسوس ہوا کہ گلے کا ہار گر پڑا ہے۔ الٹے قدم تلاش کرتی ہوئی واپس گئیں۔ بہت دیر ہو گئی ممکن ہے پچھلے سفر کے تھکان کی وجہ سے آنکھ بھی جھپک گئی ہو۔ ہار تو مل گیا مگر جب لشکر گاہ میں واپس تشریف لائیں تو قافلہ والے روانہ ہو چکے تھے اور روانگی پر رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ سمجھا کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا بھی اپنے ہودج میں ہیں۔ جسے انہوں نے اٹھا کر اونٹ پر رکھ لیا ہے اور اس تصور میں کوچ فرمایا کہ

رسول اللہ ﷺ کی حرم پاک بھی آپ کی معیت (ساتھ) میں ہیں۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا کو اس پر کوئی پریشانی اس لئے نہیں ہوئی کہ ان کو یقین تھا کہ جونہی ساربان کو ہودج کے خالی ہونے کا احساس ہو گا وہ فوراً" سواری واپس لے آئے گا۔ اس لئے ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے صحرا میں سفر کرنا مناسب نہ سمجھا للذا برقع بدن کے ارد گرد لپیٹا اور زمین پر استراحت فرما ہو گئیں۔ صفوان بن معطل سلمی رضی اللہ عنہا جو کارروان سے بچھڑ گئے تھے اس طرف سے گزرے۔ انہوں نے آیتہ حجاب نازل ہونے سے پہلے ان کو دیکھا تھا۔ آپ کو اس حال میں پایا تو بے ساختہ زبان پر آیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون واحسرتا آپ کیسے بچھڑ گئیں۔ رسول اللہ ﷺ کے حرم پاک ام المومنین رضی اللہ عنہا اللہ آپ پر رحم فرمائے۔ ام المومنین نے کوئی جواب نہیں دیا۔ صفوان رضی اللہ عنہ نے اونٹنی کو قریب بٹھا کر سوار ہونے کے لئے عرض کیا اور خود اس وقت تک دور بیٹھے رہے جب تک ام المومنین رضی اللہ عنہا سوار نہ ہوئیں۔ اس کے بعد اونٹنی تیز رفتار لے کر چلے تاکہ لشکر کے ساتھ مل جائیں۔ لیکن لشکری سفر کی تکان دور کرنے سے پہلے مدینہ منورہ پہنچنے اور ابن ابی کی ریشہ دوانیوں سے بچنے کے لئے اس سے بھی زیادہ تیز رفتار تھے۔ صفوان لشکریوں کے پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد دن ہی دن میں مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا بدستور ناقہ پر تشریف فرما تھیں۔ دار النبوۃ علیہ السلام کے قریب آ کر سواری سے اتریں۔ اور چند قدم چل کر اپنے حجرہ میں پہنچ گئیں۔ کسی فرد و بشر کے دل میں وسوسہ نہ تھا۔ نہ رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک پر کوئی حرف آیا۔ نہ کسی دل میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی نیک طینت صاحب زادی اور صفوان رضی اللہ عنہم کے متعلق کسی قسم کا خدشہ گزرا اور حقیقت یہی تھی کہ کوئی ایسی بات تھی بھی نہیں۔

تبصرہ

ام المومنین رضی اللہ عنہا لشکر کے مدینہ پہنچ جانے کے ذرا دیر بعد روز روشن میں سب کے سامنے تشریف لائیں۔ درمیانی وقفہ اتنا تھا ہی نہیں کہ کسی کے دل میں کوئی وسوسہ پیدا ہو۔ دار النبوۃ میں داخل ہوئیں تو مسکراتا ہوا چہرہ تھا۔ کسی قسم کی پریشانی نہ تھی۔ چونکہ ایسا کوئی سابقہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس لئے شہر کے حالات کا معمول پر رہنا خلاف قیاس نہیں تھا۔

مسلمان اپنے حریف بنو مصطلق کے مال و اسباب اور قیدیوں کی تقسیم میں مصروف ہوئے تا کہ اپنی محنت سے بھرپور زندگی میں تھوڑی دیر کے لئے نعمتوں کا لطف حاصل کر سکیں جس زندگی میں اپنی قوتِ ایمانی کی وجہ سے دشمن پر غالب آئے۔

جس زندگی میں ان کے عزم صادق نے انہیں دشمنوں کے مقابلہ میں فائز المرام کیا تھا اور

کبھی ایسا بھی ہوتا رہا کہ ان میں سے بعض حضرات کو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور دین و عقیدہ کی محبت میں موت کے پہلو میں سونا پڑا۔

مسلمانوں کی یہ زندگی ایسی ہے جس سے کل تک عرب خود کو دور رکھنا چاہتے تھے۔

سیدہ جویریہ

بنو مصطلق کے قیدیوں میں ان کے سردار قبیلہ کی بیٹی بھی گرفتار ہو کر آئی تھی اس کا اسم گرامی جویریہ تھا۔ جمالِ ظاہری سے آراستہ اور مال غنیمت میں ایک انصاری کے حصہ میں آئی۔ جس کے ساتھ بی بی نے مکاتبت کی درخواست کی تو انصاری نے بڑے اونچے گھرانے کی بیٹی ہونے کی وجہ سے بہت زیادہ زرِ فدیہ طلب کیا۔ نیک فطرت جویریہ فدیہ کی رقم میں امداد حاصل کرنے کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اس وقت آنحضرت ﷺ ام المومنین عائشہ الصدیقہ کے ہاں تھے۔ عرض کیا میں سردارِ قبیلہ حارث بن ابی ضرار کی دختر ہوں، میری مصیبت سے آپ آگاہ ہیں، جن صاحب کے حصہ میں آئی ہوں ان سے مکاتبت کر چکی ہوں۔ آپ کی خدمت میں زرِ فدیہ میں تعاون مانگنے حاضر ہوئی ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ایک بہتر صورت پیش کرتا ہوں کہ زرِ فدیہ میں ادا کئے دیتا ہوں اور آپ میرے ساتھ نکاح کرنا منظور کر لیجئے۔

مجاہدین نے جب سنا کہ رسول اللہ ﷺ سے بنو مصطلق سے رشتہ داری ہو گئی ہے تو سب نے اپنے اپنے حصہ کے قیدیوں کو زر فدیہ لئے بغیر رہا کر دیا۔ ان کی تعداد چھ سو تھی جن میں ایک سو صرف بنو مصطلق کی تعداد تھی۔ جنابہ بنت الحارث کی اس عزت افزائی پر ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا جویریہ سے بڑھ کر کوئی دوسری عورت اپنی قوم کے لئے باعثِ برکت ہونے کا سبب نہیں بن سکی۔

سیدہ جویریہ کے بارہ میں دوسری اور تیسری روایت

حارث اپنی بیٹی کا زر فدیہ لے کر حاضر ہوا اور پناہ ملنے کے بعد اسلام لے آیا۔ آزاد ہو جانے کے بعد ان کی صاحب زادی بھی اسلام لے آئیں، جس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے ان سے خطبہ فرمایا اور چار سو درہم حق مہر مقرر ادا فرمایا۔

(ب) سیدہ جویریہ رضی اللہ عنہا

سیدہ کے والد اس تجویز پر راضی نہ تھے، مگر بی بی کے ایک اور قرابت دار کی شرکت سے یہ عقد مکمل ہوا۔

فسانہ افک

ام المومنین رضی اللہ عنہا جویریہ کے لئے نبی اکرم ﷺ نے حرم سرائے سے ملا ہوا حجرہ بنوایا۔ ادھر حجرہ تیار ہو رہا تھا ادھر شہر کے بدفطرت منافق لوگ آپس میں کانا پھوسی کر رہے تھے کہ عائشہ الصدیقہؓ کا قافلہ سے بچھڑ کر صفوان کی سواری پہ آنے کا مقصد کیا ہے۔ جبکہ صفوان خوبصورت بھی ہے اور جوان بھی۔ مسلمانوں میں سے بی بی حمنہ کے دل میں یہ کانٹا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے حضور اس کی حقیقی بہن زینب بنت جحش پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو فوقیت حاصل کیوں ہے؟ حمنہ نے اس کینہ میں بے قابو ہو کر افترا کو ہوا دینا شروع کر دیا۔ درپردہ ان کی پشت پناہی میں حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے جن کی مجالس علی ابن ابی طالب سے بہت زیادہ رہتیں۔ بے ایمانوں میں سے راس المنافقین ابی نفسِ امارہ بالسوء کو بھی اس معاملہ میں دخل تھا۔ اسے گویا ایسی چراگاہ مل گئی جہاں سے اسے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے ہر قسم کی خشک اور تر گھاس موجود تھی۔ ابن ابی نے جی بھر کر ہوائیاں اڑائیں۔

وفادارانِ ازلی

صورت یہ تھی کہ قبیلہ اوس کا ہر فرد بلاتفریق جنس ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی عفت و عصمت کی قسم کھا رہا تھا - پھر بھی یہ خبر شہر میں پھیل ہی گئی۔

رسول اللہ ﷺ کی پریشانی

ہوتے ہوتے یہ بات رسول اللہ ﷺ کے کانوں تک پہنچ گئی۔ آپ بیحد متعجب ہوئے۔ ذہن میں مختلف خیالات کا تلاطم پیدا ہوا' اے اللہ کیا ہوا۔ لوگوں کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ کو ام المومنین پر اتنا اعتماد تھا کہ آپ ﷺ کے دل میں ان کے بارہ میں ایسا خیال آنا ہی ناممکن تھا۔ لیکن آپ ﷺ کے اردگرد مختلف گھٹیا خیالات پر مشتمل لوگوں کی زبانوں سے نکلے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔

ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی علالت

حرم سرائے رسالت و صداقت محمد ﷺ اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے کسی کو جرأت نہ تھی کہ وہ زبان پر ایسا ایک حرف بھی لا سکیں مگر رسول اللہ ﷺ کی نگاہِ کرم بھی پہلی سی نہ رہی۔ اس غم میں وہ بیمار ہو گئیں۔ انہیں اصل وجہ کا علم تک نہ تھا۔ تیمار داری

کے لئے آپ کی والدہ ماجدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پاس رہتیں۔ رسول اللہ ﷺ عیادت بھی فرماتے تو صرف ان لفظوں میں طبیعت کیسی ہے؟ مگر ام المومنین رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی سردمہری دیکھ کر اور زیادہ بیمار ہو گئیں۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی بے رخی کو جویریہ رضی اللہ عنہا کی آمد پر محمول فرمایا اور اس خلش کی وجہ سے درخواست کی۔ مجھے صحت یاب ہونے تک میکے جانے کی اجازت دی جائے۔ اجازت مل گئی۔ آپ میکے تشریف لے آئیں لیکن اجازت مل جانے سے ام المومنین رضی اللہ عنہا کے دل کا بوجھ کم نہیں بلکہ اور زیادہ ہوا۔ مسلسل 19 روز بستر علالت پر پڑی رہیں اور سوکھ کر کانٹا ہو گئیں۔ ابھی تک انہیں خود پر عائد شدہ الزام کی خبر تک نہ ہوئی تھی۔

افک کی تحقیق

اسی اثناء میں رسول اللہ ﷺ نے خطبہ فرمایا۔ صاحبو! بعض لوگ میرے حرم پر افترا باندھ رہے ہیں جو میری ذہنی اذیت کا سبب بن گیا ہے۔ اللہ لم یزال کی قسم مجھے اپنے اہل بیت کی عصمت و عفت پر پورا یقین ہے اور اس افتراء میں جس شخص کو ملوث کیا جاتا ہے۔ میں اسے نیک طینت اور صالح سمجھتا ہوں۔ وہ میرے ہاں اگر کبھی آیا بھی ہے تو میری معیت میں۔

اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

بنو اوس کے ایک سروقد نوجوان اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی وقت اٹھ کر عرض کیا۔ یہ مفتری اگر قبیلہ اوس میں سے ہے تو اس کا نام معلوم ہونے پر ہم اس کا انسداد کر سکتے ہیں اور اگر افترا باندھنے والے ہمارے بھائی قبیلہ خزرج میں سے ہیں تو اس کے متعلق بھی جو ارشاد ہو ہم سب تعمیل کے لئے حاضر ہیں۔ اللہ کی قسم ایسا بدفطرت آدمی گردن مار دینے کے قابل ہے۔

یہ سن کر قبیلہ خزرج کے سردار جناب سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اٹھے اور ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تمام بات ہمارے سر تھوپ دی ہے۔ کاش اگر اس افواہ کا منبع قبیلہ اوس ہوتا تو اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایسی سخن آرائی نہ کرتا۔ ان دونوں قبیلوں کی تقریروں سے فضا میں اشتعال پیدا ہو گیا۔ شیطان کو اپنے کردار کا کھل کر مظاہرہ کرنے کا موقع ملا لیکن رسول اللہ ﷺ کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

اطلاع کے بعد

آخر اس بدترین افتراء کی گونج ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کانوں سے ٹکرا ہی گئی۔ عصمت پناہ طاہرہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے دامن تقدیس پر دھبہ کی انگشت الاماں۔ بہت

زیادہ روئیں۔ اتنا روئیں کہ روتے روتے اپنی والدہ کی گود میں سر رکھ دیا اور کہا۔ ام محترم آپ نے تو یہ افترا سنا ہو گا۔ مجھے بتایا کیوں نہیں۔ والدہ نے عرض کیا۔ اللہ تعالیٰ پہ بھروسہ رکھو۔ سچائی جھوٹ کے اندھیروں کا سینہ چیر کر نکل آتی ہے لیکن اس وقت تک ام المومنین رضی اللہ عنہا کو سکون آتا تو کیسے؟

اس میں یہ جملہ مؤلف لکھتے ہیں۔ "دختر نیک اختر ایسی عورت کونسی ہے جو تمہاری طرح اپنے شوہر کی چہیتی ہو اور اس کی سوکنیں اس سے دشمنی نہ کریں۔ دوسرے اشخاص اس کے حسد سے جل کر کباب نہ ہوں لیکن طاہرہ صادقہ کو والدہ کی دل جوئی سے تسلی نہ ہوئی۔ فاضل مؤلف اس مسئلہ میں تمام امہات المومنین کو لے آئے۔ حالانکہ اس افک میں ان میں سے کسی کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ سب کچھ دار نبوت کے باہر کے لوگوں میں سے کچھ منافق لوگ کر رہے تھے۔

مختصر یہ کہ جب جب بھی ام المومنین رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کی حد سے سرد مہری کا تصور کرتیں تو سوچتیں اللہ نہ کرے۔ اگر یہ افترا نبی اکرم ﷺ کے دل میں گرہ بن کر بیٹھ گیا تو کیا ہو گا۔ اضطراب بڑھتا کبھی رسول اللہ ﷺ کے سامنے قسم کھا کر اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کا ارادہ کرتیں۔ بعض اوقات آنحضرت ﷺ کی محبت کے لئے تسلیم اتہام کے بعد قسم سے خود کو تہمت سے بری کرنے کے منصوبے بناتیں۔ کبھی یہ منصوبہ کہ ان دنوں جس طرح رسول اللہ ﷺ میرے ساتھ پیش آ رہے ہیں۔ میں بھی اسی قسم کی بے اعتنائی کا برتاؤ کروں؟ (فاضل مؤلف ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جس سوچ کو پیش کیا ہے۔ یہ ان کی اپنی ہو سکتی ہے۔ ام المومنین کی نہیں ہو سکتی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ان کے مشاہدہ میں یہ بات کئی بار آ چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول ﷺ کو کسی ایسے موقع پر حقیقت سے ناواقف نہیں رہنے دیتے۔ اس لئے وہ ادھر ادھر کی باتیں عام عورتوں کی سطح پر سوچ ہی نہیں سکتی تھیں۔ چنانچہ فاضل مؤلف کے اس پیراگراف کا آخری جملہ ام المومنین کی سوچ کا صحیح عکاس انہوں نے خود ہی لکھ دیا ہے) مترجم۔

ام المومنین کے ذہن میں آخر کار یہ خیال آیا سرور دوعالم ﷺ تو اللہ رب العزت کے برگزیدہ نبی ہیں۔ جس نے آپ کو ازدواج پر برتری عطا فرمائی ہے۔ یہ افتراء عوام کی کارستانی ہے۔ (اس میں سوکنوں کا کوئی عمل دخل نہیں: م) جس سے میرے قافلہ سے بچھڑ جانے کے بعد صفوان کے ناقہ پر آنے سے موقع مل گیا۔ رسول اللہ ﷺ کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔

بالآخر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ اللہ تعالیٰ مجھے سیدھی راہ بتا

تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر میری بے گناہی ثابت ہو جائے اور مجھ پر پہلے کی طرح نگاہ کرم مرکوز ہو جائے۔

تحقیق افک

عام لوگوں میں چہ مگوئیوں کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پریشان تھے۔ آخری تدبیر پر توجہ فرمائی اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں تشریف لے گئے۔ اپنے قابلِ اعتماد انفاس میں سے اسامہ رضی اللہ عنہم اور علی ابن ابی طالب کو طلب فرمایا۔ دونوں سے پوچھا تو اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سادگی سے برآت کرتے ہوئے نفس الامر کو افتراء جھوٹ' بہتان عظیم سے تعبیر فرمایا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی یہی یقین تھا۔ ان کے بعد علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا۔ تو انہوں نے تصدیق و تکذیب دونوں سے الگ ہو کر ان النساء کثیرۃ (عورتوں کی کمی نہیں) کہنے کے ساتھ عرض کیا۔ اس معاملہ میں ام المومنین رضی اللہ عنہا کی کنیز بریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دریافت فرمایئے اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کنیز کے آتے آتے اسے اچھی طرح زدوکوب کیا۔ (دروغ برگردن راوی) علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کردار ایسا نہ تھا) تاکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سچی شہادت پیش کرے۔ کنیز نے مختصر لفظوں میں ارشاد فرمایا۔ واللہ وہ تو سراپا عصمت ہیں۔ اس کے علاوہ بھی انہوں نے ام المومنین کی برآت میں بہت کچھ کہا۔ (اصل واقعہ بخاری میں ملاحظہ فرمائیں۔ مترجم)

اس تفتیش کے بعد ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے دریافت کرنا باقی رہ گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر تشریف لائے۔ اس وقت سیدہ کے پاس والدین کے سوا ایک انصاری خاتون بھی تشریف فرما تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوال پر ام المومنین رضی اللہ عنہا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ انصاری خاتون بھی رونا ضبط نہ کر سکیں۔ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا موقف یہ تھا کہ جس کا وجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہوں میں اس سے پہلے انتہائی قابلِ قدر تھا آج ان کی نظروں سے اس طرح گر گیا۔

اور جب ام المومنین رضی اللہ عنہا نے خود کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف متوجہ کیا تو آنسو خود بخود تھم گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا عائشہ (رضی اللہ عنہا) اللہ عزوجل سے ڈرتی رہو۔ اگر لوگوں کا خیال صحیح ہے تو اس کے حضور توبہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ جملہ ختم ہوتے ہی ام المومنین رضی اللہ عنہا کی رگوں میں غصہ سے خون کھول گیا۔ آنکھوں سے آنسو بہنا بند ہو گئے۔ پہلے انہوں نے اپنی والدہ کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھی تھیں۔ پھر والدِ محترم کی طرف دیکھا وہ بھی چپ سادھے بیٹھے تھے۔ ام

المومنین رضی اللہ عنہا نے دونوں سے گلہ کیا۔ آپ لوگ خاموش بیٹھے ہیں؟ دونوں نے عرض کیا۔ "ہمیں حقیقت کا کوئی علم نہیں" اس کے بعد دونوں نے سر جھکا لیا۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ جس سے قدرتاً غصہ کا ہیجان ختم ہو گیا مگر اسی حالت میں رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ آپ جو مجھے توبہ کرنے کا مشورہ دے رہے ہیں؟

میں نے جب جرم کیا ہی نہیں تو پھر توبہ کس جرم کے لئے کروں؟ دشمن مجھ پر جو افترا باندھ رہے ہیں میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ جس کی بناء پر میں توبہ کروں گی اور اگر میں اپنی صفائی میں کچھ کہوں تو اللہ تعالیٰ پر میری پاکدامنی اچھی طرح واضح ہے لیکن اگر میں لوگوں کے سامنے اپنی صفائی پیش کروں تو وہ میری تصدیق کیسے کر سکتے ہیں۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد ام المومنین رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔

میں اپنی صفائی میں اتنا ہی کہہ سکتی ہوں جتنا حضرت یوسف علیہ السلام کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا۔ فصبر جمیل واللہ المستعان علی ما تصفون۔ (8:12) بہترین عمل صبر ہے، مکمل صبر اللہ تعالیٰ ہی مدد کرے تو جو کچھ تم بیان کرتے ہو اس پر سے نقاب اٹھے۔

آیات برآت نازل ہوئیں

اس گفتگو کے بعد پوری مجلس پر سناٹا چھا گیا۔ سب کے ساتھ سرور دو عالم ﷺ بھی خاموش تھے۔ کسی کو وقت کی آمدورفت کی طوالت یا کمی کا احساس نہ رہا۔ اس اثناء میں نزول وحی کے اثرات ظاہر ہوئے۔ ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا چہرہ مبارک چادر سے ڈھانک دیا گیا۔ سرہانے تکیہ رکھ دیا گیا۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں اس وقت نہ تو مجھے اپنی پاکدامنی کی وجہ سے وحی کے نزول پر پریشانی تھی اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بارے میں کوئی شک و شبہ تھا۔ لیکن میری والدہ اور والد کو ممکن ہے کوئی دغدغہ ہو۔ مختصر یہ کہ ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب نزولِ وحی کا عرصہ ختم ہوا اور مہبطِ وحی محمد ﷺ نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے مجھے مخاطب ہو کر کہا۔

ابشری یا عائشہ! قد انزل اللہ برائتک!

عائشہ (رضی اللہ تعالیٰ عنہا) مبارک ہو اللہ تعالیٰ نے تمہاری برائت (صفائی) فرما دی۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے جواب میں صرف الحمد للہ فرمایا۔ اور خاموش رہیں۔ رسول اللہ ﷺ فوراً مسجد میں تشریف لے گئے اور جانثارانِ رسالت و توحید رضوان اللہ تعالیٰ علیہم

اجمعین کو یہ آیات سنائیں۔
ان الذین جاؤ بالافک عصبۃ منکم لا تحسبوہ شر لکم بل ھو خیر الکم لکل
امری عمنھم ما اکتسب من الاثم والذی تولی کبرہ منھم لہ عذاب عظیم۔
جن لوگوں نے بہتان باندھا ہے تم میں سے ایک جماعت ہے۔ اس کو اپنے حق میں برا نہ سمجھنا بلکہ
وہ تمہارے لئے اچھا ہے۔ ان میں سے جس شخص نے گناہ کا جتنا حصہ لیا اس کے لئے اتنا وبال ہے۔
اور جس نے ان میں سے اس بہتان کا بڑا بوجھ اٹھایا ہے اس کو بڑا عذاب ہو گا۔
لولا اذ سمعتموہ ظن المنومنون والمومنت بانفسھم خیراً وقالو ھذا افک
مبین۔
جب تم نے وہ بات سنی تھی تو مومن مردوں اور عورتوں کیوں اپنے دلوں میں نیک گمان نہ کیا اور
(کیوں نہ) کہا کہ یہ صریح بہتان ہے۔
لولا جاءو علیہ بار بعۃ شھداء فاذلم یاتوا بالشھداء فاولئک عنداللہ ھم الکاذبون۔
یہ (افترا پرداز) اپنی بات (کی تصدیق) کے (لئے) چار گواہ کیوں نہ لائے تو جب یہ گواہ نہیں لاسکے تو
اللہ کے نزدیک یہی جھوٹے ہیں۔
ولو لا فضل اللہ علیکم ورحمتہ فی الدنیا والاخرۃ لمسکم فی ما افضتم فیہ
عذاب عظیم۔
اور اگر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو جس شغل میں تم منہمک تھے
اس کی وجہ سے تم پر بڑا (سخت) عذاب نازل ہوتا۔
اذ تلقونہ بالسنتکم وتقولون بافواھکم مالیس لکم بہ علم وتحسبونہ ھیناً
وھو عنداللہ عظیم
جب تم اپنی زبانوں سے اس کا ایک دوسرے سے کرتے تھے اور اپنے منہ سے ایسی بات کہتے تھے
جس کا تم کو کچھ بھی علم نہ تھا اور تم اسے ایک ہلکی بات سمجھتے تھے اور اللہ کے نزدیک وہ بڑی بھاری
بات ہے۔
ولو لا اذ سمعتموہ قلتم مایکون لنا ان نتکلم بھذا سبحنک ھذا بھتان عظیم
اور جب تم نے سنا تھا تو یہ کیوں نہ کہہ دیا تھا کہ ہمیں تو ایسی بات منہ سے نکالنا بھی مناسب نہیں اے
اللہ تو پاک ہے۔ اور یہ تو بڑا ہی زبردست بہتان ہے۔
یعظکم اللہ ان تعودوا لمثلہ ابدا ان کنتم مومنین ویبین اللہ لکم لایت واللہ
علیم حکیم
اللہ تمہیں نصیحت کرتا ہے کہ اگر مومن ہو تو پھر کبھی ایسا (کام) نہ کرنا اور اللہ تمہارے (سمجھانے)
کے لئے اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان فرماتا ہے اور اللہ جاننے والا (اور) حکمت والا

ہے۔

ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشه فی الذین امنوالهم عذاب الیم فی الدنیا ولاخر ۃ واللہ یعلم وانتم لا تعلمون- (24:11 تا 19)

جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مومنوں میں بے حیائی (یعنی تہمت بدکاری کی خبر) پھیلے ان کو دنیا اور آخرت میں دکھ دینے والا عذاب ہو گا اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

تعزیر افک

اسی افک پاکدامن عورت پر بہتان لگانے کی سزا کا یہ حکم قرآن حکیم میں نازل ہوا۔

والذین یرمون المحصنت ثم لم یاتوا باربعه شهداء فاجلدوهم ثمانین جلده ولا تقبلوا لهم شهادة ابدا واولئک هم الفاسقون- (24:4)

اور جو لوگ پرہیز گار عورتوں کو بدکاری کا عیب لگائیں اور اس پر چار گواہ نہ لائیں تو ان کو اسی درے مارو اور کبھی ان کی شہادت قبول نہ کرو اور یہی بدکردار ہیں۔

اس تعزیر افتراء کے نازل ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مندرجہ ذیل افراد کو اسی دروں کی سزا دی۔

(1) مسطح بن اثاثہ (2) حسان بن ثابت (3) اور بی بی حمنہ (دختر جحش) انہیں نے اصل میں صدیقہ طاہرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے خلاف بہتان لگایا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جب عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا کی برائت فرمادی تو اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں عائشہ الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وقار بلند ہو گیا۔

سر ولیم میور کی رائے

واقعہ افک پر سر ولیم میور (جن کی توثیق کے بغیر وحی الٰہی کی تصدیق ناکافی تھی: م) فرماتے ہیں کہ بلاشبہ حضرت عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا افک سے پہلے بھی اور بعد میں بھی دونوں عہدوں میں اس قدر پاک دامن تھیں کہ آپ کے متعلق ایسا شبہ نہ صرف بے بنیاد ہے بلکہ اس کی تردید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مجرمین کی تعزیر کے بعد

ان میں سے حسان بن ثابت تعزیر کی سزا پانے کے بعد پہلے ہی کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لطف و کرم سے بہرہ یاب ہو کر رہے۔ مسطح کا تعاون حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جس طرح ہمیشہ فرماتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کہنے پر از سرِ نو ان کا وظیفہ جاری کر دیا

گیا۔

مدینہ کی فضا بدستور اپنی سابقہ سطح پر آ گئی۔ مسلمانوں کے دلوں میں ام المومنین عائشہ الصدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا وقار و احترام پہلے سے زیادہ ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے یکسوئی کے ساتھ دعوتِ دین پہ توجہ دینا شروع کر دی۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی سیاسی فلاح و بہبود کے لئے اس قرارداد کا وقت آ گیا۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے "فتحا مبینا" کا عنوانِ جلی عطا فرمایا جس کی تفصیل آنے والی بیسیویں فصل میں آپ پڑھیں گے۔ انشاء اللہ۔

حدیبیہ

حُدیبیہ

فتحِ مبین

رحمت للعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو ہجرت کئے ہوئے چھ سال کا عرصہ گزر گیا۔ ان سالوں میں انہیں دشمنوں کے حملوں کی مدافعت کرتے ہوئے مسلسل حالتِ جنگ میں رہنا پڑا کبھی قریشِ مکہ کفار لشکر لے کر حملہ آور ہوتے تو کبھی یہود کی خوفناک سازشوں کا سامنا کرنا پڑا لیکن مسلمانوں کی ان پریشانیوں کے باوجود دین اسلام کا اجالا پھیلتا ہی گیا۔ اللہ وحدہ لاشریک کی عظمتیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقتیں چاروں طرف ابر رحمت بن کر برستی ہی رہیں۔ گمراہوں کو ہدایت سے محبت ہوتی ہی گئی۔ مسلمانوں کا ایمان استقلال اور عاقبت پر یقین مستحکم ہوتا گیا۔

ہجرت کا پہلا ہی سال تھا کہ قیام صلوٰۃ میں مسجدِ اقصیٰ (بیت المقدس) سے مسجد حرام (بیت اللہ شریف) کی طرف رخ پھیرنے کا حکم نازل ہو گیا۔ یعنی اب مسلمان کعبہ کو قبلہ صلوٰۃ بنائیں گے جو مکہ معظمہ میں ہے اور اسے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تعمیر فرمایا تھا۔ ان کے بعد گو وقتاً فوقتاً بعد میں بھی تعمیر ہوتی رہی یہاں تک کہ اس کی تعمیر میں خود نبی آخرالزماں خاتم الانبیاء محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی آغاز شباب میں حصہ لیا اور سب سے بڑی اہم بات تو یہ ہے کہ اس کے حجر اسود کو اس کے مقام نصب پر اپنے ہاتھوں سے نصب فرمایا۔

یہ اس زمانے کی بات ہے جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عطیۂ رسالت کا علم تھا نہ ہی آپ کے متعلق کسی کے ذہن میں یہ بات آ سکتی تھی کہ آپ مستقبل میں اپنے منصبِ رسالت پہ فائز کر دیئے جانے والے ہیں۔

مسجدِ حرام (کعبہ) اہلِ عرب کی عبادت گاہ تھی جس میں چار مہینے ادب والے ہوتے

اور انہیں چار مہینوں میں زیارت کرنے والے آتے' اس کی تقدیس و تکریم کا یہ عالم تھا کہ اسی حدِ حرم میں جو بھی داخل ہو جاتا وہ دشمن سے مامون و محفوظ ہو جاتا۔ چاہے اس پر حملہ کرنے کا جواز بھی موجود ہو۔ اس کو جان سے مارنا تو ایک طرف اسے زخمی بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لیکن جب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ مکرمہ سے ہجرت کی' کفارِ مکہ نے ان کا مکہ معظمہ میں داخل ہونا ممنوع قرار دے دیا۔ انہیں مکہ مکرمہ میں داخل ہونے سے روکنے کی قسمیں کھا رکھی تھیں۔

گہوارۂ امن

جبکہ اہلِ مکہ کے اس ظالمانہ رویّہ پر ہجرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلے سال ہی یہ آیات نازل ہوئیں۔

یسئلونک عن الشھر الحرام قتال فیہ قل قتال فیھا کبیر وصد عن سبیل اللہ کفر بہ والمسجد الحرام واخراج اھلہ منہ اکبر عند اللہ۔ الخ 217:2

(اے محمد) لوگ تم سے عزت والے مہینوں میں لڑائی کرنے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ ان میں لڑنا بڑا گناہ ہے۔ اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس سے کفر کرنا اور مسجدِ حرام (یعنی خانہ کعبہ میں جانے) سے (بند کرنا) اور اہلِ مسجد کو اس میں سے نکال دینا (جو یہ کفار کرتے ہیں) اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ (گناہ) ہے۔

اور غزوہ بدر کے بعد یہ آیات نازل ہوئیں۔

ومالھم الا یعذبھم اللہ وھم یصدون عن المسجد الحرام وما کانوا اولیاء ان اولیاؤہ الا المتقون ولکن اکثرھم لا یعلمون

اور (اب) ان کے لئے کون سی وجہ ہے کہ وہ انہیں عذاب نہ دے جبکہ وہ مسجد محترم (میں نماز پڑھنے) سے روکتے ہیں اور وہ اس مسجد کے متولی بھی نہیں اس کے متولی تو صرف پرہیزگار ہیں لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

وما کان صلوتھم عند البیت الا مکاء وتصدیۃ فذوقو العذاب بما کنتم تکفرون۔

اور ان لوگوں کی صلوٰۃ بیت اللہ کے پاس سیٹیاں اور تالیاں بجانے کے سوا کچھ نہ تھی تو تم جو کفر کرتے تھے اب اس کے بدلے عذاب کا مزا چکھو۔

ان الذین کفروا ینفقون اموالھم لیصدوا عن سبیل اللہ فسینفقونھا ثم تکون

علیھم حسرۃ ثم یغلبون والذین کفروا الی جھنم یحشرون۔ (8:34 تا 36)
جو لوگ کافر ہیں اپنا مال خرچ کرتے ہیں کہ (لوگوں کو) اللہ کے رستے سے روکیں سو ابھی اور خرچ کریں گے مگر آخر خرچ کرنا ان کے لئے (موجب) افسوس ہو گا اور وہ مغلوب ہو جائیں گے اور کافر لوگ دوزخ کی طرف ہانکے جائیں گے۔

اس مفہوم کی اور بھی بہت سی آیات ہجرت کے بعد 6 سال کے عرصہ میں نازل ہوئیں جس میں بیت اللہ شریف کی بار بار زیارت اور اس کے جائے امن ہونے کا ذکر تھا۔

واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا (2:125)
اور جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لئے جمع ہونے اور امن پانے کی جگہ مقرر کیا۔

کفار نے یہ مصمم ارادہ کر لیا کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین جو ہمارے معبودوں ہبل' اساف' نائلہ اور دوسرے بتانِ کعبہ کی معبودیت کے منکر ہیں ان کے اور اپنے باپ دادا کے معبودوں کو نہ مانیں' ان کے ساتھ تب تک جنگ کرنا اور انہیں کعبہ میں داخل ہونے سے روکنا ان کا فرض ہے۔

مسلمان ان چھ سالوں میں کعبہ کی زیارت سے محروم اور دینی فریضہ کو ادا کرنے سے قاصر رہے جن سے ان کے باپ دادا ہمیشہ مستفیض ہوتے رہے۔ خصوصاً مہاجرین بیت اللہ سے علیحدگی کے صدمہ کو بہت زیادہ محسوس کرتے جس کے ساتھ انہیں جہاں مکہ کی جدائی کا غم کھاتا' وہاں انہیں وطن اور اپنے اہل و عیال سے بچھڑنے کا الم بھی چین نہ لینے دیتا۔

لیکن مہاجرین اور انصار دونوں اللہ تعالیٰ کی نصرت کے امیدوار تھے کہ وہ ایک نہ ایک دن اپنے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اس کے مطیع و فرمانبردار صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو ضرور کامیاب فرمائے گا۔ دین اسلام کو تمام باطل ادیان پر غلبہ عطا فرمائے گا۔ انہیں ان مبارک گھڑیوں کے جلد سے جلد آنے کا یقین تھا جس میں اللہ رب العزت ربِ بیت العتیق ان پر مکہ مکرمہ کے دروازہ کھول دے گا۔ وہ بیت اللہ العتیق ولیطوفوا بالبیت العتیق (22:29) کا طواف کریں گے۔ دوسروں کی طرح انہیں بھی اس فریضہ کو ادا کرنے کا موقع نصیب ہو گا۔ جسے اللہ تعالیٰ نے ہر صاحبِ قدرت پر (تمام نسل آدم) فرض کر رکھا ہے۔

مسلمانوں کا شوقِ طواف

کئی سال تک تو مسلمانوں کو جنگوں نے گھیرے رکھا۔ غزوہ بدر ختم ہوا تو احد کی

ہولناک جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کے بعد اچانک جنگِ خندق مسلط کر دی گئی۔ اسی طرح اور بھی کئی لڑائیوں نے انہیں چین سے بیٹھنے ہی نہ دیا لیکن بیت اللہ کی زیارت کا یقینِ کامل ہمیشہ ان کی نگاہوں میں شوق کا نور بن کر جگمگاتا رہا۔ وہ خود ہی نہیں بلکہ ان کے راہبرو ہادیِ برحق محمد ﷺ بھی اسی شوق کو دل و نگاہ میں سمیٹے دن گزار رہے تھے۔ مگر آج انہوں نے اپنے مطیع و متبع صحابہ کرام کو خوشخبری سناتے ہوئے فرمایا کہ اب وہ وقت قریب آچکا ہے جس میں ہمارے ایمان و شوق کو کامرانی نصیب ہو گی۔

دروازے بند

کفارِ مکہ نے اپنی قوت و مرتبہ کے گھمنڈ میں محمد ﷺ اور تمام جانثارانِ اسلام پر کعبہ کے دروازے بند کر رکھے تھے۔ مسلمان حج یا عمرہ ان میں سے کوئی بھی فریضہ ادا نہیں کر سکتے تھے۔

سوال یہ ہے کہ یہ بیت العتیق یعنی کعبہ صرف قریش ہی کی ملکیت تھی؟ وہ تمام عرب کی یکساں ملکیت نہیں تھا؟ قریش تو اس کے صرف محافظ تھے۔ ان کا کام تو کعبہ کی چابیاں سنبھالنا' حاجیوں کو پانی پلانا اور دعوت کی چاکری تھی اور ان کے یہ مناصب بھی کعبہ شریف کی زیارت کو آنے والوں کے ہی مرہون منت تھے۔

عجیب و غریب بات یہ ہے کہ اس کعبہ کے اندر ہر ایک کا بت علیحدہ علیحدہ نصب تھا اور کسی قبیلہ کو اپنے معبود بت کے سوا کسی دوسرے کے صنم سے واسطہ نہ تھا اور قریش بحیثیت مجاور اس بات کے مجاز ہی نہیں تھے کہ کسی کو اس کے مراسم ادا کرنے سے منع کریں۔

لیکن جب اندھیری کائنات میں اجالوں کے محور رحمتِ کل عالم ﷺ کا ظہورِ اقدس ہوا تو آپ ﷺ نے لوگوں کو بت پرستی سے نجات دلانے کی کوشش کا آغاز فرمایا اور اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کی دعوت دی تاکہ انہیں انسانیت کا شرف حاصل ہو۔ دنیا میں اتنے سربلند ہوں کہ اس سے بڑھ کر کسی رفعت و سربلندی کا امکان ہی نہ رہے۔ رسول اکرم ﷺ نے انسان کو ایسی روحانی زندگی کے عروج سے آشنا کرنا چاہا جس سے یہ انسان وجودِ حقیقی تک رسائی کر سکے۔ ایسی توحید جس کے فرائض میں حج و عمرہ کا ادا کرنا بھی شامل تھا۔ لیکن کفارِ مکہ کی ستم ظریفی تو دیکھیے کہ انہوں نے مسلمانوں کو یہ فرض ادا کرنے سے زبردستی روک رکھا تھا۔

کفارِ مکہ کے دل میں چور تھا' انہیں کھٹکا تھا کہ جب بھی محمد ﷺ اور مسلمان

بیت اللہ شریف میں زیارت کے لئے آ گئے تو ان کا آنا ان کے حق میں اچھا نہیں ہو گا۔ آخر وہ مسلمان اہلِ مکہ کے عزیز و اقارب میں سے ہیں جیسے ہی ان کی نگاہیں آپس میں ملیں گی آمنا سامنا ہو گا تو رگوں میں دوڑتا ہوا مشترکہ خون جوش مارے گا۔ محبت اپنا رنگ لائے گی جس سے اہلِ مکہ کو اس بات کا دکھ ہو گا کہ ان کے عزیز و اقارب کا اپنے اہل و اولاد سے بچھڑے رہنا بڑا ظلم ہے۔ ایسے حالات میں ہو سکتا ہے مسلمانوں کے ہمدردوں اور دشمنوں کے درمیان خانہ جنگی ہو جائے۔ اس کے سوا ان کے دل میں یہ خلش بھی تھی کہ محمد ﷺ اور ان کے صحابہ کرام نے ان کے لئے شام کی تجارتی راہ کو مسدود کر رکھا ہے۔ ان اسباب کی بناء پر اہل مکہ کی مسلمانوں سے دشمنی پورے شباب پر چھائی ہوئی تھی۔ اس حقیقت کا احساس انہیں کبھی نہ ہوا کہ وہ کعبہ کے مالک نہیں بلکہ اس کے صرف مجاور ہیں اور ہمارا فرض ہے کہ ہم زائرین کو پانی' کھانا اور مناسب آرام مہیا کریں۔

کعبہ اور مسلمان

مسلمان چھ سال سے مکہ معظمہ سے ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ وہ زیارت و طواف کے لئے سر سے لیکر پاؤں تک بے تاب تھے۔ ایک صبحِ سعادت میں وہ مسجد نبوی ﷺ کے حضور میں جمع تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کو یہ مژدہ جانفزا سنایا۔ لتدخلن المسجد الحرام انشاء اللہ امنین (27:48) تم مسلمان مسجد حرام میں بلاخوف و خطر اطمینان سے داخل ہو گے۔ مسلمانوں نے باآواز بلند کہا "الحمد للہ" یہ خوشخبری آناً فاناً پورے مدینہ منورہ کی فضاؤں میں بادِ بہاری کی طرح پھیل گئی۔

لیکن سب کو حیرانی یہ تھی یہ ہو گا کیسے؟ ہم بیت اللہ شریف میں کس طرح داخل ہوں گے' اس کا ذریعہ مکہ والوں سے فیصلہ کن جنگ ہو گی یا کفارِ مکہ ازخود مطیع و فرماں بردار ہو کر ہمارے داخلہ کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنیں گے؟ لیکن اللہ تعالیٰ کا فیصلہ یہ تھا کہ مسلمان مکہ معظمہ میں جنگ یا حملہ آور ہوئے بغیر مکہ معظمہ میں داخل ہوں گے۔

عام منادی

رسول رحمت ﷺ نے مدینہ منورہ میں منادی کروا دی کہ تمام غیر مسلم حلیف قبائل کے ہاں وفود بھیجے جائیں کہ سب ہمارے ساتھ زیارتِ کعبہ کے لئے تیار ہو جائیں۔ لیکن جنگ کا ارادہ کر کے کوئی بھی اپنے گھر سے نہ نکلے البتہ مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد ضرور مطلوب تھی تاکہ عرب پر محمد ﷺ کی طرف سے یہ بات واضح ہو جائے کہ وہ ادب والے مہینوں میں جنگ کرنا نہیں چاہتے۔ ان کا مقصد صرف اپنا حق حاصل کرنا

یعنی بیت اللہ شریف کی زیارت کرنا ہے اور یہ فریضہ جو اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کیا اس کا تعلق کچھ مسلمانوں ہی کے لئے مخصوص نہ تھا بلکہ ہر اہل عرب بھی ہر عقیدہ کا یا ہر مسلک کا آدمی اسے بحیثیت فرض بھی ادا کرتا تھا۔ اس لئے نبی اکرم ﷺ نے غیر مسلم قبائل کو بھی اپنے ساتھ زیارتِ کعبہ کی دعوت دی۔ اس کے علاوہ رحمتِ کل عالم ﷺ کے مدِنظر یہ مقصد بھی تھا کہ اگر پرامن طریق کے باوجود بھی بیت اللہ کی زیارت سے روکنے کے لئے مکہ والوں نے مقابلہ کی صورت استقبال کیا تو عرب کا کوئی صاحبِ عقل و دانش ان کی حمایت نہیں کرے گا اور نہ ہی مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک ہو گا بلکہ ان کو اس بات کا یقین ہو جائے گا کہ اہلِ مکہ لوگوں پر کعبہ کے دروازے بند کر کے انہیں اسماعیلی دین اور ملتِ ابراھیمی سے ہٹانا چاہتے ہیں پھر یہ بھی یقین تھا کہ اگر مکہ والوں نے ایسا غلط قدم اٹھایا تو یہ ضرور ہو گا کہ آئندہ وہ مسلمانوں کے خلاف غزوۂ خندق (احزاب) کی طرح ہلہ نہیں بول سکیں گے۔ اس صورت میں عرب ان کو صاف صاف کہہ دیں گے کہ اہلِ مکہ نے ان پرامن لوگوں کو بھی تو زیارتِ کعبہ سے روک دیا تھا جبکہ ان کی تلواریں نیام میں تھیں۔ احرام باندھے ہوئے قربانی کے جانوروں کے آگے آگے چل رہے تھے۔ یہ غریب تو صرف زیارتِ کعبہ کا فرض ادا کرنے کے لئے آئے تھے۔

غیر مسلم قبائل کی کنارہ کشی

آنحضرت ﷺ کی منادی کا مثبت جواب غیر مسلم قبائل نے بہت ہی تھوڑی تعداد میں دیا۔ بہرحال رسول اللہ ﷺ کا یہ سفر ذیقعد میں شروع ہوا۔ (یہ مہینہ بھی ادب والے مہینوں کا ایک حصہ ہے) چودہ ہزار مسلمان زائرین (صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین) کو ساتھ لیکر اپنی قصویٰ نامی ناقہ پہ سوار ہادی برحق چلے۔ اس قافلہ میں مہاجرین و انصار کے علاوہ کچھ غیر مسلم قبائل بھی تھے۔ مسلمانوں کے ہمراہ قربانی کے ستر اونٹ تھے۔ جن میں ابوجہل کا وہ اونٹ بھی تھا جو غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ آیا تھا۔ ذوالحلیفہ پہنچ کر عمرہ کی نیت سے احرام باندھے گئے۔ فضاؤں میں اَللّٰھُمَّ لبیک کی صدائیں گونجیں۔ زائرین نے سر کے بالوں کی مینڈیاں گوندھ لیں۔ مسلمانوں کے پاس صرف تلواریں تھیں۔ وہ بھی نیام میں۔ خیال رہے تلوار باندھنا عرب کا عام دستور تھا۔ امہات المومنین میں سے اُمِ سلمہ رضی اللہ عنہا شریکِ سفر تھیں۔

قریش کی پیش بندی

قریش مکہ کو جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے اس کے منفی اور مثبت تمام پہلوؤں پر غور و فکر کیا اور اس نتیجہ پہ پہنچے کہ ان کا حریف اس طریقہ سے مکہ معظمہ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے گویا وہ ان سے مدینہ پر حملہ کرنے کا انتقام لینے آ رہا ہے مگر اسے ناکام لوٹنا ہو گا۔ لیکن پریشانی کی بات یہ ہے کہ آج وہ ان کے شہر پر اس حیلہ سے قابض ہونے کے لئے سر پر آن کھڑا ہوا ہے۔

غالباً یہ ان کے اپنے ہی گندے ضمیر کی آواز تھی کہ جسے وہ خود صادق و امین مان چکے تھے۔ نامعلوم اس پر انہیں یقین کیوں نہ آیا۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو زیارتِ کعبہ اور طواف سے روکنے کا مصمم ارادہ کر لیا۔ چاہے انہیں اس کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ ادا کرنا پڑے۔ قریش نے دو سو جانبازوں کا لشکر خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابو جہل کی سپہ سالاری میں بھیجا جس نے مقام طویٰ پر مسلمانوں کی ناکہ بندی کر لی اور راستہ روک لیا۔

اطلاعات کا تبادلہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مقام عسفان پر جو مکہ معظمہ سے دو منزل کے فاصلہ پر ہے پہنچے۔ بنو کعب کا ایک شخص جو ادھر سے آ رہا تھا اس سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا۔ اہلِ مکہ آپ کے آنے کی خبر سنتے ہی بڑے طیش و غضب میں آ گئے ہیں۔ ان کا لشکر ذی طوی میں پہنچ چکا ہے۔ ان میں سے ہر لشکری نے قسم کھا رکھی ہے کہ وہ کسی قیمت پر آپ لوگوں کو مکہ معظمہ میں داخل نہ ہونے دے گا۔ ادھر خالد بن ولید اپنے لشکر کو لے کر مقام کراع الغمیم تک پہنچ چکا ہے۔ اس مقام اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پڑاؤ عسفان میں صرف آٹھ میل کا فاصلہ تھا۔ یہ خبر سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

یا ویح قریش! لقد اهلکتم الحرب ماذا علیهم لو خلوا بینی وبین سائر العرب فان هم اصابونی کان ذلک الذی ارادوا وان اظهر فی الله علیهم دخلوا فی الاسلام و اخرین وان لم یفعلوا قاتلوا وبهم قوة فماتظن قریش! فو الله لاازال اجاهد علی الذی بعثنی الله به حتی یظهره الله او تنفرد هذه السالفة۔

افسوس قریش کی حالت پہ افسوس، جنگوں نے انہیں برباد کر دیا۔ پھر بھی ان کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر آج وہ عرب زائرین کو طواف و زیارت سے نہ روکتے تو ان کا کیا بگڑتا۔ موجودہ صورت میں اگر وہ مجھ پر غالب آ گئے تو انہیں بڑی خوشی ہو گی اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے ان پر غالب کر دیا تو وہ جوق در جوق اسلام قبول کر لیں گے۔ اگر انہوں نے جنگ

شروع کر دی جس کی قوت کا ان کے دلوں میں گمان ہے اور وہ اسی نیت سے گھروں سے نکلے ہیں۔ مگر میرے متعلق کس مغالطہ میں ہیں۔ واللہ میں اسلام کو قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ ہمیشہ جہاد کرتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ اللہ اسلام کو غالب کرے یا دستِ الٰہی مجھ پر اپنا قبضہ کر لے۔

بہر حال ان حالات میں رسول اللہ ﷺ اس فکر میں ڈوب گئے کہ میں تو مدینہ منورہ سے جہاد کے لئے مسلح ہو کر نہیں نکلا بلکہ صرف طوافِ بیت اللہ کی نیت سے احرام باندھ کر نکلا تھا۔ اس فرض کو ادا کرنے کے لئے سب کے ساتھ نکلا تھا جس کو ادا کرنا سب پر فرض ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ خیال بھی آیا کہ اگر کفارِ مکہ غالب آ گئے تو فخر سے ان کا دماغ خراب ہو جائے گا۔ یہ بھی خیال آیا کہ عکرمہ اور خالد بن ولید کو انہوں نے بھیجا ہی اس لئے ہو گا کہ انہیں اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ مسلمان جہاد کے ارادہ سے نہیں آئے اس لئے ان پر فتح حاصل کرنا آسان ہو گا۔

وہی ہوا جس کا خطرہ تھا

رسول اللہ ﷺ ابھی خیالات میں گم تھے کہ دور سے اہلِ مکہ کا لشکر آتا ہوا دکھائی دیا۔۔۔۔ ان کے طور طریقوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اگر مکہ معظمہ میں داخل ہونے پر ضد کی تو انہیں بیحد مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور قریش اپنے جاہ و شرف کو بچانے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے اور رسول اللہ ﷺ جنگ پر کسی صورت آمادہ نہ تھے لیکن اگر ایسا ہوا بھی تو یہ جنگ رسول اللہ ﷺ پر زبردستی مسلط کی جائے گی۔ لیکن قریش کے لئے رسول اللہ ﷺ پر یہ الزام ثابت کرنا آسان ہو جائے گا کہ آپ ﷺ حملہ کرنے کے لئے خود آئے تھے۔

ان پیچیدہ حالات میں رسول اللہ ﷺ کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ اگر ایسی صورت سے دوچار ہونا ہی پڑا تو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم میں اتنی قوتِ ایمانی ہے کہ اپنی تلوار نیام سے نکال کر اپنی مدافعت کر سکیں گے۔ لیکن ایسی صورت میں مسلمانوں کا اصل مقصد فوت ہو جائے گا اور کفار کو یہ بہانہ مل جائے گا کہ مسلمان حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنے کے لئے چڑھ آئے۔ اس لئے جنگ نہ صرف مسلمانوں کے اصل مقصد کے خلاف ہو گی بلکہ ان کے لئے باعثِ تکلیف و اذیت اور سیاست کے بھی منافی ہو گی۔

نبی اکرم ﷺ نے اپنے رفقاء سے خطاب فرماتے ہوئے کہا۔ "جو شخص اس وادی کی راہوں کو جانتا ہو وہ ہماری راہنمائی کرے تاکہ دشمن جس راہ سے لشکر لئے آ رہا

ہے اس سے علیحدہ کوئی پگڈنڈی مل جائے اور اس پر سفر جاری رکھا جائے اور جنگ سے بچا جائے۔ کیونکہ ہمارا مقصد تو صرف طواف اور زیارتِ کعبہ ہے" سب کو معلوم ہے کہ مدینہ سے رسول اللہ ﷺ پرامن طور پر طواف اور زیارتِ کعبہ کے کیے لئے نکلے تھے۔

پہاڑیوں سے نکل کر جونہی ذرا کشادہ راستہ ملا تو دائیں سمت مڑ کر اس مقام سے قریب ہو کر گزرے جو ثنیتہ المرار یعنی لشکر کی فرودگاہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے اور مکہ معظمہ کے قریب ہی ہے ادھر قریش کے لشکریوں نے جب دیکھا کہ مسلمان عام راہ چھوڑ کر اس راستہ پر پڑ گئے ہیں جو مکہ کی طرف جاتا ہے تو ان کے دل میں ھول بیٹھ گیا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مکہ معظمہ پر حملہ کر دیں۔ کفار اسی جگہ سے مسلمانوں کے حملہ سے مکہ کو بچانے کے لئے مکہ پہنچ گئے۔

مسلمان حدیبیہ میں پہنچ گئے تو رسول اللہ ﷺ کی ناقہ (اونٹنی) قصواء خود بخود بیٹھ گئی۔ مسلمانوں نے سمجھا کہ اونٹنی تھک کر بیٹھ گئی ہے مگر نبی رحمت ﷺ نے فرمایا۔ قصویٰ تھک کر نہیں بیٹھی۔ اس کا بیٹھ جانا اسی قوت کا کرشمہ ہے جس نے ابرہہ کے ہاتھیوں کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا تھا۔ پھر فرمایا آج مکہ والے انسانیت کی بھلائی کے لئے مجھ سے جو بھی مطالبہ کریں گے اسے تسلیم کروں گا اور اپنے ساتھیوں کو پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ مسلمانوں نے اس جگہ پانی کی عدم موجودگی کی اطلاع دی۔ آپ ﷺ نے اپنی ترکش سے تیر نکال کر ایک صحابی کو دیا اور فرمایا اسے کسی کنوئیں کی تہہ میں نصب کر دو۔ چنانچہ تلاش کے بعد جب ایک کنوئیں میں وہ تیر نصب کیا گیا تو اس کنوئیں میں پانی پورے جوش کے ساتھ ابل پڑا اور لشکر جی بھیر کر پانی پینے کے بعد پڑاؤ پر اتر پڑا۔ اس کا نام حدیبیہ ہے۔

ادھر قریش اس تذبذب میں پڑ گئے کہ اگر محمد ﷺ نے مکہ میں داخل ہونے کی کوشش کی تو انہیں جان پر کھیل جانے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو گا۔ کیا اس موقع پر مسلمانوں کا مقابلہ کیلئے آمادہ ہونا مناسب تھا یا نہیں اور جیسے کہ بعض مسلمانوں کا ارادہ تھا کہ روز روز کے جھنجھٹ سے آج ایک ہی روز ادھر یا ادھر اللہ تعالیٰ کے فیصلوں کو دیکھ لیا جائے۔

اسی طرح قریش بھی ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے۔ دل میں یہ ڈر تھا کہ اگر مسلمانوں کا گروپ کامیاب ہو گیا تو یہ ملک میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ کعبہ کی تولیت، کلید برداری اور دوسرے تمام دینی مناصب اور عہدے سب محمد ﷺ کے قبضہ میں چلے جائیں گی۔ آخر انہیں کوئی راہ اختیار کرنا ہو گی۔ دونوں فریق اپنے اپنے انداز میں

مبتلائے فکر تھے مگر دونوں کی سوچ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے پیشِ نظر وہ عظیم اور مقدس مقصد تھا جسے لیکر وہ مدینہ منورہ سے نکلے تھے۔ عمرہ جس کے لئے صلح و امن چاہئے اور جنگ و قتال سے سخت اجتناب' تاوقتیکہ قریش انہیں تلوار پکڑنے پر مجبور نہ کردیں۔ قریش کا مطمع نظر یہ تھا کہ جناب محمد ﷺ کے پاس ایسے دانشور یا دیدہ ور آدمیوں کا وفد بھیجا جائے جو ایک طرف ان کی قوت کا جائزہ لے اور دوسری طرف انہیں یہ تاکید کی جائے کہ وہ طواف و زیارت کے بغیر لوٹ جائیں۔

قریش نے چار وفد بھیجے

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں قریش نے قاصدوں کے یکے بعد دیگرے چار وفد بھیجے ۔ پہلا وفد قبیلہ خزاعہ کے سربراہ بدیل بن ورقاء کی زیرِ قیادت چند اشخاص پر مشتمل تھا۔ انہیں گفتگو سے اندازہ ہوگیا کہ نبی رحمت ﷺ جنگ کرنا نہیں چاہتے۔ مسلمانوں کے آنے کا مقصد صرف زیارت اور طوافِ کعبہ ہے۔ بدیل نے جو کچھ دیکھا اور سنا بالکل حرف بحرف وہی جا کر اہلِ مکہ کو کہہ دیا اور مشورہ دیا کہ مسلمانوں کے لئے اللہ کے گھر کی زیارت کا راستہ کھول دیں۔ لیکن قریش نے انہیں الٹا برا بھلا کہا کہ محمد (ﷺ) اگر لڑائی کے لئے نہیں آئے تو نہ سہی۔ ہم انہیں مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ نہ ہم ان کو یہ موقع دیں گے کہ وہ ہماری کمزوری کی داستانیں عرب میں سناتے پھریں۔

دوسرا وفد

جس کے سامنے وہی گفتگو ہوئی جو پہلے وفد کے ساتھ ہوئی تھی مگر واپس آنے کے بعد انہوں نے قریش کی واہی تواہی بکنے کے خوف سے ادھر ادھر کی باتیں کر کے ٹال دیا۔

تیسرا وفد

احابیش کا تیسرا وفد تھا۔ احابیش ان کو اس لئے کہا جاتا ہے کہ ان کا سیاہ رنگ ہوتا ہے یا وہ حبشی نامی پہاڑ کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ بہرحال ان کے سردار جلیس کو بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر محمد ﷺ نے جلیس کو بھی ٹھکرا دیا تو پھر یہی حبشی مکہ والوں کی امداد میں پیش پیش ہوں گے۔

رسول اللہ ﷺ نے جلیس کو شناخت کر لیا اور مسلمانوں سے فرمایا کہ قربانی

کے جانوروں کو اس کے سامنے سے گزارا جائے جس کا مقصد جلیس کے ذہن میں یہ بات بٹھانا تھی کہ اہلِ مکہ جن لوگوں کے ساتھ مقابلہ کرنے کی ٹھانے ہوئے ہیں وہ تو بیت اللہ کی تقدیس کی وجہ سے صرف حج و عمرہ کے لئے یہاں آئے ہیں۔

جلیس نے یہ بھی دیکھا کہ قربانی کے جانور بھوک کی شدت سے ایک دوسرے کے بال نوچ کر کھا رہے ہیں۔ جلیس سچائی سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے قریش کے ظلم اور ان کی صلح جوئی کا یقین آ گیا۔ اور یقین کیوں نہ آتا۔

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

جلیس نے اس کے بعد رسول اللہ ﷺ سے اس صداقت کی تصدیق کرنا بھی ضروری نہ سمجھی۔ ان سے ملے بغیر ہی سچائی دل میں سموئے ہوئے واپس آ گیا مگر پہلے دو وفود کی طرح اس سے بھی سچ سن کر قریش سیخ پا ہو گئے اور کہا۔ خاموش۔۔۔۔۔۔ آخر تم بدھو ہی نکلے تم ان باتوں کو کیا سمجھو۔ یہ سن کر جلیس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ اس نے گرج کر کہا۔ میں لوگوں کو کعبہ کی زیارت سے روکنے کے لئے تمہارا حلیف نہیں ہوں۔

جلیس نے قریش سے یہ بھی کہا کہ یاد رکھو احابیش میں سے کوئی بھی محمد ﷺ کو طواف سے روکنے کے لئے حائل نہیں ہو گا۔ جلیس کی اس دھمکی سے قریش پر رعشہ طاری ہو گیا۔ منت سماجت کر کے اتنی مہلت مانگی کہ ہمیں سوچنے کا موقع دیجئے۔

چوتھا وفد

اب قریش نے ایسا آدمی منتخب کیا جو حکمت و دانش میں سب سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ یہ طائف کا رہنے والا عروہ بن مسعود ثقفی تھا۔ پہلے وفد کی تذلیل عروہ کے سامنے ہوئی تھی۔ اس نے انکار کر دیا لیکن قریش کے اصرار اور اس کے فیصلہ کو تسلیم کرنے کا یقین دلانے پر اس نے مان لیا۔ وہ حدیبیہ چلا گیا۔

عروہ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا۔ مکہ آپ کا بھی وطن ہے۔ آج اگر آپ نے ان ملے جلے یعنی مختلف قبائل کے لوگوں اور وہ بھی کمتر لوگوں کے ہاتھوں سے اسے پامال کرا دیا تو قریش ہمیشہ کے لئے رسوا ہو جائیں گے اور ان کی رسوائی میں آپ کا بھی ہاتھ ہو گا۔ قریش کے ساتھ آپ کی لڑائی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن ان کی یہ ذلت آپ کو

بھی گوارا نہیں ہونا چاہئے۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ عروہ اپنی حکمتِ عملی سے مسلمانوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بددل کرنا چاہتا ہے۔ عروہ سے صاف کہہ دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانثار کسی صورت میں بھی آپ کو تنہا نہیں چھوڑیں گے۔

عرب کے دستور کے مطابق گفتگو کے درمیان عروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ریش مبارک کو بار بار ہاتھ لگا کر بات کرتا تھا اور حضرت مغیرہ بن شعبہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے کھڑے تھے وہ ہر مرتبہ عروہ کا ہاتھ جھٹک دیتے۔ جبکہ عروہ نے مغیرہ بن شعبہ کی طرف سے تیرہ مقتولوں کی دیت ادا کی تھی۔

المختصر عروہ واپس قریش کے پاس پہنچے تو انہوں نے ان سے صاف صاف کہہ دیا۔ برادرانِ قریش! میں نے کسریٰ و قیصر اور نجاشی جیسے بادشاہوں کے دربار دیکھے لیکن محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سی عظمت کسی بادشاہ کی نہیں دیکھی اور تو اور ان کے ساتھی ان کے وضو کرنے پر پانی کے قطرے بھی زمین پر نہیں پڑنے دیتے۔ ان کا بال بھی زمین سے اٹھا کر کسی قیمت پر بھی کسی دوسرے کو دینے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ لوگ اپنی رائے پر نظرثانی کریں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے قاصد

قریش کے ہر وفد کی واپسی کے بعد ان کا کیا ردِعمل ہے اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب پتہ نہ چلا تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی جانب سے ایک صاحب کو مکہ معظمہ بھیجا مگر قریش نے انہیں دیکھتے ہی پہلے تو قریش نے ان کے اونٹ کو ہلاک کر دیا پھر انہیں نرغہ میں لے لیا لیکن احابیش نے مداخلت کر کے ان کو بچا لیا۔

اس رویہ نے ثابت کر دیا کہ کفّارِ مکہ کے دل میں مسلمانوں کے بارے میں کس قدر کینہ و بغض بھرا ہوا ہے جسے دیکھ کر بعض مسلمان جنگ کے لئے آمادہ ہو گئے۔

قریش کا حملہ

اس اثناء میں ایک رات قریش کے 40 پیادہ نوجوانوں نے حدیبیہ پہنچ کر پہلے تو مسلمانوں پر پتھراؤ کیا۔ پھر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ لیکن نتیجہ کے طور پر سب مجاہدین کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ مگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو رہا کر دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد ہی اس ادب والے مہینہ کا ادب کرنا تھا۔ پھر حدیبیہ جو حدِ حرم ہونے کی وجہ سے محترم تھا اس کا احترام بھی پیشِ نظر تھا۔ قریش کو اپنے آدمیوں کی گرفتاری کے

بعد رہائی سے کچھ ہوش آیا۔ عقل سے کام لیا اور سمجھ گئے رسول اللہ ﷺ جنگ کے لئے نہیں آئے۔ قریش کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اگر مسلمانوں پر اس احترام والے مہینے میں زیادتی کی گئی تو تمام عرب ان کو طعنہ دیں گے اور یقین کرلیں گے کہ محمد ﷺ ایسے لوگوں کے ساتھ جتنا بھی بدتر سلوک کریں وہ اس کے مستحق ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کا دوسرا قاصد

قریش کو ایک اور موقع دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قاصد بنا کر بھیجنا چاہا مگر عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ مکہ والے مجھ سے بہت زیادہ برہم ہیں اور پھر میرے خاندان بنی عدی میں سے بھی وہاں کوئی نہیں۔ اس لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مقصد کے لئے مجھ سے زیادہ بہتر ہوں گے۔ مکہ والے ان کی عزت بھی بہت کرتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے داماد عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلوا کر سادات اور ابوسفیان سے بات چیت کرنے کے لئے بھیجا۔ مکہ میں سب سے پہلے ابان بن سعید سے ان کی ملاقات ہوئی۔ ابان نے مکہ میں ٹھہرنے کی مدت تک ان کی ضمانت اپنے ذمہ لے لی۔ جب حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کے سامنے رسول اللہ ﷺ کا پیغامِ محبت پیش کیا تو انہوں نے کہا۔ عثمان اگر آپ چاہیں تو کعبہ کا طواف کرسکتے ہیں مگر عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ جب تک رسول اللہ ﷺ طواف نہ کریں تب تک میں بھی طواف نہیں کروں گا۔ ذرا غور سے سن لو۔ ہم لوگ بیت اللہ کی زیارت کے لئے آئے ہیں۔ جس کی تعظیم کرنا ہمارے دین کا حکم ہے۔ عمرہ کے ارکان ادا کرنا ہمارا مقصود ہے۔ قربانی کے جانور ہمارے ساتھ ہیں۔ یہ رسوم ادا کرکے ہم واپس چلے جائیں گے۔

جواب

ان سوالات کا جواب قریش نے ایک ہی دیا۔ ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ محمد ﷺ کو اس سال مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیں گے۔ گفتگو بڑھتی گئی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی طرف سے معاملہ کو منوانے کے سلسلہ میں مزید کوشش فرماتے رہے۔ آپ کا قیام طول پکڑ گیا تو اس تاخیر کے سبب مسلمانوں میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قتل کی افواہ پھیل گئی لیکن یہ بھی امکان تھا کہ یہ لوگ کوئی ایسی تدبیر نکالنے کی فکر میں ہوں جس سے ان کی قسم بھی بحال رہے اور مسلمان زیارت و طواف بھی کرلیں اور اس طرح حضرت عثمان کے ذریعہ سے ان کے تعلقات میں بہتری کی کوئی صورت بھی نکل آئے۔

مسلمان حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کی خبر سے بہت زیادہ مضطرب تھے کہ اہلِ مکہ عرب کے دستور کے خلاف ادب والے مہینوں میں کعبہ کے اندر قتل کرنے سے بھی باز نہیں آئے۔ تمام مسلمانوں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خون کا بدلہ لینے کے لئے اپنے ہاتھ تلواروں کے قبضہ پہ رکھ لئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس بات کا بہت زیادہ صدمہ ہوا کہ کفارِ مکہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ادب کے مہینے میں شہید کر دیا ہے۔ فرمایا۔ "لا نبرح حتٰی نناجز القوم" میں ان سے جنگ کئے بغیر یہاں سے قدم پیچھے نہیں ہٹاؤں گا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑے ہو گئے۔ جہاد کے لئے بیعت کی دعوت دی۔ ایک ایک مسلمان نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی کہ وہ زندگی سے زیادہ شہادت کو ترجیح دے گا۔ پورے استقلال اور استقامت کے ساتھ بیعت ہوئی۔ جن لوگوں نے ادب والے دنوں میں قتل کر دیا' یہ بیعت ان کے خلاف دلوں میں جوشِ قصاص لئے ہوئے تھی۔ جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ان آیات میں موجود ہے۔

لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ فعلم ما فی قلوبھم فانزل السکینۃ علیھم واثابھم فتحا قریبا" (18:48)

(اے رسول) جب ایمان والے تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ ان سے خوش ہوا اور جو (صدق و خلوص) ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کر لیا۔ تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی۔

جب تمام مجاہدین بیعت فرما چکے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پہ رکھ کر فرمایا۔ "ھذا ید عثمان" یہ عثمان کا ہاتھ ہے۔ اسی طرح اپنے دوسرے قاصد کی طرف سے بیعت کی تکمیل فرمائی۔ بیعت کے بعد مسلمانوں نے اپنی تلواریں اپنے میان سے نکال لیں اب نہ تو انہیں مقاتلہ میں شک تھا۔ نہ اس میں شبہ کہ ذرا سی دیر کے بعد یا تو ہماری شہادت ہو گی یا فتح مبین! جس کے لئے ان کی روحیں خوش اور مسرور تھیں۔ منتظر تھیں تاکہ وہ اپنے رب کے حضور یہ کہہ کر پیش ہوں۔ "یا ایتھا النفس المطمئنہ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ" اے مطمئن روح اپنے پروردگار کی طرف چل تو اس سے راضی اور وہ تم سے راضی۔ جس کے لئے ان سب کے دل اطمینان سکون کا مخزن بنے ہوئے تھے۔ اس اثناء میں حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خیریت کی اطلاع موصول ہو گئی۔ جس سے ذرا دیر بعد موصوف بھی تشریف لے آئے۔ لیکن بیعت رضوان کے ثمرات آج سے کئی سال قبل بیعت عقبۃ الکبری کی بیعت کی طرح سب کے دلوں میں

پر سرور کیفیت سے لبریز رہے۔ خود رسالت پناہ ﷺ کے لئے بھی بیعت رضوان کے اثرات بڑے پر کیف رہے! جب کبھی اس کا تصور فرماتے تو اپنے صحابہ کی جانثاری کا نقشہ ذہن میں ابھر آتا۔ لہٰذا یہ حقیقت ہے کہ جو شخص موت سے نہیں گھبراتا موت اس کے نام سے بھی لرز جاتی ہے اور کامیابی ایسے ہی لوگوں کے قدم چومتی ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کفار قریش کی روداد ان لفظوں میں بیان فرمائی۔ اب ان لوگوں کو آپ اور آپ کے تمام ساتھیوں کے یہاں آنے کا مقصد معلوم ہو چکا ہے۔ اور اس کا انہیں یقین بھی ہو گیا ہے اور وہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ آئندہ انہیں حرمت والے مہینے میں حج اور عمرہ کے لئے مکہ آنے والوں کو روکنے کا کوئی حق نہیں ہو گا۔

لیکن اس اثناء میں خالد بن ولید ایک دستہ لے کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے دیکھتے ہی دیکھتے فریقین میں جھڑپ ہو گئی۔ کیونکہ کفار کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ اگر مسلمان طواف کے لئے کعبہ میں داخل ہو گئے تو کفار مکہ کی سخت تذلیل ہو گی اور عرب کے لوگ ان کو طعنہ دیں گے کہ محمد ﷺ کے سامنے یہ لوگ بھگوڑے ثابت ہوئے۔ قریش کا مقصد تھا کہ اس سال مسلمان مکہ میں تشریف نہ لائیں۔ جس پر عملدر آمد کرانے کے لئے وہ طرح طرح کے طریقے سوچ رہے تھے۔ کہ اگر مسلمان کسی طریقہ سے باز نہ آئے تو انہیں خوشی یا ناخوشی جنگ کرنا پڑے گی۔ قریش در حقیقت کشمکش کا شکار ہو چکے تھے۔ ادب والے مہینوں میں جنگ کرنے سے بھی وہ بچنا چاہتے تھے کیونکہ انہیں اس بات کا سخت خطرہ تھا کہ اگر ان دنوں میں ان کی طرف سے خلاف ادب کوئی بھول ہو گئی تو وہ قبائل جو ان مہینوں میں تجارت کے لئے مکہ آتے ہیں ان کے دلوں سے اعتماد اٹھ جائے گا اس کے بعد وہ مکہ معظمہ میں تجارت کی خاطر آنا تو ایک طرف ادھر آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں کریں گے۔ اور ان کے نہ آنے سے مکہ کی معاشی زندگی موت کے سناٹے میں بدل جائے گی۔

مذاکرات

صلح کی پھر کوششیں جاری ہوئیں۔ اہل مکہ نے سہیل بن عمرو کو بھیجا۔ (یہ ان کے پانچویں اور آخری قاصد تھے) انہیں اس بات کی تاکید کر دی کہ مسلمانوں کی طرف سے عمرہ کرنے کی شرط ہرگز قبول نہ کی جائے ورنہ ملک میں ان کا منہ کالا ہو جائے گا۔ شرائط صلح میں طوالت کی وجہ سے سلسلۂ گفتگو ٹوٹ جانے کا بار بار خطرہ لاحق ہوا۔ لیکن فریقین کے دونوں طرف کا جذبۂ مصالحت اسے پھر جوڑ دیتا۔ اس نشست میں موجود صحابہ

کرام کو قریش کے وکیل سہیل بن عمرو کے شرائط صلح منظور نہیں تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی ناپسندیدہ شرائط تسلیم کر لیتے تو مجاہدین رنجیدہ سے ہو جاتے۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منصبِ عظیم پر ان کا ایمان و عقیدہ پکا نہ ہوتا تو مسلمان اس طرح کے یکطرفہ معاہدہ سے متفق نہ ہوتے۔ وہ عمرہ ہر حالت میں کر کے رہتے۔ اس کے بعد جو بھی ان کی قسمت میں ہوتا سو ہوتا۔

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مکالمہ

قریش کے وکیل سہیل بن عمرو کے شرائطِ معاہدہ میں عدم توازن دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا۔

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: کیا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے رسول نہیں؟

ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: بیشک آپ عزوجلّ کے رسول برحق ہیں۔

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ہم لوگوں کے مسلمان ہونے میں کوئی شبہ ہے؟

ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: کیا اس یکطرفہ معاہدہ میں اسلام کی توہین نہیں؟

ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: صبر و تحمل سے کام لیجئے۔ میں تصدیق کرتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ جلّ شانہٗ کے رسول ہیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ: اور میں بھی اس کا اقرار کرتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ عزوجلّ کے رسول ہیں۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس کے بعد اسی بے چین کیفیت میں عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ شاہدِ آیات الکبریٰ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں بارياب ہوئے اور انہیں باتوں کو دہرایا جو ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کیں تھیں۔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سنا مگر آپ کے تحمل، ضبط اور عزیمت میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آخری جملہ یہ فرمایا۔

انا عبداللہ ورسولہ لن اخالف امرہ ولن یضیعنی!

میں اللہ کا بندہ ہوں اور میں اس کا رسول بھی ہوں۔ مجھے اس کے حکم کی خلاف ورزی گوارا نہیں، اور وہ مجھے ضائع نہیں ہونے دے گا۔

معاہدہ

جب معاہدہ لکھا جانے لگا تو قریش کے وکیل کی طرف سے بات بات پر نکتہ چینی اور اختلاف سے مسلمانوں کو غصہ آتا۔ خصوصاً جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی

رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔ لکھو۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" تو اہلِ مکہ کے وکیل نے کہا۔ ہم لفظ رحمٰن اور رحیم کو نہیں مانتے! اس کی جگہ "باسمک اللھم" لکھوایا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا۔ "ایسا ہی لکھ دیجیے"

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے لکھنے کے لئے فرمایا۔ ھذا ما صالح علیہ محمد رسول اللہ و سہیل بن عمرو سہیل نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا رک جائیے۔ اگر ہم آپ کو رسول ہی مانتے تو ہماری آپ کی جنگیں کیوں ہوتیں۔ آپ صرف اپنا نام اور ولدیت لکھوائیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔ لکھو "ھذا ما صالح علیہ محمد بن عبداللہ" چنانچہ اسی طرح لکھا گیا۔ صلح ان شرائط پر طے ہوئی جو تحریر میں لائی گئیں۔

(1) فریقین ایک دوسرے کے خلاف دس سال تک جنگ نہیں کریں گے۔ واقدی دو سال مگر ان کے علاوہ سب اہلِ سیر دس سال کی تائید میں لکھتے ہیں۔

(2) قریشِ مکہ میں سے جو شخص مسلمان ہو کر اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ پہنچ جائے محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اسے واپس کرنا پڑے گا۔

(3) مسلمانوں میں سے کوئی شخص مرتد ہو کر مکہ میں چلا جائے تو اسے واپس نہ کیا جائے گا۔

(4) اہل عرب فریقین میں سے جس کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیں دوسرا فریق اس میں حائل نہیں ہو گا۔

(5) اس سال مسلمانوں کو طواف اور زیارتِ کعبہ کے بغیر واپس جانا ہو گا۔

(6) مسلمان آئندہ سال مکہ میں ان شرائط کی پابندی کے ساتھ آسکتے ہیں۔

(الف) اسلحہ میں صرف تلوار اور وہ بھی نیام میں بند ہو۔

(ب) تین روز سے زیادہ مکہ میں قیام نہیں کر سکتے۔

حدیبیہ میں ہی قبیلہ خزاعہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ اور قبیلہ بنو بکر نے قریش کے ساتھ معاہدۂ وفاداری کیا۔

ابو جندل رضی اللہ تعالیٰ عنہ مردِ انقلاب

معاہدہ کے قریشی وکیل سہیل بن عمرو جب صلح کے معاہدہ کی بات چیت کر رہے تھے تو اس سے تھوڑی دیر ہی پہلے اسی کے صاحبزادے ابو جندل اس حالت میں تشریف لائے کہ پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ مسلمان ہونے کی وجہ سے قریش کی قید میں تھے۔ موقع

پاتے ہی جیل خانہ سے بھاگ نکلے۔ سہیل بن عمرو نے اپنے لختِ جگر کو دیکھا۔ ان کا گریبان پکڑ کر منہ پر زور کا طمانچہ رسید کیا۔ ابوجندل رضی اللہ عنہ چلائے میرے مسلمان بھائیو۔ اگر مشرکین مجھے واپس لے گئے تو یا مجھے دین سے مرتد کروا دیں گے یا قتل کر دیں گے۔

ابوجندل کی یہ حالت اور الفاظ سن کر مسلمانوں کے دلوں میں غصہ ابل پڑا۔ مگر صلح کی بات چیت ابھی جاری تھی اور تحریر مکمل نہ ہوئی تھی۔ رسولِ صداقت و حقیقت نبی رب ذوالجلال محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے کہا۔

اے ابو جندل۔ اپنی مصیبت کا اجر اللہ سے طلب کرو جو تمہارے ساتھ مکہ میں قید ہونے والے تمام مسلمانوں کی نجات کا راستہ پیدا کرے گا۔

قریش کے ساتھ ہماری بات چیت مکمل ہو چکی ہے۔ اس میں فریقین نے درمیان میں اللہ تعالیٰ کو ضامن قرار دیا ہے۔ میں ان سے بدعہدی نہیں کر سکتا۔ آخر ابو جندل رضی اللہ عنہ کو معاہدہ کی شرائط کی رو سے قریش کے ہاں واپس جانا ہی پڑا۔

معاہدہ کے بعد

تحریری معاہدہ کے بعد سہیل بن عمرو واپس مکہ چلے گئے مگر مسلمانوں کے چہرہ سے ناپسندیدگی معاہدہ کے اثرات مٹ نہ سکے۔ جس سے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی متاثر تھے۔

آپ نے قیامِ صلوٰۃ فرمایا۔ دل کو ڈھارس بندھی۔ پھر قربانی ذبح کی اس کے بعد تکمیل عمرہ کے لئے استرے سے سر کے بال اتروائے۔ روحِ مبارک کو مزید سکون نصیب ہوا۔ جب صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنے ہادی و رہبر نبئ شفقت و محبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خوش و خرم دیکھا تو انہوں نے بھی اپنی اپنی قربانیاں ذبح کر دیں۔ بعض نے قینچی سے بعض نے استرے سے بال اتروائے۔ بعض نے قینچی سے ترشوائے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کی اطاعت و فرماں برداری دیکھ کر فرمایا۔ اللہ کی رحمت ہو سر کے بال استرے سے منڈوانے والے پر۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا تکمیلِ حج اور عمرہ کے بعد قینچی سے بال اتروانے والے گناہ گار ہیں۔

فرمایا: ان پر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

صحابہ کرام نے پھر وہی سوال دہرایا۔ کیا اس موقع پر بھی قینچی سے بال ترشوانے والے گناہ گار ہیں؟

فرمایا: بال ترشوانے والوں پر بھی اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو۔

صحابہ : یا رسول اللہ (ﷺ) آپ نے پہلے صرف استرے سے بال صاف کرانے والوں کے لئے دعائے رحمت کی تھی۔

فرمایا : انہیں اس لئے مقدم رکھا گیا کہ میرے سامنے انہوں نے زبانِ شکوہ نہیں کھولی تھی۔

واپسی سے پہلے

اب مسلمانوں کے لئے واپس مدینہ جا کر آنے والے سال کا انتظار کرنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ انہیں یہ تلخ گھونٹ حلق سے اتارنا ہی پڑا اور صرف اللہ کے رسول ﷺ کے حکم کی تعمیل کے لئے ورنہ ان کی گھٹی میں تو یہ تھا کہ یا تو دشمن کا مقابلہ کر کے اسے قتل کر دیتے یا بھگا دیتے یا پھر خود اس کے ہاتھوں قتل یا قیدی بن جاتے۔ وہ اپنے لئے شکست کے نام سے واقف نہ تھے۔ اگر سرورِ دوعالم ﷺ ان کو اجازت دیتے تو اپنے اس ایمان اور عقیدہ کے سہارے اللہ عزوجلّ جن کا خود حامی و ناصر ہو ان کے لئے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے دین کی کامیابی حاصل کرنے میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ وہ مکہ میں داخل ہو کر دکھا دیتے۔

مسلمان قربانی ادا کرنے اور احرام کھولنے کے بعد ہی تین دن تک حدیبیہ میں رہے۔ اس درمیان میں بعض مسلمان معاہدہ کی برکتوں کا تذکرہ کرتے بعض اعتراض نما سوالات ۔

حتیٰ کہ حدیبیہ سے واپسی کے لئے کوچ فرمایا اور مکہ سے مدینہ جاتے ہوئے وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے فتحِ مبین کی بشارت ان آیات میں نازل فرمائی۔ قرآن حکیم کی اس سورت کا نام ہی سورہ فتح ہے۔

انا فتحنا لک فتحا" مبینا لیغفر لک اللہ ما تقدم من ذنبک وما تاخر ویتم نعمته علیک ویھدیک صراطاً مستقیما۔ (2-1:48)

اے محمد (ﷺ) ہم نے تم کو فتح دی۔ فتح بھی صریح و صاف تاکہ اللہ تعالیٰ اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے اور تم پر اپنی نعمت پوری کردے اور تم کو سیدھے رستے چلائے۔

دینِ اسلام

صلحِ حدیبیہ بلاشبہ "فتح مبین" ہی کا دوسرا نام ہے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ اس صلح میں سیاسی دور اندیشی دونوں یعنی اسلام اور عرب کے مستقبل میں اثر انداز ہو کر رہیں گی۔ اس معاہدہ حدیبیہ سے پہلے قریش رسول اللہ ﷺ کو سرکش یا باغی سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ لیکن صلحِ حدیبیہ میں انہیں رسول اللہ ﷺ کو اپنا حریف یا مدِ مقابل

سمجھنا ہی پڑا۔ پھر اس صلح کی شرائط کے مطابق مسلمانوں کا حقِ زیارت و طواف اور حج تسلیم کرنے کے معنی یہ تھے کہ دین اسلام کو بھی عرب میں موجود دوسرے مذاہب کی طرح مقام حاصل ہے۔ اور عہد نامہ حدیبیہ ہی کی ایک شق کے مطابق جس میں لڑائی کا دو سال یا دس سال بند رکھنا طے پایا تو اس سے مسلمانوں کو جنوب (مکہ) کی طرف سے دشمن کی یلغار سے نجات مل گئی اور دین اسلام کو تبلیغ کا بہترین موقع میسر آ گیا۔ پھر مسلمانوں کے بدترین دشمن اور ان کے خلاف ہمیشہ جنگ کی آگ بھڑکانے والے جو کل تک اسلام کا نام تک سننا گوارا نہ کرتے تھے۔ آج انہوں نے اس ملک کے مروجہ ادیان میں سے دین اسلام کو مستقل دین تسلیم کر لیا اور ان حالات میں مسلمانوں کو اسلام کی تبلیغ کا بہترین موقع مل گیا۔ اس صلح میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ اعتراض اس شرط پہ تھا۔

قریش مکہ میں سے جو شخص مسلمان ہو کر اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ پہنچ جائے اسے واپس بھیجنا پڑے گا۔ اگر مسلمانوں میں سے کوئی شخص مرتد ہو کر مکہ پہنچ جائے تو اسے واپس نہیں کیا جائے گا۔

اس تضاد پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیال یہ تھا کہ اگر کوئی شخص مرتد ہو جائے تو پھر اس کا مسلمانوں میں رہنے سے کوئی فائدہ ہی نہیں۔ رہا وہ شخص جو کفار میں سے مسلمان ہو کر مدینہ میں آ جائے تو اسے واپس مکہ بھیج دیا جائے تو ایسے شخص کے لئے اللہ تعالیٰ خود نجات کی راہ پیدا کریں گے۔ جیسا کہ صلح حدیبیہ کے کچھ ہی عرصہ بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اصابتِ رائے پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حیران و ششدر رہ گئے۔

جب اسلام کو اس قدر تقویت حاصل ہو گئی تو اس کے دو مہینے بعد ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گردو نواح کے بادشاہوں' نوابوں اور سرداروں کی طرف دعوتی خطوط بھیجے۔

جناب ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوی رائے کے فوائد ظاہر ہونے شروع ہوئے تو اہلِ مکہ میں سے ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسلمان ہو کر مدینہ تشریف لے آئے وہ اپنے ولی کی اجازت کے بغیر آئے تھے۔ کفار کے مطالبہ پر انہیں واپس کرنا معاہدہ کے مطابق ضروری تھا۔ قریش میں سے ازھر بن عوف اور اخنس بن شریق نے ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واپسی کے لئے ایک غلام اور بنو عامر کے ایک شخص کو مدینہ بھیجا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو بصیر

رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو طلب فرما کر حکم دیا۔

انا قد اعطینا ھؤلاء القوم ما قد علمت ولا یصلح لنا فی دیننا الغدر

ابو بصیر (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) نے جو اہلِ مکہ کے ساتھ معاہدہ کیا ہے تمہیں بھی اس کا علم ہے۔ ہمارے دین میں بد عہدی نہیں تم جاؤ۔

ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ آپ مجھے مشرکوں کے سپرد کرنا چاہتے ہیں جو مجھے مرتد کر دیں گے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بار بار ان کو یہی حکم فرماتے رہے۔ آخر ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان دونوں کے ساتھ مکہ معظمہ کی طرف چل پڑے مگر جب ذوا لحلیفہ کے مقام پر پہنچے تو ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عامری کی تلوار کی تعریف کرتے ہوئے اسے دکھانے کے لئے کہا اور دستہ پر ہاتھ رکھتے ہی اس پھرتی سے وار کیا کہ عامری کا سر بدن سے کٹ کر زمین پر جا گرا۔ مقتول کا ساتھی یہ دیکھ کر بے تحاشا بھاگتا ہوا مدینہ پہنچا تو اسے دیکھتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ خیر کرے یہ شخص بہت گھبرایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا آپ کے صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میرے ساتھی کو قتل کر دیا۔ اتنے میں ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ آپہنچے۔ وہی خون آلود تلوار ہاتھ میں تھی۔ دریافت کئے بغیر ہی عرض کیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے اپنا وعدہ پورا کر کے مجھے دشمنوں کے سپرد کر دیا لیکن مجھے اسلام سے پھر جانا پسند نہیں آیا اور یہ بھی پسند نہیں آیا کہ مکہ جا کر کفار کا مشقِ ستم بنوں۔ ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جتنی محبت تھی وہ اسے چھپا نہ سکا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے تیور سے سمجھ گئے کہ اگر اس کے ساتھ کچھ اور شامل ہو جائیں تو یہ قریش کے ساتھ جنگ کئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ ابو بصیر نے مکہ نکل کر مقام عیص پر ڈیرا جما لیا۔

ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقام عیص کو اپنی پناہ گاہ بنا لینے کی خبر جب مکہ معظمہ میں قید بھگتنے والے مسلمانوں تک پہنچی تو انہیں یقین ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس اقدام کی توثیق کر دی ہو گی۔ لہٰذا ان قیدیوں کو جس جس طرح اور جب بھی موقع ملا۔ ایک ایک کر کے سب ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس پہنچ گئے۔ جب ستر مسلمان جمع ہو گئے تب انہوں نے ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت میں قریش کی ناکہ بندی شروع کر دی۔ ان کے اکا دکا آدمی کو قتل اور تجارتی قافلوں کو لوٹنے لگے۔ قریش نے جب اپنا یہ حشر دیکھا تو مکہ میں قید مسلمانوں کے عوض اپنے جانی اور مالی خسارے سے گھبرا اٹھے۔

انہیں یقین ہو گیا کہ سچے ایمان کے مالک اشخاص کو قید رکھنا بے فائدہ ہے۔ ایک نہ ایک دن اس کی نجات کا راستہ نکل ہی آتا ہے اور وہ اپنے قید کرنے والوں پر حملہ آور ہو کر ان کے لئے مصائب کھڑے کر دیتا ہے۔

اس تصور میں ان کی نگاہوں میں ان کے گزرے ہوئے نتائج بھی گھومنے لگے۔ جب انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو جبراً" مکہ معظمہ سے نکال دیا تھا اور رسول اللہ ﷺ نے ان کی تجارتی ناکہ بندی کر دی پھر تو خیر انہوں نے مجبور ہو کر ایک سفارتی وفد مدینہ بھیجا جس نے محمد رسول اللہ ﷺ سے قریش کے ساتھ رحم و قرابت کا واسطہ دے کر ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کی جمعیت کو عیص سے واپس مدینہ منورہ بلانے کی درخواست کی اور یہ شرط منسوخ کر دی گئی جس میں مدینہ آنے والے کو واپس بھیجنا ضروری قرار دیا گیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کی فراستِ علم و حکمت دیکھیے کہ آج قریش اپنے ہی وکیل سہیل بن عمرو کی حماقت کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ اس حماقت کی عبارت یہ تھی کہ "قریش میں سے جو شخص مسلمان ہو کر اپنے ولی کی اجازت کے بغیر مدینہ پہنچ جائے اسے واپس بھیجنا ہو گا" اور مسلمانوں میں سے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس شق کا گلہ کیا تھا۔ انہوں نے بھی اپنے گلہ کا نتیجہ دیکھ لیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قریش کی استدعا سے مطلع کیا اور ان کو عیص سے مدینہ آنے کا حکم دیا تو ابو بصیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم کی تعمیل میں ذرا بھی دیر نہ کی اور سب کے سب مدینہ چلے آئے۔

مکہ سے آنے والی مومن بی بیاں

اس مسئلہ میں رسول اللہ ﷺ کی رائے مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کے بارے میں بالکل مختلف تھی۔ چنانچہ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط اہل مکہ کی حراست سے نکل کر مدینہ تشریف لے آئیں اور جب ان کو واپس لینے کی غرض سے ان کے بھائی عمارہ اور ولید رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آنحضرت ﷺ نے یہ فرمایا۔ "اس معاہدہ کی شق کے مطابق عورتوں کا معاملہ مردوں سے مختلف ہے" جو عورت ہم سے پناہ حاصل کرے اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے اور یہ بات بھی اپنی جگہ بالکل واضح ہے کہ عورت مسلمان ہو جانے کے بعد کسی مشرک کی زوجیت میں نہیں رہ سکتی۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے ایسی مسلمہ عورتوں کو واپس بھیجنے سے انکار فرما دیا۔ چنانچہ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بھی اس مسئلہ کی وضاحت فرما دی ہے۔

یا ایها الذین آمنوا اذا جائکم المومنت مهجرات فامتحنوهن الله اعلم بایمانهن فان علمتموهن مومنت فلا ترجعوهن الی الکفار لا هن حل

لھم ولا ھم یحلون لھن- واتوھم ما انفقوا- ولا جناح علیکم ان تنکحوھن اذا اتیتموھن اجورھن- ولا تمسکوا بعصم الکوافر وسئلوا ما انفقتم ویسئلوا ما انفقوا- ذلکم حکم اللہ یحکم بینکم واللہ علیم حکیم- (10:40)

مومنو جب تمہارے پاس مومن عورتیں وطن چھوڑ کر آئیں تو ان کی آزمائش کر لو اور اللہ تو ان کے ایمان کو خوب جانتا ہے- سو اگر تم کو معلوم ہو کہ مومن ہیں تو ان کو کفار کے پاس واپس نہ بھیجو- کیونکہ نہ یہ ان پر حلال ہیں اور نہ وہ ان پر جائز اور جو کچھ انہوں نے ان پر خرچ کیا ہو وہ ان کو دے دو اور تم پر کچھ گناہ نہیں کہ ان عورتوں کو مہر دے کر ان سے نکاح کر لو اور کافر عورتوں کی ناموس کو قبضہ میں نہ رکھو یعنی کفار کو واپس دے دو اور جو کچھ انہوں (اپنی عورتوں پر) خرچ کیا ہو وہ تم سے طلب کر لیں یہ اللہ کا حکم ہے- جو تم میں فیصلہ کئے دیتا ہے اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

اس طرح صلح حدیبیہ کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے فراست نبوت علیہ السلام کی دُور اندیشی اور مسلمانوں کے لئے مفید ترین نتائج کی تصدیق کر دی' حدیبیہ میں صلح کی بنیاد اس انداز سے رکھی گئی کہ اس پر اسلام کی سیاست و اشاعت کی تعمیر انتہائی احسن طریقہ سے کی جا سکے-

قریش اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک دوسرے کے جانب سے مکمل اطمینان و اعتماد ہو گیا' جس کے نتیجہ میں قریش نے اپنی تجارت کا حلقہ وسیع تر کر دیا- تاکہ گزشتہ سالوں میں مسلمانوں کی ناکہ بندی کی وجہ سے جو ان کو مالی نقصان ہوا اس کی جلد سے جلد تلافی ہو سکے-

اس طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقفہ میں مشرق و مغرب میں تبلیغ رسالت کی سرگرمیوں میں مصروف رہے- اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی تدبیر فرماتے رہے کہ مسلمان بھی دوسروں کی طرح کس طرح آزادی سے رہ سکتے ہیں- اس کے اسباب کیا ہو سکتے ہیں- اس آزادی کے لئے آپ نے دو کام کئے-

الف- گرد و نواح کے بادشاہوں اور نوابوں کے ہاں سفیروں کی روانگی-

ب- غزوۂ خیبر جو اس وقفہ کے بعد پیش آیا اس کے نتیجہ میں تخریب کار فریب پیشہ یہودیوں کا جزیرۂ عرب سے اخراج-

یہ ہیں ہماری آنے والی فصل کے مرکزی موضوع جن کا تذکرہ کیا جائے گا-

حرمتِ شراب اور غزوۂ خیبر تا عمرۃ القضاۃ

حرمتِ شراب اور غزوہ خیبر تا عمرۃ القضا

مسلمانوں کی قوت و استقامت

صلح حدیبیہ کی رو سے مسلمانوں اور نبیؐ رحمت ﷺ نے طے ہی کر لیا تھا کہ اس مرتبہ کی بجائے آئندہ سال انشاء اللہ زیارتِ کعبہ کے لئے آئیں گے۔ تکمیل معاہدہ کے بعد بھی تقریباً تین ہفتہ حدیبیہ میں ہی قیام فرمایا مگر جب مدینہ لوٹے تو بعض افراد نے اس معاہدہ کو مسلمانوں کی تذلیل کے مترادف سمجھا۔ اس اثناء میں سورہ فتح نازل ہوئی۔ جسے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کے سامنے پڑھا' سنایا' سمجھایا۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کو تو ہر لمحہ ایک ہی فکر رہتی تھی کہ (الف) مسلمانوں کی قوت و استقامت ہو۔ (ب) اسلام کی توسیع ہو۔

ان دونوں مقاصد کے لئے آنحضرت ﷺ نے چاروں طرف کے غیر مسلم بادشاہوں اور نوابوں میں سے مندرجہ ذیل حکمرانوں کے پاس اپنے سفیر بھیجے۔

ہرقل (شاہ روم)' کسریٰ (شاہ ایران)' مقوقس (شاہ مصر)' نجاشی (حبشہ) علاوہ ازیں نجاشی کے یمنی گورنر اور عیسائی حارث کے پاس بھی دعوتِ اسلام دے کر سفیر بھیجے گئے۔ انہی کوششوں کے ساتھ ساتھ جزیرۃ العرب سے یہودیوں کا اخراج بڑا اہم کام تھا۔

دعوتِ اسلام کی نشوونما

دعوتِ اسلام کا پھلنا پھولنا اب اس مقام پر آ پہنچا کہ اسے بے دریغ تمام دنیا کے سامنے پورے خدوخال کے ساتھ پیش کیا جا سکتا تھا۔ اب اسلام صرف توحید اور اس کے لوازمات تک ہی محدود نہ تھا۔ بلکہ اس کا دامن زندگی کے مختلف وسیع تر پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے تھا۔ وہ اسلام جماعتی زندگی کو بلندیاں عطا کر کے فرد کو انسانی کمالات کے حسن و جمال سے آراستہ کر رہا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعتِ اسلام کے مختلف احکامات کی تفصیل کا نزول تسلسل سے رہا۔

حرمت شراب

حرمتِ شراب کے زمانہ کا تعین سیر نویسوں میں اختلافِ رائے کا حامل ہے۔ البتہ مدتِ زمانہ 4 ہجری اور زیادہ سے زیادہ 6 ہجری بتائی جاتی ہے۔

اگرچہ شراب کے حرام ہونے کا توحید کے نظریہ سے اتنا زیادہ ربط و تعلق نہیں اور یہ بھی ثابت ہے کہ بعثتِ مقدس اور نزولِ قرآن دونوں کے بیس سالہ عرصہ تک شراب کی حرمت کا حکم نازل نہیں ہوا بلکہ پہلے تو باری باری اس کی خرابیوں سے آگاہ کیا گیا تاکہ مسلمان اس سے آہستہ آہستہ خود ہی نفسیاتی طور پر نفرت کر کے کنارہ کش ہو جائیں اور آخر میں قطعی حرمت کا حکم نازل فرمایا گیا جو اس طرح منقول ہے۔

پہلی بار

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس سے بیزاری کا اظہار کیا اور بارگاہِ الٰہی میں بار بار عرض کیا۔ "اللھم بین لنا فیھا" اے اللہ شراب سے متعلق واضح حکم نازل فرمایئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما (219:2)

اے رسول لوگ تم سے شراب اور جوئے کا حکم دریافت کرتے ہیں۔ کہہ دو کہ ان میں بڑے نقصان ہیں اور لوگوں کے لئے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کے نقصان فائدہ سے کہیں زیادہ ہیں۔

لیکن شراب کے عادی اس حکم سے بالکل متاثر نہ ہوئے۔ شغلِ ناؤ نوش جاری رہا۔ رات بھر جام و سبو سے ہم آغوش رہنے کے بعد فجر کی صلوٰۃ میں کچھ کا کچھ پڑھ جاتے۔

دوسری مرتبہ

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اتنی سی پابندی پر مطمئن نہ ہو سکے۔ حتیٰ کہ بارگاہِ الٰہی میں پھر درخواست کی۔ اللھم بین لنا فیھا فانھا تذھب العقل والمال۔ اے اللہ شراب سے متعلق واضح حکم نازل فرمایئے۔ یہ تو مال اور عقل دونوں کی دشمن ہے۔

اب کے مرتبہ صرف سکر اور نشہ کی حالت میں قیامِ صلوٰۃ کی ممانعت فرمائی۔

یا ایھا الذین آمنوا لاتقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاری حتی تعلموا ما تقولون۔ (43:4)

مومنو جب تم نشہ کی حالت میں ہو تو جب تک (ان الفاظ کو) جو منہ سے کہو سمجھنے (نہ) لگو نماز کے پاس نہ جاؤ۔

تیسری مرتبہ اس آیت کے نازل ہونے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ منادی فرما دی۔ "لا یقربن الصلوٰۃ سکران" کوئی شخص نشہ کے عالم میں قیام صلوٰۃ نہ کرے۔

ان دونوں آیات اور احکامات کا اثر طبعاً ہوا اور مسلمانوں میں شراب نوشی کی عادت میں کمی آ گئی۔ لیکن جناب عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس پر بھی

قانع نہ رہے۔ اب انہوں نے اور زیادہ آہ و زاری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا۔ اللھم بین لنا فی الخمر بیانا شافیا فانھا تذھب العقل والمال"۔ اے اللہ شراب سے متعلق مبنی برشفا حکم نازل فرما۔ یہ مال اور عقل دونوں کا دشمن ہے۔

شراب کی حرمت طلبی میں عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ حق بجانب تھے۔ کیونکہ آئے دن عرب کے غیر مسلم ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی نشہ میں بدمست ہو کر ایک دوسرے کی داڑھی نوچنا شروع کر دیتے۔ کوئی شرابی دوسرے کو پکڑ کر سر کے بل زمین پر پٹخ دیتا۔ اسی اثناء میں ایک بار جب دعوت کے بعد مسلمانوں میں شراب کا دور چلا تو تھوڑی دیر میں سب کی عقل پر مستی چھا گئی اور دوست کی آبرو دوست کے ہاتھ سے خاک میں مل گئی۔ مہاجرین و انصار میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ ایک شرابی نے مہاجرین کی طرف داری میں زبان کھولی ہی تھی کہ ادھر ایک انصاری نے دسترخوان سے اونٹ کے جباڑے کی ہڈی اٹھا کر اس کے چہرہ پر دے ماری جس سے اس کا ناک زخمی ہو گیا۔ اس تقریب میں ایک ہی دسترخوان پر بیٹھ کر کھانے والے انصار و مہاجر ایک دوسرے سے سر پھٹول کرنے لگے۔ کئی مسلمان زخمی ہوئے اور بعد میں انصار و مہاجرین کی عصبیت کینہ بن کر سینوں میں پلنے لگی۔ حالانکہ اس سے پہلے دونوں ایک دوسرے کے جانثار اور جگری دوست تھے۔ اس واقعہ کے بعد شراب کی قطعی حرمت کی آیت نازل ہوئی۔

یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔ انما یرید الشیطن ان یوقع بینکم العدٰوۃ والبغضاء فی الخمر والمیسر ویصدکم عن ذکر اللہ وعن الصلوٰۃ فھل انتم منتھون۔ (5:90-91)

اے ایمان والو شراب' جوا اور بت پانسے (یہ سب) ناپاک کام اعمالِ شیطان سے ہیں۔ سو ان سے بچتے رہنا تاکہ نجات پاؤ۔ شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے سبب تمہارے آپس میں دشمنی اور رنجش ڈلوا دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے تو تم کو ان کاموں سے باز رہنا چاہئے۔

شراب کے دریا بہہ گئے

قرآن حکیم کی یہ آیات اس وقت نازل ہوئیں جب حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ شراب کی محفل میں ساقی بنے بیٹھے تھے۔ اس اثناء میں شراب کی حرمت کی منادی ہو گئی۔ یہ آواز جناب انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کانوں میں پڑی تو انہوں نے شراب باہر پانی کی طرح بہا دی۔ لیکن اس پر بعض لوگوں نے ازراہِ اعتراض کہا۔ اگر یہ شراب گندگی ہی ہے تو پھر ان

کا کیا ہو گا جنہوں نے غزوہ بدر اور غزوہ احد میں شراب پی رکھی تھی۔ اس اعتراض پہ آیت نازل ہوئی۔

لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصلحت جناح فیما طعموا اذا ما اتقوا وامنوا وعملوا الصلحت ثم اتقوا وامنوا ثم اتقوا واحسنوا واللہ یحب المحسنین (93:5)

جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے ان پر ان چیزوں کا کچھ گناہ نہیں جو وہ کھا چکے جبکہ انہوں نے پرہیز کیا اور ایمان لائے اور نیک کام کئے پھر پرہیز کیا اور ایمان لائے پھر پرہیز کیا اور نیکوکاری کی اور اللہ نیکوکاروں کو دوست رکھتا ہے۔

نیکی اور حسنِ عمل

دین اسلام اپنے حلقہ بگوشوں کو نیکی' لطف و کرم' احسان و مروت اور حُسنِ عمل کی دعوت دیتا ہے۔ عبادات سے یہ بھی مقصود ہے اس سے روحانیت میں ترقی اور اخلاقی کمالات کا حصول ہوتا ہے جیسا کہ صلوٰۃ میں رکوع اور سجود سے غرور و نخوت کا سرنیچا کرنا مقصود ہے۔ اس طرح اسلام اپنی منفرد تربیت کے سبب گذشتہ مذاہب کے مقابلہ میں طبعی مراحل کے مطابق سفر کرتا ہوا کمالات کی آخری حدوں تک جا پہنچا اور اس میں تمام عالم اور تمام زمانوں میں مقبول و مفید ہونے کی استعداد تسلیم کی جانے لگی۔

روم اور ایران

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہدِ ظہور میں آس پاس کے ملکوں میں کسریٰ (ایران) اور ہرقل (روم) دونوں اتنے طاقتور بادشاہ تھے کہ اپنے ملکوں کے سوا قریبی ممالک میں بھی انہی دونوں کی سیاست کار فرما تھی اور دونوں ایک دوسرے کی سلطنت کے حریف بھی تھے۔ قارئین پہلے صفحات میں پڑھ چکے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ بعثت کے قریب ہی ایران روم کے خلاف ایسا صف آرا ہوا کہ مصر شام اور اس کے مذہبی مرکز بیت المقدس پہ حملہ کر کے صلیب تک اٹھا کر لے گئے۔ جس مصیبت پر ہرقل روم نے منت مانی کہ اگر مقدس صلیب ان کے سر پر پھر سایہ فگن ہو جائے تو میں بیت المقدس کی زیارت کے لئے حمص (دارالخلافہ روم) سے پیدل چل کر جاؤں گا اور یہ عیسائی بادشاہ اپنے اس ارادہ میں کامیاب ہو گیا۔

ہرقل روم اور ایران میں صدیوں سے چھیڑ چھاڑ چلی آ رہی تھی۔ کبھی ایک غالب آتا تو دوسرا مفتوح ہو جاتا۔ لیکن دونوں کے قرب و جوار کی سلطنتیں اور ان کے باشندے

ہرقل اور کسریٰ کے نام سے کانپتے تھے۔ لہٰذا ان دونوں قوتوں سے ٹکرانے کا تو کسی طرح سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ البتہ دونوں کی نگاہِ لطف و کرم کے سب منتظر رہتے تھے۔

عرب کی بے بسی

یہ تو ایران اور شام کے گردو نواح کے ملکوں کا حال تھا۔ جہاں کسی نہ کسی طرح امن قائم تھا مگر ان کے مقابلہ میں عربستان کی حالت یہ تھی کہ قبائلی زندگی نے ہر ایک کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے عرب کے باشندے ایران اور روم کی عنایات کے زیادہ محتاج تھے۔ خصوصاً جبکہ عرب کے دو بڑے خطے یمن اور عراق ایران کے زیرِ نگیں اور مصرو شام جیسے وسیع تر ملک ہرقل کی مملکت میں شامل تھے اس وجہ سے حجاز اور جزیرۃ العرب اتنی پرہیبت اور مضبوط سلطنتوں میں گھرا ہوا تھا۔ جبکہ عربوں کا ذریعۂ معاش صرف تجارت ہی تھا۔ ان کی تجارت گاہ یمن کے ایک کنارے سے لیکر شام کے گوشہ تک محدود تھی جس کی وجہ سے عرب کے باشندے کسریٰ (ایران) اور قیصر (روم) دونوں کے ساتھ دعا سلام رکھنے پر مجبور تھے۔ عرب کے سیاسی انتشار کا یہ عالم کہ بھولے سے کبھی باہم صلح صفائی ہو گئی تو بہتر ورنہ آپس میں ہمیشہ جنگ و جدل ہی کا چلن رہتا۔ نہ کبھی یہ توفیق کہ منظم ہو کر رہیں۔ وقت آپڑے تو قیصرو کسریٰ سے قسمت آزمائی کریں۔

عرب کے اس داخلی انتشار اور خارجی حدود میں پرہیبت و طاقت بادشاہوں کی موجودگی میں رسول اللہ ﷺ کا قیصرو کسریٰ جیسے طاقتور بادشاہوں کو اسلام کی طرف دعوت دینا جراَتِ نبوت ہی ہو سکتی ہے اور کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ ادھر بادشاہانِ ایران' مصر اور سکندریہ کے علاوہ یمن کے حکمرانوں کو بھی دعوتِ اسلام دینا انتہائی حیرتناک ہے۔ وہ بھی اپنے مستقبل کے اس نتیجہ سے بے نیاز ہو کر کہ اللہ نہ کرے اس دعوت کی پاداش میں تمام عرب کو ان بادشاہوں میں سے کسی ایک کی رعایا بننا نہ پڑ جائے۔

حقیقت یہی ہے کہ مخاطب بادشاہوں کی شان و شوکت رعب و دبدبہ کے باوجود محمد رسول اللہ ﷺ نے دین اسلام کی دعوت دینے میں کوتاہی نہیں برتی۔ ایک روز صحابہ کرام سے یوں خطاب فرمایا۔

ایہا الناس قد بعثنی اللہ رحمۃ للناس کافۃ فلا تختلفوا علی کما اختلف الحواریون علی عیسیٰ ابن مریم

لوگو اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کی طرح میری نافرمانی پر اتر آؤ۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ

ﷺ حضرت عیسیٰ کے حواری کن معنوں میں ان کے خلاف ہو گئے؟ تو جواب میں نبی رحمت ﷺ نے فرمایا۔

دعاھم الی الذی دعوتکم الیه فاما من بعثه مبعثا قریبًا فرضی وسلم واما من بعثه مبعثا بعیدًا فکره ووجهه وتثاقل

ابنِ مریم علیہ السلام نے یہی پیغام اپنے حواریوں کے ذریعہ بادشاہوں کو پہنچانا چاہا ان میں سے جس کو نزدیک کے بادشاہ کے پاس بھیجا اس نے خوشی سے تعمیل کر لی مگر دور بھیجے جانے والوں میں سے بعض کی پیشانیوں پر بل پڑ گئے۔ اس طرح یہ گروہ اپنے وعدے اور فرائض کی ذمہ داری سے عہدہ برآ نہ ہو سکا۔

اس کے بعد فرمایا "میں تم لوگوں کو اسلام کی دعوت پہنچانے کے لئے مندرجہ ذیل بادشاہوں اور نوابوں کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں' ہرقل' کسریٰ' مقوقس (مصر) حارث الغسانی امیر صوبہ حیرہ شام حارث الحمیری (حکمران یمن) نجاشی شہنشاہ حبشہ۔

صحابہ کرام نے خندہ پیشانی سے خدمات پیش کیں' چاندی کی ایک انگوٹھی بنائی گئی جس کے نگینہ میں محمد رسول اللہ ﷺ کندہ کروایا گیا۔ دعوتی خطوط لکھوائے گئے جس پر یہ نقش چسپاں ہوا' ان میں سے ایک خط کا نفس مضمون یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم من محمد عبداللہ و رسوله الی هرقل العظیم الروم سلام علی من اتبع الهدی وما بعد فانی ادعوک بدعایة الاسلام اسلم تسلم یوتک الله اجراک مرتین! فان تولیت فانما علیک اثم الاریسین۔ یا اهل لکتاب تعالو کلمته سواء بیننا و بینکم الانعبد الا الله ولا تسرک به شیئا" ولا یتخذ بعضنا بعضا" اربابا" من دون الله فان تولوا فقولوا الشهدوا وبانا مسلمون۔ (3-64)

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بیحد مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔ یہ خط محمد (ﷺ) جو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کا رسول ہے (اس کی طرف سے ہے) ہرقل شاہ روم کے نام۔ جو ہدایت کی تعمیل کرتا ہے اس کیلئے سلامتی اور امن ہے اور میں تمہیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں اگر تم نے اسے قبول کر لیا تو تم بھی سلامت رہو گے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کا اجر دگنا عطا فرمائیں گے۔ اگر انکار کر دیا تو اہلِ ملک کا گناہ بھی تمہارے ذمہ ہو گا۔ اے اہلِ کتاب اختلاف جھگڑے چھوڑو اور اس بات کی طرف آ جاؤ جو ہمارے اور تمہارے دونوں کے لئے یکساں طور پر تسلیم کردہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں ہم کسی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔

ہم میں سے کسی ایک کو بھی حق نہیں پہنچتا کہ وہ ایک اللہ کو چھوڑ کر ایک انسان کو اس طرح مان لے جیسے وہی اس کا پروردگار ہے۔ پھر اگر یہ لوگ منہ پھیر لیں (سنی ان سنی کر دیں) تو تم کہہ دو گواہ رہنا یہ انکار تمہاری طرف سے ہے اور ہم اللہ تعالیٰ کے مطیع و فرماں بردار ہیں۔

سفیروں کے نام

(1) دحیہ بن خلیفہ کلبی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	بطرف	ہرقل روم
(2) عبداللہ ابن حذافہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	=	کسریٰ ایران (خسرو پرویز)
(3) عمرو بن امیہ ضمری رضی اللہ تعالیٰ عنہ	=	نجاشی حبشہ اصحمہ
(4) حاطب بن ابو بلتعہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ	=	مقوقس شاہ مصر اور اسکندریہ
(5) عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ	=	شاہان عمان (جیفر و عبد پسران الجلندی)
(6) سلیط بن عمرو رضی اللہ تعالیٰ عنہ	=	رئیس یمامہ ھوذہ
(7) علاء بن حضرمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	=	رئیس بحرین (منذر بن ساوی)
(8) شجاع بن وھب اسدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	=	رئیس غسان (حارث بن ابی شمر الغسانی)
(9) مہاجر بن امیہ مخزومی	=	رئیس یمن حارث حمیری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفیر ایک ہی وقت میں مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے یا مختلف اوقات میں؟ اہلِ سیر کی مختلف آراء ہیں۔

عہدِ رسالت اور ایران و روم

اب سوال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے ہم عصر بادشاہوں کو دین اسلام کی دعوت دینا قابلِ حیرت جرأت کا کام نہیں؟ اور اس سے بھی زیادہ یہ حقیقت انسان کو حیرت کے بھنور میں پھنسا دینے کے لئے کیا کم ہے کہ ٹھیک بتیس سال بعد یہ تمام سلطنتیں اسلام کے پرچم تلے آ گئیں؟ ایران اور روم کے مقابلہ میں ان ملکوں کے بہت سے باشندے پہلے ہی سے مسلمان ہو چکے تھے لیکن عربستان اور اس کے ساحلی علاقوں کے بیشتر خطوں کا مفتوح ہونا قابلِ حیرت نہیں۔ البتہ جب ہم اس خطے کے سب سے بڑے ملکوں ایران اور روم کی قوت و تمدن کا تاریخی جائزہ لیتے ہیں تو یہ دونوں ظہورِ اسلام کے بعد تک بھی بدستور تمام عالم میں ممتاز تھے۔ ان کا عروج اور ارتقاء صرف مادی بنیاد ہی پر قائم تھا۔ دونوں ملکوں کی قوتیں روحانی اعتبار کے حوالے سے دیوالیہ ہو چکی تھیں۔ ایران مذہبی طور پر دو

فرقوں میں بٹ چکا تھا' ان میں ایک بت پرست تھا اور دوسرا آتش پرست۔ روم بزنطیہ میں مسیحیت کئی ٹکڑوں میں بٹ چکی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے عقیدہ میں بھی اتنی طاقت نہ تھی کہ اس کے بل بوتے پر ان کے ماننے والوں کے دلوں میں قوتِ استقامت پیدا ہو۔ اب ان کا مذہب صرف ظاہری رسوم و قیود کا ملغوبہ بن کر رہ گیا۔ جن کے ماننے والوں کی عقل پر پردے پڑ چکے تھے۔

ایران کی بت پرستی اور آتش پرستی اور روم کی مسیحیت کے مقابلہ میں مذہب اسلام کا ظہور ہوا' جس کے ترجمان محمد ﷺ لوگوں کے سامنے خالص روحانیت کی دعوت پیش کرتے جس کے ثمرہ میں اسلام کے ماننے والے انسانیت کے اعلیٰ ترین مراتب حاصل کرسکتے تھے اور یہ بات مسلمہ ہے کہ مادیت اور روحانیت کی باہمی جنگ کی وجہ سے جب وقتی خواہشوں کے مقابلہ میں روحانی عیش اور جاودانی نعمتیں صف آراء ہو جائیں تو اول الذکر (وقتی نعمتوں) کو سرنگوں ہونا ہی پڑتا ہے۔

بلاشبہ ایران اور روم اقتدار و عظمت میں اس وقت کوئی بھی طاقت ہم پلہ نہیں رکھتے تھے لیکن مصیبت یہ تھی کہ دونوں جدیدیت اور فکرِ نو کے دشمن اور قدیمی رسم پرستی کے دیوانے تھے۔ حتیٰ کہ ہر اس ایسے نظریہ اور فکرِ وحدت کو بدعت و ضلالت سمجھتے جو ان کی دقیانوسی رسومات کے خلاف ہو۔ وہ اپنی پرانی اور بھول بھلیوں کی طرح کی راہوں کو ترقی کی شاہراہ سمجھ کر اسی میں چکر کاٹتے رہتے۔ گویا ایران اور روم دونوں نے اپنے دفاع کے دروازے بند کر دیئے تھے کیونکہ انسانی جماعت اور فرد بھی موجودات کے دوسرے عوامل کی طرح ہر لمحہ ترقی کی راہ پہ گامزن ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جماعتوں کو بھی بامِ عروج پر پہنچنے کے باوجود مزید کوششوں کو ترک نہیں کرنا چاہیئے۔

ورنہ ایسی ترقی پذیر جماعت کی مثال اس دولت مند کی طرح ہو گی جو اپنے سرمایہ کو کاروبار میں لگانے کے بجائے زندگی کے مصارف میں بہانا شروع کر دے۔

اسی طرح متمدن قوموں کا ترقی کی مزید کوششوں کو چھوڑ کر بیٹھ جانا ایسا ہی ہے جیسے صدیوں کی جمع کردہ تہذیب و تمدن کی دولت کو دریا برد کر دینا۔ جس کے نتیجہ میں ایسی قوم کا قعرِ مذلت میں گر جانا لازمی ہوتا ہے اور جب کوئی قوم یا جماعت اس طرح ذلیل و خوار ہو کر رہ جائے تو اسے کسی ایسی خارجی قوت کے زیرِ نگیں ہو کر رہنا ہی پڑتا ہے۔ جب وہ قوم کسی پس ماندہ قوم کو اپنے دامن میں پناہ دے تو اس پسماندہ قوم میں بھی ترقی کے اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔

عہدِ رسالت مآب ﷺ کی پسماندہ اقوام میں یہی ایران و روم دنیا کی دو بڑی

سلطنتیں تھیں۔ جن کی نشاۃِ ثانیہ (نئی زندگی) کے لئے نہ تو چین' نہ ہی ہندوستان میں اتنی قوت و طاقت تھی کہ وہ اس کا مداوا بن سکے اور یہی بے مائیگی و دیوالیہ پن وسطی یورپ کے ملکوں پر مسلط تھا۔

اگر کوئی جوہر تھا تو محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس تھی۔ جس کی دعوت میں وہ تعمیری جوہر تھا کہ اپنے ساتھ ان قوموں کو بھی ترقی کی راہ کا ہمسفر بنا لے جو قومیں دین کے غلط تصورات اور دقیانوسی رسومات کی وجہ سے سرِ منزل تھک کر بیٹھ گئی ہوں۔

قسمت پہ اس مسافرِ بے کس کے روئیے
تھک کے بیٹھ گیا ہو جو منزل کے سامنے

ایمان کے جس نور نے نفسِ رسول ﷺ کو اتنا مجلی و منور کر دیا اور ایسی روحانی قوت بخش دی کہ اس کے مدِمقابل کسی قوت کا آنا ناممکن ہو۔ اسی نورِ ایمان کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو مبلغین کے ذریعہ اپنے گردو نواح کے بادشاہوں اور رئیسوں کو دعوتِ اسلام دینے کی جرأت و قوت بخشی وہ دینِ اسلام جو دینِ حق اور اپنے اوصاف کی وجہ سے ہر قسم کے روحانی کمالات کا مجموعہ ہے۔ مادی تصرفات میں عادلانہ توازن کا حامل ہے۔ دینِ اسلام جس پر اللہ تعالیٰ کا ہاتھ ہے۔ دینِ اسلام جو اپنے ماننے والوں کو عقیدہ کی پرکھ پر زور دیتا ہے اور جماعتی نظم و نسق کے قوانین میں بھی راہنمائی کرتا ہے۔ جن سے مادہ اور روح دونوں میں متبادل توازن قائم ہوتا ہے تاکہ انسان کے لئے اس میں جتنی قوتِ ارتقاء ممکن ہو اسے حاصل کرنے کی کوشش میں تھک کر بیٹھ نہ جائے۔ یہ وہ قوت ہے جس پر نہ تو کوئی منفی قوت اثر انداز ہو سکتی ہے' نہ شیطانی فریب یا دھوکہ اس کے راستے میں حائل ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ہر شکست زدہ قوم اس دینِ اسلام کے اصولوں کی معاونت حاصل کر کے ایسے بلند ترین مقام پر فائز ہو سکتی ہے جو عالمِ کون و مکان میں انسان کے لئے ممکن ہو سکتا ہے۔

دوسرا رخ

اب دوسرا سوال ذہن میں یہ آتا ہے کہ ایسے حالات میں جبکہ مدینہ سے شمال کی جانب بسنے والے یہودی ہر لمحہ خاتم الرسل ﷺ کے ساتھ فریب اور بدعہدی کے لئے ادھار کھائے بیٹھے تھے ان کی موجودگی میں بادشاہوں اور رئیسوں کو تبلیغی خطوط بھیجنا حالات کے تقاضہ کے مطابق تھا یا نہیں؟

بلاشبہ صلح حدیبیہ نے رسول اللہ ﷺ کو نہ صرف قریشِ مکہ بلکہ جنوب کی

طرف سے ہر خطرہ سے محفوظ و مطمئن کر دیا تھا لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس کے برعکس مدینہ منورہ کے شمال کی طرف بسنے والے یہود ہر وقت کا خطرہ وہاں موجود تھے۔ ممکن تھا کہ ہرقل یا کسریٰ خیبر کے ان یہودیوں کو نہ صرف بھڑکا دے بلکہ فوجی امداد بھی دے اور یہود کا وہ پرانا ناسور رسنے لگے جو ان کے دینی بھائیوں قینقاع اور بنو نضیر کی مدینہ سے جلاوطنی اور بنو قریظہ کے قتل عام کی صورت میں وقوع پذیر ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کی کینہ پروری کا علم تھا' اس بدخصلت میں وہ قریشیوں سے بھی چار قدم آگے ہیں۔ اسی طرح دینی نقطہ نگاہ سے بھی قریش کے مقابلہ میں یہودی زیادہ شدت پسند ہیں' جامد ہیں' دور اندیشی میں بھی ان کا پلہ اہل مکہ سے بھاری ہے۔ رسول اللہ ﷺ کو یہودیوں کے ساتھ صلح حدیبیہ جیسا معاہدہ کرنا یا ان کی طرف سے بد عہدی نہ کرنے کا اطمینان بھی گوارا نہیں تھا۔ اس سے پہلے فریقین میں ٹکراؤ بھی ہو چکا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس تصادم میں یہودیوں کو نیچا دیکھنا پڑا۔ لہٰذا ہمیں یقین ہے کہ اگر انہیں ہرقل کی طرف سے مدد مل سکتی تو مسلمانوں سے انتقام لینے سے وہ کبھی باز نہ رہتے۔

لہٰذا یہود کے سابقہ کردار کی روشنی میں رسول اللہ ﷺ نے فیصلہ فرمالیا کہ ان کو یہاں سے جڑ سمیت اکھاڑ پھینکنا ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے خلاف مؤثر کارروائی کرنے کا فیصلہ فرمالیا اور اس کو بروئے کار لانے میں زیادہ عجلت سے بھی کام لیا تاکہ بنو غطفان یا مسلمانوں کا کوئی اور دشمن قبیلہ بروقت یہود کی کمک کے لئے نہ پہنچ سکے۔

یہود خیبر پر حملہ کی تیاریاں

رسول اللہ ﷺ نے خیبر کے یہودیوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنالیا۔ حدیبیہ سے واپسی کے ایک مہینہ یا پچیس دن بعد باختلاف روایت روانگی کا حکم دیا لیکن اس لشکر میں وہی مجاہدین شامل ہو سکتے تھے جو صلح حدیبیہ میں موجود تھے۔ دوسرے مسلمانوں کو شمولیت سے روکا تو نہیں لیکن انہیں بتا دیا گیا کہ وہ مال غنیمت سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اسی لشکر میں سولہ سو مسلمان مجاہدین شریک تھے۔ جن میں سواروں کی تعداد صرف ایک سو تک تھی۔ ہر مجاہد کے دل میں اللہ تعالیٰ کی حمایت و نصرت کا پورا پکا یقین تھا اور صلح حدیبیہ کے بعد نازل ہونے والی سورہ فتح کی بشارت ایمان و یقین کا مرکزی ستون تھی۔

سیقول المخلفون اذا انطلقتم الیٰ مغانم لتاخذوھا ذرونا نتبعکم یریدون

ان یبدلوا کلام اللہ قل لن تتبعونا کذالکم قال اللہ من قبل فسیقولون بل تحسدوننا بل کانوا لا یفقھون الا قلیلا (15:48)

"جب تم لوگ غنیمتیں لینے چلو گے تو جو لوگ رہ گئے تھے وہ کہیں گے ہمیں بھی اجازت دیجئے کہ آپ کے ساتھ چلیں یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے قول کو بدل دیں کہہ دو کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکتے' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے پہلے سے فرما دیا ہے۔ پھر کہیں گے (نہیں) تم تو ہم سے حسد کرتے ہو۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہی نہیں مگر بہت کم"

مجاہدین مدینہ سے چل کر تیسرے روز نماز مغرب کے بعد خیبر میں پہنچے اور رات بھر خیبر کے قلعہ کے نیچے میں پڑاؤ ڈال کر پڑے رہے۔ اہلِ خیبر کو مجاہدین کی آمد کا علم نہ ہوا۔ صبح کو جب کسان پھاوڑے اور ڈلیاں لے کر کھیتوں کی طرف جانے لگے تو شہر کے باہر لشکر پڑا ہوا دیکھا۔ یہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) لشکر لے کر آ پہنچے؟ کہتے ہوئے الٹے پاؤں بستی کی طرف بھاگے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو یہ آواز لگاتے ہوئے سنا تو فرمایا۔ خربت خیبر انا اذا نزلنا بساحة قوم فساء صباح المنذرین "خیبر کی تباہی کا وقت آ پہنچا۔ جب ہم کسی قوم پر حملہ کرنے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں تو اس قوم کا حشر یہی ہوتا ہے"

خیبر کے یہودی پہلے ہی سے خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے دشمنوں کو ہمارے پناہ دینے کی وجہ سے جنگ پہ تلے بیٹھے ہیں۔ وہ ایسے وقت کو ٹالنے سے غافل نہیں تھے۔ ان میں سے بعض لوگ جو قبائل میں سے کسی کی امداد کے خواہاں نہ تھے برنبائے حفظِ ماتقدم وادی القریٰ اور تیماء کے یہودیوں سے ساز باز کر چکے تھے۔ اس سے پہلے ان کا ایک گروہ مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرنے پر بھی مائل تھا تاکہ مسلمانوں کے دلوں میں حی بن اخطب کی طرف سے مدینہ پر حملہ کرنے کا جو واقعہ رونما ہوا تھا۔ اس کی تلافی ہو جائے۔ اس معاملہ میں یہود خیبر کا میلان انصارِ مدینہ کی طرف اور زیادہ تھا لیکن سابقہ واقعات نے فریقین کے دلوں کو ایک دوسرے سے اتنا دور کر دیا ہوا تھا کہ آخر مسلمانوں کو خیبر پر ہلہ بولنا ہی پڑا۔ اس سے پہلے یہودیوں کے دو بڑے سرغنہ ابو الحقیق اور یسیر ابن ازام بھی قتل کئے جا چکے تھے جس سے متاثر ہو کر انہوں نے بنو غطفان سے دوستی کر لی ہوئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تیاری کی ہوا پائی تو فوراً غطفان کو آگاہ کر دیا البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ بنو غطفان نے ان کی مدد کرنا قبول بھی کیا یا نہیں۔

قطع نظر اس کے کہ بنو غطفان اہلِ خیبر کی مدد کیلئے پہنچے یا اپنے گھروں کے دروازوں سے

باہر بھی نہ نکلے۔ رسول اللہ ﷺ نے بھی بنو غطفان سے غنیمت میں حصہ دینے کی پیشکش کی یا نہیں۔ لیکن اربابِ سیرت اس بات پر متفق ہیں کہ خیبر کے یہود نہ صرف اپنی قوم میں ہی طاقتور، فنونِ جنگ میں ماہر اور مال و دولت میں تونگر تھے بلکہ ان کے پاس تمام عرب سے زیادہ اسلحہ تھا۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کو یقین تھا کہ جب تک یہ گروہ عرب میں موجود ہے دینِ جدید کے ساتھ ان کی دشمنی دین اسلام کو فروغ حاصل نہیں ہونے دے گی۔ نہ وہ اپنی شرارتوں سے باز رہیں گے اور نہ ان کے اثرات کی وجہ سے اسلام پنپ سکے گا۔ انہیں وجوہات کی بناء پر مسلمانوں نے خیبر پر حملہ کر دیا۔

خیبر پر مسلمانوں کے حملہ کی خبر بجلی کی طرح پورے عرب میں پھیل گئی۔ ملک کا ہر شخص نتیجے کے لئے گوش پرداز ہو گیا۔ خصوصاً قریشی انتہائی بے چینی کے ساتھ انجام کا انتظار کرنے لگے۔ انہیں یقین تھا کہ یہودی اپنی روایتی بہادری، بہادروں کی بلند ہمتی، اسلحہ کی فراوانی کے سبب مسلمانوں کو شکستِ فاش دے دیں گے۔ چنانچہ اکثر نے تو اس ہار جیت پر شرطیں لگا دیں۔

محاصرہ

مجاہدین نے خیبر کے قلعوں کو چاروں طرف سے محاصرہ میں لے لیا۔ یہود نے اپنے سرغنہ سلام بن مشکم کے مشورہ سے یہ انتظام کیا کہ مال و اسباب، مستورات اور بچوں کو قلعہ وطیح اور سلام میں پہنچا دیا۔ اجناس و رسد قلعہ ناعم میں منتقل کر دیا۔ اور سپاہی اپنے تجربہ کار جنگ آزمودہ بہادر سپہ سالاروں کی قیادت میں مجاہدین کے حملہ سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہود اور ان کے بچے سب کے سب قلعہ نطاۃ میں جمع ہو گئے۔

آمنا سامنا ہو گیا

سب سے پہلے قلعہ نطاۃ کے نیچے دونوں لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ لڑائی کافی دیر تک پورے شباب پر رہی جس میں مجاہدین کے پچاس مجاہد زخمی ہوئے۔

اندازہ کر لیجئے کہ لشکرِ یہود پر کیا بیتی ہو گی۔ جبکہ ان کا سپہ سالار سلام بن مشکم مارا گیا۔ جس کے قتل ہو جانے پر قلعہ ناعم کی سپہ سالاری حارث بن ابو زینب کو سونپ دی گئی۔ بنو خزرج نے اسے دندان شکن جواب دیتے ہوئے واپس قلعہ میں دھکیل دیا۔ مجاہدین نے پوری قوت کے ساتھ محاصرہ قائم رکھا۔ اور محصورین نے بھی برابر پوری قوت کے ساتھ مدافعت جاری رکھی۔ انہیں یقین تھا کہ بنو اسرائیل کی اس شکست سے پورے عرب میں قومِ یہود کا نام و نشان مٹ جائے گا۔

مجاہدین نے قلعہ ناعم کا محاصرہ کئی روز تک کئے رکھا مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخر رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو علم دے کر ناعم کی مہم سپرد کی۔ انہوں نے جی توڑ کر جنگ کی مگر قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ دوسرے روز علم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو سونپا گیا مگر مہم سر نہ ہو سکی' تیسرے روز حضرت علی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے علم دیتے ہوئے فرمایا۔ خذھذ الرایہ فامض بھا یفتح اللہ علیک اے علی (رضی اللہ عنہ) علم لو۔ حملہ کرو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ تمہارے ہاتھ سے اسے فتح فرمائے! آمین۔

یہودی قلعہ سے نکل کر مقابلہ پر ڈٹ گئے اور ان کے ایک سپاہی کی ضرب سے علی رضی اللہ عنہ کی ڈھال گر پڑی۔ اتفاق سے قلعہ کے پاس چوکھٹ کا ایک پٹ پڑا ہوا تھا۔ علی نے اسے ہاتھ میں لے کر ڈھال کا کام لینا شروع کر دیا۔ اور یہود کے لشکر کو قلعہ میں دھکیلنے کے بعد اسی پٹ سے خندق کا پل بنا لیا۔ جس پر سے گزر کر مجاہدین قلعہ میں داخل ہو گئے اور یہودی سپہ سالار حارث بن ابو زینب کی موت کے بعد مجاہدین قلعہ ناعم پر قابض ہو گئے۔

اس واقعہ سے اندازہ لگائیے یہودیوں نے کس بہادری کے ساتھ مجاہدین کا مقابلہ کیا اور مسلمان کس طرح سینہ سپر ہو کر سرگرم پیکار رہے۔

حصنِ قموص و قلعہ صعب بن معاذ کا محاصرہ اور فتح

مجاہدین نے حصنِ قموص کا محاصرہ کیا وہ بھی شدید معرکہ کے بعد فتح ہو گیا لیکن اس موقع پر آ کر رسد ختم ہو چکی تھی۔ مجاہدوں نے رسول اللہ ﷺ کی اطلاع بھیجی مگر آپ سے مداوا نہ بن آیا۔ ناچار لشکریوں کو سواری کے گھوڑے ذبح کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

اسی اثناء میں یہود کے ایک قلعہ سے بکریوں کا ایک ریوڑ اتر رہا تھا جس میں سے دو بکریاں بچھڑ گئیں اور مسلمانوں نے ان کے گوشت پر اکتفا کیا۔ اب قلعہ صعب بن معاذ کا محاصرہ ہوا۔ اس میں بھی یہودیوں نے شکست کھائی۔ جہاں سے اس قدر رسد حاصل ہوئی کہ مجاہدین کھانے پینے سے بے نیاز ہو کر یہودیوں کو گھیرنا شروع کر دیا لیکن یہودی اپنی زمین کا چپہ تک چھوڑنے کو تیار نہ تھے۔ وہ اپنے ہر قلعہ کی مدافعت میں اس وقت تک لڑتے جب تک وہ پوری طرح بے بس نہ ہو جاتے۔

یہودی رستم مرحب

خیبر کے یہودیوں میں رستم کے لقب سے مشہور مرحب نامی پہلوان پوری طرح مسلح ہو کر فخر سے یہ اشعار کہتا ہوا نکلا۔

(1)قد علمت خیبر انی مرحب شاکی السلاح بطل مجرب

سارا خیبر مجھے پہچانتا ہے۔ میں مسلح بہادر اور مردِ میدان مرحب ہوں۔

(2)اطعن احیانا وحینا" اضرب اذ اللیوث اقبلت تحرب

جب شیر مجھ پر بپھر کر حملہ کرتا ہے تو کبھی اسے نیزہ چبھو دیتا ہوں اور تلوار مار دیتا ہوں۔

(3)ان حمای للحمی لا یقرب یحجم عن صولتی المجرب

میں اپنی چراگاہ کا مالک ہوں جس کے قریب آنا اپنی موت کو مول لینا ہے۔ میرے آزمودہ جنگ ہونے کی وجہ سے۔

محمد بن مسلمہ کے ہاتھوں رستم خیبر قتل ہو گیا

اس کے اشعار سن کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا۔ اس کے مقابلہ میں کون نکلے گا۔ محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کل اس کے ہاتھ سے میرا بھائی شہید ہو چکا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمائی اور دونوں میں مقابلہ شروع ہوا۔ مرحب نے ایسا نپا تلا وار کیا کہ اگر محمد بن مسلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسے اپنی ڈھال پر نہ لیتے تو ان کا کام تمام ہو جاتا مگر مرحب کی تلوار ڈھال میں اٹک کر رہ گئی اور محمد بن مسلمہ کے ایک ہی وار نے اسے ڈھیر کر دیا۔ جنگ پوری شدت کے ساتھ جاری تھی مگر یہود کے مضبوط قلعوں کی قطار نے انہیں ڈگمگانے نہ دیا۔

قلعہ زبیر کا محاصرہ

اب مجاہدین نے حصنِ زبیر پر دھاوا بول دیا۔ دونوں فریقین نے جی کھول کر دادِ شجاعت دی۔ پھر بھی قلعہ کا فتح ہونا مشکل ترین مسئلہ بن گیا۔ آخر مجاہدین نے محصورین کا پانی بند کر دیا جس سے یہود جان پر کھیل کر میدان میں اتر آئے۔ گھمسان کا رن پڑا دشمن آخر میں ہمت ہار کر بھاگ نکلا۔ اس طرح یکے بعد دیگرے ان کے ہاتھ سے ایک ایک قلعہ نکلتا گیا۔

آخری دو قلعے

منطقہ کتیبہ میں دو قلعے وطیح و سلالم باقی رہ گئے تھے۔ لیکن یہود کا تمام مال و اسباب قلعہ شق و نطاۃ منطقہ کتیبہ میں ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ یہود نے جاں بخشی کی شرط پر صلح کی درخواست کی جو رسول اللہ ﷺ نے قبول فرمالی اور مفتوحہ اراضی کاشت کے لئے ان کے سپرد کردی گئی اور نصف ثبانی مقرر کرکے انہیں آباد رہنے دیا۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خیبر کے یہودیوں کا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کی زمینوں پر حقِ کاشت تسلیم کر لیا لیکن مدینہ کے یہود بنو قینقاع اور بنو نضیر کو ان اراضی سے متمتع ہونے کا موقع کیوں نہ دیا بلکہ دونوں کو شہر بدر کر دیا گیا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہود خیبر کا معاملہ یہود مدینہ سے بالکل مختلف ہے۔

(الف) فتحِ خیبر کے بعد یہاں کے یہود کے سر اٹھانے کا خطرہ ختم ہو گیا۔

(ب) خیبر میں باغات و نخلستان اور اراضی کی اس قدر افراط تھی جس کی نگہداشت اور پیداوار حاصل کرنے کے لئے بڑی محنت درکار تھی۔

(ج) مدینہ کے مسلمان زراعت پیشہ تو تھے لیکن خود ان کی ذاتی اراضی ان کے اپنے بغیر دوسرا آباد نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے انہیں اس غرض کے لئے مدینہ سے خیبر منتقل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

(د) انصار کی مدینہ کی جنگوں میں ہر وقت ضرورت تھی۔

(ہ) یہودِ خیبر کی بساطِ سیاست و قیادت الٹ جانے سے ان کے لئے کاشت کاری پر اکتفا بھی ان کے لئے غنیمت تھا۔

لیکن افسوس ان کی بد فطرت کی وجہ سے وہاں کی زمین بنجر ہوتی گئی۔

جب کہ اس کے علاوہ رسول اللہ ﷺ نے ان پر یہ احسان فرمایا کہ فتح میں تورات کے جتنے نسخے مجاہدین کے ہاتھ لگے تھے وہ تمام کے تمام ان کے حوالے کر دیئے جب کہ مسیحی روم نے یروشلم پر فتح حاصل ہونے کے بعد اسی مقدس کتاب کے تمام اوراق جلا کر اس کی راکھ اپنے پیروں تلے روند ڈالی۔

پھر انہی نصرانیوں نے جب یہودیوں کے ہاتھ سے اسے حاصل کیا۔ تو وہاں انہوں نے بھی کتابِ مقدس سے ایسا ہی نازیبا سلوک کیا۔

یہودی حیرت زدہ رہ گئے

یہاں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہر سال عبداللہ بن رواحہ پیداوار کی تقسیم کے لئے تشریف لاتے' اجناس کی تمام اقسام کو دو حصوں میں تقسیم کر کے مزارعین کو

فرماتے "دونوں میں سے جو ڈھیر پسند ہو اٹھالو۔ اس پر ایک مرتبہ یہودیوں کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اسی عدل و انصاف پر ارض و سما قائم ہیں"۔

یہودیوں کے تین مراکز

الف۔فدک۔ رسول اللہ ﷺ نے مقام فدک پر یہودیوں کے مقبوضہ وطیع و سلام کے محاصرہ میں ہی پیغام بھیج دیا۔ "مسلمان ہو جاؤ ورنہ تمہیں اپنے اموال ہمارے سپرد کرنا پڑیں گے" خیبر کے بقیہ قلعوں کے انجام کی خبریں سن سن کر ان کے حواس پہلے ہی جواب دے چکے تھے لہٰذا خود سپردگی میں ہی اپنی خیریت سمجھ کر نصف پیداوار پر تصفیہ کر لیا۔

سرزمین فدک اور خیبر کی زمینوں کو دو مختلف حیثیتیں دی گئیں۔ اول الذکر لڑائی کے بعد فتح ہوئی تھی لہٰذا اس کی اراضی غازیوں میں تقسیم کر دی گئی۔ فدک کی زمین بغیر کسی جدوجہد کے حاصل ہوئی تھی اس لئے رسول اللہ ﷺ نے اسے خالصہ کے طور پر اپنے لئے مختص کر دیا۔

ب۔وادی القریٰ۔ یہ بستیاں خیبر اور مدینہ کی شاہراہوں پر واقعہ تھیں۔ خیبر سے واپسی پر مجاہدین ابھی وادی القریٰ سے تھوڑی دور ہی تھے کہ یہود نے تیر برسانا شروع کر دیئے۔ مقابلہ شروع ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے صف بندی فرمائی۔ مگر جنگ سے پہلے انہیں دعوتِ اسلام دی۔ یہود کا ایک ایک پہلوان نکلنا شروع ہوا مگر ان کی قسمت میں واپس ہونا نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ ان کے ہر بہادر کے قتل ہونے کے بعد ان کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کرتے یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ دوسرے روز کی صبح کو ازخود یہودیوں نے اطاعت کا پیغام بھیجا۔

ان کے اموال مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے گئے اور انہیں بٹائی پر زمین اور باغات دے دیئے گئے۔ وادی القریٰ میں رسول اللہ ﷺ نے چار روز قیام فرمایا۔

ج۔وادی تیماء۔ اسی شاہراہ پر وادی تیماء ہے۔ اس میں بھی یہود آباد تھے۔ مگر انہوں نے بغیر تصادم کے اطاعت قبول کر لی اور جزیہ ادا کرنا بھی تسلیم کر لیا۔

سطوتِ یہود کا آخری ستون

آج سے عربستان میں یہودیوں کا صدیوں سے قائم کردہ وقار کا ستون زمین بوس ہو گیا۔ سب نبی اکرم ﷺ کے ماتحت جینے پر مجبور ہو گئے اور جس طرح مدینہ کی جنوبی سمت (مکہ) سے صلح حدیبیہ کے بعد مسلمان محفوظ و مامون ہو گئے۔ اسی طرح خیبر کی فتح نے شمال کی طرف سے فتنوں کی یلغار کے دروازے ہمیشہ کیلئے بند ہو گئے۔ یہود کا غرور

اور طاقت چور چور ہو جانے سے انصاری مسلمانوں کو ان پر جتنا غصہ تھا سب ختم ہو گیا۔ ان میں سے بعض کی مدینہ میں آباد کاری پر بھی مسلمانوں نے رواداری سے کام لیا۔ جب منافقوں کے سردار عبداللہ بن ابی کو موت نے دبوچ لیا۔ یہودی اپنے اس قدیمی عربی کی لاش پر کھڑے رو رہے تھے۔ اس اثناء میں رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس کے بیٹے کے پاس تعزیت کے لئے تشریف لائے تو یہودیوں کے ساتھ کندھا ملا کر کھڑا ہونے کو اپنے خلاف نہیں سمجھا۔

یہود کے ساتھ حسنِ سلوک کی بناء پر معاذ بن جبل رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے درخواست کی کہ انہیں دینِ موسیٰ ترک کرنے کے لئے نہ کہا جائے۔ اسی زمانے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بحرینؔ کے یہودی قبیلہ بنو عریض اور قبیلہ بنو غازیہ کے ساتھ ان کو اطاعت اور جزیہ دینا قبول کر لیا تو انہیں اپنے دین پر قائم رہنے کی اجازت دیتے ہوئے ان کی درخواست قبول فرمالی۔ مختصر یہ کہ یہود کو مسلمانوں کے زیرِ حکومت رہنا ہی پڑا۔ تمام عرب میں ان کے مراکز ختم ہو چکے تھے۔ احساسِ ذلت سے انہیں اس سرزمین کو خیرباد کہنا پڑا' جہاں صدیوں سے ان کی عزت و وقار کی دھاک بیٹھی تھی۔ البتہ اس بات میں اختلاف ہے کہ اس سرزمین سے تمام یہودی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ مبارک میں نکل گئے یا بعد میں۔

ایک روایت یہ ہے کہ جزیرۃ العرب میں اپنا اقتدار و وقار ختم ہونے کے بعد فوراً ہی عربستان کو چھوڑ کر نہیں گئے بلکہ کچھ مدت تک یہاں آباد رہے۔ لیکن جب تک عرب میں رہے مسلمانوں پر غصہ سے دانت پیستے رہے۔ یہی نہیں بلکہ ان سے اسلام دشمنی میں جو کچھ ان سے ہو سکا انہوں نے کیا۔

زہر آلود گوشت

خیبر فتح ہو چکا تھا فریقین (یہودی اور مسلمانوں) میں معاہدہ بھی ہو چکا تھا۔ جنگ کے معمولات بے نشان ہو چکے تھے کہ یہود کے سرغنہ سلام بن مشکم کی بیوی زینب (ہمشیرہ مرحب مقتول) نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے رفقاء کو دعوت میں زہر ملا ہوا گوشت پیش کیا۔ آپ کے رفیقِ طعام (بشر ابن البراء) تو مزے لے لے کر کھاتے گئے۔ لیکن نبی الخاتم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پہلا ہی لقمہ چبا کر پھینکتے ہوئے فرمایا۔ ان ھذا العظم لیخبرنی انہ مسموم "مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ گوشت زہر آلود ہے" مجرمہ نے اقبالِ جرم کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے میری قوم کے ساتھ جو برتاؤ کیا تھا۔ یہ اس لئے کیا اور یہ بھی

سوچا اگر آپ اس قوم کے بادشاہ ہیں تو مر جائیں گے اور میری قوم کو نجات مل جائے گی اور اگر آپ نبی ہیں تو وحی کے ذریعہ آپ کو اطلاع ہو جائے گی۔ اس اعترافِ جرم پر اسے معاف کر دیا گیا یا نہیں دو مختلف روایتیں ہیں۔

(1) اس کے باپ اور شوہر کے قتل ہو جانے کی وجہ سے اس پر ترس کھا کر معاف کر دیا گیا۔

(2) حضرت بشر بن براء کے انتقال کی بناء پر اسے بھی قتل کر دیا گیا۔

زینب کی اس مذموم حرکت پر مسلمان بہت زیادہ متاثر ہوئے انہیں یہود پر بالکل یقین نہ رہا۔ مسلمانوں کو ان کی جمعیت کے ٹوٹ پھوٹ جانے کے باوجود ہمیشہ ان کی تخریب کار فطرت سے فساد کا اندیشہ رہتا۔

بی بی صفیہ

خیبر میں مفتوحہ ایک محترمہ صفیہ قیدیوں میں آئیں' یہ بنو نضیر مدینہ کے سرغنہ حی بن اخطب کی بیٹی اور بنو قریظہ کے رئیس اعظم کنانہ بن ربیع کی بیوہ تھیں۔ کنانہ مدینہ سے جلاوطنی کی سزا ملنے کے بعد چمڑے کے ایک بڑے تھیلے میں زر اور نقدی بھر کر لے آیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے قرارداد کے مطابق اس سے اس تھیلہ کا مطالبہ کیا تو اس نے قسم کھا کر لاعلمی کا اظہار کر دیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر معلوم ہو جائے کہ یہ تھیلا تم نے چھپایا ہے تو پھر اس جھوٹی قسم کے کفارہ میں تمہیں اپنا قتل منظور ہے؟

مسلمانوں میں سے ایک مسلمان کنانہ کو تھوڑی دیر پہلے ایک کھنڈر میں دیکھ چکا تھا۔ اس نے اس کی نشاندہی رسول اللہ ﷺ سے کر دی۔ رسول اللہ ﷺ نے فوراً اس کھنڈر میں تلاشی کا حکم دیا۔ تھیلا مل گیا۔ خزانہ اس میں موجود تھا۔ کنانہ اس کی منظور شدہ شرط کے مطابق قتل کر دیا گیا۔

غرض یہ کہ جب بی بی صفیہ قید ہو کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئی تو مسلمانوں نے ان کے بارہ میں عرض کیا۔ "صفیہ سیدۃ نبی قریظہ والنضیر لا تصلح الا لک" اے رسول رحمت و شفقت (ﷺ) سیدہ صفیہ بنو قریظہ اور بنو نضیر دونوں قبیلوں میں ممتاز ہونے کی وجہ سے صرف آپ کے حرم کے شایانِ شان ہے۔ یہ سن کر نبی اکرم ﷺ نے ان کو حرم میں شامل فرما لیا۔ صفیہ اب ام المومنین صفیہ رضی اللہ عنہا کے اعزاز سے فیض یاب ہو گئیں۔

آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کی رائے اس لئے بھی مان لی آپ کے سامنے سابقہ فاتحین اور اکابر کی طرح مفتوح بادشاہوں کی شہزادیوں کو اپنے محل میں داخل کر کے ان کے خوفزدہ دلوں کی ڈھارس بندھانا تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے انہیں اپنے حرم میں لینے کا اعزاز بخشا۔

لیکن شب عروسی میں ابو ایوب خالد انصاری رضی اللہ عنہ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمہ کے باہر بغیر کسی کو بتائے ہوئے ننگی تلوار لیئے پہرہ دیتے رہے۔ ان کو خطرہ تھا کہیں سیدہ صفیہ کے دل میں بھی اپنی قوم ' اپنے والد اور شوہر کے انتقام کی آگ نہ اچانک سلگ اٹھے۔ اور گستاخی نہ کر بیٹھیں۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے پہرہ کی وجہ پوچھی تو عرض کیا۔ (سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں نے سوچا شاید بی بی صفیہ کے دل سے کفر کے اثرات ابھی تک زائل نہ ہوئے ہوں اور کوئی نازیبا حرکت نہ کر بیٹھے یہ خدشہ تھا۔

تبلیغی وفود

یہ بات واضح ہونا ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہرقل' کسریٰ اور نجاشی وغیرہ کی طرف بھیجنے کے لئے جو وفود مقرر فرمائے تھے انہیں غزوۂ خیبر سے قبل بھیجا گیا یا اس کے بعد! اس تعین میں بھی مؤرخین کا بعید اختلاف ہے۔ زیادہ تر قرین قیاس یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حضرات کو بیک وقت نہیں بھیجا۔ البتہ بعض کو خیبر سے پہلے اور بعض کو خیبر کے بعد بھیجا۔ ان منتخبہ شخصیات میں سے دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ خیبر کی لڑائی میں شریک ہوئے اور فتح خیبر کے بعد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مکتوبِ گرامی لے کر ہرقل کے پاس پہنچے۔

ہرقل کا دربار

یہ وہ زمانہ ہے جب ہرقلِ روم ایران کو شکست دے کر اس صلیبِ مقدس کو واپس لانے میں کامیاب ہو گیا۔ جسے ایرانی کسریٰ بیت المقدس کو فتح کرنے کے بعد اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ہرقل نے نذر مانی تھی کہ اگر میں مقدس صلیب کو دوبارہ حاصل کر سکا تو اسے پاپیادہ اٹھا کر بیت المقدس میں نصب کر دوں گا۔ جب ہرقل صلیب کو لے کر حمص پہنچا تو یہاں رسولِ کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ایک مکتوبِ گرامی سے ملا۔ لیکن اس واقعہ میں بھی دو قسم کی روایات ہیں۔

الف۔ دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ نے اپنے دوسرے صحابہ کے ساتھ مل کر ہرقل کے دربار میں حاضر ہو کر خود ہرقل کو یہ مکتوب گرامی دیا؟

ب۔ یا اس کے عامل مقیم بصرہ کے توسط سے بادشاہ تک پہنچایا گیا؟

دونوں میں سے کوئی صورت سہی بہرحال ہرقل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خط کو بھرے دربار میں پڑھوایا۔ ترجمہ سنا اس کے چہرہ پر کسی قسم کی کوئی تبدیلی یا تاثر نہیں ہوا۔ نہ ہی اس نے ردِ عمل کے طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ کرنے کا منصوبہ اس کے دماغ میں آیا۔ بلکہ اس نے ایسے مؤدبانہ طریقہ سے جواب لکھوایا کہ بعض مؤرخین کو اس کے مسلمان ہونے کی غلط فہمی ہو گئی ہے۔

حارث غسانی

حارث غسانی گورنر روم کا ایلچی حمص میں ہی ہرقل کے پاس پہنچا جس میں حارث نے رسول اللہ ﷺ کے فرمان کی اطلاع اور آپ ﷺ کے دعویٰ رسالت کی بناء پر آنحضرت ﷺ پر فوجی یلغار کرنے کی اجازت طلب کی۔ جس کے جواب میں ہرقل نے کہا۔ بیت المقدس کی زیارت کے موقع پر وہ بھی حاضر ہو تاکہ مقدس صلیب کے احترام میں اضافہ ہو! ہرقل نے اس (جدید) اسلام کے مدعی کے سدّباب پر توجہ دینا ضروری نہ سمجھا۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ چند سال بعد ہی بیت المقدس اور شہنشاہِ روم کی سلطنت پر دینِ اسلام کا پرچم لہرائے گا اور اس کا مقبوضہ شہر دمشق اس کا دار الخلافہ ہو گا۔

قیصر اس وقت سے بھی بے خبر تھا کہ مجاہدین اسلام اور ہرقل کی جنگوں کا انجام ترک مسلمانوں کو قسطنطنیہ پر قابض کر دے گا۔ جہاں کے سب سے بڑے کلیسا کو مسجد کا مرتبہ نصیب ہو گا جس کے محراب پر اسی نبی الآخر کا اسمِ گرامی منقش ہو گا اور چند صدیاں گزرنے کے بعد یہی مسجد رومی فنِ نقش و نگار کا نمونہ قرار پائے گی۔

کسریٰ شاہ ایران

جب کسریٰ کے سامنے نبی صلاح و فلاح محمد ﷺ کا فرمان پڑھا گیا اور اسے اسلام لانے کی دعوت دی گئی تو وہ غرور و تکبر میں آگ بگولا ہو گیا۔ (صد حیف تف بر کسریٰ) نامۂ رسول ﷺ کو پھاڑ دیا۔ اور اسی وقت اپنے یمن کے نائب باذان کی طرف حکم بھیجا کہ آنحضرت ﷺ کا سر مبارک اس کے حضور پیش کیا جائے۔ غالباً اسے اپنی اس شکست کے داغ کو مٹانا مقصود تھا۔ جو اسے ابھی ابھی ہرقل روم کے مقابلہ میں ہوئی تھی۔ جب قاصد نبوت رضی اللہ عنہ نے واپس آ کر کسریٰ کی نابکار حرکت کا ذکر کیا تو فرمایا اسی طرح اللہ عزوجل اس کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

ادھر باذان نے اپنے بادشاہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دو آدمی مدینہ بھیج دیئے۔ ادھر محلِ کسریٰ میں اسی کے بیٹے شیرویہ نے اپنے باپ کو قتل کر کے عنانِ حکومت خود سنبھال لی۔ باذان کے سپاہی جونہی نبیِ رحمت ﷺ کے سامنے آئے تو آپ نے ان کو ان کے بادشاہ کسریٰ کے قتل ہو جانے کی اطلاع دی جو انہیں وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے فراہم کی تھی اور ساتھ ہی ان کو یہ بھی پیغام دیا کہ واپس جا کر باذان کو دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دو۔

والئ یمن

ہرقل روم کے مقابلہ میں ایران کی شکست اور اس کا زوال یمن کے حکمرانوں کی نگاہ میں

تھا۔ انہیں قریش کے مقابلہ میں رسول اللہ ﷺ کی فتح اور یہود کی شکست و ریخت کا علم بھی تھا۔ جب اس کے قاصدوں نے مدینہ منورہ سے واپس جا کر باذان کو اسلام کی دعوت دی جو اس خوش نصیب نیک فطرت نے قبول کر لی۔ وہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا اور خود کو ایران کی بجائے رسول اللہ ﷺ کا گورنر تصور کر لیا۔

قارئین۔ آپ کا کیا خیال ہے اس صورتحال میں رسول اللہ ﷺ باذان سے خراج' عشر' یا زکوٰۃ کا مطالبہ کر سکتے تھے جبکہ یمن اور مدینہ کے درمیان ابھی مکہ موجود تھا؟ البتہ مکہ معظمہ کے درمیان میں حائل ہونے کا زمانہ باذان کے لئے اس لئے بہت بڑی غنیمت تھا کہ وہ اس عرصہ میں کسریٰ کی غلامی سے مکمل طور پہ آزاد ہو کر عرب کی جدید سطوت دین اسلام میں شامل ہو جاتا۔ ظاہر ہے اس عرصہ میں نہ تو اسے ایران کو خراج دینا پڑے گا اور نہ ہی دین اسلام ہی کو کچھ دینا پڑے گا! افسوس اس نے غلط سوچا اگر وہ اسی وقت اپنے آپ کو رسول اللہ ﷺ کے حوالے کر دیتا صرف مسلمان ہونے کو کافی نہ سمجھتا۔ بلکہ اسلام کے صحیح مفہوم پر عمل کرتے ہوئے مکمل طور پر آپ ﷺ کی خدمات کے ساتھ رہنا پسند کر لیتا تو جزیرہ عرب کو دو سال بعد حاصل ہونے والا عروج اسی وقت عالمِ وجود میں آ جاتا جیسا کہ دو سال بعد ہی واضح ہو گیا۔

مقوقس شہنشاہِ مصر

جب قبطیوں کے شہنشاہ مقوقس کے دربار میں رسول اللہ ﷺ کا قاصد پہنچا تو بادشاہ مقوقس قاصد حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ سے انتہائی بہترین طریقہ سے پیش آیا۔ بادشاہ نے فرمانِ رسول ﷺ کا مکمل طور پر ادب ملحوظ رکھا اور جواب میں لکھا۔

میرے علم کے مطابق بھی ایک نبی آنے والا ہے مگر اس کا ظہور شام میں ہو گا عرب میں نہیں۔ بہرحال اس نے قاصد کو انتہائی عزت و احترام کے ساتھ تحفے تحائف دے کر واپس بھیجا۔

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مندرجہ ذیل تحائف پیش کیے۔

دو نوجوان بی بیاں' سفید رنگ کا خچر' بار برداری کے لئے ایک گدھا اور کئی تحائف جن میں مصر کی نایاب مصنوعات بھی تھیں۔

نجاشی شاہ حبشہ

حبشہ کے شہنشاہ کو مسلمانوں سے جیسی عقیدت تھی وہ سب کو معلوم ہے۔ اس کا تقاضہ یہی تھا کہ وہ مکتوبِ رسول ﷺ کا جواب انتہائی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے دے' بعض روایات میں اس کے مسلمان ہو جانے کا تذکرہ بھی ہے مگر بعض مستشرقین نجاشی کے اسلام سے

اس خط کی بناء پر انکار کرتے ہیں۔ جو رسول اللہ ﷺ نے تبلیغی سلسلہ کے علاوہ نجاشی کو اس وقت ارسال کیا تھا۔ جب حبشہ میں مقیم مہاجرین کو مدینہ لوٹا دینے کے لئے لکھا تھا اور جس خط پر بادشاہ نے ابن جعفر بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں انھیں کشتیوں پر سوار کر دیا تھا۔ جب بی بی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا مدینہ میں تشریف لائیں اور حرم نبوی کی حیثیت سے امہات المومنین رضی اللہ عنہ کے زمرہ میں شامل ہوئیں۔ اس نکاح کے بارہ میں مستشرقین کی دو رائے ہیں۔

(الف) سرغنہ قریش ابو سفیان (ام حبیبہ رضی اللہ عنہ) کے والد سے قرابت کی وجہ سے اہلِ مکہ کو قرارداد حدیبیہ قائم رکھنے کے لئے رسول اللہ ﷺ نے عقد فرمایا۔

(ب) ابو سفیان کے بت پرست ہونے کے غصہ میں ان کی صاحب زادی سے نکاح کر کے اسے رنجیدہ کرنا مقصود تھا (مستشرقین کی یہ سوچ اپنی فطرت کے مطابق ہے مگر رسول اللہ ﷺ کی سوچ کو مستشرقین تو ایک طرف دنیا کا کوئی انسان نہیں پا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ کی سوچ دوسروں کو رنجیدہ کرنے والی نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی سوچ صلح حدیبیہ کے قیام کی لاج رکھنے والی نہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ کی سوچ صرف اللہ تعالیٰ کے وحی کے تابع تھی۔ (مترجم)

امیرِ یمن اور عمان کے نام فرمان

1-2- امیر یمن اور عمان دونوں نے فرمانِ نبوی ﷺ کے جواب میں انتہائی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔

3- امیر بحرین مسلمان ہو گئے ان کا نام مندر بن ساوی رضی اللہ عنہ ہے۔

4- امیر یمامہ نے اپنی بادشاہت کو تسلیم کرنے کی شرط کے ساتھ اسلام قبول کرنے کا وعدہ کیا۔ جس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے اس کے اس لالچ پر لعنت فرمائی اور وہ ایک سال بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

سلاطین اور ان کا نرم رویہ

جن روسا' امراء اور حکمرانوں کو تبلیغی خطوط بھیجے گئے ان میں سے زیادہ تعداد نے جواب میں نرمی' ادب اور احسن طریقہ اختیار کیا اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔ کہ ان سے نہ تو کسی نے قاصد کو قتل کیا؟ نہ قید کیا؟ سوائے دو ایک کے جنھوں نے جواب کے لہجہ میں سخت انداز اختیار کیا۔ مثلاً کسریٰ اور حارث غسانی' رہا یہ کہ ان بادشاہوں نے دین اسلام کی تبلیغ سے برافروختہ ہو کر صاحبِ دعوت (حضرت محمد رضی اللہ عنہ) کے خلاف جدوجہد کیوں نہ کی؟ چاہیے تو یہ تھا کہ تمام بادشاہ متحد ہو کر رسول اللہ ﷺ کو مٹانے کا تہیہ کر لیتے۔

اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جس طرح ہمارے اس زمانہ میں مادیت کو اولیت حاصل ہے اور اس کے مقابلہ میں روحانیت سے تعلق نظر نہ آنے والے نقطہ کی حد تک پہنچ چکا ہے۔ اسی طرح اس دور میں بھی زندگی عیش و عشرت کا دوسرا نام تھا۔ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست' کے مترادف تھا۔

مختلف اقوام کی باہم جنگوں کا مقصد روحانی نہیں بلکہ اپنی برتری قائم رکھنا اور مادی منافع حاصل کرنا ہوتا تھا تاکہ ہوس رانی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے نہ پائے۔

ظاہر ہے کہ ایسے پر آشوب عہد میں جہاں عقیدہ اور ایمان دونوں روحانیت کے مقابلہ میں اس طرح نفس کی بھینٹ چڑھا دیئے جائیں کہ بظاہر تو دین کے مطابق اپنے اعمال کا دکھاوا ہو۔ طور طریقوں پر بھی دین ہی کا لیبل چسپاں ہو مگر درحقیقت یقین و ایمان سے قلب و نظر محروم ہوں اور بروقت نگاہوں کے سامنے یہی مقصد ہو کہ یہ لوگ جس صاحب کے اثر و رسوخ کے غلبہ میں جی رہے ہیں وہ ان کے کھانے پینے کے ساتھ ان کی عیش پرستی میں بھی ان کے معاون ہوں اور ان کی عزت و دولت بھی ان ہی لوگوں کی مرہون منّت ہو گویا ان کے تمام اعمال و شعار کی وابستگی صرف اپنے مادی منافع سے ہو۔ جب ان لوگوں کو یہ منافع دین میں حاصل ہوتے نظر نہیں آتا تو شعارِ دین سے ذرا سی بھی وابستگی گراں گزرتی ہے۔ ان کی محبت جواب دے جاتی ہے' یہی وجہ ہے جب ان لوگوں نے قوتِ ایمان اور اس کے اثر و رسوخ کے واقعات سنے تو دھک سے رہ گئے۔ انہیں معلوم ہوا کہ دینِ اسلام میں ایک اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت لازم ہے۔ دین اسلام میں انسانوں کو ایک دوسرے پر مساوات کا درجہ حاصل ہے۔ اس کے ماننے والے ایک ہی اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور صرف اسی سے امداد طلب کرتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالٰی کو کسی دوسرے کی شرکت کے بغیر نفع و نقصان دینے کی قوت حاصل ہے۔ اس کی رضا و کرم کی ایک کرن (شعاع) تمام دنیا کے بادشاہوں کی آتشِ غضب کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ اس مالک الملک کا خوف دلوں کو ہلا دیتا ہے۔ چاہے وہ دل دنیا کے تمام بادشاہوں کے عطا کردہ مال و متاع اور ان کی خوشنودی حاصل کئے ہوئے ہی کیوں نہ ہوں صرف وہی شخص اس ذاتِ مطلق سے مغفرت کا امیدوار ہے جو اس کے حضور اپنی لغزشوں سے توبہ کر کے ایمان اور خالص عملِ صالح کی ضمانت پیش کر سکے! دین اسلام کی دعوت کے بارہ میں لوگوں نے یہ بھی سنا کہ صاحبِ دعوت کے خلاف ظلم' جبر اور عذاب دہی کی سرتوڑ کوششیں بھی اس کے دین کو ماننے والی تعداد کے اضافہ کو روک نہیں سکیں اور دن بدن ان کا وقار اور اقتدار بڑھتا جاتا ہے۔ ہر قسم کی مادی قوتیں اس کو روکنے کی کوششوں میں مصروف ان کے خلاف ہر وقت متحرک ہیں۔ مگر پھر بھی وہ ذاتِ اقدس ﷺ اپنے دشمنوں پر غالب ہے۔ انہیں یہ اطلاع بھی پہنچ گئی تھی کہ صاحب دعوت بچپن میں ہی یتیم ہو گئے تھے ﷺ اور بلوغت کے زمانے میں بے

زر و بے مال تھے۔ انہوں نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ اس پر اس ذاتِ والا صفات اعلیٰ اخلاق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا یہ عالم ہے کہ اس کے اپنے وطن مکہ کی بات تو ایک طرف تمام عرب میں ان کے سوا کوئی ایسا بادشاہ نہیں گزرا جو اس قدر طاقتور ہو جس کے سامنے سارے ملک کی گردنیں نہیں دل جھک رہے ہوں دنیا اس کی آواز پر کان لگائے کھڑی ہے۔ دل اس کی محبت میں ایسے لبریز جیسے وہ اپنے وقت کا مسیحا ہو اور اس کے بغیر زندہ رہنا محال ہے۔

کچھ لوگ جو ابھی تک ان حقیقتوں کے علم سے دور تھے اگر ان کی راہ میں خوف اور شبہ کی باڑ نہ ہوتی۔ تو بھی اسی چشمۂ جاوداں سے حیاتِ نو کے گھونٹ پینے کے لئے لپک کر آتے' جوق در جوق آتے انہی وجوہات کی بناء پر بادشاہوں نے آپ ﷺ کے جوابات میں نرمی' سلیقہ اور تہذیب و آداب کو ملحوظِ خاطر رکھا اور مسلمانوں کے ایمان و اطمینان میں اور زیادہ اضافہ ہو گیا۔

عمرۃ القضاء

وہ مبارک ترین ساعتیں بھی نبی اکرم ﷺ کی قدم بوس ہو گئیں جب رسول اللہ ﷺ خیبر سے مدینہ تشریف لے آئے۔ حضرت جعفر بن طالب رضی اللہ عنہ مہاجرین کو لے کر حبشہ سے مدینہ منورہ وارد ہو گئے اور وہ تمام وفود جو مختلف بادشاہوں کو دینِ اسلام کی دعوت کے سلسلہ میں بھیجے تھے سب کے سب بارگاہِ نبوت میں حاضر ہو گئے۔ برسوں کے بچھڑے ہوئے گلے ملے۔

مسلمان اب انتہائی بے چینی سے صلح حدیبیہ میں تحریر کردہ اس مدت کی گھڑیاں گننے لگے جس کے ختم ہونے پر عمرۃ القضاء ادا کرنے کی سعادت نصیب ہو اور جو وعدہ وحی کی زبانی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا وہ پورا ہو۔

لقد صدق اللہ رسولہ الرؤیا بالحق لتدخلن المسجد الحرام ان شاء اللہ آمنین محلقین رؤسکم ومقصرین لا تخافون (27:48)

بیشک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا اور صحیح خواب دکھایا کہ تم اللہ نے چاہا تو مسجد حرام میں اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتروا کر امن و ایمان سے داخل ہو گے اور کسی طرح کا خوف نہ کرو گے۔

کتنے خوش نصیب وہ لمحے تھے جب نبی اکرم ﷺ نے جعفر بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں مہاجرین کے ساتھ وارد ہوتے ہوئے فرمائے تھا۔ میں نہیں بتا سکتا کہ مجھے خیبر فتح ہونے کی خوشی زیادہ ہوتی یا جعفر بن ابو طالب کے مہاجرین کے ساتھ خیریت سے یہاں پہنچنے کی خوشی۔

واقعۂ سحر

کہا جاتا ہے کہ یہودیوں نے اس عرصہ میں لبید نامی ساحر کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ پر جادو کروا دیا تھا جس کا اثر آپ پر اتنا تھا کہ وہ کام جو نبی اکرم ﷺ نے ابھی کیا تھا تھوڑی دیر بعد ان کو گمان گزرتا جیسے اسے نہیں کیا۔ لیکن واقعۂ سحر کی روایات میں اس قدر الجھن و اضطراب ہے کہ جو لوگ نفسِ واقعہ کے بالکل ہی منکر ہیں ان کو مانے بغیر بھی چارہ نہیں۔ یعنی جو یہ کہتے ہیں کہ ان پر سحر نہیں ہوا۔ ان کے دلائل بھی اتنے قوی ہیں کہ ان کو ماننا ہی پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ اب وہ زمانہ ہے جب مسلمان انتہائی اطمینان و سکون کے ساتھ مدینہ منورہ میں احکاماتِ نبوت کی تعمیل میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور برکتوں سے فیض یاب ہو رہے ہیں۔ کسی بڑی لڑائی کا ان کو کوئی گمان بھی نہیں۔ سوائے اس کے کہ چند تخریب کار دشمنِ اسلام ٹولوں کی سرکوبی کے لئے کبھی کبھی مجاہدین کے دستے ارسال کئے جاتے۔ صلح حدیبیہ کے بعد سال کی مدت ختم ہوئی۔ ذیقعدہ لوٹ کر آیا تو رسول اللہ ﷺ اپنے ہمراہ دو ہزار مسلمانوں کو لے کر عمرۃ القضاء کے لئے مکہ معظمہ روانہ ہوئے تاکہ حدیبیہ کی قرارداد کے مطابق زیارت و طواف سے اپنی روحوں کو خورسند و شاداں کر سکیں اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں برکتیں اور رحمتیں سمیٹ سکیں۔
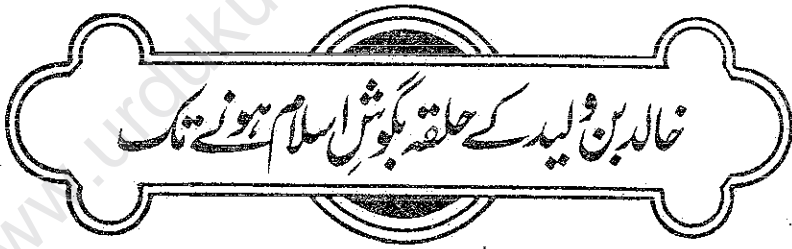
خالد بن ولید کے حلقہ بگوش اسلام ہونے تک

خالد بن ولید کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے تک

عمرۃ القضاء اور قراردادِ حدیبیہ

صلح حدیبیہ میں طے شدہ سال کی مدت گزر گئی۔ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو عمرۃ القضاء کی تیاری کا حکم دے دیا۔ جس کی ادائیگی سے پچھلے سال حدیبیہ میں روک دیا گیا تھا۔

اس اعلان سے مسلمانوں کی خوشی کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اعلان سنتے ہی لبیک کی آوازیں اتنی بلند ہوئیں کہ آسمان کے فرشتوں نے سنیں۔ ان میں ایسے مہاجرین بھی تھے جو کئی سال سے وطن کو دیکھنے سے ترس گئے تھے۔ مسلمانوں کے انتہائے شوق کا ہی نتیجہ ہے کہ پچھلے سال صرف 14 سو اور اب دو ہزار مسلمان پابہ رکابِ رسول ﷺ ہیں۔

پابندیٔ شرط کو ملحوظِ خاطر رکھا گیا۔ کسی مسلمان نے تلوار کے سوا کوئی اسلحہ اپنے ساتھ نہیں لیا۔ اگرچہ رسول اللہ ﷺ اہل مکہ کی بے وفائی بھولے نہ تھے۔ اس لئے بربنائے احتیاط ایک دستہ محمد بن مسلمہ کی سپہ سالاری میں پہلے ہی روانہ کر دیا مگر ان کو تاکید فرما دی حرمِ مکہ میں داخل نہ ہوں بلکہ (مقام) مرا الظہران متصل حرم پر پڑاؤ ڈالیں۔

مدینہ سے روانگی کا نظارہ

مدینہ سے روانہ ہوتے وقت ساٹھ ہدی (قربانی) کے جانور تھے۔ سید المرسلین اپنی ناقہ قصویٰ پر سوار آگے آگے تھے۔ زائرین کے دل میں مکہ معظمہ کی زیارت اور بیت اللہ کا طواف کرنے کی مسرتیں ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح تھیں۔ مہاجرین اس لئے بھی بے تاب کہ جس بستی میں انہوں نے آنکھیں کھولیں۔ اسے بھی دیکھنا نصیب ہو گا جس شہر کی دیواروں

کے سایہ میں جوان ہوئے ان کو چھوتے ہوئے شہر کی گلیوں میں گھومیں گے پھریں گے؟ جن دوستوں کے ساتھ زندگی کی لمبی عمر گزری انہیں دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو گی۔ وطن کی خوشگوار ہوا سے مشامِ جاں معطر ہو گا۔ اس مبارک بستی کی خاک سرمۂ چشم بنے گی جہاں سے محمد ﷺ کا ظہور ہوا اور جس سرزمین میں اللہ تعالیٰ کی پہلی وحی کا نزول ہوا۔ دو ہزار مسلمانوں کا قافلہ اسی جوش و خروش کے ساتھ مصروفِ سفر تھا ان میں سے ہر ایک کے دل خوشی سے بلیوں اچھل رہے تھے۔ تصورات میں سب یہ طے کر رہے تھے کہ جیسے ہی سواری سے اتر کر مکہ معظمہ میں داخل ہوں گے' دوستوں سے مل کر زندگی کے اس دور کی یاد تازہ کریں گے جس کی آخری گھڑیوں میں قضاو قدر نے انہیں گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ ان دوستوں کا بھی ذکر ہو گا جنہیں ہجرت کرتے وقت ہم یہاں زندہ چھوڑ گئے تھے اور اس کے بعد وہ وفات پا گئے۔ عزیزوں کے ساتھ بیٹھ کر اپنے اس مال و اسباب کی لوٹ اور غارت کی داستان بھی دریافت کی جائے گی جس سے ہاتھ دھو کر ہم اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کر گئے تھے اور یہ تصور بھی ان کے دماغ میں کروٹیں لے رہا تھا کہ جس ایمان نے ان کی زندگی میں یہ انقلاب پیدا کیا ہے وہ انہیں کس انداز سے اللہ کے گھر واپس لے آیا ہے۔ وہ شہر جو بنی نوعِ آدم کے لئے امن و سلامتی کا ضامن ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد برحق ہے۔

واذجعلنا البیت مثابۃً للناس وامنا" (125:2)

اے ہمارے رسول (ﷺ) بنی اسرائیل کو یہ بات بھی یاد دلاؤ جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کا مرجع اور امن کی جگہ بنا دیا۔

ابھی تک وہ منظر بھی ان کی نظر سے غائب نہیں ہوا تھا جب انہیں اس مقدس فرض کو ادا کرنے سے ایک سال نہیں دو سال نہیں کئی سال تک زبردستی روکا گیا۔ آج وہ کس قدر خوش تھے کہ تھوڑی دیر بعد وہ اس متبرک سرزمین میں امن و سلامتی کے ساتھ داخل ہوں گے۔

انشاء اللہ امنین محلقین رؤسکم ومقصرین لا تخافون (27:48)

اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو مسجد حرام میں اپنے سر منڈوا کر اور اپنے بال کتروا کر امن و امان سے داخل ہو گے اور کسی طرح کا خوف نہ کرو گے۔

مکہ سے قریش کی روپوشی

مسلمان جب مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تو قریش اس سے پہلے ہی روپوش ہو گئے۔ کسی نے قریبی پہاڑوں میں خیمے گاڑ لئے اور کسی نے درختوں کی آڑ لے لی۔ بعض کوہِ ابوقبیس پر چڑھ گئے کسی نے حراء میں پڑاؤ ڈال دیا۔ غرض تمام عورتیں اور مرد ندامت سے منہ چھپانے

کے لئے یا رعبِ رسالت ﷺ سے مرعوب ہو کر گردونواح کی پہاڑیوں میں دبک گئے۔
لیکن اس کے ساتھ ہی اہلِ مکہ کا ہر چور دل مکہ معظمہ میں داخل ہونے والے ہر مسلمان کو بڑے غور سے پہچان اور دیکھ رہا تھا کہ جن لوگوں کو دھتکار کر ہم نے مکہ سے نکالا تھا آج وہ کس شان سے مکہ معظمہ میں داخل ہو رہے ہیں۔

مکہ معظمہ میں داخلہ

رحمت للعالمین محمد ﷺ صحابہ کرام کے ساتھ مکہ کے شمال کی طرف سے داخل ہوئے۔ ان کے ناقہ کی مہار حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی، وہ آگے آگے چل رہے تھے۔ کچھ پیدل اور کچھ سوار، کچھ دائیں کچھ بائیں، کچھ پیچھے تمام صحابہ کرام حلقہ بنائے ساتھ تھے۔ کعبہ پہ نگاہ پڑی تو سب نے بیک زبان پکارا۔

"لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک لا شریک لک لبیک اللھم لبیک۔"

ان کے دل اور روح دونوں رب ذوالجلال کی طرف متوجہ، فرط عقیدت اور جذبہ محبت سے اللہ تعالیٰ کے اس رسول ﷺ کے اردگرد حلقہ بنائے ہوئے تھے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے تمام نوعِ انسان کو ہدایت دینے اور دینِ حق کے احکامات پہنچانے کے لئے اس دنیا میں بھیجا ہے تاکہ اس کے دین کو تمام ادیانِ سابقہ پہ غالب رکھے۔

تاریخ عالم میں اس منظر جیسی مثال کہیں نہیں مل سکتی۔ اس نظارے نے ان پتھر دل مشرکوں کے دل بھی موم کر دیئے۔ انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ جن کا رواں رواں بتوں کی بندگی میں ڈوبا ہوا تھا ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ لبیک اللھم لبیک حاضر حاضر کی گونج کانوں کے پردوں سے گزرتی ہوئی دل کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی اور مشرک حیرت و استعجاب (تعجب) کے طوفانوں میں غوطے کھا رہے تھے۔

بیت اللہ شریف میں ورُودِ مسعود

قصواء بیت اللہ شریف کے دروازہ پہ آ پہنچی۔ رسول اللہ ﷺ چوکھٹ پر تشریف لائے تو احرام کی چادر کا ایک پلہ دائیں بغل سے نکال کر بائیں کندھے پر رکھ لیا اور یہ دعا پڑھی۔

اللھم ارحم امرا اراھم الیوم من نفسہ قوۃ
یا اللہ اس شخص پر رحم فرمائیو جو دشمن کے سامنے وقار سے آئے۔

عمرہ کے اعمال

رسول اللہ ﷺ نے رکنِ یمانی کو مس فرمانے کے بعد حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ پھر کعبہ کے سات طواف کئے جن میں پہلے تین طواف میں تیز رفتار رہے اور اس کے بعد کے طواف معمولی رفتار کے ساتھ مکمل فرمائے۔

ابتدا میں دو ہزار صحابہ کرام آنحضرت ﷺ کے قدم بہ قدم اعمالِ عمرہ ادا فرماتے رہے۔ قریش کوہ ابوقبیس پر کھڑے ہوئے جھانک رہے تھے اور اس منظر نے انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے تھوڑی دیر پہلے آپس میں یہ سرگوشی کی تھی کہ جناب محمد ﷺ اور ان کے اصحاب تھکے ماندے ہیں۔ لیکن جب طواف میں ان کی پھرتی (تیز رفتاری) دیکھی تو ان کے دل سے پہلا خیال نکل گیا۔

ایک تادیب

مکہ میں داخل ہونے کے موقع پر ناقۂ نبی ﷺ کے ساربان عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے رزمیہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے۔ جس سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں روکا اور جب رسول اللہ ﷺ نے سنا تو فرمایا۔

مہلا" یا ابن رواحہ وقل لا الہ الا اللہ وحدہ نصر عبدہ واعز جندہ وخذل الاحزاب وحدہ

اے ابنِ رواحہ ان اشعار کی جگہ یہ کہو۔ ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے ہی اپنے بندے (محمد ﷺ) کی مدد فرمائی اس کے لشکر کو عزت سے سرفراز فرمایا اور غزوۂ خندق میں عرب فوجوں کے ہجوم کو شرمسار کر کے ناکام بنا دیا۔

اب سیدنا ابنِ رواحہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ باقی سب صحابہ نے بھی یہی کلمات دہرائے۔ ان کی آواز سے صحرا اور پہاڑ گونج اٹھے اور پہاڑوں میں دبکے ہوئے مشرکوں کے دل کانپ گئے۔

تکمیل عمرہ

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام طوافِ کعبہ سے فارغ ہو کر کوہ صفا پر تشریف لائے۔ کوہ صفا اور مروہ کے درمیان حسبِ آئین سات مرتبہ سعی فرمائی۔ مروہ کے قریب قربانی ذبح کر کے سر کے بال منڈوائے اور عمرہ سے فراغ حاصل فرمایا۔

کعبہ کی چھت پر اذان

دوسرے روز بیت اللہ میں تشریف لائے کعبہ میں بدستور بت موجود تھے۔ بایں ہمہ حضرت بلال نے کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذان دی اور رسول اللہ ﷺ نے اپنے دو ہزار صحابہ

سمیت ظہر کی نماز ادا کی۔ آج یہ وہی کعبہ ہے جس میں انہیں سات برس تک عبادت کرنے سے روک دیا گیا تھا۔ قرارداد حدیبیہ کے مطابق تین روز تک مکہ معظمہ میں قیام فرمایا۔ قریش روپوش ہو کر پہاڑوں میں دبکے رہے۔ مسلمان اپنی مرضی سے گلیوں محلوں میں چلتے پھرتے اور کوئی ان کے لئے رکاوٹ نہ بنتا۔ مہاجرین اپنے چھوڑے ہوئے گھروں کو دکھانے کے لئے انصار کو بھی ساتھ لے جاتے اور وہ بھی ان کے ساتھ ایسے ہی گھومتے جیسے وہ مکہ معظمہ ہی کے رہنے والے ہیں۔

مسلمانوں میں سے ہر ایک کی بات' ہر ایک کا عمل اسلامی اخلاقِ سیرت کا نمونہ تھا۔ سب قیامِ صلوٰۃ کا فریضہ ادا کرتے ہیں جس سے نفس کا غرور مر رہا ہے۔ ان میں سے ہر طاقتور اپنے سے ضعیف کا سہارا بنا ہوا ہے۔ دولت مند ضرورت مند کی مدد کر رہا ہے۔ رسول اللہ ﷺ شفیق باپ کی طرح ان کے درمیان آ جا رہے ہیں۔ کسی سے مسکرا کر بات ہو رہی ہے۔ کس کے ساتھ مزاح فرمایا جا رہا ہے اور یہ مزاح بھی حقیقت کے خلاف نہیں۔ قریش اپنے دوسرے ملکی یارانِ مشرب کے ساتھ پہاڑوں کی چوٹیوں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہے ہیں تاریخِ عالم کا یہ حیرت ناک منظر۔

اہلِ مکہ مسلمانوں کے طور طریقے دیکھ رہے ہیں کہ نہ شراب پی رہے ہیں نہ برائی کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ نہ خورد و نوش کی کوئی چیز انہیں فریب میں مبتلا کر رہی ہے بلکہ اللہ عزوجل اور رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل ان کا شعار و کردار ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔

جن مناظر میں مخالفین کی دلچسپی کا ایسا سامان ہو۔ ایسے مناظر کمالِ انسانیت کا حسین مرقع ہونے کی وجہ سے دیکھنے والوں کے دل میں کیا اثر پیدا نہیں کر سکتے؟

سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا

سیدہ میمونہ رضی اللہ عنہا تو مسلمانوں کے اس کردار کو دیکھ کر ایسی متاثر ہوئیں کہ رسول اللہ ﷺ سے عقد کا تہیہ کر لیا۔ یہ بی بی ام الفضل زوجہ سیدنا عباس بن عبدالمطلب کی ہمشیرہ اور خالد بن ولید کی خالہ تھیں۔ ام الفضل نے وکالت حضرت عباس ہی کے سپرد فرمائی جسے رسولِ رحمت ﷺ نے قبول فرما کر بعوض چار سو درہم بعوض حق مہر عقد فرمالیا۔

اب قراردادِ صلح حدیبیہ کے مطابق تین دن ختم ہو چکے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے قریش کو قریب لانے کے لئے دعوتِ طعام کرنا چاہی۔ لیکن جب قریش کے وکیل سہیل بن عمرو اور حویطب بن عبدالعزیٰ یہ پیغام لے کر آئے۔ آپ کی میعاد ختم ہو چکی ہے اب شہر خالی کر

دیجئے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ میں آپ لوگوں کی امید شمولیت پر دعوت ولیمہ کرنا چاہتا ہوں؟

سہیل: ہمارے شہر سے نکل جایئے، ہمیں یہ دعوت منظور نہیں۔

عمرہ ادا کرنے یا یہاں تین دن قیام کے درمیان مسلمانوں کی گفتار اور کردار نے اہل مکہ کے دلوں میں جو اچھا اثر پیدا کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ اس میں اضافہ کرنے کے لئے انہیں اپنی دعوت میں شریکِ طعام فرمانا چاہتے تھے۔

مکہ سے مراجعت (واپسی)

رسول اللہ ﷺ نے احترامِ معاہدہ کی غرض سے وکلائے قریش کے اس مطالبہ پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ مسلمانوں کو فوراً" واپسی کا حکم فرمایا۔ جس شان سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے تھے اسی شان سے مکہ معظمہ سے واپس ہوئے۔

آگے آگے قصواء پہ سوار رسول اللہ ﷺ ہیں اور ان کے پیچھے پیچھے قدم بہ قدم دو ہزار مسلمانوں کا جم غفیر ہے۔ اپنے غلام ابو رافع سے فرمایا کہ ام المومنین میمونہ کو ہمراہ لائیں۔ پہلی شب سرف کے مقام میں گزاری۔ یہ مقام مکہ معظمہ سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ ازواجِ مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہما میں حضرت میمونہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا آخری حرم ہیں جو رسولِ اللہ ﷺ کی رحلت سے 50 سال بعد تک زندہ رہیں اور وفات سے پہلے مقام سرف پر ہی (مقام مذکور) ہی اپنی تدفین کی وصیت فرمائی۔

ورودِ مدینہ

مسلمان مکہ سے مدینہ منورہ آپہنچے اور امن و سلامتی کے ساتھ رہنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ کو ان اثرات کے ردِ عمل کا پورا یقین تھا جو عمرۃ القضاء میں قریش اور اہلِ مکہ کے دلوں میں مسلمانوں کی گفتار اور کردار نے پیدا کئے تھے اور اس میں بھی آپ کو کوئی شبہ نہیں تھا کہ ان اثرات کے نتائج بہت ہی جلد ظاہر ہونے والے ہیں۔

خالد بن ولید حلقہ بگوشِ اسلام

عمرۃ القضاء کے تاثرات کا نتیجہ رسول اللہ ﷺ کے مکہ مکرمہ سے واپس آنے کے فوراً" ہی بعد اس صورت میں رونما ہوا کہ قریش کا وہ جانباز خالد بن ولید جس نے غزوہ احد میں لڑائی کا نقشہ بدل دیا تھا آج اس نے قریش کے سامنے اعلان کر دیا۔

لقد استبان لکل ذی عقل ان محمداً" لیس بساحر ولا شاعر وان کلامہ کلام رب

العالمین فحق علی کل ذی لب ان یتبعه

عقلمندوں پر یہ بات واضح ہو چکی کہ محمد ﷺ نہ ہی جادوگر ہیں نہ شاعر ہیں۔ ان کا کلام رب العالمین ہی کی وحی ہے اور آپ کی اطاعت ہر شخص پر واجب ہے۔ لازم ہے۔

اس مجمع میں عکرمہ (فرزند ابو جہل) بھی موجود تھے۔ انہوں نے خالد کی تردید میں کہا۔

تم نے ستارہ پرستوں کا مذہب اختیار کر لیا ہے اب دونوں کے درمیان گفتگو کا سلسلہ اس طرح چلا۔

خالد۔ نہیں بلکہ میں مسلمان ہو گیا ہوں۔

عکرمہ۔ اللہ کی قسم قریش کو تم سے یہ امید نہیں کہ تم اسلام قبول کر لو گے۔

خالد رضی اللہ عنہ۔ آخر قریش کو میرے مسلمان ہو جانے کی توقع میں کیا چیز مانع ہے؟

عکرمہ۔ محمد ﷺ نے تمہارے والد کو قتل کروایا۔ تمہارے چچا اور عم زاد برادر انہی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ واللہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو نہ اسلام قبول کرتا نہ تمہارے ایسی گفتگو کرتا۔

خالد رضی اللہ عنہ۔ یہ ضد جاہلیت کی عادت ہے۔ مجھ پر حقیقت کا انکشاف ہو چکا ہے اور میں مسلمان ہو گیا ہوں۔

حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے اپنے حلقہ بگوش اسلام ہونے کی اطلاع کے ساتھ کئی گھوڑے بطور ہدیہ ارسال کئے۔

ابو سفیان اور خالد رضی اللہ عنہ

خالد رضی اللہ عنہ کے مسلمان ہونے کی خبر جب ابو سفیان نے سنی تو اس نے انہیں اپنے گھر بلایا اور کہا۔

ابو سفیان! خالد میں عزیٰ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جو کچھ میں نے سنا ہے اگر وہ صحیح ہے تو محمد ﷺ سے پہلے میں تم سے فیصلہ کروں گا۔

خالد رضی اللہ عنہ !۔ اب کسی کو برا لگے یا بھلا۔ ابو سفیان یہ خبر بالکل صحیح ہے کہ میں اللہ کے فضل سے مسلمان ہو چکا ہوں۔

ابو سفیان تلوار لے کر خالد رضی اللہ عنہ پر پل پڑا۔ اتفاق سے عکرمہ بن ابو جہل بھی موجود تھے۔ انہوں نے ابو سفیان کا دامن کھینچتے ہوئے کہا۔ اے ابو سفیان و اللہ جس خطرہ سے تم ڈر رہے ہو۔ اس سے میں بھی ڈر رہا ہوں' خالد ہی کی مانند میں کہتا اور دین اسلام قبول کر لیتا۔

بلکہ ابو سفیان تم ایک خالد کی بات کر رہے ہو مجھے تو یہ ڈر ہے کہ کہیں ایک سال کے اندر اندر

پورے مکہ والے بھی دین اسلام قبول نہ کر لیں۔

عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کلید بردارِ کعبہ عثمان بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قبول اسلام

حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بعد عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عثمان بن طلحہ کلید بردارِ کعبہ حلقہ بگوش اسلام ہو کر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی صف میں شامل ہو گئے۔ ان کے علاوہ بھی اہل مکہ میں سے اور خوش نصیب حلقہ اسلام میں داخل ہوئے جس سے اسلام کی شان و شوکت میں مزید اضافہ ہوا اور اہل مکہ نے خاتم الرسل نبیؐ رحمت و شفقت کے فاتحانہ داخلہ کے لئے دروازے کھول دیئے اور اب کوئی امر راستہ کی دیوار نہ تھا۔

غزوۂ موتہ اور دوسرے غزوات و سرایا

غزوہ موتہ اور دوسرے غزوات و سرایا

فتح مکہ سے پہلے

حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو فتح مکہ (یا زمین کے کسی اور حصہ کو فتح کرنا) مطلوب نہ تھا۔ آپ ﷺ کو یہ یقین بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نصرت شامل حال ہے۔ صلح حدیبیہ کے بعد قریش یا کفار کو بھی کسی طرح جارحیت کا مظاہرہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی اور خود کو پابند وفا اور مستحکم عہد ہونے میں ایسے تھے کہ قولاً یا عملاً دونوں صورتوں میں ان کی قائم کردہ مثالیں پوری انسانی تاریخ میں سرِ فہرست پائندہ و تابندہ ہیں۔

عمرۃ القضاء سے واپسی کو کئی مہینے گزر گئے لیکن ان مہینوں میں کچھ تخریب کاروں کی سرکوبی ضرور عمل میں لائی گئی۔

(1) سریہ بنو سلیم

اس ہولناک المیہ میں رسول اللہ ﷺ نے قبیلہ بنو سلیم کی طرف پچاس مسلمانوں کا وفد تبلیغ کے لئے بھیجا اور اہلِ قبیلہ نے دھوکہ سے انہیں قتل کر دیا۔ ان میں صرف ایک صحابی بچ کر تشریف لائے اور انہوں نے اس المیہ کی تفصیلات بیان فرمائیں۔

(2) سریہ بنو لیث

اس واقعہ کے نتیجہ میں مجاہدین فتح یاب ہو کر کچھ مالِ غنیمت بھی ساتھ لائے۔

(3) سریہ بنو ہرہ

اس تصادم کی وجہ اس قبیلہ کی بد عہدی تھی جس کی انہیں سزا ملی۔

(4) سریہ ذات طلح

اس قبیلہ کی طرف پندرہ مسلمان تبلیغ کے لئے بھیجے گئے قبیلہ والوں نے امیرِ وفد کے سوا سب کو شہید کر دیا۔ قبیلہ کا محلِ وقوع ملکِ شام کی حدود میں ہے۔

شام اور تبلیغ اسلام

صلح حدیبیہ کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ کے جنوب کی طرف سے مطمئن ہو گئے تھے۔ اسی طرح یمن کے گورنر باذان کے مسلمان ہوتے ہی جنوبی سمت اور بے خطر ہو گئی۔ اب رسول اللہ ﷺ نے مدینہ سے شمال کی طرف واقع صوبہ شام کی طرف توجہ فرمائی۔

غزوۂ موتہ

عمرۃ القضاء سے واپسی کے بعد ہی مدینہ منورہ میں چند دن قیام فرمایا تھا کہ دو حادثے پیش آئے۔

(الف) موضع ذات طلح میں جن پندرہ مبلغینِ اسلام کو دعوت دین کے لئے بھیجا گیا' ان میں سے صرف ان کے امیر کعب بن عمیر واپس آئے باقی سب کو انہوں نے شہید کر دیا۔

(ب) اسی اثناء میں نبی اکرم ﷺ نے قیصر روم ہرقل یا اس کے گورنر شرحبیل بن عمرو غسانی کی طرف بصری میں حارث بن عمیر ازدی رضی اللہ عنہ کو دعوت اسلام کیلئے بھیجا۔ گورنر نے انہیں بے رحمی سے قتل کر دیا۔ ان کے سوا رسول اللہ ﷺ کے کسی سفیر کو قتل نہیں کیا گیا۔

ایسی صورت میں نہ تو بصرہ کے گورنر سے قصاص لئے بغیر کوئی چارہ کار تھا اور نہ ہی ذات طلح کے ان مشرکوں سے جنہوں نے مبلغین کو شہید کیا تھا' قصاص لئے بغیر کوئی اور راہ تھی۔

چنانچہ تین ہزار مجاہدین شہداء کا قصاص لینے کے لئے متعین کئے گئے۔ شام کے ایک مقام موتہ پر جنگ ہوئی۔ جہاں کفار کا لشکر ایک روایت میں ایک لاکھ اور دوسری روایت میں دو لاکھ تھا۔

حیرت کی بات ہے کہ جس طرح صلح حدیبیہ عمرۃ القضاء کے بعد فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوئی اسی طرح موتہ کی یہ لڑائی جو غزوۂ تبوک کے نام سے مشہور ہے پورے ملک شام کے فتح ہونے کا مقدمہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ عمر بن الخطاب کے زمانہ میں شام مکمل طور پہ فتح ہو گیا۔

لیکن اس جنگ کی وجہ بصریٰ کے گورنر شرجیل کے ہاتھوں رسول اللہ ﷺ کے مبلغ حارث بن عمیر کا شہید ہونا تھا۔ یا ذات طلح کے مشرکین کے ہاتھوں پندرہ مبلغین اسلام کی شہادت تھی۔ دونوں میں سے کوئی ایک سبب سہی' رسول اللہ ﷺ نے تین ہزار مجاہدین

کا لشکر تیار فرمایا اور ماہ جمادی الاول 8ھ میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لشکر کو الوداع کہتے ہوئے فرمایا۔ زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اگر کام آ جائیں یعنی (شہادت) پا جائیں تو سالاری جعفر طیار بن ابو طالب رضی اللہ عنہ کے سپرد ہو۔ یہ شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کو امیر عسکر مقرر کیا جائے۔ خالد بن ولید بھی اس لشکر میں تھے مگر اپنے اسلام کے ثبوت میں حسنِ کردار ثابت کرنے کے منتظر۔

ہدایات

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امرائے مجاہدین اور مجاہدین دونوں کو ہدایات دیتے ہوئے شہر سے باہر ثنیۃ الوداع تک الوداع فرمانے کے لئے تشریف لائے۔

تمام مجاہدین کو حکم دیا جاتا ہے کہ عورتوں' نابالغ' اور کمسن بچوں اور اندھوں کو قتل نہ کیا جائے۔ نہ کسی راہب کو قتل کیا جائے۔ کسی مکان کو گرایا نہ جائے۔ کسی درخت کو کاٹا نہ جائے۔ روانہ ہونے سے پہلے مجاہدین اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب نے مل کر دعا مانگی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان کلمات کے سایہ میں مجاہدین روانہ ہوئے۔

صبحکم اللہ ودفع عنکم وردکم الینا المسلمین۔

اللہ تعالیٰ تمہاری امداد فرمائیں۔ تمام دکھ تم سے دور رکھے اور صحیح سلامتی کے ساتھ واپس آؤ۔

مجاہدین نے اچانک حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا لیکن شرجیل کو ان کی روانگی کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی۔ اس نے مجاہدین کے مقام معان (شام) تک پہنچنے سے پہلے لشکر جرار کو روانہ کر دیا تھا۔ جس کی اطلاع مجاہدین کو ملی' یہ بھی معلوم ہوا کہ ہرقل نے یونانی اور عرب فوجیں بھی جمع کر کے سیلاب کی طرح ان کا رخ اس طرف موڑ دیا ہے۔ بعض روایات میں ہرقل خود بھی اس جنگ میں شریک ہوا۔ اور اس کے ہمراہ ایک لاکھ رومی سپاہ کے علاوہ بنی لخم' بنی جذام' القین' بھرا اور بلی قبیلوں کے ایک لاکھ سپاہی تھے۔ اور ہرقل نے ماب نامی مقام پر ڈیرہ ڈال دیا۔ ایک اور روایت کے مطابق ہرقل کے بجائے تیودرس نے ان تمام لشکروں کو جمع کیا تھا۔

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ کا خطاب

جب مسلمانوں نے غسان کے مقام پر اپنے مقابلہ میں اتنا زیادہ لشکر دیکھا تو دو دن تک اس کشمکش میں رہے کہ اتنے بڑے لشکر کے سیلاب پر کیسے قابو پایا جائے۔

ایک مجاہد رضی اللہ عنہ نے تجویز پیش کی کہ اصل صورتحال سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلع کیا جائے یا تو وہ کمک بھیجیں یا جو حکم فرمائیں اس پر عمل کیا جائے۔ تمام مجاہدین کو اس تجویز سے اتفاق تھا لیکن عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ جو اپنی شجاعت' جرات اور قوت ایمان میں

انتہائی اعلیٰ مقام کے مالک تھے اپنے فصیح تر انداز میں فرمانے لگے۔ میرے عزیز بھائیو! مجاہدو غازیو! عجیب بات ہے ہم شہادت کے لئے یہاں آ کر تذبذب میں پڑ گئے ہیں۔ ہماری فتح کا انحصار تعداد اور قوت کے کم یا زیادہ ہونے پر نہیں۔ بلکہ اس دین اور ایمان پر منحصر ہے جس دین کو عملاً اختیار کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس دنیا میں ممتاز ترین مقام بخشا۔ اٹھو اور دشمن پر حملہ بول دو۔ فتح نہ ہو گی تو شہادت اس سے کہیں زیادہ نعمتِ عظمیٰ ہے۔

جنگ

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک ایک لفظ مجاہدین کے دلوں میں اترا۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو میں سمو گیا۔ ہر ایک کی قوتِ ایمانی نے اپنے پورے جوش کے ساتھ کہا۔ واللہ ہمیں عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مکمل اتفاق ہے۔ مجاہدین آگے بڑھے تو دیکھا وادی مشارف میں ہرقل کی رومی اور عربی فوجیں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں۔ مجاہدین موضع موتہ کو وادی مشارف سے بہتر سمجھ کر وہیں لوٹ آئے' اس کے بعد جنگ شروع ہوئی۔ تین ہزار کا ایک لاکھ یا دو لاکھ سے مقابلہ!

جنگ اپنے پورے شباب پر آ گئی۔ مگر ایمان کی قوت اور اس کا رعب و جلال ملاحظہ ہو۔

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سپرد فرمایا ہوا علم لے کر کفار کی فوجوں میں کود گئے۔ انہیں یقین تھا کہ موت تو بہرحال آنی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی راہ میں آنے والی موت شہادت ہے جو مومن کی نگاہ میں فتح و کامرانی سے کہیں زیادہ عظیم تر ہے۔ چنانچہ زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا فرضِ منصبی ادا کرتے ہوئے کفار کے تیروں میں گھرے اور شہادت پا گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ

علم اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں جعفر طیار بن ابی طالب کے ہاتھ میں آیا۔ وہ شیرانہ انداز سے علم لئے لشکر کفار میں اپنے دائیں اور بائیں کفار کو واصلِ جہنم کرتے ہوئے ٹھیک درمیان تک پہنچ گئے۔ کفار نے نرغہ میں لے لیا۔ جعفر طیار یہ دیکھ کر اپنے گھوڑے سے اتر پڑے اور پہلے اس کی کونچیں کاٹ دیں اور پھر تلوار سے چومکھی لڑائی شروع کر دی۔ دشمنوں کے سر گاجر مولی کی طرح اڑانے لگے علم ان کے دائیں ہاتھ میں تھا جسے دشمن نے کاٹ کر الگ کر دیا تو جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے بائیں ہاتھ میں لے لیا۔ کافروں نے یہ ہاتھ بھی کاٹ کر الگ کر دیا۔ تب انہوں نے علم اپنے سینے سے چپکا کر اپنی کٹی ہوئی بانہوں کے بچے ہوئے حصہ میں اٹھا لیا لیکن تا بہ کے! آخر کار جعفر بن طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی شہید ہو گئے۔ اور

دشمنوں نے انہیں دو ٹکڑے کر دیا۔

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت

اس کے ساتھ ہی عبداللہ بن رواحہ نے آگے بڑھ کر علم تھام لیا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھے۔ دشمنوں کی صفوں کو دائیں بائیں اور سامنے سے چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ گھوڑے سے اترتے ہوئے کسی گہری سوچ میں پڑ گئے مگر تھوڑے ہی لمحہ میں سنبھلے تو یہ شعر پڑھتے ہوئے مقابلہ میں ڈٹ گئے۔

اقسمت یانفس لتنزنہ لتنزلن اولنکرھنہ

ان اجلب الناس وشدوالرانہ مالی اراک تکرھین الجنہ

ترجمہ۔ میں قسم کھا کر کہتا ہوں اے نفس تمہیں پسند ہو یا نہ ہو تمہیں میدان میں اترنا ہی ہو گا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ دوسرے تو اس والہانہ انداز میں شہادت کے لئے بڑھیں اور تو جنت میں جانے سے سستی برتے؟ اور شہادت پا گئے۔

خواب

اس معرکہ کفرو ایمان میں تین جلیل القدرو شجاعت پیشہ سالار زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، جعفر طیار بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے۔ ان کی شہادتوں کی خبر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی تو جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور زید کی شہادت کے حوالے سے فرمایا۔

"مجھے خواب میں تینوں شہداء کو سونے کے تخت پر آرام فرماتے ہوئے دکھایا گیا ہے البتہ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تخت ایک طرف سے ذرا جھکا ہوا نظر آیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا۔ ایسا کیوں؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جعفر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے میدان جنگ میں کود پڑے لیکن عبداللہ بن رواحہ ذرا سے تامل کے بعد! میدانِ شہادت کی طرف بڑھے"۔

قارئین۔ اس درس عبرت اور "موعظہ حسنہ" پر غور فرمایئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ مومن کے لئے موت سے کسی صورت کسی لمحہ بھی ڈرنا جائز نہیں۔ اس کا فرض ہے کہ اپنے یقین اور ایمان کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے اور اپنے دین کی بھلائی میں معمولی سا بھی تامل کئے بغیر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر جو بھی اس کی راہ میں حائل ہو اسے نیست و نابود کرنے کی کوشش کرے' کامیابی کی صورت میں اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کر لی اپنے دین کی بھلائی کے لئے معرکہ سر کر لیا اور شہید ہونے کی صورت میں اس کی یاد ان

لوگوں کی مانند ہے جو وفات کے بعد دنیا میں زندہ ہیں۔ ایسے اشخاص کی شہادت کے بعد ان کی یاد کا زندہ رہنا اس کی عظمت کی دلیل ہے' اللہ کی راہ یا دین و وطن کی بھلائی میں جان دینے کے مقابلہ میں زندہ رہنے کی کوئی قیمت نہیں اور یاد رکھئے ہر قیمت پر زندہ رہنے کی کوشش کرنا دراصل انسانیت کی سب سے بڑی توہین ہے۔ ایسی زندگی موت سے بدتر اور اس کا ذکرِ خیر بے معنی ہے۔

اسی طرح جو شخص کسی معمولی سی بات کے لئے اپنی جان کھو بیٹھے لیکن جب داعی برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام باطل کو مٹانے کے لئے آواز دیں تو اپنی جان بچانے کے لئے منہ چھپاتا پھرے تو ایسے شخص کی زندگی موت سے زیادہ شرم و ننگ کا موجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالٰی عنہ کی طرف دیکھیے۔ ایک لمحہ تامل کیا اور زید رضی اللہ تعالٰی عنہ اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ تعالٰی عنہ کو ان کے مقابلہ میں دیکھئے انہوں نے تردد میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا جس کی بناء پر ان دونوں کا درجہ شہادتِ عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالٰی عنہ سے زیادہ بلند ہو گیا۔ (واللہ اعلم بالصواب)

غرض ان شہدائے کرام کے مقابلہ میں ان لوگوں کے بارہ میں کیا کہیں جو مال و دولت اور دنیاوی جاہ و مراتب حاصل کرنے یا دوسرے دنیاوی مقاصد حاصل کرنے میں مشغول رہتے ہیں۔ یقیناً ایسے لوگ ناچیز و حقیر کیڑے مکوڑے ہیں اگرچہ عوام میں ان کی کتنی ہی عزت کیوں نہ ہو اور مال و دولت میں انہیں قارون کی برابری ہی کیوں نہ حاصل ہو۔ انسان کے لئے اس کے برعکس اسی میں عزت و مسرت ہے جس بات کو وہ حق سمجھتا ہو اس کے تحفظ میں کسی قسم کی قربانی دینے سے دریغ نہ کرے یہاں تک کہ اپنی جان قربان کرنے میں بھی اسے تامل نہ ہو۔

سپہ سالار خالد بن ولید رضی اللہ تعالٰی عنہ

عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالٰی عنہ کے شہید ہو جانے کے بعد قبیلہ بنو عجلان کے معزز نامور شخص جناب زید بن ثابت رضی اللہ تعالٰی عنہ نے علم اٹھایا اور با آواز بلند کہا۔ اس منصبِ علم برداری کے لئے کس کا نام تجویز کرتے ہو۔ مجاہدین نے کہا۔ آپ ہی اس اعزاز کے قابل ہیں مگر انہوں نے ازروئے عجز و انکساری انکار کیا اور علم مجاہدین نے خالد بن ولید رضی اللہ تعالٰی عنہ (سیف اللہ) کے سپرد کر دیا۔ خالد رضی اللہ تعالٰی عنہ کو مجاہدین کی تعداد اور بظاہر قوت کی کمی کا احساس تھا لیکن خالد رضی اللہ تعالٰی عنہ کو اللہ تعالٰی نے جنگ کے نشیب و فراز اور لڑنے لڑانے میں مہارت عطا فرمائی تھی۔ انہوں نے ازسرِنو فوج کو ترتیب دیا۔ غروبِ آفتاب تک انہیں دشمن سے لڑاتے رہے مگر معمولی جھڑپوں کے ساتھ یہاں تک کہ رات نے اپنی اندھیری چادر پھیلا دی۔

اسی رات کی تاریکی میں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جنگی چال چلی- مجاہدین کی بھاری تعداد کو میدانِ جنگ سے دور چھپا دیا- یہ دستہ بلند آواز سے نعرہ لگاتے ہوئے میدان جنگ میں داخل ہو گیا- کفار یہ سمجھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مجاہدین کے لئے کمک آگئی ہے- اس خوف نے ان کی ہمتیں پست کر دیں- گزشتہ روز مجاہدین نے جس شجاعانہ انداز میں ان کا مقابلہ کیا ان کے ہزاروں سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا- اس کے ردعمل نے انہیں بہت زیادہ خائف کر دیا تھا- اب وہ اس نئی کمک کو دیکھ کر ان کے پسینے چھوٹنے لگے، شکست نظروں میں گھومنے لگی-

خاتمہ

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی اس جنگی حکمت سے رومی فوجی گھبرا گئے ان میں جارحانہ حملہ کرنے کی جرأت نہ رہی- وہ جہاں کھڑے تھے وہیں دبکے رہے- مجاہدین نے دیکھا- یہ لوگ اپنی جگہ پر مردہ بن کر کھڑے ہیں- خود حملہ کرنے کی اسلام نے انہیں اجازت نہیں دی تھی لہٰذا خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے مجاہدین کو مدینہ منورہ کوچ کرنے کا حکم دیا- اس جنگ میں نہ تو مجاہدین کو فتح حاصل ہوئی اور نہ ہی کفار فاتح بن سکے-

مدینہ منورہ میں واپسی پر لوگوں کا ردِ عمل

مجاہدین و غازی جب مدینہ منورہ پہنچے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مسلمانوں سے ملاقات ہوئی- آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے چھوٹے صاحبزادے عبداللہ کو اس کے گھر سے بلوا کر گود میں اٹھا لیا-

کچھ مسلمانوں نے ان مجاہدین کے منہ پر مٹی پھینکتے ہوئے مجاہدین کو "فرار یق" بھگوڑوں کو نام سے طعنہ دیتے ہوئے کہا- تم لوگ جہاد فی سبیل اللہ سے بھاگ آئے ہو- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا تو فرمایا- یہ لوگ مفرور نہیں بلکہ کرار ہیں انشاء اللہ (کرار یعنی دوبارہ حملہ کرنے والے ہیں)-

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارہا اطمینان دلانے کے باوجود مقامی مسلمان اس غزوہ سے واپس آنے والے مجاہدین کے بارے میں یہی سمجھتے رہے یہ لوگ سخت قصوروار ہیں- یہاں تک کہ سلمہ ابن ہشام نے تو ان طعنوں یا فرار فرر تم فی سبیل اللہ اے بھگوڑے تم اللہ تعالیٰ کی راہ میں جنگ کرنے سے فرار ہو کر آئے ہو سے ڈر کر---- مسجد میں آنا جانا ترک کر دیا- اگر شرکائے موتہ کو اپنی شجاعت اور اپنے سپہ سالار کی نیک نیتی اور خلوص پر اعتماد نہ ہوتا تو انہیں فرار ہونے کا طعنہ قبول کرنا ہی پڑتا-

رسول اللہ ﷺ

زید رضی اللہ عنہ اور جعفر طیار رضی اللہ عنہ کی شہادت سے رسول اللہ ﷺ غمزدہ ہو گئے۔ جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر تشریف لے گئے۔ ان کی اہلیہ اسماء بنت عمیس اس وقت آٹا گوندھ رہی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان بچوں کو نہلا دھلا کر سینے سے لگالیا۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی بندھ گئی۔ اسماء رضی اللہ عنہا چونک گئیں۔ عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کہیں جعفر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی مجاہدین کے بارے میں تو کوئی خبر نہیں آئی۔ فرمایا۔۔ وہ شہید ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ (یہ کمزور روایت ہے رسول اللہ ﷺ شہادت کو نعمتِ عظمیٰ جانتے تھے۔ وہ حوصلہ دینے کے لئے آئے تھے خود رو کر دوسروں کے حوصلوں کو توڑنے کا عمل آپ ﷺ سے ناممکن ہے۔ مترجم)

بی بی اسماء رضی اللہ عنہا نے گریہ اور آہ و بکا سے آسمان سر پہ اٹھالیا۔ عورتیں جمع ہو گئیں۔ (حدیث نبوی ﷺ نے گریہ اور آہ و بکا کی یہ صورت جو فاضل مؤلف نے لکھی ہے۔ جاہلانہ عمل قرار دیا ہے۔ مترجم) بہرحال حقیقت اتنی ہے کہ آپ ﷺ اپنے گھر آئے اہلِ بیت سے فرمایا۔ جعفر رضی اللہ عنہ شہید ہو گئے ہیں اور آلِ جعفر سخت غمزدہ ہیں ان کے لئے کھانا تیار کرو اور بھیج دو۔

اسی اثناء میں زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی تشریف لے آئیں۔ رسول اللہ ﷺ کے بازوؤں پر ہاتھ رکھ کر رونے لگیں۔ غرض شہدائے موتہ میں رسول اللہ ﷺ کو غمزدہ دیکھ کر مسلمان بھی بیحد متاثر ہوئے۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ یہ غم اپنے بچھڑے ہوئے رفقاء کے فراق میں ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی لاش خالد رضی اللہ عنہ اور مجاہدین کی موتہؔ سے واپسی کے تین بعد مدینہ لائی گئی اور انہیں دفن کیا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے گریہ و زاری کرنے والوں سے فرمایا۔ جعفر رضی اللہ عنہ کو دو بازوؤں کی جگہ اللہ نے دو پر عطا فرما دیئے ہیں۔ جن سے وہ جنت میں اڑ کر سیر کر رہے ہیں۔ انہی پروں کی مناسبت سے جعفر رضی اللہ عنہ جعفر طیار کے لقب سے مشہور ہوئے۔

غزوہٗ ذات سلاسل

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو غزوہٗ موتہ سے ابھی چند ہی ہفتے گزرے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے شمالی عرب میں مسلمانوں کی مزید دھاک بٹھانے کے لئے عمرو بن العاص کو بھیجتے ہوئے حکم دیا کہ راستے میں سے اہلِ عرب کو اپنی معاونت کے لئے ساتھ لے لیں۔ آپ

ﷺ کو یہ امید تھی کہ حضرت عمرو بن العاص سپہ سالار دستہ کی والدہ کے میکے انہیں علاقوں سے تھے۔ اس لئے یہ لوگ ان کی اعانت کے لئے آسانی سے آمادہ ہو جائیں گے۔

لیکن جونہی مجاہدین جذام کے ایک چشمے (جس کا نام سلاسل تھا) پر پہنچے تو حضرت عمرو بن العاص خوفزدہ ہو گئے اور کمک کے لئے رسول اللہ ﷺ کے پاس قاصد ارسال فرمایا جس کی بناء پر رسول اللہ ﷺ نے ابو عبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں ایک دستہ روانہ فرمایا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور ابو بکر رضی اللہ عنہ بھی اس دستہ میں شامل تھے ایسا نہ ہو کہ عمرو بن العاص اور عبیدہ الجراح میں کوئی اختلاف نہ ہو جائے۔ حفظِ ماتقدم کے طور پر رسول اللہ ﷺ نے دونوں کو آپس میں اختلاف سے بچنے کا حکم صادر فرمایا۔ آگے چل کر معلوم ہوا رسول اللہ ﷺ کا یہ خیال درست نکلا۔ ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ میں اختلاف ہونے کو تھا۔ سچ یہ ہے کہ اگر آخر الذکر تحمل نہ فرماتے تو اختلاف کوئی رنگ لے آتا۔ چنانچہ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ سے کہا "میں امیر جیش ہوں اور آپ میری اعانت کے لئے تشریف لائے ہیں" ابو عبیدہ بہت بردبار اور نرم دل تھے۔ مناصب کے بھی طلب گار نہ تھے۔ عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے عرض کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں اختلاف سے منع فرمایا ہے۔ اب اگر آپ میری رائے ماننا پسند نہیں فرماتے تو میں آپ کی فرمانبرداری کے لئے بسرو چشم حاضر ہوں۔ چنانچہ قیام صلوٰۃ کے وقت حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ امامت فرماتے۔

مختصر یہ کہ لشکر ان کی قیادت میں آگے بڑھا۔ لیکن ان کی خبر ملتے ہی کفار کا لشکر جو شام کے گردو نواح میں جمع ہوا تھا۔ وہ خوفزدہ ہو کر ادھر ادھر بکھر گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجاہدین کی ہیبت و عزت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا۔

اس اثناء میں رسول اللہ ﷺ کے دل میں مکہ معظمہ اور بیت اللہ شریف کا کئی بار خیال آیا لیکن آپ کے نزدیک صلح حدیبیہ کی پابندی بہت ضروری تھی البتہ دورو نزدیک سے کفار کے حملہ آور ہونے کی خبر جہاں سے ملتی' ان کی سرکوبی کے لئے مجاہدین کو بھیج دیا جاتا۔ اسی عرصہ میں آس پاس کے کئی قبائل آپ ہی آپ مدینہ منورہ میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کی اطاعت و فرماں برداری کی درخواستیں پیش کرتے رہے جو قبول فرمائی جاتی رہیں۔ لیکن اچانک ایک ایسا حادثہ رونما ہوا جو فتح مکہ کا پیش خیمہ ثابت ہوا اور اسلام کی دائمی عظمت اور عالمی استحکام و استقرار کا موجب ثابت ہوا۔

فتح مکہ اور تطہیر کعبہ

فتح مکّہ اور تطہیرِ کعبہ

غزوہ موتہ سے واپسی کا ردِ عمل

غزوہ موتہ سے مجاہدین اپنے مقرر کردہ امیر خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حکم کی تعمیل میں فتح و شکست کے بغیر یعنی بے نتیجہ واپس مدینہ آ گئے تاہم مسلمانوں نے اسے اپنے حق میں بہتر ہی سمجھا لیکن اس کے ساتھ ہی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور جعفر طیار رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عبداللہ بن رواحہ کی شہادتوں نے مختلف طبقات پر مختلف اثرات چھوڑے۔

رومی اور مسلمانوں کی شجاعت

(الف) اس کے باوجود کہ عیسائی ایک لاکھ یا دو لاکھ کی تعداد میں تھے اور مجاہدین کی کل تعداد تین ہزار تھی لیکن رومیوں نے مجاہدین کی واپسی کو اپنے لئے بڑی غنیمت سمجھا۔

(ب) شاید اس لئے کہ اس ایک روزہ جنگ میں مجاہدین کے چوتھے سپہ سالار خالد ابن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی (نو) 9 عدد تلواریں ٹوٹیں' اس کے باوجود ان کی ہمت و شجاعت میں کوئی کمی نہ آئی اس کا ردِ عمل تھا۔

(ج) یا اس کی وجہ یہ بھی ہو کہ لڑائی کے دوسرے روز خالد بن ولید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جنگی حکمت عملی کے تحت اپنے لشکر کو دو حصوں میں تقسیم کر کے اور ترکیب سے رومیوں کو یہ یقین دلانے میں کامیابی حاصل کر لی کہ مسلمانوں کو تازہ دم کمک آ گئی ہے۔

(د) شاید اس لئے بھی کہ لڑائی میں اپنی شجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجاہدین کو شام کے نواحی قبائل نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا جس کے ردِ عمل میں ان کے حوصلے سرد پڑ گئے۔

(ہ) یا اس لئے کہ قیصر روم کی فوجوں کے سپہ سالار فروہ بن عمرو (الجذامی) مسلمان ہو گئے اور انہیں بادشاہ کے فرمان سے بغاوت کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا۔ ہرقل نے انہیں دوبارہ مسیحی مذہب اختیار کر لینے اور سابقہ منصب و جاہ پر فائز رہنے کا یقین دلایا۔ لیکن فروہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

کے ایمان نے اس سودے کو ٹھکرا دیا اور قیصر نے انہیں قتل کروا دیا۔ گویا وہ شہادت کا مرتبہ عظیم پا گئے۔

(و) اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہرقل کو یہ علم ہو چکا تھا کہ عراق اور شام کی سرحد پر واقع تمام قبائل جو اس کے ماتحت تھے اب ان کے دلوں میں اسلام کی رحمت و برکت کا بسیرا ہونے لگا ہے۔

غرض رومیوں کے متاثر ہونے کی مذکورہ وجوہات تھیں یا کچھ اور ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اللہ تعالٰی کی نصرت و تائید مجاہدین کے ساتھ تھی۔ جس کا انہیں خوف کھانے لگا۔

لیکن وہ عرب جو ہرقل کی سلطنت میں شمالی مشرقی روم میں آباد تھے ان کا اسلام کی طرف مائل ہونے کا دوسرا سبب ہے۔ وہ یہ تھا کہ ایک بار رومی فوج کے راشن تقسیم کرنے والے اہلکار نے اعلان کر دیا کہ رضاکار فوج سے نکل جائیں جو رضاکارانہ طور پر شامل ہوئے ہیں اور بادشاہ سلامت کی طرف سے راشن صرف سرکاری فوج کے لئے ہے۔ حتیٰ کہ سرکار کے پالتو کتوں کے لئے بھی کچھ مہیا نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے وہ تمام عرب رضاکار بدگمان ہو گئے جو رومی فوج میں ہرقل کے ماتحت مشرقی روم میں آباد ہونے کی وجہ سے مجاہدین اسلام کے خلاف لڑنے کے لئے رضاکارانہ شامل ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رضاکار رومی فوج سے الگ ہو گئے۔

ہو سکتا ہے جب یہ لوگ بددل ہو کر رومی لشکر سے الگ ہوئے ہوں تو اس لمحہ دین اسلام کی روشنی نے ان کی راہنمائی کی ہو اور حقیقت ان کا ہاتھ پکڑے صحیح مقصدِ حیات تک لے آئی ہو۔ اس زمانہ میں مندرجہ ذیل قبائل کی قسمت جاگی اور دولتِ اسلام ان کے مقدر میں لکھی گئی۔

(1) قبیلہ بنو سلیم اپنے سردار عباس بن مرداس کی رہبری میں مسلمان ہوا۔

(2) قبیلہ اشجع (3) یہود کے حلیف بنو غطفان جن کا مسلمان ہونا خیبر میں مقیم یہودیوں کے لئے ایسا ثابت ہوا جیسے ان پر مصیبتوں اور تباہیوں کا پہاڑ آ گرا ہو۔ (4) قبیلہ بنو عبس (5) قبیلہ ذبیان اور (6) قبیلہ بنو فزارہ۔

ان حالات کی روشنی میں غزوہ موتہ ہی شمالی عرب میں ملک شام تک مسلمانوں کے اثر و نفوذ کا بنیادی سبب بنا۔ جس سے اسلام کی شان و شوکت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔

اہلِ مدینہ پر رد عمل

رومیوں پر جو اثر ہوا وہ تو آپ پڑھ چکے لیکن اہل مدینہ پر اس کا بالکل الٹا رد عمل ہوا۔ مجاہدین اور ان کے سپہ سالار خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بغیر فتح کے لوٹ کر آئے تو مقامی مسلمانوں

نے انہیں سربازار "یا فرار! فررتم فی سبیل اللہ"
(مفرور لوگو تم لوگ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے سے بھاگ آئے ہو۔) کہنا شروع کر دیا۔ جس کی وجہ سے مجاہدین میں سے بڑے بڑے بہادر بھی شرم کے مارے گھروں میں چھپ گئے تاکہ کم عمر اور نوجوانوں سے مفرور ہونے کا طعنہ نہ سنیں۔

قریش اور غزوہ موتہ

قریش نے اس واقعہ کو اس حد تک منفی پہلو سے لیا کہ اسے شکست و ذلت سے تعبیر کیا اور اب مسلمانوں کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان کو قائم رکھنا اپنے خلاف شان سمجھنا شروع کر دیا۔ قریش نے یہاں تک منصوبہ طے کر لیا کہ عمرۃ القضاء سے پہلے کی طرح فضا پیدا کر دی جائے بلکہ صلح حدیبیہ کو پس پشت ڈال کر بلا خوفِ قصاص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے حلیف قبیلوں پر حملہ کر دیا جائے۔

قرارداد حدیبیہ کو نظرانداز کر دیا

قرارداد حدیبیہ میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ اہل عرب فریقین میں سے جس فریق کے ساتھ معاہدہ کرنا چاہیں۔ دوسرا فریق اس میں حائل نہیں ہو گا۔ اس قرارداد کے مطابق بنو خزاعہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معاہدہ کر لیا اور قبیلہ بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے لیکن بنو خزاعہ اور بنو بکر دونوں کے درمیان کئی پشتوں سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ جو صلح حدیبیہ کے بعد بظاہر تو ختم ہو چکی تھی۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے بہت ہی قریب نظر آنے لگے تھے لیکن غزوہ موتہ نے جہاں قریش کے ناپاک ارادوں کو ہوا دی اور مسلمانوں کو ذلیل سمجھنے لگے اسی طرح بنو بکر کے دل میں بھی یہی گمان پیدا ہو گیا۔ نہ صرف یہ بلکہ بنو خزاعہ کے ساتھ ان کی پرانی دشمنی بھی سانپ کی طرح پھنکارنے لگی۔ انہوں نے موقع غنیمت سمجھا اور بنو خزاعہ سے انتقام لینے کے لئے تل گئے۔ عکرمہ بن ابو جہل نے جلتی پر تیل کا کام کیا' ایک روایت کے مطابق بھیس بدل کر ان کے ساتھ حملہ میں بھی شامل ہوا۔ قریش کفار کے بعض سرغنوں نے درپردہ بنو بکر کی اسلحہ کے ساتھ مدد کی اور ایک رات جبکہ بنو خزاعہ کے بہت سے افراد "وتیر نامی" گھاٹی پر گہری نیند سو رہے تھے۔ بنو بکر کی شاخ بنی الدئل نے ان پر شب خون مار کے ان کے کئی آدمی موت کے گھاٹ اتار دیئے جو بچ گئے بھاگ کر مکہ معظمہ میں بدیل بن ورقہ کے گھر میں آ چھپے اور ان کو اطلاع دی کہ قریش اور قبیلہ ابو بکر نے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معاہدہ کو توڑ دیا ہے۔

قبیلہ بنو خزاعہ کا سردار فوراً" مدینہ منورہ پہنچا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت مسجد نبوی میں تھے۔ مسلمان چاروں طرف حلقہ باندھے بیٹھے تھے۔ اس نے بنو بکر کی بدعہدی بیان کی اور

مدد کا طلبگار ہوا۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا- اے عمرو تمہاری امداد کی جائے گی انشاء اللہ۔ عمرو بن سالم خزاعی کے بعد ہی بدیل ورقہ بھی اپنے مظلوم ساتھیوں کے ساتھ مدینہ آئے اور بارگاہ نبوی میں عرض کیا- کہ قریش مکہ نے خفیہ طور پر بنو بکر کی اسلحہ اور افراد سے مدد کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کفار مکہ کے صلح حدیبیہ کی قرارداد توڑنے کی تلافی فتح مکہ کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے دور اور نزدیک سب مسلمانوں' جانثاروں کو پیغام بھیج دیا کہ "ہر شخص جہاد کی مکمل تیاری کر لے اور حکم ثانی کا انتظار کرے" لیکن آپ ﷺ نے اپنی یہ رائے کسی پر ظاہر نہیں ہونے دی کہ یہ چڑھائی کس پر ہو گی۔

قریش مکہ کے دل کا چور بولا

چند روز بعد ہی مدینہ میں قریش کو عکرمہ اور اس کے نوجوانوں کی اس خطرناک غلطی کا احساس ہو گیا۔ قرارداد صلح کے خلاف عہد شکنی نے انہیں پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ ان پر یہ بات تو ثابت ہو چکی تھی کہ نور ہدایت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ہر اندھیرے دل میں اجالا کر دیا ہے۔ اس حقیقت نے ان کے دل میں اور اضافہ کر دیا۔ سوچنے پر مجبور ہو گئے کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ ان کے دانشوروں نے طے کیا کہ ابوسفیان کو وفد کے ہمراہ مدینہ بھیجا جائے تاکہ حدیبیہ کی دو سالہ میعاد کو دس سالہ میعاد میں بدل دیا جائے۔

چنانچہ اس منصوبہ کے تحت ابوسفیان عسفان نامی مقام پر پہنچے۔ تو بدیل ابن ورقہ سے سرراہ ملاقات ہوئی۔ ابوسفیان کا دل گھبرایا۔ اسے یہ بات کھٹکی کہ ہو نہ ہو یہ شخص ضرور مدینہ منورہ سے ہو کر آیا ہے اور اسی نے سرور کائنات محمد ﷺ سے سارا ماجرا بیان کر دیا ہو گا۔ یہ تو غضب ہو گیا مگر بدیل سے پوچھا تو وہ بات ٹال کر چل دیئے۔ مگر ابوسفیان نے اس کے اونٹ کی مینگنیوں سے پہچان لیا کہ وہ مدینہ ہی سے آ رہے ہیں۔

اپنی صاحبزادی ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے گھر

ابوسفیان جب مدینہ پہنچے تو ادھر ادھر سے صورتحال کی خبریں مہیا کرنے کے بعد سیدھے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کے بجائے اپنی بیٹی ام المومنین ام حبیبہ کے پاس آئے۔ قریش کے معاملہ میں رسول اللہ ﷺ کے موجودہ رجحانات کا اندازہ ان کو بھی تھا۔ اپنے والد کو دیکھ کر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے رسول اللہ ﷺ کا بستر سمیٹ لیا۔ تو ابوسفیان نے پوچھا کیا یہ بستر تمہارے باپ کے شایان شان نہیں؟ یا تمہارا باپ اس پر بیٹھنے کے قابل نہیں؟ انہوں نے جواب دیا۔ یہ بستر رسول اللہ ﷺ طاہر و مطہر کا ہے۔ اور آپ

مشرک اور نجس ہیں۔ مجھے یہ گوارا نہیں کہ آپ کا ناپاک جسم اس بستر کو مس کرے۔ ابوسفیان بھنا کر بولا۔ بیٹی میرے بعد تمہیں بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں گی۔ غرض اسی غصہ میں بھرا ہوا ام المومنین رضی اللہ عنہا کے گھر سے نکلا اور نبی کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہو کر صلح کی مدت میں توسیع کرنے کی درخواست کی مگر رسول اللہ ﷺ نے مثبت یا منفی دونوں میں سے کوئی جواب نہ دیا۔

اس کے بعد ابوسفیان حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان سے سفارش کرانے کی کوشش میں ناکام ہوا تو پھر عمر بن الخطاب کی خدمت میں حاضر ہو کر سفارش کی التجا کی تو انہوں نے فرمایا میں اور تمہارے لئے سفارش؟ البتہ تمہارے ساتھ لڑائی میں ذرا سا بھی فائدہ ہو تو میں تیار ہوں۔

ابوسفیان علی ابن ابی طالب کے گھر

ابوسفیان جب علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے گھر آیا تو اس وقت سیدہ فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی وہاں موجود تھیں۔ ابوسفیان کی درخواست سن کر انہوں نے بڑے نرم لہجہ میں فرمایا۔ "رسول اکرم ﷺ جب کسی کام کا ارادہ کر لیتے ہیں تو پھر ان کو کوئی شخص روک نہیں سکتا۔"

ابوسفیان: مجھے حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی پناہ میں دے دیا جائے۔

سیدۃ الزہرا رضی اللہ عنہا: رسول اللہ ﷺ کے مخالف کو کوئی شخص پناہ دینے کا مجاز ہی نہیں اور نہ وہ دے سکتا ہے۔

علی رضی اللہ عنہ: تمہارے لئے کوئی گنجائش ہمیں تو نظر نہیں آتی چونکہ تم بنو کنانہ کے سردار ہو۔ مدینہ کے کسی مناسب مقام پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دو کہ "صلح قائم ہے" اور چلے جاؤ۔

ابوسفیان کا از خود توسیع کا اعلان

ابوسفیان مسجد نبوی ﷺ میں پہنچا اور کھڑے کھڑے یہ کہہ کر کہ "صلح قائم ہے" مکہ کی راہ لی لیکن اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ خصوصاً اپنی بیٹی ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے برتاؤ اور ان کے جملے بار بار اس کے کانوں سے ٹکراتے رہے۔ اس پر مزید پریشانی یہ تھی کہ مکہ سے ہجرت کرنے سے پہلے جن لوگوں کی زندگی اس کے رحم و کرم پر تھی آج ان کا رویہ اس کے ساتھ انتہائی مختلف تھا۔

مکہ میں واپسی

ابوسفیان مکہ واپس آیا' مدینہ منورہ میں جو کچھ پیش آیا وہ سب کچھ بلا کم و بیش کہہ دیا' لیکن جب مسجد نبوی میں کھڑے ہو کر اپنی طرف سے صلح کے قائم ہونے کے اعلان کا ذکر کیا تو اس کے حواریوں نے کہا "تم سمجھے نہیں۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تم سے مذاق کیا تھا" بہرحال اس کے بعد تمام مدبرین اور دانشور آئندہ کے لئے لائحہ عمل تیار کرنے کے لئے غور و فکر کرنے بیٹھ گئے۔

فتح مکہ کی تیاری

اس کے باوجود کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی قوت اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی نصرت پہ یقین کامل تھا۔ پھر بھی آپ نے قریش مکہ کو مدافعت کی تیاری یا جارحانہ حملہ کے لئے مہلت دینا مناسب نہ سمجھا۔ ہو سکتا ہے ایسی صورت میں کئی جانوں کا ضیاع ہو جائے' پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف جہاد کے لئے تیار رہنے کا حکم فرمایا تھا۔ تو حکم ثانی میں اعلان فرما دیا کہ مکہ پر چڑھائی کرنا ہے۔ مسلمانو مجاہدو تیزی سے بڑھو' اور اللہ رب العزت کی بارگاہ عالیہ میں دعا فرمائی کہ اہل مکہ کو مسلمانوں کے آنے کی خبر نہ ہونے پائے۔

ایک مہاجر کی طرف سے مخبری

جب مسلمان کوچ کی تیاری کر رہے تھے تو ایک مہاجر مکی نے قریش کی طرف خط لکھا' اور اسے سارہ نامی کنیز کے حوالے کیا۔ یہ بنو عبدالمطلب کے ایک صاحب کی کنیز تھی۔ اس شخص نے اس کنیز کے ساتھ پیغام پہنچانے کی قیمت بھی طے کر لی تھی۔ اس خط میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مکہ معظمہ پر چڑھائی کرنے کی خبر تھی۔

اگرچہ جناب حاطب مہاجر سرکردہ مسلمانوں میں سے تھے لیکن انسان ہی تو ہے جو کبھی اپنے ادنیٰ سے مقاصد کے لئے ایسی بھول کر بیٹھتا ہے کہ اگر کوئی دوسرا اس کی جگہ وہی حرکت کرے تو وہ اسے بہت برا قرار دے۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاطب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مخبری کی خبر دے دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کو کنیز سارہ کا تعاقب کرنے کا حکم دیا۔ جاؤ اور اس سے خط برآمد کرو۔ سارہ قابو آ گئی۔ اس کے سامان کی تلاشی لی گئی تو اس سے خط برآمد نہ ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے دھمکی دی اگر تم نے خط ہمارے حوالے نہ کیا تو ہم تمہاری جامہ تلاشی لینے پر مجبور ہوں گے۔ چنانچہ کنیز نے گھبرا کر کہا۔ آپ تھوڑی دیر ادھر منہ پھیر لیں میں آپ کو خط دیتی ہوں۔ غرض اس نے یہ خط اپنی مینڈیوں سے نکال کر ان کے حوالے کیا۔

دونوں حضرت خط لے کر مدینہ پہنچے۔ رسول اللہ ﷺ نے حاطب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بلوا کر پوچھا تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ میرا ایمان رسول اللہ پر اور اللہ پر اتنا ہی ہے جتنا پہلے تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں مگر میرے بال بچے ابھی تک مکہ میں گھرے ہوئے ہیں اور وہاں میرا کوئی عزیز یا رشتہ دار نہیں۔ میرا مقصد صرف ان کے بچاؤ کی تدبیر کرنا تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ حاطب منافق ہو گیا ہے۔ مجھے اس کی گردن اڑا دینے کا حکم دیجئے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہیں۔ اے عمر یہ غزوہ بدر میں شریک تھے اور اللہ تعالیٰ نے غزوہ بدر میں شریک ہونے والوں کے سب گناہ کالعدم قرار دے دیئے ہیں۔ اس واقعہ پر یہ وحی نازل ہوئی۔ یا ایھا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی و عدوکم اولیاء تلقون الیھم بالمودہ (1-60)

"اے ایمان والو ہمارے اور اپنے دشمنوں یعنی کافروں کو دوست مت بناؤ۔ کہ تم ان کی طرف دوستی کے نامہ و پیام بڑھانے لگو۔"

مکہ کی طرف کوچ

اس کے بعد مکہ کی طرف کوچ ہوا۔ اسلامی عساکر اس نیت کے ساتھ مکہ کی طرف بڑھیں تاکہ اسے فتح کر کے اللہ کے گھر کی زیارت کا عام اعلان کر دے اللہ کا وہ گھر جسے اللہ تعالیٰ نے ازل سے امن و پناہ کی گود قرار دے رکھا ہے۔

مدینہ کے رہنے والوں نے کبھی اتنی تعداد میں فوج نہیں دیکھی تھی۔ اس لشکر میں مہاجرین و انصار کے سوا بنو سلیم تھے۔ بنو مزینہ اور غطفان کا جم غفیر تھا۔ ان کے علاوہ بھی اتنے لوگ شامل تھے کہ چاروں طرف انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر نظر آتا تھا۔ صحرا و ریگستاں جہاں خیمے نصب ہوتے تھے دیکھنے والوں کو زمین نظر نہیں آتی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں مجاہدین کی افواج مکہ کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جیسے جیسے مجاہدین آگے بڑھتے راستے ہی میں کئی قبائل ساتھ شامل ہوتے جا رہے تھے۔ قدم قدم پر تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ہر ایک کے دل میں یقین و ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا انہیں کوئی مغلوب نہیں کر سکتا۔

فوج کے پیشوا آگے سب سے آگے ہمیشہ آگے آپ ﷺ کی سواری تھی۔ یہ دعا مانگ رہے تھے کہ اے میرے اللہ کسی انسان کے خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر مکہ میں اللہ کے گھر داخل ہو جائیں۔

چنانچہ اسلامی لشکر نے مقام "مرالظہران" مکہ معظمہ سے ایک منزل دور پر پڑاؤ ڈالا۔ اس وقت ان کی تعداد دس ہزار تک پہنچ چکی تھی۔ قریش کو اللہ تعالیٰ نے خبر ہی نہ ہونے دی وہ اپنی

جگہ اس کشمکش میں تھے کہ محمد ﷺ کی دشمنی کا مداوا کس طرح کیا جائے؟

سیدنا عباس کا قبول اسلام

حضرت عباس رضی اللہ عنہ اپنے قبیلے کو اسی ذہنی کشمکش میں چھوڑ کر اپنے چند قبیلہ والوں کے ساتھ حجفہ نامی مقام میں جو مکہ سے تراسی میل پر واقع ہے' رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مشرف باسلام ہونے کا اظہار فرمایا۔

لیکن بعض سیرت نگاروں نے اس مقام کو رابغ بتایا ہے بہرحال رابغ ہو یا حجفہ دونوں میں سے کوئی ایک مقام سہی' آنحضرت ﷺ سے ملے اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ اسی عرصہ میں اسلام لائے۔

دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ جناب عباس رضی اللہ عنہ فتح مکہ سے پہلے مدینہ تشریف لے گئے وہاں اسلام لائے اور پھر اسلامی لشکر کے ساتھ ہی مکہ تشریف لائے۔

البتہ بنو ہاشم کو آنحضرت ﷺ کے آنے کی خبر کسی صورت پہلے ہی مل چکی تھی۔ بنو ہاشم ہر قیمت پر اب مجاہدین کی یلغار سے اپنے آپ کو بچانا چاہتے تھے۔ اسی طرح ابوسفیان بن حارث رسول اللہ رضی اللہ عنہ کے چچا زاد بھائی اور رسول اللہ ﷺ کے دونوں پھوپھی زاد بھائی عبداللہ بن ابوامیہ بن مغیرہ اور ابوسفیان نے نبق العقاب نامی مقام پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں باریابی کی التجا کی لیکن آنحضرت ﷺ نے انکار فرما دیا۔ عبداللہ ام المومنین رضی اللہ عنہا ام سلمہ کے حقیقی بھائی تھے۔ سیدہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں آپ کے ساتھ تھیں۔ عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ابوسفیان (بن حارث) آپ کے عم زاد ہیں۔ اور عبداللہ سے آپ کا دوہرا رشتہ ناطہ ہے۔ وہ میرے بھائی اور آپ کے پھوپھی زاد ہیں۔ فرمایا میرے اس عم زاد نے میری رسوائی میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ اور پھوپھی زاد نے مکہ میں مجھے کیسا کیسا رسوا کیا۔تم رہنے دو میں ان سے دور ہی بھلا ابوسفیان نے رسول اللہ ﷺ کی برہمی سن کر کہا۔

واللہ لیوذنن لی اولا حذن بید بنیی ھذا ثم لتذھبن فی الارض حتی تموت عطشا" وجوعا"

واللہ اگر آج آپ نے مجھے باریابی کی اجازت نہ دی میں اپنے بچے کا ہاتھ پکڑ کر صحرا میں نکل جاؤں گا اور بھوکا پیاسا مرجانا ہی پسند کروں گا۔

ابوسفیان کی اس رقت پر رسول اللہ ﷺ کا دل بھی پسیج گیا۔ دونوں کو شرف باریابی بخشا۔ دونوں کا جرم معاف فرما دیا اور دونوں مسلمان ہو گئے۔

سیدنا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اہل مکہ کے لئے سفارش عفو

سیدنا عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے عالی مرتبہ بھائی کے بیٹے کی فوجی قوت اور ولولہ سے بیحد متاثر ہوئے۔ اگرچہ وہ خود اسلام لاچکے تھے مگر انہوں نے غازیوں کی کثرت سے اندازہ کرلیا کہ پورے عربستان میں جس لشکر کے مقابلہ کی کسی میں ہمت و جرات نہیں اہل مکہ اس سے کیسے نپٹ سکتے ہیں۔

اس کے علاوہ بعض سیرت نگاروں کی رائے (ب) جو پہلے بیان کی جاچکی ہے۔ اس کی تردید میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ تو خاندان عباسیہ کو خوش کرنے کے لئے بعد میں وضع کی گئی ہے۔ فریق "ب" کی اپنے اس خیال کی حمایت میں یہ دلیل بھی قابل غور ہے کہ ہجرت سے پہلے ان کی مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت یا نگرانی ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے تھی۔ لیکن حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے اسلام کا اظہار یا ہجرت اس لئے نہ کرسکے کہ کہیں ان کی تجارت اور سودی لین دین تباہ نہ ہو جائے۔ اس بارے میں فریق ب کا یہ بھی دعوی ہے کہ اگر عباس کا فتح مکہ سے پہلے مسلمان ہونا تسلیم کرلیا جائے تو وہ اس وفد میں ضرور شامل ہوتے جو صلح حدیبیہ کی توسیع کے لئے مدینہ میں حاضر ہوا تھا۔ غرض یہ کہ حضرت عباس ابھی حال ہی میں مکہ سے آئے تھے جہاں ان کے اہل و عیال اور دوست احباب سب موجود تھے۔ انہیں پوری طرح یقین تھا کہ اسلام اپنے مقابلہ میں کمزور افراد سے تعلق توڑنے کو جائز نہیں سمجھتا۔ اس لئے عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل مکہ کے متعلق اپنا اضطراب ظاہر کرتے ہوئے عرض کیا۔ اگر قریش طالب اماں ہوں؟ ممکن ہے کہ برادر زادہ کو اپنے عم بزرگوار کی پیش کلامی پسند آئی ہو۔ اس لئے اس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بطور سفیر بھیجنے کے لئے سوچا تاکہ وہ قریش کو اس حد تک ذہنی اور نفسیاتی طور پر مرعوب کردیں کہ کشت و خون کے بغیر مکہ مکرمہ پر ان کا قبضہ ہو جائے۔ اور یہ شہر جس طرح ازل سے امن و سلامتی کا گہوارہ چلا آرہا ہے۔ اسی طرح آج بھی اس کے امن و سکون میں کسی قسم کا خلل نہ آنے پائے۔

اس مقصد کے لئے جناب عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی بیضا پر سوار ہو کر گزرگاہ اراک سے ہوتے ہوئے مکہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت عباس کا اس راستے سے آنے کا منشا یہ تھا کہ اگر کوئی لکڑہارا، شیر فروش یا کوئی شخص مکہ کی طرف جاتے ہوئے مل جائے تو اس کے دل میں مسلمانوں کی کثرت اور ان کی قوت کا اس انداز سے خوف پیدا کردیا جائے کہ وہ خود جاکر اہل مکہ کو اتنا ڈرائے کہ اہل مکہ خوفزدہ ہو کر خود بخود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو جائیں۔ جناب عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو علم تھا کہ جب سے مسلمانوں نے مرا لظہران پر

ڈیرے ڈالے ہیں، قریش اس اطلاع کے بغیر اپنے مستقبل سے گھبرا رہے ہیں کہ ان کے خیال میں خطرات ان کے قریب آ چکے ہیں۔

قریش کا ایک وفد

قریش نے پیش قدمی کرتے ہوئے اپنے تین نامور دانشوروں کا وفد نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں بھیجا۔ (1) ابو سفیان بن حرب اموی (2) بدیل بن ورقہ (3) حکیم بن حزام تینوں حضرات ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے۔ راستے میں بھی یہ لوگ مسلمانوں کی باتیں سننے کے لئے گوش بر آواز رہے۔ خطرہ کی وجہ سے ان کے اپنے دل بھی ڈوبتے جا رہے تھے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے راستہ چلتے ہوئے ان کی یہ آواز سن لی۔

ابو سفیان: آج رات میں نے اتنی روشنی اور اس قدر فوج دیکھی کہ اس سے پہلے نہ کبھی دیکھی ہے نہ سنی ہے۔

بدیل: میں بھی قسم کھا کر کہتا ہوں۔ یہ بنو خزاعہ ہیں جو لڑائی ہی کے لئے آئے ہیں۔

ابو سفیان: بنو خزاعہ کی کیا اوقات ہے کہ وہ اتنی فوج جمع کر سکتے یا ایسی آگ روشن کر سکتے؟

اتفاقیہ ملاقات

اس وفد کی حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے اتفاقی ملاقات ہو گئی۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے ابو سفیان کو ان کی آواز سے پہچان لیا۔ اور انہیں ان کی کنیت "ابو حنظلہ" کے نام سے پکار کر کہا۔ تمہارا برا ہو رسول اللہ ﷺ لشکر جرار لے کر آ گئے ہیں اگر کل دن چڑھے مکہ میں داخل ہو گئے تو تمہارا کیا ہو گا؟

ابو سفیان: اے عباس میرے باپ تم پر نثار! کوئی تدبیر؟

سیدنا عباس نے بدیل اور حکیم دونوں کو مکہ واپس لوٹا دیا اور ابو سفیان کو اپنے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی ناقہ پر سوار کر کے اسلامی لشکر کی طرف روانہ ہوا۔ مجاہدین اونٹنی کے اعزاز میں خود بخود راستہ بناتے چلے گئے۔ دونوں سردار لشکر کے درمیان سے ہوتے ہوئے نکلے۔ مجاہدین نے اہل مکہ کو مرعوب کرنے کے لئے آگ کے بڑے بڑے الاؤ روشن کر رکھے تھے۔ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے الاؤ کے قریب سے گزرے تو انہوں نے اندازہ لگا لیا کہ ابو سفیان عباس رضی اللہ عنہ کی پناہ میں ہے۔ ان سے الجھنے کے بجائے جلدی سے رسول اللہ ﷺ کے خیمہ میں آئے اور ابو سفیان کو قتل کرنے کی اجازت طلب کی۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ ابو سفیان کو میں اپنی ضمانت پر لایا ہوں۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ عباس رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ میں تیز گفتگو ہو رہی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا۔ اس وقت ان کو اپنے خیمہ میں لے جائیے اور صبح ہمارے پاس لائیے گا۔

قرین قیاس یہ ہے کہ نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد کسی سے انتقام لینا تھا۔ نہ کسی اور مسلمان کے دل میں یہ جذبہ تھا بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد تو اپنے ہر دشمن کو دین اسلام کی نعمت سے مالا مال کرنا تھا۔ اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں یہ خیال کہ وہ ابوسفیان سے ان کی سابقہ غلطیوں کا انتقام لینا چاہتے تھے عقل تسلیم نہیں کرتی۔ (مترجم) صبح ہوتے ہی "بقول مولف" مجرم پیش ہوا۔ مہاجرین و انصار دونوں گروہ موجود تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ "ابھی تک تیرے لئے اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لانے کا موقع نہیں آیا"

ابوسفیان: "آپ پر میرے ماں باپ قربان' اس ذات برحق کی قسم جس نے آپ کی ذات میں تحمل و کرم' رحم' صلہ رحمی جیسی صفات اعلیٰ کو سمو دیا ہے۔ اگر ایک اللہ کے سوا کوئی اور اللہ ہوتا تو آج وہ کچھ نہ کچھ تو میری حمایت کرتا"۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تو مجھے اللہ تعالیٰ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تسلیم کرلے؟

ابوسفیان: جناب پر میرے ماں باپ نثار اس ذات برحق کی قسم میں آپ کو ان کا رسول برحق (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ماننے میں اب بھی متذبذب ہوں!

اس پر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ ابوسفیان بحث کو چھوڑو۔ اور کہو "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ورنہ تمہاری گردن ماردی جائے گی۔ (مولف نے ثابت کیا ہے کہ ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے موت کے ڈر سے کلمہ پڑھا اور یہ روایت اکثر سیرت نگاروں نے غلط ثابت کی ہے۔ مترجم)

ابوسفیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایمان لے آئے کلمہ طیبہ پڑھا۔ اس مرتبہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی اگر آپ اس موقع پر ابوسفیان کے اعزاز میں کچھ حکم فرمائیں تو اس کی خوش نصیبی ہوگی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ جو شخص ابوسفیان کے گھر میں پناہ لے لے یا اپنے گھر کا دروازہ بند کرلے اندر چھپ جائے یا بیت اللہ شریف میں چلا جائے وہ امان پائے گا۔

حسنِ اتفاق کہیں یا پہلے سے طے شدہ

مذکورہ واقعات سے اکثر مورخین متفق ہیں' البتہ بعض اہلِ تاریخ فرماتے ہیں کہ ان واقعات کو حسنِ اتفاق کی بجائے پہلے سے طے شدہ کیوں نہ سمجھ لیا جائے؟

(الف) کیا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ واقعہ ہی اپنے گھر سے مدینہ جانے کے لئے نکلے تھے اور مقام

جحفہ میں ان کی ملاقات نبی اکرم ﷺ سے حسن اتفاق سے ہو گئی تھی۔

(ب) وہی بدیل جو چند دن پہلے بنو خزاعہ پر ہونے والے ظلم کی فریاد لے کر مدینہ منورہ گئے تھے' تاکہ رسول اللہ ﷺ سے ان کے لئے مدد حاصل کر سکیں۔ آج وہ بنو خزاعہ کے دشمن ابوسفیان کے ساتھ مل کر مسلمانوں کی جاسوسی کرنے کے لئے مدینہ کیسے چلے گئے؟

(ج) کیا ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو یہ علم نہ ہوا کہ اتنا بڑا لشکر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مکہ پر چڑھائی کرنے آیا ہے۔

(د) ہو سکتا ہے عباس اور ابوسفیان دونوں نے پہلے سے اس موقع پر ملاقات کا منصوبہ بنا رکھا ہو؟ جہاں بدیل بن ورقہ اور حکیم بن حزام کے ساتھ عباس رضی اللہ عنہ کی ملاقات ہو گئی۔ طے ہوا ہو کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ محمد رسول اللہ ﷺ سے مل کر آئیں گے اس کے بعد ابوسفیان مکہ کی طرف سے انہیں اسی راہ پر یہیں ملیں گے؟

دوسرا احتمال صحیح ہونے کی صورت میں ممکن ہے ابوسفیان کو میعاد صلح کی توسیع کے لئے مدینہ سے ناکام لوٹنے کے بعد یہ یقین ہو گیا ہو کہ اب کفار مکہ کا نبی آخر الزماں ﷺ پر غالب آنا ناممکن ہے۔ اس بناء پر آج ابوسفیان کو مکہ فتح ہونے کا بھی یقین ہو گیا ہو' اور اس کے ساتھ ہی ابوسفیان فتح مکہ کے بعد اپنی سیادت کو باقی رکھنے کے لئے حکمت عملی کا منصوبہ بنا کر رسول اللہ ﷺ سے ملنے آیا ہو۔ آج ابوسفیان نے محسوس کر لیا کہ رسول اللہ ﷺ نے مکہ فتح کرنے کے ارادہ کا اظہار صرف اپنے جانثاروں کے سوا اور کسی کے سامنے نہیں کیا۔ ان جانثاروں کے سامنے جو آپ ﷺ کے پسینہ کی جگہ اپنا خون بہانا حیات جاوداں رحمت دوجہاں کے مصداق مانتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب ابوسفیان عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ رسول اللہ رضی اللہ عنہ کے حضور میں حاضر ہوئے تو عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے انہیں دیکھتے ہی قتل کرنے کا ارادہ کر لیا۔ غرض یہ کہ اس قسم کی دو مختلف روایات موجود ہیں۔ دونوں کے پاس دلائل بھی ہیں۔ ہم کسی کی حتمی طور پر نہ تو تائید کر سکتے ہیں اور نہ ہی تردید! لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ فتح مکہ جیسی عظیم الشان کامیابی جو کسی خوں ریزی یا مقابلہ کے بغیر عالم وجود میں آئی' تاریخ کی وہ اہم ترین مثال ہے جس سے رسول اللہ ﷺ کی فراستِ نبوت اور عام انسانوں کی حکمت و سیاست سے کہیں زیادہ اعلیٰ بلند اور مقدس ترین ہے۔

حسنِ تدبیر

بیشک اللہ تعالیٰ کا ارشاد برحق ہے۔ نصرت و کامیابی دینے کا مختار صرف اللہ جل شانہ ہے۔

یوتیہ من یشاء جس کو چاہے عطا فرمائے لیکن اس کا ایک فرمان یہ بھی ہے کہ وہ اس کی مدد کرتا ہے جو حسنِ تدبیر اور موقع شناسی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ رسول اللہ ﷺ صرف ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے ایمان لانے پر مطمئن نہیں ہو گئے بلکہ انہوں نے کفر کی شکست کے لئے ہر قسم کی پیش بندی اور احتیاط کو مدِ نظر رکھا اور پھر ابوسفیان رضی اللہ عنہ کو ایک ایسے تنگ درے کی چوٹی پر کھڑے رکھا جس سے اسلامی لشکر کو گزر کر مکہ معظمہ میں داخل ہونا تھا تا کہ وہ حشمت سپاہ و لشکر اسلامی کو دیکھ کر خود ہی خائف ہو اور اپنے سابقہ ہم خیال مکہ والوں کو بھی ڈرائے تاکہ مسلمانوں سے کسی کو مقابلہ کرنے کا خیال بھی نہ آئے۔

ابوسفیان کے سامنے سے مسلمانوں کے مختلف قبائل کا دستہ ایک ایک کر کے گزرتا گیا۔ انہیں میں سے ایک دستہ جس کا علم سبز رنگ کا تھا جب گزرنے لگا تو ابوسفیان نے ان کے بارہ میں پوچھا۔ اس دستہ میں مہاجرین و انصار دونوں کے تیغ زن تھے۔ ان میں سے ہر سپاہی خود اور زرہ میں لپٹا ہوا تھا کہ آنکھوں کے سوا کوئی حصہ نظر نہیں آتا تھا۔

ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کی یہ قوت و جمیت یہ شان و شوکت دیکھ کر سیدنا عباس سے عرض کیا۔ عباس آج کسی کو اس لشکر کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں۔ یہ اللہ کی شان ہے۔ اے ابو الفضل تمہارے برادر زادہ کی بادشاہت قائم ہو ہی گئی۔ یہ کہہ کر ابوسفیان نے ایک پہاڑ پر کھڑے ہو کر بلند آواز سے پکارا۔

یا معشر القریش! ھذا محمد قد جائکم فی مالا قبل لکم بہ

قریشیو! محمد ﷺ اتنا بڑا جری لشکر لے کر آئے ہیں کہ تم ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

البتہ—— من دخل دار ابی سفیان فھو امن و من اغلق علیہ الباب فھو امن و من دخل المسجد فھو امن!

جو شخص ابوسفیان کے گھر میں جا کر چھپ جائے وہ مامون ہو گیا۔ (امن پا گیا) اور جو بھی اپنے گھر کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جائے وہ بھی امن پا گیا اور جو مسجد حرام میں داخل ہو جائے گا وہ بھی امن یافتہ ہو گا۔

رسول اللہ ﷺ لشکر کے ہمراہ آگے بڑھے۔ ذی طویٰ کے مقام پر پہنچے تو دیکھا کہ اہلِ مکہ کو مقابلہ میں آنے کی ہمت نہیں۔ فوج کو توقف کا حکم فرما کر خود سواری ہی پر اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں سجدہ شکر ادا کیا کہ اس نے اول ھبطِ وحی کے دروازے کھلوا دیئے اور مومنین کے لئے اطمینان و سکون کے ساتھ بیت اللہ شریف میں آنے جانے کی راہ پیدا فرما دی۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ کے والدِ محترم رضی اللہ عنہ

ابو قحافہ بہت بوڑھے تھے اس کی وجہ سے ان کی آنکھوں کی بینائی جا چکی تھی۔ انہوں نے

اس موقع پر اپنی نواسی سے کہا- بیٹی میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کوہ ابوقبیس پر لے چلو- جب دونوں پہاڑ پر پہنچ گئے تو صاحبزادی ایک طرف غور سے دیکھنے لگیں- ابو قحافہ نے محسوس کیا کہ بچی کسی خاص چیز کی طرف تجسّس سے دیکھ رہی ہے- دریافت کرنے پر ان کی نواسی نے بتایا- کچھ سیاہی سی نظر آ رہی ہے؟ ابو قحافہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ سیاہی نہیں لشکر ہے- نواسی نے ذرا غور سے دیکھا تو سیاہی غائب ہو چکی تھی- حیرت سے کہنے لگے- ارے سیاہی کہاں گئی؟

ابو قحافہ: "وہ تو لشکر تھا بیٹی جو مکہ میں داخل ہو گیا- اللہ کے لئے مجھے جلدی سے گھر پہنچا دو"-

چنانچہ ابو قحافہ کے گھر پہنچنے تک اسلامی لشکر مکہ معظمہ میں داخل ہو چکا تھا- اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنے رب والجلال والاکرام کا شکر ادا فرمایا-

لیکن فتح کے ان تمام مراحل کے ساتھ ساتھ نبی رحمت و حکمت صلی اللہ علیہ وآلہ نے ہر قسم کی احتیاط و تدابیر کا خیال رکھا- پہلے مرحلہ پر لشکر اسلامی کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے ہر ایک کو یہ خصوصی ہدایت فرمائی کہ مجبوری یا اضطرار کے سوا کسی پر حملہ نہ کیا جائے- گویا آپ نے جہاں ضرورت پڑے صرف وہیں مدافعت کرنا ہے- نہ تو کسی پر حملہ کرنا ہے نہ کسی کو اذیت دینا ہے-

لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد اس ترتیب سے داخلہ کا فرمان صادر ہوا-

(1) مکہ مکرمہ کے شمالی دروازہ سے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ میسرہ کو ساتھ لے کر داخل ہوں-

(2) بائیں جانب شہر سے- جناب خالد بن ولید رضی اللہ عنہ میمنہ کے ساتھ داخل ہوں-

(3) غربی سمت سے- سیدنا سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ (انصاری) اہل مدینہ کو لے کر داخل ہوں-

(4) جبل ہند کے سامنے والی راہ سے- حضرت عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کو نہتے مہاجرین کی سپہ سالاری دی اور خود نبی کل عالم رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ بھی ستے کے ہمراہ تھے-

نعرہ قتال پر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی معزولی

دستوں کی روانگی کے ساتھ جوش و جلال میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا-

الیوم یوم الملحمہ الیوم تستحل الحرمہ

آج گھمسان کی جنگ ہونے والی ہے- ممکن ہے کہ حرمت کعبہ بھی ملحوظ خاطر نہ رہے- ظاہر ہے یہ نعرہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے اس فرمان کے خلاف تھا جس میں واضح ہدایت کر دی

گئی تھی کہ کوئی مسلمان مجبوری اور کوئی دوسرا راستہ نہ ہونے کے بعد صرف اپنی مدافعت کے لئے تلوار اٹھا سکتا ہے۔ ورنہ اہل مکہ میں سے کسی پر ہتھیار نہ اٹھایا جائے۔ خونریزی نہ کی جائے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے حکم صادر فرمایا۔

"سعد رضی اللہ عنہ سے علم لے کر ان کے صاحبزادے قیس کے سپرد کر دو۔"

جناب قیس ابن سعد قوی الجثہ ہونے کے ساتھ ساتھ بردبار بھی تھے۔

مکہ والوں کا حملہ

اسلامی لشکر کے تین دستے تو اپنے مقررہ راستوں سے بغیر کسی تصادم یا رکاوٹ کے شہر میں داخل ہو گئے لیکن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دستے کو دفاع کے بغیر کوئی چارہ نہ رہا۔

پائین شہر والے لشکر اسلامی کے پہنچنے سے پہلے مورچے سنبھالے بیٹھے تھے۔ یہ بدنصیب مکہ کے دوسرے لوگوں سے زیادہ ہی رسول اللہ ﷺ سے دل میلے رکھتے تھے۔ دشمنی پہ تلے ہوئے تھے۔ انہیں لوگوں نے مسلمانوں کے حلیف بنو خزاعہ کے حلاف بنو بکر کی حمایت کی تھی۔ آج انہوں نے ابوسفیان کے منع کرنے کے باوجود جنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گو محلّے کے چند آدمی ادھر ادھر کترا گئے لیکن نوجوانوں کی اکثریت مورچہ پر جم کر لشکر اسلامی کی آمد کا انتظار کرنے لگی ۔ ان کے سرغنہ صفوان بن امیہ، سہیل بن عمروؓ عکرمہ بن ابوجہل۔ جونہی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا دستہ قریب پہنچا انہوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی لیکن خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے جوابی حملہ سے لمحہ بھر میں بعض روایت میں تیرہ اور بعض روایات کے مطابق اٹھارہ ڈھیر ہو گئے اس کے بعد ان کی لاشیں چھوڑ کر باقی سب ادھر ادھر بھاگ لئے۔ اس حادثہ میں مسلمانوں کے دو آدمی ایسے شہید ہوئے جو مسلمانوں کے دستے سے بچھڑ کر کفار کے نرغہ میں آ گئے تھے۔

سپہ سالارانِ کفار صفوان، سہیل اور عکرمہ نے خود کو خالد رضی اللہ عنہ کی زد میں دیکھا تو ان کی شجاعت اور جنگی مہارت کے خوف سے اپنی اپنی جان بچا کر ادھر ادھر نکل گئے اور جنہیں مسلمانوں کے خلاف لڑنے کے لئے اکسایا تھا۔ انہیں خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔

رسول اللہ ﷺ کا اضطراب

جب رسول رحمت ﷺ جبلِ ہندی کے بالکل برابر والی پہاڑی پر مہاجرین اور انصار کے دستہ کے ساتھ تشریف فرما ہوئے۔ آپ ﷺ یوں پرامن یہاں تک پہنچنے کی وجہ سے انتہائی خوش تھے، لیکن جونہی مکہ معظمہ کے پائیں حصہ کی طرف دیکھا تو تلواریں چمکتی نظر آئیں تو آنحضرت ﷺ بہت زیادہ پریشان ہو گئے۔ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ خود کو دشمن سے بچا رہے تھے۔ خیال آیا میں نے تو قتال سے سب کو منع کر دیا تھا پھر ایسا کیوں؟ لیکن اصل حقیقت

بیان کی گئی تو آپ ﷺ مطمئن ہو گئے اور فرمایا۔ شاید اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مصلحت ہو گی۔

نصب خیمہ

رسول اللہ ﷺ جبل ہند کے سامنے والے درہ "اعلیٰ مکہ" سے شہر میں داخل ہوئے۔ جس کے متصل سیدہ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اور جناب ابوطالب کی قبریں ہیں۔ سیدالبشر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنا خیمہ ان کے قریب نصب کیا۔ لیکن بعض جانثاروں نے عرض کیا۔ اگر اجازت ہو تو آپ کے آبائی دولت کدہ میں آرام فرمانے کا اہتمام کیا جائے؟ فرمایا نہ میں آبائی گھر میں اترنا چاہتا ہوں' نہ ہی میرے مہربانوں نے اسے میرے لئے باقی رہنے دیا ہے۔ اس کے بعد آپ ﷺ اپنے مختصر سے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ دل بیحد خوش اور ہر سانس پر اللہ رحیم و کریم کے احسانات کا شکر ادا فرما رہے تھے۔ اللہ عزوجل شکر ہے' بے حدو حساب شکر ہے۔ وہی شہر جو میرے لئے رنج و محن کا گھر تھا۔ جس کے رہنے والوں کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا گیا۔ آج انہیں بے کس اور بے سہارا لوگوں کے ساتھ اس شہر میں اس عدیم المثال شان کے ساتھ داخل فرمایا۔

ختم رسل ﷺ نے متشکر نگاہوں سے پہاڑی کی بلندی سے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ تو شعب ابو طالب پر نظر رکی۔ جہاں قریش مکہ سے ان ہی کی وجہ سے بنو ہاشم سے مکمل قطع تعلق کا المناک زمانہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ یہاں سے نظر ہٹی جبل بوقبیس پر آکر رکی۔ اسی پہاڑ کے ایک غار میں برسوں گوشہ نشینی کے کیف و کم میں محو رہے اور اسی پہاڑ کے غارِ حرا میں پہلی وحی نازل ہوئی۔

اقراء باسم ربک الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقراء وربک الاکرم الذی علم باالقلم علم الانسان مالم یعلم۔ (96-1 تا 4)

"اے محمد اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا۔ پڑھو تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جس کا اس کو علم نہ تھا۔"

ان اونچی نیچی پہاڑیوں کے دامن میں اور کہیں ان کی چوٹیوں پر بسے گھر' اور ٹھیک درمیان میں اللہ تعالیٰ کے گھر بیت اللہ پر نگاہ پڑی تو اللہ غفور الرحیم کی عنایات و احسانات کرم و رحمت کے تصورات سے دل بھر آیا۔ آنکھوں میں آنسو اظہارِ تشکر کی صورت اس طرح برسنے لگے جیسے ساون بھادوں کی جھڑی لگ گئی ہو۔ کپکپاتے ہونٹوں پر دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی۔ بلاشبہ

ہر کام کی ابتداء و انتہاء اللہ عزوجل ہی کے قبضہ و اختیار میں ہے۔

اعمالِ مبارکہ

اب جمال و کمال انسانیت رحمت دوعالم محمد ﷺ نے خیال فرمایا عساکر اسلامی کا کام اس وقت مکمل ہوا۔ خیمہ سے باہر تشریف لائے۔ اپنی ناقہ قصواء پر سوار ہو کر بیت اللہ میں داخل ہوئے۔ سواری ہی پر کعبہ کے سات طواف فرمائے۔ اپنی خم دار دستہ والی چھڑی کی نوک کو رکن یمانی سے چھو کر چھڑی ہی کے ذریعہ استلام کیا۔ کلید بردار کعبہ عثمان بن طلحہ کو طلب فرما کر کعبہ کا دروازہ کھلوایا۔ خود رسول اللہ ﷺ دروازہ کے باہر ہی تشریف فرما رہے۔ بیت اللہ کے وسیع ترین صحن میں لوگوں کا ہجوم تھا۔ آپ ﷺ نے خطاب فرمایا۔

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من ذکر وانثی وجعلنا کم شعوبا" وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم ان اللہ علیم خبیر - (13:49)

اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا۔ تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرسکو اور اللہ کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔ بیشک اللہ سب کچھ جاننے والا اور سب سے خبردار ہے۔

مجرموں کو عام معافی دینے کا اعلان

خطبہ کے بعد حاضرین مجلس سے دریافت فرمایا!

یا معشر قریش ما ترون انی فاعل بکم

"اے قریش میری طرف سے تمہیں کس قسم کے سلوک کی امید ہے؟"

اہل مکہ کے وکیل حدیبیہ سہیل بن عمرو نے عرض کیا۔

خیرا" اخ کریم وابن اخ کریم (ﷺ)

"آپ ہمارے مشفق بھائی اور مہربان بھائی کے فرزند ہیں۔ ہمیں آپ سے حسن سلوک ہی کی امید ہے۔"

فرمایا-- فاذھبوا فانتم الطلقاء تو جائیے جہاں جی چاہے رہیے آپ لوگ آزاد ہیں۔

دوستو---- رسول رحمت و شفقت کا ایک ہی جملہ ان کے لئے جاں بخشی کا سبب بن گیا' جنہوں نے نامعلوم کتنے ستم کتنے ظلم آپ ﷺ پر کئے تھے۔ آج دشمن پر پورا اختیار اور قدرت ہونے کے باوجود عفو عام صرف اور صرف آنحضرت ﷺ ہی کی ذات اقدس کے اخلاق حسنیٰ کا خاصہ ہے۔ جس میں نہ حسد' ہے نہ کینہ ہے' نہ بغض ہے۔ آج رسول اللہ ﷺ کے ان دشمنوں کی جان آپ ﷺ کی مٹھی میں ہے۔ آپ کے حضور دس ہزار فوج جری کا لشکر دست بستہ حکم کا منتظر ہے۔ ایک لفظ----- ان لوگوں کے سر قلم کروا سکتا ہے۔

دوسرے لفظ سے ان لوگوں کے شاندار قلعہ اور عمارتیں زمیں بوس ہو سکتی ہیں۔ یہ سراپا رحم و کرم وجود علیہ الصلوٰۃ والسلام انسان کا دشمن نہیں۔ یہ قابل صد مدح و ثنا محمد ﷺ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نبی' اللہ تعالیٰ کی تعلیمات کھول کر بیان فرمانے والے علیہ التحیۃ والسلام ہیں۔ یہ پروردگارِ عالم کے رسول ہیں' علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اس کے بندوں کو اسی کے احکامات پہنچانے کے لئے اللہ ہی کی طرف سے نامزد (مقرر ہیں) آپ سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام ان میں سے نہیں جن کے دل میں لحہ بھر کے لئے بھی اولاد آدم و حوا کے لئے دشمنی یا انتقام کا جذبہ ابھر آئے۔ آپ ﷺ نہ سخت گیر ہیں' نہ ہی متکبر ہیں' بیشک اللہ تعالیٰ نے آج آپکو آپ کے قدیم ترین دشمنوں پر فتح نصیب فرمائی لیکن آپ نے ان پر پورا اختیار و قدرت رکھنے کے باوجود معاف فرما دیا۔ تمام دنیا کے سامنے عفوو احسان کی ایسی مثال پیش کر دی کہ ایسی مثال نہ اس سے پہلے نہ اس کے بعد دیکھنے اور سننے میں آئی۔ ابن آدم کی پوری تاریخ میں اس عظیم کردار کی جھلک تک نہیں ملتی۔

تطہیر کعبہ

اب رسول اللہ ﷺ کعبہ میں تشریف لے گئے۔ ہر طرف بتوں کی بھرمار دیکھی دیواروں پر ملائکہ کی اور انبیاء کی فرضی تصاویر بنی ہوئی تھیں' جس میں ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھ میں فال کے تیر دکھائے گئے تھے۔ گویا اللہ تعالیٰ کے نبی بھی فال کے تیروں کا سہارا لے کر نبوت چلاتے تھے۔ کاٹھ کا کبوتر بھی پوجا کے لئے موجود تھا۔ جسے آنحضرت ﷺ نے زمین پر پٹک کر توڑ ڈالا اور ابراہیم علیہ السلام کی تصویر پر کچھ دیر نگاہ جمائے رکھنے کے بعد فرمایا۔ ان پر اللہ کی مار! انبیاء کے جد اعلیٰ کو فال پرست ٹھہرا دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ اسلام اور تیروں سے تفاول؟ فال نکالنا' تف بر عقل۔ ارشاد فرمایا۔

ماکان ابراھیم یھودیا" ولا نصرانیا" ولکن کان حنیفا" مسلما" وما کان من المشرکین (67:3)

ابراھیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے نہ نصرانی تھے۔ بلکہ سب سے بے تعلق ایک اللہ وحدہ لاشریک کے ہو گئے تھے۔ اسی کے فرماں بردار تھے اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔

ملائکہ کی تصویروں پر نگاہ ڈالی تو سب کی سب تصویروں کو پری جمال نازنینوں کی صورت جلوہ بار پایا۔

فرمایا! غضب اللہ کا فرشتے تو نہ مرد ہیں نہ عورت! ان کو مٹا دینے کا حکم فرما کر جب ذرا اوپر نگاہ ڈالی تو محرابِ کعبہ کے ہر طرف بت ہی بت نظر آئے۔ جنہیں دیوار کے ساتھ چونے کے ساتھ چپکا دیا گیا تھا۔ ہبل کعبہ کے ٹھیک درمیان میں رکھا ہوا تھا۔ حضور بت شکن' شرک شکن' باطل شکن' علیہ الصلوٰۃ والسلام چھڑی سے ہر ایک بت کی طرف اشارہ فرماتے اور پڑھتے

جاتے تو بت خود بخود گرتے جاتے!

قل جاء الحق وزھق الباطل ان الباطل کان ذھوقا" (81:17)

اور کعبہ رو حق آگیا اور باطل نابود ہو گیا۔ بیشک باطل نابود ہونے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے رسول برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام آج سے بیس سال پہلے جس مقصد کے لئے دعوت دے رہے تھے اور اپنی امت کو دینِ حق پر مستحکم رہنے کی مثال قائم فرما رہے تھے اور قریش جن بتوں اور شرک کے لئے سینہ سپر رہے آج ان جھوٹے معبودوں ان کی تصویروں اور مجسموں سے اللہ تبارک وتعالیٰ وحدہ لاشریک کا گھر پاک و صاف ہو گیا۔ لوگوں کے سامنے ان کے معبودوں کی تصویریں کھرچ دی گئیں اور ان کے سامنے ان کی موجودگی میں ان کے سب سے بڑے معبود ہبل اور اس کے حاشیہ بردار بتوں کو اٹھوا کر باہر پھینک دیا گیا۔ قریش حیران تھے کہ انہیں تو وہ اور ان کے بڑے باپ دادا سب حاجت روا سمجھتے تھے۔ انہیں کیا ہو گیا ہے یہ اپنی ذات کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔

انصار کو خدشہ

رسول اللہ ﷺ کے قدم بقدم سانس بسانس ساتھ چلنے والے مدینہ منورہ کے جانثار انصار ہر منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جب بیت اللہ کی تطہیر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر دعا فرمائی تو انصار کے دل میں یہ خیال آیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے مولد مقدس پر فتح حاصل کر لی ہے۔ اب مدینہ منورہ کیسے جائیں گے؟ یہاں تک کہ ان میں سے دو ایک نے اسی مفہوم کی آپس میں باتیں بھی کیں! انصار کے اس خدشہ کے اسباب بہت زیادہ تھے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور مکہ معظمہ میں اللہ کا گھر ہے مگر دعا ختم کرتے ہی رسول اللہ ﷺ نے انصار سے مخاطب ہو کر پوچھا پھر ان کے اظہارِ تردد پر فرمایا۔ معاذ اللہ تم لوگ کیا سمجھ رہے ہو! میرا ارادہ یہ کیسے ہو سکتا ہے جس کی زندگی اور موت دونوں تم لوگوں سے وابستہ ہیں۔ آنحضرت ﷺ کا یہ اشارہ بیعتِ عقبہ میں باہم معاہدہ کی طرف تھا۔ جس میں انصار کے ساتھ عہد و پیمان ہوئے تھے۔ اگر انصار نے اپنی طرف سے وفاداری کا یقین دلایا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے بھی اسی کا عہد فرمایا تھا۔ وہ عہد و پیمان وطن، اہل و عیال بلکہ اللہ تعالیٰ کے گھر کے باوجود بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے رسولِ برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا عہدِ مستحکم تھا۔

بیت اللہ میں اذان

تطہیرِ کعبہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو کعبہ کی چھت پر چڑھ کر اذانِ صلوٰۃ کہنے کا حکم فرمایا۔ اذان دی گئی اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کی

امامت میں مسلمانوں نے صلوٰۃ ادا کی۔ جو آج بھی چودہ سو پندرہ سال سے جاری ہے۔ بلال رضی اللہ عنہ کی طرح ان کے قائم مقام مؤذن اور ان کے نائبین اپنے اپنے زمانہ میں یہ اذان دے رہے ہیں۔

اسی بیت اللہ کے اندر دن رات پانچ مرتبہ مکبر پر سروقد موذن کھڑے ہو کر اذان دے رہے ہیں۔ اسی طرح نہ صرف بیت اللہ کے نزدیک اور ہر طرف بلکہ دنیا کے ہر گوشہ میں رہنے والے مسلمان اس عائد شدہ فریضہ اذان کو ادا کر رہے ہیں اور اسی بیت الحرام کی طرف منہ کر کے بارگاہِ الٰہی میں انتہائی خشوع و خضوع کے ساتھ صلوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ جس گھر کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ فتح ہونے کے بعد بتوں سے پاک و صاف فرما دیا۔

ناقابل معافی

البتہ قریش میں سترہ ایسے ناقابلِ معافی مجرم تھے جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفقت و محبت نصیب نہ ہوئی اور انہیں قتل کرنے کا حکم فرمایا۔ ان میں سے اگر کوئی کعبہ کے غلاف میں بھی چھپا ہو تو اسے وہاں سے کھینچ کر بھی قتل کر دو۔

جن لوگوں کے بارے میں قتل کا حکم دیا گیا اس میں سے کچھ تو زیر زمین روپوش ہو گئے، بعض مکہ عکرمہ سے بھاگ کر مکہ سے دور چلے گئے لیکن ان مجرموں کے ساتھ یہ برتاؤ کسی کینہ یا برہمی کی وجہ سے نہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اخلاق ان سب سے مبرّا منزہ اور پاک تھا بلکہ ان بدبختوں نے خود اپنے بداعمال کی وجہ سے یہ دن دیکھا۔ ان مجرموں کی فہرست مندرجہ ذیل ہے۔

(1) عبداللہ ابن سعد:۔ جو مسلمان ہونے کے بعد کاتبِ وحی کے عہدہ پر فائز ہوا لیکن اس کی بدفطرت رنگ لائے نہ رہی۔ اسلام چھوڑ کر کفّارِ مکہ میں شامل ہو گیا اور یہاں آ کر یہ ڈینگیں مارنے لگا کہ میں قرآن میں کمی بیشی کرتا رہا ہوں۔

(2) عبداللہ ابن خطل:۔ یہ بھی اسلام قبول کرنے کے بعد مرتد ہو گیا اور مرتد ہونے کے بعد اپنے بے گناہ غلام کو قتل کر دیا۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنی دو کنیزوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجو سے بھرے قصے اور راگ کے سنانے پر مقرر کر دیا۔ ان سے خود بھی سنتا اور دوسروں کو بھی سناتا۔

(3 اور 4):۔ مذکورہ انہی گانے والی خرافہ عورتوں (کنیزوں) کو بھی قتل کا حکم دیا گیا۔

(5) عکرمہ بن ابوجہل:۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے انتہا دشمنی رکھتا تھا فتح مکہ کے روز بھی خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے دستہ پر اسی نے حملہ کیا اور دوسروں سے کروایا۔

(6) صفوان بن امیہ۔

(7) حویرث بن نقیذ۔ جناب زینب بنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کے موقع پر سیدہ زینب

رضی اللہ عنہا کی سواری کو اس زور سے کونچا دیا کہ سواری بے تحاشا بھاگی اور سیدہ زمین پر گریں اور اسقاط حمل ہو گیا۔

(8) مقیس بن حبابہ:۔ مسلمان ہونے کے بعد مرتد ہو کر مشرکوں کا مددگار بن گیا۔

(9) ھبار بن اسود۔

(10) ہندہ بنت عتبہ:۔ زوجہ ابوسفیان سید الشہداء عم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت حمزہ کا کلیجہ چبانے والی۔

ان میں سے چار کردار تو اپنے انجام بد کو پہنچ گئے۔ ابن اخطل اس کی کنیز قریبہ مقیس، حویرث۔

باقی کی سرگزشت اس طرح ہے۔

(1) عبداللہ بن سعد۔ (1) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے سوتیلے رضاعی بھائی تھے۔ ممدوح اسے ہمراہ لائے۔ جاں بخشی کی سفارش پیش کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تھوڑی دیر خاموشی کے بعد معاف فرما دیا۔

(2) عکرمہ بن ابوجہل (5) کی اہلیہ سیدہ ام حکیم بنت الحارث اسلام لے آئی تھیں۔ عکرمہ فرمان قتل سن کر یمن بھاگ گیا۔ ام حکیم نے اپنے شوہر کی جاں بخشی کی درخواست کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبول فرمائی تو بی بی خود یمن کی طرف گئیں۔

(3) صفوان ابن امیہ (6) بھی عکرمہ کے ہمراہ تھے۔ دونوں ایک کشتی میں سوار ہو کر یمن کی طرف جانے کے لئے پتوار سنبھالنے کو تھے کہ بی بی ام حکیم پہنچ گئیں۔ اور جاں بخشی کی خوشخبری سنا کر انہیں واپس لے آئیں۔

(4) سیدہ ہندہ (نمبر 10) زوجہ ابوسفیان

فتح مکہ کے بعد دوسرا خطبہ

فتح کے دوسرے روز بنو خزاعہ نے قبیلہ ہذیل کے ایک مشرک کو اپنی سابقہ دشمنی کی بنا پر قتل کر دیا یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچی تو آپ نے یہ خطبہ ارشاد فرمایا۔

یا ایھا الناس ان اللہ حرم مکہ یوم خلق السموات والارض فھی من حرم الی یوم القیامہ لایحل لامرء یومن باللہ والیوم الاخر ان یسفک فیھا دما" اورلیعضل فیھا شجرا" لم تحلل لاحد کان قبلی ولا تحل لاحد یکون بعدی ولم تحلل لی الا ھذہ الساعتہ غضبا" علی اھلھا ثم رجعت کحرمتھا بالامس فلیبلغ الشاھد الغائب فمن قال لکم ان رسول اللہ قد قاتل فیھا تقولوا ان اللہ قد احلھا الرسولہ ولم یحللھا لکم۔

"اے لوگو! اللہ عزوجل نے مکہ مکرمہ کو حرمت دی ہے۔ اس دن سے جب سے یہ زمین اور آسمان پیدا کیا اور یہ حرمت قیامت تک قائم رہے گی۔ لہٰذا جو شخص بھی رب کل کائنات اور آخرت پر یقین رکھتا ہو اسے مکہ کے حدود میں کسی کو قتل نہیں کرنا چاہئے بلکہ کسی کو اس کے درخت کاٹنا نہیں چاہئیں۔ مجھ سے پہلے اور مجھ سے بعد کسی کے لئے اس کی حُرمت ختم کرنا ہرگز حلال و جائز نہیں اور میرے لئے بھی صرف ایک لمحہ کے لئے جائز ہوئی۔ وہ بھی تب جب اہل مکہ نے خود اپنے اللہ جل شانہ کو ناراض کر لیا تو صرف اس برہمی کی بناء پر اور اتنی ہی دیر کے لئے، جس کے بعد وہی حرمت پھر برقرار کر دی گئی۔ لوگو جو لوگ آج یہاں موجود نہیں انہیں بھی یہ مسائل بتا دیجئے۔ یاد رکھو اگر کوئی شخص کہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ میں جنگ کی تو جواب میں کہنا کہ یہ تو اللہ تعالیٰ نے صرف اپنے رسول ﷺ کے لئے وقتی طور پر جائز قرار دی تھی مگر یہ تمہارے لئے ہرگز حلال نہیں۔

خزاعہ سے خطاب

یا معشر الخزاعہ! ارنعوا ایدیکم عن القتل فلقد کثران نفع' بعد قتلتم لا دینہ فمن قتل بعد مقالتی ھذا فاھلہ بخیر الناظرین۔ ان شاء وفدم قاتلہ فان شاؤا فعقلہ

اے قبیلہ خزاعہ، قتل و غارت سے ہاتھ روک لو اگرچہ تمہارے لئے اس جنگ میں کوئی فائدہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں فیصلہ کرتا ہوں کہ تمہارے ہاتھ سے جو شخص قتل ہوا ہے اس کے عوض میں قاتلوں کو اپنی طرف سے خون بہا دیئے دیتا ہوں لیکن آئندہ کے لئے مقتول کے وارثوں کو اختیار دیتا ہوں اپنے مقتول کا خون بہا لیں یا قصاص انہیں اختیار ہے۔

چنانچہ قتیل یعنی قتل ہونے والے کے وارثوں کو اپنی طرف سے دیت (خون بہا) ادا کر کے اس تنازعہ کو ختم کر دیا۔

اہلِ مکہ پر اثر

آنحضرت ﷺ شفقت و محبت سے بھرپور لہجہ خطاب اور کریمانہ سلوک نے اہل مکہ کے دلوں کو فتح کر لیا اس حد تک کہ اب دنیا بھر کی دولت یا سلطنت بھی ان کو اتنی مسرت نہیں دے سکتی تھی۔ اب یہ عالم تھا کہ لوگ گروہ در گروہ شوق و خلوص کے ساتھ اسلام کی طرف بڑھے۔ اب آنحضرت ﷺ نے اعلان فرمایا جس کسی کا ایمان اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ہے اسے چاہئے کہ وہ اپنے گھروں سے (اگر کوئی بت ہو) تو اسے نکال کر باہر پھینک دیں۔

حرم کی حرمت

بنو خزاعہ کو حکم دیا کہ حرم کے سنگ میل بارہ پتھریں سے جو بھی ٹوٹ پھوٹ گیا ہو اس کو مرمت کیا جائے۔ اس حکم کو سن کر اہل مکہ کے دلوں میں یہ یقین اور محکم ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک حرم بیت اللہ کی تقدیس و محبت انتہائی پکی ہے۔

اہلِ مکہ سے خطاب

انہی لمحات میں رسولِ رحمت و شفقت ﷺ نے اہل مکہ سے خطاب فرمایا۔ آپ تمام دنیا میں موجود انسانی جماعت سے بہتر ہیں۔ مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کر مدینہ نہ جاتا اور کسی کو تمہارے برابر نہ سمجھتا مگر کیا کروں تم ہی نے مجھے جلاوطن کیا۔ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سن کر اہل مکہ کے دل اور بھی عظمت رسالت کے قائل ہو گئے۔

بوڑھوں سے شفقت و محبت

قیامِ مکہ ہی کے درمیان ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے والد محترم ابو قحافہ کو ساتھ لے کر آئے۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا۔ "اے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) یہ تو بوڑھے ہیں کمزور ہیں میں خود ہی ان کے ہاں چلا جاتا۔ آپ نے انہیں یہاں آنے کی زحمت کیوں دی"۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ: یا رسول اللہ ﷺ یہ ان کا فرض تھا نہ کہ آپ تکلیف فرماتے!

نبی کائنات ﷺ رب ذوالجلال نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے نابینا باپ کو سامنے بٹھایا اور اپنے ہاتھوں سے ان کا سینہ مس کیا اور فرمایا۔ اے شیخ اسلام قبول کیجئے۔ ابو قحافہ رضی اللہ عنہ نے کلمہ طیبہ پڑھا۔ وہ عہد کیا جو ہر مسلمان کرتا ہے۔ "لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ" اس کے بعد جب تک زندہ رہے' دین اسلام کے اصولوں سے اپنی زندگی کو سنوارتے رہے۔

الغرض آج رسول اکرم ﷺ نے اپنے نبوی اخلاقِ اعلیٰ سے ان لوگوں کے دلوں کو اپنا فریفتہ بنا لیا جو کل تک خونیں بھیڑیوں کی طرح ختم الرسل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تعاقب میں مارے مارے پھرتے تھے۔ وہی لوگ آج رحمت دوعالم کی مدح خوانی کو اپنی زندگی کا نچوڑ ماننے لگے۔ رسول رحمت ﷺ کی طرف سے عوام و خواص' قاتل و مقتول' عبادت گاہیں اور عبادت کرنے والے بیت اللہ یا حرم کی عزت و تکریم دیکھ کر مکہ کے مرد' عورتیں' بچے' بوڑھے سبھی حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

سوا تیرے نظر بھر کر کسی کو کس طرح دیکھیں
نگاہِ شوق سے سب چھین لیں دلچسپیاں تو نے

اے رسولِ کل عالم ﷺ!

رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابہ کرام کے ساتھ مکہ معظمہ میں پندرہ روز تک قیام فرمایا۔ اس اثناء میں مکہ بھی اسلامی آئین کے تحت آگیا۔ اس لئے وہاں کے مقامی لوگوں کو شرعی نظم و نسق کی تعلیم و تربیت دیتے رہے۔

یہیں سے بہت سے وفود دعوتِ اسلام کے لئے غیر مسلم قبائل میں بھیجے جنہیں تاکید فرما دی کہ بت جہاں بھی نظر آئیں انہیں نیست و نابود کر دیجئے لیکن خونریزی سے اجتناب کرتے رہیئے۔

اس سے قبل حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نخلہ کے مقام پر بنو شیبان کے معبود بت عزیٰ کو چند مجاہدین کی معیت میں توڑ کر چور چور کرایا۔

حضرت خالد کے ہاتھوں قتل اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی برایت ظاہر فرمائی۔

جناب خالد رضی اللہ عنہ عزیٰ کو ختم کرنے کے بعد بنو خزیمہ کی طرف بڑھ گئے۔ اہل قبیلہ نے انہیں اپنی طرف آتے دیکھا تو مسلح ہو کر نکل آئے۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے ان کو ہتھیار ڈالنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ دوسرے تمام لوگوں نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ لوگ ہتھیار ڈالنے کو تیار تھے مگر ایک بوڑھے نے کہا یہ خالد ہے۔ یہ تمہیں قید کر کے تمام گردنیں اڑا دے گا۔ قبیلہ کے چند اصلاح پسند لوگوں نے یہ بھی کہا کہ دوسرے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں ہر طرف امن و امان کا پہرہ ہے۔ لیک آپ ہم کو قتل کرنا چاہتے ہیں۔ آخر ایک ایک نے ہتھیار ڈال دیئے مگر اس کے بعد خالد نے وہی کیا جس کا انہیں ڈر تھا۔ آخر ایک ایک نے ہتھیار ڈال دیئے مگر اس کے بعد خالد نے وہی کیا جس کا انہیں ڈر تھا۔ سب کی مشکیں باندھیں اور قتل کر دیا۔

الھم انی ابراء ما صنع خالد بن ولید۔

"اے اللہ عزوجل میں خالد کی اس حرکت کا ہرگز ذمہ دار نہیں ہوں"۔

اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بہت سا مال وزر دے کر مظلومین کی طرف بھیجا تاکہ ان کی تعداد کے مطابق دیت ادا کی جائے۔ اور علی رضی اللہ عنہ کو ہدایات دی کہ ضیاعِ نفوس اور اموال کے معاملہ میں جاہلیت کے ناپ تول کو پاؤں تلے روند دیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ہدایات کے مطابق دیت اور اموالِ تاوان ادا کیا بلکہ جو کچھ تھا وہ بھی انہیں کو عطا فرما دیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ پندرہ دن کے قیام میں رسول اللہ ﷺ نے آس پاس کے جتنے بھی بت کدے تھے سب کے سب ختم کروا دیئے۔ مگر بیت اللہ شریف کے مناصب میں سے دو

مناصب برقرار رکھے۔

(1) کلید برادری جناب عثمان بن طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو چابی دیتے ہوئے فرمایا۔ ان سے یہ چابی ظالم کے سوا کوئی دوسرا لینے کی جرآت نہ کرے۔ یہ وہی عثمان بن طلحہ ہیں جن کے خاندان میں کلید کعبہ نسل در نسل چلی آ رہی تھی۔

(2) سقایت

زائرین بیت اللہ کو پانی پلانے کا منصب نسل در نسل سیدنا عباس بن عبدالمطلب کو سونپ دیا گیا۔

آج سے مکہ اور اس کا حرم از سرنو امن و سلامتی کا گہوارہ بن گیا۔ جہاں سے نور توحید کی تابندہ و درخشاں شعائیں ابھریں اور ساری دنیا کو اپنی شعاؤں سے منور کر دیا۔ جن کا نور آج بھی ہمارے دلوں میں کر انہیں منور کر رہا ہے۔

غزوۂ ہوازن اور طائف

غزوہ ہوازن اور طائف

پھر اسلام دشمن اجتماع

فتح مکہ کے بعد چند دن رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام مکہ میں ہی رہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی مہربانیوں اور احسانات کا شکر ادا کرتے رہے' سب سے زیادہ خوشی اور اطمینان اس بات پر تھا کہ اللہ کے فضل سے اتنی بڑی فتح قتل و غارت کے بغیر اللہ تعالیٰ نے دی۔ بلال رضی اللہ عنہ اذان کہتے اور مسلمان بیت اللہ شریف میں قیام صلوٰۃ کے لئے حاضر ہو جاتے۔ رسول اللہ ﷺ شہر میں جہاں جاتے' صحابہ کرام ساتھ جاتے۔ مہاجرین اور انصار ہم قدم رہتے۔ مہاجرین اپنی متروکہ حویلیوں میں جاتے تو ان میں بسنے والوں سے مل کر دونوں فریق خوشی کا اظہار کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اس فتح کی بدولت ان کو بھی ہدایت فرمائی ہے۔ فاتح اور مفتوح دونوں کو یہ خوشی ہوئی کہ بلد الامین (مکہ) میں اسلام کا نفاذ اور اس کا استقرار حاصل ہوا۔

لیکن اس اثناء میں اطلاع ملی کہ مکہ کے جنوب مشرقی پہاڑوں میں قبیلہ ہوازن اور ان کے حلیف جمع ہو رہے ہیں۔ ان کا ارادہ مکہ مکرمہ پہ حملہ کرنا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مکہ معظمہ میں بتوں کو توڑنے کے بعد مسلمان ان پر بھی حملہ کر دیں گے۔ لہٰذا اس سے پہلے ہمیں ان پر دھاوا بول دینا چاہیے۔ ورنہ محمد ﷺ اور ان کے ساتھی جنہیں جنگ میں بے انتہا مہارت ہے اور اسی غرور میں وہ عربستان کے تمام قبائل کو مسلمان بنانے پہ تلے ہوئے ہیں وہ انہیں بھی اسی حال میں نہیں رہنے دیں گے۔ یہ تھا ہوازن کا منصوبہ جس کے لئے نوجوان سردار مالک بن عوف نے اپنے قبیلہ کے ساتھ بنو ثقیف' بنو نضیر اور جشم کو شامل کر لیا۔ البتہ ہوازن کے دو قبیلوں کعب اور کلاب نے شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

قبیلہ جشم کا مرد پیر

قبیلہ جشم کے ایک بوڑھے کہنہ مشق' میدان جنگ کے بے انتہا تجربہ کار کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اسے جنگ میں مشورہ دینے کے لئے پلنگ پر اٹھا کر لایا گیا۔

جنگ میں شریک ہونے والے اپنے ساتھ مال' مویشی' بال بچے' سب لے آئے تھے۔ میدان کے ایک طرف اونٹوں کے بلبلانے کی آوازیں تو دوسری طرف گدھوں کے ہنہنانے کا شور' ادھر بکریوں کے ممیانے کا غل غپاڑہ بچوں کے رونے کی چیخ و پکار سے ساری فضا بھری ہوئی

تھی۔ بوڑھے نے سردار مالک بن عوف سے پوچھا ان سب کو ساتھ لانے کی کیا مصلحت ہے؟

مالک بن عوف نے کہا۔ تاکہ بہادر لڑائی میں منہ نہ موڑیں اور انہیں دیکھ کر جی توڑ کر مقابلہ کریں۔

(درید بوڑھے نے کہا) یہ چیزیں اکھڑی ہوئی فوج کے قدم نہیں جما سکتیں۔ ایسے موقع پر صرف فوج، تیر اور تلوار ہی کام آ سکتی ہے۔ اگر تم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے ان کو یہاں سے الگ نہ کیا تو بڑی ندامت ہو گی۔ لیکن نوجوان سردار اور اس کے ساتھیوں نے بوڑھے کی تجویز سنی ان سنی کر دی۔ درید نے اپنی ساری عمر کی فراست کا یہ حشر دیکھا تو خاموش ہو کے رہ گیا۔

کفار کی مورچہ بندی

مالک بن عوف نے اپنی فوج کو حنین کی چوٹی اور پہاڑ کے تنگ دروں کے بالائی کناروں پر تعینات کر دیا اور تاکید کر دی جونہی مسلمان اس وادی میں اتریں فوراً" حملہ کر دیں تاکہ ان کی صفوں میں ایسی ابتری پھیلے کہ وہ خود ہی ایک دوسرے کو قتل کرنے لگیں۔ انہیں بھاگنے کے بغیر کوئی راستہ نظر نہ آئے اور فتح کا نشہ اتر جائے۔ عربستان میں کفار کی دلاوری کی دھاک ایک بار پھر بیٹھ جائے کہ حنین میں ایسی قوت کو پارہ پارہ کر دیا گیا جس نے تمام عرب کو سرنگوں کرنے کا تہیہ کر رکھا ہے۔

فوجوں نے اپنے سردار کے حکم کے مطابق مورچے سنبھال لئے۔ اس صورتحال کا پتہ نبی اکرم ﷺ کو بھی چل گیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی سپہ سالاری میں عساکر اسلامی نے حنین کا رخ کیا۔ اب کے اسلامی لشکر کی تعداد زیادہ تھی اور اس کا مقصد قبیلہ ہوازن اور اس کے حلیفوں کو مکہ معظمہ پر حملہ کرنے سے روکنا تھا۔ اسلامی لشکر کی تعداد 12 ہزار تھی۔ جس میں دس ہزار وہ فوج تھی جو مدینہ سے مکہ آئی تھی۔ اور دو ہزار نو مسلم مکہ سے شامل ہو گئے تھے۔ جن میں ابوسفیان بن حرب بھی تھے۔ مسلمانوں کے سپاہیوں کی زرہوں کی چمک سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ فوج کے مقدمہ میں گھوڑوں کا دستہ تھا۔ جس کی نگرانی میں رسد کے بار بردار اونٹ بھی تھے۔ عرب نے اتنا بڑا لشکر آج تک نہیں دیکھا تھا۔

ہر ایک قبیلہ اپنے اپنے ہاتھ میں علم لئے ہوئے تھا۔ ہر ایک سپاہی اپنی فوج کی کثرت پر اس قدر نازاں تھا کہ ایک نے دوسرے کو کہنا شروع کر دیا "اتنی کثیر التعداد فوج کو کون شکست دے سکتا ہے؟" فوجیں غروبِ آفتاب کے بعد حنین میں جا پہنچیں۔ رات سر پر آنے کی وجہ سے درے کے ادھر ہی میدان میں پڑاؤ ڈال دیا۔ دوسرے روز پو پھوٹتے ہی آگے بڑھے۔ رسول

اللہ ﷺ اپنی سفید اونٹنی پر سب سے آگے تشریف لے جا رہے تھے۔
آنحضرت ﷺ کے پیچھے پیچھے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں بنو سلیم کا دستہ مقدمتہ الجیش میں تھا۔ ان کے ہاتھ میں علم بھی تھا۔

حملہ

جونہی یہ دستہ تہامہ کا میدان طے کر کے حنین کی تنگ گھاٹیوں سے گزرا' کفار کی گھات لگائے ہوئی فوج نے تیروں کی برسات کر دی۔ ابھی دن کا اجالا نہیں ہوا تھا۔ مسلمانوں میں خلفشار پڑ گیا۔ دشمن کے حملہ سے گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ جن کی بد دلی دیکھ کر ابو سفیان حیران ہو گیا۔ جس نے ان لوگوں کو فتح مکہ کے وقت دیکھ کر کہا تھا۔ "کہ ان کے طور طریقوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سمندر سے ادھر نہیں رک سکتے"۔
اسلامی لشکر کے ایک سپاہی شیبہ بن عثمان بن ابو طلحہ جس کا باپ احد میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوا تھا اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ "آج میں بھی اپنے باپ کا بدلہ محمد ﷺ سے لوں گا" اسی لشکر میں سے کلدہ بن حنبل نے کہا۔ آج سحر ٹوٹ گیا۔ کلدہ کی بات صفوان بن امیہ کے کانوں میں پڑی تو کہا۔ تیرے منہ میں آگ پڑے۔ واللہ مجھے ہوازن کی حکومت سے ایک مرد قریش کی فرماں روائی زیادہ محبوب ہے "(اس وقت صفوان ابھی مسلمان نہیں ہوا تھا)"۔
ہوازن کے اس اچانک حملہ نے مسلمانوں میں ایسی ابتری پھیلا دی کہ رسول اللہ ﷺ اونٹنی پر سوار تھے اور مجاہدین آپ ﷺ کے سامنے سے بھاگتے ہوئے جا رہے تھے اور کوئی نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

کوہِ ثبات و عزیمت

صرف ایک ثبات و استقلال کی علامت کبریٰ محمد ﷺ وہاں ڈٹے رہے۔ حالات کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا تھا "کیا آج خاتم الرسل ﷺ کی مسلسل بیس سالہ قربانی کا ثمرہ ان لمحوں میں تلف ہونے کو ہے یعنی آج کے دن فجر کی تاریکی میں ان مجاہدین کے رب نے اپنا دامن جھٹک کر انہیں ہمیشہ کے لئے اپنی نصرت سے محروم کر دیا ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں' یہ ایسے لمحات ہوتے ہیں جن میں ایک قوم یا تو اپنے مقابل کو ملیا میٹ کر دیتی ہے یا خود کو فنا کر دیتی ہے۔ "وکل امۃ اجل اذا جاء اجلھم فلا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون"۔
ترجمہ۔ ہر امت کے لئے مٹنے کا ایک مقررہ وقت ہے جب وہ وقت آ جاتا ہے تو اس میں نہ ایک

گھڑی کا اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی کمی کی جاتی ہے۔

مجاہدین لوٹ آئے

چنانچہ مجاہدین نے لوٹنا شروع کر دیا۔ لمحہ بہ لمحہ تعداد بڑھتی گئی۔ ایک دوسرے کو واپس آتے دیکھ کر مجاہدین کے قدم پھر جمتے گئے۔ لیکن کبھی انصار نے اپنے آدمیوں کو پکارا۔ ''اے انصار!'' اور کبھی فضاؤں میں آواز گونجی ''اے خزرج'' رسول اللہ ﷺ مجاہدین کی کارکردگی کا نظارہ کرتے ہوئے محو پیکار تھے۔ ایک بار پھر گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ اب مجاہدین کفار کو پاؤں تلے روندنے لگے۔ رسول اللہ ﷺ نے باآوازِ بلند فرمایا۔ مجاہدین ہمت مت ہارو۔ لڑائی نے زور پکڑ لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے نصرت کا جو وعدہ فرمایا ہے وہ پورا ہو کر رہے گا۔

کنکریاں پھینکی گئیں

آنحضرت ﷺ نے مٹھی بھر کنکریاں لیکر دشمن کی طرف پھینکیں اور فرمایا۔ شاھت الوجوہ مجاہدین موت سے نڈر دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ آج کا شہید بعد میں زندہ رہنے والے سے زیادہ بہتر ہے۔

شکست

لڑائی نے ہولناک صورت اختیار کر لی۔ ہوازن' بنو ثقیف اور ان کے ساتھیوں کو یقین ہو گیا کہ اب میدان جنگ میں رہنے کا نتیجہ موت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے۔

مالِ غنیمت

کفار میدان چھوڑ کر بھاگے تو اپنے مویشی' عورتیں اور دوسرا مال و اسباب اتنی تعداد میں چھوڑا

اونٹ= 2200 چاندی= 40000 اوقیہ یعنی 4 لاکھ بیس تولہ

بکریاں= 40000 عورتیں اور بچے= 6000

مجاہدین مال و اسباب غنیمت کو جعرانہ پہنچا کر خود مفرورین کے تعاقب میں نکل گئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اس موقع پر اعلان فرمایا کہ اصل قاتل اپنے مقتول کی سواری' اسلحہ وغیرہ کا حق دار ہے۔ جس سے مجاہدین کا ولولہ اور زیادہ ہو گیا۔ (یہ مؤلف کا مفروضہ ہے) ورنہ

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

ربیعہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں درید بن صمہ کا قتل

اسی تعاقب میں ربیعہ ابن دغنہ کے ہاتھوں ایک اونٹ لگا جس کے اوپر ہودج کی جگہ پلنگ تھا۔ انہوں نے سمجھا کہ اس پر کوئی امیرو کبیر عورت ہو گی مگر پلنگ پر ایک ضعیف بوڑھا تھا۔ جسے ربیعہ رضی اللہ عنہ پہچان نہ سکے۔ یہ ہوازن کا جنگی مشیر درید بن صمہ تھا۔ درید نے ربیعہ رضی اللہ عنہ سے پوچھا کیا چاہتے ہو۔ انہوں نے کہا تمہارا قتل' اس کے ساتھ ہی ایک ہاتھ زور سے مارا مگر بوڑھا جھول دے گیا اور وار خالی گیا۔ درید نے ان سے کہا۔ تمہاری ماں نے تمہیں ناکارہ تلوار دے کر بھیجا ہے۔ میری پشت کی طرف تلوار رکھی ہے۔ اس سے کام لو اور دیکھو سر کی ہڈی سے نیچے یعنی گلے پر تلوار مارنا۔ میں اپنے بہادر دشمنوں کو اسی طرح قتل کیا کرتا تھا۔

حضرت ربیعہ رضی اللہ عنہ نے یہ واقعہ اپنی ماں کو بیان کیا تو اس نے کہا تو نے کیا ستم ڈھایا۔ درید نے تو تمہارے قبیلہ کی تین عورتوں کی جان بچائی تھی اور تو نے اسے قتل کر دیا۔

ادھر مجاہدین نے مقامِ اوطاس تک تعاقب جاری رکھا۔ یہاں آ کر کفار کو نرغہ میں لے لیا۔ ایک مرتبہ پھر جنگ کے شعلے بھڑک اٹھے مگر کفار بھاگ کھڑے ہوئے اور حنین میں سے جو عورتیں اور بچے ہمراہ لائے تھے وہ چھوڑے مال اسباب بھی چھوڑا اور جان بچائی۔ جنہیں مسلمان سمیٹ کر جعرانہ میں لے آئے۔ اب ہوازن کی شکست (حنین) پر مہر لگ گئی۔

مالک بن عوف

مالک بن عوف بھی اپنے مشرکین دوستوں کے ساتھ اوطاس میں گھر گیا۔ لیکن وہ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا اور اپنے چند سپاہیوں کے ہمراہ "نخلہ" نامی مقام میں چھپ گیا۔ جو طائف سے ملا ہوا ہے۔

دوستو------ یہ ہے ہوازن کی عبرتناک شکست کی داستان جس کا ایک روح فرسا حصہ یہ بھی ہے کہ ایک بار مجاہدین اسلام آخر شب کی تاریکی میں مشرکین کے حملہ سے گھبرا کر بھاگ نکلے لیکن دوسرا پہلو خوشگوار بھی رہا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثابت قدمی کامیاب ہو کر رہی۔ جن کے ساتھ چند مجاہدین رہ گئے تھے سچ تو یہ ہے کہ یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثابت قدمی تھی کہ اس نے دشمنوں کو شکست سے ہمکنار کیا' ورنہ صورتحال انتہائی مخالف تھی۔ ان حالات سے متعلق قرآن حکیم میں آیات

نازل ہوئیں۔

ولقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرۃ ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلن تغن عنکم شیئا" وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین۔

اللہ تعالیٰ نے بہت سے مواقع پر تمہیں مدد دی ہے (اور جنگ حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرور تھا تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین باوجود (اتنی بڑی) فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے۔ ثم انزل اللہ سکینتہ علٰی رسولہ وعلی المومنین وانزل جنودا" لم تروھا وعذب الذین کفروا وذالک جزاء الکافرین

پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور تمہاری مدد کو فرشتوں کے لشکر جو تم کو نظر نہیں آتے (آسمان سے) اتارے اور کافروں کو عذاب دیا اور کفر کرنے والوں کی یہی سزا ہے۔

ثم یتوب اللہ من بعد ذالک علٰی من یشاء واللہ غفور رحیم۔

پھر اللہ تعالیٰ اس کے بعد جس پر چاہے مہربانی سے توجہ فرمائے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

یاایھا الذین امنوا انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا وان خفتم علیة فسوف یغنیکم اللہ من فضلہ ان شاء ان اللہ علیم حکیم۔ (9:25_28)

اے ایمان والو مشرک تو پلید ہیں۔ تو اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں اور اگر تم کو مفلسی کا خوف ہو تو اللہ چاہے گا تو تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ بیشک اللہ سب کچھ جانتا اور حکمت والا ہے۔

فتح حنین کی قیمت

مسلمانوں کو یہ فتح سستے داموں نہ پڑی۔ انہوں نے اس کی بہت قیمت ادا کی صرف اس وجہ سے کہ ان کے دل میں اپنی کثرت کا غرور سما گیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ یہ میدان چھوڑ کر بھاگتے اور نہ ہی ابوسفیان کو ان پر حیرت ہوتی جس نے فتح مکہ کے دن کہا تھا کہ مجاہدین سمندر سے ادھر نہیں رکھیں گے۔

غرض غزوۂ حنین میں مجاہدین کتنی تعداد میں شہید ہوئے تاریخ اس کی تعداد بتانے سے قاصر ہے۔ اتنا کہا جاتا ہے دو قبیلے یا تو بالکل ہی شہید ہو گئے یا ان میں معدودے چند بچ گئے۔

تاہم اس غزوہ میں مسلمان ہی فاتح ہوئے۔ انہوں نے کافروں پر پوری طرح قبضہ پالیا۔ اس فتح سے ان کو جس قدر مالِ غنیمت اور قیدی ہاتھ لگے اس سے پہلے کبھی دستیاب نہیں ہوا

تھا۔ اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری تھی۔ کہ لڑائی سے اصل مقصد ایسی فتح یابی ہے جس میں اگر شرافت کا لحاظ بھی رکھا جائے تو ایسی فتح کی جس قدر قیمت لگائے اللہ کا شکر ہے بہت سستی رہی کے مصداق ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہ فتح انتہائی مسرت و شادمانی کا سبب بنی۔

طائف کا محاصرہ

اس فتح میں درخشاں پہلو مشرکین کے سپہ سالار اعظم مالک بن عوف نصری کا ماجرا ہے۔ جس نے اپنے دامن سے اس آگ کو مشتعل کیا اور جب مغلوب ہوا تو اپنے ہمراہ قبیلہ ثقیف کے بقیتہ السیف اشخاص کے ساتھ طائف کے ایک قلعہ میں چھپ کر پناہ لی۔ جس سے مسلمانوں کو ایسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑا کہ اگر وہ مالک کا پیچھا نہ کرتے تو ہو سکتا ہے وہ اس چنگاری کو پھر ہوا دینے میں کامیاب ہو جاتا لہٰذا طائف کے معاملہ کو نبٹانا ہی ان کے لئے بہتر تھا۔

رسول اللہ ﷺ کا طریق جنگ یہ بھی تھا کہ کسی بڑے معرکہ کے بعد درپردہ وہ دوسرے دشمنوں کا محاصرہ فرماتے۔ جیسا کہ غزوہ احد سے فارغ ہونے کے بعد تو یہود خیبر کی خبر لی۔ جنگ خندق سے فارغ ہوئے تو مدینہ کے بنو قریظہ کی خبر لی۔

محاصرہ طائف سے متعلق مؤلف کی ایک اور رائے

طائف کے محاصرہ کا محرک کہیں قبل از ہجرت کا واقعہ نہ ہو۔ جب رسول اللہ ﷺ یہاں تبلیغ کے لئے تشریف لائے تو مغرور شہریوں نے پہلے تو تمسخر اڑایا پھر شہر کے نوعمر لڑکوں سے جی بھر کر پتھر برسوائے۔ رسول اللہ ﷺ لہولہان ہو کر انگوروں کی بیل کے سائے میں بیٹھ گئے آج شاید اپنی اس ناتوانی کا خیال آ گیا ہو جس موقع پر سوائے اللہ وحدہ لاشریک کی امداد کے کوئی سہارا نہ تھا۔ یا اس قوت ایمان کا آسرا جس سے قلب مبارک معمور تھا اور یہ ایسی قوت ہے جو پہاڑ کو بھی ریزہ ریزہ کر سکتی ہے۔(نہ معلوم مؤلف کی نظر سے وہ حقیقت کیوں اوجھل ہو گئی۔ کہ انھیں لمحات میں اللہ تعالیٰ نے فرشتے کو بھیج کر اجازت مانگی کہ اگر آپ کہیں تو میں ان دونوں پہاڑوں کو طائف پر گرا کر ان کو مسل دوں لیکن آپ ﷺ نے فرمایا تھا نہیں۔ لہٰذا انتقامی جذبہ کا تصور بھی نبی رحمت ﷺ سے وابستہ کرنا ــــــ جہالت کے مترادف ہے۔ مترجم)

غرض رسول اللہ ﷺ نے اس قلعہ پر حملہ کرنے کا حکم دیا جس میں مالک بن عوف چھپا ہوا تھا(جو اس بات کا ثبوت ہے کہ مولف کا مفروضہ ان کی اپنی فطرت کا غماز ہے۔)

بہرحال آج خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام ایسی کوہ پیکر فوج کے ساتھ یلغار بولنے کو ہیں

جس کی قوت اور تعداد جزیرہ عرب نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ طائف کے اردگرد دوسرے مشہور شہروں کی طرح چاروں طرف سربفلک فصیل کھڑی تھی اور شہر میں آمدورفت کے لئے شہر کے چاروں طرف ایک ایک صدر دروازہ تھا۔ شہر کے رہنے والے فنون حرب میں بڑے ماہر اور پورے عرب میں سب سے زیادہ مالدار بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے شہر کے چاروں طرف حفاظت کے لئے قلعوں کا جال پھیلا رکھا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے طائف کے بعد قلعہ پر حملہ کرنے کا حکم صادر فرمادیا۔ جس میں مالک بن عوف اپنے ثقفی ساتھیوں کے ساتھ چھپا بیٹھا تھا' مجاہدین نے قلعہ تک پہنچنے سے پہلے بنو ثقیف کی حفاظتی دیوار زمیں بوس کر دی۔ قلعہ مسمار کر دیا اور طائف کے قریب جا پہنچے۔ مگر آگے بڑھنے کے بجائے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق ایک مقام پر رک گئے۔ مقصد یہ تھا کہ یہاں جمع ہو کر مشورہ کیا جائے۔ ادھر بنو ثقیف بھی اس تاک میں تھے۔ انہوں نے قلعہ کی ایک بلند دیوار سے تیروں کی بوچھاڑ کر دی جس سے کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے از سرنو حکمت عملی پر غور فرمایا۔ اور سوچا کہ بنو قریظہ اور یہود خیبر کی طرح ان کا بھی محاصرہ زیادہ مفید ہو گا۔ بنو ثقیف رسد سے گھبرا کر شہر حوالے کرنے پہ مجبور ہو جائیں گے۔

اور اگر وہ قلعہ سے باہر بھی نکل آئیں تو مقابلہ آسان ہو گا۔ اس قسم کی تجویزیں زیر غور تھیں سوچا کہ دشمن کے تیروں کی زد سے پہلے ہٹا جائے۔

چنانچہ مجاہدین پہلی جگہ سے ہٹ کر وہاں جمع ہو گئے۔ جہاں بعد میں اہل طائف نے اپنی شکست تسلیم کی اور قبول اسلام کے بعد وہاں مسجد تعمیر کرائی۔ کیونکہ پہلی مشاورت کی جگہ پر کفار کے تیروں سے 18 مسلمان شہید ہو چکے تھے جن میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے صاحبزادے بھی تھے' آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات میں سے ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا اور زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا بھی موجود تھیں۔ دونوں کے لئے علیحدہ علیحدہ دو سرخ خیمے نصب کئے گئے تھے۔ یہیں پہ رسول اللہ ﷺ نے قیام صلوٰۃ فرمایا اور یہی وہ جگہ ہے جہاں مسجد بنی۔

مجاہدین منتظر تھے کہ دیکھئے پردۂ غیب سے اب کیا ظاہر ہوتا ہے۔ دشمن کون سا پہلو اختیار کرتا ہے۔ اس درمیان میں ایک بدو ادھر آ نکلا۔ اس نے رسول پاک سے عرض کیا۔ بنو ثقیف اپنے قلعہ میں اس طرح سمٹ گئے ہیں جیسے لومڑی بھٹ میں اگر اسے چھوڑ دیا جائے تو وہ کوئی نقصان پہنچا نہیں سکتی۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کے لئے ناکام لوٹنا خلافِ منصب تھا۔ آپ کے دل میں خیال آیا کہ پائیں مکہ میں رہنے والے قبیلہ بنی دوس منجنیق اور دبابہ کے فن سے واقف ہیں۔ ان کے

امیر طفیل (بن عمرو دوسی) اس محاصرہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ وہ غزوہ خیبر میں بھی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے۔ آپ ﷺ نے طفیل رضی اللہ عنہ سے فرمایا۔ مکہ جا کر اپنے قبیلہ کے چند ایسے دلاور ہمراہ لے آؤ اور ان کے ساتھ اس قسم کے آتش گیر گولے اور دبابے (کپے) بھی لے آنا جو اس مقصد کے لئے منجنیق کے ذریعہ استعمال کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ محاصرہ کے چار دن کے بعد یہ سب پہنچ گئے۔ چنانچہ مجاہدین منجنیق اور آتشیں گولے لے کر قلعہ کی دیواروں میں شگاف کرنے کے لئے آگے بڑھے۔ لیکن اہل طائف بھی فنون حرب میں کچھ کم نہ تھے۔ انہوں نے گرم لوہوں کے ٹکڑے غلیلوں میں رکھ کر پھینکنا شروع کئے۔ جن سے کئی مسلمان شہید ہو گئے۔ مجاہدین کو وہاں سے ہٹنا پڑا۔ گویا یہ کوشش بھی ناکام ہوئی اور طائف کے قلعوں کو مسخر کرنا محال ہو گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے پھر حکمت عملی پر غور فرمایا تو بنو نضیر کے باغات جلوانے کا نقشہ ذہن میں ابھرا جس کے بعد بنو نضیر نے ازخود جلاوطن ہونے پر آمادگی ظاہر کی تھی۔ طائف کے انگوروں کے باغات بنو نضیر مدینہ کے باغات سے کہیں زیادہ بیش قیمت تھے۔ جب تک ان کے باغات پر دست برد نہ ہو' یہ لوگ راہ راست پر نہیں آئیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے حکم فرمایا۔ ہمارے جن دشمنوں نے مالک بن عوف کو اپنی بغل میں دبا رکھا ہے۔ ان کے انگوروں کے باغ جلا دو جو جل نہ سکیں انہیں کاٹ کر پھینک دو۔ طائف کو اپنی جس دولت پہ ناز تھا اسے چند لمحوں میں برباد ہونے کے تصور سے کانپ اٹھے اور پیغام بھیجا۔ ایسی نعمت کو برباد کرنے کے بجائے اسے اپنے لئے قائم رکھئے تو ہمیں تعرض نہ ہو گا۔ اور اگر ہمارے لئے بھی رہنے دیں تو مزید کرم ہو گا۔ آخر بنو ثقیف سے آپ کی قرابت داری بھی تو ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے مجاہدین کو باغات کو ختم کرنے سے روک دیا لیکن اسے معاہدہ صلح نہیں کہا جا سکتا اس لئے طائف سے جنگ کرنا تو مقصود ہی نہ تھا۔ اصل مسئلہ تو مالک بن عوف کو پناہ دینے پہ متنبہ کرنا تھا۔

آنحضرت ﷺ نے اعلان فرما دیا۔ طائف کے غلاموں میں سے جو ہم میں شامل ہو جائے وہ آزاد ہے۔ اس اعلان کے بعد تقریباً بیس غلام بھاگ کر آئے اور انہوں نے اطلاع دی کہ طائف والوں کے پاس ایک سال کا سامانِ رسد موجود ہے۔

آنحضرت ﷺ نے محاصرہ کو طول دینا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ حرمت والا مہینہ ذوالقعدہ سر پر آن پہنچا ہے۔ اس میں قتال حرام ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ محاصرہ چھوڑ کر جعرانہ میں پہنچے ہی تھے کہ ذوالقعدہ کا چاند نظر آ گیا۔ آپ ﷺ نے اپنے لشکر سمیت عمرہ کا لباس زیب تن فرمایا۔ بعض راوی یہ بھی کہتے ہیں کہ طائف سے مراجعت کے موقع پر ماہ محرم کے ختم ہو جانے کے بعد پھر حملہ کرنے کا ارادہ بھی رسول اللہ ﷺ نے

ظاہر فرمایا تھا۔

تقسیم

رسول اللہ ﷺ مجاہدین کو ساتھ لئے ہوئے عمرہ کی نیت لے کر طائف سے چلے تھے لیکن جعرانہ میں رکنا پڑا' تاکہ اموال اور ہوازن کے قیدیوں کو تقسیم کر دیا جائے۔
آنحضرت ﷺ نے خمس علیحدہ کر کے باقی مال اور قیدی لشکریوں میں تقسیم کر دیئے۔
اس اثناء میں ہوازن کا ایک وفد حاضر ہوا جو مسلمان ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے مال اور قیدیوں کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ وفد کے ایک رکن نے ان سے کہا۔

یا رسول اللّٰہ' انما فی الحظائر عماتک وخالاتک وحواضنک اللواتی کن یکفلنک ولو انا ملحنا للحارث بن ابی شمر او نعمان بن المنذر ثم نزل منا بمثل الذی نزلت بہ رجونا عطفہ وعائدتہ علینا وانت خیر المکفولین۔

یا رسول اللہ (ﷺ) آپ کو معلوم ہے ان قیدیوں میں آپ کی پھوپھیاں بھی ہیں۔ بعض خالہ کے رشتہ میں ہیں اور کوئی آپ کی رضاعیہ ہیں اور اگر آپ کی قید میں ہماری محترمات میں سے کسی نے حارث بن ابو شمر یا نعمان بن منذر امیر غسان کو اپنا دودھ پلایا ہوتا۔ اور وہ آپ ہی کی طرح ہم پر غالب آ جاتا۔ تو پھر ہم ان سے اپنی عورتوں کی واپسی کا مطالبہ کرتے تو ناممکن تھا کہ وہ ہماری استدعا کو مسترد کر دیتے اور آپ تو دنیا بھر کے مربیوں سے بہتر ہیں۔

رضاعی بہن شیما

ان قیدیوں میں شیماء بنت حارثہ بھی گرفتار ہو کر آئی تھیں' جنہیں قید کرتے وقت مجاہدین نے جنگی قیدیوں کی طرح سختی سے کام لیا تو انہوں نے کہا۔
تعلموا--- واللّٰہ انی لاخت صاحبکم من الرضاعۃ "جانتے نہیں ہو میں تمہارے صاحب کی رضاعی بہن ہوں" لیکن مجاہدین کو یقین نہ آیا۔ انہیں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں لے آئے۔ وہ اس وقت بڑھاپے کی عمر کو پہنچ چکی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیکھا تو اپنی مبارک چادر ان کے لئے بچھا دی اور فرمایا۔ اے بہن تم میرے ہاں رہنا چاہو تو تمہارا اپنا گھر ہے۔ واپس جانا چاہو تو بھی منظور ہے۔ سیدہ شیما رضی اللہ عنہا نے اپنے قبیلہ میں جانے کو ترجیح دی مگر اسی روز مسلمان ہو گئیں۔ رضی اللہ عنہا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اموالِ خمس میں سے غلام اور مال دے کر رخصت فرمایا۔

ہوازن کی امید بڑھ گئی

سیدہ شیماء رضی اللہ عنہا سے رسول اللہ ﷺ کا یہ سلوک دیکھا تو ہوازن کے حوصلے بڑھ گئے اور اس بارگاہ رسالت میں تو ہمیشہ ہی ایسا ہوا کہ جس کسی نے قرابت یا محبت کا تعلق بتایا تو رسول اللہ ﷺ نے اپنی لطف و عنایات میں ہمیشہ سبقت فرمائی۔ دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک تو آپ کی فطرت میں تھا۔ ہوازن کی درخواست پر فرمایا۔ آپ لوگوں کو اپنا مال اور دولت عزیز ہے یا اپنی اولاد اور بیویاں؟

وفد نے بیک زبان کہا۔ یا رسول اللہ (ﷺ) جب آپ نے دونوں میں سے کسی ایک چیز کا اختیار دے دیا ہے تو ہمیں اپنے بال بچے زیادہ عزیز ہیں! رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ بہت اچھی بات ہے۔ خمس اور بنو عبدالمطلب کے حصہ میں آنے والی عورتیں اور بچے بلکہ مرد بھی واپس کر دیئے جائیں گے۔ رہے وہ لوگ جنہیں میں آپ سے پہلے دوسروں میں تقسیم کر چکا ہوں تو آپ صلوٰۃ ظہر کے بعد میرے سامنے ان الفاظ کے ساتھ میرے ساتھیوں سے درخواست کیجئے۔

انا نستشفع برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الی المسلمین و بالمسلمین الی رسول اللہ فی ابناءنا ونساءنا

اے صاحبو ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی وساطت سے آپ لوگوں سے درخواست کرتے ہیں کہ اپنی رضا و رغبت سے ہماری عورتوں اور بچوں کو واپس کر دیں۔

تم لوگوں کی اس درخواست کے ساتھ ہی میں ان سب کے سامنے میں اپنا اور عبدالمطلب کا حصہ واپس کر دوں گا۔ اور مسلمانوں سے بھی آپ لوگوں کے لئے سفارش کروں گا۔

چنانچہ نماز ظہر ادا کرنے کے بعد انہیں قدموں پر ہوازن نے فرمان رسول اللہ ﷺ کے مطابق اپنی درخواست پیش کر دی اور سب سے پہلے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔

دوستو میں اپنا اور بنو عبدالمطلب کا حصہ واپس کرتا ہوں۔

انصار، مہاجرین، حاضرین اور مجاہدین سب کا جواب ایک ہی تھا۔ ما کان لنا فھو لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم "ہمارا جو کچھ ہے وہ سب رسول اللہ ﷺ ہی کا ہے"

ابتدا میں ذیل کے تین آدمیوں نے اپنے اپنے حصہ کو واپس کرنے سے انکار کر دیا۔

(1) اقرع بن حابس

(2) عینیہ بن حصن

(3) عباس بن مرداس۔ لیکن اپنے قبیلہ والوں کے اصرار پر عباس بن مرداس بھی قیدیوں کی واپسی پر راضی ہو گئے۔ چنانچہ دوسری سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ اقرع اور عینیہ نے بھی

اپنی خوشی سے اپنے حصہ کے قیدی واپس کر دیئے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ جو حصہ دار اپنا حصہ واپس کر دیں گے انھیں میں اپنی غنیمت میں سے ہر ایک غلام کے بدلے چھ چھ غلام عطا کروں گا۔

مالک بن عوف کی خود سپردگی

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ہوازن کے وفد سے مالک بن عوف کے بارہ میں پوچھا۔ تو انہوں نے بتایا مالک ابھی تک بنو ثقیف ہی کے ہاں دبکا پڑا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مالک بن عوف اگر از خود اسلام لے آئے اور حاضر ہو جائے تو اس کے اہل و عیال اور تمام مال و اسباب کے علاوہ سو اونٹ زائد عطا ہوں گے۔

مالک نے اپنے متعلق یہ خوشخبری سنی تو بنو ثقیف سے چھپ کر اپنے گھوڑے کی زین کسی اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ اسلام قبول کر لیا۔ رضی اللہ عنہ۔ ان کے بچے بیوی اور مال اسباب کے علاوہ سو اونٹ بھی ان کے حوالے کر دیئے گئے۔

بعض لوگ بے حوصلہ بھی ہوتے ہیں

دوسروں پر عطا و بخشش کی یہ حالت دیکھ کر بعض مجاہدین گھبرا گئے۔ ایک دوسرے سے کانا پھوسی کرنے لگے۔ اگر نو مسلم افراد کے لئے داد و دہش (سخا و عطا) کا یہی سلسلہ رہا تو ہمارے لئے باقی کیا رہے گا۔ ہوتے ہوتے یہ بات رسول اللہ ﷺ تک پہنچ ہی گئی۔ آپ ﷺ ایک اونٹ کے قریب تشریف لائے۔ اور اس کے چند بال اٹھا کر مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

یا الناس۔ مالی من فیئکم ولا ھذا الوبرۃ الا الخمس والخمس مردود علیکم

لوگو۔۔۔۔ واللہ مجھے تمہارے مال غنیمت میں سے ان بالوں کے برابر بھی طمع نہیں رہا۔ میرے حصہ کا خمس بھی آپ لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔

اور فرمایا جو چیز جس کی تحویل میں ہو اسے مال خانے (بیت المال) میں جمع کر دو تاکہ عدل کے ساتھ تقسیم ہو سکے اور فرمایا۔

فمن اخذ شیئا فی غیر عدل ولو کان ابرۃ کان علیٰ اھلہ عارو نار و شنار الی یوم القیامہ

اور جو شخص کسی چیز پر خود قابض رہے چاہے وہ سوئی ہی کیوں نہ ہو۔ قیامت کے دن اس کے خاندان کے لئے یہ شرمندگی کا سبب ہو گا اور اس کے اپنے لئے شرمندگی کے علاوہ عذاب کا سبب بھی ہو گا۔ یہ برہمی رسول اللہ ﷺ نے اس وقت فرمائی جب ایک شخص آپ کی چادر

آپ کے کندھے سے اچک کر لے گیا۔ آپ ﷺ نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

ردوالی ردائی ایھا الناس فواللہ لو ان لکم بعدہ شجرو تھامہ نعما" لقسمتہ علیکم ثم لاالفیتمونی بخیلا ولا خیانا" ولا کذابا"

لوگو میری چادر مجھے واپس کر دو۔ واللہ اگر آپ لوگوں کو بطور غنیمت وادی تہامہ کے پودوں درختوں کے برابر بکریوں کے ریوڑ بھی آ جائیں۔ تو بھی ان کی تقسیم میں تم مجھے نہ ہی بخیل پاؤ گے نہ خائن اور نہ ہی جھوٹا۔

چنانچہ ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ' معاویہ پسر ابوسفیان رضی اللہ عنہ' حارث بن حارث کلدہ رضی اللہ عنہ ' حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ' سہیل بن عمرو رضی اللہ عنہ' حویطب بن عبدالعزی ہر ایک نومسلم کو ایک سو اونٹ عطا فرمائے۔

ان حضرات سے دوسرے درجہ کے شرفاء اور روسا کو فی کس پچاس پچاس اونٹ عطا فرمائے۔ جن کی تعداد دس سے زیادہ تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے جس خندہ پیشانی سے اپنے گزشتہ کل کے دشمنوں کو یہ عطا و بخشش فرمائی ان کے ضمیر اور زبانیں آپ ﷺ کی مدح سرائی پہ مجبور ہو گئیں۔ بلکہ جس نے جس قدر مانگا اسے اتنا ہی عطا فرما دیا۔ خاص کر ابوسفیان رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے معاویہ کے لئے جو مانگا اسے دیا گیا۔ اسی طرح عباس بن مرداس بھی جو اپنے حصہ سے مطمئن نہ تھے' ان کی زبان سے یہ جملہ نکل گیا کہ عینیہ اور اقرع کو مجھ پر ترجیح دی گئی۔ جب آنحضرت ﷺ نے سنا تو فرمایا۔ انہیں علیحدہ لے جاؤ اور جو چیزیں ان کو چاہئیں ہوں وہ دے دو! عباس اس طرح مطمئن ہوا۔

انصار کا گلہ

دراصل رسول اللہ ﷺ نے مذکورہ اشخاص کو تالیفِ قلب کے لئے بخشش فرمائی تھی مگر انصار مدینہ کو برا محسوس ہوا۔ ان کے بعض نوجوانوں کی زبان سے یہ بات نکل گئی کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے قبیلہ کی کیسی طرف داری فرمائی۔ یہ خبر سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کی ذاتی تائید کے ساتھ رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے فرمایا۔ آپ انصار کو اس باغیچہ میں جمع کیجئے۔ میں ابھی آتا ہوں اور مندرجہ ذیل گفتگو ہوئی۔

یامعشر الانصار! ماقالہ' بلغنی عنکم۔

اے انصار! آپ لوگوں کے دل میں یہ کیسی بات آ گئی۔

وجدۃ وجدتموہ فی انفسکم الم اتکم ضلالا" فھد اکم اللہ وعالتہ فاغناکم اللہ

واعداءفالف اللہ قلوبکم!

آپ کے دلوں میں کوئی گرہ تو نہیں پڑ گئی کیا آپ لوگ بھول گئے کہ آپ گمراہ تھے۔ اور میری وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تمہیں سیدھی راہ پر گامزن فرمایا۔ میرے ہی صدقہ میں آپ کی مفلسی تونگری میں بدل گئی۔ تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے میری برکت سے تمہارے دلوں کو محبت سے لبریز کر دیا۔ ایک دوسرے کا ہمدرد بنا دیا۔

انصار بل اللہ و رسولہ امن وافضل

بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ اکرم کے ہم پر بہت احسان ہیں؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

الا تجیبونی یا معشر الانصار

برادرانِ انصار۔ تم لوگ میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دیتے۔

انصار ـــــ بماذا نجیبک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

ہماری اوقات کیا ہے کہ ہم آپؐ پر اپنا احسان جتائیں۔ جبکہ اللہ عزوجل اور آپ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احسانات سے ہم سبکدوش نہیں ہو سکتے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ـــــ واللہ۔ تم یہ بھی کہہ سکتے ہو اور اس میں کوئی شبہ بھی نہیں کہ آپ کی دوسروں نے تکذیب کی اور ہم نے آپ کی تصدیق کی۔ اوروں نے آپ کو ستایا اور ہم نے آپ کی حمایت کی۔ آپ کو جلاوطن کیا گیا ہم نے آپ کا خیر مقدم کیا۔ آپ ہمارے پاس بے یار و مددگار آئے ہم نے اپنی آنکھیں آپ کے قدموں تلے بچھائیں۔

لیکن اے انصار جو چیزیں میں دوسروں کو بخش رہا ہوں وہ دنیا کی معمولی سی دولت ہے۔ مگر اس دولت کے مقابلہ میں اسلام جس نعمت سے تم کو مالا مال کرتا ہے کیا دونوں برابر ہیں۔

کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ دوسرے لوگ یہاں سے لوٹیں تو اونٹ اور بکریاں ساتھ لے کر جائیں اور تم اپنے گھروں میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ساتھ لے کر جاؤ؟ اس ذات کبریا کی قسم اگر مہاجر ہونے کا ثواب نہ ہوتا۔ یا اعزاز نہ ہوتا تو میں انصار کہلانا ہی پسند کرتا۔ دوسرے لوگ اگر پورے اتحاد کے ساتھ ایک راستے پر چلیں اور انصار دوسرے راستہ پر۔ تو میں صرف انصار کے ساتھ ہی چلنا گوارہ کروں گا۔ الھم الرحم الانصار وابناء الانصار وابناء ابناء الانصار اے اللہ انصار اور ان کی اولاد اور پھر ان کی اولاد پر ہمیشہ رحم فرمانا۔ آمین ثم آمین۔

انصار کی معذرت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی حقیقی کیفیات اور سچے خیالات کا اظہار جس رقّت اور

پُرسوز لہجہ میں فرمایا۔ اس کی تاثیر سب کے دلوں میں اتر گئی۔ عالم یہ تھا کہ وہ انصار جو بیعت کرنے کے بعد ہر وقت آپ کے لئے اور دین اسلام کے لئے سربکف رہے' کسی وقت بھی آپ کی تعظیم و تکریم کا خیال اپنے دلوں محو نہ ہونے دیا۔ ان کی تو رو رو کر سسکیاں بندھ گئیں' محبت اور احترام میں رونا بھی عجیب لذت دیتا ہے۔ سب نے بیک زبان باآوازِ بلند رو رو کر کہا۔ رضینا برسول اللہ (رضی اللہ عنہ) قسما" وحفظا" ہماری قسمت ہمارا حصہ ہمارا سب کچھ اللہ تعالیٰ کے رسولِ برحق ہی ہیں۔ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ حنین سے حاصل ہونے والی دولت سے لاتعلقی کا اظہار کس شاندار انداز میں فرمایا۔ دوسری طرف اسی دولت کو نوواردانِ اسلام کی تالیف قلب کے لئے استعمال فرما کر انہیں یہ یقین دلوا دیا کہ اسلام لانے میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائی یقینی ہے۔ یہ سب لوگ ابھی تین چار ہفتہ پہلے ہی حلقہ بگوش اسلام ہوئے تھے۔ بہت زیادہ مال و دولت کی سخاوت اور بخشش پر اگرچہ پرانے اور پختہ تر مسلمانوں کے دل میں بھی کچھ خلش ابھر آئی اور انہوں نے اس تقسیم پر نکتہ چینی سے بھی گریز نہ کیا لیکن حکمتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نئے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے والوں کے دلوں کو اس سلوک سے ایسا مٹھی میں لے لیا کہ یہ بھی اب جُود و سخا سے متاثر ہو کر اللہ تعالیٰ کی راہ اور دین اسلام کے آئین کے تحفظ کے لئے سر کٹانے پہ کمربستہ ہو گئے۔

عمرۃ الجعرانہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جعرانہ سے بقصد عمرہ مکہ مکرمہ روانہ ہو گئے۔ ادائے عمرہ کے بعد عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ کی خلافت عطا فرمائی۔ جناب معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو معلم دین کی حیثیت سے مکہ مکرمہ میں مقرر فرمایا۔ اور خود مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ تاکہ اپنے نَو مولود ابراہیم رضی اللہ عنہ کو دیکھ کر آنکھوں کو ٹھنڈا کر لیں اور کچھ مدت کے بعد ان مسیحی دشمنانِ اسلام کا سدِباب کریں جو تبوک میں جمع ہو کر اسلام کو مٹانا چاہتے تھے۔

مدینہ طیبہ میں واپسی

مدینہ طیبہ میں واپسی

مراجعت کے بعد:۔ فتح مکہ اور طائف کے طویل محاصرہ کے بعد جب نبی رحمت ﷺ اپنے ساتھیوں، صحابہ کرام کے ساتھ مدینہ الاسلام میں واپس تشریف لائے تو اس وقت یہ عالم تھا کہ پورے جزیرہ عرب میں نہ تو کسی کو آپ کا مقابلہ کرنے کی ہمت تھی نہ ہی آپ کے خلاف اپنی زبان پر ایک لفظ بھی لانے کی جرات تھی۔ مہاجرین و انصار دونوں خوشی سے پھولے نہیں سماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول دین اسلام کو مسجد حرام کی تطہیر کرنے کی توفیق بخشی اہل مکہ نے اسلام قبول کر لیا۔ اب عرب قبائل جوق در جوق حلقہ بگوش اسلام ہونے لگے اور نبی اکرم ﷺ کو کچھ مدت مدینہ منورہ میں آرام و سکون کے ساتھ اپنے اللہ عزوجل کی حمد و ثنا کرنے کا موقعہ نصیب ہوا۔

عتاب بن اسید

جیسا کہ سابقہ سطور میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے مکہ معظمہ سے روانہ ہوتے وقت عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ مکرمہ کا عامل مقرر فرما آئے تھے اور معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اہل مکہ کا دینی معلم مقرر فرمایا تھا تاکہ نئے حلقہ بگوشان اسلام کو تعلیم و تربیت دیں۔

مکہ مکرمہ اور حنین کی فتح نے تمام عرب میں مسلمانوں کا ایسا رعب ڈال دیا تھا کہ کل تک مکہ کے بڑے بڑے مجرم غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ان کے مقابلہ میں محمد ﷺ کا اثر رسوخ ہونا ناممکن ہے۔ اس غلط زعم میں مبتلا تھے کہ دین اسلام میں مقبولیت کی کوئی دلیل ہی نہیں اور ان کے حاشیہ بردار شاعر دین اسلام کے ہجو میں اپنے سرغنوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیتے تھے اللہ کی شان برحق آج سچائی غالب آئی اور سب بداندیش حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

حالات بدل گئے

صحراؤں کے بادشاہ جنہیں اپنی زندگی سے بہتر اپنے نظام حیات سے بہتر کوئی نظم و نسق پسند نہیں آتا تھا۔ جو اپنی طرز بود و باش کو کسی قیمت پر چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے۔ جو اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے اپنی جان نثار کر دینا اپنے لئے باعث فخر سمجھتے تھے۔ ان میں سے بہت سے لوگ سرور کائنات محمد رسول اللہ ﷺ کی غلامی میں آنے کے بعد اس پر فخر کرنے لگے تھے۔ تسخیر مکہ کے بعد مکہ ہی کے ہر گھر میں خوشیوں کے باغ لہلہانے لگے۔ کل تک جو شاعر رسول اللہ ﷺ اور دین اسلام میں سو نقص نکالتے تھے۔ وہ آج گونگے ہو گئے تھے ملک میں چند اکابر اور قبائل جنہیں نہ ہی رسول اللہ ﷺ کو ابھی تک دیکھنا نصیب ہوا اور نہ ہی دین اسلام کے محاسن سے آشنائی ہوئی۔ وہ اپنی جگہ بدحواس پھر رہے تھے کہ اب ہمارا موقف کیا ہو؟

ان شعراء میں کعب بن زہیر بھی تھے جو ہجو اسلام میں ہمیشہ پیش پیش رہتے مگر مکہ فتح ہو جانے کے بعد جب قریش کے سرغنہ ہی سرنگوں ہو گئے۔ سارے بت پاش پاش ہو گئے تو پھر خالی الفاظ اور حروف سے مقابلہ کرنے والے کی اوقات ہی کیا؟ شان اسلام کا منظر اس کے حقیقی بھائی بجیر بن زہیر رضی اللہ عنہ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور جب موصوف بجیر بن زہیر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے شرف ہمرکابی میں طائف سے مکہ واپس آئے تو انہوں نے اپنے بھائی کعب کو خط لکھا جن لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو ایذائیں پہنچائیں وہ اب مفتوح ہو چکے ہیں لیکن جنہوں نے آپ ﷺ کی ہجو میں سبقت کی ان کی گردنیں ماری جا رہی ہیں اور جو لوگ گرفت سے بچ گئے ہیں وہ ادھر ادھر منہ چھپاتے پھر رہے ہیں۔ بجیر نے کعب کو تاکید کی یا تو وہ جلد سے جلد مدینہ آ کر معافی نامہ پیش کرے اور میں یقین دلاتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ ایسے لوگوں کو معاف کرنے میں ذرا بھی لیت و لعل نہیں کرتے اگر یہ نہیں کر سکتے تو پھر کسی دوسرے ملک میں بھاگ جاؤ۔

بجیر نے صحیح لکھا تھا اس لئے کہ تسخیر مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے چار ایسے اشخاص کو قتل کرایا جن میں ایک شاعر بھی تھا جو آنحضرت ﷺ کی ہجو کرنے میں پیش پیش تھا۔ اور وہ شخص بھی تھا جس نے سیدہ زینب رضی اللہ عنہا بنت رسول اللہ ﷺ کی تذلیل کی۔ جب وہ اپنے شوہر کی اجازت سے اپنے والدِ ذوالاحترام علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ملنے مدینہ جا رہی تھی۔ اس نے ان کی اونٹنی کو بدکایا تو آپ رضی اللہ عنہا گریں اور اسقاط حمل ہو گیا۔ اس کے اس جرم میں قتل کروایا گیا۔

کعب اپنے بھائی کی نصیحت کے مطابق مدینہ پہنچے اور بارگاہِ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں

حاضر ہو کر جاں بخشی کی درخواست کرتے ہوئے پہلا یہ شعر پڑھا۔

بانت سعاد فقلبی الیوم متبول--- متیم اثرھا لم یغد مکبول

رسول اللہ ﷺ نے کعب کو معاف فرما دیا۔ بعد میں وہ مسلمان ہو گئے اور اپنے آپ کو اسلامی اخلاق و عادات سے آراستہ کر لیا۔

وفود

دین اسلام کی نورانی شعاعیں اب قبائل کے دلوں کو بھی منور کرنے لگیں۔ ہر طرف سے ان کے وفود آنے لگے یہ سب بارگاہ رسالت علیہ التحیۃ والسلام میں حاضر ہوتے اور اسلام قبول کرتے!

قبیلہ بنو طے کا وفد

بنو طے کے امیر زید الخیل تھے۔ معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ خوش کلام بھی تھے۔ ان سے گفتگو کے بعد شافع محشر ﷺ نے فرمایا۔ اہل عرب کے جن جن ارباب علم و دانش کا تذکرہ میرے سامنے آیا یا میری ملاقات ان سے ہوئی تو میں نے ان کی شہرت کے مقابلہ میں انہیں بہت کم مرتبہ پایا۔ لیکن "زید الخیل" میں خوبیاں ان کی شہرت سے زیادہ پائیں۔ اس خراج تحسین کے علاوہ بارگاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے انہیں "زید الخیل" کی جگہ "زید الخیر" کے لقب کا اعزاز بھی ملا۔ رضی اللہ عنہ

حاتم طائی کے بیٹے اور بیٹی کا قبول اسلام

عرب کے شہرہ آفاق حاتم طائی کے فرزند عدی مذہباً . . . . عیسائی تھے اور رسول اللہ ﷺ سے سخت متنفر کر دیئے گئے تھے۔ اپنے ملک میں دین اسلام اور محمد ﷺ کی مقبولیت دیکھ کر برداشت نہ کر سکے اور اپنے بال بچے اونٹ اور سامان لے کر شام میں منتقل ہو گئے جہاں ان کے ہم مذہب کثرت سے رہتے تھے۔ لیکن جب رسول اللہ ﷺ نے قرب و جوار کے علاقوں میں بتوں کا صفایا کرنے کے لئے مجاہدین کے مختلف دستے بھیجے تھے تو حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو 8 ہجری میں پچاس مجاہدین کے ساتھ ایک دستہ کو قبیلہ طے کے صنم (بت) "ثابت" کو توڑنے کے لئے بھیجا۔ اور تصادم ہوا نتیجہ کے طور پر قیدیوں میں حاتم طائی کی بیٹی بھی آئیں۔ قیدی مسجد نبوی کے سامنے والے باغیچے میں نظر بند کیے گئے۔ حاتم کی صاجزادی نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھ کر شور مچانا شروع کر دیا۔

یا رسول اللہ! غاب الوافدو انقطع الوالدو انا عجوز کبیرۃ ما بی خذمہ فمن علی! من اللہ علیک

یا رسول اللہ میرا سرپرست روپوش ہے۔ والد وفات پا چکے ہیں میں بڑھاپے کی وجہ سے کام کاج

کے قابل نہیں رہی۔ مجھ پر احسان فرمائیے۔ اللہ آپ پر کرم فرمائے گا۔

رسول اللہ ﷺ: تمہارا سرپرست کون تھا؟

محترمہ: میرے سرپرست حاتم طائی کے فرزند عدی تھے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ سے ڈر کر روپوش ہو گیا۔ محترمہ نے اپنے والد حاتم کے بخشش و سخاوت کا تذکرہ بھی کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا انہیں "خلعتِ زادِ راہ اور سواری کے اونٹ دے کر جو قافلہ سب سے پہلے جانے والا ہو ان کے ہمراہ واپس بھیج دو" محترمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں جب میں نے شام میں جا کر یہ واقعہ عدی کو سنایا تو وہ از خود شام سے بارگاہِ رسالت علیہ التحیتہ والسلام میں حاضر ہو کر اسلام لے آیا۔ رضی اللہ عنہ

اسی طرح مکہ اور حنین کی فتح اور طائف کے محاصرہ سے مدینہ واپس تشریف لے آنے کے بعد وفود کا تانتا بندھ گیا۔ یہ لوگ آتے اور رسالت مآب علیہ الصلوۃ والسلام کی تصدیق کرتے اور قبولِ اسلام فرماتے۔

سیدہ زینب بنت النبی رضی اللہ عنہا کی وفات

سدا ایک سا وقت نہیں رہتا۔ رسول اللہ ﷺ کی مسرت و شادمانی کا یہ دور بھی جلد ہی غم سے مبدل ہونے پر آ گیا۔

جگر گوشہ رسول سیدہ زینب رضی اللہ عنہا عرصہ سے بستر علالت پر دن گزار رہی تھیں۔ گزشتہ اوراق میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ ممدوحہ کے ہجرت کے وقت حویرث و ہبار نے ان کی اونٹنی کو کونچا دے کر بدکا دیا تھا وہ بے تحاشا دوڑی سیدہ رضی اللہ عنہا گریں اور جنین ساقط ہو گیا۔ اس صدمہ کی وجہ سے دن بدن ان کی صحت گرتی جا رہی تھی اور اسی مرض سے داعی اجل کو لبیک کہا۔

رسول اللہ ﷺ پر صدموں کی حد ہو گئی۔ سیدہ زینب سے پہلے سیدہ ام کلثوم اور تیسری صاجزادہ سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہما رحلت فرما چکی تھیں۔ جن کے بعد اب صرف ایک صاجزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا رہ گئی تھیں۔ سیدہ زینب کے شوہر ابو العاص بن ربیع بدر میں مسلمان کے خلاف لڑائی میں شامل ہوئے اسیر ہو گئے جب سیدہ زینب نے سنا تو ان کے فدیہ میں گلے کا ہار پیش کر دیا۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اپنی صاجزادی کا اپنے شوہر کے ساتھ اس حسن سلوک کا تذکرہ کر کے اکثر رو دیتے کہ زینب نے خود مسلمان ہو کر اپنے شوہر کی وفاداری کا کیسا نمونہ پیش کیا۔ یہی شوہر ہے جس نے زینب رضی اللہ عنہا کے والد خاتم النبین علیہ الصلوۃ والسلام کے خلاف قتال میں حصہ لیا۔ تصور کیجئے۔ اگر ابو العاص کی طرح خاتم الرسل ﷺ کافروں کے ہاتھ گرفتار ہو جاتے تو وہ لوگ آنحضرت ﷺ کو زندہ چھوڑ دیتے؟

جگر گوشہ رسول جناب زینب رضی اللہ عنہا نے سفرِ ہجرت میں جو مصیبتیں برداشت کیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی ان کو دہراتے اور کبھی اپنی بیٹی کے دین اور تقویٰ کا ذکر فرماتے۔ کبھی ان کی شدتِ مرض کا المیہ سناتے اور مرحومہ کی ایک ایک تکلیف کو بیان فرماتے اور بعد میں رو دیتے۔

یہ تو جگر گوشہ تھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دل تو دوسروں کی مصیبت پر بھی اسی طرح پسیج جاتا۔ کسی کے بیمار پڑنے کی خبر سنتے تو عیادت کے لئے فوراً پہنچتے ناداروں کی دست گیری دن رات کا مشغلہ تھا اور مصیبت زدہ لوگوں کا حوصلہ بڑھانا ان کو تسلیاں دینا گویا اپنا فریضہ بنا رکھا تھا۔ (صرف خود ہی نہیں بلکہ یہ حکم اپنی امت کو بھی دیا کہ مریض کی عیادت کرو' مصیبت زدہ لوگوں کی مدد کرو' ان کا حوصلہ بڑھاؤ لیکن واویلا اور رونا دھونا بند کرو صبر سے کام لو اور سمجھو کہ ہر چیز تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ (مترجم)

صدموں کا یہ عالم زینب نے آپ کے سامنے کراہ کراہ کر جان دے دی اس سے قبل انہیں کی دو بہنیں سیدہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا اور سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا قبر میں جا سوئیں۔ بعثت سے قبل دو فرزند سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے پیدا ہوئے اور آپ کی آنکھوں کے سامنے موت کی گود میں چلے گئے۔

سیدنا ابراہیم کی ولادت

بار غم ہلکا ہوا سیدہ ماریہ قبطیہ کے بطن سے فرزند پیدا ہوا جس کا نام جد الانبیاء کے اسم مبارک پر برکت حاصل کرنے کے لئے ابراہیم رکھا گیا۔

یاد رہے کہ سیدہ ماریہ قبطیہ والئ مصر مقوقس کی طرف سے پیش کی گئی تھیں۔ سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تولید فرزند تک کنیز کے درجہ پہ رکھا۔ دوسری ازدواج مطہرات کی طرح ان کے لئے مسجد کے قریب حجرہ بنوانے کے بجائے مدینہ سے باہر ایک قریہ میں مکان مہیا کر دیا جو آج بھی مشربہ ابراہیم کے نام سے مشہور ہے۔ اس گھر کو چاروں طرف انگور کی بیل نے گھیر رکھا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں اس طرح تشریف لاتے جیسے کوئی اپنی باندی کے ہاں آتا ہو۔ یہ بھی روایت ہے کہ اس کی دوسری بہن سیرین تھی جنہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں دے دیا اور یہ بھی آپ کو معلوم ہو گا کہ سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رحلت کے بعد جن کو شرفِ مناکحت بخشا گیا ان میں بعض نوجوان بعض ادھیڑ عمر تھیں۔ جن کے ہاں ان کے پہلے شوہروں سے تو اولاد پیدا ہوئی لیکن حرم رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منسلک ہونے کے بعد سب کی کوکھ خالی رہی۔

میرا کہنا یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو محترمہ ماریہ قبطیہ کی گود بھری دیکھ کر کتنی مسرت

ہوئی ہو گی اور اس عالم میں آپ کا سن ساٹھویں سال میں داخل ہو چکا تھا۔ اتنے بلند انسان کے دل میں اولاد کی خوشی سماتی نہ تھی۔ سیدہ ماریہ جو کنیز کی حیثیت سے چنی گئی تھیں آج وہ سید الکونین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نگاہ میں دوسرے حرم کے مساوی بلکہ ان سے بھی زیادہ موقر رہنے لگیں۔

چونکہ ازواج مطہرات میں سے کسی کے ہاں اولاد نہ تھی۔ ماریہ حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کی ماں بننے کے بعد اپنی تمام سوکنوں کی موردِ رشک بن گئیں اور اس میں دن بدن شدت بڑھتی گئی۔ مولود ابراہیم رضی اللہ عنہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبت لمحہ بہ لمحہ بڑھنے لگی جس سے حرم رسول میں تلاطم اور بڑھتا گیا۔

دایہ کی خدمت بی بی سلمیٰ (زوجہ ابو رافع) نے سرانجام دی' مولود کے سر کے بالوں کے ہم وزن چاندی خیرات فرمائی۔ ام سیف کو بچے کی ریاضت سونپی گئی جس کے لئے سات بکریاں عنایت ہوئیں۔

رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز مشربہ (دولت کدہ) ماریہ میں جاتے اور اپنے فرزند کے حسن و جمال اور معصوم تبسم کو دیکھ کر اپنا دل بہلاتے' مگر یہ امور ان ازواج مطہرات کے لئے طبعاً رشک کا سبب تھے جن کے بطن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عقد میں آنے کے بعد کوئی اولاد نہ ہوئی اس دوران میں ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابراہیم علیہ اسلام کو اپنی گود میں اٹھائے ہوئے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں تشریف لائے اور محبت پدری سے مولود کی طرف دیکھ کر ام المومنین سے فرمایا۔ عائشہ رضی اللہ عنہا دیکھ رہی ہو۔ ہم دونوں میں کس قدر مشابہت ہے۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے (دروغ بر گردن راوی) دیکھ کر کہا۔ آپ کے خدوخال اور ان کے چہرہ مہرہ میں تو بہت فرق نظر آتا ہے۔ ام المومنین نے جب یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرزند کو دیکھ کر باغ باغ ہو رہے ہیں تو رشک میں اور شدت پیدا ہو گئی۔ عرض کیا ہر بچہ اسی طرح دودھ پی کر پنپتا آتا ہے۔ ابراہیم ہی پر کیا منحصر ہے یہ تو ابھی کچھ بھی نہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوسرے حرم کو بھی ابراہیم رضی اللہ عنہ کا وجود کھل گیا۔ ہر ایک کی زبان اور عمل سے آئے دن اسی قسم کی حرکات کا ظہور ہوتا رہا۔ ان واقعات نے اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تاریخ میں بھی اپنا اثر پیدا کر لیا۔ قرآن مجید میں بھی اس کا ذکر ہے۔

ان واقعات کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ازواج مطہرات میں برہمی بھی ہو گئی۔ جو اس حد تک رونما ہوئی کہ تاریخ اسلام کا ایک جزو بن گئی۔

واضح رہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ازواج مطہرات کو جو تفوق بخشا اس کی نظیر قبل از اسلام ملنا ناممکن ہے۔ جیسا کہ عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ "قبل از اسلام ہمارے معاشرہ میں

عورت کی عزت پرکاہ کے برابر بھی نہ تھی۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے وحی قرآنی کے ذریعہ تفوق و برتری کے احکامات نازل فرما دیئے۔ جیسا کہ میں اپنے گھر میں کچھ مشورہ کر رہا تھا کہ میری بیوی مجھے پوچھے بغیر مشورہ دینے لگی مجھے بیحد ناگوار گزرا۔ میں نے ان سے کہا میں نے تو آپ کو مشاورت کی تکلیف نہیں دی آپ دخل در معقولات دینے والی کون ہوتی ہیں۔ میری اہلیہ نے جواب دیا۔ آپ کے معاملہ میں مجھے زبان ہلانے کی جرات نہ ہو مگر جناب کی صاجزادی نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا زچ کر رکھا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو خفا کرنے میں بھی کوئی کمی اٹھا نہیں رکھی۔ میں نے چادر کندھے پہ رکھی اور ام المومنین حفصہ رضی اللہ عنہا کے ہاں پہنچ کر کہا۔ صاجزادی تم نے رسول اللہ ﷺ کو جھگڑا کرکے خود پر ناراض کر لیا ہے۔

بی بی حفصہ: ہم نے ایسا ہی کیا ہے آپ کو اس سے کیا غرض ہے؟

عمر: اے حفصہ میں تمہیں رسول اللہ ﷺ کے غصہ اور عذاب سے ڈراتا ہوں مبادا تم اپنی ہم عصر کے نقش قدم پر چلو! ان پر تو رسول اللہ ﷺ کی نظرِ لطف سب حرم کے مقابلہ میں بیش از بیش ہے۔

میں یہاں سے نکلا اور ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں حاضر ہوا جو میری قرابت دار تھیں۔ ان سے یہ تذکرہ کیا تو انہوں نے اور زیادہ تنبیہہ فرمائی کہ اے ابن خطاب تم رسول اللہ ﷺ کے ہر معاملہ میں دخل دینے لگے یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کے گھریلو معاملات میں بھی دخل دے رہے ہو۔ مجھے سیدہ ام سلمہ کی ڈانٹ کے بعد زیادہ احساس ہوا اور میں وہاں سے اٹھ کر چلا آیا۔

دوسری روایت مسلم میں حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے۔ میں بارگاہ نبوی ﷺ میں موجود تھا کہ اتنے میں ابوبکر رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ فرط غم سے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ تمام امہات بھی موجود بالکل خاموش بیٹھی تھیں۔ مجھے دل میں آیا رسول اللہ ﷺ کو ہنسنے پہ مجبور کیا جائے۔ میں نے عرض کیا۔ "اگر بنت خارجہ مجھ سے ایسے نفقہ کا مطالبہ کرے تو اس زور کی پٹخنی دوں کہ سر کے بل زمین پر گر پڑے" رسول اللہ ﷺ ہنسی نہ روک سکے اور فرمایا یہ سب مجھے اسی قسم کے مطالبہ میں گھیرے ہوئے ہیں۔

یہ سن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ اٹھے اور اپنی صاجزادی کو ایک طمانچہ رسید کر کے کہا۔ تم اللہ کے رسول ﷺ سے وہ چیز طلب کرتی ہو جو آپ کے قبضہ میں نہیں۔

عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی حفصہ کے تھپڑ مار کر کہا۔ تم رسول اللہ ﷺ سے وہ شے طلب کرتی ہو جو ان کے قبضہ میں نہیں۔

عائشہ رضی اللہ عنہا اور حفصہ رضی اللہ عنہا دونوں نے وعدہ کیا کہ آئندہ ہم آپ سے کوئی ایسی چیز طلب نہیں کریں گی جو آپ کے قبضہ قدرت میں نہیں۔ اس موقع پر ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا بارگاہ نبوی میں آنے کا سبب یہ تھا کہ اذان ہونے کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں نہیں آئے تھے جو مسلمانوں کے لئے پریشانی کا سبب بن گیا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے جس کا تعلق بقیہ امہات کے علاوہ حفصہ رضی اللہ عنہا اور عائشہ رضی اللہ عنہا سے بھی ہے یہ آیت نازل ہوئی۔

یا ایھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیاۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتعکن واسرحکن سراحا" جمیلا○

اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت و آرائش کی خواستگار ہو تو آؤ میں تمہیں مال دوں اور اچھی طرح سے رخصت کر دوں۔

وان کنتن تردن اللہ ورسولہ والدار الاخرۃ فان اللہ اعد للمحسنات منکن اجرا" عظیما"○ (33:28-29)

اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور عاقبت کے گھر کی طلب گار ہو تو تم میں جو نیکوکاری کرنے والی ہیں' ان کے لئے اللہ تعالٰی نے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔

دوسرا واقعہ

شہد کے بارہ میں دوسرا واقعہ یہ ہے کہ معمول مبارک یہ تھا کہ رسول پاک نماز عصر کے بعد حرم میں سے ہر ایک بی بی کے حجرہ میں ذرا دیر کے لئے تشریف لاتے۔ ایک روز سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا بروایت دیگر سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا لیکن اس روایت کا تعلق سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا سے ہے' کے گھر تشریف لے گئے اور معمول سے زیادہ دیر لگا دی جس سے دوسری حرم رشک سے بے تاب ہو گئیں۔ ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ "میں اور حفصہ دونوں اس بات پر متفق ہو گئیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کے ہاں تشریف لائیں وہ کہے یا رسول اللہ دھن مبارک سے یہ مغافیر کی سی بو کیسے آ رہی ہے۔ آپ نے کہیں مغافیر تناول تو نہیں فرما لیا" (مغافیر کھانے میں شیریں مگر اس کی بو میں کراہت ہوتی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بدبو سے سخت نفرت تھی۔

چنانچہ آپ یکے بعد دیگرے دونوں کے ہاں تشریف لائے حسب قرارداد دونوں نے مغافیر کھانے کا شبہ ظاہر کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ میں تو زینب کے ہاں سے شہد کھا کر آیا ہوں۔ اگر یہی بات ہے تو آج سے شہد استعمال نہ کروں گا۔

بروایت ام المومنین سودہ رضی اللہ تعالٰی عنہا جو اس تجویز میں جنابہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ

عنہا سے متحد تھیں، آنحضرت ﷺ میرے ہاں تشریف لائے تو میں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ شاید آپ نے مغافیر کا پھل، عرفط کا شہد استعمال کر لیا ہے؟ اسی طرح عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا۔ جب ان کے ہاں قدم رنجہ فرمایا اور سیدہ صفیہ کے ہاں تشریف لائے تو انہوں نے بھی اسی طرح کا شبہ ظاہر کیا جس سے رسول اللہ ﷺ نے متاثر ہو کر شہد اپنے اوپر حرام کر دیا۔

اس کامیابی پر سودہ رضی اللہ عنہا نے فخر سے کہا۔ سبحان اللہ ہم کامیاب ہو گئیں۔ مگر بی بی عائشہ نے معنی خیز نظروں سے ان کو دیکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔ یہ تجربات جن کا درجہ اب تک عرب کی عام عورتوں کا تھا جو اپنے حقوق طلب کرنے میں زبان کھولنے کی جرات نہ کر سکتی تھیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ نے انہیں اپنے حرم میں لے کر ان کا درجہ بہت بلند فرما دیا جس کی وجہ سے بی بیاں حضرت ﷺ ہی کے بارے میں زیادتیاں کرنے لگیں کہ ایک پورا دن آنحضرت ﷺ غم میں ڈوبے رہے۔ حرم میں سے ایک بی بی نے رُو در رُو رسول پاک ﷺ سے گفتگو اس انداز سے کی جس سے آپ رنجیدہ ہو جائیں۔ اس سے پہلے کئی بار ایسا ہو تا رہا، بیبیوں میں سے جس کسی نے بھی سوتیاپے کے اثر میں مزاج اقدس کے خلاف بات کی تو آپ ﷺ نے اس کے لئے ظاہری نرمی اور لطف کے دامن کا پھیلاؤ ذرا سمیٹ لیا تاکہ حدود ادب سے تجاوز نہ کرنے پائیں۔ لیکن ابراہیم کی ولادت سے تمام ازواج کا رشک ناخوشگوار حد تک ابھر آیا۔ یہاں تک کہ آپ کو سخت صدمہ پہنچایا۔

ازواج کا شکوہ

اسی طرح ایک روز بی بی حفصہ رضی اللہ عنہا اپنے والد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ہاں تشریف لے گئیں۔ ان کی موجودگی میں سیدہ ماریہ حرم سرائے نبوی میں آئیں۔ رسول اللہ ﷺ اس وقت حفصہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں تھے۔ بی بی ماریہ رضی اللہ عنہا بھی اسی حجرہ میں آ بیٹھیں۔ حفصہ رضی اللہ عنہا واپس آئیں تو رشک سے بے قابو ہو گئیں۔ جونہی ماریہ رضی اللہ عنہا ان کے کمرہ سے نکلیں سیدہ حفصہ نے رسول اللہ ﷺ سے کہا۔ میں نے ماریہ کو اپنے حجرہ میں دیکھ لیا ہے۔ آپ کے دل میں اگر ذرا بھی منزلت ہوتی تو آپ مجھے اتنا ذلیل نہ فرماتے۔

رسول اللہ ﷺ حیران تھے کہ حفصہ میرے راز کو افشا نہ کر دیں۔ (نہ معلوم اس میں راز کی کیا بات تھی؟) رسول اللہ ﷺ نے حفصہ کو مطمئن کرنے کے لئے ماریہ کو خود پر حرام کر دیا۔ اس شرط کے ساتھ کہ یہ واقعہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے بیان نہ کریں۔ سیدہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے زبانی کلامی یہ بات مان لی لیکن کسی انداز سے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ میں آپ کا

یہ راز سب سے بیان کر آئی ہوں۔ رسول اکرم ﷺ کو بارہا یہ خیال گزرا کہیں یہ معاملہ دوسری بیبیوں تک پہنچ گیا ہو۔ ممکن ہے اسی وجہ سے سب ایک ہو گئی ہوں۔

اگرچہ واقعہ اہم نہ تھا۔ میاں بیوی کے درمیان معمولی جھگڑے ہو ہی جاتے ہیں۔ اسی طرح کنیز اور اس کے آقا میں بھی شکر رنجی ہو سکتی ہے۔ جو اپنے آقا کے لئے حلال ہو مگر سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں کے شایان شان نہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ اور ماریہ کے معاملہ میں خود کو اس قدر پریشان کرتیں۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی رسول اللہ ﷺ اور آپ کے حرم کے درمیان زندگی کے بعض معاملات و اخراجات کی وجہ سے یا سیدہ زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے گھر سے شہد کھانے کی بناء پر جھگڑا ہو چکا تھا۔ دوسرے امور بھی جیسے عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی طرف ما بقی حرم کے مقابلہ میں زیادہ تر آپ کا لطف اور عنایات' اسی طرح ماریہ قبطیہ پر مزید لطف و کرم وجہ نزاع بنتا رہا۔

سیدہ زینت بنت جحش رضی اللہ عنہا

اس درمیان میں جناب زینب رضی اللہ عنہا دوسرے حرم کو اپنے ساتھ ملا کر نبی اکرم ﷺ سے گلہ کرنے لگیں کہ آپ نے بی بی عائشہ کو ہم سب پر ترجیح دے رکھی ہے۔ چہ جائیکہ شوہر کو سب بیویوں سے مساوی سلوک کرنا چاہئے۔ درخواست یہ ہے کہ اپنے ہر ایک حرم کے لئے ایک ایک دن کی باری مقرر فرما دیجئے۔ اس وقد میں یہ واقعہ بھی رونما ہوا کہ ایک ام المومنین جنہیں اپنی ذات کی طرف رسول اللہ ﷺ کی طرف سے کم جھکاؤ کی شکایت تھی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خوشی کے لئے اپنی باری بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کو سونپ دی۔

اس موقعہ پر ایک اور حادثہ ہوا۔ سیدہ زینب بن جحش جو دوسرے حرم کو اپنے ساتھ ملا کر حاضر ہوئی تھیں ان سے بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں بے جا ناراضگی کا اظہار ہو گیا جس کے جواب کے لئے سیدہ عائشہ کو آمادہ دیکھ کر رسالت مآب ﷺ نے انہیں اشارہ سے منع کر دیا لیکن سیدہ زینب رضی اللہ عنہا خود پر قابو نہ رکھ سکیں۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا کی تحقیر میں اور زیادہ اتر آئیں۔ رسول اللہ ﷺ ان کی یہ جرأت دیکھ کر اس طرح خاموش ہو گئے جیسے آپ ہی نے عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنی مدافعت میں جواب دینے کے لئے کہا ہو۔ بی بی عائشہ رضی اللہ عنہا نے زینب رضی اللہ عنہا کو مغلوب کر لیا تو رسول اللہ ﷺ پر پھر مسرت لوٹ آئی۔

نتیجہ

امہات المومنین کے باہم جھگڑوں اور رقابت نے ایسی صورت اختیار کر لی کہ انہیں رسول

اللہ ﷺ کی طرف سے ایک دوسری کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا بھی دشوار ہو گیا- نتیجہ یہ ہوا کہ ان میں سے بعض کو طلاق دے کر یکطرف کر دینے پر غور کرنے کی نوبت آ گئی- (مولف موصوف نے امہات المومنین کے کردار کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ کسی دوسری نہ تو سیرت کی کتابوں میں ملتا ہے نہ احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے- مترجم)

ادھر ختم المرسلین ﷺ کے مشاغل اس قسم کے نہ تھے کہ وہ رسالت جیسے فریضہ سے دامن بچا کر ساری عمر گھر کے جھگڑوں کو سلجھانے میں ختم کر دیں- ضروری تھا کہ حرم کی تادیب و تنبیہہ کا کوئی راستہ نکالا جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عائد کردہ فرض کی تبلیغ یکسوئی سے فرما سکیں- لہٰذا خاتم الرسل ﷺ نے اپنی تمام ازواج مطہرات سے عارضی علیحدگی اختیار کرنے کا ارادہ کر لیا- اگر بیویاں اپنے رویہ میں قطعی تبدیلی کر لیں تو فبہا ورنہ ان سے صاف صاف کہہ دیا-

فتعالین امتعکن واسرحکن سراحا" جمیلاً- (28:33) میری حرم نشینو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر خوش اسلوبی سے رخصت کر دوں! چنانچہ رسول اللہ ﷺ پورا ایک مہینہ سب سے الگ رہے- ان کا ذکر کرنے سے بھی اجتناب فرماتے- اصحاب میں سے کسی کو یہ جرات نہ تھی کہ اس وقفہ میں آپ کے پاس آئیں اور اس بارہ میں گفتگو کر سکیں- آخر آدھے مہینہ کے بعد نبی اکرم ﷺ کی توجہ اس طرف ہوئی کہ مسلمانوں کو عرب سے باہر دعوتِ اسلام دینی چاہیئے اور اپنا وقار کس طرح قائم کرنا چاہیئے- اس طرف رسول کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام اس معاملہ میں تدابیر سوچنے لگے- ادھر ابو بکر رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ اور دوسرے جن کی رسول اللہ ﷺ سے ایسی ہی قرابت تھی سب کے سب امہات المومنین کے بارے میں خوفزدہ کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کو خود پر ناراض کرنے میں کس قدر غلطی کی ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کا غضب اور ملائکہ کا غضب ان پر برس پڑے- ازواج اپنی جگہ بے قرار و نادم کہ ہم نے ایسے مہربان شوہر کو کیوں ستایا- جو ہماری زندگی اور موت ہر حالت میں باپ' بھائی اور بیٹے تک کے حصہ کا سلوک کرنے میں بھی پس و پیش نہ فرمائے-

اس زمانے میں رسول اللہ ﷺ پورے اوقات اپنے بالا خانے میں صرف فرماتے- رباح نامی غلام دہلیز پر چوکیداری کرتا- بالا خانہ میں جانے کے لئے زینہ نہ تھا بلکہ کھجور کے خشک تنے کے سہارے چڑھتے اور اترتے جس میں رسول اللہ ﷺ کو بہت زحمت گوارا کرنا پڑتی-

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مصالحت کی کوشش

اسی انداز سے نبی رحمت ﷺ نے اپنے بالا خانہ میں پورا ایک مہینہ گزار دیا جس میں آپ نے حرم سے علیحدگی اختیار فرمالی۔ اس مہینے کے آخر میں مسلمان غمزدہ بیٹھے تھے۔ سر جھکائے زمین کرید رہے تھے۔ ہر شخص سر جھکائے بیٹھا یہ سمجھ رہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے حرم کو طلاق دے ہی دی ہے۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ ان میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ کرلیا۔ انہوں نے رباح (دربان) کے ذریعہ بارگاہِ نبوت میں حاضر ہونے کے لئے اجازت چاہی مگر رباح پتھر کا بت بن کر کھڑا رہ گیا۔ جیسے اسے یہ بھی اجازت نہیں کہ وہ کسی کی ملاقات کی اجازت بھی طلب کرے چنانچہ عمر رضی اللہ عنہ کے دوسری بار اصرار پر بھی رباح اسی طرح کھڑے رہے۔ تیسری بار عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے چلا کر کہا۔ اے رباح رسول اللہ ﷺ سے میرے لئے اجازت طلب کیجئے۔ شاید نبی رحمت ﷺ نے آپ کو اس لئے منع کردیا ہو کہ میں اپنی صاحبزادی حفصہ رضی اللہ عنہا کی سفارش کرنا چاہتا ہوں حاشا و کلا ایسا نہیں۔ اگر رسول اللہ ﷺ مجھے حفصہ رضی اللہ عنہا کی گردن اڑا دینے کے لئے بھی کہیں تو میں اس سے بھی دریغ نہ کروں گا۔ اس کے بعد اجازت ملی اور بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے۔ اور سامنے حاضر ہوتے ہی رو پڑے۔ رسول اللہ ﷺ نے رونے کا سبب پوچھا تو انہوں نے اظہار کرتے ہوئے فرمایا؟

(1) سونے کے لئے ایک چٹائی۔ جس کے نشان رسول اللہ ﷺ کے جسدِ مبارک پر پڑے ہوئے تھے۔

(2) چمڑہ رنگنے کی چھال۔

(3) ایک کھال۔

(4) مٹھی بھر جو۔

یہ تھی سراج منیر ہادی کل جہاں ﷺ کی کل جائیداد جسے دیکھ کر عمر رضی اللہ عنہ ضبط نہ کرسکے اور آنکھوں سے آنسوؤں کا تانتا بندھ گیا۔

رسول اللہ ﷺ نے ان کے رونے کا سبب معلوم ہونے کے بعد انہیں دنیا کی نعمتوں سے لاپرواہی اور قناعت و صبر کی خوبیوں سے آگاہ کیا۔

عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا۔ آپ ازواج کے معاملہ میں اس قدر پریشان ہیں۔ اگر آپ نے واقعہ ہی انہیں مطلقہ قرار دے دیا ہے تو اللہ تعالیٰ آپ کا والی ہے۔ اس کے فرشتے آپ کے نگہبان ہیں۔ جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام آپ کی حفاظت پہ مامور ہیں۔ میں آپ کی نصرت کے لئے سربکف ہوں۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ پر جان و مال سے نثار ہیں اور تمام

مسلمان آپ کے معین و مددگار ہیں۔ کس کی مجال ہے جو آپ کی طرف میلی نظر سے بھی دیکھے۔ اس کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے کچھ اس انداز سے گفتگو کا رنگ بدلا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کی خفگی جاتی رہی اور آپ بے ساختہ ہنس پڑے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر فوراً" کہا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ مسلمانوں کا اس خبر کی وجہ سے برا حال ہے۔ کہ شاید آپ نے ازواج کو طلاق دے دی۔ میں انہیں یہ خوشخبری سنانے جاتا ہوں کہ طلاق نہیں دی گئی۔ یہ کہہ کر عمر فاروق رضی اللہ عنہ بالا خانہ سے اترے' مسجد میں آئے اور بآوازِ بلند کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے ازواج مطہرات کو طلاق نہیں دی۔ اس واقعہ کی نشاندہی میں قرآن کی یہ آیات اتریں۔

یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللّٰہ لک تبتغی مرضات ازواجک واللّٰہ غفور الرحیم۔ (1:66)

(2)قد فرض اللّٰہ لکم تحلۃ ایمانکم واللّٰہ مولاکم وھو العلیم الحکیم۔ (2:66)

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لئے تمہاری قسموں کا کفارہ مقرر کر دیا ہے اور اللہ ہی تمہارا کارساز ہے اور وہ دانا اور حکمت والا ہے۔

(3)واذاأسر النبی الی بعض ازواجہ حدیثا" فلما نبات بہ واظہرہ اللّٰہ علیہ عرف بعضہ واعرض عن بعض فلما نباھا بہ قالت من انباک ھذا قال نبانی العلیم الخبیر۔ (3:66)

اور یاد کرو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ نے اپنی ایک بیوی سے ایک راز کی بات کہی تو اس نے دوسری کو بتا دی جب اس نے اس کو افشاء کیا اور اللہ نے اس سے رسول کو آگاہ کر دیا تو رسول نے (ان بیوی کو وہ بات) کچھ تو جتائی اور کچھ نہ جتائی اور جب ان کو جتائی وہ پوچھنے لگیں کہ آپ کو یہ کس نے بتایا۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس نے بتایا ہے جو سب کچھ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔

(4)ان تتوبا الی اللّٰہ فقد صغت قلوبکما وان تظاھرا علیہ فان اللّٰہ فھو مولہ وجبریل وصالح المومنین والملائکۃ بعد ذالک ظہیر۔ (4:66)

اگر تم دونوں اللہ تعالیٰ کے آگے توبہ کرو (تو بہتر ہے کیونکہ) تمہارے دل کج ہو گئے ہیں اور اگر رسول (کی ایذا) پر باہم اعانت کرو گی تو اللہ اور جبرئیل اور نیک کردار مسلمان ان کے حامی (اور دوست دار ہیں) اور ان کے علاوہ اور فرشتے بھی مددگار ہیں۔

(5)عسیٰ ربہ ان طلقکن ان یبدلہ ازواجا" خیرا" منکن مسلمات مومنات قانتات تائبات عابدات سیحات ثیبات وابکارا" (5:66)

اگر رسول تم کو طلاق دے دیں تو عجب نہیں کہ ان کا پروردگار تمہارے بدلے ان کو تم سے بہتر بی بیاں دے۔ مسلمان، صاحب ایمان، فرماں بردار، توبہ کرنے والیاں، عبادت گزار، روزہ رکھنے والیاں، بن شوہر اور کنواریاں!

ازواج مطہرات کی اب آنکھیں کھل گئیں اور معاملات اللہ تعالیٰ نے خود سلجھا دیئے۔ اس کے بعد ہر بی بی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دل سے صاف، مطیع فرمان ہو کر پیش آنے لگیں اور رسول رحمت ﷺ ہمیشہ کی طرح اپنے گھریلو معاملات میں متوجہ ہو گئے جس کے بغیر کسی بشر کو مفر نہیں۔

دوستو! راقم مولف نے اس سلسلہ میں امور ذیل کی ترتیب پوری وضاحت کے ساتھ نقل کی ہے۔ یعنی

(ا) شفیع المذنبین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا اپنے ازواج سے ایلا (یعنی علیحدگی)

(ب) آپ کا اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ازواج کو طلاق

ان حوادث اور ان کی دوسری کڑیوں کے مقدمات و نتائج

اور ان حوادث کے متعلق ہر اس صحیح روایت کو لکھ دیا ہے جو حدیث و تفسیر یا سیرت کی کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں۔ ایک دوسری روایت سے متعلق اور ایک دوسرے کی تائید کرنے والی روایات سب جمع کر دی ہیں۔ البتہ اس سلسلہ کے تمام مرویات نہ تو کسی ایک جگہ منقول ہیں اور نہ اس ترتیب کے ساتھ مسطور ہیں۔ جس صورت میں ہم نے نقل کیا۔ ہمارے لئے یہ مشکل قدم قدم پر سدِ راہ بن گئی کہ بعض مسلمان سیرت نگار حضرات ان حوادث پر صرف ایک نگاہ ڈال کر آگے نکل جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں ترتیب و مقدمہ اور نتیجہ میں ناقابل برداشت تحقیق و تلاش پر محنت کرنا پڑتی ہے اور بعض مسلمان سیرت نویس ایلا (علیحدگی) کا سبب عسل اور مغافیر کو بیان کرنے کے بعد خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ جامعین حضرت حفصہ و ماریہ کے واقعات پر توجہ نہ دے سکے!

حضرت حفصہ اور ماریہ رضی اللہ عنہما کیلئے مستشرقین کی توہین آمیز تحریر

مسلمان مورخین کے برعکس مستشرقین نے اس سلسلہ میں ایک نئی راہ اختیار کر لی کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ایلاء کی اصل بنیاد حفصہ رضی اللہ عنہا اور ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو بنایا ہے اور لکھا ہے کہ عائشہ رضی اللہ عنہا سے ماریہ کا قصہ کسی ملتجیانہ انداز میں چھپانے کا وعدہ لیا اور بی بی حفصہ سے کہا کہ آج سے میں ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا کو خود پر

حرام کرتا ہوں۔

اسلام کے ان مہربان مستشرقین نے "ایلا" کے ایک اسی واقعہ کو اپنا مرکزی خیال اس لئے بنایا تاکہ ان کے مسیحی ہم مذہبوں کے سامنے رسول کل عالم کی عظمت قائم نہ ہو سکے! اللہ رے انصاف۔

دنیا کی تاریخ بلند پایہ انسانوں میں سے کسی ایک کے متعلق ایسی لغزش پیش نہیں کر سکی چہ جائیکہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جیسی شخصیت، ہر اپنے بیگانے، اجنبی یا شناسا کے ہمدرد و غمخوار محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنی نوع بشیر کی محبت اور خیر خواہی میں سرفہرست حاضر۔ ان تمام صفات سے متصف جس ذات کو تمام محققین نے بلا اختلافات مانا ہے۔ کیا ایسا عظیم الشان جلیل القدر انسان صرف اس بات پر اپنے تمام ازواج سے قطع تعلق کر لے کہ اپنی ہی مملوکہ کنیز کے ساتھ آپ کو ایک منکوحہ حرم نے خلوت میں دیکھ کر اپنی دوسری ہم عصر جناب عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی بتا دیا۔ بس! تعجب ہے۔ کیا ایسا رفیع المنزلت انسان اتنی سی بات پر اپنے حرم سے یوں کنارہ کش ہو کر انہیں طلاق دینے پر آمادہ ہو جائے۔

اگر ان واقعات کو ایماندارانہ ترتیب کے ساتھ باہم منسلک کیا جائے تب ایسے صحیح نتائج پر پہنچا جا سکتا ہے جو عقل صریح اور علم صحیح کے معیار پر پورا اتر سکیں۔ جیسا کہ ہم نے ان واقعات کی تنقیح کا فریضہ انجام دیا ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان کے بالکل مطابق ہے۔

مستشرقین کی نکتہ چینی کا جواب

سورہ تحریم کی جو آیات نقل کی گئی ہیں مستشرقین انہی آیات کو اپنے اعتراضات کا ذریعہ بنا کر فرماتے ہیں۔ قرآن کے علاوہ دوسری آسمانی کتابوں میں کسی نبی کے متعلق اس قسم کا حادثہ منقول نہیں۔ لیکن اگر ہم (1) آسمانی کتابوں میں سے جن میں قرآن مجید بھی شامل ہے قوم لوط کے جنسی مشاغل کا اقتباس پیش کریں جنہیں ہر شخص جانتا ہے۔

(2) نبی اللہ حضرت لوط علیہ السلام کے ان دو مہمانوں کا ذکر جو حقیقت میں فرشتے تھے مگر خوبرو، بلند قامت امرد لڑکوں کے روپ میں حضرت لوط کے ہاں اجنبی بن کر آئے اور یہ تذکرہ تورات میں اس طرح منقول ہے۔ تورات: پیدائش باب! آیت نمبر 1 تا 25-

(3) تورات ہی میں حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کی وہ داستان بھی موجود ہے۔ جس کی پاداش میں وہ اپنی بدچلن قوم کے ساتھ عذاب میں مبتلا ہوئی۔

غرض یہ کہ ہر آسمانی کتاب انبیاء کے واقعات بیان کرتی ہے تاکہ آنے والی نسلیں عبرت حاصل کریں۔ لہذا قرآن حکیم میں بھی ایسے ہی واقعات منقول ہیں جنہیں رب العالمین نے

احسن پیرایہ میں بیان فرمایا ہے۔ رسول اللہ ﷺ بھی دوسرے پیغمبروں کی طرح اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ تھے جن کا یہ قصہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔

لہٰذا اگر قرآن کسی واقعہ کو نقل کرتا ہے تو ظاہر ہے اس کے بیان کرنے کا مقصد رسول اللہ ﷺ کی سیرت میں سے مثال پیش کرنا مقصود ہے تاکہ ان کے فرماں بردار اس مثال سے اپنے لئے مشعلِ راہ کا کام لیں۔ کتبِ سماوی میں انبیاء کے قصص بیان کرنے میں یہی حکمت کار فرما ہے۔

رسول برحق ﷺ کا ایلاء (علیحدگی) کسی ایک واقعہ کی بناء پر موقوف نہیں۔ نہ اس پر مبنی کہ حضرت رسالت مآب ﷺ کو حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بی بی ماریہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ خلوت میں دیکھ کر اپنی ہم عصر بی بی رضی اللہ عنہا عائشہ الصدیقہ کے سامنے بیان کر دیا۔ سوال یہ ہے کہ خاوند کا اپنی اہلیہ یا آقا کا اپنی کنیز سے یہ تعلق کوئی جرم ہے یا چھپانے کا متقاضی ہے۔ ہرگز نہیں۔

قارئین نے مستشرقین کے ان اتہامات کا مطالعہ کر لیا۔ تاریخی حیثیت سے اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ نہ وہ سابقہ آسمانی کتب کا تائید یافتہ ہے جن میں انبیاء کی صرف حکایات اور سیرت کے واقعات جا بجا منقول ہیں۔

غزوہ تبوک اور وفات ابراہیم علیہ السلام

غزوۂ تبوک اور وفات ابراہیم علیہ السلام

رسول اللہ ﷺ اور ازواج مطہرات میں ہونے والے مختلف واقعات کے درمیان بھی آپ ﷺ کے معمولاتِ نفسی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور فتح مکہ کے بعد دین اسلام کی عظمت و رحمت میں اور اضافہ ہو گیا۔ قبائل میں اس کے اوصاف کی اور عزت بڑھ گئی۔ عرب میں زیارات وحج کے دائمی مرکز بیت اللہ شریف کے مختلف اہم شعبے مثلاً کلید برادری' حاجیوں کو پانی پلانا' اور دوسرے امور کی تقسیم و عطا اب مکمل طور پر ماحی الکفر' کفر کو مٹانے والے محمد ﷺ کے قبضہ میں آگئے۔ اور ان کو دستور اسلام کے مطابق ضابطوں کے ساتھ قائم کر دیا گیا۔ تو گویا بیت اللہ شریف کی براہ راست عزت خدمت میسر آنے کے بعد مسلمانوں کی ذمہ داریاں اور زیادہ بڑھ گئیں۔ ذمہ داریاں بڑھیں تو اخراجات بڑھے' اخراجات بڑھے تو آمدن ذرائع پر غور کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں نشاندہی ہو چکی تھی۔ تجویز کیا گیا کہ مسلمان زکوۃ ادا کریں اور غیر مسلم خراج' گو آخر الذکر کو اللہ کا یہ فیصلہ ناگوار گزرا لیکن اسلامی اقتدار کے سامنے اب وہ لب کشائی کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

زکوۃ کی وصولی

چنانچہ النبی الحاشر علیہ الصلوٰۃ السلام نے حکم الٰہی کی تعمیل میں زکوۃ وصول کرنے والے عمال

مقرر فرما دیئے جنہیں جس قبیلہ کی طرف بھی بھیجا گیا جو اسلام لا چکا تھا۔ انہوں نے نہایت خندہ پیشانی اور اطاعت کیشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ اور انتہائی فراخ دلی کے ساتھ اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کی لیکن بنو تمیم کی شاخ بنو عنبر اور بنو مصطلق نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا۔

حملہ

چنانچہ بنو تمیم کے قبیلہ نے زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو اپنی حدود میں داخل ہوتے دیکھ کر ہی تیر کمان پر چڑھا لئے اور مسلمانوں پر تیروں کی بوچھار کر دی۔ مسلمانوں کا ارادہ جنگ کا تھا نہیں، بغیر کوئی جوابی کاروائی کے سب بارگاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں واپس آ گئے اور روداد سنائی۔

حکم نبوی ﷺ

ماحی الکفر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عینیہ بن حصن رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں پچاس مجاہدین کو ان کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ حملہ ہوا تو سارے بنو تمیم قبیلہ کے لوگ سر پہ پاؤں رکھ کر بھاگ نکلے مجاہدین ان کے پچاس افراد قید بنا کر لے آئے، انہیں نظر بند کر دیا گیا۔

بنو تمیم

اگرچہ بنو تمیم کی اکثریت شرف اسلام حاصل کر چکی تھی۔ لیکن کئی قسم کے بت پرست اب بھی اسلام دشمنی میں بڑے سخت کوشش تھے۔ جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ وہ فتح مکہ اور غزوہ حنین میں بھی شامل ہونے کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔

مفرورین بارگاہ نبوی ﷺ میں

مفرور بنو تمیم کا ایک گروہ فرار کے کچھ دنوں بعد مدینہ منورہ میں آیا اور نبی البشیر النذیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حجرہ کے بالکل سامنے آ کر بلند آواز سے یا محمد، یا محمد چلانا شروع کیا۔ جو آپ ﷺ کو انتہائی ناگوار گزرا، اگر فوری طور پر صلوٰۃ ظہر کے لئے آپ ﷺ کو مسجد نبوی میں آنا ضروری نہ ہوتا۔ تو یہ ہو سکتا ہے اس گروہ کو شرف باریابی بھی نصیب نہ ہوتا۔ غرض صلوٰۃ ظہر کے بعد اس وفد کے ترجمان نے اپنی صفائی پیش کی۔ عینیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شکایت کرتے ہوئے کہا انہوں نے بغیر کسی وجہ کے ہمیں گھیرے میں لے لیا اور ہمارے معزز افراد قید کر لائے۔ اپنی صفائی میں یہ بھی یاددہانی کرائی کہ ہم میں سے کتنے ہی لوگوں نے فتح مکہ

کے وقت آپکی حمایت میں شرکت کی۔ اور بطور فخریہ بھی بتایا کہ ہمارے قبیلہ کو عرب میں کیسی پذیرائی اور کتنی عزت حاصل ہے لیکن اس وقت ہم آپ کے پاس علمی مفاخرہ کے لئے آئے ہیں (مفاخرہ یعنی کلام کے فنی محاسن کی بناء پر نثر اور شاعری میں اپنی قوم اور قبیلہ کا تعارف کرانا ہے)۔

لہٰذا ہماری درخواست قبول کی جائے آپ اپنے ایسے شعراء اور خطیبوں کو بلوا لیجئے جو ہمارے شعراء اور خطیبوں کا مقابلہ کرنے کی استعداد رکھتے ہوں۔

جوامع الکلم رسول اللہ ﷺ نے مطالبہ قبول فرمالیا۔ بنو تمیم کی طرف سے ان کے خطیب عطارد بن حاجب نے اپنے کمالِ خطابت کا زور شور دکھایا۔ ان کے جواب میں مسلمانوں کی طرف سے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ رونق افروز ہوئے اور محاسن کلام کے حسن کو جواباً نکھارا' اس کے بعد شاعری میں مقابلہ ہوا۔ تو بنو تمیم کی طرف سے زبرقان بن بدر نے شعلہ نوائی کا مظاہرہ کیا۔ اپنے قبیلہ کے محاسن گنوا کر خوب خراج تحسین حاصل کیا۔ اس کے جواب میں جناب حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ اٹھے تو اس شان سے اٹھے کہ اسلام کے محاسن سنا سنا کر سب کے ہوش کو دو زانو کر کے بٹھا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنو تمیم کا ایک سردار اقرع بن حابس پکار اٹھا۔ ہماری فکر ہمارا زورِ کلام و بیان سب ہار گئے۔ ہمارے مقابل والوں کی پشت پناہی میں ضرور کوئی غیبی قوت ہے۔

ان کے خطیب ہم سے زیادہ فصاحت و بلاغت میں یکتا ہیں۔ ان کے شاعر ہمارے شاعروں کے مقابلہ میں زیادہ قدرت و ندرت میں بلند قامت ہیں۔ ہمارے خطیبوں اور شاعروں کے مقابلہ میں مسلمان شاعروں اور خطیبوں کی آواز میں زیادہ دلکشی اور اثر انگیزی ہے۔ اس اعتراف کے بعد بنو تمیم کے بقیہ افراد بھی حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ رسول رحمت ﷺ نے ان کے تمام قیدی رہا فرما دیئے۔

بنو مصطلق

اب بنو مصطلق کی باری آئی تو انہوں نے بھی جیسے ہی ماحی الکفر ﷺ کے ارسال کردہ مجاہدین کی جماعت کو اپنی بستی کی طرف آتے ہوئے دور سے دیکھا تو بنو تمیم ہی طرح بھاگ نکلے مگر کچھ دور جانے کے بعد ذرا گھبراہٹ کم ہوئی تو فیصلہ کیا۔ بھاگ کر جائیں گے کہاں؟ نبی رحمت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر معذرت کر لیں ہماری خیریت اسی میں ہے۔ چنانچہ اپنے اس فیصلہ کے ساتھ بارگاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں آئے اور سارا معاملہ سچ سچ بتا دیا۔ مجاہدین کو دیکھ کر کیسے بھاگے اور پھر سچے دل سے آپ سے معافی مانگنے کی غرض سے حاضر ہوئے ہیں۔

ہمیں معاف فرما دیجئے۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاف فرما دیا۔

جزیرۂ عرب میں نور افشاں اسلام

رسولِ رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دعوت طلوع ہونے والے آفتاب کی شعاعوں کی طرح اپنا نور پھیلاتے ہوئے بڑھی۔ نور بڑھتا گیا۔ اجالا ہوتا گیا عرب بلکہ عرب کی سرحدوں کے اس پار بھی اس اجالے نے لوگوں کی آنکھوں کو اپنی ٹھنڈک سے آشنا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر قبیلہ کی طرف دعوت و تبلیغ کے لئے مجاہدین کو بھیجتے' جو قبیلہ اسلام قبول کر لیتا اسے زکوٰۃ دینا لازم ہوتی اور جو سابق دین پر قائم رہنے پر اڑا رہتا اسے اطاعت قبول کر لینے کی صورت میں خراج ادا کرنا ہوتا تاکہ ان سے حاصل ہونے والی آمدن سے ان قبائل کے اقتصادی اور معاشی نظام کو اسلام کے عادلانہ نظام کی سرپرستی حاصل ہو جائے۔

اجالا دیکھ کر اندھیرے کے عادی گھبرائے

روشنی سے گھبرانے والوں میں سرِفہرست روم کا مسیحی بادشاہ ہرقل کا نام آتا ہے جب رسول کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام عرب کی داخلی آبادیوں میں اسلامی تعلیم و تربیت کا نظام نافذ فرما رہے تھے' آئینِ الٰہیہ کے تحفظ کے لئے ہر مخالف اسلام کی سرکوبی میں مصروف تھے۔ تو اس اثناء میں بارگاہ رسالت و نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں یہ اطلاع پہنچی کہ مسیحی حکمران ہرقل روم عرب کے شمال میں مسلمانوں کو برباد کر دینے کی نیت سے بہت بڑا لشکر جمع کر رہا ہے۔ تاکہ موتہ کے میدان میں مجاہدین اسلام نے عیسائیوں کے خلاف اپنی شجاعت و ہمت کی جو دھاک بٹھائی اور رومی عیسائیوں پر ہیبت طاری کر دی تھی اس نفسیاتی دباؤ کو ختم کیا جا سکے! اور اس کے ساتھ ہی ایرانی مجوسیوں نے حیرہ کے مقام پر عیسائیوں کو مغلوب کر کے جو وقتی طور پہ اپنا رعب جمالیا ہے اس پر بھی کاری ضرب لگا کر اسے ختم کر دیا جائے۔

ہرقل کے ان ارادوں کی خبریں ہوا کے کندھوں پر سوار آناً فاناً تمام عرب اور دیگر ممالک کے اطراف میں پھیل گئیں لہٰذا حالات نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری توجہ اس اسلام دشمن قوت کے مقابلہ کی طرف موڑ دی۔

اعلانِ جہاد

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بذات نفس کریم بحیثیت سالار اعلان جہاد فرما دیا۔ گویا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حتمی فیصلہ فرما لیا کہ اب کے بار مسیحیت پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ آئندہ اسے ہمارے خلاف عداوت کی جرأت نہ ہو لیکن موسم کا یہ حال تھا کہ دشت و صحرا پہاڑ

سب کے سب دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح ہو رہے تھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دوزخ نے اپنا منہ کھول دیا ہو۔ بلا کا حبس' قدم قدم پر جاں کنی کا خطرہ' مدینہ منورہ سے لیکر تبوک تک بہت ہی لمبا سفر' جس کے لئے ہمت کے ساتھ ساتھ زاد راہ اور پانی کی اشد ضرورت تھی۔ لیکن اب کے معمول کے خلاف سرور انبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے سفر کا مقصد صیغہ راز میں رکھنے کے بجائے صاف طور پر بیان فرما دیا تھا تاکہ مجاہدین اسلام مکمل طور پر تیار ہو جائیں۔ چنانچہ چاروں طرف قاصد دوڑا دیئے گئے تاکہ مسیحیوں کی فوجی یلغار کے مقابلہ میں مسلمان پوری جمعیت اور اکثریت کے ساتھ نکلیں اور دشمن کے اذیت ناک ارادوں کو پامال کر دیں اور مسیحی غرور کا بت پاش پاش کر دیا جائے۔

ایک سوال

لیکن ذہن میں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسے جان لیوا ماحول میں مسلمانوں کو کودنے کی کیا مجبوری تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے بال بچے کو چھوڑتے' وطن کو چھوڑتے' مال و دولت سے لاتعلق ہوتے' شدید گرمی اور بے آب و گیاہ صحرا کی لمبی منزلیں طے کرتے؟ پھر ایسے قوی دشمن سے ٹکر لینے کا عزم لئے ہوئے جس سے ابھی چند ماہ پہلے ہی مقام موتہ پر مقابلہ ہوا تو اسے شکست دیئے بغیر مجاہدین لوٹ آئے! بہرحال حوصلہ شکن اسباب تو اژدہا کی طرح نظر آ رہے تھے۔ پھر ان کی یہ جرات' یہ ہمت صرف اور صرف ان کے مکمل ایمان کی قوت کے سبب کارفرما تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے پناہ محبت اور جذبہ اطاعت نے انہیں ناقابل شکست جذبہ عمل عطا کیا تھا۔ جذبۂ ایمان' خلوص اور شوق پر استوار اللہ تعالیٰ سے محبت نے انہیں اس کائنات کی ہر چیز پر غالب کر دیا تھا۔

دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحراؤ دریا
سمٹ کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی

مجاہدین اسلام چمکتی زرہیں پہنے اس انداز سے نکلے کہ ان کے رعب و دبدبہ کے سامنے دشمن میں مقابلہ کی ہمت سرنگوں ہو جائے۔ ایسے بہادروں کے سامنے منزلوں کی صعوبتوں کے کیا معنی' گرمی کی شدت' بھوک پیاس کی کیا حیثیت؟

غزوہ تبوک

اس غزوہ میں ہم دو گروہ الگ الگ پاتے ہیں۔

الف۔ کامل الایمان۔ نور ہدایت سے منور دل' رواں رواں ایمان کی لذت سے اچھی طرح آشنا۔

ب۔ طمع اور خوف سے اسلام کا اقرار کرنے والے' ان کو یہ لالچ تھا کہ وہ غیر مسلم قتال سے

حاصل ہونے والے جزیہ کے مال سے حصہ لے سکیں گے بصورت دیگر اگر مقابلہ کریں گے تو یہودیوں کی طرح یا تو جلاوطن کر دیئے جائیں گے یا الٹا جزیہ دینا پڑے گا۔

مجاہدین کے گروہ الف نے تو رسول اللہ ﷺ کی صدا کے جواب میں بلا تاخیر لبیک کہا۔ ان میں سے بعض تو ایسے بھی تھے جو ناداری کے سبب طویل سفر کے لئے سواری کا انتظام کرنے سے بھی قاصر تھے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے برضا و رغبت اپنی جانوں کے علاوہ اپنے اموال کا بھی زیادہ تر حصہ بارگاہِ نبوی ﷺ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ ان لوگوں کا بنیادی مقصد شہادت حاصل کر کے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا تھا۔

شہادت ہے مطلوب و مقصود مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

مگر دوسرے حریص اور طامع گروہ کے جسم پر جہاد کے نام سے رعشہ طاری ہو گیا۔ وہ دعوت جہاد کے جواب میں طرح طرح کی بہانہ بازی پہ اتر آئے۔ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ موسم گرما اور جہاد کے لئے ہلاکت آفریں اس لمبے سفر کو حماقت قرار دیتے ہوئے تمسخر اڑانے لگے۔ منافقوں کے اسی گروہ کے قبیح کردار کی نشاندہی کرنے والی سورہ توبہ نازل ہوئی۔ جس میں جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت و اہمیت بیان کی گئی اور مسلمان کہلا کر رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کرنے پر اللہ کی طرف سے عذاب کا خوف بھی دلایا گیا۔

منافقین جنہوں نے ایک دوسرے کو یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ ایسی گرمی میں گھر سے نہ نکلنا۔ "لا تنفروا فی الحر" (82:9) اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

وقالو الا تنفروا فی الحرا قل لو کانوا یفقہون فلیضحکوا قلیلا" ولیبکوا کثیرا" جزاء بما کانوا یکسبون۔ (9:81-82)

کہنے لگے کہ گرمی میں مت نکلنا (ان سے) کہہ دو کہ دوزخ کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔ (کاش یہ اس بات کو) سمجھتے یہ دنیا میں تھوڑا ہنس لیں اور (آخرت میں) ان کو ان اعمال کے بدلے جو کرتے رہے ہیں بہت سا رونا ہو گا۔

قبیلہ بنو سلمہ کے ایسے منافقوں ہی میں سے جد بن قیس سے رسول شاہد و بشر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ تم بنو اصفر (رومی عیسائیوں) کے ساتھ جہاد کے لئے نہیں چلو گے؟

تو اس منافق جد بن قیس نے جواب میں کہا۔ یا رسول اللہ ﷺ مجھے اپنے ہمراہ نہ لے چلیئے۔ میری قوم جانتی ہے میں عورتوں کے معاملہ میں کس قدر حواس باختہ ہوں۔ بنو اصفر کی عورتیں حسن و جمال میں ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ انہیں دیکھ کر میں اپنے آپ پر قابو نہیں پا

سکوں گا۔

نبی اکرم ﷺ نے اس کی طرف اپنی پشت فرما دی۔ لیکن اللہ رب العزت کی طرف سے اس کو اس طرح جواب دیا گیا۔

ومنهم من يقول ائذن لی ولا تفتنی الا فی الفتنة سقطوا وان جهنم لمحيطة بالكافرين۔ (49:9)

اور ان میں کوئی ایسا بھی ہے جو کہتا ہے کہ مجھے تو اجازت ہی دیجئے اور آفت میں نہ ڈالئے دیکھو یہ آفت میں پڑ گئے ہیں اور دوزخ سب کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔

منافقین نے اپنی طرف سے عوام و خواص کو ورغلانے کی بہت کوشش کی مگر رسول اللہ ﷺ نے بھی ان لوگوں پر نہ صرف کڑی نظر رکھی بلکہ ایسے غداروں کو سخت سزائیں بھی دیں۔

آپ ﷺ کو اطلاع ملی کہ سویلم یہودی کے ہاں کچھ ایسے لوگ جمع ہیں جو مسلمانوں کو جہاد میں شریک ہونے سے روکنے کی سازشیں کر رہے ہیں۔

ماحی الکفر نبی ﷺ نے جناب طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں مجاہدین کو بھجوا کر اس کے گھر کو آگ لگوا دی۔ آگ کے شعلوں سے گھبرا کر ایک ابو الفتنہ چھت سے کودا تو اپنا پاؤں توڑ بیٹھا۔ باقی سب جان بچا کر بھاگ گئے لیکن اس کے بعد کسی منافق کو زبان کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک ہی گرفت نے سب سازشیوں کو خوف میں جکڑ کر رکھ دیا۔

جیشِ عسرہ (عسکر تبوک)

نبی ذوالجلال علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتی نگرانی نے ہر چھوٹے بڑے کو یہ یقین دلا دیا کہ اس غزوہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے چنانچہ دولت مند مسلمانوں نے دل کھول کر مالی امداد کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ایک ہزار درہم نقد اور تین سو اونٹ بمعہ پالان و نکیل پیش کئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے گھر کا پورا اثاثہ پیش خدمت کر دیا۔ بہت سارے مسلمانوں نے اپنی اپنی استطاعت کے مطابق سبقت کی۔ لیکن بعض لوگ جو اپنی ناداری کی وجہ سے خود سواری کا بندوبست نہ کر سکے انہوں نے بارگاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں اس کے لئے درخواست کی، جس کے لئے ہو سکا اس کے لئے سواری کا بندوبست کر دیا گیا۔ بقیہ سے معذرت کی گئی تو وہ لوگ جہاد سے محرومی کے تصور سے بے تحاشا رونے لگے، ان کے شدت گریہ و بکا کی بناء پر ان کا لقب "بکائین" پڑ گیا۔ اس عسرہ جیش تبوک کی تعداد تیس ہزار تھی۔

اسلامی لشکر مدینہ سے باہر جمع ہو کر نبی الحاکم الحاکمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا انتظار کرنے لگا۔ شہر میں اپنے بعد نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کو مدینہ کی نیابت عطا فرمائی۔ اپنے اہل عیال کی نگرانی کے لئے حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو مناسب ہدایات فرمائیں۔ جب تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم لشکر میں تشریف نہ لائے امامت کے فرائض حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے انجام دیئے۔ لیکن عسکر اسلامی میں شامل ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عبداللہ بن ابی (منافق اعظم) اور اس کے ساتھیوں کو باہر نکال دیا۔

روانگی

نقارہ کوچ بجتے ہی عسکر اسلامی حرکت میں آیا۔ تھوڑی ہی دیر میں فضا میں ہر طرف غبار اڑنے لگا۔ مجاہدین کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے فضا میں تھرتھری پیدا ہو گئی۔ مقامی عورتیں اپنے مکانوں کی چھتوں پر سے اس کوہ پیکر لشکر کا نظارہ کرنے لگیں جو صحرا و جبل کو پاؤں تلے روندتے ہوئے شام کے دور دراز ملک کی طرف جا رہا ہے اور دیکھنے والی ہر نگاہ کی زبان پر ہے۔ اللہ رے جذبۂ جہاد و شوق شہادت سلامت' یہ کیسے عظیم المرتبہ مجاہد ہیں نہ ان کے دلوں میں گرمی کا خوف نہ پیاس کا غم۔

زندگی کے دیوانے

زندگی سے محبت کرنے والے نادان جنہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی پر اپنے چھتوں کے سائے اور سامانِ تعیش کی گود کو ترجیح دی اور جہاد میں حصہ نہیں لیا۔ قرآن کی اصطلاح میں ان کو "مخلفین" کہا جاتا ہے۔ اس عسکرِ عظیم کو حد نظر تک جاتے ہوئے نظارہ کرنے والی عورتوں کے علاوہ کچھ ایسے مسلمان بھی تھے جو اس نظارہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے چنانچہ ان میں سے ہی ایک ابو خثیمہ رضی اللہ عنہ تھے جو اس ایمان افروز نظارے کو دیکھ کر اپنے گھر دوڑے ہوئے آئے اس وقت ان کی دونوں بیویوں نے اپنے اپنے دالان اور آنگن میں چھڑکاؤ کیا ہوا تھا اور شوہر کے لئے کھانا تیار کئے بیٹھی تھیں۔ ابو خثیمہ رضی اللہ عنہ نے یہ انتظام و اہتمام دیکھ کر فرمایا۔ اللہ جل شانہ کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دھوپ کی شدت اور گرم لو کے تھپیڑوں سے گزر رہے ہوں اور ابو خثیمہ رضی اللہ عنہ پر بہار سائے اور خوش ذائقہ دسترخوان اور حسین و مہ پارہ بیویوں کے جھرمٹ میں دادِ عیش دے رہا ہو! ایسا نہیں ہو سکتا۔ میرے لئے فوراً زادِ راہ تیار کرو۔ غرض جتنی جلدی ممکن ہو سکا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم پہ چل نکلے اور مقام تبوک میں جا ملے۔

مخلفین یعنی قصداً" پیچھے رہنے والوں میں سے کچھ اور بھی ایسی شخصیات تھیں جنہیں نفس

لوامہ نے گھیرا' ندامت اور رسوائی کے احساس نے انہیں ابو خیثمہ رضی اللہ عنہ کی طرح تبوک کی طرف روانہ کر دیا۔

وادیٔ حجر اسود

جب اسلامی لشکر مقام حجر پر پہنچا جہاں پتھروں کو کھود کر مکان بنا کر بسنے والی قوم ثمود بستی تھی۔ اب بھی وہاں پتھر بکھرے ہوئے تھے' حکم ہوا کہ یہیں پڑاؤ کیا جائے لیکن ساتھ ہی تاکید فرما دی نہ تو یہاں کا پانی پیا جائے نہ اس سے وضو کیا جائے۔ اگر کسی نے پکانے کے لئے آٹا گوندھ لیا ہے تو وہ آٹا اونٹوں کو کھلا دیا جائے مگر اس آٹے کی روٹی کوئی شخص نہ کھائے اور یہ بھی تاکید کر دی گئی کہ کوئی شخص اکیلا بھی لشکر گاہ سے باہر نہ نکلے۔ کیونکہ بسا اوقات اب بھی اسی وادی میں ایسی تند و تیز ہوائیں چلتی ہیں جن کے جلو میں ریت کے پہاڑ ہوتے ہیں جو انسان تو کیا اونٹ بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ بدقسمتی سے دو مسلمان علیحدہ علیحدہ رات کے وقت باہر چلے گئے۔ ایک کو ہوا جھپٹ کر لے گئی اور دوسرا ریت کے نیچے دب گیا۔ صبح ہوئی تو مجاہدین نے دیکھا جس کنوئیں سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پانی پینے سے منع کیا تھا وہ ریت سے لبالب بھرا ہوا تھا۔

مجاہدین پیاس سے نڈھال ہو رہے تھے۔ دل و دماغ پر خوف طاری تھا کہ اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ثمر ایک چھوٹے سے ابر کی صورت ان کے سروں پہ نمودار ہوا اور آنکھ جھپکتے ہی ایسا برسا کہ چاروں طرف جل تھل ہو گیا۔ لشکر نے جی بھر کے پانی پیا۔ جانوروں کو پلایا۔ چھاگلیں بھریں۔ سب خوش و خرم چلے۔ بعض مجاہدین نے اسے معجزہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہا۔ بعض نے کہا نہیں یہ تو غیر موسمی برسات تھی۔ اطلاع ملی کہ عیسائیوں کا جو لشکر سرحد پر جمع ہو رہا تھا یا ہو چکا تھا وہ شام سے واپس بلا لیا گیا ہے۔

رسول رب کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے عیسائیوں کے خوف کا اندازہ تو لگا لیا لیکن ان کا تعاقب غیر ضروری سمجھنے کے باوجود لشکر اسلامی کو عرب اور شام کی سرحد پر پڑاؤ ڈالنے کا حکم فرما دیا۔ گویا یہ دعوتِ جنگ کا ایک انداز تھا۔ اگر عیسائیوں کو شوقِ پنجہ آزمائی ہے تو آؤ۔ میدان بھی موجود اور ہم بھی موجود ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس درمیانی سرحد کو مدافعتی دیوار کی صورت ایسا مضبوط فرمایا کہ آئندہ عیسائیوں کو اس راستے سے عرب میں داخل ہونے کی راہ نہ مل سکے۔

ایلہ ابن روبہ پناہ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں

اسی سرحد پہ ایلہ ابن روبہ نامی شخص کی حکومت تھی۔ رسول اللہ عزوجل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی طرف اس پیغام کے ساتھ اپنا سفیر بھیجا۔ ''اگر تمہیں ہماری اطاعت منظور ہے تو بہتر ورنہ جنگ کیلئے تیار ہو جاؤ'' پیغام ملتے ہی ایلہ یوحنا خود دست بستہ حاضر ہوا۔ اسکے سینے پہ

سونے کی صلیب لٹک رہی تھی۔ بہت سارے تحائف بارگاہ نبوی ﷺ کی خدمت میں پیش کئے اور جزیہ ادا کرنے کا تحریری معاہدہ کرنے پہ رضامندی ظاہر کی۔ اسی طرح جربا اور اذرح نام کی بستیوں کے حکمرانوں نے بھی اطاعت کے لئے سر جھکا دیئے۔ ان تینوں کو رسول اللہ عزوجل علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معافی نامے لکھ دیئے۔ ان میں یوحنا کو عطا کئے ہوئے معافی نامہ کا متن یہ ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ھذہ امنۃ من اللہ ومحمد النبی رسول اللہ لیوحنۃ ابن روبہ' سفنھم وسیارتھم فی البر والبحر لھم ذمۃ اللہ ومحمد النبی! ومن کان مھعم من اھل الشام واھل الیمن واھل البحر فمن احدث منھم حدثا فانہ لایحول مالہ دون نفسہ وانہ طیب لمحمد اخذہ من الناس وانہ لایحل ان یمنعوہ ماء یردونہ ولا طریقا یریدونہ من برا وبحرا!

یہ عافیت نامہ اللہ عزوجل اور اس کے نبی ﷺ کی طرف سے ہے جو اس کے رسول اللہ ﷺ ہیں یوحنا ابن روبہ کے نام مندرجہ ذیل مراعات کا حامل ہے۔ (الف) یوحنا کے کسی دشمن کی طرف سے بری اور بحری نقصان سے تحفظ کی ذمہ داری اللہ رب العزت اور اس کے رسول اللہ ﷺ پر ہو گی۔ اس ضمن میں، یمن اور ساحل سمندر کے رہنے والے وہ حلیف بھی شامل ہوں گے۔ (ب) اور اگر ان کا کوئی آدمی ہمارے ساتھ بدتمیزی کرے گا تو اس کے تمام مال و اسباب ضبط کر لیا جائے گا۔ اور ایسا مال محمد ﷺ کے لئے مباح ہو گا۔ مالی نقصان کے بدلے کسی کی جان نہیں لی جائے گی۔

(ج) یوحنا اور اس کے دوسرے حلیفوں کو ان دریاؤں کا پانی بند کرنے کا ہرگز جواز نہ ہو گا جو اب تک ان کے علاقوں سے گزر کر مسلمانوں کی اراضی کو سیراب کر رہے ہیں۔

(د) یوحنا اور اس کے حلیفوں کو ہمارے ان راستوں کی ناکہ بندی جائز نہیں ہو گی جو خشکی یا سمندر میں ہماری گزرگاہیں ہیں۔

رسولِ رحمت و شفقت نے معافی نامہ یا عافیت نامہ کی توثیق میں یوحنا کو اپنی چادر مبارک بھی عطا فرمائی۔ خاطر و مدارات سے ہر طرح کا آرام پہنچایا۔ بطور جزیہ فی سال 300 دینار! سالانہ ادا کرنا طے پایا۔

غزوہ دوما

رسولِ کتاب اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب دیکھا کہ رومیوں نے از خود اپنی فوجیں واپس

بلالی ہیں۔ اور سرحدی حکمرانوں نے اطاعت قبول کر لی ہے۔ اب کسی کے ساتھ جنگ کی غرض سے یہاں پڑاؤ ڈالے رہنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ دومہ کے حکمران اکیدر بن عبد الملک نصرانی کی طرف سے بغاوت کے امکانات ضرور ہیں۔ ہو سکتا ہے ہرقل روم پھر کسی وقت سر اٹھائے اور اکیدر بھی اس کی کمک پہ اتر آئے۔ ان دلائل کی روشنی میں نبی اللہ جل شانہ علیہ الصلوٰۃ و اسلام نے اکیدر کی سرکوبی ضروری قرار دے کر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں پانچ سو مجاہدین دومہ ارسال فرما دیئے۔

خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کچھ اس انداز سے بڑھے کہ اکیدر کو ان کے آنے کی خبر تک نہ ہوئی۔ اتفاق کی بات اس رات چاندنی اپنے پورے شباب پہ تھی۔ اکیدر نے اس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے اپنے بھائی حسان کو نیل گائے کا شکار کھیلنے کے شوق میں ساتھ لیا۔ حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی نظر پڑ گئی۔ انہوں نے حسان کو قتل کر کے اکیدر کی اس شرط پہ جان بخشی کرا دی کہ وہ مسلمانوں کے لئے شہر کے دروازے کھول دے گا۔ اہل شہر نے اپنے امیر کی جان کا فدیہ قبول کرتے ہوئے شہر کے دروازے کھول دیئے۔ خالد رضی اللہ عنہ کو یہاں سے مال غنیمت میں ایک ہزار اونٹ (1000) بکریاں (8400) گندم (400) وسق' زرہیں (400) اور اس کے ساتھ ثابت و سالم اکیدر ہاتھ لگا۔ اکیدر بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوتے ہی مسلمان ہو گیا۔ اور بطور حلیف دومہ پر اس کو حکمران بنا دیا گیا۔ بعض سیرت نگاروں کا کہنا ہے وہ بعد میں مرتد ہو گیا تھا۔

تبوک سے واپسی

میرے خیال میں اتنی کثیر تعداد اسلامی لشکر کی اتنی لمبی مسافت سے واپسی کا مسئلہ اپنے دامن میں یقیناً کئی مسائل لئے ہوئے ہو گا۔ بعض مجاہدین کے دل میں یہ الجھن کہ ہم نے اتنی لمبی مسافت میں اتنی مصیبتیں سہیں مگر شہادت کے مواقع ہی ہاتھ نہ آئے' ہماری تلواریں نیاموں میں ہی رہیں۔

بعض کے دل میں یہ شکایت کہ اتنے دکھ اٹھانے کے بعد نہ مال غنیمت ہاتھ لگا' نہ ہی مدینہ منورہ کے موسمی میوے ہی کھانے کو ملے۔ مجاہدین میں سے اکثر ایسے بھی ہوں گے جنہیں امیر ایلہ کے علاوہ جربا اور اذرح کے حکمرانوں سے ہونے والے معاہدوں کے مستقبل بعید میں کیا فائدے ہوں گے ان کا شعور ہی نہ رکھتے ہوں! پھر لشکر اسلامی میں منافقین بھی موجود تھے۔ انہوں نے اس قسم کے امکانات سے فائدہ اٹھا کر واقعہ ہی تمسخرانہ انداز اور طنزیہ جملوں کو ہوا دینا شروع کی۔ مومنین نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی ان حرکات سے آگاہ کیا تو منافقین نے ذرا

احتیاط برتنا شروع کیا۔ ورنہ انہوں نے زہر گھولنے میں کوئی کمی نہ چھوڑی چنانچہ واپسی کا حکم فرماتے ہی رسول دانش و حکمت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سخت نگرانی کا عمل بھی جاری کیا اور اسی نگرانی میں لشکرِ اسلامی مدینہ منورہ میں داخل ہوا اور اس کے کچھ ہی دنوں بعد خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی دومہ کے امیر اکیدر کو حراست میں لئے کندھوں پہ زر بفت کی بیش قیمت چادر لئے داخل ہوئے تو اہلِ مدینہ انگشت بدنداں رہ گئے۔ اس کے علاوہ مالِ غنیمت مزید ان کے ساتھ تھا۔

مدینہ منورہ سے لشکر اسلامی کی روانگی کے بعد جو لوگ "متخلف" رہے یعنی گھر بیٹھے رہے اب وہ ندامت سے منہ چھپائے پھرتے تھے۔ منافقین کو اپنی منافقت سانپ کی طرح ڈسنے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایک کو بلوایا۔ پیچھے رہ جانے کی وجہ دریافت فرمائی۔ سب نے بہانے بنائے سب کو معاف کر دیا گیا۔ لیکن تین حضرات کعب بن مالک رضی اللہ عنہ، مرارہ بن ربیع رضی اللہ عنہ اور ہلال بن ربیعہ رضی اللہ عنہ نے اپنا جرم تسلیم کر لیا۔ تو رسول فرقان الحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان سے قطع تعلق (مقاطعہ) کا حکم صادر فرما دیا۔ مسلمانوں نے ان سے خرید و فروخت، سلام کلام سب بند کر دیا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر کرم فرمایا۔ اور آیات نازل فرمائیں۔

لقد تاب اللّٰہ علی النبی والمھاجرین والانصار الذین اتبعوہ فی ساعۃ العسرۃ من بعد ماکاد یزیغ قلوب فریق منھم ثم تاب علیھم انہ بھم رؤف رحیم○

بیشک اللہ تعالیٰ نے رسول پر مہربانی کی اور مہاجرین اور انصار پر جو باوجود اس کے کہ ان میں سے بعضوں کے دل جلد پھر جانے کو تھے مشکل کی گھڑی میں رسول کے ساتھ رہے پھر اللہ نے ان پر مہربانی فرمائی بیشک وہ ان پر نہایت شفقت کرنے والا مہربان ہے۔

وعلی الثلاثۃ الذین خلفوا حتی اذا ضاقت علیھم الارض بما رحبت وضاقت علیھم انفسھم وظنوا ان لا ملجاء من اللّٰہ الا الیہ ثم تاب علیھم لیتوبوا ان اللّٰہ ھو التواب الرحیم۔

اور ان تینوں پر بھی جن کا معاملہ ملتوی کیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ جب زمین باوجود فراخی کے ان پر تنگ ہو گئی اور ان کی جانیں بھی ان پر جنجال ہو گئیں اور انہوں نے جان لیا کہ اللہ (کے ہاتھ) سے خود اس کے سوا کوئی پناہ نہیں پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر مہربانی کی تاکہ توبہ کریں بیشک اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

منافقین پر گرفت

بہر حال تبوک سے واپسی کے بعد منافقین پر گرفت مضبوط کر دی گئی۔ جس کی وجہ یہ تھی

کہ مسلمانوں کی اکثریت ہونے کی وجہ سے ان کی سرگرمیاں اور بھی تیز ہونے لگیں۔ اس لئے نبی رحمت ﷺ نے اس تخریب کار گروہ کو ختم کرنا ضروری سمجھا۔ اللہ عزوجل کی طرف سے دین اسلام کی نصرت و مقبولیت غلبہ اور سربلندی نمودار ہونا شروع ہوئی۔ جزیرۃ العرب کی حدود سے نکل کر دین اسلام اطراف کے ممالک میں داخل ہونا شروع ہو گیا۔ تو منافقین کی تخریب کاری بھی یقیناً بڑھے گی اس لئے ان جراثیم کا ختم کرنا ضروری ہے۔

مسجد ضرار

منافقین نے تخریب کاری کے لئے سب سے پہلا مرکز مسجد کو بھی بنایا۔ مدینہ منورہ سے ملی ہوئی بستی "ذواوان" میں ایک الگ مسجد تعمیر کی گئی۔ اس کا مقصد نماز کے بہانے اسلام میں تحریف کرنا تھا۔ مسلمانوں میں مختلف مسائل کی صورت تفریق پیدا کرنا تھا۔ منافقین یعنی مسجد کے بانیوں نے غزوہ تبوک میں روانہ ہونے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں اس مسجد کے افتتاح کرنے کی درخواست کی تھی۔ جسے آپ ﷺ نے اس وقت ملتوی فرما دیا تھا لیکن تبوک سے واپسی کے بعد ان لوگوں نے پھر وہی مسئلہ پیش کر دیا۔ لیکن اس سے پہلے رسول اللہ ﷺ کو منافقین کے مقاصد سے اللہ عزوجل نے آگاہ فرما دیا تھا۔ اس لئے اس کا افتتاح تو نہ ہوا بلکہ اسے جلا دینے کا حکم صادر ہوا جب یہ مسجد ضرار جلا دی گئی تو تمام منافقین کو سانپ سونگھ گیا۔ خصوصاً راس المنافقین "عبداللہ بن ابی" کو بہت دکھ ہوا لیکن یہ بدنصیب بھی ضرار مسجد کے مسمار کر دینے کے دو مہینے بعد ہی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ دل جو ہمیشہ مسلمانوں کے حسد میں جلتا رہتا' کینہ کی آگ جس سینے میں ہمیشہ سلگتی رہتی' وہ جب ہمیشہ کے لئے موت کی آغوش میں چلا گیا تو نبی رحمت ﷺ نے مسلمانوں کو اس منافق عبداللہ بن ابی کی مذمت کرنے سے بھی منع فرما دیا۔ یہاں تک کہ اس کی نماز جنازہ کی درخواست بھی قبول فرمالی اور جب تک اس کی لاش قبر میں دفن نہ ہوئی اس کے سرہانے تشریف فرما رہے۔ لیکن عبداللہ بن ابی کی موت سے گویا منافقت کا انتہائی قد آور ستون پاش پاش ہو گیا اور اس کے ہم مشرب اب اسلام کی طرف انتہائی خلوص کے ساتھ بڑھے اور صدقِ دل سے توبہ کر کے مخلصین میں شمار ہونے لگے۔

مدینہ منورہ امن و سلامتی کا گہوارہ

تبوک کے سفر سے واپسی اپنے ساتھ مدینہ منورہ کے لئے چاروں طرف سے امن و سکون

کی برکتیں لاتی۔ اب تک حدودِ عرب میں جتنے قبائل مسلمان ہوئے تھے وہ سب کے سب اپنے روٴسا کی قیادت میں بارگاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں وفود کی صورت اٹد آئے۔ انہی ایامِ سکون میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے لختِ جگر ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مرکزِ توجہ رکھتے۔ اس وقت ابراہیم علیہ اسلام کی عمر 16 ماہ یا 18 ماہ سے زیادہ نہ تھی۔ وفود اسے منصب رسالت و نبوت کی ذمہ داری و دعوت دین کے فرائض ادا کرنے کے بعد جتنا بھی وقت میسر آتا۔ اپنے نور نظر سے دل بہلاتے۔ ابراہیم علیہ اسلام کی صحت ماشاء اللہ بہتر سے بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ ام سیف جو ان کی پرورش کے لئے مقرر کی گئیں تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے عطا کردہ بکریوں کے دودھ سے انہیں ہمیشہ سیراب رکھتیں' ابراہیم علیہ السلام کی شکل و شباہت اپنے رفیع المنزلت والد رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملتی جلتی تھی۔ اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان سے زیادہ محبت تھی۔ مگر آپ کا یہ یقین محبت نہ تو اس خواہش پہ مبنی تھا کہ انہیں رسالت یا خلافت کی وارثت ملے۔ نہ دنیا کی وراثت کا ترکہ اسے دینے کی تمنا تھی۔ اس لئے وضاحت فرما دی۔

نحن معاشر الانبیاء لانرث ولا نورث ما ترکناہ صدقہ!

ہم انبیاء کا دستور یہ ہے کہ ہم خود کسی ترکہ کے وارث بنتے ہیں اور نہ ہی کسی کو اپنے ترکہ کا وارث بنانے کے مجاز ہوتے ہیں۔

صاحب زادے کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ جذبہ محض پدرانہ شفقت کا حامل تھا۔ جس سے تمام والدین یکساں فطرتاً بہرمند ہیں۔ البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں یہ محبت و شفقت رحمت و رقت سب سے زیادہ تھی۔ یہ جذبہ ہر عربی نژاد میں تھا کہ اس کے بعد اس کی نسل کی طمع قائم رہے۔ چنانچہ سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اس فطری جذبہ کے مالک تھے۔ اس سے پہلے دو صاحبزادے سید قاسم و طاہر جو سیدہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے بطن سے تھے۔ آپ کے سامنے راہی ملک بقا ہوئے تھے۔ اپنی تین صاحب اولاد اور شوہر والی صاحب زادیوں میں سے دوسری کو اپنے ہاتھوں سے دفنا چکے تھے جن کے بعد صرف سیّدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا رہ گئی تھیں۔ غرض یہ کہ اپنے ہاتھوں سے اپنی اولاد کی دائمی مفارقت کا جو گھاؤ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھی۔

ابراہیم علیہ السّلام کی علالت و وفات۔

آنکھیں ٹھنڈی کرنے کا یہ دور سولہ یا اٹھارہ مہینہ سے زیادہ نہ رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لخت جگر ایسے بیمار ہوئے کہ زندگی کی سب امیدیں ٹوٹ گئیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان

کے مطابق انہیں ان کی نگہداشت رکھنے والی ام سیف رضی اللہ عنہا کے ہاں سے ان کی والدہ عالیہ ماریہ قطبیہ رضی اللہ عنہا کے ہاں ہمشیرہ ام ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ہاں منتقل کر دیا گیا۔ سیدہ ماریہ رضی اللہ عنہا اور ان کی ہمشیرہ سیدہ سیرین رضی اللہ تعالیٰ عنہا دونوں تیمار داری میں مصروف رہیں لیکن مرض بڑھتا ہی گیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی گئی۔ سنتے ہی دل بیٹھ گیا۔ عبدالرحمٰن عوف رضی اللہ عنہ' کا سہارا لئے سید البشر علیہ الصلوۃ والسلام تشریف لائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اس وقت آخری سانس لے رہے تھے۔ سید البشر الصلوٰۃ والسلام نے اپنی گود میں لے کر فرمایا۔انا یا ابراہیم لاتغنی عنک من اللہ شیاء "اے ابراہیم میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو تم سے دور نہیں رکھ سکتا" سید البشر علیہ اصلوۃ والسلام نے انہیں منع فرمایا۔ صبر کی تلقین کی اس اثناء میں ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کا سلسلہ وار بقا سے جا جڑا اور ادھر سے ٹوٹ گیا۔ تو سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دل میں شفقت و محبت پدری کی روشن شمع کپکپا اٹھی۔ پھر۔ وہ جیسے آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ہونٹوں پر تھر تھر دیا۔

یا ابراہیم لو لا انہ امر حق و عد صدق و ان آخر نا سیحلق یا ولنا لحزنا علیک اشد من ھذا اے ابراہیم اگر موت برحق نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کے وعدے سچے نہ ہوتے تو ہم تمہاری موت پر بہت زیادہ بے قرار ہوتے۔ لیکن مرنے والوں کی ملاقات کے لئے ہمیں بھی ایک نہ ایک دن ان کے پاس پہنچنا ہی ہے۔

اس کے بعد سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کچھ سنبھلے تو فرمایا۔

تدمع العین ویحزنَ القلب و لاتقول الا ما یرضی الرب وانا یا ابراہیم لمحزونون۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ دل غم زدہ ہے۔ لیکن زبان پر ہم ایسا کلمہ ہرگز نہیں لائیں گے جو ہمارے پروردگار کو پسند نہ ہو۔ ابراہیم (علیہ السلام) میں تمہاری موت پر بہت زیادہ غمگین ہوں۔

سید البشر علیہ الصلوۃ والسّلام کے رونے اور غم زدہ ہونے سے متاثر ہونے والے حاضرین نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ تو رونے اور اظہارِ غم سے دوسروں کو منع فرماتے ہیں؟ فرمایا۔

ما عن الحزن نہیت و انما نہیت عن الحزن یا لبکاء وان ماترون بی اثر ما فی القلب من محبۃ و رحمۃ ومن لم یبد الرحمہ لم یبد غیرہ علیہ الرحمۃ۔ میں نے حزن و غم سے کسی کو نہیں روکا۔ بین اور نوحہ کرنے سے روکا ہے۔ میرے حزن و غم کا سبب

فطری جذبہ بشریت ہے۔ محبت و شفقت و پدری ہے۔ جو شخص دوسروں پر شفقت و محبت یا رحم نہیں کرتا۔ وہ بھی اوروں کی مہربانی اور لطف و رحم سے محروم رہتا ہے۔ یہ فرمانے کے بعد جب اپنے جذبات پر قابو پایا تو سیدہ ماریہ رضی اللہ عنہا اور سیرین رضی اللہ عنہا سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ان لہ لمرضعاً فی الجنتہ۔ ابراہیم علیہ السلام کے لئے جنت میں ایک دائی موجود ہے؟ سیدنا ابراہیم علیہ السلام کے چہرہ مبارک کو بی بی ام بردہ رضی اللہ عنہا (اور ایک دوسری روایت کے مطابق سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کے صاحب زادے جناب فضل بن عباس رضی اللہ عنہ نے غسل دیا۔ کھٹولے پر نعش معصوم رکھ لی گئی۔ سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عم بزرگوار اور دوسرے مسلمانوں کے ساتھ جنت البقیع میں لے گئے۔ سید البشر علیہ السلام نے جنازہ پڑھایا۔ تدفین کے بعد فرمایا۔ قبر میں دراڑیں نہ رہیں۔ درستی کے بعد دست مبارک سے مرقد بنا کر پانی چھڑکا اور نشانی کے طور پر قبر کے سرہانے پتھر رکھ دیا۔ آخر میں یہ کلمات ارشاد فرمائے۔

انہا لاتضر ولا تنفع ولکنہا تقر عین الحی وان العبد اذا عمل عملا احب اللہ ان تیقنہ قبر کی ساخت پر میت کے نفع اور نقصان کا انحصار نہیں۔ اس سے زندوں کی تسکین ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو دوست رکھتا ہے۔ جو کسی شے کو ادھورا نہ چھوڑے۔

ایک اتفاقی حادثہ سورج گرہن

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات کے روز ہی اتفاق سے سورج گرہن لگ گیا۔ جسے بعض سادہ لوح مسلمان رسول اللہ ﷺ کا معجزہ قرار دینے لگے کہ آپ کے صاحب زادہ علیہ السلام کی قبر پر سورج بھی غم سے کالا ہو گیا۔ یہ خبر رسول اللہ ﷺ تک پہنچی تو آپ ﷺ نے اس کے رد عمل میں مسلمانوں کے عام مجمع میں اعلان فرمایا۔

ان الشمس والقمر آیات من آیات اللہ لا تخسفان الموت احد و لا لحیاتہ فاذار ایتم ذالک فافزعوا الی ذکر اللہ با الصلوٰۃ

یہ چاند اور سورج تو اللہ جل و شانہ کی ذات اقدس کے ٹھوس ثبوت ہیں ان کا کسی کی موت یا زندگی پر گرہن لگنے سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔ البتہ گرہن لگنے پر تم اہتمام صلوٰۃ کرو اور اللہ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کرو۔

اس سے زیادہ واضح دلیل اور کیا ہو سکتی ہے۔ کہ نبی اکرم ﷺ اپنے غم میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی منصب رسالت کا فریضہ ادا کرنے میں ذرہ بھر بھی فرق نہیں آنے دیتے۔ چنانچہ مستشرقین کو بھی آپ ﷺ کی عظمت و برتری کا اعتراف کرنا پڑا اور ان کے قلم سے

بے ساختہ نکل گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نازک سے نازک مواقع پر بھی حق و صداقت کو دوسروں تک پہنچانے کے فرض منصبی سے نہیں چوکتے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے انہیں حضرت ابراہیم کے غم میں مبتلا پایا تو ان کے دلوں پر کیا گزری ہو گی؟

وفود کا سال

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے تمام گزشتہ حالات حادثات اندوہ و شادمانی کے درمیان رسول برحق امام المہدیٰ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے فرائض کو ادا کرنے میں صبح و شام مصروف رہے۔ اور اطرافِ عالم سے کثرت کے ساتھ وفود بارگاہ نبوت میں حاضر ہوتے رہے۔ جن کی وجہ سے اس سال کا لقب ہی 6 سال وفود "(عام الوفود)" مشہور ہو گیا اور اسی سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد پر 10 ہجری کو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حج کعبہ کی سعادت حاصل ہوئی۔

سالِ وفود ایک بار پھر

غزوہ تبوک کے بعد کے اثرات کا اختصار ایک بار پھر ذہن نشین کرلیں۔ اس غزوہ کا نتیجہ تمام جزیرۃ العرب میں دین اسلام کے اثر و نفوذ کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

رسول اللہ العالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خارجی اور داخلی دشمنوں کی جارحانہ کوششوں سے سکون ملا۔ مدینہ منورہ مکمل طور پر اطمینان و سکون کا گہوارہ بن گیا۔

جتنے قبائل اب تک قدیم مذہب شرک پر قائم تھے غزوہ تبوک کے بعد سب اپنے مذہب پر محاسبانہ نظر کرنے پر مجبور ہو گئے۔ تمام اہل عرب اس حیرت میں کہ رومی فوجیں لشکر اسلامی کے سامنے صف آرا ہونے کے بجائے اپنے ملک کے اندر قلعوں میں جا بیٹھیں۔ ملک کے جنوب کی سمت واقع یمن، حضر موت اور عمان کے رہنے والوں تک رومیوں کی پسپائی انتہائی قابلِ حیرت سوال بن گئی۔ کل ہی کی بات تھی انہیں رومی فوجوں نے ایران جیسی سلطنت کو شکستِ فاش دے کر اپنی مقدس صلیب ان سے چھین لی اور اسے دوبارہ بہت بڑے انسانی ہجوم کے ساتھ قدم بقدم چل کر بیت المقدس میں اس کے اصل مقام پر نصب کرنے کا اعزاز حاصل کرلیا تھا۔ وہی ایران جس کی حکمرانی کے ماتحت یمن جیسا وسیع ملک اور دوسرے عربی صوبے باج گزار تھے۔

عام الوفود

جزیرۃ العرب کے قرب و جوار میں سے نہ صرف یمن بلکہ ہر خطہ میں دین اسلام کے اصول

و ضوابط اور اخلاقی محاسن سے لوگ آشنا ہی نہیں بلکہ متاثر ہو چکے تھے' ان لوگوں کے لئے اس سے اور کون سا بہتر راستہ ہو سکتا تھا کہ وہ بارگاہ رسالت معلمِ علم و حکمتِ دین کے حضور میں حاضر ہو کر حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں یا علمِ اسلام کے نیچے ایران اور روم جیسے خونخوار شاہی نظام سے رہائی پالیں لہٰذا ان دونوں صورتوں میں سے جو قبائل بھی نعمت و رحمتِ اسلام قبول کرنے کا تحفہ بارگاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پیش کرتے وہ خلعتِ اسلام سے مزین ہو کر لوٹتے اور جو قبائل کے رئیس ہوتے ان کے عہدوں پر ان کو بدستور قائم رہنے دیا جاتا۔ 10 ہجری کے اس سال وفود اتنی زیادہ تعداد میں حاضر خدمت ہوئے کہ اس سال کا لقب ہی "عام الوفود" مشہور ہو گیا۔

عروہ بن مسعود طائفی کا قبولِ اسلام اور شہادت

طائف کی سرکردہ شخصیتوں میں سے اس شخصیت کا واقعہ انتہائی حیرت انگیز ہے یہ وہی اہلِ طائف ہیں جن کا محاصرہ غزوہ حنین کے بعد مجبوراً" کیا گیا تھا۔ لیکن جنگ یا فتح کے بغیر محاصرہ ترک کرنا پڑا۔ اتفاق کی بات ہے رئیسِ طائف عروہ بن مسعود محاصرہ کے زمانہ میں طائف چھوڑ کر یمن گئے ہوئے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تبوک سے واپس آنے کے بعد اہلِ طائف نے بھی اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا۔ درحقیقت وہ ایک عرصہ سے غور و تدبر کر رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہئے؟ یہی وجہ ہے رئیس طائف عروہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ بذات خود مدینہ منورہ بارگاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں حاضر ہوئے خود اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی پوری قوم کو مشرف بہ دین اسلام کرنے کے لئے جلد ہی واپس جانے پہ اصرار فرمایا۔

جناب عروہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ شاہد' مبشر' نذیر رحمت للعالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت سے ناآشنا نہ تھے' معاہدہ حدیبیہ کے موقع پر قریش کی طرف سے وکالت کے درمیان اللہ تعالیٰ کے رسول کے علم اور حکمت و دانش و فراست بلاغت سے متاثر ہو چکے تھے جس کا اظہار انہوں نے واپسی پر قریش کے سامنے کر بھی دیا تھا۔

علم الوحی کے معلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عروہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دل میں دعوت دین کے پرعزیمت جذبوں کا احساس ہو چکا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں بنو ثقیف کی اپنے معبود لات سے شدید لگاؤ پر بھی تھی۔ اسی کو مدّ نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں دعوت کے معاملہ کچھ تدبر اور تامل اختیار کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے فرمایا۔ اگر تم نے بنو ثقیف میں تبلیغ کی تو ہو سکتا ہے وہ تمہیں قتل کر دیں۔ عروہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے تو بنو ثقیف اپنی آنکھ کا تارا سمجھتے ہیں! مختصر یہ کہ عروہ بن مسعود

رضی اللہ عنہ طائف پہنچے اور اپنی قوم کو دعوت اسلام پیش کی' قوم کے مشرکوں نے صیغہ راز میں رکھ کر آپس میں ایک فیصلہ کیا۔ اسی رات کی جب صبح ہوئی اور عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم کو فجر کی صلوٰۃ کیلئے جمع ہونے کا اعلان کیا تو سب نے چاروں طرف سے جواب میں تیروں کی بوچھاڑ کر کے انہیں شہید کر دیا۔ آخری سانسوں کے وقت جب عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اہل و عیال ان کے اردگرد جمع ہوئے تو زندگی کے آخری سانسوں کے ساتھ آخری الفاظ فرمائے۔

کرامته اکرمنی اللہ بھا وشھادة ساقھا اللہ الی فلیس منی الا مافی الشھداء الذین قتلوا مع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یر تحل عنکم۔

اللہ کا دین اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے جو مجھے اللہ عزوجل نے عطا فرمائی اور اس سے زیادہ عظیم نعمت شہادت کی موت ہے۔ قبل اس کے جو میرے مقدر میں تھی۔ میں بھی انہیں شہیدوں کی طرح ہوں جو اس سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معیت میں کفار سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔

جناب عروہ رضی اللہ عنہ نے وصیت میں فرمایا کہ انہیں ان لوگوں میں دفن کیا جائے جو محاصرۂ طائف میں شہید ہوئے۔

بہت جلد یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا خون رائیگاں نہ گیا۔ طائف کے نواحی باشندے جو مسلمان ہو چکے تھے انہیں تو عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی شہادت کا افسوس تھا ہی۔ خود بنو ثقیف کو بھی اپنے کئے پر ندامت بھی تھی اور مسلمانوں کا خوف بھی تھا۔ انہیں یقین تھا کہ مسلمان انہیں جہاں کہیں دیکھ لیں گے ان کو زندہ نہیں چھوڑیں گے لہٰذا بنو ثقیف نے آپس میں مشورہ کر کے عبد یالیل کو اپنی طرف سے صلح کے لئے نامزد کیا۔ لیکن اس خوف سے کہ کہیں اس کا حشر بھی عروہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسا نہ ہو اس نے انکار کر دیا لیکن بہت زیادہ اصرار کے بعد اپنے ساتھ چار اور اشخاص کو شامل کر کے روانہ ہوئے تاکہ اگر یارانِ قبیلہ کسی بات پر برافروختہ ہو بھی جائیں تو یہ چاروں ان کو روک ٹوک تو سکیں۔

بارگاہ نبوت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں بنو ثقیف

جب اس وفد کو مدینہ میں داخل ہوتے ہوئے مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ نے دیکھا تو دوڑ کر ان سے پہلے بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہونے کے لئے جا رہے تھے کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ سے تیز رفتاری کی وجہ دریافت کی تو حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے وجہ بتا کر جلدی سے یہ خوشخبری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور پہنچا دی۔

طائف کا یہ وفد ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملائے بازاروں میں چل رہا تھا۔ انہیں دیکھ کر ہر ایک کی زبان پر محاصرہ طائف کے تذکرے جاری ہو گئے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر ان کو اسلامی طریقِ ملاقات اور سلام و آداب کے الفاظ بتائے مگر انہوں نے ان کے بتائے ہوئے آداب پر عمل کرنے سے انکار کر دیا اور باریابی کے موقع پر سلام و آداب کے لئے جاہلیت کے زمانہ کے طور طریقے ہی استعمال کئے۔

مسجد نبوی میں بنو ثقیف کا خیمہ

رسول رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے بنو ثقیف کے لئے مسجد نبوی میں ہی خیمہ نصب کیا گیا۔ مگر طائف والوں کے دلوں میں خود کردہ گناہ کا خوف تھا۔ چنانچہ شرائطِ مصالحت میں حضرت خالد بن سعید بن العاص رضی اللہ عنہ وکیل بنے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور طائف کے وفد کے درمیان مذاکرات کرتے۔

خالد بن سعید رضی اللہ عنہ ہی ان کے لئے دستر خوان لاتے لیکن بنو ثقیف حضرت خالد کو اپنے سامنے اس خوان میں سے تھوڑا بہت کھانا چکھائے بغیر خود کھانے کے لئے ہاتھ نہ بڑھاتے۔ بنو ثقیف نے ایک پیغام میں کہلا بھیجا کہ شرائطِ مصالحت میں سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ تین سال تک ہمارے معبود لات کو نہ توڑا جائے اور ابھی ہمیں قیامِ صلوٰۃ سے بھی مستثنیٰ قرار دیا جائے۔ مگر رسول برحق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کی ان شرائط کو بیک حرف مسترد کر دیا۔ حتیٰ کہ انہی لوگوں نے اپنے معبود لات کی ایک مہینہ زندگی مانگی۔ رسول اللہ ماحی الکفر نے اس مہلت سے بھی ایسا قطعی انکار فرمایا جس میں کسی ترمیم، استثنا اور اضافہ کی گنجائش ہی نہ تھی۔ گنجائش ہو بھی کیسے سکتی تھی اللہ واحد القہار کے بعد وہ بزرگ برتر ہستی جسے خود اللہ رب العالمین نے منصبِ نبوت پر مامور اور دعوت دین کے لئے مبعوث فرمایا ہو جس نے شرک کے کسی بت کے وجود کو گوارا نہ کیا ہو، وہ آج ایک قبیلہ کی خاطر استثناء کو کیسے جائز قرار دے سکتا ہے، یا بنو ثقیف کا ماضی میں جس طرح تادیبی کارروائی کئے بغیر ازراہ مروت محاصرہ اٹھا لیا گیا تھا اب بھی ان کو مراعات دے دی جائیں؟ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ آئینِ الٰہیہ کے بالکل خلاف ہے۔ کفر یا ایمان ـــ ان دونوں کے درمیان کچھ نہیں۔ ایمان اور عدم ایمان کے درمیان اگر کچھ ہے تو وہ صرف شک ہے، گمان ہے، ہلاکت خیز گمان! طے شدہ بات ہے جس طرح کفر اور ایمان اندھیرا اور اجالا ایک ساتھ نہیں رہ سکتے اسی طرح ایمان باللہ وحدہ لا شریک اور لات دونوں کو مساوی درجہ دینا چاہتے ہیں۔ جو واضح شرک تھا۔ "وان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ" (51:4) بنو ثقیف نے نماز سے استثناء کی شرط پیش کی تو فرمایا۔

ان لا خیر فی دین لا صلٰوۃ فیھا- جس دین میں عبادت ہی نہ ہو اس میں اور بھلائی کیا ہو سکتی ہے؟

امیرِ وفد عبدیالیل نے عرض کیا- ہمارے ہاں تجرد (شادی کے بغیر) زندگی گزارنے کی رسم عام ہے اور تجرد کی وجہ سے جنسی آوارگی ہماری فطرت بن چکی ہے-

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا-

وھو علیکم حرام فان اللہ یقول"ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ"(۱۷: ۳۲)

یہ بھی تم پر حرام قرار دیا گیا ہے- اللہ عزوجل کا حکم ہے زنا کے تصور کے قریب بھی نہ جاؤ' کیونکہ یہ بے حیائی ہے اور برا چلن ہے-

سود کے لئے استثناء کی درخواست کی گئی اور کہا گیا ہمارا پورا معاشی نظام ہی سود پر ہے-

فرمایا-

لکم رؤس اموالکم ان اللہ یقول"یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وذروأ ما بقی من الربوا ان کنتم مومنین" (۲: ۲۷۸)

تمہارے لئے صرف وہی رقم حلال ہے جو تم لوگوں نے مقروض کو اصلی رقم دی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں- اے ایمان والو اگر واقعہ ہی تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو اس سے ڈرو اور جس قدر سود مقروضوں کے ذمہ ہے اسے چھوڑ دو- اگر تم ایماندار ہو-

انہوں نے شراب نوشی کی اجازت چاہتے ہوئے کہا- یہ ہمارے خطہ کی خصوصی سوغات ہے- فرمایا اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قرار دیا ہے اور یہ آیت تلاوت فرمائی-

یا ایھا الذین آمنوا انما الخمر والمیسر رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ- (93:5)

اے ایمان والو بلاشبہ شراب اور جوا سب شیطانی کام اور گندگی ہیں- ان سے اجتناب کرو- بچو!

اب بنو ثقیف کو یقین ہو گیا کہ کسی برائی کا دین اسلام سے کوئی میل نہیں- پھر درخواست پیش کی کہ ہمارے بتوں کو ہمارے ہاتھوں سے نہ تڑوایا جائے- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی یہ آخری درخواست قبول فرمالی-

طائف کے تمام لوگ اس وفد کی مدینہ سے واپسی اور نتائج کے منتظر تھے- ان کی دینی تربیت کے لئے عثمان بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا تقرر فرمایا- عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ابھی آغازِ شباب ہی کا زمانہ تھا- مسائلِ دین سمجھنے اور قرآن حکیم پڑھنے کا بڑا شوق رکھتے تھے جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے مہاجرینِ اولین کی عثمان (رضی اللہ تعالیٰ عنہ) سے متعلق شہادت سے معلوم ہوتا ہے-

بنو ثقیف کا وفد آخر رمضان تک مدینہ منورہ میں رہا- نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ روزے

بھی رکھے' افطاری اور سحری دونوں وقت کا کھانا بارگاہ رسالت سے آتا۔ مدینہ سے ان کو الوداع فرماتے ہوئے عثمان رضی اللہ عنہ کو ہدایات دیں۔

تجاوز وفی الصلوۃ واقدر الناس ضعفهم فان فیهم الکبیر و الصغیر و الضعیف وذو الحاجه۔

باجماعت قیام صلوٰۃ میں قیام و سجود کو زیادہ لمبا نہ کرنا۔ کمزور اور ضعیف لوگوں کو ملحوظ خاطر رکھنا۔ (خیال رہے) ناتواں اور کاروباری لوگ بھی ہوتے ہیں۔

لات پاش پاش ہو گیا

ثقیف کے وفد کے ہمراہ ابوسفیان بن حرب رضی اللہ عنہ اور مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ کو طائف بھیج دیا گیا۔ ان دونوں کی طائف میں قرابت داری بھی تھی۔ طائف وفد پہنچا تو منجملہ شرائط کے لات کو توڑنے کا تذکرہ بھی آیا۔ ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور مغیرہ رضی اللہ عنہ اپنے ہاتھوں میں کدالیں لئے ہوئے سیدھے لات کے بتکدہ میں گئے۔ شہر کی عورتیں بہزار حسرت و یاس مکانوں کی چھتوں پر چڑھ کر یہ نظارہ تک رہی تھیں جیسے ہی لات پر کاری ضرب لگی آواز لوگوں کے کانوں سے ٹکرائی۔ عورتوں نے زور زور سے رونا چیخنا شروع کر دیا۔ وفد کے ساتھ معاہدہ کی وجہ سے کسی کو جرأت نہیں تھی کہ آگے بڑھ کر ہاتھ روکے! لات کے چڑھاوے میں جتنا مال و دولت زیور جمع تھے حضرت عروہ بن مسعود اور ان کے والد مسعود دونوں کا قرض ادا کر دیا۔ جس کی ہدایات انہیں بارگاہِ رسالت سے روانگی کے وقت مل چکی تھیں۔

لات کے چکنا چور ہو جانے اور اہلِ طائف کے اسلام قبول کر لینے کے بعد حجاز کے باقی قبائل بھی مسلمان ہو گئے۔ گویا آج سے محمود احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عظمت و برکت کے تذکرے شام سے گزر کر روم کی دیواروں سے ٹکرائے اور جنوب کی طرح ان کا غلغلہ یمن و حضر موت کی حدیں پار کر گیا۔

ابوبکر رضی اللہ عنہ

تمام اطراف و ممالک سے قبول اسلام کے لئے وفود کی آمد کا سلسلہ رہا یہاں تک کہ ایامِ حج آپہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آج تک پورے شرائط کے ساتھ حج ادا نہیں کیا تھا اور اب تبوک سے انتہائی فاتحانہ واپسی' طائف کے قبائل کا مسلمان ہونا اور دیگر حلقہ بگوش اسلام ہونے والے وفود' درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ عزوجل کے احسانات تھے۔ جن کا تقاضا تھا کہ اب وہ اس کا شکر ادا کرنے کے لئے اہتمامِ حج فرماتے۔ لیکن ابھی ملک میں خال خال سہی مگر کفر سے وابستہ قبائل موجود تھے۔ یہود و نصاریٰ بھی کہیں کہیں موجود تھے۔ صورتحال یہ بھی تھی کہ

ادب کے مہینوں میں بے خطر مشرکین بھی بیت اللہ شریف آتے اور اپنی مشرکانہ رسمیں ادا کرتے جبکہ دین اسلام کے واضح فیصلہ کے مطابق یہ لوگ نجس تھے۔ لہٰذا جب تک ان سے نجات حاصل نہ ہو جائے رسول اللہ ﷺ کا مدینہ منورہ میں رہنا ضروری تھا۔ مزید بر آں جب تک اللہ تبارک وتعالیٰ سے حج کا حکم نہ ہو نبی اکرم ﷺ خود حج کے لئے تشریف نہیں لے جاسکتے تھے۔ اس لئے صرف تین سو مسلمانوں کا قافلہ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ حج بیت اللہ کے لئے روانہ فرمایا۔

مشرکین بیت اللہ کا حج اور زیارت کے لئے ادب کے چار مہینوں میں راستے بے خطر ہونے کی وجہ سے بعثتِ نبوی سے پہلے بھی آتے تھے اور بعثت کے بعد بھی انہیں یہاں آنے کی کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ دوسرے معنوں میں ہر عقیدے اور عمل کے لوگوں کو کھلی چھٹی تھی' باوجودیکہ کعبہ کے باہر اندر اس کے گرد و نواح کے تمام بت خانے مسمار کئے جا چکے تھے۔ لیکن غیر مسلم اشخاص مناسک کے رسوم اپنے پرانے طریقہ پر ہی ادا کرتے۔ اس لئے کہ ابھی تک مشرکین اور محمد ﷺ کے درمیان کوئی ایسا معاہدہ نہیں ہوا تھا جس کی رو سے انہیں روکا ٹوکا جاسکے۔ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اگرچہ عتاب بن اسید رضی اللہ عنہ کو مکہ معظمہ کا امیر مقرر فرما دیا تھا لیکن مذکورہ مقصد کے لئے کوئی حکم جاری نہیں فرمایا تھا۔ صرف مکہ معظمہ میں ہی نہیں بلکہ بیت المقدس کی زیارت کرنے والوں میں بھی ایسا ہی دستور رائج تھا۔ کہ یہود اس کے ارضِ موعود اور نصاریٰ اس کے مولدِ مسیح ہونے کی وجہ سے وہاں جاتے مگر شرک و بت پرستی کی کوئی رسم ایسی نہ تھی جسے یہ لوگ پورا نہ کرتے۔ بیت اللہ کی طرح یہاں بھی اصنام پرستی ہی کا دور دورہ تھا۔

اہلِ کتاب اور مسلمان

بیت اللہ الحرام میں اہلِ اسلام اور بت پرستوں کا ایسا اجتماع جس میں مسلمان اپنے طریق پر مناسک ادا کریں اور مشرکین بت پرستانہ رسوم کے مطابق ہونا قابلِ برداشت اور فہم و فراست سے دور تھا۔ ضروری تھا کہ جس طرح مشرکین کے خداؤں کو کعبہ سے نکال دیا گیا ان بتوں کے پرستاروں کو بھی یہاں آنے سے روک دیا جائے۔ چنانچہ سورۃ براۃ اس معاملہ میں حرفِ آخر کے طور پہ نازل ہوئی۔ موسم حج میں ایک مہینہ ذی قعدہ کا رہ گیا تھا۔ مشرکین دور و نزدیک سے حرم کعبہ میں پہنچ چکے تھے۔ رسول اللہ احکم الحاکمین نے فیصلہ کر لیا کہ اس سال 9ھ عوام و خواص کے اجتماع میں اعلان کر دیا جائے کہ شرک و ایمان ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔ دین کے کسی معاملہ میں دونوں کا اتحاد ناممکن ہے۔ ہاں اگر کسی سے معاہدہ ہوا ہو تو مسلمانوں پر اس کی پابندی لازم

ہے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی نیابت

آپ کو معلوم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حج کی اجازت فرمائی تھی مگر اس کے چند دن بعد ہی حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے پیچھے بھیجا تاکہ عرفہ کے روز مجمع عام میں لوگوں کو اللہ جل شانہ اور اس کے رسولِ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم سنا دیں۔

جس دن لوگ عرفات کی طرف آ رہے تھے اسی روز علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ وہاں پہنچے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھتے ہی فرمایا۔ آپ کو امیر کی حیثیت سے بھیجا گیا ہے یا ماتحت کی حیثیت سے؟

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ ماتحت کے طور پر۔ آنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا۔ سورۃ براۃ کی عام منادی کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر یہ اعتماد ان کے اہل بیت ہونے کی وجہ سے کیا۔

مجمعِ عام میں اعلانِ براۃ

مناسکِ حج ادا کرنے کے بعد جب لوگ منا میں جمع ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورۃ براۃ کی مندرجہ ذیل ابتدائی آیتیں باآواز بلند پڑھ کر سنائیں۔

(1) براۃ من اللہ ورسولہ الی الذین عاھد تم من المشرکین۔

اے اہلِ اسلام اب اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشرکوں سے جن سے تم نے عہد کر رکھا تھا بیزاری (اور جنگ کی تیاری) ہو۔

(2) فسیحوا فی الارض اربعہ اشھر و اعلموا انکم غیر معجزی اللہ وان اللہ مخزی الکافرین۔

تو (مشرکو تم) زمین میں چار مہینے چل پھر لو اور جان رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہ کرسکو گے اور یہ بھی کہ اللہ کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔

(3) واذان من اللہ ورسولہ الی الناس یوم الحج الاکبر ان اللہ بری من المشرکین ورسولہ فان تبتم فھو خیر لکم وان تولیتم فاعلموا انکم غیر معجزی اللہ وبشر الذین کفروا عذاب الیم۔

اور حجِ اکبر کے دن اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ اللہ مشرکوں سے بیزار ہے اور اس کا رسول بھی۔ (ان سے دست بردار ہو) پس اگر تم توبہ کرلو تو تمہارے حق میں بہتر ہے اور اگر نہ مانو (اور اللہ سے مقابلہ کرو) تو جان رکھو کہ تم اللہ کو ہرا نہیں سکو گے

اور (اے پیغمبر) کافروں کو دکھ دینے والے عذاب کی خبر سنا دو۔

(4)الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا" ولم یظاھروا علیکم احدا" فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم ان اللہ یحب المتقین۔

البتہ جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا ہو اور انہوں نے تمہارا کسی طرح کا قصور نہ کیا ہو اور نہ تمہارے مقابلے میں کسی کی مدد کی ہو تو جس مدت تک ان کے ساتھ عہد کیا ہو اسے پورا کرو (کہ) اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔

(5)فاذا انسلخ الاشھر الحرم فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم وخذوھم واحصروھم واقعدوا لھم کل مرصد فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فخلوا سبیلھم ان اللہ غفور رحیم

جب عزت کے مہینے گزر جائیں تو مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو اور پکڑ لو۔ اور گھیر لو اور ہر گھات کی جگہ ان کی تاک میں بیٹھے رہو۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے لگیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(6)وان احد من المشرکین استجارک فاجرہ حتی یسمع کلام اللہ ثم ابلغہ مامنہ ذالک بانھم قوم لا یعلمون۔

اور اگر کوئی مشرک تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اس کو پناہ دو یہاں تک کہ کلام اللہ سننے لگے۔ پھر اس کو امن کی جگہ واپس پہنچا دو اس لئے کہ یہ بے خبر لوگ ہیں۔

(7)کیف یکون للمشرکین عھد عند اللہ وعند رسولہ الا الذین عاھدتم عند المسجد الحرام فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم ان اللہ یحب المتقین۔

بھلا مشرکوں کے لئے (جنہوں نے عہد توڑ ڈالا) اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد کیونکر (قائم) رہ سکتا ہے۔ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد محترم (یعنی خانہ کعبہ) کے نزدیک عہد کیا ہے اگر وہ (اپنے عہد پر) قائم رہیں تو تم بھی (اپنے قول و قرار پر) قائم رہو بیشک اللہ پرہیز گاروں کو دوست رکھتا ہے۔

(8)کیف وان یظھروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا ولا ذمۃ یرضونکم بافواھھم وتابی قلوبھم واکثرھم فاسقون

(بھلا ان سے عہد) کیونکر (پورا کیا جائے جب ان کا یہ حال ہے) کہ اگر تم پر غلبہ پا لیں تو نہ قرابت کا لحاظ کریں نہ عہد کا۔ یہ منہ سے تو تمہیں خوش کر دیتے ہیں لیکن ان کے دل (ان باتوں کو) قبول نہیں کرتے اور ان میں اکثر نافرمان ہیں۔

(9)اشتروا بایات اللہ ثمنا" قلیلا فصدوا عن سبیلہ انھم ساء ما کانوا یعملون۔

یہ اللہ کی آیتوں کے عوض تھوڑا سا فائدہ حاصل کرتے اور لوگوں کو اللہ کے رستے سے روکتے ہیں کچھ نہیں کہ جو کام یہ کرتے ہیں برے ہیں۔

(10)لا یرقبون فی مومن الا ولا ذمۃ۔ واولئک ھم المعتدون

یہ لوگ کسی مومن کے حق میں نہ تو رشتہ داری کا پاس کرتے ہیں نہ عہد کا اور یہ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔

(11)فان تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ فاخوانکم فی الدین۔ ونفصل الایت لقوم یعلمون۔

اگر یہ توبہ کرلیں اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے لگیں تو دین میں تمہارے بھائی ہیں اور سمجھنے والے لوگوں کے لئے ہم اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔

(12)وان نکثوا ایمانھم من بعد عھدھم وطعنوا فی دینکم فقاتلوا ائمۃ الکفر انھم لا ایمان لھم لعلھم ینتھون۔

اور اگر عہد کرنے کے بعد اپنی قسموں کو توڑ ڈالیں اور تمہارے دین میں طعنے کرنے لگیں تو ان کفر کے پیشواؤں سے جنگ کرو۔ یہ بے ایمان لوگ ہیں اور ان کی قسموں کا کچھ اعتبار نہیں۔ عجب نہیں کہ (اپنی حرکات سے) باز آجائیں۔

(13)الا تقاتلون قوما نکثوا ایمانھم وھموا باخراج الرسول وھم بدؤکم اول مرۃ۔ اتخشونھم فاللہ احق ان تخشوہ ان کنتم مومنین۔

بھلا تم ایسے لوگوں سے کیوں نہ لڑو جنہوں نے اپنی قسموں کو توڑ ڈالا اور اللہ کے رسول کو جلاوطن کرنے کا عزم مصمم کرلیا اور انہوں نے تم سے (عہد شکنی کی) ابتدا کی۔ کیا تم ایسے لوگوں سے ڈرتے ہو حالانکہ ڈرنے کے لائق اللہ ہے بشرطیکہ تم ایمان رکھتے ہو۔

(14)قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدکم ویخزھم وینصرکم علیھم ویشف صدور قوم مومنین۔

ان سے (خوب) لڑو اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں سے عذاب میں ڈالے گا اور رسوا کرے گا اور تم کو ان پر غلبہ دے گا اور مومن لوگوں کے سینوں کو شفا بخشے گا۔

(15)ویذھب غیظ قلوبھم۔ ویتوب اللہ علی من یشاء۔ واللہ علیم حکیم۔

اور ان کے دلوں سے غصہ دور کرے گا اور جس پر چاہے گا رحمت کرے گا اور اللہ سب کچھ جانتا (اور) حکمت والا ہے۔

(16)ام حسبتم ان تترکوا ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا منکم ولم یتخذوا من دون اللہ ولا رسولہ ولا المومنین ولیجۃ۔ واللہ خبیر بما تعملون۔

کیا تم لوگ یہ خیال کرتے ہو کہ (بے آزمائش) چھوڑ دیئے جاؤ گے اور ابھی تو اللہ نے ایسے لوگوں کو متمیز کیا ہی نہیں جنہوں نے تم سے جہاد کئے اور اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کے سوا کسی کو ولی دوست نہیں بنایا اور اللہ تمہارے سب کاموں سے واقف ہے۔

(17)ما کان للمشرکین ان یعمروا مسٰجد اللہ شٰھدین علٰی انفسھم بالکفر۔ اولئک حبطت اعمالھم وفی النار ھم خلدون۔

مشرکوں کو زیبا نہیں کہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں جبکہ وہ اپنے آپ پر کفر کی گواہی دے رہے ہوں۔ ان لوگوں کے سب اعمال بے کار ہیں اور یہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

(18)انما یعمر مسٰجد اللہ من امن باللہ والیوم الاخر واقام الصلوۃ واتی الزکوۃ ولم یخش الا اللہ فعسٰی اولئک ان یکونوا من المھتدین۔

اللہ کی مسجدوں کو تو وہ لوگ آباد کرتے ہیں جو اللہ پر اور روز قیامت پر ایمان لاتے اور نماز پڑھتے اور زکوۃ دیتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے یہی لوگ امید ہے کہ ہدایت یافتہ لوگوں میں (داخل) ہوں۔

(19)اجعلتم سقایۃ الحاج وعمارۃ المسجد الحرام کمن امن باللہ والیوم الاخر وجاھد فی سبیل اللہ۔ لا یستون عنداللہ۔ واللہ لا یھدی القوم الظلمین۔

کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد محترم (یعنی خانہ کعبہ) کو آباد کرنا اس شخص کے اعمال جیسا خیال کیا ہے جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہو؟ یہ لوگ اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

(20)الذین امنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم اعظم درجۃ عنداللہ۔ واولئک ھم الفائزون۔

جو لوگ ایمان لائے اور وطن چھوڑ گئے اور اللہ کی راہ میں مال اور جان سے جہاد کرتے رہے اللہ کے ہاں ان کے درجے بہت بڑے ہیں۔ اور وہی مراد کو پہنچنے والے ہیں۔

(21-22)یبشرھم ربھم برحمۃ منہ ورضوان وجنت لھم فیھا نعیم مقیم۔ خلدین فیھا ابدا۔ ان اللہ عندہ اجر عظیم۔

ان کا پروردگار ان کو اپنی رحمت کی اور خوشنودی کی اور بہشتوں کی خوشخبری دیتا ہے جن میں ان کے لئے نعمت ہائے جاودانی ہے۔ (اور وہ) ان میں ابدالآباد رہیں گے۔ کچھ شک نہیں کہ اللہ کے ہاں بڑا صلہ (تیار) ہے۔

(23)یایھا الذین امنوا لا تتخذوا اٰبائکم واخوانکم اولیاء ان استحبوا الکفر علی الایمان۔ ومن یتولھم منکم فاولئک ھم الظلمون۔

اے اہل ایمان! اگر تمہارے (ماں) باپ اور (بہن) بھائی ایمان کے مقابل کفر کو پسند کریں تو ان

سے دوستی نہ رکھو۔ اور جو ان سے دوستی رکھیں گے وہ ظالم ہیں۔

(24)قل ان کان آباؤکم وابناؤکم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومسٰکن ترضونھا احب الیکم من اللہ ورسولہ وجہاد فی سبیلہ فتربصوا حتٰی یاتی اللہ بامرہ۔ واللہ لا یھدی القوم الفسقین۔

کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے مندہ ہونے سے ڈرتے ہو اور مکانات جن کو پسند کرتے ہو اللہ اور اس کے رسول سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تمہیں زیادہ عزیز ہوں تو ٹھہرے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم (یعنی عذاب) بھیجے اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

(25)لقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرۃ ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم فلم تغن عنکم شیئاً وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین۔

اللہ نے بہت سے موقعوں پر تم کو مدد دی ہے اور (جنگ) حنین کے دن جبکہ تم کو اپنی (جماعت کی) کثرت پر غرہ تھا تو وہ تمہارے کچھ بھی کام نہ آئی اور زمین باوجود (اتنی بڑی) فراخی کے تم پر تنگ ہو گئی۔ پھر تم پیٹھ پھیر کر پھر گئے۔

(26)ثم انزل اللہ سکینتہ علٰی رسولہ وعلی المومنین وانزل جنوداً لم تروھا وعذب الذین کفروا۔ وذلک جزاء الکفرین۔

پھر اللہ نے اپنے پیغمبر پر اور مومنوں پر اپنی طرف سے تسکین نازل فرمائی اور (تمہاری مدد کو فرشتوں کے) لشکر جو تمہیں نظر نہیں آتے تھے (آسمان سے) اتارے اور کافروں کو عذاب دیا اور کفر کرنیوالوں کی یہی سزا ہے۔

(27)ثم یتوب اللہ من بعد ذلک علٰی من یشاء۔ واللہ غفور رحیم۔

پھر اللہ اس کے بعد جس پر چاہے مہربانی سے توجہ فرمائے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

(28)یایھا الذین امنوا انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا وان خفتم عیلۃ فسوف یغنیکم اللہ من فضلہ ان شاء۔ ان اللہ علیم حکیم۔

مومنو! مشرک تو پلید ہیں تو اس برس کے بعد وہ خانہ کعبہ کے پاس نہ جانے پائیں اور اگر تم کو مفلسی کا خوف ہو تو اللہ چاہے گا تو تم کو اپنے فضل سے غنی کر دے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ جانتا (اور) حکمت والا ہے۔

(29)قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتب حتٰی یعطوا الجزیۃ عن

یدوھم صاغرون-

جو لوگ اہل کتاب میں سے اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر (یقین رکھتے ہیں) اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کی ہیں اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

(30)وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصری المسیح ابن اللہ۔ ذلک قولھم بافواھم یضاھؤن قول الذین کفروا من قبل۔ قاتلھم اللہ انی یؤفکون۔

اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے اور عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ پہلے کافر بھی اسی طرح کی باتیں کہا کرتے تھے۔ یہ بھی انہیں کی ریس کرنے لگے ہیں اللہ ان کو ہلاک کرے۔ یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔

(31)اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا" من دون اللہ والمسیح ابن مریم۔ وما امروا الا لیعبدوا الھا" واحدا"۔ لا الہ الا ھو۔ سبحنہ عما یشرکون۔

انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے سوا اللہ بنا لیا حال آنکہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اللہ واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔

(32)یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکفرون۔

یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے (پھونک مار کر) بجھا دیں۔ اور اللہ اپنے نور کو پورا کئے بغیر رہنے کا نہیں۔ اگرچہ کافروں کو برا ہی لگے۔

(33)ھو الذی ارسل رسولہ بالھدی ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون۔

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دیکر بھیجا تاکہ اس (دین) کو (دنیا کے) تمام دینوں پر غالب کرے اگرچہ کافر ناخوش ہی ہوں۔

(34)یاایھا الذین امنوا ان کثیرا من الاحبار والرھبان لیاکلون اموال الناس بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ۔ والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔

مومنو! (اہل کتاب کے) بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے اور (ان کو) راہ اللہ سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خبر سنا دو۔

(35)یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم وجنوبھم وظھورھم۔ ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزون۔

جس دن وہ (مال) دوزخ کی آگ میں (خوب) گرم کیا جائے گا پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا کہ) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا سو جو تم جمع کرتے تھے (اب) اس کا مزہ چکھو۔

(36)ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا" فی کتاب اللہ یوم خلق السموات والارض منھا اربعۃ حرم۔ ذلک الدین القیم۔ فلا تظلموا فیھن انفسکم وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ۔ واعلموا ان اللہ مع المتقین۔

اللہ کے نزدیک مہینے گنتی میں (بارہ ہیں یعنی) اس روز (سے) کہ اس نے آسمانوں کو زمین کو پیدا کیا۔ کتاب (برس کے) بارہ مہینے (لکھے ہوئے) ہیں ان میں سے چار مہینے ادب کے ہیں۔ یہی دین (کا) سیدھا (رستہ) ہے تو ان (مہینوں) میں (قتال ناحق سے) اپنے آپ پر ظلم نہ کرنا اور تم سب کے سب مشرکوں سے لڑو جیسے وہ سب کے سب تم سے لڑتے ہیں اور جان رکھو کہ اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

سورہ توبہ کی یہ آیات جنہیں ہم نے نقل کر دیا ہے مقام منیٰ پر علی رضی اللہ عنہ نے باآوازِ بلند سنائیں۔ ان کے ساتھ مندرجہ ذیل چار امور کا اعلان مزید فرمایا۔

ایھا الناس۔ اے لوگو سن لو۔

(1)انہ لا یدخل الجنۃ کافر۔ کافر جنت میں داخل نہیں ہو گا۔

(2)ولا یحج بعد عام المشرک۔ آج کے بعد مشرک حج بیت اللہ نہیں کر سکتا۔

(3)ولا یطوف بالبیت عریانا" کوئی شخص برہنہ ہو کر طواف کعبہ نہیں کر سکتا۔

(4)ومن کان لہ عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عھد فھو الی مدتہ۔ جس شخص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس مدت تک امان کا وعدہ دیا ہے اس کی پابندی کی جائے گی۔

علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اس اعلان کے بعد فرمایا۔ آج کے بعد چار مہینے کی مہلت ہے۔ مقصد یہ تھا کہ جو لوگ دور دراز سے حج کے لئے آئے ہیں وہ امن و سلامتی کے ساتھ اپنے اپنے گھروں میں پہنچ جائیں۔

یوم تاسیس :۔ یوم عرفہ 9ھ گویا دولت اسلامیہ کی تاسیس کا دن ہے جس دن کے متعلق ہم نے سورہ توبہ کی ابتدائی آیات نقل کر دیں۔ رسول احکم الحاکمین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قاصد جناب علی رضی اللہ عنہ کے اس سفر کا مرکزی مقصد ہی یہی تھا۔ جو بڑی معتمد روایات میں منقول ہے کہ علی رضی اللہ عنہ نے ان آیات کو صرف منیٰ میں ہی نہیں بلکہ بیت اللہ سے واپسی کے بعد ہر منزل پر ان آیات کو دوسروں کے سامنے بار بار بیان کیا۔

آپ سورۃ براۃ کی ابتدائی آیات کا گہری نظر سے مطالعہ کریں تو ہدایات صاف طور پر واضح

ہو جاتی ہیں کہ یہ آیات جدید سلطنت کی تشکیل کا اشارہ ہیں۔

یہ بات بھی آپ کو معلوم ہے کہ سورۃ براۃ دشمنانِ دین کے پیدا کردہ جنگی ہنگاموں سے پوری طرح فارغ ہونے کے بعد نازل ہوئی۔ حتیٰ کہ طائف جیسے سرکش و باغی باشندے دامنِ اسلام میں آنا اپنے لئے باعثِ عزت سمجھنے لگے۔ یہی نہیں بلکہ تمام حجاز نے اسلام قبول کر لیا۔ تہامہ میں بھی اسلام کا ڈنکا بجنے لگا۔ پورا نجد اسلامی علم کے سایہ میں آ چکا۔ خانہ بدوش قبائل اپنے سرداروں کے ماتحت وفود بھیج کر داعیِ اسلام محمد و احمد ﷺ کی اطاعت و اتباع کا اقرار کرنے لگے اور ہر ایک نے اسلام کو بحیثیت دین اختیار کر لیا۔ وقت آ گیا کہ نوزائیدہ دولتِ اسلام ان آیات کی روشنی میں تشکیل پائے۔ اسلامی قوت و سطوت کا مرکز بنے۔ جس کے تمام پیروکار ایک ہی عقیدہ میں منسلک ہوں اور اس مستحکم عقیدۂ توحید کے سہارے دین اسلام اور اس دین کے پیروکاروں پر ظلم کرنے والوں کے ہاتھ روک سکیں ضرورت پڑے تو توڑ سکیں۔

اس عظیم ترامہ کی سب سے بڑی قوت ایسے ایمان سے بڑھ کر اور کون سا عقیدہ ہو سکتا ہے جس میں اللہ وحدہٗ لاشریک پر یقینِ کامل ہو اور انسان اپنی روح کو ایک ایسی سب سے بلند و بالا اعلیٰ و ارفع ہستی سے وابستہ سمجھے جس کا کوئی ہمسر نہیں اور اس کے اس عقیدہ کے نتائج میں اسے یہ بھی یقین ہو کہ نہ تو اس پر اس اللہ وحدہ القہار کے سوا کوئی غالب آ سکتا ہے اور نہ ہی اس اللہ جل شانہ کے سوا اس کے ضمیر پر کوئی قبضہ کر سکتا ہے۔

تجربہ یہ بھی کہتا ہے کہ جو لوگ اس عقیدہ کے متوازی کوئی عقیدہ وضع کر لیں۔ نہ صرف یہی بلکہ اس خود تراشیدہ عقیدہ پر جدید حکومت کی بنیادیں رکھنے کا ارادہ بھی رکھتے ہوں۔ "اولئک هم الفاسقون" ایسے لوگ عادی تخریب کار اور بنی نوع انسان کے اندر فتنہ و فساد اور خوں ریزی کروانے میں مرکزی کردار ادا کرتے ہیں۔ ایک عادل ریاست کی طرف سے ایسے لوگوں سے مراعات تو ایک طرف ان کے بارہ میں تو حکم ہے فسیحوا فی الارض اربعۃ اشھر واعلموا انکم غیر معجزی اللہ وان اللہ مخزی الکافرین۔ (2:9) اے مشرکو تم زمین میں چار مہینے (ذی قعدہ، ذی الحج، محرم، رجب) چل پھر لو اور یاد رکھو تم اللہ تعالیٰ کو عاجز نہیں کر سکو گے اور یہ کہ اللہ عزوجل کافروں کو رسوا کرنے والا ہے۔ معلوم ہوا چار مہینے کی مہلت کے بعد ایسے لوگ واجب القتل ہیں۔

ایسے فاسق و فاجر لوگ اگر کسی قوم کے اجتماعی عقیدہ کے خلاف ریشہ دوانی کریں تو انہیں قید رکھ کر اطاعت کے لئے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو کسی قوم کے عقیدہ سے اجتماعی دشمنی تو ضرور رکھتے ہیں لیکن اس عقیدے کے خلاف نہ تو سازشیں کرتے ہیں نہ ہی نقصان پہنچانے کے وسائل اختیار کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی مثال وہ اہل کتاب ہیں جن سے جنگ کی بجائے صرف جزیہ ادا کرنے کا تقاضہ کیا گیا۔

ان دونوں اقسام کا تعارف ایک ہی آیہ میں کروا دیا گیا ہے۔

قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الآخر ولا یحرمون ماحرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیہ عن یدوھم صاغرون۔ (29:9)

جو لوگ اہل کتاب میں سے اللہ تعالیٰ پر یقین نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول (ﷺ) نے ان کے لئے حرام کی ہیں۔ نہ دینِ حق کو قبول کرتے ہیں۔ ان سے جنگ کرو۔ یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں۔

تاریخی اور اجتماعی نقطۂ نگاہ سے دیکھنے کے بعد سورۃ براۃ کی ان آیات کے مطابق ہم ایسے نتائج پر پہنچ سکتے ہیں جو انصاف پسند مصنف کی تحقیق کا ماحصل ہوں لیکن ان دیدہ وروں کی کوتاہ نظری کا ماتم کہاں تک کیا جائے جو بہرحال دین اسلام اور رسول اللہ ﷺ پہ نکتہ چینی کرنا اپنی دانشوری اور تحقیق و جستجو کے لئے بنیادی جز سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ سورہ براۃ کے مرکزی خیال کو ایسی عصبیت ثابت کرنا چاہتے ہیں جس کی تصدیق ان کا قابلِ صد فخر عہد حاضر کا تمدن تو ہرگز نہیں کر سکتا۔ ان کی تحقیق کے مطابق سورۃ براۃ مشرکوں کے لئے بے رحمانہ قتل کی محرک ہے کہ مسلمان انہیں جہاں بھی دیکھ پائیں قتل کر دیں۔ یہ آیات مذکورہ تنقید نگاروں کے نقطۂ نگاہ سے دعوت اسلام کو ہیبت و جبر سے منوانے کی ترغیب دیتی ہیں جیسا کہ مستشرقین کی تحریروں سے ثابت ہوتا ہے۔

مغربی مدرسۂ تحقیق و تنقید کے یہ استاد اسلام کے خلاف اس طرح معاندانہ مقدمات مرتب کرتے ہیں کہ ان کے نتائج ان کے اپنے مفروضہ کی تائید کرتے ہوں لیکن افسوس تو اس بات کا ہے کہ مسلمانوں میں جو لوگ فنِ تنقید و بحث کے بنیادی اصولوں سے ناواقف ہیں۔ وہ ان کی تحریروں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ حالانکہ ان مستشرقین کا طرزِ استدلال فن تنقید اور تاریخی اجتماعی لحاظ سے کسی مجذوب کی بڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھے۔ ان مستشرقین کی طرف سے سورۃ توبہ اور قرآن حکیم کے دوسرے حصوں کی تفسیریں خود رسالت مآب ﷺ ہی کے اس اسلوبِ زندگی کے منافی ہیں جو مکارم الاخلاق صاحب اسوہ حسنہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے آغازِ بعثت سے لیکر تادمِ آخر تاریخ کی پیشانی پہ بے داغ درخشندہ و تاباں ہے۔

موجودہ تمدن کے خدوخال

معلمِ علم و حکمتِ الٰہیہ محمد ﷺ کی روحانی یا دین اسلام کی دعوت کے نتیجہ میں جس تمدن نے نسلِ انسانی کو پائیدار امن و سلامتی بخشی، امن پرور اقدار بخشیں، اس کا اس دور حاضر کے تمدن سے تقابلی جائزہ لیا جائے۔ آج کے تمدن کی بنیاد حریتِ رائے بتائی جاتی ہے۔ ایسی

آزادی رائے جس کی کوئی حد نہیں بالکل بے لگام- ایک یا دو بلکہ گنتی کے آخری عدد تک کئی تعریفوں کے باوجود کوئی خاص تعریف معین نہیں- سوائے اس کے کہ وقت کا قانون خود اس آزادیٔ رائے کی تعریف متعین کرے۔

کہنے کو تو بڑے زور و شور سے یہ کہا جاتا ہے کہ آزادیٔ رائے ہی کے بل بوتے پر کمزور کو طاقتور کے ظالم پنجوں سے نجات دلائی جا سکتی ہے- اس نعرہ کو بنیاد بنا کر آزادیٔ رائے کی حفاظت کے لئے ہر وقت لوگوں کو ایثار و قربانی پر آمادہ کیا جاتا ہے اور پھر آزادیٔ رائے کی حدود اور تعریف کا تجزیہ اور تحقیق کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ چلایا جاتا ہے' تاکہ عوام اس چکر میں چکرائے رہیں' ہوش و حواس قائم نہ ہونے پائیں' اس سلسلہ کو باقی رکھنے کے لئے جنگ کے بھڑکتے شعلوں پہ سوار ایک جست لگائی جاتی ہے' اور قوم کے جن اسلاف نے آزادی رائے کی حفاظت میں مصیبتیں جھیلی ہوتی ہیں ان کا ذکر فخریہ طور پہ کیا جاتا ہے اور ان کے قصیدے دن رات پڑھے جاتے ہیں-

جن مستشرقین کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اسی "آزادیٔ رائے" پر فخر و غرور کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں پر الزام دھرتے ہیں کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق جو لوگ اللہ جل شانہ اور آخرت پر ایمان نہ لائیں ان کے خلاف جنگ کرنا ایسا تعصب ہے جو عقیدہ کی آزادی کے خلاف ہے- لیکن مستشرقین کا یہ مغالطہ سراسر بے بنیاد ہے کیونکہ عقیدے کی جس آزادی کے خلاف ارتکاب کو مستشرقین مسلمانوں کے سر تھوپتے ہیں خود ان کے گھر میں ہی اس آزادیٔ رائے پر شمہ بھر بھی عمل نہیں ہوتا- دوسری طرف اسلام ہے' جو کسی مشرک کے ساتھ اس وقت تک الجھنے کے لئے تیار نہیں جب تک وہ سلطنت مسلمہ کی اطاعت کے بعد شرک کی تبلیغ نہ کریں- نہ خود کسی قسم کی علانیہ رسومات عبادت مثال کے طور پر ولا یطوف بالبیت عریانا نہ کوئی شخص برہنہ ہو کر طوافِ کعبہ نہیں کر سکتا ہے' بجا لا سکتے ہیں- اب موجودہ آزادی رائے کے احترام کا دعویٰ کرنے والوں کے تمدن کو دیکھئے تو آپ دیکھیں گے کہ ریاست کے خلاف عقیدہ رکھنے والوں کے ساتھ ایسی روح فرسا سختیاں کی جاتی ہیں جن کے مقابلہ میں مسلمانوں نے جو سلوک مشرکین کے ساتھ روا رکھا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ ان سے جزیہ وصول کیا جاتا ہے- لیکن موجودہ تمدن اپنے خلاف عقیدہ رکھنے والوں پر ہزار گنا زیادہ دباؤ ڈال رکھا ہے-

ہم یورپ کی ان جنگوں کا ذکر رفعِ الزام کے لئے نہیں کریں گے' جو انہوں نے بردہ فروشی کے خلاف لڑیں حالانکہ ان کے اپنے بہت سے مذہبی سکالر غلاموں کی تجارت کو جائز قرار دیتے ہیں- اس تذکرہ کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے مسیحانِ یورپ اور ان کے حاشیہ بردار اسلام پر اپنی طرف سے عائد کردہ تہمت کو دہرا دیں کہ اسلام نے بھی تو غلامی کو جائز قرار دیا ہے-

آج کا یورپ جو تہذیب و تمدن کا لالہ زار کہلاتا ہے جس کی پشت پناہی کے لئے امریکہ جیسا حریت نواز ملک کمربستہ ہے اور جنوب میں پورا ایشیا اور مشرق اقصیٰ اس کی امداد میں سربکف نظر آتا ہے ان سب نے مل کر بالشویک روس سے وہ جنگ لڑی جس کی ہلاکت آفرینی کے سامنے شاید صور اسرافیل بھی--- کچھ نہ ہو۔ اتنی بڑی لڑائی صرف روس کے اس عقیدے کو کچلنے کے لئے نہ تھی کہ تقسیم اموال میں بالشویک نظریہ یورپ اور امریکہ کے ان مدعیان تہذیب کے عقیدہ سرمایہ داری کے خلاف ہے۔ یا اس کے سوا کوئی اور بنائے مخاصمت ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اسلام کی مشرکین کے ساتھ جنگ یورپ اور امریکہ کی بالشویک کے ساتھ کی جانے والی جنگ سے زیادہ عصبیت کی حامل تھی؟ کیا بالشویک کے خلاف صرف اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ تقسیم دولت میں امریکہ اور یورپ کے عقیدے کے خلاف ایسا نظام پیش کرتا ہے۔ جس کے کامیاب ہونے کے بعد ان کی آزادی رائے کی حفاظت کا دعویٰ کرنے والوں کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے؟

مغرب میں برہنہ رہنے کی منظم انجمنیں

یورپ کے کئی شہروں میں ایسی منظم جماعتیں ہیں جن کا ایمان یہ ہے کہ جس طرح عقیدے کی آزادی پر کوئی پابندی نہیں اسی طرح جسم کی آزادی بھی ہر قسم کے محاسبہ اور پابندی سے آزاد رہنے کی مستحق ہے۔ ان کی تحقیق کے مطابق جنسی ملاپ کی زیادتی معیوب ہے اور اس کا علاج صرف یہ ہے کہ جسم پر پہنا ہوا لباس کا غلاف اتار کر پھینک دیا جائے۔ لباس کا غلاف جس قدر زیادہ دبیز ہو گا اسی قدر جنسی خواہشات اور زیادہ بھڑکیں گی۔ لہٰذا ننگا رہنا بھی اس خوفناک بیماری کا علاج ہو سکتا ہے۔ ان جماعتوں نے بعض شہروں میں مخصوص قسم کے محل بنا رکھے ہیں۔ جہاں مرد اور عورتیں پوری آزادی کے ساتھ ننگے رہتے بستے ہیں۔ ان محلوں میں داخلہ کے لئے بے حیائی کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔

اب محافظین آزادی رائے کا ردعمل ملاحظہ ہو۔ کچھ دن تو اس برہنگی کو دیکھتے رہے لیکن جب دیکھا کہ برہنگی کا عقیدہ رکھنے والے اپنے نظریہ کی تبلیغ کرنے لگے تو "آزادی رائے" کے تحفظ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ان تمام محلات کو مقفل کر دیا گیا اور ایسے لوگوں کو اس حد تک بے بس کر دیا کہ اس برہنگی کے نظریہ کو قانونی تمدن کے بھی خلاف قرار دے دیا گیا۔ تسلیم شدہ بات ہے کہ جب کسی قوم میں عملاً ایسا عقیدہ عام ہو جائے تو دوسری قوموں کو اس کے خلاف جنگ کرنے کا حق حاصل ہو تا ہے۔ اس لئے کہ یہ عقیدہ فی نفسہٖ کمالاتِ انسانی کی توہین کا سبب ہے۔

جیسا کہ مغرب میں سفید فام باشندوں کی خرید و فروخت اور گھر بار والی عورتوں کے بیوپار کے خلاف خوں ریز جنگیں ہوئیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ جنگیں کیوں ہوئیں؟ ظاہر ہے کہ

کسی نظریہ یا عقیدہ کی آزادی اس وقت تک گوارا کی جا سکتی ہے جب تک اس کی مضرت سے معاشرہ کو نقصان نہ پہنچے۔ یہی عقیدہ چاہے کیسا بھی ہو وہ انفرادی طور پر تو عملاً مناسب ہو سکتا ہے۔ لیکن جس کا اثر اجتماعی طور پر معاشرہ پہ پڑنے لگے جیسے بردہ فروشی' خصوصاً گھریلو عورتوں کی تجارت تو ظاہر ہے اس کے خلاف جنگ کرنا لازم ہو جائے گا۔ چاہیے اس کی اثراندازی اخلاق کی حد تک ہو یا اس سے اجتماعی سیاست متاثر ہو' ملک کی اقتصادی حالت میں دخل اندازی کا خطرہ ہو یا کوئی اور اندیشہ۔ عہد حاضر کا دستور اجتماعی اور قانون مدنیت بھی اس کے خاتمہ کی تائید کرتے ہیں۔ الغرض ہم مختلف قوموں کے ایسے نظریات کی مثالیں پیش تو کر سکتے ہیں مگر اختصار کو مد نظر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی کہنا کافی سمجھتے ہیں کہ ہر وہ عقیدہ یا نظریہ جو وطنی معاشیات اور ملکی سیاسیات اور اجتماعی اتحاد کے منافی ہو' ہر ملک کا قانون ایسے عقائد کے خلاف ہر قسم کی سختی یا پابندی لگانے میں حق بجانب ہے۔

لہٰذا اگر ہم یہ معلوم کرنا چاہیں کہ مسلمانوں کا مشرکین کے ساتھ مقاتلہ (جنگ) حق بجانب یا ناروا ہے تو سب سے پہلے ہمیں بت پرستی اور اس کے نتائج پر غور کرنا ہو گا۔ جس کے لئے ہمیں تاریخ کے گذشتہ اوراق کا مطالعہ کرنا ضروری ہو گا۔ ان کا مطالعہ اگر یہ ثابت کر دے کہ شرک کا عقیدہ مختلف زمانوں میں بنی نوع انسان کے لئے انتہائی ضرر رساں رہا ہے۔ معاشرہ کے بگاڑ کا سبب بنا ہے تو پھر ہمیں یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ مشرکین کے خلاف اسلام کی نبرد آزمائی جائز ہی نہیں بلکہ ضروری ہے۔

جس زمانہ میں رسول اللہ ﷺ نے دین اسلام کی تبلیغ کا آغاز فرمایا۔ شرک محض بتوں کی پوجا پاٹ ہی تک جلوہ آرا نہ تھا۔ میں تو کہوں گا اگر یہاں تک بھی ہوتا تو بھی اس کے خلاف جہاد اس لئے ضروری تھا کہ آخر انسان خالق کائنات کا سب سے عظیم شاہکار پتھر کے سامنے پیشانی رگڑ کر اپنی توہین کا آپ مرتکب کیوں ہو؟ عظمت انسانی کو ذلیل کیوں کرے؟

لیکن خاتم المرسلین ﷺ کے زمانہ میں تو مشرک اپنے دامن میں عقائد و اعمال کے بڑے ہی عجیب و غریب نمونے لئے بت کدوں میں براجمان تھا۔ ایسے اعمال اور عقیدہ کے ساتھ جو نہ صرف بردہ فروشی کے مقابلہ میں انتہائی کمتر ہیں۔ بالشویک عقیدہ تقسیم دولت کے سامنے حقیر و ذلیل نظر آتا ہے۔ بلکہ موجودہ بیسویں صدی میں بعض دوسرے مجلسی نظام کے مقابلہ میں بدترین اور گھناؤنے دکھائی دیتے ہیں۔ مثال کے طور پہ بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیا۔ بیویوں کی کثرت تعداد' کسی کے عمل میں تیس ہیں تو کسی کے ہاں سو سے زیادہ اور کسی کا تو تین سو سے کم بیویوں کے بغیر گزارا ہی نہیں ہوتا۔ اسی شرک کا پھل سود در سود کا خونیں دیو ہے۔ جسے سرمایہ داروں نے غریب الحال لوگوں پر مسلط کر رکھا ہے۔ اسی طرح کوچہ و بازار میں کھلم کھلا بے حیائی' پستی اخلاق کی نمائش' معاشرہ کا حسن سمجھا جاتا' رسول اللہ جل شانہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ

میں عرب ہی کیا دنیا کے ہر کونہ میں ایسی ہی خرابیاں یا ان سے ملتی جلتی خرابیاں موجود تھیں۔
اب دورِ حاضر کے دانشور اربابِ فکرو نظر کیا فرماتے ہیں؟ اگر آج کے معاشرہ میں کسی جزو یا کل میں بیٹیوں کو زندہ دفن کر دینا ضروری اور جائز قرار دیا جاتا ہو۔ بیویوں کی تعداد جتنی بیان کی ہے اس سے کم و بیش جائز سمجھا جاتا ہو۔ بردہ فروشی چاہے وہ قحط یا کسی اور سبب پر مبنی ہو۔ سود خوری انتہائی بہیمانہ انداز میں رائج ہو تو ریاست ان خرابیوں کے قلع قمع پر اتر آئے تو آپ ریاست کے اس اقدام کو تعصب اور دوسروں کے عقیدہ پہ ضرب کاری کہیں گے؟ یا --- عدل و انصاف کا فرضِ منصبی کہیں گے؟

بالفرض ایک قوم ایسے برے اخلاق کو معاشرت کا حصہ قرار دے چکی ہو اور اب یہ بداخلاقی دوسری قوموں پر اثر ہونے کے لئے پر تول رہی ہو تو ایسی صورت میں اربابِ اختیار ایسے عناصر کے خلاف اعلان جنگ کر دیں تو کیا ان کا یہ اعلان ناجائز ہو گا؟ اور یہ جنگ اس عالم گیر جنگ کے مقابلہ میں زیادہ بھیانک ہو گی جس میں کروڑوں انسان صرف اربابِ سیاست کی ہوسِ استعمار پر نچھاور کر دیئے جاتے ہیں؟ فیصلہ قارئین کریں!

خاتمہ بحث

سورۃ براۃ کی ابتدائی آیات پر مستشرقین کی نکتہ چینی کتنی بے معنی ہے اسلام جیسی موحدانہ دعوت کے مقابلہ میں شرک اور مشرکین جب دونوں مل کر نبرد آزما ہو جائیں انسانی فطرت کے مطابق نظم و نسق کے حامل نظام سے ٹکرانے لگیں تو ان کے خلاف اعلانِ جنگ حمایتِ حق میں ضروری ہو گا یا نہیں؟

رسول عرب و عجم ﷺ کے زمانہ میں عرب میں جو نظام شرک اور بت پرستی کے زیر اثر تھا۔ اس پر تاریخ گواہ ہے اس نظامِ شرکیہ کے مقابلہ میں خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پوری زندگی کے معمولات پر تاریخ گواہ ہے اس میں وہ مدت بھی شامل کر لیجئے جب نبی الکریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بعثت کے ابتدائی تیرہ سال میں مسلسل تبلیغ فرمائی۔ اس عرصہ میں سخت سے سخت اذیت ناک ردِ عمل اور شدید سے شدید مشتعل کن رویوں کے مقابلہ میں نہ تو براہین و دلائل کا دامن ہاتھ سے چھوڑا نہ ہی گفتگو میں احسن سے احسن ترین انداز سے ہٹ کر کبھی کوئی لفظ زبانِ مبارک پر آیا۔

یہی طرزِ احسن اسوہ حسنہ میں بھی تھا، کبھی جارحانہ اقدام کا موقعہ پیدا ہی نہیں ہونے دیا۔ البتہ جہاں کہیں مسلمانوں پر ظلم و تشدد کیا گیا تو اس کی مدافعت کے لئے چاروناچار ادھر کا رخ کرنا پڑا۔ مسلمانوں کی طرف سے یہ مدافعت اپنے اس عقیدہ و دعوت کی محافظ تھی۔ جس پر مسلمان ایمان لائے اور اس کے لئے قدم قدم پر قربانیاں دیں۔ پھر یہی دعوتِ اسلام پوری طاقت کے

ساتھ مشرکین کے ساتھ ان کے عقیدہ شرک کی نجاست کی وجہ سے نبرو آزما ہوئی۔ اور وہ بھی بار بار اس تنبیہہ کے بعد کہ اگر وہ شرک سے ہاتھ نہ روکیں تو ان کے لئے عہد و پیماں کی کوئی ذمہ داری مسلمانوں پر نہیں ہوگی۔ "کیف وان یظھر واعلیکم لا یر قبو افیکم الا ولا ذمہ" یعنی مشرکین کا عہد کیسے قابلِ اعتبار ہو سکتا ہے جب کہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر یہ لوگ تم پر غلبہ پا جائیں تو تمہارے بارے میں نہ قرابت کا خیال رکھیں نہ عہد و پیمان کا (8:9) معلوم ہوا کہ جنگ طلبی کی رسم بھی ان کی اپنی ایجاد ہے۔ یعنی جب بھی ان کو مومنین پر غلبہ حاصل ہوا۔ انہیں مومنین کے ساتھ کسی قسم کی رواداری کا میلان نہ ہو سکا۔

الغرض سورۃ براۃ تمام غزوات کے بعد تا بہ خاتمہ غزوہ تبوک نازل ہوئی۔ اب آپ ہی بتایئے عرب میں ایک شہر ہے جس میں کچھ لوگ مسلمان ہو چکے ہیں لیکن اسی شہر کے رہنے والوں میں بہت سے اشخاص ابھی تک شرک کی نجاست سے آلودہ ہیں۔ اب وقت آتا ہے کہ مسلمانوں نے اس شہر میں اس اجتماعی اور اقتصادی نظام کو نافذ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے جو رسول عدل و احسان محمد صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت سے پہلے یا موجودہ مشرکانہ نظام کو تہس نہس کر دیتا ہے۔ اس نظام میں اللہ کی طرف سے حلال کی ہوئی اور حرام کی ہوئی دونوں اشیاء کی تبلیغ کی جاتی ہے۔ تو یہ لوگ اسے ٹھکرا دیتے ہیں۔ اچھائیوں کی ترغیب دی جاتی ہے برائیوں سے روکا جاتا ہے تو یہ لوگ جبرو تشدد پہ اترتے ہیں۔ تو کیا انصاف پسند طبائع کے نزدیک ایسے لوگوں کے خلاف طاقت کا استعمال ناروا ہے؟ اگر ایسے لوگ معمولی طاقت کی نمائش کے باوجود ریاست کے دستورِ اخلاق پر عمل پیرا ہونا تسلیم نہ کریں تو اس وقت ان کے خلاف جنگ کرنے میں تامل کرنا کس حد تک ناجائز ہے؟ ہمارے خیال میں اخلاق اور انسانیت کا تقاضہ ہے کہ ان سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک کلمہ حق کو تسلیم نہ کر لیں۔ ویکون الدین کلہ للہ (4:8) یعنی ان سے اس وقت تک جنگ کی جائے جب تک صرف اللہ تعالیٰ ہی کے دین کا غلبہ ہو!

یہی وجہ ہے کہ علی علیہ السلام کے اعلام (براۃ من اللہ ورسولہ الی الذین عاہدتم من المشرکین فسیحوافی الارض اربعۃ اشھر) کے بعد ریاست میں مندرجہ ذیل قوانین کے نفاذ کی وضاحت کر دی گئی۔

(1) لایدخل الجنہ کافر۔ کافر جنت میں داخل نہیں ہوں گے۔

(2) لایحج بعد العام المشرک۔ شرک کرنے والا حج نہیں کر سکتا۔

(3) ولا یطوف بالبیت عریا نا" برہنہ ہو کر طواف کعبہ نہیں کیا جا سکتا۔

جس کا نتیجہ ریاست میں یکجہتی نظام کے لئے بے انتہا مفید ثابت ہوا۔ قبائل میں اعلام کے بعد یمن، مہرہ، بحرین، اور یمامہ کے وہ لوگ بھی اسلام میں شامل ہو گئے جو اب تک تردد یا شکوک میں مبتلا تھے۔

عامر بن طفیل کا حشر

سوائے ان گنتی کے مغرور اور خودسر لوگوں کے جنہیں ان کی خودسری نے بہکا رکھا تھا' اور اپنی جاہلیت نخوت اور تکبر کے سہارے اپنی سرداری کے سایہ میں جی رہے تھے۔ انہیں میں سے ایک متکبر انسان نما شیطان عامر بن طفیل بھی تھا۔ جو اپنے قبیلہ کا باری کے اعتبار سے چوتھا رئیس تھا۔ اربد بن قیس' خالد بن جعفر' حیان بن مسلم بن مالک عامر بن طفیل رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن جب عامر بن طفیل بارگاہِ نبوت ﷺ میں روبرو ہوا تو تکبر میں اکڑ گیا۔ ریاست میں اپنے وقار پر وثیقہ طلب کرنے پر اتر آیا۔ گویا مجھے ریاست کا امیر مان لیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی تلقین سے اسے دامنِ رحمت میں آنے کی بہت دعوت دی مگر وہ بدنصیب نہ مانا۔ یہ کہتا ہوا نکلا کہ دیکھنا میں اس شہر کو پیدل اور سوار فوج سے کس طرح کھنڈر میں بدل دیتا ہوں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دعا فرمائی۔ اے اللہ عزوجل مجھے اس کے شر سے محفوظ رکھیو۔

عامر ابھی مدینہ کی حدوں کو بھی پار نہ کر پایا تھا کہ بدبخت بیمار پڑ گیا گردن پر طاعون کا پھوڑا نکل آیا۔ راستے میں بنو سلول کی ایک عورت کے گھر میں آ گرا۔ اور اسی گھر میں ایڑھیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا۔ مرتے وقت اس کی زبان پر یہ کلمہ تھا۔ اے برادرانِ بنو عامر یہ پھوڑا تو اونٹ کی گردن پر نکلا کرتا ہے میرے مقدر میں بھی اسی سے مرنا لکھا ہے۔

قبیلہ بنو عامر کا دوسرا متکبر

یہ بھی اسی وفد میں شامل تھا جو رحمت و برکتِ نبوی ﷺ میں پہنچ کر بھی محرومِ رحمت و برکت لوٹا۔ ایک روز وہ اپنا اونٹ بیچنے کے لئے گھر سے نکلا تو بجلی گری اور اربد بن قیس کو جلا کر راکھ کر گئی۔ لیکن عامر اور اربد دونوں اپنے قبیلہ کو دین اسلام کو قبول کرنے سے روک نہ سکے۔

مسیلمہ کذاب

عامر بن طفیل اور اربد بن قیس دونوں سے زیادہ بدانجام اور آفت رسیدہ مسلمہ بن حبیب تھا۔ جو تہامہ میں بنو حنیفہ کے وفد میں آیا۔ لیکن خود شہر سے باہر اپنے ہمراہیوں کے سامان کی چوکیداری کے لئے رہ گیا۔ دوسرے افراد بارگاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ والسلام میں حاضر ہو گئے۔ سب کے سب مشرف با اسلام ہو گئے۔ انعامات بھی پا گئے۔

بنو حنیفہ نے رسولِ رحمت ﷺ سے اپنے وفد کے ساتھی مسیلمہ کا تذکرہ کیا۔ آپ ﷺ نے اس کے لئے بھی برابر کا عطیہ بخشا اور فرمایا۔ "وہ بھی مرتبہ میں تم لوگوں کے

مساوی ہے" اس لئے کہ سامان کی چوکیداری مرتبہ میں کمی کا سبب نہیں ہو سکتی"۔

لیکن بدبخت مسیلمہ نے جب رسول اللہ ﷺ کا یہ فرمان سنا۔ تو اس نے متوازی نبوت اور وحی کا دعویٰ کرتے ہوئے خود کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رسالت میں شراکت کا پیغام بھیج دیا۔ اور اپنے وحی کے نمونہ میں یہ جملے زبان سے ادا کئے۔

لقد انعم اللہ علی الحبلی نخرج منہا نسمتہ تسعی من بین صفاق وحشاء

اللہ تعالیٰ نے زنِ حاملہ کو کیا نعمت عطا فرمائی۔ اس کے بطن سے زندہ بچہ پیدا فرمایا جو چلنے پھرنے لگا۔

مسیلمہ کی شریعت

زنا اور شراب حلال نماز حرام؟ جس کی طرف اس نے لوگوں کو دعوت دی۔

وفود

رسالت مآب ﷺ کے حضور میں چاروں طرف سے جتنے وفود آتے ان میں امیرِ قبیلہ کا کوئی ایک معزز سردار ہوتا۔ مثلاً عدی بن حاتم' حضرت عمرو بن معدی کرب!

البتہ حمیر کے نوابوں نے اپنی طرف سے قبولِ اسلام کا ایک تحریری وثیقہ اپنے سفیر کے توسل سے پیش کیا۔ جو قبول فرما لیا گیا۔ اور انہیں بارگاہِ رسالت سے شریعت کے احکامات تحریری طور پر بھیج دیئے گئے۔ یہ جنوب ملک یمن کا علاقہ تھا۔ جب پورے یمن میں اسلام پھیل گیا تو داعیِ اسلام محمد ﷺ نے سابقینِ اسلام میں سے کچھ لوگوں کو یمن بھیجا جو نو مسلموں کو دینِ اسلام کے عقیدہ اور مسائل کی تعلیم و تربیت دیتے۔

عرب قبیلوں کے وفود اور ان کے نام

مزینہ' اسد' تمیم ---------- عبس' فزارہ' مرہ' ثعلبہ' محارب' سعد بن بکر' کلاب' رؤاس بن کلاب' عقیل بن کعب' جعدہ' قشیر بن کعب' بنی البکاء' کنانہ' اشجع' باہلہ' سلیم' ھلال بن عامر' عامر بن صعصعہ' ثقیف!

ربیعہ کی طرف سے

عبدالقیس' بکر بن وائل' تغلب' حنیفہ' شیبان۔

خطۂ یمن سے

طے' تجیب' خولان' جعفی' صداء' مراد' زبید' کندہ' صدف' خشین' سعد ہزیم' بلی' براء'

عذرہ، سلامان، جہینہ، کلب، جرم، ازد، غسان، حارث بن کعب، ہمدان، سعد العشیرہ، عنس، الدار یمن، الرہاء یمن۔

از بنو مزحج

غامد، نخع، بجیلہ، خشعم، اشعر یمن، حضر موت، ازد عمان، غافق، بارق، دوس، ثمالہ، حدان، اسلم، جذام، مہرہ، حمیر، نجران، جیشان۔

غرض عرب میں اب کوئی قبیلہ ایسا نہ تھا جس نے بت پرستی چھوڑ کر دین اسلام قبول نہ کیا ہو۔ مدینہ منورہ میں جو وفد بھی آیا بغیر کسی تحکم جبر اور تشدد کے آیا اپنے دل سے اطاعتِ رسالت علیہ السلام کے لئے آیا۔ نہ کسی قبیلہ پر دباؤ ڈالا گیا نہ کشت و خون کیا گیا۔

مشرکین کے قبول اسلام کے بعد اب صرف یہود و نصاریٰ کا معاملہ باقی رہ گیا کہ ان کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا سلوک فرمایا؟

اہل کتاب سے حجۃ الوداع تک

اہلِ کتاب سے حجۃ الوداع تک

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے منیٰ میں سورۃ براۃ کی جو آیات اعلاناً سنائیں ان کے بعد یہ بھی اعلان فرما دیا کہ آج کے بعد نہ تو کوئی کافر جنت میں مقام حاصل کر سکتا ہے۔ نہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج یا زیارت بیت اللہ کے لئے کعبہ (حدود حرم) میں داخل ہو سکتا ہے۔
اور نہ ہی کوئی زیارت کرنے والا برہنگی کی حالت میں طواف کر سکتا ہے۔ البتہ اگر کسی کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عطا کردہ ایسا وثیقہ موجود ہو۔ تو وہ آئندہ ان پابندیوں سے آزاد ہو گا۔
اس کے بعد مشرکین کو یقین ہو گیا کہ آج کے بعد بتوں کو معبود ماننے کی کوئی گنجائش نہیں اگر اب کسی نے ایسا کیا تو اس کے خلاف اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلان جنگ ہو گا البتہ عرب کے جنوبی گوشہ یمن اور حضر موت میں ایسے لوگ باقی رہ گئے جو بت پرستی پہ قائم تھے اور ان کے ساتھ نصاریٰ بھی ابھی تک اپنے قدیم مذہب پر قائم تھے۔ البتہ ان کے علاوہ حجاز اور اس سے ملحقہ گردو نواح خصوصاً عرب کے شمالی حصہ میں بسنے والے مشرکین اسلام قبول کر چکے تھے۔

اہلِ کتاب اور بت پرستوں میں امتیاز

اہل کتاب یہود و نصاریٰ کے متعلق سورۃ برآۃ کی جو آیات علی رضی اللہ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ حج میں سنائی تھیں وہ مندرجہ ذیل ہیں۔

قاتلوا الذین لا یومنو باللّٰہ ولا بالیوم الاخر ولا یحرمون ماحرم اللّٰہ و رسولہ ولا یدینون الحق من الذین اوتوالکتب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون (29:9)

اور جو لوگ اہل کتاب میں سے اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور نہ روز آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ اور نہ ان چیزوں کو حرام جانتے ہیں۔ جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دی ہے۔ اور نہ دین حق کو قبول کرتے ہیں ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ ذلیل ہو کر اپنے ہاتھ خراج ادا کریں۔

یاایھا الذین امنوا ان کثیراً من الاحبار والرہبان لیاکلوا اموال الناس

بالباطل ویصدون عن سبیل اللہ والذین یکنزون الذہب والفضتہ ولا ینفقونہا فی سبیل اللہ فبشرھم بھم بعذاب الیم یوم یحمی علیہا فی نار جہنم فتکوی بہا جباھہم وجنوبہم وظہورھم ھذا ماکنزتم لانفسکم فذوقوا ماکنتم تکنزون (35:34)

ایمان والو اہل کتاب کے بہت سے عالم اور مشائخ لوگوں کا مال ناحق کھاتے ہیں۔ اور ان کو اللہ تعالیٰ کی راہ سے روکتے ہیں۔ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ان کو اس دن کے عذاب الیم کی خبر دے دو جس دن وہ مال دوزخ کی آگ میں خوب گرم کیا جائے گا پھر ان بخیلوں کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی۔ اور کہا جائے گا۔ کہ یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لئے جمع کیا تھا۔ اب اس کا مزہ چکھو!

بیشتر مسیحی مورخین سورۃ براۃ کی متذکرہ بالا آیات پہ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ رسول اللہ ﷺ نے اس قانون کے خلاف حکم جاری نہیں کیا۔ جو سورۃ براۃ کے نازل ہونے سے دو سال پہلے کا معمول تھا۔

بعض مستشرقین نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب یہود نصاریٰ دونوں کی مشرکین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب انہیں یہود و نصاریٰ کے تعاون سے مشرکین پر غلبہ حاصل تھا اور نبی اکرم ﷺ اپنے زمانۂ رسالت کے آغاز میں مسلسل کئی سال تک فرماتے رہے ہیں دین عیسوی' مسلک موسیٰ اور دین ابراہیم علیہ السلام اور ان انبیاء کے طریقہ کے تجدد اور بشارت کے لئے مبعوث ہوا ہوں! جو اس سے پہلے اس دنیا میں تشریف لائے ہیں۔

اس سے کچھ عرصہ بعد جب یہودیوں کی طرف سے عداوت ظاہر ہونے پر ان کے قلع قمع پر متوجہ ہوئے تو نصاریٰ سے امداد حاصل کرنے کے لئے ان کی مہمان دوستی کی تعریف میں رسول اللہ ﷺ پہ آیت نازل ہوئی۔

لتجدن اشد الناس عداوۃ للذین آمنوا لیہود والذین اشرکو ولتجدن اقربہم مودۃ للذین آمنوا الذین قالو انا نصاری ذالک یان منہم قسیسن ورہبانا" وانہم لایستکبرون (86:5)

(اے ہمارے رسول اللہ ﷺ تم دیکھو گے کہ مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرک ہیں اور دشمنی کے لحاظ سے مومنوں کے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان میں عالم بھی ہیں' مشائخ بھی اور وہ تکبر نہیں کرتے!

لیکن آج عیسائیوں کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جا رہا ہے۔ جو کل تک یہودیوں کے ساتھ ہوا۔ بلکہ یہاں تک کہ نصاریٰ کو ان لوگوں کے ہم مقام قرار دیا جا رہا ہے۔ جو نہ اللہ تعالیٰ کو

مانتے ہیں۔ نہ قیامت کا انہیں یقین ہے! یہی نصاریٰ جب محمد ﷺ کے مطیع و فرماں بردار مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ پہنچے تو ان کے عیسائی بادشاہ نجاشی نے اپنی سلطنت میں انہیں پوری آزادی کے ساتھ رہنے کی اجازت دی تھی۔

انہیں مسیحیوں کو نجرانی اور دوسرے مسیحی قبائل کو محمد ﷺ نے اس زمانہ میں ان کے سابقہ دین بلکہ رسومات پر بھی پہلے کی طرح عمل کرنے سے بھی نہ روکا۔ حتیٰ کہ ان میں سے جس کا جو منصب تھا اس پر ہی اسے برقرار رکھا! رسول اللہ ﷺ پر اتنے الزامات لگانے کے بعد ان کے ہم ملک مستشرقین فرماتے ہیں آج انہیں نصاریٰ کے ساتھ اس قدر مختلف برتاؤ کیوں؟ جس سے مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان دشمنی کی خلیج حائل ہو سکتی ہے۔ جس کی بنا پر مسیح کے فرماں بردار اور محمد ﷺ کے مطیع و فرماں بردار مسلمانوں کے درمیان یک جہتی کے امکانات محال نہیں تو کم از کم بہت مشکل ضرور ہیں۔

از روئے قرآن مریم علیہ السلام کی منزلت

بظاہر مستشرقین کا یہ تنقیدی پہلو ان لوگوں کے لئے سرمایہ تسکین ہو سکتا ہے۔ جن کے سامنے مسئلہ کا دوسرا پہلو نہ ہو۔ لیکن اگر تاریخی تواتر کی روشنی میں ان آیاتِ قرآن کی ترتیب اور اسبابِ نزول پر غور کیا جائے تو قطعیت کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ آغاز بعثت سے لیکر رحلت تک رسول اللہ ﷺ کا موقف اہل کتاب یہود اور نصاریٰ دونوں کے متعلق ایک ہی سا ہی رہا ہے۔

چنانچہ قرآن حکیم کے مطابق مریم کا بیٹا مسیح علیہ السلام کلمۂ بشارت کا ظہور ہے۔ جو مریم علیہ السلام پر کیا گیا تھا اور مسیح بن مریم اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں۔ اور اللہ عزوجل جس نے ان کو اعزازِ نبوت عطا فرمایا، اور ان کے قیام ہر مقام کو باعث برکت فرمایا انہیں قیام الصلوٰۃ کا حکم فرمایا۔ اللہ ایک ہی ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ کوئی اس کے برابر ہے۔ روزِ اول سے لے کر دنیا کے آخری دن تک اسی بنیاد پر روح اسلام قائم ہے۔ اور یہ روح اسی طرح ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے منفک نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ زیر بحث مسئلہ کے متعلق یہ بات واضح ہے کہ مستشرقین کے موجودہ اعتراضات (سورۃ براۃ میں) مستشرقین کے ساتھ اہل کتاب کی تنبیہہ سے بہت پہلے سے متعلق ہیں۔ (جب نجران کے عیسائی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مناظرانہ انداز میں رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ محترمہ تو مریم علیہ السلام تھیں، مگر ان کے والد؟ اس موقع پر مندرجہ ذیل آیات نازل ہوئیں۔

ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم خلقہٗ من تراب ثم قال لہ کن فیکون○ الحق من ربک فلا تکن من الممترین

عیسیٰ علیہ السلام کا حال اللہ تعالیٰ کے نزدیک آدم کی مثل ہے کہ اس نے پہلے مٹی سے ان کا قالب بنایا۔ پھر فرمایا کہ (انسان) ہو جا تو وہ (انسان) ہو گئے! یہ بات تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے تو تم ہرگز شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

فمن حاجک فیہ من بعد ما جائک من العلم فقل تعالوا ندع ابناء نا و ابناء کم ونساء نا ونساء کم وانفسنا وانفسکم ثم نبتہل فنجعل لعنۃ اللہ علی الکاذبین○

پھر اگر یہ لوگ عیسیٰ السلام کے بارہ میں تم سے جھگڑا کریں تو تم کو حال تو معلوم ہو چکی ہے۔ تو ان سے کہنا آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں تم اپنے بیٹے اور عورتوں کو بلاؤ اور ہم خود بھی آئیں تم خود بھی آؤ پھر دونوں فریق اللہ عزوجل سے دعا التجا کریں۔ اور جھوٹوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو!

ان ھذا لھو القصص الحق وما من الہ الا اللہ وان اللہ لھو العزیز الحکیم○

یہ تمام بیانات صحیح ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ ہی سب پر غالب اور صاحب حکمت ہے۔

فان تولوا فان اللہ علیم بالمفسدین۔ قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سوآء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھدوا بانا مسلمون (64:59:3)

تو اگر یہ لوگ پھر جائیں تو اللہ تعالیٰ مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ تو پھر کہہ دیجئے اے اہلِ کتاب جو بات تمہارے اور ہمارے درمیان یکساں تسلیم کی گئی۔ اس کی طرف آؤ۔ یہ کہ اللہ عزوجل کے سوا ہم کسی کی عبادت نہیں کریں گے۔ اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ تعالیٰ کے سوا کارساز نہ سمجھے۔ اگر یہ لوگ اس بات کو نہ مانیں تو ان سے کہہ دو کہ تم گواہ رہو۔ ہم تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے فرماں بردار ہیں۔

یہ آیات سورہ عمران میں سے ہیں۔ جن میں اللہ جل شانہ نے نصاریٰ (بشمول یہود) پر عتاب فرمایا۔ کہ تم دوسروں کو بھی ﷺ پر ایمان لانے سے منع کرنے میں اللہ سے نہیں ڈرتے۔ اور خود بھی اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے انکار کرتے ہو؟ اور اسی طرح سورہ آلِ عمران میں وہ احکامات بھی بیان فرمائے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جناب موسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام پر نازل ہوئے۔ لیکن یہود نصاریٰ دونوں نے آپس میں گٹھ

جوڑ کرکے دنیاوی فائدہ اٹھانے کے لئے ان میں ہیر پھیر (تحریف) کر دیا۔ جن کی نشاندہی کے لئے سورہ عمران کی کافی آیات پیش کی جا سکتی ہیں۔ غرض صرف سورہ عمران ہی نہیں بلکہ قرآن مجید میں دوسری سورتوں میں بھی یہ احکامات بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے سورہ مائدہ میں

لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ثالث ثلاثہ وما من الہ الا الہ واحد وان لم ینتھوا عمایقولون لیمسن الذین کفرو امنھم عذاب الیم۔

وہ لوگ بے شک کافر ہیں جو لوگ کہتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ تین میں سے تیسرا ہے۔ جب کہ اس وحدہ لاشریک کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اگر یہ لوگ ایسے اقوال و عقائد سے باز نہیں آئیں گے تو ان میں سے جو کافر ہوتے ہیں وہ تکلیف دینے والا عذاب پائیں گے۔

افلایتوبون الی اللہ ویستغفر ونہ واللہ غفور رحیم ماالمسیح ابن مریم الا رسول قدخلت من قبلہ الرسل وامہ صدیقہ کانا یاکلان الطعام انظر کیف نبین لھم الا یات ثم انظر انی یوفکون (72:85 تا 75)

تو پھر یہ لوگ کیوں نہیں اللہ عزوجل کی طرف رجوع کرتے اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی نہیں مانگتے اللہ تعالیٰ تو بخشنے والا مہربان ہے○ مسیح ابن مریم علیہ السلام تو صرف اللہ تعالیٰ کے رسول تھے ان سے پہلے بھی سب سے رسول گزر چکے ہیں اور ان کی والدہ اللہ تعالیٰ کی ولی اور سچی فرماں بردار تھیں۔ وہ دونوں انسان تھے کھانا کھاتے تھے' دیکھو ہم ان لوگوں کے لئے اپنی آئتیں کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔ پھر بھی دیکھو یہ لوگ الٹے جا رہے ہیں۔ سورۃ مائدہ میں یہ آیت بھی ہے۔

واذ قال اللہ یا عیسیٰ ابن مریمؑ انت قلت للناس اتخذ ونی وامی الھین عن دون اللہ قال سُبحانک مایکون لی ان اقول مالیس لی بحق○(166:)

اور اس وقت کو بھی یاد رکھو جب اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر میرے اور میری والدہ کو معبود مقرر کر لو۔ وہ کہیں گے اللہ تو پاک ہے۔ مجھے یہ بات کہنی کیسے جچتی تھی ایسی بات میں کیوں کہتا۔ جس کا مجھے کچھ حق ہی نہیں۔

سورہ مائدہ ہی کی چند آیات کو مسیحی مؤرخین اپنی حمایت میں استدلال پیش کرتے ہیں کہ ابتدا میں محمد ﷺ نصاریٰ کے ساتھ حسن مراعات سے پیش آتے رہے ہیں:

ولتجدن اشدالناس عداوۃ للذین آمنوالیھود والذین اشرکو والتجدن اقربھم مودۃ للذین آمنوالذین قالو انا نصاری ذالک بان منھم قسیسین ورھبانا وانھم لایستکبرون (86:5)

اے ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ تم مومنوں کے ساتھ سب سے زیادہ دشمنی کرنے والے یہودی اور مشرکوں کو پاؤ گے! اور دوستی کے لحاظ سے مومنوں سے قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جو کہتے ہیں۔ کہ ہم نصاریٰ ہیں یہ اس لئے کہ ان میں عالم بھی ہیں۔ مشائخ بھی ہیں۔ اور وہ تکبر نہیں کرتے!

اب رہیں وہ آیات جن میں نصاریٰ کو مزید دور کرنے کا پابند بتایا گیا ہے۔ تو یہ پابندی ان کے ابن مریم علیہ السلام پر ایمان لانے کی وجہ سے نہیں۔ بلکہ اس کی وجہ ان کا اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے۔ دھوکے سے دوسروں کا مال بٹورنا ہے۔ سرمایہ داری کی کثرت سے پیٹ کو دولت کا تندور بنانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال کر لینے کی وجہ سے ہے۔ یہ تمام خرابیاں اسلام خود عیسوی دین ہی کے خلاف جنگ سمجھتا ہے اس لئے کہ مذکورہ تمام خرابیاں عیسوی مذہب میں سنگین گناہ کہلاتی ہیں۔

اس آگاہی کے باوجود نصاریٰ کے ساتھ اسلام کی رواداری کا یہ عالم ہے کہ ان تمام برائیوں کے باوجود انہیں اہل ایمان کے زمرہ سے خارج نہیں کیا۔ نہ ان کے ساتھ بت پرستوں کا سا رویہ جائز رکھا ہے۔ بلکہ اسلام نے تو ان نصاریٰ کے ان اللہ ثالث ثلثہ (77:5) "اللہ تین بھی ایک ہی ہے" پر عقیدہ رکھنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حرام کئے ہوئے کام اور اشیاء کو حلال کر لینے کے باوجود اعلانِ جنگ کی بجائے صرف جزیہ اپنے تک حکم کو محدود رکھا۔

وفد کندہ

جیسا کہ سابقہ اٹھائیسویں فصل میں بیان کیا جا چکا ہے۔ کہ مدینہ منورہ میں متواتر آنے والے وفود میں مستشرقین اور اہلِ کتاب دونوں قسم کے وفود تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر وفد کی ممکنہ دلجوئی اور عزت افزائی فرماتے۔ ان کے سرداروں کو ان کے سابقہ عہدوں پر ہی فائز فرما دیتے۔

جب بنو کندہ کے 80 اسی افراد کا وفد حاضر ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف فرما تھے۔ شرکاء وفد بڑی دھوم دھام سے مدینہ منورہ میں داخل ہوتے۔ کندھوں پہ زلفیں بکھری ہوئیں تھیں۔ آنکھوں میں سرمہ کی لکیریں' اور ریشمیں استر سے مندھے ہوئے یمنی جفر کے پٹکے ان کے گلوں میں تھے۔ انہیں دیکھتے ہی رسولِ کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔
کیا تم لوگ مسلمان نہیں ہو؟

عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کیوں نہیں ہم مسلمان ہیں۔ تو پھر مسلمان ہونے کے باوجود گلوں میں ریشمیں استر کے پٹکے گلے میں لٹکانے کے کیا معنی ہیں؟

وفد کے افراد نے یہ حکم سنتے ہی تمام پٹکے پھاڑ کر پھینک دیئے! ارباب وفد شعث بن قیس نے مزاحاً عرض کیا ہم لوگ نبی اکل المرار ہیں اور جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اسی خاندان سے ہیں! یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور فرمایا۔ نبی اکل المرار عباس ہوں گے یا ربیعہ بن حارث ہوں گے میں نبی اکل المرار کیوں ہونے لگا۔

وائل بن حجر اور معاویہ بن سفیان

اسی وفد میں کندہ ہی کے ایک نواب وائل بن حجر بھی شریک تھے۔ حضر موت کے ساحلی شہروں اور بستیوں کے سردار مانے جاتے تھے۔ یہ مسلمان ہوئے تو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں اس شرط پر ان کے سابقہ منصب پر فائز فرمایا۔ کہ اپنے زیر اثر علاقہ سے عشرو زکواۃ وصول کر کے محصلین کو سونپ دیا کریں! ان کے ہمراہ معاویہ بن ابو سفیان رضی اللہ عنہ کو وہاں کے مسلمانوں کی تربیت کے لئے بھجوا دیا۔ راستے میں معاویہ رضی اللہ عنہ نے ان سے ان کی ردیف میں بیٹھ جانے کی درخواست کی تو اس نے کہا ردیف میں جگہ دینا تو درکنار اگر دھوپ سے بچنے کیلئے میرے جوتے کی نوک بھی طلب کرو گے تو مجھے گوارا نہیں۔ البتہ تم میرے اونٹ کے سایہ میں چل سکتے ہو۔ (اس روایت میں خاص عصبیت کی بو آتی ہے یہ معاویہ رضی اللہ عنہ کی توہین نہیں روایت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کو تربیت دین کا معلم بنا کر بھیج رہے ہیں۔ وہ ان کے لئے سواری کا بندوبست بھی نہیں کرتے۔ نعوذ باللہ من ذالک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں پیدا ہونے والے ہر انسان سے سے زیادہ ماہر نفسیات تھے۔ انہیں معلوم تھا جب میں معلم دین کے وقار کو خود ملحوظ خاطر نہیں رکھوں گا تو جن کو یہ تربیت دینے جا رہے ہیں وہ ان کی تعظیم کیا کریں گے! اور اگر تعظیم نہیں کریں گے تو تعلیم و تربیت بے اثر ہو گی (مترجم) معاویہ رضی اللہ عنہ نے وائل کی اس بد تمیزی کو نظر انداز کر دیا۔ تاکہ ان کے ذریعہ اس کی قوم اسلام سے بہرہ مند ہو۔

اہل یمن کی دینی تعلیم کے لئے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا تقرر

یمن کے رہنے والوں کی تعلیم و تربیت کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی قیادت میں معلمین کا ایک وفد روانہ فرماتے ہوئے امیر وفد کو ہدایات دیں۔

لیسرولا تعسر و بشر و لا تنفر وانک ستقوم علی قوم من اھل الکتاب یسئلونک مفتاح الجنتہ فقل شھادۃ ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ

اے معاذ۔ آسانی مد نظر رکھنا تنگی سے بچنا۔ لوگوں کو اپنے ساتھ مانوس رکھنا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے رویہ سے لوگ متنفر ہو جائیں۔ وہاں تمہاری ملاقات اہل کتاب سے ہو گی جو تم سے

پوچھیں گے جنت کی کنجیاں کہاں ہیں؟) تو ان سے کہنا جنت کی چابی لا الہ الا اللہ ہے۔ اور اللہ وہ ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ ایک جماعت ایسی بھی شامل فرما دی جو اہل یمن کی دینی مسائل میں تربیت کے علاوہ ان کے عدالتی فیصلوں کو بھی شریعت اسلامی کے مطابق کرنے کی تربیت دیں۔

اب جزیرہ عرب کا ہر باشندہ علمِ اسلام کے نیچے آ چکا تھا۔ ملک کے تمام باشندے امتِ واحدہ کہلانے لگے۔ سب کا دین ایک، رسول ایک، سب کا رخ ایک ہی طرف گویا سب کا قبلہ ایک اور اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت سب کا مقصود!

یہی وہ قبائل تھے جو آج سے بیس سال پہلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، ایک دوسرے کے مال اور آبرو کے دشمن تھے۔ آج وہ اسلام کے جھنڈے تلے کیا آئے بت پرستی کی نجاست ان سے دور ہو گئی۔ اللہ وحدہ لاشریک کی اطاعت کا جذبہ غالب آ گیا۔ دشمنی، گلے، شکوے، سب کے سب جاتے رہے۔ ایک دوسرے سے جنگ وجدل کی راہیں بالکل بند ہو گئیں۔ جس تلوار کی تیز دھار کا امتحان ایک دوسرے کی گردن پر ہوتا تھا۔ آج سے وہ امتحان دین اسلام کے دشمن کی شہ رگ پہ ہونے لگا۔

مسیحیانِ نجران کا قبول اسلام

نجران کے عیسائیوں میں سے اگرچہ قبیلہ حارث مسلمان ہو چکا تھا لیکن ایک حصہ ابھی تک اپنے قدیم مسلک پر ڈٹا ہوا تھا۔ رسول برحق ﷺ نے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ان کی تلقین و تعلیم کے لئے بھیجا تو انہوں نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے ان کا وفد بارگاہ رسالت علیہ الصلوٰۃ و السلام میں بھیجا وہ حاضر ہوا اور اس سے بھی مروت اور خندہ پیشانی سے برتاؤ کیا گیا۔

اہلِ یمن

یمن کا ایک قبیلہ نخع ابھی تک اسلام قبول کرنے سے بھاگ رہا تھا۔ ان کے دماغ میں خبط تھا کہ دینِ اسلام کا ظہور ملک حجاز میں ہوا جو کل تک ان کا باجگذار تھا۔ اگر ہم ایمان لے آئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم اس کا باجگذار ہونا قبول کر لیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک سو مجاہدین کا دستہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہمراہ یمن بھیجا۔ یہ لوگ مقابلہ میں اتر آئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کمسنی کے باوجود انہیں بھگا دیا۔ وہ دوسری مرتبہ پھر سمٹ کر حملہ آور ہوئے۔ اس مرتبہ علی رضی اللہ عنہ نے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور اسلام بھی قبول کر لیا اور اپنے حسنِ عمل و خلوص سے اسلام کا بول بالا کر دکھایا۔ وہ لوگ

بھی حضرت معاذ اور ان کے رفقاء کی تقسیم و تربیت سے مستفید ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہونے والا یہ آخری وفد تھا۔ جو وفدِ نخع کے نام سے موسوم ہے۔ اس وفد کے امیر زرارہ بن عمر نخعی تھے۔

حجِ اکبر کا اہتمام

جس زمانہ میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ یمن سے واپسی کی تیاریاں کر رہے تھے نبی اکرم ﷺ اس وقت حج اکبر کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ذی قعدہ تیسرے عشرہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اب تک رسول رب العالمین علیہ الصلوٰۃ والسلام حج اصغر (یعنی عمرہ تو دو دفعہ فرما چکے تھے لیکن حج اکبر ادا کرنے کا ابھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ یہ بھی مقصد تھا کہ حج کے تمام اعمال کو خود ادا کر کے مسلمانوں کو بتائیں۔

یہ خبر صبح کی روشنی کی طرح تمام عرب میں پھیل گئی۔ صحرانشین، پہاڑوں کے مکیں، دیہاتوں اور شہروں کی بستیوں کے رہنے والے سارے کے سارے مدینہ منورہ میں اُمڈ آئے! مدینہ منورہ کے باہر خیموں کا ایک نیا شہر آباد ہو گیا۔ ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ مسلمان جمع ہو گئے۔ یہ سب کے سب وہ لوگ تھے جنھوں نے دعوتِ اسلام کی پہلی آواز سن کر ہی لبیک کہہ دیا تھا۔ یہ لوگ جو چند سال پہلے درندوں کی طرح ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ آج محبت اخوت اور دوستی کے جذبے لئے ایک دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔ ایک دوسرے کو دعائیں دے رہے تھے۔ السلام علیکم السلام علیکم السلام علیکم کی دعا سے مدینہ منورہ کی فضا میں بھرپور ہو گئیں۔ مسکراتے چہرے، ہونٹوں پہ تبسم گفتگو میں محبت، خلوص نرم لہجہ ایثار وفا کے مجسّمے مسلمانوں کا یہ اجتماع جو نورِ اسلام کا سرچشمہ و منبع تھا۔ آج یہ اتحاد و استحکام میں ایسے کانھم بنیان مرصوص "گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار تھے۔

حجِ بیت اللہ کے لئے روانگی کی تیاریاں

ختم المرسلین شفیع المذنبین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے 25 ذیقعدہ 10ء کے روز مدینہ سے حج بیت اللہ شریف کے لئے سفر اختیار کرنے کا آغاز فرمایا۔ تمام حرم ساتھ تھیں۔ سب سے آگے رسول اللہ ﷺ کی سواری تھی۔ امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا اپنے اپنے ہودج میں تشریف فرما تھیں۔ باقی زائرین کا جم غفیر پیچھے پیچھے ان کے نقش قدم پہ چل رہا تھا۔ ان کی تعداد ستر ہزار اور بعض دوسری روایتوں کے مطابق ایک لاکھ دس ہزار منقول ہے۔ مسلمانوں کے اس سفر کی محرک اُن کی قوت ایمان تھی۔ اللہ تعالیٰ کے گھر کی زیارت اور حج بیت اللہ کا والہانہ شوق دلوں میں موجزن تھا۔ سفر جاری رہا۔ جب مقام ذوالحلیفہ (مقام میقات) پہ پہنچے تو رات وہیں قیام

کا حکم ہوا۔ وہ رات بھی اپنی مثال آپ تھی اور اس کی صبح بھی اپنے ساتھ نسلِ آدم کی تاریخ میں منفرد سعادتوں کو ساتھ لائی۔ اس صبح اسی مقام ذوالحلیفہ پہ سید البشر' نور القمر' شافع روز جزا محمد و احمد ﷺ نے احرام باندھا ۔ آپ ﷺ نے احرام باندھا تو ہزاروں اور لاکھوں نے اتباع الرسول ﷺ میں احرام باندھے۔ فرشتوں کا ساتھ تو تھا ہی نامعلوم کتنے مسلمان جنات نے احرام باندھا۔ ایک تہہ بند' ایک چادر۔۔۔۔ سب کا ایک لباس' سب کی ایک نیت' سب کا ایک عمل۔ سب کا ایک ہی جمال۔ انہیں بے مثال لمحوں میں ان مقدس ہونٹوں کو جنبش ہوئی جن ہونٹوں کی ہر جنبش کو مشیت الٰہی حاصل ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ "ما ینطق عن الھوی" ان متبرک ہونٹوں کی جنبش نے ایسے مخصوص عظیم المعنی الفاظ میں اللہ جل شانہ کی عظمتوں کا اعتراف و اقرار فرمایا جو آج بھی غیر متبدل ہیں منفرد ممیّز ہیں۔ جو آج بھی اسی خاص لباس' خاص ہیئت' خاص نیت' خاص عبادت سے مختص و متعلق ہے۔ ان الفاظ کا مجموعی نام بھی منفرد مخصوص تلبیہ ہے۔

لبیک اللھم لک لبیک لبیک لا شریک لک لبیک الحمدو النعمہ والشکر لک لبیک لبیک لا شریک لک لبیک۔

اے اللہ میں تیرے حضور میں حاضر ہوں۔ تیرا کوئی شریک نہیں۔ (میں اس اعتراف کے ساتھ) تیرے حضور میں حاضر ہوں۔ (مجھے اس بات کا بھی اقرار ہے) کہ تو ہی تمام حمد و ثنا کا واحد مستحق ہے تمام نعمتیں تیری ہی عطا و بخشش ہیں اور تیرا ہی شکر ادا کرنا واجب ہے۔ میں تیرے حضور حاضر ہوں تیرا کوئی شریک نہیں ہے تیرے حضور حاضر ہوں!

اللہ عزّوجل کی بارگاہ جلیلہ میں اس مخصوص خراجِ تحسین تلبیہ کی آواز دشت و جبل میں گونج اٹھی موجودات کا ذرہ ذرہ الہ العالمین کی ربوبیت کا اعتراف میں ڈوب گیا۔ مدینۃ الرسول اور مکہ معظمہ کے درمیانی فاصلے زائرین کے کوسوں دور تک پھیلے ہوئے قافلہ نے سمیٹنے شروع کیے جہاں کہیں قیام صلوٰۃ کا وقت آیا سب مل کر بارگاہ الٰہی میں رکوع و سجود میں گرے۔ خشوع و خضوع سے دعائیں مانگیں' تکبیر کی دل کش آوازوں میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور تشکر کا اظہار کیا۔ ہر لمحہ ہر ایک کا شوق بڑھتا گیا جتنی منزل قریب آتی گئی اتنا ہی جذبوں میں تلاطم بڑھتا گیا۔ عرب کے دشت و جبل بھی وادیاں اور نخلستان بھی اتنے بڑے مجمع پر حیران کہ آج تک اس نبی امی عبدہ علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسی عظیم المرتبت بابرکت و پربہار شخصیت دیکھنے میں نہیں آئی۔

حج عمرہ اور حل احرام

جب یہ قافلہ۔۔۔ مقامِ سرف پہ پہنچا تو ہادی برحق نور ہدایت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا

جس زائر کے پاس قربانی کا جانور نہ ہو اس کو صرف عمرہ کی نیت کرنا چاہئے اور جن حضرات کے پاس (ہدی) قربانی کا جانور موجود ہے ان کے لئے حج کی نیت واجب ہے۔

مکہ معظمہ میں

زائرین ذوالحجہ کی چوتھی تاریخ کو مکہ معظمہ میں پہنچے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہ کرام نے زیارتِ کعبہ میں سبقت کی۔ نبی کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام اور صحابہ کرام نے پہلے حجر اسود کو بوسہ دیا۔ کعبہ کے سات طواف میں سے پہلے چار تیز قدم اور باقی تین طواف عمومی رفتار میں فرمائے۔ اس کے بعد یہاں سے فراغت کے بعد کوہ صفا پر تشریف لائے صفا اور مروہ کے درمیان سعی فرمانے کے بعد حکم فرمایا جس زائر کے ساتھ ہدی (قربانی کا جانور) نہ ہو وہ احرام کھول دے مگر بعض حضرات نے اس میں تامل کیا تو نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام نے تاکیداً" فرمایا۔

ما امرکم فافعلوا۔ جو حکم میں دیتا ہوں تم پر اس کی تعمیل واجب ہے۔

اس برہمی کی حالت میں اپنے خیمہ میں تشریف لے گئے۔ ام المومنین عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا نے دریافت فرمایا۔ آپ کا مزاج گرامی برہم کیوں ہے؟

فرمایا--- مالی اغضب وانا آمر امراً" فلا یتبع؛ مجھے غصہ کیوں نہ آئے میں جو حکم دیتا ہوں اس کی تعمیل نہیں کی جاتی۔

صحابہ میں سے ایک صحابی تشریف لائے اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ کو ناراض کرنے والے کو اللہ تعالیٰ دوزخ میں جھونک دے گا۔ فرمایا میں نے انہیں جو حکم دیا ہے یہ لوگ اس کی تعمیل نہیں کر رہے۔ اگر مجھے حجِ قران کی مشکلات کا اندازہ ہوتا تو میں ہدی کے جانور خرید کر ساتھ نہ لاتا اور احرام کھول دیتا۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں مروی ہے۔

جب مسلمانوں کو آپ کی برہمی کا علم ہوا تو ایسے زائرین نے ندامت کے ساتھ احرام کھول دیئے جن کے ہمراہ ہدی نہ تھیں۔ اس حوالہ سے ازواجِ مطہرات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صاحبزادی نے بھی احرام کھول دیا۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واپسی

اس اثناء میں علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی یمن سے تشریف لے آئے۔ تو انہیں معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے احرام زیب تن فرما رکھا ہے تو خود بھی اقتدائے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں احرام حج باندھ لیا۔ مگر جب فاطمہ رضی اللہ عنہا کو احرام کے بغیر دیکھا تو ان سے وجہ پوچھی انہوں نے بتایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عمرہ کی نیت کرنے کا حکم دے کر احرام اتار دینے کا ارشاد فرمایا۔ اس پر ہم نے بھی احرام کھول دیئے۔

اس کے بعد علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو یمن کے حالات سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کعبہ کا طواف کرنے اور دوسرے مسلمانوں کی مانند احرام اتار دینے کے لئے ارشاد فرمایا۔ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ احرام باندھنے کے موقع پر میں ان الفاظ میں نیت کر چکا ہوں۔

اللھم انی اھل بما اھل بہ نبیک وعبدک ورسولک محمد۔ اے اللہ میرا تلبیہ انہیں لفظوں میں ہے جن سے تیرے نبی، عبد اور رسول محمد ﷺ نے فرمایا۔

جب رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ ہدی (قربانی کا جانور) نہیں تو ان کو اپنی قربانیوں میں شریک فرمالیا اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بدستور احرام باندھے رہے۔ اور اسی میں مناسکِ حج ادا کئے۔

نویں ذوالحجہ (ترویہ) کے روز منیٰ میں اپنے خیمہ کے اندر تشریف لائے۔ اس دن کے معمولاتِ عبادت فرمانے کے بعد رات کو خیمہ میں ہی قیام فرمایا۔

صبح ہوئی صلوٰۃ فجر ادا فرمائی اور سورج نکل آنے کے بعد اپنی ناقہ (قصواء نام) پر سوار ہو کر میدانِ عرفات کا قصد فرمایا۔ یہ 9 ذوالحجہ کا دن تھا۔ آپ کے ساتھ ایک لاکھ زائرین صحابہ کرام تھے۔ عرفات نام کی پہاڑی پر تشریف لائے تو چاروں طرف مسلمانوں کا جمِ غفیر تھا۔ ان میں بعض تلبیہ "لبیک اللھم لک لبیک! لبیک لاشریک لک لبیک! الحمدو النعمۃ والشکرلک لبیک! لبیک لاشریک لک لبیک! اور بعض ترویہ اور تکبیرات پکار رہے ہیں۔ ترویہ یعنی کلمہ اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد!

نبی اکرم ﷺ نے ان میں سے کسی کو منع نہیں فرمایا۔ عرفات کی شرقی سمت نمرہ نامی بستی کے قریب آپ کے ارشاد کے مطابق پہلے ہی سے خیمہ نصب کر رکھا تھا۔ اس میں آپ ﷺ نے آرام فرمایا۔ سورج کے ڈھلنے کے بعد ناقہ قصواء پہ کاٹھی کسنے کا حکم دیا۔ اور سوار ہو کر میدانِ عرفات کے درمیان میں تشریف لائے اور سواری پہ ہی بیٹھے ہوئے باآوازِ بلند خطبہ ارشاد فرمایا۔ آپ ﷺ ہر جملہ کے بعد توقف فرماتے اور اسی لمحہ جناب ربیعہ بن امیہ بن خلف انہیں الفاظ کو باآوازِ بلند ساتھ ساتھ دہراتے۔

حج اکبر کا خطبہ-------------- اللہ عزوجل کی حمد و ثناء کے بعد فرمایا۔

یا ایھا الناس! اسمعوا قولی! فانی لاادری لعلی لاالقاکم بعد عامی ھذا بھذا الموقف ابدا"

اے لوگو میں جو کچھ کہوں اسے بگوشِ ہوش سنو شاید آئندہ سال اور اس کے بعد پھر کبھی میری

تمہاری ملاقات نہ ہو سکے!

انسانی جان کی حرمت

یا ایہا الناس! ان دمائکم واموالکم علیکم حرام الی ان تلقو اربکم۔ کحرمۃ یومکم ھذا وکحرمۃ شہرکم ھذا۔

اے لوگو تم پر ایک دوسرے کا جان و مال اس دن تک حرام ہے جب تم اپنے پروردگار سے ملاقات کرو جس طرح اس مہینہ میں تم ایک دوسرے کی بے حرمتی کرنا حرام سمجھتے ہو۔

ادائے امانت

فمن کانت عندہ امانۃ فلیؤدھا الٰی من ائتمنہ علیہا۔

تم میں سے جس کسی کے پاس دوسرے کی امانت ہو اسے لوٹا دیا جائے۔

سود کی حرمت

وان کل ربا موضوع! ولکن لکم رؤس اموالکم لا تظلمون ولا تظلمون قضی اللہ انہ لا ربا وان ربا عباس بن عبدالمطلب موضوع کلہ۔

آج سے ہر قسم کا سود ختم کیا جاتا ہے۔ اپنی قرض دی ہوئی اصل رقم کے اوپر تم کچھ نہیں لے سکتے! اگر ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو گے' قیامت کے دن تم پر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے سود لینے دینے کو منع فرما دیا ہے۔ عباس کا جو سود دوسروں نے ادا کرنا ہے اسے ختم کیا جاتا ہے۔

جاہلیت کے قتل پر انتقامی جذبوں پر خطِ تنسیخ

وان کل دم کان فی الجاھلیۃ موضوع وان اول دمائکم اضع دم ابن ربیعہ الحارث بن عبدالمطلب!

جاہلیت کے زمانہ میں قتل کئے جانے والوں کا قصاص اور دیت دونوں کو کالعدم قرار دیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے میں ہی بنو ہاشم کے بیٹے ابنِ ربیعہ بن حارث بن عبدالمطلب کے فرزند کا بدلہ اور دیت معاف کرتا ہوں!

عملِ صالح جزوِ ایمان

امابعد! ایہا الناس! کانَ الشیطٰن قد یئس من ان یعبد بارضکم ھذا ولکنہ ان یطمع فیما سوی ذٰلک فقد رضی بہ مما تحقرون من اعمالکم فاحذروہ علی دینکم۔

غور سے سنئے کہ اب عرب میں شیطان کی پرستش نہ کی جائے گی لیکن اس کو پوجنے کی بجائے اگر شیطان کی صرف اطاعت ہی کی گئی تب بھی وہ بہت خوش ہو گا۔ اس لئے دینی امور میں شیطانی وساوس کو اپنے قریب نہ آنے دو۔ مذہب میں خارجی رسوم کا دخل منع ہے۔

ایھا الناس! ان النسی زیادة فی الکفر یضل الذین کفر و یحلونه عاماً یحرمونه عاماً لیو اطؤا عدة ما حرم اللّٰہ و یحرموا ما احل اللّٰہ

اے لوگو۔ ادب والے مہینوں کا دوسرے مہینوں سے ادل بدل کر لینا کفر ہے جس میں مومن آلودہ نہیں ہو سکتا مگر کافر کا اس سے بچنا محال ہے جو اس سال ان چار مہینوں میں ایک مہینہ آئندہ سال کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں اور آنے والے سال میں اسے بدستور اپنے محل پر رکھتے ہیں۔ یہ بھی اللہ کی طرف سے حرام کردہ امور کو حلال کر لینا اور حلال شدہ امور کو حرام کر لینا ہے۔

وان الزمان قد استدار کھیئة یوم خلق السموات و الارض وان عدة الشھور عند اللّٰہ اثناء عشر شھراً منھا اربعة حرم ثلاثة متوالیة و رجب مفرد الذی بین جمادی و شعبان۔

اور دیکھو جب اللہ تعالیٰ نے ابتداً ہی زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا زمانہ پھر پھرا کر آج پھر اسی نقطہ پر آ گیا ہے۔ چار ادب والے مہینے ہیں۔ یعنی تین متواتر ہیں۔ از ذی قعدہ تا بہ محرم اور ایک مفرد یعنی رجب کہ جمادی اولیٰ و آخر اور شعبان دونوں کا درمیانی مہینہ ہے۔

شوہر و زوجہ کے باہمی حقوق کا تحفظ

مابعد! ایھا الناس! فان لکم علیٰ نسائکم حقاً و ان لھن علیکم حقاً الا یوطئن فرشکم احداً ھو نه۔

اس کے بعد۔ اے لوگو بیوی اور خاوند دونوں ایک دوسرے کے سامنے جوابدہ ہیں۔ ان میں سے ایک بات یہ ہے کہ کسی عورت کے لئے غیر مرد کو اپنے قریب کرنے کا حق نہیں ہے۔ ورنہ خاوند کے تن بدن میں آگ لگ جائے گی۔

اگر بیویاں فحش کا ارتکاب کر بیٹھیں۔

وعلیھن الا یاتین بفاحشته مبینة فان فعلن فان اللّٰہ قد اذن لکم ان تھجروھن فی المضاجع و تضربوھن ضرباً غیر مبرح!

اور عورتوں کو چاہیے کو وہ بے حیائی سے بالکل بچ کر رہیں۔ اگر ان سے یہ قصور ہو جائے تو ان کے شوہر ان کو بدنی سزا دے سکتے ہیں۔ مگر وہ سزا ضربِ شدید کی حد تک نہ پہنچ جائے۔

لاابالی عورتیں

فان انتهن فلهن رزقهن وکسوتهن بالمعروف فاسترضوا بالنساء خیرا" فانهم عندکم عوان لا یملکن لانفسهن شیئا" وانکم انما اخذتموهن بامانة اللّٰه واستحللتم فروجهن بکلمات اللّٰه

اگر عورتیں ایسا لاابالی پن چھوڑ دیں تو دستور عام کے مطابق ان کے خوردو نوش اور ان کے لباس کا پورا لحاظ رکھو اور ان کے معاملہ میں حسن سلوک سے ہاتھ نہ روکو وہ تمہارے نکاح میں آنے کے بعد تمہاری پابند ہو جاتی ہیں۔ اور ان معنوں میں اپنے نفس کی مالک نہیں رہتیں لیکن تم بھی خیال رکھو کہ آخر کلمۂ ایجاب و قبول کے ساتھ ہی تو تم نے اللہ کی اس امانت کو اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ اور انہیں کلمات کے ساتھ انہیں خود پر حلال کیا ہے۔

فاعقلوا ایها الناس قولی! فانی قد بلغت وقد ترکت فیکم ماان اعتصمتم به فلن تضلو ابدا" امرا" بینا" کتاب اللّٰه وسنته رسوله۔

اے لوگو غور سے سنو! اور بگوشِ ہوش سنو جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں اس کے بیان و تفصیل پہ مبنی جو چیزیں تم میں چھوڑ کر جا رہا ہوں اگر تم نے اسے مضبوطی سے (قول و کردار میں) تھامے رکھا تو کبھی گمراہ نہ ہو گے اور وہ چیز بذاتِ خود نہایت واضح ہے۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے۔

ایها الناس! اسمعوا قولی واعقلوه تعلمن ان کل مسلم اخ للمسلم وان المسلمین اخوة فلا یحل لامری من اخیه الاما اعطاه عن طیب نفس منه فلاتظلمن انفسکم۔

اے لوگو! میری بات کو بڑے غور سے سنو۔ اور یاد رکھو تم سب مسلمان ایک دوسرے کے بھائی ہو اور اس رشتہ کی وجہ سے کسی مسلمان بھائی کو کسی دوسرے مسلمان بھائی کی کسی شے پر اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنے کا حق نہیں۔ ورنہ یہ ایک دوسرے پہ ظلم کے مترادف ہو گا۔

اس کے بعد رسولِ کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر فرمایا۔

اللهم هل بلغت۔ اے اللہ آپ سن رہے ہیں میں نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

نیابت خطبہ

خطبہ کے درمیان نبی الہادی والاکمل علیہ الصلوٰۃ والسلام ہر جملہ کو ختم کرنے کے بعد ایک لمحہ خاموش ہو جاتے اور اس وقفہ میں ربیعہ بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلند آواز سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد کو دہرا کر دوسروں تک پہنچاتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ربیعہ بن امیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تاکید فرمادی کہ حاضرین کو خطبہ میں دی گئی ہدایات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کی تاکید

کریں۔ اور ان سے جواب بھی طلب کریں۔

سوال۔ هل تدرون ای یوم هذا؟ تم لوگ جانتے ہوں آج کا دن کونسا دن ہے؟ (حاضرین نے جواب میں کہا)

ج۔ حج اکبر کا دن ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا۔

ان اللہ حرم علیکم دمائکم واموالکم الی ان تلقوا ربکم اکحرمة یومکم هذا۔

اے لوگ تم پر ایک دوسرے کی جان اور ایک دوسرے کا مال قیامت تک حرام ہے۔ جیسا کہ آج کے دن اور اس مہینے میں تم کسی قسم کی بے حرمتی نہیں کر سکتے۔

اس جملہ کے فرمایا۔ اللھم بلغت اے اللہ تو سن رہا ہے کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا اور ہر طرف سے آوازیں بلند ہوئیں۔ اللھم اشهد یا اللہ میں گواہی دیتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔

تکمیلِ دین کی بشارت

خطبہ ارشاد فرمانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قصواء اونٹنی سے اتر کر تھوڑی دیر تک کچھ دور پیدل چلے۔ ظہر اور عصر دونوں نمازیں ایک ساتھ یعنی جمع کر کے پڑھیں۔ پھر ناقہ پہ سوار ہو کر عرفات کے مقام پر نزول فرمایا اور وہیں پہ آیت تکمیل نازل ہوئی۔

الیوم اکملت دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

آج کے دن میں نے تمہارے لئے دین کو مکمل کر دیا۔ اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لئے دین اسلام کو پورا کر لیا۔

ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو دیئے

حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ دین کی تکمیل اور منصب رسالت کی سند تبلیغ کے اظہار کو دنیا سے نورِ ہدایت سرچشمۂ رحمت محسن انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے مترادف سمجھے اور بے ساختہ روتے روتے ان کی ہچکیاں بندھ گئیں۔

حج کے بقیہ اعمال کی تکمیل

ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام عرفات سے مکہ معظمہ روانہ ہوئے سر راہ مزدلفہ کے مقام پر منزل فرمائی۔ رات یہیں بسر کی، اسی رات کی صلوٰۃ فجر اور طلوع آفتاب کے درمیان یہاں سے

روانہ ہونے کی تیاری فرمائی۔ اسی راہ میں جمرہ پہ رمی فرمائی اور پھر منیٰ میں اپنے خیمہ میں نزول فرمایا۔

ذبیحہ قربانی

ذرا وقفہ کے بعد دسویں تاریخ ہی کو من جملہ ایک سو اونٹ کے جو مدینہ سے قربانی کے لئے ہمراہ لائے تھے' تریسٹھ اونٹ اپنی طرف سے اپنے سن مبارک کے ہر سال کے عوض میں ایک قربانی کے ذبح کئے اور باقی سینتیس اونٹ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ذبح کئے۔ جس کے بعد مناسک کا آخری عمل سر کے بال منڈوانا باقی رہ گیا۔ اس سے فارغ ہو کر احرام کھول دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس حج کو تین مختلف عنوانات سے موسوم کیا گیا۔

(1) (الف) حج الوداع۔ مکہ معظمہ اور بیت اللہ شریف کی زندگی میں آخری بار زیارت کی وجہ سے حج الوداع عنوان دیا گیا۔

(2) (ب) حج البلاغ۔ اس بناء پر کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابلاغ کی ذمہ داری یا منصب رسالت کی تکمیل کے اظہار کی بناء پر یہ عنوان تجویز کیا جاتا ہے۔

(3) (ج) حج الاسلام۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رب العالمین کی طرف سے مبشر و منذر دونوں حیثیت سے مبعوث ہوئے اور اس ذمہ داری کی تکمیل کی سند دیتے ہوئے اللہ جل شانہ نے اس حج ہی کے موقع پر فرمایا۔ الیوم اکملت لکم دینکم۔ آج کے دن ہم نے تیرے دین یعنی دین اسلام کو کامل کر دیا۔ لہٰذا اس نسبت سے اسے حج الاسلام کا عنوان دیا جاتا ہے۔

علالت سے وصال تک

علالت سے وصال تک

مناسکِ حج ادا ہو چکے۔ لشکر مومنین اب اپنے اپنے وطن کو چلا۔ یمن اور حضر موت کے بسنے والوں نے ادھر کی راہ لی تو نجد کے رہنے والے اپنی منزل کی طرف چل دیئے۔ خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنے مدینہ طیبہ کے رفقاء صحابہ کرام کے ساتھ مدینہ منورہ کی طرف چل دیئے۔

اب جزیرہ نمائے عرب میں کوئی اندرونی خطرہ موجود نہ تھا البتہ خارجی ممالک روم' ایران' شام' مصر اور عراق کی طرف سے سازشوں کے امکانات موجود تھے۔

سابقہ اوراق میں ہم بتا چکے ہیں کہ جزیرہ عرب کے ہر گوشہ سے لوگ فوج در فوج دین اسلام قبول کر چکے تھے جو خود حاضر نہ ہو سکے۔ انہوں نے دستاویزی ثبوت پیش کر کے علم اسلام کا سایہ بخوشی قبول کر لیا۔ صدر حکم و دانش علم الوحی کے مہبط احمد و محمد ﷺ نے قبائل کی ہر سیادت کو برقرار رکھا۔ خصوصاً مملکتِ ایران کے گورنر باذان نے جب اسلام قبول کر لیا۔ آتش کدہ ایران کو پانی میں غرق کر دیا تو اس کے منصب کو برقرار رکھا گیا۔

البتہ کچھ شریر النفس افراد سرکشی کے مرض میں مبتلا تھے لیکن نبی رحمت ﷺ نے ان کو قابل توجہ نہ سمجھا۔ اب تقریباً تمام اہل عرب کے سر ہی نہیں بلکہ دل ہادی راہ فلاح احمد و محمد ﷺ کے حضور جھک چکے تھے۔ یہاں کے تمام اہل عرب نے اپنے باپ دادا کے مذہب بت پرستی کو چھوڑ کر اللہ واحد القہار پر اپنا ایمان و یقین مستحکم کر لیا تھا۔

حسد و حماقت کی اولاد کچھ لوگ

کچھ احمق جہالت کے مارے افراد نے جب رسول اللہ ﷺ کی کامیابیوں کو دیکھا۔ آپ کے مقام مقبولیت اور احترام کو دیکھا تو مدینہ منورہ سے بہت دور کی بستیوں میں نبوت کا

بہروپ اختیار کر کے لوگوں کو دعوت دینا شروع کر دی ان کے ذہن میں اس شوق کا کیڑا رینگنے لگا کہ جس طرح قبیلہ قریش میں سے ایک نبی علیہ السلام نے عالی مقام و مرتبہ حاصل کر لیا ہے اسی طرح ان کا قبیلہ بھی اپنے جھوٹے نبی کے ذریعہ شہرت حاصل کر لے گا۔

نبوت کے یہ جھوٹے خبطی اور ان کے قبیلے ان اسباب سے بالکل ناواقف تھے۔ جس کی وجہ سے خود ان کا مولد اسلام مکہ مکرمہ سے بہت دور رہنا تھا۔ دوسرے انھیں اس بات کا احساس ہی نہیں کہ اسلام کی ناقابلِ شکست مقبولیت اس کی صداقت تھی۔

پھر صداقت کے اظہار و دعوت کے بعد اتنی مصیبتیں سہنا جن کے چرچے گھر گھر ہونے لگے جھوٹ کے بس کی بات نہیں۔ صداقت کی روح منبع و مصدر حق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی استقامت ان کی قوت صداقت تھی۔ ان کے مقابلہ میں ایسے جھوٹے مدعیانِ نبوت جن کی بنیاد ہی بہتان و افتراء ہے کہاں ٹھہر سکتے تھے۔

جھوٹا نبی نمبر 1 طلیحہ

قبیلہ بنو اسد کا سردار تھا۔ عرب میں اس کی بہادری اور فن حرب میں مہارت مشہور تھی۔

اپنے صوبہ نجد میں صاحبِ اقتدار ہونے کی وجہ سے اس کے دماغ پر نبوت کا بھوت سوار ہو گیا۔ اس پر ایک اتفاقی حادثہ نے اس کے اپنے اس خبط کو اور زیادہ مضبوط کر دیا وہ واقعہ یہ تھا کہ ایک بار یہ شخص اپنے قبیلہ کے ساتھ سفر میں تھا۔ پیاس سے سب کا دم نکلا جا رہا تھا اپنے قبیلہ کے لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے اس نے کہہ دیا کہ گھبراؤ نہیں پانی تھوڑی دور کے بعد مل جائے گا۔ اتفاق کی بات ہے کہ تھوڑی دور جانے کے بعد واقعہ ہی پانی مل گیا۔ اس واقعہ نے اس کے اپنے دل و دماغ میں اپنی نبوی حیثیت کا یقین اور زیادہ کر دیا۔ لیکن طلیحہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارک میں تو اس اظہار کی جرات نہ ہوئی لیکن وصالِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد اس کے خبط کو پر لگے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو خبر ملی تو خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی قیادت میں مجاہدین کا مختصر سا دستہ اس کی سرکوبی کے لئے بھیجا۔ طلیحہ شکست کھا گیا۔ اسلام کی عظمت و حقیقت نے اس کے ضمیر کو سچائی کی روشنی سے منور کر دیا وہ مسلمان ہو گیا اور پھر تمام عمر دین اسلام کے مطابق زندگی تمام کر دی! رضی اللہ عنہ

مسیلمہ اور اسود عنسی (مدعیان نبوت)

ان دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد حیات میں اپنی اپنی نبوت کا دعوی کیا۔ مسیلمہ کو تو اپنے جھوٹ پر اتنا اعتماد تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اپنا سفیر بھیجنے کی جرات کر بیٹھا اور خط لکھا۔

مسیلمہ کا خط

من مسیلمہ رسول اللّٰہ الی محمد رسول اللّٰہ (ﷺ) اما بعد! فانی قد اشترکت فی الامر معک وان لنا نصف الامر والقریش نصف الامر ولیس قریش قوما یعدلون

ترجمہ۔ یہ خط اللہ کے رسول مسیلمہ کی جانب سے محمد رسول اللہ ﷺ کی طرف ہے۔ ہم اس منصب رسالت میں باہم شریک ہیں۔ آدھا اختیار آپ کا ہے اور آدھا اختیار اقتدار میرا ہے۔ اگرچہ قریش کی طرف سے عدل کی توقع ناممکن ہے۔

نبی رحمت ﷺ کا جواب

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم۔ من محمد رسول اللّٰہ (ﷺ) الی مسیلمۃ الکذاب والسلام علی من اتبع الھدی واما بعد فان الارض للّٰہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبۃ للمتقین۔

ترجمہ۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ گرامی نامہ اللہ (رب العالمین) کے رسول کل عالم ﷺ کی طرف سے بنام مسیلمہ کذاب۔ سلامتی کا مستحق صرف وہی شخص ہے جو صداقت کا پیرو ہو۔ ملک سب اللہ عزوجل کا ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے' انجام بخیر کا انحصار پرہیزگاری پر ہے۔

مسیلمہ کے دو قاصد تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ اگر سفیروں کا قتل جائز ہوتا تو میں ان دونوں کو قتل کر دیتا۔

اسود عنسی کا حشر

صنعائے یمن کا جادوگر بدہان گورنر یمن باذان کے بعد اس صوبہ پہ مسلط ہو گیا۔ جادوگری میں ترقی کرتے کرتے نبوت کے وہم میں مبتلا ہو گیا۔ ابتدا میں تو اس نے پراسرار انداز میں اپنی نبوت منوانا شروع کی مگر رفتہ رفتہ اس نے کافی لوگوں کو اپنا قائل کر لیا اور جادوگری کے زعم میں اپنے ساتھیوں کو لے کر جنوب کی طرف بڑھا۔ اور یہاں کے مسلمان تحصیلداروں کو بھگا کر اس نے نجران کا رخ کیا۔ جہاں گورنر باذان کا صاحبزادہ اس وقت حکمران تھا۔ بدہان نے اس کو شہید کر دیا اور اس کی بیوی کو اپنے ہمراہ لے گیا۔

اسود کی ان حرکات کی اطلاعات تو کم و بیش ملتی رہیں لیکن ان کو یقین تھا کہ یمن کے عمال (عہدیدار) خود اس معاملہ میں نپٹ لیں گے لیکن ایسا نہ ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے اس کے قتل یا گرفتاری دونوں میں سے کسی ایک صورت کا حکم نامہ عمالِ یمن کی طرف بھیجا۔ مگر اس سے پہلے باذان کی وفات اور اس کے بعد اس کے بیٹے کو بدہان نے شہید کر کے اس قضیہ کو ہی پاک کر دیا۔

مسیحی سلطنت اور مسلمان

حجتہ الوداع سے واپسی کے بعد کا وہ زمانہ ہے جب رسول اللہ ﷺ کو یقین تھا کہ جنوب عرب کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف کسی قسم کی چیرہ دستی (جارحیت) کا امکان نہیں لیکن عرب کا شمالی حصہ شام اور روم میں عیسائی سلطنت کا رعب و دبدبہ اپنے عروج پر تھا۔ ان کی طرف ہر وقت یہ کھٹکا رہتا تھا کہ کہیں یہ لوگ پھر موتہ کی طرح جمع ہو کر مسلمانوں کو نرغہ میں لے لیں۔ یوں بھی مسیحان روم سے اپنے دو شہیدوں زید بن حارثہ اور جعفر طیار کی شہادت کا قصاص بھی لینا تھا۔ وہ تو اللہ اللہ کر کے خالد بن ولید کی جنگی تدبیر نے مسلمانوں کو ان کے نرغہ سے نکالنے میں اللہ کے فضل سے کامیابی حاصل کر لی۔ جنگ موتہ میں تو یہ بھی صورتحال تھی۔ کہ مسیحی دشمنان اسلام سے یہ خطرہ بھی نہ تھا کہ وہ نصاریٰ جو عرب سے جلاوطن ہو کر فلسطین آباد ہو گئے ہیں وہ پھر دشمنان اسلام کے ساتھ ساز باز کر کے خطرناک صورتحال پیدا نہ کر دیں۔ ایسی ہی صورتحال تو تھی جس کی اطلاع پانے کے بعد رسول اللہ ﷺ ایک بہت بڑا لشکر لے کر تبوک تشریف لے گئے لیکن وہاں پہنچنے کے بعد عیسائیوں نے اپنا لشکر اندرونِ وطن بلوا لیا۔ ہیبت رسول ﷺ نے انہیں اپنے وطن میں دھکیلنے پر مجبور کر دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ واپس تشریف لے آئے۔

لیکن رومی عیسائیوں کے اس وقت کے اس مظاہرہ کا مطلب یہ نہیں تھا کہ رسول اللہ ﷺ ہمیشہ کے لئے ان کی اسلام دشمنی سے لاپرواہ ہو جاتے۔ وہ ایسا سوچنے میں حق بجانب تھے کہ رومی نصاریٰ' تبوک سے اس وقت فوجیں ہٹانے والا گروہ' نجران کو چھوڑنے پہ مجبور نصاریٰ' اسی طرح عرب کے مختلف حصوں سے اسلام دشمنی کے سبب جلاوطنی پانے والے گروہ سب مل کر پھر طوفان بپا کر سکتے ہیں۔

جیش اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ

دور اندیشی کے تقاضوں نے رسول اللہ ﷺ کو مدینہ منورہ واپس آنے کے فوراً بعد تحفظِ دین کی خاطر شام پر چڑھائی کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ فوج کو جمع ہونے کا حکم جاری فرما دیا۔ جن میں وہ عظیم و بزرگ ہستیاں بھی تھیں جو مہاجرین میں صف اول کا اعزاز رکھتے تھے۔ جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ' حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے سربر آوردہ بھی شامل تھے لیکن اس جیش کا سپہ سالار ہونے کا اعزاز اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو عطا ہوا۔ جن کی عمر اس وقت پچیس برس سے اوپر نہ تھی۔ اگر رسول اللہ ﷺ کی ذات پر لوگوں کا سچا اعتماد اور پختہ ایمان نہ ہوتا تو مہاجرین و سابقین اور دوسرے ممتاز ترین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا سپہ سالار ہونا گوارا نہ ہوتا۔

حکمتِ نبوی ﷺ کے پیش نظر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو یہ ذمہ داری سونپنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے والد زید ابن حارثہ رضی اللہ عنہ کو اسی مقام پر انہیں عیسائیوں نے شہید کیا تھا لہٰذا بیٹے کو اپنے باپ کا قصاص لینے اور فتح یاب ہونے کا اعزاز ملے۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ نوجوانوں کو مواقع دیئے جائیں تاکہ یہ مصائب برداشت کرنے کے خوگر ہو جائیں اور ریاست کی مہمات پہ قابو پانے کا تجربہ حاصل ہو۔

ہدایات

بارگاہِ رسالت ﷺ سے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو یہ ہدایات ملیں کہ جلد سے جلد لشکرِ اسلامی کو ارضِ فلسطین کے اس مقام پر لے جائیں۔ جہاں بلقاء اور روم کی حدیں ملتی ہیں۔ وہیں مورچہ بندی کی جائے۔ یہ وہی مقام ہے جس کے قریب دشمنوں نے اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کے والد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ حکم دیا گیا کہ اللہ عزوجل کے دشمنوں کو صبح کی تاریکی میں گھیر لیا جائے۔ اس انداز سے حملہ کیا جائے کہ دشمن کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ فتح و کامرانی کے بعد فوراً ہی مدینہ منورہ کی طرف مراجعت کرنے میں اولیں فرصت کو ترجیح دی جائے۔

اچانک علالت

ادھر لشکرِ اسلامی کی تیاریاں چل رہی تھیں ۔ اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کمان سنبھالے مدینہ منورہ سے باہر جرف کے مقام پر مجاہدین کی دیکھ بھال میں مصروف تھے کہ اچانک رسول اللہ ﷺ کی شدید علالت کی اطلاع آئی۔ لہٰذا عساکرِ اسلامی کے روانہ ہونے میں الجھن پیدا ہو گئی۔

اس الجھن کا پیدا ہونا کوئی ناقابلِ فہم بات نہیں۔ سید البشر رسول اللہ ﷺ کی اللہ تعالیٰ کے بعد وہ عدیم الشال ہستی سخت بیمار ہو جو ہر مسلمان کو اس وقت کیا آج بھی اپنی جان اپنے مال اپنی اولاد سے بھی زیادہ پیاری ہو اسے اس حالت میں چھوڑ کر جانا شام کے طویل سفر اور دشوار گزار راہوں کو پار کرنے سے زیادہ دشوار ہی نہیں بلکہ ناممکن تھا۔

اس سے پہلے بھی رسول اللہ ﷺ دو بار بیمار ہوئے۔ (الف) ایک بار 6ھ میں بھوک کی شدت سے گھبرا کر طبیعت ناساز ہو گئی۔ تو بعض افراد نے یہود کی طرف سے ان پر جادو کا اثر سمجھا۔

(ب) دوسری بار خیبر میں یہودی عورت نے کھانے میں زہر دیا۔ تو اس کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو پچھنے لگوانے پڑے! حقیقت تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں تشکیل

یافتہ معاشرہ میں صحت کے ایسے اصول کارفرما تھے جن سے بیماری کا امکان ہی تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔ مثلاً صدر حکمت و دانش رسول اللہ ﷺ کا ارشاد تھا۔

کھانا کم کھایا کرو، سادہ لباس پہنا کرو، گھروں میں بھی بود و باش کا سامان سادہ رکھا کرو، زندگی کے معمولات میں ہر وقت میں پاکیزگی اور صاف ستھرا رہنے کی پابندی کیا کرو، قیام صلوٰۃ سے پہلے وضو اچھی طرح کیا کرو اور اگر امت پر بوجھ کا احساس نہ ہوتا تو نبی رحمت ﷺ پانچوں وقت وضو کے ساتھ مسواک کرنا بھی لازم قرار دے دیتے جو منہ کی پاکیزگی خوشبو اور صحت کی ضامن ہے۔

غرض عبادت ہو یا زندگی میں حاصل شدہ نعمتوں کا استعمال کرتے وقت میانہ روی کا خیال رکھا جائے۔ نفسانی خواہشات کو لگام ڈال کر رکھا جائے تاکہ کائنات اور زندگی میں منصفانہ ربط قائم رہے۔ اب آپ ہی اپنی عقل و دانش سے پوچھئے جو معاشرہ ان ہدایات پر عمل کرتا ہو وہ جسمانی تندرستی اور قلبی مسرتوں کا مالک کیوں نہ ہو۔ پھر ایسا معاشرہ جس کی نسل تندرست جسم تنومند والدین کی گود میں پلے ان سے بیماری خود بخود دور کیوں نہ بھاگے۔ ان مسلمہ حقائق میں اچانک رسول رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ایسی بیماری جس کی تشخیص محال ہو، اس میں مبتلا ہونے کی خبر سن کر ان کے جانثاروں مطیع و فرماں برداروں کا آپ ﷺ کو اپنی نگاہوں سے اوجھل کرنا کیسے گوارا کیسے ہو سکتا تھا۔ انہیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے مسلسل بیس سال تک انسانی معاشرہ کو تمام روحانی اور جسمانی بیماریوں سے نجات دلانے کی مخلصانہ کوششوں کی بناء پر بے گنت مصیبتیں جھیلتے ہوئے اس ہستی رحمت و شفقت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھا۔ ان تمام صعوبتوں اذیتوں کا سبب اس مصدر صداقت و حق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا صرف کہنا تھا کہ بتوں کی پوجا کرنے والو! بتوں کی پوجا چھوڑ دو۔ تمہاری یہ دلیل کہ ہم بتوں کو اس لئے پوجنے میں برحق ہیں کہ ہمارے باپ دادا انہیں پوجتے تھے انتہائی بے جان ہے۔ تمہاری بہتری اسی میں ہے کہ بتوں کی پوجا چھوڑ دو اور ایک اللہ وحدہ لاشریک کی عبادت کرو۔ یہی وہ سیدھی راہ اور واضح بات تھی جس پر اہل مکہ نے ایسے ظلم کئے تشدد و جبر کیا۔ جن سے گھبرا کر آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کو وطن سے دور حبشہ ہجرت کرنے کے کا حکم دیا۔

یہی نہیں بلکہ قریش کے ظالم ہاتھوں نے آپ ﷺ کو مسلسل تین سال تک شعب ابو طالب میں نظربند کر دیا۔ اس پر مزید ستم تو دیکھئے کہ قریش کے مظالم نے آپ ﷺ کو بیعت عقبہ کے بعد یثرب میں منتقل ہونے پہ مجبور کر دیا۔ جس کا سفر ایسے پر خطر ماحول اور روح فرسا موسم میں ہوا۔ جب قدم قدم پر سورج کی گرمی سے ہلاکت و موت کا خطرہ تھا۔ اور ساتھ ہی قریش کی طرف سے تعاقب کرتے ہوئے دشمنوں کا خوف سایہ کی طرح پیچھا کر رہا تھا۔ پھر یہ بھی معلوم نہ تھا کہ یثرب پہنچنے کے بعد نتائج کیا ہوں گے۔ جہاں یہود جیسے دوبارہ مزاج یہودی سرمایہ دار چھائے ہوئے تھے۔

اور جب مدینہ منورہ میں قیام کے بعد اللہ عزوجل کی نصرت و حمایت سے عرب قبائل جوق در جوق مسلمان ہونا شروع ہو گئے تو ان نئے حلقہ بگوش اسلام ہونے والوں میں، گو ایسے بہادر صاحبِ ہمّت نوجوان موجود تھے جن پر اعتماد کیا جا سکتا تھا لیکن ان کے مقابلہ میں ابھی جتھہ بند قریش اور ان کے ازلی عقیدت مند جنھوں نے ایک سال میں کئی کئی مرتبہ مسلمانوں کے خلاف جنگ کے شعلے بھڑکائے تھے وہ بھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ لڑائیوں میں آنے والے ایسے روح فرسا واقعات جن سے آپ ﷺ کو دوچار ہونا پڑا۔ اگر یہی صدمات کسی نوجوان پر پڑیں تو وہ وقت سے پہلے بوڑھا ہو جائے۔

ذرا غزوہ احد میں پیش آنے والے حادثہ کا تصور کیجئے جب ایک بار مجاہدین کے قدم ایسے اکھڑے کہ رسول اللہ ﷺ کو وادی سے پہاڑ کی طرف منتقل ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ دشمنوں کے پتھراؤ سے آپ ﷺ کے دو دانت شہید ہو گئے۔ غزوہ حنین کے وہ ہولناک لمحہ یاد کیجئے جب ابھی صبح کے اجالے نے سانس بھی نہ لیا تھا کہ دشمنوں نے تیروں کی بوچھاڑ کر دی جس کی تاب نہ لا کر مجاہدین بھاگ نکلے۔

ایسے نازک موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ کے ثبات و استقلال کا یہ حال تھا کہ اپنے قدموں سے سر مو بھی نہ ہٹے اور مجاہدین کو بار بار پکار لگاتے۔ لوگو تم کہاں جا رہے ہو؟ واپس آؤ ـــــ میں موجود ہوں۔ جس پر مجاہدین واپس میدان میں پلٹ آئے اور بالآخر فتح یاب ہوئے۔

بارِ نبوت کی سختیاں

اب ان ظاہری اور مادی مصیبتوں سے قطع نظر وحی اور نبوت کا دشوار ترین سلسلہ! جس کا ایک کنارہ تو حلقہ کائنات اور اس کے اسرار سے جڑا ہوا اور آخری سلسلہ ملائے اعلیٰ سے وابستہ' اقتدار کے نبھانے کی ذمہ داریاں دشواریاں اسی بناء پر خاتم النبین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا۔ "شیبنی ھود واخوانھا" مجھے تو سورہ ہود اور اس کے دوسرے مناظر نے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا ہے۔ یہ حوادث ایک ایک کر کے مسلمانوں کی نظر کے سامنے بھی گزرتے رہے۔ لیکن سب اس بات کے چشم دید گواہ تھے کہ سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام جس طرح اپنی دوسری صفات میں نسل انسانی سے برتر و اعلیٰ ہیں۔ اسی طرح شجاعت و ہمت' ثابت قدمی' جرات اور استحکام برحق میں بھی سب سے بلند و برتر ہیں۔ نہ ان حادثوں کی وجہ سے آپ کے حوصلوں میں فرق آیا۔ نہ آپ پر کسی مرض کا حملہ ہوا۔ لیکن گذشتہ تمام مصائب سے گزرنے کے بعد جب سید البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحبِ فراش ہوئے تو اس کے پیش نظر عساکر اسلامی کا التوا لازمی اور فطری امر تھا کہ اب ذاتِ باری کی طرف سے کس فیصلہ کا ظہور ہوتا ہے۔

علالت کی پہلی رات اور جنت البقیع میں تشریف آوری

علالت کی پہلی شب اتفاق یہ ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شدت مرض سے ایسے بے چین ہوئے کہ آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی۔ شدید گرمی کا موسم تھا۔ شہر سے باہر کھلی ہوا کے جھونکوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو باہر کھلے میدان میں آنے کے لئے آمادہ کیا۔ اپنے خدمت گار ابو مویہبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لئے باہر تشریف لائے۔ جنت البقیع میں داخل ہوئے اور اس کے درمیان میں کھڑے ہو کر اہل قبور کو ان الفاظ میں خطاب فرمایا۔

السلام علیکم یا اهل المقابر لیهنی لکم ما اصبحتم فیه الناس فیه۔

اے اصحاب قبور تم پر سلامتی ہو۔ جو بھی تمہاری حالت ہے اس پر خوش رہنے سے جی نہ چراؤ۔ یہ سب کے ساتھ یکساں ہے۔

اقبلت الفتن کقطع اللیل المظلم یتبع آخرها اولها ولا خرة شر من الاولیٰ۔

دیکھو فتنے اس طرح اوپر تلے آ رہے ہیں جیسے اندھیری رات کے اندھیرے پردے' ایک کے بعد دوسرا۔ دوسرے کے بعد تیسرا اور ہر پردہ پہلے پردہ سے زیادہ خوفناک ہوتا ہے۔

اس روایت میں جناب ابو مویہبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ (غلام) نے یہ بھی فرمایا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت البقیع پہنچنے کے بعد یہ بھی فرمایا۔

انی امرت ان استغفر لاهل هذا البقیع فانطلق معی!

بقیع میں مدفونین کے لئے مجھے دعائے مغفرت کرنے کا حکم ہوا ہے۔ اے ابو مویہبہ تم بھی میرے ساتھ چلو!

اور جب اس دعا سے فارغ ہوئے تو ابو مویہبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا۔

انی قد اوتیت مفاتیح خزائن الدنیا والخلد فیها ثم الجنة فخیرت بین ذالک ولقاء ربی والجنة۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے دنیا کے خزانے اور ہمیشہ کی زندگی یا اس کے مقابلہ میں جنت کے انتخاب کا حق دیا مگر میں نے دنیا کے خزانوں اور اس دنیا کی دائمی زندگی کے مقابلہ میں اپنے رب کی ملاقات اور جنت پر اکتفا کیا۔

جس رات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنت البقیع میں مدفون شخصیات کے لئے دعائے مغفرت فرمائی۔ اسی رات کی صبح کو آپ کے مرض میں شدت پیدا ہو گئی۔ مسلمان گھبرا اٹھے اور عساکر اسلامی بھی اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ جہاں مقام جرف میں پڑاؤ ڈالے تھا وہیں پڑا رہا۔

بعض مورخین ابو مویہبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت کو مشتبہ قرار دیتے ہیں۔ اس بناء پر وہ

جیش اسامہ رضی اللہ عنہ کا التواء۔ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علالت نہیں بلکہ انصار و مہاجرین میں اسامہ رضی اللہ عنہ کی کم عمری کی وجہ سے ان کی قیادت پر اختلاف تھا۔ ایسے مورخین کے نقطہ نگاہ پر تنقید کئے بغیر گزر جانا خلاف انصاف ہو گا کیونکہ ابو مویہبہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے مشکوک یا غیر مشکوک ہونے سے قطع نظر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علالت ناقابل انکار دلیل ہے۔ خصوصاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبرستان بقیع میں جانا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی وفات کا احساس ہو چکا تھا۔

دور حاضر میں روحوں کے ساتھ --- مکالمہ کا جو دروازہ کھل گیا ہے اس علم کے موجد اور عامل ہر دو فریق روحوں سے باتیں کرنے کے بعد دوسروں کو بتاتے ہیں کہ ارواح سے مکالمہ کا ادراک روحانی قوت پر منحصر ہے۔ یہ عالمین یہاں تک دعوی کرتے ہیں۔ مردہ روحوں کے ساتھ دو ایک سوالات ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ مکالمات بھی ممکن ہیں۔ ظاہر ہے یہ مکالمات زندہ انسانوں کے ساتھ مردہ روحوں کے ہیں اور وہ بھی معمولی طریق پر نہیں بلکہ ان مکالمات میں جہاں ماضی اور مستقبل کے ڈانڈے مل جاتے ہیں وہاں زمان مکان بھی حائل نہیں رہتے۔

(نوٹ) مولف نے شاید ہندومت کے قدیم زمانہ کے جوگیوں اور زمانہ جاہلیت میں عرب کے کاہنوں کے ان دعوؤں کا مطالعہ فرمانے کی زحمت گوارا نہیں کی جو دور حاضر سے ہزارہا صدیوں پہلے روح سے مکالمہ بازی کا دعوی کرتے رہے ہیں۔ اور ان تمام دعوؤں کی بنیاد شیاطین کی گمراہ کن شعبدہ بازیاں ہیں "موت کے بعد ارواح----- کس حال اور مقام میں رہتی ہیں اس کی سچی خبر وہی ہے۔ جو ہمیں ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خبر دی ہے۔ جس کا نام عالم برزخ ہے" (مترجم)

بایں ہمہ ابھی تک اس علم کے جاننے والے دوسروں کے سامنے علم الارواح کو ایسے واضح طریقہ سے بیان کرنے سے قاصر ہیں جسے ہر درجہ کا انسان سمجھ سکے۔ لہٰذا اگر ابو مویہبہ کی روایت کے مطابق یہ تسلیم کر لیا جائے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معنوی اور روحانی ہر دو لحاظ سے دوسروں سے زیادہ کائنات کے راز سے آگاہ تھے تو یہ اعتراف کرنا ہی پڑے گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قبل از وقت اپنے وصال کی آگاہی مشکل نہ تھی۔

حالت مرض میں ام المومنین رضی اللہ عنہا کے ساتھ مزاح

شب مذکور کے دوسرے دن رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ام المومنین عائشۃ الصدیقہ رضی اللہ عنہا کو دیکھا کہ وہ سر پکڑے درد سے کراہ رہی ہیں۔ اور بار بار کہہ رہی ہیں ہائے میرا سر۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مرض کی شدت سے نڈھال ہو رہے تھے مگر عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا کو اس حالت میں دیکھ کر فرمایا۔

بل انا واللہ یا عائشہ وار اساہ ○بی بی میں بھی درد سر سے بے حال ہو رہا ہوں بے شک نبی کریم ﷺ کے درد و کرب کا یہی عالم تھا لیکن ابھی تک بسترِ علالت پر گر جانے کی نوبت نہ آئی تھی۔ نہ مرض اس حالت تک پہنچا تھا کہ اہل و ازواج سے لطف و مزاح کا دامن سمیٹ لیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ام المومنین رضی اللہ عنہا رسول اللہ ﷺ کے کراہنے کی آواز سننے کے باوجود اپنا واویلا نہ روک سکیں تو رسول اللہ ﷺ نے بطور مزاح فرمایا۔

وماضرک لومت قبلی فقمت علیک وکنفتک وصلیت علیک و دفنتک

بی بی اگر ایسا ہو جائے تو تمہیں کیا گھاٹا ہے میں خود تمہاری تجہیز و تکفین کر کے تمہاری میت پر دعا پڑھ کر تمہیں دفن کروں گا۔

ام المومنین رضی اللہ عنہا جن کو اپنی نو عمری کی وجہ سے ابھی اور زندہ رہنے کی تمنا تھی۔ وہ اپنی ضرب المثل حاضر جوابی کی بدولت اپنے گرامی منزلت کے مزاح کا جواب مزاح میں عرض کرنے پہ مائل تھیں عرض کیا۔ (دروغ برگردن راوی)

لکن ذالک خطا" غیری واللہ لکانی بلک لوقد فعلت ذالک لقد جعلت الی بیتی فاعرست فیہ ببعض نسا ○

آپ کی خواہش تو یہی ہو گی کہ جس طرح ہو سکے مجھے سپرد زمین کر کے دولت خانہ پر تشریف لا کر میری نوبت کسی سوت کو ہبہ کر دیں!

رسول اللہ ﷺ نے اپنے حرم کا جواب سن کر تبسم فرمایا! اور خاموش ہو گئے شدّتِ مرض کی وجہ سے کسی قسم کی گفتگو کو طویل کرنا مناسب نہ سمجھا۔

جملہ حرم پاک کی طلبی اور حضرت عائشۃ الصدّیقہ کے ہاں قیام کی تحریک

کچھ دیر بعد افاقہ محسوس ہوا تو سابقہ معمول کے مطابق تمام حرم کے ہاں قدم رنجہ فرمانے کا ارادہ فرمایا۔ لیکن مرض ہے کہ لمحہ بہ لمحہ شدت اختیار کر رہا ہے ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں تشریف لائے ہی تھے۔ کہ تکلیف بڑھ گئی تمام ازواج کو میمونہ رضی اللہ عنہا کے ہاں بلوایا۔ اور فرمایا۔ مجھے عائشہ رضی اللہ عنہا کے ہاں رہنے کی اجازت دی جائے۔

سب نے صدق دل سے تسلیم کر لیا۔ حضرت علی ابن ابی طالب اور اپنے عم بزرگوار عباس رضی اللہ عنہ کے کندھوں پہ ہاتھ رکھ کر عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں تشریف لے آئے۔ بے چینی اور نقاہت کی شدت سے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور قدم لڑکھڑا رہے تھے۔

مسجد میں تشریف آوری

دراصل بیماری نے ابتدا ہی میں شدت اختیار کر لی تھی۔ رواں رواں گرمی کا سرچشمہ بن

گیا تھا۔ لیکن تپ میں کمی واقعہ ہوتے ہی مسجد میں تشریف لائے نماز پڑھائی' اسی طرح ایک سے زیادہ دنوں تک نماز پڑھاتے رہے۔ مگر مسجد میں ہونے والی کسی گفتگو میں شرکت نہیں فرمائی۔ نہ صحابہ کرام سے کسی قسم کا خطاب فرمایا۔ دوسروں کی باتیں آپ کے گوش مبارک تک پہنچتی رہیں۔ یہاں تک کہ ایک بات سننے میں آئی کہ "آخر رسول اللہ ﷺ نے کیا مصلحت دیکھی کہ شام کی مہم پر ایک کمسن نوجوان کو اکابر مہاجرین و صحابہ پر سپہ سالار نامزد فرمادیا" جوں جوں مرض بڑھتا گیا۔ اسامہ رضی اللہ عنہ کی تقرری کے بارے میں مسلمانوں کو تنبیہہ کرنے کا احساس بڑھتا گیا۔ حرم اور متعلقین کو حکم دیا کہ سات کنوؤں سے علیحدہ علیحدہ سات برتن منگوا کر یہ پانی آپ کے بدن پر ڈالا جائے۔ غسل کے دوران فرمایا۔ بس۔ بس۔ غسل سے فارغ ہو کر پوشاک زیب تن فرمائی اور سر سے پٹی باندھ کر مسجد میں منبر پر تشریف لائے' خطبہ ارشاد فرمایا۔ جس میں حمد و ثنا اور شہدائے احد کے لئے دعائے مغفرت کے بعد فرمایا۔

جیش اسامہ کی روانگی کی تاکید

یا ایہا الناس انفذ وابعث فلعمری لئن قلتم فی امارۃ ابیہ من قبلہ وانہ لخلیق للامارۃ وان کان ابوہ لخیلقا لہا۔

لوگو! اسامہ کے منصب پر اعتراض نہ کرو مجھے اپنی جان کی قسم' آج جو تم اسامہ کی امارت پر تنقید کر رہے ہو۔ اسامہ کے والد کی امارت پر بھی تم تنقید کرتے رہے ہو۔ لیکن اسامہ اسی طرح امارت کے لئے پیدا ہوا ہے جس طرح اس کے والد زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ امارت کے لئے پیدا ہوئے تھے۔

خطبہ میں اپنی وفات کا اشارہ

رسول اللہ ﷺ خاموش ہو گئے پھر فرمایا۔ ان عبداً من عباد اللہ خیرہ اللہ بین الدنیا والاخرہ وبین ما عندہ فاختارہ ما عندہ۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندہ کو اختیار دیا ہے کہ وہ دنیا یا اللہ تعالیٰ کی نعمت عقبیٰ دونوں میں سے کسی ایک کو اپنے لئے منتخب کر لے مگر اللہ تعالیٰ کے اس بندے نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو ترجیح دی ہے۔

یہ فرمانے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے پہلے کی طرح پھر خاموشی اختیار فرما لی اور حاضرین بھی خاموش رہے۔ لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ بات کی تہہ تک پہنچ گئے کہ رسول اللہ ﷺ تو اپنے ہی متعلق فرما رہے ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ دھاڑیں مار کر رونے لگے اور عرض کیا۔

بل نحن نفدیک بانفسنا وابنائنا- اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہماری جانیں اور اولاد آپ پر نثار ہو- آپ ہمیں یہ کیسی بات سنا رہے ہیں-

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سوچ کر کہ کہیں یہ احساس دوسروں کو بھی گریہ و بکا کرنے پر آمادہ نہ کر دے- ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو صبر کی تلقین و تاکید فرمائی اور فرمایا- مسجد میں جن لوگوں کے گھروں کے دروازے ہیں- ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سواسب کے دروازے بند کر دیئے جائیں- اس کے بعد منبر سے اترتے ہوئے فرمایا-

انی لا اعلم احدا" کان افضل فی الصحبۃ عندی ید امنہ وانی لوکنت متخذ امن العباد خلیلا" لا تخذت ابابکر خلیلا- ولکن صحبۃ واخاء ایمان حتی یجمع اللہ بین عندہ-

دوستو! مجھ پر کسی کا احسان ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے برابر نہیں- اگر میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو اپنا خلیل بنانے کا مجاز ہوتا تو یہ منزلت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے ہوتی- لیکن از روئے اسلام مجھے باہمی رفاقت و اخوت ایمانی تک اختیار ہے اور اسی حالت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری ہے-

انصار کے حق میں وصیت!

یا معشر المہاجرین! استو صوابا لانصار خیرا" فان الناس یزیدون والانصار علی ہئیتہا لا تزید وانہم کانوا عیبتی التی اویت الیہا فاحسنوا الی محسنہم وتجاوزوا عن سیئہم!

اے مہاجرین انصار کے ساتھ بہتر سلوک کرنا- ان کے سوا دوسروں کی تعداد بڑھتی جائے گی- انصار میرے ایسے محرم ہیں جن کے دامن میں مجھے پناہ ملی ان کی خوبیوں کی قدر اور ان کی لغزشوں سے چشم پوشی کرتے رہنا-

مسجد سے نکلے تو عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر ہی میں تشریف فرما ہوئے- آج کی جدوجہد اور مسجد میں تشریف لے جانے سے مرض بڑھا اور تھکن زیادہ ہو گئی- وہ مریض جن کے بدن پر سات مشکیزے ڈالے گئے پھر بھی یکسوئی نصیب نہ ہوئی ہو- جنہیں اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فکر! انصار کا غم! اور ملت جو ابھی ابھی اسلام سے وابستہ ہوئی اس کا فکر مآل! یہی تفکرات دوسرے روز بھی مسجد میں تشریف لانے کے محرک بنے- لیکن مرض نے اتنا کمزور کر دیا تھا کہ ارادہ پورا نہ فرما سکے اور قیام صلوٰۃ کا وقت سر پہ آ گیا- دوستوں سے فرمایا-

مرو ابوبکر فلیصل الناس- ابوبکر سے کہو میری جگہ قیام صلوٰۃ کی امامت وہ فرمائیں- لیکن ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا جو دنیا و جہان سے زیادہ آپ کو صحت مند دیکھنا چاہتی تھیں- عرض کیا ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رقیق القلب ہیں- ان کی آواز بھی مدھم ہے- اور قرأت میں گریہ پہ

بھی ضبط نہیں کر سکتے اس پر بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی کے لئے امامت الصلوٰۃ کا حکم قائم رکھا۔ ادھر ام المومنین رضی اللہ عنہا نے اپنے پہلے اندازے کے مطابق اپنے والد گرامی کی طرف سے معذرت کے ارادہ سے پھر دہرایا۔ مگر اس وقت بھی آپ نے فرمایا۔

انّ کن صواحب یوسف مروہ فلیصل الناس۔ تم گویا حضرت یوسف کی ہم جلیس ہو۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہو میری جگہ وہ امامت کرائیں۔ (واللہ اعلم بالصواب)

اور ایسا ہی ہوا مگر ایک دن ایک موقع پر جب ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ابھی مسجد میں تشریف نہیں لائے تھے کہ بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کی بجائے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امامت کی درخواست کی۔ عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز اتنی گرجدار تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں سن لی اور فرمایا۔

این ابوبکر؟ یابی اللہ ذالک والمسلمون۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہاں رہ گئے۔ اللہ اور تمام مسلمان ناپسند کرتے ہیں کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا کوئی اور نماز پڑھائے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ فرمان سن کر بعض مسلمانوں نے سمجھ لیا کہ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا نائب خلیفہ مقرر کرنا چاہتے ہیں کیونکہ نیابتِ رسالت کا سب سے بڑا مظہر قیام صلوٰۃ کی امامت ہے۔ جس کی تاکید اسی شدومد سے فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلافت کا حقدار ہونے کی دلیل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہی دلیل پیش کی۔

لحہ لحہ مزاج زیادہ ناساز ہوتا گیا۔ تپ کی شدت بڑھ گئی۔ چہرہ مبارک چادر سے ڈھانک دیا گیا۔ ازواج مطہرات یا دوسرے تیماردار جب جبینِ مبارک پر ہاتھ رکھتے تو شدّتِ حرارت محسوس کر کے حیران رہ جاتے۔

سیدہ فاطمہ سے اپنی وفات کا راز

لختِ جگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بار بار تیمار داری کے لئے تشریف لاتیں۔ اولاد میں سے صرف سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا ہی رہ گئی تھیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے بے حد محبت فرماتے۔ جب تشریف لاتیں استقبال کے ساتھ آپ رضی اللہ عنہا کے ماتھے کا بوسہ لیتے' اپنی مسند پر نشست کا اعزاز عطا فرماتے۔ سیدہ شدّتِ علالت میں بھی آتیں تو بھی ان معمولات میں کوئی فرق نہ آتا۔ اسی درمیان میں ایک دن انہیں اپنے پاس بٹھا کر ان کے کان میں کچھ کہا۔ تو وہ رو پڑیں۔ دوسری مرتبہ ان کے کان میں کوئی بات کہی تو وہ ہنس دیں۔ ام المومنین عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا نے ان سے رونے اور ہنسنے کا سبب دریافت فرمایا تو فاطمہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا۔

ماکنت لافشی سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے جو

بات راز کے طور پر بتائی ہے اس کے افشاء کرنے کا یہ موقع نہیں۔

لیکن رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا نے خود ہی بتا دیا۔ کہ "اس روز میرے رونے کا سبب یہ تھا کہ آپ ﷺ نے مجھے اپنی موت کی خبر سنائی تھی اور دوسری بار میرے ہنسنے کا سبب یہ تھا کہ آپ ﷺ نے مجھے یہ بشارت دی کہ خاندانِ نبوت میں سب سے پہلے مجھے ہی رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گا تو میں خوشی سے ہنس پڑی۔"

بے چینی کی شدت

رسول اللہ ﷺ کو تپ کی شدت نے اس قدر نڈھال کر دیا کہ آپ کے فرمانے کے مطابق پانی کسی بڑے برتن میں رکھ دیا گیا۔ آپ پانی میں ہاتھ ڈالتے اور جبین مبارک اور چہرہ کو تر کرتے! بار بار غشی کے دورے اٹھتے ذرا افاقہ ہوتا تو شدتِ کرب سے کراہ اٹھتے۔

فاطمہ رضی اللہ عنہا کا "واکرباہ"

اپنے شفیق باپ کی یہ حالت دیکھ کر اس قدر متاثر ہوئیں کہ بے ساختہ واکرب ابتاہ" "آہ میرے باپ کی جان پر کیا بیت رہی ہے" نکل گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنی لختِ جگر کی آواز سنی تو فرمایا۔ بیٹی! آج کے بعد تمہارے باپ پر کوئی جسمانی سختی نہیں ہو گی!

صحابہ رضی اللہ عنہما نے آپ کا غم غلط کرنے کے لئے عرض کیا۔ یا رسول اللہ ﷺ دوسرے مریضوں کو تو آپ صبر کی تلقین کرتے رہے ہیں۔ فرمایا درست ہے مگر میری تکلیف دو مریضوں کے برابر ہے۔

واقعۂ قرطاس

دولت کدۂ رسول ﷺ پر تیمار داروں کا ہجوم تھا۔ فرمایا

ائتونی بدواۃ واصحیفۃ اکتب لکم کتاباً لا تضلوا ابداً"

کاغذ اور دوات لے آؤ میں تمہاری بہتری کے لئے ایسی تحریر کرا دوں جس سے تم کج روی سے بچ جاؤ گے!

ہمارے لئے اللہ کی کتاب کافی ہے

حاضرین میں سے ایک صاحب نے عرض کیا۔ (جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے)

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد غلبہ اللہ وجع وعندکم القرآن۔ وحسبنا کتاب اللہ!

اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ تکلیف سے دوچار ہیں۔ مسلمانو! ہمارے پاس قرآن مجید موجود ہے وہی ہمارے لئے کافی ہے۔

بعد میں اس حادثہ پہ دو رائیں ہو گئیں۔ بعض نے اسے ضروری سمجھا اور دوات کاغذ پیش کرنے کا مشورہ دیا۔ بعضوں نے کتاب اللہ کے کامل ہونے کی بناء پر اسے زیادہ اہمیت نہ دی۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے یہ رنگ دیکھ کر فرمایا۔ نبی کے سامنے اس قسم کا غوغا نامناسب ہے۔ آپ حضرات میرے پاس سے ہٹ جائیں۔

واقعہ قرطاس پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ کی رائیں

جناب عباس رضی اللہ عنہ کی رائے!

"ان لوگوں نے کیسی غفلت برتی جو بیش قیمت نصائح سے محروم رہ گئے' کاش رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ سے املا کرانے میں جلدی کرتے!"

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی رائے!

"نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ کی رحلت کے بعد بھی اپنی اس رائے کی تحسین فرماتے رہے۔ اس لئے کہ قرآن اپنے متعلق "مافرطنا فی الکتاب من شیئی" فرماتا ہے۔

ایک تیسری رائے بھی ہے۔ مولف نے اس سے اغماض برتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بعض سیرت نگار اس واقعہ سے انکار کرتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ کے فرمان کو ٹالنے والا اور وہ بھی ایسی بیماری کی حالت میں جس میں بیمار کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کی خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ نے ہدایت فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ کے فرمان کو ٹالنا--- اور وہ بھی عمر فاروق رضی اللہ عنہ ٹالیں۔ نہ صرف وہ ٹالیں بلکہ تمام حرم موجود--- ہیں' عمر فاروق اور دوسرے سب لوگ نکال دیئے گئے ہیں (بقول مولف) تو اس کے بعد بھی کسی کو فرمان رسول کی تعمیل کا خیال نہ آیا۔ گویا سب نافرمان ہو گئے نعوذ باللہ! اور قرآن حکیم فرماتا ہے۔ ہمارا رسول جو تمہیں حکم دے وہ قبول کرو اور جس سے منع کریں اس سے منع ہو جاؤ--- قرآن ہی کا یہ حکم سب بھول گئے؟

دوسری دلیل یہ بھی ہے کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ دوسرے دن صبح کی صلوۃ میں شامل ہوتے ہیں اور خود مؤلف ان کے ارشادات کو قلمبند کرتے ہیں آپ اسے پڑھ کر خود فیصلہ کریں کہ اس وقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ اس اختیار میں تھے کہ قلم اور دوات منگوا کر جو اس وقت لکھوانا چاہتے تھے وہ اب لکھوا دیتے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ (مترجم)

(تسلسل کتاب) علامت تشویشناک حد تک آ پہنچی۔ اور خبر دور دور تک پھیلی۔ جیش فلسطین جو

شام کے سپہ سالار اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے ہمراہی مجاہدین کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دولت کدہ پہ حاضر ہوئے۔ لیکن اب بات کی تاب نہ تھی لیکن اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا تو ان کے سر پہ ہاتھ رکھا۔ آسمان کی طرف دست مبارک اٹھایا پھر وہی ہاتھ اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سر پہ رکھ دیا۔ گویا اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لئے دعا کی علامت تھی۔

معالجہ

یہ دیکھ کر اہل بیت کی توجہ معالجہ کی طرف متوجہ ہوئی۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا کی قرابت دار جناب اسماء رضی اللہ عنہا حبشہ کے زمانہ ہجرت میں ایک شربت بنانے کی ترکیب معلوم کر رکھی تھی۔ وہی شربت غشی کی حالت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دہن مبارک میں ٹپکایا۔ ذرا افاقہ ہوا تو شربت پلانے کا سبب دریافت فرمایا۔ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذات الجنب کے شبہ کی بناء پر شربت کے چند قطرے دہن مبارک میں ٹپکائے ہیں۔ فرمایا۔ مجھے تو اللہ تعالیٰ نے ذات الجنب سے محفوظ فرمالیا ہے۔ پھر فرمایا مناسب یہ ہے کہ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سوا ہر اس شخص کے گلے میں ٹپکا دیا جائے جو یہاں موجود ہے۔ حتیٰ کہ ام المومنین میمونہ رضی اللہ عنہا جو اس روز روزہ دار تھیں ان کا بھی استثناء نہ فرمایا؟

آخری پونجی کا صدقہ

شدتِ علالت میں آپ کی آخری پونجی پانچ دینار تھے یہ سوچ کر کہ شاید اللہ کا پیغام آ جائے اور یہ رقم میرے پاس رہ جائے اسے فوراً صدقہ کرنے کا حکم عطا فرمایا۔ لیکن اہل بیت تیمار داری میں ایسے منہمک تھے کہ تعمیل کرنا ذہن سے اتر گیا۔ زندگی کے آخری روز دو شنبہ کو غشی سے افاقہ ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دیناروں کے بارہ میں دریافت فرمایا تو ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا نے معذرت کرتے ہوئے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے فرصت نہیں ملی۔ دینار ابھی تک میری ہی تحویل میں ہیں۔ ان سے لیکر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ماظن محمد بربہ لولقی وعندہ ھذہ۔ اگر یہ دینار میری تحویل میں رہ جائیں تو میں اپنے رب کے متعلق کیا گمان لے کر اس کے سامنے حاضر ہوں گا۔

بہرحال رات سکون سے گزری' تپ سے افاقہ نظر آنے لگا' سمجھا گیا اسی دوا کا اثر ہے۔ جو اہل بیت نے آپ کو پلائی تھی۔ صبح کے وقت پٹی باندھے ہوئے مسجد میں تشریف لائے۔ علی ابن ابی طالب اور فضل ابن عباس دونوں کے کندھوں پہ ٹیک لگا رکھی تھی۔ (یہاں بھی اتنی اہم املا جو امت کو گمراہی سے بچانے والی تھی لکھوانا چاہتے تھے ابن عباس علی ابن ابی طالب کی موجودگی میں یاد نہ آئی؟)

ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اقتدا میں صلوٰۃ

فجر کی نماز شروع ہو چکی تھی۔ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ امامت فرما رہے تھے۔ جب صحابہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ورود کا احساس ہوا تو ہر ایک کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اور آپ کے مصلیٰ پر لے جانے کے لئے راستہ بنا دیا۔ مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشارہ سے بتا دیا کہ صلوٰۃ میں خلل نہ ہونے پائے اور خود مسلمانوں کو اس خشوع و خضوع کے ساتھ صلوٰۃ ادا کرتے ہوئے دیکھ کر بہت ہی مسرور ہوئے۔

ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو محسوس ہوا کہ مقتدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی وجہ سے آپ کے مصلیٰ تک پہنچنے کے لئے راستہ بنا رہے ہیں تو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے مصلیٰ خالی چھوڑ کر پچھلی صف میں لوٹ آنے کا قصد کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی پشت پر ہاتھ رکھ کر فرمایا۔ "صل بالناس" اے ابو بکر آپ ہی امامت کرائیے۔ اور خود ان کی اقتدا میں دائیں طرف بیٹھ کر نماز ادا کی۔

ادائے صلوٰۃ کے بعد تذکیر

تکمیل نماز کے بعد رخ مبارک نمازیوں کی طرح فرمایا اور ایسی بلند آواز سے جو مسجد سے باہر بھی سنی گئی۔ فرمایا۔

سعرت النار' واقبلت الفتن' کقطع الیل المظلم وانی واللہ! ماتمسکون علی سئی! انی واللہ لم احل الا ما احل القرآن ولعن قومنا" اتخذو اتبور انبیاء ھم مساجد۔

آگ دہک اٹھی ہے۔ اندھیری رات کی مانند فتنے یکے بعد دیگرے اڑتے چلے آ رہے ہیں۔ اللہ کی قسم تمہیں میرے فرمان کے سوا کسی اور کے فرمان سے تمسک نہ کرنا چاہئے۔ میں اس پر بھی اللہ کی قسم کھاتا ہوں کہ میں نے قرآن ہی کی حرام کردہ چیزوں کو حرام قرار دیا۔ اور اللہ اس قوم پر لعنت کرے جس نے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا۔

(یہاں بھی کاغذ اور دوات کی یاد نہ آئی اور ایسی اہم املا جو ملت اسلامیہ کو گمراہ ہونے سے بچائے اسے ہادئ دوجہاں رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنہیں زندگی کے کسی لمحہ میں بھی انسانیت کی بھلائی نہ بھولی ہو' وہ بھول جائیں حیرت ہے اس سوچ پر! مترجم) مسلمانوں نے فجر کی نماز کے بعد یہ ہدایات سن کر سمجھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحت یاب ہو گئے ہیں۔ وہ بہت زیادہ محظوظ ہوئے یہاں تک اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جیش شام کی رخصت چاہی اور ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے آپ کی صحت عود کر آئی ہے۔ آج کا دن بنت خارجہ کی نوبت ہے۔ اجازت ہو تو میں ان کو آپ کی صحت کی

بشارت سنا آؤں۔ فرمایا اجازت ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور عمر رضی اللہ عنہ اپنے کام کاج میں مصروف ادھر ادھر چلے گئے۔ لیکن رات ابھی پورے طور پہ نہ پڑی تھی کہ مزاج کی ناسازی' تپ کی سختی اور غشی کے دوروں کی خبریں پھیلنا شروع ہو گئیں اور رسول اللہ ﷺ عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں ہی پڑے رہنے پہ مجبور ہو گئے۔

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا کا حزن و ملال

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا جن کا دل ایسے عظیم المرتبت وجود اللہ تعالیٰ کے بعد بزرگ و برتر وجود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے احترام جلالت سے لبریز تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی نقاہت دیکھ کر چاہتی تھیں کہ آپ ﷺ کی زندگی کے عوض میں اپنی جان قربان کر دوں! آہ آنحضرت ﷺ کا اس ہمت کے ساتھ مسجد میں تشریف لے جانا گویا ایسا سنبھلنا تھا جو مریض کے لئے افاقۃ الموت کے مترادف ہو اور مسجد سے واپسی کے بعد ہر لحہ نقاہت بڑھتی جا رہی تھی اور یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کسی پل بھی روح اقدس جسد عنصری سے پرواز کر جائے۔

اس وقفہ کے درمیان ذہن مبارک زندگی کے ان لمحات کا تصور کر رہا تھا جس میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبی و ہادی کا مرتبہ بخش کر مبعوث فرمایا؟ پھر منصب نبوت کی ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہوئے جن صعوبتوں سے واسطہ پڑتا رہا۔ ان کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ یا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں سے سرور حاصل ہو رہا تھا جن سے تبلیغ نبوت کی وجہ سے متمتع ہوئے تھے۔ یا دین حق کی مقبولیت نے اہل عرب کے دلوں کو جس طرح مسخر فرمایا اس کی خوشی سے مستفیض ہو رہے تھے۔ یا زندگی کے ان آخری لمحوں میں اللہ تعالیٰ کے حضور میں توبہ و انابت کی طرف رجوع فرماتے جیسا کہ زندگی بھر کا معمول رہا۔ یا جان کنی کی دشواریوں سے گھبرا کر پوری زندگی کے حوادث کو فراموش کر دیا گیا۔ ہر ایک واقعہ پر روایات کا اختلاف نمایاں ہے!

دنیا کا آخری عمل (مسواک) دہن مبارک کی صفائی

اسی اثناء میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کے خاندان کے ایک صاحب اپنے ہاتھ میں مسواک لئے داخل ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف اس انداز سے دیکھا جیسے وہ مسواک طلب فرما رہے ہوں۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا نے ان کے ہاتھ سے مسواک لی اور اپنے دہن مبارک میں چبائی۔ جب اس کے ریشے نرم ہو گئے تب آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش کی جس سے خود دہن مبارک صاف فرمایا۔ جاں کنی کی کشمکش آخری مرحلہ پہ پہنچ چکی تھی۔ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو کر الحاح فرمایا۔

اللھم اعنی علٰی سکرات الموت! اے اللہ عزوجل اس جاں کنی کے عالم میں میری مدد فرمایئے۔

آغوشِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں دنیا سے رحلت

اس وقت سرور کائنات احمد و محمد سراج و منیرؐ مزمل و مدثر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سر مبارک ام المومنین رضی اللہ عنہا کی آغوش میں تھا۔ اس حالت کے تذکرہ میں فرماتی ہیں۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میری گود بوجھ سے دبی جا رہی ہے۔ میں نے چہرہ اقدس پر نگاہیں جمائیں تو آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں اور زبان پر بل الرفیق الاعلٰی اپنے رب رفیق اعلٰی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا۔ اللہ کی قسم جس نے آپ کو رسول صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کا منصب عطا فرمایا۔ جب آپ کو دنیا اور عقبٰی دونوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو آپ نے عقبٰی کو ترجیح دی۔

روح مقدس اسی حالت اور میری گود ہی میں ٹیک لگائے ہوئے رفیق اعلٰی کی جانب سدھاری۔ یہ ایک وجہ میرے لئے خصوصی اعزاز کی مستحکم دلیل ہے جس کے اظہار سے مجھے کسی کی توہین مقصود نہیں۔ ایسے ہی ہوا۔ رسول اللہ ﷺ کا میری گود میں جاں بحق ہونا اللہ تعالٰی تیرا شکر میری یہ منزلت!

رسول اللہ ﷺ کی حیات مبارک اس جسدِ عنصری سے لاتعلق ہو گئی تو آپ کے سر مبارک کے نیچے تکیہ رکھ کر انتہائے غم میں سر جھکائے ایک طرف کھڑی ہو گئیں۔

ان لمحات میں مسلمانوں میں عجیب اضطراب پیدا ہو گیا۔ بعض حضرات کو آپ کے وفات پانے کا تذکرہ بھی سننا گوارا نہ تھا۔ ایسے لوگوں کا خیال تھا کہ آپ نے وفات نہیں پائی۔ یہ مسئلہ حدِ نزاع تک پہنچنے کو تھا کہ ربِّ کائنات الہ العالمین نے جو مسلمانوں سے حسنِ سلوک کا خواہاں تھا اس فتنہ کا انسداد کر دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین

اس صبح کے اجالے بے جان تھے

اس روز جو لوگ مسجد میں تھے یہ خبر سن کر حیرت میں ڈوب گئے۔ گزشتہ دن کی صبح تو۔۔۔۔ ان لوگوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بآواز بلند ہدایات دیتے ہوئے سنا تھا۔ صحت مند محسوس کیا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ام المومنین زینب بنت خارجہ رضی اللہ عنہا کو بلانے تشریف لے گئے تھے۔ اسی اطمینان کی بناء پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوڑے ہوئے حجرے میں آئے جہاں جسد مبارک ابدی نیند میں محو استراحت تھا۔ اسی وجہ سے عمرؓ کو آپ کی وفات پر یقین نہیں آتا تھا۔ رُخِ انور سے ردائے مبارک ہٹائی تو سانس کی ذرا سی رمق نہ ہونے کے باوجود حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسے غشی تصور کر لیا۔ یہ سوچا کہ ذرا دیر بعد انشاء اللہ ہوش میں آ جائیں گے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بہت سمجھایا مگر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رحلت کا یقین نہیں آتا تھا۔

بلکہ حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اصرار کرنے پر ان کو ڈانٹ دیا۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہو گیا ہے؟"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر

انہی جذبات میں ڈوبے ہوئے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مسجد میں آئے۔ مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ساتھ تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تقریر شروع کر دی۔

ان رجالا من المنافقین یزعمون ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قد توفی وانہ واللہ مامات ولکن انہ ذھب الی ربہ کما ذھب موسی بن عمران فقد غاب عن قومہ اربعین لیلۃ ورجع الیھم بعد ان قیل قد مات واللہ لیرجعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کما رجع موسی فلیقطعن ایدی رجال وارجلھم زعموا انہ مات۔

منافق افواہ اڑا رہے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے ہیں۔ نہیں بلکہ موسیٰ بن عمران کی طرح اللہ کے حضور تشریف لے گئے ہیں۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے چالیس روز تک غائب رہنے کے بعد دوبارہ واپس تشریف لے آئے۔ ان کے غائب رہنے کے عرصہ میں بنی اسرائیل نے بھی یہی کہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات ہو گئی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی رجعت فرما ہوں گے۔ اور جس جس نے نبی کریم کی وفات کی خبر پھیلائی ہے۔ نبی اکرم ﷺ واپسی پر اس کے ہاتھ اور پاؤں قلم کروا دیں گے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر پر سامعین کا ردعمل

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر سن کر مسلمان شش و پنج میں پڑ گئے۔ کبھی سوچتے کہ اگر رسول رحمت ﷺ رحلت فرما چکے ہیں تو یہ ہمارے لئے کتنا بڑا المیہ ہے۔ درحقیقت یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے نبی اکرم ﷺ کو زندگی میں دیکھا۔ آپ ﷺ کے حسنِ تکلم سے فیض یاب ہوئے۔ آپ ﷺ کی تعلیم کے اثر سے اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان لائے۔ وہ اللہ تعالیٰ جس نے آپ ﷺ کو سچا دین دے کر اس دنیا میں مبعوث فرمایا۔ آج ان مسلمانوں کے ذہن میں رسول صادق و امین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تصور گردش کر رہا تھا۔ ان کے اس تصور کے مقابلہ میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر تھی۔ لیکن حضرت موسیٰ کی طرح ان کی واپسی تو اور بھی حیرت انگیز تھی۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ارگرد جمع ہو گئے تھے وہ اس بات کی تصدیق پر مائل ہو گئے تھے کہ رسول اللہ ﷺ کا واقعہ ہی انتقال نہیں ہوا۔ ان کے دماغ میں یہ بھی گھوم رہا تھا کہ تھوڑی ہی دیر پہلے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو صحیح و تندرست دیکھا تھا۔ آپ ﷺ کی زبانِ مبارک سے دعا اور استغفار کے کلمات اپنے کانوں سے سنے تھے۔ مسلمانوں کی یہ سوچ بھی تھی کہ رسول اللہ ﷺ تو اللہ تعالیٰ کے خلیل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ذات نے ان کو اپنی رسالت کے لئے منتخب فرما لیا۔ تمام عرب نے آپ ﷺ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔ اس ذات پر موت واقع ہو سکتی ہے؟ ان کے دماغ میں یہ بات بھی تھی کہ ابھی تک قیصر و کسریٰ کو شکست نہیں ہوئی۔ سب سے بڑا مؤثر یہ احساس تھا کہ ایک ایسا عظیم الشان عظیم الاخلاق اور عظیم المرتبہ عالم ﷺ جس نے بیس سال کے اندر اندر بڑے بڑے سرکش باغیوں کو اپنا مطیع و فرماں بردار بنا لیا ہے اس پر موت کیسے وارد ہو سکتی ہے۔ عورتیں فرطِ غم میں پریشان حال رو رہی تھیں۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی واپسی

اس افراتفری میں ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہٗ سنخ سے واپس آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وصال کی پر آشوب خبر ملی تو کلیجہ تھام کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہٗ کی مذکورہ تقریر سنی تو سیدھے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ میں داخل ہونے کی اجازت چاہی۔ حکم ہوا آج ہر شخص بلااجازت آ سکتا ہے۔ دالان میں ایک طرف جسد رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رکھا تھا۔ یمن کی خط دار چادر سے چہرۂ مبارک ڈھپا ہوا تھا۔ ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہٗ نے دامن ہٹا کر پیشانی مبارک کا بوسہ لیا۔ زبان مبارک سے یہ کلمہ کہا۔ ما الطیبک حیا! وما اطیبک میتا" آپ کا جسد مبارک زندگی میں جتنا عطر بیز تھا مرنے کے بعد بھی ویسی ہی خوشبو بکھیر رہا ہے! اپنے دونوں ہاتھ رخ انور کا ہالہ بنائے اور سر مبارک ذرا سا تکیہ سے اٹھا کر دیکھا تو چہرہ کا نور ویسے کا ویسے ہی روشنی بکھیر رہا تھا۔ بے ساختہ کپکپاتے ہونٹوں سے کہا۔

با بی انت وامی! اما الموتۃ التی کتب اللہ علیک فقد ذقتھا ثم لن تصیبک بعد ھا موتہ ابدا"

میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ اللہ کی طرف سے لکھی ہوئی آپ پر وارد ہو چکی اب آپ کے لئے دوبارہ وفات پانے کا امکان نہیں۔

اس کے بعد سر مبارک کو تکیہ پر جس طرح رکھا ہوا تھا' رکھا اور چہرۂ مبارک پر چادر کا دامن اوڑھایا' مسجد میں تشریف لے گئے۔ جہاں حضرت عمر رضی اللہ تعالٰی عنہٗ کی تقریر جاری تھی۔ وہ مسلمانوں کو یقین دلا رہے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وصال نہیں ہوا۔ لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہٗ کے لئے راستہ چھوڑا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہٗ کی تقریر

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہٗ نے مجمع کو اپنی طرف متوجہ کیا اور کہا میں جو کچھ کہتا ہوں اسے غور سے سنو! ظاہر ہے۔ ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہٗ کا ہم پلہ کون ہو سکتا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صداقت کے ایسے تصدیق کرنے والے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تھا کہ اگر میں کسی کو خلیل بنانے کا مجاز ہوتا تو ابوبکر رضی اللہ تعالٰی عنہٗ کے سوا کوئی اور نہ تھا جب تمام لوگ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہٗ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ تو ممدوح نے اللہ تعالٰی کی مختصر حمد وثنا کے بعد کہا۔

یا ایھا الناس ان من کان یعبد محمدا" فان محمدا قدمات فمن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت۔

لوگو۔۔۔۔ جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عبادت کرتا تھا۔ اسے معلوم ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وفات پا چکے اور جو شخص اللہ عزوجل کا عبادت گزار تھا وہ سن لے کہ اللہ تعالٰی ہمیشہ زندگی عطا کرنے والا

ہمیشہ زندہ رہنے والا اور کبھی نہ مرنے والا ہے۔

اس کے بعد یہ آیات تلاوت فرمائیں۔

من کان یعبد اللہ فان اللہ حی لایموت وما محمدالارسول قد خلت من قبلہ الرسل افان مات اوقتل انقلبتم علی اعقابکم ومن ینقلب علی عقبیہ فلن یضر اللہ شیئا" سیجزی اللہ الشاکرین" (144:3)

محمد (ﷺ) اللہ تعالیٰ کے صرف رسول ہیں اور ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں (جو اپنے وقتوں میں ظاہر ہوئے اور اپنی دعوت دے کر دنیا سے رخصت ہو گئے) پھر اگر ایسا ہو کہ وہ وفات پائیں اور انہیں ایک دن وفات پانا ہی ہے۔ یا فرض کرو۔۔۔۔۔۔ اگر لڑائی میں قتل ہو جائیں۔ تو کیا تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔ اور جو راہ حق سے الٹے پاؤں پھر جائے گا وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔ وہ اللہ تعالیٰ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا مگر جو لوگ شکر گزار ہیں اللہ تعالیٰ جلد ہی ان کو اجر دے گا۔

یہ آیت سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاؤں لڑکھڑا گئے وہ گر پڑے اور انہیں یقین آ گیا کہ آپ ﷺ کا رفیقِ اعلیٰ سے وصال ہو چکا ہے۔ مجمع کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ ان کے دماغ میں رسول اللہ ﷺ کی وفات کا نقش قائم ہو گیا۔ ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے "رفیقِ اعلیٰ" سے وصال کو ترجیح دی ہے اور رفیقِ اعلیٰ نے بھی اپنی رحمت کا دامن آپ ﷺ پر پھیلا دیا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فہم پر تبصرہ

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کی وفات سے انکار کیا عمداً" تھا۔ نہیں۔ ان کے انکار کی مثال میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ دور کے اربابِ علم کی تحقیق کے مطابق آفتاب اپنی روشنی اور حرارت بتدریج کھوتا جا رہا ہے۔ اور ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ چمکتا سورج سیاہ ہو جائے گا گرمی سرد ہو جائے گی لیکن سورج کی اس حالت کا یقین کرنا شک کے بغیر ناممکن ہے۔ ایسا سرچشمۂ نور جس کی روشنی اور حرارت دنیا کے ہر ذرہ کی بقا کا سبب ہو وہ ایسا بے جان ہو جائے گا کہ اس کی روشنی تاریکی میں بدل جائے گی۔ گرمی بے جان پتھر بن جائے گی اور اس پر طرفہ یہ کہ دنیا اس کے بعد بھی ایک دن قائم رہے گی۔

میں کہتا ہوں محمد ﷺ نورِ ہدایت و ایمان اور قوت کے لامحدود اوصاف کے مالک ہوتے ہوئے آفتاب عالم تاب سے کم نہ تھے۔ جس طرح سورج کی روشنی تمام عالم پر ہے اسی طرح محمد ﷺ کی رحمت، برکت، حکمت، دعوت اور علمِ وحی کے نور سے تمام دنیا منور

ہے۔ جس طرح آفتاب کائنات کے استقرار (ٹھہراؤ) کا سبب ہے اسی طرح محمد ﷺ اپنی صفات کی وجہ سے برکت و رحمت کا باعث ہیں۔ جن کے تذکرہ سے تمام عالم کون و مکاں کی رونق قائم ہے۔

لٰہذا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ یقین کر لینا کہ رسول اللہ ﷺ کی موت ممکن نہیں ان معنوں میں قابلِ تسلیم ہے کہ آنحضرت ﷺ اس وقت بھی اپنی صفات کی وجہ سے زندہ تھے۔ زندہ رہیں گے۔ ان پر موت وارد نہیں ہو سکتی۔

جیشِ اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جرف سے واپسی

حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اس روز کی صبح کو مسجد میں دیکھ کر صحت یاب محسوس کیا اور سمجھ لیا کہ اب آپ تندرست ہو گئے ہیں۔ اپنے تمام مجاہدین کے ساتھ واپس مقام جرف کو لوٹ گئے اور تقریباً کوچ کا حکم دینے کو تھے کہ پھر یہ جانکاہ خبر ملی تو غم و اندوہ سے بوجھل مجاہدین کے ساتھ واپس مدینہ منورہ آ گئے۔ علم عائشۃ الصدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کے سامنے نصب کر دیا۔ مسلمانوں نے فیصلہ کے انتظار میں سفر ملتوی کر دیا۔

سقیفہ بنی ساعدہ اور تاسیسِ خلافت

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر نے لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کے وصال کا یقین دلا دیا تھا۔ مسلمان بیحد پریشان تھے۔ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے مگر ایک گروہ محلہ بنو سقیفہ بنی ساعدہ میں حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاں جمع ہوا اور مہاجرین میں سے چند حضرات اسید بن حضیر کی معیت میں محلّہ بنی اشہل ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، زبیر بن العوام رضی اللہ تعالیٰ عنہ، اور طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ جناب فاطمہ رضی اللہ عنہا کے دولت کدہ میں آ کر ایک طرف بیٹھ گئے۔ اس اثناء میں سقیفہ سے اطلاع آئی کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سقیفہ میں میں انصار کا مجمع لگا رکھا ہے۔ اطلاع دینے والے نے کہا اگر آپ دونوں (ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ) امت کی بھلائی چاہتے ہیں تو انصار کے فیصلہ سے پہلے سقیفہ بنی ساعدہ میں پہنچ جائیے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سقیفہ پہنچنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ ہمیں وہاں جا کر دیکھنا چاہیئے کہ ہمارے انصار بھائی کیا کر رہے ہیں۔ دونوں بنو سقیفہ کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں انہیں دو نیک فطرت انصار ملے جو اس مجمع سے ہی آ رہے تھے ان دونوں نے سقیفہ میں جمع ہونے والوں کے مقاصد بیان کیے۔ جب ان دونوں سے ان کی رائے پوچھی گئی تو انہوں نے کہا کہ آپ کو سقیفہ میں جانے کے بجائے مہاجرین کے مستقبل کا خیال

کرنا چاہیے۔

دونوں انصار نے حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے تبادلہ خیال کے بعد کہا کہ آپ مہاجرین سے مل کر اپنا معاملہ طے کیجیے لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا کہ اب ہم سقیفہ ضرور جائیں گے۔

سقیفہ پہنچ کر دیکھا کہ ایک صاحب چادر میں لپٹے ہوئے زمین پر پڑے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دریافت کیا تو معلوم ہوا یہ سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ ان کا مزاج کچھ ناساز ہے۔

اس اثناء میں ایک انصار نے تقریر شروع کی۔ حمد و ثنا کے بعد فرمایا۔ لوگو۔۔۔۔ سب کو علم ہے کہ ہم انصار اللہ ہیں۔ اور مسلمانوں میں جنگ آزمودہ بہادر ہیں۔ اے مہاجر دوستو! آپ لوگوں کو ہم انصار کا ایک فوجی دستہ ہونے کی حیثیت حاصل ہے مگر افسوس ہے کہ آپ لوگوں کی مختصر جماعت نے مدینہ میں ہماری جڑیں کاٹ کر ہمیں اپنے ماتحت رکھنے کا منصوبہ بنانا شروع کر دیا۔ یہ تقریر سننے کے بعد عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس فتنہ کے انسداد کا فیصلہ کر لیا لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کی سخت کلامی کی وجہ سے انہیں روک کر خود انصار سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

ایھا الناس! نحن المہاجرون اول الناس اسلاما" واکرمھم احسابا" واوسطھم دارا" واحسنھم وجوھا" واکثرھم ولادۃ فی العرب وامسھم رحما برسول اللہ۔

دوستو۔ بیشک ہم مہاجر ہیں۔ مگر سب سے پہلے مشرف باسلام ہم ہوئے۔ ملک کے تمام باشندوں میں سے حسب و نسب کے لحاظ سے مقتدر ہیں ہمارا مولد مکہ معظمہ ہے۔ عرب کے ہر قریہ و شہر سے ممتاز۔ دوسروں کے مقابلہ میں عمدہ ترین خوبیوں کا مجموعہ ہیں۔ تعداد میں عرب قبائل سے زیادہ اور قرابت میں ملک کے ہر خاندان سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب تر!

اسلمنا قبلکم وقدمنا فی القرآن علیکم فقال تبارک وتعالیٰ والسابقون الاولون من المہاجرین ولانصار والذین اتبعوھم باحسان والسابقون الاولون من المہاجرین والانصار الذین اتبعوھم باحسان۔ فمن المہاجرون وانتم الانصار اخواننا فی الدین وشرکائنا فی الفی وانصارنا علی العدوا ماما ذکرتم فیکم من خیر فانتم لہ اھل وانتم اجدرنا بالثناء من اھل الارض جمیعا"۔

انصار دوستو۔ ہم نے آپ لوگوں سے پہلے اسلام قبول کیا۔ قرآن نے بھی ہمیں آپ کے مقابلہ میں اولیت قرار دی۔ واضح ہو کہ ہم مہاجر ہیں اور انصار ہمارے بھائی۔ جو غنیمتوں میں ہمارے حصہ دار ہیں اور جنگوں میں ہمارے معین و انصار ہیں۔ اور آپ نے اپنی جن خوبیوں کا اظہار کیا

ہے۔ ہم سب کو ان کا بھی اعتراف ہے بلکہ ہم تو یہاں سے تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا میں آپ لوگ ہی افضل ہیں۔

فاما العرب فلن تعرف هذا الامر الا بهذا الحی من قریش! فما الامراء و منکم الوزراء۔

لیکن عرب کا کوئی قبیلہ قریش کے علاوہ کسی کی امارت پر صاد نہیں کرے گا۔ اس لئے امیر قریش میں سے ہی ہو گا اور وزیر انصار میں سے!

انصار کی جوابی تقریر

حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی تقریر کے ختم ہونے کے بعد ایک انصاری غالباً حباب بن منذر نے جوش کے ساتھ کہا۔ انا جذیلها المحک و عذیقها المرجب منا امیر و منکم امیر یا معشر القریش

میں لکڑی کا وہ مضبوط ٹکڑا ہوں جسے اونٹوں کے طویلہ میں گاڑ دیا جاتا ہے اور ایسا درخت ہوں جس کی حفاظت کے لئے اس کے ارد گرد حفاظتی دیوار تعمیر کر دی جاتی ہے۔ یعنی امارت کے لئے میں موزوں ہوں۔

ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں کہہ چکا ہوں کہ امیر مہاجرین میں سے ہو گا اور وزیر انصار میں سے۔ اس اصول کی روشنی میں دو مہاجر حضرات کے نام پیش کرتا ہوں۔ اس موقع پر میں حضرت عبیدہ جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ (جو وہیں موجود تھے) کا نام اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا نام تجویز کرتا ہوں۔ ان میں سے جسے سب مسلمان پسند کریں اسے منتخب کر لیا جائے۔ اس مرحلہ پر شور بلند ہوا۔ اختلاف بڑھا تو عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باواز بلند ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے درخواست کی کہ آپ اپنا ہاتھ بڑھایئے اور ساتھ ہی حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کرتے ہوئے کہا۔

الم یامرک النبی بان تصلی انت یا ابابکر بالمسلمین! فانت خلیفه و نحن نبایعک فنبایع خیر من احب رسول اللّٰہ منا جمیعاً۔

کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو نماز پڑھانے کا حکم نہیں دیا تھا۔ اے ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس فرمان کے مطابق آپ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ ہیں اور ہم آپ کی بیعت کرتے ہیں۔ یقین ہے کہ جس کی بیعت کی جا رہی ہے وہ ہم سب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں زیادہ پسندیدہ اور محبوب ہے۔

مسجد نبوی میں تجدید بیعت!

چنانچہ دوسرے روز مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اجتماع ہوا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ منبر پر تشریف فرمائے ہوئے اور جناب عمرؓ نے سبقت فرماتے ہوئے مندرجہ ذیل تقریر کی۔

انی قد قلت لکم بالامس مقالۃ ماکانت ھما وجدتھا فی کتاب اللہ ولا کانت عھداً عھدہ الی رسول اللہ ولکنی قد کنت اری ان رسول اللہ سید بر امرنا ویبقی فیکون آخرنا وان اللہ قد ابقی فیکم کتابہ الذی بہ ھدی اللہ ورسولہ۔

محترم سامعین ـــــ کل جو کچھ عرض کیا۔ نہ وہ کتاب اللہ میں مذکور ہے نہ رسول اللہ ﷺ نے ان لفظوں میں میرے سامنے بیان فرمایا۔ میرا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ اس معاملہ میں کوئی خاص تدبیر فرما سکیں گے اور آپ کی رحلت ہمارے بعد ہو گی۔ دوستو! اللہ تعالیٰ نے ہمارے سپرد وہ کتاب فرمائی جس کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ نے رہنمائی کی۔ ہم نے بھی اس کتاب کے ساتھ تمسک کیا۔ ہمارے لئے کامیابی کی راہیں کھلیں۔ ہم میں سے بہتر شخص ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے ہمارا حاکم تفویض فرمایا۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کا ندیم ہونے کا شرف حاصل ہے۔ قرآن ہی میں ارشاد ہے۔

وثانی اثنین اذ ھما فی الغار۔ پس اے مسلمانو اٹھو اور ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیعت کرنے میں سبقت کرو۔

تقریر ختم ہونے کے ساتھ ہی ہر مسلمان نے ایک دوسرے سے سبقت کر کے بیعت شروع کر دی۔ گذشتہ کل کے بعد آج کی بیعت عامہ تھی اور اول الذکر بیعت خاصہ تھی۔

خلیفہ اول کی پہلی تقریر

بیعت کا مرحلہ ختم ہونے کے بعد خلیفہ اول بلافصل حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر رسول اللہ ﷺ پر تشریف لا کر تقریر ارشاد فرمائی۔ (جسے آیت حکمت اور فصل خطاب کا درجہ حاصل ہے)

امابعد ایھا الناس! فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم! فان احسنت فاعیوننی وان اسات فقومونی! الصدق امانہ والکذب خیانۃ الضعیف فیکم قوی عندی حتی اریح علیہ حقہ ان شاء اللہ والقوی فیکم ضعیف عندی حتی آخذ الحق منہ انشاء اللہ ولا یدع قوم الجھلاء فی سبیل اللہ الا ضربھم اللہ بالذل۔

لوگو! مجھے تم لوگوں کا امیر بنا دیا گیا ہے۔ حالانکہ میں آپ لوگوں سے زیادہ لائق نہیں۔ یہ سب آپ کی خوشی سے ہوا اب بھلائی میں میری اعانت کرتے رہئے گا۔ اور برائی کے موقع پر میری مخالفت کیجئے گا۔ خیال رہے سچ کہنا امانت داری کے مترادف ہے۔ اور جھوٹ خیانت کہلاتا ہے۔ جو تم میں سے کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے جس نے بھی کمزور کا حق تلف کیا۔ اس سے

اس کا حق انشاء اللہ دلوا دیا جائے گا۔ اور جابر میرے نزدیک کمزور ہے میں ایسے شخص سے مظلوم کا حق دلوا کر رہوں گا۔ انشاءاللہ۔

فان عصیت اللہ ورسولہ فلا طاعتہ لی علیکم۔

اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو ایسی حالت میں تم پر میری اطاعت واجب نہیں۔

قوموا الی صلوٰتکم یرحمکم اللہ۔

اے لوگو اب صلوٰۃ ادا کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اللہ تم لوگوں پر رحم کرے۔

تدفین نبی الکریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

مسلمانوں میں خلافت کے متعلق جو اختلاف پیدا ہوا تھا وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھوں پر بیعت ہو جانے کے بعد ختم ہوا۔ اس کے بعد جسد مبارک کی تدفین کا اہتمام شروع ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس پلنگ پر ابدی نیند میں محو تھے۔ وہ پلنگ پر بدستور اسی طرح اسی جگہ تھا۔ اب مدفن کی جگہ پر بحث شروع ہوئی۔

(الف) مکہ معظمہ میں تدفین ہو۔ جسے آپ کا مولد اور آبائی وطن ہونے کا فخر حاصل ہے۔

(ب) بیت المقدس۔ انبیائے کرام کی آخری آرام گاہ ہونے کی وجہ سے بہتر ہے۔ لیکن مسلمان اس پر متفق نہ ہو سکے! کیونکہ ابھی تک بیت المقدس پر نصرانی رومی حکومت کا قبضہ تھا جن کی اسلام دشمنی مدتوں سے چلی آ رہی تھی۔ مسلمانوں کے دل سے ابھی تک غزوہ موتہ اور غزوہ تبوک دونوں کا داغ تک مندمل نہیں ہوا تھا۔ حتیٰ کہ ابھی تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے مقتولوں کا قصاص روم سے نہیں لیا تھا اور اسی مقصد کے لئے اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو فلسطین پر حملہ آور ہونے کا حکم دیا تھا۔

غرض بیت المقدس اور مکہ مکرمہ دونوں میں سے کسی ایک پہ مسلمان رضامند نہ ہوئے۔

(ج) مدینہ منورہ جس بستی کے لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور ان کے رفقاء نے اپنے دروازے کھول دیئے۔ جہاں کے باشندوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کی۔ جس شہر نے سب سے پہلے علم اسلام بلند کرنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی اس رائے پر سب ہی متفق ہو گئے۔

اب مرقد کے لئے جگہ کی تقرری پر بحث شروع ہوئی اس میں بھی مختلف رائے ہوئیں۔

(الف) مسجد نبوی میں منبر کی جگہ۔ جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔

(ب) مصلیٰ کی جگہ جہاں پر امامت صلوٰۃ کے لئے قیام فرماتے تھے۔

مرقد سے متعلق یہ دونوں رائیں ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی اس روایت کی وجہ سے مسترد کر دی گئیں۔ کہ علالت کے آخری مرحلہ میں جب رسول اللہ ﷺ نے سیاہ رنگ کی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ دفعتاً تکلیف بڑھ گئی۔ جس کے اثر سے کبھی چادر کا دامن چہرہ مبارک پر پھیلا دیتے اور کبھی دامن کو رخ انور سے سرکا کر دوسری طرف پھینک دیتے۔ اسی اضطراب میں زبان مبارک سے یہ الفاظ ادا ہوئے۔ قاتل اللہ قوما" اتخذو قبور انبیاء مساجدا" اللہ تعالیٰ اس قوم کو ہلاک کرے جو نبیوں کی قبروں کو مسجد بنا لیتے ہیں۔

ام المومنین رضی اللہ عنہا کی اس روایت سے مسجد کے اندر تدفین کا ارادہ ختم ہو گیا۔ لیکن مرقد کی تعین کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ کہ خلیفتہ المسلمین ابو بکر رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے اور فرمایا۔

سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول ماقبض نبی الادفن حیث تقبض۔

میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ نبی کی روح جسد عنصری سے جہاں پرواز کرے اس زمین کے حصہ کو اس کے مرقد ہونے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔

جس کا شرف ام المومنین عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرہ کو حاصل تھا۔ نبی آخر الزماں علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آخری آرام گاہ بھی آپ کا حجرہ ہی قرار پائی پلنگ جس مقام پر لگا ہوا تھا وہیں قبر کھود لی گئی۔

غسل میں صرف قرابت دار شریک تھے۔ جناب علی رضی اللہ عنہ جسد اطہر کو مل رہے تھے۔ حضرت عباس اور آپ کے ہر دو صاحبزادے فضل و قثم اور شقران پردہ کئے ہوئے تھے۔ اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہ پانی ڈالنے پر مامور تھے۔

بعض حضرات نے بدن سے قمیض علیحدہ کرنے کا مشورہ دیا۔ مگر علی اور ان کے دوسرے رفقاء نے اسے مناسب نہ سمجھا۔ غسل کے درمیان جسد گرامی پر مالش کرنے سے خوشبو کی لپٹوں سے درو دیوار مہک اٹھے جس پر علی ابن طالب رضی اللہ عنہ نے کہا۔ یابی انت وامی! ما اطیبک حیا" ومیتا" میرے ماں باپ آپ قربان تمام زندگی آپ کے جسد مبارک سے خوشبو آئی اور آج بھی اس حالت میں بھی خوشبو کی مہک آ رہی ہے۔

خوشبو کے بارے میں مستشرقین کی رائے

بعض مستشرقین نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ زندگی میں رسول اللہ ﷺ کو جس

چیز کا زیادہ شوق تھا وہ خوشبو تھی اس لئے خوشبو ان کے جسم مبارک کا حصہ بن گئی۔

تکفین و تدفین

کفن تین چادروں پر مشتمل تھا۔ جن میں دو چادریں قریہ صحار (یمن) کی بنی ہوئی تھیں اور ایک چادر دھاری دار تھی۔ تکفین سے فارغ ہونے کے بعد فی الحال جسد مبارک کو اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا۔ اور زیارت کے لئے پردہ ہٹا دیا گیا۔

زائرین مسجد سے گزر کر آخری دیدار کے لئے آنے لگے۔ اور درود و سلام پڑھ کر حسرت و غم دلوں میں لئے واپس ہو جاتے۔

نماز جنازہ

ابوبکر رضی اللہ عنہ اور عمر فاروق رضی اللہ عنہ حجرہ میں داخل ہوئے تو زائرین کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ دونوں حضرات نے مسلمانوں کی معیت میں نماز جنازہ ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر ہر شخص اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔

السلام علیک یا رسول اللّٰہ ورحمتہ اللّٰہ وبرکاتہ ونشھد ان نبی ورسولہ قد بلغ رسالتہ ربہ وجاھد فی سبیلہ حتیٰ اتم اللّٰہ النصر لدینہ وانہ وفی بوعدہ وامر الانعبد الا اللّٰہ وحدہ لاشریک لہ۔

اے رسول اللہ آپ پر سلام ہو رحمت و برکت ہو۔ ہم سب گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اللہ کی رسالت مکمل طور پہ پہنچا دی۔ اس کی راہ میں اس وقت تک جہاد جاری رکھا۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے دین کی نصرت نہ فرما دی۔ ہم اس پر بھی گواہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ برحق نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو میثاق کیا تھا۔ اسے حرف بحرف پورا کر دیا۔ اور لوگوں کو فرما دیا کہ ہم اللہ وحدہ لاشریک کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔

جناب ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہر ایک جملہ کی سب حاضرین صدق زبان سے تائید کرتے اور موقعہ بموقعہ انہیں پکارتے رہے۔

مردوں کے حجرہ سے باہر آ جانے کے بعد عورتیں اندر آئیں۔ ان کے بعد بچے آئے جو خاتم النبین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرہ مبارک پر حسرت فراق کی نظر ڈال کر نکل جاتے آپ کی وفات کے بعد ہر مرد اور عورت دین کے مستقبل کے بارہ میں خائف تھا۔

پر شکوہ گھڑیاں

یہ واقعہ جسے تیرہ سو سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ جو تاریخ کا پر شکوہ منظر ہے۔ جب

اس کا تصور کرتا ہوں دل پر اس روز کی ہیبت اور دبدبہ سے لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔ کفن میں لپٹا ہوا جسدِ اطہر حجرہ کے ایک طرف ابدی نیند سو رہا ہے۔ یہ جسد گرامی سپرد لحد ہو جائے گا۔ گذشتہ کل تک یہی جسمِ مبارک زندگی، نیکی اور رحمت کا سرچشمہ تھا۔ یہ ایسے بزرگ کا پیکر ہے جو بنی نوعِ بشر کو ہدایت و حق کی تبلیغ کرتا رہا۔ نیکی کا مصدر رحمت دوعالم، احسان کا منبع، رفاہ عام کی ہر صفت میں سب سے سبقت لے جانے کا عادی، ہدایت و رشد کا سرچشمہ، سرکشوں سے مظلوموں کا حق دلانے والا۔ آج اس مجموعہ اوصاف کے آخری دیدار کے لئے ہجوم کے ہجوم چلے آرہے ہیں۔ ہر مرد، عورت، بچہ۔۔۔ سب ان کی مدح سرائی کر رہا ہے۔ اور فرط غم سے نڈھال ہے کہ ایسا بزرگ ان سے بچھڑ رہا ہے جو ان کے لئے شفیق باپ کا قائم مقام تھا۔ مہربان بھائی کا بدل، مونس و غم خوار دوست، محبت وفا کا پیکر اللہ تعالیٰ کا نبی اور رسول اللہ ﷺ ہے جو آج اپنے رب کے پاس جا رہا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد۔۔۔۔ آپ کا جسد مبارک تین دن تنہا رہا ہو۔ تمام جانثاران کو خلافت کی فکر نے گھیر لیا ہو۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ اصحاب صفہ کہاں چلے گئے۔ ہر سانس پہ ساتھ رہنے والے کہاں گئے۔ جُرأت و شجاعت کی علامت کہاں گئی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ صرف وو کو مورد الزام بنانے کے لئے سیرت نگاری میں صدیوں پہلے بددیانتی کر دی گئی ہو؟

سیرت نگار یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہر ایک کے دل میں دین اسلام کے بقا کا غم بھی تھا۔ جیسے کہ خود مؤلف لکھتے ہیں کہ ایسے لوگوں کا احساس کس قدر قابل تعریف ہے۔ جن کے دل ایمان سے مالا مال ہیں۔ سب سمجھے ہوئے ہیں کہ نبی رحمت ﷺ کے بعد پردہ غیب سے نہ معلوم کیا ظہور میں آنے والا ہے۔ (دین اسلام کے اتنے غم خوار اور دین کے معلم سے وفات کے بعد تین دن تک ایسے لاتعلق۔ عقل سلیم مانتی نہیں)

جب میں آج سے تیرہ سو برس پہلے اس منظر کا تصور کرتا ہوں تو حیرت میں کھو جاتا ہوں روح ایسے پر شکوہ منظر کی ہیبت سے ایسی متاثر ہو جاتی ہے کہ بھلانے کی کوشش کے باوجود بھلا نہیں سکتا۔

مسلمانوں کا یہ خوف بے سبب نہ تھا۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبر پھیلتے ہی اطراف مدینہ کے یہود و نصاریٰ دونوں گروہ سرکشی پہ آمادہ ہو گئے۔ قبائل میں جو لوگ ضعیف الایمان تھے منافقت پر اتر آئے۔ اور تو اور مکہ معظمہ کے مسلمان بھی اسلام سے برگشتہ ہونے پہ اتر آئے۔ عامل مکہ حضرت عتاب بن اسید رضی اللہ تعالیٰ عنہ جن کو خود رسول اللہ ﷺ نے یہاں کا عامل مقرر فرمایا تھا۔ یہ رنگ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ اس نازک موقع پر سہیل بن عمرو

رضی اللہ عنہ کی فراست نے اپنے کام کر دکھایا۔ مجمع عام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تذکرہ کرنے کے بعد فرمایا۔

اس سے ہماری قوت میں ضعف نہیں آ سکتا۔ سن لو جس نے اسلام کے خلاف زبان کھولی۔ اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔ ذرا سوچو تم لوگ تمام لوگوں کے بعد اسلام میں داخل ہوئے۔ مگر اسلام سے برگشتہ ہونے میں سب سے پہل کر رہے ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ دنیا میں قریش کی برتری قائم کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ انہیں کے ہاتھ ان کی نصرت کرائے گا۔

صورت تدفین

عرب میں قبر بنانے کے دو طریقہ رائج تھے۔ ایک بغلی اور دوسری ہودہ! مدینہ منورہ میں بغلی قبر کا رواج تھا۔ اہل مکہ ہودہ بناتے' حضرت ابو عبیدہ الجراح رضی اللہ عنہ سرد آبہ تیار کرنے کے بعد مکی طریقہ کی لحد بناتے۔ اور جناب ابو طلحہ رضی اللہ عنہ اور زید بن سہیل رضی اللہ عنہ جو مدینہ منورہ میں قبر کن تھے۔ بغلی لحد تیار کرتے۔ سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے دونوں کو بلوایا۔ مگر ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ گھر میں موجود نہ تھے۔ ابو طلحہ رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ اور مرقد مبارک مدینہ کی رسم کے مطابق تیار کی گئی۔

نصف شب تک جب مسلمان آخری دیدار سے فارغ ہوئے تو اہل بیت نے تدفین پر توجہ فرمائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوڑھنے کی سرخ رنگ کی چادر کا فرش بچھایا۔ جو حضرات غسل میں شریک تھے۔ انہیں کے ہاتھوں سے جسد مبارک کو لحد میں اتارا گیا۔ کچی اینٹوں سے ڈھانک دیا گیا علیہ السلام اور سردابیہ میں مٹی ڈال کر قبر بنا دی۔

ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں نصف شب کے قریب پھاوڑوں سے مٹی کاٹنے کی آواز سن کر اندازہ ہوا کہ جسدِ مبارک دفن ہو رہا ہے۔ اسی طرح حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

تاریخ اور یومِ تدفین

12 ربیع الاول بروز چہار شنبہ یومِ رحلت سے دو روز بعد۔

ام المومنین صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حجرہ مزار مقدس

عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا اسی حجرہ میں مقیم رہیں۔ جس کے ایک حصہ میں رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کا مرقد مبارک تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسائیگی کو باعث فخر سمجھتی رہیں۔ اسی حجرہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں جانب حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدفون ہیں۔ ان کے بعد عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قبر بائیں طرف ہے۔

ام المومنین رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں۔ کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مدفون ہونے سے پہلے میں چہرہ پہ نقاب اوڑھے بغیر اندر جاتی۔ لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دفن ہونے کے بعد نقاب اور پورا پردہ کئے بغیر زیارت کے لئے حاضر نہ ہوتی۔

جیش اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روانگی

جسد مبارک علیہ السلام کی تدفین کے بعد خلیفۃ المسلمین ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سب سے پہلے اس پر توجہ فرمائی کہ جیش اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو شام کی طرف روانہ کیا جائے۔ کیونکہ جس طرح سلمانوں نے اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قیادت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ علالت میں اعتراض کیا تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو پھر وہی نکتہ چینی شروع ہو جائے۔ اس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان لوگوں کے ہمنوا تھے لیکن آج عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے مختلف تھی۔ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ان میں افتراق پیدا ہونے کا ڈر تھا۔ انہیں اس فوج کو بھیج دینے کے بعد یہ بھی خطرہ تھا کہ جو لوگ ابھی ابھی اسلام لائے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ دین حق سے پھر جائیں۔ ایسی صورت میں لشکر کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ان کی سرکوبی کی جا سکتی ہے۔

لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیل میں مزید ایک لمحہ بھی دیر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور نہ ہی اس پر آمادہ ہوئے کہ نوعمر اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جگہ کسی تجربہ کار کے ہاتھ لشکرِ اسلامی کی کمان دے دی جائے۔

جیشِ اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کامیابی

مدینہ سے روانگی کے بعد دس دن بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ بلقائے روم پر مسلمانوں نے حملہ کر دیا۔ جس میں اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے غزدہ موتہ میں شہید ہونے والے مسلمانوں اور اپنے والد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بدلہ لے لیا۔ مسلمان اس لڑائی میں مغلوب ہونے والے دشمنوں پر وار کرتے ہوئے للکار کر کہتے اے مفتوحین تم مر کر ہی نجات پا سکو گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کس خلوص اور اتحاد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل کی۔ جب اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلقاء فتح کر کے مدینہ تشریف لائے تو سواری میں اس دشمن کا گھوڑا تھا۔ جس کے ہاتھ سے ان کے والد

گرامی زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہید ہوئے تھے اور وہ علم جو رسول کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے مبارک ہاتھوں سے گوند کر اسامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سپرد کیا تھا۔ وہی علم گھوڑے کی زین سے بندھا ہوا تھا۔

انبیائے کرام کی توریث (وراثت)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا خلیفتہ المسلمین ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حضور تشریف لائیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے حصہ کے خمس کی اراضی جو فدک و خیبر میں تھی اس کا حصہ مانگا۔ لیکن خلیفتہ المسلمین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے ایک حکم کی تعمیل کی بناء پر مجبوری کا اظہار کر دیا اور وہ حکم رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ تھا۔

نحن معاشر الانبیاء لانورث ماترکناہ صدقہ۔ ہم انبیاء کی جماعت میں سے ہیں اور ہم اپنے کسی عزیز و قرابت دار کو اپنی متروکہ کا وارث نہیں بناتے۔ ہمارا ترکہ امت کے لئے صدقہ ہے۔

لیکن خلیفتہ المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احتراماً" فرمایا۔ اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی زمین آپ کے لئے ہبہ فرما دی ہو تو میں آپ ہی کے فرمان سے حکم کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں۔ سیدہ نے فرمایا۔ یہ تذکرہ ام ایمن رضی اللہ عنہا نے مجھ سے کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا میرے لئے فدک اور خیبر کی اراضی ہبہ کرنے کا ارادہ تھا۔ لیکن میرے والد گرامی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے براہ راست اس سلسلہ میں تجھ سے کبھی بات نہیں کی۔ سیدہ رضی اللہ عنہا کی زبان سے یہ سننے کے بعد ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فدک اور خیبر کی اراضی بیت المال میں داخل فرما دیں۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خمس سے تھیں۔

انبیائے کرام کی میراث معنوی ہے

ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا سے رخصت ہوئے تو مال و زر میں سے کوئی چیز اپنے وارثوں کے لئے نہیں چھوڑی۔ جس طرح دنیا میں تشریف لائے تھے اسی طرح اپنے اور قرابت داروں کی پابندی زر و مال کی محبت کا داغ دل میں لئے بغیر دنیا سے تشریف لے گئے۔ البتہ ورثاء اور تمام بنی نوع انسان کے لئے دین اسلام اور اسلام کا ایک ایسا تمدن چھوڑا جس کے سایہ میں یہ جہان صدیوں سے خوشی و خرمی کی زندگی گزر رہا ہے۔ اور رہتی دنیا تک اہل جہاں ان دونوں سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے توحید کی بنیاد کو استوار فرمایا۔ کلمتہ اللہ کو سربلند اور کلمہ کفر کو سرنگوں کیا۔ بت پرستی اور شرک کی جڑیں پاتال

سے کھود کر پھینک دیں۔ انسان کو ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور محبت سے پیش آنے کی تلقین فرمائی۔ منافرت اور کینہ پروری سے باز رہنے کی ہدایت فرمائی اور اپنے بعد قرآن حکیم اور اپنا اسوہ حسنہ ہدایت و رحمت کی حیثیت سے دنیا میں چھوڑا۔

یہ وجود مقدس کہ مظہر کامل اور پیشوائے بزرگانی ہے۔ اپنے کردار کا آخری مرقع کس حیرت انگیز طریقہ میں پیش فرماتا ہے۔

ایها الناس-- من كنت جلدته له ظهراً فهذا ظهري۔

لوگو--- تم میں سے جس کو میرے ہاتھ سے کوئی جسمانی ایذا پہنچی ہو تو قصاص کے لئے میری پشت حاضر ہے۔

اور پھر ارشاد فرمایا۔

ومن كنت شتمت له عرضا" فهذا عرضي فليستقد منه ومن اخذت له مالا فهذا مالي فليستاخذ منه ولا يخش الشحناء فهو ليست من شاني!

جس کسی کے حق میں میری زبان سے کوئی ناروا بات نکل گئی ہو وہ شخص اسی طرح مجھ سے انتقام لے سکتا ہے جس کسی کا قرض میرے ذمہ ہو مجھ سے مانگنے میں ادا کرنے کو تیار ہوں اور ایسے حضرات کے خلاف میرے دل میں کوئی رنجش نہ ہو گی۔ کیونکہ میری فطرت ایسی تمام چیزوں سے پاک و صاف ہے! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!

خاتمہ (۱) اسلامی تمدّن قرآنی نقطۂ نگاہ سے

خاتمہ (۱) اسلامی تمدن قرآنی نقطۂ نگاہ سے

خاتمہ (۱) اسلامی تمدن قرآنی نقطۂ نگاہ سے

ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے بعد ایسا تابدار اور پائیدار تمدن چھوڑا ہے جو صدیاں گزر گئیں لیکن وہ اپنے اوصاف میں اتنا تابندہ و درخشاں ہے کہ آج بھی تمام عالم اس کی روشنی سے منور ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے رسول اللہ ﷺ کا متروکہ تمدن ضیا پاشی کرتا رہے گا۔ تاریخ کے اوراق پہ لکھی ہوئی تحریریں گواہ ہیں کہ زمانہ ماضی میں اللہ کے رسول ﷺ کی اس میراث سے تمام عالمِ انسانیت نے کتنا فائدہ اٹھایا۔ جو بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس میں مستقبل کو بھی فیض یاب کرنے کی صلاحیتیں اور بھی زیادہ ہیں۔ اس لئے کہ خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسے "دین قیم" فرمایا ہے جو کائنات کی تمام خوبیوں تا قیامت حامل اور ضامن ہے۔

اسلامی تمدن اور مغربی تہذیب کا امتزاج

اس اسلامی تمدن کے مزاج میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگر اسے صحیح علم اور عقل سلیم کی آمیزش اور استقامت کے ساتھ مربوط کر دیا جائے یعنی مذکورہ تینوں قوتوں کو کام میں لیتے ہوئے مغربی تہذیب و تمدن کی ان ایجادات و انکشافات سے بھی کام لیا جائے۔ جو مغربی تمدن کا اٹوٹ انگ بن چکے ہیں۔ اور بنی نوعِ بشر کے لئے اپنی افادیت بھی ثابت کر چکے ہیں اور انہیں قرآنی تعلیمات کے تابع کر کے اسلامی تمدن میں شامل کر لیا جائے تو کیا ان کی شمولیت خود اسلام کے لئے تقویت کا سبب ہو گی؟

اسلام کی فطرت میں یہ جوہر موجود ہے کہ وہ غور و فکر سے حاصل شدہ نتائج اور عقل و دانش کے درمیان خود بخود ربط و تعلق پیدا کر دے۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ غور و فکر اور عقل و دانش کے علمی اسلحہ سے لیس ہو کر اسلامی تمدن اور مغربی تہذیب میں رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے یہ خیال درست ہو لیکن سوال یہ ہے کہ یہ رابطہ پیدا کیسے ہو؟

جبکہ اسلام کے نزدیک تمدن کی اپنی منفرد تعریف ہے جس کی شرح وہ اپنے مخصوص انداز

سے کرتا ہے۔

اور اسی تمدن کی تعریف و تشریح مغرب دوسرے انداز سے کرتا ہے۔ غور کیجئے تو پتہ چلے گا کہ دونوں کے تمدن کی اساس الگ الگ ہے۔ دونوں کے اصل جو ہر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

مغربی سوچ کے فیصلوں اور صحیح حقائق کے درمیان گہرا خلا ہے

مغربی تمدن کے نتائج کا سب سے خطرناک پہلو یہ ہے کہ اس سے انسانی سوچ اور فطری حقائق کے درمیان گہری خلیج حائل ہو گئی ہے جس کا پر کرنا بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ جس کی بنیادی وجہ اقتصادیات کو تمام نظام حیات کی اساس قرار دینا ہے۔ جسے مغرب کے ہر سیاسی کاروبار میں صرف اولیت ہی نہیں بلکہ اعلیٰ ترین مرتبہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اسلامی تمدن اور مغربی تمدن دونوں کے درمیان اس اختلاف کے پس منظر میں تاریخی اسباب کارفرما ہیں۔ جیسا کہ ہم نے اس کتاب کے مقدمہ طبع اول اور مقدمہ ثانی (طبع ثانی) میں کچھ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہوا یہ کہ جب مغرب میں ریاست اور کنیسہ کے درمیان اختیار کا فرق رونما ہوا تو یہ اختلاف اس آخری نقطہ عروج پہ جا پہنچا جہاں ریاست اور کنیسہ دو مختلف گدیاں طے پائیں۔

اس لئے کہ مغربی دانشوروں کی سوچ اور نتائج کی سمتیں بھی مختلف تھیں۔ ادھر کلیسا کا یہ دعویٰ اور دھمکی کہ وہ سلطنت پر حاوی ہے۔ ادھر ریاست کا یہ اصرار کہ پوپ اور ریاست کے درمیان کوئی مذہبی رابطہ نہیں۔ دونوں کی باہم کشمکش مغرب کے جز اور کل سبھی میں پائی جاتی ہے۔ مغرب کے مفکرین کے نتائج کا ایک باہم تنازع یہ بھی ہے کہ عقل محض (عقل مجرد) اور عقلِ عملی (مادیات) دونوں کے درمیان مشرق و مغرب کی دوری ہے اور اہلِ مغرب کو یقینِ کامل ہے کہ ان کا موجودہ تمدن عقلِ عملی ہی کے سہارے بامِ عروج تک پہنچا ہے۔

اس مغالطہ میں گرفتار مغرب کے متعدد مفکرین نے یقین کر لیا ہے کہ نظام مغرب کیا پوری دنیا کا نظام اقتصادیات ہی کے کھونٹے سے بندھا ہوا ہے۔ عالم یہ ہے کہ مغرب کے بہت سے مفکرین تو اب یہ بھی عملی طور پہ ثابت کرنے کی کوشش میں ہیں کہ مذہب، صنعت، حرفت، فلسفہ، منطق غرض ہر ایک شعبہ اقتصادی نظام ہی سے وابستہ ہے۔ تاریخ عالم میں رونما ہونے والے انقلابات بھی اقتصادیات ہی کی کرشمہ سازی ہے ماضی میں ہونے والے اقوام عالم میں تصادم کے نتائجِ شکست و فتح بھی اقتصادی حالات کا ثمر ہیں۔ بلکہ ان مفکرین کا یہ بھی خیال ہے کہ قوموں کے اخلاق کا انحصار بھی معاشی نظام کی خوبی یا خرابی پر ہی ہے۔ گویا مغربی فلسفیوں کے نزدیک سارا عالم مادی اور اخلاقی طور پہ معاشیات کے ہاتھ میں کٹ پتلی کی طرح ناچ رہا ہے۔

روحانیت اور اہلِ مغرب

مغرب کے فلاسفرز کے نزدیک روحانی بلندی یعنی دل کی پاکیزگی اور اعلیٰ اخلاق میں برتری ہر ایک کا انفرادی (ذاتی) مسئلہ ہے۔

لہٰذا ریاست کو کسی کے انفرادی مسئلہ سے کوئی سروکار نہیں۔ مغرب نے اس معاملہ میں یہاں تک لاتعلقی اختیار کر رکھی ہے کہ دوسروں کی اس انفرادی آزادی کی پاسداری کو اپنے اصول اور عقیدہ کی آزادی کے مترادف سمجھتے ہیں۔ اور افراد کو ان کے اختیار پر چھوڑے رکھنا ریاست کا فرض سمجھتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ مذکورہ فلاسفر ہر فرد کی انفرادی مختاریت کو بھی اقتصادی برتری ہی کا جزو سمجھتے ہیں۔

مغربی تمدن کا انجام؟

میرے خیال میں جس تمدن کی بنیاد صرف معاشی اصلاح و بہبود پر منحصر ہو۔ یہاں تک کہ وہ اخلاقیات کو بھی معاشی سودو منافع ہی کا ثمر سمجھے۔ اخلاقیات کو معاشرہ کا اجتماعی جز قرار دینے کے بجائے اسے انفرادیت سے علیحدہ تصور کرنے کا دعویدار ہو۔ ایسا تمدن انسان کو سعادت و فلاح یا کامیابی کی حقیقی راہ دکھا سکے ناممکن ہے۔ بلکہ ایسا تمدن بالآخر قوم کو لامتناہی مصیبت اور تباہی میں مبتلا کر دے گا۔ جیسا کہ اہل یورپ کی روزمرہ زندگی میں نظر آ رہا ہے۔ ظاہر ہے جب تک ان مغربی دانشوروں کا یہ شعار رہے گا تب تک جنگوں سے دست برداری اور باہم صلح و امن کے وعظ بے کار ثابت ہوں گے۔ کیونکہ ان کا مرکزی نقطہ روٹی ہے۔ اور ساتھ ہی ہر ایک قوم کا اپنی مرضی کے مطابق اس کے حصول کا تقاضا چسپاں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی اقوام میں سے ہر ایک ملک نے جنگی قوت بھی روٹی ہی کے نام سے بڑھا رکھی ہے۔ لیکن اصل مقصد اپنے لئے روٹی نہیں بلکہ دوسرے کے ہاتھ سے لقمہ چھیننا ہے۔ ان میں سے ہر ایک طاقت دوسری حکومت کو دشمنی کی نگاہ کے علاوہ دیکھ ہی نہیں سکتی۔ جیسے ان میں انسانیت کا کوئی رشتہ ہی نہیں اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم انسان کہلانے کے باوجود حیوانوں کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک قوت کو صرف اپنے ذاتی مفاد کا احساس باقی رہ گیا ہے اور وہ اخلاقی مبادیات جن پر ایک دوسرے کی دوستی' محبت' ایثار اور وفا کا انحصار ہے' بے نام و نشان ہو گئی ہیں۔

اشتراکیت اور آمریت

یورپ میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات ہمارے تجزیے اور دعوے کے مؤید ہیں۔ اقوامِ مغرب میں موجودہ دشمنی اور سرد و گرم جنگ اسی اقتصادی نظام کی غلط روش کا نتیجہ ہے۔

یہ وبا یورپ کے اس طبقہ میں بھی پائی جاتی ہے جو خود کو جدید اشتراکی نظریہ کا عامل قرار دیتا ہے۔ اور اس گروہ میں بھی جو اشتراکیت کا دشمن ہے۔ یعنی آمریت کے ٹھیکیدار!

یورپ میں یہ دونوں قسمیں اشتراکیت پسند اور اس کا مخالف گروہ ایک دوسرے کے ہاتھ کی روٹی چھیننے کی تاک میں اس طرح گھات لگائے ہوئے ہیں جیسے گدھ مردار کی تاک میں ہو۔ تمدن کے یہ دعویدار ہر وقت دوسرے کی دولت کو چھیننے کی فکر میں چاک و چوبند ہیں اور لطف یہ ہے کہ دونوں گروہ اپنے آپ کو انسانی حقوق کا محافظ اور اپنے کردار کو ان حقوق کے تحفظ کا پاسبان کہتے ذرا بھی شرماتے نہیں ہیں۔ کاش ان قوموں کا یہ رشک یا رقابت انسانی زندگی کی حفاظت کے لئے ہوتی۔ تو ہم ان کی رقابت اور مبارزت کو بھی طبعی قرار دے پاتے۔

اب حل طلب سوال یہ ہے کہ کون سی ایسی صورت ہو سکتی ہے جو قوموں میں باہم صلح قائم رکھے اور ان میں جنگوں سے اجتناب کا رجحان دائمی اور مستحکم رکھ سکے؟

موجودہ صدی (بیسویں) کی اول تہائی میں یورپ کی باہم جنگوں سے جو حوادث رونما ہوئے۔ ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جن قوموں کی زندگی کی بنیاد ہی قومیت ہو ان قوموں میں دائمی صلح یا پائیدار دوستی کا استحکام ایسی خام خیالی ہے جس کا تصور تو انتہائی حسین ہو مگر نتیجہ نہایت ہولناک ہو گا یا یوں کہہ لیں تو درست ہو گا کہ جیسے فریبِ سراب جو دور سے ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر دکھائی دے لیکن حقیقت میں چمکدار ریتیلے ذروں کے سوا کچھ بھی نہ ہو۔

اسلامی تمدن کی بنیاد

مغربی تمدن کے بالکل برعکس اسلامی تمدن کی بنیادوں میں معنوی حسن و زیبائش بدرجہ اتم موجود ہے۔ جو انسان کو ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ اور ادراک یعنی افہام و تفہیم کے لئے آمادہ کرتا ہے۔ اور اس پر بھی متوجہ رکھتا ہے کہ خود اس کی اپنی پہچان بھی اس کی نظر سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اس کا یہی ادراک جب ایمان باللہ تک جا پہنچتا ہے تب وہ انسان اپنی روحانیت کو مہذب اور دل کو مزکی (پاکیزہ) کرنے کا ذریعہ صرف اس جذبہ کو بنا لیتا ہے۔ یہی ادراک اس کے لئے عقل و شعور کی ابتدائی غذا مہیا کرتا ہے جس میں فرد خود اخلاقی طور پر سربلند ہو کر اپنے آپ کو انسانی برادری کے ساتھ منسلک کر کے محبت و احسان اور پرہیزگاری کا منبع سمجھنے لگتا ہے۔ جس کے بعد اپنی زندگی کے اقتصادی معاملات کو اسی محبت و احسان اور پرہیزگاری کے مطابق درجہ کمال تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلام میں اس امر کی اجازت نہیں کہ اخلاقی اقدار کو راہ سے ہٹا کر اقتصادی نظام کے لئے راستہ ہموار کرے۔

اسلامی تمدن کا تصور

اسلام دینی اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے ایسا جاذب و معتبر ہے کہ اس میں تمام انسانی کمالات و اوصاف پرورش پا سکتے ہیں۔ اگر اسلام کا تمدن دلوں میں بس جائے اور اس کے نفاذ اور اجراء کے لئے ویسے ہی ذرائع اور پابندیٔ قانون کا تسلسل کام میں لایا جائے جو مغربی نظامِ تمدن کی ترویج و اشاعت میں استعمال کیا جاتا ہے۔ تو انسانیت کے خدوخال میں نکھار آ جائے۔ تمدن کی بنیاد اس انداز سے مستحکم ہو جائے جس سے تمام عالم موجودہ بحران سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ جو اسے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ موجودہ حالات میں مشرق و مغرب اس بحران سے نجات پانے کی ہر ممکن کوشش میں مصروف ہے۔ لیکن صحیح طریق کار سے بے خبر ہے۔ اس پر ستم یہ ہے کہ نہ صرف غیر مسلم بلکہ خود مسلمان بھی ان کے ہی نقشِ قدم پہ چل رہے ہیں اور ان کے جوشِ اتباع میں صحیح رخ سے بے خبر ہیں۔

میں صاف اور واضح طور پہ کہتا ہوں کہ دنیا کے اس بحران کا علاج صرف اسلام کے پاس ہے۔ جس کے لئے اہلِ مشرق و اہلِ مغرب ہر طرف نظریں دوڑا رہے ہیں۔ لیکن افسوس ہے انہیں اپنے قریب ہی اس تریاق اور تیر بہدف علاج کو دیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ مال و دولت کی عبادت نے ہی ان کو آپس کی لڑائیوں کے بحران میں دھکیل دیا ہے۔ اس طرف انہیں خیال ہی نہیں آتا۔ اس پر لطف یہ ہے کہ جب وہ اس بحران کا سبب اپنے عیسوی مذہب کو سمجھ کر کسی دوسرے مذہب کی طرف جاتے ہیں تو ان کی نگاہ ہندو مت سے ادھر رکتی ہی نہیں۔

جبکہ جغرافیائی حیثیت سے بھی ہندو مت کے گہوارہ ہندوستان سے زیادہ اہلِ مغرب کے قریب دینِ اسلام ہے جو مشرقِ اقصیٰ میں پھیلا ہوا ہے مگر اہلِ یورپ اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے جس کے پاس موجودہ سیاسی اور معاشی بحرانوں کا مکمل و شافی علاج بصورتِ قرآن حکیم موجود ہے۔ جس کی تشریح حاملِ قرآن کریم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے ہر صفحہ پر موجود ہر حرف سے ان کی مشکلات میں ان کی رہنمائی کر سکتی ہے۔

دوستو! اس وقت اسلامی تہذیب و تمدن کی وضاحت میرا موضوعِ سخن نہیں۔ یہ مضمون بذاتِ خود ایسی طویل بحث کا متقاضی ہے کہ اگر اس پر قلم اٹھایا جائے تو زیرِ تسوید کتاب (حیات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے برابر بلکہ اس سے بھی ضخیم کتاب درکار ہے۔

البتہ یہاں نظامِ اسلامی کا مختصر سا تعارف کرایا جا سکتا ہے۔ ممکن ہے اس ضمن میں دعوت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ انداز بھی معرضِ ذکر میں آ جائے جس میں مطلوبہ مباحث کا آنا ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوا تو اس سے مزید استفادہ کے امکانات موجود ہوں گے۔

اسلامی نظامِ تمدن کی مختصر توضیح

اسلامی تاریخ میں کوئی ایسا دور نہیں گزرا جس میں مسیحی مغرب کی طرح کینسہ اور سلطنت دو مختلف و متضاد طاقتیں تسلیم کی گئی ہوں۔ جانشین رسول ﷺ خلیفہ ابوبکر رضی اللہ عنہ سے لیکر خلیفہ راشد تک نے بھی اپنی طرف سے کوئی ایسا ضابطہ نافذ نہیں کیا جس سے خود کو مستثنیٰ قرار دیا ہو۔ اس لئے کہ منصب کی بناء پر کسی مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر ترجیح حاصل نہیں۔ صرف تقویٰ اور پرہیزگاری معیارِ عظمت ہے اور یہی تقویٰ قربت الٰہیہ کا واسطہ ہے۔ نہ کسی ایسے والی یا حکمران کی اطاعت ایسے امور میں کسی مسلمان پر واجب ہے جس سے اللہ وحدہ لاشریک یا فرمانِ نبوی ﷺ کی نافرمانی ہوتی ہو۔ یا ایسا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ جیسا کہ خلیفہ اول ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عنانِ خلافت سنبھالتے ہی اپنے پہلے خطاب میں فرمایا۔

اطیعونی ما اطعت اللّٰہ ورسولہ فان عصیت اللّٰہ ورسولہ فلا طاعتہ لی علیکم!

اے مسلمانو! جو کام میں اللہ جل شانہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کی اطاعت کے لئے کہوں اس میں تم پر میری اطاعت واجب ہے۔ جس معاملہ میں اللہ رب العزت یا رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی دعوت دوں اس حکم کی اطاعت کرنا تمہارے لئے واجب نہیں۔

مگر جب خلافت کی باگ ڈور جابر حکمرانوں کے ہاتھ میں آ گئی تو طرح طرح کے فتنے اٹھ کھڑے ہوئے۔ لیکن مسلمانوں کی قوتِ فکر پر اس کا کوئی اثر نہ پڑ سکا۔ کیونکہ مسلمان آزادی فکر اور قوتِ عمل کو دین و ایمان کے معاملہ میں بھی الگ نہیں ہونے دیتے۔ جس کا ثبوت مامون رشید کا وہ دور ہے جب ایسے حکمرانوں نے خلیفۃ الرسول کی بجائے خود کو اللہ کا نائب کہتے ہوئے مسلمانوں کی گردنوں پہ قبضہ کر لیا۔

مامون رشید ہی کے دور میں عقیدہ خلق قرآن کی مہم کا تصور کیجئے جس کے مخالف پر اس نے ہر قسم کے جبر و تشدد کو فرض سمجھ لیا مگر مسلمانوں نے پورے استقلال و جرأت کے ساتھ مامون کے اس بدعی اور جبری قانون کی مخالفت کی اور اس راہ میں مختلف قسم کی سختیوں کو برداشت کرنے سے نہیں گھبرائے۔

اسلام نے عقل کو ہر معاملہ میں حاکم قرار دیا ہے

اللہ تعالیٰ نے دین اور ایمان دونوں میں عقل و شعور کو حاکیت کا مقام دیا ہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

ومثل الذین کفروا کمثل الذی ینعق بما لا یسمع الا دعاء ونداء صم بکم عمی فھم لا یعقلون۔ (171:2)

جو لوگ کافر ہیں ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی ایسی چیز کو آواز دے جو پکار اور آواز

کے سوا کچھ نہ سن سکے۔ یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں کہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکتے۔

عقل کی اہمیت کے بارے شیخ محمد عبدہ کی رائے

آیت متذکرہ الصدر کی تفسیر میں شیخ محمد عبدہ فرماتے ہیں۔

قرآن مجید کی اس آیت کے مطابق سمجھ بوجھ کے بغیر دوسروں کی پیروی کرنا کافروں کا شیوہ ہے اس لئے جو شخص حقیقت اور صحتِ حقیقت دونوں باتوں کو سمجھ نہیں سکتا وہ مومن نہیں ہو سکتا۔

ایمان کا یہ مقصد نہیں کہ انسان بھی حیوان کی طرح نیکی کی اطاعت پر مائل ہو جائے انسانیت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ وہ عقل و شعور دونوں کی ہم آہنگی کے ساتھ علم کی راہنمائی سے ترقی حاصل کرے۔ اس یقین کے ساتھ کہ جس کام کو جتنا سمجھ کر کیا جائے وہ کام اتنا ہی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کا بہتر ذریعہ ہو گا۔ اسی طرح اسے ہر اس کام سے بچنا چاہئے جس کے بدانجام ہونے کا اسے یقین ہو۔

شیخ نے اس آیت کی تفسیر میں جو کچھ لکھا قرآن مجید نے اسے بیشمار آیات میں واضح طور پر بیان فرمایا ہے۔

(1) ان فی خلق السموات والارض واختلاف الیل والنہار والفلک التی تجری فی البحر بما ینفع الناس ما انزل اللہ من السماء من ماء فاحیا بہ الارض بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین السماء والارض لایات لقوم یعقلون۔ (164:2)

بیشک بلندی اور پستی کے دو متضاد زاویوں میں آسمان اور زمین کے پیدا کرنے اور دن کی "رنگت" (اندھیرے اور اجالے) میں اختلاف۔ کشتیاں اور جہاز جو دریا میں لوگوں کے فائدے کے لئے چلتے ہیں اور برسات جسے اللہ تعالیٰ آسمانوں سے برساتے ہیں اور اس سے زمین کے مرنے کے بعد اسے زندہ کرتے ہیں۔ (یعنی خشک ہونے کے بعد سرسبز بنا دیتے ہیں) اور زمین پر ہر قسم کے جانور پھیلانے میں اور ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر کئے گئے ہیں۔ عقلمندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں۔

(2) وایۃ لہم الارض المیتۃ احییناھا واخرجنا منہا حبافمنہ یاکلون وجعلنا فیہا جنت من نخیل واعناب وفجرنا فیہا من العیون۔ لیاکلوا من ثمرہ وما عملتہ ایدیہم افلا یشکرون۔ سبحان الذی خلق الازواج کلہا مما تنبت الارض ومن انفسہم مالا یعلمون۔

ایک نشانی ان کے لئے مردہ زمین ہے کہ ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس میں سے اناج اگایا پھر یہ اس میں سے کھاتے ہیں۔ اور اسی میں کھجوروں اور انگوروں کے باغ پیدا کیے اور ان میں چشمے جاری کر دیے تاکہ یہ ان کے پھل کھائیں۔ کسی اور کے ہاتھوں نے تو ان سب کو نہیں بنایا تو پھر کیوں یہ شکر نہیں کرتے؟ اور اللہ تعالیٰ پاک ہے جس نے زمین کی نباتات کے اور خود ان کے اور جن کی ان کو خبر نہیں سب کے جوڑے بنائے۔

(3)وایۃ لھم الیل نسلخ منہ النہار فاذا ھم مظلمون۔

اور ایک نشانی ان کے لئے رات ہے کہ اس میں سے ہم دن کی روشنی کو کھینچ لیتے ہیں تو اس وقت ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

(4)والشمس تجری لمستقر لہا ذالک تقدیر العزیز العلیم۔

اسی طرح سورج اپنے مقرر راستے پہ چلتا رہتا ہے۔ یہ اللہ دانا اور غالب کا مقرر کیا ہوا اندازہ ہے۔

(5)والقمر قدرناہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم۔

اور چاند کی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔

(6) لاالشمس ینبغی لھا ن تدرک القمر ولا الیل سابق النہار وکل فی فلک یسبحون۔

نہ تو سورج ہی سے یہ ہو سکتا ہے کہ وہ چاد کو جا پکڑے نہ رات ہی کے اختیار میں ہے کہ دن سے پہلے آ سکے! اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔

(7) وآیۃ لھم انا حملنا ذریتھم فی الفلک المشحون و خلقنا لھم من مثلہ مایرکبون٥ وان نشاء نغرقھم فلاصریخ لھم ولا ھم ینقذون الا رحمۃ منا ومتاعا" الی حین۔ (36:33-44)

اور ایک نشانی ان کے لئے یہ بھی ہے کہ ہم نے ان کو ان کی اولاد کو بھری ہوئی کشتی میں سوار کیا اور ان کے لئے ویسی ہی اور چیزیں پیدا کیں جن پر وہ سوار ہوتے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو ان کو غرق کر دیں پھر نہ تو ان کا کوئی فریاد رس ہو اور نہ ان کو رہائی کا کوئی امکان۔

قرآن حکیم نے یہ مفہوم کئی سورتوں میں بیان فرمائے ہیں جو انسان کو اس کائنات کے پراسرار معاملات پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ جن کے مطالعہ سے انسان پر طرح طرح کے حقائق منکشف ہوتے ہیں اور یہی حقائق بالآخر خالق کائنات پر ایمان لانے کا کا بدلل ذریعہ بنتے ہیں۔ اللہ خالق کائنات انسان کی قوت عاقلہ کو فکر و تدبر کے لئے ہر لحظہ پکار رہا ہے تاکہ عقل و

دلیل سے رہبری حاصل کرے نہ کہ اپنے باپ دادا کی قدیمی روایات کو اپنا پیشوا بنائے۔

قوتِ ایمان کا ثمر

ایمان کی یہ قسم ان اسلامی تعبیرات کا ماحصل ہے جو بوڑھی عورت کے ایمان سے بالکل مختلف ہے۔ ایسا ایمان جو غور و تدبر کی روشنی میں دلائل کے ساتھ حاصل ہو۔ جو روز روشن کی طرح پرکھا گیا ہو جس کے جانچنے والے نے اس کا ایک ایک پہلو غور سے دیکھ کر اس کے کھرے ہونے کا یقین کر لیا ہو وہی ایمان غیر متزلزل اور مستحکم ہو گا۔

حقائقِ کائنات پر غور کا نتیجہ

جیسے جیسے انسان زمان و مکاں کے اس لامتناہی سلسلہ پہ غور کرتا ہے تو اس کا تصور انتہائی بے چینی سے جاگتا ہے اور پھر وہ لمحات بھی آتے ہیں جب وہ خود کو اس سلسلہ کائنات کا ایک لازمی حصہ تصور کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تب اس پر ایک منظم اور مربوط ترتیب کا سلسلہ اپنے راز منکشف کرنا شروع کرتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ یہ ماننے پہ مجبور ہو جاتا ہے کہ اگر وہ ان حقائق کو جاننے کے بعد بھی ایسی ہستی پر جو حس و عقل سے بہت بلند بہت ہی بلند ہے یقین نہ کرے اور ان حقائق کو تسلیم نہ کرے تو وہ اصل مقصد سے ہٹ جائے گا۔ اور سراسر نقصان کی اتھاہ گہرائیوں میں گر کر رہ جائے گا۔ بس یہی ادراک وہ قوت ہے جسے ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سرورِ ایمان کا درجہ

ایمان ایسا وجدان ہے کہ انسان اپنی ذات کو کائنات کے ساتھ ایسا مربوط سمجھ لے کہ عالم کے لامتناہی دائرہ میں نہ صرف محصور ہے بلکہ کائنات کو اپنی ذات میں منعکس کرنے کا شعور پیدا کر لے۔ تو یہ اپنے آپ کو بھی اس کائنات کی مقررہ رسم کے مطابق اس کے ساتھ ہی مصروف گردش محسوس کرنے لگے گا۔ اس کے بعد اگر وہ اپنی اور کائنات دونوں کی کارکردگی کو عملاً اپنی مدح و ثنا کا وظیفہ بنا لے تو ایمان کا یہ درجہ اس کے دل کو سرور و انبساط کا مخزن بنا دیتا ہے۔

واجب الوجود کی تفتیش

رہا یہ سوال کیا ربِ ذوالجلال و متعال دنیا میں جلوہ فرما ہے؟ اگر ہے تو پھر وہ موجودات میں جاری و ساری ہے یا ان سے منفصل (الگ تھلگ)؟

اس مسئلے پر بحث و تمحیص ایسا جھگڑا ہے جس میں پڑنے سے نقصان تو زیادہ سے زیادہ ہو سکتا ہے لیکن نفع کا کوئی امکان نہیں۔ البتہ نتیجہ گمراہی ضرور ہے۔ یہ ایسی بحث ہے جس پر جتنی

بحث کی جائے جہالت اتنی بڑھے گی۔ اس جستجو میں اہلِ قلم اور اہلِ فلاسفہ نے بڑی کوششیں کیں آخر تھک کر بیٹھ گئے کیوں کہ الوہیت کا مقام ان کے ادراک سے بالاتر ہے اور اس کوشش کی ناکامی میں ان کی عقل کے کوتاہ ہونے کا ہاتھ ہے۔

لیکن عقل و شعور کی یہی کوتاہی باری تعالیٰ پر ایمان کو اور زیادہ استوار بھی کر دیتی ہے۔ جب دل میں یہ یقین کامل ہو جائے کہ وہ ذات احد و صمد جلوہ فرما ہے۔ اس کا علم ہر شے پر حاوی ہے، تخلیقِ کائنات اس کی نگاہ کرم کا صدقہ ہے، کائنات کی ہر شے کو اس کی طرف ہی لوٹنا ہے یعنی پہلی حالت میں۔ (اور پہلی حالت ہے لم یکن شیئاً مذکورا) تب اور زیادہ ایمان کے ساتھ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہم اس کی ذات و حقیقت سے محض نابلد ہیں۔ کیونکہ آج کے دور میں ذات باری تعالیٰ کے ادراک کے ماورا کچھ ایسی چیزیں ہمارے سامنے موجود ہیں جن کا احاطہ کرنے سے ہم محض قاصر ہیں۔ مثلاً کہربا "Electricity" اور ایتھر Ether۔ ان دونوں کا وجود بھی ہم دیکھ رہے ہیں۔ یہ بھی محسوس کر رہے ہیں کہ آواز اور روشنی دونوں اس کہربا "Electricity" اور ایتھر کی موجوں کے دوش پر ادھر سے ادھر منتقل ہو رہے ہیں۔ لیکن جب ہم ان کی ماہیت دریافت کرنے پر توجہ دیتے ہیں تو ہماری بے بسی ہمیں پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ اسی طرح ہم اللہ عزوجل کی صنعت کے گوناگوں شواہد تو دیکھتے ہیں لیکن ان ہی صنعتوں کو ان کی حقیقتِ ذات کی تصدیق میں آلہ کے طور پہ استعمال کرنے کا تہیہ کر لیں تو ظاہر ہے یہ کاوش و کاہش خود ہماری کم عقلی پر ختم ہو گی۔ اس لئے کہ ذات واجب الوجود ہماری حدِ ادراک و تعینِ سے بالاتر ہے۔ اور اس کی ذات کا ادراک کرنے میں وہی لوگ منہمک ہیں جو انسانیت کے حدود و فرائض کو متعین کرنے سے دامن سمیٹ کر واجب الوجود کی تحقیقِ ماہیت ان آلات و ذرائع سے کرنے بیٹھ جاتے ہیں جو ذرائع ہماری عقلِ محدود نے تجویز فرمائے ہیں۔

دوسرا گروہ

واجب الوجود کی اصل حقیقت کی تلاش میں دوسرا گروہ وہ ہے جن کا تجسّس اور ادراک کا ذریعہ پہلے گروہ کے آلات و ذرائع سے مختلف ہے۔ جب یہ گروہ اس مسئلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو قرآن حکیم کی یہ آیت انہیں روک دیتی ہے اور وہ ویسئلونک عن الروح! قل الروح من امر ربی اور آپ سے روح کے بارہ میں سوال کرتے ہیں کہہ دو کہ وہ میرے پروردگار کا ایک حکم ہے وما اتیتم من العلم الا قلیلا (85:17) اور تم کو بہت ہی کم علم دیا گیا ہے۔ یہاں پہنچ کر مطمئن ہو جاتا ہے اور خالقِ روح پر ایمان رکھنے کی بدولت اس کا دل سرور و انبساط سے بھر جاتا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ بے جا قیل و قال سے اپنا دامن بچا کر گوشہ عافیت

میں چلے جاتے ہیں۔

مسلمان اور مومن کا فرق

قرآن مجید مسلمان اور مومن دونوں کا فرق بیان کرتا ہے۔

قالت الاعراب آمنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم (14:49)

دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے (بلکہ یوں) کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں اور ایمان تو ابھی تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا۔

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اس قسم کا اسلام یا تو خوف و امید کا کرشمہ ہے یا مسلمان کے گھر میں پیدا ہونے کی وجہ ہے اور اس شخص نے اپنے آپ پر اسلام کا لیبل چپکانا ضروری سمجھ لیا ہے یا اس شخص نے اسلام کی روایتی تقدیس کی وجہ سے اپنے آپ کو اس سے چپکا رکھا ہے۔ مگر نہ تو اس کے دل میں اس کو جگہ ملی نہ ایسے شخص نے اس کی حقیقت کو سمجھا۔ قرآن ایسے مسلمانوں کے بارہ میں فرماتا ہے۔

یخدعون اللہ والذین امنوا وما یخدعون الا انفسھم وما یشعرون۔ فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا۔ (10:9)

یہ لوگ اپنی (سمجھ میں) اللہ تعالیٰ اور ایمان والوں کو چکمہ دیتے ہیں مگر حقیقت میں لوگ اپنے سوا کسی کو چکمہ نہیں دیتے اور اس سے بے خبر ہیں۔ ان کے دلوں میں مرض ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا مرض اور زیادہ کر دیا۔

گویا ایسے لوگ مسلمان تو ہیں مگر مومن نہیں کہلا سکتے۔ ان کی روح ہمیشہ ضعیف، عقیدہ ہمیشہ متزلزل اور ان کے دل ہمیشہ غیروں کی اطاعت و فرماں برداری کرنے پر مائل رہتے ہیں۔

مگر جو لوگ سمجھ کر ایمان لائے ان کے دل ایمان صادق پر قائم رہتے ہیں اور اللہ کے سوا کسی کے حکم کے سامنے نہیں جھکتے اور نہ کسی پر اپنے مسلمان ہونے کا احسان ظاہر کرتے ہیں۔

بل اللہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان ان کنتم صدقین۔ (17:49)

بلکہ اللہ عزوجل کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں (ایمان عطا فرمایا) "ایمان کا رستہ دکھایا۔ تاکہ تم سچے مسلمان ہو۔

اس شخص کا اسلام یقیناً قابل قدر ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے اسے اختیار کرے اور وہی شخص مومن ہے جسے قیامت کے دن نہ غم ہو گا نہ ملال ہو گا اور ایسے مومنین کو نہ تو

دنیا میں محتاجی اور ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا نہ آخرت میں رسوائی دیکھنا پڑے گی۔ ایمان باللہ کا صلہ عزتِ نفس اور استغناء ملتا ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والوں کے لئے ہمیشہ کی عزت ہے۔ اور سعید روحیں ہمیشہ ایسے ہی ایمان کے حصول کی کوشش کرتی ہیں تاکہ خود کو اسرار کائنات کے قریب لے جا کر قربتِ الٰہیہ حاصل کریں۔

اسرارِ کائنات پر آگہی کا ذریعہ

اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق کا مطالعہ ایسی گہری نظر سے کیجئے جس کی دعوت کا علم قرآن حکیم پیش کرتا ہے۔ اس طرح جس جس طرح دور اول میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان والوں نے مطالعہ کیا جن کے طریقہ تحقیق کا مقصد یہ نہیں تھا جو موجودہ یورپ کے پیش نظر ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ انسان تحقیق کے وسیلے سے اس نظم و ضبط کی حقیقتوں کو پہچانے جو اللہ تعالیٰ نے کائنات کے لئے لکھی ہیں تاکہ انسان خود کو ان سے وابستہ کر کے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فیض یاب ہو سکے! جبکہ یورپ کے پیشِ نظر حقائق پر عبور حاصل کر کے صرف دنیوی سامان تعیش حاصل کرنا ہے۔ مگر دین اسلام ہر وسیلہ اور ذریعہ کو اللہ تعالیٰ کی پہچان کے لئے استعمال کرنے کا حکم فرماتا ہے۔ اس لئے کہ انسان کو معرفت میں جس قدر وسیع علم حاصل ہو گا اسی قدر اس کے ایمان و ایقان میں اتنا ہی اضافہ ہو گا اور آخر اسی عرفان کی وساطت سے اسے جماعت کے سودو بہبود کا احساس ہو گا نہ کہ یورپ کی مانند صرف منفعت کا ہی خیال رہے کیونکہ روحانی کمالات کی وسعت انفرادی مصالح کو اپنے دامن میں جگہ نہیں دیتی وہ تو مشرق و مغرب حتی کہ چاروں اطراف کو اپنے دامن میں لپیٹے ہوئے ہے۔ اس لئے مادی منافع کو روحانی کمالات پر نثار کر دینا ازحد مفید ہے۔

مگر ایسی انمول دولت کو حاصل کرنے کے لئے صرف قیل و قال ہی کافی نہیں۔ بلکہ علم کے ساتھ عقل و ذہن کو بروقت اس طرف متوجہ رکھنا ضروری ہے اور یہ نعمت بارگاہ الٰہی کی امداد اور قلب و روح دونوں کو اللہ رب العزت کے سپرد کر دیئے بغیر حاصل ہی نہیں ہوتی۔ کیونکہ صرف ذات باری تعالیٰ ہی عبادت کی مستحق ہے اور اسی کی توجہ سے کائنات کے سربستہ راز کھلتے ہیں اور زندہ رہنے کے آداب معلوم ہوتے ہیں۔ یہی ذریعہ تقرب الٰہی کا موجب ہے۔ ہم جو اس کی نعمتوں پر اظہار تشکر میں تساہل برت رہے ہیں۔ ہم اس سے لطف و کرم کے خواہش مند ہیں کہ وہ اس منزل پر ہمیں فائز المرام فرما ہونے میں ہماری مدد فرمائے جس منزل سے ہم بحکم قرآن دور پڑے ہوئے ہیں۔

دعا اور استعانت

واذا سالک عبادی عنی فانی قریب احیبب دعوۃ الداع اذا دعاف فلیستجیبوالی والیومنوابی لعلھم یرشدون- (186:2)

اے میرے رسول جب میرے بندے تم سے سوال کریں تو کہہ دو میں تو تمہارے پاس ہوں جب کوئی پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی دعا قبول کرتا ہوں تو ان کو چاہئے کہ میرے حکموں کو مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک رستہ پائیں-

دوسری جگہ اور ارشاد فرمایا-

واستعینوابالصبر والصلوۃ وانھا لکبیرۃ الاعلی الخاشعین- الذین یظنون انھم ملاقواربھم وانھم الیہ راجعون- (46-45:2)

اور مجھ سے صبر اور صلوٰۃ کے ذریعہ مدد مانگا کرو اور بیشک قیام صلوٰۃ مشکل ہے مگر ان لوگوں کے لئے مشکل نہیں (گراں نہیں) جو عاجزی کرنے والے ہیں اور جو لوگ یقین کئے ہوتے ہیں کہ اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں اور اس کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں- یہ حقیقت ہے کہ ہمارے ایمان و یقین میں یہی کمزوری ہے کہ ہم اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے محروم سمجھتے ہیں- اگر یقین ہو تو پھر قیامِ صلوٰۃ ہمارے لئے مشکل نہیں ہے-

صلوٰۃ

قیامِ صلوٰۃ جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بڑھانے کا دوسرا نام ہے اور مدد و نصرت کی جستجو سے تعبیر ہے- صلوٰۃ رکوع و سجود اور تلاوت و تکبیر ہی کو نہیں کہتے بلکہ اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ جس سے دل میں ایمان ابھرے- تقدیس و احترام کے جذبات پیدا ہوں اور عقل و خرد کو اس ذاتِ حقیقی کی طرف پرواز کرنے کے مواقع نصیب ہوں- ارشاد ربانی ہے-

لیس البر ان تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من امن باللہ والیوم الاخر والملائکہ والکتاب والنبین واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتمی والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوۃ واتی الزکوۃ والموفون بعھدھم اذا عاھدوا والصابرین فی الباساء والضراء وحین الباس والئک الذین صدقوا واولئک ھم المتقون- (177:2)

نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق یا مغرب کو قبلہ سمجھ کر منہ پھیر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ پر فرشتوں پر اللہ تعالیٰ کی کتاب پر انبیاء اور رسل پر ایمان لائیں- اور مال باوجود عزیز رکھنے کے رشتہ داروں، یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کریں اور قیامِ صلوٰۃ کریں- زکوٰۃ دیں اور جب عہد کریں تو اس کو پورا کریں اور سختی

اور تکلیف میں اور معرکہ کارزار کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ایمان میں سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والے ہیں۔

یہ ہے وہ تعارف جو اللہ تعالیٰ خود ایمان والوں کے اوصاف کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتا ہے۔ جس کسی میں یہ اوصاف نہیں اسے ماننا ہو گا کہ وہ نیک آدمی نہیں۔

صادق الایمان مومن

سچا مومن تو وہ ہے جو سچے دل سے قیام صلوٰۃ کرے بلکہ زندگی کے ہر کام میں ہر بات میں اپنے آپ کو بارگاہِ الٰہی کی حقیر مخلوق سمجھے۔

مثال کے طور پہ جب ہم طیارے میں پرواز کرتے ہوئے فضا کے بلند ترین منطقہ پہ جا پہنچتے ہیں اور نیچے کی طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو سربلند پہاڑوں اور سینکڑوں میل پھیلے ہوئے دریاؤں اور بڑے شہروں کو ہم ایسے دیکھتے ہیں جیسے کسی نقشہ پہ چھوٹے چھوٹے نشان اور مدھم سے خط کھینچے ہوئے ہیں۔

سربفلک پہاڑوں کی بلندی پرایک نقطہ کی طرح بہتی ہوئی نہریں خط کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ زمین کے تمام نشیب و فراز ایک سے ہو کر رہ گئے۔ نقطہ نظر آتا ہے۔ یا ذرا سی لکیر۔ پھر جوں جوں طیارہ بلندی کی طرف بڑھتا جاتا ہے یہ نقطے اور خط چھوٹے ہوتے جاتے ہیں۔ زمین جو ہزاروں لاکھوں افلاک اور ستاروں کو اپنی گود میں لئے بیٹھی تھی وہ بھی ایک موہوم سا نقطہ یا گلی کی طرح دکھائی دینے لگتی ہے۔

ان مثالوں کو مدِ نظر رکھ کر نسان کو اپنی طرف دیکھنا چاہئے جو ان پر شکوہ کروں' دریاؤں اور پہاڑوں کے مقابلہ میں ذرہ بے مقدور سے بھی کم درجہ پہ ہے۔ خالق کائنات اور مدبر ہستی جس کی عظمت و برتری اس انسان کی عقل و خرد سے بہت ہی بلند و بالا ہے۔ ایسی ذات گرامی کے سامنے یہ انسان کس قدر کم درجہ ہے لہٰذا انسان جیسی بے بس و کمزور ہستی کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ جب ادائے صلوٰۃ کے لئے اللہ عزوجل کی بارگاہ میں حاضر ہو تو اپنی قوت اور ہدایت کے لئے اس بلند بالا ذات سے امداد طلب کرے۔

انسان کو یہ حقیقت کبھی نہیں بھولنی چاہئے وہ اللہ عزوجل کے حضور حقیر محض ہے اور اس تصغیر کی تلافی نہ تو مال و زر سے ہو سکتی ہے نہ اس کا دنیاوی منصب و جاہ اسے پورا کر سکتا ہے۔ البتہ ایمان خالص اور خضوع الی اللہ جس کے دائیں اور بائیں نیکی اور تقویٰ ہے جو انسان کو ایسا مطلوبہ ایمان حاصل کرنے کے لئے اس کی طبعی بے چارگی اور بے مائگی کے اعتراف کا سرمایہ عطا کر سکتے ہیں۔

یورپ کا قانون جو گذشتہ آخری صدیوں میں منضبط ہوا اسلامی ساوات کے آئین کے مقابلہ میں اتنا کمتر قانون ہے کہ اسکی بناء پر بہت سے مغربی دانشور انسانوں میں اصل مساوات کے امکان سے انکار پر مائل ہیں۔ بعض کو بعض پر مخصوص حالت میں مراعات دیا جانا فطری امر ہے۔

لیکن ازروئے اسلام قیام صلوٰۃ کی صورت میں جو مساوات ظاہری طور پہ نظر آتی ہے۔ وہ اسلام میں آزادی فکر کا ثبوت ہے۔ مگر یورپ میں انسانی مساوات کا یہ قحط ہے کہ ایک دوسرے کا مال فریب اور منافقت کے ساتھ پوری دیدہ دلیری سے ہتھیا لیا جاتا ہے۔ اور قانون ہی کی رعایت سے ایسے ذلیل انسان کو بچالینا سوا سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی اور مغربی قانون مساوات میں فرق ہے۔

قیام صلوٰۃ میں مساوات کا سبق

قیام صلوٰۃ میں اللہ تعالیٰ کے حضور مساوات انسانی برادری کو یہ نکتہ سمجھاتی ہے کہ وہ سب ایک دوسرے کے بھائی اور ایک ہی خالق کی عبادت میں شریک ہیں۔ انہیں یقین ہونا چاہئے کہ عبادت کے لائق سب کا ایک خالق و مالک اللہ وحدہ لاشریک ہے۔ اور مسلمان انسان کی اس برادری کا نام ہے جسے قرآن کی صورت میں دستور عطا فرمایا گیا ہے اور یہی قرآن اس برادری کو فکرو تدبر کی وہ لازوال نعمت عطا فرماتا ہے جو انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ارتقاء میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ اسلام نے انسان کو فکرو عمل میں جس قدر آزادی' باہمی اخوت اور مساوات دی ہے کوئی اور قوم اس کی مثال پیش کر سکتی ہے جس کے ماننے والے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک صف میں دست بستہ کھڑے ہوں۔ سب کے سب بیک وقت خشوع و خضوع میں سرشار' تکبیرو رکوع اور سجدے میں ہم آہنگ و ہم نوا متوجہ ہوں کسی ایک کو کسی دوسرے پر ترجیح نہیں۔ کسی کو کسی پر امتیاز حاصل نہیں۔ ہر ایک توبہ استغفار اور طلب استعانت کا بھکاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور میں سوائے نیکی اور تقویٰ کے اور کوئی ذریعہ فلاح و نجات ہی نہیں۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

جب انسانی برادری اس مسلک پہ قائم ہو جاتی ہے تو اس کی عبادت اس کے دل اور روح کو دنیا کے لالچ اور دنیا کی آلائشوں سے پاک کر دیتی ہے پھر وہی انسانی برادری اپنے اور بیگانے سب کے لئے محبت و اخوت ایثار' وفا کی علامت بن جاتی ہے۔

فلسفۂ صوم

تقویٰ کے اعتبار سے تمام انسان احکامِ الٰہیہ بجالانے میں یکساں نہیں ہو سکتے۔ اس لئے کہ ہمارے جسم مادیت کی وجہ سے ہماری روحوں پر ہمیشہ غالب رہتے ہیں۔ اگر ہم ادائے صلوٰۃ میں رکوع و سجود اور قرأت پر اکتفا کر کے دلوں کو اللہ عزوجل کی طرف متوجہ نہ کریں۔ تو یہ مادی اجسام روح کو پژمردہ کر دیتے ہیں اور حیوانیت انسان پر غالب آ جاتی ہے۔ اس کے انسداد کے لئے ایسے اعمال ضروری ہیں جو روح کو جسم پر غالب اور انسانیت کو حیوانیت پر مختار بنا دیں۔ اسلام نے انسان میں ایسے اعمال کی پرورش کے لئے صوم کو ذریعہ بنایا ہے اور اسے ہمارے روحانی مدارج میں ترقی اور ہمارے تقویٰ کو توانا بنانے کا سبب قرار دیا ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر روزے (صیام) اسی طرح فرض کیے گئے ہیں جیسے تم سے پہلوں پر فرض کیے گئے تاکہ تم میں تقویٰ کے اوصاف پیدا ہوں۔

نیکی اور تقویٰ

نیک وہی شخص ہے جو تقویٰ کی نعمت سے مالا مال ہے۔ اللہ وحدہ لاشریک پر، قیامت پر، فرشتوں، آسمانی کتابوں، انبیاء اور رسل پر ایمان رکھتا ہے۔ جو مذکورہ آیت کے ایک ایک حرف کے مطابق اعمال کا مالک ہے!

صوم اور شب خوری

یاد رکھئے اگر آپ سمجھتے ہیں کہ صوم کا یہ مقصد ہے کہ جسم روح پر مسلط ہی رہے اس کے اندر پلنے والی حیوانی عادات کو اور زیادہ توانا کرتا رہے تو آپ غلطی پر ہیں۔

ذرا سوچئے طلوع فجر سے لیکر غروب آفتاب تک نفسانی خواہشات اور ضرورتوں سے اپنے آپ کو روکے رکھنے کے بعد رات شروع ہوتے ہی شکم پری اور دوسری لذتوں پر ٹوٹ پڑنا مقصدِ صوم کا ترجمان بھی ہے یا نہیں؟ حاشا و کلا۔ صوم کا مقصد یہ نہیں ہے۔ یہ کیسا روزہ کہ انسان دن بھر کھانے پینے سے ہاتھ روکے اور جونہی آفتاب غروب ہو ایک دم ان چیزوں پر جھپٹ پڑے جو دن میں اپنے آپ پر حرام کر رکھی تھیں۔ یہ تو اپنے خلاف اللہ تعالیٰ کو گواہ بنانے کے مترادف ہے۔ ایسے شخص نے تزکیہ نفس اور انسانیت کو سربلند کرنے کے لئے خود پر کھانا پینا حرام نہیں کیا بلکہ اس نے ایمان کو مدِ نظر رکھ کر روزہ دار رہنے کے بجائے دن بھر ناحق خود پر

پابندی لگا رکھی اور جیسے ہی ان کا نور زائل ہوا تو اشیاء کا مسرفانہ استعمال شروع کر دیا۔ ایسے شخص کی مثال اس چور کی سی ہے جو چوری کرنے سے اس لئے باز نہیں رہتا کہ یہ فعل انسانیت کے منافی ہے بلکہ درحقیقت وہ قانون کی گرفت سے ڈر کر چوری نہیں کرتا۔

روزہ کی حقیقت

روزہ کو اس نگاہ سے دیکھنا کہ یہ صرف چند قسم کی لذتوں سے محرومی کا نام ہے سراسر غلط اور بے معنی ہے۔ ایسا روزہ بے سود ہے۔ روزہ تو تزکیہ نفس کا وہ ذریعہ ہے جسے عقل واجب سمجھتی ہے۔ روزہ دار اپنے اختیار سے نفس کو مادی لذتوں سے دور رکھنے کا فیصلہ کرتا ہے اور اپنے اختیار کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مکمل طور پہ دینے کے بعد وہ خود کو بلند ترین مقام تقویٰ پر پہنچا دیتا ہے۔ فرضیتِ صوم سے اللہ تعالیٰ کا مقصد مذکورہ آیت نمبر 103:2 میں بیان فرماتے ہوئے یہ بھی فرمایا۔

ایاما" معدودات فمن کان منکم مریضا" او علیٰ سفر فعدۃ من ایام اخر
صیام کے دن گنتی کے چند روز ہیں تو جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں روزوں کا شمار پورا کرے۔

وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین فمن تطوع خیرا" فھو خیر لہ وان تصوموا خیر لکم ان کنتم تعلمون۔ (184:2)

اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے، تو وہ صوم کے بدلے محتاج کو کھانا کھلا دیں اور جو کوئی شوق سے نیکی کرے تو اس کے حق میں زیادہ اچھا ہے۔ اور اگر سمجھو تو روزہ رکھنا ہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

روزہ کے اخلاقی فوائد

ہم روزہ کی قوت سے آزادیٔ عزم اور حریّتِ فکر کو زیادہ توانا کر کے اپنی روحانی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں۔ لیکن یہی بات جب ہم غیروں کے سامنے کہتے ہیں تو انہیں بڑی عجیب و غریب بات لگتی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ہاں سے روحانیت کی بنیادوں کو جڑ سے ہی اکھاڑ کر پھینک دیا ہے۔ اور قصرِ قوت و مادیت کے مینار اپنی فوجی قوت کی امداد سے آسمان تک پہنچا رکھے ہیں۔ انسان فکرِ نو کی روشنی میں دوسروں کے مال اور نفس پر تصرف کا مستحق نہیں اسے صرف اپنی ذات پر اختیار ہے اگرچہ اس کا اختیار عقل اور قانون کے خلاف کیوں نہ استعمال ہو لیکن حقیقت ایسے قانون کے خلاف گواہی دیتی ہے۔

عادت غیر متبدل شے ہے

مثلاً انسان عادت کا بندہ بھی ہے جس عادت کے مطابق وہ صبح، چاشت اور شام تینوں وقتوں میں کھانے کا عادی ہے اب اگر اس سے یہ تقاضا کیا جائے کہ صبح کا ناشتہ ترک کر کے صرف چاشت اور شام پر اکتفا کر لے تو اتنا اختصار بھی وہ ایسی عادت پر پابندی عائد کرنا سمجھ بیٹھے گا۔

اسی طرح جن لوگوں کو تمباکو نوشی کی عادت ہے۔ وہ ایک لمحہ بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اب اگر ان کو دن کے وقت تمباکو نوشی سے منع کر دیں تو ظاہر ہے وہ اسے اپنی آزادی پر بے محل محاسبہ تصور کریں گے۔

اسی طرح جس طرح بعض لوگ مقررہ وقت پر قہوہ، چائے یا کسی خاص قسم کے مشروب کے عادی ہو چکے ہیں۔ اگر ایسے حضرات سے صرف اوقات کی تبدیلی کا تقاضا کیا جائے تو وہ سے اپنی آزادی پر حرف سمجھ کر چلا اٹھیں گے چہ جائیکہ محض وقت کی تبدیلی ان کی آزادی پر ضرب نہیں لگاتی۔ مگر وہ اس کو بھی سلبِ حقوق کے سوا کوئی اور نام دینے کو تیار نہیں ہوں گے۔

ظاہر ہے کہ ہر مزمن (پرانی) عادت فکر کی سلامتی کے لئے خطرہ سے مبرا نہیں ہو سکتی، اس لئے ایسے حضرات بھی ہفتہ یا مہینہ میں ایک نہ ایک روز اپنی ایسی عادت میں اعتدال پیدا کرنے کی کوشش جاری رکھتے ہیں۔ ان کی یہ احتیاط بھی تو ایک قسم کا روزہ ہی ہے مگر اس کے مقابلہ میں اسلام میں روزہ اپنی نوعیت اور افادیت میں سب سے منفرد ہے۔

معین اوقات میں روزہ کی مصلحت

اللہ جل شانہ نے مسلمانوں کی آسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے سال بھر میں مقررہ دنوں کے روزے فرض فرمائے ہیں۔ جن کی تعمیل امیر اور غریب سب پر ہے اور ان کی قضاء کے عوض ناتواں پر فدیہ ہے، مگر مسافر اور مریض کے ذمہ قیام و صحت کی حالت میں قضا واجب ہے۔

صرف مقررہ دنوں میں روزہ کی پابندی بدنی ریاضت سے قطع نظر باہمی اخوت کا بھی ذریعہ ہے۔ جس میں ہر ادنیٰ و اعلیٰ غریب و امیر توانا مساویانہ حیثیت سے روحانی ریاضت کے ساتھ اللہ جل شانہ کے حضور میں پیش ہوتا ہے۔ سفیدیٔ سحر سے لیکر آغازِ شب تک پورا معاشرہ باجماعت قیام صلوٰۃ کی طرح ایک ہی انداز میں صاحبِ صوم ہے۔ اس صورت میں ان سب میں باہمی مساوات کا احساس بدرجہ کمال پیدا ہونا لازمی امر ہے۔ روزہ رکھنے سے پہلے جو ایک دوسرے میں فرق نظر آتا تھا وہ کالعدم ہو جاتا ہے۔

روزہ زندگی کی مشکلات میں دلیلِ راہ ہے

اسی طرح جب ہم اپنے اختیار سے روزہ رکھتے ہیں تو ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ

عقل اگر زندگی کے صحیح مقاصد سمجھ لے تو اللہ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے روزہ رکھنا نہ تو بعید از عقل ہے نہ ہماری عادت پر کاری ضرب بلکہ یہ عادت کی غلامی سے انسان کو آزادی دلا کر نہ صرف ہمارے اندر قوتِ ارادی عزم و استقلال کے اوصاف کی قوت عطا فرماتا ہے۔ بلکہ روحانی کمال حاصل کرنے کے لئے اپنی کسی بھی عادت پر قابو پانے کے حوصلے بھی بخشتا ہے۔ جس سے ایمان کی مشکل اور طویل منزلیں آسانی سے طے ہو جاتی ہیں۔

تقلیدی روزہ

جس طرح تقلیدی ایمان مسلمان کے لئے کافی نہیں اسی طرح تقلیدی روزہ بھی بے سود ہے۔ ایسا روزہ دار دل میں یہ سمجھتا ہے کہ روزہ اس کے کھانے پینے پہ پہرہ کے سوا کچھ بھی نہیں ایسا روزہ دار یقیناً حقیقی کیف و سرور سے محروم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ روزہ دراصل انسان کو عادت کی قید سے رہائی دلا کر اس کی روح کو قوی اور طاقتور بنا دیتا ہے۔

زکوٰۃ اور صدقہ

جب انسان کی روحانی قوت اسے اسرارِ کائنات کے قریب لے جاتی ہے تو اس پر اپنی اور بنی نوعِ انسان کی قدر و منزلت واضح ہو جاتی ہے۔ اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہم سب ایک ہی وجود کے مختلف مظاہر ہیں۔ تب وہ دوسرے انسان کے ساتھ محبت کرنے کے لئے بے تاب ہو جاتا ہے۔ اس کے دل میں ہر شخص کو اپنا بھائی سمجھنے، نیکی اور حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آنے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ طاقتور کو ناتواں پر رحم دولت مند کو غریب کی مالی امداد کرنے کی خواہش خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ امداد اگر نصاب کی حد تک ہے تو زکوٰۃ اور اگر اس سے زائد ہے تو صدقہ کہلائے گی۔

نماز کی طرح زکوٰۃ بھی عبادت میں شامل ہے

قرآن مجید میں کئی جگہ زکوٰۃ اور صلوٰۃ کا ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے۔ جیسا کہ قارئین اس آیت میں مطالعہ فرما چکے ہیں۔

لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق والمغرب ولکن البر من آمن باللہ والیوم الاخر والملائکۃ والکتاب والنبیین واتی المال علی حبہ ذوی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوۃ واتی الزکوۃ۔ (177:2)

نیکی یہ نہیں کہ تم مشرق و مغرب کو قبلہ سمجھ کر ان کی طرف منہ کر لو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ

اللہ پر، فرشتوں پر، اللہ تعالیٰ کی کتاب پر، رسل اور انبیاء پر ایمان لائیں اور اپنے عزیز ترین مال کو رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں اور مسافروں اور مانگنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں استعمال کریں اور اقامتِ صلوٰۃ کے پابند ہوں اور زکوٰۃ ادا کرنے کے پابند ہوں۔

اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ انسانی برادری کو ایسے اجتماعی عمل کی ہدایت فرماتے ہیں جس میں انسانیت کو نوازنے والے اخلاق کی پرورش ہوتی ہے۔

اقیموا الصلوۃ واتو الزکوۃ وارکعوامع الراکعین (43:2)

اقامتِ صلوٰۃ کی پابندی کے ساتھ زکوٰۃ بھی ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ مل کر رکوع کرو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

قد افلح المومنون الذین ھم فی صلوٰتھم خاشعون والذین ھم عن اللغو معرضون والذین ھم للزکوۃ فاعلون۔ (33-4تا1)

بے شک ایمان والوں کے مقدر میں فلاح لکھی جا چکی ہے۔ ایمان والے وہ ہیں جو نماز میں عجزو نیاز کرتے ہیں۔ بے ہودہ باتوں سے کتراتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔

صدقہ ایمان کا ہم پلہ ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے زکوٰۃ اور صدقہ کا حکم بار بار ارشاد فرمایا ہے جس میں کہیں صدقہ کو نیک اور مفید امور میں ثواب حاصل کرنے کا وسیلہ قرار دیا ہے اور کہیں اسے ایمان کا ہم پلہ قرار دیا ہے۔

خذوہ وغلوہ ثم الجحیم صلوہ ثم فی سلسلۃ ذرعھا سبعون ذراعاً فاسلکوہ انہ کان لایومن باللہ العظیم ولا یحض علی طعام المسکین (34-30:69)

حکم ہو گا اسے پکڑ لو اور طوق پہنا دو۔ پھر دوزخ کی آگ میں جھونک دو پھر زنجیر سے جس کی ناپ ستر گز ہے اس سے جکڑ دو۔ یہ نہ تو اللہ جل شانہ پر ایمان لاتا تھا نہ فقیر کے کھانا کھلانے پر آمادہ ہوتا تھا۔

اپنے معاشرہ میں جائزہ لیجئے کتنے فرعون آج بھی موجود ہیں۔

ایک اور مقام میں فرمایا۔

وبشر المخبتین الذین اذ ذکر اللہ وجلت قلوبھم والصابرین علی ما اصابھم والمقیمی الصلوۃ ومما رزقناھم ینفقون۔ (22:34-35)

اور عاجزی کرنے والوں کو خوش خبری سنا دو۔ یہ وہ لوگ ہیں جب اللہ جل شانہ کا نام ان کے سامنے لیا جاتا ہے۔ تو ان کے دل کانپ جاتے ہیں اور جب ان پر مصیبت پڑتی ہے تو صبر کرتے

ہیں اور قیام صلوٰۃ کرتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے۔ اس میں سے نیک کاموں پر خرچ کرتے ہیں۔

اور تیسری جگہ فرمایا۔

صدقہ ہر عقیدہ و عمل سے برتر ہے

الذین ینفقون اموالهم باللیل والنهار سرا وعلانیة فلهم اجرهم عند ربهم ولا خوف علیهم ولا هم یحزنون۔ (274:2)

اور جو لوگ اپنا مال رات اور دن پوشیدہ اور ظاہر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور ان کو قیامت کے دن نہ کسی کا خوف ہو گا نہ غم۔

قرآن حکیم میں صدقہ کا تذکرہ محض ایمان باللہ یا صرف نماز کے اجرو ثواب کا ہم پلہ ہی قرار دینے کے لئے نہیں کیا گیا ' بلکہ اس صدقہ کی مدح میں ایسا عجیب پیرا یہ اختیار فرمایا کہ گویا صدقہ ہر عقیدہ اور عمل سے زیادہ افضل ہے۔

ان تبدوا الصدقات فنعما هی وان تخفوها وتوتوها الفقراء فهو خیر لکم۔ (27:2-1)

اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہل حاجت کو تو وہ خوب تر ہے۔

اور یہ کہ

قول معروف ومغفرة خیر من صدقة یتبعها اذی واللہ غنی حلیم۔ (263:2)

جس خیرات دینے کے بعد (لینے والے کو) ایذا دی جائے اس سے تو نرم بات کہہ دینا (اور اس کی بے ادبی سے) درگزر کرنا ہی بہتر ہے۔ اور اللہ بے پرواہ اور بردبار ہے۔

یاایها الذین امنوا لاتبطلو صدقاتکم بالمن والاذی کالذی ینفق ماله رئاء الناس۔ (263:2)

اے ایمان والے لوگو اپنے صدقات (خیرات) کا لینے والوں پراحسان مت رکھو اور انھیں ایذا دے کر اپنا ثواب اس شخص کی طرح برباد نہ کر دینا جو لوگوں کے دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہے۔

مستحقین صدقہ

انما الصدقات للفقراء والمساکین والعملین علیها والموالفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین فی سبیل اللہ وابن السبیل فریضة من اللہ واللہ علیم حکیم۔

(40:9)

صدقات (یعنی زکوٰۃ و خیرات) تو مفلسوں اور محتاجوں اور کارکنانِ صدقات کا حق ہے اور ان لوگوں کا جن کی تالیف قلوب منظور ہے اور غلاموں کے آزاد کرانے میں اور قرضداروں (کے قرض ادا کرنے میں) اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کی مدد) میں (بھی یہ مال خرچ کرنا چاہئے) (یہ حقوق) اللہ کی طرف سے مقرر کئے گئے ہیں اور اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔

ثابت ہوا کہ زکوٰۃ اور صدقہ دین اسلام میں ایک اہم فریضہ اور دین کا رکن ہے۔ البتہ ایک سوال یہ ہے کہ آیا اسے اجزائے عبادت میں شمار کیا جائے یا محض اخلاق و تہذیب کا مظاہرہ کہا جائے واللہ زکوٰۃ اور صدقہ بھی عبادت ہیں۔ جس کی مقصد یہ ہے کہ ہر مسلمان ایک دوسرے کا بھائی ہے اور مومن کا ایمان اس وقت تک کامل نہیں ہوتا جب تک اسے دوسرے بھائی کیلئے وہی گوارا نہ ہو جو وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ کیونکہ مومن اللہ تعالیٰ کے نور کی روشنی میں اپنے بھائی کے ساتھ والہانہ محبت کرتا ہے۔ اور فریضہ صدقہ و زکوٰۃ اس جذبہ اخوت کو ایک دوسرے کو قریب تر کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اسے صرف اخلاق یا عام باہم معاملوں سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ ایمان اسی عمل سے کامل ہو سکتا ہے جو باہمی اخوت کو مستحکم کرے اور ایمان باللہ کی تکمیل کا باعث ہو۔ اسی عمل کا نام حقیقی عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زکوٰۃ کو اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رکن قرار دیا گیا۔

خلیفۃ الرسول ﷺ نے زکوٰۃ کو جزو ایمان قرار دیا

یہی سبب ہے وصال رسالت مآب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بعد خلیفۃ الرسول ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے زکوٰۃ کا مطالبہ کیا تو بعض لوگوں کے انکار پر خلیفۃ الرسول ﷺ نے اسے ان کے ضعف ایمان کا ثبوت سمجھا۔ گویا یہ لوگ مال کو ایمان پر ترجیح دے کر بغاوت کا ارتکاب کر رہے ہیں جو قرآن کے روحانی نظام سے مرتد ہونے کی دلیل ہے۔

اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے واقعہ ہی ان لوگوں کو مرتد قرار دے کر ان کے ساتھ جنگیں کیں جو ”حروب الردہ“ کے نام سے مشہور ہیں۔ اور خلیفۃ الرسول ﷺ اپنے اس کردار کی بناء پر اسلام کی وحدت کو از سرِنو مربوط کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

صدقہ کی اہمیت

اسلام نے صدقہ و زکوٰۃ کو جس جلی عنوان کے ساتھ ایمان کا ایک جزو قرار دیا ہے وہ اپنی ذات میں معاشی اصلاح کا وہ جوہر رکھتا ہے کہ اگر متمدن اقوام اس پر عمل پیرا ہوں تو بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا فریضہ بڑے احسن طریقہ سے سرانجام دے سکتی ہیں۔ اس کے برعکس

مال و زر کو خزانوں میں جمع رکھنا اور دوسروں پر غلبہ حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہنے کا ثمر نہ صرف عوام کی ذلت بلکہ خونریز جنگوں کا منبع ثابت ہو سکتا ہے۔ جسے مادہ پرستی کی نحوست کا ثمر کہنا غلط نہ ہو گا۔ اسی مادہ پرستی کی بدولت اخوت جیسی نعمت سے منہ موڑ کر دوسرے بھائی کی دشمنی پر کمر باندھ لی جاتی ہے۔

اگر مادہ پرست غور کریں تو انہیں اخوتِ انسانی کے سامنے مادیت پرستی سے دست بردار ہوئے بغیر کوئی چارہ کار ہی نہیں۔ کاش اہلِ دولت اللہ پر ایمان لا کر انسانی برادری کا طبعی حق ادا کر سکیں۔ جس کا اولین مظاہرہ محتاجوں کو افلاس سے بچانا اور مظلوم کو چیرہ دستوں سے نجات دلا کر اس کی حرمت بحال کرنا ہے۔ جیسا کہ دورِ حاضر میں خیراتی شفاخانے اور امدادی ادارے کام کر رہے ہیں۔ جن سے انسانی زندگی کا تحفظ اور مفلوک الحال طبقہ کی اعانت مقصود ہے۔ یہی کام اگر برادری (انسانی برادری) اور تشکرِ نعمت کی صورت میں کیے جائیں تو انسان کو دلی سکون حاصل ہو اور اس کا یہ فعل بہت ہی بلند اور اونچا سمجھا جائے جیسے کہ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الآخرۃ ولا تنس نصیبک من الدنیا واحسن کما احسن اللہ الیک ولا تبغ الفساد فی الارض ان اللہ لایحب المفسدین۔ (77:28)

اور جو (مال) تم کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے اس سے آخرت (کی بھلائی) طلب کیجئے اور دنیا سے بھی اپنا حصہ لینا نہ بھلائیے۔ اور جیسے ہی اللہ تعالیٰ نے تم سے بھلائی کی ہے (ویسی) تم بھی (لوگوں سے) بھلائی کرو۔ اور ملک میں طالبِ فساد نہ بنو۔ اس لئے کہ اللہ عزوجل فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

حج

اس قسم کی برادری بنی آدم کو آپس میں محبت کے رشتے میں مربوط کر سکتی ہے۔ خیال رہے کہ اسلام نے انسانی برادری کو مستحکم اور برقرار رکھنے میں نہ تو وطن کو درخور اعتناء سمجھا اور نہ محبت و اخوت کے تقاضوں کو کسی ملک یا قطعۂ زمین پہ منحصر کیا بلکہ اسلام محبت کو لامحدود رحمتِ الٰہی قرار دیتا ہے۔ یعنی اسلامی تعلیم کے مطابق محبت کا دائرہ تمام ربعِ مسکوں کو اپنے بازوؤں میں لئے ہوئے ہے تاکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا جذبہ لئے ہوئے ہر شخص دوسرے کی طرف محبت کا ہاتھ بڑھائے۔

ایسی محبت جو ایمان زیادہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور یہی محبت انسانوں کو دور دراز سے کھینچ کر ایک ایسے میدان میں جمع کرنے پر قادر ہے جو اجتماع کیلئے بے مثل مقام ہے جس میں باہمی محبت

کا فوارہ ابل رہا ہے۔ یہ بیت اللہ ہے اس کے شہر کا نام مکہ معظمہ ہے اور مومنین کے اس اجتماع کو حج کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

حج جس کے لئے ہر مومن کی زندگی میں ایک مرتبہ تکلفِ رحلت واجب ہے اس لئے کہ شعائرِ حج ادا کرنے سے ایمان باللہ میں مزید استقامت پیدا ہو اور انسانی برادری کی قدر و قیمت میں ترقی ہو۔

الحج اشهر معلومات فمن فرض فيهن الحج فلا رفث ولا فسوق ولا جدال في الحج وما تفعلوا من خير يعلمه الله وتزودوا فان خير الزاد التقوى واتقون يا اُولی الالباب۔ (197:2)

حج کے مہینے جو معین ہیں۔ (معلوم ہیں تو جو شخص ان مہینوں میں حج کی نیت کر لے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حج کے دنوں میں نہ عورتوں سے اختلاط کرے، نہ کوئی برا کام کرے، نہ کسی سے جھگڑے اور جو تم میں سے نیک کام کرے گا وہ اللہ تعالیٰ کو معلوم ہو جائے گا اور زاد راہ (یعنی رستے کا خرچ) ساتھ لے لو اور بہترین زاد راہ پرہیزگاری ہے اور اے اہلِ عقل مجھ سے ڈرتے رہو۔

حج سے انسانی برادری کا رشتہ استوار ہوتا ہے

مومنین حج کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے تعارف سے برادری اور مواخات کا رشتہ اور استوار ہوتا ہے۔ ایمان میں مزید استقامت حاصل ہوتی ہے۔ فرقِ مراتب ختم ہوتا ہے۔ اگرچہ مومنین میں ویسے بھی کوئی فرق نہیں پھر بھی یہاں پہنچ کر تو ان میں یہ احساسِ انتہائی حد تک جوان ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سب کا درجہ یکساں ہے۔ سب کے دل میں یہ بھی خیال کہ انہیں اللہ تعالیٰ کی دعوت کو صدقِ دل سے قبول کرنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر زیادہ متوجہ رہنا چاہئے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا زیادہ سے زیادہ شکر ادا کرنا چاہئے جن میں سب سے بڑی نعمت ایمان ہے۔ جو تمام نیکیوں اور نعمتوں کا مصدر ہے۔ جس کی روشنی میں تمام وہم و وساوس شک و شبہات شکست خوردہ ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ جس کے سامنے مال اولاد اور جاہ و منصب زوال پذیر تصورات کی مانند نظر آتے ہیں۔ ایمان کی روشنی میں حقیقت، نیکی اور جمالِ حقیقی کا صحیح ادراک حاصل ہوتا ہے اور کائنات کے غیر متبدل اسرار اس کے پرتو میں روشن روشن نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرزمینِ مکہ میں حج کے موقع پر مومنین کے دل میں اخوت کا وقار اور زیادہ ہو جاتا ہے۔

اسلام کے یہ اصول محمد احمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کی صورت میں نازل ہوئے۔ یہی اصول ایمان کے ارکان ہیں جن کا تذکرہ مذکورۃ الصدر آیتوں میں کیا جا چکا ہے اور یہی اصول

اسلامی زندگی کی اساس ہیں جن کے بعد ان اخلاقی قوانین کا ذکر کیا جاتا ہے جن کی بنیاد بھی ایمان ہی ہے۔ جو اخلاق ایمان کے شجر میں پھل اور پھول کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں اور جن کا رنگ و بو دنیا کی کسی متمدن قوم کے ہاں دیکھنے میں نہیں آیا۔

قرآن حکیم نے اخلاق اور رواداری کا جو خاکہ پیش کیا ہے اس پر عمل پیرا ہونے سے انسانیت کا اعلیٰ ترین درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ان اخلاقی اصولوں کا قرآن حکیم کی ایک ہی سورت میں نہیں بلکہ متعدد آیات میں ذکر ہے۔ جن کا بدل آپ کو دنیا کی متمدن سے متمدن قوم میں نہیں ملے گا بشرطیکہ آپ کی نظر میں صرف کردار کا معیار ایمان باللہ اور تزکیہ نفس ہو۔ مادی منفعت مقصود نہ ہو۔

قرآنی اخلاق

اہلِ قلم نے مختلف زبانوں میں انسانی اخلاق کا نمونہ تحریر کیا ہے۔ شعراءٗ نثر نگار، فلاسفرز۔ سکالرز نے قدیم زمانے سے لیکر آج تک انسان کامل کی کتنی تصویریں کھینچیں ہیں۔ ان کی یہ مشقیں صفحہ قرطاس پر آج تک جاری رہی ہیں لیکن اس غیر منقطع مشق کے باوجود کوئی بھی ایسا نقشہ پیش نہیں کر سکا جو اپنے خدوخال کی رعنائی اور حسن و جمال میں اس قدر جاذب دل ہو جو قرآن حکیم کی سورۃ اسراء (بنی اسرائیل) میں مذکور ہے۔ یہ نمونہ اس حکمت بالغہ کا کرشمہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعہ اپنے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام پہ اتارا۔ جو کسی گزرے ہوئے دور کے انسان کامل کی حکایت نہیں بلکہ بنی آدم کو اس کے وظیفہ حیات سے آگاہ کرنے پہ مبنی ہر دور کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

(1) وقضیٰ ربک الا تعبدوا الا ایاہ۔

اور تمہارے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔

(2) وبالوالدین احساناً اما یبلغن عندک الکبر احدھما او کلاھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولاً کریماً واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ وقل رب ارحمھما کما ربیانی صغیرا ربکم اعلم بما فی نفوسکم ان تکونوا صالحین فانہ کان للاوابین غفورا۔

اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرتے رہو۔ اگر ان میں سے ایک یا دونوں کو تمہارے سامنے بڑھاپا پہنچ جائے تو ان کو اف تک نہ کہنا اور نہ انہیں جھڑکنا اور ان سے ادب کے ساتھ بات کرنا۔ اور عجز و نیاز سے ان کے آگے جھکے رہو اور ان کے لئے دعا کرو کہ اے پروردگار جیسا انہوں نے مجھے بچپن میں شفقت سے پالا ہے تو بھی ان (کے حال) پر رحمت فرما جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تمہارا پروردگار اس سے بخوبی واقف ہے۔ اگر تم نیک بن جاؤ تو وہ رجوع کرنے والوں کو

بخش دینے والا ہے۔

(3)وات ذا القربیٰ حقہ والمساکین وابن السبیل۔

اور رشتہ داروں محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو۔

(4)ولا تبذر تبذیرا ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین وکان الشیطن لربہ کفورا۔ واما تعرضن عنھم ابتغاء رحمۃ من ربک ترجوھا فقل لھم قولا میسورا۔

اور فضول خرچی سے مال نہ اڑاؤ کہ فضول خرچی کرنے والے تو شیطان کے بھائی ہیں۔ اور شیطان اپنے پروردگار کی نعمتوں کا کفران کرنے والا ہے (یعنی ناشکرا رہے) اگر تم اپنے پروردگار کی رحمت (یعنی فراخ رزق) کے انتظار میں ہو جس کی تمہیں امید ہو۔ اس وجہ سے ان (مستحقین) کی طرف توجہ نہ کر سکو تو ان سے نرمی سے بات کہہ دیا کرو۔

(5)ولا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطھا کل البسط فتقعد ملوما" محسورا۔ ان ربک یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر انہ کان بعبادہ خبیرا" بصیرا۔

اور اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (یعنی تنگ کر لو) یعنی کسی کو کچھ دو ہی نہیں اور نہ بالکل اتنا ہاتھ کھول کر دو کہ سبھی کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔ بیشک تمہارا پروردگار جس کی روزی چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کی روزی چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے وہ اپنے بندوں کے حال سے خبردار ہے اور دیکھنے والا ہے۔

(6)ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم کان خطاً کبیرا۔

اور اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔ (کیونکہ) ان کو بھی اور تم کو بھی ہم ہی رزق دیتے ہیں جس سے کچھ شک نہیں بلاشبہ ان کو مار ڈالنا بہت سخت گناہ ہے۔

(7)ولا تقربوا الزنا انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا۔

اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکنا کہ وہ بے حیائی ہے اور بد ترین راہ بھی ہے۔

(8)ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق ومن قتل مظلوما" فقد جعلنا لولیہ سلطانا" فلا یسرف فی القتل انہ کان منصورا۔

اور جس جاندار کا مارنا اللہ نے حرام کیا ہے اسے قتل نہ کرنا مگر جائز طور پر یعنی (قانون) شریعت جسے اجازت دے اور جو شخص ظلم سے قتل کیا جائے ہم نے اس کے وارث کو اختیار دیا ہے کہ ظالم قاتل سے بدلہ لے۔ مگر بدلہ لینے والے کو چاہئے کہ قتل کا بدلہ لینے میں زیادتی نہ کرے۔ یہ سمجھ کر کہ اب وہ منصور اور فتح یاب ہے۔

(9)ولا تقربوا مال الیتیم الا بالتی ہی احسن حتی یبلغ اشدہ۔
اور یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جانا مگر اس طریق سے کہ بہت بہتر ہو یہاں تک کہ وہ جوانی کو پہنچ جائے۔
(10)واوفوا بالعھد ان العھد کان مسؤلا۔
اور عہد پورا کرو کہ عہد کے بارہ میں ضرور پرسش ہوگی
(11)اوفوا الکیل اذا کلتم وزنوا بالقسطاس المستقیم ذالک خیرو احسن تاویلا۔
اور جب کوئی چیز ماپ کر دینے لگو تو پیانہ پورا بھرا کرو اور جب تول کر دو تو ترازو سیدھی رکھ کر تولا کرو یہ بہت اچھی بات اور انجام کے لحاظ سے بھی بہت بہتر ہے۔
(12)ولا تقف مالیس لک بہ علم ان السمع والبصر و الفواد کل اولئک کان عنه مسؤلا۔
اور اے بندے، جس چیز کا تمہیں علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ بیشک کان، آنکھ اور دل ان سب (جوارح) سے ضرور باز پرس ہوگی۔
(13)ولا تمش فی الارض مرحا" انک لن تخرق الارض مرحا" انک لن تخلق الارض ولن تبلغ الجبال طولا کل ذالک کان سئیتہ عند ربک مکروھا۔ (38-23:17)

اور زمین پر اکڑ اور تن کر مت چل کہ تو زمین کو پھاڑ تو نہیں ڈالے گا اور نہ لمبا ہو کر پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچ جائے گا۔ ان سب عادتوں کی برائی تیرے پروردگار کے نزدیک بہت ناپسند ہے۔

کس کے پاس اس سے بہتر معیار اخلاق ہے؟

آپ ہی بتایئے کہ کیا اس سے بڑھ کر انسان کے لئے اعلیٰ ترین اخلاق تزکیہ نفس کا معیار کسی اور کے پاس ممکن ہے؟ ان آیات میں جس شوکت الفاظ فصاحتِ بیان اور معانی کی وسعتیں اور بیان کا عاجز کر دینے والا انداز موجود ہے اور پھر یہ سب ایک دوسرے سے ایسا مربوط کہ پڑھنے والے اس کی تقدیس و تعظیم کے لئے بے اختیار مرحبا پکار اٹھیں۔ کاش فرصت کا دامن وسیع ہوتا تو ان آیات میں جو حقیقتیں سمو دی گئی ہیں۔ ان کی وضاحت میں ایک مستقل کتاب لکھ سکتا۔

بلکہ قرآن نے روحانی اور اخلاقی تربیت کے لئے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے۔ اگر اس کے ایک کرشمہ کی وضاحت بھی کی جائے تو بات طویل ہو جائے گی۔ بس اسی قدر کافی ہے کہ قرآن کے سوا نہ تو کوئی اور انسان کو ایسی نیکی اور شرافت کا درس دے سکتا ہے نہ ہی کوئی اور صحیفہ انسان

کے سامنے دوسروں کے ساتھ ایسے حسن سلوک' رحم و کرم' مواخات و مودت' باہمی تعاون و رفاقت' صدقہ و خیرات' وفا کیشی و ادائے امانت' خلوصِ دل اور صدق لہجہ' عدل و عفو' صبرواستقامت' تواضع و انکسار' ہمدردی اور شفقتِ باہم' امرِ معروف و نہی عن المنکر کی تلقین کو اس پیرایہ و اعجاز کے ساتھ بیان کر سکتا ہے۔

سئیات سے تنبیہہ

اسی طرح نہ کوئی اور صحیفہ انسان کو بزدلی' نامردی' خوف و حسد' بغض و ظلم ایک دوسرے پر ظلم و ستم' کذب و چغلی' اسراف و بخل' بہتان و غیبت' بدامنی و فساد' بے وفائی و خیانت' الغرض ہر قسم کے اخلاقِ رذیلہ و خبیثہ سے قرآن حکیم کے مانند منع کرتا ہو۔

یہ وحی الٰہی کا صدقہ ہے جو نبی کل عالم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر نازل ہوئی۔ قرآن حکیم کسی سُورۃ کا مطالبہ کیجئے نیکی اور امربالمعروف کی تلقین اور نہی منکرات پر مختلف پیراؤں میں تنبیہہ اور اخلاقی کمالات کی جانب ترغیب دیکھنے میں آئے گی جس سے روح بذاتِ خود رفعت کی طرف پرواز کرے گی۔

برائی کے عوض بھلائی کا حکم

ارفع بالتی ہی احسن السئیۃ نحن اعلم بما یصفون۔ (97:23)

اور بری بات کے جواب میں ایسی بات کہو جو نہایت اچھی ہو اور یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں ہمیں خوب معلوم ہے۔

ایک اور جگہ وضاحت فرمائی۔

ولا تستوی الحسنۃ ولا السئیۃ ادفع بالتی ہی احسن فاذ الذی بینک وبینہ عداوۃ کانہ ولی حمیم۔ (34:41)

اور بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتی تو سخت کلامی کا ایسے طریقہ سے جواب دو جو بہت ہی اچھا ہو۔ (ایسا کرنے سے تم دیکھو گے) کہ جس کو تم سے دشمنی تھی وہ تمہارا بہترین دوست بن جائے گا۔

عفوو درگزر

کسی سے بدلہ لینے کی طاقت ہونے کے باوجود اس کو معاف کر دو کیونکہ درگزر کرنا اعلیٰ اخلاق کا نمونہ ہے۔

یہ بھی فراموش نہ کیجئے کہ قرآن حکیم میں عفوو درگزر کی تلقین کسی ضعف و کمزوری کے سبب نہیں بلکہ احسان و مروت کی بناء پر انسان کو کینہ پن سے بچانے کے لئے ہدایت فرمائی گئی

ہے۔ سلام کے جواب میں سلام کہنے کا حکم دیا گیا ہے۔

واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا او ردوھا۔ (86:4)

اور جب تم کوئی دعا دے تو جواب میں تم اس سے بہتر کلمے سے (اسے) دعا دو------ یا انہیں لفظوں میں دعا لوٹا دو۔

2-وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لھو خیر للصابرین۔ (126:16)

اگر تم ان کو تکلیف دینا چاہو تو اتنی ہی دو جتنی تکلیف تم کو ان سے پہنچی اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لئے بہت اچھا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح ایک دوسرے کے مظالم اور چیرہ دستیوں سے چشم پوشی کر لینا بزدلی یا بے بسی کی وجہ سے نہیں بلکہ انسان کو اخلاقی اقدار کے اعلیٰ ترین معیار کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ جسے فطرت نے اس کے خمیر میں سمو دیا ہے۔

قرآن نے جس شرف و بزرگی کی تلقین فرمائی اس کی اصل اسلام کے اس پیش کردہ تمدن سے مربوط ہے جو مسلمانوں کی عالمی برادری کو ایک رشتہ میں منسلک کرنا چاہتی ہے اور جس رشتے نے مشرق اور مغرب دونوں کو ایک دوسرے سے جوڑ رکھا ہے اخوت و برادری میں جو عدل اور رحمت پر مبنی ہے اور ان ضوابط میں رعایت کی کوئی گنجائش نہیں۔ جس کا مقصد صداقت و بھلائی اور انسانی برادری میں مساوات کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا۔ اس اصول اخوت کے سامنے فوری فائدہ حاصل کرنے کے تصور کو کوئی گنجائش حاصل نہیں۔ گویا اس قرآنی معاشرہ سے تعلق رکھنے والے تمام افراد اعلیٰ اخلاقی اقدار کے مالک و ممدوح ہیں۔

دوسروں پر خود کو ترجیح

ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ۔ (9:59)

اور جو کچھ ان کو ملا اس سے اپنے دل میں کچھ خواہشیں اور (خلش) نہیں پاتے اور نہ ہی انکو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں چاہے وہ خود ضرورت مند ہی ہوں۔

صرف اللہ کا خوف

ویخشونہ ولا یخشون احدا الا اللہ۔ (39:33)

اور اسی سے ڈرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے!

ایفائے عہد

والموفون بعھدھم اذا عاھدوا۔ (177:2)

اور اپنے کئے ہوئے عہد کو پورا کرتے ہیں جب عہد کرتے ہیں۔

تکالیف میں ضبط

الصابرون بالباساء والضراء وحین الباس۔ (177:20)

اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ کارزار میں) ثابت قدم رہنے والے ہی وہ لوگ ہیں جو (ایمان میں) سچے ہیں۔

الذین اذا اصابتھم مصیبۃ قالوانا للہ وانا الیہ راجعون۔ (156:2)

اور ان لوگوں پر جب کوئی مصیبت واقع ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اللہ ہی کا مال ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

قرآنی اخلاق سے جنہوں نے اپنی زندگیاں سنواریں ان کا ذکر قرآن مجید میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔

(1) اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو (مہاجرین) بھائیوں کی ضرورتوں کو اپنے سے زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔

(2) اور وہ اللہ کا خوف رکھتے تھے۔ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔

(3) اپنی بات کے پکے ہوتے ہیں جب قول و اقرار کر لیتے ہیں تو اسے پورا کرتے رہتے ہیں۔

(4) تنگی و مصیبت کی گھڑی ہو یا خوف و ہراس کا وقت ہر حال میں صبر کرنے والے اور اپنی راہ میں ثابت قدم ہوتے ہیں۔

(5) یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کبھی ان پر مصیبت آن پڑتی ہے۔ تو ان کی زبان پر صدا ہوتی ہے کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہماری زندگی اور موت رنج و غم، جو کچھ بھی ہے۔ سب اللہ عزوجل ہی کے لئے ہے۔ اور ہم سب کو بالآخر مرنا اور اسی کی طرف لوٹنا ہے۔

گفتگو میں لہجہ کا انداز۔ ولا تصعر خدک للناس۔ (18:31) اور لوگوں سے بے رخی نہ کر۔

بخل سے اجتناب

ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون۔ (9:59)

بخل تو سب ہی طبیعتوں میں ہوتا ہے مگر جو شخص بھی اپنی طبیعت کو بخل سے بچائے تو ایسے لوگ فلاح پائیں گے۔

فحش باتوں سے پرہیز

ان الذین یحبون ان تشیع الفاحشۃ فی الذین آمنوا لھم عذاب الیم فی الدنیا

والآخرۃ۔ (19:24)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں فحش باتوں کا چرچا ہو ان کے لئے دنیا میں بھی دردناک عذاب ہے۔ اور آخرت میں بھی۔ اور ایسے لوگوں کو اللہ ہی جانتا ہے اور تم لوگ نہیں جانتے۔

کبائر سے اجتناب

یعنی کبیرہ گناہوں سے بچنے والے قرآنی اخلاق کے مالک ہیں۔

والذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش واذما غضبوا ھم یغفرون (37:42)

اور جو لوگ بڑے بڑے گناہوں سے اپنے آپ کو بچا لیتے ہیں اور جب ان کو غصہ آتا ہے تو لوگوں کی خطاؤں کو معاف کر دیتے ہیں۔

قرآنی اخلاق کی ایک اور صفت

عفوو ترحم

والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس۔ (134:13)

قرآنی اخلاق کے مالک غصہ پی جاتے ہیں اور اللہ کو معاف کر دینے کے عادی ہیں اور ہماری عفوو رحمت نے انہیں اپنے سایہ میں لے رکھا ہے۔

آپس کی بدگمانی سے بچو

اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضاً ایحب احدکم ان یاکل لحم اخیہ میتا فکرھتموہ۔ (13:49)

اور لوگوں کی نسبت (مفروضہ) گمان کرنے سے بچتے رہو۔ کیونکہ بعض شک گمان گناہ میں شامل ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور نہ تم میں سے کوئی ایک کو ایک کی پیٹھ پیچھے برا کہے۔ بھلا تم میں سے کوئی اس بات کو گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے یہ تو یقیناً تم کو گوارا نہیں۔ تو غیبت کیوں گوارا ہو۔ کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا مردار کھانا ہے۔ گویا قرآنی اخلاق کا مالک نہ تو ناحق کسی سے بدگمان ہوتا ہے۔ نہ ایک دوسرے مسلمان کی جستجو کرنا ہی اس کی عادت ہوتی ہے۔

رشوت اور قرآنی تعلیم

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل وتدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم۔ (188:2)

اور دیکھو ایسا نہ کرو کہ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ سے کھاؤ اور نہ ہی حاکم کو

رشوت دے کر ناحق مال چھینو۔ یعنی قرآنی اخلاق کا مالک رشوت دے کر مقدمہ بازی میں اپنا حق یا ناحق مال حاصل نہیں کرتا۔

ترکِ حسد کی ہدایت

ولا یغتب بعضکم بعضا۔ ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔

ترکِ فریب کا حکم

ویل للمطففین الذین اذا کتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم اوزنوھم یخسرون۔ (1:83تا3)

کم تولنے والے کی بڑی ہی تباہی ہے کہ لوگوں سے ماپ کریں تو پورا پورا لیں اور جب ان کو ماپ یا تول کر دیں تو کم دیں۔

یاوہ گوئی کی مذمت

عن اللغو ھم معرضون۔ (3:23)

وہ لوگ خود کو ہر قسم کی بے ہودہ باتوں سے دور رکھتے ہیں۔

ہجو کرنے سے منع کیا جاتا ہے

یا ایھا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونو خیرا" منھم ولا نساء من نساء عسیٰ ان یکن خیر منھن ولا تلمزوا انفسکم ولا تنابزوا بالالقاب بئس الاسم الفسوق بعد الایمان ومن لم یتب فاولئک ھم الظالمون۔ (11:49)

اے ایمان والو کوئی قوم کسی قوم کا تمسخر نہیں اڑائے ممکن ہے کہ وہ لوگ تم سے بہتر ہوں۔ اور نہ عورتیں عورتوں سے (تمسخر کریں) ممکن ہے کہ وہ ان سے اچھی ہوں۔ اور اپنے (مومن بھائی) کو عیب نہ لگاؤ اور ایک دوسرے کا برا نام نہ رکھو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام رکھنا گناہ ہے اور جو توبہ نہ کرے وہ ظالم ہے۔

تاجرانہ اخلاق

قرآن حکیم نے انسان کو تہذیب و تمدن کا کوئی پہلو نہیں جس میں اسے تنہا چھوڑا ہو۔ تہذیبِ نفس حسن کردار سب کو قرآنی تعلیم الاخلاق نے اپنے دامن میں سمیٹا ہوا ہے۔ اس نظام کی اساس ایمان باللہ ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر انسانی خمیر کی زمین میں اخلاق کی نشوونما نہیں ہو سکتی۔

اسی ایمان باللہ کی سرپرستی میں روح انسانی اخلاقی اور مادی آلائشوں سے پاک ہو کر نیکی کی

طرف متوجہ ہو جاتی ہے اس کے برعکس اگر انسان صرف مادی فائدوں کو حاصل کرنے کی تعلیم کی نگرانی میں لگا رہے تو اس کے نزدیک حسنِ معاملہ بھی سودا بازی ہو گا۔ منفعت پیش نظر ہو گی۔ اور جہاں کہیں اس سودے میں خود کو خسارہ ہوتا دیکھے گا فوراً" ہاتھ روک لے گا۔ کیونکہ تاجرانہ اخلاق کی تہہ میں نفع حاصل کرنے کے سوا کوئی اور جذبہ کار فرما نہیں ہوتا۔ یہی سبب ہے کہ ایسے افراد کا دل اور ہوتا ہے زبان اور ہوتی ہے۔ زبان پر حفظِ امانت اور ادائے حقوق کے قصائد ہوتے ہیں مگر دل میں مقابل کا جیب کترلینے کے منصوبے۔ ہاتھ میں ایسی ترازو جس کا تول خریدار کے حق میں سراسر خسارہ مگر اپنا نفع پہلے مد نظر!

اخلاق کا یہ انداز دورِ حاضر میں اچھی طرح رس بس گیا ہے۔ کئی بار سننے میں آیا ہے کہ فلاں شہر میں خطرناک حالات پیدا ہو رہے ہیں جب اس کے اسباب تلاش کئے گئے تو ان خطرناک حالات کی تہہ میں صرف مال و دولت اور جاہ و منصب کی کشمکش ہوتی ہے۔ ان فسادات کی ذمہ داری جن افراد کے سر ڈالی جاتی ہے بظاہروہی لوگ معاشرہ میں ممتاز اور حسن اخلاق میں سند یافتہ سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ان کا یہ رویہ صرف نمائشی ہوتا ہے۔ یہ لوگ جہاں سود و زیاں میں کشمکش دیکھتے ہیں فوراً" اخلاق کا دامن چھوڑ کر منافع کے ڈھیر پر گر پڑتے ہیں۔ ان میں بعض ایسے چھپے رستم ہوتے ہیں جو بظاہر خود تو چھپے رہتے ہیں لیکن معاشرہ میں برائی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہوتا جس میں ان کا ہاتھ نہ ہو۔ بعض ایسے زود پشیماں بھی ہوتے ہیں کہ جہاں ان کا پول کھل گیا تو خودکشی سے دریغ نہیں کرتے۔

موجودہ زمانہ میں یہی کردار متمدن قوموں کا حسن کہلاتا ہے۔ جس اخلاق کا پس منظر صرف حصولِ منفعت ہو جہاں نفع نہیں بلکہ زوال دیکھا ان کی دولتِ اخلاق نے وہیں انہیں جواب دے دیا۔

اخلاق بنائے ایمان

مگر جو اخلاق قرآنی ہدایات کے مطابق اور عقیدہ یعنی اخلاق برائے اخلاق پر مبنی ہو اس پر کسی قسم کا خوف رعشہ طاری نہیں کر سکتا۔ ایسے افراد کا پس منظر صرف حسنِ نیت ہے۔ تو نفع و نقصان میں یکساں سمجھا جاتا ہے اس لئے جو شخص لاٹری کا ٹکٹ اس لئے حاصل کرتا ہے کہ اس رقم میں سے ایک حصہ خیراتی شفاخانہ میں خرچ کردے گا تو ظاہر ہے اس سودے میں خیرات اور احسان پیش نظر نہیں بلکہ اپنی منفعت مقدم ہے۔ گو شفاخانہ ضمناً اسکا ایک حصہ ہی سہی۔ اس شخص کے مقابلہ میں ایک کریم النفس انسان ہے جو ہر وقت ان لوگوں کی تلاش میں رہتا ہے جن کو دوسروں سے مانگتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے مگر حالات ان کی تباہ حالی کی چغلی کھا رہے ہیں یہ شخص ان کی امداد کے لئے خفیہ طور پہ ہاتھ بڑھا دیتا ہے۔ ایسے فرد کی خیرات کس قدر حسنِ نیت کی مظہر ہے۔

شراب اور جوئے کی مذمت

قرآن عقل کے صحیح استعمال کا محرک ہے داعی ہے معلم ہے۔ وہ انسانی عقل کو ایسے امور سے منع کرتا ہے جو انسان کی عقل کو غلط استعمال کرنے کا سبب بنیں۔ اس سلسلہ میں شراب اور جوا دونوں ایسے موثر حربے ہیں کہ انسانی عقل ان کے ہاتھوں میں کھیلنے لگتی ہے۔ اس لئے قرآن حکیم فرماتا ہے۔ یہ دونوں" ناپاک اور شیطانی عمل" ہیں بظاہران دونوں میں فائدہ کی جھلک نظر آتی ہے لیکن ان کا گناہ ان کے نفع سے کہیں زیادہ ہے جس کی وجہ سے دونوں سے مطلقاً" دور رہنے کا حکم دیا گیا۔

جواری کا دھندا ملاحظہ ہو۔ ضیاعِ اوقات اخلاقی قدروں سے تجاوز اس کا نتیجہ ہے۔ اب شرابی کا سنئے ادھر نشہ سر پہ سوار ہوا ادھر حواس نے الوداع کہا۔ ہوش نے جن کاموں کے پاس نہ جانا ہو اسے عظیم کام کر دکھایا۔ گویا جوا اور شراب ملتِ اسلامیہ کے امت وسطیٰ ہونے میں مانع ہے۔

قرآن نے جو اخلاقی نظام پیش فرمایا ہے اس میں دنیا کی نعمتوں سے کنارہ کشی نہیں۔ رہبانیت کے چکر میں پھنس کر کائنات پر غور و فکر کی نعمت سے محروم ہونا نہیں۔ مگر شراب جو انسان کو خواہشوں کا ایسا پجاری بنا دیتا ہے جن سے شرافت' مروت اور اخلاق کے تمام نقش انسان کے دل و دماغ سے الوداع ہو جاتے ہیں۔ اس سے منع فرماتا ہے قرآن اعتدال کے ساتھ اخلاقی نظام کی دعوت دیتا ہے تاکہ انسان اپنے صحیح مقصدِ حیات کا ترجمان بنے۔ یعنی مسلمان کو "امتِ وسطیٰ" ہونے کا جو اعزاز دیا گیا ہے اس کے لئے وہ کوشش جاری رکھ سکے۔ اس اعزاز کو برقرار رکھ سکے! جو شراب اور جوئے کی عادتوں کے سبب چھن سکتا ہے۔

قرآن کائنات اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں بار بار غور و فکر کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ کبھی ہلالِ نو ہے تو کبھی شمس و قمر' کہیں رات اور دن ہے کہیں زمین اور اس کی پیداوار میں غور و فکر کی دعوت دیتا۔ کبھی افلاک اور اس پر سجے ہوئے ستاروں کی طرف کبھی دریاؤں کے سینے پہ تیرنے والی کشتیوں' جہازوں کی پروازوں---- پرندوں کی اڑانوں اور فضاؤں میں ٹھہرنے کے نظاروں پر تدبر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ کبھی ہمیں ہماری شان و شوکت کے سامان پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے تمام علوم و فنون کو حاصل کرنے اور انہیں قرآنی ہدایات کے ماتحت استعمال کرنے کی ہدایات دیتا ہے۔ الغرض کائنات کی ان گنت نعمتوں کا بار بار اعادہ اور یاد دہانی اس لئے کرتا ہے کہ ان چیزوں پر غور کر کے انہیں عادلانہ طور پہ استعمال کرنے کا نظام قائم کریں اور خالق کائنات کی دی ہوئی ان نعمتوں کا شکریہ ادا کریں۔ جن پر عقل کی راہنمائی کے بغیر قابو پانا ناممکن ہے اور بالآخر یہی غور و فکر اور تعقل ہمارے اقتصادی نفع اور نقصان کا سبب ثابت ہو سکتا ہے۔

اقتصادی نظام

اگر ہمارے اقتصادی نظام کی بنیاد اخلاق و شرافت پر ہو تو وہ بنی نوع انسان کے لئے آسائش و مسرت کا سرمایہ ثابت ہو سکتا ہے۔ جس کے نتیجے میں انسان کی نحوست کا ستارہ خود بخود ڈوب جائے گا۔

اس لئے قرآن کے اقتصادی نظام کی بنیاد بھی عقیدہ ایمان اور فضائل اخلاق کی زمین پر ہے۔ اگر یہ نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ اگر ان تینوں (عقیدہ' ایمان اور فضائل اخلاق) سے اقتصادی نظام محروم ہو جائے تو بد نصیبی کے سوا کچھ میسر نہیں ہو گا۔ لہٰذا جو شخص عقیدہ ایمان اور فضائل اخلاق کو اپنے اقتصادی حالات کا حل بنائے گا۔ وہ سود جیسی بے برکت تجارت کو ایک لحہ بھی گوارا نہیں کرے گا۔ سود جس کے ہاتھ میں موجودہ اقتصادی نظام کی شہ رگ ہے۔ اور قرآن اسی لئے ربا (سود) کو حرام قرار دیتا ہے۔

سود خوری کا انجام

الذین یاکلون الربا لایقومون الا کما یقوم الذی یتخبطه الشیطان من المس۔ (27:25)

اور جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قبروں سے اس طرح بدحواس اٹھیں گے جس طرح کسی کو جن نے لپٹ کر دیوانہ بنا دیا ہو۔

ایک اور آیت میں

وما اتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عندالله وما آتیتم من زکوٰة تریدون وجه الله فاولئک هم المضعفون۔ (39:30)

اور جو تم سود دیتے ہو کہ لوگوں کے مال میں افزائش ہو تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس میں بڑھاوتی نہیں ہوتی اور جو تم زکوٰۃ دیتے ہو۔ اور اس سے اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرتے ہو وہ موجب برکت ہے اور ایسے ہی لوگ اپنے مال کو دگنا تگنا کرنے والے ہیں۔

سود کی حرمت تمدن کا ایسا رکن ہے جس پر تمام بنی نوع انسان کی خیرو بھلائی کا انحصار ہے۔ مثلاً ربا کی ادنٰی صورت یہ ہے کہ صاحبِ مال خود کوئی مشقت کئے بغیر اپنے مقروض کی کمائی سے ایک مقرر رقم حاصل کرتا رہتا ہے۔ اس لئے کہ اس نے غریب کو چند روپے قرض عنایت کئے ہیں۔ ظاہر ہے اگر قرض دینے والا خود کاروبار کرنے کی صلاحیت کا مالک ہوتا تو دوسرے کو اپنی رقم کیوں دیتا۔ اور خود کام کی صلاحیت نہ رکھنے والا اگر اپنا راس المال اس شخص کو نہ دیتا تو رفتہ رفتہ اس کی رقم ضائع ہو جاتی۔ بہتر صورت تو یہ تھی کہ منافع مقرر کرنے کے بجائے ایسے محنت

کش کے ساتھ نفع اور نقصان دونوں کا ذمہ دار ہوتا۔ سود مقروض کے لئے ایسی مصیبت ہے کہ کاروبار میں خسارہ کی صورت میں غریب کو اصل کے ساتھ سود خور کو مقررہ شرح بھی ادا کرنا پڑتی ہے اور سود کے اسی نقص کی وجہ سے شریعت نے اسے مطلقاً حرام قرار دے دیا۔

اجارہ اور سود میں فرق

اگر مقروض یہ کہے کہ روپیہ بھی زمین یا سواری کی طرح اجارہ پر لیا دیا جا سکتا ہے اور مال دار اس پر جو منافع طے کرے وہ اجارہ ہی ہے۔ تو یہ اعتراض عقل کے خلاف ہے کہ روپیہ بذات خود نفع یا نقصان نہیں۔ اسے یا تو خرچ کیا جا سکتا ہے۔ یا جمع کیا جا سکتا ہے۔ یعنی زمین اور سواری کے جانور کی طرح اس کی ذات نفع رساں نہیں ہے۔ روپیہ کی نسبت اس قسم کا حسن ظن بے وقوف یا پاگل پن ہی رکھ سکتے ہیں۔

البتہ اس کو مضاربت پر دیا جا سکتا ہے۔ جس میں نفع اور نقصان دونوں کا امکان ہے۔ منجمد یا طے کئے ہوئے روپیہ کے سوا دوسری چیزوں میں خسارہ کا بہت احتمال ہوتا ہے۔ اور یہ احتمال عام دستور کے مطابق مضاربت کے مانع نہیں اور جہاں اس قسم کی صورت رونما ہو۔ ارباب قانون اس پر فریقین کے درمیان مناسب تصفیہ کرا سکتے ہیں۔ جس میں صاحبِ مال اور مستاجر دونوں کو زیر بار کیا جا سکتا ہے۔ نہ صرف مستاجر کو!

لیکن سود؟ سات یا نو فیصد یا اس سے کم و بیش پر لین دین ہوا تو اس کے نتیجہ میں قرضدار ہی گھاٹے میں رہے گا۔ جس میں یہ صورت اور بھی خوفناک ہے۔ کہ خسارہ اصل رقم کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبا۔ مگر مقروض پر واجب ہے کہ وہ مالدار کے حضور اصل رقم اور سود دونوں پیش کرے اخلاقی طور پر یہ صورت کس قدر بھیانک ہے۔ جس کا نتیجہ انسانی برادری میں محبت کی بجائے دشمنی اور کینہ پروری کے سوا کچھ نہیں اور اسی کی بدولت موجودہ دور انتہائی مہلک بحرانوں میں گرفتار ہے۔

جب سود کی معمولی رقم کا نتیجہ اتنا بھیانک ہے تو اس کی دوسری صورتوں میں اس کا نتیجہ کیا ہو گا مثلاً ایک شخص نے تجارت کے سوا دوسرے اخراجات یعنی اہل و عیال کے نان نفقہ کیلئے سود قرض لیا۔ تو اس کی ادائیگی کہاں سے کیسے کرے گا؟ سوائے اس کے وہ غیب سے کشائشِ رزق کا امیدوار ہو۔ جو کبھی کہیں سے ہاتھ لگ جائے تو ادا کر دے ایسے حالات میں قرآن حکیم نے ایسے شخص کو قرض دینا فرض قرار دیا ہے اور پھر اس کی آسودگی تک مہلت دینے کی تلقین بھی کی ہے۔

برخلاف اس کے سود اس وحشیانہ نظام کا پروردگار ہے۔ جو مردم کشی کے مترادف ہے۔ ایسا معیوب ترین طریقہ کہ مالدار سود کے نام سے لوگوں کے مال ہتھیانے کا جرم قانون کی آڑ

میں کرتا ہے۔ ایسی قبیح چوری جس کی نگرانی قانون کرتا ہے۔

سود اور استعمار

موجودہ دور میں ہمہ گیر اور مشہور ترین گرفت استعمار سود ہی کا ثمر ہے۔ اس کا طریقہ واردات یہ ہے کہ سرمایہ دار ملک کسی غریب ملک کو تاک لیتے ہیں اور اپنے دو چار ایجنٹوں کو اس ملک میں بھیج دیتے ہیں جو وہاں کے غریب لوگوں کو سودی قرض دینا شروع کر دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی آمدنی کے ذرائع پہ قابض ہو جاتے ہیں۔ جب مقروض طبقہ کو ہوش آتا ہے تو اپنی بے بسی پر سر پیٹ کر رہ جاتا ہے۔ اور ان ظالموں سے نجات پانے کی کوششیں شروع کرتا ہے تو ان کو بھیجنے والی حکومت اپنی رعایا (یعنی اپنے ایجنٹوں کے تحفظ کا بہانہ بنا کر اس ملک پر فوجی یلغار کر دیتی ہے۔ بالآخر ان کا تسلط ہو جاتا ہے۔ اب اس خطہ کے رہنے والے ان سود خوروں کی رعایا اور سود خور ان کے بادشاہ بن جاتے ہیں۔

جس کے بعد ملک کے اصل باشندوں کی غیرت بے غیرتی میں بدل جاتی ہے۔ اور ایمان غفلت کی نذر ہو کر برسوں تک منہ ڈھانکے پڑا رہنے پہ مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن جو قومیں زوال و منکبت کو سمجھتی ہیں وہ سودی قرضہ کے لین دین سے دور رہ کر اپنے ایمان اور مال دونوں پر خود قابض اور مسلط رہتی ہیں۔ سود ہی استعمار و جنگوں کا سرچشمہ ہے بدبختی کا بوجھل طومار ہے۔ جس کے بوجھ تلے آج تمام عالم انسانیت دم توڑ رہا ہے۔ استعمار سود کا پروردہ ہے۔ گویا سود اور یہ دونوں جبر و تشدد کی تیز دھار تلوار ہیں۔ جب تک دونوں میں سے ایک کا وجود موجود ہے۔ انسان محبت اور اخوت کا منہ نہیں دیکھ سکتا اور اس کا خاتمہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک معاشرہ قرآن کی ہدایات سے پرورش پایا ہوا نظام اقتصادیات قائم نہیں کرتا۔ قرآن جو وحی کی صورت میں نازل ہوا۔

اسلامی اشتراکیت

اسلام بذاتِ خود اشتراکیت کا حامی ہے مگر اس کی اشتراکیت کے سایہ میں نہ تو جنگوں کی ہماہمی ہے نہ ایٹم نہ آکسیجن بموں کی غارت گری ہے۔ نہ اس کے ہاں اجارہ دار استعمار میں جکڑنے کے داؤ پیچ ہیں۔ جو مغربی اشتراکیت کا لازمی حصہ ہیں۔

قرآنی اشتراکیت ایسی اخلاقی سربلندی ہے جس کے سایہ میں مختلف ملکوں کے رہنے والے ایک دوسرے کی اخوت اور برادری سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ ایک خطہ کے رہنے والے مسلمان دوسرے خطہ کے مسلمانوں کی کفالت اور دونوں باہم تعاون میں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ اور ایک دوسرے کے خلاف سرکشی یا بغاوت میں تعاون نہیں کر سکتے ۔

تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا بالاثم والعدوان۔
گویا قرآنی اشتراکیت۔ ایک دوسرے کے ساتھ نیکی اور تقوی میں معاونت اور برائی اور سرکشی سے علیحدگی کے اصولوں پر قائم ہے۔

قرآنی اشتراکیت کا ایک حرف نظام صدقہ اور زکوٰۃ کی شکل میں ہے جس زکوٰۃ کی ادائیگی قرآن کے ماننے والوں پر فرض ہے اور جس زکوٰۃ کا نتیجہ وہ اشتراکیت نہیں جس کے نام پر ایک ٹولہ یا سیاسی جماعت اپنے ماتحت طبقہ کو اپنی قوت سے بے بس کر کے زندگی کے تمام اسباب پر قابض ہو جائے! قرآنی تمدن میں قوم یا فرد دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر تفوق نہیں۔ یہاں باہم ایسی مساوات کا درجہ حاصل ہے کہ تمدن حاضرہ کے دربار میں جس کی پذیرائی ناممکن ہے اس لئے کہ مغرب میں وقتی فائدوں پر ایمان قربان کر دیا جاتا ہے۔ اور ایسا نہ کیا جائے تو مصالح میں استحکام ہونا ناممکن ہے۔ لیکن قرآنی تمدن میں ایمان کے تابع مصلحت ہی سے فوائد میں استحکام ہے۔ جس کا ثمر اخوت و برادری کا احساس ہے۔ دیکھا آپ نے دونوں میں کتنا فرق ہے۔

قرآنی اشتراکیت میں حق تملیک؟ قرآنی اشتراکیت ذاتی ملکیت کے حق پر اس طرح کا قبضہ نہیں کرتی جو کچھ عرصہ تک مغربی اشتراکیت کا سرمایہ افتخار رہا ہے۔ حتیٰ کہ روسی بالشویک پارٹی کے اکابر کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ حق تملیک پر کلی تصرف غیر ممکن ہے۔

البتہ املاک کے منافع اور پیداوار میں عوام کا اشتراک ضروری ہے۔ مگر ریاست اس امر کی مجاز نہیں کہ عوام کے منافع کی غرض سے ایسا قانون جاری کرے جس کی رو سے حق تملیک بالکل ہی چھن کر رہ جائے۔

اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اشتراکیت کا تصور

ان حضرات میں اس نقطہ خیال سے دو مختلف نظریات تھے۔

(الف) وہ متشدد حضرات جو تملیک کے قطعاً خلاف تھے اور نہ صرف پیداوار بلکہ پیداوار کے مصادر و منافع پر بھی عوام کے تصرف و دخل اندازی کے قائل تھے۔

(ب) اراضی پر بھی دوسرے عروض یعنی خرید و فروخت کے قابل ذرائع کی طرح حق ملکیت کو تسلیم کرتے تھے۔

مگر یہ دونوں فریق اختلاف رائے کے باوجود یورپ کی موجودہ اشتراکی تقسیم اموال کے طریق پر اس انداز سے متفق تھے۔

(الف) مشترکہ مفاد کے لئے جمع کرنا ہر فرد کا فرض ہے۔

(ب) مشترکہ خزانوں میں سے معاشرہ پر ضرورت مند کی کفالت نگران بیت المال کے ذمہ ہے۔

اس لئے ہر مسلمان کا حق ہے کہ جب تک وہ خود کفیل نہیں ہوتا اس کی ضروریات بیت

المال سے پوری کی جائیں اور جو لوگ بیت المال کے منتظم ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ایسے خستہ حالوں کی کفالت کو کسی صورت نظرانداز نہ کریں۔

قرآن کے جس دستور معاشرہ کا ہم نے ذکر کیا ہے کوئی بھی عقل مند اس کی افادیت اور نافعیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور نہ ہی یہ دعویٰ صحیح ہے کہ حامل قرآن علیہم الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں تو یہ دستور معاشرہ میں مقبول و محمود ہو سکتا تھا لیکن آج کے دور میں اس کی افادیت موثر نہیں۔ اور نہ ہی ایسا کوئی دعویٰ قبول کیا جا سکتا ہے کہ یہ دستور پورے عالمی معاشرے کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

ایسے معترض ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیں کہ صدر اول سرور کل عالم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں مسلمانوں کے امیران کے حالات سے کس حد تک باخبر رہتے تھے۔ نہ کوئی ضرورت مند ان کی نگاہوں سے اوجھل رہ سکتا تھا نہ وہ خود ضرورت مندوں کی پرسش سے اپنے آپ کو آزاد سمجھتے تھے۔

اسلامی اشتراکیت پر غور کرنے سے احساس ہوتا ہے کہ وہ روسی اشتراکیت کی مانند تقسیم اموال یعنی حقدار تک پہنچنے تک دم نہیں توڑ دیتی اسلامی اشتراکیت کے ڈانڈے اخوت اور روحانی زندگی کی حدوں سے مربوط ہیں۔ ان کی برکت اور پذیرائی سے انسان اخلاق اور اقتصادیات دونوں پر قابض ہو جاتا ہے۔ مثلاً اسلامی اشتراکیت کی یہ شق ملاحظہ ہو۔

لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔ تکمیل ایمان کی شرط یہ ہے کہ مومن جو کچھ اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی دوسرے بھائی کے لئے بھی پسند کرے۔

اس کے وہی معنی ہیں کہ اگر مومن اپنا شکم بھرے اور دوسرے بھائی کی روٹی کا اسے خیال نہ رہے تو ایسا شخص مومن نہیں۔

اسلامی دستور اشتراکیت کے مطابق یہ شخص جو دوسروں کی روٹی سے بے فکر ہے قرآن اس کے لئے یہ سزا تجویز کرتا ہے۔

ارئیت الذی یکذب بالدین۔ فذالک الذی یدع الیتیم ولا یحض علی طعام المسکین۔(107:1تا3)

بھلا تم نے اس شخص کو دیکھا جو (روز جزا) کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہی بدبخت ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔ اور فقیر کو کھانا کھلانے کے لئے (لوگوں کو) ترغیب نہیں دیتا۔

قرآن نہ صرف واضح اور ظاہراً" دینے کو پسند کرتا ہے بلکہ درپردہ اور علانیہ حسب مصلحت ہر دو صورت میں غریبوں کی روٹی اور ضروریات کا خیال رکھنے کی تاکید کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

ان تبدوا الصدقات فنعما ہی وان تخفوھا وتوتوھا الفقراء فھو خیر لکم۔
(271:2)

اگر تم خیرات ظاہر دو تو وہ بھی خوب ہے اور اگر پوشیدہ دو اور دو بھی اہلِ حاجت کو تو وہ خوب تر ہے۔

اور اس آیہ کے مطابق۔

الذین ینفقون اموالھم بالیل والنھار سراً وعلانیۃ فلھم اجرھم عند ربھم۔ (274:2)

اور وہ لوگ جو اپنا مال رات اور دن پوشیدہ اور ظاہر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں ان کا صلہ پروردگار کے پاس ہے۔

اس قسم کی اشتراکیت میں ایثار کی بدولت انسان کا ایمان اور زیادہ ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی قربت اور رضا حاصل ہو جاتی ہے۔ اور دل سکون و مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔

خالقِ کائنات رب العالمین نے انسان کی کسی حالت اور نعمت کے اعتبار سے ایک دوسرے کا ہم مثل نہیں بنایا۔ کسی امر میں ایک کو دوسرے پر فوقیت حاصل ہے تو دوسرے امر میں دوسرے کو اول پر فوقیت اصل ہے۔

اللہ یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر۔ اللہ تعالیٰ جس کے چاہے رزق وسیع کر دیں جس کے لئے چاہیں تنگ کر دیں۔

اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں برابری قائم رکھنے کے لئے پابندی عائد فرما دی۔ حکم دیا گیا کہ چھوٹے بڑے ایک دوسرے کی توقیر کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ بزرگ چھوٹوں پر ترس کھائیں، رحم کرنے میں پہل کریں اور چھوٹے بڑوں کا ادب کرنے میں پہل کریں۔ دولت مند غریبوں کی دستگیری کے لئے ہاتھ بڑھائے رکھیں" یہی اللہ کی نعمتوں کا اندازِ تشکر قرار دیا گیا۔ نہ اس لئے کہ غریبوں پر احسان جتائیں۔

وراثت، وصیت معاملات اور تجارت

قرآن حکیم نے اقتصادی نظام کے مختلف پہلوؤں از قسم ترکہ، وصیت، معاملات، تجارت کے بارہ میں جس انداز سے راہنمائی فرمائی ہے۔ اگر ان کے منطقی، فقہی اور اقتصادی فوائد کے پہلوؤں پر قلم اٹھایا جائے تو ایک مستقل کتاب ہو جائے گی۔ اتنا کافی ہے کہ ان کے مقابلہ میں دنیا کا کوئی قانون پورا نہیں اتر سکتا۔ بلکہ اسلام کے تجارتی اصولوں سے قطع نظر اگر لین دین (محض قرض) کے اندازِ تحریر و تمسک (دستاویزات) اور شہادت کے اصولوں پر نظر ڈالی جائے یا شوہر اور بیوی کے باہم اختلاف پیدا ہو جانے پر دونوں کے تجدیدِ تعلقات کے لئے فریقین کو دونوں طرف سے ایک ایک صاحبِ فراست کا انہیں سمجھانے کا بے مثال اصول ہے تاکہ کسی غلط فہمی کی وجہ سے ان میں دائمی تفرقہ پیدا نہ ہونے پائے جو اولاد کیلئے باعث اذیت ہے۔ اسی طرح مسلمانوں یا

ایسے دو گروہوں کے درمیان جو ایک دوسرے پر تلواریں سونت کر اڈ پڑنے کے قریب پہنچ چکے ہوں اور مصالحت کی بجائے مرنے مارنے پر تل آئے ہوں تو ان میں صلح و امن کی کوشش کرنا اور امن قائم کرنے کے لئے مظلوم کی حمایت کرنا قرآن حکیم کے وہ اصول معاشرہ و تمدن ہیں کہ ان کے متبادل ان سے بہتر آج تک کوئی معاشرہ، صحیفہ یا کتاب پیش نہیں کر سکی!

اب اگر ہم سود خوار کی مذمت میں اسلامی اشتراکیت پیش کرتے ہیں تو کون سے تعجب کی بات ہے۔ جبکہ قرآن حکیم میں ایسے قوانین اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ موجود ہیں۔ جن کی قوت و پذیرائی کی صلاحیت کی وجہ سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن حکیم میں انسانیت کا فائدہ اور منفعت معنوی ہر طرح کا خیال رکھا گیا ہے۔

قرآنی نظام تمدن اور مستشرقین

جیسا کہ ہم نے قرآنی نظام تمدن اور اس کے اساس کی وضاحت کی ہے۔ مستشرقین میں سے بھی بعض اہلِ قلم اس کی افادیت کے معترف ہیں۔ اگرچہ بعض ان پر اعتراض کرنے میں بھی پیش پیش ہیں۔

مثلاً

قرآنی نظامِ تمدن اس قدر بہتر ہے کہ انسان اپنی فطری کمزوریوں (لالچ، حرص) کی وجہ سے اس کی پیروی کرنے سے کتراتا ہے۔ اس لئے کہ اسے قبول کر لینے کے بعد اس کی زندگی محنت کش ہو جائے گی۔ اور انسان امید، ناامیدی، حرص اور لالچ دوگونہ عذاب میں مبتلا ہے۔ درحقیقت (انسان) حیوان ہی تو ہے۔ اس لئے اسلامی نظام حیات اس کی حیوانیات پر بالکل بوجھ ہے۔ اگر اسلامی نظام کو بلاشبہ مان لیا جائے تو پھر یہ تسلیم کئے بغیر چارہ کار نہیں کہ انسان کو بے جا طمع اور ہوس سے دور رکھنا اسلام کا اولین مقصد ہے تاکہ انسان امید و خوف اور حرص و آز سے الگ تھلگ رہ کر اپنے لئے اقتصادی منافع حاصل کر سکے۔

مستشرقین کا اعتراض ہے کہ اسلامی نظام ہماری پیش کردہ وضاحت کے مطابق رسول اللہ ﷺ کے زمانہ اور اس کے بعد خود مسلمانوں کے ہاں جاری نہ رہ سکا۔ اگر اس میں کماحقہ قبولیت ہوتی تو پھر تمام عہد کے اندر مسلمانوں میں یہ نظام جاری رہتا۔ جن مسلمانوں کی حکومت دنیا کے تمام گوشوں پر قائم ہو گئی۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکا بلکہ ان مسلمان حکمرانوں نے اپنے اپنے ہاں جو نظام قائم کئے وہ قرآنی نظام اجتماعیت کے بالکل متضاد تھے۔ اس لئے کہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ کہ قرآنی نظام حیات انسانیت کے لئے کماحقہ، نفع رساں ہے خود ان کی تاریخ اس کی تردید کرتی ہے۔

معترض کو یہ تو تسلیم ہے کہ یہ نظام عہد رسالت زمانۂ خلفاء میں کامیاب ہوا جو اس کے رفع اعتراض کے لئے کافی ہے گویا اس معترض کے نزدیک جناب محمد ﷺ اپنی ذات میں انسانیت کی رہبری کا مکمل نمونہ تھے۔ اور خلفائے راشدین بھی آپ کی پیروی کی بدولت اس درجہ کمال تک پہنچے کہ عوام ان سے بھی مستفید ہو گئے۔ کہنا یہی ہے کہ خلفائے راشدین کے بعد چاروں طرف حسد و کینہ اور عناد و دشمنی کے چشمے ابل پڑے۔ کہیں یہود کی سازشیں ابھر آئیں تو کہیں قبائلی عصبیت پھوٹ نکلی جس کی بدولت اس نظام کے اجراء میں رکاوٹ پیدا ہو گئی۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں پر بھی مادیت نے اپنا تسلط قائم کر لیا اور مسلمان خود اپنے حیوانی جذبوں کے تلے دب کر اپنا وقار کھو بیٹھے!

قرآن حکیم گواہ ہے کہ سید البشر معلم کتاب و حکمت محمد ﷺ اپنی صفات اعلیٰ کی بناء پر انسانی تمدن و ارتقاء کے بہتر راہنما تھے۔ اور اس کتاب میں اس کی وضاحتیں بھی آپ نے پڑھیں۔ نبی اکرم ﷺ نے مسلمانوں میں اخوت کی بنیاد قائم کر کے انہیں ایسے تمدن کی راہ پر ڈال دیا جس کی گھٹی میں بھائی چارہ' ایثار اور خلوص تھا۔ اب آپ نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مکی زندگی کی مصیبتوں پر نظر ڈالئے جہاں آپ کے ساتھ تمام مسلمان بھی مصیبتوں میں مبتلا رہے لیکن ان میں سب سے زیادہ خوف و ہراس کا تختہ مشق خود نبی رحمت ﷺ کی ذات برحق تھی۔ یہاں تک کہ آپ ﷺ کو مدینہ منورہ ہجرت کرنا پڑی جہاں مہاجرین اور انصار کے درمیان اس انداز سے بھائی بندی کا رشتہ قائم کیا جس کی بدولت دونوں آپس میں یک جان و دو قالب ہو گئے اور قرآن حکیم کا پیش کردہ اجتماعی وحدت کا نظریہ اس تمدن کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کا ذریعہ بنا۔ مہاجرین اور انصار کے مواخات میں ایمان کی قوت نے اور جان ڈال دی۔

سید البشر محمد ﷺ جو ایمانِ کل کی علامت تھے بلکہ ایمانِ کل کا مظہر تھے۔ غزوہ بدر میں پروردگار کی بارگاہ میں یہ درخواست پیش کرتے ہیں۔

اے اللہ تو نے جو مومنین کی نصرت کا وعدہ فرمایا تھا اس کے پورا کرنے کا یہی دن ہے۔ اے پروردگارِ عالم اگر آج یہ شکست کھا گئے تو اس کے بعد تیرا نام کسی کی زبان پر نہ آئے گا!

غزوہ بدر میں رسول اللہ ﷺ کا یہ کردار اللہ رب العزت کے ساتھ اس دائمی تعلق کا مظہر ہے جسے آپ ﷺ نے کسی اور غزوہ میں بھی نظرانداز نہیں فرمایا۔ جو اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ آنحضرت ﷺ کو نزولِ وحی کے وقفہ میں اللہ جل شانہ سے اتنا قرب تھا کہ ہر لمحہ یہاں تک کہ میدان کارزار میں بھی اس کیف و سرور سے محروم نہ رہتے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جس دل میں ایمان کامل ہو اس وجود گرامی پر موت طاری ہی نہیں ہو سکتی۔ ایسے

ایمان والوں کے لئے زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن یہ دنیا چھوڑنا ہی ہے۔ ہر ذی روح کو موت کا مزہ چکھنا ہی ہے۔ اگرچہ خود کو بچانے کے لئے کسی چونہ گچ کے گنبد میں ہی کیوں نہ بند ہو جائے۔

سرور کونین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کمال ایمان کی شان ہی تو ہے کہ غزوہ حنین میں مسلمان دشمن کی یلغار پر ادھر ادھر سہارا ڈھونڈ رہے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ کے نبی محمد احمد علیہ الصلوٰۃ والسلام کوہ گراں کی طرح اپنی جگہ پر نہ صرف خود ثابت قدم ہیں بلکہ دوسرے مجاہدین کو بھی پکار رہے ہیں۔ لوگو اس موت کے ڈر سے بھاگ رہے ہو جس سے ایک نہ ایک دن دوچار ہونا ہی ہے۔ اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے چند ساتھی بھی آپ کے ساتھ قدم جمائے کھڑے تھے۔ جن کی کمک میں ان کی قوتِ ایمان کارفرما تھی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ معرکہ قتال کی وحشت ناکی میں ایسی ثابت قدمی عجوبہ ایمان ہی کا کمال ہے۔ جس کی امداد سے مرد مومن اپنی تنگ دستی کے نتائج کی پرواہ کئے بغیر دوسرے مفلوک الحال بھائی کی کفالت کرنا اپنا فریضہ سمجھتا ہے۔

یہی ایمان لاوارث یتیم کے ساتھ حسنِ سلوک پر مائل کرتا ہے۔ یہی ایمان مرد مومن کو ایسے مسافروں کی آمد آمد پر چشم براہ رکھتا ہے جن کا زاد راہ انہیں جواب دے گیا ہو۔ یہی ایمان ضرورت مند سائل اور سوال میں حسنِ طلب (تعفف) کے پابند ناداروں کی کفالت پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ ایمان ہی ہے جس کی بدولت مومن کو کتاب اللہ کی بشارت میں ترقی کا سب سے اعلیٰ اعزاز ملتا ہے۔

ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ (23:3)

اور نہ ہمت ہارو نہ پریشان ہو تمہیں سربلند ہو گے اگر تم صاحب ایمان ہوئے تو۔

یہ مومن تھے جن میں سے ہر ایک تعمیل ارشاد میں ایک سے ایک بڑھ کر تھا۔ جو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و اتباع میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے میں بے مثال تھے۔ جن کے اعمال جن کی عملی زبان کی تبلیغ نے رسول خالق کائنات محمد ﷺ کے وصالِ رفیق اعلیٰ کے بعد بھی اسلام کا علم بڑی شان سے گاڑے رکھا۔ دور دراز کے ملکوں کے وہ لوگ جو صدیوں تک بھائی بندی کی تنظیم سے محروم ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ نفاق، عداوت اور دشمنی کا شکار ہو کر ضعیف، ناتواں ہو گئے تھے اور نامرادی اور ظلم و تشدد کا تختہ مشق بنے ہوئے تھے۔ انہوں نے جونہی قبول اسلام کے ساتھ ہی اپنی قوتِ عمل اور ایمان کی روشنی میں مواخات کا رشتہ استوار کیا تو ان کا شمار دنیا کی طاقتور قوموں میں ہونے لگا۔ کیونکہ اسلام کی راہنمائی میں انسان اسرارِ کائنات پر حاوی ہو جاتا ہے۔ گذشتہ صدیوں کے مسلمانوں کا تمدن عہد

حاضر کی متمدن قوموں کو شرما رہا ہے جو آج اپنے ارتقا کے غرور میں دوسری قوموں کو خاطر میں لانے کے روادار نہیں۔ جبکہ انہوں نے یہ ارتقاء' ضمیر اور ایمان بیچ کر مادیت حاصل کرنے کے لئے کیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں انہیں عارضی فروغ اور شان و شکوہ ملا۔ لیکن انسانیت اس مادی ارتقا کے شکنجے میں ہزارہا بحرانوں میں مبتلا تڑپ رہی ہے۔ اور مغرب کی تمام متمدّن قومیں ہر لمحہ اپنے آپ کو تباہی میں گھرا ہوا محسوس کر رہی ہیں۔

اسکی وجہ!

پیشہ ور علما کے تسلط نے اصل میں ساری خرابیوں کو پیدا کیا ہے۔ ہوا یہ کہ ایک طرف تو تمدن اسلام کی تخریب کاری میں داخلی (قبائلی عصبیت) اثرانداز ہوئی تو باہر سے اسرائیلیات نے ہلہ بول دیا۔ سب سے زیادہ بد نصیبی یہ کہ علمائے اسلام جو انبیاء کے وارث تھے' ذاتی مفاد' وجاہت اور مناصب کے لئے حق گوئی سے کنارہ کش ہو گئے دوسروں کو گمراہ کیا اور غلط مسائل بتائے بغیر انہیں کامیابی حاصل ہونا ناممکن تھی۔

موجودہ دور میں اس قسم کے مدعیانِ علم و ہوس نے بھی ایسی منحوس یادگاریں قائم کی ہیں کہ ان کی بدولت پورا معاشرہ ذلت و رسوائی میں گھرا ہوا ہے۔ ایسے علماء شیطان کے حواری ہیں جن سے بروز قیامت دوسرے تمام گناہ گاروں سے زیادہ ان ہی سے بازپرس ہو گی۔ اس لئے ہر وہ شخص جو علم دین پر حاوی ہے اسے سب سے پہلے انہی سے بغاوت کرنا چاہئے تاکہ اسلام ان کی ریشہ دوانیوں سے صاف ستھرا ہو کر اپنی صحیح صورت پر آجائے۔ اس قسم کے علماء مغرب ہی کے لئے مبارک ہیں۔ جہاں مذہب اور علم دونوں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں نہ کہ اسلامی ممالک میں جہاں تمدن' علوم' اور مذہب سب کے سب ایک دوسرے سے غیر منفک رہنا چاہئیں۔ کیونکہ علم مذہب کے بغیر اور مذہب علم کے بغیر کفرانِ نعمت کے مترادف ہے۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اسلامی تمدن (جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے) ان بادشاہوں کے اثر سے بھی محفوظ نہ رہ سکا جو نام کے تو مسلمان تھے مگر نہ انہیں اسلامی تمدن سے آگاہی تھی نہ وہ اسے خود اپنانا ضروری سمجھتے تھے۔ اگر ایسے مسلمان بادشاہ عوام کو ان قوانین کا پابند نہ کرتے جو اخوت اسلامی کے خلاف تھے اور رعایا کو اسلام کی بجائے اپنی شہنشاہیت کے جبر میں نہ جکڑتے تو آج دنیا کا نقشہ ہی کچھ اور ہوتا اور آج انسان جس کرب و بلا میں مبتلا بے بس پڑا سسک رہا ہے ایسا کبھی نہ ہوتا۔

مجھے یقین ہے کہ موجودہ مغربی اہل قلم اگر تعصب سے الگ ہو کر دنیا کے سامنے اسلامی تمدن کے صحیح خدوخال پیش کریں تو ساری دنیا ہمارے سامنے اس تمدن اسلام کو سینے سے

لگانے میں فخر محسوس کرے۔ تمدن اسلام جس کے اندر دل اور دماغ میں اتر جانے کی صلاحیت مکمل طور پہ موجود ہے۔

مگر اس مصیبت کا کیا کریں کہ جہاں کسی قوم نے اسلام پر توجہ کی' یارانِ طریقت (مغربی اہل قلم) فوراً" اس کو ورغلانا شروع ہو جاتے ہیں۔ تاہم جتنے بھی اہلِ علم اسلامی تمدن کے دعویدار ہیں اگر ایمانِ کامل اور تزکیہ دل سے منور ہو کر دوسرے کے سامنے حق گوئی و بے باکی سے کام لیں اور اپنے تمدن کی اصلی صورت پیش کریں تو مجھے یقین کامل ہے کہ دنیا عہدِ نبوّت علیہ السلام ہی کی طرح دین اسلام کی دعوت کو سر آنکھوں پہ رکھنے کے لئے لبیک پکار اٹھے اور ہر شخص اسلامی اخوت کی برکتوں سے سرشار ہو کر سربلند ہو جائے۔

جیسا کہ میں نے مقدمہ کتاب میں لکھا ہے کہ عہدِ نبوّت اور صدر اول نبی رحمت و حکمت علم و دانش محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں مسلمانوں کو جو عروج حاصل ہوا ہے وہ بذاتِ خود اس بات کی دلیل ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایات کے مطابق مسلمانوں نے اپنے آپ کو جن اخلاقی قدروں سے سنوار لیا تھا اسی انداز کے مطابق آج اگر اپنے اخلاق اور ایمان میں پختگی پیدا کر لی جائے تو دنیا کا موجودہ اقتصادی' معاشی' سیاسی تمام بحران اپنی موت آپ مر جائیں۔

مسئلہ تقدیر اور مغربی تیشہ زن

ایک اور مسئلہ یہ بھی ہے کہ جب بھی مغربی مستشرقین اسلامی تمدن کے مدوجزرِ عروج و زوال پر خامہ فرسائی کرتے ہیں تو اصلی بحث سے ہٹ کر کوئی نہ کوئی نیا شوشہ چھیڑ دیتے ہیں جس سے اصل موضوعِ سخن ایک دوسرے میں گھل مل جانے سے غائب ہو جاتا ہے۔اور پیاسے سراب کو پانی سمجھ کر اس طرف دوڑ جاتے ہیں۔ مثلاً یہ لوگ اسلامی تمدن کی خستہ حالی کو مسئلہ تقدیر سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ جس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ تمدنِ اسلام کی غیر مقبولیت کو تقدیر کے سر منڈھ دیا جائے حالانکہ مسلمان تقدیر پر قانع رہ کر ترقی کے ذرائع سوچنے کی زحمت ہی نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ قوم دنیا میں یوں ذلیل و خوار نظر آتی ہے۔ لہٰذا مسئلہ تقدیر ہم دوسری فصل میں زیر بحث لا رہے ہیں۔

خاتمہ (۲) اسلامی تمدّن اور مستشرقین

خاتمہ (۲) اسلامی تمدّن اور مستشرقین

واشنگٹن ارونگ (Washingtion Irving)

انیسویں صدی عیسوی کے مشہور امریکی مستشرق واشنگٹن ارونگ ہیں۔ جن پر نہ صرف امریکہ بلکہ تمام مسیحی اقوام فخر کرتی ہیں۔ موصوف نے رسول عرب و عجم محمد ﷺ کی سیرت پر کتاب لکھی ہے۔ اس کا ایک رخ اگر ایسے انصاف کا پہلو لئے ہوئے ہے جس سے ہمارے دل متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تو اس کا دوسرا رخ ایسے مکروہ خدوخال لئے ہوئے بھی ہے کہ جس سے پہلی کیفیت بھی نفرت سے بدل جاتی ہے۔ گویا اس میں حقیقت کو چھپانے اور جھوٹ کے پلندے ضبطِ تحریر کرنے میں کوئی پہلو نظرانداز نہیں کیا گیا۔

اسلامی نظریہ تقدیر اور مستشرقین

واشنگٹن ارونگ نے اپنی کتاب کے آخر میں جن مسائل کی بحث کو اپنا محور بنایا ہے وہ دین اسلام کے پانچ بنیادی عقائد ہیں۔ ایمان باللہ، اقرار ملائکہ، آسمانی کتابوں کی تصدیق، انبیاء اور مرسلین کی تصدیق و اعتراف، یومِ آخرت پر یقین! لیکن اس کے ساتھ چھٹا عنصرا یمان بالقدر یعنی "لکھی ہوئی تقدیر" کو بھی وہ زیرِ بحث لایا ہے۔ چنانچہ واشنگٹن کہتا ہے۔

کہ مسلمانوں کے عقائد میں سے چھٹا عقیدہ تقدیر ہے جس پر اللہ عزوجل کے رسول محمد ﷺ کو اتنا زیادہ یقین تھا کہ آپ کی جنگوں میں شرکت اور دلاوری اسی اعتقاد کو کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ ان کو پورا یقین تھا کہ انسانی زندگی میں پیش آنے والے ہر واقعہ کا علمِ خالق کائنات اللہ تعالیٰ کو پہلے ہی سے ہے اور وہ واقعہ اس عالمِ رنگ و بو کے وجود میں آنے سے پہلے لوح پہ محفوظ ضبط تحریر ہے۔

چنانچہ انسان کی موت کا جو لمحہ لکھا جا چکا ہے اس میں ایک لمحہ آگے یا پیچھے ہونا ناممکن ہے۔ اس لئے انسان کو اپنی زندگی کو بچانے کی کوشش ہی نہیں کرنا چاہئے۔

مسلمان اسی عقیدہ کے (فریب) میں آکر آگ کے دریا جنگوں میں کود پڑتے کہ اگر بچ گئے

تو فتح و نصرت کے نقارے بجاتے ہوئے دنیا پر حکمرانی کریں گے اور اگر شہید ہو گئے تو سیدھے جنت میں مزے لیں گے۔

اس کے بعد یہ عقیدہ ایک نئی شکل میں تشکیل پا گیا اور اس نئے تصورِ تقدیر کو ماننے والے فرقہ کا نام "جبریہ" کہلایا۔ یہ طبقہ اس بات پر یقین رکھتا ہے کہ انسان اپنے اعمال میں مختار نہیں بلکہ مجبور ہے۔ اس سے جو گناہ سرزد ہوتے ہیں اس کی ذات اس کی ذمہ دار نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ہر شے پر قادر ہے اور وہی سب کچھ کراتا ہے۔ اس عقیدہ کو بعض مسلمانوں نے اللہ تعالیٰ کے عدل اور اس کی رحمت کے منافی سمجھ کر اس کی تردید میں پوری طاقت صرف کر دی ہے لیکن ایسے لوگوں کا شمار اہل سنت میں نہیں ہوتا۔ تقدیر پہ قناعت کرنے یا صبر کرنے کی آیات محمد ﷺ پہ آغاز رسالت ہی سے نازل ہو رہی تھیں۔ جن کی تجدید ہر موقع پر وحی کے ذریعہ کر دی جاتی۔ جیسا کہ غزوہ احد میں جب مجاہدین انتہائی ہولناک تباہی میں گھر گئے جس کی وجہ سے بیشمار مجاہدین شہید ہوئے خصوصاً نبی اکرم ﷺ کے بزرگوار چچا حمزہ کے شہید ہو جانے سے شہادت سے بچ جانے والے مجاہدین پر انتہائی خوف و ہراس کے بادل چھا گئے تھے تب معلم و ہادی محمد ﷺ نے قانون الٰہیہ کو اس انداز میں بیان فرمایا۔ کہ موت کے لئے میدان کارزار اور رشیمیں گدوں کا بستر دونوں برابر ہیں۔ ظاہر ہے کہ انجام و نتائج سے بے خبر سپاہیوں کے لئے اس سے بہتر انداز ترغیب اور کیا ہو سکتا ہے کہ اگر شہید ہو گئے تو جنت میں لطف اندوز ہوں گے اور اگر زندگی نصیبوں میں ہے تو مال غنیمت سے بہرہ اندوز ہوں گے۔ مسلمانوں کے اس عقیدے نے انہیں نڈر اور بہادر بنا دیا تھا کہ ان کا بڑے سے بڑا بہادر قوی الجثہ بھی ان پر غلبہ حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرا دور آیا۔ یہی تقدیر کا تصور ان کے لئے زہر قاتل بن گیا اور ان کی سطوت کا جنازہ نکل گیا۔ جب ان کے خلفاء نے اپنی تلواریں میان میں کر لیں اور مسلمان جنگ جوئی اور جہاں بانی کا شیوہ چھوڑ کر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ گئے تو ساری توجہ فقیروں مزاروں اور دعاؤں پر مرکوز ہو گئی۔ پھر بے کار بیٹھے رہنے کے عادی ہونے کی وجہ سے عیش و آرام سے اتنے مانوس ہوئے کہ سامان تعیش سے چمٹ کر ہی رہ گئے۔ اگرچہ قرآن حکیم نے انہیں ان نعمتوں کو ان پر حلال کیا تھا لیکن جیسا کہ اباحت میں مسیحیت کے قوانین قرآن حکیم سے مختلف ہیں جن کے مطابق دنیا کی نعمتوں سے کترا کر نکل جانا ایمان کے مکمل ہونے کی دلیل ہے۔

مسلمانوں نے اپنے آپ کو ایسی تقدیر کے حوالے کر کے اپنے آپ کو اس حد تک معیبت میں ڈال لیا کہ ان کے نزدیک ذاتی جدوجہد تقدیر کے مقابلہ میں محض بے معنی ہو گئی۔ اگر مسلمان مشہور کلیے "اعن نفسک یعنک اللہ" اگر تم اپنی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ بھی تمہاری

مدد فرمائیں گے) کو اپنا اصول حیات بنا لیتے تو ان کی یہ درگت نہ ہوتی کہ صلیب ہلال پر غالب آ جاتی۔ اگر مسیحی یورپ میں ابھی تک ترکوں کا ہلال نظر آتا ہے تو وہ بھی صرف اسی لئے کہ

(الف) یہ مسیحی مملکت کی مہربانی ہے۔

(ب) دوسری وجہ مغرب میں باہم اختلافات ہیں۔

(ج) یا اس مشہور قاعدے کی صداقت کہہ لیجئے کہ جو شخص آپ سے اپنی قوتِ شمشیر سے آپکی شمشیر لے لے اس سے واپس لینے کے لئے بھی آپ کو قوت شمشیر سے کام لینا ہو گا۔

یہ ہیں واشنگٹن ارونگ صاحب کی عقل و دانش کے شاہکار جن کا ہم نے سطور بالا میں ذکر کیا ہے اب ہم اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں۔ واشنگٹن ارونگ جیسے مرد دانا اگر ایسی باتیں کہیں جن سے یہ ظاہر ہو کہ موصوف وہ ہیں جنہیں اسلام کی روح اور اس کے تمدن کی الف' بے بھی نہیں آتی تو بے جا نہ ہو گا۔

مسئلہ تقدیر میں دوسرے مباحث کی شمولیت

موصوف واشنگٹن ارون نے قضا و قدر اور موت کے آخری لمحوں کے تعین کو زیر بحث لا کر ایسا نتیجہ اخذ کیا جس پر علم و دانش جتنا ماتم کرے اتنا ہی کم ہے۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ موصوف کے تقدیر سے متعلق حاصل کئے ہوئے علم کی حد ہی یہاں تک ہو! جس میں تقدیر کا مفہوم ہی یہی سمجھایا گیا ہو۔

لیکن قرآن حکیم کی تشریحات کے مطابق خود اعتمادی اور دینی جدوجہد کا وہ نتیجہ ہے جس کی تہہ میں حسن نیت بھی ہو اور مسلسل کوشش کی روح رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی تعمیل ہے۔ "اعن نفسک یعنک اللہ" تم اپنی مدد کرو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو پیش رکھنا موصوف کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ قرآن حکیم میں ارشاد ہے۔

یا ایھا الناس قد جائکم الحق من ربکم فمن اھتدی فانما یھتدی لنفسہ ومن ضل فانما یضل علیھا۔ (109:10)

کہہ دو لوگو تمہارے پروردگار کے ہاں سے تمہارے پاس حق آ چکا ہے۔ تو جو کوئی ہدایت حاصل کرتا ہے تو وہ اپنے ہی لئے ہدایت پاتا ہے۔ (بھلائی حاصل کرتا ہے) اور جو گمراہ ہوتا ہے تو اس کی گمراہی اس کے اپنے لئے ہی نقصان دہ ہے۔

(2) ولا تزر وازرۃ وزر اخری وماکنا معذبین حتی نبعث رسولا۔ (15:17)

اور کوئی شخص کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ جب تک ہم رسول نہ بھیج لیں عذاب نہیں کرتا۔

(3)من کان یرید حرث الاخرہ نزدلہ فی حرثہ ومن کان یرید حرث الدنیا نؤتہ منھا ومالہ فی الاخرۃ من نصیب۔ (20:42)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اس کے لئے آخرت کی کھیتی کو زیادہ کرتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی کا طلب گار ہو اس کو ہم اس میں سے ہی دیں گے لیکن آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہو گا۔

گویا ہماری یہ زندگی کھیت کی حیثیت رکھتی ہے۔

اور یہ بھی فرمایا۔

ان اللہ لایغیر مابقوم حتی یغیروا مابانفسھم۔ (11:13)

اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ اپنی حالت خود نہ بدلے۔

ثابت ہوا کہ انسان کو اس بات کا اختیار ہے کہ وہ اپنی ایک کروٹ سے دوسری کروٹ بدل لے جو ہماری عام زندگی میں بھی گواہ ہے۔

قرآنِ حکیم میں ارادہ و عمل کی وضاحت

قرآن حکیم میں بہت سی آیات موجود ہیں جن میں اللہ جل شانہ نے انسانوں کو واضح طور پہ فرمایا کہ ارادہ اور عمل ہی تمہاری کامیابیوں کا زینہ ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کئی آیات میں انسان کو جہاد فی سبیل اللہ کی تاکید فرمائی ہے جسے کہ قارئین سابقہ اوراق میں جا بجا پڑھ چکے ہیں۔ جن سے واشنگٹن ارونگ اور ان کے دوسرے ہم پیالہ و نوالہ دوستوں کے الزام کی تردید ہوتی ہے کہ اسلام اپنے ماننے والوں کو ایسے توکل کی ہدایت دیتا ہے کہ انسان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہوا اپنی کامیابی کا یقین رکھے یا انتظار کرے اور اپنے ارادہ اور کوشش کو نفع و نقصان کے لئے موثر نہ سمجھے اور یہ کہنے کی کوشش بھی اللہ ہی کی چاہت سے ہی نصیب ہوتی ہے اور جب ہماری تقدیر میں مشیت نے ناکامی لکھی ہوئی ہے تو پھر کوشش سے کیا فائدہ۔ اگر تقدیر میں کامیاب ہونا ہے تو کوشش کے بغیر ہی کامیاب ہو جائیں گے۔

لیکن قرآن حکیم مستشرقین کے ان الزامات کی تردید کرتا ہے جسے کہ سابقہ آیات میں آپ نفسِ مضمون کو پڑھ چکے ہو سکتا ہے کہ وہ مسلمان جو اپنی کاہلی کی وجہ سے آخری صدی میں ناکامی اور نامرادی کی زندگی بسر کر رہے تھے مذکور معترضین انہیں مندرجہ ذیل آیات کا مورد نہ سمجھتے ہوئے انہیں کو اپنے استدلال کی بنیاد قرار دیتے ہوں!

(1)وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا" موجلا"۔ (145:3)

کسی شخص میں طاقت نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر مرجائے۔ اس نے موت کا وقت

مقرر کر کے لکھ رکھا ہے۔

موت کا وقت لکھے جانے سے انسان کے افعال کا کوئی تعلق نہیں۔

(2)ولکل امۃ اجل فاذا جا اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ (34:7)

اور ہر ایک کے فرقہ کے لئے (موت کا) ایک ہی وقت مقرر ہے نہ تو ایک گھڑی دیر کر سکتے ہیں اور نہ ہی جلدی۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی انسان کی تقدیر سے کوئی واسطہ نہیں۔

(3)وما اصاب من مصیبۃ فی الارض ولا فی انفسکم الا فی کتاب من قبل ان نبراھا ان ذالک علی اللہ یسیرا۔ (22:57)

کوئی مصیبت ملک پر اور خود تم پر نہیں پڑتی مگر پیشتر اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں ایک کتاب میں (لکھی ہوئی ہے) اور یہ (کام) اللہ کو آسان ہے۔

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ اپنے اختیارات کا تعارف فرما رہے ہیں۔

(4)قل لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا وعلی اللہ فلیتوکل المومنون۔ (51:9)

کہہ دو کہ ہم کو کوئی مصیبت نہیں پہنچ سکتی بجز اس کے جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے لکھ دی ہو وہی ہمارا کارساز ہے اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیئے۔

اس آیت کا مفہوم بھی انسان کو اس کے عمل میں اعتقاد کی قوت بخشتا ہے۔

مستشرقین مذکورہ آیات کے مفاہیم سے ناآشنا ہیں' اس لئے وہ ان آیات کو اپنی تحریر کا مرکز بنا کر بزعم خود اپنی عقل و دانش پہ اترانے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آیات بندے اور اس مختار کل مالک کے درمیان رابطہ کی تشریح کرتے ہیں۔ لیکن معترضین یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام اپنے فرماں برداروں کو ترکِ جدوجہد یا کاہلی کی تعلیم دیتا ہے جب کہ اسلام اس کے بالکل برعکس معاشرہ کے ہر فرد کو انفرادی اور اجتماعی طور اخوت' محبت و ایثار اور ایک دوسرے سے لطف و کرم سے پیش آنے اور خوددار و باوقار زندگی گزارنے کی تعلیم دیتا ہے۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ قرآن حکیم میں جہاں تقدیر کا ذکر کیا گیا ہے وہاں اس مسئلہ کی پوری طرح وضاحت کر دی گئی ہے جس پر تمام مغربی فلاسفر متفق ہیں اور اسے اپنی اصطلاح میں "جبریت" تعبیر کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قرآن حکیم نے کائنات کے مربوط و منظم دستور فطرت کو اللہ تعالیٰ کے تصرف اور علم سے منسوب کیا ہے۔ اور یہ لوگ اسے مبہم تصور کے ساتھ قانون فطرت یا زندگی کے تقاضوں یعنی مادہ میں ازخود موجود کیمیاوی عمل کے نتیجہ کا نام دیتے ہیں۔ جو اسلامی تصورِ جبریت کے مقابلہ میں زیادہ تنگ نظری اور کم علمی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

یہ علمی جبریت اس حقیقت کو تسلیم کرتی ہے کہ انسان کو اضافی طور پر اختیار دیا گیا ہے اس کے اختیارات کا حلقہ محدود ہے۔ مغربی فلاسفر اس حدِ اختیار کو تسلیم کرنے پہ اس لئے مجبور ہیں کہ انسان کی اجتماعی ضرورتیں اسی بات کی متقاضی ہیں۔ ورنہ ان کی علمی خودسری اور فلسفیانہ غرور اس بات کو بھی تسلیم نہ کرے اور اگر اس جزوی اختیار سے بھی انکار کر دیا جائے تو معاشرہ میں قانون' تہذیب' اخلاقی اقدار کے نقشوں اور ضابطوں کو قائم رکھنا بے معنی ہو جاتا ہے اور کوئی شخص بھی اپنے اعمال کی بازپرس کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔

بیشک ایک طبقہ ایسا ضرور ہے جنہیں عالم' درویش یا صوفی کہا جاتا ہے۔ انہوں نے انسانی جزا و سزا کی بنیاد انسانی اختیار عمل کو قرار دینے سے انکار کیا۔ بلکہ بنیاد اس پر رکھی ہے کہ کسی شخص کی وفات سے معاشرہ پر کیا اثر پڑتا ہے

تری دنیا جہان مرغ و ماہی
میری دنیا فغان صبح گاہی
تیری دنیا میں میں محکوم و مجبور
میری دنیا میں تیری بادشاہی

لیکن علماء و فقہا کی اکثریت نے اختیار کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ساتھ ہی اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ آئین الٰہیہ میں انسان کے محدود مختار ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اللہ تعالی اپنے قانون یا جزا و سزا سے ان انسانوں کو الگ قرار دیتا ہے۔ مثلاً پاگل' نیکی اور بدی کی تمیز سے انجان' بچہ اور بے ہوش ان۔ میں سے کوئی بھی قانون الٰہیہ کو جوابدہ نہیں۔

لیکن جب ہم ان عملی تقاضوں کا خیال نہ رکھیں مسئلہ صرف علمی پہلو ہی سے جائزہ لیں تو پھر ماننا پڑے گا کہ علمی اور فلسفیانہ جبر ہمیں چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب ہے جو شخص جس زمانہ میں پیدا ہوا مجبوری سے پیدا ہوا۔ نہ تو مولود کو کسی اور وقت ہی پیدا ہونے کا اختیار تھا نہ اسے اپنی جننے والی کے اس فعل تولید پر اختیار کہ وہ اس وقت میں کوئی کمی بیشی کر سکے! اسی طرح نہ ہی کسی اولاد کو اپنے والدین کی امیری اور غریبی سے تعلق نہ ان کی عزت و وقار یا ذلت و رسوائی سے واسطہ کہ وہ اپنی مرضی سے ان حالات میں تبدیلی پیدا کر سکے۔

مولود لڑکی ہو تو واہ واہ ------ لڑکا ہے تو سبحان اللہ' نہ اسے اپنے گردوپیش ماحول میں دخل اندازی کی طاقت! جو ہوا' ہو رہا ہے یا بعد میں ہو گا اس میں ذرہ برابر تبدیلی بھی اس کے بس کی بات نہیں۔ اس حقیقت کو فرانسیسی فلاسفر "ہیولیٹ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ "انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہے" مزید براں دوسرے فلاسفر بھی یہ مانتے ہیں کہ اگر ہم کوشش کریں تو فرد اور اقوام کے مستقبل پر اس حد تک فیصلہ صادر کر سکتے ہیں جس حد تک اجرام فلکی کی آئندہ نقل و حرکت اور شمس و قمر کے گرہن کے اوقات کے (قبل از وقت) اظہار وقت پہ قدرت رکھتے

ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ مشرق و مغرب کے علماء و فلاسفر میں سے کسی نے بھی ان مسلمات کے باوجود حتمی طور یہ دعویٰ نہیں کیا کہ جب فطرت نے ہی کائنات کے ہر ذرہ کو اپنے جبر کے ہاتھ میں قید کر رکھا ہے تو پھر انسان پہ ذمہ داری کیوں عائد کی جاتی ہے کہ وہ اپنی ترقی اور بھلائی کے لئے جدوجہد کرے اور نہ ہی ان فلاسفرز میں سے کسی نے یہ کہا کہ جبرِ فطرت کے سامنے کسی قوم کو اپنا مستقبل درخشاں کرنے کے لئے جدوجہد مفید نہیں۔ لیکن صرف مخصوص مزاج کے مستشرقین ہیں جو مسلمانوں کے تقدیر پر ایمان رکھنے کی وجہ سے ان کی زندگی میں جدوجہد کو یعنی تقدیر اور کوشش کو ایک دوسرے کے متضاد قرار دیتے ہیں۔

کوشش اور تقدیر :۔ غرض مغرب کے دانشوروں کا کہنا ہے کہ فطرت کا قانونِ جبر سب پر غالب ہے۔ اور قانون الٰہیہ کی تشریح کرنے والی کتاب قرآن حکیم "تقدیر اور کوشش" دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت کچھ سہی لیکن تمہاری جدوجہد کا پھل مرتب ہو کر رہے گا۔

وان لیس للانسان الا ما سعی وان سعیہ سوف یری (53:39-40)

اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کوشش کا جلد ہی جائزہ لیا جائے گا۔

اب غور کیجئے کہ قرآن کا اصول تقدیر ان آیات کے پیش نظر زندگی کے لئے کار آمد اور بہتر ہے یا مستشرقین کا تسلیم شدہ فلسفہ اجباری قانون فطرت؟ جس کی سطوت کے قہرو ستم ایک طرف اور دوسری طرف قرآن حکیم کا مفہوم و مطلوب مشفقانہ اصول جو انسان کو ہر ممکن جدوجہد سے اپنی بھلائی اور عزت و وقار حاصل کرنے کی تعلیم دے۔

بلاشبہ فریقین، مسلمان اور مستشرقین اس حد تک متفق ہیں کہ کائنات پر ایک ایسا اٹل قانون مسلط ہے جس سے انسان سرکشی نہیں کر سکتا۔ انسان اس قانون میں جکڑا ہوا ہے۔ لیکن مستشرقین اور مسلمانوں میں یہ فرق واضح ہے کہ اہل مغرب کے تصورات کے مطابق انسان کا اپنے لئے جدوجہد کرنا یا ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنا دونوں برابر ہیں لیکن قرآن حکیم کا تصور تقدیر ہر فرد کو عقل کی مدد سے نیک ارادوں کی تکمیل پر توجہ دلاتا ہے اور اسے کہتا ہے کہ محنت کا پھل ضرور ملے گا۔ اگر تم محنت سے ہاتھ کھینچ لو گے تو تم دنیا میں کبھی بھی باآبرو جی نہیں سکو گے۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔ (13:11)

اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت آپ نہ بدلے۔

گویا اللہ تعالیٰ نے انسان پر فکرو تدبر کو استعمال کرنا ضروری قرار دیا ہے جیسا کہ آسمانی کتابوں

اور مرسلین کی تعلیمات بتاتی ہیں اور جن کے مطابق "سنت اللہ" اور اس کی مشیت دونوں پر غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور صاف کہہ دیا گیا ہے کہ جو بھی اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے بعد اس کے قوانین پر متوجہ ہو گا اس کو اس کی کوشش کا پھل ضرور ملے گا۔ اگر اس کے لئے نیکی کی راہ میں جان دینا لکھا ہے تو اس میں خوف و ہراس کی کونسی بات ہے؟ اس تصور تقدیر کا مالک ہر شخص اپنی سرفروشی کے عوض ہمیشہ کی زندگی کا اعزاز پا چکے ہیں۔ "احیاء عند ربھم یوزقون" (63:3)

اگر اسلام نے ایسی شہادت کو زندگی کے مقابلہ میں اعلیٰ ترین مقام دیا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں حاصل ہو اور اس دعوت کی صدا سب مسلمانوں کے لئے لگا دی گئی تو پھر تکمیلِ ارادہ کی اس سے بہتر راہ یا بہتر دلیل اور کون سی ہو سکتی ہے۔

جیسا کہ واشنگٹن اورنگ اور ان کے ہم نواؤں کا بھی یہی مقولہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ پر توکل کا نام کاہلی نہیں توکل کے معنی یہ نہیں کہ خود کو اس کے احکامات کی تعمیل سے بے نیاز ہو کر کے بیٹھ جائیں۔ بلکہ توکل اس کے اشارہ پر سرفروشانہ جدوجہد کا نام ہے۔

عزم و ارادہ اور توکل

فاذا عزمت فتوکل علی اللہ (158:3)

اور جب تم ارادہ کر لو تو پھر اللہ تعالیٰ پہ بھروسہ کرو!

توکل انسان کے اندر ایک ایسی غیر مرئی قوت کی ناقابلِ شکست پشت پناہی کا احساس پیدا کر دیتا ہے کہ اس کے بعد انسان اپنی کوشش میں ناکامی کا چہرہ دیکھ ہی نہیں سکتا۔ پھر جس معاملہ میں بنیادی مقصد ہی اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنا ہو اور اس میں کسی طرح کا خوف و ہراس بھی نہ ہو تو "سنت اللہ" جو ازل سے تا ابد غیر متبدل ہے کے اصول کے مطابق اس شخص کے لئے دستگیری کے سامان خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں جس کے ساتھ ہی اس شخص کا اپنی کوشش میں کامیاب و کامران ہونا یا اس کوشش میں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھنا دونوں صورتوں میں مقصد کا حصول ہی تو ہوتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اگر وہ کامیاب ہو جائے تو اسے اپنے اللہ کی مہربانی سمجھے اور اگر ناکامی ہو تو اس میں اپنی ہی کوتاہی سمجھے اور اگر انسان نے اللہ تعالیٰ کے توکل یا اس کی قدرت کاملہ کا سہارا چھوڑ کر دوسری قوتوں کو اپنی کامیابی کا ذریعہ تصور کر لیا تو یہ اس کی سب سے بڑی بھول ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نیکی کی نسبت اس ذات کبریا سے اور ہر برائی کا انتساب ابلیس کے وسوسہ یا شیطانی چکر سے کیا جاتا ہے۔ رہا یہ کہنا کہ ہر حادثہ کا علم اس کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اللہ علیم و حکیم کو ہوتا ہے۔

لا یعزب عنہ مثقال ذرۃ فی السموات ولا فی الارض ولا اصغر من ذالک ولا اکبر الا فی کتاب مبین۔ (3:34)

ذرہ برابر چیز بھی اس ذات اعلیٰ و برتر سے پوشیدہ نہیں نہ آسمانوں میں نہ زمین میں۔ اور کوئی چیز چھوٹی یا بڑی نہیں مگر کتاب روشن میں (لکھی ہوئی) ہے۔

بلاشبہ یہ درست ہے لیکن اس کا یہ علم کسی انسان کے عمل پر اثرانداز نہیں ہوتا۔ انسان اپنے ارادہ اور عمل پہ قادر ہے۔ اور پھر رسول اللہ ﷺ کی امتِ مسلمہ کو سکھائی ہوئی دعائیں اس بات کی گواہ ہیں کہ یہ لکھا ہوا انسان اپنی کوشش سے بدل سکتا ہے۔ مثلاً۔۔۔ دعا ہے۔ وقنی من شر ما قضیت فانک تقضی ولا یقضیٰ علیک۔ یعنی اے اللہ مجھے اپنے ان فیصلوں سے بچا جو میرے لئے برے ہوں آپ خود اپنے فیصلوں میں مالک و مختار ہیں۔ اور آپ پر کوئی حاکم نہیں۔ وتر میں یہ پڑھی جانے والی دعا بھی ایک ایسی کوشش ہے جو ہماری لغزشوں سے ہمیں نقصان دینے والے فیصلوں کے عادلانہ اصولوں میں رحم کی درخواست کی صورت بدلوائے جا سکتے ہیں۔

تمام دانشور اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ اگر علم کو اتنا اختیار ہوتا کہ وہ کائنات کے تمام اسرار و رموز اور ان کی نوعیتوں کا احاطہ کر سکتا۔ تو وہ کبھی خاموشی اختیار نہ کرتا۔ وہ تمام افراد اور اقوام کے فرد عمل کا ایک ایک حرف دہرا دیتا۔ جس طرح علم نجوم کا ماہر اپنے علم کے زور سے چاند اور سورج کے گرہن میں آنے والی گرہیں کھول کر بتا دیتا ہے۔

ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ ہم اس عالم الغیب ذات اکبر اللہ جل شانہٗ کے علم پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں ہر رونما ہونے والے واقعہ کا مکمل علم اسے پہلے ہی سے ہے۔ جس طرح ایک کامل مہندس (انجینئر) کسی عمارت کا نقشہ تصور میں قائم کرتا ہے تو کاغذ پر منتقل ہونے سے پہلے وہ مکمل طور پہ اس کے تصور میں ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے علم میں یہ بھی ہوتا ہے کہ عمارت کی تعمیر میں استعمال ہونے والے میٹریل کی روشنی میں وہ اس کی مدت قیام سے بھی واقف ہوتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمارت کی مدت کی قیام اتنی ہے اور اس کا گرنا اتنی مدت میں لازمی ہے۔

ایک اقتصادیات کا ماہر آنے والے زمانے میں قبل از وقت اقتصادی مدوجزر پر اپنی رائے دے سکتا ہے۔ تو پھر اللہ جل شانہ خالق کائنات کے علم کو اپنی ہر چھوٹی بڑی مخلوق کے حالات سے مکمل آگاہی، ماضی حال اور مستقبل کی مکمل صورتحال پہ علمی احاطہ سے قادر نہ سمجھنا ناانصافی نہیں تو اور کیا ہے؟ بلکہ عقل و دانش اس تصور سے بھی بیزار ہیں۔ اللہ جل شانہ کے علم کی وسعت و قدرت اپنی جگہ! اور انسان کی تقدیر اور عمل کے نتائج کا آپس میں تعلق اپنی جگہ دو مختلف علم ہیں۔ انسان کو اپنے معاملات میں خود غور و خوض کرنے کا اختیار ہمارے سب کے تجربوں میں ہے۔ پھر اس غور و خوض کے بعد اس کی جدوجہد کے نتائج اس بات کی دلیل ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار کی اتنی وسعت دی ہے کہ وہ اپنی کوشش جاری رکھے۔ اپنی وسعت

کے مطابق صحیح سمت کا تعین کرے اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ (وکتب علی نفسہ الرحمہ اس ذات برحق جل شانہ نے اپنی مخلوق پر) مہربانی رحمت اور شفقت کرنا بذاتِ خود لازم قرار دے رکھا ہے۔ یعنی اللہ رحیم و کریم کے اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ وہ اپنی مخلوق پر رحمت و برکت نچھاور کرتا رہے۔

جو شخص اپنے گناہوں کا اقرار کرتا ہے وھو الذی یقبل التوبۃ عن عبادہ۔ (24:42) اور وہی تو ہے جو اپنے گناہ گار بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ یعنی گناہ کرنے والا جب معافی کی رو رو کر درخواست کرتا ہے تو وہ قبول فرمالیتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ تمہارا خالق وہی تو ہے جو اپنے بندوں کے بہت سے گناہوں سے درگزر کرتا ہے۔

"ویعفوا عن کثیر۔ (29:42) یعنی اللہ تعالیٰ تمہارا خالق وہ مہربان ہے جو تمہارے بہت سے گناہوں سے تم معافی مانگو یا نہ مانگو درگزر فرما دیتا ہے"

ذرا غور کیجئے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ باتوں کے درمیان ہم اللہ جل شانہ کے خلاف کئی باتیں کہہ جاتے ہیں ہمارے ہاتھ ہماری آنکھیں ہمارے قدم کتنے ہی گناہ کر گزرتے ہیں ہمیں اپنے گناہوں کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اگر اللہ تعالیٰ درگزر نہ فرمائیں تو ہمیں ان کی سخت ترین سزا ملنا لازم ہو۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ کائنات پر غور و فکر کرے اپنی نیکی کے معاوضہ سے مایوس نہ ہو۔ کتنا ہی بدنصیب ہے وہ شخص جو اپنی اصلی منزل سے بے خبر ہو حقیقت کی تلاش اور زندہ رہنے کے آداب کی تعلیم سے کنارہ کش ہو کر رہ جائے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت سے کٹ کر اس کی ذات سے دشمنی مول لے لیتے ہیں۔ اور پھر ان کے دلوں میں گمراہی کی مہر صادر ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ ختم اللہ علی قلوھم۔ (6:2) اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگادی اور وہ جہنم کا ایندھن بن گئے اور فیصلہ صادر فرمایا۔ ولھم عذاب عظیم۔ (6:2) تو ان کے لئے سب سے بڑا عذاب ہے۔ حیرت ہے انسان اپنے نظام حکومت میں وقت کے حکمران کے خلاف بغاوت کرنے والے کو پھانسی دینا تو جائز قرار دے اور احکم الحاکمین کے حکم کا باغی۔۔۔ یوں ہی چھوڑ دیا جائے کی رٹ لگائے! اس پہ کہے کہ میں دانشور ہوں!

اے ربِ کائنات! یہ مستشرقین قرآن حکیم کے نظریہ وسعت و ہمہ گیری سے انصاف کیوں نہیں کرتے؟ قرآن کا پیش کردہ نظریہ تقدیر نہ تو انسان کو کاہل بناتا ہے نہ انسان کو جدوجہد سے منع کرتا ہے۔ نہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو کر گھر بیٹھے رہنے کی اجازت دیتا ہے۔ بلکہ جو لوگ اپنی اس لغزش یا گمراہ خیالی سے توبہ کرلیں اللہ تعالیٰ کی رحمت مانگیں تو تقدیر ان کی مدد کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے دروازے ان پر بند نہیں ہوتے۔

لیکن مستشرقین قرآنی نظریہ تقدیر کے بالکل برعکس رٹ لگائے رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ قرآن میں تقدیر کی وضاحت اس طرح ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ پر توکل رکھنے کے ساتھ اپنے

معاملات کو پورا کرنے کی کوشش کرے جس مہم میں اسے ناکامی ہوئی ہے اسے ایک بار پھر سے شروع کرے۔ اگر اپنی کوشش سے ہاتھ نہ روکے گا تو کامیابی یقیناً اس کے پاؤں چومے گی۔ اللہ اس کا حامی و ناصر ہو گا۔

جب اسلام میں تقدیر کا یہ مفہوم ہو تو سعی اور جدوجہد کے ساتھ اس کی رضا و عفو کی امید رکھنا تقدیر کے وہ معنی کیسے ہو گئے جو یہ مہربان معین کرتے ہیں۔ آخر ہم اس کی عبادت کرتے ہیں اور اس کی ہی مدد چاہتے ہیں۔ "ایاک نعبد و ایاک نستعین" اور ہر شے کا وہی ہادی و ملجا ہے۔

اس حقیقت سے متعارف کرانے والے نظریہ تقدیر کے مقابلہ میں اور کون سا ایسا نظریہ ہے جو انسان کو ایسی اعلیٰ ترین تعلیم دے اس سے زیادہ امید کا اور کون سا افق ہے۔ جو انسان کے سامنے اس طرح نمودار ہو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لئے نیکی میں سبقت کرو گے تو اپنی محنت کا اپنی آرزو کے مطابق پھل پاؤ گے اور اگر کبھی شیطان کے گھراؤ میں آ کر حرص و ہوس تمہارے دل و دماغ میں بسیرا کر گئی اور پھر تمہیں احساسِ ندامت ہوا توبہ کر لی تو ربِ دوعالم تمہاری توبہ قبول فرمالیں گے۔

"صراط مستقیم" اللہ تعالیٰ کے اس قانون کا نام ہے جو کائنات کے ہر وجود میں جاری و ساری ہے۔ مگر عقل و دانش اس پر قابو نہیں پاسکتی۔ جو شخص اس حقیقت کو نظرانداز کر کے کسی اور طاقت کو اللہ تعالیٰ کا شریک سمجھ بیٹھے تو یہ شرک ہے کہ انسان ایک جھوٹ کو اپنا سہارا بنا کر فتنہ پروری میں اپنی کامیابی تصور کر کے طغیان و سرکشی میں ڈوب جائے۔ دوسروں سے بھائی بندی اور محبت کے رشتے کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے صرف اپنی ذات کی بھلائی اور فائدہ کو حاصل کرنے میں لگ جائے۔ ایسے باغیوں کا حشر انتہائی عبرت ناک ہونا آئین فطرت کے مطابق اس لئے عدل پہ مبنی ہے کہ دوسرے اس کے انجام کو دیکھ کر عبرت حاصل کریں۔ ایسے باغیوں کا یہ حشر اللہ تعالیٰ کے عدل اور رحمت دونوں پہ مشتمل ہے۔ گویا بدکرداروں کے لئے اس کی تعزیر کا کوڑا ہر وقت حرکت میں رہتا ہے۔ مثلاً۔

(1) موت جو ہر وقت اس بدکار کی گھات میں لگی ہوئی ہے۔ جونہی وہ گھڑی آجائے گی ایک لمحہ نہ آگے ہو گا نہ پیچھے پھر زندگی کے لئے تگ و دو کی کیا مجال ہے؟

(2) اسی طرح اگر نیک بختی اور بدبختی انسان پر مسلط ہو تو نیک بخت اور بدبخت دونوں کا نصیب لوح محفوظ پہ لکھا جا چکا ہے تو اس صورت میں بھی زندگی کے لئے جدوجہد بے کار ہے۔

اگرچہ ان مذکورہ بالا دونوں اعتراضات یا مباحث کا جواب دیا جا چکا ہے لیکن میں اس لئے تکرار سے کام لے رہا ہوں تاکہ موت کے اسلامی نقطہ نظر سے مقدر ہونے کا تذکرہ بھی شامل ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ کبھی نہ بدلنے والا نظامِ کائنات کا صرف وہ قانون ہے جو تخلیقِ عالم سے

پہلے ہی مقدر (مقرر) تھا۔

"کتب ربک علی نفسہ الرحمہ۔" (54:6) تمہارے پروردگار نے اپنے بندوں پر (ازخود) مہربانی کرنا اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اور رحمت اللہ کی وہ صفت ہے جو اس کے قانون ہی کی بنیادی شق ہے۔ نہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اسے (رحمت کو) واجب قرار دے لیا۔ یہ کہ ذات کبریا پر کسی امر کا وجوب لازم نہیں۔

وماکنا معذبین حتی نبعث رسولاً۔ (15:17) اور جب تک ہم رسول نہ بھیج لیں عذاب نہیں دیا کرتے! اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی قوم گمراہی کا شکار ہے اور اس کے پاس صراط مستقیم کا قانون بتانے والا یا نافذ کرنے والا نہ آیا تو اس پر اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل نہیں ہو گا۔ لیکن جس شخص نے اللہ تعالیٰ کو کائنات کا خالق و مالک بھی مان لیا۔ اسے اس کا بھی علم حاصل ہو چکا کہ اسی نے اپنی مخلوق پر اپنے قواعد عائد فرمائے ہیں۔ ان قواعد کے تابع اپنی زندگی گزارنے کے عواقب و نتائج کے علم سے بھی آشنا ہے۔ اور ان قواعد و ضوابط سے بغاوت کرنے والے کے نتائج سے بھی آگاہ ہے تو اب اس قادر مطلق اللہ عزوجل کا قانون تخلیق اور مشیت اس بات کی متقاضی ہے کہ مذکورہ تمام معلومات رکھتے ہوئے بھی اگر کوئی شخص گمراہی اختیار کرتا ہے تو وہ اپنے نفس پر آپ ظلم کرتا ہے اور اس صورت میں اس شخص کا انجام دوسروں کے لئے باعثِ عبرت بنا دینا حق و انصاف ہے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ "اسلامی عقیدہ کے مطابق جو شخص گناہ کرتا ہے وہ خود پر ظلم کرتا ہے۔ اسے سزا دی جائے گی اور دوسری طرف اس کا یہ قصور پہلے سے ہی اس کی تقدیر میں بھی لکھا ہے" یہ عقیدہ اصل میں نادانی یا سادہ لوحی کی وجہ سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ معترض کا ایسا تصور اس کی اپنی اس عادت کا نتیجہ ہے جس کی بنا پر وہ حقیقت سے چشم پوشی یا کج بحثی کا عادی بن چکا ہے۔ اس کا یہ فعل اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت (عقل) کی ناشکری بھی ہے۔

انصاف کی نگاہ سے دیکھیں تو جب مجرم خود ارتکابِ جرم کا قصوروار ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جرم کی سزا دیکر ظلم نہیں کیا۔ اس کی مثال اس طرح ہے جیسے ایک باپ اپنے بچہ کو آگ کے قریب لے جاتا ہے۔ مگر جونہی بچہ آگ کو پکڑنے لگتا ہے تو اس کا باپ اس کا ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ تاکہ اس کا ہاتھ آگ میں جلنے نہ پائے۔

باپ بچے کو آگ کے قریب اس مقصد سے لیکر گیا تھا کہ وہ اسے آگ سے کیا تکلیف پہنچتی ہے اس کا احساس اس کے ذہن میں پیدا کر دے۔ اب اگر بچہ لپک کر آگ میں ہاتھ ڈال دے یا ـــ اچھل کر آگ میں کود جائے تو اس میں باپ کا کوئی قصور نہیں ہو گا۔ یہی مثال ایسے باپ پر صادق آتی ہے جو اپنے بیٹے کو شراب اور جوئے کے نقصانات سے خبردار کرتا ہے۔ لیکن صاحبزادہ بالغ ہوتے ہی شراب نوشی یا جوئے کی لت میں پڑ جائے تو اس میں اس کے باپ کا کوئی

قصور نہیں۔ کیونکہ باپ تو اسے جوئے اور شراب کے نقصانات کی تعلیم اچھی طرح دے چکا سمجھا چکا۔ اس کے بعد بھی اس کا بچہ اگر اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ رہا ہے اور باپ اس کو اس سے نجات دلانے کی کوشش نہیں کرتا تو وہ باپ ملامت کے لائق نہیں ہو گا۔

خصوصاً جب ان جواری یا شرابیوں کی عبرتناک صورت دوسروں کے لئے باعث سبق ہو بلکہ انصاف کے تقاضا کے مطابق ایسے مجرموں کی اس عبرتناک حالت کو دکھانے کے لئے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جمع کرنا چاہئے تاکہ ان بدبخت جواریوں کو عبرت حاصل ہو۔ جو ابھی تک ان بری عادتوں سے اپنے آپ کو روکنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس طرح آپ اس نیکی کے مظاہرہ کریں گے جس کے فوائد کی انتہا نہ ہو گی۔ اس طرح آپ اس سادہ اور عام طریقہ سے دنیا و جہان کے ان گنت افراد کی اصلاح بھی کر سکیں گے۔

البتہ وہ باپ جو اپنی اولاد کو یہ کہہ کر نظرانداز کر دے کہ مجھے اس سے کیا واسطہ جو کریں وہ بھگتیں۔ تو ایسا باپ اپنی اولاد کے لئے ظالم کہلائے گا۔ اس لئے کہ اگر ہم پسو کو اس کے کاٹنے سے پہلے ہلاک کر دیتے ہیں یا کسی متعدی (وبائی) امراض کے پھیلنے سے پہلے اس کی روک تھام کے ممکن طریقہ اختیار کر لیتے ہیں۔ بنی آدم کو ہلاک ہونے سے پہلے بچانے کی تدبیر کر لیتے ہیں۔ ایسا پتھر جو شاہراہ پر پڑا یا گھر کے آنگن میں پڑا ہے جس کی ٹھوکر سے بچنے کے لئے یا دوسروں کو بچانے کے لئے ہم اسے وہاں سے ہٹا لیتے ہیں یا ہمارے جسم کا ایک عضو جو بے کار ہو چکا ہے جس کی وجہ سے دوسرے اعضا کا متاثر ہو کر بے کار ہو جانا لازمی امر نظر آتا ہے تو اسے کاٹ کر پھنکوا دینا ضروری تسلیم کرتے ہیں تو یہ سب حق بجانب ہو گا یا نہیں؟

اور اگر ہم ان سب امور سب بیماریوں میں گرفتار لوگوں کو ان کے حال پہ یہ کہہ کر چھوڑ دیں کہ ہمیں کیا ان کی تقدیر میں ہی یہی لکھا ہے وہ پیش آ کر ہی رہے گا تو یہ ہماری بے سمجھی کی دلیل ہے۔

اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر خطرہ سے محفوظ رہنے کے طریقہ سمجھا دیئے ہیں۔ جس طرح اس نے گناہ گار کے لئے توبہ کا ذریعہ واضح بیان فرما دیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ شخص اس سے فائدہ اٹھانے کی بجائے یہ سمجھ کر بیٹھ جائے یا مسلسل گناہ کا ارتکاب کرتا رہے کہ اس کے مقدر میں ہی لکھا ہے تو وہ تقدیر کے مطلب کو غلط انداز سے سمجھ رہا ہے۔ اس لئے کہ ہم پسو کو مارنے، پتھر کو ہٹانے اور گلے سڑے جسم کے حصہ کو کاٹ کر پھینک دینے کو ہی عدل قرار دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قانون ہمارا راہنما ہے۔ اس نے ہم کو علم دیا ہے کہ پسو خون چوسنے سے باز نہیں آ سکتے متعدی بیماریاں ہلاکت پھیلائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ عضوِ فاسد انسان کے پورے جسم کو فاسد بنا دے گا اس راہنمائی اور علم کے باوجود ہم تقدیر کے غلط مفہوم سے چمٹ کر خود کو مصیبت میں محصور کر دیں اور ان تکلیف دینے والی چیزوں کی مدافعت سے ہاتھ روکے رکھیں تو

کیا یہ عقیدہ ہماری کوتاہ اندیشی' حماقت یا تن پروری پر مبنی ہو گا یا نہیں؟

کائنات کے مقابلہ میں پسو' سنگِ گراں حتیٰ کہ انسان کی بساط ہی کیا ہے؟ بلکہ نفسِ انسانیت بھی اس کائنات کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جس کائنات کی ابتدا اور انتہاء دونوں کا پتہ نہیں چلتا۔ ہم جب بھی اپنے تصور میں اسے محصور کرنا چاہتے ہیں تصور کی دوڑ زمان سے لیکر مکان اور ازل سے لیکر ابد تک آکر دم توڑ دیتی ہے۔ کائنات کی تعریف میں ہمارے الفاظ گونگے اور تشبیہات بے جان ہو کر رہ جاتی ہیں۔ ہماری اس بے بسی کی دلیل ہماری کم علمی ہے۔ تاہم اس کم علمی کے باوجود ہماری عقل ہماری راہنمائی کرتی ہے کہ اللہ عزوجل کا وہ قانون جو کائنات پر جاری و ساری ہے عین عدل ہی عدل ہے۔ اس میں تغیرو تبدل کی کوئی گنجائش نہیں۔ اگر ہم اپنے آپ کو اس قانون کا مطیع و فرمانبردار رکھیں تو اللہ تعالیٰ نے ہمیں آنکھ' کان اور دل دیکھنے' سننے اور سمجھنے کی جتنی صلاحیتیں بخشیں ان کے ذریعہ ہم کائنات کی صفت اور اس کے سربستہ رازوں سے آگاہی حاصل کر کے اس کے خالق و مالک کو پہچان سکتے ہیں۔ اس کے حکموں کی تعمیل میں نیک کاموں کے لئے اپنے آپ کو آمادہ کر سکتے ہیں اور جب نیک اعمال کی بنیاد ایمان و خلوص پر ہو تو وہی اعمال عباداتِ الٰہی کا بہترین مظہر ہوتے ہیں۔

موت کیا ہے؟

زندگی اور موت کے درمیان ایک ہلکا سا پردہ ہے۔ دو سرحدیں۔ سرحد کی اس طرف کا نام زندگی اور ادھر کا نام موت ہے۔ جس کے نام سے لوگوں کے بدن پر تھرتھری آتی ہے۔ لیکن صرف ان لوگوں کو جن کا جیب اچھے اعمال سے خالی ہے۔ یہ اپنی بداعمالیوں کے انجام سے ڈرتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جنہوں نے اپنی زندگی میں ایمان باللہ پہ عمل کیا۔ اللہ تعالیٰ کے رسول ﷺ کے احکامات کی تعمیل کی وہ مسکراتے ہوئے موت کے فرشتے کا استقبال کرتے ہیں۔ اللہ رب کائنات فرماتے ہیں۔

الذی خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملاً و ھوالعزیز الغفور۔ (2:67)

وہ اللہ عزوجل جس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون اچھے کام کرتا ہے اور وہ غالب اور بخشنے والا ہے۔

اور اپنے نبی اکرم ﷺ سے فرمایا۔

وما جعلنا بشر من قبلک الخلد افائن مت فھم الخالدون○ کل نفس ذائقۃ الموت ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ والینا ترجعون۔ (21:34-35)

اور (اے رسول ﷺ) ہم نے تم سے پہلے کسی آدمی کو بقائے دوام نہیں بخشا بھلا اگر تم

مرجاؤ تو کیا یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے ہر جاندار کو موت کا مزا چکھنا ہے۔ اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آسودگی آزمائش کے طور پر دیتے ہیں اور تم ہماری طرف ہی لوٹ آؤ گے۔

مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفارا بئس مثل القوم الذین کذبوا بایات اللہ واللہ لا یھدی القوم الظالمین۔ (5:62)

جن لوگوں پر تورات اتاری گئی انہوں نے اس (کے بارے تفصیل) کو نہ اٹھایا۔ ان کی مثال گدھے کی سی ہے جس پر بڑی بڑی کتابیں لدی ہوں جو لوگ اللہ کی آیتوں کی تکذیب کرتے ہیں ان کی مثال بری ہے اور اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔

قل یا ایھا الذین ھادوا ان زعمتم انکم اولیاء اللہ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین○ ولا یتمنونہ ابداً بما قدمت ایدیھم واللہ علیم بالظالمین۔ (7-6:62)

ان سے کہہ دیجئے کہ اے یہود اگر تم کو یہ دعویٰ ہو کہ تم ہی اللہ تعالیٰ کے دوست ہو اور دوسرے لوگ نہیں تو پھر تم موت کی آرزو کرو۔ اگر تم سچے ہو اور یہ اپنے کئے ہوئے اعمال کے سبب کبھی ایسی آرزو نہیں کریں گے اور اللہ تعالیٰ ظالموں سے خوب واقف ہے۔

وھوالذی یتوفاکم باللیل ویعلم ما جرحتم بالنھار ثم یبعثکم فیہ لیقضیٰ اجل مسمی ثم الیہ مرجعکم ثم ینبئکم بما کنتم تعملون۔ (60:6)

اور وہی اللہ (رب العزت تو ہے) جو رات کو سونے کی حالت میں تمہاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اس سے خبر رکھتا ہے۔ پھر تمہیں دن کو اٹھا دیتا ہے تاکہ یہی سلسلہ جاری رکھ کر زندگی کی پہلے سے مقررہ مدت پوری کر دی جائے پھر تم سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے (اس روز) وہ تم کو تمہارے عمل جو تم کرتے رہتے ہو (ایک ایک کرکے) بتائے گا۔

اوپر بیان کی گئی آیات کا ایک ایک حرف انسان کو تقدیر محض پر قانع ہو کر بے عمل زندگی بسر کرنے سے روک رہا ہے۔ تمام پانچوں آیات اپنے اس مفہوم کو واضح کر رہی ہیں کہ موت اور زندگی کا مالک ایک اللہ تعالیٰ ہے۔ اور وہی ہر زندہ وجود کے اعمال کا نگران بھی ہے۔ دنیا میں کس انسان نے نیکی کو اپنایا۔ برائی سے بچا سب اس کی نگاہ میں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یاد رکھو زندگی محنت و عمل ہے۔ اور آخرت ان اعمال کی جزا و سزا ہے کہ اگر انسان نے اس زندگی میں نیک کام کیا ہے تو اس کے مطابق اس کو بدلہ ملے گا۔

ھوالذی جعل لکم الارض ذلولاً فامشوا فی مناکبھا وکلوا من رزقہ والیہ النشور۔ (15:67)

وہی اللہ عزوجل تو ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو نرم کیا۔ تو اس کی راہوں میں چلو پھرو اور اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق کھاؤ اور اسی کی طرف قبروں سے نکل کر جانا ہے۔

اس زمین نے جو کچھ پیدا کیا اس کو خود ہی کھایا یا دوسروں کو بھی کھلایا جس کی نشاندہی اس

آیہ کریمہ میں فرمائی۔

ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصہ۔ (9:59)

اپنے اوپر تنگی ہی کیوں نہ ہو مہاجرین کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے ہیں۔

گویا اپنی زندگی میں اس نے ایسے نیک اعمال بھی کیئے۔ اگر اس نے اس کارِ خیر سے غفلت سے کام لیا ہو تو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مجرم ہے!

لیکن اس کے برعکس جس شخص نے ہر نیک عمل میں پہل کی تو اس کا یہ اچھا عمل اللہ تبارک وتعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے اور آخرت میں اس کی بہتر جزا اس کے لئے یقینی ہے۔ اللہ تعالیٰ جہاں دنیا میں اپنے بندوں کے اعمالِ خیر و شر کی نگرانی کرتا ہے۔ وہاں اس نے ہمیں نیک و بد کا شعور بھی عطا فرما دیا ہے۔ اور یہ بھی بات صاف صاف طور فرما دی کہ فیصلہ سے پہلے جو تم نے کیا ہو گا وہ تمہیں دکھا دیا جائے گا۔

ومن یعمل مثقالِ ذرۃ خیراً یرہ○ ومن یعمل مثقال ذرۃ شراً یرہ۔ (99:7-8)

جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہو گی وہ بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہو گی وہ بھی دیکھ لے گا۔

بلاشبہ ہمارے مقدر سے زیادہ ہمیں نہیں مل سکتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ میں بجائے خود ہمارے لئے اچھے اعمال کی ترغیب ہے۔ یعنی اگر اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی کی جدوجہد کے درمیان ہی دنیا سے اٹھا لے یعنی یہ حادثہ جوانی کے زمانہ میں بھی ہو جائے۔ یا ہمیں انتہائی بڑھاپے کی عمر تک زندگی دے دے جس میں سوجھ بوجھ اور قوتِ عمل ایک ایک جواب دیکر ہمیں تنہا چھوڑ دیتے ہیں یہ تو ہمارے لئے دونوں حالتیں برابر ہیں۔ زندگی سال اور مہینوں سے تعبیر نہیں۔ بلکہ زندگی نام ہے اچھے اعمال اور نیکیوں کے پس انداز کرنے کا! جو لوگ نیک اعمال کرتے ہوئے گزر جاتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں زندہ ہیں اور یہی نیک اعمال دنیا میں بھی ان کا زندہ ذکر بن کر رہتے ہیں ان کے نام جریدہ عالم پہ ہمیشہ کے لئے ثبت ہو کر رہ جاتے ہیں۔ انہیں دنیا سے گئے صدیاں گزر گئیں لیکن ان کے اچھے اعمال کی بناء پر ابھی تک ان کی یاد زندہ ہے۔

موت کی گھڑی سے کیا مراد ہے؟

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مفہوم کیا ہے؟

فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ (16:16)

اور جب ان کا وقت آ پہنچتا ہے تو اس سے ایک پل نہ آگے ہوتا ہے نہ پیچھے!

بیشک موت کی گھڑی لمحہ بھر بھی آگے یا پیچھے نہیں ہو سکتی۔ جس کی تصدیق نظامِ عالم کا ہر لمحہ کر رہا ہے۔ دنیا کے ہر جاندار کی موت کا ایک لمحہ مقرر ہے۔ اور اس حقیقت کو تسلیم کر لینے میں کوئی قباحت بھی نہیں۔ آخر کسوفِ شمس او خسوفِ قمر کے لمحات بھی تو انسانی موت ہی کے مانند مقررہ وقت کا نتیجہ مانے جاتے ہیں جن میں لمحہ بھر تقدم و تاخر ناممکن ہوتا ہے۔

انسان کی موت کے طے شدہ وقت یا اس گھڑی کو پوشیدہ رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان دنیا میں نیکی کے لئے زیادہ سے زیادہ کوشش کر سکے! کیونکہ وہ اس گھڑی سے غافل ہے۔ جب موت کا فرشتہ اچانک آکر اس کی روح کو نکال کر لے جائے گا۔ جس کے بعد نیک اعمال کے سوا اس کا کوئی توشہ نہیں ہو گا۔

ہم رات دن موت کا عمل دیکھ رہے ہیں۔ کسی کو وہ ایک لمحہ علالت کے بغیر جھپٹ لیتی ہے تو کوئی مدتوں سے مرض کی وجہ سے موت کو بلا رہا ہے مگر وہ اس کے قریب نہیں آتی۔ جب تک اس کی موت کا وقت نہیں آتا۔

موت کا جرثومہ اور انسان

اصل میں موت کا جرثومہ انسان کے اندر ہی موجود ہے۔ بلکہ یہ رحم مادر سے ہی عالم وجود میں آتا ہے۔ جو ایک مقررہ مدت کو پہنچنے کے بعد انسان کی زندگی کو ختم کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

(2) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موت کا یہ جرثومہ یا تو مادی شکل میں انسان کے اعضائے رئیسہ یا بدن کے کسی اور عضو میں چھپا پڑا ہے یا غیر مادی حالت میں دماغ کے کسی کونہ سے لگا ہوا ہے جو دماغ کو انسان کی معینہ مدت کے وقت سے پہلے اسے دوسروں پر حملہ یا خود پر حملہ کرنے کی مدافعت کے لئے مشتعل کر کے اس کی موت کا محرک بن جاتا ہے۔

لہذا تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کا علم تمام ذرہ ذرہ کو اپنے احاطہ میں لئے ہوئے ہے۔ جس کے مقرر کردہ نظام عالم کے اصول و ضوابط میں کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ وہ ذاتِ کبریا ہر انسان کی موت کے لمحوں سے بھی آگاہ ہے۔

پروردگار عالم کا کتنا احسان ہے کہ جب تک وہ کسی قوم کی طرف رسول نہ بھیجے جو ان کو نیکی اور صحیح عقائد کی تعلیم دے انہیں اچھی طرح سمجھائے اس وقت تک کسی قوم کو اس کے گناہوں کی وجہ سے سزا نہیں دیتا۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر انسان ہی کیا۔ دنیا میں ہر ذی روح مستوجب سزا قرار پاتا۔ اللہ عزوجل کے اس ارشاد پر غور فرمایئے!

ولو یواخذ اللہ الناس بظلمھم ماترک علیھا من دابۃ ولکن یوخرھم الی اجل مسمی فاذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون۔ (61:16)

اور اگر اللہ غفور الرحیم لوگوں کو ان کے گناہوں کے سبب پکڑنے لگے تو ایک جاندار کو زمین پر نہ

چھوڑے لیکن ان کو ایک وقت مقررہ تک مہلت دی جاتی ہے اور جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک گھڑی نہ پیچھے رہ سکتے ہیں نہ آگے بڑھ سکتے ہیں!

اللہ رحیم و کریم نے اپنے رسولوں کو سخت تاکید کی کہ اپنی اپنی امت کو یہ بات ذہن نشین کرا دو۔

وذر الذین اتخذوا دینھم لعبا ولھوا غرتھم الحیوۃ الدنیا وذکر بہ۔ (70:6)

اور جن لوگوں نے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے ان سے کچھ کام نہ رکھو۔ البتہ اس قرآن کے ذریعہ نصیحت کرتے رہو۔

انبیائے کرام

اللہ تعالیٰ نے کسی رسول کو بادشاہ گھرانے میں پیدا نہیں کیا۔ نہ کسی دولت مند یا صاحب جاہ و منصب اور خانوادۂ علم و فضل سے مبعوث فرمایا۔ ہر نبی طبقۂ جمہور میں سے ظہور فرما ہوا۔

جناب ابراہیم علیہ السلام اور ان کے والد نجار تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے مولد ناصرہ کے نجار خاندان سے ظہور فرما ہوئے کئی انبیاء بکریاں پالتے تھے۔

نبی کے جمہور میں سے مبعوث ہونے میں یہ مصلحت ہے کہ جمہور دوسرے اوصاف کی طرح حقیقت کو بھی اغنیاء و ارباب جاہ میں ہی شمار نہ کرلیں بلکہ حقیقت کو اس خوش نصیب کی ملکیت سمجھیں جو خود بھی اس کو اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کے لئے استعمال کرے اور دوسروں کے لئے بھی ایسے ہی عام کر دے کہ انسان جو کچھ اپنے لئے پسند کرتا ہے وہی دوسروں کے لئے بھی پسند کرے۔ حدیث نبوی ﷺ ہے۔

یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ۔

سوال یہ ہے کہ کیا یہ سمجھ لیا جائے کہ اس کے بغیر ایمان کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ حقیقت کے دوسرے معنی یہ بھی ہیں کہ انسان کا شرف احترام اس کے حسب و نسب کی بجائے اعمالِ صالحہ کی بدولت ہے جو اس آیت سے واضح ہے۔

ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم۔ (13:49)

تم میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی بزرگ ہے جو متقی ہے۔

اسی طرح دوسری جگہ فرمایا۔

وقل اعملوا فسیری اللہ عملکم۔ (105:9)

اور کہہ دیجئے (ہمارے رسول ﷺ) کہ عمل کئے جاؤ اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

اور فرمایا۔

بل تجزون الا بما کنتم تکسبون۔ (52:10)

تم انہیں اعمال کا بدلہ پاؤ گے جو دنیا میں کرتے رہے۔ یاد رکھیے توحید باری تعالیٰ حقیقت کبریٰ ہی کا نام ہے۔

موت کا ایک بار پھر تذکرہ

ہم اس سے پہلے موت کے بارہ میں کہہ چکے ہیں کہ موت زندگی کے ایک مرحلہ ختم ہونے کا نام ہے۔ اور موت اس کی دوسری منزل کا آغاز بھی اور قیام و دوام بھی۔ بے شک ہم زندگی کے طویل مرحلے سے عملاً گزرتے ہیں۔ اور ہمیں اس کے بارہ میں اتنا ہی معلوم ہے جتنا ہماری عقل ہمارے شعور نے راہنمائی کی۔ لیکن آخرت کی زندگی کا معاملہ اس زندگی سے کہیں مختلف ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں جس قدر بتایا اس سے زیادہ نہیں جان سکتے۔ کیونکہ اس جہان کی کیفیت ہم سے پوشیدہ اور اللہ عزوجل کی اپنی تخلیق کردہ ہے۔ ہمارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ جتنی اطلاع اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرما دی اور ہم اس بات کے مکلف ہیں کہ ہمارے اعمال کی سزا ہمیں وہاں ملے گی۔ ہمیں اللہ عزوجل پر توکل رکھتے ہوئے اس سے اپنے اعمال کی عادلانہ جزا کی امید رکھتے ہوئے نیکی میں سبقت حاصل کرنا چاہئے اور دوسرے معاملات ذات کبریا پر چھوڑ دینا چاہئیں۔

مستشرقین اور کلیسائی کوششیں

امریکی مستشرق واشنگٹن اور اس کے ہمنوا قطع نظر اس سے کہ وہ مسند استشراق کے بیرے ہوں یا کلیسا کے مجاور دونوں کو اپنی غلطی پہ نادم ہونا چاہئے کہ انہوں نے اسلامی نظریہ تقدیر کے سر کیا کیا تھونپ دیا ہے۔ ہم نے اس مسئلہ کے سلسلہ میں صرف قرآن حکیم ہی سے جواب عرض کیا ہے۔ اس لئے کہ ہمارا مقصد نہ علمائے اسلام اور صوفیا کی توجیہات معرض بحث میں لانا منظور ہے نہ فلسفۂ اسلام کی تنقیحات پیش کرنا۔ واشنگٹن نے تقدیر کی آیات کو غزوہ احد اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شان نزول بتانے میں کلیسائی مجاوروں کی تحقیق سے بھی زیادہ کمزوریوں کا ارتکاب کیا ہے۔ ہم نے اس موضوع پر جو آیات پیش کی ہیں۔ ان میں سے بعض ہجرت سے قبل مکہ میں نازل ہوئیں۔ جب غزوات کا ذکر اذکار تک کہیں موجود نہ تھا۔

واشنگٹن اروِن اور ان کے ہم نوا مسیحی اہل قلم کی اس غلطی کا پس منظر یہ ہے کہ انہوں نے اسلامی نظریۂ تقدیر پر تحقیق کرنے کی بجائے اسے مسیحی تصورات کے سانچے میں ڈھال لیا۔ تاکہ پڑھنے والوں کو بلا تکلف اپنا ہم نوا بنالیں۔ کاش یہ حضرات اسلامی نظریہ تحقیق کو قرآنی نقطہ نظر سے پرکھنے کی زحمت فرماتے۔ اس سے انہیں اندازہ ہو سکتا تھا کہ وہ نظریات عقل و شعور کے ساتھ کس حد تک مطابقت رکھتے ہیں۔ اور جنہیں ہر زمانہ کے فلاسفرز نے اسلامی نظریہ تقدیر کے مطابق اپنے اپنے دور میں قبول کیا ہے۔

اگر مستشرقین منصفانہ طریق سے اسلامی طریق پر مسئلہ تقدیر کا تجزیہ کرلیں تو انہیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ تقدیر کا اسلامی تصور اس قدر ارفع و اعلیٰ ہے۔ جو زندگی کے ان تمام تصورات کو اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے جنہیں مختلف ادوار کے فلاسفرز نے تقدیر کے متعلق قائم کیا ان میں ابتدا سے لے کر اب تک کے بتدریج ارتقائی تصورات موجود ہیں۔

اسلامی نظریۂ تقدیر اور علمی تجربہ میں مطابقت

اگر مستشرقین اسلامی جبریت کی حقیقت کو سمجھ لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ تصور اعلیٰ اونچا اور کتنا گہرا ہونے کے ساتھ زندگی کے عین تقاضوں کے مطابق بھی ہے۔ تقدیر کے اس تصور کو ان تمام فلسفوں اور عقلی کوششوں کا نچوڑ قرار دینا چاہئے۔ جو اس سلسلہ میں بروئے کار لائی جاتی رہیں۔ یہ تصور اپنی ہیئت و ترہیت کے اعتبار سے بالکل انوکھا ہی نہیں بلکہ اسے ایک طرح کا ہمہ پہلو امتزاج کہنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ تصور نہ تو ایجابیت پسندوں کی علمی جبریت سے متصادم ہے۔ اور نہ ہی شوپنہار کے اس نظریہ سے برسرپیکار ہے۔ کہ یہ عالم محض ارادوں کی کارفرمائیوں کا کرشمہ ہے۔ بقول غالب ہر گز فریب ہستی میں نہ آئیو اسد۔۔۔ عالم تمام حلقہ دام خیال ہے' اور نہ ہی برگساں کے ارتقائے پیہم ہی سے اس کا ہے۔ اس کے برعکس ان تمام سچائیوں کو یہ اپنی وسعتوں میں لئے ہوئے ہے۔ اختصاراً" چند امور بامید غور و تدبر پیش کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ میرے پیش نظر مسیحی نظریہ تصوّر پر الجھنا مقصود ہے۔ بلکہ میں بارہا یہ عرض کرچکا ہوں کہ اسلام مسیح کی ابدی تعلیم کو بھی اس طرح تسلیم کرتا ہے۔ جس طرح دوسرے انبیائے سابقین یعنی ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کو تسلیم کرتا ہے۔ جیسا کہ خود جناب مسیح علیہ السلام نے انجیل مقدس میں فرمایا۔ "یہ نہ سمجھو کہ میں تورات یا پہلے انبیاء کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں۔ بلکہ میں انہیں پورا کرنے آیا ہوں۔

اسلام کا مقصدِ وحید

اسلام کا مقصد انبیائے کرام سابقین کی تعلیمات کو مکمل کرنا ہے۔ مگر ان کے شارحین کی تصحیح کرتے ہوئے جہاں کہیں حق اور باطل کو ملا دیا گیا ہے۔ اس کو الگ کرکے آگے بڑھنا ہے۔ اس لئے میں اسی نظریہ کی تعبیر قرآن حکیم کی روشنی میں کرنے والا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ مجھ سے پہلے بھی کئی اہل علم میرے ہم نوا ہیں۔ البتہ اسلوب بیان میں یقیناً" فرق ہو گا۔ لہٰذا اگر قسمت نے ساتھ دیا اور میں اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے ہو گا جن ارباب فکر و دانش کو علم کی نعمت نصیب ہوئی ہے۔ ان سے امید ہے کہ وہ میری لغزش پر میری اصلاح فرمائیں گے اور اس کے عطا کردہ علم و فضل کا شکریہ ادا کریں گے۔

قرآن حکیم کے سامنے سب سے پہلے یہ نظریہ مسلم ہے کہ یہ جہان ایسے مربوط اور منظم سلسلے کا نام ہے جس میں کسی تغیرو تبدل کی گنجائش ہی نہیں۔ یہ جہان صرف اس زمین و آسمان اور سیاروں اور ستاروں پر ہی منحصر نہیں جنہیں ہم اپنی گردوپیش میں دیکھ رہے ہیں۔

اسی روزو شب میں الجھ کر نہ رہ جا
زمیں اور بھی آسماں اور بھی ہیں

ان کے سوا بھی بے شمار محسوسات کے جہان ہیں۔ ان کے علاوہ بے حساب غیر محسوس جہان ہیں اور ہمارے حس و ادراک سے بالاتر ہیں۔ اور یہ سب کے سب ارض و فلک اور ستاروں کے ساتھ مل کر جہان رنگ وبو کی تشکیل کا ذریعہ قرار پاتے ہیں۔

اگر یہ صحیح ہے تو یہ بھی تسلیم کرلینا چاہئے کہ اس جہاں کے متعلق ہماری معلومات بے حد محدود ہیں۔ مثلاً ایتھر اور کہربائیہ کو ہی لیجئے۔ ایتھر ہمارے اور ستاروں کے درمیان حائل ہے اور کہربائی لہریں جنہوں نے ایتھر اور زمین دونوں کے درمیان تلاطم برپا کر رکھا ہے ان دونوں ایتھر اور کہربائیہ کی وجہ سے آفتاب اور دوسرے ستاروں سے ہمیں جس قدر بعد (دوری) ہے اس کے باہمی فاصلہ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ جل شانہ کے علاوہ کسی کو اس پر احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن ان اجرام کے درمیان اس قدر فاصلہ ہونے کے باوجود سب کے سب ایک ایسے مقرر کردہ نظام کے تابع ہیں۔ جس میں تغیرو تبدل ناممکن ہے۔ انسانی معلومات کی وسعت کے باوجود ہم ان نیرنگیوں سے بہت کم آگاہ ہو پاتے ہیں۔ بلکہ جوں جوں ہماری معلومات میں ترقی ہوتی جائے گی۔ ہم اصل حقیقت سے بہت دور ہوتے جائیں گے۔ البتہ ہماری معلومات میں اضافہ ضرور ہوگا جس کے مقابلہ میں حقیقت ہمیں نہایت کمزور نظر آئے گی۔ بایں ہمہ حقیقت کو ہم دوسری چیزوں سے غیر منفک تسلیم کرتے اور اسی کو اپنی ترقی کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اسی حقیقت کی روشنی میں ہم زندگی کے قوانین اور جہان کو بھی گمان کئے ہوئے ہیں۔ اگر ہم اس طرح تسلیم کرتے ہوئے اپنے تصور کو دور تک لے جائیں یا اس پر گفتگو کرنا چاہیں تو ہمارے لئے یہ میدان اور بھی محدود ہو جائے گا۔ پس ایک مثال پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

مریخ پر آبادی کی مثال

فرض کریں کہ مریخ پر انسانی آبادی موجود ہے۔ اور ان کے پاس لاسلکی تار بھی موجود ہے۔ جو اپنی آواز ایک سو ملین میل تک پھینک سکتی ہے۔ جس کے ذریعہ مریخ کے باشندے کرہ زمین پر رہنے والوں کو اپنے ہاں کے حوادث ٹیلیویژن کے ذریعہ سناتے رہیں۔ تو کیا یہ بات ہمارے فہم میں آ سکتی ہے۔ حالانکہ مریخ ان ستاروں سے قریب تر ہے جو زمین سے لاکھوں میل اور دور واقع ہوئے ہیں۔

مجھے عرض یہ کرنا ہے کہ جہاں حس کے متعلق ہماری کم علمی کا یہ حال ہے کہ اس کی مختصر سے مختصر اطلاعات پر بھی ہم احاطہ نہیں کر سکتے۔ دوسری طرف اس جہان کی بیحدو حساب وسعتوں، پہنائیوں اور پذیرائی کا یہ عالم کہ اس کے تاثرات ہماری زمین اور اس پر بسنے والی بے گنت مخلوقات میں یوں جاری و ساری ہیں کہ ہم انگشت بدنداں ہیں۔ پھر اگر اس جہان کا کوئی ایک کرہ ذرا سا پہلو بدل لے تو دنیا کا انجام کیا ہو؟

انسانی زندگی جو دوسری موجودات و مخلوقات کے مقابلہ میں بے مقدار ذرے کے درجہ پہ ہے۔ اپنی موجودہ صورت سے تحلیل ہو کر نہ معلوم کس حالت میں متبدل ہو کر رہ جائے۔ اور اگر حیاتِ کائنات پر کوئی بڑا حادثہ رونما ہو جائے تو پھر نہ معلوم کیا صورت ہو؟

خارجی اثرات اور انسان

ہماری زندگی اپنی فطری کمزوریوں کے سبب خارجی تاثرات سے کبھی نیکی کی طرف اور کبھی برائی کی طرف مائل ہو جاتی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں خارجی عوامل ہی کارفرما نہیں ہوتے بلکہ جس نفس پر یہ خارجی عوامل اثرانداز ہوتے ہیں۔ اس نفس کی ذاتی استعداد اور اثر پذیری اور واقعات کی نوعیت سب کے سب اپنی اپنی جگہ بنیادی عوامل کے ہی عناصر ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر ان عوامل کے نتیجے میں متاثر ہونے والا کبھی تو نیکی کی طرف اپنا رخ کر لیتا ہے اور کبھی برائی پہ آمادہ ہو جاتا ہے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ایک ہی حادثہ مختلف لوگوں پر مختلف ردِّعمل کا مظہر بنا۔ ایک ہی حادثہ کے ردعمل میں ایک شخص نیکی اور بدی کے درمیان آہنی دیوار بن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر دوسرے پر ویسے ہی حادثہ کا ردِّعمل اس سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ ردِّعمل اچھائی کی صورت میں ہو یا برائی کی صورت میں، دونوں صورتوں میں نتیجہ خارجی عوامل اور انسانی روح دونوں کی باہمی کیفیت اور تاثرات کا ہی مرہونِ منت ہو گا۔

بالکل اسی طرح نیکی اور بدی بھی قوانینِ خلقت اور وجود کائنات کے زیر اثر عالم وجود میں آتی ہے۔ جس طرح کہ مثبت اور منفی دونوں کہربائیہ کی ایک ہی گرہ میں اکٹھے بندھے ہوئے ہیں۔ بالکل ایسے ہی جیسے انسانی جسم کی بقا کے لئے کئی قسم کے جراثیم بھی اس کے بدن میں پل رہے ہیں۔

اس زمانہ میں نہ کوئی چیز مفید ہے نہ نقصان دہ۔ اشیاء کا نفع اور نقصان اس کے استعمال کی نوعیت پر منحصر ہے۔ جو چیز ایک صورتحال میں مہلک ہے وہی دوسرے حالات میں جان بخش بھی ہے۔ جیسے آگ برسانے والے جنگی ہتھیار جو لاکھوں انسانوں کا خون جلا کر راکھ کر دینے کے باوجود اب تک سرگرم عمل ہیں۔ جن کے شعلے چند ہی لمحوں میں فلک بوس قلعوں اور محلوں کو زمین بوس کر دیتے ہیں۔ حسین سے حسین فطرت کے مناظر آنکھ جھپکنے کی مدت میں ویران و برباد نظر آنے لگتے ہیں۔ مگر یہی آلات حرب جنگ کی عدم موجودگی میں اپنی افادیت کا دامن بھی

پھیلائے رکھتے ہیں جس سے انسان مکمل اطمینان محسوس کرنے لگتا ہے اگر یہی بارود اور آتش بار ایجادات نہ ہوتیں تو پہاڑوں کے سینے چیر کر ان میں ریل کی پٹڑی بچھانے کا امکان ہی نہ ہوتا۔ اسی بارود کی قوت زمین کے دل سے سونے اور چاندی کے ذرے اگلوا لیتی ہے۔ اسی کی بدولت کوہ پیکر چٹانیں ہٹا کر ایسی گیسیں نکال لی جاتی ہیں جو لڑائی کے دوران انسانی خون کی پچکاریاں پھینک کر اسے جلا کر راکھ کر دیتی ہیں۔ اور صلح و آشتی کے زمانہ میں یہی گیسیں مفید امور کی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ بعض گیسیں انسانی جان بچانے کے لئے اکسیر، بعض گیسیں پینے کے پانی کو مہلک جراثیم سے محفوظ کرنے میں معاون و مددگار، بحری جہازوں کے مہلک جراثیم کی ہلاکت میں ہماری مدد جس میں ایسے خطرناک چوہے بس جاتے ہیں۔ کہ اگر یہ گیس نہ ہوتی تو یہ چوہے جہازوں میں شگاف ڈال کر انہیں سمندروں کی تہہ میں پہنچا دیتے۔ اسی طرح ان گیسوں کی بدولت کئی قسم کے جراثیم تباہ کئے جاتے ہیں۔

حشرات الارض اور ہمارے فوائد

آج سے پہلے حشرات الارض، چرند و پرند سب کا وجود محض بے مصرف سمجھا جاتا تھا۔ مگر جدید انکشافات نے جوں ہی پردہ ہٹایا تو جن جانوروں کو آج تک ہم بے مصرف تصور کئے ہوئے تھے۔ ان میں ہماری زندگی کی بقا نظر آئی۔ ان جانوروں کے مسئلہ نے بعض ملکوں میں یہاں تک اہمیت حاصل کر لی ہے کہ ایسے جانوروں کی حفاظت کے لئے شکاریوں اور چڑی ماروں کو قانوناً منع کر دیا گیا ہے۔ اور ماہرین حیوانات نے تسلیم کر لیا ہے کہ ایسے ذی روح جو انسان کی زندگی کے لئے خطرناک نہ ہوں۔ ان کی بقا اور حفاظت کا انتظام ضروری ہے۔ ورنہ ایسے جانوروں کی ہلاکت اور بربادی خود انسانوں کی تباہی کا ذریعہ بن جائے گی۔

یہ قرآن حکیم کی صداقت کی گواہی ہے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ انسان کائنات پہ غور و تدبر کے بعد خود پکار اٹھتا ہے۔

ربنا ما خلقت ھذا باطلا ○ (3 : 191)

اے ہمارے پروردگار تو نے یہ سب بے مقصد پیدا نہیں کیا۔

فعل اور موقع کا باہم تعلق

میرے خیال میں اس قسم کے ذی روح حیوانات کی طرح انسانی اعمال بھی نہ تو مفید ہیں نہ مضر۔ بلکہ ان کے فائدے یا نقصان کا فیصلہ نتیجہ کے مطابق ہی کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً از روئے قرآن انسان کا قتل گناہ کبیرہ بھی ہے حرام بھی ہے۔ لیکن یہی قتل جسے فی ذاتہ "حق" کی تخصیص سے موسوم کیا گیا فرمایا۔

ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔ (151:6)

اور جس کے قتل کو اللہ تعالیٰ نے حرام کر دیا ہے قتل نہ کرنا لیکن جائز طور پہ جس کی شریعت

اجازت دے۔

اس سے ثابت ہوا کہ جب کوئی انسان اپنے جرم کی وجہ سے "مباح الدم" واجب القتل قرار پا جائے تو اس کا قتل کر دینا سے "حق" ہے۔

اسی طرح ارشاد الٰہی ہے۔

"ولکم فی القصاص حیاۃ یا اُولی الالباب" (179:2)

اور اے دانشورو قصاص کے حکم میں زندگی مضمر ہے۔

ہر قسم کا قاتل موقع کی اہمیت و نوعیت کے اعتبار سے حق بجانب ہو سکتا ہے۔ مثلاً جلاد۔

غرض ان ہر دو آیات سے ثابت ہوا کہ

(1) وہ جلاد جو مجرم کو قتل کرتا ہے۔

(2) جو شخص اپنی مدافعت میں اپنے مقابل کو موت کی گھاٹ اتارتا ہے۔

(3) وہ سپاہی جو اپنے وطن کی حفاظت میں مقابل کو قتل کر دیتا ہے۔

(4) اور وہ مومن جو اپنے دین کی حفاظت کے لئے کافر کو فی النار کر کے خود بچ نکلتا ہے۔

یعنی یہ لوگ کسی معصیت کی نیّت یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے تحت قتل نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دیئے ہوئے حق کو استعمال کرتے ہیں' اور وہ گناہ کی بجائے محسنِ قوم یا نیکو کردار اجر و ثواب کے مستحق قرار پاتے ہیں۔

اسی طرح مثلاً ایک شخص اپنے وطن کے لوگوں کو کسی مہلک وبائی بیماری سے بچانے کے لئے جراثیم کش کیمیاوی جوہر دریافت کر لیتا ہے جو اس وبا کا باعث بننے والے تھے۔ ظاہر ہے ایسے شخص کا مقصد نیک ہے۔ اسی طرح وہ تمام اربابِ صنعت و حرفت ہیں جو تمام دنیا میں موجود ہیں۔ اگر ان کی ایجادات و مصنوعات انسان کی بھلائی میں آتی ہوں تو یہ ان کے لئے اجر و ثواب کا باعث ہوں گے اور اگر بنی نوع بشر کی ہلاکت و تباہی کا موجب ثابت ہوں تو نتیجہ بالکل برعکس ہو گا۔

قدرتی تقسیم

رب العالمین کا ارادہ اور دنیا میں اس کا قانون دونوں کارفرما ہیں۔ اس بناء پر اس نے بنی نوع انسان پر مختلف قسم کی ذمہ داریاں تقسیم کر دی ہیں۔ جس میں ہر شخص کو اس کے سلیقہ کے مطابق کام کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ ایک طبقہ تعمیرات سے دنیا کو آباد کر رہا ہے تو دوسرا طبقہ کھیتی باڑی سے ان کی قوت کا سامان مہیا کر رہا ہے۔ کچھ لوگ صنعت و حرفت کے ذریعہ اس دنیا کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ بعض حضرات علم و ہنر سے جمہور کی ذہنی تربیت میں مصروف ہیں۔

لیکن جملہ علوم و فنون کے باوجود ان میں سے کوئی طبقہ اللہ تعالیٰ کے قانون کی وضاحت نہیں کر سکتا۔ ایسے عظیم منصب کے لئے اللہ تعالیٰ ایک طبقہ کو خلعتِ نبوت سے سرفراز فرما کر ابلاغِ رسالت پہ مامور فرماتا ہے۔ اسی طرح ایک گروہ کو علم و حکمت کی دولت حاصل ہونے کی وجہ سے انبیاء کا ورثہ نصیب ہوتا ہے۔ جو ہمیں کردنی اور ناکردنی سے آگاہ کرتے ہیں۔ پھر بشر کو فی ذاتہ عقل و تمیز عطا فرمائی گئی۔ جس سے وہ انبیاء اور وارثینِ علوم نبوت کی تعلیم کے مطابق چل کر ناکامی سے بچے اور کامیابی پا سکے اور اپنے ساتھ دوسروں کو بھی نیک راہ پہ چلنے کی دعوت دے اور اس کے بعد جو شخص بھی کسی مجرمانہ فعل کا مرتکب ہو گناہ سے باز نہ رہ سکے تو ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے مروّجہ آئین کے مطابق اسے سزا دے۔ غفلت سے کام نہ لے تاکہ جرائم میں حوصلہ افزائی نہ ہو۔ لیکن ربّ العالمین گناہ گاروں کے لئے توبہ کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ جو شخص غلطی سے برائی کا ارتکاب کر بیٹھے پھر اللہ تعالیٰ کے حضور ندامت اور پشیمانی کا اظہار کر دے دل میں آئندہ اس گناہ سے باز رہنے کا پکا ارادہ کر لے تو اس کے لئے یہ گنجائش باقی ہے کہ اللہ غفور الرحیم اس کو بخش دیں۔ توبہ قبول کر لیں۔ اسلامی نظریۂ تقدیر کے مطابق اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت اس شخص کے لئے مخصوص ہے جو سچے دل گناہ سے بغاوت کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور توبہ کر لے!

وانہ ھوالتّواب الرّحیم۔ (35:2)

یعنی وہ اللہ تعالیٰ توبہ قبول کرنے والا اور انتہائی مہربان ہے۔

قرآن حکیم کے اصول و ضوابط جنہیں ان کے مخالف اعمال کی تقابلی صورت میں بیان کیا جاتا ہے وہ درحقیقت زندگی کے فطری اصولوں کے عین مطابق ہیں۔

قرآن حکیم یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اشیاء کا وجود اللہ تعالیٰ کے محض ارادہ کا نتیجہ ہے۔

انما قولنا لشئیٍ اذا اردناہ ان نقول لہ کن فیکون۔ (40:16)

اور جب ہم کسی چیز کا ارادہ کرتے ہیں تو بس ہمارا کہنا کہ ہو جا کافی ہوتا ہے وہ ہو جاتی ہے۔

ہمارے لئے یہ جہاں محسوسات اور غیر محسوسات دونوں کا سرچشمہ ہے مگر اس کے قوانین غیر متغیر ہیں۔ جن کے ادراک کے لئے ہم اپنی عقل کے مطابق خود مکلف ہیں اور اس ادراک و تعقل کی راہ میں پیش آمدہ مسائل کو اللہ کی دی ہوئی عقل و فہم ہی کی قوت سے حل کرنے کے ذمہ دار ہیں جس سے ہمارے ادراک و تعقل میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

اس جہان کے لئے باعثِ توازن نیکی ہے جس سے بدی ہر وقت برسرِ پیکار رہتی ہے۔ کبھی کبھی بدی نیکی پر غالب بھی آ جاتی ہے۔ لیکن جب نیکی بدی پر غالب آ جاتی ہے تو انسان آنکھ جھپکتے ہی ترقی کی کئی منزلیں طے کرتے ہوئے بہت آگے نکل جاتا ہے۔ جیسا کہ موجودہ زمانے

ہیں بعض انسانوں کو اس میں کمال حاصل ہو چکا ہے۔

عالمِ رنگ و بو اور چھ دن

ہم دیکھ رہے ہیں کہ قرآن حکیم کے علمی اصول انسانی دماغوں کے اختراع کردہ اصولوں سے بالکل مختلف ہیں۔ جو انسان کو حصول مراتب میں معاون ہونے میں بہتر و افضل ہیں اور اپنی نوعیت میں بے مثال بھی ہیں قرآن حکیم تخلیقِ ارض و فلک کا ذکر فرماتے ہوئے وضاحت کرتا ہے کہ اس نے زمین اور آسمانوں کو چھ روز میں پیدا کیا۔ اس کے بعد عرش بریں پر مستوی ہو گیا۔ مگر ان دنوں کی ساعتیں ہمارے دنوں کی ساعتوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں۔

وان یوماً عند ربک الف سنۃ مما تعدون۔ (45:22)

اور تمہارے پروردگار کے ہاں تم لوگوں کی گنتی کے مطابق ہزار برس کے برابر اس کا ایک دن ہے۔

مگر یہ بحث ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ لیکن نظریۂ ارتقاء قرآن مجید کے اسی تخلیقِ عالم کے مطابق قرار دیا جاتا ہے۔ اور اس کے مطابق ارتقاء کے معاونین کو اظہارِ خیال میں وسعت بھی ملتی ہے۔

آدم و حوا

اللہ خالق کائنات نے ارض و سما اور اس میں موجود مخلوقات کے بعد آدم علیہ السلام اور حوا کو پیدا فرمایا۔ اور ملائکہ کو ان کی تعظیم کا حکم دیا۔ جس کی تعمیل تمام فرشتوں نے کی مگر ابلیس نے انکار کر دیا۔ لیکن اس کے باوجود ابلیس آدم علیہ السلام کی فضیلتِ علمی اور حیران کن عقل و دانش سے انکار نہ کر سکا۔ قرآن حکیم آدم علیہ السلام کی پیدائش کے بعد واقعہ بیان فرماتے ہیں۔

ویا آدم سکن انت وزوجک الجنۃ فکلا من حیث شئتما ولا تقربا ہذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین ○ فوسوس لھما الشیان لیبدی ماوری عنھما من سواتھما وقال مانھا کما ریکما عن ھذہ الشجرۃ الا ان تکونا ملکین اؤتکونا من الخالدین ○ وقاسمھما انی لکمالمن النا صحین ○ فدلھما بغرور فلما ذاق الشجرۃ بدت لھما سواتھما وطفقا یخصفان علیھما من ورق الجنۃ وفادھما ربھما الم اتھکما عن تلکما الشجرۃ واقل لکما ان الشیطن لکما عدومبین ○ قالا ربان ظلمنا انفسنا وان لم تغفرلنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین ○ قال اھبطوا بعضکم لبعض عدوولکم فی الارض مستقر و متاع الی خین قال فیھا تحیون وفیھا

تموتون ومنھا تخرجون یا بنی آدم قد انزلنا علیکم لباساء یواری
سواتکم وریشاً ولباس التقوی ذالک خیر ذالک من آیت اللہ لعلھم
یذکرون یا بنی آدم لایفتنکم الشیطان کما اخرج ابویکم من الجنۃ
ینزع عنھما لباسھما لیریھما سواتھما انہ یراکم ھوو قبیلہ من حیث
لاترونھم انا جعلنا الشیطین اولیاء للذین لایومنون۔ (27 تا 19:8)

اور ہم نے آدم سے کہا کہ تم اور تمہاری بیوی جنت میں رہو۔ اور جہاں سے چاہو اور جو چاہو
نوش جاں کرو مگر اس درخت کے پاس مت جانا ورنہ گناہ گار ہو جاؤ گے۔ شیطان دونوں کو بہکانے
لگا تاکہ ان کے ستر کی چیزیں جو ان سے پوشیدہ تھیں کھول دے اور کہنے لگا کہ تم کو تمہارے
پروردگار نے اس درخت کے قریب جانے سے صرف اس لئے منع کیا ہے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ
یا ہمیشہ جیتے نہ رہو۔ اور ان سے قسم کھا کر کہا۔ میں تو تمہارا خیر خواہ ہوں۔ غرض مردود نے دھوکا
دے کر ان کو معصیت کے لئے منوا لیا۔ جب انہوں نے اس درخت کے پھل کو کھا لیا۔ تو ان کے
ستر کی چیزیں کھل گئیں۔ اور وہ بہشت کے درختوں کے پتے توڑ توڑ کر اپنے اوپر چپکانے اور ستر
چھپانے لگے تب ان کے پروردگار نے ان کو پکارا کیا میں نے تم کو اس درخت کے پاس جانے
سے منع نہیں کیا تھا اور جتا نہیں دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے۔ دونوں عرض کرنے لگے
پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہمیں بخش نہیں دے گا اور ہم پر رحم نہیں
کرے گا تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم سب اتر جاؤ۔ اب سے تم ایک دوسرے
کے دشمن ہو اور تمہارے لئے ایک وقت خاص تک زمین پر ٹھکانا اور زندگی کا سامان کر دیا گیا
ہے۔ یعنی کہا کہ اسی میں تمہارا جینا ہو گا اور تمہارا مرنا ہو گا۔ اور اسی میں سے قیامت کو زندہ کر
کے نکالے جاؤ گے! اے بنی آدم ہم نے تم پر پوشاک اتاری کہ تمہارا ستر ڈھانکے اور تمہارے
بدن کو زینت دے اور جو پرہیزگاری کا لباس ہے وہ سب سے اچھا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی نشانیاں
ہیں تاکہ نصیحت پکڑیں اے بنی آدم دیکھنا کہیں شیطان تمہیں بہکا نہ دے جس طرح تمہارے
ماں باپ کو بہکا کر بہشت سے نکلوا دیا اور ان سے ان کے کپڑے اتروا دیئے تاکہ ان کے ستر ان
کو کھول کر دکھا دے وہ اور اس کے بھائی تم کو اس جگہ سے دیکھتے رہتے ہیں جہاں سے تم ان کو
نہیں دیکھ سکتے ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا رفیق بنایا ہے جو ایمان نہیں رکھتے۔

ہابیل اور قابیل

آدم علیہ السلام اور حوا علیہما السلام جنت سے نکل آئے اور باہر آ کر ان کی اولاد ایک
دوسرے کی دشمن ہو گئی۔ البتہ انہوں نے اس دنیا میں آ کر اپنی زندگی کو بہتر بنانے میں کوئی کسر

اٹھا نہ رکھی۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کے یکے بعد دیگرے آنے والوں نے یہ جدوجہد جاری رکھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق (بعضکم لبعض عدو۔ 23:7) یعنی تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے کی جو نشاندہی فرمائی تھی۔ وہ پورا ہو کر رہا۔ ان کے اس دنیا میں آنے کے بعد سب سے پہلے تعصب ہی نے اپنا رنگ دکھایا۔

واتل علیھم نباابنی آدم بالحق اذقربا قربانا" فتقبل من احدھما ولم یتقبل من الاخر قال لاقتلنک۔ قال انما یتقبل اللہ من المتقین لئیں بسطت الی یدک لتقتلنی ماانا بباسط یدی الیک لاقتلک۔

اور اے محمد ﷺ ان کو آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں (ہابیل اور قابیل) کے حالات جو بالکل سچے ہیں پڑھ کر سنا دو جب ان دونوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں کچھ نیازیں چڑھائیں تو ایک نیاز تو قبول ہو گئی مگر دوسرے کی قبول نہ ہوئی تب قابیل ہابیل سے کہنے لگا۔ میں تجھے قتل کر دوں گا۔ اس نے کہا اللہ تعالیٰ پرہیز گاروں ہی کی نیاز قبول فرماتا ہے۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لئے ہاتھ اٹھائے گا تو میں تجھ کو قتل کرنے کے لئے ہاتھ نہیں چلاؤں گا۔

انی اخاف اللہ رب العالمین نی اریداں تبوابا ثمی واثمک فتکوں من اصحاب النار وذالک جزاء الظالمیں فطوعت لہ نفسہ قتل اخیہ فقتلہ فاصبح من الخاسرین فبعث اللہ غرابا" یبحث فی الارض لیریہ کیف یواری سوت اخیہ قال یاویلتی اعجزت ان اکوں مثل ھذا الغراب فاواری سوۃ اخی فاصبح من النادمیں من اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرائیل انہ من قتل نفسا" بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاھا فکانما احیاالناس جمیعا ولقد جاء تھم رسلنا باالبینات ثم ان کثیرا" منھم بعدذالک فی الارض لمسرفون۔(27:5 تا 33)

مجھے تو اللہ رب العالمین سے ڈر لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرے گناہ میں بھی ماخوذ ہو اور اپنے گناہ میں بھی پھر زمرہ اہل دوزخ میں ہو اور ظالموں کی یہی سزا ہے۔ مگر اس کے نفس نے اسے بھائی کو قتل کرنے پہ اکسایا۔ تو اس نے اس کو قتل کر دیا اور خسارہ اٹھانے والوں میں ہو گیا۔ اب اللہ تعالیٰ نے ایک کوا بھیجا جو زمین کو کھودنے لگا تا کہ اسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کیوں کر چھپائے کہنے لگا ہائے ہائے مجھ سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ اس کوے کے برابر ہو سکتا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا سکتا۔ پھر وہ پشیمان ہو گیا۔ اس قتل کی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پہ حکم نازل فرمایا کہ جو شخص کسی کو ناحق قتل کرے گا۔ یعنی بغیر اس کے کہ جان کا بدلہ لینا ہو یا ملک میں خرابی کرنے کی سزا دینا ہو تو اس نے گویا تمام لوگوں کو قتل کر دیا اور جو دوسرے کی

زندگی کا سبب بنے گا تو گویا اس نے تمام لوگوں کو زندگی دی! اور ان لوگوں کے پاس ہمارے رسول روشن دلیلیں لا چکے ہیں۔ پھر اس کے بعد بھی ان میں سے بہت سے لوگ ملک میں حدِ اعتدال سے نکل جاتے ہیں۔

دو بھائیوں میں قتل کی اس سب سے پہلی واردات میں انسان کے اندر چھپا ہوا سفلی جذبہ حسد بنا۔ جس کی وجہ سے بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا۔ لیکن دوسرا بھائی جس کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف تھا جب حملہ آور بھائی نے اسے قتل کی دھمکی دی تو مقتول نے متقی ہونے کے باوجود اس کے گناہ کے ساتھ اپنے گناہ کا بوجھ بھی اس کے سر ڈالنے کی خواہش ظاہر کی۔

انی ارید ان تبوء باثمی و اثمک فتکون من اصحاب النار ۔(5 ؛ 29)

تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ سمیٹے اور جہنم میں داخل ہو۔

غور کیجئے کہ انسان کے اندر انتقام اور سخت دلی کا جذبہ عفوو بخشش سے کتنا زیادہ طاقتور ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کے بعد

حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہما السلام کی پیدائش کے بعد سلسلہ جاری رہا۔ نسلِ آدم بڑھتی گئی۔ دنیا میں پھیلتی گئی۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو راہ راست پر قائم رکھنے کے لئے انبیاء کا سلسلہ جاری فرمایا۔ جو اولادِ آدم کو ان کے نیک کاموں پہ فلاح و کامرانی کی خوشخبری سناتے اور برائیوں کے برے انجام سے ڈراتے لیکن نسلِ آدم نیکی سے دور اور برائیوں کے قریب جانے لگی۔ ان کی روحانی زندگی میں خلا بڑھتا گیا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا انہوں نے اپنی قوم کو سمجھایا۔

ان لا تعبدوا الا اللہ انی اخاف علیکم عذاب یوم الیم۔ (26:11)

اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ تم کو قیامت کے دن دردناک عذاب نہ ہو۔

انتہائی محنت کے باوجود نوح علیہ السلام کی دعوت کو چند لوگوں نے مانا۔ مگر اکثریت جمہور گمراہ ہی رہے۔ اس کے بعد بھی ایک کے بعد دوسرے رسول اور نبی کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا سب کے سب ان کو اللہ کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دیتے رہے لیکن جمہور کی عقل پر پردے پڑ چکے تھے۔ حقیقت سے بے بہرہ ہو چکے تھے اور اللہ تعالیٰ کی جگہ محسوس (نظر آنے والے) معبودوں کی عبادت کرنے لگے اور

افکلما جائکم رسول بما لا تھوی انفسکم استکبر تم انفسکم ففریقا کذبتم و فریقا تقتلون۔

(87:2)

جب بھی ان کے پاس کوئی رسول اللہ تعالیٰ کے ایسے احکام لے کر آیا جن کو ان کے دل نہیں چاہتے تھے تو کتنوں کو جھٹلا دیا اور بہت سے انبیاء کو قتل کر دیا۔

کوشش ضائع نہیں جاتی

غرض انبیاء اور رسل کے بار بار آنے سے آخر جمہور (اکثریت) میں قدرے شعور آیا۔ انبیاء علیہ السلام کی محنت بڑی دیر سے پھل لائی۔ تاخیر سہی لیکن کلمتہ الحق کا بے اثر رہنا ناممکن ہوتا ہے۔ بیشک بعض اشخاص کا غرور اور خودپسندی انہیں سچائی قبول کرنے سے روکتی ہے۔ یہ لوگ سچائی اور نیکی کی دعوت دینے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن یہی لوگ جب تنہائی میں اپنے دلوں کو ٹٹولتے ہیں تو حقیقت کو اپنی شہ رگ کے قریب پاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بہت سے تھوڑے لوگ سچائی کو قبول کرتے ہیں۔ اور زیادہ تر (جمہور) اپنی جہالت اور نخوت میں ڈوبے رہتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون

مصر کے یہ کاہن جو موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں اترے اور فرعون کے خاص الخاص تھے وہ درپردہ تو اللہ تعالیٰ کی وحدت کا اقرار کرتے تھے۔ لیکن عوام کو دوسرے دوسرے معبودوں پر ایمان لانے کیلئے کہتے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں کے دلوں میں ان کاہنوں کی جو عظمت بیٹھ چکی ہے اس میں کمی نہ آنے پائے۔ اسی اثناء میں موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا ظہور ہوا۔ جنہوں نے فرعون کو توحید کی دعوت دی اس نے انکار کیا تو انہوں نے اپنی قوم بنی اسرائیل کو اپنے حوالے کر دینے کا فرعون سے مطالبہ کر دیا۔ جسے فرعون اور اس کے باپ دادا نے صدیوں سے اپنا غلام بنا رکھا تھا۔

فرعون نے اس کے جواب میں موسیٰ علیہ السلام پر فوجوں کے ساتھ چڑھائی کر دی۔ قرآن مجید میں بہت سے اور انبیاء کا ذکر ہے جو ایک کے بعد دوسرے اولاد آدم کو ان کی زندگی کا مقصد اور خالق سے ان کے تعلق کو سمجھانے کے لئے آتے رہے ہیں۔ لیکن کسی زمانہ میں بھی جمہور (اکثریت) ان کی ہم نوا نہ بنی البتہ چند لوگ ہی ایمان لاتے رہے۔

انبیاء کی یہ مہم اہل نظر کے لئے بے حد قابل توجہ ہے۔ لیکن اس موقع پر صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور نبی الخاتم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مناصب اور ان کے عظیم الشان کارناموں کا ذکر ہی کافی ہے۔

انبیائے کرام اور معجزات

اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو طرح طرح کے معجزات عطا فرمائے۔ مگر لوگوں (کفار) کا نبوت سے انکار اور انبیاء کی دعوت کو قبول نہ کرنے میں ایک نکتہ قابل توجہ ہے جسے عقلِ صحیح اور معجزات و خوارق کے درمیان حدِ فاصل کہا جا سکتا ہے اور معجزات اس لئے دیئے گئے تاکہ عوام (جمہور) ان کو دیکھ کر دعوت قبول کرنے پہ آمادہ ہوں لیکن پھر بھی بہت کم لوگ ان کی طرف متوجہ ہوئے۔ عوام تو اللہ وحدہ لاشریک کی جگہ صدیوں سے محسوس بتوں کو اپنا معبود بنا چکے تھے۔ ان کا شعور اور عقل ایک اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے میں ان کی کیسے راہنمائی کر سکتا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام کا مصر سے نکلنا اور واپسی

حضرت موسیٰ کا واقعہ اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو سرزمینِ مصر میں توحید کی دعوت دینے کے لئے مبعوث کرنا چاہا تو پہلے موسیٰ علیہ السّلام کو مصر سے نکلنا پڑا۔ سفر پہ سفر کرتے ہوئے وہ مدین پہنچے۔ ایک چشمے پہ تشریف لائے۔ آخر اسی مدین میں انہیں نکاح کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ جس کے بعد پروردگار عالم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ان کے وطن (مصر) واپس تشریف لے جانے کا ارشاد فرمایا۔

فلما اتاها نودی من شاطی الوادی الایمن فی البقعة المبارکة من الشجرة ان یاموسی انی انا اللہ رب العالمین وان الق عصاک فلما راها تهتز کانها جان ولی مدبر اولم یعقب یاموسی اقبل ولا تخف انک من الامنین اسلک یدک فی جیبک تخرج بیضاء من غیر سوء واضمم الیک جناحک من الرهب فذانک برهانان من ربک الی فرعون وملائه انهم کانوا فاسقین۔ (28:30-32)

جب اس کے پاس پہنچے تو میدان کے دائیں کنارے سے ایک مبارک جگہ میں ایک درخت میں سے آواز آئی کہ موسیٰ میں خود اللہ رب العالمین ہوں اور یہ کہ اپنی لاٹھی ڈال دو جب دیکھا کہ وہ حرکت کر رہی ہے گویا سانپ ہے تو پیٹھ پھیر کر چل دیئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ہم نے کہا موسیٰ آگے آؤ اور ڈرو مت تم امن پانے والوں میں ہو۔ اپنا ہاتھ گریبان میں ڈالو تو بغیر کسی عیب کے سفید نکل آئے گا اور خوف دور ہونے کی وجہ سے اپنے بازو کو اپنی طرف سکیڑ لو۔ یہ دو دلیلیں تمہارے پروردگار کی طرف سے ہیں۔ (ان کے ساتھ فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس جاؤ کہ وہ نافرمان لوگ ہیں۔

فرعون کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام تبلیغ کرتے ہیں۔

فرعونِ مصر اور مداری

موسیٰ علیہ السلام حصول نبوت کے بعد مصر واپس آ گئے فرعون کو تبلیغ فرمائی۔ اپنے معجزات

دکھائے تو اس نے اپنے مداریوں کو جمع کر کے انہیں معجزات کا مقابلہ کرنے کو کہا۔ اجتماع ہوا اور فرعون کے مداری اپنے پورے فنی کمالات کے ساتھ آئے۔ انہیں موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا کے بارہ میں معلوم تھا۔ انہوں نے لاتعداد ٹوٹکے بنا لائے جن میں سانپ کی طرح رینگنے کی قوت بھر دی۔ اور بیک لحہ انہیں زمین پر بکھیر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب میں اپنا معجزہ عصا زمین پر رکھا تو وہ ہیبت ناک اژدہا بن کر مداریوں کے سنپولیوں کو نگل گیا۔ جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ جادوگر یہ منظر دیکھ کر حقیقت کو پا گئے اور "آمنا برب ہارون وموسیٰ" (20: 7) ہم ایمان لائے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے رب پر اور ساتھ اللہ وحدہ لاشریک کے حضور میں گر پڑے! سب کچھ ہوا لیکن بنی اسرائیل جو اللہ تعالیٰ کی ذات کے لئے خوگرِ پیکرِ محسوس تھے۔ کچھ عرصہ بعد ان میں ناسور پھوٹ نکلا اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کے رسول سے برملا تقاضہ کیا۔

یاموسیٰ لن نؤمن لک حتیٰ نری اللہ جھرۃ (55:2)

موسیٰ ہم تمہاری بات پر اس وقت تک یقین نہیں کریں گے جب تک اپنی آنکھوں سے اللہ عزوجل کو نہ دیکھ لیں۔

موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد فوراً ہی یہی بنی اسرائیل اپنے سابق تصور کے مطابق بچھڑے کی پوجا پر ٹوٹ پڑے۔ (فاضل مولف شاید بھول گئے قرآن مجید کے مطابق یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد نہیں بلکہ ــــــــ ان کی زندگی میں ہی ہوا ہے۔ م)

مختصر یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور بھی بہت سے نبی اور رسول ظہور فرما ہوئے لیکن عوام (جمہور) نے ان کو قتل کیا۔ جھٹلایا۔ ایک مدت کے بعد اسرائیلیوں کو شعور آیا۔ تو ایک ایسے نبی کا انتظار کرنے بیٹھ گئے جس کی مدد سے وہ پھر اپنی ارضِ موعود (فلسطین) کو حاصل کریں گے۔

حضرت مسیح علیہ السلام کا ظہور

تاریخ میں موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل اور ان کے حالات اور تفصیلات کا زمانہ اتنا پرانا نہیں صرف پچیس صدیاں ہی گزری ہیں۔ تاریخ میں اتنا وقفہ ایک لمحہ کی اہمیت رکھتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عقل پر حیات نے غلبہ پا لیا تھا جس کی وجہ سے روحانیت اور معنوی تصورات پر مادی محسوسات اور تصورات کو فوقیت حاصل تھی۔ چنانچہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پانچ چھ سو سال پہلے عیسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ انہوں نے اپنی قوم کے سامنے توحید کی دعوت

پیش کی جس میں روح القدس ان کے دست و بازو تھے مگر ان کی قوم نے ان کی دعوت پر توجہ نہ دی۔

جناب مسیح علیہ السلام یہودی تھے۔ یہودی ان کی دعوت سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو وہ رسول سمجھا جو مسیحان روم کی غلامی سے بچا کر انہیں ارضِ موعود (فلسطین) پر غالب آنے میں راہنمائی فرمائے گا۔ یہود نے بھی یہی محسوس کر لیا۔ کہ نبی اللہ صرف عقل ہی سے اپنی رسالت اللہ کی دعوت کی نص پیش نہیں کرتے۔ ان کے ساتھ کئی ایسے معجزات اور خوارق بھی ہیں جو ان کے دعوے کا ثبوت ہیں۔ مثلاً مسیحی روایات کے مطابق پہلا معجزہ! مسیح کی برکت سے قانا کلیل کی شادی میں پانی شراب میں متبدل ہو گیا جس کے بعد نان و ماہی کا معجزہ کر دکھایا۔ مردہ کو حیاتِ نو بخشی۔ مسیح علیہ السلام نے تعلیم و منطق کے بجائے معجزہ پہ معجزہ دکھا کر دلوں کو مسخر کرنے کی داغ بیل ڈالی۔

اگرچہ سابقہ انبیاء کے مقابلہ میں جناب مسیح کی تبلیغ زیادہ پر کشش تھی۔ وہ ایک دوسرے پر عفوو مہربانی، محبت اور رحم کرنے کی تعلیم دیتے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کا درس دیتے مگر اس تعلیم کے ساتھ دلیل اور منطق شامل نہ تھی۔

چنانچہ جب ایک بار لوگوں نے ان کی دعوت سننے سے انکار کر دیا تو ان کے معجزات میں حیرت و تعجب کا عنصر زیادہ شامل ہو گیا وہ کوڑھ اور جنون کو بھی شفا دینے لگے۔ مردوں کو زندہ کر دکھایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ معجزے لوگوں کو ان کی طرف توجہ کرانے کے لئے عطا کئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طبقہ نے انہیں اللہ کا بیٹا کہنا شروع کر دیا۔ بعض لوگ اس سے بھی آگے بڑھے اور انہوں نے ابنِ مریم کو عین ذاتِ حق تسلیم کر لیا۔ جو انسانی ڈھانچے میں خود کو اتار کر ساری مصیبتیں صرف اس لئے برداشت کر رہا ہے کہ بنی آدم کے گناہوں کا کفارہ ادا ہو۔ جو اس امر کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ مسیح کے زمانہ تک منطق و عقل اس حد تک کمال کو نہیں پہنچے تھے کہ حقائق کے ذریعہ خالقِ دوجہاں کی وحدانیت کو تسلیم کیا جا سکے جو الوہیت سے بے گانہ (یعنی باپ سے بیگانہ) ابنیت (بیٹے سے لاپرواہ) اور اس کی برابری کا یارا ہو!

اللہ الصمد۔ لم یلد ولم یولد۔ ولم یکن لہ کفواً احد۔ (112 : 1 تا 4)

اللہ ایک ہے۔ اللہ تعالیٰ بے نیاز ہے۔ نہ اس سے کوئی پیدا ہوا نہ وہ کسی سے پیدا ہوا اور نہ ہی اس کا ہم پلہ کوئی ہے۔

فراعنۂ مصر کے علوم اور یونانی فنون

جس زمانہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے اس تمام عرصہ

میں مصری علوم و فنون (فراعنہ کے علوم و فنون) یونان اور روم میں منتقل ہو چکے تھے۔ یونان اور روم نے ان علوم سے خوب فائدہ اٹھایا۔ بعد میں یونان نے تو فلسفہ ادب کے دریا بہا دیئے۔ جس سے منطق و حجیت کی آبپاشی مصرو فلسطین اور شام میں سب ملکوں سے زیادہ ہوئی۔ جغرافیائی طور پر مسیحیت کا سرچشمہ ان ملکوں کے بہت زیادہ قریب تھا۔ مگر ان تینوں ممالک نے تصدیق نبوت کے لئے خوارق و معجزات کی بجائے دلیل و برہان کو مقدم سمجھا۔ جیسا کہ ہم اس کتاب کی ابتداء میں اشارہ کر چکے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت اور دلیل

بلاشبہ اللہ عزوجل نے انسان کو دلیل و علم کی بناء پر تاج سروری عطا فرمایا ہے ایسی لطیف و پرکیف منطق جو عقل و دلیل اور روح تینوں کے امتزاج سے مرکب ہے اور انسان کو حقائق کو سمجھنے کا شعور عطا کرتی ہے۔ اللہ المتعال نے ابتدائے آفرینش سے ہی یہ منطق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نصیب میں ودیعت کر رکھی تھی۔ کہ جب ہمارا یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ظہور پذیر ہو تو عقل، محبت اور روح تینوں اس کے پشتیبان ہوں اور انہیں خوبیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ اپنے نوشتوں کے ذریعہ ان کے دین اسلام کو مکمل کر دے گا۔ اور یہی تکمیل دین اس کی امت کے لئے اتمام نعمت کی دلیل ثابت ہو۔ اور رسالتوں کا تشریعی یا غیر تشریعی یعنی دونوں قسم کا سلسلہ ختم ہو جائے! اسلام کی بنیاد--- حقیقت توحید اور ایمان باللہ قرار پائے اور جس کو اس پر یقین ہو جائے گا اسے دین کے دوسرے احکامات کی تعلیم دی جائے گی۔

خاتمہ

خاتمہ کی فصل اول میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ایمان کی تکمیل کا انحصار کشف و ادراک کائنات پر ہے جو لوگ حقیقت کی تلاش کرتے ہیں وہی ایمان کی نعمت پاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے جو روز حساب تک جاری رہے گی۔ اس دن تک جب اللہ تعالیٰ تمام بنی نوع انسان کو دوبارہ زندہ کر کے ایک جگہ جمع کرے گا۔ زمانہ اولیٰ کے مسلمانوں کا یہی ایمان تھا اسی پر عمل تھا۔ ان کے بعد ایک عرصہ تک مسلمان اسی پر عمل پیرا رہے۔ یہاں تک کہ حوادث نے ایسے اہم ترین عمل اور کوشش سے دور کر دیا۔

اسلام اور دعوت عمل

گزشتہ اوراق میں ہم نے جتنے دلائل دیئے ہیں وہ واضح طور پہ اس کی نشاندہی کرتے ہیں کہ مستشرقین نے اسلام کے مفہوم توحید پر قرآن حکیم کی جن آیات کو قضا و قدر، نوشتہ تقدیر و لوح

محفوظ اور ازل سے طے شدہ اور ابدی مفروضوں کے دلائل میں پیش کیا ہے۔ یہ ان اہل قلم و مستشرقین کی جبلی، نسلی و فطری عادت ہے۔ جبکہ اسلام ہر شخص کو سعی و عمل کی دعوت دیتا ہے اور صاف کہتا ہے کہ ہر ایک کو اپنے عمل کی جزاؤ سزا مل کر رہے گی۔ اللہ تعالیٰ کسی پر ظلم و جبر کا روادار نہیں اور نہ جرم کے بغیر سزا دیتا ہے۔ جو لوگ کوشش اور جدوجہد کو چھوڑ کر کاہلی اور نامرادی کو توکل کا نام دے کر اللہ تعالیٰ سے رحمت کی توقع رکھیں وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔

مال و اولاد اور نیکی میں امتیاز

اگرچہ گذشتہ اوراق میں ہم نے اپنے مقصود کو وضاحت سے ثابت کر دیا ہے پھر بھی ایک اور دلیل جو قطعی حیثیت رکھتی ہے اس کی پہچان کروا دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

المال والبنون زینۃ الحیاۃ الدنیا والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثوابا وخیر املا" - (46:18)

بلاشبہ اولاد اور مال و دولت دنیا کی زینت ہیں لیکن باقی رہنے والی نیکیاں ہی ہیں جو تیرے رب کے پاس محفوظ ہیں۔ اور آنے والے وقت کے لئے بہترین اثاثہ ہیں۔

اس دنیا میں انسان کے لئے مال کی حرص اور کسب معاش سے زیادہ محبوب کوئی مشغلہ نہیں۔ جس میں جمہور عوام کی اکثریت ہر وقت ہمہ تن مصروف رہتی ہے وہ اپنی ہمت و بساط سے بھی زیادہ محنت کرتے ہیں۔ سرسری نظر سے بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کو اس محنت میں کیسی کیسی صعوبتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ کس عجلت کے ساتھ وہ اپنا عیش و آرام قربان کر دیتا ہے اور دکھ کے پہاڑ سر پہ رکھ لیتا ہے۔ ایک اور شخص ہے جو مال و دولت کے بجائے یہی قربانی اولاد کی خاطر گوارا کر لیتا ہے اور اپنی جان تک نثار کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ دونوں کی جدوجہد یعنی مال و زر جمع کرنا ہو یا اولاد پر جانثاری کا عمل دونوں دنیا ہی کی زینت کہلاتی ہیں۔ لیکن نیکی کے مقابلہ میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔ اور نہ ہی کوئی عاقبت اندیش نیکی کے مقابلہ میں انہیں ترجیح دے سکتا ہے۔ البتہ اس کو کیا کہا جا سکتا ہے جو نادان، کم فہم اور ناعاقبت اندیش ہو۔ یا وہ عورتیں جو چند روزہ جوانی کے لئے آپے سے باہر ہو کر اپنے حسن و جمال کی نمائش بڑھانے کے لئے مال و دولت کو ہر برائی کے ذریعہ حاصل کرنے کے لئے ذرا تامل نہ کریں۔

یا وہ جو جوانی کے نشہ میں عقل و شرافت سے منہ موڑ کر اپنے اردگرد خوشامدی دوستوں کو جمع کر لیتے ہیں۔ تاکہ انہیں کھلا پلا کر اپنے اثر نفوذ سے آڑے وقت میں ان دوستوں سے کام لیا جا سکے۔ جبکہ ان موسمی پروانوں کے دلوں میں ایسے آقاؤں کی تنکا برابر بھی عزت نہیں ہوتی۔ یہ

سب قسمیں ایسے ہوش باختہ دیوانوں کی ہیں جو نیکی سے لاپرواہ ہو کر متاعِ عقل و خرد ظاہر کے پلے بندھے ہوئے ہیں۔ فکر امروز میں فردا سے لاپرواہ! یہ درست ہے کہ مال و دولت دنیا کی زینت کے لئے ضروری ہیں اولاد بھی زیبائشِ دنیا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان نیکی کے لئے جدوجہد چھوڑ کر صرف انہی کے پیچھے لگا رہے۔ مقصدِ حیات یقیناً اس سے کہیں بلند ہے جسے سمجھنے اور پانے کے لئے بہت زیادہ جدوجہد کرنا ضروری ہے۔

نیکی اصل منفعت ہے

قرآن حکیم کی ایسی تعلیم ہے جس میں تمام اعلیٰ اخلاقی اقدار کی روح موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

المال والبنون زینۃ الحیٰوۃ والباقیات الصالحات خیر عند ربک ثواباً وخیر أ ملا۔ (46:18)

مال اور بیٹے تو دنیا کی زندگی کی رونق و زینت ہوتے ہیں اور نیکیاں باقی رہنے والی ہوتی ہیں وہ ثواب کے لحاظ سے تمہارے پروردگار کے ہاں بہت اچھی اور تمہاری امید کے لحاظ سے بہت بہتر ہیں۔

غور کیجئے مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کس قدر مفید تعلیم دے رہے ہیں جس طرح دنیوی استراحت' عیش و آرام اور زینت کے لئے دن رات محنت کرتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں روح و قلب اور آخرت کے لئے حقیقت روح اور نیکی کے حصول میں جان توڑ کوشش کرنا ضروری ہے۔ مال و دولت ہو تو اس کا خرچ بھی اسی نیکی کی راہ میں ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد عطا کی ہے۔ تو ان کی تربیت بھی اسی انداز سے کیجئے کہ وہ بھی اپنے وقت میں والدین اور عوام الناس کے لئے نیکی کی راہ پہ نثار ہوں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے نیکی کا اجر دنیا کے سرور و عیش مال و دولت اور اولاد سے کہیں زیادہ لطف انگیز ہے۔

افسوس مسلمانوں کی قوتِ فکر اتنی ناکارہ ہو چکی ہے جو ظاہرہ باہر اور ایسے خوش آئندہ منافع سے منہ پھیر کر دنیا کی زندگی کے حسن مال و اولاد کو ہی اپنی دلچسپیوں کا مرکز بنائے ہوئے ہے اور نیکی سے اس طرح پیٹھ پھیر رکھی ہے جیسے نیکی اور مسلمان کا آپس میں کوئی رشتہ ہی نہیں۔

زوالِ مسلمین پر شیخ محمد عبدہ مصری کی رائے

آخر مسلمانوں کی قوت ایسی واضح منطق سے ہٹ کر ان چیزوں کی طرف مائل ہو گئی جنہیں ان کے عقائد سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ہم نے فصلِ اول میں اس کا اشارہ کر دیا ہے کہ عقیدہ کی تبدیلی کا سبب وہ فاتحین ہیں جنہوں نے دورِ عباسیہ کے آخری ایام میں مسلمانوں کی بستیوں کو

تاخت و تاراج کیا۔ اور یہ کہ زمانہ اولیٰ کے بعد نظام حکومت کے لئے شوریٰ کی جگہ جابر بادشاہت نے لے لی جس میں نمایاں کردار اموی بادشاہوں کا ہے۔ اس کی قدرے وضاحت شیخ محمد عبدہ کی مصنفہ کتاب "الاسلام والنصرانیہ" سے نقل کی جاتی ہے۔

اسلام عرب سے نکلا اور یونانی علوم سے ملوث ہو کر "دین عربی" کی بجائے علم "عربی" سے موسوم ہونے لگا۔ حتیٰ کہ عباسی خلیفہ سے سیاسی غلطی کا ارتکاب ہوا اور اس نے اسلامی ریاست کو اپنی خاندانی مملکت میں محصور رکھنے کی غرض سے یہ منصوبہ بنایا کہ مبادا عربی نژاد مسلمان سپاہی علوی خلفاء کی حمایت میں کود پڑیں - ان کی بجائے ترک ویلم اور دوسرے ملکوں کے نوجوان فوج میں بھرتی کر لئے جن میں علوی خاندان کی عظمت کا کوئی پہلو نہ ملے تمام لشکری میرا ہی کلمہ پڑھیں گے اور میری سطوت سے لرزہ براندام رہیں گے۔ میں انہیں اپنے انعامات سے اپنے بس میں کر لوں گا اور یہ بادشاہت تا حشر میرے خاندان کا پانی بھرے گی۔ اسلامی احکام کے مطابق غیر ملکیوں کو فوج میں بھرتی کرنے کی اجازت پہلے سے تھی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خلیفہ نے عجمی لشکر بنا لیا جس سے رفتہ رفتہ عربی دین میں عجمی بوباس سرایت کر گئی۔

عباسی خلیفہ نے اپنی سطوت اور اپنی اولاد کے لئے "ملک لا یبلی" یعنی ایسی مملکت جو کبھی پرانی نہ ہو' کی بنیاد ڈالی۔ جس سے امت محمدیہ اور دین اسلام میں شگاف پڑ گیا۔ عجمی سپاہی اپنے محبوب خلیفہ کی امیدوں کو پامال کرتے ہوئے اس کی ہی سلطنت پر اس طرح قابض ہو گئے کہ خلیفہ کو برائے نام بادشاہ رہنے دیا۔ مگر اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لئے۔ ان سپاہیوں اور عجم نژاد عناصر کے دماغ اسلامی تصورات سے بے گانے' ان کے دل اسلام کی محبت سے خالی اور اپنے وطن سے خشونت اور ظالم جو جذبہ اپنے ساتھ لائے تھے یہاں پہنچ کر اس ترکہ میں اضافہ کر لیا۔ ان عجمیوں میں بے شمار سپاہی اور افسر ایسے بھی تھے جو اپنے بت معبودوں کو اپنے گریبانوں میں ڈال کر سینے سے چپکائے ہوئے تھے جونہی تنہائی میسر آتی تو ان کی آرتی بجالاتے۔

ان عجمی نژاد عناصر کے دخل در آمد کے بعد فتنہ تاتار سربلند ہوا جس نے عباسیوں کو عدم آباد دھکیل دیا۔ شروع میں جو عباسی کلیدی آسامیوں پر قابض ہوئے ان لوگوں کو علم و دین دونوں سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ یہ امیر شروع سے ہی علمائے حق کے مخالف تھے۔ کلیدی آسامیاں ملنے پر کھل کر سامنے آ گئے۔ علمائے حق کی نصرت و امداد سے ہاتھ روک لئے۔ اور ان کی بجائے ان علماء اور فتوی بازوں کو مسند علم پر جانشیں کر دیا جن کے لبادے تو علمائے حق ہی طرح کے تھے۔ ان کا لب و لہجہ بھی وہی تھا لیکن اسلام کی بیخ کنی کا فریضہ ادا کرنے میں ہر لمحہ مصروف تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ جس طرح ہو سکے مسلمانوں کو صحیح اسلامی تصورات سے بے گانہ کر دیا جائے اور اس میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کو طرح طرح کے فریب میں

مبتلا کر دیا۔ کبھی دین کو ناقص ثابت کر کے اسے خود مکمل کرنے والا بتایا۔ کبھی دین کو مریض اور خود کو مسیحا بنایا کبھی قصر اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کہہ کر تعمیر کے نام سے نقب زنی کرتے رہے۔

عوام جمہور اکثریت اس قسم کی تعلیمات کو قبول کرنے کے لئے پہلے ہی تیار تھے۔ نصاری ان کے قرب و جوار میں آباد تھے۔ جن کے مذہبی رویوں سے مسلمان بھی متاثر تھے۔ انہوں نے نصرانی عقائد کو اسلامی عقائد میں خلط ملط کرنا شروع کر دیا۔ انہیں یہ خیال نہ آیا کہ غیر مذہبی عقیدہ کا دخول اسلام کے پاکیزہ تصورات میں مسیحیت کے ان ملوثات کو نہ سمو دے جن کی اساس اصل دین مسیحی نہیں بلکہ ان کے پادریوں اور راہبوں کی بدعات ہیں۔ انہیں یہ خیال بھی نہ آیا کہ اس طرح مسلمانوں کے پلے اپنا کیا رہ جائے گا۔ نہ انہیں یہ سجھائی دے سکا کہ نصرانیت کی اس طرح دخل اندازی سے مسلمان اپنے ولیوں اور عالموں کی پوجا کرنے لگیں گے اور پھر ان کی اپنی وحدت توحید پارہ پارہ ہو جائے گی۔ نہ وہ یہ سوچ سکے کہ ایک دفعہ ایسی گمراہی میں گھر جانے کے بعد جب انہیں منع کیا جائے گا تو وہ برملا کہیں گے "کہ بعد والوں کو پہلے والوں کے مسلمات میں رد و بدل کا جواز کیوں؟"

آخر یہ بات ان کے عقیدے میں داخل ہو گئی اور ان کے شعور پر جہالت کے پردے پڑ گئے۔

یہاں تک کہ اثر و نفوذ حاصل کرنے کے بعد ان مشتبہین بالاسلام (برائے نام مسلمان) نے اپنے ہم نواؤں کو تمام اسلامی ممالک میں پھیلا دیا جن کی زبانوں سے مسلمانوں نے نئے نئے عقائد اور عجیب عجیب تصورات کے ذکر اذکار سن کر خود میں تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ حتیٰ کہ عجمی تصورات کے ان داعیوں نے مسلمانوں کو متعدد ایسے عقائد پر مستحکم کر دیا۔

(1) کہ ازروئے شرع شریف مسلمانوں پر امور سلطنت کے بارے میں کوئی ذمہ داری نہیں۔ بلکہ بار صرف عمال حکومت پر ہے!

(2) انسان کی خستہ حالی کا مداوا نہ اس کے اختیار میں ہے نہ ریاست اس کی ذمہ دار ہے۔ اس کے لئے کسی تباہ حال مسلمان کا اپنی فلاح و بہبود کی سعی کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر ہیں۔

چالاک داعی مسلمانوں کو اس تباہ حالی پر قناعت کرنے کے لئے کبھی انہیں قرب قیامت سے متاثر کرتے جن کا نتیجہ سوائے انسانی محرومی پیدا کرنے کے اور کچھ نہ ہوتا۔ یا ایسی روایات پیش کرتے جن میں تشابہ کا امکان ہوتا۔ ان کی من مانی تاویلات سے مسلمانوں میں کاہلی اور سستی برقرار رکھنے کی تدبیریں سوچتے رہتے۔ ان معاملوں میں وضعی روایات کی باگ ڈور انہیں داعیوں کے ہاتھ میں تھی۔ جہاں جیسا موقع دیکھا ایسی ہی روایت کا جوڑ لگا کر انہیں ٹھنڈا کر دیا۔

اس علم و تبلیغ کی جعل سازی میں مرکزی عنوان ہمیشہ مسئلہ قضا و قدر تھا۔ گویا یہ مسئلہ ان کی مٹھی میں تھا جس کی تفصیل سن کر مسلمان یک قلم بے حس ہو کر رہ گئے۔

مسلمانوں میں ایسے عقائد ان کی سادگی اور جہالت کی وجہ سے مقبول ہوتے گئے۔ ایسے حالات میں مسلمان اور غیر مسلم میں تمیز ہی کیا رہ سکتی ہے۔ جس قوم کا جیب حقیقتوں سے خالی ہو جائے اور اس کا دامن مفروضات سے بھر جائے تو وہ اسی طرح ناکامی اور نامرادی میں گھر جائے گی جیسا کہ مسلمانوں سے حقیقت نے منہ موڑ کر انہیں دور دھکیل دیا۔ ان پر دین جس کے نام سے ایسے عقائد مسلط ہو گئے جو اسلامی تصورات سے متضاد ہونے کے سبب مسلمانوں کی بربادی کا ذریعہ بن گئے۔

ان نام نہاد مسلمانوں کی سیاست جہالت اور خود پرستی دونوں پر مبنی تھی۔ جس سیاست نے اسلام میں ان عقائد کو داخل کر دیا جن کے ساتھ دین کو دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اسلام ہی کے نام پر کئی ایسی رسمیں داخل کر دی گئیں جن پر اسلام کی مہر نہ تھی۔ البتہ مسلمانوں کی نماز' روزہ اور حج ان کے دست برد سے بچ گئے۔

کہاں تک بیان کیجئے اور کب تک سنئے گا اس غلبہ نے مسلمانوں میں بدعات و خرافات کے طومار کھڑے کر دیئے اور وہ ایسی عیاری کے ساتھ کہ آنے والے ان بدعات کو اصل دین سمجھ بیٹھے۔

نعوذ باللہ منھم وما یفترون علی اللہ و دینہ۔

متذکرۃ الصدر سطور میں شیخ محمد عبدہ نے جو کچھ فرمایا ہے ظاہر ہے کہ دشمنانِ دین نے اسلام میں ایسی خرافات شامل کر دی ہیں جنہیں بادیٔ النظر میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم سمجھا گیا۔

میں پھر اعادہ کرتا ہوں کہ اسلام میں تقدیر کا وہ تصور ہرگز نہیں جو مستشرقین پیش کرتے ہیں یا ازرہِ حسد مسلمانوں کے سر تھوپتے ہیں۔ مسیحی مہربانوں کے ہاتھوں تقدیر ہی گلہ نہیں وہ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ اسلامی نقطہ نظر کے مطابق مادیات سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔ جیسا کہ یونان کے رواقی فرقہ کا مسلک ہے جو عہدِ عباسیہ میں مشرق وسطیٰ میں پہنچا اور مسلمانوں کے ایک فرقہ نے اسے اپنا لیا۔ بہرحال قرآن مادیات سے فائدہ اٹھانے کی کھلم کھلا ترغیب دیتا ہے۔ واضح حکم ہے۔ ولا تنس نصیبک من الدنیا۔ (77:28) اور دنیا میں جو تمہارا حصہ ہے اسے بھولئے مت۔ قرآن مسلمانوں کو ایسی اعتدال اور میانہ روی کی تعلیم دیتا ہے کہ جس میں نہ تو رواقیت جیسی ترک دنیا کی تعلیم ہے اور نہ اندھوں کی طرح تلذذِ نفس میں استغراق و انہماک کی اجازت دیتا ہے۔ لیکن ارونگ مستشرق یہ دونوں برائیاں تقدیر کے کندھوں پر رکھ کر مسلمانوں کے گلے ڈال

رہا ہے کہ مسلمانوں کو تقدیر اور عیش طلبی دونوں نے سعی و جدوجہد سے دور کر کے برباد کر دیا ہے۔ مصنف اپنی مسیحیت کے دامن میں پاکیزگی اور ایثار کے نقش دکھا کر اسلام کے جیب و دامن کو ان دونوں صفات سے خالی ثابت کرنا چاہتا ہے!

نصرانیت اور اسلام

ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ ہم علمی نصرانیت اور اسلام کا تقابل کریں۔ اس لئے کہ اصل میں دونوں ایک ہی ہیں۔ اور اگر ہم علمی مسیحیت کے چہرے سے نقاب الٹیں تو اس کا مطلب جھگڑوں کے دروازہ کھولنا ہوگا جو ہم نہیں چاہتے اس لئے اس میں نہ تو اسلام کے لئے کوئی فائدہ ہے نہ مسیحیت کا بھلا ہے۔ لیکن انجیل مقدس کی اس آیت کو کیا کیجئے گا جس میں حضرت مسیح کو رواقی ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت مسیح کا سب سے پہلا معجزہ یہ ہے کہ قانائے گلیل کی شادی میں حضرت مسیح نے پانی کو شراب میں تبدیل کر دیا۔ تعجب تو یہ ہے کہ ان کے جو ساتھی اس سے محروم رہ گئے تھے تو حضرت انہیں فریسیوں کے ہاں لے پہنچے جن کے دسترخوان پر دوسری نعمتوں کے علاوہ شراب بھی موجود تھی۔ ثابت ہوا نہ تو مسیح نے اپنا لذتوں سے دامن سمیٹا اور نہ اپنے دوستوں کو اس کا درس دیا۔ البتہ انہوں نے دولت مندوں کو یہ ہدایات ضرور دیں کہ وہ محتاجوں کی امداد کریں ان سے محبت سے پیش آئیں اور انہیں اپنا احسان نہ جتائیں۔

جناب مسیح کے برعکس حضرت محمد ﷺ کے کردار میں ان معاملات کے حوالہ سے کتنا اعتدال پایا جاتا ہے اس کی تعریف اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بارہا فرمائی ہے جس کا ہم گذشتہ اوراق میں ذکر کر چکے ہیں۔ اسی طرح مسیحی مفتری اروِنگ اسلام پر جو رواقیت کا الزام دھرتے ہیں اس کی تردید میں بھی قرآن حکیم میں توسط و اعتدال کی تلقین کافی موجود ہے۔

تلوار کا مقابلہ تلوار سے

اروِنگ نے اسلام کے جسم میں جتنے تیر و نشتر چبھوئے ہیں اس میں ایک نشتر مسلمان ترکوں کی یورپ میں حکومت بھی ہے۔ اروِنگ کہتا ہے اگر مسیحی یورپ میں ہلال (ترک) اب تک نظر آ رہا ہے تو اس کی وجہ

(ا) مسیحی رول کی مہربانی ہے۔ (ب) یا مسیحی حکومتوں یورپ کی باہم نااتفاقی کا نتیجہ ہے۔ (ج) یا ترکوں کی ہمت کا نتیجہ ہے۔ اس کلیہ کے مطابق "کہ جو شخص تلوار کے زور سے کسی سے تلوار چھین لیتا ہے اس سے تلوار واپس لینے کے لئے تلوار ہی سے کام لینا ضروری ہوتا ہے" مگر شمشیر اور اس کی واپسی کا جو الزام اروِنگ نے اسلام پر تھونپ دیا ہے اس بے چارے نے یہ کتاب

انیسویں صدی عیسوی میں لکھی جب تک یورپ کا استعمار بقول ارونگ "استعمار مسیحی موجودہ صدی کے مطابق حریص اور شمشیر پر بھروسہ کرنے والے نہ ہوں گے۔ لیکن انیسویں صدی ختم ہوتے ہی بیسویں صدی کے آغاز 1918ء میں مسیحی یورپ کی شمشیر کی کاٹ دیکھئے کہ لارڈ ایلن بی اتحادی فوجوں کا ٹڈی دل لے کر بیت المقدس پر حملہ آور ہیں جہاں یورپ ہی کے ترک حکمران ہیں۔ جب ایلن بی اس منصوبے میں کامیاب ہو گئے تو ہیکل سلیمانی کے حضور کھڑے ہو کر کہا۔ صلیبی جنگیں آج ختم ہو گئیں۔ بیت المقدس کے اس سقوط پر ترسین ایم سمتھ نے اپنی تصنیف "سیرت المسیح" میں لکھا ہے کہ 1918ء میں اتحادیوں کا بیت المقدس پر قبضہ آٹھویں صلیبی جنگ تھی۔ جس میں مسیحیت اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکی۔ اگرچہ بیت المقدس کا یہ سقوط مسیحی یورپ کی کوششوں کا ثمر نہیں۔ اتحادیوں نے اس مقصد کے لئے ان یہودیوں کو آلہ کار بنایا جو صدیوں سے ارض موعود (بیت المقدس) میں قدم جمانے کے لئے کوششوں میں لگے ہوئے تھے جن کی آڑ میں (مسیحی یورپ نے) مسلمان ترکوں سے بیت المقدس چھین کر مظلوم مسیح کے قاتلوں کی نذر کر دیا۔

مسیح اور ایک رخ

میں زمین پر آگ بھڑکانے آیا ہوں اور اگر آگ بھڑک چکی ہوتی تو میں کیا ہی خوش ہوتا۔ لیکن مجھے بپتسمہ لینا ہے اور جب تک وہ نہ ہو لے میں بہت ہی تنگ رہوں گا۔ کیا تم گمان کرتے ہو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ میں تم سے کہتا ہوں نہیں جدائی کرانے! یہ ہے انجیل کا کلمہ!

مگر اسلام پر یہ کلیہ اس لئے لاگو نہیں ہوتا کہ اسلام نے کوئی شہر تلوار کے زور سے فتح نہیں کیا۔ یہ خاصہ تو صرف مسیح کا ہے جس نے گزشتہ صدیوں سے جہاں گیری اور جہاں بانی اپنا شیوہ بنا لیا ہے۔ مگر آج اسے پیروان مسیح اسلام کے سر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جبکہ آج کا یورپ ہوس استعمار میں سرشار ہو کر تاتاریوں کی طرح سرگرم عمل ہے جنہوں نے اسلام کا لبادہ اوڑھ کر ملک فتح کئے۔ لیکن اسلامی تعلیم کا ان تاتاریوں پہ شمہ برابر اثر نہ تھا۔ ان کے اس جرم کی سزا میں دوسرے مسلمان بھی جکڑے گئے۔

پھر دیکھئے جہاں یورپ نے استعمار کی بنیاد ڈالی تو ان ملکوں کے باشندوں نے ان کی نیت سے جلد ہی آگاہی حاصل کر لی۔ اس کے برعکس جتنے ملک مسلمانوں کے زیر علم آئے ان ملکوں کے غیر مسلم باشندوں نے اسلام کی عظمت سادگی اور اعلیٰ ترین اخلاقی اصولوں سے متاثر ہو کر از خود اسلام قبول کیا۔ دونوں (یورپ اور مسلمان حکمرانوں) میں مابہ الامتیاز پہلے ہی ہوس استعمار اور ثانی الذکر کی اس ذوق سے محرومی ہے۔ یورپ کے پیچھے دینی قوت کا شائبہ تک نہیں جس کی بدولت عیسائیت ایسا بے ثمر پودا ہے جس کی قیمت یورپ میں بھی نہیں رہی۔ اسی بے عملی کی

وجہ سے مسلمانوں میں ان کی تبلیغ بے اثر ہو گئی۔ مگر عیسویت اور مغربی استعمار کے برعکس اسلام کی عظمت اور سادگی عقل و ادراک میں وسعت پیدا کرتی ہے۔ جس کی بناء پر اس کے مقابلہ میں دوسرے مذاہب کی پذیرائی نہیں ہو سکتی۔ من اخذ باالسیف فبا السیف یوخذ۔ "جس نے تلوار کے زور سے تلوار چھینی ہے تم بھی تلوار کے زور سے اس سے واپس لو" بلاشبہ مسلمہ کلیہ ہے لیکن اس کا اطلاق دو طبقوں پر صادق آتا ہے۔

(الف) ان مسلمان حکمرانوں پر جنھوں نے مدافعت یا اپنے عقیدہ کی حفاظت سے قطع نظر جہاں بانی کی ہوس میں ملک فتح کئے ہوں۔

(ب) مسیحی مستعمرین یورپ جو پسماندہ اقوام کو اپنا غلام بنائے رکھنے کے لئے ان ممالک میں بزور شمشیر گھس جاتے ہیں۔

رسول رحمت ﷺ اور فتوحات

زمانہ اولیٰ کے مسلمانوں یا خلفائے راشدین کے زمانہ میں بلکہ اس سے کچھ مدت بعد بھی امرائے اسلام میں سے کسی نے کسی غیر قوم پر محض غلبہ حاصل کرنے یا ہوس استعمار کی غرض سے حملہ نہیں کیا۔ ان کی جنگوں کا مقصد دشمنوں کی مدافعت یا اپنے عقیدہ کا تحفظ تھا۔ جیسا کہ جب قریش نے (بعد نبوت) مسلمانوں کو ان کے عقیدے سے لوٹانے کی کوشش کی تو اس معاملہ میں پورا عرب قریش کے ساتھ ہو کر مسلمانوں پر حملہ آور ہو گیا۔ تب مسلمانوں نے ان سے مدافعت کے لئے جنگ ضرور کی۔ اسی طرح روم کے مسیحی دشمنان اسلام اور ایران کے مجوسی حاسدان دین اسلام کا ماجرا بھی ہے جب انہوں نے مسلمانوں کے عقائد میں مداخلت کی تو مسلمانوں نے انہیں آڑے ہاتھوں لیا۔ قریش عرب روم اور ایران کی جنگوں میں بھی صداقت مسلمانوں کی طرف تھی۔ اور جدھر صداقت ہو فتح ادھر ہی ہوتی ہے۔

مسلمانوں نے فاتح ہونے کے باوجود اپنے کسی مقابل کے عقیدہ میں مداخلت نہیں کی اس لئے کہ اسلامی عقیدہ میں کسی کے عقیدے میں بالجبر مداخلت گناہ ہے۔ (لا اکراہ فی الدین) ان فاتحین نے یورپ کے مستعمرین کی طرح اپنے مفتوحہ ممالک کو اپنے لئے استعمار کی منڈیاں نہیں بنایا۔

جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے انداز حکمرانی کی تاریخ گواہی دے رہی ہے وہ مفتوح قبیلوں میں ان کے سابقہ امیروں کو ہی ان کے منصب پر جوں کے توں رکھتے تھے۔ مسلمانوں کو کسی کے مذہب و عقیدہ میں مداخلت کا جواز ہی نہیں۔ لیکن یہ بھی ان کے اختیار میں نہ تھا کہ ان کے عقیدے کی استواری اور اہل عرب کی اہالیان عجم پر عدم ترجیح دیکھ کر مفتوحہ ممالک کے باشندے خود بخود اسلام قبول نہ کریں تو وہ پھر ایسے مساواتی عقیدہ کے دین سے آنکھیں بند کر کے کون گزر سکتا ہے۔

صرف تبلیغ اسلام

فاتحین کا اصل مقصد دین اسلام کی تبلیغ ہوتا تھا۔ جس کے بنیادی اصول کے تحت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر برتری حاصل نہیں۔ جب عرب سے باہر رہنے والوں نے مسلمانوں میں اخلاق کا یہ اعلیٰ معیار پایا تو اسلام قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہ تھا۔
اسلام انسانوں کے سروں کو زبردستی جھکانا جرم قرار دیتا ہے۔ اسلام انسانی ضمیر اور دل کے دروازوں پہ دستک دیتا ہے۔ پھر عقل و تدبر اور فطرت کے عین مطابق زندہ رہنے کے آداب سکھاتا ہے۔

لیکن گذشتہ آخری صدیوں میں ملوکیت نے ڈیرے ڈال دیئے۔ مسلمانوں نے بادشاہوں کی جہانگیری کے لئے جنگیں شروع کر دیں ورنہ اسلام بزور شمشیر فتح کرنے کا نہ حامی ہے۔ نہ کسی کو اس کے مفتوحات میں بزورِ شمشیر ملک کا کوئی حصہ واپس لینے کی جرات کی اجازت دیتا ہے۔
مذکورہ تحریر کے مطابق مفتوحہ قبائل کے امراء و نوابین کو ان کے مناصب پر رسول اللہ ﷺ کے برقرار رکھنے کا مقصد یہی ہوتا تھا کہ ہمارا مقصد زمین پر حکمرانی کرنا نہیں تم پر حکمرانی کرنا نہیں بلکہ سب کو ایک اللہ کی حکمرانی میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ جس کے نتیجہ میں سب کے سب وحدت اسلامی میں منسلک ہوتے چلے گئے۔ اب اسلامی ممالک میں نہ کوئی راجہ تھا نہ پرجا۔ حتیٰ کہ قبائل عرب مکہ معظمہ یا مدینہ منورہ میں سے بھی کسی کی ماتحتی میں سرنگوں نہ تھے۔ ان میں اگر کوئی امتیاز تھا تو ان کے ایمان و عمل کے اعتبار سے تھا۔ لیکن تمام مسلمان ایک حکمران اللہ کے سامنے مساوی تھے۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز

البتہ جب کوئی دشمن ان کی جمعیت کو پارہ پارہ کرنے یا ان کے عقائد میں تبدیلیاں لانے کی کوشش کرتا تو یہ ان کے مقابلہ میں ڈٹ جاتے۔ اس لئے کہ ہر فرد ملت کے جسم کا ایک حصہ ہے اور ان کا مرکز دارالخلافہ ہے۔ لیکن خلیفہ اور دارالخلافہ دونوں میں سے کسی کو اقتدار و منزلت یا معنوی برتری میں جمہوری عوام پر کوئی تفوق بھی نہیں۔
اسلام میں یہ برتری صرف احکام الٰہی کو حاصل ہے۔ اسی مساوات کے صدقہ میں مسلمانوں کا ہر بڑا شہر علم و فن اور صنعت و حرفت کا مرکز بنا ہوا تھا، جہاں امن تھا، سکون تھا، چاروں طرف سے دھن (دولت) برستا تھا۔

مسلمان کی تباہی ان کا اپنا حاصل عمل ہے

مسلمانوں نے اسلام کے اصولوں میں تحریف شروع کر دی جس کے خود ہی شکار ہوئے باہمی اخوت دشمنی میں بدل دی تو تسبیح کے دانوں کی طرح بکھر گئے۔ ایک دوسرے کے کاموں اور ضرورتوں پر اپنے کاموں اپنے مفاد کو ترجیح دینا شروع کر دی۔ خود پرستی سب کا شیوہ بن گیا۔ جس سے وقت کا رخ بھی بدل گیا۔ دشمن کی تلوار میان سے نکل آئی۔ شمشیر کے قانون کا جزو اول نافذ ہو گیا۔ اور مسیحی تلوار نے ان کے پرخچے اڑا دیئے۔ اب اس شمشیری قانون کے آخری جملہ کی عملی تعبیر کا انتظار ہے کہ مسلمانوں کو مسیحی فاتحین سے شمشیر ہی کا قانون کب ان کا مالک انہیں واپس دلاتا ہے؟

تلوار کا قانون

پندرھویں صدی عیسوی کے آغاز سے ہی مسیحیت نے ایسی کروٹ لی کہ اگر ان کی آپس میں پھوٹ نہ پڑتی تو ان کا وجود دنیا کے لئے انتہائی خطرناک ثابت ہوتا' مسیحی یورپ کی شمشیر نے ان مسلمانوں کو اپنے نرغے میں لے لیا جو اسلامی اصُول ترک کر چکے تھے۔ لیکن عیسائیوں نے مسلمانوں پر ہر طرح حکومت کی ذرا تو ر دیکھئے فاتح اور مفتوح کے درمیان تلوار رکھ دی گئی۔ ظاہر ہے جہاں تلوار کے زور سے حکومت حاصل کی جائے وہاں سے عقل و علم' شرافت اور محبت بلکہ ایمان و انسانیت تک رخصت ہو جاتے ہیں۔

اسلامی قانون

دنیا کا موجودہ اخلاقی بحران زور شمشیر ہی کا نتیجہ تو ہے' یورپ کی جو بادشاہیاں تلوار کے زور سے کمزور ممالک پر حکمران ہیں۔ آج سے بیس سال پہلے بھی قومیں دنیا میں امن و صلح پیدا کرنے کا احساس کر رہی تھیں۔ لیکن ایسی صلح اور محبت کا سبق صرف اور صرف اسلام ہی کے پاس ہے۔

وان طائفتان من المومنین اقتتلوا فاصلحوا بینھما فان بغت احدھما علی الاخری فقاتلوا التی تبغی حتی تفئی الی امر اللہ فان فائت فاصلحوا بینھما بالعدل واقسطوا ان اللہ یحب المقسطین انما المومنون اخوۃ فاصلحوا بین اخویکم واتقوا اللہ لعلکم ترحمون۔ (10-9:49)

اگر تمہارے مسلمانوں کے دو فرقے آپس میں لڑ پڑیں تو تم ان میں صلح کرا دو اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف

رجوع کرے پس جب وہ رجوع کرے تو دونوں فریقوں میں برابری (عزتِ نفس کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو۔ کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اور اپنے دو بھائیوں میں صلح کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے!

مغربی تمدن استعمار پر مبنی ہے

اس آیت کے برخلاف مغربی حکمرانوں کی صلح کی ایسی کوششیں ابھی تک ناکام ہیں۔ بلکہ ان کی نحوست کے اثر سے صلح و امن کا وجود دنیا کے کسی کونے میں آباد نہیں ہونے پاتا اور ایسا ہو بھی کیسے؟ جبکہ مغرب کے تمدن کی بنیاد ہی استعمار پر ہے اور استعمار کا مطلب ہے کمزور لوگوں کو اپنی طاقت کے شکنجے میں جکڑے رکھنا ہے بلکہ استعمار کے ہاتھوں جکڑے ہوئے ممالک کو آزادی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کی اجازت بھی نہیں ہوتی۔ اگر وہ ایسا کریں تو دنیا کرۂ نار میں جل کر فنا ہو جائے گی۔ لیکن ایک دن آئے گا جب پسماندہ اقوام ان ابلیسانِ سیاست کو اپنی گرفت میں لا کر دم لیں گے۔ ظاہر ہے جب تک دنیا میں ایک ابلیس بھی باقی ہے جس کے دماغ کو ہوس استعمار نے پاگل بنا رکھا ہے۔ صلح و امن کا برقرار رہنا ناممکن ہے۔ روز نقلی معاہدے ہوتے ہیں لیکن معاہدوں کے بعد بھی دونوں فریق نہ تو ایک دوسرے سے اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے ہیں اور نہ ہی وقت ملنے پر دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پہ حملہ آور ہونے سے باز رہتا ہے۔

صلح و امن کا دور دورہ صرف ایک صورت میں ہو سکتا ہے کہ ہر قوم اپنی برتری کا سودا سر سے نکال کر باہمی محبت و مساوات کی فکر میں مصروف ہو جائے ہر قوم کا اساسی عقیدہ اسی پر مبنی ہو کہ جب کوئی ملک دوسرے پر حملہ آور ہو تو سب مل کر حملہ آور پر ٹوٹ پڑیں۔ لیکن یہ صورت اس وقت ممکن ہے جب تمدن کی بنیاد استعمار پر نہ ہو۔ اور دنیا پر واضح ہو جائے کہ اب سے طاقتور ملک پسماندہ قوموں کی امداد پر کمربستہ ہو جائیں۔ حکمران اپنے ماتحتوں پر شفقت و محبت کا برتاؤ کریں۔ علم دوست جاہلوں کی تربیت کرنا اپنا فرض سمجھیں۔ عقل و دانش کا علم بلند ہو۔ علم سے بے بہرہ قوموں کو سائنس و فنون کے بل بوتے پر غلام نہ بنا لیا جائے بلکہ ہر حال میں انسانیت کی منزلت کو مقدم رکھا جائے گا۔ اگر تمدن کی بنیاد استعمار کی بجائے اسلامی نظریہ تہذیب پر قائم کی جائے تو امن و صلح خود بخود قائم ہو جائے گا۔ انسان دنیا کے ہر کونے کو اپنا تصور کرے گا۔

ایک دوسرے کو اپنا بھائی سمجھ کر اپنی ضروریات اس کی ضروریات پر قربان کرے گا۔ دلوں میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگے گا۔ جب برسر اقتدار جماعتیں اپنے لب و لہجہ کو تبدیل کر لیں گے۔ ہر قوم دوسرے فریق کی حرمت خود پر واجب سمجھ لے گی۔ باہم دوستانہ تحائف ایک

دوسرے کو دیئے لئے جائیں گے۔ اور یہ تمام اطوار و کردار صرف اور صرف اللہ عزوجل کی خوشنودی کے لئے عمل میں آئیں گے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ صداقت کو فروغ حاصل نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ ایسے ہی دور میں اپنے بندوں پر خوش ہو سکتا ہے۔ اور اس کے بندے اسی طرح اپنے خالق کو خوش رکھ سکتے ہیں۔

اسلام کی اساس عفوو مساوات پر ہے

ان الذین آمنواوالذین ہادوا والنصاری والصابئین من آمن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحا" فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولاھم یحزنون۔ (62:2)

اور جو لوگ مسلمان ہیں یا یہودی یا عیسائی یا ستارہ پرست ان میں سے جو اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لائے گا اور عمل نیک کرے گا۔ ایسے لوگوں کو ان کے اعمال کا صلہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ملے گا۔ اور قیامت کے دن کو نہ کسی طرح کا خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غم سہیں گے۔

اسلام کے افق کے سوا اور کہاں مساوات، عفوو کرم اور اخوت کا آسمان تلاش کیجئے گا۔ جس میں اللہ وحدہ لاشریک پر ایمان اور یوم حساب پر یقین کے ساتھ ساتھ ہر نیکی کا ثواب مقرر ہے۔ اس سے قطع نظر کہ دوسرا شخص مسلمان ہے یا اسلام کی دعوت نہ پہنچنے پر مرنے تک یہودیت پر قائم کر رہا۔ نصرانیت پر اس کا خاتمہ ہوا یا صابیت کی گود میں بیٹھا ہوا قبر میں پہنچ گیا۔

وان من اھل الکتاب لمن یومن باللہ وما انزل الیکم وما انزل الیھم خاشعین للہ لا یشترون بایات اللہ ثمنا" قلیلاً اولئک لھم اجرھم عند ربھم ان اللہ سریع الحساب۔ (199:3)

اور بعض اہل کتاب ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوئی اور اس پر جو ان پر نازل ہوئی اس پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے آگے عاجزی کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی آیتوں کے بدلے تھوڑی سی قیمت نہیں لیتے۔ یہی لوگ ہیں جن کا صلہ ان کے پروردگار کے ہاں ہے اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے۔

کیا قرآن مجید کے اس لطف و عفو کے مقابلہ میں مغرب کا وہ تمدن پیش کیا جا سکتا ہے جس کی بناء ہی عصبیت اور اس کا کمال ہی ایک دوسرے سے باہم حسد اور جنگوں پر ہو؟ عفوو صلح کی جو تعلیم قرآن کی اس آیت (199:3) میں ہے اس کا پرچار دنیا کے کونے کونے میں کرنا ہمارا فرض ہے۔ تاکہ ہر انسان اپنا مرتبہ معلوم کر سکے اور یہی وہ روح ہے جو ختم المرسلین جناب محمد ﷺ وحی الٰہی کے ذریعہ نازل ہوئی۔ انسانی زندگی کے لئے جو لائحہ عمل مرتب کیجئے۔ اسی آیت کے پیش نظر کیجئے۔ جس سے روحانی، مادی اور اخلاقی مسائل کے حل ہونے میں مدد مل سکتی

ہے۔ جن کا تعلق ہماری روزمرہ کی زندگی سے ہے اور جس کے حل کے لئے اہلِ علم صدیوں سے سرگرداں ہیں۔

حیاتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

اس کتاب میں محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے جو نقوش دکھائے گئے ہیں انہیں ایک ایسے انسان کا خاکہ کہئے جو مقام عفو و برتری کے تمام مراتب و مراحل طے کر چکا ہو۔

جو لوگ زندگی کے لئے نمونہ و مثل کی جستجو میں ہیں ان کے لئے جناب محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ایسا جامع اور کامل و اکمل درس ہے جس کے ہوتے ہوئے کسی اور کے درس کی ضرورت ہی نہیں۔ بلکہ کسی اور کا درس آپ کو گمراہ کر دے گا۔ آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا اعمالِ حسنہ کے حسین اور واضح نقوش کہیں بھی نہیں ملیں گے۔ اللہ القادر کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سراج منیر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعثت کے زمانہ سے پہلے بھی صداقت و شرافت کی ضرب المثل ہیں اور نبوت کے بعد بھی صداقت و امانت شرافت و حکمت عدالت و شجاعت کی علامت کبریٰ ہیں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ہر لمحہ قربانی کے لئے وقف ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صداقت و حقیقت اور منصبِ رسالت کے ابلاغ کی کوششوں میں کئی بار موت کے قریب پہنچے لیکن کیا مجال کہ قدم ڈگمگا جائیں۔ اس پر یہ بھی بے مثال امتیاز حاصل ہے کہ کسی نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے مقصد حیات سے ہٹانے کے لئے جاہ و مال کا لالچ دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے ٹھکرا دیا۔

شافع محشر رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زندگی کے جس بلند و بالا مرتبہ پہ فائز ہیں کسی اور انسان کی رسائی وہاں تک ہونا ناممکن ہے۔ بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور یہ بے مثال کمالات زندگی کے کسی ایک شعبہ میں نہیں بلکہ آپؐ کی زندگی کے ہر زاویہ میں بے داغ تکمیل نظر آئے گی۔ بشر کے لئے اس سے زیادہ برتری کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی کہ ایک طرف یہ کمالات حاصل ہوں اور دوسری طرف اللہ رب العالمین سے بھی پورا پورا رابطہ ہو۔

صدیاں گزریں' ہزاروں انقلاب آئے اس سراج منیر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کی روشنی کو ماند کرنے کی نہ معلوم کتنی سازشیں ہوئیں' ہو رہی ہیں۔ نہ معلوم اس مینارِ صداقت و رحمت کے اردگرد ابلیسی سازشوں نے کتنے ہی خود ساختہ روشنیوں کے شہر آباد کئے ہیں اور کئے' لیکن اس مینارِ صداقت کی روشنی اس کی چمک اس کی آب و تاب اپنی جگہ ممیز ہے۔ درخشاں ہے تابندہ ہے۔ 21 ویں صدی تک نہ معلوم کیسی کیسی بلند ترین ہستیاں پیدا ہوئیں۔ زندگی میں بڑے بڑے بلند مقام پر فائز بھی ہوئیں۔ مگر نبی الخاتم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مقام ان سب سے آج بھی بلند ہے۔

بلکہ النبی الخاتم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے منصبِ نبوت و رسالت پہ بھی بڑی بڑی ہستیاں اس دنیا میں آئیں ان پر اللہ کی سلامتی اور برکتیں نازل ہوں مگر اس ہستی رسولِ کل عالم نبی رحمت علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بڑھ کر کوئی ہستی نہیں۔

بلاشبہ رسالت و نبوت کا عظیم ترین مرتبہ خاتم النبین محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے نامعلوم تعداد ہستیوں کو نصیب ہوا جو اپنی اپنی قوم میں آئیں۔ اپنی قوم کو ہدایات دیں۔ مگر ان بے شمار نبیوں میں سے کسی کو بھی تمام دنیا کی رسالت کا اعزاز نہیں ملا۔ اور نہ ہی کسی کو ختم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام کا سا خصوصی مقام و مرتبہ ملا۔ مگر یہ مقام و مرتبہ صرف اور صرف محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی ملا۔ آپؐ کو اللہ تعالیٰ نے تمام نبی نوع انسان کی طرف رسول مبعوث فرمایا۔ اور اس اعزاز کو قیامت تک کا دوام بخشا۔ سننے والوں نے تصدیق کی آج سے پندرہ سو سال پہلے بھی آج بھی ـــــ اور رہتی دنیا تک تصدیق کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ایسا کیوں نہ ہو ـــ کیوں نہ ہوتا "صداقت" کبھی نہیں مرتی ـــ صداقت کبھی ماند نہیں پڑتی۔ صداقت ہمیشہ زندہ رہتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالتِ صداقت کا دوسرا نام اور ان پر اور نازل ہونے والی کتاب قرآن حکیم فرقان حمید صداقت' لاریب صداقت لاعیب صداقت ــــــ جس کا ہر حرف صداقت ـــــ اور اس صداقت کا نور تابندہ و پائندہ

ماکان حدیثاً یفتری ولکن تصدیق الذی بین یدیہ وتفصیل کل شئی وھدی ورحمۃ لقوم یومنون۔ (111:12)

یہ قرآن ایسی بات نہیں جو اپنے دل سے بنائی گئی ہو بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے نازل ہوئیں ہیں یہ قرآن ان کی تصدیق کرنے والا ہے۔ ہر چیز کو تفصیل سے بیان کرنے والا اور مومنوں کے لئے ہدایت و رحمت ہے۔

حرفِ آخر

حرفِ آخر

اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور رحم و کرم سے امید ہے کہ میں نے جس مقصد کے لئے قلم اٹھایا تو جہاں تک میری علمی بساط تھی اس نے مجھے اس میں پوری کامیابی عنایت فرمائی۔

لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا لھا ما کسبت وعلیھا ما اکتسبت' ربنا لا تواخذنا ان نسینا او اخطانا۔

اللہ تعالیٰ کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتے۔ ہر شخص کے لئے وہی ہے جو اس نے اپنی محنت سے کمایا۔ (اچھے اعمال کئے تو فائدہ اور برے اعمال کئے تو نقصان کمایا) اے پروردگار اگر ہم سے بھول چوک ہو گئی ہو تو ہم کو معاف فرما کر مواخذہ نہ کرنا۔ ہمیں بخش دینا۔ (آمین)

ربنا ولا تحمل علینا اصراً کما حملتہ علی الذین من قبلنا ربنا ولا تحملنا مالا طاقۃ لنا بہ۔

اے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالنا جیسا کہ تم نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا۔ اے پروردگار جس قدر بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہمارے کاندھوں پہ نہ ڈالنا۔

واعف عنا واغفر لنا وارحمنا انت مولانا فانصرنا علی القوم الکافرین۔

اے اللہ ہمارے گناہوں سے درگزر فرما۔ ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما تو ہی تو ہمارا مالک ہے اور ہم کو کافروں پر فتح و کامرانی عطا فرما۔ آمین!

ماخذ

جن کا ذکر مصنف نے کیا۔

(ا)

الابطال۔ کارلیل
اسباب النزول۔ الواحدی
الاسلام۔ اب لامنس
الاسلام الصحیح۔ استاد محمد اسعاف انشاشیبی
الاسلام والنصرانیہ۔ امام محمد عبدہ

(ب)

البحر الرائق۔ ابن نجیم
البدایہ والنہایہ۔ ابن کثیر

(ت)

تاریخ ابن کثیر۔ البدایہ والنہابہ
تاریخ ابی الفداء۔ البدایہ والنہایہ
تاریخ الرسل والملوک ------ طبری
تفسیر طبری ------ جامع البیان
تفسیر آیات القرآن الحکیم ---

(ح)

حیات محمد ﷺ ---- امیل در منجم

حیات محمد ﷺ --- ولیم میور

(د)

دائرۃ المعارف البریطانیہ
دلائل النبوہ - ابی نفیم اصبہانی

(ر)

رسالہ فی التاریخ العرب۔ کوسان دیر سفال
روح الاسلام۔ امیر علی
زوح المعانی۔ آلوسی

(س)

سیرۃ ابن ہشام

(ش)

شرح مسلم نودی
الشفاء قاضی عیاض

(ص)

صحیح مسلم

(ط)

الطبری۔ تاریخ الرسل والملوک
طبقات ابن سعد۔ ابن سعد

(ف)

فتح العرب مصر۔ دکتور بتلر
فجر الاسلام۔ استاد احمد امین
فی الادب الجاہلی ------ دکتور طہ حسین

(ق)

قصص الانبیاء۔ استاد عبدالوہاب نجار

(ک)

کتاب البخاری۔ الجامع الصحیح
کتاب واشنطن ارفنج
کلیات ابی البقاء

(م)

مجلته المستشرقن الالمانیه
مجلته المنار
مغازی الواقدی
مفتاح کنوز السنه
موسوعة۔ اروس الفرنسیه

(ن)

الناسخ والمنسوخ۔ ابن سلامه
النهایه ابن ایثر

(و)

الوحی المحمدی۔ رشید رضا

(ی)

الیهود فی البلاد العرب۔ اسرائیل والفنسن